3

مرقاۃ المفاتیح

شرح اردو

مشکوٰۃ المصابیح

للعلامہ الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری

مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم

مکتبۃ رحمانیۃ

مرقاة المفاتیح اردو

للعلامه الشیخ القاری علی بن سلطان محمد القاری ھجری ۱۰۱۴

شرح

مشکوٰۃ المصابیح

للامام العلامۃ محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی المتوفی ۷۴۱

مترجم: مولانا راؤ محمد ندیم

جلد سوم

مکتبہ رحمانیہ
اقرأ سنٹر۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار لاہور
فون: 37355743-37224228-042
MAKTABA-E-REHMANIA

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

MAKTABA-E-REHMANIA

مکتبہ رحمانیہ

نام کتاب: .... مرقاۃ المفاتیح اردو (جلد سوم)

مترجم: .... مولانا راؤ محمد ندیم

ناشر: .... مکتبہ رحمانیہ

مطبع: .... لٹل سٹار پرنٹرز لاہور

استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔

بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرما دیں۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لیے ہم بے حد شکر گزار ہوں گے۔ (ادارہ)

فہرست

الموضوع

تابع

کِتَابُ الصَّلٰوۃِ

بَابُ الصَّلَاۃِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفَضْلِهَا

حضور نبی مکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ پر درود شریف پڑھنے اور اس کی فضیلت کا بیان

اِس مسئلہ میں علماء کرام کا اختلاف ہے کہ مندرجہ ذیل ارشادِ ربانی میں امر کا محمل کیا ہے؟

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [الأحزاب : ٥٦]

''اے اہل ایمان! پیغمبر اسلام پر بکثرت درود وسلام بھیجا کرو۔''

آیا یہ امر وجوب کے لئے ہے یا استحباب کے لئے۔ پھر درود شریف کا پڑھنا فرض عین ہے یا فرض کفایہ؟ نیز یہ کہ ہر مرتبہ آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا نام نامی' اسم گرامی آنے پر درود شریف کا تکرار کرنا ہوگا یا نہیں؟ ایک ہی مجلس میں ''تداخل'' ہوگا یا نہیں؟

سو اس سلسلے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ قعدۂ اخیرہ میں تو درود شریف کا پڑھنا فرض ہے جبکہ جمہور علمائے امت اسے سنت قرار دیتے ہیں۔ اس کی تفصیلی مباحث کے لئے تو حافظ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''القول البديع في الصلوٰة على الشفيع'' کی طرف رجوع کیجئے تاہم اتنی بات ذہن میں رہے کہ احناف کے نزدیک فتویٰ اس بات پر ہے کہ آیت مذکورہ میں امر وجوب کے لئے ہے اور ایک مجلس میں ایک ہی مرتبہ درود شریف پڑھ لینا بھی کافی ہے۔

فائدہ : ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس عبارت میں فتویٰ نقل فرمایا ہے کہ جو یقیناً صحیح ہے تاہم وادیٔ عشق ومحبت میں قدم رکھنے والے جانتے ہیں کہ محبوب کا کثرت سے تذکرہ ہی دلِ عشاق کو حیاتِ نو عطا کرتا ہے اس لئے تقاضائے عشق یہ ہے کہ ہر مرتبہ درود وسلام کا نذرانہ پیش کرے اور اسے اپنے لئے سعادت سمجھے۔

الفصل الاول :

قعدہ میں درود پڑھنے کا طریقہ

۹۱۹: وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِیْ لَیْلٰی قَالَ لَقِیَنِیْ کَعْبُ بْنُ عُجْرَةَ فَقَالَ اَلاَ اُهْدِیْ لَكَ هَدِیَّةً سَمِعْتُهَا مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ بَلٰی فَاهْدِهَا لِیْ فَقَالَ سَاَلْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْنَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ کَیْفَ الصَّلَاةُ عَلَیْکُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ فَاِنَّ اللّٰهَ قَدْ عَلَّمَنَا کَیْفَ نُسَلِّمُ عَلَیْكَ قَالَ قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاهِیْمَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ (متفق علیه) اِلَّا اَنَّ مُسْلِمًا لَمْ یَذْکُرْ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ فِی الْمَوْضِعَیْنِ۔

أخرجه البخاري في صحيحه ٦/٤٠٨ حديث رقم ٣٣٧٠ ومسلم في صحيحه ١/٣٠٥ حديث رقم (٦٦-٤٠٦)۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت کعب بن عجرہ سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کیا میں تمہیں وہ چیز بطور ہدیہ پیش نہ کروں جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ وہ ہدیہ ضرور بتائیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اے اللہ کے رسول آپ پر اور آپ کے اہل بیت پر ہم درود کس طرح بھیجیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ تو بتا دیا ہے کہ ہم آپ پر سلام کیسے بھیجیں۔ (آپ یہ بتائیں کہ ہم صلوٰۃ کیسے بھیجیں)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس طرح کہو: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ ...... اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما۔ جس طرح کہ تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل پر رحمت نازل فرمائی ہے بے شک تو بزرگ اور برتر ہے۔ اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان کی آل پر برکت نازل کر جس طرح تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل پر برکت نازل کی۔ بے شک تو بزرگ اور برتر ہے۔

تشریح: ''قوله کیف الصلوٰة علیکم اهل البیت؟'' اس عبارت میں لفظ ''اهل البیت'' ترکیب نحوی کے اعتبار سے منصوب ہے۔ جس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔

① یہ منصوب علی المدح والاختصاص ہے۔

② منادی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

تاہم اسے مجرور پڑھنا بھی جائز ہے۔ اس صورت میں یہ ''علیکم'' کی ضمیر مخاطب سے ''عطفِ بیان'' واقع ہوگا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی تردید:

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اسے مجرور پڑھنے کی وجہ ضمیر مخاطب سے بدل ہونے کو قرار دیا ہے۔ جو کہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ضابطہ یہ ہے کہ اسم ظاہر، اسم ضمیر سے بدل صرف اسی صورت میں بن سکتا ہے۔ جبکہ وہ ضمیر غائب کی ہو۔ جیسے ''ضربته

زیدا'' اور یہاں ضمیر، مخاطب کی ہے، نہ کہ غائب کی۔ اور یہی لفظی فرق ہے عطف بیان اور بدل کے درمیان، جیسا کہ ابن حاجب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''کافیہ'' میں تحریر فرمایا ہے۔

''**قوله كيف نسلم عليك**'' صحابہ کرام علیہم الرضوان کے سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ نے ہمیں آپ پر درود وسلام پڑھنے کا حکم دیا ہے اور سلام کا طریقہ بھی بتایا ہے لیکن ''صلوٰۃ'' کا طریقہ ارشاد نہیں فرمایا۔ آپ ہمیں اس کا طریقہ بھی بتا دیجئے تا کہ اس امر الٰہی کی تعمیل و تکمیل ہو سکے۔

بظاہر اس سوال کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح کلمات تسلیم آپ کی زبان مبارک سے اللہ نے ہمیں سکھائے ہیں۔ اسی طرح کلمات درود بھی آپ کی مقدس و بابرکت زبان کے ذریعے معلوم ہو جائیں تا کہ اس کا کامل اور مکمل ثواب حاصل ہو سکے۔ نیز اس میں اس حقیقت کا بھی اعتراف ہے کہ سرورِ کون ومکاں صلی اللہ علیہ وسلم کی کما حقہ تعریف کرنا ہمارے امکان اور طاقت سے باہر ہے اور اس میں بھی ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ اس کی مثال مسلم شریف کی وہ روایت ہے۔ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم، جناب باری میں عرض کرتے ہیں:

''**سبحانك لا احصي ثناء عليك، انت كما اثنيت على نفسك**''

بس اتنا ہی کہتا ہوں کہ آپ ویسے ہی ہیں جیسی آپ نے خود اپنی تعریف کی ہے۔

جبکہ ''مظہر'' اس سوال کا مقصد یہ قرار دیتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر صلوٰۃ وسلام کی تعلیم تو ''**يايها الذين امنوا صلوا عليه وسلموا تسليما**'' کہہ کر دے دی ہے۔ اب یہ بتائیے کہ آپ اہل بیت پر کیسے درود پڑھا جائے؟ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آیت مذکورہ سے صلوٰۃ وسلام کا حکم تو مستفاد ہوتا ہے۔ لیکن ان کی کیفیت معلوم نہیں ہوتی۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان نے اسی کیفیت کے متعلق سوال کیا ہو جیسا کہ سوال کے الفاظ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔

الفاظِ حدیث پر روایتاً بحث:

اس حدیث کے مطابق تو صحابہ کرام علیہم الرضوان نے کلماتِ درود کے متعلق سوال کیا تھا جبکہ بقول حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے صحیحین کی ایک اور روایت کے مطابق بھی کلماتِ درود کے متعلق ہی سوال کیا تھا۔ اسی طرح ایک دوسری حدیث میں جس کی سند جید ہے مروی ہے کہ جب آیت صلوٰۃ وسلام نازل ہوئی تو ایک آدمی نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ کو سلام کرنے کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہو چکا ہے۔ درود پڑھنے کا طریقہ بھی ارشاد فرما دیجئے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں مذکور درود شریف کے کلمات تلقین فرمائے۔

مسلم شریف ہی کی ایک دوسری روایت میں یہ سوال اس طرح بھی منقول ہے کہ اللہ نے ہمیں آپ پر درود پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ یہ بتائیے! کہ ہم آپ پر درود کیسے پڑھیں؟ یہ سوال سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے اور اتنی دیر خاموش رہے کہ ہم تمنا کرنے لگے کاش! آپ سے یہ سوال پوچھا ہی نہ جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری طرف متوجہ ہو کر مذکورہ درود شریف تلقین فرمایا اور آخر میں فرمایا کہ سلام کا طریقہ وہی ہے جو تمہیں معلوم ہے۔

درود سے متعلق ایک نکتہ:

بعض عارفین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں نبی ﷺ پر درود پڑھنے کا حکم تو دیا لیکن اس کے الفاظ وطریقہ تعلیم نہیں فرمایا۔اس لئے بندے اپنی کمزوری کا اظہار کرتے ہوئے بارگاہ اقدس میں عرض کرتے ہیں کہ پروردگار! تو خود ہی ہمارے آقا ومولیٰ جناب رسول اللہ ﷺ پر درود شریف بھیج دے کیونکہ ہم توان کی شان ومرتبت سے ناواقف ہیں اور تو بہتر طریقے سے جانتا ہے کہ ان کی شایان شان کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟ اس لئے اپنے پسندیدہ طریقے کے مطابق ہماری طرف سے نبی ﷺ پر درود بھیج دے۔

نہایہ میں ''اللھم صل علی محمد'' کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے۔کہ اے اللہ! دنیا میں نبی ﷺ کو ان کے نام کی بلندی وعظمت، غلبہ دعوت اور ابقاء شریعت کے ذریعے عظمتیں عطا فرما اور آخرت میں شفاعت عظمٰی اور دوگنے اجر وثواب کے ذریعے عظمتیں رحمت فرما۔

''قولہ وعلی آل محمد'' اس جملے میں یہ بات قابل غور ہے۔کہ ''آل محمد ﷺ'' سے کیا مراد ہے؟ سو اس سلسلے میں علماء کرام کے مختلف اقوال ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

① اس کا مصداق وہ لوگ ہیں جن پر زکوٰۃ حرام ہے۔جیسے بنی ہاشم اور بنی مطلب وغیرہ۔

② اس کا مصداق ہر متقی شخص ہے جیسا کہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

③ اسکا مصداق ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور وہ لوگ ہیں جن پر زکوٰۃ حرام ہے۔اسی کے ضمن میں آپ کی اولاد بھی آجاتی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور جمہور علماء کے نزدیک اس کا مصداق بنوہاشم ومطلب کے مسلمان افراد ہیں۔بعض حضرات نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد اور نسل کو اس کا مصداق قرار دیا ہے۔بعض حضرات نے نبی ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور ذریت طیبہ دونوں کو اس کا مصداق قرار دیا ہے، بعض حضرات نے ہر مسلمان کو اس کا مصداق قرار دیا ہے جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا میلان بھی اسی رائے کی طرف ہے۔امام زہری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا مختار مذہب بھی یہی ہے، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا بھی یہی قول ہے اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی شرح مسلم میں اسی قول کو ترجیح دی ہے۔تاہم قاضی نے اس میں متقی ہونے کی قید بھی بڑھائی ہے۔

اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو تمام نے اپنے فوائد میں اور دیلمی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آل سے کون لوگ مراد ہیں؟ تو فرمایا ''کل تقی من آل محمد ﷺ''

دیلمی کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی:

﴿ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ ﴾ ''اس کے متولی صرف پرہیزگار ہیں'' [الانفال: ۳۴]

قولہ ''کما صلیت علی ابراھیم'': کلمات درود میں دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو چھوڑ کر خاص حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ اس لیے ہے کہ وہ حضور ﷺ کے جد اعلیٰ ہیں اور ہمیں دین کے اصول میں ان کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔یا توحید مطلق اور انقیاد میں ان کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

قوله على آل ابراهيم : یہاں مراد حضرت اسماعیل واسحاق علیہما السلام اور ان کی اولاد ہے۔

مسئلہ تشبیہ:

درود ابراہیمی کے ان کلمات پر تشبیہ کے سلسلے میں ایک مشہور اعتراض وارد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ذمی و بلغاء کے یہاں مسلّم ضابطہ ہے کہ مشبہ بہ افضل ہوتا ہے مشبہ کی نسبت۔ یہاں مشبہ حضور ﷺ ہیں اور مشبہ بہ حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضور ﷺ کی نسبت زیادہ افضل ہوں حالانکہ پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ نبی ﷺ تمام انبیاء کرام سے علی الاطلاق افضل ہیں؟

اس سوال کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

① حضور ﷺ نے درود ابراہیمی کے یہ کلمات اس وقت تلقین فرمائے تھے جب آپ کو افضلیتِ کلی کا علم نہ تھا۔

② تواضعاً تلقین فرمائے تھے۔

③ یہ تشبیہ اصل میں ہے، مقدار و مرتبہ میں نہیں (کہ جس قدر درود کا نزول نبی ﷺ پر ہو، اسی قدر حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی ہو، یہ مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ دونوں پر درود کا نزول ہو، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دونوں کی مقدار و مرتبہ بھی برابر ہو)

جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں بھی یہی توجیہہ کی گئی ہے:

"يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ" [البقرة: ۱۸۳]

"اے اہل ایمان! تم پر اسی طرح روزے فرض کئے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے۔"

یہاں یہ مراد نہیں ہے کہ جس مقدار میں پہلے لوگوں پر روزے فرض کئے گئے تھے تم پر بھی اسی مقدار میں فرض کئے گئے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ان پر روزے فرض ہوئے، تم پر بھی ہو گئے۔ اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ ﴾ [النساء: ۱۶۳]

"بے شک ہم نے آپ پر اسی طرح وحی بھیجی ہے جیسے حضرت نوح پر بھیجی تھی"۔

کا یہی مطلب ہے، نیز آیت قرآنی:

﴿ وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ﴾ [القصص: ۷۷]

"جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تم بھی لوگوں پر احسان کرو"۔

میں بھی تشبیہ سے یہی مراد ہے۔

④ درود ابراہیمی میں کاف (کما صلیت) برائے تشبیہ نہیں ہے بلکہ برائے تعلیل ہے جیسا کہ قرآن کریم میں بھی کاف برائے تعلیل استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

⑤ تشبیہ کا تعلق محمد ﷺ سے نہیں بلکہ آل محمد ﷺ سے ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، آل محمد (ﷺ) سے یقیناً افضل ہیں۔

⑥ یہاں مجموع کو مجموع سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ آل ابراہیم میں بکثرت انبیاء آئے ہیں۔ پھر خود نبی علیہ السلام بھی آل ابراہیم میں سے ہیں۔

⑦ یہاں تشبیہ فصاحت کے ایک مخصوص قانون کے مطابق دی گئی ہے جیسے ''الحاق مالم یشتهر بما اشتهر'' کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

⑧ سوال میں ذکر کیا گیا دعویٰ اور قانون ہی صحیح نہیں ہے کیونکہ مشبہ بہ ہمیشہ افضل نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات تشبیہ اپنے سے برابر اور کم تر چیز کے ساتھ بھی دی جاتی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت میں ہے:

﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ﴾ [النور: ۳۵]

قولہ ''انك حميد مجيد'': حمید بروزن فعیل، مفعول کے معنی میں ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ! آپ اپنی ذات، صفات اور افعال میں اپنی مخلوق کی زبانی محمود ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فعیل بمعنی فاعل کے ہو، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ! آپ اپنی ذات اور اپنے اولیاء کی خود ہی تعریف کرنے والے ہیں۔ اور حقیقت کو دیکھا جائے تو اصل حامد بھی وہی اور محمود بھی وہی۔ اسی طرح مجید کا معنی عظیم اور معزز ہے۔

قولہ اللهم بارك على'': اصل میں یہ لفظ ''برك البعير'' سے ماخوذ ہے۔ جو اس وقت بولا جاتا ہے جب اونٹ کو بٹھا دیا جائے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے اللہ! آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو عزتیں اور شان وشوکت عطاء فرما رکھی ہے، اسے دوام اور ثبات بھی عطاء فرما۔ تاہم ''برکت'' کا اطلاق ''زائد'' چیز پر بھی ہوتا ہے، یاد رہے کہ ان میں سے پہلا معنی ہی اصل ہے۔

فائدہ: مسلم شریف کی روایت میں مذکورہ الفاظ کے ساتھ ''في العالمين'' کا اضافہ بھی منقول ہے جس کا متعلق محذوف ہوگا اور اس پوری عبارت کا ترجمہ یہ ہوگا۔

''اے اللہ! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل واولاد پر تمام کائنات میں درود وبرکت کا ظہور فرما جیسے اپنے اہل زمانہ پر حضرت ابراہیم وآل ابراہیم پر ان دونوں چیزوں کا ظہور فرمایا تھا''۔

درود کے مختلف الفاظ

۹۲۰: وَعَنْ اَبِيْ حُمَيْدٍ السَّاعِدِيِّ قَالَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ نُصَلِّيْ عَلَيْكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَاَزْوَاجِهٖ وَذُرِّيَّتِهٖ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

(متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٠٧/٦ حديث رقم ٣٣٦٩ ومسلم في صحيحه ٣٠٦/١ حديث رقم (٦٩-٤٠٧)۔

ترجمہ: حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم آپ پر صلوۃ کس طرح بھیجیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کہو: اَللّٰهُمَّ صَلِّ ...... اے اللہ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن پر اور آپ کی اولاد پر رحمت نازل فرما۔ جیسے تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل پر رحمت نازل فرمائی اور

محمد ﷺ پر اور آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن پر اور آپ کے اولاد پر برکت نازل کر جیسے تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل پر برکت نازل فرمائی۔ بے شک تو بزرگ اور برتر ہے۔

تشریح: ''**قولوا اللّٰھم**'' لغوی تحقیق کے مطابق ''**اللّٰھم**'' اصل میں ''یا اللہ'' تھا حرفِ نداء ''یا'' کے عوض آخر میں میم لے آئے، یہی وجہ ہے کہ حرف نداء اور میم دونوں کو جمع کر کے ''**یا اللّٰھم**'' کہنا انتہائی شاذ ہے (کیونکہ عوض اور معوض جمع نہیں ہوتے) اور بعض حضرات نے اس میم کو علامتِ جمع قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ جس طرح واؤ علامت جمع ہوتی ہے اسی طرح میم بھی ہے۔ اس صورت میں ''**اللّٰھم**'' کا ترجمہ ہوگا ''اے وہ ذات! جس میں سارے اسماء حسنیٰ جمع ہو گئے۔ بعض حضرات نے میم کو دوسرے جملے کا جزو قرار دیتے ہوئے اصل عبارت یہ بیان کی ہے:

''**یا اللّٰہ امنا بخیر**'': ''اے اللہ! ہمیں خیر کے ساتھ امن عطا فرما''۔

جبکہ بعض حضرات نے میم کو زائد اور برائے تفخیم قرار دیا ہے۔

ان چاروں اقوال میں سے دوسرے قول کی تائید خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ ''**اللّٰھم**'' کا لفظ ''مجتمع الدعاء'' ہے اسی طرح نضر بن شمیل فرماتے ہیں کہ جس شخص نے ''اللھم'' کہہ کر دعاء کی، گویا اس نے اللہ کو اس کے سارے ناموں سے پکارا۔ نیز ابورجاء کا قول بھی اسی کا مؤید ہے کہ اس میم میں اللہ تعالیٰ کے تقریباً ننانوے اسماءِ مبارکہ موجود ہیں۔

''**قولہ صلّ علی محمد**'': حضور نبی مکرم، سرور دوعالم ﷺ کا یہ اسم مبارک آپ کے تمام اسماء مبارکہ میں ''علم'' کی حیثیت سے مشہور ہے جو آپ کے جدِ محترم خواجہ عبدالمطلب کو بذریعہ الہام تلقین کیا گیا تھا تاکہ سارے آسمان و زمین والے ان کی مدح سرائی میں رطب اللسان رہیں چنانچہ خواجہ عبدالمطلب کی یہ معصوم خواہش اس طرح پوری ہوئی کہ پوری دنیا نے اس کا مشاہدہ کیا، اسی لئے خواجہ عبدالمطلب'' جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں تحریر فرمایا ہے'' اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

وشق لہ من اسمہ لیجلہ ☆ فذوالعرش محمود وھذا محمد

اللہ نے ان کا نام اپنے نام سے بنایا ہے تاکہ انہیں بزرگیاں عطاء فرمائے چنانچہ مالک عرش کا نام ''محمود'' ہے اور (میرا) یہ (پوتا) ''محمد'' ہے (ﷺ)۔

یاد رہے کہ یہ نام حضور ﷺ کے تمام ناموں میں سے زیادہ مشہور ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ نے آپ کی ذات اور صفات میں وہ محامد اور صفاتِ حمد جمع فرمادی ہیں جو کسی اور کو عطاء نہیں فرمائیں۔ چنانچہ میدان حشر میں آپ کے دست مبارک میں جو جھنڈا ہوگا، اس کا نام بھی ''لواء الحمد'' (تعریف کا جھنڈا) ہوگا۔ آپ کو جو مقام ملے گا، اس کا نام ''مقام محمود'' ہوگا۔ یعنی جہاں اولین و آخرین سب ہی آپ کی تعریف کریں گے۔ اسی طرح جب آپ ﷺ انسانیت کا حساب کتاب شروع کروانے کیلئے بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوں گے تو آپ کو عجیب وغریب 'کلمات حمد' الہام کئے جائیں گے جو آپ ﷺ سے پہلے کسی کی زبان سے ادا نہ ہوئے ہوں گے۔ نیز آپ ﷺ کی امت کا لقب ''حمادون'' ہوگا کہ وہ خوشی اور غمی ہر حال میں حمد وثناء رب جلیل میں مشغول رہتے ہیں۔

آپ ﷺ کا دوسرا اسم گرامی ''احمد'' تو اس اعتبار سے اور بھی اہم ہے کہ پورے عرب میں اس سے پہلے یہ نام کسی نے رکھا

ہی نہ تھا۔ جبکہ اسم محمد ﷺ پر بعض لوگوں نے اپنے بچوں کے نام اس لالچ میں رکھے تھے کہ شاید انہیں آخری نبی ہونے کا اعزاز حاصل ہو جائے لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ رسالت ایک عظیم ترین منصب ہے جس کے عالی مقام حاملین اللہ کے علم میں پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں۔ ایسے افراد کی تعداد پندرہ تک بیان کی گئی ہے۔

فائدہ: کلمات درود کی روایات میں سے بعض میں ''وارحم محمدا وآل محمد کما رحمت علی ابراهیم'' کا اضافہ بھی منقول ہے اور بعض لوگ اسے پڑھتے بھی ہیں۔ جبکہ بعض روایات میں ''ترحمت'' کا لفظ بھی آیا ہے لیکن یہ اضافہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اہل عرب میں ''رحمت علیہ'' کا لفظ مروج و مستعمل ہی نہیں ہے یقیناً یہ بعد کی پیداوار ہے۔ اور ''ترحم'' میں تکلف اور تصنع کا معنی پایا جاتا ہے (کیونکہ یہ باب تفعل سے مصدر ہے) اور اللہ تعالیٰ پر تکلف کا اطلاق ناپسندیدہ ہے۔

بلکہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ یہ اضافہ بدعت ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں، ہمارے بعض ائمہ احناف سے بھی یہی منقول ہے اور ابن دحیہ نے تو ان الفاظ کو پڑھنا ناجائز ہی قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا تذکار مبارک کرنے والے کو درود شریف پڑھنا چاہیے۔ دعاءِ ترحم کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ [النور: ٦٣]

''پیغمبر اسلام ﷺ کو آپس میں اس طرح مت پکارا کرو جیسے ایک دوسرے کو پکارتے ہو''۔

تفصیل اس اجمال کی بعض علماء نے یہ بیان فرمائی ہے کہ رحمت کا تعلق اکثر ان افعال سے ہوتا ہے جو قابل ملامت ہوتے ہیں (چنانچہ کسی کو گناہ کرتے ہوئے دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ اللہ اس کے حال پر رحم کرے) جبکہ ہمیں نبی ﷺ کی تعظیم کا حکم ہے اس لئے ان الفاظ سے احتراز ہی بہتر ہے۔

بعض متاخرین حفاظ حدیث نے کلمات درود سے متعلق تمام متفرق روایات کو جمع کر کے اس اضافہ کو صحیح قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ان کلمات ترحم کا استعمال مطلقاً افضل ہے لیکن متاخرین شوافع وحنابلہ نے ان کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ چونکہ یہ سارے کلمات کسی ایک حدیث میں وارد نہیں ہوئے اس لئے بدل بدل کر درود شریف پڑھنا زیادہ بہتر ہے اور میرے نزدیک بھی یہی رائے زیادہ صحیح اور قابل قبول ہے۔

''قوله وازواجه وذريته'': لفظ ذریت کو ذال کے ضمہ کے ساتھ ضبط کیا گیا ہے تاہم حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق اسے ذال کے کسرہ کے ساتھ پڑھنا بھی صحیح ہے۔ اس صورت میں یہ ''ذرء'' بمعنی خلق سے ماخوذ ہوگا، یا یہ ''ذر'' بمعنی گردہ سے ماخوذ ہے یا یہ ''ذر'' بمعنی چھوٹی چیونٹی سے ماخوذ ہے۔ اس صورت میں وجہ تسمیہ یہ ہوگی کہ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک مرتبہ عالم ارواح میں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت مبارک سے چیونٹی کی شکل میں نکال کر پھیلایا تھا اس لئے اس پر ''ذریت'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظ ''ذریت'' کا اطلاق انسان کی نسل پر ہوتا ہے خواہ مذکر ہو یا مؤنث، اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظ ذریت کے عموم میں بیٹی کی اولاد داخل نہیں ہوتی۔ سوائے نبی ﷺ کی بنات طیبات کی اولاد کے۔ کہ نبی ﷺ کی طرف نسبت کی یہ خصوصیت ہے چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دیگر بنات طیبات کی اولاد لفظ ''ذریت''

کا مصداق ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے بعض کی نسل چلی اور بعض کی نسل منقطع ہوگئی۔

''قوله كما صليت على آل ابراهيم'': اس حدیث میں وارد شدہ کلمات درود پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالیئے جو یہ ہیں:۔

''اللهم صلى على محمد وازواجه وذريته كما صليت على آل ابراهيم''

اس میں ''كما صليت على آل ابراهيم'' کے الفاظ قابل غور ہیں۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ کو یہ اعتراض ہو کہ یہ کلمات درود گذشتہ کلمات کے موافق نہیں ہیں کہ اس میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر ہے؟ تو اس کا جواب قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ یہاں ''آل'' کا لفظ مقحم یعنی زائد ہے جیسے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی تعریف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔

''انه اعطى مزمارا من مزامير آل داؤد''

''اسے آل داؤد کے مزامیر میں سے ایک مزمار عطاء کیا گیا ہے''۔

یہاں بھی ''آل'' کا لفظ زائد ہے کیونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی کوئی اولاد حسن صوت میں مشہور نہیں ہوئی۔ لیکن قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جواب محل نظر ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل تو مشہور ہے۔ اس لئے اس کی مثال میں یہ آیت قرآنی پیش کرنا زیادہ بہتر ہے۔

﴿ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هَارُوْنَ ﴾ [البقرة:۲۴۸]

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اصل میں یہاں گذشتہ حدیث میں کیے گئے سوال سے متعلق کی گئی توجیہات میں سے اس توجیہہ کی تائید کی گئی ہے جس کے مطابق صحابہ کرامؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل بیت پر درود پڑھنے کا طریقہ پوچھا تھا اور ''كيف نصلى عليك'' کا معنی ''كيف نصلى على اهلك'' ہے اس صورت میں ''آل محمد'' سے پہلے ذکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم بطور تمہید کے ہوگا۔ کیونکہ انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی نسبت سے عظمت و بزرگی حاصل ہوگی۔

لیکن اس توجیہہ پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ پھر تو آل مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود مقصود بالذات بن جائے گا۔ حالانکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ درود وسلام کا اصل مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کی آل اولاد آپ کے تابع ہے نہ کہ مقصود بالذات، اسی وجہ سے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ صحیح مسلک کے مطابق کسی بھی غیر نبی پر ابتداءً درود پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے کیونکہ یہ اہل بدعت کا شعار ہے اور ہمیں اس سے منع کیا گیا ہے۔

شیخ ابومحمد الجوینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سلام کا حکم بھی درود شریف کی طرح ہے یعنی انبیاء وملائکہ کے علاوہ دوسرے افراد پر صرف تبعاً ہی جائز ہے، اصالۃً اور مقصود بنا کر جائز نہیں۔

درود پڑھنے کی فضیلت

۹۲۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرًا۔ (رواه مسلم)

أخرجه في صحيحه ۳۰۶/۱ حديث رقم (۷۰۔۴۰۸)۔ وأبوداؤد في السنن۱۸۴/۲ حديث رقم ۱۵۱۴۔ والترمذی ۳۵۵/۱ حديث رقم ۴۸۵۔ والنسائي ۵۰/۳ حديث رقم ۱۲۹۶۔ والدارمی ۴۰۸/۲ حديث رقم۲۷۷۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل کرے گا۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں ایک مرتبہ درود شریف پڑھنے پر دس رحمتوں کے جس نزول کا تذکرہ آیا ہے، وہ "من جاء بالحسنة فله عشر امثالها" والے قاعدے کے مطابق کم از کم ثواب ہے اور علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے جس صلوٰۃ کا تذکرہ اس حدیث میں بندۂ مومن سے متعلق آیا ہے اسے ظاہر پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے جیسے درود پڑھنے والے کے اعزاز میں فرشتوں کو سنایا جاتا ہو جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں آتا ہے کہ اگر بندہ مجھے کسی محفل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس سے بہتر محفل میں یاد کرتا ہوں۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سماع ملائکہ کے ساتھ اسے مقید کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ اسی حدیث قدسی میں یہ بھی تو مراد ہے کہ اگر بندہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں۔

الفصل الثانی:

ایک مرتبہ درود پڑھنے کے تین فائدے

۹۲۲: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ صَلَاةً وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرَ صَلَوَاتٍ وَحُطَّتْ عَنْهُ عَشْرُ خَطِيْئَاتٍ وَرُفِعَتْ لَهُ عَشْرُ دَرَجَاتٍ۔ (رواه النسائی)

أخرجه النسائي في السنن ۳/ ۵۰ حديث رقم ۱۲۹۷۔ وأحمد في المسند ۳/ ۱۰۲۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل کرے گا۔ اور اس کے دس گناہ بخش دے گا اور اس کے دس درجات بلند ہوں گے۔ (نسائی)

تشریح: ابن ملک فرماتے ہیں کہ "صلوٰۃ اللہ" سے مراد رحمت اللہ ہے جو درود پڑھنے والے بندۂ مومن پر نازل ہوتی ہے اور علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ العبد سے مراد بندہ کا جناب رسول اللہ ﷺ کیلئے عظمت و بزرگی کا طلب کرنا ہے اور صلوٰۃ اللہ کے دو معنی ہوں گے۔

① لفظ صلوٰۃ کا معنی "بخشش" ہوگا، اس صورت میں چونکہ پہلے بھی بخشش کا ذکر آ چکا ہے، اس لئے یہ مشاکلۂ لفظی کے قبیل سے ہوگا۔

② لفظ صلوٰۃ "تعظیم" کے معنی میں ہو۔ اس صورت میں لفظاً و معنی دونوں طرح موافقت ہو جائے گی اور یہی وجہ مراد لینا زیادہ بہتر ہے تاکہ بخشش کا مفہوم مکرر نہ ہو جائے۔

نیز اس حدیث میں "دس" کا جو عدد آیا ہے، اس سے عدد مخصوص مراد نہیں بلکہ کثرت و زیادت مراد ہے۔

زیادہ درود پڑھنے والا قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کے قریب ہوگا

۹۲۳: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَوْلَی النَّاسِ بِیْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَکْثَرُھُمْ عَلَیَّ صَلَاۃً۔ (رواہ الترمذی)

أخرجہ الترمذی فی السنن ۱/۳۵٤ حدیث رقم ٤۸٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن لوگوں میں سے میرے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جو مجھ پر درود زیادہ پڑھتے ہیں۔

تشریح: حضور نبی مکرم، سرور دو عالم ﷺ پر کثرت سے درود شریف پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے دل میں نبی ﷺ کی تعظیم بہت زیادہ ہے اور تعظیم مقتضی ہے نبی ﷺ کی پیروی کی، اور نبی ﷺ کی پیروی دلیل محبت ہے جس پر پروردگار عالم کی محبت مرتب ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ، ،

﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ﴾ [آل عمران: ۳۱]

”اے حبیب ﷺ! آپ فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت بھی فرمائے گا اور تمہارے گناہوں کو بھی معاف فرمائے گا“۔

اسی وجہ سے بکثرت درود شریف پڑھنے والے کو یوم قیامت نبی ﷺ کا قرب حاصل ہوگا۔ اس حدیث کے ضمن میں علامہ ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ اس صحیح حدیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ قیامت کے دن نبیؐ کے سب سے زیادہ قریب محدثین کرام ہوں گے کیونکہ اس امت میں ان سے زیادہ درود شریف پڑھنے والی کوئی جماعت اور گروہ نہیں ہے اور بعض حضرات نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ محدثین قولاً وفعلاً دونوں طرح نبی ﷺ پر درود شریف پڑھتے ہیں اس لئے انہیں یہ اعزاز حاصل ہوگا۔

فرشتے درود پہنچاتے ہیں

۹۲۴: وَعَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ لِلّٰہِ مَلَائِکَۃً سَیَّاحِیْنَ فِی الْاَرْضِ یُبَلِّغُوْنِیْ مِنْ اُمَّتِی السَّلَامَ۔ (رواہ النسائی والدارمی)

أخرجہ النسائی فی السنن ۳/٤۳ حدیث رقم ۱۲۸۲۔ والدارمی فی السنن ۲/٤۰۹ حدیث رقم ۲۷۷٤۔ وأحمد فی المسند ۱/٤۵۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے فرشتے زمین پر سیاحت کرتے ہیں اور میری امت کا سلام مجھ تک پہنچاتے ہیں۔ (نسائی، داری)

تشریح: امت مرحومہ میں سے جب بھی کوئی شخص نبی ﷺ پر درود وسلام کا تحفہ پیش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ فرشتے اسے نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں خواہ درود وسلام کے یہ کلمات تھوڑے ہوں یا زیادہ۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ درود وسلام پڑھنے والے جناب رسول اللہ ﷺ کے روضۂ مقدسہ ومطہرہ سے دور ہو اور اگر درود وسلام پیش کرنے والا روضۂ اقدس واطہر کے قریب ~~ہو تو نبی~~ ﷺ اسے خود براہ راست سماعت فرماتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اس کا جواب

بھی ارشاد فرماتے ہیں۔

اس حدیث میں جناب رسول اللہ ﷺ کی دائمی حیات کی طرف بھی بڑے لطیف انداز میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہ کہ نبی ﷺ کو اس چیز سے خوشی ہوتی ہے کہ آپ کے امتی آپ ﷺ پر درود وسلام کا نذرانۂ عقیدت پیش کریں۔ نیز یہ کہ ہر امتی کا درود وسلام قبول ہو جاتا ہے کیونکہ جب ملائکہ نے اسے قبول کر کے خدمت اقدس میں پیش کر دیا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ انہوں نے اسے قبول کر لیا ہے کیونکہ وہ مزاج شناس نبوت ہوتے ہیں۔

اس حدیث کو امام نسائی اور داری نے اپنی اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے جبکہ میرک فرماتے ہیں کہ ابن حبان اور حاکم نے بھی اس روایت کی تخریج فرمائی ہے لیکن ان دونوں کی روایت میں ''فی الارض'' کی قید نہیں ہے۔ اسی طرح شیخ جزری رحمہ اللہ کے کلام سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جبکہ حضرت مصنف علیہ الرحمہ کا اسلوب اسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایات میں شمار کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق اس روایت کو امام احمد، ابونعیم اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے اور ابن عساکر نے تو اسے متعدد اسناد سے روایت کیا ہے جن میں سے بعض اسانید درجۂ حسن تک پہنچی ہوئی ہیں۔ حافظ صاحب رحمہ اللہ کے بقول ہی اس سلسلے کی مندرجہ ذیل روایت بھی سند حسن سے مروی ہے تاہم اس میں ایک راوی مجہول ہے اور وہ روایت یہ ہے:

''حیثما کنتم فصلوا علی فان صلاتکم تبلغنی''

''تم جہاں کہیں بھی ہوا کرو، مجھ پر درود شریف پڑھا کرو کیونکہ اس صورت میں (جبکہ تم مجھ سے دور ہو) تمہارا درود مجھ تک پہنچایا جاتا ہے''۔

سلام کا جواب

۹۲۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ اَحَدٍ یُسَلِّمُ عَلَیَّ اِلَّارَدَّ اللّٰهُ عَلَیَّ رُوْحِیْ حَتّٰی اَرُدَّ عَلَیْهِ السَّلَامَ۔ (رواہ ابوداود والبیهقی فی الدعوات الکبیر)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۲/۵۳۴ حدیث رقم ۲۰۴۱۔ وأحمد فی المسند ۲/۵۲۷۔ فی المخطوطة "سحاب"۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی آدمی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح کو لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ (ابوداؤد) امام بیہقیؒ نے اس کو دعوات کبیر میں بیان کیا ہے۔

تشریح: ''اس حدیث کی وضاحت میں قاضی عیاض رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ شاید اس حدیث کی مراد یہ ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی روحِ مقدسہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ رہتی ہے۔ جب کسی امتی کا سلام آپ ﷺ تک پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کی روح مبارکہ کو اس سلام کے جواب کی طرف متوجہ فرما دیتے ہیں۔ جیسا کہ دنیا میں بھی جناب رسول اللہ ﷺ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات میں کھوئے رہتے تھے اور جب کوئی خدمت اقدس میں حاضر ہوتا تو اسے بھی اللہ کی طرف سے ہونے

والے فیضان کا حصہ عطاء فرماتے۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ ردروح سے مراد یہ نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ جسدِ اطہر میں نہیں ہے۔ ردّ سلام کیلئے اسے لوٹایا جاتا ہے بلکہ یہاں اسے کنایۃً استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مراد اللہ کی طرف سے اس بات کا اعلام والہام ہے کہ آپ کے فلاں امتی نے آپ پر درود وسلام کا نذرانہ پیش کیا ہے۔

فائدہ: اس مسئلے کی مکمل وضاحت کیلئے علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے جو قابل دید ہے۔

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں اور امام بیہقی نے اپنی کتاب الدعوات الکبیر میں نقل کیا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی کے بقول اس حدیث کی تخریج طبرانی اور ابن عساکر نے بھی کی ہے۔ اور یہ حدیث سند کے اعتبار سے حسن کے مرتبے میں ہے بلکہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اپنی کتاب الاذکار میں اس کی تصحیح فرمائی ہے۔

اسی سلسلے کی ایک دوسری روایت میں سلام اور جواب سلام کے اس حکم کو روضۂ مقدسہ کے قریب ہونے کے ساتھ مقید کیا گیا ہے لیکن بعض حفاظ حدیث کا کہنا کہ یہ اضافہ ہماری معلومات کے مطابق کسی سند سے ثابت نہیں ہے۔

گھروں کو قبرستان نہ بناؤ

۹۲۶: وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قُبُوْرًا وَلَا تَجْعَلُوْا قَبْرِيْ عِيْدًا وَصَلُّوْا عَلَيَّ فَاِنَّ صَلَاتَكُمْ تَبْلُغُنِيْ حَيْثُ كُنْتُمْ۔ (رواه النسائى)

أخرجه أبوداؤد فى السنن ٢/ ٥٣٤ حديث رقم ٢٠٤٢ـ وأحمد فى المسند ٢/ ٣٦٧ـ

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ اور میری قبر کو عید نہ بناؤ۔ تم مجھ پر درود پڑھا کرو کیونکہ تم جہاں کہیں بھی ہو تمہارا درود مجھ تک پہنچتا ہے۔ (نسائی)

تشریح: ''اس حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھروں کو قبر بنانے سے جو ممانعت فرمائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے گھروں کو قبروں کی طرح مت بنانا جو کہ اللہ کے ذکر اور اس کی طاعت سے خالی ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی برکتوں کو حاصل کرنے کیلئے نفلی عبادات کا کچھ حصہ گھروں میں کیا کرو۔ لیکن ایک معنی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مردوں کو گھروں میں دفن نہ کرو۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ اس دوسرے معنی پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر مردوں کو گھروں میں دفن کرنے کی ممانعت ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے گھر میں دفن نہ کیا جاتا لیکن یہ رائے اس لئے ناقابل اعتبار ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے:۔

''ما قبض نبی الا ودفن حیث یقبض''

''ہر نبی کو وہیں دفن کیا جاتا ہے جہاں ان کی روح قبض کی جاتی ہے''۔

اس حدیث کا ایک تیسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قبروں کو اپنی رہائش گاہ نہ بناؤ کیونکہ اگر تم نے وہاں رہنا شروع کر دیا تو

وہ رقت اور دلوں کی نرمی تم سے رخصت ہو جائے گی جو قبروں کو دیکھ کر ہونی چاہیئے۔ اس لئے قبروں کی زیارت کر کے اپنے گھروں کو واپس لوٹ آیا کرو، یا کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ قبرستان میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے تم پر ہر وقت ایک جذب کی کیفیت رہنے لگے اور اس کی وجہ سے نظام کائنات معطل ہو کر رہ جائے اسی وجہ سے بعض بزرگوں کا یہ قول ہے:۔

''لو لا الحمقی لخربت الدینا''

''اگر احمق نہ ہوتے تو دنیا ویران ہو جاتی''۔

اور اسی وجہ سے عورتوں کو بکثرت قبرستان جانے سے منع کیا گیا ہے۔

اس حدیث کا ایک چوتھا معنی بعض حضرات نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ کچھ نماز اپنے گھروں میں بھی پڑھا کرو اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ کیونکہ انسان جب مر کر اپنی قبر میں پہنچتا ہے تو وہاں نماز نہیں پڑھ سکتا۔

اس حدیث کا پانچواں مطلب یہ بیان کیا گیا ہے اپنے گھروں کو صرف سونے کی حد تک استعمال میں نہ لاؤ کہ وہاں نماز بالکل ہی نہ پڑھو کیونکہ نیند بھی موت ہی کی طرح ہے اور مرنے والا نماز نہیں پڑھ سکتا۔

حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص اپنے گھر میں نماز نہیں پڑھتا وہ اپنے آپ کو مرے ہوئے شخص کی طرح بنا لیتا ہے اور اپنے گھر کو قبر کی طرح بنا لیتا ہے اس احتمال کی تائید میں اس روایت کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے جس کی تخریج امام مسلم نے اپنی صحیح میں کی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں۔

''مثل البیت الذی یذکر اللّٰہ فیه و البیت الذی لا یذکر اللّٰہ فیه کمثل الحی و المیت''

''اس گھر کی مثال جس میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہو اور اس گھر کی مثال جس میں اللہ کا ذکر نہ کیا جاتا ہو زندہ اور مردہ کی طرح ہے''۔

اب حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ تم لوگ مردوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں یعنی قبروں میں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ یا یہ کہ گھروں میں نماز پڑھنا نہ چھوڑو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم مُردوں کی طرح اور تمہارے گھر قبروں کی طرح ہو جائیں اور اس معنی کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

''اجعلوا من صلاتکم فی بیوتکم و لا تتخذوھا قبورا''

''اپنی نماز کا کچھ حصہ اپنے گھروں کیلئے بھی رکھا کرو، انہیں قبریں مت بناؤ''۔

ایک بزرگ نے اس حدیث کا مطلب ایک لطیف نکتہ کی صورت میں یوں بیان فرمایا ہے کہ اپنے گھروں کو قبروں کی طرح مت بناؤ کہ جہاں آنے والوں کی کوئی خاطر تواضع نہیں کی جاتی (بلکہ آنے والے مہمانوں کا اعزاز و اکرام کیا کرو)۔

میری قبر کو عید گاہ نہ بناؤ:

اس حدیث کے دوسرے جملے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قبر مبارک کو عید یا مظہر عید بنانے سے منع فرمایا ہے کیونکہ عید کا دن خوشی کا موقع ہوتا ہے اور اس دن انسان مختلف قسم کی تفریحات سے لطف اندوز ہوتا ہے جبکہ زیارت قبر کا موقع خوشی کا نہیں ہوتا۔ اور بعض حضرات نے اس جملے کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ اس حدیث میں روضہ مقدسہ کی بکثرت زیارت کرنے کی

ترغیب دی گئی ہے اور عید بنانے کی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ وہ تو سال میں صرف دو مرتبہ آتی ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ اس جملے کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو روضۂ مقدسہ پر اس طرح اجتماع کرنے کی ممانعت فرمائی نے جس طرح عید کے دن سیر وتفریح کیلئے اجتماع کیا جاتا ہے اور لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ چونکہ یہود ونصاری اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کی قبور مقدسہ کے ساتھ ایسا کیا کرتے تھے اس لئے وہ غفلت اور قلبی سختی میں مبتلا ہو گئے۔ نیز صنم پرستوں اور بتوں کے پجاریوں کی بھی یہی عادت اور خصلت رہی ہے کہ وہ ہمیشہ سے اپنے مُردوں کی اتنی تعظیم کرتے آئے ہیں کہ انہیں معبود بنا کر پوجنا کچھ برا محسوس نہیں ہوتا۔ یہی وہ چیز ہے جس کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں اشارہ فرمایا ہے۔

''اللهم لا تجعل قبری وثنا يعبد''

''اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا دیجئے گا کہ اس کی پوجا کی جانے لگے''۔

گویا اس ممانعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ روضۂ مقدسہ کے بارے میں حد سے تجاوز کرنے کی کراہت واضح ہو جائے۔ اسی وجہ سے ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اس قوم پر اللہ کا بہت شدید غضب نازل ہوتا ہے جو اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کی قبور مبارکہ کی مسجد بنا لیتی ہیں۔

بعض حضرات نے عید کو ''اعتیاد'' سے اسم قرار دیا ہے اور حدیث کے اس جملے کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ میری قبر پر اس کثرت سے مت آؤ کہ میرا ادب واحترام تمہارے دلوں سے رخصت ہو جائے (کیونکہ کسی چیز کی کثرت اس کے ادب واحترام میں کمی کا باعث بہر حال بنتی ہی ہے)۔ اور کہیں یہ خیال کسی کے ذہن میں پیدا نہ ہو جائے کہ جو لوگ میری قبر پر حاضر ہو کر درود وسلام پیش کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ دور سے بھی ان کا درود وسلام مجھ تک نہیں پہنچایا جاتا، چنانچہ آگے فرمایا:۔

''فصلوا علی، فان صلاتکم تبلغنی حيث كنتم''

''مجھ پر درود پڑھتے رہا کرو کیونکہ تم جہاں کہیں بھی ہو تمہارا درود میری خدمت میں پیش کیا جاتا ہے''۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اصل میں نفوس قدسیہ جب جسمانی تعلقات سے آزاد ہو جاتے ہیں تو انہیں عروج حاصل ہوتا ہے کہ وہ ملأ اعلی سے جا کر مل جاتے ہیں اور ان کیلئے کوئی رکاوٹ اور حجاب و پردہ باقی نہیں رہتا۔ اور انہیں ہر چیز اپنی آنکھوں سے دکھائی دیتی محسوس ہوتی ہے (جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو یہ چیز بطریق اولیٰ حاصل ہو گی کیونکہ آپ تو نفوس قدسیہ کے سردار ہیں)۔ یا یہ کہ فرشتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دیتے ہیں، اور اس میں بھی ایک راز ہے جس پر صرف وہی مطلع ہو سکتا ہے جس کیلئے اللہ کی طرف سے آسانی کی گئی ہو۔

اس حدیث کی تخریج امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے اور میرک کے بقول ''الاذکار'' میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوداؤد نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق اس حدیث کو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں اور امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں نقل فرمایا ہے اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الاذکار'' میں اس کی تصحیح بھی فرمائی ہے۔

درود نہ پڑھنے پر وعید

۹۲۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ ذُكِرْتُ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ وَرَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ دَخَلَ عَلَيْهِ رَمَضَانُ ثُمَّ انْسَلَخَ قَبْلَ اَنْ يُّغْفَرَلَهٗ وَرَغِمَ اَنْفُ رَجُلٍ اَدْرَكَ عِنْدَهٗ اَبَوَاهُ الْكِبَرَ اَوْ اَحَدُهُمَا فَلَمْ يُدْخِلَاهُ الْجَنَّةَ۔ (رواه الترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خاک آلود ہو اس شخص کی ناک کہ جس کے سامنے میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود نہ بھیجا۔ خاک آلود ہو اس آدمی کی ناک کہ اس پر رمضان المبارک آیا اور اس کی بخشش سے پہلے گزر گیا۔ خاک آلود ہو اس آدمی کی ناک کہ اس کے والدین یا ان میں سے کسی ایک نے اس کے سامنے بڑھاپا پایا اور انہوں نے اس کو جنت میں داخل نہیں کیا۔ (ترمذی)

تشریح: اس حدیث میں اس شخص کیلئے سخت تہدیدی کلمات استعمال کئے گئے ہیں جس کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکار مبارک ہو اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف نہ پڑھے، علماء کرام فرماتے ہیں کہ یا تو یہ کلمات خبر پر محمول ہیں یا بددعاء پر، اور مطلب یہ ہوگا کہ ان تعظیمی کلمات کے ترک کرنے پر جزاءً اسے ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جبکہ بعض علماء کرام کی رائے کے مطابق اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس شخص کو یہ چار کلمات اپنے منہ سے ادا کرنے پر قدرت تھی اور وہ اس کے ذریعے اپنے لئے اللہ کی دس رحمتیں، دس درجات کی بلندی اور دس گناہوں کی معافی کا پروانہ حاصل کر سکتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے ایسا نہ کیا تو وہ خائب وخاسر ہوا۔

''قولہٗ ورغم انف رجل دخل علیہ رمضان ثم انسلخ'':

حدیث کے اس جملے میں لفظ ''ثم'' لانے کی وجہ پر بحث کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ اصل میں آغازِ رمضان اور اختتام رمضان کے درمیان ایک لمبا عرصہ اور طویل مدت ہوتی ہے جسے ظاہر کرنے کیلئے ''ثم'' کا لفظ لایا گیا جو کہ تراخی پر دلالت کرتا ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک سنتے ہی درود وسلام کا مطالبہ ہے کیونکہ وہاں کوئی مدت حائل نہیں۔ اسی طرح والدین کے ساتھ حسن سلوک بھی ان کی ضرورت واحتیاج کے فوراً بعد ہی مؤکد ومطلوب ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ اس جملے کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کی مثال یوں سمجھو جیسے تم اپنے کسی دوست کو ملامت کرتے ہوئے کہتے ہو کہ تم نے بہت برا کام کیا، تمہیں اتنی فرصت بھی ملی اور تم پھر بھی اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے، اسی طرح جس شخص کو رمضان المبارک کی دولت ملی لیکن پھر بھی وہ اپنے گناہوں کو معاف نہ کروا سکا۔

یعنی رمضان المبارک کا مہینہ ملنے کے باوجود اس میں توبہ نہ کر سکا۔ یا اللہ تعالیٰ کی زیادہ سے زیادہ عبادت کر کے اس مہینے کی صحیح تعظیم نہ کر سکا کہ اس کے گناہ معاف ہو جاتے۔ یا اس مقدس مہینے میں بھی وہ اعمال سیئہ مثلاً سود، رشوت وغیرہ کا مرتکب ہوتا رہا جس کی بناء پر اس کے اعمال صالحہ کا اثر بھی باطل ہو گیا اور اس کی معافی نہ ہو سکی۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ الفاظِ حدیث پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بظاہر یہاں ''ولم یغفر لہ'' کا لفظ ہونا زیادہ مناسب

تھا، لیکن "قبل ان یغفر لہ" فرما کر اس بات کی طرف تنبیہ فرمادی کہ مغفرت اور بخشش میں تاخیر کا ہونا اس کی اپنی کوتاہی کی وجہ سے ہے۔ حق تو یہ تھا کہ رمضان المبارک ختم ہونے سے پہلے پہلے اس کے گناہوں کی بھی معافی ہو چکی ہوتی لیکن اس کی کوتاہی نے ایسا نہ ہونے دیا۔

اس حدیث کی تخریج امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے اور سنداً اسے حسن غریب قرار دیا ہے۔ اسی طرح ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور بزار نے اپنی مسند میں بھی اس کی تخریج کی ہے۔ جیسا کہ میرک نے ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی متعدد اسناد ہیں جن میں سے بعض صحیح، بعض حسن اور بعض ضعیف ہیں۔

درود کی فضیلت

۹۲۸: وَعَنْ اَبِیْ طَلْحَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَاءَ ذَاتَ یَوْمٍ وَالْبِشْرُ فِیْ وَجْھِہٖ فَقَالَ اِنَّہٗ جَاءَ نِیْ جِبْرِیْلُ فَقَالَ اِنَّ رَبَّکَ یَقُوْلُ اَمَا یُرْضِیْکَ یَامُحَمَّدُ اَنْ لَّا یُصَلِّیَ عَلَیْکَ اَحَدٌ مِنْ اُمَّتِکَ اِلَّا صَلَّیْتُ عَشْرًا وَلَا یُسَلِّمُ عَلَیْکَ اَحَدٌ مِّنْ اُمَّتِکَ اِلَّا سَلَّمْتُ عَلَیْہِ عَشْرًا۔ (رواہ النسائی والدارمی)

أخرجہ النسائی فی السنن ۲/ ۵۰ حدیث رقم ۱۲۹۵۔ والدارمی فی السنن ۲/ ۴۰۸ حدیث رقم ۲۷۷۳۔ وأحمد فی المسند ۴/ ۳۰۔

ترجمہ: حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ صحابہ کرام کے پاس تشریف لائے اور اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر بشاشت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے تھے وہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ اس بات سے راضی نہیں ہیں کہ آپ کی امت میں سے جو کوئی آپ پر درود بھیجے گا میں اس پر دس رحمتیں نازل کروں گا۔ اور جو کوئی آپ کی امت میں سے آپ پر سلام بھیجے گا میں اس پر دس مرتبہ سلام بھیجوں گا۔ (نسائی۔ دارمی)

راویٔ حدیث:

ابوطلحہ۔ یہ ابوطلحہ ہیں ان کا نام "زید بن سہل" ہے۔ انصاری ہیں۔ یہ اپنی کنیت کے ساتھ مشہور ہیں۔ یہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ کے شوہر ہیں۔ یہ مشہور تیر اندازوں میں سے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا کہ "ابوطلحہ" کی آواز لشکر میں ایک جماعت کی آواز سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ ۳۱ھ میں وفات پائی جب کہ ان کی عمر ستتر (۷۷) سال کی تھی۔ اہل بصرہ کا خیال ہے کہ وہ سمندر میں سفر کر رہے تھے کہ انتقال ہو گیا اور کسی جزیرہ میں سات (۷) دن کے بعد دفن کیے گئے۔ بیعت عقبہ میں ستر (۷۰) صحابہ کے ساتھ یہ بھی شریک ہوئے تھے پھر بدر اور اس کے بعد غزوات میں بھی شریک ہوئے۔ صحابہ کی ایک جماعت ان سے روایت کرتی ہے۔

تشریح: اس حدیث میں جس بشارت کا تذکرہ آیا ہے، درحقیقت اس کا تعلق امت مرحومہ سے ہے، یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی تائید اسی حدیث کی ان بعض اسناد سے بھی ہوتی ہے جن

میں اس حدیث کا مضمون اس طرح وارد ہوا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اپنی امت کو اس بات کی خوشخبری سنا دیجئے کہ جو شخص آپ پر ایک مرتبہ درود شریف پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اس کیلئے دس نیکیاں لکھ دیں گے۔ دس گناہوں کو معاف فرما دیں گے، دس درجات کو بلند فرما دیں گے اور پلٹ کر اسے بھی ان ہی جملوں سے جواب عطاء فرمائیں گے۔ جن سے اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا ہے اور ایک روایت کے مطابق درود شریف پہنچانے کی خدمت پر مأمور فرشتہ درود شریف پڑھنے والے سے کہتا ہے کہ اللہ تجھ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

اس حدیث کو امام نسائی اور دارمی کے ساتھ ساتھ میرک کے بقول ابن حبان نے اپنی صحیح میں حاکم نے اپنی مستدرک میں اور ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں نقل کیا ہے اور امام احمد و حاکم نے اسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بھی نقل کیا ہے۔ لیکن اس کے آخر میں یہ اضافہ بھی ہے:۔ ''فسجدت اللّٰه شکرا''

''یہ بشارت سن کر شکریہ کے طور پر بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہو گیا''۔

حاکم نے اس اضافے کی تصحیح بھی کی ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس حدیث کی متعدد اسانید قرار دی ہیں۔

درود سے دین و دنیا کی بھلائی ہے

۹۲۹: وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اُکْثِرُ الصَّلَاۃَ عَلَیْكَ فَکَمْ اَجْعَلُ لَكَ مِنْ صَلَاتِیْ فَقَالَ مَا شِئْتَ قُلْتُ الرُّبُعَ قَالَ مَاشِئْتَ فَاِنْ زِدْتَّ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكَ قُلْتُ النِّصْفَ قَالَ مَا شِئْتَ فَاِنْ زِدْتَّ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكَ قُلْتُ فَالثُّلُثَیْنِ قَالَ مَا شِئْتَ فَاِنْ زِدْتَّ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكَ قُلْتُ اَجْعَلُ لَكَ صَلَاتِیْ کُلَّهَا قَالَ اِذًا تُکْفٰی هَمَّكَ وَیُکَفَّرُ لَكَ ذَنْبُكَ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٤٩ حدیث رقم ٢٤٥٧۔

ترجمہ: حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول میں آپ پر کثرت سے درود بھیجتا ہوں۔ میں کتنا وقت آپ پر درود بھیجنے کے لئے خاص کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس قدر کہ تمہارا دل چاہے میں نے عرض کیا۔ کیا چوتھائی وقت مقرر کر دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جتنا تمہارا دل چاہے۔ اگر زیادہ وقت مقرر کرو گے تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا کیا آدھا وقت مقرر کر دوں۔ فرمایا جتنا تمہارا دل چاہے۔ اگر زیادہ کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا پھر دو تہائی وقت مقرر کر دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جتنا تمہارا دل چاہے اگر زیادہ کرو گے تو تمہارے لئے بہتر ہے۔ پھر میں نے عرض کیا کیا میں تمام وقت ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کے لئے مقرر کر دیتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ تمہارے لئے کفایت کرے گا۔ اس سے تمہارے دین و دنیا کے مقاصد پورے ہوں گے۔ اور تمہارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ (ترمذی)

تشریح: اس حدیث میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے سوال کا منشا یہ ہے کہ جن اوقات میں میں اپنی ذات کیلئے دعاء مانگتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ اس کے بدلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کی تعداد بڑھا دوں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے

ہے؟رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ تم جتنی مقدار بڑھانا چاہو تمہیں اختیار ہے، انہوں نے عرض کیا کہ میں اپنے اوقاتِ دعاء کا ایک چوتھائی حصہ درودشریف کیلئے وقف کرلوں؟ فرمایا جیسے تم مناسب سمجھو،لیکن اگر تم اس میں اضافہ کرلو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔انہوں نے اضافہ کرتے کرتے بالآخر یہ عرض کیا کہ میں جتنا وقت دعاء کیلئے الگ کرتا ہوں ،اب میں اس سارے وقت میں آپ ﷺ پر صرف درودشریف ہی پڑھا کروں گا۔ یہ سن کر جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ اگر تم نے ایسا کرلیا تو تمہاری ساری پریشانیوں سے تمہاری کفایت کی جائے گی اور تمہارے گناہوں کو بخش دیا جائے گا۔

ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الفاظِ حدیث میں ''همك'' مصدر ہے اور مفعول کے معنی میں ہے: ''تكفي'' کیلئے مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔اس کا مفعول اوّل ''انت'' ضمیر مفعول ''مالم يسم'' فاعلہ ہے۔جیسا کہ سید جمال الدین نے ''الازهاء'' سے نقل کیا ہے۔

جبکہ سید اصیل الدین کی صحیح میں اس لفظ ''تكفي'' کو''یا'' کے ساتھ ''يكفي'' ضبط کیا گیا ہے۔اس صورت میں ''همك'' مرفوع ہوگا کیونکہ یہ بعض اوقات ایک مفعول کی طرف بھی متعدی ہوجاتا ہے۔

حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مطابق حضرت ابی بن کعبؓ کے بار بار سوال کرنے اور درود شریف کی مقدار بڑھانے کا مقصد یہ تھا کہ نبی ﷺ ان کیلئے کوئی حد متعین کردیں تاکہ وہ اس پر عمل پیرا ہوسکیں۔لیکن نبی ﷺ نے ان کیلئے کوئی حد اور مقدار مقرر کرنا مناسب خیال نہ فرمایا تاکہ ایک تو فضیلت اور فریضہ میں التباس پیدا نہ ہوجائے۔اور دوسرے یہ کہ اس پر بھی اضافہ ممکن رہے اور اس کا دروازہ بند نہ ہوجائے۔یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ اس اضافے کو ہمیشہ ان ہی کی رائے پر موقوف فرماتے رہے تاکہ وہ رغبت اور شوق سے اس کی مقدار میں اضافہ کرتے رہیں تا آنکہ انہوں نے خود ہی یہ عرض کردیا کہ اب میں اپنے لئے دعاء کرنے کی بجائے ہمہ وقت آپ ﷺ پر ہی درودشریف پڑھتا رہوں گا۔

اس موقع پر نبی ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ پھر تمہارے تمام دینی و دنیوی اہم کاموں میں تمہاری کفایت کی جائے گی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی ﷺ پر درودشریف پڑھنے میں ایک تو ''ذکرِ الٰہی'' ہے۔پھر ''تعظیم مصطفی ﷺ'' ہے۔اس کے بعد اپنے ذاتی مفادات و مقاصد کو ترک کرکے حقوق مصطفی ﷺ کی ادائیگی میں مشغول ہونا ہے اور اپنے لئے دعاء کرنے پر نبی ﷺ کیلئے دعاء کرنے کو ترجیح دینا ہے،اس لئے اللہ کی طرف سے کفایت کا ہونا ایک واضح بات ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تخریج کرتے ہوئے اسے ''حسن'' قرار دیا ہے۔امام احمد اور حاکم نے بھی اسے نقل کیا ہے اور میرکؒ کے بقول حاکم نے اس کی تصحیح بھی کی ہے اور حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق یہ روایت ابن حمید نے اپنی مسند میں،اور احمد بن منیع اور رویانی نے بھی نقل کی ہے۔

درود کے بعد دعا قبول ہوتی ہے

۹۳۰:وَعَنْ فُضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ قَالَ بَيْنَمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاعِدٌ اِذْ دَخَلَ رَجُلٌ فَصَلّٰى فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَجَّلْتَ اَيُّهَا الْمُصَلِّيْ اِذَا

صَلَّيْتَ فَقَعَدْتَّ فَاحْمِدِ اللّٰهَ بِمَا هُوَ اَهْلُهٗ وَصَلِّ عَلَيَّ ثُمَّ ادْعُهٗ قَالَ ثُمَّ صَلّٰى رَجُلٌ اٰخَرُبَعْدَ ذٰلِكَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَصَلّٰى عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّهَا الْمُصَلِّيْ اُدْعُ تُجَبْ۔ (رواه الترمذی وروی ابوداود والنسائی نحوه)

أخرجه الترمذي في السنن ٥/٤٨٢ ٣٤٧٦۔وأخرجه النسائي في السنن ٣/٤٤ حديث رقم ١٢٨٤۔وأحمد في المسند ٦/١٨۔

ترجمہ: حضرت فضالہ بن عبیدؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے کہ اچانک ایک آدمی آیا اس نے نماز پڑھی پھر یہ دعا مانگی: اللّٰهم اغفرلی وارحمنی ۔اے اللہ مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم کر" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے جلدی کی ہے اے نماز پڑھنے والے جب تم نماز پڑھو تو نماز کے بعد دعا کے لئے بیٹھو اور اللہ تعالیٰ کی تعریف کرو جس تعریف کے وہ لائق ہے۔ پھر مجھ پر درود پڑھو پھر جو چاہو اللہ سے دعا مانگو۔ دعا قبول ہوگی۔ راوی کہتے ہیں کہ کے بعد ایک اور آدمی نے نماز پڑھی اور اس (نماز کے بعد) اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور نبی ﷺ پر درود بھیجا تو نبیؐ نے فرمایا اے نماز پڑھنے والے دعا کر قبول ہوگی۔ (ترمذی) امام ابوداؤدؒ اور امام نسائیؒ نے اسی جیسی روایت نقل کی ہے۔

تشریح: اس حدیث میں حضور ﷺ نے نووارد کیلئے "عجلت" کا لفظ اس لئے استعمال فرمایا کہ اس نے دعاء کی اس ترتیب کو ترک کر دیا جو کہ نبی ﷺ کی سنت ہے۔ اور حمد باری تعالیٰ اور درود شریف پڑھنے سے پہلے ہی "جو کہ انتہائی اہم وسیلہ ہے، قبولیتِ دعا کا" اپنی حاجت پیش کر دی۔

امام زاہدی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں "مسارعت اور عجلت" کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "مسارعت" کا اطلاق عام طور پر خیر کے کاموں میں ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار شر کے کاموں میں بھی اسے استعمال کر لیا جاتا ہے اور "عجلت" کا اطلاق ہمیشہ شر کے کاموں پر ہوتا ہے اور بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ "مسارعت" کا اطلاق اس تیزی اور جلدی پر ہوتا ہے جو وقت میں رہ کر کی جائے اور "عجلت" کا اطلاق اس جلدی پر ہوتا ہے جو وقت سے پہلے یا وقت کے بعد کی جائے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ "سائل" کو "وسائل" اختیار کر کے مسئول منہ کا قرب حاصل کرنا چاہیے۔ اور اپنی حاجت پیش کرنے سے پہلے کسی سفارش کنندہ کا توصل اختیار کرنا چاہئے تا کہ اس کی ضرورت کی تکمیل اور حصولِ مقصد کی زیادہ سے زیادہ امید کی جا سکے۔ لیکن جو شخص ایسا نہ کرے۔ سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے جلد بازی سے کام لیا۔

اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے اور اس کی تحسین کی ہے بلکہ میرک کے مطابق ایک نسخہ میں اس پر "حسن صحیح" کا حکم بھی موجود ہے نیز امام ابوداؤد اور نسائی نے بھی اس کی تخریج کی ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوداؤد کی اس روایت کو نقل کر کے یہ بھی فرمایا ہے کہ ابن خزیمہ، حاکم اور ابن حبان نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔

فرائض کے بعد دعا قبول ہوتی ہے

۹۳۱: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ كُنْتُ اُصَلِّيْ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَاضِرٌ وَ اَبُوْبَكْرٍ وَ عُمَرُ مَعَهٗ فَلَمَّا جَلَسْتُ بَدَأْتُ بِالثَّنَاءِ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى ثُمَّ الصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ

دَعَوْتُ لِنَفْسِيْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَلْ تُعْطَهْ سَلْ تُعْطَهْ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٢/٤٨٨ حديث رقم ٥٩٣۔ وأحمد في المسند ٢/٣٨٦۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نماز پڑھ رہا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور آپ کے پاس حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ چنانچہ جب نماز کے بعد میں بیٹھا اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا اس کے بعد میں اپنے لئے دعا مانگنے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ سے مانگو عطا کیا جائے گا (دو مرتبہ فرمایا)۔ (ترمذی)

تشریح: اس حدیث میں جو لفظ "سل تعطه" آیا ہے اس پر علماء نے ایک لفظی بحث چھیڑی ہے، مظہر فرماتے ہیں کہ "تعطه" کے آخر میں جو "ہاء" ہے یا تو یہ "ہاءِ سکتہ" ہے جیسے قرآن کریم میں لفظ "حسابيه" آیا ہے۔ یا یہ ضمیر ہے اور اس کا مرجع مسئول عنہ ہے جس پر لفظ "سل" دلالت کر رہا ہے۔ جبکہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے "وان تعفوا هو اقرب للتقوی" کی نظیر قرار دیا ہے، لیکن یہ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہم ہے کیونکہ "وان تعفوا" میں "ان" مصدر یہ ہے جس کی وجہ سے یہ "ما نحن فيه" کی نظیر نہیں بن سکتا، البتہ اگر اس کی نظیر پیش کرنا ہی ہو تو اس آیت کو پیش کرنا چاہیے:۔

"اعدلوا هو اقرب للتقوی"

اسی طرح حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں ایک اور فروگذاشت بھی ہے اور وہ ہے لفظ "ھو" کا اضافہ۔ جس سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ یہ بھی قرآن کریم کا حصہ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کریم کے الفاظ تو یہ ہیں:۔

"وان تعفوا اقرب للتقوی"

اور یہ آیت درحقیقت نظیر ہے "وان تصوموا خيرلكم" کی۔ اور ان دونوں کی تقدیری عبارت یوں ہے۔ "وعفوكم اقرب وصيامكم خيرلكم" اور "اقرب" اور "خير" کی ضمیر کا مرجع "ان" کا مجموعہ ہے۔

اس حدیث کی تخریج امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے اور اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ نیز امام ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے جیسا کہ میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

الفصل الثالث:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امی ہیں

۹۳۲: عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يُّكْتَالَ بِالْمِكْيَالِ الْاَوْفٰى اِذَا صَلّٰى عَلَيْنَا اَهْلَ الْبَيْتِ فَلْيَقُلْ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِ نِالنَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَاَزْوَاجِهٖ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَذُرِّيَّتِهٖ وَاَهْلِ بَيْتِهٖ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ١/٦٠١ حديث رقم ٩٨٢۔ في المخطوطة "تحصل"۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس آدمی کو یہ پسند ہو کہ اسے بھرپور

زیادہ سے زیادہ ثواب ملے تو اسے چاہیے ہم اہل بیت پر اس طرح درود بھیجے: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ نِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ...... ''اے اللہ تو اپنی رحمت نازل فرما محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی ازواج مطہرات پر جو سب مؤمنوں کی مائیں ہیں اور آپ کی اولاد پر اور اہل بیت پر نازل فرما جیسے تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل پر رحمت نازل فرمائی بے شک تو بزرگ اور برتر ہے'' (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث میں سب سے پہلے تو یہ بات سمجھنی ہے کہ ''مکیال'' کا لفظ عام طور پر اشیاء کثیرہ کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اور ''میزان'' کا لفظ عام طور پر اشیاء قلیلہ کیلئے۔ یہاں ''مکیال'' کا لفظ لا کر اسے ''الاوفی'' کی قید سے اور زیادہ مؤکد کر دیا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اذا صلی علینا'' میں ''اذا'' شرط کیلئے ہے اور اس کی جزاء ''فلیقل'' ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''اذا'' ظرفیہ ہو اور ''فلیقل'' اس کیلئے عامل ہو۔ جیسا کہ بعض نحویوں کا مذہب ہے کہ فاء جزائیہ کا مابعد اپنے ماقبل میں عمل کرسکتا ہے جیسا کہ آیت قرآنی ''لا یلاف قریش'' میں ہے کہ اس کا عامل ''فلیعبدوا'' ہے۔

اس حدیث میں دوسری بات جو قابل وضاحت ہے وہ لفظ نبی سے متعلق ہے اس لفظ کو ہمزہ کے ساتھ نبیءٌ اور یاء کا یاء میں ادغام کر کے نبیٌّ دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ قراءتِ سبعہ میں اس لفظ کو دونوں طرح پڑھا گیا ہے البتہ اکثر قراء کی قراءت کے مطابق یاء کا یاء میں ادغام ہی زیادہ فصیح ہے۔ رہی یہ بات کہ بعض روایات سے ہمزہ کے ساتھ استعمال کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے تو یہ استقرارِ شریعت سے پہلے تک تھی کیونکہ زمانہ جاہلیت میں اس لفظ کا اطلاق اس شخص پر ہوتا تھا جو اپنے دین سے نکل جائے اور اپنے وطن چھوڑ دے۔

لفظِ نبی فعیلٌ کے وزن پر فاعل یا مفعول کے معنی میں نباء بمعنی خبر سے ماخوذ ہے یا نبوت بمعنی رفعت و بلندی سے ماخوذ ہے۔ نبی اس انسان کو کہتے ہیں جس کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئے خواہ انہیں تبلیغ کا حکم ہو یا نہ ہو۔ اور رسول اس پیغمبر کو کہتے ہیں جنہیں دوسروں تک وحی پہنچانے کا حکم بھی دیا گیا ہو۔

اس حدیث میں رسول کی جگہ نبی کا لفظ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نبی کے احوال عام ہوتے ہیں اور دوسرا مقصد مبالغہ پیدا کرنا بھی ہے کیونکہ جب ایک شخص وصفِ نبوت کے ساتھ درود و سلام کا مستحق ہو تو وصف رسالت کے ساتھ متصف ہونے کی صورت میں تو بطریق اولیٰ وہ درود و سلام کا مستحق ہوگا۔ یا یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ وصفِ نبوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ولایتِ خاصہ کو شامل ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ کے درمیان دائر ہے۔

اس حدیث میں تیسری بات لفظ اُمّی سے متعلق ہے جو کہ اُمّ کی طرف یائے نسبت سے منسوب ہے اور یہ اس شخص پر بولا جاتا ہے جو نہ لکھ سکے اور نہ ہی لکھی ہوئی چیز کو پڑھ سکے۔ گویا کہ لکھنے پڑھنے کے معاملے میں وہ اسی حالت پر ہے جس حالت پر اسے اس کی ماں نے جنم دیا تھا یا اس نسبت کی وجہ یہ ہے کہ اُمّی بھی عورت ہی کی طرح ہوتا ہے کہ اکثر عورتیں اس سے ناآشنا ہوتی ہیں۔ تاہم اس کے باوجود عدمِ کتابت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عظیم معجزہ تھا کہ علوم ظاہری و باطنی کا وافر حصہ ملنے کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

''وما کنت تتلو من قبله من کتٰب و لا تخطه بیمینك اذا لارتاب المبطلون''

بعض حضرات کی رائے کے مطابق لفظ امّی ام القریٰ یعنی مکہ مکرمہ کی طرف منسوب ہے کیونکہ تخلیق کے اعتبار سے وہ پوری زمین کا مرکز اور بنیاد ہے اور خانہ کعبہ کے نیچے سے ہی زمین پھیلائی اور بچھائی گئی تھی یا یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ مکہ مکرمہ نبی ﷺ کا شہر ہے اس لئے اس کی طرف نسبت کی گئی یا یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ اسی شہر مکہ مکرمہ میں تمام عالم کے مسلمانوں کا قبلہ موجود ہے یا یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ پوری دنیا کے بالکل بیچ و بیچ واقع ہے اور دنیا کے تمام ممالک سے اس کے پاس لوگ ایسے آتے ہیں۔ جیسے اولاد ماں کے پاس آ کر جمع ہوتی ہے۔ اور یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ لوگوں کو فیض اور رحمت و برکت یہیں سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ اللہ کی طرف سے رحمت کا نزول سب سے پہلے یہیں ہوتا ہے بعد میں وہ رحمت و برکت اطراف واکنافِ عالم میں پھیلا دی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی اس کی مختلف وجوہات بیان کی گئی ہیں جن میں سے چند ایک مزید یہ ہیں:۔

① یہ لفظ امۃٌ کی طرف منسوب ہے کیونکہ عرب میں اکثر باندیاں عام طور پر نوشت وخواند سے عاری ہوتی ہیں اور ہوتی تھیں۔
② اس کی نسبت پوری اُمت کی طرف ہے جسے اس بات کی ترغیب دینے کیلئے بہت زیادہ اہتمام کیا گیا۔
③ اس کی نسبت اُمّ الکتاب کی طرف ہے جو کہ اصولِ کتابت کو بھی شامل ہے۔

اس حدیث کو امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن اور ابن حمید نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ نیز ابونعیم اور طبرانی بھی اس کی تخریج کی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کیا ہے جو امام بخاری اور ابوحاتم کے بقول زیادہ اصح ہے اور ایک روایت میں حضرت علیؓ سے مرفوعاً یہ حدیث دوسرے الفاظ کے ساتھ مروی ہے جو یہ ہیں:

''من سرهٔ ان یکتال بالمکیال الاوفی فلیقرأ هذه الایة سبحن ربك رب العزة عما یصفون وسلٰم علی المرسلین والحمد لله رب العلمین''۔

درود نہ پڑھنے والا بخیل ہے

۹۳۳: وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْبَخِيْلُ الَّذِيْ مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ۔

(رواه الترمذی ورواه احمدعن الحسین بن علی رضی اللّٰہ عنهما وقال الترمذی هذاحدیث حسن صحیح غریب أخرجه الترمذی فی السنن ٥/١٥ ٥حدیث رقم ٣٥٤٦۔ وأحمد فی المسند ١/ ٢٠١۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بخیل وہ آدمی ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود نہیں بھیجا'' (ترمذی) اور امام احمدؒ نے اس روایت کو حضرت حسین بن علیؓ سے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

تشریح: اس حدیث میں ''البخیل'' پر جو الف لام داخل ہے وہ جنسی ہے اور کمال پر محمول ہے اس لئے مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص نبی ﷺ کا تذکرہ مبارک سن کر آپ ﷺ پر درود شریف نہیں پڑھتا وہ کامل درجہ کا بخیل ہے، اس سے بڑا کوئی بخیل نہیں

ہوسکتا چنانچہ ایک روایت میں یہ الفاظ بھی وارد ہوتے ہیں:۔ ''البخیل کل البخیل''
یعنی ایسا شخص انتہائی بخیل ہے اور خود بھی خسارے میں ہے کہ درود شریف پڑھنے سے جو ثواب حاصل ہوتا، اس سے محروم رہا۔

اس حدیث کو حضرت علیؓ کے حوالے سے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق امام بیہقی، ابن ابی عاصم، طبرانی اور ابن حبان نے بھی اس کی تخریج وتصیح کی ہے، نیز امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو حضرت حسینؓ کے حوالے سے بھی نقل کیا ہے۔ اور میرک کے مطابق امام نسائی، ابن ماجہ اور حاکم نے بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درود سننے کے لئے تشریف نہیں لاتے

۹۳۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى عَلَیَّ عِنْدَ قَبْرِیْ سَمِعْتُهٗ وَمَنْ صَلّٰى عَلَیَّ نَائِیًا اُبْلِغْتُهٗ۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

أخرجہ البیہقی فی شعب الایمان ۲/ ۲۰۹ حدیث رقم ۱۵۵۳۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھتا ہے میں اس کو سنتا ہوں اور جو آدمی مجھ پر دور سے درود پڑھتا ہے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے (بیہقی)

تشریح: اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے روضۂ مقدسہ کے قریب پیش کئے جانے والے درود وسلام کو سننے اور سماعت فرمانے کا جو ذکر فرمایا ہے اس سے سماعت حقیقیہ مراد ہے جس میں متکلم اور سامع کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہو۔ اور علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ روضۂ مقدسہ کے قریب کھڑے ہو کر درود وسلام پیش کرنا دور سے پیش کرنا نسبت زیادہ افضل ہے کیونکہ یہ ایک انسانی فطرت ہے کہ مجلس میں موجود شخص کی طرف قلبی توجہ زیادہ ہوتی ہے۔
اس حدیث کی تخریج امام بیہقی نے شعب الایمان میں کی ہے اور میرکؒ کے مطابق اسے ابوالشیخ نے بھی اور ابن حبان نے ''ثواب الاعمال'' میں سند جید سے نقل کیا ہے۔

فرشتوں کا درود وسلام

۹۳۵: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ مَنْ صَلّٰى عَلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَمَلَائِكَتُهٗ سَبْعِیْنَ صَلَاةً۔ (رواہ احمد)

أخرجہ أحمد فی المسند ۲/ ۱۸۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ جو آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک مرتبہ درود پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس پر ستر مرتبہ صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ (احمد)

تشریح: اس حدیث میں ایک مرتبہ درود شریف پڑھنے پر اللہ اور فرشتوں کی طرف سے ستر مرتبہ رحمتوں کے جس نزول کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ یہ حکم جمعہ کے دن کے ساتھ خاص ہو کیونکہ مسند احمد کی ایک روایت میں آتا ہے کہ جمعہ کے

دن اعمال کا ثواب ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے اسی وجہ سے اگر یوم عرفہ جمعہ کو واقع ہو تو وہ اپنے اندر ستر مرتبہ حج کرنے کا ثواب رکھتا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن زنجویہ نے اپنی ترغیب میں سند حسن سے نقل کیا ہے اور حکماً یہ روایت مرفوع ہے کیونکہ اجتہاد سے یہ بات معلوم نہیں کی جا سکتی۔

ایک خاص دُرود

۹۳۶: وَعَنْ رُوَيْفِعٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَلَّى عَلٰى مُحَمَّدٍ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ اَنْزِلْهُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِيْ۔ (رواه احمد)

أخرجه أحمد في المسند ٤/١٠٨۔

ترجمہ: حضرت رویفعؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے اور پھر یہ کہے: اَللّٰهُمَّ اَنْزِلْهُ ...... ''اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مقام پر جگہ دے جو تیرے نزدیک مقرب ہو قیامت کے دن تو اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوتی ہے''۔ (احمد)

تشریح: اس حدیث میں جس مقام و مقعد مقرب کا تذکرہ آیا ہے اس سے مراد یا تو ''مقامِ محمود'' ہے جس کا قرینہ ''یوم القیمة'' ہے اور ایک روایت میں ''یوم القیمة'' کی جگہ ''فی الجنة'' کا لفظ بھی وارد ہوا ہے۔ اس صورت میں اس سے جنت کا وہ اہم ترین اور اعلیٰ ترین مقام مراد لیا جائے گا۔ جو صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دیا جائے گا اور اس کا نام ''وسیلہ'' ہے۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود کے علاوہ دو مقام اور بھی عطا فرمائے جائیں گے۔

① عرش الٰہی کی دائیں جانب، جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیام فرما ہو کر پوری کائنات کیلئے سفارش فرمائیں گے۔ اولین و آخرین اس مقام پر رشک کرتے ہوں گے۔

② جنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ٹھکانہ جس سے بڑھ کر بہتر کوئی ٹھکانہ نہیں ہو سکتا۔

اس حدیث میں یہ دوسرا احتمال مراد ہونا زیادہ اقرب ہے۔ اس صورت میں ''یوم قیامت'' سے مراد ''دار آخرت'' ہوگا۔

اس حدیث کو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ نے نقل کیا ہے اور میرک کے مطابق بزار نے اپنی مسند میں اور طبرانی نے معجم اوسط اور کبیر میں بھی اس کی تخریج کی ہے جن میں سے بعض اسناد درجۂ حسن تک پہنچی ہوئی ہیں جبکہ حافظ صاحب رحمۃ اللہ کی تحقیق کے مطابق ابن ابی عاصم، ابن ابی الدنیا، اسماعیل قاضی اور ابن بشکوال نے بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک طویل سجدہ

۹۳۷: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى دَخَلَ نَخْلًا فَسَجَدَ فَاَطَالَ السُّجُوْدَ حَتّٰى خَشِيْتُ اَنْ يَكُوْنَ اللّٰهُ تَعَالٰى قَدْ تَوَفَّاهُ قَالَ فَجِئْتُ اَنْظُرُ فَرَفَعَ رَاْسَهٗ فَقَالَ مَا لَكَ فَذَكَرْتُ لَهٗ ذٰلِكَ قَالَ فَقَالَ اِنَّ جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ لِيْ اَلَا اُبَشِّرُكَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ

يَقُوْلُ لَكَ مَنْ صَلّٰى عَلَيْكَ صَلاَةً صَلَّيْتُ عَلَيْهِ وَمَنْ سَلَّمَ عَلَيْكَ سَلَّمْتُ عَلَيْهِ۔ (رواه احمد)

أخرجه أحمد في المسند ١/١٩١۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن گھر سے نکل کر کھجوروں کے ایک باغ میں داخل ہو گئے اور وہاں اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ اور آپ ﷺ نے بہت طویل سجدہ کیا میں ڈر گیا کہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات تو نہیں دی چنانچہ میں آپ کو دیکھنے کے لئے آیا آپ ﷺ نے اپنا سر مبارک اٹھایا اور فرمایا کہ کیا ہوا تو میں نے صورت حال آپ کے سامنے ذکر کر دی راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت جبرائیل نے مجھ سے کہا کہ آپ کو یہ بشارت نہ سنا دوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو آدمی آپ پر درود پڑھے گا میں اس پر رحمت بھیجوں گا اور جو آپ پر سلام بھیجے گا میں اس پر سلام بھیجوں گا۔ (احمد) امام احمدؒ نے اپنی دیگر روایات کے آخر میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور سجدہ شکر کے بارے میں اس سے زیادہ صحیح حدیث میری نظر میں نہیں ہے اور یہ حدیث متعدد سندوں سے ثابت ہے۔

تشریح: اس حدیث میں نبی ﷺ کا جس باغ میں داخل ہونا مذکور ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدینہ منورہ کے ''اسواف'' نامی مقام پر واقع تھا۔

اس حدیث کی تخریج امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے فرمائی ہے اور میرک نے اسے حاکم کی روایت وتصحیح کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ نیز ابو یعلی اور ابن ابی الدنیا نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ حافظ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''خلافیات'' میں امام حاکم کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے بلکہ سجدۂ شکر کے بارے میں اس سے زیادہ صحیح روایت میرے علم میں کوئی نہیں۔

درود کے بغیر دعا قبول نہیں ہوتی

۹۳۸: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اِنَّ الدُّعَاءَ مَوْقُوْفٌ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لَايَصْعَدُ مِنْهُ شَيْءٌ حَتّٰى تُصَلِّيَ عَلٰى نَبِيِّكَ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٢/٣٥٦ حديث رقم ٤٨٦۔ والنسائي في السنن ٣/٥٦ حديث رقم ١٣٠٩۔

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ دعا اس وقت تک آسمان وزمین کے درمیان معلق رہتی ہے اور اس میں سے کوئی چیز اوپر نہیں چڑھتی جب تک کہ تم اپنے نبی ﷺ پر درود نہ پڑھو۔ (ترمذی)

تشریح: اس حدیث کے ضمن میں علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہی کا کلام ہو، اگر ایسا ہو تو یہ حدیثِ موقوف کے درجے میں ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ: نبی ﷺ کا ارشاد مبارک نقل فرما رہے ہوں، اس صورت میں نبی ﷺ کا ذکر نہ کرنا صنعتِ تجرید کی وجہ سے ہوگا۔ تاہم دونوں صورتوں میں خطاب عام ہے۔ اس کا مخاطب کوئی خاص شخص نہیں ہے۔

اس حدیث کی تخریج موقوفاً ومرفوعاً دونوں طرح امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمائی ہے اور میرک کے مطابق اس کا موقوف ہونا

ہی صحیح ہے تاہم محققین علماءِ حدیث کی رائے یہ ہے کہ اس قسم کی بات محض اپنی رائے سے کوئی آدمی نہیں کہہ سکتا اس لئے یہ حدیث حکماً مرفوع ہے۔

حصن حصین میں شیخ ابوسلیمان دارانی کا یہ قول منقول ہے کہ جب تم اللہ سے اپنی کسی حاجت کی تکمیل کا مطالبہ اور سوال کرو۔ تو اوّل آخر درود شریف پڑھو اور درمیان میں دعاء کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے درود شریف کو تو بہرحال قبول فرمائیں گے ہی، یہ بات بھی ان کے کرم سے بعید ہوگی کہ درمیان کی دعاء کو چھوڑ دیں اور اوّل آخر کے درود شریف کو قبول فرمالیں۔

بَابُ الدُّعَاءِ فِی التَّشَهُّدِ

تشہد میں دُعا پڑھنے کا بیان

آخری قعدہ میں تشہد اور درود کے بعد دعاء کا پڑھنا مسنون ہے کہ نمازی اپنی پسند اور تمنا کے مطابق دعاء مانگے مگر فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ وہ دعا کلام الناس کے مشابہ نہ ہو اس سے مراد ہر وہ دعا ہے کہ اگر اس کا مطالبہ لوگوں سے کیا جائے تو وہ پورا کر سکے جیسے کوئی یہ دعا مانگے اے اللہ مجھے روٹی دے دے۔ اے اللہ مجھے کپڑے دے دیں۔ علیٰ ھذا القیاس حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد کی تعلیم دی اور پھر تشہد اور درود کے بعد اپنی پسند کے مطابق دعاء کرنے کی تعلیم دی۔ تشہد میں قرآن اور سنت سے ثابت شدہ دعاؤں کا پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔

الفصل الاول:

تشہد کے بعد کی دعا

۹۳۹: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْعُوْفِي الصَّلَاةِ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَفِتْنَةِ الْمَمَاتِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ فَقَالَ لَهٗ قَائِلٌ مَا اَكْثَرَ مَا تَسْتَعِيْذُ مِنَ الْمَغْرَمِ فَقَالَ اِنَّ الرَّجُلَ اِذَا غَرِمَ حَدَّثَ فَكَذَبَ وَوَعَدَ فَاَخْلَفَ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في الصحيحه ٣١٧/٢۔حديث رقم ٨٣٢۔ومسلم في صحيحه ٤١٢/١حديث رقم (١٢٩۔٥٨٩) وأبوداوٗد في السنن ٥٤٨/١حديث رقم ٨٨٠ والنسائي في السنن ٥٨/٣حديث رقم ١٣١٠۔وأحمد في المسند ٨٨/٦۔

ترجمه: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں یہ دعا مانگتے تھے: اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ ...... اے اللہ میں قبر کے عذاب سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اور مسیح دجال کے فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں زندگی اور موت کے فتنوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اے اللہ میں تجھ سے گناہوں سے اور قرض سے پناہ چاہتا ہوں۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا سن کر کسی کہنے والے نے کہا کہ آپ قرض سے کس قدر پناہ مانگتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا

جب آدمی قرض دار ہوجاتا ہے تو باتیں بناتا ہے اور جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: اس حدیث میں عذابِ قبر سے پناہ مانگنے کے جو الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ اس سے معتزلہ کی بڑی پُر زور تردید ہوجاتی ہے جو کہ عذاب قبر کا انکار کرتے ہیں۔ اور اہلسنّت والجماعت کا مسلک ورائے بڑی وضاحت کے ساتھ ثابت ہوجاتی ہے۔

ایک مرتبہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان کو کسی معتزلی کی نماز جنازہ پڑھنے کا اتفاق ہوا تو اس نے دعاء کرتے ہوئے کہا کہ اے اللہ! اسے عذاب قبر ضرور چکھانا کیونکہ یہ عذابِ قبر پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ بڑے پُر زور انداز میں اس کی نفی وتردید کرتا تھا اور اس کے قائلین کو غلط اور خطا کار قرار دیتا تھا۔

اس حدیث میں ''مسیح دجال'' کے فتنے سے بھی پناہ مانگی گئی ہے جس کے وسیع مفہوم میں ہر مفسد اور گمراہ شخص شامل ہے۔ دجال کو ''مسیح'' کہنے کی بہت سی وجوہات میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

① مسیح بروزن فعیل ممسوح کے معنی میں ہے۔ چونکہ اس کی ایک آنکھ اس کے چہرے سے ایسے غائب ہوگی جیسے کسی نے پونچھ کر صاف کردی ہو، اس لئے اسے ''مسیح'' کہا جاتا ہے۔ (یاد رہے کہ دجال ایک چشم گل ہوگا)۔

② ممسوح سے مراد ہر خیر سے دور ہونا ہے۔

③ اس کی تخلیق ہی اس طرح ہوئی ہے کہ چہرہ کی ایک جانب نہ آنکھ ہے اور نہ ہی ابرو، اس لئے اسے ''مسیح'' کہتے ہیں۔

④ مسیح بروزن فعیل بمعنی فاعل کے ''مساحت'' سے ماخوذ ہے، چونکہ یہ حرمین شریفین کو چھوڑ کر باقی پوری دنیا میں چند ہی دنوں کے اندر چکر لگالے گا اس لئے اسے ''مسیح'' کہتے ہیں۔

بہرحال! انجامِ کار یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں اپنے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوگا۔

رہی یہ بات کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب بھی تو ''مسیح'' ہے۔ سو یاد رہے کہ عبرانی زبان میں اس کی اصل ''مسیحا'' بمعنی مبارک کے ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے بابرکت ہونے کی وجہ سے ''مسیح'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کی اور بھی متعدد وجوہات ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

① مسیح ''مسح'' سے ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس بیمار کو اپنا ہاتھ لگادیتے وہ تندرست ہوجاتا تھا، اس لئے انہیں یہ لقب دیا گیا۔

② حضرت عیسیٰ علیہ السلام سیاح تھے اور کثرت سے سفر میں رہا کرتے تھے اس لئے انہیں ''مسیح'' کہا گیا۔

③ شکم مادر سے جنم لے کر دنیا میں آتے ہوئے آپ کا سر تیل سے پونچھا ہوا تھا۔

④ حضرت زکریا علیہ السلام نے چونکہ انہیں چھوا تھا اس لئے ان کا نام ہی ''مسیح'' پڑ گیا۔

امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ یہ لفظ اگر ''س'' کی تشدید کے ساتھ ''مسّیح'' ہو تو اس سے مراد ''دجال'' ہوگا اور اگر ''س'' کی تخفیف کے ساتھ ''مسیح'' ہو تو اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے، جبکہ بعض حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ یہ لفظ دجال کیلئے ''خ'' کے ساتھ ''مسیخ'' بولا جاتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیلئے ''ح'' کے ساتھ، لیکن ان میں سے پہلا قول غیر مشہور اور دوسرا تصحیف کی وجہ سے ناقابل قبول ہے۔

زندگی اور موت کے فتنہ سے کیا مراد ہے؟

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زندگی کے فتنے سے مراد یہ ہے کہ انسان پر آزمائشوں اور مصائب کا نزول ہو، صبر اور رضا بالقضاء کا تصور اس کے ذہن سے رخصت ہو جائے۔ اور گناہوں میں زیادہ ملوث ہو جائے۔ اور موت کے فتنہ سے مراد یہ ہے کہ منکر نکیر کی طرف سے سوالات میں سختی ہو اور انسان حیرت، خوف اور عذابِ قبر میں مبتلا ہو جائے۔

اور موت کے فتنے سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ نزع کی حالت میں انسان کو آزمائش میں مبتلا کر دیا جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ زندگی اور موت کے فتنے سے مراد دنیا اور آخرت کا عذاب ہو۔ اور ان دونوں سے بھی زیادہ سخت چیز یہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کا دیدار ہی نصیب نہ ہو۔

مغرم سے کیا مراد ہے؟

ہر وہ چیز جس کا اداء کرنا انسان کیلئے ضروری ہو۔ اسے ''مغرم'' کہا جاتا ہے۔ یہ مصدر بمعنیٰ ''غرامۃ'' کے ہے اور اسم کی جگہ استعمال ہوا ہے، بعض حضرات اسے مالی قرض کی بجائے گناہوں اور معصیتوں کے قرض پر محمول کرتے ہیں۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ ''غرم'' کی طرح ہے جو قرض کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس صورت میں اس سے وہ قرض مراد ہوگا جس کی ادائیگی ضروری بھی ہو اور وہ اسے ادا بھی کر سکتا ہو۔

بظاہر یہاں اس سے مراد مطلقاً قرض ہے خواہ کسی بھی نوعیت کا ہو کیونکہ قرض کی بابت منقول ہے کہ دَین، باعثِ عیبِ دین ہے کیونکہ اس کے ذریعے زمانۂ حال میں ذلت ملتی ہے اور زمانۂ مستقبل میں ادائیگی نہ ہو سکنے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، گو کہ یہ الگ بات ہے کہ مجبوری میں اس کے بغیر کوئی چارہ کار بھی نہیں دکھائی دیتا۔

مقروض کے جھوٹ بولنے سے کیا مراد ہے؟

اصل میں جب قرض خواہ مقروض سے اپنے قرضے کا مطالبہ کرے اور اس کے پاس اتنے پیسے موجود نہ ہوں کہ جس سے وہ قرضہ ادا کر سکے تو وہ اس سے اپنی جان خلاصی کیلئے یقیناً جھوٹ بولے گا اور قرض خواہ سے کہے گا کہ میرے پاس مال آنے والا ہے جیسے ہی میرے پاس مال آئے گا میں تمہیں قرض ادا کر دوں گا۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اپنے حالات اور معاملات جب بتائے گا تو یا جھوٹ بولے گا یا پھر قرض خواہ کی طرف سے ناراضگی مول لے گا۔

وعدہ خلافی سے کیا مراد ہے؟

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وعدہ پورا کرنا عام ہے۔ خواہ اس کا تعلق کسی بھی زمانے سے ہو یا کسی بھی جگہ سے ہو اگر کوئی آدمی اپنے پاس مال کو جمع کر کے رکھنے کی لالچ میں یا اپنی غلط تدبیروں اور ناجائز تصرفات سے اپنے قبضے میں اسے رکھتا ہے تو وہ بھی وعدہ خلافی کرتا ہے۔

یہ حدیث متفق علیہ ہے اور میرک کے مطابق اس کی تخریج امام ابوداؤد اور نسائی نے بھی کی ہے۔

تشہد کے بعد کی ایک دعا

۹۴۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا فَرَغَ اَحَدُكُمْ مِنَ التَّشَهُّدِ الْاٰخِرِ فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْ اَرْبَعٍ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَمِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ وَمِنْ شَرِّ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ۔

(رواه مسلم)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۳/۲۴۱حديث رقم ۱۳۷۷۔وأخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۴۱۲حديث رقم (۱۳۰۔۵۸۸) وأخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۱۰۶حديث رقم ۹۸۳۔وابن ماجة فی السنن ۱/۲۹۴حديث رقم ۹۰۹۔ والدارمی فی السنن ۱/۳۵۷ حديث رقم ۱۳۴۴۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی آخری تشہد سے فارغ ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ چار چیزوں سے اللہ کی پناہ طلب کرے۔ نمبر۱ جہنم کے عذاب سے۔ نمبر۲ عذاب قبر سے۔ نمبر۳ زندگی اور موت کے فتنہ سے۔ نمبر۴ مسیح دجال کے شر سے۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث کی وضاحت میں علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے قعدۂ اخیرہ میں تعوذ کا مستحب ہونا صراحۃً معلوم ہوتا ہے اور اشارۃً ہی یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ قعدۂ اولیٰ میں یہ مستحب نہیں ہے کیونکہ قعدہ اولیٰ مختصر اور ہلکا ہوتا ہے۔ نیز دعا کا اصل موقع اختتام پر ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک اصول ہے:۔

''طلب الامل انما يكون بعد تمام العمل''

دجال کب اور کیوں ظاہر ہوگا؟

دجال کا لفظ دجل سے نکلا ہے جس کا معنی فریب اور دھوکا ہے اس حدیث میں اسے سب سے آخر میں اس لئے ذکر کیا گیا کہ یہ قیامت کے قریب اختتام دنیا پر خروج کرے گا۔ علماء کرام فرماتے ہیں کہ دجال کے خروج میں بھی خیر اور شر دونوں پہلو موجود ہیں۔ چنانچہ خیر کا پہلو یہ ہے کہ اسے دیکھ کر مومن کے ایمان میں اضافہ ہو جائے گا اور وہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لفظ کافر لکھا ہوا پڑھ کر اپنے ایمان ویقین کو مضبوط کر سکے گا اور اس کا شر یہ ہوگا کہ کافر اس سے بچ نہ سکے گا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس باب کی احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ تشہد اور سلام کے درمیان ان چیزوں سے اللہ کی پناہ مانگنا مستحب ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق اس کا موزوں ترین موقع درود شریف اور سلام کے درمیان ہے۔

۹۴۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُعَلِّمُهُمْ هٰذَا الدُّعَاءَ كَمَا يُعَلِّمُهُمُ السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْاٰنِ يَقُوْلُ قُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ الدَّجَّالِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۴۱۲ حديث رقم(۱۳۴۔۵۹۰)۔وأبوداؤد فی السنن ۱/۶۰۱ حديث رقم ۹۸۴۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم صحابہ اور اہل بیت کو یہ دعا اس طرح سکھاتے تھے جس طرح آپ ﷺ ہمیں قرآن کی کوئی سورت سکھایا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ فرماتے تھے کہ یہ دعا اس طرح پڑھو۔ اللهم انی اعوذبك الخ۔ اے اللہ میں جہنم کے عذاب سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اور عذاب قبر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ مسیح دجال کے فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں زندگی اور موت کے فتنہ سے پناہ مانگتا ہوں۔

تشریح: اس حدیث میں جو دعا لفظ ''قولوا'' کے ذریعے سکھائی گئی ہے اس کے بارے میں علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ طاؤس اس امر کو وجوب پر محمول کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ جب ان کے بیٹے نے نماز میں یہ دعا نہ پڑھی تو انہوں نے اسے نماز لوٹانے کا حکم دیا جبکہ جمہور محدثین اس امر کو استحباب پر محمول کرتے ہیں۔

تکرارِ تعوذ کی وجہ:

اس دعا میں ہر جملے کے ساتھ تعوذ کا لفظ بار بار لایا گیا ہے تا کہ ان میں سے ہر ایک کی اہمیت اور عظمت و بڑھائی واضح ہو سکے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ان میں سے ہر ایک جملہ مستقل ہے۔

یہاں یہ بات جاننا بھی ضروری ہے کہ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے نسخے میں یہاں ایک بہت بڑی غلطی پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ الفاظِ حدیث میں ''واعوذ بك من فتنة المسيح الدجال'' کا جملہ مکرر ہے اور ''واعوذ بك من فتنة المحيا والممات'' کا جملہ سرے سے ہے ہی نہیں جو کہ مشکوۃ شریف کے تمام نسخوں کے خلاف ہے۔ پھر اس پر مستزاد علامہ ابن حجر کی وہ تحریر ہے جو انہوں نے اپنے نسخے کی توجیہہ میں لکھی ہے کہ نبی ﷺ نے اس حدیث میں دوسری احادیث کے برخلاف صرف فتنہ دجال کا تذکرہ فرمایا کیونکہ یہ دنیا میں واقع ہونے والے تمام فتنوں سے بڑا اور عظیم الشان فتنہ ہوگا اور اس فتنے میں ایمان پر ثابت قدم نہ رہنے والوں کو عذابِ قبر اور عذابِ جہنم کا سامنا ہوگا اسی وجہ سے یہاں اسے دو مرتبہ ذکر کیا گیا تا کہ اس کی اہمیت بھی واضح ہو جائے اور لوگ اس سے بکثرت استعاذہ کر سکیں۔

لیکن جیسا کہ ہم نے ذکر کیا یہ نسخہ مشکوۃ شریف کے تمام نسخوں کے خلاف ہے اس لئے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی یہ توجیہہ نا قابلِ قبول ہے۔

۹۴۲: وَعَنْ اَبِیْ بَکْرِ ۣ الصِّدِّیْقِ قَالَ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ عَلِّمْنِیْ دُعَاءً اَدْعُوْبِہٖ فِیْ صَلَاتِیْ قَالَ قُلْ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا کَثِیْرًا وَّلَا یَغْفِرُالذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَۃً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳۱۷/۲۔حدیث رقم ۸۳۴۔ومسلم فی صحیحه ۲۰۷۸/۴حدیث رقم (۴۸۔۲۷۰۵) والترمذی فی السنن ۵۰۷/۲حدیث رقم ۳۵۳۱۔والنسائی فی السنن ۵۳/۳حدیث رقم ۱۳۰۲۔وأحمد فی المسند ۴/۱۔

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اے اللہ کے رسول۔ مجھے کوئی ایسی دعا بتا دیجئے کہ جس کو میں اپنی نماز میں پڑھ لیا کروں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دعا پڑھ لیا کرو: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ ...... اے اللہ بیشک میں نے اپنے نفس پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے علاوہ کوئی دوسرا گناہوں کو نہیں

بخش سکتا لہٰذا تو مجھے بخش دے خاص طریقہ سے بخشنا۔ اور مجھ پر رحم کر بے شک تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس دعا میں ظلمًا کثیرًا کا لفظ اکثر روایات میں ثاء کے ساتھ وارد ہوا ہے لیکن مسلم شریف کی بعض روایات میں یہ لفظ باء کے ساتھ کبیرًا آیا ہے۔ اور دونوں صحیح ہیں اور ان دونوں کو جمع کر کے کثیرًا کبیرًا بھی کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ علامہ ابہری نے ذکر کیا ہے۔

اس کی مثال امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا یہ ارشاد ہے کہ نمازی کو چاہیے جب وہ تکبیر تحریمہ کہہ چکے تو ''سبحانك اللّٰھم'' اور ''انی وجھت وجھی'' دونوں پڑھ لیا کرے اور دونوں میں تطبیق دینے کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے جو زیادہ واضح بھی ہے کہ کبھی ایک کو پڑھ لے کبھی دوسرے کو یا فرائض میں اس لفظ کا استعمال کر لے جو مختار مذہب اور اکثر روایات کے مطابق کثیرًا ہے اور نوافل میں کبیرًا کو استعمال کر لے۔

یہاں ابن جماعۃ نے علامہ نووی رحمہ اللہ پر ایک اعتراض کیا ہے جس میں زرکشی نے بھی ان کی ہم نوائی کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں لفظوں کو اس طرح نہیں استعمال فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ایک ہی لفظ کو استعمال کر کے حاصل ہو سکتی ہے اکٹھا کر کے نہیں اور یہاں جو اکٹھا کیا گیا اس کی وجہ روایات میں تعارض دور کرنا ہے اس لئے علامہ نووی رحمہ اللہ کی یہ توجیہہ صحیح نہیں ہے گو کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جواب صحیح نہیں۔

میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دعا انتہائی جامع دعاء ہے کیونکہ اس میں اپنی انتہائی ذلت اور عاجزی کا اعتراف ہے اور اللہ سے اس کے انعام کا مطالبہ ہے۔ چنانچہ مغفرت گناہوں کو چھپانے اور مٹانے کا نام ہے اور رحمت بھلائی پہنچانے کا نام ہے گویا پہلے میں جہنم سے حفاظت کی درخواست ہے اور دوسرے میں نیکوکاروں کے ساتھ جنت داخل کرنے کی درخواست ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے جس کی دعا ہم سب اللہ سے کرتے ہیں۔

اس حدیث کو شیخین کے علاوہ دیگر ائمہ صحاح نے بھی روایت کیا ہے۔

نماز کے آخر میں سلام پھیرنے کا بیان

۹۴۳: وَعَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كُنْتُ اَرٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ يَسَارِهٖ حَتّٰى اَرٰى بَيَاضَ خَدِّهٖ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤٠٩/١ حديث رقم (١١٦ـ٥٩٢)ـ والنسائي في السنن ٦١/٣ حديث رقم ١٣١٧ـ وابن ماجه ٢٩٦/١ـ حديث رقم ٩١٥ـ والدارمي ٣٥٧/١ حديث رقم ١٣٤٥ـ وأحمد في المسند ٣٩٠/١ـ

ترجمہ: حضرت عامر بن سعد اپنے والد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں دیکھتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دائیں اور بائیں سلام پھیرتے تھے حتیٰ کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخساروں کی سفیدی کو دیکھ لیتا تھا۔ (مسلم)

راوئ حدیث:

عامر بن سعد۔ نام۔ ''سعد بن ابی وقاص'' کے بیٹے ہیں۔ زہری و قریشی ہیں۔ اپنے والد اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے حدیث سنی ہے۔ ان سے زہری اور دوسرے لوگ روایت کرتے ہیں۔ ۱۰۴ھ میں وفات پائی۔

تشریح: اس حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک کی سفیدی ذکر کرنے کیلئے ''خدّ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مشکوٰۃ کے تصحیح شدہ نسخوں میں یہ لفظ مفرد ہی استعمال ہوا ہے جبکہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس لفظ کو تثنیہ کے ساتھ ''خدّیه'' اصل قرار دیا ہے، اور ''خدّ'' کو اس کا دوسرا نسخہ قرار دیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ پہلے صورت میں اس کا معنی یوں ہو جائے گا کہ پہلے سلام پر مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں رخسار مبارک کی سفیدی نظر آئی اور دوسرے سلام پر بائیں رخسار مبارک کی۔ اور اس کی دلیل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جو عنقریب ۹۰ پر آیا چاہتی ہے، جس میں اس مضمون کی تصریح واضح الفاظ میں موجود ہے۔

البتہ ایک بات قابل غور ہے کہ اس حدیث میں بھی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی محولہ بالا حدیث میں بھی ''خدّ'' کا لفظ مفرد کے صیغے کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ اس میں تو ظاہر ہے کہ کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر تثنیہ کا صیغہ ہو تو پھر اشکال ہوگا کیونکہ ایک طرف سلام پھیرنے سے اسی طرف کا رخسار نظر آ سکتا ہے۔ دوسری طرف کا نہیں۔

نیز الفاظ حدیث میں اس بات پر بھی کوئی دلالت موجود نہیں کہ سلام پھیرنا نماز کا ایسا رکن ہے جس کے بغیر نماز درست ہی نہیں ہوتی جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے یہ رائے اختیار کی ہے اور فرمایا ہے کہ اگر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جب التحیات میں بیٹھنے کا طریقہ سکھایا تو کلمات تشہد سکھانے کے بعد فرمایا جب تم یہ کہہ چکو تو تمہاری نماز مکمل ہو گئی، اگر تم چاہو تو کھڑے ہو جاؤ اور چاہو تو بیٹھے رہو۔ سو اس روایت کو امام ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی ''ان شئت'' کے قائل تھے۔ تو میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث موقوف حکماً مرفوع ہے کیونکہ ایسی بات کوئی بھی محض اپنی رائے سے نہیں کہہ سکتا پھر اتنی بات تو آپ بھی مانتے ہیں کہ اس سے پہلے کا جملہ حجت ہے کیونکہ وہ حدیث ہے۔

باقی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اگر اسے حدیث مرفوع تسلیم کر بھی لیا جائے تو ''قضیت'' کا معنی ہوگا تمہاری نماز مکمل ہونے کے قریب ہوگئی، یا تم اس کا ایک بڑا حصہ ادا کر چکے، اس لئے کہ ابھی خود ہی تو حافظ صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ''ان شئت'' کے قائل بالاتفاق حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور اس سے پہلے کا جملہ بالاتفاق مرفوع ہے، یہ تو تناقضِ صحیح ہے، پھر وہ تاویل جو حافظ صاحب رحمہ اللہ نے ''قضیت'' کا معنی بیان کرتے ہوئے ذکر کی ہے، وہ بھی بعد از قیاس ہے اور دور دور تک اس تاویل کا کوئی مقتضی نہیں پایا جاتا۔

اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے مندرجہ ذیل حدیث کو بھی ضعیف قرار دیا۔

''اذا رفع الامام راسه من آخر ركعته وقعد، ثم احدث قبل ان يتكلم فقد تمت صلاته''۔

اور فرمایا ہے کہ اگر صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو اسے پہلے سلام کے بعد حدث لاحق ہونے پر محمول کیا جائے گا۔

میں اس کا جواب یہ دوں گا کہ سند کے اعتبار سے یہ حدیث صحیح ہے اور حافظ صاحب رحمہ اللہ کا اسے پہلے سلام سے قبل پر

محمول کرنا غلط ہے کیونکہ حدیث کے الفاظ ''قبل ان یتکلم'' اس کی پُر زور تردید کر رہے ہیں۔ پھر اس تاویل کا بعید از فہم ہونا بھی واضح ہے، نیز ایک دوسری حدیث میں تو صراحۃً یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

''اذا احدث وقد قعد فی آخر صلاتہ قبل ان یسلم فقد جازت صلاتہ''

اسی طرح ایک اور حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں۔

''اذا جلس قدر التشھد، ثم احدث فقد تمت صلوتہ''

اس حدیث کو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اتنی مختلف اسناد سے نقل کیا ہے کہ یہ درجۂ حسن سے اوپر پہنچ جاتی ہے اس لئے اصلاً یہ حدیث قوی قرار پاتی ہے اسی وجہ سے بعد میں اس پر طاری ہو جانے والا ضعف بھی کچھ مضر نہیں رہتا، اس لئے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا کہ یہ دونوں حدیثیں بھی تمام حفاظ حدیث کے اتفاقی قول کے مطابق ضعیف ہیں، نرا دعویٰ ہے جس کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔

پھر متعدد اسانید سے ایک سلام پر اکتفاء بھی ثابت ہے اور دوسری روایات سے دو سلاموں کا ثبوت بھی ملتا ہے جن میں سے پہلے کو بیانِ جواز پر محمول کیا جائے گا یا پھر اقتصارِ راوی پر، البتہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت سے صرف ایک مرتبہ سلام پھیرنے کا جوذکر ملتا ہے وہ دائیں یا بائیں جانب نہیں بلکہ چہرے کے سامنے کی طرف ہے، اور اسے ابن حبان و حاکم نے صحیح بھی قرار دیا ہے، جبکہ محدثین کی ایک دوسری جماعت نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

امام نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف منہ کرے

۹۴۴: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا صَلّٰى صَلَاةً اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ۔

(رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۳۳۳۔حديث رقم ۸۴۵۔والنسائي في السنن ۳/۸۳حديث رقم ۱۳۶۳۔وابن ماجه ۱/۱۷ حديث رقم ٤٤۔

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھ کر فارغ ہو جاتے تھے تو ہماری طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔

تشریح: اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے ابن ملک فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرتے وقت اپنے روئے انور کو دائیں اور بائیں جانب گھمایا کرتے تھے جبکہ علامہ ابہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر اپنے روئے انور مقتدیوں کی طرف کر کے بیٹھ جایا کرتے تھے، حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی قول کی تائید کرتے ہوئے دلیل میں اس روایت کو پیش کرتے ہیں جو عنقریب آیا چاہتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیر کر فارغ ہو جاتے تو کبھی کبھار اپنی دائیں جانب لوگوں کی طرف اور بائیں جانب قبلہ کی طرف بھی کر لیا کرتے تھے۔

اس حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دس مختلف جگہوں پر کہیں مفصل اور کہیں مجمل نقل فرمایا ہے، نیز میرک کے مطابق امام مسلم، ترمذی اور نسائی نے بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے۔

۹۴۵: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْصَرِفُ عَنْ يَمِيْنِهِ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في في صحيحه ۱/۴۹۲ حديث رقم (۶۱ـ۷۰۸)ـ والنسائي ۳/۸۱ حديث رقم ۱۳۵۹ـ

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر دائیں طرف مڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔

تشریح: اس حدیث کی وضاحت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول مبارک پیش کیا جا سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دائیں جانب کوئی کام ہوتا تو سلام پھیر کر دائیں جانب رخ انور کر کے بیٹھ جاتے اور اگر بائیں جانب کوئی کام ہوتا تو بائیں جانب رخ فرما لیتے، اس لئے میں کہتا ہوں کہ اگر نمازی کو کوئی کام ہو تو وہ اس رخ پر بیٹھ جائے جس طرف اسے کام ہو۔ اور اگر دونوں جانبیں برابر ہوں تو پھر جس طرف چاہے رخ کر لے۔ البتہ دائیں جانب رخ کرنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر کام میں ''تیامن اور یمین'' بہت پسند تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول مبارک تھا کہ جب مسجد سے نکلنے کا ارادہ نہ ہوتا تو دائیں جانب رخ کر کے نمازیوں کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔

فائدہ: یاد رہے کہ مذکورہ آخری چار حدیثیں اس باب کے ساتھ ادنیٰ مناسبت کی وجہ سے ذکر کر دی گئی ہیں۔

اپنی نماز سے شیطان کا حصہ مقرر نہ کرو

۹۴۶: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَا يَجْعَلُ اَحَدُكُمْ لِلشَّيْطَانِ شَيْئًا مِنْ صَلَاتِهٖ يُرٰى اَنَّ حَقًّا عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَنْصَرِفَ اِلَّا عَنْ يَمِيْنِهٖ لَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَثِيْرًا يَنْصَرِفُ عَنْ يَّسَارِهٖ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۳۳۷ـ حديث رقم ۸۵۲ـ ومسلم في صحيحه ۱/۴۹۲ حديث رقم (۵۹ـ۷۰۷) وأبوداؤد في السنن ۱/۶۳۱ حديث رقم ۱۰۴۲ـ والنسائي في السنن ۳/۸۱ حديث رقم ۱۳۶۰ـ وابن ماجه ۱/۳۰۰ حديث رقم ۹۳۰ـ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی آدمی اپنی نماز میں سے شیطان کا حصہ مقرر نہ کرے۔ یہ کہ اس چیز کو لازم سمجھے کہ دائیں طرف ہی سے پھرے۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ اکثر بائیں طرف سے بھی پھرا کرتے تھے۔

تشریح: اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد کہ ''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اکثر بائیں جانب رُخ پھیرتے ہوئے دیکھا ہے'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال سے کمال مطلع ہونے پر دلالت کرتا ہے، اور اسی حدیث سے علامہ طیبی رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ بھی مستنبط کیا ہے کہ کسی مستحب کام پر اصرار کرنا اور اس میں رخصت پر عمل نہ کرنا شیطانی دھوکہ اور اس کی طرف سے گمراہ کرنے کی ایک کوشش ہے۔ جب مستحب کام پر اصرار کا یہ حکم ہے تو بدعت اور غلط کاموں پر اصرار شیطانی دھوکہ کیوں نہ ہوگا؟ نیز حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ اللہ اپنی جانب سے دی جانے والی رخصتوں کو قبول کرنا بھی اسی طرح پسند کرتا ہے جس طرح عزیمت پر عمل کرنا پسند کرتا ہے، اسی طرح اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ''انصرفنا من الصلوٰۃ'' کہنا جائز ہے

گو کہ حضرت ابن عباسؓ اسے مکروہ سمجھتے تھے اور دلیل میں قرآن کریم کی یہ آیت پیش کرتے تھے:
"ثم انصرفوا صرف الله قلوبهم"۔ "خدا نے ان کے دلوں کو پھیر رکھا ہے۔"

نماز کے بعد کی دعا

۹۴۷: وَعَنِ الْبَرَاءِؓ قَالَ كُنَّا إِذَا صَلَّيْنَا خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحْبَبْنَا اَنْ نَكُوْنَ عَنْ يَمِيْنِهٖ يُقْبِلُ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ قَالَ فَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ رَبِّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ اَوْتَجْمَعُ عِبَادَكَ۔

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۴۹۲حدیث رقم(۶۲۔۷۰۹)۔وأبو داوٗد فی السنن ۵/۲۹۸حدیث رقم ۵۰۴۵۔والترمذی ۵/۴۳۹حدیث رقم ۳۳۹۸۔وابن ماجه ۲/۱۲۷۶۔حدیث رقم ۳۸۷۷۔وأحمد فی المسند ۱/۴۰۰

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے تو اس کو پسند کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے دائیں طرف کھڑے ہوں تاکہ سلام کے وقت سب سے پہلے آپ ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوں۔ حضرت براءؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز کے بعد یہ دعا کرتے ہوئے سنا ہے۔ رب قني عذابك يوم تبعث او تجمع عبادك۔ اے اللہ مجھے اپنے عذاب سے بچا اس دن کہ جب تو اپنے بندوں کو اٹھائے گا یا جمع کرے گا۔ (مسلم)

۹۴۸: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ اِنَّ النِّسَآءَ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُنَّ اِذَا سَلَّمْنَ مِنَ الْمَكْتُوْبَةِ قُمْنَ وَثَبَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ صَلّٰى مِنَ الرِّجَالِ مَاشَاءَ اللّٰهُ فَاِذَا قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ الرِّجَالُ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۳۴۹۔حدیث رقم ۸۶۶۔وأحمد فی المسند ۶/۳۱۶۔ فی المخطوطة "التصنیف"۔

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک میں عورتیں فرض نماز کا سلام پھیر کر فی الفور اٹھ جاتی تھیں۔ اور اپنے گھروں کو چلی جاتی تھی۔ اور رسول اللہ ﷺ اور مردوں میں سے جو لوگ نماز میں شامل ہوتے تھے جتنی دیر اللہ کو منظور ہوتا بیٹھے رہتے تھے۔ پھر جب آپ ﷺ کھڑے ہوتے تو سب مرد بھی کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ (بخاری) اور جابر بن سمرہ کی حدیث ہم باب الضحک میں ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ

تشریح: اس حدیث سے ابن ملک نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ عورتوں کے گذر جانے کی غرض سے امام کا اپنی جگہ کھڑا رہنا مستحب ہے اور یہ بھی مستحب ہے کہ جب تک امام کھڑا نہ ہو، مقتدی اپنی جگہ ہی بیٹھے رہیں۔

اس مضمون کی ایک روایت حضرت جابر بن سمرہؓ سے بھی مروی ہے جو عنقریب "باب الضحک" میں مکمل تفصیل کے ساتھ آئے گی۔ تاہم یہاں اس کا مضمون ذکر کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا چنانچہ مروی ہے کہ حضور ﷺ جس جگہ نمازِ فجر پڑھاتے تھے، وہاں سے طلوعِ آفتاب سے پہلے نہ اٹھتے تھے، اور لوگ بھی آپ میں زمانۂ جاہلیت کی پرانی باتیں اور یادیں تازہ کرتے ہوئے

گفتگو میں مصروف رہتے، صحابۂ کرام علیہم الرضوان دورانِ گفتگوان باتوں پر ہنستے بھی جاتے تھے جس پر ہنسی آتی ہے لیکن نبی ﷺ صرف تبسم فرمایا کرتے تھے۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مسجد میں جائز اور مباح کلام سننے کے جواز کی بھی دلیل ہے تاہم بعض حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ چونکہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کی گفتگو دینی فوائد سے خالی نہیں ہوتی تھی اس لئے اس سے صرف مباح کا جواز ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

تنبیہ: حضرت جابر بن سمرہؓ کی محولہ بالا حدیث کو اسی بات میں ذکر کرنا زیادہ بہتر تھا تا کہ حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اعتزار کی ضرورت پیش آتی اور نہ ان پر کوئی اعتراض وارد ہوتا۔ اور یہ واضح بات ہے کہ اگر کوئی طویل حدیث مختلف امور پر مشتمل ہو اور اسے مختلف ابواب میں کسی ایک مناسبت کی وجہ سے ذکر کیا جاسکتا ہو تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک ہی حدیث کئی ابواب کے تحت معمولی مناسبت کی وجہ سے ذکر فرمائی ہے۔

الفصل الثانی:

نماز کے بعد کی ایک دُعا

۹۴۹: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍؓ قَالَ اَخَذَ بِيَدِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّيْ لَاُحِبُّكَ يَا مُعَاذُ فَقُلْتُ وَاَنَا اُحِبُّكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ فَلَا تَدَعْ اَنْ تَقُوْلَ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ رَبِّ اَعِنِّيْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ (رواه احمد وابوداود والنسائى) اِلَّا اَنَّ اَبَادَاوٗدَ لَمْ يَذْكُرْ قَالَ مُعَاذٌ وَاَنَا اُحِبُّكَ.

أخرجه أبوداوٗد فى السنن ۲/ ۱۸۰ حديث رقم ۱۵۲۲ ـ والنسائى فى السنن ۳/ ۵۴ حديث رقم ۱۳۰۴ ـ ومالك فى الموطأ ۲/ ۹۵۳ حديث رقم ۱۶ من كتاب الشعر ـ وأحمد ۵/ ۲۴۷ ـ

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر فرمایا۔ اے معاذ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ میں بھی آپ ﷺ سے محبت کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کسی بھی نماز کے بعد اس دعا کو ترک نہ کرنا۔ رب اعنى على ذكرك وشكرك وحسن عبادتك۔ اے میرے پروردگار تو اپنے ذکر اپنے شکر اور اپنی اچھی عبادت میں میری مدد کر۔ (ابوداؤد۔ احمد۔ نسائی) امام ابوداؤد نے حضرت معاذؓ کے یہ الفاظ وانا احبك نقل نہیں کیے ہیں۔

تشریح: اس حدیث کے ضمن میں ابن ملک فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے جن الفاظ میں اظہار تعلق ومحبت فرمایا، وہ حضرت معاذؓ کے اظہار محبت والے کلمات سے زیادہ مؤکد ہیں، میری طرف سے اس کی توجیہہ یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ حضرت معاذؓ کی طرف سے تو تاکیدی کلمات کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ نبی ﷺ سے محبت نہ کرتے ہوں اس لئے بظاہر ان کے کلمات محبت زیادہ مؤکد نہ تھے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اللہ کا ذکر، انشراح صدر کا مقدمہ ہے، اس کا شکر حصول نعمت کا سبب اور ذریعہ ہے۔ اور وہ حسن عبادت جس کا ایک بندۂ مؤمن سے مطالبہ ہے، یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ماسویٰ اللہ سے جدا کر لے۔

حافظ سخاوی رحمہ اللہ حدیث مسلسل کی بحث میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ''انی لا احبك'' کا لفظ ہمیں مسلسل بالروایۃ کے طور پر نقل کیا گیا ہے اور یہ حدیث ہمارے لئے مسلسلات میں سے ایک اہم حدیث ہے۔

سلام پھیرنے کا طریقہ

۹۵۰: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُسَلِّمُ عَنْ يَمِيْنِهٖ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ حَتّٰى يُرٰى بَيَاضُ خَدِّهِ الْاَيْمَنِ وَعَنْ يَسَارِهٖ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ حَتّٰى يُرٰى بَيَاضُ خَدِّهِ الْاَيْسَرِ۔ (رواه ابوداؤد والترمذی والنسائی ولم يذكر الترمذی حتّٰى يُرٰى بَيَاضَ خَدِّهٖ)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۶۰۶ حديث رقم ۹۹۶۔ والترمذی ۲/۸۹ حديث رقم ۲۹۵ وأخرجه النسائی فی السنن ۳/۶۳ حديث رقم ۱۳۲۳۔ والدارمی فی السنن ۱/۳۵۷ حديث رقم ۱۳۴۵۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دائیں جانب سلام پھیرتے اور کہتے تھے السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں رخسار کی سفیدی نظر آتی تھی۔ اور اپنی بائیں جانب بھی السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہوئے سلام پھیرتے تھے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں رخسار کی سفیدی نظر آتی تھی۔ (ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی)

تشریح: اس حدیث کے تحت بعض شوافع نے یہ بھی فرمایا ہے کہ نماز سے فارغ ہونے کیلئے جو سلام پھیرا جاتا ہے اس میں ''وبرکاته'' کا اضافہ کر لینا مستحب ہے۔ لیکن حافظ ابن صلاح نے اس کی تردید کرتے ہوئے اسے عقلاً ونقلاً دونوں طرح شاذ قرار دیا ہے۔

۹۵۱: وَرَوَاهُ ابْنِ مَاجَةَ عَنْ عَمَّارِ بْنِ يَاسِرٍ۔

ترجمہ: اور ابن ماجہ نے اس روایت کو عمار بن یاسر سے نقل کیا ہے۔

تشریح: یہ حدیث امام ابن ماجہ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بھی نقل کی ہے۔ جو یہاں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور بظاہر ان کی روایت مکمل حدیث ہے، جزوِ حدیث نہیں، ورنہ صاحب مشکوٰۃ ''وکذا رواہ ابن ماجۃ'' فرماتے۔

۹۵۲: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ اَكْثَرُ اِنْصِرَافِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ صَلَاتِهٖ اِلٰى شِقِّهِ الْاَيْسَرِ اِلٰى حُجْرَتِهٖ۔ (رواه فی شرح السنة)

أخرجه البغوی فی شرح السنة ۳/۲۱۰ حديث رقم ۷۰۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر نماز کے بعد بائیں جانب اپنے حجرہ کی طرف مڑ جاتے تھے۔ (شرح السنہ)

تشریح: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرۂ مبارکہ کا دروازہ مسجد میں کھلتا تھا جو محراب کی بائیں جانب بنتی ہے، اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوکر اکثر بائیں جانب سے واپس ہوکر اپنے حجرۂ مبارکہ میں تشریف لے جاتے تھے۔

فرض کے بعد سنتوں کے لئے جگہ تبدیل کرنا

۹۵۳: عَنْ عَطَاءِ الْخُرَاسَانِيِّ عَنِ الْمُغِيْرَةِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُصَلِّي الْإِمَامُ فِي الْمَوْضِعِ الَّذِيْ صَلّٰى فِيْهِ حَتّٰى يَتَحَوَّلَ (رواه ابوداود) وَقَالَ عَطَاءُ الْخُرَاسَانِيُّ لَمْ يُدْرِكِ الْمُغِيْرَةَ۔

أخرجه أبوداوٗد في السنن ١/ ٤٠٩ حديث رقم ٦١٦۔وابن ماجه ١/ ٤٥٩ حديث رقم ١٤٢٨۔

ترجمہ: حضرت عطاء خراسانی سے روایت ہے وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ امام اس جگہ نماز نہ پڑھے جہاں نماز پڑھ چکا ہے بلکہ وہاں سے جگہ تبدیل کرے۔ (ابوداؤد) اور کہا ہے کہ عطاء خراسانی کی ملاقات حضرت مغیرہ بن شعبہ سے ثابت نہیں ہے۔

راویٔ حدیث:

عطاء بن عبداللہ۔ نام عطاء عبداللہ کے بیٹے ہیں۔ جلیل القدر تابعی ہیں۔ ''عطا خراسانی'' کے نام سے مشہور ہیں۔ اصل میں ''خراسان'' کے باشندہ تھے شام میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۵ھ میں انتقال ہوا۔ ان سے مالک بن انس اور معمر بن راشد نے روایت کی ہے۔

تشریح: اس حدیث میں امام کو فرض نماز کے بعد مصلّی امامت پر ہی نوافل ادا کرنے سے جو منع کیا گیا ہے، اس کی توجیہہ میں بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق ان نمازوں کے ساتھ ہے جن کے بعد سنن رواتبہ ہوں، اور جن نمازوں کے بعد سنن رواتبہ نہ ہوں ان میں یہ ممانعت نہیں ہے اور بعض علماءِ کرام فرماتے ہیں کہ یہ ممانعت ہر فرض نماز کے بعد ہے خواہ اس کے بعد سنتیں ہوں یا نہ ہوں۔

اور کتاب الازھار میں صاحب کتاب نے تو یہ فرمایا ہے کہ ممانعت کا یہ حکم صرف امام کے ساتھ خاص نہیں بلکہ مقتدیوں کو بھی شامل ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ اس ممانعت کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسی جگہ پر نوافل پڑھنے کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ کہیں دیکھنے والے کو یہ وہم نہ ہو جائے کہ یہ ابھی تک فرض نماز ہی پڑھ رہا ہے۔ یا یہ کہ اپنی پڑھی ہوئی نماز کو لوٹا رہا ہے، جبکہ مظہر اس کی حکمت یوں بیان فرماتے ہیں کہ جب انسان دو مختلف جگہوں پر نماز پڑھے گا تو قیامت کے دن دو مختلف جگہیں اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی گواہی دیں گی اس لئے جگہ بدل بدل کر عبادت کرنا اچھی بات ہے۔

سند حدیث پر بحث:

حدیث کے متن اور اس کی مکمل وضاحت کے بعد اب اس کی سند پر بھی غور فرمایئے کیونکہ یہ حدیث سنداً ضعیف ہے، علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ضعیف قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ راوی حدیث عطاءِ خراسانی کی حضرت مغیر بن شعبہؓ سے ملاقات ثابت ہی نہیں جیسا کہ امام ابوداؤد فرماتے ہیں۔ اور میرک کے مطابق دیگر محدثین نے بھی اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

چنانچہ شرح السنہ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس روایت ''**لا یتطوع امام فی مکانہ**'' کا مرفوع ہونا ثابت ہے اور نہ ہی صحیح ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ''جو اتباع سنت میں بہت مشہور تھے'' فرائض کی جگہ کھڑے ہو کر نوافل ادا کر لیا کرتے تھے، قاسم بن محمد کا بھی یہی عمل تھا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک ضعیف حدیث میں اس حدیث کی تائید ان الفاظ سے بھی وارد ہوئی ہے:۔

''**یعجز احدکم ان یتقدم او یتأخر او عن یمینہٖ او عن شمالہ فی الصلاۃ**''۔

نیز مسلم شریف کی مندرجہ ذیل روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

''**امرنا رسول اللہ ﷺ ان لا نوصل صلاۃً بصلاۃ حتّٰی نتکلم او نخرج**''۔

٩٥٤: **وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَضَّهُمْ عَلَى الصَّلَاةِ وَنَهَاهُمْ اَنْ يَنْصَرِفُوْا قَبْلَ انْصِرَافِهٖ مِنَ الصَّلَاةِ** ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ١/ ٤١٢ حديث رقم ٦٢٤۔ وأحمد في المسند ٣/ ٢٤٠۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کو نماز کی ترغیب دیتے تھے اور ان کو اس بات سے منع کرتے تھے کہ وہ نماز کے بعد آپ ﷺ کے اٹھنے سے قبل اٹھیں (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث میں نبی ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اپنے واپس جانے سے پہلے لوٹنے سے منع فرمایا جس کی علت بیان کرتے ہوئے علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دراصل اس زمانے میں خواتین بھی نبی ﷺ کے ساتھ باجماعت نماز میں شریک ہوتی تھیں ان کے احترام میں اور بے پردگی سے بچنے کیلئے یہ حکم دیا گیا تاکہ وہ اطمینان سے مسجد سے جا سکیں۔ خود نبی ﷺ اپنی جگہ پر تشریف فرما رہتے اور عورتوں کے جا چکنے کے بعد پہلے نبی ﷺ اٹھتے اور ان کے بعد صحابہ کرامؓ اٹھتے۔

میرک فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں انصراف سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب تک میں سلام پھیر کر نماز سے فارغ نہ جاؤں تم نماز سے فارغ نہ ہوا کرو اور بندہ ضعیف کی رائے کے مطابق انصراف سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ مسبوق امام کے سلام کے کہنے سے پہلے کھڑا نہ ہو جائے کیونکہ ایسا کرنا ہمارے نزدیک حرام ہے۔

الفصل الثالث:

تشہد کے بعد رسول اللہ ﷺ کی دُعا

۹۵۵: وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ اَوْسٍؓ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِىْ صَلَاتِهٖ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْاَلُكَ الثَّبَاتَ فِى الْاَمْرِ وَالْعَزِيْمَةَ عَلَى الرُّشْدِ وَاَسْاَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ وَحُسْنَ عِبَادَتِكَ وَاَسْاَلُكَ قَلْبًا سَلِيْمًا وَلِسَانًا صَادِقًا وَاَسْاَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ ۔ (رواه النّسائی وروى احمد نحوه)

أخرجه النسائي في السنن ٤/٥٤ حديث رقم ١٣٠٤ ـ وأحمد في المسند ٤/١٢٣ ـ

ترجمہ: حضرت شداد بن اوسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی نماز میں یہ دعا پڑھتے تھے: اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْاَلُكَ ...... اے اللہ میں تجھ سے دین میں ثابت قدمی اور راہ راست کے قصد کا سوال کرتا ہوں۔ اور میں تجھ سے تیری نعمت کے شکر اور تیری عبادت کے حسن کی درخواست کرتا ہوں اور تجھ سے قلب سلیم اور سچی زبان مانگتا ہوں اور تجھ سے وہ بھلائی چاہتا ہوں جس کو تو جانتا ہے اور اس برائی سے پناہ مانگتا ہوں جس کو تو جانتا ہے اور معافی مانگتا ہوں ان گناہوں سے جن کو تو جانتا ہے۔ (احمد۔ نسائی)

عزیمت سے کیا مراد ہے؟

عزیمت عزم کی طرح ہے جس کا معنی ہے کسی کام پر دل کو مضبوطی سے جمالینا اس حدیث میں ثابت قدمی کو عزیمت پر مقدم کیا گیا ہے گو کہ دلی ارادہ اور عمل نفس فعل پر مقدم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل مقصود بالذات دلی ارادہ نہیں بلکہ ثابت قدمی ہے کیونکہ نتیجہ کار بہرحال رتبے میں مقدم ہوتا ہے گو کہ وجود میں مؤخر ہی ہو۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں قلب سلیم کی جو دعا مانگی گئی ہے اس سے مراد عقائد فاسدہ اور خواہشات نفسانی کی طرف جھکاؤ سے حفاظت ہے کیونکہ یہ قلبی امراض میں شمار ہوتے ہیں اور انسان کو دلی اور قلبی طور پر صحیح اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جبکہ وہ زیور علم اور اخلاق حسنہ سے مزین ہو یا یہ مراد بھی ہو سکتا ہے کہ میرا دل دھوکہ، کینہ، اخلاقِ رذیلہ اور کمینہ خصلتوں اور عادتوں سے پاک صاف ہو یا یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ میرا دل اپنے مولیٰ کے احکام کے تابع اور فرمانبردار ہو یا یہ کہ وہ ماسوی اللہ سے بالکل خالی ہو۔

۹۵۶: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ فِىْ صَلَاتِهٖ بَعْدَ التَّشَهُّدِ اَحْسَنُ الْكَلَامِ كَلَامُ اللّٰهِ وَاَحْسَنُ الْهَدْىِ هَدْىُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔ (رواه النسائی)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول کریم ﷺ نماز کے دوران تشہد کے پڑھنے کے بعد فرماتے تھے سب سے بہتر کلام اللہ کا کلام اور سب سے بہتر ہدایت محمد (ﷺ) کی ہدایت ہے۔

تشریح: اس حدیث میں کلام اللہ اور نبی ﷺ کی سیرت کی جو مدح سرائی کی گئی ہے درحقیقت وہ خود اللہ تعالیٰ اور نبی ﷺ کی مدح سرائی ہے اس اعتبار سے یہ معنیً تسبیح وذکر اور نبی ﷺ پر درود ہے اس سے وہ اشکال بھی دور ہو گیا جو اس مقام ان پر علماء کیلئے باعث اشکال بنتا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ ذکر ودعا کے علاوہ جو کلام بھی نماز کے دوران انسان کے منہ سے نکلے اس سے نماز باطل ہو جاتی ہے اس لئے کہ اس صورت میں ہمارا یہ کہنا ہے کہ اعتبار معانی کا ہوتا ہے الفاظ کا نہیں۔ اسلئے ہمارے علماء کرام فرماتے ہیں کہ اگر کسی آدمی کو نماز کے دوران یہ بات پتہ چلی کہ فلاں آدمی کا انتقال ہو گیا ہے اور اس نے ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھ لیا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی کیونکہ معنی کے اعتبار سے یہ کہنے والے کا جواب ہے اگرچہ الفاظ قرآن کے ہیں۔

علماء کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ تشہد کے بعد نماز کے دوران کوئی ایسی دعا نہ مانگے جس کی درخواست مخلوق سے بھی کی جاسکتی ہو، چنانچہ اگر کسی آدمی نے یہ دعا کی کہ اے اللہ مجھے مال یا لونڈی عطا فرما تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی ہاں اگر کسی نے یہ دعا کی ''اللھم اغننی وزوجنی الحور العین'' تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی۔

سلام پھیرنے کی کیفیت

۹۵۷: وَعَنْ عَائِشَةَ ؓ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَلِّمُ فِي الصَّلَاةِ تَسْلِيْمَةً تِلْقَاءَ وَجْهِهٖ ثُمَّ يَمِيْلُ إِلَى الشِّقِّ الْاَيْمَنِ شَيْئًا۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ۲/ ۹۰حديث رقم ۲۹٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک سلام پھیرتے تھے سامنے کی طرف پھر تھوڑا رخ دائیں طرف کو پھیرتے۔ (ترمذی)

سلام کا جواب

۹۵۸: وَعَنْ سَمُرَةَ ؓ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَرُدَّ عَلَى الْاِمَامِ وَنَتَحَابَّ وَاَنْ يُّسَلِّمَ بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ۔ (رواہ ابوداؤد)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/ ٦۰۹حديث رقم ۱۰۰۱۔وأخرجه ابن ماجه ۱/ ۲۹۷حديث رقم ۹۲۲۔ في المخطوطة "الرد"۔ في المخطوطة "بالتسليمة"۔

ترجمہ: حضرت سمرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم سلام پھیرتے وقت امام کے سلام کے جواب کی نیت کریں۔ ہم آپس میں محبت رکھیں اور ایک دوسرے کو سلام کریں۔ (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد جب ہم سلام پھیریں تو اپنے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نیت کریں اور جو ہم سے آگے ہیں ان کی بھی نیت کریں۔

علامہ طیبی ؒ فرماتے ہیں کہ امام کے سلام کا مقتدی جواب دیں اس سے مراد یہ نہیں کہ مقتدی بھی وہی کہیں جو امام نے

کہا ہے جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ مقتدی تین مرتبہ سلام کہے ایک مرتبہ تو اپنے چہرے کو سامنے کے رخ پر دائیں جانب ذرا سا مائل کر کے سلام پھیرے تا کہ نماز سے نکل جائے دوسرا سلام امام کے جواب میں اور تیسرا سلام ان لوگوں کیلئے جو امام کی بائیں جانب ہیں۔

محبت سے کیا مراد ہے؟

اس حدیث میں جس محبت کا ذکر ہے اس سے مراد نمازیوں اور تمام مسلمانوں سے محبت ہے جس کی صورت یہ ہے کہ ہر شخص اخلاق حسنہ، اعمال صالحہ، اقوال صادقہ اور نصائح خالصہ کا مظاہرہ کرے جس سے آپس میں محبت پیدا ہو سکے۔

''قولہٗ و ان یسلم بعضنا علی بعض'':

اس سلام سے مراد نماز والا سلام ہے جس کی دلیل مسند بزار کی روایت کے الفاظ ہیں:

''و ان نسلم علٰی ائمتنا و ان یسلم بعضنا علٰی بعض فی الصلاۃ''۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ نمازی اپنے دائیں بائیں موجود انسانوں اور فرشتوں کی نیت سے سلام پھیرے۔ ہمارے بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے جسے لوگوں نے ترک کر دیا ہے تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ اس سلام کو خارج صلوٰۃ پر محمول کیا جائے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ عطف ''الخاص علی العام'' کے قبیل سے ہے کیونکہ محبت کا مفہوم زیادہ عام ہے سلام کی نسبت۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی سند پر بحث کرتے ہوئے متردد ہیں اور فرماتے ہیں کہ سنداً یہ حدیث حسن یا صحیح ہے امام ابوداؤد کے علاوہ اس روایت کو امام محمد اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اس روایت کو نقل کرتے ہوئے اس کی تحسین فرمائی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز سے پہلے اور بعد میں بھی چار چار رکعتیں پڑھتے تھے۔ اسی طرح عصر کی نماز سے پہلے بھی آپ چار رکعتیں پڑھتے تھے اور ہر دو رکعتوں کے درمیان ملائکہ مقربین، انبیاء کرام اور دیگر مؤمنین پر سلام پڑھتے تھے لیکن بظاہر یہ حدیث کلمات تشہد میں پڑھے جانے والے سلام پر محمول ہے جس میں یوں کہا جاتا ہے: ''السلام علینا و علٰی عباد اللّٰہ الصلحین'' کیونکہ اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ نماز سے نکلنے والے سلام میں انبیاء کرام کی نیت نہیں کی جاتی۔

بَابُ الذِّكْرِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ

نماز کے بعد ذکر کا بیان

الفصل الاوّل:

نماز کے آخر میں تکبیر کہنا

۹۵۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ كُنْتُ اَعْرِفُ انْقِضَاءَ صَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِالتَّكْبِيْرِ. (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٣٢٥۔حديث رقم ٨٤٢۔ومسلم في صحيحه ١/٤١٠حديث رقم (١٢٠۔٥٨٣) وأبوداوٗد في السنن ١/٦٠٩حديث رقم ١٠٠٢۔والنسائي ٣/٦٧حديث رقم ١٣٣٥۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کے ختم ہونے کو تکبیر سے معلوم کر لیتا تھا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: اس حدیث میں تکبیر سے مراد یہ ہے کہ نبی ﷺ نماز سے فارغ ہو کر ''اللہ اکبر'' کہا کرتے تھے۔ اشرف کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ تکبیر ہے جو نبی ﷺ کے بعد از نماز معمولات میں شامل تھی، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ اسی صورت میں صحیح ہوسکتا ہے جبکہ حضرت ابن عباسؓ جو کہ راوی حدیث ہیں۔ نبی ﷺ سے دور ہوں اور تکبیر کے علاوہ آپ ﷺ کی آواز زیادہ بلند نہ ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کلمات تسبیح میں نبی ﷺ پہلے ''اللہ اکبر'' ہی فرماتے ہوں۔ چنانچہ ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ ''وسبحان الله، الحمد لله، الله اكبر'' میں سے جس سے بھی ابتداء کر لے۔ صحیح ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب نماز میں نبی ﷺ ایک رکن اور ہیئت سے دوسرے رکن اور ہیئت کی طرف منتقل ہوتے ہوئے تکبیر کہتے تو میں اسے سن کر اندازہ کر لیتا تھا کہ اب نبی ﷺ کسی رکن میں ہیں! لیکن یہ تاویل ترجمۃ الباب کے خلاف ہے کیونکہ اس میں نماز کے بعد ذکر کا عنوان باندھا گیا ہے۔

سید جمال الدین فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں تکبیر کی آواز آنا بند ہو جانے پر یہ سمجھ لیتا تھا کہ بس اب نماز ختم ہونے والی ہے کیونکہ نماز کا اختتام تو ''سلام'' پر ہوتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کے دربار سعادت میں فرض نماز سے فراغت کے بعد بلند آواز سے ایک مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہنے کا رواج تھا، جسے امام شافعی رحمہ اللہ نے اس بات پر محمول فرماتے ہیں کہ مقتدیوں کو تعلیم دینا مقصود تھا کہ نماز سے فراغت کے بعد بھی اللہ کی کبریائی کا ترانہ بلند کرنا چاہیے۔

یاد رہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ اسے ''تعلیم'' پر محمول اس لئے فرماتے ہیں کہ خود قرآن کریم میں بلند آواز سے ذکر کی ممانعت آئی ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ''ولا تجهر بصلاتك''۔

صحیحین کی روایت کے مطابق یہ آیت دعاء کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جبکہ امام بیہقی رحمہ اللہ آہستہ آواز سے ذکر کرنے

کے مطلوب ہونے پر صحیحین کی اس روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں جس کے مطابق نبی ﷺ نے صحابہ کرام علیہم الرضوان کو بلند آواز سے تہلیل وتکبیر کی ممانعت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم کسی بہرے یا غائب خدا کو نہیں پکار رہے (جو کہیں موجود ہو اور کہیں نہ ہو) وہ تو تمہارے ساتھ ہے، اور سنتا ہے اور انتہائی قریب ہے۔

اذکار وادعیہ میں جہر کے مواقع:

ویسے تو اکثر اذکار وادعیہ میں مسنون طریقہ ہی ہے کہ انہیں سرًا اور آہستہ آواز میں کہا جائے لیکن چند مواقع ایسے بھی ہیں جہاں بلند آواز سے ذکر ودعا مستحب ہے، جن میں سے چند ایک حسبِ ذیل ہیں:

① تلبیہ۔ ② قنوت نازلہ۔ ③ عیدین کی راتوں میں تکبیرات تشریق۔ ④ دس ذی الحجہ کو قربانی کے جانور دیکھ کر۔ ⑤ سورۃ الضحیٰ سے آخر قرآن تک ہر دو سورتوں کے درمیان۔ ⑥ اونچی جگہ پر چڑھتے ہوئے اور ٹیلوں و بلند جگہوں سے اترتے ہوئے۔

فرض نماز کے بعد بیٹھنے کی مقدار

۹۶۰: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَلَّمَ لَمْ يَقْعُدْ اِلَّا مِقْدَارَ مَا يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَاذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤١٤/١ حديث رقم (١٣٦-٥٩٢) وأبو داؤد في السنن ١٧٦/٢ حديث رقم ١٥١٢ والترمذي في السنن ٩٥/١ حديث رقم ٢٩٨ والنسائي ٦٩/٣ حديث رقم ١٣٣٨ وابن ماجه ٢٩٨/١ حديث رقم ٩٢٤ والدارمي ٣٥٨/١ حديث رقم ١٣٤٧ ۔ في المخطوطة "السلام"۔ في المخطوطة "يعرفه" في المخطوطة "فاحينا"۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سلام پھیرتے تھے تو اس کے بعد صرف اس دعا کے بقدر بیٹھتے تھے۔ اللھم انت السلام الخ۔ اے اللہ تو سالم ہے تمام عیوب سے اور سلامتی تیری طرف سے ہے تو برکت والا ہے۔ اے بزرگی اور بخشش والے۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں فرض نماز سے وہ فرض نماز مراد ہے جس کے بعد سنتیں ہوں اسلئے کہ صحیح روایات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ نبی ﷺ نماز فجر ادا فرمانے کے بعد طلوع آفتاب تک اپنی جائے نماز پر تشریف فرما رہتے تھے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے جو روایت عنقریب نقل ہوگی اس سے نماز فجر اور نماز عصر کے بعد طلوع وغروب آفتاب تک فضیلت واستحبابِ ذکر معلوم ہوتا ہے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات نبی ﷺ تھوڑی دیر اپنے مصلّے پر بیٹھے رہتے تھے اور بعض اوقات سلام پھیرتے ہی اُٹھ جاتے تھے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ اس دعا کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سلامتی کی ابتدا بھی آپ ہی سے ہوتی ہے اور کسی چیز کو وجود اور عدم کی کیفیت سے متصف ہونے کرنے کی دونوں حالتوں میں لوٹی بھی آپ کی طرف ہے اور اس کی وجہ واضح ہے کہ سلامتی کے ساتھ عرف عام میں اس شخص کو موصوف سمجھا جاتا ہے جسے آفت ومصیبت آسکتی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ معنی ذات وصفات

باری تعالیٰ میں متصور بھی نہیں ہوسکتا اسلئے یہاں سلام سے مراد وہ ذات ہے جو سلامتی بخشے اور مصائب وآفات سے حجاب بن جائے۔ شیخ جذری رحمۃ اللہ علیہ "تصحیح المصابیح" میں فرماتے ہیں کہ بعض حضرات اس دعا میں جو ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں۔ "والیك یرجع السلام حیّنا ربنا بالسلام وادخلنا دار السلم" سند کے اعتبار سے اس کی کوئی اصل نہیں بلکہ بعض قصہ گو افراد نے اسے اپنے پاس سے گھڑ لیا ہے۔

٩٦١: وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا انْصَرَفَ مِنْ صَلَاتِهٖ اِسْتَغْفَرَ ثَلَاثًا وَقَالَ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٤١٤ حديث رقم (١٣٥-٥٩١)۔ والدارمي ١/٣٥٨ حديث رقم ١٣٤٨۔ وأحمد في المسند ٥/٢٧٥۔

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنی نماز سے فارغ ہو جاتے تو تین مرتبہ استغفار کرتے تھے۔ اور پھر یہ دعا پڑھتے: اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔

تشریح: اس حدیث میں نماز سے فراغت کے بعد نبی ﷺ کے جس استغفار کا ذکر ہے اس سے مراد یہ ہے کہ نبی ﷺ نماز سے فارغ ہو کر تین مرتبہ استغفر اللہ فرمایا کرتے تھے جیسا کہ حصن حصین میں ہے اور اس استغفار کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ نبی ﷺ اطاعتِ رب میں کسی قسم کی کوتاہی خیال فرماتے ہوں (حالانکہ یہ بات ہر قسم کے شک وشبے سے بالاتر ہے کہ نبی ﷺ جیسی نماز پڑھنا تو بڑی دور کی بات ہے اس کی ایک رکعت کے کروڑویں حصے تک بھی امت کا کوئی بڑے سے بڑا فرد اور ولی نہیں پہنچ سکتا) تاہم یہ بات مشہور ہے "حسنات الابرار سیأت المقربین"۔

حضرت رابعہ بصریہ رحمہم اللہ کا یہ قول بھی اسی کے قریب قریب ہے کہ "استغفارنا یحتاج الی استغفار کثیر"۔

فرض نماز کے بعد کی دُعا

٩٦٢: وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَؓ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ مَكْتُوْبَةٍ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اَللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٣٢٥۔ حديث رقم ٨٤٤۔ ومسلم في صحيحه ١/٣٤٧ حديث رقم(٢٠٥-٤٧٧)۔ وأبوداؤد في السنن ٢/١٧٢ حديث رقم ١٥٠٥۔ والترمذي ٢/٩٦ حديث رقم ٢٩٩۔ والنسائي في السنن ٣/٧٠ حديث رقم ١٣٤١۔ وابن ماجه ١/٢٨٤ حديث رقم ١٣٤٩ والدارمي ١/٣٥٩ حديث رقم ١٣٤٩۔ وأحمد في المسند ٣/١٧۔

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرض نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے۔ لا الٰہ الا اللہ الخ۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہت ہے اور اسی کے لئے ہر قسم کی تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ جو چیز تو نے عطا کی ہے اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے اور جس چیز کو تو

نے روکا ہے اس کو کوئی دینے والانہیں ہے اور مال دار کو اس کا مال تیرے عذاب سے بچانے والا نہیں ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: اس حدیث میں جس ذکر کا تذکرہ کیا گیا ہے اسے ہر فرض نماز کے بعد پڑھنا چاہئے۔ چاہے فرضوں کے فوراً بعد یا سنتوں سے فارغ ہونے کے بعد۔

اس حدیث کی تخریج شیخین نے کی ہے جبکہ میرک نے تصحیح سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اسے امام ابوداؤد، اور نسائی نے نیز بزار نے حضرت جابر اور حضرت ابن عباس کے حوالے سے اور طبرانی نے ابن عباس کے حوالے سے اس روایت کو نقل کیا ہے اور مؤخر الذکر دونوں حضرات نے ''وله الحمد'' کے بعد ''يحيي ويميت'' کا بھی اضافہ کیا ہے اور عبد بن حمید نے ''لما اعطيت'' کے بعد ''ولا راد لما قضيت'' کا بھی اضافہ کیا ہے۔

٩٦٣: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَلَّمَ مِنْ صَلَاتِهٖ يَقُوْلُ بِصَوْتِهِ الْاَعْلٰى لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ لَا نَعْبُدُ اِلَّا اِيَّاهُ لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٤١٦ حديث رقم (١٣٩ـ٥٩٤)ـ وأبوداؤد ٢/١٧٣ حديث رقم ١٥٠٦ والنسائي ٣/٧٠ حديث رقم ١٣٤٠ـ وأحمد في المسند ٤/٥ـ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز سے فارغ ہو جاتے تھے تو بلند آواز سے یہ دعا پڑھتے تھے: لا الٰہ الا اللہ ...... اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ بادشاہت اسی کے لئے ہے اور اسی کے لئے ہر قسم کی تعریف ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور گناہوں سے باز رہنے اور نیکی کرنے کی قوت صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے۔ اللہ ہی کی طرف سے نعمت ہے۔ اور اللہ ہی کے لئے بزرگی ہے۔ اور ہر قسم کی اچھی تعریف اللہ ہی کے لئے ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ہم خالص اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔ اگرچہ کافر اس کو برا سمجھیں۔ (مسلم)

نماز کے بعد جن چیزوں سے پناہ مانگی گئی

٩٦٤: وَعَنْ سَعْدٍ اَنَّهٗ كَانَ يُعَلِّمُ بَنِيْهِ هٰؤُلَآءِ الْكَلِمَاتِ وَيَقُوْلُ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَتَعَوَّذُ بِهِنَّ دُبُرَ الصَّلَاةِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْقَبْرِ۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ١١/١٧٤ـ حديث رقم ٦٣٦٤ـ ومسلم ٤/٢٠٨٠ حديث رقم (٥٢ـ٢٧٠٦)ـ والترمذي في السنن ٥/٥٣٥ حديث رقم ٣٥٦٧ـ والنسائي ٨/٢٧١ حديث رقم ٥٤٩٦ـ وابن ماجه ٢/١٢٦٣ حديث رقم ٣٨٤٤ وأحمد في المسند ١/١٨٦ـ في المخطوطة "في"ـ

ترجمہ: حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ وہ اپنی اولاد کو یہ کلمات سکھاتے تھے اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے

بعدان کلمات کے ساتھ پناہ مانگتے تھے۔اللھم انی اعوذ الخ۔اے اللہ میں بزدلی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔اور بخل سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔گھٹیا عمر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔دنیا کے فتنہ اور عذاب قبر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔(بخاری)

تشریح:''اس حدیث میں جن چیزوں سے پناہ مانگی گئی ہے ان میں سے ایک بخل بھی ہے یعنی مال، علم یا کسی اور چیز کے ذریعے لوگوں کو فائدہ پہنچانے سے رکنا۔علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات سخاوت نفس سے ہوتی ہے اسے شجاعت کہا جاتا ہے جس کے مقابلے میں جبن آتا ہے اور بعض اوقات مال کے ذریعے اسے سخاوت کہا جاتا ہے جس کے مقابلے میں بخل آتا ہے یہ دونوں صفات یعنی شجاعت اور سخاوت اس انسان میں جمع ہوتی ہیں جو کامل ہو اور یہ دونوں جس شخص سے رخصت ہو جائیں وہ نفس کی انتہائی اور آخری کھائی میں جا گرتا ہے۔

ارذلِ عمر سے کیا مراد ہے؟

ارذلِ عمر سے مراد ایسا بڑھاپا ہے جس میں انسان کی عقل کام کرنا چھوڑ دے اعضاء اور جسمانی قوتیں کمزور پڑ جائیں۔یہ حصہ انسان کی عمر کا بدترین حصہ اس لئے کہلاتا ہے کہ زندگی کا اصل مقصد احسانات وانعاماتِ الٰہیہ میں غور وفکر کرنا ہوتا ہے پھر ان انعامات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا بھی زندگی کا ایک بڑا مقصد ہے لیکن وہ عمر کے اس حصے میں آ کر فوت ہو جاتا ہے اور انسان میں اس کی ادائیگی کی طاقت نہیں رہتی۔

نماز کے بعد تسبیح

۹۶۵:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ اِنَّ فُقَرَاءَ الْمُهَاجِرِيْنَ اَتَوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا قَدْ ذَهَبَ اَهْلُ الدُّثُوْرِ بِالدَّرَجَاتِ الْعُلٰى وَالنَّعِيْمِ الْمُقِيْمِ فَقَالَ وَمَا ذَاكَ قَالُوْا يُصَلُّوْنَ كَمَا نُصَلِّيْ وَيَصُوْمُوْنَ كَمَا نَصُوْمُ وَيَتَصَدَّقُوْنَ وَلَا نَتَصَدَّقُ وَيُعْتِقُوْنَ وَلَانُعْتِقُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَفَلَا اُعَلِّمُكُمْ شَيْئًا تُدْرِكُوْنَ بِهٖ مَنْ سَبَقَكُمْ وَتَسْبِقُوْنَ بِهٖ مَنْ بَعْدَكُمْ وَلَا يَكُوْنُ اَحَدٌ اَفْضَلَ مِنْكُمْ اِلَّا مَنْ صَنَعَ مِثْلَ مَاصَنَعْتُمْ قَالُوْا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ تُسَبِّحُوْنَ وَتُكَبِّرُوْنَ وَتَحْمِدُوْنَ دُبُرَكُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ مَرَّةً قَالَ اَبُوْصَالِحٍ فَرَجَعَ فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِيْنَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا سَمِعَ اِخْوَانُنَا اَهْلُ الْاَمْوَالِ بِمَا فَعَلْنَا فَفَعَلُوْا مِثْلَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ متفق عليه وَلَيْسَ قَوْلُ اَبِیْ صَالِحٍ اِلَى الْاٰخِرِ اِلَّا عِنْدَ مسلم وفي البخاری تُسَبِّحُوْنَ فِیْ دُبُرِكُلِّ صَلَاةٍ عَشْرًا وَتَحْمِدُوْنَ عَشْرًا وَتُكَبِّرُوْنَ عَشْرًا بَدَلَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ لِلْبُخَارِيِّ۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳۲۵/۲۔حدیث رقم ۸۴۳ ومسلم ۴۱۶/۱حدیث رقم (۱۴۲۔۵۹۵)۔والنسائی ۷۸/۳رقم ۱۳۵۳۔وابن ماجه ۲۹۹/۱حدیث رقم ۹۲۷۔والدارمی ۳۶۰/۱حدیث رقم ۱۳۵۳۔وأحمد فی المسند ۱۹۶/۵۔ فی المخطوطة "أما"۔ فی المخطوطة "الشاكر"۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ فقراء مہاجرین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اے اللہ کے رسول۔ دولت مند لوگ بلند درجات اور دائمی نعمت کو حاصل کرنے میں ہم سے سبقت کر گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یہ کس طرح؟ انہوں نے عرض کیا وہ اسی طرح نماز پڑھتے ہیں جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں اور وہ اسی طرح روزہ رکھتے ہیں جس طرح ہم روزہ رکھتے ہیں اور وہ مال دار ہونے کی وجہ سے صدقات وخیرات کرتے ہیں اور ہم صدقہ خیرات نہیں کر سکتے۔ وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم غلام آزاد نہیں کر سکتے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا میں تم لوگوں کو ایسی بات نہ بتادوں کہ اس پر عمل کر کے تم ان لوگوں کے درجات کو پہنچ جاؤ گے جو تم سے پہلے اسلام لا چکے ہیں اور ان لوگوں کے درجات سے بڑھ جاؤ گے جو تمہارے بعد پیدا ہوں گے۔ اور کوئی آدمی تم سے اچھا نہیں ہوگا سوائے اس آدمی کے جو تمہارے جیسا عمل کریں۔ فقراء مہاجرین نے عرض کیا بہتر ہے اے اللہ کے رسول فرمایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ ہر نماز کے بعد۔ سبحان اللہ۔ ۳۳ مرتبہ۔ اللہ اکبر۔ ۳۳ مرتبہ۔ الحمد للہ۔ ۳۳ مرتبہ۔ پڑھا کرو اس حدیث کے ایک راوی حضرت ابو صالح فرماتے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد پھر فقراء مہاجرین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اے اللہ کے رسول۔ ہمارے دولت مند بھائیوں نے ہمارے عمل کا حال سنا تو ہمارے عمل جیسا عمل کرنا شروع کر دیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جس کو چاہے اپنا فضل عطا کرے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: اس حدیث کی تشریح میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''**ويصومون كما نصوم**'' کے بعد ''**ويجاهدون كما نجاهد ويزيدون علينا لانهم يتصدقون ونحن لا نتصدق**'' کا اضافہ بھی نقل کیا ہے جس سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ ''**ويجاهدون كما نجاهد**'' بھی حدیث کا حصہ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فقراء مہاجرین کو ایسے کلمات کی تعلیم ارشاد فرمائی کہ جو لوگ ان اذکار و کلمات کو ادا نہ کریں ان پر فضیلت حاصل ہو جائے اس اعتبار سے بعدیت سے مراد رتبۃً بعد میں ہونا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ سبقت لے جانے والوں کو پالینا اور بعد والوں سے آگے بڑھ جانا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارک کی برکت کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ یہ لوگ اس قرن اور زمانے میں تھے جو سب سے بہترین شمار کیا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں بعد میں آنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان آنے والے صحابہ کرام کے بعد اسلام قبول کر لیا یا وہ ان کے زمانے کے بعد آئے کہ ان لوگوں کو یہ ثواب حاصل نہ ہوگا جو ان فقراء مہاجرین کو حاصل ہوگا۔

اس مقام پر میرک نے یہ اعتراض اور سوال اٹھایا ہے کہ بعد میں آنے والوں کو یہ ثواب کیوں حاصل نہیں ہو سکتا؟ پھر خود ہی اس کا جواب دیا کہ ''**الا من صنع مثل ما صنعتم**'' وہ اس سے مستثنیٰ کر کے یہ بات واضح کر دی گئی کہ یہ ثواب بعد میں آنے والوں کو بھی حاصل ہو سکتا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ کئی جملوں کے بعد آنے والا استثناء ان میں سے ہر ہر جملے کی طرف لوٹ سکتا ہے اور وہ ہر جملے کیلئے مستثنیٰ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اس صورت میں ''**الا من صنع**'' کا مطلب یہ ہوگا ''**الا الغنی الذی یسبح**''۔

ہاں اگر ہم یہ کہیں کہ استثناء کا تعلق پہلے جملے سے بھی ہے تو پھر قطعیت کے ساتھ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مالدار ہی افضل ہے کیونکہ اس صورت میں حدیث کا معنی یہ ہوگا کہ اگر تم نے میرے کہنے کے مطابق عمل کیا تو تم اپنے سے آگے بڑھ جانے والوں کو پالو گے لیکن ان میں سے کوئی بھی آدمی اسی طرح کرنے لگے جس طرح تم کر رہے ہو تو تم انہیں نہیں پا سکو گے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر مالدار بھی تسبیح وتکبیر اور کلمات تحمید کہنے لگے تو وہ پھر آگے بڑھ جائیں گے اور فقراء پھر پیچھے رہ جائیں گے تو فقراء کی اصل شکایت پھر بھی باقی رہے گی اس کا جواب یہ ہے کہ ان فقراء مہاجرین صحابہ کا اصل مقصد اور منشاء بلند درجات اور جنت کی دائمی نعمتوں کا اپنے لئے حصول تھا دوسرے مالدار صحابہ کرام کیلئے اس میں مطلقاً اضافے کی نفی نہ ان کی خواہش تھی اور نہ ان کی تمنا۔ یہیں سے یہ بات بھی معلوم کہ شکر گزر مالدار کا درجہ صبر کرنے والے فقیر سے زیادہ افضل اور اونچا ہے جیسا کہ علامہ کرمانی نے شرح بخاری میں تحریر فرمایا ہے لیکن یہ جواب محل نظر ہے۔ کیونکہ "فرجع فقراء المهاجرين" کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ ان کا مقصود مالداروں سے مطلقاً اپنی برتری ہی تھی ورنہ اس سوال کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی کیونکہ اعمال صالحہ سے بلند درجات کا حصول ہونا قانون الٰہی کے مطابق ہوتا ہی ہے اور یہی مقصد ہوتا تو پھر سوال کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

افضلیت سے کیا مراد ہے؟

اس موقع پر علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ "لا يكون احد افضل منكم" میں افضلیت سے کیا مراد ہے بالخصوص جبکہ "او من صنع مثل ما صنعتم" بھی فرمایا گیا ہے؟ کیونکہ افضلیت تو اضافے کا تقاضا کرتی ہے اور مثلیت مساوات کا، ظاہر ہے کہ برابری اور اضافہ کبھی جمع نہیں ہو سکتے؟ سو یہ حدیث مندرجہ ذیل شعر کے قبیل سے ہے۔

وبلدة ليس بها انيس ☆ الا اليعافير والا العيس

یعنی اگر فرض کر لیا جائے کہ مثلیت بھی افضلیت کا تقاضا کرتی ہے تو تمہیں بھی افضلیت حاصل ہو جائے گی حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ مثلیت افضلیت کا تقاضا نہیں کرتی لہٰذا تم میں سے بھی کوئی اگر یہ عمل کرے گا تو کوئی شخص تم سے افضل نہ ہوگا۔ یہ تقریر تمیمی کے مذہب کے مطابق ہے۔

اور اس حدیث کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یوں تو تم لوگوں سے کوئی افضل نہیں ہو سکے گا لیکن سوائے ان لوگوں کے کہ وہ تمہارے برابر ہوں گے۔

۳۳ کے عدد سے کیا مراد ہے؟

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان اذکار کو ۳۳ مرتبہ پڑھنے کی جو ترغیب دی گئی ہے، اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ تسبیح تکبیر اور تحمید تینوں کو صرف ۳۳ مرتبہ پڑھنا ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ۳۳، ۳۳ مرتبہ پڑھا جائے۔ دوسری احادیث کی روشنی میں یہی دوسرا قول زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے تاہم پہلے قول کی تائید بخاری شریف کی ایک روایت سے ہوتی ہے جس میں ہر کلمہ دس مرتبہ پڑھنے کا ذکر ہے، گو کہ زیادہ بہتر یہی ہے کہ اگر پہلے قول ہی کی تائید کرنا مقصود ہو تو

صحیح مسلم کی اس روایت سے استدلال کیا جائے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس میں ہر کلمہ گیارہ مرتبہ پڑھنے کا ذکر ہے تا کہ ۳۳ کا عدد پورا ہو جائے۔ بخاری شریف کی روایت سے یہ عدد پورا نہیں ہوتا۔

غنی شاکر اور فقیر صابر میں افضل کی تعیین:

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غنی شاکر، فقیر صابر کی نسبت زیادہ افضل ہے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ مالدار کے بارے میں ایک گونہ خطرہ لاحق رہتا ہے اور فقیر کے بارے میں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب احیاء العلوم میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس مسئلے میں حضرات صوفیاء کا اختلاف ہے، حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، خواص اور اکثر صوفیاء کرام کی رائے یہ ہے کہ مقام فقر افضل ہے۔ جبکہ ابن عطاء فرماتے ہیں کہ وہ غنی شاکر جو اداءِ حقوق کا مکمل اہتمام رکھتا ہو، وہ فقیر صابر سے زیادہ افضل ہے، لیکن ابن عطاء کی اس رائے پر شیخ الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی ناراضگی کا اظہار کیا ہے حتی کہ بعض حضرات کی رائے کے مطابق تو ابن عطاء، شیخ کی اس مخالفت اور ان کی ناراضگی کی وجہ سے تکالیف اور پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔

بہر حال! اگر فقر اور غناء کو مطلقاً دیکھا جائے تو احادیث و روایات سے ادنی مناسبت رکھنے والا بھی فقر کی فضیلت میں شک نہیں کر سکتا۔ البتہ یہاں کچھ تفصیل ہے جسے جاننا ضروری ہے تا کہ یہ مسئلہ مکمل طور پر واضح ہو جائے۔

شک وہ جگہ پر ہو سکتا ہے: ① وہ فقیر صابر جو طلبِ مال کا حریص نہ ہو بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے پر قانع اور راضی رہے جبکہ دوسری طرف ایک ایسا مالدار ہو جو اپنے مال کو نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہو اور اس کے اپنے پاس مال جمع کر کے رکھنے کی حرص نہ ہو۔ ② وہ فقیر جو حریص ہو اور وہ مالدار جو حریص ہو۔

اب اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ قناعت پسند فقیر اس غنی سے افضل ہے جو حریص بھی اور مال کو جمع کر کے رکھتا ہو اسی طرح وہ مالدار آدمی جو اپنا مال نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہو وہ اس فقیر سے افضل ہے جو حریص اور لالچی ہو۔ پہلی صورت کے بارے میں یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ غنی فقیر کی نسبت افضل ہو کیونکہ مال کی حرص کم ہونے میں دونوں برابر ہیں جبکہ مالدار میں ایک اضافی چیز صدقات و خیرات کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کرنا ہے جس سے فقیر عاری اور عاجز ہے۔ ہمارے خیال کے مطابق یہی وہ چیز ہے جو ابن عطاء کے ذہن میں آئی اور انہوں نے مذکورہ قول اختیار کیا۔

رہا وہ مالدار آدمی جو اپنے مال و دولت سے خود فائدہ اٹھاتا ہو گو کہ مباح کاموں ہی میں ہو اس کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ فقیر قانع پر فضیلت رکھتا ہوگا اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ کچھ فقراء صحابہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ شکایت لے کر آئے کہ مالدار لوگ خیرات و صدقات اور حج و جہاد کے ذریعے ہم پر سبقت لے جاتے ہیں جبکہ ہم مال نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام نہیں کر سکتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں چند کلمات تسبیح کے سکھا دیئے اور فرمایا اس کے ذریعے تمہیں اس بڑھ کر ثواب حاصل ہو جائے گا۔ جو مالداروں کو ملتا ہے۔ بعد میں وہی کلمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مالدار صحابہ کر بھی سکھا دیئے اور وہ بھی یہ کلمات کہنے لگے۔ فقراء صحابہ کو جب معلوم ہوا تو وہ دوبارہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ عرض کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اللہ کا

فضل ہے جسے چاہتا ہے دے دیتا ہے۔

لیکن اس حدیث سے استدلال کرنا محل نظر ہے کیونکہ دوسری احادیث میں بڑی تفصیل سے دوسرا نقطہ نظر ثابت ہوتا ہے کہ تسبیح میں فقراء کا ثواب مالداروں کے ثواب سے بڑھ کر ہے اور یہی ثواب جو انہیں حاصل ہوتا ہے ان کی کامیابی اور اللہ کا فضل ہے۔ چنانچہ زید بن اسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ ایک مرتبہ فقراء صحابہ نے اپنا ایک نمائندہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ اس نے آ کر عرض کیا یا رسول اللہ میں فقراء کی طرف سے نمائندہ بن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں بھی اور ان لوگوں کو بھی خوش آمدید جن کے پاس سے تم آئے ہو تم ایک ایسی قوم کے پاس سے آئے ہو جس سے اللہ محبت کرتا ہے اس نے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جنت تو یہ مالدار لوگ لے جائیں گے کیونکہ یہ حج کرتے ہیں ہم اس کی طاقت نہیں کرتے، یہ عمرہ کرتے ہیں۔ ہم اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ یہ جب ہمارے ہوتے ہیں تو اپنا مال خرچ کر کے آخرت کیلئے ذخیرہ کر لیتے ہیں۔

یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری طرف سے فقراء کو یہ پیغام پہنچا دو کہ تم میں سے جو شخص صابر رہے گا اور اسے ثواب کی نیت سے اختیار کئے رکھے گا تو اسے تین ایسی چیزیں حاصل ہوں گی جو مالداروں کو حاصل نہ ہونگی۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ جنت میں ایسے بالا خانے بھی ہیں جنہیں اہل جنت اس طرح دیکھیں گے جیسے زمین والے آسمان کے ستاروں کو دیکھتے ہیں ان میں صرف وہ لوگ داخل ہوں گے جو نبی فقیر یا شہید فقیر یا مومن فقیر ہوں گے۔ ② فقراء جنت میں مالداروں سے نصف یوم پہلے داخل ہوں گے۔ نصف یوم سے مراد پانچ سو سال ہیں۔ ③ جب مالدار اللہ کی پاکیزگی یوں بیان کرتا ہے ''**سبحن اللّٰہ والحمد للّٰہ و لا الہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر**'' اور فقیر بھی یہی کلمات کہتا ہے تو مالدار فقیر کے ثواب کو نہیں پہنچتا اگرچہ اس میں دس ہزار درہم بھی خرچ کر دے اور یہی حکم نیکی کے دوسرے تمام اعمال کا ہے۔

وہ نمائندہ یہ بشارتیں سن کر فقراء صحابہ کے پاس پہنچا اور انہیں یہ ساری تفصیلات بتائیں جسے سن کر ان سب نے کہا کہ ہم راضی اور خوش ہیں۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بہر حال! فقیر صابر کا درجہ غنی شاکر سے کہیں زیادہ اونچا ہے اس مسئلے میں اس کے علاوہ کچھ اور اقوال بھی ہیں جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

① کفایت شعاری ان دونوں سے ہی افضل ہے۔

② فقیر شاکر غنی شاکر سے افضل ہے۔

دونوں حالتوں میں اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنا اور سر تسلیم خم کئے رکھنا زیادہ افضل ہے۔ اس وجہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ غنی اور فقر دو سواریاں ہیں مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ میں ان دونوں میں سے جس پر چاہوں سوار ہو جاؤں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''**ان ربك يبسط الرزق لمن يشاء ويقدر انه كان بعباده خبيرا بصيرا**''۔

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اکثر انبیاء، اولیاء اور اصفیاء کیلئے فقر کو منتخب فرمایا ہے اور زیادہ تر اپنے دشمنوں کیلئے

غنی کو اختیار فرمایا ہے اللہ کی نظر میں محبوب بندوں میں سے بہت کم کو مال و دولت کی فراوانی سے نوازا گیا ہے اس لئے یا تو آپ بھی اسی راستے کو اختیار کیجئے جو اللہ کی نظروں میں پسندیدہ ہے یا اپنی مرضی سے کسی راستے کا انتخاب نہ کریں بلکہ اللہ پر چھوڑ دیں۔

٩٦٦: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُعَقِّبَاتٌ لَا يَخِيْبُ قَائِلُهُنَّ اَوْ فَاعِلُهُنَّ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ ثَلَاثٌ وَثَلَاثُوْنَ تَسْبِيْحَةً وَثَلَاثٌ وَثَلَاثُوْنَ تَحْمِيْدَةً وَاَرْبَعٌ وَثَلَاثُوْنَ تَكْبِيْرَةً ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/ ٤١٨ حديث رقم (١٤٥ - ٥٩٦) - والنسائي ٣/ ٧٥ حديث رقم ١٣٤٩ -

ترجمہ: حضرت کعب بن عجرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہر فرض نماز کے بعد پڑھنے کے چند کلمات ہیں جن کا کہنے والا یا فرمایا کہ کرنے والا محروم نہیں ہوتا اور وہ کلمات یہ ہیں۔ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ۔ الحمد للہ ۳۳ مرتبہ۔ اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

کعب بن عجرہ۔ یہ کعب ہیں۔ عجرہ کے بیٹے ہیں خاندانی اعتبار سے ''بلوی'' ہیں۔ کوفہ میں قیام کر لیا تھا۔ ۵۱ھ میں بعمر ۷۵ سال بمقام مدینہ انتقال فرمایا۔ ان سے صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کی ایک بڑی جماعت نے روایت کی۔ ''عجر'' عین مہملہ کے ضمہ اور جیم کے سکون کے ساتھ ہے۔

تشریح: اس حدیث میں ''معقبات'' کا جو لفظ آیا ہے، یہ ''عقب'' سے نکلا ہے یعنی وہ کلمات جو ایک دوسرے کے عقب میں واقع ہوں۔ بعض حضرات کی رائے کے مطابق ان کلمات کو معقبات کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اپنے پیچھے پیچھے ثواب لے آتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ چونکہ یہ کلمات نماز کے بعد ادا کئے جاتے ہیں اس لئے انہیں معقبات کہا جاتا ہے۔ بعض حضرات کی رائے کے مطابق انہیں بار بار ادا کرنا اس کی وجہ بنا، جبکہ بعض حضرات ''معقب'' کا معنی ''ناسخ'' بیان کرتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ: ''لا معقب لحکم'' میں اس کا یہی معنی مراد لیا گیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ کلمات گناہوں کیلئے ناسخ بن جاتے ہیں۔ اور علامہ طیبی رحمہ اللہ کی تحقیق یہ ہے کہ ''معقبات'' ان اونٹنیوں کو کہا جاتا ہے جو حوض پر پانی پینے کیلئے کھڑے ہوئے اونٹوں کے پیچھے کھڑی ہوں۔ اور باری باری ایک اونٹنی کے فارغ ہونے کے بعد دوسرے اونٹنی اس جگہ پر پہنچ کر اپنی پیاس بجھائے اسی طرح ان تسبیحات کی بھی مثال ہے کہ جب ایک کلمہ گذر جاتا ہے دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے اس لئے ان تسبیحات کو معقبات کہا جاتا ہے۔

امام دارقطنی رحمہ اللہ کا امام مسلم پر ایک اعتراض اور اس کا جواب:

امام مسلم رحمہ اللہ نے اس روایت کو مرفوعاً نقل کیا ہے جبکہ امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اس پر استدراک کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس روایت کا حضرت کعب بن عجرہؓ پر موقوف ہونا ہی صواب اور درست ہے اس لئے کہ اس روایت کو مرفوع قرار دینے والوں کا

حفظ و اتقان میں وہ درجہ نہیں جو اسے موقوف قرار دینے والوں کا ہے۔

اس اعتراض کا جواب شرح مسلم میں دیتے ہوئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بلکہ قابل تردید ہے کیونکہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو متعدد اسانید سے نقل کیا ہے جو سب کی سب مرفوع ہیں۔ خود امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی منصور اور شعبہ کی سند سے اس کی کئی مرفوع اسانید ذکر کی ہیں۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ منصور اور شعبہ ہی کے درمیان رفع وقف کا اختلاف ہے جسے امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی واضح فرمایا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اصول حدیث کا ایک مشہور ضابطہ ہے کہ اگر کوئی حدیث مرفوعاً و موقوفاً دونوں طرح منقول ہو تو اصولیین، فقہاء اور محقق محدثین مثلاً امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق صحیح مذہب یہی ہے کہ اس حدیث کے مرفوع ہونے کا حکم لگایا جائے گا حتی کہ اگر اسے موقوف قرار دینے والوں کی تعداد، مرفوع قرار دینے والوں کی تعداد سے زیادہ ہو تب بھی اسے مرفوع ہی قرار دیا جائے گا کیونکہ یہ "زیادت ثقہ" ہے جسے قبول کرنا ضروری ہے۔ موقوف قرار دینے والے کی کوتاہی یا نسیان کی وجہ سے اسے رد نہیں کیا جا سکتا۔

۹۶۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَبَّحَ اللّٰهَ فِیْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ وَحَمِدَاللّٰهَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ وَكَبَّرَاللّٰهَ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِیْنَ فَتِلْكَ تِسْعَةٌ وَتِسْعُوْنَ وَقَالَ تَمَامُ الْمِائَةِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ غُفِرَتْ خَطَایَاهُ وَاِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤١٨/١ حديث رقم (١٤٦-٥٩٧)۔ والترمذي ٤٧٨/٥ حديث رقم ٣٤٦٦۔ والنسائي ٧٩/٣ حديث رقم ١٣٥٤۔ ومالك في الموطأ ٢١١/١ حديث رقم ٢٢ من كتاب القرآن ۔ وأحمد في المسند ٣٧١/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو آدمی ہر نماز کے بعد سبحان اللہ۔ ۳۳ مرتبہ۔ الحمد للہ۔ ۳۳ مرتبہ۔ اللہ اکبر۔ ۳۴ مرتبہ جن کی مجموعی تعداد ۹۹ ہے اور سو کے عدد کو پورا کرنے کے لئے ایک یہ ہے: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے اگرچہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث کی تشریح میں نحوی ترکیب نقل کرنے کے بعد ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں کہ تسبیح فاطمی کے ان تینوں کلمات کے سلسلے میں مختلف روایات میں مختلف تعداد بیان کی گئی ہے جن میں سے چند احادیث یہاں بھی مذکور ہوئیں اور باقی احادیث کا ہم ذکر کئے دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① کلمات تسبیح کی تعداد مختلف روایات میں ۳۳، ۲۵، ۱۱، ۱۰، ۳، ۱۷، ۱، اور ایک عدد بھی منقول ہے۔

② کلمات تحمید کی تعداد مختلف روایات میں ۳۳، ۲۵، ۱۱، ۱۰، ۱۰۰ منقول ہے۔

③ کلمات تہلیل کی تعداد مختلف روایات میں ۱۰، ۲۵، اور ۱۰۰ تک منقول ہے۔

حافظ عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ سب طریقے ویسے تو اچھے ہیں لیکن جتنی تعداد زیادہ ہو۔ وہ اللہ کی نگاہوں میں اتنی ہی محبوب ہوگی، اور علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سب روایات میں تطبیق دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ شاید یہ تعداد مختلف اوقات میں

مخاطب کے لحاظ سے ارشاد فرمائی گئی ہو۔ یا لوگوں کو اختیار دے دیا گیا ہو کہ جس میں آسانی اور سہولت ہو، اسی کو اختیار کر لیں، یا کسی وقت ایک تعداد میں پڑھ لیں، دوسرے وقت دوسری تعداد میں۔

انگلیوں اور گٹھلیوں پر تسبیح پڑھنا:

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں پر تسبیح کی تعداد شمار فرماتے تھے، بلکہ ایک روایات میں تو نبی ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ انگلیوں پر تسبیحات کو شمار کیا کرو کیونکہ قیامت کے دن ان سے بھی پوچھ گچھ کی جائے گی اور انہیں قوت گویائی عطاء کی جائے گی، اور ایک ضعیف سند سے حضرت علیؓ کا یہ قول منقول ہے کہ تسبیح (ہاتھ میں پکڑنے والی) کتنی بہترین یاد دہانی کرانے والی چیز ہے، اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے منقول ہے کہ ان کے پاس دھاگے کی ایک تسبیح تھی جس میں ایک ہزار گرہیں پڑی ہوئی تھیں، اور وہ اس وقت تک نہیں سوتے تھے جب تک اسے مکمل نہ کر لیتے، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ وہ گٹھلیوں پر تسبیح پڑھا کرتے تھے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گٹھلیوں اور کنکریوں پر کلمات تسبیح پڑھنے کی کثیر روایات صحابہ کرام اور بعض امہات المؤمنین علیہم الرضوان سے منقول ہیں بلکہ اسی طریقے کو نبی ﷺ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی بلکہ اس پر لوگوں کو جمے رہنے دیا، البتہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ انگلیوں پر تسبیح پڑھنا، تسبیح کے دانوں پر پڑھنے سے زیادہ افضل ہے جبکہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اگر تعداد بھول جانے کا اندیشہ نہ ہو تو انگلیوں پر پڑھنا افضل ہے ورنہ تسبیح استعمال کرنا زیادہ اولیٰ ہے۔

الفصل الثانی:

قبولیت دعا کا وقت

۹۶۸: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّ الدُّعَاءِ اَسْمَعُ قَالَ جَوْفَ اللَّیْلِ الْاٰخِرِ وَدُبُرَ الصَّلَوَاتِ الْمَکْتُوْبَاتِ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/٤٩٢ حدیث رقم ٣٤٩٩۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول ﷺ کس وقت دعا زیادہ قبول ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا سحری کے وقت اور فرض نمازوں کے بعد۔ (ترمذی)

تشریح: اس حدیث میں دعاء مانگنے کا حکم اور اس کی ترغیب وفضیلت وارد ہوئی ہے۔ ان میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش ہے اور نہ ہی نسخ کا احتمال، جیسے "وقال ربکم ادعونی استجب لکم" وغیرہ۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ زبان سے تو مانگے لیکن دل سے اللہ کے فیصلوں پر راضی رہے۔ علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زمانے کے اوقات (اور انسان کے احوال) مختلف ہوتے ہیں۔ بعض اوقات دعاء کرنا زیادہ افضل ہوتا ہے اور بعض اوقات سکوت، اگر دل میں دعاء کی طرف کوئی اشارہ غیبیہ پایا جاتا ہو تو اس وقت ادب کا تقاضا اور افضل دعاء کرنا ہی ہے اور

اگر سکوت کا کوئی اشارہ ملتا ہو تو وہاں ادب اور افضل سکوت ہی ہے۔

نیز یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس وقت مسلمانوں کا یا اللہ تعالیٰ کا حق بنتا ہو تو اس دعاء کرنا زیادہ اولیٰ ہے کیونکہ یہ اعلیٰ ترین عبادت ہوگی اور اگر دعاء کرنے والے کو اپنا فائدہ ملحوظ خاطر ہو تو سکوت زیادہ بہتر ہے۔

ہر نماز کے بعد معوذات پڑھنے کا حکم

۹۶۹: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍؓ قَالَ اَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَقْرَأَ بِالْمُعَوِّذَاتِ فِیْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ۔ (رواہ احمد وابوداود والنسائی والبیہقی فی الدَّعَوَاتِ الْکَبِیْر)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۲/۱۸۱حديث رقم ۱۵۲۳۔والترمذی ۵/۱۵۷حديث رقم ۲۹۰۳۔والنسائی في السنن ۳/۶۸حديث رقم ۱۳۳۶۔وأحمد في المسند ٤/۱۵۵۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ہر نماز کے بعد معوذات پڑھوں۔ (احمد۔ابوداؤد۔نسائی) امام بیہقیؒ نے اس کو دعوات کبیر میں نقل کیا ہے۔اس حدیث میں معوذات کو ہر نماز کے بعد پڑھنے کا ذکر ہے

تشریح: اس حدیث کی تخریج کرتے ہوئے میرک نے اسے ابوداؤد، نسائی، ابن حبان اور حاکم کی طرف بھی منسوب کیا ہے اور یہ کہ ابن حبان اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے، جبکہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو نقل فرمایا ہے لیکن ان کی روایت میں ''معوذات'' کے لفظ کی بجائے ''معوذتین'' کا لفظ آیا ہے۔علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سنن ابوداؤد، نسائی اور بیہقی میں ''معوذات'' کا لفظ وارد ہوا ہے اور مصابیح کی روایت میں معوذتین کا۔پہلی صورت میں جمع کا کم از کم درجہ یعنی دو کا عدد مراد ہوگا یا پھر سورۂ اخلاص اور سورۂ کافرون کو معوذتین میں داخل کر لیا جائے گا۔اور ایسا یا تو تغلیباً کیا جائے گا یا اس وجہ سے کہ سورۂ اخلاص اور سورۂ کافرون میں شرک سے براءت و بیزاری اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کا مضمون پایا جاتا ہے گویا کہ ان دونوں میں بھی تعوذ کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لئے ''معوذات'' جمع کا لفظ استعمال کیا گیا۔

طلوع اور غروب کے وقت ذکر کی فضیلت

۹۷۰: وَعَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاَنْ اَقْعُدَ مَعَ قَوْمٍ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ مِنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اُعْتِقَ اَرْبَعَةً مِنْ وُلْدِ اِسْمَاعِيْلَ وَلَاَنْ اَقْعُدَ مَعَ قَوْمٍ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ مِنْ صَلَاةِ الْعَصْرِ اِلٰی اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اُعْتِقَ اَرْبَعَةً۔

(رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ٤/۷۳حديث رقم ۳۶۶۷۔ في المخطوطة "لقربه"۔ في المخطوطة "في غيره"۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک ایسی جماعت کا میرے ساتھ بیٹھنا جو نماز فجر سے طلوع آفتاب تک اللہ کے ذکر میں مشغول رہے میرے نزدیک حضرت اسماعیل علیہ السلام کی

اولاد میں سے چار غلام آزاد کرنے سے بہتر ہے۔اور عصر کی نماز کے بعد سے غروب آفتاب تک ایسے لوگوں میں میرا بیٹھنا جو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہوں میرے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ میں چار غلام آزاد کروں۔ (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث میں حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کا خصوصیت کے ساتھ ذکر اس لئے فرمایا گیا کہ ان کی شرافت اور دوسرے اہل عرب پر ان کی فضیلت مسلّم ہے پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا قرب بھی اس کا تخصیص کا سبب ہے۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ اولادِ اسماعیلؑ پر غلامی اور آزادی کا اطلاق ایک ایسی چیز کے طور پر ہے جسے فرض کرلیا گیا ہے اس لئے یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی اس رائے میں ان کی دلیل نہیں بن سکتا کہ اہل عرب کو غلام بنانا جائز ہے اگر ایسا کرنا منع ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے کہ مجھے یہ عمل انہیں آزاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اس موقع پر انتہائی عجیب بات فرمائی ہے کہ اس حدیث میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی واضح ترین دلیل موجود ہے حالانکہ واضح ترین ہونا تو بہت دور کی بات صرف واضح بھی نہیں ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں چار غلاموں کے آزاد کرنے کی جو تخصیص کی گئی ہے اس کی وجہ تو صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے معلوم ہوسکتی ہے ہمیں چاہئے کہ ہم اسے جوں کا توں ہی تسلیم کرلیں۔البتہ یہ ممکن ہے کہ جس چیز کو فضیلت دی گئی ہے وہ چار چیزوں کا مجموعہ بنتی ہے: ① ذکر اللہ۔ ② اس کیلئے بیٹھا۔ ③ اس کیلئے اکٹھا ہونا۔ ④ طلوع یا غروب آفتاب تک مستقل اس میں مصروف رہنا تو ممکن ہے کہ ہر چیز کے بدلے ایک ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہو جبکہ ابن ملک چار چیزوں کی تفصیل یوں بیان فرماتے ہیں کہ: ① ذکر اللہ کیلئے بیٹھنا۔ ② ذاکرین کی جماعت کے ساتھ ہونا۔ ③ صبح شام ہونا۔ ④ طلوع یا غروب آفتاب تک اس کا مسلسل رہنا۔

ظاہر ہے کہ قعود سے یہ مراد نہیں ہے کہ اگر وہ ذکر کرنے والا کسی آدمی کے آنے پر تعظیماً کھڑا ہوگیا یا جنازے کے گزرنے پر تعظیماً کھڑا ہوگیا تو اس کا قعود ختم ہوگیا بلکہ قعود سے مراد یہ ہے کہ وہ استمراراً اُسی کام میں لگا رہا خواہ درمیان میں کھڑا ہی ہوگیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں چار کے عدد کیلئے اربعہ کا لفظ جو دو مرتبہ استعمال فرمایا گیا ہے اس میں سے پہلا معرفہ اور دوسرا نکرہ ہے اور اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ دونوں جگہ الگ الگ عدد مراد ہے کیونکہ یہ بات مشہور ہے کہ اگر نکرہ بعینہٖ معاد ہوجائے تو وہ تغایر کا تقاضا کرتا ہے بخلاف معرفہ کے لیکن حافظ صاحب کا یہ قول انتہائی غریب ہے کیونکہ یہ دو الگ الگ اور مستقل جملے ہیں جن کا مبنی اور معنی دونوں جدا ہیں۔

اس حدیث کی تخریج امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے اور میرک کے مطابق اس پر سکوت بھی فرمایا ہے نیز اس روایت کو ابو یعلیٰ نے بھی نقل فرمایا ہے لیکن ان کی روایت میں دونوں جگہ یہ الفاظ ہیں۔

''اربعة من ولد اسماعيل دية كل رجل منه اثنا عشر الفًا''

ان الفاظ سے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا تردید کرنا بھی غلط ثابت ہوگیا کیونکہ انہوں نے ان الفاظ پر مطلع ہوئے بغیر ہی فرمادیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں من ولد اسماعیل نہیں فرمایا تو شاید وہ مراد ہو اور دوسری جگہ سے اسے حذف کردیا کیونکہ پہلا اس پر دلالت کررہا ہے اور ممکن ہے کہ وہ مراد نہ ہو دونوں میں فرق یہ ہے کہ دن کا پہلا حصہ ذکر میں مصروف رہنے کیلئے زیادہ بہتر

ہے کیونکہ اس میں انسان اکثر ذہنی طور پر چست اور تازہ دم ہوتا ہے اس کی تائید میں اس سلسلے کی صحیح روایت کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ صبح کے وقت کو ذکر سے آباد کرنا حج اور عمرے کے برابر ثواب رکھتا ہے لیکن اس قسم کی کوئی روایت عصر کے بعد سے متعلق مروی نہیں۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ دن کے آخری حصے میں اپنے آپ کو ذکر میں مشغول رکھنا زیادہ اولیٰ ہے تاکہ جو چیزیں اس سے فوت ہو گئیں ان کا تدارک ہو سکے۔ یا جو کمی کوتاہی ہوئی ہے اس کا ازالہ ہو سکے۔

۹۷۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ صَلَّى الْفَجْرَ فِيْ جَمَاعَةٍ ثُمَّ قَعَدَ يَذْكُرُ اللّٰهَ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ كَانَتْ لَهٗ كَاَجْرِ حَجَّةٍ وَعُمْرَةٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ تَامَّةٍ تَامَّةٍ تَامَّةٍ۔

(رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٢ / ٤٨٠ حدیث رقم ٥٨٦۔ فی المخطوطة "تكريره"۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھے اور سورج طلوع ہونے تک اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے اور پھر دو رکعت نماز پڑھے۔ تو اس کو حج اور عمرہ کے برابر ثواب ہوگا۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پورے حج وعمرہ کا۔ پورے حج وعمرہ کا۔ پورے حج وعمرہ کا۔ (ترمذی)

تشریح: علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جس نماز کا ذکر کیا گیا ہے اسے اشراق کی نماز کہا جاتا ہے۔ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کے ایک نیزہ برابر اونچا ہو چکنے کے بعد ادا فرمائی۔ تاکہ مکروہ وقت نکل جائے۔

نیز علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ان دو رکعتوں کے ثواب کو حج وعمرہ کے ثواب سے تشبیہ جو دی گئی ہے وہ ناقص کو کامل سے الحاق کرنے کی قبیل سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا مقصد صرف ترغیب ہے یا نمازی کے اجر وثواب مکمل طور پر حاصل کرنے کو حاجی کے مکمل اجر وثواب حاصل کرنے کے ساتھ اپنی اپنی نسبت سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس کا مقصد مبالغہ ہے۔

الفصل الثّالث:

دو نمازوں کے درمیان وقفہ کا حکم

۹۷۲: وَعَنِ الْاَزْرَقِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ صَلّٰى بِنَا اِمَامٌ لَّنَا يُكْنٰى اَبَا رِمْثَةَ قَالَ صَلَّيْتُ هٰذِهِ الصَّلَاةَ اَوْمِثْلَ هٰذِهِ الصَّلَاةِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَ كَانَ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا يَقُوْمَانِ فِي الصَّفِّ الْمُقَدَّمِ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَكَانَ رَجُلٌ قَدْ شَهِدَ التَّكْبِيْرَةَ الْاُوْلٰى مِنَ الصَّلَاةِ فَصَلّٰى نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ يَسَارِهٖ حَتّٰى رَاَيْنَا بَيَاضَ خَدَّيْهِ ثُمَّ انْفَتَلَ كَانْفِتَالِ اَبِيْ رِمْثَةَ يَعْنِيْ نَفْسَهٗ فَقَامَ الرَّجُلُ الَّذِيْ اَدْرَكَ مَعَهُ التَّكْبِيْرَةَ الْاُوْلٰى مِنَ الصَّلَاةِ يَشْفَعُ فَوَثَبَ عُمَرُ فَاَخَذَ بِمَنْكِبَيْهِ فَهَزَّهٗ ثُمَّ قَالَ اِجْلِسْ فَاِنَّهٗ لَنْ يُهْلِكَ اَهْلُ الْكِتَابِ اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَكُنْ بَيْنَ صَلَاتِهِمْ فَصْلٌ

فَرَفَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَصَرَهُ فَقَالَ اَصَابَ اللّٰهُ بِكَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/ ٦١١ حديث رقم ۱۰۰۷ ۔ في الأصل "لن" والتصحيح من السنن۔ في المخطوطة "جاز"۔

ترجمہ: حضرت ازرق بن قیسؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہمیں ہمارے امام نے جن کی کنیت ابورمثہ تھی ہمیں نماز پڑھائی اور نماز کے بعد انہوں نے فرمایا کہ میں نے یہ نماز یا اس کے مثل نماز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھی حضرت ابورمثہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی رسول اللہ ﷺ کی دائیں طرف پہلی صف میں کھڑے تھے۔ایک آدمی آ کر نماز کی تکبیر اولیٰ میں شریک ہوا۔رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی اور دائیں اور بائیں جانب سلام پھیرا ہم نے آپ ﷺ کے رخساروں کی سفیدی دیکھی۔ پھر آپ ﷺ پھر کر بیٹھ گئے جس طرح ابورمثہ یعنی میں پھر کر بیٹھ گیا۔وہ آدمی جو تکبیر اولیٰ میں شریک تھا کھڑا ہو گیا اور دو رکعت نماز پڑھنے لگا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے دیکھ کر فوراً اٹھے اور اس آدمی کے دونوں کندھوں کو پکڑ کر حرکت دی اور فرمایا بیٹھ جاؤ۔کیونکہ اہل کتاب اسی لئے ہلاکت کی وادی میں جا گرے کہ وہ اپنی نمازوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کر رسول اللہ ﷺ نے اپنی نگاہ مبارک اوپر اٹھائی۔اور ارشاد فرمایا اے خطاب کے بیٹے اللہ تعالیٰ نے تمہیں راہ حق پر پہنچا دیا۔(ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث میں مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں۔

① حضرت ابورمثہ رضی اللہ عنہ نے ''هذه الصلوٰة'' کے ذریعے اس نماز کی طرف اشارہ نہیں فرمایا تھا جو اس وقت انہوں نے پڑھ کر دکھائی تھی کیونکہ وہ نماز تو انہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ نہیں پڑھی تھی۔البتہ اس جیسی نماز خود نبی ﷺ کے ساتھ پڑھی تھی، اس لئے یہ بات طے ہے کہ ''هذه'' کے ذریعے جو اشارہ کیا گیا ہے وہ اس حقیقت کی طرف ہے جو ان کے ذہن میں موجود تھی۔

② حضرات شیخین رضی اللہ عنہما پہلی صف میں نبی ﷺ کی دائیں جانب اس لئے کھڑے تھے کہ نبی ﷺ نے فرما رکھا تھا ''تم میں سے جو عقل مند افراد ہیں وہ میرے قریب رہا کریں۔ تاہم حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس چیز کا بیان برسبیل تذکرہ آ گیا ہے ورنہ اصل قصے کے ساتھ اس کا اتنا خاص تعلق نہیں ہے کہ اگر اسے چھوڑ دیا جاتا تو بات نامکمل رہ جاتی۔لیکن اس کا برسبیل تذکرہ آ جانا بھی خالی از فائدہ نہیں بلکہ اس میں صف اول کے حصول کی کوشش کرنے کی ترغیب موجود ہے اور صف اول میں بھی امام کی دائیں جانب کھڑے ہونے کی ترغیب دی گئی ہے جیسا کہ یہی افضل ہے۔

③ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ ممکن ہے صحابۂ کرام علیہم الرضوان کو دو نمازوں میں وقفہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہو اور انہیں یاد نہ رہا ہو۔جس کی وجہ سے تعمیل حکم میں کوتاہی ہوئی ہو۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں وقفہ رکھنے کا حکم نہ دیا گیا ہو اور انہوں نے ملا کر نماز پڑھنے کو اپنے ذہن میں جگہ دے دی ہو۔نیز یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ ہر نماز کے بعد جو ذکر کیا جاتا ہے۔نماز ملا کر پڑھنے کی صورت میں وہ ذکر نہیں ہو سکتا اور ذکر کی جو نورانیت اور برکت ہوتی ہے وہ فوت ہو جاتی ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح میں یہ احتمال بیان فرماتے ہیں کہ ممکن ہے عدمِ فصل سے مراد سلام کے بعد ترکِ ذکر

ہو اور تقدیری عبارت یہ ہو کہ سلام پھیرنے کے بعد ترکِ ذکر ہی نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا۔ اس لئے تم ایسا نہ کرو کیونکہ اس سے نماز کی رکعتوں کی تعداد مشتبہ ہو جاتی ہے جبکہ حافظ صاحب رحمۃ اللہ اس جملے کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کو کسی ایسی چیز نے ہلاک نہیں کیا جو انہوں نے نماز کے بعد سرانجام دی ہو۔ بلکہ انہیں تو اس کے علاوہ اور بہت سی چیزوں نے ذلیل اور ہلاک کر دیا۔ گویا مقدر مانے گئے مخصوص لفظ کی رعایت ہی کی تعیین ہوئی۔ جبکہ اسے عام ماننے کی صورت میں یہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

اصل میں اس عبارت سے حافظ صاحب رحمۃ اللہ کا مقصد علامہ طیبی رحمۃ اللہ پر اعتراض کرنا ہے حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ اس ہلاک کا تعلق مخصوص ہے نمازیوں کے ساتھ جبکہ ہلاکت کے دوسرے اسباب انسان کو اگلے جہان پہنچا دیتے ہیں۔ یا اس حصہ کو حصر ادعائی بھی کہا جا سکتا ہے جس میں مبالغہ مقصود ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

نماز کے بعد کی تسبیح

۹۷۳: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ اُمِرْنَا اَنْ نُسَبِّحَ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَنَحْمدُ ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَنُكَبِّرُ اَرْبَعًا وَّثَلَاثِيْنَ فَاُتِىَ رَجُلٌ فِي الْمَنَامِ مِنَ الْاَنْصَارِ فَقِيْلَ لَهٗ اَمَرَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تُسَبِّحُوْا فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ كَذَا وَكَذَا قَالَ الْاَنْصَارِيُّ فِيْ مَنَامِهٖ نَعَمْ قَالَ فَاجْعَلُوْهَا خَمْسًا وَّعِشْرِيْنَ وَاجْعَلُوْا فِيْهَا التَّهْلِيْلَ فَلَمَّا اَصْبَحَ غَدَا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْبَرَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَافْعَلُوْا۔ (رواه احمد والنسائی والدارمی)

أخرجه النسائي في السنن ۳/۷٦حديث رقم ۱۳۵۰۔والدارمي ۱/ ۳٦۰حديث رقم ۱۳۵٤۔وأحمد في المسند ۵/۱۸٤۔ في المخطوطة "كذا"۔

ترجمہ: حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ہر نماز کے بعد۔ سبحان اللہ ۳۳ بار۔ الحمد للہ ۳۳ بار۔ اللہ اکبر ۳۴ بار پڑھیں۔ ایک انصاری صحابی نے ایک فرشتہ کو خواب میں دیکھا۔ فرشتہ نے اس انصاری سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم ہر نماز کے بعد اتنی اور اتنی تسبیح پڑھو۔ اس انصاری نے کہا ہاں۔ فرشتہ نے کہا ان تینوں کی تعداد پچیس پچیس مقرر کرو۔ اور اس کے ساتھ لا الہ الا اللہ بھی پچیس مرتبہ مقرر کر لو۔ تاکہ سو کا عدد پورا ہو جائے۔ صبح کے وقت اس انصاری نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا خواب بتایا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس پر عمل کرو۔ (احمد۔ نسائی۔ دارمی)

تشریح: اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ طیبی رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ حدیث میں مذکور انصاری صحابیؓ کے ساتھ خواب میں اس واقعہ کا پیش آنا از قبیل الہام ہے جیسا کہ بعض اوقات خود نبی ﷺ کو بھی خواب میں کسی چیز کی تعلیم دے دی جاتی تھی اور اسی وجہ سے نبی ﷺ نے خواب میں دکھائی دینے والے شخص یا فرشتے کی بات کی تائید و تصویب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی بات پر عمل کرتے ہوئے کلمات تسبیح کو ۲۵، ۲۵ مرتبہ کر کے اس میں ۲۵ مرتبہ لا الہ اور اللہ کا اضافہ بھی کر لو۔ اور یہ صورت

زیادہ جامع بھی ہے کیونکہ اس میں تہلیل کے کلمات بھی آ گئے ہیں اور سو کا عدد بھی پورا ہو جاتا ہے۔تاہم ایک بات ضرور ہے کہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ سے از قبیل الہام جو قرار دیا ہے وہ صحیح نہیں کیونکہ الہام اور منام میں تغایر ہوتا ہے اور یہ منام کا واقعہ ہے۔

نیز علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ خواب میں دکھائی دینے والے شخص کی عبارت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب تسبیحات بھی یہی ہیں اور عدد بھی سو کا ہے تو اس عدد کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں کمی بیشی نہ کرو۔اور قبل اس کے کہ تم اس ترتیب پر عمل کرو۔اس میں کلماتِ تہلیل کا اضافہ کر لو۔لیکن میری رائے میں یہ بات بھی محل نظر ہے کیونکہ حدیث میں کہیں بھی ایسے الفاظ نہیں جو اس مفہوم پر دلالت کرتے ہوں ''قبل اس کے کہ تم اس ترتیب پر عمل کرو''۔ بلکہ صحابۂ کرام علیہم الرضوان کے جذبۂ اتباع کو دیکھتے ہوئے تو یہی بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اس حکم پر عمل کر چکے ہوں گے۔ہاں!یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ''کلماتِ تہلیل'' کلمات تکبیر سے پہلے کہہ لیا کرو۔تاکہ ترتیب مشہور کی رعایت بھی ہو جائے اور مقصد بھی ہو جائے کیونکہ ترتیبِ مشہور یہی ہے۔ ''سبحان اللہ،والحمد للہ،ولا الٰہ الا اللہ،واللہ اکبر''اور ''فیھا'' کا لفظ بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ۲۵،۲۵ مرتبہ ان کلمات کے مسنون ہونے کی دلیل صرف انصاری صحابیؓ کا خواب نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کی تائید کرتے ہوئے ''فافعلوا'' فرمانا ہے کیونکہ کسی غیر معصوم کے ذہن میں آنے والی باتیں ''خواہ بیداری میں ہو یا نیند کی حالت میں'' حجت نہیں اور نہ ہی دین کے کسی معاملے میں ان کو کوئی شرعی اعتبار ہے۔

آیۃ الکرسی کی فضیلت

۹۷۴: وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اَعْوَادِ هٰذَا الْمِنْبَرِ يَقُوْلُ مَنْ قَرَأَ اٰيَةَ الْكُرْسِيِّ فِيْ دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ اِلَّا الْمَوْتُ وَمَنْ قَرَأَهَا حِيْنَ يَأْخُذُ مَضْجَعَهٗ اٰمَنَهُ اللّٰهُ عَلٰى دَارِهٖ وَدَارِ جَارِهٖ وَاَهْلِ دُوَيْرَاتٍ حَوْلَهٗ۔

رواه البيهقي في شعب الايمان وقال اسناده ضعيف

رواه البيهقي في شعب الايمان ٤٥٨/٢ حديث رقم ٢٣٩٥۔ في المخطوطة "حقيقة"۔ في المخطوطة "الحسان"۔ في المخطوطة "هي"۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکڑی کے اس منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو آدمی ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھتا ہے اس کو جنت میں جانے سے سوائے موت کے اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔اور جو آدمی سوتے وقت آیۃ الکرسی پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے گھر میں اور اس کے ہمسایہ کے گھر میں اور اس کے گرد و پیش چند اور گھروں میں امن دیتا ہے۔(بیہقی) امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی روایت کمزور ہے۔

تشریح: اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس حدیث پر اپنی گرفت اور یادداشت مضبوط ثابت کرنے کیلئے ''سماع'' کا لفظ استعمال کرنے کے بعد جو یہ فرمایا ''علی اعواد ھذا المنبر'' تو اس کی حکمت یہ ہے کہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ یہ واقعہ لکڑی کا منبر تیار ہو چکنے اور رکھے جانے کے بعد پیش

آیا تھا، کیونکہ نبی ﷺ ابتداءً زمین پر کھڑے ہوکر لکڑی کے ایک تنے سے ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ بعد میں جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تو اکثر حضرات کے مطابق ۷ھ میں اور بعض حضرات کے نزدیک ۷ھ میں لکڑی کا یہ منبر بنایا گیا تاکہ نبی ﷺ اس پر کھڑے ہوکر خطبہ ارشاد فرمایا کریں اور سب مسلمان اس سے مستفید ہو سکیں۔

"الاّ الموت" سے کیا مراد ہے؟

بعض محدثین اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے والا جنت میں داخل ہوگا۔ سوائے اس شخص کے جس کی موت بدبختی اور شقاوت کی حالت میں ہوئی ہو۔ اور بعض محدثین "الا الموت" سے یہ مراد لیتے ہیں کہ موت نہ آنے تک وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ موت آنے کے بعد وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ اس شخص کے اور جنت میں داخل ہونے کے درمیان صرف موت رکاوٹ ہے۔ جب اس کا چراغِ زندگی گل ہو جائے گا اور وہ اس عالم سے کوچ کر جائے گا تو یہ رکاوٹ دور ہو جائے گی اور وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کیلئے جنت میں داخل ہونے کی کوئی شرط باقی نہیں بچی (سب پوری ہو چکی ہیں) ہاں! ایک شرط باقی رہتی ہے اور وہ ہے موت، جو کہ اس کے راستے کی رکاوٹ ہے اور بزبان حال یہ کہہ رہی ہے کہ آپ کے جنت میں داخل ہونے سے پہلے میرا آپ کی قدم بوسی کرنا ضروری ہے تاکہ ساری شرائط مکمل ہو جائیں۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ خود بھی اس حدیث کی توجیہہ میں ایک لطیف بات فرماتے ہیں اور وہ یہ کہ اس شخص کیلئے دخول جنت سے کوئی بھی چیز کسی صورت مانع اور رکاوٹ نہیں بن سکتی حتیٰ کہ موت بھی نہیں۔ بلکہ موت تو دخول جنت کا سبب ہے، یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے:۔

"ولا عیب فیهم غیران سیوفهم" (البیت)

حالانکہ یہ تو کوئی عیب نہیں، معلوم ہوا کہ ان میں کوئی عیب ہے ہی نہیں، گویا یہ "تاکید المدح بمایشبہ الذم" کے قبیل سے ہے کہ الفاظ تو ذم کے مشابہہ ہیں لیکن اس کا مقصد "تاکیدِ مدح" ہے۔ اس کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

"وما نقموا منهم الا ان یؤمنوا بالله"

"ظالموں نے ان کو صرف اسی وجہ سے برا اور ناقص سمجھا تھا کہ وہ اللہ پر ایمان لائے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ خرابی تو نہیں۔ یہ تو عین خوبی ہے، اسی طرح "الا الموت" کا معنی بھی ہے۔

اور ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کیلئے جنت میں داخل ہونے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ ہاں! اگر وہ کفر کی حالت میں مرے تو بات جدا ہے۔ گویا یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ کفر و شرک کے علاوہ اگر کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو وہ دخول جنت میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔ واللہ اعلم۔

سند حدیث پر بحث:

یہ حدیث سند کے اعتبار سے گو کہ ضعیف ہے تاہم فضائل اعمال کے سلسلے میں ضعیف حدیث پر بھی عمل کر لیا جاتا ہے۔ بالخصوص جبکہ اس حدیث کا ابتدائی حصہ حصن حصین میں مذکور ہے اور انہوں نے نسائی کا رمز ذکر کیا ہے نیز ابن حبان اور ابن السی کا بھی رمز لکھا ہے، تاہم میرک کے مطابق یہ روایت حضرت علیؓ سے ہے اور مذکورہ کتابوں میں حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے نقل کی گئی ہے۔

حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام نسائی اور طبرانی نے اسے متعدد اسناد سے نقل کیا ہے جن میں سے ایک سند صحیح بھی ہے بلکہ طبرانی نے تو اپنی بعض اسناد میں "قل هو الله احد" کا بھی اضافہ نقل کیا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کی سند بھی جید ہے جبکہ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوامامہؓ کے حوالے سے اس کا ایک صحیح شاہد موجود ہے جسے امام نسائی نے روایت کیا ہے اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت الکرسی کی فضیلت میں اس کے علاوہ بھی مزید احادیث نقل کی ہیں۔ لیکن امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سب کو ضعیف قرار دیا ہے۔ جبکہ ہماری رائے یہ ہے کہ اتنی متعدد اسناد سے کسی روایت کا نقل ہو کر آنا اس بات کی دلیل ہے کہ یقیناً اس کی کوئی نہ کوئی صحیح اصل موجود ہے۔ اس لئے اسے بالکل ترک نہیں کیا جا سکتا۔

۹۷۵ : وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ غَنْمٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَالَ قَبْلَ اَنْ يَنْصَرِفَ وَيَثْنِيْ رِجْلَيْهِ مِنْ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ وَالصُّبْحِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَعَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ عَشْرَمَرَّاتٍ كُتِبَ لَهٗ بِكُلِّ وَاحِدَةٍ عَشْرُ حَسَنَاتٍ وَمُحِيَتْ عَنْهُ عَشْرُ سَيِّئَاتٍ وَرُفِعَ لَهٗ عَشْرُ دَرَجَاتٍ وَكَانَتْ لَهٗ حِرْزًا مِنْ كُلِّ مَكْرُوْهٍ وَحِرْزًا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ وَلَمْ يَحِلَّ لِذَنْبٍ اَنْ يُدْرِكَهٗ اِلَّا الشِّرْكُ وَكَانَ مِنْ اَفْضَلِ النَّاسِ عَمَلًا اِلَّا رَجُلًا يَفْضُلُهٗ يَقُوْلُ اَفْضَلَ مِمَّا قَالَ۔ (رواہ احمد)

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن غنم سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے کہ جو آدمی فجر اور مغرب کے بعد اپنی جگہ سے اٹھنے سے قبل اور اپنے پاؤں موڑنے سے پہلے ان کلمات کو پڑھے۔ لا اله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد بيده الخير وهو على كل شيءٍ قدير۔ تو اس کے لئے ہر مرتبہ کے بدلہ میں دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اور اس کے دس گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ اور یہ کلمات اس آدمی کے لئے ہر شر سے اور شیطان مردود سے امن کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اور شرک کے علاوہ کوئی گناہ اسے ہلاکت میں نہیں ڈالتا ہے اور وہ آدمی عمل کے اعتبار سے سب لوگوں میں سے بہتر ہوگا۔ سوائے اس آدمی کے جو اس سے زیادہ افضل عمل کرے (احمد)

راویٔ حدیث:

عبدالرحمٰن غنم۔ "عبدالرحمٰن بن غنم الاشعری" یہ شام کے رہنے والے ہیں۔ زمانہ جاہلیت بھی پایا اور زمانہ اسلام بھی پایا۔

اسلام آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں قبول کیا لیکن آنحضرت ﷺ کی زیارت نہ کر پائے۔ جب سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ نے یمن بھیجا تھا برابر ان کے ساتھ رہے تا آنکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔ فقہاء اہل شام میں سب سے زیادہ فقیہ تھے۔ عمر بن الخطاب و معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما جیسے متقدمین صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔

''غنم'' میں غین منقوطہ مفتوح اور نون ساکن ہے۔ ۷۸ھ میں انتقال ہوا۔

تشریح: اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے ''ویثنی رجلیه'' یہ لفظ ایک دوسری روایت میں اسم فاعل سے ''وھو ثان رجله'' بھی آیا ہے۔ صاحبِ نہایہ فرماتے ہیں کہ لفظ اعتبار سے تو یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن معنوی اعتبار سے ان میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ دونوں کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ تشہد کی حالت میں انسان جس کیفیت پر بیٹھا ہوتا ہے۔ اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے اور پاؤں موڑنے سے پہلے پہلے جو شخص یہ کلمات کہے گا اسے یہ یہ فوائد حاصل ہوں گے۔

فجر اور مغرب کے بعد ذکر کی فضیلت

۹۷۶: و روی الترمذی نحوہ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ اِلٰی قَوْلِهٖ اِلَّا الشِّرْكُ وَلَمْ يَذْكُرْ صَلَاةَ الْمَغْرِبِ وَلَا بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَقَالَ ھذاحدیث حسن صحیح غریب۔

أخرجه أحمد في المسند ٤/٢٢٧۔

ترجمہ: اس روایت کو امام ترمذیؒ نے بھی حضرت ابوذرؓ سے صرف۔ الا الشرك۔ تک نقل کیا ہے۔ اور ان کی روایت میں صلوٰۃ المغرب اور بیدہ الخیر کے الفاظ بھی منقول نہیں ہیں۔ اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

تشریح: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ایک بہترین اور عمدہ قسم کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ دعا کرنے والا جب کلمہ توحید کے ذریعے دعا کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دے دیتا ہے اور وہ اللہ کی قائم کردہ حدود کو توڑنے سے بچتا ہے اور جونہی وہ توحید کے حرم سے نکلتا ہے تو لامحالہ اسے شرک کی گندگی گھیر لیتی ہے مطلب یہ ہے کہ گناہ کیلئے اس بات کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان کلمات کو کہنے والے کا احاطہ کر کے اسے توحید کی جڑوں سے اکھاڑ کر کسی گناہ میں مبتلا کر سکے ہاں اگر یہ انسان خود ہی شرک کی گندگی میں پھنس جائے تو اور بات ہے۔

فجر کے بعد ذکر کی فضیلت

۹۷۷: وَعَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ بَعْثًا قِبَلَ نَجْدٍ فَغَنِمُوْا غَنَائِمَ كَثِيْرَةٍ وَاَسْرَعُوا الرَّجْعَةَ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَّا لَمْ يَخْرُجْ مَا رَاَيْنَا بَعْثًا اَسْرَعَ رَجْعَةً وَلَا اَفْضَلَ غَنِيْمَةً مِنْ هٰذَا الْبَعْثِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى قَوْمٍ اَفْضَلَ غَنِيْمَةً وَاَفْضَلَ رَجْعَةً قَوْمًا شَهِدُوْا صَلَاةَ الصُّبْحِ ثُمَّ جَلَسُوْا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ حَتّٰى طَلَعَتِ الشَّمْسُ فَاُولٰئِكَ اَسْرَعُ رَجْعَةً وَاَفْضَلُ غَنِيْمَةً۔ (رواہ الترمذی وَقَالَ ھذاحدیث غریب وَحَمَّادُ ابْنُ اَبِیْ حُمَیْدٍ الرَّاوی ھو ضعیف فی الحدیث)

أخرجه الترمذي في السنن ٥/٥٢٢ حديث رقم ٣٤٧٣۔في المخطوطة هذه العبارة موقعها بعد كلمة "صفة رجل"۔ في المخطوطة "قره"۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر نجد کی طرف روانہ کیا۔ چنانچہ وہ لشکر بہت زیادہ مال غنیمت لے کر جلدی واپس لوٹ آیا۔ ہم میں سے ایک آدمی نے جو لشکر کے ساتھ نہیں گیا تھا کہا کہ ہم نے تو ایسا کوئی لشکر نہیں دیکھا جو اس لشکر کی طرح اتنا جلدی واپس آیا ہو۔ اور اپنے ساتھ اتنا زیادہ مال غنیمت بھی لایا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں ایک ایسی جماعت کے بارے میں نہ بتاؤں جو مال غنیمت میں بھی اور جلدی واپس آنے میں بھی اس لشکر سے بڑھ کر ہے۔ وہ جماعت وہ ہے جو فجر کی نماز میں حاضر ہوئی ہو اور پھر طلوع آفتاب تک اپنی جگہ بیٹھ کر ذکر میں مشغول رہی ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو جلدی واپس آنے اور مال غنیمت لانے میں ان سے افضل ہیں۔ (ترمذی) اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس کے ایک راوی حماد بن ابو حمید ضعیف ہیں۔

تشریح: اس حدیث میں نمازِ فجر پڑھ کر طلوعِ آفتاب تک بیٹھ کر ذکر الٰہی کرنے والوں کیلئے دو باتیں ارشاد فرمائیں گئیں۔

① جلدی لوٹ آنے والے یعنی اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے بعد جس پر ان سے ثواب عظیم کا وعدہ کیا گیا کچھ ہی دیر گذرنے کے بعد وہ اپنے گھر اور اپنے امور معیشت کی طرف لوٹ آتے ہیں جبکہ مجاہدین اکثر کئی دن گزرنے کے بعد اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہماری اس تقریر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں فراغت کو رجعت کے الفاظ سے بطریق مشاکلہ تعبیر کیا گیا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں ذاکر نمازی کو استعارۃً اس مسافر سے تشبیہ دی گئی ہو جو اپنے مقصد سفر کی تکمیل کے بعد ہی اپنے گھر کی طرف لوٹ کے آتا ہے اس صورت میں اس کی مثال وہ محاورہ ہوگا جو عام طور پر حدیث کے حوالے سے مشہور ہے لیکن اس کی سند میں شہر بن حوشب راوی ہونے کی وجہ سے اسے مضبوط حدیث نہیں قرار دیا جا سکتا اسی لئے ہم نے اسے محاورے سے تعبیر کیا ہے۔ ''**رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر**'' اور اس کے بعد حافظ صاحب نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ جہاں کسی لفظ کو اپنے معنی حقیقی میں استعمال کرنا ممکن ہو وہاں اس کا مجازی معنی مراد لینا اچھا نہیں ہوتا خاص طور پر جب کسی ضرورت کے بغیر اس میں تکلف اور ظاہر سے خروج کرنا پڑتا ہو۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ اپنی رائے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہاں مجازی معنی مراد لینے کا قرینہ یہی کافی ہے کہ نمازی کیلئے عموم ثابت ہو جائے خواہ وہ مسجد میں نماز پڑھے یا اپنے گھر میں دونوں صورتوں میں یہی حکم ہے جیسا کہ حدیث کے ظاہری الفاظ پر اطلاق سے ظاہر ہے۔

بَابُ مَالَا يَجُوْزُ مِنَ الْعَمَلِ فِي الصَّلٰوةِ وَمَا يُبَاحُ مِنْهُ

نماز میں جائز اور ناجائز چیزوں کا بیان

اس باب میں ایسے امور اور اشیاء کا ذکر کیا گیا ہے کہ جن کو نماز میں کرنا جائز ہے اور جن کو نماز میں کرنا مکروہ تحریمی ہے یا مکروہ تنزیہی ہے یا مستحب ہے اور یا مباح ہے۔

الفصل الاول:

چھینک کے جواب سے نماز فاسد ہو جاتی ہے

۹۷۸: عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ الْحَكَمِ قَالَ بَيْنَا اَنَا اُصَلِّي مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا عَطَسَ رَجُلٌ مِّنَ الْقَوْمِ فَقُلْتُ يَرْحَمُكَ اللّٰهُ فَرَمَانِي الْقَوْمُ بِاَبْصَارِهِمْ فَقُلْتُ وَاثُكْلَ اُمِّيَاهُ مَاشَانُكُمْ تَنْظُرُوْنَ اِلَيَّ فَجَعَلُوْا يَضْرِبُوْنَ بِاَيْدِيْهِمْ عَلٰى اَفْخَاذِهِمْ فَلَمَّا رَاَيْتُهُمْ يُصَمِّتُوْنَنِي لٰكِنِّي سَكَتُّ فَلَمَّا صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبِاَبِيْ هُوَ وَاُمِّيْ مَارَاَيْتُ مُعَلِّمًا قَبْلَهٗ وَلَابَعْدَهٗ اَحْسَنَ تَعْلِيْمًا مِنْهُ فَوَاللّٰهِ مَا قَهَرَنِيْ وَلَا ضَرَبَنِيْ وَلَاشَتَمَنِيْ قَالَ اِنَّ هٰذِهِ الصَّلَاةَ لَا يَصْلُحُ فِيْهَا شَيْءٌ مِنْ كَلَامِ النَّاسِ اِنَّمَا هِيَ التَّسْبِيْحُ وَالتَّكْبِيْرُ وَقِرَاءَةُ الْقُرْاٰنِ اَوْكَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ وَقَدْجَاءَ نَا اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ وَاِنَّ مِنَّا رِجَالًا يَاْتُوْنَ الْكُهَّانَ قَالَ فَلَا تَاْتِهِمْ قُلْتُ وَمِنَّا رِجَالٌ يَتَطَيَّرُوْنَ قَالَ ذٰلِكَ شَيْءٌ يَجِدُوْنَهٗ فِيْ صُدُوْرِهِمْ فَلَا يَصُدَّنَّهُمْ قَالَ قُلْتُ وَمِنَّا رِجَالٌ يَخُطُّوْنَ قَالَ كَانَ نَبِيٌّ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ يَخُطُّ فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهٗ فَذَاكَ رواه مسلم قَوْلُهٗ لٰكِنِّيْ سَكَتُّ هٰكَذَا وَجَدْتُّ فِيْ صَحِيْحِ مسلم وكتاب الحميدى وصحح فِيْ جامع الْاُصُوْلِ بِلَفْظَةِ كَذَا فوقَ لكنى۔

أخرجه مسلم فى صحيحه ۳۸۱/۱حديث رقم (۳۳۔۵۳۷)۔وأبوداوٗد فى السنن ۵۷۰/۱حديث رقم ۹۳۰والنسائى ۱۴/۳حديث رقم ۹۳۰۔وأحمد فى المسند ۵۴۷/۵۔ فى المخطوطة زيادة عبارة "فلاتكن فى قوله تعالىٰ "۔ فى المخطوطة "صلى"۔ فى المخطوطة "وقيل"۔

ترجمہ: حضرت معاویہ بن حکمؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا اچانک ایک آدمی کو چھینک آ گئی۔ میں نے یرحمک اللہ کہا۔ لوگوں نے مجھ کو گھورنا شروع کیا۔ میں نے کہا کہ تمہاری ماں تمہیں گم کر دے۔ تم لوگ مجھے کیوں گھور رہے ہو۔ لوگوں نے اپنی رانوں پر اپنے ہاتھ مارنے شروع کئے۔ میں نے دیکھا کہ لوگ مجھے خاموش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں خاموش رہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ چکے میرے ماں باپ آپ پر

قربان ہوں' میں نے ایسا اچھا تعلیم دینے والا نہ آپ ﷺ سے پہلے دیکھا تھا اور نہ ہی بعد میں دیکھا۔ اللہ کی قسم نہ تو آپ ﷺ نے مجھے ڈانٹا نہ مارا اور نہ ہی مجھے برا کہا' فرمایا کہ نماز میں انسان کا کلام مناسب نہیں ہے۔ نماز تو تسبیح تکبیر اور قرآن پڑھنے کا نام ہے یا آپ ﷺ نے اس کے مثل کچھ اور فرمایا میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول۔ میں ایک نو مسلم ہوں۔ پھر میں نے عرض کیا کہ ہم میں سے بہت لوگ کاہنوں کے پاس جاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کے پاس ہرگز نہ جایا کرو۔ میں نے عرض کیا ہم میں سے بہت لوگ بدفالی لیتے ہیں۔ فرمایا یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو وہ اپنے دلوں میں پاتے ہیں۔ انہیں اپنے کام سے رکنا نہیں چاہئے۔ حضرت معاویہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا۔ ہم میں سے بعض لوگ خط کھینچتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ وہ غیب کی کچھ باتیں بتاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انبیاء میں سے ایک نبی تھے جو خط کھینچتے تھے لہٰذا جس آدمی کا خط کھینچنا اس نبی کے خط کے موافق ہو جائے وہ اس بات کو حاصل کر لیتا ہے۔ (مسلم)

صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ ۔لکنی سکت۔ کو صحیح مسلم اور حمیدی کی کتاب میں اسی طرح دیکھا ہے۔ صاحب جامع الاصول نے لکنی کے اوپر لفظ کذا لکھ کر اس کے صحیح ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

معاویۃ بن الحکم۔ یہ ''معاویہ'' ہیں۔ ''حکم'' کے بیٹے ہیں اور ''سلمی'' ہیں۔ یہ مدینہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کا شمار اہل حجاز میں ہے۔ ان سے ان کے بیٹے کثیر اور عطاء بن یسار وغیرہ نے روایت کی۔ ۱۱۷ھ میں انتقال فرمایا۔ کہا گیا ہے کہ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے۔

تشریح: اس حدیث کی وضاحت میں علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی نمازی کسی چھینک کر الحمد للہ کہنے والے کے جواب میں **یرحمك اللّٰہ** کہہ دے تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی کیونکہ اس نے اسے مخاطب بنایا اور اگر اس نے ضمیر غائب استعمال کرتے ہوئے **یرحمہ اللّٰہ** کہا تو نماز باطل نہ ہوگی۔

حافظ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر اس نے اپنے لئے رحم کی دعا کرتے ہوئے **یرحمنی اللّٰہ** کہا تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی جبکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اگر اس نے یہ دعا کسی اور کیلئے بھی کی ہو تب بھی نماز فاسد نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ دعائے رحمت و مغفرت ہے دونوں کی دلیل یہی حدیث ہے لیکن حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جو عنقریب آیا چاہتی ہے وہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے اس قول کی تردید کرتی ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں کلام کی نسبت لوگوں کی طرف کی گئی ہے اور یوں فرمایا گیا ہے۔ ''ان **ھذہ الصلوٰۃ لا یصلح فیھا شیء من کلام الناس** '' اس کی وجہ یہ ہے کہ دعا، تسبیح اور ذکر اس سے خارج ہو جائیں کیونکہ ان چیزوں کے ذریعے لوگوں سے نہ خطاب مقصود ہوتا ہے اور نہ انہیں کچھ سمجھانا مقصود ہوتا ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر کسی آدمی نے یہ قسم کھالی کہ وہ کسی سے بات نہیں کرے گا اور اس نے تسبیح یا تکبیر کہہ دی یا قرآن پاک کی تلاوت کی تو وہ حانث نہیں ہوگا۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ نماز کی حالت میں چھینک کا جواب دینا جائز نہیں۔ جس نے ایسا کیا اس کی نماز باطل ہو جائے

گی۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکم شرعی سے ناواقف کا گفتگو اور کلام کرنا نماز کو باطل نہیں کرتا کیونکہ اسے نبی کریم ﷺ نے اعادہ نماز کا حکم نہیں فرمایا اکثر تابعین کی رائے یہ ہے۔ یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی قول ہے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ اس میں ایک شق کا اضافہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر نمازی نے جان بوجھ کر نماز کی کسی مصلحت سے متعلق کلام کیا مثلاً اگر امام بیٹھنے کے مقام پر کھڑا ہو گیا اور نمازی نے کہہ دیا بیٹھ جایئے یا آہستہ آواز سے پڑھنے کے مقام پر جہراً تلاوہ شروع کر دی اور نمازی نے اسے مطلع کر دیا تو اس سے نماز باطل نہیں ہوئی۔

احناف کا مسلک یہ ہے کہ نماز میں مطلقاً کلام کرنا خواہ بھول کر ہو یا جان بوجھ کر، نماز کی مصلحت سے اس کا تعلق ہو یا نہ ہو نماز باطل ہو جائے گی اور اس حدیث کا اطلاق ہماری دلیل ہے جیسا کہ صاحبِ ہدایہ نے ذکر کیا ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دیگر ائمہ کی طرف سے اس حدیث کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ بطلانِ نماز پر یہ حدیث آپ کی دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ نماز میں کلام کرنا محظورات میں سے ہے اور حظر مستلزم بطلان نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے مذکورہ واقعہ میں نبی ﷺ نے اعادۂ نماز کا حکم نہیں دیا بلکہ نماز کے احکام تعلیم فرمائے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اولاً تو ہمیں آپ کی بات تسلیم ہی نہیں اور اگر بالفرض اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ جان بوجھ کر کسی محظور و ممنوع کا ارتکاب موجب فساد ہوتا ہے اور جو چیز حالتِ عمد میں موجب فساد ہو، وہ سہو کی حالت میں بھی موجب فساد ہوتی ہے جیسے کھانا پینا وغیرہ کیونکہ وہاں کوئی ایسی شرعی چیز موجود نہیں ہوتی جو اسے زائل کر سکے۔

باقی رہی وہ حدیث جس میں فرمایا گیا ہے: ''رفع عن امتی الخطأ والنسیان''

تو بالاجماع اس سے مراد ''رفع اثم'' ہے، یہ مراد نہیں کہ میری امت غلطی نہیں کر سکتی۔ پھر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر جان بوجھ کر کوئی شخص دوران نماز کلام کرے اور اس کا تعلق نماز کی کسی مصلحت سے نہ ہو تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی اس سلسلے میں یہ رائے ہے کہ اگر لوگ نماز پڑھ رہے ہوں اور اسی اثناء میں بارش شروع ہو جائے ، اور نمازیوں میں سے کوئی یہ کہہ دے کہ اے بھائی! ذرا نماز ہلکی کرو، بارش شروع ہو گئی ہے تو اس کی نماز باطل نہ ہو گی۔ کیونکہ اس کا تعلق نماز کی مصلحت سے ہے تاہم بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس کا تعلق نفس نماز کی کسی مصلحت سے نہیں ہے۔

اس کی دلیل حضرت زید بن ارقمؓ کی وہ حدیث ہے جس کی تخریج امام مسلم رحمہ اللہ نے کی ہے کہ ہم لوگ نماز میں ایک دوسرے سے بات چیت کر لیا کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت مبارکہ نازل ہوگئی ''وقوموا للّٰہ قانتین'' اس آیت مبارکہ کے ذریعے ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیتے ہوئے نماز میں کلام کرنے سے منع کر دیا گیا۔

یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ دورانِ نماز کلام کی اجازت مدینہ منورہ میں بالکل آخر میں منسوخ کی گئی ہے کیونکہ سورۂ بقرہ مدنی دور کے اختتام پر نازل ہوئی اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ حضرت زید بن ارقمؓ ہجرت کے ابتدائی ایام میں چھوٹے بچے تھے۔ اس لئے یہ اوائل ہجرت کا واقعہ نہیں ہو سکتا۔ نیز یہیں سے ان لوگوں کی بھی تردید ہوگئی جو یہ کہتے ہیں کہ دوران نماز حرمت

کلام کا حکم مکہ مکرمہ میں ہی نازل ہو گیا تھا۔

تکبیر تحریمہ شطر صلوٰۃ ہے یا شرط صلوٰۃ؟

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ شطر صلوٰۃ ہے اوران کی دلیل یہ حدیث ہے جس میں تکبیر کو قراءۃ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور قراءۃ جزءِ صلوٰۃ ہے لہٰذا تکبیر تحریمہ بھی جزءِ صلوٰۃ ہوئی۔ ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تکبیر سے تکبیر تحریمہ مراد نہیں بلکہ نفس تکبیر ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ شرط صلوٰۃ ہے اوران کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وذكر اسم ربه فصلى﴾

اس میں ''اسم رب'' سے مراد تکبیر تحریمہ ہے اور ''فصلی'' میں جو ''ف'' حرف عطف ہے، وہ تغایر پر دلالت کرتا ہے اور شرط شی بھی شی سے خارج ہوتی ہے اس لئے تحریمہ شرط صلوٰۃ ہے۔

کاہن اور عرّاف کا فرق:

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کاہن اور عراف کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کاہن ان خبروں کے پیچھے پڑا رہتا ہے جو زمانۂ مستقبل میں پیش آنے والی ہوں۔ اور عراف چوری شدہ چیزوں اور گمشدہ چیزوں جیسے واقعات میں مگن رہتا ہے۔ بعض کاہنوں کا یہ دعویٰ بھی ہوتا ہے کہ جنات آ کر اسے مستقبل یا ماضی کے واقعات بتاتے ہیں اور بعض کاہن اپنی عقل نارسا کے بل بوتے پر یا کچھ علامات کو دیکھ کر اپنی غیب دانی کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں۔

اس سلسلے میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص کسی عراف یا کاہن کے پاس آیا اور اس کی کہی ہوئی باتوں کی تصدیق کی، گویا کہ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی شریعت کا انکار کر دیا۔

تطیّر سے کیا مراد ہے؟

اصل میں تطیر کا معنی ہے پرندے کے ذریعے فال لینا (یہ طیر سے ماخوذ ہے) لیکن بعد میں اسے ہر طریقے کیلئے استعمال کیا جانے لگا جس سے اچھی یا بری فال حاصل ہو (خواہ پرندے کے ذریعے یا کسی اور طریقے سے) زمانۂ جاہلیت میں لوگ پرندوں اور ہرن وغیرہ شکاری جانوروں سے فال لیا کرتے تھے اور ''سوانح'' کو مبارک اور ''بوارح'' کو منحوس خیال کرتے تھے۔

قاموس کے مطابق ''بوارح'' ان شکاری جانوروں کو کہا جاتا ہے جو دائیں جانب سے گذر کر بائیں جانب چلے جائیں اور ''سوانح'' ان جانوروں کو کہا جاتا ہے جو بائیں جانب سے گذر کر دائیں جانب چلے جائیں۔

اس زمانے کے رسم ورواج کے مطابق ''بوارح'' سے سامنا ہونے کی صورت میں لوگ اپنے مقاصد کی تکمیل سے رک جاتے تھے اور اپنے ضروری کاموں کو بھی ترک کر کے گھر میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ شریعت نے اس خیال باطل کی تردید کرتے ہوئے لوگوں کو اس سے منع فرمایا اور انہیں یہ بات باور کرائی کہ ان چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور انہیں اس دعاء کی تلقین کی۔

''اللّٰهم لا طير الا طيرك، ولا خير الا خيرك، ولا اله غيرك،

اللّٰھم لا یاتی بالحسنات الا انت، ولا یذھب بالسیات الا انت''

شریعت نے لوگوں کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی (جو آج کے جاہلیت زدہ طبقوں کو سمجھ نہیں آتی) کہ فال کے ان طریقوں میں کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں۔ یہ شیطان کا دھوکہ اور فریب ہے جسے وہ لوگوں کے سامنے خوشنما کر کے پیش کرتا ہے تاکہ لوگ اس کا اعتقاد رکھیں اور آہستہ آہستہ ان کا یہ ذہن بن جائے کہ اللہ کے علاوہ یہ چیزیں بھی مؤثر ہوسکتی ہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کے باطل اور کفریہ عقیدہ ہونے میں کسی کو شک نہیں ہوسکتا۔

نیز شریعت نے انہیں اس بات کی بھی تلقین کی محض ان پرندوں اور فال کے طریقوں سے گھبرا کر اپنی ضروریات زندگی اور اپنے مقاصد کو ترک کر دینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس مقصد کیلئے اپنے گھر سے نکلے ہیں، محض اس بنیاد پر اسے پورا کئے بغیر گھر کو واپس نہ جائیں، اس اعتبار سے اس نہی کا تعلق ان چیزوں سے ہوگا جن سے لوگ بظاہر وہم میں مبتلا ہو سکتے ہوں۔

لکیریں کھینچنے سے کیا مراد ہے؟

کہا جاتا ہے کہ حضرت ادریس یا حضرت دانیال علیہما السلام کچھ مخصوص طریقوں سے لکیریں کھینچا کرتے تھے جس سے بہت سی نامعلوم باتیں معلوم ہو جاتی تھیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ بن حکمؓ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی کا خط اپنی بناوٹ میں اور اپنی کیفیت میں مذکورہ نبی کے خط کے مشابہ اور موافق ہوگیا تو وہ صحیح ہے یعنی وہ لکیریں کھینچنے والا جتنی مضبوط فراست ایمانی اور کامل علم وعمل سے متصف ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ اس کے خط کا اقرب الی الصواب ہونا یقینی ہوگا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ''فراست'' سے مراد وہ قلبی نور لیتے ہیں جو بندۂ مومن کو منجانب اللہ عطا ہوا اور اس کی برکت سے بعض غیبی امور اس کی آنکھوں کے سامنے کھل کر آجائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کیفیت انسان کو اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ وہ علم وعمل کے اعتبار سے درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہو اور اس کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ جو شخص چالیس دن تک اپنے آپ کو اللہ کیلئے وقف کر دے تو اسکے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے جاری ہو جائیں گے۔ اور اس کی زبان حکمت بولے گی۔

اس حدیث کا مطلب بیان کرتے ہوئے علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ درحقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے ''**من وافق خط فذاك**'' یہ زجر وتوبیخ پر محمول ہے اور حدیث کا معنی یہ ہے کہ ان نبی کے خط کے موافق کسی کا خط نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کا یہ عمل بطور معجزہ کے تھا۔ ابن ملک بھی یہی معنی بیان کرتے ہوئے اس کی وجہ یہ ذکر فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے مذکورہ نبی کے خط کو جب دیکھا ہی نہیں تو موافقت اور مخالفت کیسے معلوم ہوسکتی ہے اور ان کا یہ عمل ان کی نبوت کی نشانی تھا جس کا زمانہ گذر چکا اور ظاہر ہے کہ کسی امر ممتنع پر کسی چیز کو معلق کرنا خود ممتنع ہے لہٰذا ان چیزوں کے ذریعے کسی نامعلوم چیز کا علم اور یقین ہونا بھی ممتنع ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی تشریح میں تحریر فرماتے ہیں کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام میں مشغول ہونے کی ممانعت نہیں فرمائی کیونکہ اس کی نسبت ایک نبی کی طرف کی جاتی ہے۔ کسی شخص کے ذہن میں یہ خیال نہ آجائے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کسی ایسے کام میں بھی مشغول ہو سکتے ہیں جو ان کی شایان شان نہ ہو۔ تاہم اتنی بات واضح ہے کہ چونکہ ہماری اور ان کی

شریعت ایک نہیں اس لئے فروع و جزئیاتِ احکام میں اختلاف کا ہونا ناگزیر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو علماء علمِ رمل کو حرام قرار دیتے ہیں ''اور ان کی تعداد زیادہ ہے'' ان کا یہ کہنا ہے کہ اس حدیث سے اس کے مباح و جائز ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس حدیث میں جو اجازت دی گئی ہے وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ خط مذکورہ نبی کے خط کے موافق ہو اور یہ کسی کو معلوم نہیں کیونکہ اس کا علم تواتر سے حاصل ہو سکتا ہے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی تصریح سے یا کسی صحابیؓ کے قول سے، اور ایسی کوئی بھی چیز موجود نہیں لہٰذا اس کا حرام ہونا واضح ہو گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے گرامی:

ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خط سے مراد وہ ہے جسے حازی (اپنے اندازے سے اشیاء کا تخمینہ لگانے والا) کھینچتا ہے۔ اصل میں یہ ایک مخصوص قسم کا علم تھا جسے لوگوں نے اس وجہ سے ترک کر دیا کہ اس میں کوئی فائدہ نہ رہا تھا، ہوتا یہ تھا کہ کوئی بھی ضرورت مند حازی کے پاس آتا اور اجرت کے طور پر اسے مٹھائی یا کوئی اور چیز پیش کرتا، اس حازی کے پاس ایک غلام ہوتا تھا جو اپنے پاس سرمہ کی ایک سلائی رکھتا تھا، وہ حازی کسی نرم زمین یا نرم لکڑی کے پاس آتا اور جلدی جلدی اس پر کچھ لکیریں کھینچ دیتا تا کہ انہیں گنا نہ جا سکے۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ ان لکیروں کو دو، دو کر کے مٹانا شروع کرتا، آخر میں اگر دو لکیریں باقی رہ جاتیں تو یہ کامیابی کی نشانی ہوتی تھی اور اگر ایک لکیر باقی رہ جاتی تو یہ ناکامی کی علامت ہوتی تھی۔

صاحب نہایہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے جس علم کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ تو بہت مشہور و معروف علم ہے اور اس میں مختلف تصانیف کثیر تعداد میں موجود ہیں، یہ علم تو آج تک معمول بہ ہے اور ہر ایک کی اپنی اپنی اصطلاحات اور اپنے اپنے طریقے ہیں جس سے چھپی ہوئی چیزیں دریافت کرنے میں مدد لی جاتی ہے، بعض اوقات اتفاقاً یہ طریقہ کارگر بھی ہو جاتا ہے اور کبھی خطا بھی کر جاتا ہے بلکہ اکثر ہی غلط ہوتا ہے۔

میرکؒ نے حازی کی ایک تعریف تو وہی کی ہے۔ جو ہم اوپر لکھ آئے اور کہا ہے کہ نجومی کو بھی حازی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی ستاروں کو دیکھ کر اندازہ اور تخمینہ لگاتا ہے، نیز کاہن کو بھی حازی کہا جاتا ہے۔

نماز میں سلام کا جواب دینے کا حکم

۹۷۹: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كُنَّا نُسَلِّمُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِي الصَّلَاةِ فَيَرُدُّ عَلَيْنَا فَلَمَّا رَجَعْنَا مِنْ عِنْدِ النَّجَاشِيِّ سَلَّمْنَا عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْنَا فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كُنَّا نُسَلِّمُ عَلَيْكَ فِي الصَّلَاةِ فَتَرُدُّ عَلَيْنَا فَقَالَ اِنَّ فِي الصَّلَاةِ لَشُغْلًا۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٨٨/٧۔ حديث رقم ٣٨٧٥۔ ومسلم في صحيحه ٣٨٢/١ حديث رقم (٣٤۔٥٣٨) وأبوداوٗد في السنن ٥٦٧/١ حديث رقم ٩٢٣۔ وأخرجه ابن ماجه ٣٢٥/١ حديث رقم ١٠١٨۔ وأحمد في المسند ٣٧٦/١۔ في المخطوطة "بالرد"۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہوتے اور ہم آپ کو

سلام کرتے تو آپ ﷺ ہمیں سلام کا جواب دیتے تھے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد جب ہم نجاشی کے پاس سے واپس آئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ ہم نے آپ ﷺ کو سلام کیا۔ آپ ﷺ نے ہمارے سلام کا جواب نہیں دیا جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ہم آپ کو نماز میں سلام کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ جواب دے دیتے تھے۔ آج آپ نے جواب کیوں نہیں دیا۔ آپ نے فرمایا کہ نماز خود ایک کام ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: اس حدیث میں نجاشی کا جو لفظ آیا ہے نون کے فتحہ اور کسرہ دونوں طرح سے ضبط کیا گیا ہے جیم کی تخفیف، نقطوں والے شین اور یاء کی تخفیف اور تشدید دونوں طرح سے نقل کیا گیا ہے قاموس میں یاء کی تخفیف کو افصح قرار دیا ہے۔ علامہ ابن تین فرماتے ہیں کہ یہاں یاء ساکن ہے یعنی یہ یائے نسبت نہیں بلکہ یائے اصلی ہے۔

نجاشی حبشہ کے بادشاہ کا لقب تھا، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے مطابق ان کا انتقال ۹ ھ میں ہوا ہے اور ان کا اصل نام اصحمہ تھا، ایمان لانے کے بعد جب ان کا انتقال ہوا تو نبی ﷺ نے صحابہ کرام کے ساتھ مل کر ان کی نماز جنازہ ادا فرمائی جس کی صورت یہ ہوئی کہ ان کی لاش کو ملک حبش سے اٹھا کر نبی ﷺ کے سامنے پیش کر دیا گیا اس طرح یہ نماز جنازہ غائبانہ نہیں تھی۔

اس حدیث کی تشریح میں ابن ملک فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے والے ان صحابہ کرام کا منشاء کفار و مشرکین کی ایذا رسانی اور ظلم و ستم سے اپنا بچاؤ تھا جب نبی ﷺ مدینہ منورہ ہجرت فرما گئے اور ان حضرات کو نبی ﷺ کی ہجرت کا علم ہوا تو یہ بھی حبشہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ یہ حضرات صحابہ مدینہ منورہ میں اس وقت پہنچے جب نبی ﷺ نماز پڑھا رہے تھے ان آنے والے صحابہ کرام میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی تھے جنہوں نے نبی ﷺ کو سلام کیا لیکن آپ ﷺ نے نماز کے دوران میں جواب نہیں دیا اور بعد میں فرمایا: ''ان فی الصلوٰۃ لشغلاً''

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تنوین تنکیر تنوین کے معنی میں ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ نماز کی مصروفیت قرآن کی تلاوت، تسبیح اور دعا ہے کلام نہیں اور دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ اس کی بارگاہ میں استغراق کی مصروفیت انتہائی عظیم مصروفیت ہے اس لئے اس وقت کسی اور کام میں مصروف نہیں ہونا چاہیے۔

مظہر فرماتے ہیں کہ دوران نماز گفتگو کرنا ابتداء اسلام میں جائز تھا بعد میں اسے حرام قرار دیا گیا۔ شرح السنۃ میں اکثر فقہاء کرام کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ زبان سے تو سلام کا جواب نہ دے کیونکہ اگر ایسا کیا تو نماز باطل ہو جائے گی۔ البتہ ہاتھ یا انگلی کے اشارے سے جواب دے سکتے ہے جس کی وجہ بیان کرتے علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ترمذی کی تصحیح کردہ روایت کے مطابق نبی ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ہاتھ سے جواب دیا تھا باقی رہی وہ روایت جس میں یہ فرمایا گیا کہ جو شخص نماز میں کوئی ایسا اشارہ کرے جو دیکھنے والے کو سمجھ میں آجائے تو (اس کی نماز باطل ہو جائے گی) اور اسے چاہیے کہ اپنی نماز لوٹا لے تو اس حدیث کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔

شرح منیہ میں ہے کہ اگر نمازی سلام کا جواب اپنے ہاتھ یا سر سے دے یا اس کوئی شخص سے کوئی چیز مانگے اور وہ اپنے سر یا ہاتھ سے اشارہ کر دے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی لیکن مکروہ ہے۔

علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سلام کا جواب نماز سے فارغ ہونے کے بعد دینا سنت ہے جیسا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو ان کے سلام کا جواب دیا۔ امام احمد ابن حنبل رحمہ اللہ اور تابعین کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔

نماز میں زمین کو ہموار کرنا

۹۸۰: وَعَنْ مُعَيْقِيبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الرَّجُلِ يُسَوِّي التُّرَابَ حَيْثُ يَسْجُدُ قَالَ اِنْ كُنْتَ فَاعِلاً فَوَاحِدَةً۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۳/۷۹۔ حديث رقم ۱۲۰۷۔ ومسلم في صحيحه ۱/۳۸۸ حديث رقم (۴۹۔۵۴۶)۔

ترجمہ: حضرت معیقیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ اس آدمی کے بارے میں جو سجدہ کی جگہ سے مٹی برابر کرتا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ضروری ہو تو ایک مرتبہ ایسا کر لیا کرو۔ (بخاری، مسلم)

راویٔ حدیث:

معیقیب بن ابی فاطمہ۔ ''معیقیب'' ہیں ''ابو فاطمہ'' کے بیٹے ہیں۔ ''دوسی'' ہیں۔ سعید بن ابی العاص کے آزاد کردہ ہیں۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ بہت پہلے مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے۔ دوسری ہجرت حبشہ میں انہوں نے بھی ہجرت کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لے جانے تک حبشہ میں مقیم رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر کی حفاظت پر مقرر تھے۔ ان کو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بیت المال کا افسر اعلیٰ بنایا تھا ان سے ان کے بیٹے ''محمد'' اور پوتے ''ایاس بن الحارث'' وغیرہ نے روایت کی۔ ۴۰ھ میں انتقال فرمایا۔

تشریح: اس حدیث میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے شرح منیہ میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سجدے کی جگہ سے کنکریوں کو الٹ پلٹ کرنا مکروہ ہے ہاں اگر کنکریوں کے اونچا نیچا ہونے کی وجہ سے ان پر پیشانی ٹکانا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں انہیں ایک یا دو مرتبہ برابر کرنا جائز ہے کیونکہ اس سلسلے کی ایک روایت میں ایک مرتبہ انہیں برابر کرنے کی اجازت مذکور ہے اور ایک روایت میں دو مرتبہ گو کہ زیادہ ظاہر یہی ہے کہ انہیں ایک ہی مرتبہ برابر کر لے اس پر اضافہ نہ کرے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز پڑھتے ہوئے کنکریوں کو مت چھیڑو اگر ایسا کرنا ضروری ہی ہو تو صرف ایک مرتبہ ایسا کر لو تا کہ وہ کنکریاں برابر ہو جائیں اور ان پر سجدہ کرنا ممکن ہو سکے۔ اور ایک روایت میں یہاں تک آتا ہے کہ تم میں سے جب کوئی شخص نماز کیلئے کھڑا ہو تو وہ کنکریاں برابر نہ کرے کیونکہ کنکریاں برابر نہ کرنے کی صورت میں اللہ کی رحمت اس کی طرف مکمل متوجہ ہو جاتی ہے۔

نماز میں خصر منع ہے

۹۸۱: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخَصْرِ فِي الصَّلٰوةِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۳/۸۸۔ حديث رقم ۱۲۲۰۔ ومسلم في صحيحه ۱/۳۸۷ حديث رقم (۴۶۔۵۴۵) وأبو داؤد

فی السنن ۱/۵۸۲ حدیث رقم ۹٤۷۔والترمذی ۲/۲۲۳ حدیث رقم ۳۸۳۔والنسائی ۲/۱۲۷ حدیث رقم ۸۹۰۔والدارمی ۱/۳۹۲ حدیث رقم ۱٤۲۸۔وأحمد فی المسند ۲/۳۹۹۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں خصر سے منع کیا ہے۔(بخاری،مسلم)

خصر سے کیا مراد ہے؟

اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خصر فی الصلوٰۃ سے منع فرمایا ہے جس کا معنی بعض حضرات یہ بیان کرتے ہیں کہ ہاتھ سے مخصرہ نامی لکڑی کو پکڑ کر اس پر سہارا لگایا جائے بلا عذر ایسا کرنا مکروہ ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے دیوار پر ٹیک لگانا اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ خصر کا مطلب یہ ہے کہ مکمل سورۃ کی تلاوت نہ کی جائے چونکہ تکمیل سورت زیادہ اولیٰ ہے لیکن اس کے ایک جز پر اکتفاء کرنا مکروہ بھی نہیں ہے اس لئے یہاں پر یہ معنی مراد لینا صحیح نہیں ہے، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد کوکھ پر ہاتھ رکھنا اس کی تائید اکثر روایات سے ہوتی ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختصار سے منع فرمایا ہے اور فرمایا کہ اختصار جہنمیوں کی راحت ہے۔

حافظ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خصر کی تفسیر کوکھ پر ہاتھ رکھنے سے کی گئی ہے جو کہ یہودیوں کا طریقہ ہے لیکن یاد رہے کہ خصر کی یہ تعریف لغت کی کسی کتاب میں نہیں کی گئی اور نہ ابھی تک میں کسی ایسی تعریف پر مطلع ہوا ہوں۔

یہ بات طے ہے کہ اس حدیث کی تخریج امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی فرمائی ہے جن کے بعض رواۃ میں غالباً بعض لوگ ایسے ہیں جو خصر سے اختصار مراد لیتے ہیں اسی وجہ سے ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کو مختصر ہونے کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔

''نھٰی عن الاختصار فی الصلوٰۃ'' معلوم ہوا کہ بطلانِ نماز کیلئے اختصار کا اعتبار ہے خصر کا نہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تورپشتی رحمہ اللہ کا اکابر اور ثقات ائمہ محدثین کے قول کی تردید کرتے ہوئے یہ فرمانا کہ خصر کی یہ تعریف لغت کی کسی کتاب میں نہیں کی گئی، اپنے اندر کچھ حقیقت نہیں رکھتا کیونکہ مجاز اور کنایہ کا استعمال سماع پر موقوف نہیں (کہ لغت کی کتاب کا حوالہ ضروری ہو) بلکہ اس کا استعمال اس تعلق پر موقوف ہوتا ہے جس پر اعتبار کیا جا سکے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خصر کا معنی ہوتا ہے کوکھ اور یہ انسان کے جسم کے درمیان میں ہوتی ہے۔ جب نہی کا درود اس پر ہوا تو معلوم ہوا کہ یہاں مراد اس امر کی نہی ہے جو اس کے ساتھ متعلق ہو، چونکہ تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ حدیث میں اس سے مراد کوکھ پر ہاتھ رکھنا ہے تو پھر اسے اسی معنی پر محمول کیا جائے گا کہ کنایۃً ہی سہی، کیونکہ ذات کی نفی زیادہ قوی ہوتی ہے بہ نسبت صفات کی نفی کے۔

ابن ملک بعض روایات کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ اصل میں نماز کے اندر یہ کیفیت اختیار کرنے کی ممانعت اسلئے وارد ہوئی ہے کہ جب ابلیس راندۂ درگاہ ہو کر زمین پر اترا تھا تو اس وقت اس کی یہی کیفیت تھی اور اس نے اپنی کوکھ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔

نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا منع ہے

۹۸۲: وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ سَئَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْاِلْتِفَاتِ فِي الصَّلَاةِ فَقَالَ هُوَ اخْتِلَاسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطٰنُ مِنْ صَلٰوةِ الْعَبْدِ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٢٣٤۔حديث رقم ٧٥١۔وأبوداوٗد في السنن١/٥٦٠حديث رقم ٩٠٩۔والترمذي ٢/٤٨٤حديث رقم٥٩٠۔والنسائي ٣/٨حديث رقم ١١٩٦۔وأحمد في المسند ٦/١٠٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں ادھر ادھر دیکھنے کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اچک لینا ہے کہ شیطان بندے کی نماز میں سے اچک لیتا ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: دوران نماز چہرہ پھیر کر ادھر ادھر دیکھنے اور متوجہ ہونے سے نماز مکروہ ہو جاتی ہے لیکن اگر چہرہ پھیرے بغیر صرف آنکھیں گھما کر ادھر ادھر دیکھ لیا تو اس سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اگرچہ خلافِ اولیٰ ہے اور اگر اس موقع پر آدمی کا سینہ ہی قبلہ سے پھر گیا تو بالاتفاق نماز باطل ہو جائے گی۔

بعض علماء کرام کی رائے یہ بھی ہے کہ جو آدمی دوران نماز دائیں بائیں دیکھتا ہے اس کی نماز سے خشوع رخصت ہو جاتا ہے اور اکثر علماء کے مطابق کمال نماز اسی پر موقوف ہے، اس لئے وہ بھی حاصل نہ ہوگا، بلکہ بعض علماء کی رائے کے مطابق تو صحتِ نماز خشوع پر موقوف ہے، لہٰذا اس قول کے مطابق تو نماز ہی نہ ہوگی اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ بندہ جب نماز پڑھ رہا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ مسلسل اس کی طرف متوجہ رہتے ہیں بشرطیکہ وہ ادھر ادھر نہ دیکھے، اور جب وہ ادھر ادھر دیکھنے اور متوجہ ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ اس سے اپنی توجہ ہٹا لیتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اس آخری حدیث کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ رحمت کی توجہ نہ ہونے سے کنایہ ہے (اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بھرپور توجہ سے وہ محروم ہو جاتا ہے) اور بعض علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ اس شخص نے بلاضرورت اس کام کا ارتکاب کر کے بالخصوص جبکہ اسے یہ بات معلوم بھی تھی کہ دوران نماز ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے آپ کو رحمت الٰہیہ سے محروم کر لیا۔

البتہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مسلم شریف کی ایک روایت میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مرضِ وفات میں مبتلا ہوئے اور اس دوران ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر صحابہ کرام کو نماز پڑھائی جبکہ صحابہ پیچھے کھڑے تھے اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے التفات کی صورت میں صحابہ کرام کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ نیز صحیح سند سے یہ بھی ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فجر کی نماز پڑھاتے ہوئے گھاٹی کی طرف اِدھر اُدھر دیکھا تا کہ حفاظتی نقطۂ نظر سے وہاں کوئی محافظ مقرر کر سکے۔

ان دونوں حدیثوں میں التفات سے مراد کن اکھیوں سے دیکھنا ہے چہرہ گھما کر دیکھنا نہیں اور اسکی دلیل یہ صحیح حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دائیں بائیں دیکھا کرتے تھے لیکن گردن موڑ کر پس پشت نہیں دیکھتے تھے اسلئے یہ جائز تو ہے لیکن خلافِ اولیٰ ہے۔

نماز میں بوقتِ دُعا نظر آسمان کی طرف نہ اٹھائی جائے

۹۸۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیَنْتَهِیَنَّ اَقْوَامٌ عَنْ رَفْعِهِمْ اَبْصَارَهُمْ عِنْدَ الدُّعَاءِ فِی الصَّلٰوةِ اِلَى السَّمَاءِ اَوْ لَتُخْطَفَنَّ اَبْصَارُهُمْ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۲۳۳۔حديث رقم ۷۵۰۔ومسلم في صحيحه ۱/۳۲۱حديث رقم(۱۱۸۔۴۲۹)۔والنسائي ۳/۷حديث رقم ۱۱۹۳۔وابن ماجه ۱/۳۳۲حديث رقم ۱۰۴۵۔والدارمي ۱/۳۳۹حديث رقم۱۳۰۱۔وأحمد في المسند۳/۱۰۹۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگ نماز میں اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھانے سے باز رہیں۔ ورنہ ان کی نگاہیں اچک لی جائیں گی۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو دعا کرتے وقت آسمان کی طرف نظریں اٹھانے سے باز آ جانا چاہیے ورنہ ان کی قوتِ بصارت سلب کر لی جائے گی کیونکہ اس سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف اوپر کی جانب موجود ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ جہت سے پاک اور ہر جگہ موجود ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں تہدید کا پہلو اختیار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ دو میں سے کوئی نہ کوئی کام تو ہو کر ہی رہے گا اس کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''لنخرجنك یا شعیب والذین امنوا معك من قریتنا اولتعودن فی ملتنا''

حافظ ابن حجر اس کی مثال میں یہ آیت پیش فرماتے ہیں: ﴿تقاتلونهم اویسلمون﴾

یعنی کہ دو میں سے کوئی ایک بات تو بہر حال ہوگی ان دو کے علاوہ کوئی تیسری بات نہیں ہو سکتی ''یا قتال یا اسلام'' اسی طرح اخراج یا کفر کی طرف واپسی گویا ان دونوں آیتوں اور حدیث میں خبر بمعنی امر کے ہے۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دعا کے وقت جبکہ آدمی نماز میں نہ ہو آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دعا کرنے کی کراہت میں علماء کرام کا اختلاف ہے قاضی شریح اور دیگر حضرات اسے مکروہ قرار دیتے ہیں اور اکثر علماء کرام اسے جائز قرار دیتے ہیں کہ آسمان دعا کا قبلہ ہے جیسے کعبہ نماز کا قبلہ ہے اس لئے یہ مکروہ نہیں ہے جیسے نماز میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ناپسندیدہ نہیں۔

اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ دعا کی حالت میں ہاتھوں کو اٹھانا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول بھی ہے اور اس کا حکم بھی ہے لیکن نگاہوں کو آسمان کی طرف متوجہ کرنا ممنوع ہے جیسا کہ علامہ جزری رحمۃ اللہ علیہ نے حصنِ حصین میں آدابِ دعا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

حافظ ابن احجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مضمون کی روایت بخاری شریف میں بھی آتی ہے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا نماز میں آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ ابتداء میں تو یہ نکیر انہی الفاظ میں تھی لیکن بعد میں اس میں شدت آ گئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ لوگ ابھی تک اس سے باز نہیں آئے تو فرمایا پھر لوگوں کو اس سے باز آ جانا چاہیے۔ ورنہ ان کی قوت بصارت سلب کر لی جائے گی۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابتداء میں آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا کرتے تھے جیسا کہ صحیح روایات سے ثابت

ہے لیکن جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ ''الذین هم فی صلاتهم خاشعون'' تو نبی ﷺ نے نگاہیں اٹھانا بند کر دیا۔

نماز میں بچے کو کندھے پر اُٹھانا

۹۸۴: وَعَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَتْ رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَؤُمُّ النَّاسَ وَاُمَامَةُ بِنْتُ اَبِی الْعَاصِ عَلٰی عَاتِقِهٖ فَاِذَا رَکَعَ وَضَعَهَا وَاِذَا رَفَعَ مِنَ السُّجُوْدِ اَعَادَهَا۔ (متفق علیه)

أخرجه مسلم فی صحيحه ٣٨٦/١ حديث رقم (٤٢-٥٤٣)۔ والنسائی ١٠/٣ حديث رقم ١٢٠٥۔ وأحمد فی المسند ٢٩٦/٥ فی المخطوطة "الذوات"۔ فی المخطوطة بصيغة المذكر۔ فی المخطوطة زيادة "كون"۔ فی المخطوطة "انفصاله"۔

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے اور امامہ بنت ابوالعاص آپ کے کندھے پر بیٹھی تھیں۔ جب آپ رکوع کرتے تو امامہ کو نیچے بیٹھا دیتے۔ اور جب سجدے سے اٹھتے تو پھر کندھے پر بیٹھا لیتے تھے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: علامہ خطابی رحمہ اللہ اس حدیث کی وضاحت میں فرماتے ہیں کہ حضرت امامہ رضی اللہ عنہا کا جو واقعہ اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ نماز پڑھا رہے تھے اور یہ نبی ﷺ کے مبارک کندھوں پر سوار تھیں۔ جب نبی ﷺ نے رکوع کیا تو اتار دیا اور سجدے سے سر اٹھانے کے بعد انہیں دوبارہ اپنے کندھے پر سوار کر لیا اس میں انہیں اٹھانے کی نسبت نبی ﷺ کی طرف جو کی گئی ہے وہ مجازاً ہے کیونکہ نبی ﷺ نے انہیں ارادۃً نہیں اٹھایا تھا اسلئے کہ ایسا کرنے سے نماز سے توجہ ہٹ جاتی ہے البتہ اتنی بات ضرور ہے چونکہ عادۃً وہ اکثر نبی ﷺ کے کندھے پر سواری کا شرف اٹھایا کرتی تھیں اور نبی ﷺ انہیں اپنے کندھوں سے نہیں اتارتے تھے اس لئے اس موقع پر بھی انہیں نہیں اتارا۔

ہمارے رائے میں اگر ایسا کرنے سے نبی ﷺ کی نماز میں خلل آتا اور نماز سے توجہ ہٹ جاتی تو نبی ﷺ ضرور انہیں اپنے کندھے سے اتار دیتے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ واقعہ نبی ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے یا یہ واقعہ نبی ﷺ کے اس ارشاد سے پہلے کا ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔ ''ان فی الصلوٰۃ لشغلاً'' یا پھر بیانِ جواز پر اسے محمول کیا جائے گا کیونکہ کراہت کے ساتھ یہ جائز تو ہے جیسا کہ منیۃ المصلی میں اس کی تصریح ہے اور شرح السنۃ میں ہے کہ یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ محرم عورتوں کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ لیکن ہماری رائے میں یہاں لمس کا تحقق ہوتا ہی نہیں اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ وہ اس وقت بچی تھیں اور غیر مشتہات تھیں۔

یہ رائے قائم کرنے کے بعد میں نے جب حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی فتح الباری کا مطالعہ کیا تو وہاں بھی یہی لکھا ہوا تھا کہ یہ تو بڑی عجیب بات ہے بالخصوص جبکہ حضرت امامہ اس وقت بالکل چھوٹی بچی تھیں حالانکہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر بچی حد طفولیت سے نکل جائے اور مشتہات ہونے کی حد تک نہ پہنچے تو اگرچہ وہ اجنبیہ ہی کیوں نہ ہو اسے چھونے سے نماز نہیں ٹوٹتی۔

اس حدیث سے مندرجہ ذیل امور بھی مزید معلوم ہوتے ہیں:

① بچوں کے کپڑے اور جسم طہارت پر محمول کیے جائیں گے جب تک کہ کوئی نجاست واضح طور پر معلوم نہ ہو۔

② عمل قلیل سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

③ متعدد افعال اگر فاصلے سے ہوں تب بھی نماز باطل نہیں ہوتی۔ اس تیسرے مسئلے میں علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فاصل کا ایک رکعت کے بقدر ہونا شرط ہے لیکن علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس رائے کو غریب اور ضعیف قرار دیا ہے اور فرمایا ہے اس سلسلے میں صحیح قول یہ ہے کہ جسے عرف عام میں حد فاصل سمجھا جا سکے وہی مراد ہو گی جبکہ ہمارے ہاں اس سے مراد اتنی مقدار ہے جس میں نماز کا کوئی ایک رکن ادا کیا جا سکے۔

نماز میں جمائی کا حکم

۹۸۵ :وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا تَثَاءَ بَ اَحَدُکُمْ فِی الصَّلٰوۃِ فَلْیُکْظِمْ مَا اسْتَطَاعَ فَاِنَّ الشَّیْطٰنَ یَدْخُلُ ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کسی کو نماز میں جمائی آ جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کو حتی الامکان روکے۔ کیونکہ شیطان منہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں جمائی لیتے وقت حتی الامکان منہ کو بند رکھنے کی جو ترغیب وارد ہوئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سستی اور غلبۂ نیند کی علامت ہے، اور اطاعت الٰہیہ میں جو چیز بھی موجب غفلت ہو یا اس میں دلجمعی کا کمی کا سبب بنے، وہ ناپسندیدہ ہے، اس لئے اپنی طاقت کے بقدر جب تک ہونٹوں کو بھینچ کر منہ بند رکھنا ممکن ہو، اسے بند رکھے ورنہ ہاتھ رکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں جیسا کہ منیۃ المصلی میں ہے۔

نیز اس حدیث میں جمائی کے وقت منہ کھولنے پر اس میں شیطان داخل ہو جانے کا ذکر ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے ابن ملک فرماتے ہیں کہ ''منہ'' کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ جب بھی کسی ناپسندیدہ کام پر منہ کھلتا ہے تو وہ شیطان کا راستہ بن جاتا ہے اور یوں اس کیلئے جسم انسانی میں داخلہ ممکن ہو جاتا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل میں تثاؤب (جمائی) کا معنی ہے سستی یا پیٹ بھرا ہوا ہونے کی وجہ سے کسی جانور کا منہ کھولنا، یہ کیفیت نیند آور ہوتی ہے اور نیند کے ذریعے شیطان نمازی کو اس کی نماز سے خارج کروا دیتا ہے اور اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ میں نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں؟ اس لئے تثاؤب کو دخول شیطان کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسی مضمون کی جو صحیح روایت مروی ہے:۔

''ان اللّٰہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب''

اس کی وجہ بھی یہی ہے کیونکہ چھینک آنے کے اسباب وہ نہیں ہوتے جو جمائی آنے کے ہوتے ہیں بلکہ اس کے ذریعے انسان کے دل و دماغ بالکل ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں، انسان کی طبیعت میں نشاط اور نکھار آ جاتا ہے اور اس کے بعد انسان تندہی سے عبادات کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ''الحمد للہ'' کہہ کر اللہ کا شکر ادا کرنا چھینکنے پر مسنون ہے، نہ کہ جمائی آنے پر۔

۹۸۶ : فِیْ رِوَایَۃٍ لِلْبُخَارِیِّ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ اِذَا تَثَاءَ بَ اَحَدُکُمْ فِی

الصَّلٰوةِ فَلْيُكْظِمْ مَا اسْتَطَاعَ وَلَا يَقُلْ هَا فَاِنَّمَا ذَالِكُمْ مِنَ الشَّيْطٰنِ يَضْحَكُ مِنْهُ۔

أخرجه مسلم في صحيحه ٢٢٩٣/٤حديث رقم (٥٧_٢٩٩٥)۔وأبوداوٗد ٢٨٧/٥حديث رقم ٥٠٢٧۔والترمذی ٢٠٦/٢حديث رقم ٣٧٠۔

ترجمه: اور بخاری کی روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے الفاظ اس طرح ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو نماز میں جمائی آ جائے تو جس قدر ممکن ہو وہ منہ بند کرے اور ہا نہ کہے جیسا کہ جمائی کے وقت بے اختیار یہ لفظ منہ سے نکل جاتا ہے اس لئے کہ یہ شیطان کی طرف سے ہے اور وہ اس سے ہنستا ہے۔

تشریح: اس حدیث میں جمائی لیتے وقت حتی الامکان منہ کو بند رکھنے کی جو ترغیب وارد ہوئی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سستی اور غلبہ نیند کی علامت ہے اور اطاعت الٰہی میں جو چیز بھی موجب غفلت ہو یا اس میں دلجمعی کی کمی کا سبب بنے، وہ ناپسندیدہ ہے، اس لئے اپنی طاقت کے بقدر جب تک ہونٹوں کو بھینچ کر منہ بند رکھنا ممکن ہو، اسے بند رکھے ورنہ ہاتھ رکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں جیسا کہ منیۃ المصلی میں ہے۔

نیز اس حدیث میں جمائی کے وقت منہ کھولنے پر اس میں شیطان کے داخل ہو جانے کا راستہ بن جاتا ہے اور یوں اس کیلئے جسم انسانی میں داخلہ ممکن ہو جاتا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصل میں تثاؤب (جمائی) کا معنی ہے سستی یا پیٹ بھرا ہونے کی وجہ سے کسی جانور کا منہ کھولنا، یہ کیفیت نیند آور ہوتی ہے اور نیند کے ذریعے شیطان نمازی کو اس کی نماز سے خارج کروا دیتا ہے اور اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ میں نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں؟ اس لئے تثاؤب کو دخول شیطان کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی مضمون کی جو صحیح روایت مروی ہے۔

''ان اللّٰه يحب العطاس ويكره التثاؤب''

اس کی وجہ بھی یہی ہے کیونکہ چھینک آنے کے اسباب وہ نہیں ہوتے جو جمائی آنے کے ہوتے ہیں بلکہ اس کے ذریعے انسان کے دل و دماغ بالکل ہلکے پھلکے ہو جاتے ہیں، انسان کی طبیعت میں نشاط اور نکھار آ جاتا ہے اور اسکے بعد انسان تندہی سے عبادات کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ''الحمد للہ'' کہہ کر اللہ کا شکر ادا کرنا چھینکنے پر مسنون ہے، نہ کہ جمائی آنے پر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک جن کے ساتھ واقعہ

٩٨٧:وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ عِفْرِيْتًا مِنَ الْجِنِّ تَفَلَّتَ الْبَارِحَةَ لِيَقْطَعَ عَلَىَّ صَلَاتِیْ فَاَمْكَنَنِی اللّٰهُ مِنْهُ فَاَخَذْتُ فَاَرَدْتُ اَنْ اَرْبِطَهٗ عَلٰى سَارِيَةٍ مِّنْ سَوَارِی الْمَسْجِدِ حَتّٰى تَنْظُرُوْا اِلَيْهِ كُلُّكُمْ فَذَكَرْتُ دَعْوَةَ اَخِیْ سُلَيْمَانَ رَبِّ هَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِنْ بَعْدِیْ فَرَدَدْتُهٗ خَاسِئًا ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٥٥٤/١_حديث رقم ٤٦١ ـومسلم في صحيحه ٣٨٤/١حديث رقم (٣٩_٥٤١)وأحمد في المسند ٢٩٨/٢ـ في المخطوطة "السورة ـ بالمثلة"هكذا في المخطوطة ـ

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آج رات جنوں میں سے ایک دیو جھپٹ کر میرے پاس آیا تا کہ میری نماز میں خلل ڈالے مگر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس پر حاوی کر دیا چنانچہ میں نے اس کو پکڑ لیا اور ارادہ کیا کہ مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون سے باندھ دوں تا کہ تم سب لوگ اس کو دیکھ لو پھر مجھے اپنے بھائی حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہ دعا یاد آ گئی۔ رب هب لي ملكا لا ينبغي لاحد من بعدي۔ اے میرے پروردگار مجھے ایسی بادشاہت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کے لئے مناسب نہ ہو۔ چنانچہ میں نے اس کو ذلیل بنا کر چھوڑ دیا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: اس حدیث میں عفریت بروزن فعلیت بمعنی خبیث کے ہے اور آگے من الجن سے اس کی وضاحت ہے کیونکہ عفریت جنات ہی میں سے ہوتے ہیں، یہ ایسے لطیف اجسام ہوتے ہیں جن کی تخلیق یا تو صرف آگ سے ہوتی ہے یا غالب عنصر آگ ہوتی ہے، یہی دو قول ملائکہ میں بھی اختیار کئے گئے ہیں کہ یا تو وہ نور محض سے پیدا کئے گئے ہیں یا ان کی تخلیق میں نور کا پہلو غالب ہے اور جسمانی لطافت میں یوں بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ ان کیلئے ہر روپ دھارنا ممکن ہوتا ہے یہ الگ بات ہے کہ جنات عام طور پر قبیح شکلیں اختیار کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کی فطرت کا لازمی حصہ ہے۔

اس حدیث کی وضاحت میں ابن مالک فرماتے ہیں کہ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیطان کی اپنی ذات ناپاک نہیں اور نہ اسے چھونے سے نماز ٹوٹتی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۃ اعراف کی یہ آیت:

"انه يراكم هو وقبيله من حيث لا ترونهم"

عموم پر محمول ہے یا یہ مطلب ہے کہ تم انہیں ان کی اصلی شکل وصورت میں نہیں دیکھ سکتے جس پر انہیں اللہ نے پیدا فرمایا ہے کیونکہ ان کے اجسام کو وہ زائد لطافت دی گئی ہے جو ہماری قوت بینائی کے دائرے سے خارج ہے کیونکہ ہماری فطرت میں مٹی کے اثرات اور عناصر زیادہ ہونے کی وجہ سے کثافت غالب ہے۔

بظاہر اس حدیث میں جس مسجد کا یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے اس سے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہے کہ وہاں ایک جن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں خلل ڈالنا چاہا تو اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر قدرت عطا فرمائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پکڑ لیا اور فرمایا کہ اگر میں چاہتا تو اسے مسجد کے کسی ستون سے باندھ دیتا تا کہ تم سب بھی اسے دیکھتے اس سے عبرت حاصل کرتے اور اس بات کا یقین کر لیتے کہ اللہ نے مجھے بھی ان پر ویسے ہی حکومت عطا فرما رکھی ہے جیسے حضرت سلیمانؑ کو عطا فرما رکھی تھی اور اس میں اس کی وہ طاقت بھی کام نہیں آ سکتی تھی جس کی بدولت وہ مختلف شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ نے بطور معجزے کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کی یہ صلاحیت سلب کر لی تھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تو بہت اونچا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سامنے اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ قوت سلب کر لی تھی اور یہ اس وقت کی بات جبکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صدقے کی کھجوروں کی نگرانی پر مامور تھے شیطان نے آ کر اس میں سے کچھ کھجوریں چوری کر کے لے جانے لگا اور دو تین مرتبہ کے واقعے کے بعد اس نے آیت الکرسی کی فضیلت سنا کر جان چھڑائی کہ اپنے پڑھنے والے کی حفاظت کرتی ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ کوئی ضرورت مند مسلمان ہے اس لئے اسے

ترس کھا کر چھوڑ دیا لیکن بعد میں نبی ﷺ نے اسے بتایا کہ وہ شیطان تھا لیکن جھوٹا ہونے کے باوجود اس نے بات سچ بتائی۔

اگر شیطان کیلئے یہ ممکن ہوتا کہ کوئی دوسری شکل وصورت اختیار کر کے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اپنی جان چھڑا کر بھاگ سکتا تو یقیناً وہ ایسا کر لیتا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو پتہ بھی نہ چلتا اور یہیں سے حضرت سلیمانؑ اور جناب رسول اللہ ﷺ کے درمیان امتیاز واضح ہو جاتا ہے کیونکہ حضرت سلیمانؑ کے کسی پیروکار کے متعلق ایسا کوئی واقعہ ثابت نہیں ہے۔

''قوله فردته خاسئاً''

اس جملے کا معنی بیان کرتے ہوئے علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے اسے دھتکار کر بھگا دیا یا یہ معنی بھی مراد ہو سکتا ہے کہ میں نے اسے ذلیل کر کے چھوڑ دیا، مظہر فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں نے اسے کسی ستون سے باندھ دیا ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ حضرت سلیمانؑ کی دعا قبول نہیں ہوئی لیکن اس سے زیادہ واضح معنی یہ ہے کہ اگر حضرت سلیمانؑ کی دعا قبول نہ ہو چکی ہوتی تو میں اسے ضرور باندھ دیتا۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ اس مقام پر اس اشکال کو حل کرنا بھی ضروری ہے کہ اس روایت کے مطابق نبی ﷺ کو حضرت سلیمانؑ کی دعا اس وقت یاد آئی جب آپ ﷺ اسے پکڑ چکے تھے اور اسی باب کے آخر میں اس مضمون کی جو روایت ذکر کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات نبی ﷺ کو پہلے یاد آئی۔ یوں ان دونوں روایتوں میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں میں کوئی منافات نہیں کیونکہ ان دونوں کا لسانِ نبوت سے صادر ہونا دو الگ الگ وقتوں میں تھا اور یہ جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ آخر باب میں ''ثم اردت ان اخذه'' میں اخذ سے مراد صرف پکڑنا نہیں بلکہ باندھنے کیلئے پکڑنا مراد ہے کیونکہ صرف اسے پکڑنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمانؑ کی دعا قبول نہیں ہوئی ہاں اسے پکڑ کر باندھنے سے یہ لازم آ سکتا تھا لیکن نبی ﷺ نے ایسا کیا ہی نہیں اس لئے ان دونوں کے درمیان کوئی منافات بھی نہیں یہ دونوں جواب تو اس صورت میں ہیں جبکہ دونوں حدیثوں کو ایک ہی واقعے پر محمول کیا جائے اور اگر یہ دو الگ الگ واقعے ہوں تو پھر اس تکلف کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔

لقمہ دینے کی ایک صورت

٩٨٨: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ اَبِىْ سَعْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَابَهٗ شَيْءٌ فِيْ صَلٰوتِهٖ فَلْيُسَبِّحْ فَاِنَّمَا التَّصْفِيْقُ لِلنِّسَاءِ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ اَلتَّسْبِيْحُ لِلرِّجَالِ وَالتَّصْفِيْقُ لِلنِّسَاءِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٧٧/٣۔حديث رقم ١٢٠٤۔ومسلم في صحيحه ٣١٦/١حديث رقم (١٠٢۔٤٢١) وأبوداؤد ٥٧٨/١حديث رقم ٩٤٠۔والنسائي ٧٧/٢حديث رقم ٧٨٤۔والدارمي ٣٦٥/١حديث رقم ١٣٦٤۔والموطا ١٦٣/١ حديث رقم ٦١من كتاب قصر الصلاة وأحمد في المسند ٣٣٣/٥۔

ترجمه: حضرت سہل بن ابی سعدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس آدمی کو نماز میں کوئی بات پیش آجائے تو اس کو چاہئے وہ سبحان اللہ کہے اور تالی بجانا عورتوں کے لئے خاص ہے۔ اور ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ سبحان اللہ کہنا مردوں ~~کے ساتھ مخصوص~~ ہے اور تالی بجانا عورتوں کے ساتھ خاص ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی توضیح میں فرماتے ہیں کہ "من ناب" کا لفظ "نوب" سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہوتا ہے "رجوع" ایک چیز کا یکے بعد دیگرے لوٹ کر آنا، بعد میں کثرت استعمال کی بناء پر اسے ہر اس مصیبت یا پریشانی کے معنی میں لیا جانے لگا جس سے انسان دوچار ہو، اگر نماز میں کوئی اچنبھے والی چیز امام سے صادر ہو تو مردوں کو "سبحان اللہ" کہنا چاہیے، تصفیق یعنی ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مارنے کی اجازت صرف عورتوں کیلئے ہے کیونکہ ان کی آواز بھی عورت ہے جیسا کہ ابن ملک نے فرمایا ہے۔

اور علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تصفیق کی اجازت مردوں کیلئے نہیں ہے کیونکہ یہ مردانہ وجاہت وشہامت کے خلاف اور نامناسب ہے، علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ تصفیق کا مطلب واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کا اندرونی حصہ بائیں ہتھیلی کے پشت والے حصہ پر مارنا تاکہ اس سے آواز پیدا ہو جائے اور امام سمجھ لے کہ اس سے کوئی غلطی ہوتی ہے۔ تصفیق کہلاتا ہے، جبکہ تاج المصادر میں اس کا مفہوم یہ لکھا ہے کہ دائیں ہاتھ کی انگلیوں کی پشت بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارنا تصفیق کہلاتا ہے۔

الفصل الثانی:

نماز میں سلام کا جواب منع ہے

۹۸۹: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ كُنَّا نُسَلِّمُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِی الصَّلٰوةِ قَبْلَ اَنْ نَاْتِیَ اَرْضَ الْحَبَشَةِ فَيَرُدُّ عَلَيْنَا فَلَمَّا رَجَعْنَا مِنْ اَرْضِ الْحَبَشَةِ اَتَيْتُهٗ فَوَجَدْتُّهٗ يُصَلِّیْ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَیَّ السَّلَامَ حَتّٰی اِذَا قَضَی الصَّلٰوةَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ مِنْ اَمْرِهٖ مَا يَشَاءُ وَاِنَّ مِمَّا اَحْدَثَ اَنْ لَّا تَتَكَلَّمُوْا فِی الصَّلٰوةِ فَرَدَّ عَلَیَّ۔

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۱/۵٦۷ حدیث رقم ۹۲٤۔ وأحمد فی المسند ۱/۳۷۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حبشہ جانے سے پہلے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب آپ نماز میں ہوتے تھے سلام کرتے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سلام کا جواب دیا کرتے تھے۔ پھر جب ہم حبشہ سے واپس آئے تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اس وقت میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہیں دیا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو گئے تو فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اپنے جس حکم کو چاہتا ہے ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اب یہ حکم ظاہر کیا ہے کہ نماز میں بات چیت نہ کیا کرو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سلام کا جواب دیا۔

تشریح: اس حدیث کے مضمون پر گذشتہ صفحات میں سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے تاہم ابن ملک کا یہ نکتہ جو انہوں نے اس حدیث سے اخذ کیا ہے قابل بیان ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا، نماز سے فراغت کے بعد سلام کا جواب دینا مستحب ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص قضاء حاجت میں مشغول ہو، یا تلاوت قرآن میں منہمک ہو اور کوئی اسے سلام کرے تو فارغ ہونے کے

بعد ان کا جواب دینا مستحب ہے۔

تخریج حدیث پر ایک اشکال:

صاحبِ مشکوٰۃ کے مطابق اس حدیث کی تخریج امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے اور حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بقول امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی تخریج کی ہے۔ اور دونوں سندیں صحیح ہیں۔ لیکن میرک فرماتے ہیں کہ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات محل نظر ہے کیونکہ امام ابوداؤد نے حدیث کا آخری جملہ ''انما الصلوٰۃ لقراءۃ القرآن'' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل نہیں کیا بلکہ انہوں نے یہ جملہ حضرت معاویہ بن حکم السلمیؓ کے حوالے سے ایک طویل روایت میں نقل کیا ہے اور اس کی تصحیح یا تضعیف کی بجائے اس پر سکوت فرمایا ہے اور منذری نے بھی اس کی توثیق کرتے ہوئے اس فیصلے کو برقرار رکھا ہے۔

اصل میں صاحبِ مصابیح نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ارشاد ''فرد علی السلام'' کے فوراً بعد ''وقال ان الصلوٰۃ'' کا جملہ نقل کر دیا جس سے دونوں حدیثوں میں خلط واقع ہو گیا اور صاحبِ مشکوٰۃ یہ سمجھے کہ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی گذشتہ حدیث کا تمتہ اور تکملہ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ صاحبِ مصابیح کا مقصد دوسری حدیث لانا ہے جیسا کہ ان کی عادت ہے۔

۹۹۰: قَالَ اِنَّمَا الصَّلٰوۃُ لِقِرَاءَۃِ الْقُرْاٰنِ وَذِکْرِ اللّٰہِ فَاِذَا کُنْتَ فِیْھَا فَلْیَکُنْ ذَالِکَ شَانَکَ۔

(رواہ ابوداود)

ترجمہ: اور اس کے بعد فرمایا نماز صرف قرآن پڑھنے کے لئے اور اللہ کے ذکر کے لئے ہے لہٰذا جب تم نماز میں ہو تو تمہارا بھی یہی مقصود ہونا چاہئے۔ (ابوداؤد)

نماز میں اشارہ سے سلام کا جواب دینا

۹۹۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قُلْتُ لِبِلَالٍ کَیْفَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَرُدُّ عَلَیْھِمْ حِیْنَ کَانُوْا یُسَلِّمُوْنَ عَلَیْہِ وَھُوَ فِی الصَّلٰوۃِ قَالَ کَانَ یُشِیْرُ بِیَدِہٖ۔

(رواہ الترمذی وفی روایۃ النسائی نحوہ وعوض بلال صھیب)

أخرجه الترمذي في السنن ٢/ ٢٠٤ حديث رقم ٣٦٨۔ والنسائي ٣/ ٥ حديث رقم ١١٨٧۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت بلالؓ سے سوال کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہوتے تھے اور اس وقت کوئی آپ کو سلام کرتا تھا تو آپ سلام کا جواب کس طرح دیتے تھے۔ حضرت بلالؓ نے فرمایا ہاتھ سے اشارہ کر کے دیا کرتے تھے۔ (ترمذی) اور اسی طرح کی ایک روایت امام نسائیؒ نے بجائے حضرت بلالؓ کے حضرت صہیبؓ سے نقل کی ہے۔

تشریح: اس حدیث کی تشریح میں ابن ملک فرماتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی آنکھ یا سر کے اشارے سے دوران نماز سلام کا جواب دے دے تو بھی جائز ہے۔ الظہیر ۃ میں ہے کہ اگر کوئی شخص سلام کا جواب دیتے ہوئے سر، ہاتھ یا انگلی سے اشارہ کر دے

تو نماز فاسد نہیں ہوگی جبکہ خلاصہ میں ہے کہ سر یا ہاتھ سے جواب دینے کی صورت میں نماز فاسد ہو جائے گی جیسا کہ برجندی نے نقل کیا ہے۔ اور شرح منیہ میں ہے کہ نمازی کیلئے ہاتھ یا سر کے اشارے سے سلام کا جواب دینا مکروہ ہے اس لئے یہ بات متعین ہوگئی کہ اس حدیث کو نسخ کلام سے قبل پر محمول کیا جائے گا کیونکہ یہاں اشارہ کلام ہی کے معنی میں ہے۔

نماز میں چھینکنے کا مسئلہ

۹۹۲: وَعَنْ رِفَاعَةَ بْنِ رَافِعٍ فَقَالَ صَلَّيْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَطَسْتُ فَقُلْتُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيْرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا مُبَارَكًا عَلَيْهِ مُبَارَكًا فِيْهِ كَمَا يُحِبُّ رَبُّنَا وَيَرْضٰى فَلَمَّا صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ انْصَرَفَ فَقَالَ مَنِ الْمُتَكَلِّمُ فِي الصَّلٰوةِ فَلَمْ يَتَكَلَّمْ اَحَدٌ ثُمَّ قَالَهَا الثَّانِيَةَ فَلَمْ يَتَكَلَّمْ اَحَدٌ ثُمَّ قَالَهَا الثَّالِثَةَ فَقَالَ رِفَاعَةُ اَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَقَدِ ابْتَدَرَهَا بِضْعَةٌ وَّ ثَلَاثُوْنَ مَلَكًا اَيُّهُمْ يَصْعَدُ بِهَا۔

(رواہ الترمذی و ابوداود و النسائی)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۲۸۴/۲۔حديث رقم ۷۹۹۔ومسلم ۴۱۹/۱حديث رقم (۱۴۹۔۶۰۰)وأبوداوٗد فی السنن ۴۸۸/۱حديث رقم ۷۷۰۔والترمذی ۲۵۴/۲۔حديث رقم ۴۰۴والنسائی ۱۴۵/۲حديث رقم ۹۳۱۔ومالك فی الموطا ۲۰۹/۱حديث رقم ۲۵من كتاب القرآن وأحمد فی المسند ۳۴۰/۴۔ فی المخطوطة "عن"۔

ترجمہ: حضرت رفاعہ بن رافعؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی نماز کے درمیان مجھے چھینک آ گئی میں نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْدًا كَثِيْرًا ۔ تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے بہت زیادہ تعریف بہت پاکیزہ اور برکت والی کہ جسے پسند کرے ہمارا رب اور خوش رسول اللہ ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ نماز میں یہ کلام کرنے والا کون ہے؟ کوئی نہیں بولا پھر آپ ﷺ نے دوسری مرتبہ یہی فرمایا۔ پھر بھی کوئی نہ بولا جب تیسری مرتبہ آپ ﷺ نے یہی فرمایا تو رفاعہ نے کہا۔ اے اللہ کے رسول میں ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ تیس سے زائد ملائکہ ان کلمات کو لے جانے میں جلدی کر رہے تھے۔ کہ ان میں سے کون ان کو پہلے لے جائے۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: اس حدیث میں ایک ہی جیسے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں یعنی ''مبارکًا فیه'' اور ''مبارکًا علیه'' ابن ملک فرماتے ہیں یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد برکت یعنی اضافے کی انواع واقسام مراد ہوں، علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فیہ اور علیہ دونوں میں ضمیر کا مرجع لفظ حمد ہے، پہلے میں برکت کا معنی ہے جو نفس حمد سے بھی زائد ہو اور زیادت ثواب کو مستلزم ہو اور دوسرے جملے میں خارج حمد سے اضافہ مراد ہے۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث دوران نماز چھینک آنے پر الحمد للہ کہنے کی جواز دلیل ہے اور یہی قول صحیح اور معتمد ہے بخلاف اس روایت کے جس میں بطلان نماز کا ذکر آیا ہے کہ وہ شاذ ہے لیکن اولیٰ یہی ہے کہ یا تو دل ہی دل میں الحمد للہ کہہ لے یا خاموش رہے تا کہ حسب استطاعت اختلاف سے بچا جا سکے جیسا کہ شرح منیہ میں ہے اور اس حدیث کو بھی نسخ کلام سے پہلے پر

محمول کیا جا سکتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ نمازی کیلئے چھینک آنے پر الحمد للہ کہنا مسنون ہے اگر چہ ائمہ اس بات پر بھی اکتفاء کر لیتے ہیں کہ الحمد للہ کہنا مسنون تو ہے لیکن نمازی کو چاہیے کہ وہ اپنے دل ہی میں الحمد للہ کہہ دے۔ احیاء العلوم وغیرہ میں بھی یہی ہے کہ زبان نہ ہلائے بلکہ دل ہی دل میں الحمد للہ کہہ دے لیکن یہ حدیث اس قول کی پرزور تردید کرتی ہے۔

ہماری رائے کے مطابق بظاہر یہ واقعہ تحریم کلام سے پہلے کا ہے جس کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ ہیں: ''من المتکلم فی الصلٰوۃ'' کہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام کا ذکر کیا ہے یہ نہیں فرمایا: من الحامد فی الصلٰوۃ''۔

جمائی شیطان کی تاثیر سے ہے

۹۹۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلتَّثَاءُ بُ فِی الصَّلٰوةِ مِنَ الشَّیْطٰنِ فَاِذَا تَثَاءَ بَ اَحَدُکُمْ فَلْیَکْظِمْ مَا اسْتَطَاعَ ۔

(رواه الترمذی وَفِی اُخْرٰی لَهٗ وَلِابْنِ مَاجَةَ فَلْیَضَعْ یَدَهٗ علی فِیْهِ)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/ ۲۰۶ حدیث رقم ۳۷۰۔ وابن ماجه ۱/ ۳۱۰ حدیث رقم ۹۶۸۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ نماز میں جمائی لینا شیطان کی طرف سے ہے لہٰذا جب تم میں سے کسی کو نماز میں جمائی آئے تو اس کو حتی الامکان روکے۔ (ترمذی) اور ترمذی کی ایک دوسری روایت اور ابن ماجہ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ نماز میں جسے جمائی آئے تو اس کو چاہئے کہ اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لے۔

تشریح: اس حدیث میں نماز کے دوران جمائی آنے کو شیطان کی طرف سے بتایا گیا ہے کیونکہ جمائی غفلت، سستی، زیادہ کھانے پینے یا زیادہ سونے کی وجہ سے آتی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نماز کی قید تخصیص کیلئے نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ نماز کی حالت میں اس کی قباحت اور زیادہ ہو جاتی ہے اسی وجہ سے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ اللہ کا ذکر کرتے ہوئے خواہ وہ نماز میں ہو یا نماز سے باہر جمائی لینا مکروہ ہے۔ نیز حدیث اور دیگر علماء کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ جمائی شیطان کی طرف سے ہونا اس بات کا تعلق عبادات سے ہے جیسے نماز، تلاوت، ذکر، دعا وغیرہ، عام حالات میں یہ حکم نہیں ہے۔

نماز میں تشبیک منع ہے

۹۹۴: وَعَنْ كَعْبِ ابْنِ عُجْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا تَوَضَّاَ اَحَدُکُمْ فَاَحْسَنَ وُضُوْءَ هٗ ثُمَّ خَرَجَ عَامِدًا اِلَی الْمَسْجِدِ فَلَا یُشَبِّکَنَّ بَیْنَ اَصَابِعِهٖ فَاِنَّهٗ فِی الصَّلٰوةِ ۔

(رواه احمد والترمذی وابوداود والنسائی والدارمی)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۳۸۰حدیث رقم ۵۶۲۔والترمذی ۲/۲۸۸حدیث رقم ۳۸۶والدارمی فی السنن ۱/۳۸۱۔حدیث رقم ۱۴۰۴۔وأحمد فی المسند ۴/۲۴۳۔

ترجمہ:حضرت کعب بن عجرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایاجب تم میں سے کوئی وضو کرے اوراچھی طرح وضو کرے پھر نماز کا ارادہ کر کے مسجد کی طرف چلے تو انگلیوں میں تشبیک نہ کرے کیونکہ وہ اس وقت سے گویا نماز میں ہے۔(احمد،ترمذی،ابوداؤد،نسائی،دارمی)

تشریح:اس حدیث کی شرح میں تشبیک کا معنی بیان کرتے ہوئے ابن ملک فرماتے ہیں کہ ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کرنا تشبیک کہلاتا ہے جو کہ نماز میں مکروہ ہے۔کیونکہ یہ خشوع وخضوع کے منافی ہے اسی طرح جو آدمی فی الحال نماز تو نہ پڑھ رہا ہو لیکن نماز کے مراد سے نکل چکا ہو تو حصولِ ثواب کے اعتبار سے وہ بھی نماز میں شمار ہوتا ہے اس لئے اسے بھی تشبیک سے منع کیا گیا۔

میرکؒ فرماتے ہیں کہ شاید اس نہی کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنے میں لوگوں کا یہ نظریہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی خصوصیات بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہیں ورنہ نماز سے باہر خود نبی ﷺ سے ایسا کرنا ثابت ہے۔چنانچہ ایک مرتبہ نبی ﷺ نے نماز فتنوں کا ذکر کرتے ہوئے انگلیوں کوایک دوسرے میں داخل فرمایا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی ممانعت ایسے ہی ہو جیسے نماز میں جمائی لینے کی ممانعت ہے چنانچہ مسند احمد میں سند جید سے حضرت ابوسعید خدریؓ کی یہ مرفوع روایت منقول ہے کہ جب تم میں سے کوئی مسجد میں ہو تو وہ تشبیک نہ کرے کیونکہ تشبیک شیطان کی طرف سے ہوتی ہے اور تم میں سے جو شخص بھی جب تک مسجد میں رہے وہ برابر نماز ہی میں شمار ہوتا ہے یہاں تک کہ مسجد سے نکل جائے۔

ذوالیدین کی حدیث میں بھی یہ بات ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے مسجد میں تشبیک فرمائی جو دلیل ہے اس بات کی کہ ایسا کرنا حرام نہیں ہے لیکن اس سے کراہت کی نفی بھی نہیں ہوتی کیونکہ نبی ﷺ کا یہ فعل بیانِ جواز پر محمول ہے اوراسے ممانعت سے پہلے کے زمانے پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے کیونکہ ذوالیدین کی حدیث اوران کا واقعہ نسخ کلام سے پہلے ہی پیش آیا تھا اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ اس موقعے پر نبی ﷺ کا تشبیک فرمانا اس گمان پر مبنی تھا کہ آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو چکے۔

اس حدیث میں نبی ﷺ کا ''فانه فی الصلوٰة'' کی قید لگانا اس بات کی دلیل ہے کہ نماز میں تشبیک جائز نہیں بلکہ نماز کی دوران اس کی کراہت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ سنن ابن ماجہ میں حضرت کعب بن حجرہؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ نماز کے دوران تشبیک کئے ہوئے ہے تو آپ ﷺ نے اپنی انگلیاں مزید کشادہ فرمائیں۔

نماز میں اِدھر اُدھر متوجہ ہونے سے ثواب کم ہوجاتا ہے

۹۹۵:وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَزَّوَجَلَّ مُقْبِلًا عَلَى الْعَبْدِ وَهُوَ فِیْ صَلَاتِهٖ مَالَمْ يَلْتَفِتْ فَاِذَا الْتَفَتَ انْصَرَفَ عَنْهُ۔

(رواہ احمد وابوداود والنسائی والدارمی)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۵۶۰حدیث رقم ۹۰۹۔والنسائی فی ۳/۸حدیث، رقم ۱۱۹۵۔والدارمی ۱/۳۹۰۔حدیث

رقم ۱٤۲۳۔وأحمد فی المسند ٥/۱۷۲۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی بندہ نماز میں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بندہ کی طرف اس وقت تک متوجہ رہتا ہے جب تک وہ اِدھر اُدھر نہیں دیکھتا۔ اور جب انسان ادھر ادھر دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے منہ پھیر لیتا ہے۔ (احمد۔ ابوداؤد۔ دارمی۔ نسائی)

تشریح: ملاحظہ ہو اگلی روایت کی تشریح' یہ دونوں (تقریبا) بعینہ ہیں۔

نماز میں نگاہ سجدہ والی جگہ پر ہو

۹۹۶: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا اَنَسُ اِجْعَلْ بَصَرَکَ حَیْثُ تَسْجُدُ رَوَاہُ الْبَیْهَقِیُّ فِیْ سُنَنِ الْکَبِیْرِ مِنْ طَرِیْقِ الْحَسَنِ عَنْ اَنَسٍ یَرْفَعُهُ الْجَزْرِیُّ ۔(شعب الایمان)

أخرجه البیهقی فی السنن الکبری ۲/۲۸٤۔ فی المخطوطة زیادة کلمة "أصحاب"

ترجمہ: حضرت انس ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اے انس نماز میں تم اپنی نظر وہاں رکھو جہاں سجدہ کرتے ہو۔ (اس حدیث کو امام بیہقیؒ نے سنن کبیر میں حضرت انس ؓ سے بطریق حسن نقل کیا ہے۔ جس کو جزری نے مرفوع کہا ہے)

تشریح: علامہ ابن حجر عسقلانی ؒ اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں کہ نگاہوں کو سجدے کی جگہ پر مرکوز رکھنے کا جو حکم اس حدیث میں دیا گیا ہے امام شافعی ؒ کے نزدیک اس کا تعلق ساری نماز کے ساتھ ہے جبکہ علامہ طیبی ؒ فرماتے ہیں کہ نماز کیلئے قیام کی حالت میں سجدے کی جگہ پر اپنی نگاہوں کو مرکوز کرنا، رکوع میں پاؤں کی پشت پر، سجدے میں ناک پر، اور تشہد میں اپنی گود پر نگاہوں کو متوجہ رکھنا مستحب ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب ہے اور غالبًا یہی ایک روایت امام شافعی ؒ سے بھی ہے لیکن علامہ ابن حجر عسقلانی ؒ فرماتے ہیں کہ شارح کا اس پر یقین ظاہر کرنا فحش ترین غلطی ہے۔ پھر کچھ آگے چل کر فرمایا ہے کہ بعض حضرات کی رائے کے مطابق جو شخص مسجد حرام میں ہو اس کیلئے خانہ کعبہ کو دیکھنا اور اس پر اپنی نگاہوں کو متوجہ رکھنا مسنون ہے ہاں جب تشہد میں لا الہ الا اللّٰہ کہے تو اس وقت اپنی نگاہوں کو اپنی شہادت والی انگلی سے نہ جھکائے جب تک شہادت کی انگلی اٹھی رہی۔

متقدمین شوافع سے بھی یہی قول منقول ہے جو کہ بعض حضرات کی رائے کے مطابق نوافل سے متعلق ہے فرائض سے متعلق نہیں۔

متاخرین نے اس استثناء کو رد کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کی کوئی نقل دلیل نہیں گویا کہ حدیث اور علماء کرام کی آراء کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ قول مردود ہے پھر اس طرح کرنے سے خشوع وخضوع کی کیفیت رخصت ہو جاتی ہے نیز حضرت عائشہ صدیقہؓ سے یہ روایت صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ تعجب ہے اس مسلمان پر جو خانہ کعبہ میں داخل ہو وہ کیسے اپنی نگاہوں کو اٹھا لیتا ہے۔ حالانکہ جناب رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تھے لیکن آپ ﷺ نے اپنی نگاہیں سجدے کی جگہ سے نہیں ہٹائیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ نبی ﷺ خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہوئے اپنی نگاہوں کو سجدے کی جگہ پر جمائے رہے تو خانہ کعبہ

سے باہر بھی یہی حکم ہوگا اس لئے کہ اس حکم میں خانہ کعبہ کے اندر اور باہر میں کوئی بھی تفریق کا قائل نہیں۔ اسی وجہ سے طواف کرنے والے کیلئے یہ سنت ہے کہ اس کی نگاہیں اپنے پاؤں کی جگہ سے آگے نہ بڑھیں کیونکہ یہی ادب ہے اور اسی سے جمعیت قلب نصیب ہوتی ہے۔

اسی حدیث سے دورانِ نماز آنکھیں بند رکھنے کی کراہت بھی معلوم ہوتی ہے جس کی تائید طبرانی کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھنے کیلئے کھڑا ہو تو اسے اپنی آنکھیں بند نہیں کرنی چاہیے لیکن اس حدیث کو نقل کرنے میں حضرت حذیفہ متفرد ہیں۔

احناف کا صحیح مسلک یہ ہے کہ دورانِ نماز مطلقاً سجدے کی جگہ کو دیکھنا چاہیے تاہم خانہ کعبہ کی طرف بھی نظر کی جاسکتی ہے اور اس کا یک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قبلے کی رعایت ملحوظِ خاطر رہے کیونکہ قبلے سے انحراف کی صورت میں نماز جاتی رہتی ہے اس لئے اس کی طرف دیکھنے کی گنجائش ہے۔

نماز میں اِدھر اُدھر متوجہ ہونے پر وعید

۹۹۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا بُنَيَّ إِيَّاكَ وَالْاِلْتِفَاتَ فِي الصَّلٰوةِ فَإِنَّ الْاِلْتِفَاتَ فِي الصَّلٰوةِ هَلَكَةٌ فَإِنْ كَانَ لَا بُدَّ فَفِي التَّطَوُّعِ لَافِي الْفَرِيْضَةِ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/ ۴۸۴ حديث رقم ۵۸۹۔ فی المخطوطة "حاطب" فی المخطوطة "تفويته"۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا۔ اے بیٹے نماز میں ادھر ادھر دیکھنے سے بچو۔ کیونکہ نماز میں ادھر ادھر دیکھنا ہلاکت کا سبب ہے۔ اگر دیکھنا ہو تو نفل میں گنجائش ہے فرض میں نہیں۔ (ترمذی)

تشریح: اس حدیث میں دورانِ نماز ادھر ادھر دیکھنے کو باعثِ ہلاکت قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں شیطان کی پیروی ہے جو کہ انسان کیلئے ہلاکت کا سبب ہے۔

میرکؒ فرماتے ہیں کہ ہلاکت کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

① کوئی چیز آپ کے پاس نہ ہو اور دوسرے کے پاس موجود ہو اس معنی میں یہ لفظ ''هلك عني سلطانيه'' میں استعمال ہوا ہے۔

② کسی چیز کا فاسد اور خراب ہوجانا۔

③ موت اس معنی میں یہ لفظ ''ان امرؤ هلك'' میں استعمال ہوا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ مذکورہ تین معانی میں سے دوسرے معنی کو بیان کرتے ہوئے اس کی مثال ''ويهلك الحرث والنسل'' بیان فرماتے ہیں اور ان کی رائے یہ ہے کہ دورانِ نماز ادھر ادھر دیکھنے سے نماز درجہ کمال سے نکل کر اس کیفیت پر پہنچ جاتی ہے جسے حدیث میں اختلاس سے تعبیر کیا گیا ہے۔

نیز اس حدیث میں نوافل میں ادھر ادھر دیکھنے کی جو گنجائش بیان کی گئی ہے ابن ملک اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ نوافل

میں بنیادی طور پر گنجائش کا پہلو مدنظر لکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ نوافل کھڑے ہو کر پڑھنے کی قدرت رکھنے کے باوجود بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے۔

اسی طرح علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ فرائض میں زیادہ ثواب اور اس کے ثمرات وفوائد حاصل کرنے کیلئے جس احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے وہ نوافل میں نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ نہ سمجھا جائے کہ ایسا کرنے کی نوافل میں کھلی اجازت ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی کوئی کراہت نہیں ہے بلکہ فرائض میں ایسا نہ کرنے کی ترغیب دینا مقصود ہے اور اس بات کی وضاحت کہ فرائض میں احتیاط کرنا زیادہ ضروری ہے اور مراتب کمال میں نوافل کے اندر ایک درجہ نیچے اترتے ہوئے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اگر کوئی شخص نوافل میں کمال کا یہ مرتبہ رہ جانے پر راضی ہو تب بھی کم از کم فرائض میں تو اسے اس پر راضی نہیں ہونا چاہئے۔

خلاصہ کلام یہ کہ مضمون حدیث سے یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ نوافل میں التفات بالصلوٰۃ کی کراہت فرائض سے کچھ کم ہے۔

نماز میں آنکھ کے کنارے سے دیکھنا جائز ہے

۹۹۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَلْحَظُ فِي الصَّلٰوةِ يَمِيْنًا وَ شِمَالًا وَلَا يَلْوِيْ عُنُقَهُ خَلْفَ ظَهْرِهِ۔ (رواه الترمذي والنسائي)

أخرجه الترمذي في السنن ٢/٤٨٤ حديث رقم ٥٨٧۔ والنسائي ٣/٩ حديث رقم ١٢٠١ وأحمد في المسند ١/٢٧٥۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آنکھ کے کنارے سے دائیں بائیں دیکھتے تھے۔ مگر پیچھے پیٹھ کی طرف اپنی گردن نہیں موڑتے تھے۔ (ترمذی۔ نسائی)

تشریح: اس حدیث کی تشریح میں علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شاید یہ کوئی نفل نماز تھی جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران نماز ادھر ادھر دیکھا کیونکہ یہ بات عنقریب گذر چکی کہ نوافل میں گنجائش ہے، ابن ملک فرماتے ہیں یہ التفات قلیل تھا اور اس کا مقصد اس بات کی وضاحت تھی کہ اس سے نماز باطل نہیں ہوتی یا کسی ضرورت کی بناء پر ایسا کیا کیونکہ یہ نہیں ہوسکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امت کو کسی کام سے روکیں اور بغیر کسی مجبوری اور ضرورت کے خود وہی کام کرنے لگے۔

نماز میں شیطان کے اثرات

۹۹۹: وَعَنْ عَدِيِّ ابْنِ ثَابِتٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ رَفَعَهٗ قَالَ الْعُطَاسُ وَالنُّعَاسُ وَالتَّثَاءُبُ فِي الصَّلٰوةِ وَالْحَيْضُ وَالْقَيْءُ وَالرُّعَافُ مِنَ الشَّيْطٰنِ۔ (رواه الترمذي)

أخرجه الترمذي في السنن ٥/٨١ حديث رقم ٢٧٤٨۔ وابن ماجه ١/٣١١ حديث رقم ٩٦٩۔

ترجمہ: حضرت عدی بن ثابت اپنے والد سے اور وہ اپنے والد یعنی عدی کے دادا سے اور وہ اس کو مرفوع نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ نماز میں چھینک آنا، اونگھنا، جمائی کا آنا، حیض کا آنا، قے ہو جانا، نکسیر کا آ جانا شیطان کی

طرف سے ہے۔ (ترمذی)

تشریح: اس حدیث کی وضاحت میں علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں چھ چیزیں بیان کی گئیں۔ پہلی تین چیزوں کے ساتھ فی الصلوٰۃ کی قید ہے آخری تین کے ساتھ نہیں گویا فی الصلوٰۃ کی قید سے امتیاز اور فصل مقصود ہے کیونکہ پہلی تین چیزیں یعنی چھینک، اونگھ اور جمائی نماز کو باطل نہیں کرتیں اور آخری تین چیزیں نماز کو باطل کر دیتی ہیں۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ اس حدیث کی وضاحت میں فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کو شیطان کی طرف اس لئے منسوب فرمایا کہ شیطان ان چیزوں کو محبوب رکھتا ہے اور ان چیزوں کے ذریعے انسان کو نماز اور دیگر عبادات سے روکتا ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان تمام صورتوں میں طعام کا پہلو غالب ہوتا ہے (یہی وجہ ہے کہ زیادہ کھانے والا زیادہ اونگھتا ہے اسے جمائی بھی زیادہ آتی ہے اور اسے الٹیاں بھی بکثرت ہوتی ہیں)۔ حافظ تورپشتی رحمہ اللہ کی اس میں اس بات کا بھی اضافہ فرماتے ہیں کہ شیطان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اللہ اور بندے کی ان استغراقی کیفیت کے درمیان حائل ہو جائے جو اسے مناجات کے وقت حاصل ہوتی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں چھینک سے مراد کثرت کے ساتھ چھینکنا ہے اسلئے یہ گذشتہ حدیث کے منافی نہیں ہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ کو چھینک پسند ہے کیونکہ اس سے مراد وہ کیفیت ہے جو معتدل ہو یعنی مسلسل تین کے عدد سے آگے نہ بڑھے کیونکہ اگر کسی شخص کو مسلسل تین مرتبہ سے زیادہ چھینک آئے تو اس وقت یہ سمجھا جائے گا کہ یہ بیماری کی وجہ سے ہے اور اس صورت میں چھینک کا جواب یرحمك الله'' کہہ کر نہیں دیا جائے گا بلکہ 'عافاك الله'' یا 'شفاك الله'' کہہ کر دیا جائے گا۔

بظاہر ان دونوں حدیثوں کو یوں بھی جمع کیا جا سکتا ہے کہ چھینک اللہ کی نگاہ میں نماز سے باہر مطلقاً محبوب ہے اور نماز کے اندر مطلقاً مکروہ کیونکہ نماز میں چھینک آنے سے ذہن یقیناً اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اگر یہ دونوں حدیثیں مطلق ہوں تو پھر یہی تطبیق متعین ہوگی۔

رونے سے نماز فاسد نہیں ہوتی

۱۰۰۰: وَعَنْ مُطَرِّفِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الشِّخِّيْرِ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يُصَلِّيْ وَلِجَوْفِهٖ اَزِيْزٌ كَاَزِيْزِ الْمِرْجَلِ يَعْنِيْ يَبْكِيْ وَفِيْ رواية قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَفِيْ صَدْرِهٖ اَزِيْزٌ كَاَزِيْزِ الرَّحٰى مِنَ الْبُكَاءِ۔ (رواه احمد وروى النسائى الرواية الاولى وابوداود الثانية)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ١/٥٥٧ حديث رقم ٩٠٤۔ والنسائي ٣/١٣ حديث رقم ١٢١٤ وأحمد في المسند ٤/٢٥۔ في المخطوطة "يقلقله"۔

ترجمہ: حضرت مطرف بن عبداللہ بن شخیر اپنے والد صاحب سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے اندر ہنڈیا جیسی آواز آ رہی تھی۔ جب وہ جوش مارے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رو رہے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ

ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اس وقت آپ کے سینہ کے اندر چکی کی آواز کی طرح رونے کی آواز آ رہی تھی۔(احمد) امام نسائی نے پہلی روایت کو نقل کیا ہے اور ابوداؤد نے دوسری کو۔

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن الشخیر۔ یہ عبداللہ بن شخیر بن عامر بن صعصعہ ''عامری'' ہیں بصریوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آنحضور ﷺ کی خدمت میں بنی عامر کے وفد میں شامل ہو کر حاضر ہوئے۔ ان سے ان کے دو بیٹے ''مطرب'' اور ''یزید'' روایت کرتے ہیں۔ ''شخیر'' میں شین معجمہ اور خاء معجمہ دونوں کے نیچے زیر ہے۔ خاء پر تشدید اور یائے تحتانی ساکن ہے۔

تشریح: اس حدیث کی وضاحت میں علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ازیز مرجل سے مراد ہنڈیا کے جوش مارنے کی آواز ہے قرآن کریم میں ''تؤزھم ازّاً'' اسی سے ماخوذ ہے اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مرجل سے مراد لوہے، پتھر یا ٹھیکری کی ہنڈیا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نماز میں رونے سے نماز باطل نہیں ہوتی جبکہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بات محل نظر ہے کیونکہ وہ آواز جو نبی ﷺ سے سنی گئی وہ پیٹ یا سینے سے نکلنے والی آواز تھی زبان سے نکلنے والی نہیں اور اصل اختلاف اس رونے کی آواز کے بارے میں ہے جو حروف پر مشتمل ہو صحیح بات ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اگر اس رونے کی وجہ سے دو حرف ظاہر ہو گئے گو کہ ان کا تعلق آخرت ہی سے ہو تو نماز باطل ہو جائے گی یہ اس صورت میں ہے جبکہ حروف غالب نہ ہوں۔ ورنہ غلبۂ حروف کی صورت میں یہ ضابطہ ہے کہ زیادہ ہوں تو نماز باطل ہو جائے گی تھوڑے ہونے کی صورت میں نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ رونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حروف بھی پیدا ہو جائیں کیونکہ آہ و بکا کا منشاء وہ خوف ہوتا ہے جو انسان کے دل کو ہلا کر رکھ دیتا ہے جس کی بناء پر اس کے پیٹ میں سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے جو صرف جسم کے اندر ہی سے سنائی دیتی ہے جس کی وجہ اندرونی طور پر نارِ جہنم کا خوف اور غم اور باطنی طور پر اضطراب و قلق ہوتا ہے۔

شرح منیۃ میں ہے کہ اگر کوئی آدمی دوران نماز روئے اور اس سے ایسی آواز پیدا ہو جسے دوسرے سن سکیں اور وہ جنت و جہنم وغیرہ کے تذکرے کی وجہ سے ہو تو اس سے نماز نہیں ٹوٹے گی کیونکہ دعاءِ رحمت و مغفرت کے مرتبے میں ہے اور اگر کسی درد یا کسی مصیبت کی وجہ سے ہو تو نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ یہ بمنزلہ شکایت کے ہے اور شکایت کلام الناس میں سے ہے لہٰذا اس سے نماز فاسد ہو جائے گی۔

امام محمد رحمہ اللہ سے یہ بھی منقول ہے کہ اگر کسی آدمی کو اتنی شدید تکلیف ہو کہ وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے اور نماز میں رو پڑے تو اس سے نماز نہیں ٹوٹے گی۔

نماز میں کنکر ہٹانے کا مسئلہ

۱۰۰۱: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ اَحَدُکُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَلَا

يَمْسَحُ الْحَصٰى فَإِنَّ الرَّحْمَةَ تُوَاجِهُهُ۔ (رواه احمد والترمذی وابوداود والنسائی وابن ماجة)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/ ۵۸۱ حديث رقم ۹۴۵۔ والترمذی ۲/ ۲۱۹ حديث رقم ۳۷۹۔ والنسائی ۳/ ۶ حديث رقم ۱۱۹۱۔ وابن ماجه فی السنن ۱/ ۳۲۸ حديث رقم ۱۰۲۷ وأحمدفی المسند ۵/ ۱۵۰۔ فی المخطوطة "الغفلة"۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی نماز کے لئے کھڑا ہو جائے تو وہ اپنے سامنے سے کنکریاں نہ ہٹائے کیونکہ رحمت اس کے سامنے ہوتی ہے۔

(احمد۔ترمذی۔ابوداؤد۔نسائی۔ابن ماجہ)

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دوران نماز اللہ تعالیٰ کی رحمت نمازی کی طرف متوجہ ہوتی اور اس پر برس رہی ہوتی ہے۔اب کسی عقلمند کا یہ کام نہیں ہوسکتا کہ اس عظیم نعمت کا شکریہ ادا کرے اس طرح کہ کنکریوں کو آگے پیچھے کرتا رہے، یا یہ مراد ہے کہ اس کام میں پڑ کر اس نعمت و رحمت کو فوت نہیں کر دینا چاہیے۔اگر مجبوری ہو تو بات جدا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی مضمون کی ایک روایت ابوداؤد میں '' علی شرط الشیخین '' ان الفاظ کے ساتھ بھی منقول ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے کنکریوں کو مت چھیڑا کرو، اگر ایسا کرنا ضروری ہی ہو تو پھر کنکریوں کو برابر کرنے کیلئے صرف ایک مرتبہ پر ہی اکتفاء کیا کرو۔

سجدہ کی جگہ پھونکنا منع ہے

۱۰۰۲: وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ رَأَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُلَامًا لَنَا يُقَالُ لَهُ أَفْلَحُ إِذَا سَجَدَ نَفَخَ فَقَالَ يَا أَفْلَحُ تَرِّبْ وَجْهَكَ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/ ۲۲۰ حديث رقم ۳۸۱۔

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے ایک غلام کو دیکھا جس کا نام افلح تھا جب وہ سجدہ کرتا تو سجدہ کی جگہ صاف کرنے کے لئے پھونک مارتا' تاکہ پیشانی خاک آلود نہ ہو۔آپ ﷺ نے فرمایا افلح اپنے چہرے پر مٹی لگنے دو۔(ترمذی)

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر زمین پر مٹی پڑی ہوئی ہو اور سجدہ کرنے کی وجہ سے پیشانی اور چہرے پر لگ جاتی ہو تو اسے پھونک مت مارو بلکہ مٹی پر اپنی پیشانی اور چہرے کو لگا دو کیونکہ اس میں بارگاہ خداوندی میں انتہائی تضرع وزاری ہے اور ثواب بھی اس پر عظیم ہوگا، درحقیقت یہ الفاظ کنایہ ہیں زمین پر پھونکیں نہ مارنے سے، جسے ''ترب وجھك'' کے الفاظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے۔

۱۰۰۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِخْتِصَارُ فِي الصَّلٰوةِ رَاحَةُ أَهْلِ النَّارِ۔

رواه فی شرح السنة

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا نماز میں کوکھ پر

ہاتھ رکھنا اہل جہنم کی حالت استراحت ہے۔(شرح السنہ)(اس کی وضاحت بقدر ضرورت گزر چکی ہے)

تشریح: اس حدیث کا مطلب بیان کرتے ہوئے قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جہنمی جب میدان حشر میں کھڑے کھڑے تھک جائیں گے تو وہ اپنے پہلوؤں پر ہاتھ رکھ لیں گے تاکہ آرام کی کوئی معمولی سی صورت بن جائے، نماز میں اپنے پہلوؤں پر ہاتھ رکھنا ایسے ہی ہے، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ یہود ونصاریٰ کا شیوہ اور طریقہ ہے جو وہ اپنی نماز کے دوران اختیار کرتے ہیں اور وہ انجام کار بہرحال جہنم میں جائیں گے اور اہل جہنم کیلئے کسی قسم کی راحت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''لا یفتّر عنهم وهم فیهم مبلسون''

فائدہ: یہ حدیث شرح السنہ میں بغیر سند کے یوں منقول ہے کہ بعض احادیث میں یہ بھی آتا ہے ''الاختصار راحة اهل النار'' لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ گذشتہ صحیح احادیث سے اس کی ممانعت بڑی وضاحت کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے کہ انسان دوران نماز اپنے پہلوؤں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو۔

مروی ہے کہ شیطان راندۂ درگاہ ہونے کے بعد اسی کیفیت میں زمین پر اترا تھا، اور یہ بھی بعض حضرات کی رائے ہے کہ شیطان جب چلتا ہے تو اسی طرح چلتا ہے۔

علامہ منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی تخریج ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنی اپنی صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے مرفوعاً ان ہی الفاظ میں کی ہے۔''الاختصار فی الصلوٰۃ راحة اهل النار'' اس لئے شرح السنہ میں اس کا حوالہ نہ ہونے سے اس کا بے سروپا بات ہونا لازم نہیں آتا۔

نماز میں موذی چیز کو مارنے کا حکم

۱۰۰۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اُقْتُلُوا الْاَسْوَدَیْنِ فِی الصَّلٰوةِ الْحَیَّةَ وَالْعَقْرَبَ ۔ (رواه احمد وابوداود والترمذی والنسائی معناه)

۱۰۰۴ : أخرجه أبوداؤدفی السنن ۱/۵٦٦حدیث رقم ۹۲۱۔والترمذی ۲/۲۳۳حدیث رقم ۳۹۰۔والنسائی ۳/۱۰ حدیث رقم ۱۲۰۲۔وابن ماجه ۱/۳۹٤حدیث رقم ۱۲٤۵۔وأحمد فی المسند ۲/۲۳۳۔ فی المخطوطة "لاعانه"۔فی المخطوطة "دارهم"۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز میں دو سیاہ چیزوں کو یعنی سانپ اور بچھو کو مار ڈالو۔(احمد۔ابوداؤد۔ترمذی۔اورنسائی نے اس کے ہم معنی روایت نقل کی ہے)

تشریح: اس حدیث کی تشریح میں ابن ملک فرماتے ہیں کہ سانپ اور بچھو کو دوران نماز ایک یا دو ضربوں سے تو مارنا جائز ہے، اس سے زیادہ تعداد میں ضربیں لگانا جائز نہیں۔ کیونکہ دو سے زیادہ پر کثیر کا اطلاق ہوتا ہے اور عملِ کثیر سے نماز باطل ہو جاتی ہے، شرح منیہ میں بعض مشائخ کے حوالے سے منقول ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ دوران نماز زیادہ چلنا نہ پڑے جیسے تین مسلسل قدم چلنا، اسی طرح اس میں ~~شدید مصروف~~ نہ ہونا پڑے مثلاً پے در پے تین ضربیں لگانا، اگر کسی نے دوران نماز

ایسا کیا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی اور یہ ایسے ہی ہو گا جیسے کوئی آدمی دوران نماز کسی سے لڑنے لگے، اس سے بھی نماز فاسد ہو جاتی ہے کیونکہ یہ عمل کثیر ہے۔

سروجی نے مبسوط میں اسے ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اس میں ایسی کوئی تفصیل نہیں ہے کیونکہ اس عمل کی اجازت رخصت پر مبنی ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی مقتدی کو دوران نماز حدث لاحق ہو جائے اور وہ وضو کرنے کیلئے چل کر جائے، اور اطلاقِ حدیث بھی اسی کا مؤید ہے۔

تاہم اس سلسلے میں اصح قول یہی ہے کہ دورانِ نماز عمل کثیر کی وجہ سے ایسا کرنا مفسدہ صلوٰۃ تو ہو گا لیکن اس سے وہ گنہگار نہیں ہو گا جیسے اگر کسی مصیبت زدہ نے اسے پکارا، کسی آدمی نے چھت سے گرتے ہوئے، یا آگ میں جلتے ہوئے یا دریا میں ڈوبتے ہوئے مدد کیلئے پکارا اور وہ اپنی نماز کو چھوڑ کر ان کی مدد اور تعاون کیلئے بھاگا تو یہ جائز بلکہ ضروری ہے لیکن نماز ختم ہو جائے گی، یہ الگ بات ہے کہ وہ اس وجہ سے گنہگار بھی نہیں ہو گا۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ حدیث اپنے مطلق ہونے کی وجہ سے ان صورتوں کو بھی شامل ہے جن میں عمل کثیر کی احتیاج ہو، بعض حضرات اسے ''عمل قلیل'' کے ساتھ مقید کرتے ہیں جبکہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ سانپ کو قتل کرنا مطلقاً جائز ہے اور یہی مسلک بھی ہے، اس کی تشریح میں حافظ ابن حمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دراصل صاحبِ ہدایہ اس قول سے احتراز کرنا چاہتے ہیں جس کے مطابق سفید سانپ کو قتل نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ جن ہوتا ہے۔

علامہ طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر سانپ کو مارا جا سکتا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ نبی ﷺ اور جنات کا یہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ وہ نبی ﷺ کے کسی امتی کے گھر داخل نہیں ہوں گے اور نہ ان پر غالب آئیں گے، اگر وہ اس معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے توڑ دیتے ہیں تو انہیں قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

البتہ بہتر یہ ہے کہ جس سانپ میں جن ہونے کی کوئی علامت پائی جاتی ہو اسے قتل کرنے سے بچنا چاہیے، اس کی حرمت کی وجہ سے نہیں بلکہ دفع شر وضرر کی وجہ سے، اور بعض حضرات کی رائے کے مطابق بہتر یہ ہے کہ اسے مخاطب کر کے اتمام حجت کر دے کہ مسلمانوں کا راستہ چھوڑ دو، یا اللہ کے حکم سے واپس چلے جاؤ، اگر مان جائے تو بہت اچھا، ورنہ اسے قتل کر دے۔

نماز میں دروازہ کھولنا

۱۰۰۵: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ تَطَوُّعًا وَالْبَابُ عَلَيْهِ مُغْلَقٌ فَجِئْتُ فَاسْتَفْتَحْتُ فَمَشٰى فَفَتَحَ لِيْ ثُمَّ رَجَعَ اِلٰى مُصَلَّاهُ وَذَكَرَتْ اَنَّ الْبَابَ كَانَ فِي الْقِبْلَةِ ۔

(رواه احمد وابوداود والترمذی والنسائی نحوه)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ٥٦٦/١حديث رقم ٩٢٢۔والترمذی ٤٩٧/٢حديث رقم ٦٠١۔والنسائی فی السنن ١١/٣حديث رقم ١٢٠٦۔وأحمد فی المسند ٢٣٤/٦۔ فی المخطوطة "دقائق"۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ گھر میں نفل نماز میں مشغول ہوتے اور دروازہ بند ہوتا۔ میں آتی اور دروازہ کھلواتی تو آپ ﷺ چل کر میرے لئے دروازہ کھول دیتے تھے پھر مصلّٰی پر واپس

آ جاتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ذکر کیا ہے کہ دروازہ قبلہ کی طرف تھا۔ (احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی)

تشریح: اس حدیث کی شرح میں علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "تطوع" کی قید میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نوافل میں تھوڑی بہت گنجائش ہوتی ہے جبکہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسی کوئی بات نہیں اور نہ ہی شوافع میں سے کوئی فرض اور نفل میں کسی قسم کی تفریق کا قائل ہے اور یہاں بھی صرف ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ اس واقعے کے مطابق دوران نماز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چل کر جانا، دروازہ کھولنا پھر اپنی جگہ واپس لوٹنا یہ سب چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ اگر عمل کثیر پے در پے بھی ہو تو اس سے نماز نہیں ٹوٹتی اور یہی بعض علماء کا مذہب بھی ہے، لیکن یہ رائے نا قابل اعتماد ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رہنی چاہئے کہ یہ ایک اصول ہے کہ احوال ووقائع فعلیہ میں جب احتمال آ جاتا ہے تو اس سے استدلال باطل ہو جاتا ہے اور یہاں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل چل کر نہ گئے ہوں بلکہ رک رک کر آہستہ آہستہ کھسک کر دروازے کے قریب پہنچے ہوں، پھر اس کی سند بھی مختلف فیہ ہے اس لئے اس حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

پھر اس حدیث میں حضرت عائشہؓ نے اس بات کی بھی وضاحت فرمائی ہے کہ دروازہ قبلہ کے رخ تھا، اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رخ انور قبلہ سے منحرف بھی نہیں ہوا اور دروازہ بھی کھل گیا۔ اشرف فرماتے ہیں کہ اس وضاحت سے ان لوگوں کا وہم بھی دور ہو گیا جن کا گمان یہ ہے کہ دروازہ کھولنے سے تو ترک استقبال قبلہ لازم آئے گا تو اس صورت میں نماز کیسے برقرار رہ سکتی ہے؟ سو اس کا جواب واضح ہو گیا کہ دروازہ قبلہ کی جانب تھا اور یہ عین ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دروازے تک مسلسل چل کر نہ پہنچے ہوں، اس لئے کہ عمل کثیر میں اگر فصل ہوا اور وہ پے در پے نہ ہو تو اس سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

مظہر اس کی توجیہہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ممکن ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موقع پر چلنا دو قدموں سے زیادہ نہ ہو، اس طرح یہ عمل کثیر نہیں رہتا، لیکن ہمارے نزدیک اس توجیہہ کو قبول کرنے کی صورت میں اصل اشکال تو پھر بھی باقی رہتا ہے کیونکہ دروازہ کھولنا اور پھر پلٹ کر واپس آنا تو عمل کثیر ہے اس لئے بہترین توجیہہ یہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل چل کر دروازہ تک نہیں گئے اور نہ ہی یہ سارے افعال تسلسل کے ساتھ سرانجام دیئے ہیں۔

نماز میں حدث لاحق ہونے کا مسئلہ

۱۰۰۶: وَعَنْ طَلْقِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا فَسَا اَحَدُكُمْ فِي الصَّلٰوةِ فَلْيَنْصَرِفْ وَلْيَتَوَضَّأْ وَلْيُعِدِ الصَّلَاةَ۔ (رَوَاهُ ابوداود وروى الترمذى مع زيادة ونُقْصان)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ١/١٤١ حديث رقم ٢٠٥ ـ والترمذى ٣/٤٦٩ حديث رقم ١١٦٦ ـ والدارمى ١/٢٧٦ حديث رقم ١١٤١ ـ

ترجمہ: حضرت طلق بن علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز کی حالت میں جب تم میں سے کسی کی بغیر آواز کے ریح خارج ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ جا کر وضو کرے اور نماز کو دوبارہ

پڑھے۔(ابوداؤد) اس روایت کو روای کا تعارف نہیں کرایا امام ترمذیؒ نے بھی کچھ کی زیادتی کے ساتھ نقل کیا ہے۔

تشریح: اس حدیث میں دوران نماز وضوٹوٹ جانے پر اعادۂ صلوٰۃ کا جو حکم دیا گیا ہے وہ وجوب کیلئے ہے جبکہ اس نے جان بوجھ کر وضو توڑا ہو اور اگر اسے ازخود حدث لاحق ہو جائے تو یہ امر استحباب پر محمول ہوگا۔ چنانچہ شرح منیہ میں ہے کہ جس شخص کو نماز میں کوئی ایسا حدث سماوی لاحق ہو جائے جو موجب وضو ہو تو وہ فوراً واپس جائے اور کسی دوسرے کام میں مشغول ہوئے بغیر جلدی سے وضو کر کے آئے اور اپنی نماز پر بناء کرے۔ یہی ہمارا مسلک ہے لیکن اس میں ایک شرط بھی ہے اور وہ یہ کہ اس سے نماز کے منافی کوئی کام سرزد نہ ہوا ہو۔ لیکن ائمہ ثلاثہ کا اس مسئلے میں ہمارے ساتھ اختلاف ہے۔

ہماری دلیل نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے:

"من اصابه قيء او رعاف اوقلس او مذى فلينصرف، فليتوضأ ثم ليبن على صلوته، وهو فى ذلك لا يتكلم"

اور ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں: **"ثم ليبين على صلوته مالم يتكلم"**

لیکن اس کے باوجود اختلاف سے بچنے کیلئے افضل یہی ہے کہ از سر نو نماز پڑھ لی جائے۔ جبکہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنے کی فضیلت کو بچانے کیلئے امام اور مقتدی کے حق میں تو بناء ہی افضل ہے (مسبوق کے حق میں نہیں) ہاں! اگر جماعتِ ثانیہ کی صورت میں استیناف ممکن ہو تو پھر بناء نہ کرے کیونکہ دوسری جماعت کے ذریعے جماعت کا ثواب تو مل ہی جائے گا۔

پھر حدث لاحق ہونے کی صورت میں امام کا کسی کو اپنا نائب بنانا بالا جماع جائز ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے نماز پڑھانا شروع کی۔ درمیان ہی میں ایک آدمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے کر دیا اور خود واپس تشریف لے گئے، نماز سے فراغت کے بعد فرمانے لگے کہ اصل میں جب میں نے تکبیر کہہ نماز شروع کی تو مجھے کچھ شبہ سا ہوا، میں نے اپنا ہاتھ لگا کر دیکھا تو تری محسوس ہوئی اس لئے میں واپس چلا گیا۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ جوازِ بناء کی حدیث ابن ماجہ اور دارقطنی نے مرفوعاً نقل کی ہے اور اس کا مرفوع ہونا ہی صحیح ہے جبکہ بعض حضرات کی رائے میں وہ مرسل ہے، نیز ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی تخریج ابن ابی شیبہ وغیرہ نے موقوفاً بھی کی ہے۔ چنانچہ یہ روایت حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت ابن عمر اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہم سے موقوفاً مروی ہے اور طبقۂ تابعین میں سے علقمہ، طاؤس، سالم بن عبداللہ، سعید بن جبیر، شعبی، ابراہیم نخعی، عطاء، مکحول اور سعید بن مسیّب اس کے رواۃ میں سے ہیں، ان تمام حضرات کا نام ہی اس حدیث کے مستند ہونے کی دلیل ہے۔

نیز حدیث مرسل کا حجت ہونا بھی کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ صرف ہمارے نزدیک ہی نہیں بلکہ جمہور کے نزدیک بھی حدیث مرسل حجت ہے، جبکہ یہ حدیث مرسل تسلیم کی جائے، باقی رہی حدیث استخلاف تو اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو چکا ہے۔ جسے امام احمد اور ابن منذر نے حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

ابن اثرم نے اپنی سند سے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نمازِ ظہر پڑھانے کیلئے تشریف لائے، نماز شروع کرنے کے کچھ ہی دیر کے بعد اپنی دائیں جانب کھڑے ہوئے ایک آدمی پکڑ کر اسے آگے کر دیا

اور خود واپس تشریف لے گئے۔ ''الی آخرہ''

اسی طرح صحیح بخاری میں عمرو بن میمون سے مروی ہے کہ جس دن حضرت عمر فاروقؓ پر دورانِ نماز قاتلانہ حملہ ہوا، میرے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان صرف حضرت ابن عباسؓ تھے۔ ابھی انہوں نے تکبیر ہی کہی تھی کہ میں ان کی آواز سنی مجھے کتے نے قتل کر دیا، یا کتا مجھے کھا گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منہ سے یہ جملہ اس وقت نکلا جب ابو لؤلؤ نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا۔

بہر حال: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا ہاتھ پکڑ کر آگے کر دیا اور انہوں نے بقیہ نماز پڑھائی، اسی طرح سعید نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی مرتضیٰؓ ہمیں نماز پڑھانے کیلئے کھڑے ہوئے، اچانک ان کی نکسیر جاری ہوگئی، انہوں نے ایک آدمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے کر دیا اور خود واپس تشریف لے گئے۔

فائدہ: یہ حدیث حضرت علی بن طلقؓ سے مروی ہے، نہ کہ حضرت طلق بن علیؓ سے، امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے حضرت علی بن طلقؓ ہی کے حوالے سے نقل کرتے ہوئے اس کی تحسین کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ میں نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ علی بن طلقؓ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے اس کے علاوہ کوئی دوسری روایت میرے علم میں نہیں ہے اور نہ ہی میں اسے علی بن طلق سحیمی کی روایت سمجھتا ہوں، گویا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق یہ ایک اور صحابی کا نام ہے۔

مذاہب ائمہ اربعہ:

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قولِ جدید تو یہی ہے کہ اگر کسی شخص کو دوران نماز غیر اختیاری طور پر کوئی حدث لاحق ہو جائے تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی اور جس حدیث میں بناء کا ذکر ہے (عنقریب جو گزر چکی) وہ بالاتفاق مرسل ہے اس لئے حجت نہیں، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول قدیم، امام احمد کی ایک روایت، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک جوازِ بناء کے قائل ہیں لیکن اس کی کچھ شرائط ہیں جو فروعی کتابوں میں مذکور ہیں۔

نماز میں وضو ٹوٹ جائے تو نکلنے کا طریقہ

۱۰۰۷: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَحْدَثَ اَحَدُكُمْ فِيْ صَلَاتِهٖ فَلْيَأْخُذْ بِاَنْفِهٖ ثُمَّ لِيَنْصَرِفْ۔ (رواہ ابو داود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۱/ ٦٦٦ حديث رقم ١١١٤۔ وابن ماجه ۱/ ٣١٦ حديث رقم ١٢٢٢۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کا وضو نماز میں ٹوٹ جائے تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنی ناک پکڑ کر نماز سے نکل جائے۔ (ابوداؤد)

تشریح: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں حدث لاحق ہونے پر ناک پکڑنے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ اس کی نکسیر جاری ہوگئی ہے، اسے کذب اور جھوٹ نہیں کہا جا سکتا بلکہ اسے ''تعریض بالفعل'' کہا جاتا ہے، اور نمازی کو ایسا کرنا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے اور شیطان اسے لوگوں کے سامنے شرمندہ نہیں کر سکتا۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ادب سکھاتے ہوئے ناپسندیدہ امور کو چھپانے کی تلقین کی گئی ہے، نیز احسن

طریقے سے توریہ کرنے کی رخصت فراہم کی گئی ہے، اسے ریاء اور کذب اسلئے بھی نہیں قرار دیا جاسکتا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بعض تعریضات جھوٹ سے دور ہوتی ہیں اسی طرح ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جو شخص اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتا ہو، وہ تہمت کی جگہ پر ہرگز نہ کھڑا ہو۔

سلام کے بغیر نماز کا پورا ہو جانا

۱۰۰۸: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَحْدَثَ اَحَدُكُمْ وَقَدْ جَلَسَ فِيْ اٰخِرِ صَلَاتِهٖ قَبْلَ اَنْ يُّسَلِّمَ فَقَدْ جَازَتْ صَلٰوتُهٗ (رواه الترمذی وقَالَ هذاحديث اسناده لَيْسَ بِالْقَوِيِّ وَقَدِاضْطَرَبُوْا فِيْ اِسْنَادِهٖ۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/ ۲٦۱ حديث رقم ٤۰۸۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تم میں سے کسی کا وضو اس وقت ٹوٹے جب کہ وہ اپنی نماز کے آخری قعدہ میں ہو اور سلام نہ پھیرا ہو تو اس کی نماز پوری ہو جائے گی۔ (ترمذی) اور کہا ہے کہ اس حدیث کی سند قوی نہیں ہے اور انہوں نے اس کی سند میں اضطراب کیا ہے۔

تشریح: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چونکہ خروج بصنع المصلی فرض ہے اس لئے وہ اس حدیث کو عمداً حدث لاحق کرنے پر محمول فرماتے ہیں جبکہ صاحبین رحمۃ اللہ علیہ اسے مطلق رکھتے ہیں، خواہ کوئی شخص جان بوجھ کر اپنے آپ کو حدث لاحق کرے یا سہواً ہو جائے، دونوں صورتوں میں "جبکہ وہ تشہد کے بقدر بیٹھ چکا ہو، لیکن سلام پھیرنے کی نوبت نہ آئی ہو" اس کی نماز مکمل ہو جائے گی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلہ میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک سلام پھیرنا فرض ہے جبکہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب، اور اس حدیث کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ سند کے اعتبار سے اس میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ حجت نہیں۔

حدیث مضطرب کی تعریف:

حافظ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ حدیث مضطرب سے مراد وہ حدیث ہوتی ہے جو مختلف اور باہم ایک دوسرے کے مقابل اسناد سے مروی ہو، اس اضطراب کا تعلق بعض اوقات متن سے ہوتا ہے، بعض اوقات سند سے، اور بعض اوقات ایک یا کئی راویوں سے بھی ہوتا ہے، یاد رہے کہ حدیث مضطرب ضعیف ہوتی ہے کیونکہ اس میں پایا جانے والا اضطراب واختلاف ہی اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ یہ روایت اچھی طرح سے ضبط نہیں کی گئی۔

ہم اس کا جواب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث متعدد اسناد سے مروی ہے جیسا کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سب کی تخریج کی ہے اور تعدد طرق سے حدیث درجۂ ضعف سے نکل کر درجۂ حسن تک پہنچ جاتی ہے اور وہ سب کے نزدیک حجت ہے۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی حدیث کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے اور ہم اس کو تسلیم بھی کر لیتے ہیں پھر بھی اس حدیث کو رد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حدیث کا حجت ہونا اس کی صحت پر موقوف نہیں بلکہ صحت حدیث کیلئے تو حدیث حسن بھی کافی ہے، پھر اگر کوئی مجتہد اس بات کو جاننے کے باوجود کہ اس حدیث کے صحیح ہونے یا نہ ہونے میں محدثین کا اختلاف ہے اپنی غالب رائے سے اس کے صحیح ہونے کو ترجیح دیتا ہے تو وہ اس کی طرف نسبت کر کے صحیح ہی کہلائے گی کیونکہ محض اختلاف سے ترجیح اور ثبوت صحت میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اس ضابطے کو اچھی طرح اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیجئے کہ یہ بہت سے مواقع پر کام آ سکتا ہے۔

الفصل الثالث:

امام کو مصلے پر حدیث یاد آ جائے

۱۰۰۹: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ اِلَی الصَّلَاةِ فَلَمَّا کَبَّرَ اِنْصَرَفَ وَ اَوْمَأَ اِلَیْهِمْ اَنْ کَمَا کُنْتُمْ ثُمَّ خَرَجَ فَاغْتَسَلَ ثُمَّ جَاءَ وَرَأْسُهٗ یَقْطُرُ فَصَلّٰی بِهِمْ فَلَمَّا صَلّٰی قَالَ اِنِّیْ کُنْتُ جُنُبًا فَنَسِیْتُ اَنْ اَغْتَسِلَ رواه احمد.

أخرجه ابن ماجه ۱/۳۸۵ حديث رقم ۱۲۲۰۔ وأحمد في المسند ۲/۴۴۸۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے تشریف لائے جب اقامت کہنے کا ارادہ کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے مڑے اور صحابہ کو یہ اشارہ کیا کہ تم لوگ اپنی جگہ کھڑے رہو۔ پھر مسجد سے باہر نکلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کیا اور اس حال میں واپس تشریف لائے کہ آپ کے سر مبارک سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو نماز پڑھائی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ مجھے غسل کی ضرورت تھی مگر میں غسل کرنا بھول گیا تھا۔ (احمد)

تشریح: اس حدیث کی تشریح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تکبیر تحریمہ کہہ چکے تھے، اور ہم یہ کہتے ہیں کہ ''فلما کبر'' سے مراد ''فلما اراد ان یکبر'' ہے اس اعتبار سے ابھی نماز شروع نہیں ہوئی تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ یاد آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے گئے، اس دوسری توجیہہ کے راجح ہونے کی دلیل عنقریب آپ کے سامنے آ جائے گی۔

اسی طرح ''ان کما کنتم'' کا مطلب بیان کرتے ہوئے علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تم جس طرح ہو، اسی طرح رہو، میں ابھی آتا ہوں اور علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اس کا مطلب بیان کرتے ہیں کہ میرے جانے کے بعد بھی تم نماز کی حالت میں ہی رہنا، اس سے نکلنا مت اور نہ ہی اسے خود مکمل کرنا، لیکن یہ تاویل بعید از قیاس ہے جیسا کہ اہل عقل پر مخفی نہیں۔

اور اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ امام کی نماز ٹوٹ جانے کا پتہ لگ جانے کے بعد بھی مقتدیوں کی نماز نہیں ٹوٹتی۔

یاد رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نسیان اس لئے طاری ہوتا کہ امت کو مسئلہ معلوم ہو جائے اور اس سلسلے میں اس کی رہنمائی نامکمل نہ

رہے، اس سے وہ اعتراض بھی دور ہو گیا جو اس موقع پر کیا جاتا ہے کہ نبی ﷺ کو اپنا حالت جنابت میں ہونا بھول کیوں گیا؟ جبکہ بعض اولیاء کرام کے بارے میں آتا ہے کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہونے پر دوسروں کی جنابت تک پر مطلع ہو جایا کرتے تھے۔ چنانچہ یافعی نے نقل کیا ہے کہ امام الحرمین ابوالمعالی ابن امام ابومحمد الجوینی ایک دن نماز فجر کے بعد مسجد میں پڑھانے کیلئے تشریف فرما ہوئے تو وہاں سے صوفیاء کے ایک شیخ اپنے مریدوں کے ساتھ گذرے، امام الحرمین انہیں دیکھ کر اپنے دل میں کہنے لگے کہ ان لوگوں کو کھانے اور ناچنے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں آتا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہی شیخ امورِ دعوت وتبلیغ سے فارغ ہو کر دوبارہ وہیں سے گذرے، تو رک کر فرمانے لگے مفتی صاحب! اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو جنابت کی حالت میں نمازِ فجر پڑھے، مسجد میں آ کر بیٹھے، لوگوں کو درس دینے لگے اور غیبت بھی کرتا ہو؟ یہ سنتے ہی امام الحرمین کو یاد آیا کہ ان پر تو غسل واجب تھا، اس واقعے کے بعد صوفیاء کے بارے میں وہ اچھا گمان رکھنے لگے۔

اسی طرح علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ اس واقعے میں یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ابھی تکبیر تحریمہ نہ کہی ہو، صرف نبی ﷺ نے ہی تکبیر تحریمہ کہی ہو کہ آپ کو یاد آ گیا، بھی صحیح نہیں، بعید از قیاس بلکہ ناقابل اعتبار ہے کیونکہ روایات میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ صحابہ کرام بھی اس وقت تک تکبیر تحریمہ کہہ چکے تھے۔

جبکہ ہماری رائے کی تائید بخاری شریف کی اس صحیح روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں صراحۃً مذکور ہے کہ جب نبی ﷺ مصلّی پر آ کر کھڑے ہوئے اور ہم منتظر ہوئے کہ کب آپ تکبیر کہتے ہیں کہ اچانک آپ ﷺ پیچھے ہٹ گئے اور فرمایا اپنی جگہ ہی رہو۔

لیکن اصل بات صرف اتنی ہے کہ بعض اوقات انسان کسی چیز کی محبت میں اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے، معروف کو منکر پر اور منکر کو معروف پر محمول کرنے لگتا ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے دعاء ہی کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں راہ راست کی ہدایت نصیب فرمائے تاکہ ہم نبی ﷺ کے احوال کو حتی الوسع اچھے محمل پر محمول کر سکیں۔

۱۰۱۰: وَرَوَى مَالِكٌ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ مُرْسَلاً۔

ترجمہ: امام مالک نے بھی اس حدیث کو عطاء بن یسار سے بطریق ارسال بیان کیا ہے"۔

مذکورہ صدر حدیث کو امام مالک رحمہ اللہ نے عطاء بن یسار کے حوالے سے مرسلاً بھی نقل کیا ہے، میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں "صالح بن کیسان عن الزہری عن ابی سلمۃ" کی سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نماز پڑھانے کیلئے تشریف لائے، اقامت ہو چکی، صفیں برابر ہو چکیں، جب حضور ﷺ اپنے مصلی پر آ کر کھڑے ہوئے اور ہم منتظر ہوئے کہ کب حضور ﷺ تکبیر کہتے ہیں تو آپ ﷺ واپس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اپنی جگہ پر ہی رکو۔ ہم اسی طرح نبی ﷺ کا انتظار کرتے رہے تا آنکہ نبی ﷺ تشریف لے آئے اور غسل کی وجہ سے سر مبارک سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

اسی طرح اوزاعی عن الزہری کی سند سے بھی اسی مضمون کی حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے، اس اعتبار سے حضرت

مصنف علیہ الرحمۃ کو چاہیے تھا کہ وہ اس مسئلہ میں صحیح بخاری کی حدیث کو پیش کرتے تاکہ اثبات مسئلہ کیلئے حدیث مرسل کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

سجدہ کی جگہ کو گرمی سے بچانا

۱۰۱۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كُنْتُ اُصَلِّي الظُّهْرَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاٰخُذُ قَبْضَةً مِّنَ الْحَصٰى لِتَبْرُدَ فِيْ كَفِّيْ اَضَعُهَا لِجَبْهَتِيْ اَسْجُدُ عَلَيْهَا لِشِدَّةِ الْحَرِّ۔

(رواہ ابوداود وروی النسائی نحوہ)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/۲۸۲ حديث رقم ۳۹۹۔ والنسائي ۲/۲۰۴ حديث رقم ۱۰۸۱۔ في المخطوطة "لأخذ"۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ظہر کی نماز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھا کرتا تھا اور ایک مٹھی میں کنکریاں لے لیتا تھا تاکہ وہ میرے ہاتھ میں ٹھنڈی ہو جائیں۔ گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے میں ان کو سجدہ کے وقت اپنی پیشانی کے نیچے رکھ لیتا تھا۔ (ابوداؤد۔ نسائی)

تشریح: اس حدیث میں ''فآخذ'' مضارع کا صیغہ حکایت ماضی کے طور پر استعمال ہوا ہے جیسا کہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے۔ یہی رائے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ہے۔ لیکن یہ قول اس بات پر مبنی ہے کہ ''فآخذ'' کا عطف ''کنت'' پر کیا جائے لیکن عبارت کا ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کا عطف ''اصلی'' پر کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کا جن کے ساتھ ایک واقعہ

۱۰۱۲: وَعَنْ اَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ فَسَمِعْنَاهُ يَقُوْلُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ ثُمَّ قَالَ اَلْعَنُكَ بِلَعْنَةِ اللّٰهِ ثَلَاثًا وَبَسَطَ يَدَهٗ كَاَنَّهٗ يَتَنَاوَلُ شَيْئًا فَلَمَّا فَرَغَ مِنَ الصَّلَاةِ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَدْ سَمِعْنَاكَ تَقُوْلُ فِي الصَّلٰوةِ شَيْئًا لَمْ نَسْمَعْكَ تَقُوْلُهٗ قَبْلَ ذٰلِكَ وَرَاَيْنَاكَ بَسَطْتَّ يَدَكَ قَالَ اِنَّ عَدُوَّ اللّٰهِ اِبْلِيْسَ جَاءَ بِشِهَابٍ مِنْ نَارٍ لِيَجْعَلَهٗ فِيْ وَجْهِيْ فَقُلْتُ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قُلْتُ اَلْعَنُكَ بِلَعْنَةِ اللّٰهِ التَّامَّةِ فَلَمْ يَسْتَأْخِرْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ اَرَدْتُّ اَنْ اٰخُذَهٗ وَاللّٰهِ لَوْلَا دَعْوَةُ اَخِيْنَا سُلَيْمَانَ لَاَصْبَحَ مُوْثَقًا يَلْعَبُ بِهٖ وِلْدَانُ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۳۸۵ حديث رقم (۴۰۔۵۴۲) والنسائي ۳/۱۳ حديث رقم ۱۲۱۵۔

ترجمہ: حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ ہم نے سنا آپ ﷺ سے کہ آپ ﷺ فرما رہے تھے: میں تجھ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں' پھر آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ ارشاد فرمایا کہ میں تجھ پر لعنت کرتا ہوں اللہ کی لعنت۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک آگے بڑھائے گویا کہ آپ ﷺ کسی چیز کو پکڑ رہے ہیں۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو گئے تو ہم نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم نے آج آپ کو نماز میں ایسی بات کہتے ہوئے سنا ہے کہ اس سے قبل کبھی آپ ﷺ کو اس طرح کہتے ہوئے نہیں سنا اور آج ہم نے آپ کو

ہاتھ پھیلاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کا دشمن ابلیس ملعون آگ کا شعلہ لے کر آیا تھا تا کہ اس کو میرے منہ میں ڈالے چنانچہ اس وقت میں نے تین مرتبہ یہ کہا کہ میں تجھ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ پھر میں نے کہا میں تجھ پر لعنت کرتا ہوں اللہ کی پوری لعنت وہ نہیں ہٹا تو میں نے یہ کلمات تین مرتبہ کہے۔ جب وہ پھر بھی نہ ہٹا تو میں نے اس کو پکڑنا چاہا۔لیکن اللہ کی قسم اگر ہمارے بھائی حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا نہ ہوتی تو وہ صبح تک مسجد کے ستون کے ساتھ بندھا رہتا اور مدینہ کے بچے اس کے ساتھ کھیلتے ۔(مسلم)

تشریح: اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اصحاب کی رائے کے مطابق خطاب کے صیغے کے ساتھ کسی کیلئے دعاء کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے البتہ یہ حدیث محمول ہے تحریم کلام سے قبل کے زمانے پر۔

لیکن اس پر ایک اعتراض ہوتا ہے، اعتراض اور جواب ابن ملک کی طرف سے ہے،اعتراض یہ ہے کہ نماز کے دوران گفتگو کے حرام ہونے کا حکم تو قیام مکہ مکرمہ کے دوران ہی آ گیا تھا جبکہ یہ واقعہ مدینہ منورہ کا ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ ''مدینہ'' سے مراد اس کا لغوی معنی یعنی شہر ہے،اصطلاحی معنی یعنی مدینہ منورہ مراد نہیں تا کہ دلائل میں توافق اور تطابق ہو جائے۔

اس کا دوسرا جواب یوں بھی دیا جا سکتا ہے کہ جواز کی دلیل نبی ﷺ کا عمل ہے اور عدم جواز کی دلیل نبی ﷺ کا فرمان ہے ''یعنی نماز میں عام گفتگو کی طرح باتیں کرنا مناسب نہیں ہیں'' اور یہ مسلّمہ اصول ہے کہ جب قول اور عمل میں تعارض پیدا ہو جائے تو قول کو ترجیح ہوتی ہے اس لئے عدم جواز کو ترجیح ہو گی۔

بعض حضرات یہ جواب بھی دیتے ہیں کہ غیر کیلئے خطاب کے صیغے کا عدم جواز ابلیس لعین کے ساتھ ہے کہ جب وہ نمازی کو دورانِ نماز مختلف وساوس سے پریشان کرے تو اس میں صیغۂ خطاب کی گنجائش ہے کیونکہ اس کا تعلق ''مصالح نماز'' سے ہے اور اس کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے، جبکہ شیطان کے علاوہ کسی اور میں یہ ضرورت نہیں ہے اس لئے وہاں یہ حکم بھی نہیں ہے۔

ہماری رائے یہ ہے کہ یہ آخری قول جن حضرات کا نقل کیا گیا ہے،اس کی بنیاد یہ ہو سکتی ہے کہ نماز میں ''مصالح نماز'' کی وجہ سے کلام کرنا جائز ہے جیسا کہ عنقریب تفصیل سے آتا ہے، تاہم اس حدیث کے سلسلے میں بعض حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ یہ نبی ﷺ کی خصوصیت تھی، امت کیلئے یہ حکم نہیں ہے۔

نماز میں اشارہ سے سلام کا جواب دینا

۱۰۱۳: وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ اِنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ مَرَّ عَلٰى رَجُلٍ وَهُوَ يُصَلِّيْ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَرَدَّ الرَّجُلُ كَلَامًا فَرَجَعَ اِلَيْهِ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ فَقَالَ لَهٗ اِذَا سُلِّمَ عَلٰى اَحَدِكُمْ وَهُوَ يُصَلِّيْ فَلَا يَتَكَلَّمْ وَلْيُشِرْ بِيَدِهٖ۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ١/١٦٨ حديث رقم ٧٦ من كتاب قصر الصلاة ۔ في المخطوطة "فالحكمي"۔

ترجمہ: حضرت نافعؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا گزر ایک آدمی پر ہوا جو کہ نماز پڑھ رہا تھا حضرت عبداللہؓ نے اس کو سلام کیا اور اس نے حضرت عبداللہؓ کے سلام کا جواب زبان سے دیا۔حضرت عبداللہؓ اس کی طرف لوٹے اور فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو نماز پڑھنے کی حالت میں سلام کیا جائے تو اس کو بولنا نہیں

چاہیے مناسب ہے کہ وہ ہاتھ کے اشارہ سے جواب دے دے۔(مالک)اس مسئلہ کی وضاحت گزر چکی ہے۔

تشریح: اس حدیث کے متن پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نمازی آدمی کو دوران نماز سلام کیوں کیا، جبکہ معلوم ہے کہ نمازی جواب نہیں دے سکتا؟ تو عین ممکن ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو پتہ ہی نہ چلا ہو کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے اور اسے سلام کرتے ہوئے گذر گئے ہوں، یا یہ کہ کلام حقیقی کو کلام حکمی سے منسوخ کرنے سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا ہو، یا اشارہ سے مراد یہ ہے کہ نماز میں ہونے کا عذر اشارۃً پیش کر دے جیسے کوئی شخص اگر سلام کا جواب دینا نہ چاہتا ہو تو وہ گذرنے والے کو فقط اشارہ کر دیتا ہے۔

بَابُ السَّهْوِ

سجدۂ سہو کا بیان

اس باب میں نماز کے دوران سہو لاحق ہو جانے کا حکم بیان کیا جائے گا، سہو دراصل ''عمد'' کی ضد ہے اور خطاً ونسیان دونوں کو شامل ہے، جیسا کہ ازہری وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ اس کا لغوی معنی کسی چیز سے غفلت، دل کا کسی اور چیز کی طرف متوجہ ہو جانا ہے، تاہم یہاں اس سے مراد سجدۂ سہو بھی ہو سکتا ہے جو کہ ہمارے نزدیک ترک واجب پر واجب ہے۔

الفصل الاول:

تعداد رکعت میں نسیان سے سجدہ سہو کا حکم

۱۰۱۴: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا قَامَ يُصَلِّیْ جَاءَهُ الشَّيْطَانُ فَلَبِسَ عَلَيْهِ حَتّٰى لَايَدْرِیْ كَمْ صَلّٰى فَاِذَا وَجَدَ ذٰلِكَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰٤/۳ حديث رقم ۱۲۳۲۔ ومسلم في صحيحه ۳۹۸/۱ حديث رقم (۸۲۔۳۸۹) وأبو داؤد ۶۲۳/۱ ۱۰۳۰۔ والترمذي في السنن ۲٤۳/۲ حديث ۳۹۶۔ والنسائي ۳۰/۳ حديث رقم ۱۲۵۲۔ وأخرجه مالك في الموطأ ۱۰۰/۱ حديث رقم ۱ من كتاب السهو۔ وأحمد في المسند ۲٤۱/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو شیطان اس کے پاس آجاتا ہے اور اس کو اشتباہ میں ڈالتا ہے یہاں تک کہ اس کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی رکعات پڑھی ہیں۔ لہٰذا اگر تم میں سے کسی کو یہ صورت پیش آجائے تو اس کو چاہیے کہ وہ آخر میں بیٹھ کر دو سجدے کر لے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: اس حدیث مبارکہ میں جس مسئلے کی طرف رہنمائی کی گئی ہے، اس کی مکمل تفصیل فتاوی خاقانیہ میں یوں مذکور

ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہو، اور اسے یاد نہ رہے کہ اس نے تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار، سو اگر اس کے ساتھ ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہو تو وہ از سرِ نو نماز پڑھے، رہی یہ بات کہ "پہلی مرتبہ" کی تعیین کس طرح کی جائے؟ تو اس سلسلے میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ جو نماز وہ پڑھ رہا ہے، مثلاً ظہر کی، آج اسے اس میں پہلی مرتبہ سہو ہوا، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سال میں اسے پہلی مرتبہ سہو لاحق ہوا ہو۔ دو قول ذکر نہیں کیے؟

بہر حال! پہلی مرتبہ سہو لاحق ہونے کی صورت میں اکثر مشائخ کا فتویٰ "استیناف" ہی کا ہے اور ان کے نزدیک وہ تحری نہیں کرے گا، اور اگر اس کے ساتھ ایسا ہوتا رہتا تو پھر وہ "تحری" کرے گا اور گمان غالب پر بناء کرے گا، چنانچہ اگر غالب گمان یہ ہو کہ دو رکعات والی نماز میں اس نے ایک رکعت پڑھی ہے تو اس کے ساتھ ایک رکعت اور ملا کر سجدۂ سہو کر لے، اگر غالب گمان یہ ہو کہ وہ دونوں رکعتیں پڑھ چکا ہے تو بیٹھ کر تشہد پڑھے اور بعد میں سجدۂ سہو کر لے اور اگر اس کا غالب گمان کسی رخ پر بھی نہ جاتا ہو تو پھر رکعتوں والا رخ اختیار کر لے کیونکہ اسے زیادہ میں شک ہے، کم تو یقینی ہے (مثلاً تین اور چار میں شک ہو تو گویا تین بہر حال یقینی ہے، شک اس بات میں ہے کہ چوتھی پڑھی یا نہیں؟ لہٰذا وہ انہیں تین ہی سمجھتے ہوئے ایک اور رکعت اس کے ساتھ ملا لے)۔

اسی طرح اگر کسی شخص کو نمازِ فجر کی رکعتوں میں سہو ہو گیا تو وہ کم پر بناء کرنے اور اسے ایک رکعت شمار کرنے کے باوجود احتیاطاً قعدہ ضرور کرے گا کیونکہ ہو سکتا ہے وہ دو رکعتیں پڑھ چکا ہو، اور دو رکعتوں کے بعد قعدہ فرض ہے، اس لئے احتیاطاً قعدہ بھی کرے اور ایک رکعت بھی ساتھ ملا لے۔ كذا في شرح المنية۔

سجدۂ سہو قبل السلام ہوگا

۱۰۱۵: وَعَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا شَكَّ اَحَدُكُمْ فِیْ صَلَاتِهٖ فَلَمْ يَدْرِ كَمْ صَلّٰى ثَلَاثًا اَوْ اَرْبَعًا فَلْيَطْرَحِ الشَّكَّ وَلْيَبْنِ عَلٰى مَا اسْتَيْقَنَ ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يُّسَلِّمَ فَاِنْ كَانَ صَلّٰى خَمْسًا شَفَعْنَ لَهٗ صَلَاتَهٗ وَاِنْ كَانَ صَلّٰى اِتْمَامًا لِاَرْبَعٍ كَانَتَا تَرْغِيْمًا لِلشَّيْطَانِ۔ (رواه مسلم ورواه مالك عن عطاء مرسلا وفي روايته شَفَعَهَا بِهَاتَيْنِ السَّجْدَتَيْنِ)۔

أخرجه مسلم في صحيحه ١/ ٤٠٠ حديث رقم ٨٨/ ٥٧١ ـ ومالك في الموطأ ١/ ٩٥ حديث رقم ٦٢ من كتاب الصلاة ـ

ترجمہ: حضرت عطاء بن یسار سے روایت ہے وہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی نماز کے درمیان شک میں مبتلا ہو جائے اور اس کو یہ یاد نہ ہو کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں تین یا چار تو اس کو چاہئے کہ وہ اپنا شک اور تردد دور کرے اور جس پر اس کو یقین ہو اس پر بناء کرے اور پھر سلام پھیرنے سے قبل دو سجدے کرے۔ اگر اس نے پانچ رکعات پڑھی ہوں گی تو یہ پانچ رکعات ان دو سجدوں کی وجہ سے جفت ہو جائیں گی۔ اور اگر اس نے چار رکعتیں پوری پڑھی ہوں گی تو پھر یہ دونوں سجدے شیطان کی ذلت کا سبب بن جائیں گے۔ (مسلم) امام مالکؒ نے اس روایت کو حضرت عطاء سے بطریق ارسال نقل کیا ہے اور امام مالکؒ کی ایک

روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ نمازی ان دونوں سجدوں کی وجہ سے پانچ رکعات کو جفت کر دے گا۔

تشریح: اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ سجدۂ سہو نماز کا آخری سلام پھیرنے سے پہلے کیا جائے گا اور یہی مذہب ہے امام شافعی رحمہ اللہ کا، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ سجدۂ سہو کا وقت سلام کے بعد ہے، ان دونوں حضرات کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ روایت جو ''قصۂ ذوالیدین'' کے نام سے مشہور ہے اور یہ دونوں حدیثیں صحیحین کی متفق علیہ حدیثیں ہیں اور دوسری حدیث کو سنن اربعہ کے مصنفین نے بھی نقل کیا ہے اور پہلی حدیث ''افراد مسلم'' میں سے اسلئے جو روایت صحت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو، اس پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''اور یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی قولِ قدیم ہے'' کہ اگر سجدۂ سہو کسی نقصان کی تلافی کیلئے ہو تو اسے سلام سے پہلے کیا جائے اور اگر کسی اضافہ کی تلافی کیلئے ہو تو اسے مؤخر کر دیا جائے اور انہوں نے اس سلسلے کی احادیث میں تطبیق کرنے کیلئے انہیں دو صورتوں پر محمول کر لیا، کمی کی صورت میں جدا حکم اور زیادتی کی صورت میں جدا حکم۔

لیکن امام مالک رحمہ اللہ کے اس مذہب پر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی طرف سے یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک ہی نماز میں کمی اور زیادتی دونوں کا مرتکب ہو جائے تو کیا حکم ہے؟ ظاہر ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک پر عمل کرنے سے اس صورت کا کوئی حل نہیں نکلتا۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ موارد حدیث کی چھان بین کرنے کے بعد مسئلہ زیر بحث میں یہ تفصیل بیان فرماتے ہیں کہ اگر نمازی کو تعداد رکعات میں شک ہوا ہو تو اسے سلام سے قبل سجدہ کرنے کا حکم دیا جائے گا اور اگر اس سے نماز میں کوئی چیز چھوٹ گئی جس کا اس نے بعد میں تدارک کر لیا تو وہ سجدۂ سہو بعد میں کرے، یہاں پر بھی وہی اشکال ہے جو امام مالکؒ کے مذہب پر وارد ہوتا ہے۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ تقدیم و تاخیر سجدۂ سہو کا یہ اختلاف ''اولویت'' میں ہے ''جواز'' میں نہیں، یہی رائے زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے اور اس طرح تمام احادیث مبارکہ میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔

قوله شفعن له صلوته:

علامہ طیبی رحمہ اللہ اس جملے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''شفعن'' کی ضمیر غائب کا مرجع ''پانچ رکعتیں'' ہیں اور ''لہ'' کی ضمیر مصلّی (نمازی) کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تمہاری نماز کی (بھولے سے پڑھی جانے والی) پانچوں رکعتیں دونوں سجدوں کی وجہ سے شفع بن جائیں گی (طاق نہیں رہیں گی) اور اس کی دلیل اگلی حدیث ہے جس میں ''**شفعها بها تين السجدتين**'' صراحۃً مذکور ہے۔

جبکہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ''شفعن'' کی ضمیر کا مرجع ''پانچوں رکعتوں'' کی بجائے صرف ''پانچویں رکعت'' کو قرار دیتے ہیں اور دلیل میں اس صحیح روایت کو پیش کرتے ہیں جس کے مطابق اس کی یہ آخری (پانچویں) رکعت اور سہو کے دونوں سجدے نفل ہو جائیں گے اور اس کی نماز اپنی اصلیت پر ہی برقرار رہتے ہوئے شفع رہے گی۔ اور فرماتے ہیں کہ اس سے ان

لوگوں کی بڑی وضاحت کے ساتھ تردید بھی ہوگئی جو یہ کہتے ہیں کہ پانچویں رکعت ملانے والا چھٹی رکعت بھی ملائے تا کہ اس کی نماز شفع کی حالت میں رہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شفع حکمی، شفع حقیقی کے بالمقابل اور منافی نہیں ہے حالانکہ ان دونوں کے درمیان تقابل اور منافات کا ہونا واضح بات ہے۔ پھر حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وہ بات بھی غرابت کا ایک نمونہ ہے جس میں انہوں نے علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کو محال سے تشبیہ دی ہے، حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ درحقیقت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کی بات کا مطلب ہی نہیں سمجھ سکے، یا یہ کہئے کہ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے کلام کو حقیقت پر محمول کیا ہے جبکہ انہوں نے اسے مجازی طور پر استعمال کیا ہے۔

پھر اس حدیث کے آخر میں سہو کے دو سجدوں کو شیطان کے ذلیل ورسوا ہونے کا جو ذریعہ قرار دیا گیا ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایسا شخص سجدۂ سہو نہ کرے کیونکہ اصل یہ ہے کہ اس نے کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا لیکن اس کی نماز دو میں سے کسی ایک خرابی سے خالی نہیں یا تو واقعۃً اس نے ایک رکعت کا اضافہ کر دیا ہوگا یا پھر اس نے چوتھی رکعت ہی پڑھی ہوگی، اس خلل کی تلافی اور حدارک کیلئے اسے سجدہ کرنا ہوگا اور چونکہ یہ تردد اور شک شیطان کے وسوسے اور بہکانے کی وجہ سے پیدا ہوا اس لئے اس کی تلافی کو شیطان کیلئے باعث ذلت قرار دیا گیا۔

فائدہ: اس حدیث کی تخریج امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ساتھ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کی ہے لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے عطاء کے حوالے سے مرسلاً نقل کیا ہے جس کے بارے میں حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح متصل سند کے ساتھ مروی ہے، کسی کے مرسل نقل کرنے سے اس میں پیدا ہونے والی کوتاہی اس کیلئے نقصان دہ نہیں ہو سکتی کیونکہ اسے متصلاً نقل کرنے والے حفاظ، ثقہ اور ایسے راوی ہیں جن کا اضافہ مقبول ہوتا ہے۔

نیز امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں جو ''شفعها بها تين السجدتين'' کا لفظ آیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نے یقین پر بناء کرتے ہوئے ایک رکعت اور پڑھ لی، لیکن درحقیقت یہ اس کی پانچویں رکعت ہوئی تو سہو کے دو سجدوں سے یہ جفت ہو جائیں گی۔ کیونکہ کسی بھی رکعت میں سجدہ ایک اہم ترین رکن کی حیثیت رکھتا ہے، سو جس نے دو سجدے کر لئے گویا کہ اس نے ایک رکعت پڑھ لی یعنی دو سجدے ایک رکعت کے قائم مقام ہو گئے اور یوں کل رکعتیں چھ ہو گئیں۔

اس موقع پر ابن ملک سے ایک بڑی واضح اور فحش غلطی ہوئی ہے کہ انہوں نے مذکورہ تفصیل بیان کرنے کے بعد اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق پانچویں رکعت پڑھنے والا چھٹی رکعت بھی ساتھ ملائے گا، حالانکہ یہ بات غلط ہے کیونکہ یہاں جو چیز زیر بحث ہے وہ ''مقدر'' ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وشافعی رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان جو اختلاف ہے وہ اس رکعت میں ہے جو ''محقق'' بھی ہو، تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ چھٹی رکعت ملا لینے میں کوئی حرج نہیں بلکہ مندوب ہے۔

اس طرح حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہاں ابوداؤد کی ایک روایت سے غلط استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں اس حدیث کی تخریج کی ہے کہ ''جب تم میں سے کسی کو نماز میں شک ہو جائے اور اسے پتہ نہ چلے کہ

اس نے تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار؟ تو شک کو دور کر کے یقینی تعداد پر بناء کر لے اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کر لے، اگر اس کی نماز مکمل ہو گئی ہو تو وہ ایک رکعت اور دو سجدے نفل ہو جائیں گے۔ اور اگر نماز پہلے نامکمل رہی ہو گی تو اس ایک رکعت سے نماز مکمل ہو جائے گی اور دو سجدے شیطان کو ذلیل کرنے کا سبب بن جائیں گے، حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ سجدۂ سہو واجب نہیں ہے۔ اور یہی ہمارا مذہب ہے، حالانکہ اس حدیث میں سجدۂ سہو کے عدم وجوب کا احتمال تک نہیں، چہ جائیکہ اس کی تصریح ہو۔

پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہونے کا مسئلہ

۱۰۱۶: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الظُّهْرَ خَمْسًا فَقِيْلَ لَهٗ اَزِيْدَ فِي الصَّلَاةِ فَقَالَ وَمَا ذَاكَ قَالُوْا صَلَّيْتَ خَمْسًا فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ بَعْدَ مَا سَلَّمَ وَفِيْ رواية قَالَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ فَاِذَا نَسِيْتُ فَذَكِّرُوْنِيْ وَاِذَا شَكَّ اَحَدُكُمْ فِيْ صَلَاتِهٖ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ فَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ ثُمَّ لِيُسَلِّمْ ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱/۵۰۳حديث رقم ۴۰۱۔ومسلم في صحيحه ۱/۴۰۱حديث رقم (۹۲۔۵۷۲)وأخرجه أبوداوٗد ۱/۶۲۲حديث رقم ۱۰۲۲۔والنسائي ۳/۳۱حديث رقم ۱۲۵۴۔وابن ماجه ۱/۳۸۰حديث رقم ۱۲۰۳وأحمد في المسند ۱/۳۷۹۔ في المخطوطة "أي"۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پانچ رکعت پڑھا دی۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ نماز میں زیادتی ہوگئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا ہوا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ آپ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد از سلام دو سجدے کر لئے۔ اور ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں انسان ہی تو ہوں جس طرح تم بھولتے ہو اس طرح میں بھی بھول جاتا ہوں لہٰذا جب میں کچھ بھول جایا کروں تو مجھے یاد دلا دیا کرو۔ اور جب تم میں سے کسی کو شک ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ صحیح رائے قائم کرے اور اس رائے کی بنیاد پر نماز پوری کرے اور پھر سلام پھیر کر دو سجدے کر لے۔

تشریح: اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں جو سلام پھیرنے کے بعد سجدۂ سہو کرنے کا ذکر ہے، یہ ہمارے مذہب کے منافی نہیں ہے کہ سجدۂ سہو مطلقاً سلام پھیرنے سے پہلے کیا جائے گا کیونکہ یہاں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پانچویں رکعت کے اضافہ کا پتہ ہی اس وقت چلا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیر چکے تھے اور لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا نماز کی رکعتیں بڑھا دی گئی ہیں؟ اور اس صورت میں علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سجدۂ سہو سلام پھیرنے کے بعد ہی کیا جائے گا۔ کیونکہ اس صورت میں سلام پھیرنے سے پہلے سجدۂ سہو کرنا متعذر رہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ سجدۂ سہو کے بعد تو سلام پھیرنا متعذر نہیں ہے، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیوں نہیں کیا تاکہ سب سے آخر میں "سلام" پھیرا جاتا کہ وہ تمہارے کے نزدیک رکن صلوٰۃ ہے اور پہلے سلام کا تو کوئی اعتبار ہی نہیں کیونکہ وہ اپنے محل میں نہیں رہا، پھر دوسری روایت میں اس کی تصریح بھی موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سلام پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ دوبارہ سلام

پھیرا۔

اور ابن ملک کی بات تو اس سے بھی زیادہ عجیب ہے کہ نبی ﷺ کو سہو کا علم بعد میں ہوا یہ اس کے مذہب کے خلاف ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کا یہ فرمان ''ثم یسلم ثم یسجد'' بھی اس کو رد کرتا ہے اور درمیان نماز میں گفتگو کرنا ابتداء اسلام میں جائز تھا، تاہم بعد میں اسے منسوخ کر دیا گیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس نماز میں جب آپ ﷺ نے ایک رکعت زیادہ پڑھائی تو صحابہ کرام علیہم الرضوان نے آپ کی متابعت اس لئے کی کہ نماز میں اضافہ بہر حال ممکن تھا۔ کیونکہ اس وقت تو نبی ﷺ خود موجود تھے اسلئے اس وقت ایسا ہونا ممکن تھا۔

زیادہ صحیح اور واضح بات یہ ہے کہ صحابۂ کرام علیہم الرضوان کے ذہنوں سے یہ بات محو ہوگئی تھی کہ انہیں سہو لاحق تھا۔ اس لئے انہوں نے سلام پھیر دیا اور یہ سمجھ کر کہ اب نماز سے فراغت ہوگئی انہوں نے باہم گفتگو بھی کی، لیکن جب نبی ﷺ دوبارہ نماز میں مشغول ہوئے تو انہوں نے بھی پیروی کی اور نبی ﷺ کا سہو کا یہ عذر لاحق ہونے پر اپنے اور ان کیلئے مغفرت طلب کی۔

اور ہمارے مسلک کے مطابق تو یہاں کوئی اشکال وارد ہی نہیں ہوتا کیونکہ ہمارے نزدیک تو امام کی متابعت واجب ہے۔ اگرچہ امام زیادت یا نقصان کر بیٹھے، (لیکن یہ اسی صورت میں ہے جبکہ مقتدی بھی بھول جائیں یا امام لقمہ کو قبول نہ کرے)۔

تحری کا معنی اور حکم کی وضاحت:

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تحری کا لغوی معنی قصد کسی چیز کے حصول میں محنت اور کسی چیز کو بالفعل حاصل کرنے میں عزم ہے۔ اور حدیث کے اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ صحیح رخ متعین کرنے کیلئے تحری کرے اور اپنی بقیہ نماز کو ایک یا دو رکعتیں ملا کر پورا کر لے، اور جس رکعت کے بعد قعدۂ اولیٰ کا احتمال ہو وہاں لازماً قعدہ کرے، یہ اس پر واجب ہے اور جہاں قعدۂ اخیرہ کا احتمال ہو وہاں فرضاً قعدہ کرے۔

رہی یہ بات کہ اگر تحری و اجتہاد سے کسی رخ پر اسے غلبۂ ظن حاصل نہ ہو تو وہ اقل پر بناء کر لے کیونکہ اقل تو بہر حال یقینی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے ''بعد ما سلّم'' کے بعد والی اس روایت کی نسبت صراحۃً جو صحیحین کی طرف کی ہے، یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس روایت کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل نہیں کیا ہے بلکہ صرف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تخریج کی ہے اور ایسا مصنف سے بکثرت ہوا ہے اور ان کا اس سلسلے میں یہ عذر ہے کہ اس سے ان کی مراد اور مقصد اصل روایت کی تخریج پر شیخین کا اتفاق نقل کرنا ہوتا ہے اگرچہ مضمون کے ساتھ ساتھ تمام الفاظ ایک جیسے نہ ہوں۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات تحقیق کے خلاف ہے کیونکہ اصل بات یہ ہے کہ ''بعد ما سلّم'' کے بعد ''وفی روایۃ'' کہہ کر جو روایت نقل کی گئی ہے، وہ صرف بخاری ہی کے مفردات میں سے ہے لفظاً بھی اور معنی بھی، ورنہ مسلم شریف کا تو کوئی لفظ بھی اس معنی کو ادا نہیں کرتا، اعتراض کا اصل منشاء یہ ہونا چاہیے کہ حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے اسے ''متفق علیہ'' قرار دیا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

یہی وجہ ہے کہ بعض محققین فرماتے ہیں کہ اتحاد لفظی کا معنی ہی یہ ہے کہ ایک حکم کو بیان کرنے کیلئے الفاظ مختلف نہ ہو، یہ

مطلب نہیں کہ عبارت مختلف نہ ہو، اور اتحاد معنوی کا مطلب یہ ہے کہ دونوں عبادتوں کو ایک ہی معنی و مفہوم ادا کرنے کیلئے لایا گیا ہو اور ایک سے جو چیز لازم آ رہی ہے وہی دوسرے سے بھی لازم آ رہی ہو اور اسی وجہ سے محققین نے شاہد اور تابع میں فرق بیان کیا ہے اور فرمایا ہے کہ شاہد اس حدیث کو کہتے ہیں جو معنوی طور پر دوسری حدیث کی مؤید ہو اور تابع اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس کے الفاظ دوسری حدیث کے مطابق ہوں۔

متابعت کی مثال میں محدثین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے۔

''الا نزعتم جلدها فدبغتموه فاستمتعتم به''

اور اسے مندرجہ ذیل ارشاد گرامی کا متابع قرار دیا ہے۔

''لو اخذوا اهابها فدبغوه فاستمتعوا به''

اور مندرجہ ذیل ارشاد گرامی کو اس کا شاہد قرار دیا ہے۔

''ایما اهاب دبغ فقد طهر''

کلام فی الصلوٰۃ کا مسئلہ

۱۰۱۷: وَعَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِحْدٰى صَلَاتَيِ الْعَشِيِّ قَالَ ابْنُ سِيْرِيْنَ قَدْسَمَّاهَا اَبُوْ هُرَيْرَةَ وَلٰكِنْ نَسِيْتُ اَنَا قَالَ فَصَلّٰى بِنَا رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ فَقَامَ اِلٰى خَشَبَةٍ مَعْرُوْضَةٍ فِی الْمَسْجِدِ فَاتَّكَأَ عَلَيْهَا كَاَنَّهٗ غَضْبَانٌ وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى وَشَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ وَوَضَعَ خَدَّهُ الْاَيْمَنَ عَلٰى ظَهْرِ كَفِّهِ الْيُسْرٰى وَخَرَجَتْ سِرْعَانُ الْقَوْمِ مِنْ اَبْوَابِ الْمَسْجِدِ فَقَالُوْا اَقُصِرَتِ الصَّلَاةُ وَفِی الْقَوْمِ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ فَهَابَاهُ اَنْ يُّكَلِّمَاهُ وَفِی الْقَوْمِ رَجُلٌ فِیْ يَدَيْهِ طُوْلٌ يُقَالُ لَهٗ ذُوالْيَدَيْنِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَسِيْتَ اَمْ قُصِرَتِ الصَّلَاةُ فَقَالَ لَمْ اَنْسَ وَلَمْ تُقْصَرْ فَقَالَ اَكَمَا يَقُوْلُ ذُوالْيَدَيْنِ فَقَالُوْا نَعَمْ فَتَقَدَّمَ فَصَلّٰى مَا تَرَكَ ثُمَّ سَلَّمَ ثُمَّ كَبَّرَ وَسَجَدَ مِثْلَ سُجُوْدِهٖ اَوْ اَطْوَلَ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهٗ وَكَبَّرَ ثُمَّ كَبَّرَ وَسَجَدَ مِثْلَ سُجُوْدِهٖ اَوْ اَطْوَلَ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهٗ وَكَبَّرَ فَرُبَمَا سَاَلُوْهُ ثُمَّ سَلَّمَ فَيَقُوْلُ نُبِّئْتُ اَنَّ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ قَالَ ثُمَّ سَلَّمَ متفق عليه ولفظه للبخاری وفی اخرٰی لَهُمَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَدَلَ لَمْ اَنْسَ وَلَمْ تُقْصَرْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمْ يَكُنْ فَقَالَ قَدْ كَانَ بَعْضُ ذٰلِكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ١/٥٦٥ حدیث رقم ٤٨٢ ـ ومسلم فی صحیحه ١/٤٠٣ حدیث رقم (٩٧ ـ ٥٧٣) والنسائی فی السنن ٣/٢٠ حدیث رقم ١٢٢٤ ـ

ترجمہ: حضرت محمد بن سیرین رحمہ اللہ سے ثابت ہے وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے تو اس نماز کا نام بتا دیا تھا

مگر میں بھول گیا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دو رکعت نماز پڑھائی اور پھر سلام پھیر دیا پھر اس لکڑی کے سہارے سے جو کہ مسجد میں عرضاً کھڑی تھی کھڑے ہو گئے گویا آپ غصہ کی حالت میں تھے۔ آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھا اور انگلیوں میں انگلیاں ڈال دیں اور اپنا دایاں رخسار مبارک اپنے بائیں ہاتھ کے پشت پر رکھ دیا۔ جلد باز لوگ مسجد کے دروازوں سے جانے لگے۔ صحابہ آپس میں کہنے لگے کہ کیا نماز میں کمی ہو گئی؟ اس وقت صحابہؓ کے درمیان حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے مگر ہیبت کی وجہ سے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی صحابہؓ میں ایک اور آدمی تھا جن کے ہاتھ لمبے تھے اسی وجہ سے ان کو ذوالیدین کہا جاتا تھا انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بھول گئے ہیں یا نماز میں کوئی کمی ہو گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نہ تو میں بھولا ہوں اور نہ نماز میں کمی ہوئی ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کیا تم بھی یہی کہتے ہو جو ذوالیدین کہہ رہے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا جی ہاں یہی بات ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے دو رکعت نماز اور پڑھائی اور سلام کہہ کر تکبیر کہی اور حسب معمول سجدوں جیسا یا ان سے بھی طویل سجدہ کیا اور پھر تکبیر کہہ کر سر اٹھایا لوگ محمد بن سیرین سے پوچھنے لگے پھر اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیر دیا ہو گا انہوں نے کہا مجھے عمران بن حصینؓ سے یہ خبر ملی ہے وہ کہتے تھے کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیر دیا۔ (بخاری، مسلم) الفاظ بخاری کے ہیں۔ بخاری اور مسلم کی ایک دوسری روایت اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالیدین کے جواب میں **لم انس** اور **لم تقصر** کی بجائے **کل ذلك لم یکن** فرمایا اس صحابی نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کچھ تو ضرور ہوا ہے۔

تشریح: اس حدیث میں ''**احدی صلاتی العشی**'' سے کیا مراد ہے؟ اس کی تعیین کرتے ہوئے علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے ظہر یا عصر مراد ہے، کیونکہ مسلم شریف کی ایک روایت میں یہاں نمازِ ظہر کو یقینی طور پر اس واقعہ کا موقعہ قرار دیا گیا ہے اور دوسری روایت میں عصر کی نماز کو، اور ایک روایت میں دونوں کو ذکر کرتے ہوئے یہ الفاظ بھی آئے ہیں۔

''**صلی بنا رسول الله ﷺ الظهر والعشی من حین تزول الشمس الی ان تغیب**''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو حضرات اس موقع کی نماز کی تعیین کرتے ہوئے مغرب یا عشاء کا ذکر کرتے ہیں، ان کا قول نہ تو روایتاً صحیح ہے اور نہ درایتاً، اصل میں ان حضرات کو لفظ ''**عشی**'' سے دھوکہ ہوا ہے، اس لئے اس کی مکمل وضاحت ضروری ہے۔

لفظ ''عشی'' کی تحقیق:

یہ لفظ عین کے فتحہ، شین کے کسرہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور قرآن وحدیث کے الفاظ میں یہ اسی طرح مشہور ہے جبکہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے ''**عشاء**'' بمعنی ظلمت سے ماخوذ قرار دیتے ہوئے ''**عُشی**'' ضبط کیا ہے لیکن یہ حافظ صاحب رحمہ اللہ کا ضبط نہیں بلکہ خبط ہے کیونکہ لغت کی مشہور کتاب قاموس میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ ''**عشاء**'' کا اطلاق اندھیرے کی ابتداء پر، مغرب سے لے کر نمازِ عشاء تک، یا زوال شمس سے لے کر طلوعِ فجر تک ہوتا ہے جبکہ لفظ ''**عشی**'' اور ''**عشیۃ**'' دن کے آخری حصے پر بولا جاتا ہے اور ''**صلوٰۃ العشی**'' سے مراد ظہر یا عصر کی نماز ہوتی ہے۔

قاموس کی یہ عبارت ہماری ہی مراد کو واضح کر رہی ہے اور یہی ہمارا مقصد تھا۔ **فللّٰہ الحمد**۔

علامہ ابن سیرین فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس مخصوص نماز کا نام بھی بتایا تھا لیکن مجھے وہ بھول گیا، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایک روایت میں اس کے بعد یہ الفاظ بھی منقول ہیں کہ میرے خیال کے مطابق وہ عصر یا عشاء کی نماز تھی، پھر حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آگے چل کر فرمایا ہے کہ یہاں ظہر یا عصر کی نماز ہی مراد ہو سکتی ہے جیسا کہ مسلم شریف میں اس کی صراحت وارد ہوئی ہے، تاہم مسلم شریف ہی کی ایک دوسری روایت میں یقین کے ساتھ نماز عصر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چونکہ روایتیں دونوں صحیح ہیں اس لئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول یہ واقعہ ایک سے زائد مرتبہ پیش آیا ہے، ایک مرتبہ نماز ظہر کے وقت اور ایک مرتبہ نماز عصر کے وقت، لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ واقعہ ایک ہی ہے اور نماز سے مراد نماز عصر ہے کیونکہ تمام روایات میں نماز عصر کا ہونا تو یقینی ہے، شک اور تردد دوسری نمازوں کے بارے میں ہے، اس لئے شک کو چھوڑ کر یقینی بات پر عمل کیا جائے گا اور اس واقعہ کو نماز عصر سے متعلق اور غیر متعدد مانا جائے گا۔

اس حدیث مبارکہ میں تشبیک وغیرہ کا جو عمل بیان کیا گیا ہے، اس کی بنیادی وجہ تکمیل نماز کا خیال تھا اس لئے یہ حدیث اس گذشتہ حدیث کے منافی نہیں ہے جس میں دوران نماز تشبیک کی ممانعت کی گئی ہے، ابن ملک فرماتے ہیں کہ اگر تشبیک انگلیاں کھینچ کر سکون حاصل کرنے کی خاطر ہو، یا بیٹھنے میں سہولت پیدا کرنے کی خاطر ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر پکڑنا مقصود ہو، یا چہرے اور سر کو گھٹنوں پر رکھنے کیلئے ایسا کیا جائے تو یہ مکروہ نہیں ورنہ مکروہ ہے۔

لیکن ابن ملک کی یہ بات قابل تعجب ہے کیونکہ نماز میں تشبیک اور اس کی طرف متوجہ ہونے کا ارادہ مطلقاً مکروہ ہے اور نماز سے باہر ''خواہ بے مقصد ہی ہو'' مباح ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسی واقعہ سے متعلق ایک روایت حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جس میں یہ اضافہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ عصر کی نماز پڑھائی، تین رکعتوں پر سلام پھیر دیا اور اپنے گھر تشریف لے گئے، لیکن یہ ایک دوسرا واقعہ ہے جیسا کہ عنقریب آتا ہے۔

سہو کا جو واقعہ اس حدیث مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے، اس پر حضرات شیخینؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ کہنے میں آپ کا رعب محسوس کیا، لیکن یہ رعب صرف گفتگو کی حد تک رکاوٹ تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اور آپ کے پیچھے پیچھے چلنے میں یہ رعب حائل نہ ہوتا تھا، یہ بات اس لئے کہی گئی تاکہ اس حدیث حسن کے ساتھ منافات معلوم نہ ہو جس کا مضمون یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام علیہم الرضوان کے پاس تشریف لاتے تو سوائے حضرات شیخین کے کوئی بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھتا تھا، بس یہی دونوں حضرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے رہتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھتے اور یہ دونوں حضرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مسکراتے رہتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے مسکراتے رہتے۔

ذوالیدین کا تعارف:

''ذوالیدین'' کا لفظی معنی ہے ہاتھوں والا، اس روایت کے مطابق چونکہ ان صحابی کے ہاتھ معمول سے زیادہ لمبے تھے اسلئے انہیں ذوالیدین کہا جاتا تھا، ایک روایت کے مطابق ان کا یہ نام خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا اور حقیقۃً ان کے ہاتھ طویل تھے یا مجازاً یہ لفظ ان کیلئے بولا جاتا تھا جو کہ کنایہ ہے سخاوت اور کثرت عمل سے، بعض حضرات کی رائے کے مطابق ان کا اصل نام خرباق السلمی الحجازی ہے اور علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ ان کا اصل نام تو عمیر ہے، خرباق ان کا لقب ہے اور ابو محمد کنیت ہے۔

ابن اکثیر جامع الاصول میں فرماتے ہیں کہ ذوالیدین کا تعلق بنوسلیم سے تھا اور انہیں خرباق کہا جاتا ہے، یہ حجازی صحابی ہیں ، یہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضری کا شرف رکھتے ہیں، انہی کی موجودگی میں دوران نماز سہو کا واقعہ پیش آیا، انہیں ذوالشمالین بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی زہری سے روایت میں ہے، لیکن حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ ذوالیدین اور ذوالشمالین دو الگ الگ نام ہیں، ذوالیدین تو وہی ہیں جن کا ذکر سجدۂ سہو کے اس واقعے میں آیا ہے اور ان کا نام خرباق ہے، جبکہ ذوالشمالین دوسرے صحابی ہیں جن کا نام عمیر بن عبدعمرو ہے اور ابن اسحاق کے بقول یہ خزاعی ہیں۔ اور غزوۂ بدر کے شرکاء اور اس میں کام آنے والوں میں سے تھے۔

پھر ذوالیدین کو اللہ تعالیٰ نے اتنی لمبی عمر عطاء کی کہ بہت سے متاخرین تابعین کو ان سے روایت واستفادہ کا موقع نصیب ہوا، نیز سجدۂ سہو کے اس واقعے کے وقت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے اور انہوں نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے، ظاہر ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے ہیں اور غزوۂ بدر اس سے بہت پہلے وقوع پذیر ہو چکا تھا، معلوم ہوا کہ ذوالشمالین اور ذوالیدین دو الگ الگ صحابی ہیں۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ اپنی جلالت قدر اور مغازی میں مہارت، حذاقت کے باوجود اس موقع پر ان دونوں میں فرق نہ کر سکے اور یہ رائے قائم کر بیٹھے کہ ذوالیدین اور ذوالشمالین ایک ہی شخص کے دو نام ہیں اور یہ وہی صحابی ہیں جو غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے تھے، نیز یہ کہ سہو کا یہ واقعہ، غزوۂ بدر سے پہلے کا ہے، بعد میں اس کی تمام تفصیلات متعین کر دی گئی تھیں لیکن یہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کا وہم ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کو اتنا اضطراب ہوا ہے کہ جس کی بناء پر ان کی سند سے آنے والی اس موضوع کی ہر حدیث قابل ردّ ہے۔ اور اسی اضطراب کی وجہ سے محدثین نے ان کی اس روایت کو رد بھی کر دیا ہے۔ نیز امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کا سند اور متن کو مکمل طور پر ذکر نہ کرنا بھی ترک روایت کا سبب ہے۔ اگرچہ زہری رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے امام فی الحدیث تھے، لیکن اس کے باوجود وہ انسان تھے اور انسانی غلطیوں سے محفوظ نہ تھے، کامل اور مکمل ذات صرف اللہ کی ہے، نبی ﷺ کے علاوہ ہر ایک کی بات قابل قبول بھی ہو سکتی ہے اور قابل انکار بھی۔

الغرض! ذوالیدین کے توجہ دلانے پر جب نبی ﷺ کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ نماز میں کچھ سہو ہو گیا ہے تو آپ ﷺ نے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی اس کی تصدیق کرنا چاہی اس لئے فرمایا کیا واقعی ایسا ہی ہوا ہے کہ میں نے نصف نماز چھوڑ دی ہے اور قال سے اعراض کر کے حال کی کیفیت اختیار فرمائی تاکہ مکمل استحضار اور غور وفکر کے ذریعے اصل حقیقت تک پہنچا جا سکے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ یہاں اس نکتہ کو بھی اٹھاتے ہیں کہ نبی ﷺ کا صحابی مذکور کو ذوالیدین کے نام سے پکارنا اس بات کی دلیل ہے کہ تعارف کیلئے کسی کا ایسا لقب استعمال کرنا جائز ہے لیکن تحقیر کیلئے ایسا کرنا کسی صورت جائز نہیں۔

اس روایت میں تو صحابہ رضی اللہ عنہم سے استصواب پر ان کا جواب صرف لفظ "نعم" کی صورت میں مروی ہے جبکہ بخاری شریف کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: "صدق لم تصل الا رکعتین"

اس تصدیق کے بعد بقول ابن حجر نبی ﷺ کو یہ یقین ہو گیا کہ آپ سے دو رکعتیں چھوٹ گئی ہیں۔ جس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ

نبی ﷺ کو یاد آ گیا یا تصدیق کرنے والے صحابہ عدد تواتر تک پہنچے ہوئے تھے، یا اللہ نے نبی ﷺ کو ساری صورتحال سے خود ہی مطلع کر دیا تھا جیسا کہ ابوداؤد کی روایت میں بھی ہے۔

اور اسی لفظ ''نعم'' سے استدلال کرتے ہوئے امام مالک واحمد کا مذہب یہ ہے کہ دوران نماز مصالح نماز کی وجہ سے کلام کرنا جائز ہے، حالانکہ اس حدیث سے یہ استدلال کرنا درست نہیں ہے کیونکہ یہ بات پیچھے گذر چکی ہے کہ یہ اجازت صرف نبی ﷺ کی خصوصیت تھی اور احادیث صحیحہ میں اس کی تصریح بھی موجود ہے۔ کہ نماز میں قولاً وفعلاً ہر طرح گو کہ اس میں عمل کثیر ہی لازم آتا ہو'' نبی ﷺ کی بات کا جواب دینا ضروری ہے اور اس سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

اس تشریح کے مطابق ابن سیرین کے اس قول کی ضرورت نہیں رہتی کہ صحابۂ کرام علیہم الرضوان نے ''نعم'' نہیں کہا تھا بلکہ اشارہ کیا تھا اور ظاہر ہے کہ اشارہ کو کلام نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ میری نظر سے تو ایک صحیح روایت ایسی بھی گذری ہے جس میں یہ دونوں چیزیں جمع ہیں اور اس کے الفاظ یوں ہیں۔ ''اومؤوا ای نعم''

سہواً اگر قبلہ کی جانب سے سینہ پھر جائے تو؟

علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے اگر سہواً کسی شخص کا رخ قبلہ کی طرف سے پھر جائے تو اس کے ذمے اعادۂ نماز واجب نہیں ہے۔ حالانکہ اس حدیث میں تحوّل قبلہ کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے البتہ فصل ثالث کے شروع میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت پر یہ اشکال کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔

تقدم سے کیا مراد ہے؟

اس حدیث میں جو لفظ ''فتقدم فصلي ماترك'' آیا ہے، اس کا معنی بیان کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ اپنے مصلی کی طرف چلے، یا تو وہ نبی ﷺ کے قریب ہی تھا اس لئے آپ کو صرف دو قدم ہی چلنا پڑا، یا اگر دور تھا تو نبی ﷺ پے در پے قدم اٹھا کر وہاں نہیں پہنچے بلکہ آہستہ آہستہ کھسک کھسک کر اپنی جائے نماز پر پہنچ گئے۔ گویا اس واقعے کو عمل کثیر کے جواز کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

ہماری رائے میں تقدم کا معنی ''مشی'' نہیں ہے بلکہ یہ اپنے اصلی معنی میں ہے اور مراد یہ ہے کہ نبی ﷺ امامت کیلئے آگے بڑھ گئے، اور چونکہ نبی ﷺ اسی جگہ پر تشریف فرما تھے اسلئے عبارت میں لمبے چوڑے تکلفات اور عجیب وغریب تفریعات کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

اسی طرح حافظ صاحب رحمہ اللہ نے ''فصلي ما ترك'' پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ جملہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ایک شاگرد کی اس رائے کے خلاف ایک واضح ترین حجت ہے جس کے مطابق بھول کر سلام تحلل پھیرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور اس کی دلیل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو روایت پیش کی جاتی ہے وہ سنداً منقطع ہے، نیز اس کا سبب کلام اجنبی تھا اس لئے اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارا مشہور مذہب نہیں ہے، صرف ایک صاحب کی رائے ہے، اس لئے اس پر اعتراض کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔

زیر بحث مسئلہ میں ایک تعارض:

قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عطاء کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سجدۂ سہو قبل السلام تھا، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث تاخیر سجدہ پر دلالت کر رہی ہے جو کہ ایک واضح تعارض ہے، امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اگر چہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دونوں طرح کا عمل منقول ہے قبل السلام بھی اور بعد السلام بھی، لیکن قبل السلام سجدۂ سہو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل تھا اور اسی کو ترجیح ہوتی ہے، نیز حضرت ذوالیدین رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ غزوۂ بدر سے پہلے پیش آیا تھا، اس وقت تک نماز کے احکام مکمل طور پر نہیں آئے تھے اور نہ ہی دوران نماز گفتگو کا جواز منسوخ ہونے کا کوئی حکم آیا تھا۔

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نسخ کلام سے یہ لازم نہیں آتا کہ نماز میں جتنی چیزیں بھی واقع ہیں وہ سب بھی منسوخ ہو جائیں، اور حدیث میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو بعد السلام سجدۂ سہو کے منسوخ ہونے کی دلیل بن سکے، اور یہ قانون ہے کہ تعارض کے وقت اس روایت کو ترجیح ہوتی ہے جو اصح، ابین اور اقیس ہو، اب یہ ایک زائد از نماز چیز ہے جو کہ نماز سے خارج ہے اور بالاجماع اس کے بغیر نماز مکمل ہو جاتی ہے تاہم اختلاف اولویت میں ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص نے قبل السلام سجدۂ سہو کر لیا تو ہمارے نزدیک بھی اس کی نماز ہو جائے گی جیسا کہ ابن ہمام نے ذکر کیا ہے اور ابن حجر کا یہ قول تو بہت ہی زیادہ دور از کار کی بات ہے کہ اس حدیث میں ''ثم'' بمعنی واؤ کے ہے جو سہواً استعمال ہو گیا ہے، یہ بہت بڑی جرأت ہے جو حدیث کے متعلق حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سرزد ہوئی ہے۔

قولہ ثم کبر: اس موقع پر ابوداؤد شریف کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: ''**فکبر ثم کبر وسجد بسھو**''۔

اور یہ ان حضرات کی دلیل ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ نماز کا سلام پھیرنے کے بعد سجدۂ سہو کرنے کیلئے تکبیر تحریمہ کہنا ضروری ہے پھر ہی جا کر سجدۂ سہو کیا جا سکے گا، جبکہ جمہور علماء کے نزدیک سجدہ کی تکبیر ہی کافی ہے، پہلے تکبیر تحریمہ کہہ کر پھر سجدہ کی تکبیر کہنا ضروری نہیں اور اس کی دلیل وہ روایات صحیحہ ہیں جو اس مضمون پر کثرت کے ساتھ دلالت کرتی ہیں اور ابوداؤد کی محولہ بالا روایت شاذ ہے اس لئے اس پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔

قولہ ان عمران بن حصین قال: ثم سلم:

حدیث کے اس جملے پر بحث کرتے ہوئے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص یہ اعتراض نہ کرے کہ یہ منقطع ہے اور اس سے استدلال کرنا درست نہیں اور دلیل یہ پیش کرے کہ ابن سیرین نے تو حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو پایا ہی نہیں ہے اور انہوں نے درمیان میں کوئی واسطہ بھی ذکر نہیں کیا، اس لئے کہ ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ زیر بحث حدیث متصل ہے جیسا کہ امام مسلم کے حوالے سے آ رہا ہے۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اگر کسی شخص نے بعد السلام سجدۂ سہو کیا تو اس کیلئے سجدہ سہو کا تشہد ضروری نہیں ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس حدیث سے تشہد پر ثبوتاً یا نفیاً کسی طرح بھی دلالت نہیں ہوتی، البتہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے جس سند سے اس حدیث کو ذکر کیا ہے اس میں اس کا ثبوت ضرور مل جاتا ہے، عنقریب اس کی

مزید وضاحت فصل ثانی کے شروع میں آیا چاہتی ہے۔

علامہ ابن ہمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہدایہ کہ ایک عبارت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس عبارت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سجدۂ سہو تشہد کو ختم کر دیتا ہے لیکن قعدہ کو ختم نہیں کرتا، پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذوالیدین کا واقعہ تحریم کلام سے پہلے کا تھا، اس لئے لوگوں کے ذہن اس کیلئے تیار نہ تھے، اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس حدیث کے احکام انہی صحابہ کے ساتھ خاص ہیں جو اس موقع پر موجود تھے، اس لئے آج اس حدیث کو ان کے خلاف حجت کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس سے پہلے تو اس کا کوئی شرعی حکم آیا ہی نہ تھا اس لئے انہیں اس سلسلے میں معذور سمجھا جائے گا۔ علماء کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ جس دن یہ واقعہ پیش آیا ہے اس وقت تک تو یہی حکم تھا لیکن اس کے بعد احکام بدل گئے۔ واللہ اعلم۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے مندرجات پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اگر کسی شخص کو ایک ہی نماز میں کئی مرتبہ سہو لاحق ہو جائے تب بھی اسے سہو کے دو ہی سجدے کرنا ہوں گے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک تو بھولے سے سلام پھیر دیا تھا اور دوسرے بھولے سے کلام بھی کیا تھا لیکن سجدے صرف دو ہی کئے۔ یہی اکثر فقہاء کا مذہب ہے لیکن امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ اس میں شذوذ کی راہ اختیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر سہو کے بدلے میں دو سجدے کرنا ضروری ہیں اور ان کی دلیل یہ حدیث ہے۔

"لكل سهو سجدتان"

لیکن امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کا اس حدیث سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ سنداً ضعیف اور منقطع ہے اور اگر بالفرض اسے صحیح اور متصل تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ مؤول ہوگی اور اس حدیث ذوالیدین سے اس کا تعارض لازم آئے گا جو سنداً اس سے زیادہ اصح ہے اور یہ قانون ہے کہ صحیح اور اصح میں تعارض کے وقت اصح کو ترجیح ہوتی ہے۔

اسی طرح شرح السنہ میں ہے کہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر جان بوجھ کر بھی نماز کلام کیا جائے اور اس کا تعلق نماز کی کسی مصلحت سے ہو تو نماز باطل نہیں ہوتی، اسلئے کہ ذوالیدین نے عمداً ہی کلام کیا تھا، دیگر صحابہ نے بھی "نعم" کہہ کر عمداً ہی جواب دیا تھا، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ابھی نماز مکمل نہیں ہوئی ہے اور جن حضرات کی رائے یہ ہے کہ کلام الناس مبطل صلوٰۃ ہے، ان کی رائے یہ کہ یہ واقعہ تحریم کلام سے پہلے کا ہے کیونکہ راوی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ متاخر الاسلام صحابہ میں سے ہیں۔ باقی دوسرے صحابۂ کرام کا کلام کرنے کی وضاحت ابن سیرین کی روایت میں اشارہ کرنے سے آئی ہے اور اگر یہ بات صحیح بھی ہو کہ انہوں نے زبان سے گفتگو کی تھی، سر ہلا کر ہاں کا اشارہ نہیں کیا تھا تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اجابت تھی اور اجابتِ پیغمبر سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

اور اس کی دلیل وہ روایت ہے جس کے مطابق ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس سے گذرے، وہ نماز پڑھ رہے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پکارا لیکن نماز میں ہونے کی وجہ سے وہ جواب نہ دے سکے، نماز سے فارغ ہو کر حاضر خدمت ہوئے اور نماز میں ہونے کا عذر پیش کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا۔

"يايها الذين امنوا استجيبوا لله وللرسول اذا دعاكم"

اسی طرح اس کی ایک دلیل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب آپ نماز پڑھتے ہیں تو التحیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''السلام عليك ايها النبي ورحمة الله وبركاته''

ظاہر ہے کہ غیر نبی کے ساتھ اس طرح مخاطب ہونے سے تو نماز باطل ہو جاتی ہے، معلوم ہوا کہ اجابتِ رسول سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

باقی رہا ذوالیدین کا واقعہ تو وہ بر سبیل نسخ ہے کیونکہ اس زمانے میں احکامات کے جاری اور منسوخ ہونے کا سلسلہ چلتا رہتا تھا اس لئے یوں سمجھا جائے گا کہ گویا ذوالیدین کا کلام بھی سہواً ونسیاناً ہوا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گفتگو فرمانا اس بنیاد پر تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ خیال فرماتے تھے کہ میری نماز مکمل ہو گئی ہے اس لئے اس کا مدار بھی سہو ونسیان پر ہوا اور حدیث میں تو آتا ہی ہے کہ مجھے بھی عام انسانوں کی طرح سہو ونسیان لاحق ہو سکتے ہیں۔

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ذوالیدین کی حدیث کو تسلیم کرنے کے بعد یہ بات از خود ثابت ہو جاتی ہے کہ خبر واحد حجت شرعیہ بن سکتی ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے کیونکہ ذوالیدین رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خبر دی (عدم تکمیل نماز کی) اور وہ افراد صحابہ میں ایک مامون شخص ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دینے کے بعد صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے کیا نمازوں کی رکعتوں میں کمی کر دی گئی ہے؟ یہ الفاظ جو ان کی زبان سے نکلے، ان کے متکلم ہونے کی دلیل ہیں حالانکہ وہ یہ بات جانتے تھے کہ وہ نماز کی حالت میں ہیں، اس کے باوجود وہ نماز سے خارج نہیں ہوئے، معلوم ہوا کہ یہ نسخ کلام سے پہلے کا واقعہ ہے۔

نیز امام طحاوی رحمہ اللہ اس موقع پر پیدا ہونے والے ایک اشکال کو ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو یہاں یہ اعتراض ہے کہ نسخ کلام کا یہ دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے جبکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس موقع پر موجود تھے؟ اور یہ بات طے شدہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف تین سال قبل دولت اسلام کو حاصل کیا تھا اور نسخ کلام کا حکم تو مکہ مکرمہ ہی میں نازل ہو چکا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے زمانے کا جہاں تک تعلق ہے وہاں تک تو آپ کی بات صحیح ہے، لیکن نسخ کلام کے مکہ مکرمہ میں ہو چکنے کی جو بات آپ نے ذکر کی ہے تو ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ یہ روایت آپ سے کس نے نقل کی ہے؟ آپ تو بغیر سند کے استدلال نہیں کرتے اور نہ آپ اپنے مدمقابل کو ایسا کرنے دیتے ہیں پھر اس کی سند کیا ہے اور اس کے راوی آخر کون لوگ ہیں؟

ادھر دوسری طرف ہمارے سامنے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ہیں جو فرماتے ہیں کہ ہم دوران نماز گفتگو کر لیا کرتے تھے تا آنکہ یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی: ''وقوموا لله قنتين''

اور اس میں ہمیں سکوت اختیار کرنے کا حکم دے دیا گیا اور اسی کتاب (طحاوی) میں متعدد مقامات پر اس مضمون کی دیگر روایات بھی ہم نقل کر چکے ہیں اور یہ بات طے شدہ ہے کہ حضرت زید بن ارقم انصاری رضی اللہ عنہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف صحبت مدینہ منورہ میں حاصل ہوا ہے، لہٰذا ان کی حدیث سے ثابت ہوا کہ نسخ کلام کا حکم مدینہ منورہ میں نازل ہوا ہے نہ کہ مکہ مکرمہ میں۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس نماز کے موقع پر سرے سے موجود ہی نہیں تھے (بلکہ بعد میں

دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سن کر انہوں نے اسے دوسری روایات کی طرح امت کے فائدے کیلئے آگے نقل کر دیا) کیونکہ ذوالیدین تو غزوۂ بدر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے، اس اعتبار سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس جملے "ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی" کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو نماز پڑھائی اور لغت کے اعتبار سے ایسا کرنا جائز ہے۔

اس کی مثال وہ روایت ہے جو حضرت نزال بن سبرہؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ مجھے اور تمہیں، ہم سب کو بنو عبد مناف کہا جاتا تھا لیکن آج تم بھی بنو عبداللہ ہو اور ہم بھی بنو عبداللہ ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت نزالؓ فرما رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا حالانکہ فرمانا تو دور کی بات، انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے اور آپ کی زیارت کا فیض حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، اس لئے ان کے اس جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری قوم سے فرمایا۔

نسخ کلام کے مدینہ منورہ میں ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ ہم دوران نماز سلام کا جواب پہلے دے دیا کرتے تھے لیکن بعد میں ہمیں اس سے منع کر دیا گیا، اور حضرت ابو سعید خدریؓ تو حضرت زید بن ارقمؓ سے عمر میں شاید نہیں بلکہ یقیناً کافی چھوٹے تھے، اس لئے یہ بات طے ہوگئی کہ دوران نماز گفتگو اور بات چیت کی ممانعت کا حکم مدینہ منورہ ہی میں نازل ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔

۱۰۱۸ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ بُحَيْنَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى بِهِمُ الظُّهْرَ فَقَامَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ لَمْ يَجْلِسْ فَقَامَ النَّاسُ مَعَهُ حَتّٰى اِذَا قَضَى الصَّلَاةَ وَانْتَظَرَ النَّاسُ تَسْلِيْمَهُ كَبَّرَ وَهُوَ جَالِسٌ فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يُسَلِّمَ ثُمَّ سَلَّمَ ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣/٩٢حديث رقم ١٢٢٤۔و مسلم في صحيحه ١/٣٩٩حديث رقم(٨٥۔٥٧٠)۔وأبوداؤد في السنن١/٦٢٥حديث رقم ١٠٣٤۔والترمذي في السنن ٢/٢٣٥حديث رقم ٣٩١۔والنسائي ٣/١٩حديث رقم ١٢٢٢۔والدارمي ١/٤٢١حديث رقم ١٤٩٩۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن بحینہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو ظہر کی نماز پڑھائی اور پہلی دو رکعتیں پڑھ کر پہلا قعدہ کیے بغیر کھڑے ہو گئے۔ دوسرے لوگ بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ جب نماز پڑھ چکے اور لوگ سلام پھیرنے کے منتظر تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھے بیٹھے تکبیر کہی اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کیے اور اس کے بعد سلام پھیرا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: اس حدیث میں قبل السلام سجدۂ سہو کا ذکر ہے جو کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کی دلیل ہے لیکن بعض دوسری روایات "جو ایک دوسرے کی تائید و تقویت بھی کرتی ہیں" میں بعد السلام سجدۂ سہو کا تذکرہ آتا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بھی بعد السلام سجدۂ سہو کا ثبوت ملتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ زیر بحث حدیث منسوخ ہے۔

گو کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہاں بھی جواب دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ہے کہ بعد السلام سجدۂ سہو کرنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا اجتہاد تھا لیکن یہ جواب انتہائی کمزور اور بودا ہے (کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد بھی تو ہمارے لئے حجت ہے)

اور سجدے کے بارے میں یہ تاویل کرنا کہ یہ سجدۂ سہو تھوڑی تھا، یہ تو نماز کا سجدہ تھا، گوکہ ہمارے بھی بعض علماء اس کے قائل ہوئے ہیں لیکن یہ دور از کار بات ہے اور نہ ہی یہاں اس تاویل کی کوئی ضرورت ہے اور اس سے بھی زیادہ بعید وہ قول ہے جس کے مطابق نبی ﷺ نے یہ سجدہ ہی سہواً اور بھولے سے کیا تھا۔

اگر امام سجدۂ سہو چھوڑ دے:

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر امام سجدۂ سہو نہ کر سکے اور بھولے سے یوں ہی سلام پھیر دے تو مقتدی بھی اس کی اتباع کرتے ہوئے سجدۂ سہو چھوڑ دیں گے۔ یہی امام مالک رحمہ اللہ اور دیگر حضرات کا مذہب ہے جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ وغیرہ اس میں اختلاف رائے رکھتے ہیں، ہماری تحقیق کے مطابق امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہی واضح ہے کیونکہ ان حضرات کے پاس اپنے مذہب کے اثبات کیلئے کوئی دلیل نہیں اور اصل عدم مخالفت ہے۔

الفصل الثّانی:

سجدہ سہو کے بعد تشہد کا حکم

۱۰۱۹: عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى بِهِمْ فَسَهَا فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ تَشَهَّدَ ثُمَّ سَلَّمَ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث حَسَنٌ غَرِيْبٌ)

أخرجه الترمذی ۲/ ۲٤٠ حديث رقم ۳۹۵۔ فی المخطوطة "روايته"۔ "فی المخطوطة يؤثر" فی المخطوطة "ولذ"۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن لوگوں کو نماز پڑھائی اور آپ کو سہو ہوگیا پھر آپ نے دو سجدے کیے اس کے بعد تشہد پڑھی اور سلام پھیر دیا۔ (ترمذی) اور کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: اس حدیث میں قبل السلام، سجدۂ سہو کا ذکر ہے جس پر حافظ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زیادتِ تشہد میں اس حدیث کے راوی متفرد ہیں۔ اور دوسرے راویوں کے مخالف بھی ہیں، جو کہ ان سے زیادہ حافظ و متقن ہیں اس لئے یہ روایت ان کی روایت کے مرتبے تک نہیں پہنچتی۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اصولیین کے یہاں یہ مسلمہ ضابطہ اور اصول ہے کہ زیادت ثقہ مقبول ہوتی ہے، دوسری روایات میں تشہد سے نفیاً یا اثباتاً کسی طرح بھی تعرض نہیں کیا گیا، مثبت کو نافی پر ترجیح ہوتی ہے اور حافظ کو غیر حافظ پر حجت قرار دیا جاتا ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اس روایت کی تخریج کی ہے تاہم اس کے رفع اور وقف کا اختلاف قبولِ حدیث کیلئے کچھ مضر نہیں کیونکہ اس نوعیت کی موقوف روایات بھی حکماً مرفوع ہی ہوتی ہیں، اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ متاخرین شوافع کی ایک جماعت کا یہ کہنا ہے کہ اصح قول کے مطابق سجدۂ سہو کے بعد تشہد کا دوبارہ پڑھنا مندوب و مستحب ہے، بلکہ ایک شافعی بزرگ امام ابوحامد رحمہ اللہ نے تو اس پر شوافع کا اجماع و اتفاق نقل کیا ہے۔

علماء کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کا اس حدیث کے متعلق غرابت کا دعویٰ کچھ مؤثر نہیں، کیونکہ غرابت کی وجہ سے حدیث زیادہ سے زیادہ ضعیف ہو جائے گی اور اس بات پر تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ فضائل اعمال کے سلسلے میں ضعیف حدیث پر بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔

بلکہ ہم تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ اصول حدیث کے مطابق غرابت تو صحت وحسن حدیث کے بھی منافی نہیں ہے، اسی وجہ سے امام ترمذی رحمہ اللہ بعض اوقات ایک ہی حدیث پر ''حسن غریب'' کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں، معلوم ہوا کہ اسے ضعیف قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اس نکتے سے غافل رہے اسلئے انہوں نے اپنے ہی اصحاب واحباب کی رائے کی تردید کر دی، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ فضائل اعمال کے سلسلے میں بھی ضعیف حدیث پر اسی وقت عمل کیا جائے گا جبکہ وہ کسی صحیح حدیث کے معارض نہ ہو، حالانکہ غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں تو کوئی ضعیف حدیث بھی اس حدیث کے معارض موجود نہیں ہے، چہ جائیکہ کوئی صحیح حدیث اس کے معارض ہو، اسی وجہ سے شوافع کی ایک جماعت نے بھی اس کی وضاحت کی ہے کہ تشہد کا قول پرانا ہے اور اس کی بنیاد یہ نکتہ ہے کہ سجدۂ سہو کا محل بعد السلام ہے۔

پہلا قعدہ چھوٹنے کا حکم

۱۰۲۰: وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ ابْنِ شُعْبَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا قَامَ الْاِمَامُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ فَاِنْ ذَكَرَ قَبْلَ اَنْ يَّسْتَوِيَ قَائِمًا فَلْيَجْلِسْ وَاِنِ اسْتَوٰى قَائِمًا فَلَا يَجْلِسْ وَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ ۔

(رواہ ابوداود وابن ماجۃ)

أخرجه أبوداؤد ۱/ ۶۲۹ ۱۰۳۶ ۔وابن ماجه في السنن ۱/ ۳۸۱ حديث رقم ۳۹۵۔

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب امام دو رکعت پڑھ کر کھڑا ہو جائے تو اگر سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے یاد آ جائے تو اسے چاہئے کہ وہ بیٹھ جائے اور اگر وہ سیدھا کھڑا ہو تو اب وہ نہ بیٹھے اور آخر میں سجدہ سہو کر لے۔ (ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

تشریح: اگر امام دو رکعتیں پڑھنے کے بعد بھولے سے کھڑا ہو جائے اور سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے یاد آ جائے تو اسے بیٹھ جانا چاہیے یہ بات کہ اس پر سجدۂ سہو بھی واجب ہوگا یا نہیں؟ سو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے، اصح قول یہی ہے کہ اس پر سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا کیونکہ یہ عمل، قیام میں شمار نہیں ہوگا بلکہ اسے ''قعود'' ہی سمجھا جائے گا۔ کذا فی شرح المنیہ۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث کے ظاہری الفاظ ''ویسجد سجدتی السھو'' قسم ثانی کے ساتھ خاص ہیں، اس لئے یہاں سجدۂ سہو نہیں ہوگا گو کہ وہ قیام کے قریب ہی ہو، ہمارے جمہور فقہاء کے نزدیک یہی قول زیادہ صحیح ہے اور علامہ نووی رحمہ اللہ نے بھی اپنی متعدد کتب میں اس کی تصحیح کی ہے اور دلیل میں یہ حدیث پیش فرمائی ہے۔

''لا سھو فی وثبۃ من الصلوٰۃ الاقیام عن جلوس او جلوس عن قیام''

اور اگر کوئی شخص تیسری رکعت پر بھولے سے مکمل کھڑا ہو گیا تو اب نہ بیٹھے بلکہ بعد میں سجدۂ سہو کر لے، سجدۂ سہو کا یہ وجوب اس بنیاد پر ہے کہ وہ ترک واجب یعنی قعدۂ اولی کو چھوڑنے کا مرتکب ہوا ہے، اگر تیسری رکعت کیلئے سیدھا کھڑا ہو چکنے کے بعد وہ بیٹھ گیا تو اصح قول کے مطابق اس کی نماز فاسد ہو جائے گی کیونکہ فرض کو شروع کرنے کے بعد اسے نامکمل چھوڑ دینے کی وجہ سے جنایت کامل ہو گئی اور فرض کی تکمیل نہ کرنا ایک ایسے کام کی وجہ سے ہوا ہے جو فرض نہیں ہے اس لئے اس صورت میں نماز فاسد ہو جائے گی۔

اگر کوئی شخص چار رکعت والی نماز میں پانچویں رکعت کیلئے بھولے سے کھڑا ہو گیا، یا تیسری رکعت میں سجدہ سے سر اٹھانے کے بعد بیٹھ گیا، یا نماز مغرب میں چوتھی رکعت کیلئے کھڑا ہو گیا، یا فجر میں تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہو گیا، یا کسی بھی نماز میں پہلی رکعت کے سجدے سے سر اٹھانے کے بعد بیٹھ گیا، ان تمام صورتوں میں سجدۂ سہو واجب ہوگا۔ کذا فی شرح المنیہ۔

الفصل الثالث:

۱۰۲۱: عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الْعَصْرَ وَسَلَّمَ فِيْ ثَلَاثِ رَكْعَاتٍ ثُمَّ دَخَلَ مَنْزِلَهٗ فَقَامَ اِلَيْهِ رَجُلٌ يُّقَالُ لَهُ الْخِرْبَاقُ وَكَانَ فِيْ يَدَيْهِ طُوْلٌ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ لَهٗ صَنِيْعَهٗ فَخَرَجَ غَضْبَانَ يَجُرُّ رِدَاءَهٗ حَتّٰى انْتَهٰى اِلَى النَّاسِ فَقَالَ اَصَدَقَ هٰذَا قَالُوْا نَعَمْ فَصَلّٰى رَكْعَةً ثُمَّ سَلَّمَ ثُمَّ سَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/ ۴۰۴ حديث رقم (۱۰۱۔ ۵۷۴) وابن ماجه ۱/ ۳۸۴ حديث رقم ۱۲۱۵۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی اور تین رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا اور گھر میں تشریف لے گئے ایک آدمی کھڑا ہوا جس کو خرباق کہا جاتا تھا اور اس کے ہاتھ بھی کچھ لمبے تھے اس نے عرض کیا اے اللہ کے رسول پھر انہوں نے پورا واقعہ بیان کیا رسول اللہ ﷺ غصہ کی حالت میں اپنی چادر مبارک کھینچتے ہوئے باہر نکل گئے اور لوگوں کے پاس پہنچ گئے اور فرمایا کہ کیا ذوالیدین ٹھیک کہہ رہے ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا جی ہاں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ایک رکعت اور پڑھادی پھر سلام پھیرا اور آخر میں سجدہ سہو کیا پھر سلام پھیر کر نماز کو مکمل کر دیا۔ (مسلم)

تشریح: حضرت عمران بن حصین ؓ کی یہ وہی روایت ہے جس کا حوالہ عنقریب گذر چکا ہے، اس حدیث میں بھولے سے استقبال قبلہ کی کیفیت بھی برقرار نہیں رہ سکتی، اور کثرت مشی بھی لازم آئی جو کہ ہمارے نزدیک مبطل صلوٰۃ ہے، اس لئے ہماری تحقیق کے مطابق اس حدیث کو بھی ''کلام فی الصلوٰۃ'' کی طرح منسوخ قرار دیا جائے گا۔

اس کے بعد حضرت مصنف علیہ الرحمہ نے ذوالیدین کے نام ولقب پر وہی تحقیق رقم فرمائی ہے جو عنقریب گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے۔

اگر نماز میں شک ہو جائے تو کیا کرے

۱۰۲۲: وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ صَلّٰى صَلَاةً يَشُكُّ فِي النُّقْصَانِ فَلْيُصَلِّ حَتّٰى يَشُكَّ فِي الزِّيَادَةِ ۔ (رواه احمد)

أخرجه أحمد في المسند ۱/۱۹۵۔ في المخطوطة "شروطه"۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس آدمی کو نماز پڑھتے ہوئے کمی کا شک ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ اور نماز پڑھ لے تاکہ زیادتی کا شک ہو جائے۔ (احمد)

بَابُ سُجُوْدِ الْقُرْاٰنِ

قرآن کریم کے سجدوں کا بیان

اس باب میں سجدۂ تلاوت کے احکام بیان کئے جائیں گے، یہ ایک ہی سجدہ ہوتا ہے جس میں نیت بھی ہوتی ہے اور دو تکبیروں کے درمیان گھرا ہوا ہوتا ہے، اس میں شرائط بھی وہی ہیں جو نماز کی شرائط ہیں، البتہ اس میں ہاتھ اٹھانے، قیام، تشہد اور سلام کی ضرورت نہیں ہوتی، آیت سجدہ کی تلاوت پر قاری اور سامع دونوں پر سجدۂ تلاوت واجب ہوتا ہے گو کہ متوجہ ہو کر آیت سجدۂ نہ بھی سنی ہو، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب کی یہی رائے ہے، جبکہ دوسرے حضرات کی رائے یہ ہے کہ قاری اور مستمع پر سجدۂ تلاوت واجب ہوتا ہے، فقط سامع پر نہیں، صرف سماع کی صورت میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے اور شوافع کے یہاں دونوں طرح کے قول ملتے ہیں، تاہم اصح قول کے مطابق ''روضہ'' میں استحباب ہی نقل کیا گیا ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم میں قاضی عیاض کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ علماء کرام کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اگر عالم اور متعلم کوئی آیت سجدہ تلاوت کرے تو کیا حکم ہے؟ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ پہلی مرتبہ آیت سجدہ تلاوت کرنے پر تو سجدۂ تلاوت واجب ہوگا، اس کے بعد نہیں۔ اور بعض حضرات کی رائے کے مطابق سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوگا جبکہ ہمارے نزدیک سجدوں میں تداخل ہوگا بشرطیکہ قراءت ایک ہی مجلس میں ہو، خواہ پہلے سجدہ کیا ہو یا آخر میں کر لے۔

الفصل الاول:

سورۂ نجم کا سجدہ

۱۰۲۳: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَجَدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّجْمِ وَسَجَدَ مَعَهُ الْمُسْلِمُوْنَ وَالْمُشْرِكُوْنَ وَالْجِنُّ وَالْاِنْسُ ۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ۸/۱٤ حديث رقم ٤٨٦٢۔ والترمذي ۲/٤٦٤ حديث رقم ۵۷۵۔ في المخطوطة

"نقل"۔ فی المخطوطة "رواہ"۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سورۂ نجم میں سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ مسلمانوں مشرکوں اور جنوں اور سب انسانوں نے بھی سجدہ کیا۔ (بخاری)

تشریح: اس حدیث کی تشریح میں "نجم" سے مراد ابن ملک نے "سورۂ نجم" لی ہے اور ہماری رائے کے مطابق "سورۂ نجم کی آیت سجدہ" ہے نیز اس حدیث میں اس بات کی بھی دلیل موجود ہے کہ مفصلات کا سجدہ بھی واجب ہے لیکن امام مالک رحمہ اللہ اس مسئلے میں دیگر ائمہ سے اختلاف کرتے ہیں۔

اس حدیث مبارکہ میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، میرک کے مطابق یہ اس وقت پیش آیا تھا جب آپ ﷺ قیام مکہ کے دوران مسجد حرام میں تھے، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے مطابق جنات کی حاضری کی وجہ ان کے سجدے میں غرابت کا ہونا تھا اور مشرکین کے سجدے کی وجہ یہ تھی کہ جب نبی ﷺ اس آیت پر پہنچے:۔﴿افرأیتم اللات و العزی﴾

تو شیطان نے بھی نبی ﷺ کی قراءت کے دوران ہی آپ جیسی آواز بنا کر یہ شعر پڑھ دیا:

تلك الغرانيق العلى ☆ وان شفاعتهن لترتجى

اور اس شعر کو نبی ﷺ کی قراءت میں شامل کر دیا، مشرکین یہ سمجھے کہ نبی ﷺ نے ان کے معبودوں کی تعریف کی ہے اور ان کی شان میں توصیفی کلمات کہے ہیں اس لئے وہ بہت خوش ہوئے اور نبی ﷺ کے آیت سجدہ پر سجدہ ریز ہونے کو دیکھ کر وہ بھی سجدے میں گر پڑے، اسی موقع کیلئے یہ آیت قرآنی نازل ہوئی:﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾[الحج: ۵۲] "اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر (اس کا یہ حال تھا کہ) جب وہ کوئی آرزو کرتا تھا تو شیطان اس کی آرزو میں (وسوسہ) ڈالتا ہے جو وسوسہ شیطان ڈالتا خدا اس کو دور کر دیتا ہے۔ پھر خدا اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدا علم والا اور حکمت والا ہے"۔

یہ تشریح ہی صحیح ہے اور بعض دیگر مفسرین نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ سہواً نبی ﷺ کی زبان اقدس پر دوران قراءت یہ الفاظ جاری ہو گئے تھے، (شیطان نے نہیں پڑھے تھے) تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ نبی ﷺ کے مقام کے خلاف اور منافی ہے، یہ ساری تفصیل حافظ صاحب رحمہ اللہ نے تصحیح کے حوالے سے نقل کی ہے۔

ابن ملک شرح مصابیح میں اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی مبارک طبیعت پر مشرکین کا شریعت و توحید سے اعراض بہت گراں گذرتا ہے اور آپ ﷺ طبعی طور پر اس سے رنج محسوس فرماتے تھے، ایک دن آپ ﷺ قریش کی کسی مجلس میں شریک تھے، آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسی علامت ظاہر فرما دیں جس سے وہ آپ کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو سکیں، آپ ﷺ یہ نہیں کہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی نشانی ظاہر ہو جائے جو انہیں اور زیادہ متنفر کر دے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ نجم نازل فرمائی اور نبی ﷺ نے وہ انہیں پڑھ کر سنائی، تلاوت کرتے کرتے جب آپ ﷺ اس آیت مبارکہ پر پہنچے:﴿افرأیتم اللات و العزی ومناة الثالثة الاخری﴾

تو شیطان نے نبی ﷺ کی زبان پر یہ شعر جاری کروا دیا:۔

''تلك الغرانيق العلى ☆ وان شفاعتهن لترتجى''

قریش یہ شعر سن کر بہت خوش ہوئے اور نبی ﷺ بدستور اپنی قراءت میں مشغول رہے، اختتام سورۃ پر جب نبی ﷺ نے سجدہ کیا تو نبی ﷺ کو دیکھ کر مسلمانوں نے بھی سجدہ کیا، اور وہاں پر موجود تمام مشرکین بھی سجدہ ریز ہو گئے، اور نبی ﷺ کی زبان اقدس سے مذکورہ شعر سن کر خوش وخرم وہاں سے متفرق ہو گئے۔ اور کہنے لگے کہ آج تو محمد ﷺ نے ہمارے معبودوں کا بڑے اچھے الفاظ وانداز میں ذکر کیا ہے اسلئے جس طرح انہوں نے ہمارے معبودوں کی مدح سرائی کی ہے، ہم بھی اسی طرح ان کی موافقت کریں گے۔

اس واقعے کے تھوڑی ہی دیر کے بعد جبرئیل امین نبی ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ سرکار! یہ آپ نے کیا کیا؟ آج آپ نے لوگوں کے سامنے وہ چیز پڑھ دی جو میں اللہ کی طرف سے آپ کے پاس نہیں لایا اور وہ کہہ دیا جو میں نے آپ سے نہ کہا تھا، یہ سن کر نبی ﷺ شدید مغموم ہوئے اور آپ ﷺ پر اللہ کا خوف چھا گیا۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ [الحج : ۵۲] ''اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا مگر (اس کا یہ حال تھا کہ) جب وہ کوئی آرزو کرتا تھا تو شیطان اس کی آرزو میں (وسوسہ) ڈالتا ہے جو وسوسہ شیطان ڈالتا خدا اس کو دور کر دیتا ہے۔ پھر خدا اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدا علم والا اور حکمت والا ہے''۔

اس آیت کو سن کر قریش کہنے لگے کہ محمد ﷺ کو ہمارے معبودوں کی تعریف کرنے پر اللہ کے یہاں ندامت ہوئی اور ان کی شرارتوں میں مزید اضافہ ہو گیا، باقی جنات کا اس آیت کو سن کر سجدہ ریز ہونا اس لئے تھا کہ ان میں سے بعض مسلمان تھے اور بعض مشرک، مسلمانوں نے مسلمانوں کی دیکھا دیکھی نبی ﷺ کی موافقت کی اور مشرکوں نے مشرکوں کو دیکھ کر نبی ﷺ کی موافقت کی۔

نیز محولہ بالا آیت میں ''القی الشیطن'' کا مطلب یہ ہے کہ شیطان نے وہ کلمات نبی ﷺ کی آواز جیسی آواز بنا کر ادا کر دیئے، کیونکہ شیطان کو نبی ﷺ پر غلط اور باطل چیزوں کے القاء کی قدرت نہیں دی گئی، اسی وجہ سے علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چونکہ اس سورت مبارکہ کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

''وما ينطق عن الهوى ان هو الا وحى يوحى''

اپنی بارگاہ میں ان کا قرب واضح کیا، انہیں اپنی عظیم نشانیوں کی زیارت کروائی، اور انہیں دیکھنے میں آپ کی آنکھوں کو کسی قسم کا دھوکہ نہیں ہوا، ان تمام چیزوں کو دیکھتے ہوئے نبی ﷺ نے بارگاہ الوہیت میں سجدۂ شکر ادا فرمایا تھا، یہ سجدۂ تلاوت نہ تھا۔

ادھر مشرکین نے جب دیکھا کہ نبی ﷺ نے ان کے معبودان باطلہ کے نام لئے ہیں تو وہ بھی نبی ﷺ کے ساتھ سجدہ ریز ہو گئے، باقی یہ جو قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ نبی ﷺ نے ان کے معبودان باطلہ کی تعریف کی تھی، اس لئے انہوں نے بھی سجدہ کیا

تھا، سو یہ غلط اور باطل قول ہے جسے زندیقوں نے اپنے مذموم مقاصد کیلئے گھڑ لیا ہے۔

لیکن اس رائے پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ بالاتفاق یہ سجدہ، سجدۂ شکر نہیں تھا بلکہ سجدۂ تلاوت تھا، اس لئے علت مذکورہ صحیح نہیں ہے، پھر میں نے دیکھا کہ حافظ صاحب رحمہ اللہ نے بھی اس پر اعتراض کیا ہے اور فرمایا ہے کہ پورے قرآن کریم میں اپنے اپنے مقام پر سجدے کی جو چودہ آیات ہیں، ان پر سجدہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان آیات کو ساجدین کی تعریف میں یا سجدہ سے انکار کرنے والوں کی مذمت میں، یا سجدہ کا حکم اور اس پر ترغیب دینے کیلئے لایا گیا ہے، پھر اس کا سجدۂ شکر نہ ہونا اور سجدۂ تلاوت ہونا مستزاد ہے، اس حسن موافقت پر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

یہاں یہ بات بھی آپ کے علم میں لانا ضروری ہے کہ بہت سے حضرات نے اس واقعہ کو تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا ہے مثلاً علامہ طیبی رحمہ اللہ اور قاضی بیضاوی وغیرہ، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے شرح بخاری میں اس کے ثبوت پر کافی طویل کلام کیا ہے، اور آخر میں فرمایا ہے کہ اس واقعہ کی سب سے بہترین توجیہ تاویل یہ ہو سکتی ہے کہ شیطان نے یہ کلمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی خاموشی کے لمحے میں کہہ دیئے ہوں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں میں اس کی آواز نہ پڑی ہو، لیکن دوسرے لوگوں نے اسے سن لیا ہو۔

ہماری رائے کے مطابق بظاہر کافر ہی اصل سامعین تھے، بغوی کے بقول اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ کلمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر سہواً جاری ہو گئے تھے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو متنبہ کر دیا گیا تھا، شیخ عطیہ ''جو ہمارے استاذ اور عمدۃ المفسرین ہیں'' نے اپنے امام ابوالحسن بکری کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یہ واقعہ عصمت انبیاء پر حرف گیری کا سبب نہیں بن سکتا، کیونکہ یہ بلاقصد وارد ہوا ہے جیسے مرتعش پر ارتعاشی کیفیت بلاقصد و ارادہ طاری رہتی ہے۔

صاحب مدارک فرماتے ہیں کہ شیطان کا زبردستی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس پر کسی قسم کے الفاظ کو اس طرح جاری کر دینا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے اپنے سے دور کرنے پر قادر نہ ہوں، ناممکن ہے کیونکہ شیطان تو کسی دوسرے کے متعلق یہ قدرت نہیں رکھتا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ان عبادی لیس لك علیهم سلطن''

تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اسے یہ قدرت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ نیز سہواً یا غفلت کی بناء پر شیطان کو اس پر قدرت رکھنے کا قول بھی بالکل مردود اور باطل ہے، کیونکہ اس طرح کی غفلت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص جبکہ آپ پر تبلیغ وحی کی ذمہ داری بھی ہو، اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں یہ جائز ہو جائے تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بھی بات پر اعتماد نہیں کیا جا سکے گا۔

اس کے بعد صاحب مدارک نے علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی ذکر کردہ تاویل کو ہی مختار قرار دیا ہے اور کچھ آگے چل کر فرمایا ہے کہ شیطان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کلام کرتا بھی تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام مبارک سنتا بھی تھا، چنانچہ مروی ہے کہ شیطان نے غزوہ احد کے موقع پر آواز لگائی:

''الا ان محمد قد قتل''

اور غزوۂ بدر کے موقع پر کہا تھا: ''لا غالب لکم الیوم من الناس''

سورۃ الانشقاق اور علق میں سجدہ

۱۰۲۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَجَدْنَا مَعَ النَّبِیِّ ﷺ فِیْ اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ وَاقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۴۰۶ حدیث رقم (۱۰۷۔۵۷۸)۔الترمذی ۲/۴۶۲ حدیث رقم ۵۷۳۔والنسائی ۲/۱۶۱ حدیث رقم ۹۶۳۔وابن ماجه ۱/۳۳۶ حدیث رقم ۱۰۵۸۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سورۂ انشقاق اور سورۂ علق میں سجدہ تلاوت کیا۔ (مسلم)

سجدہ تلاوت کے لئے صحابہ کا شوق

۱۰۲۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَاُ السَّجْدَةَ وَنَحْنُ عِنْدَهٗ فَيَسْجُدُ وَنَسْجُدُ مَعَهٗ فَنَزْدَحِمُ حَتّٰى مَا يَجِدُ اَحَدُنَا لِجَبْهَتِهٖ مَوْضِعًا يَسْجُدُ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۵۵۷ حدیث رقم ۱۰۷۶۔ومسلم فی صحیحه ۱/۴۰۵ حدیث رقم (۱۰۴۔۵۷۵) وأخرجه الدارمی ۱/۴۰۹ حدیث رقم ۱۴۷۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کی کوئی آیت پڑھتے اور ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے جب آپ سجدہ تلاوت ادا کرتے تو ہم بھی آپ کے ساتھ سجدہ ادا کرتے اور ہم لوگوں کا اس قدر ازدحام ہوتا کہ ہم میں سے بعض کو اپنی پیشانی زمین پر رکھنے کے لئے سجدہ کرنے کے لئے جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث سجدۂ تلاوت کی تاکید مزید پر دلالت کرتی ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے قرآن کریم کی تلاوت فرمایا کرتے تھے، جب آیت سجدہ پر گذر ہوتا تو تکبیر کہتے ہوئے سجدہ ریز ہو جاتے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی سجدے میں چلے جاتے۔

حافظ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر رونق افروز ہو کر قرآن کریم کی تلاوت فرمائی، جب آیت سجدہ پر گذر ہوا تو منبر سے نیچے اتر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور صحابۂ کرام علیہم الرضوان نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ کیا۔

سجدۂ تلاوت کی ادائیگی کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ آیت سجدہ تلاوت کرنے والا آگے بڑھ جائے اور سننے والے پیچھے صف بنا کر کھڑے ہو جائیں یہ حقیقی اقتداء تو نہیں ہوگی البتہ صورۃً ضرور ہوگی۔ اسی لئے یہ مستحب ہے کہ سجدے میں جانے اور اٹھنے میں امام سے مسابقت نہ کی جائے، اگر یہ اقتداء حقیقی ہوتی تو امام سے مسابقت نہ کرنا واجب ہوتا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سجدۂ تلاوت کی مشروعیت پر تو سب علماء کا اتفاق ہے، اختلاف اس کے وجوب

میں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ سنت ہے، واجب نہیں اور اس کی دلیل بخاری شریف کی وہ روایت ہے جو حضرت بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہمیں سجدۂ تلاوت کا حکم دیا گیا ہے اب جو شخص سجدۂ تلاوت کرلے تب بھی صحیح ہے اور جو شخص نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، نیز بخاری شریف ہی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ منبر پر رونق افروز ہوکر سورۂ نحل کی تلاوت فرمائی، آیت سجدہ پر پہنچ کر آپؓ منبر سے نیچے اترے، خود بھی سجدہ کیا اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔ اگلے جمعے آپؓ نے پھر اسی آیت کی تلاوت فرمائی، لوگ سجدہ کرنے کیلئے تیار ہونے لگے تو فرمایا کہ اطمینان سے بیٹھے رہو، اللہ نے ہم پر اسے فرض نہیں کیا، ہاں! اگر ہم چاہیں تو ہماری مرضی ہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ بخاری شریف کی مذکورہ دونوں روایتیں موقوف ہیں، نیز یہ دونوں روایتیں ان حضرات کے اجتہاد پر مبنی ہیں یا یہ مراد ہے کہ سجدۂ تلاوت علی الفور واجب نہیں ہے۔

متوجہ ہوکر سننے والے پر سجدۂ تلاوت کی تاکید بھی زیادہ ہے اور اس کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمانؓ کی وہ صحیح روایت ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

''السجدة على من استمع''

اسی طرح حضرت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے:

''السجدة على من جلس لها''

زیادہ ظاہر یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت کو علی الفور ادا کرنے کی تاکید وارد ہوئی ہے کیونکہ تاخیر سے اس کی مخالفت کا ایک مذموم پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ بالخصوص جبکہ قاری بھی سجدہ کرے یا حاضرین وسامعین بھی اس کے ساتھ سجدے میں شریک ہوں۔ واللہ اعلم۔

سورۂ نجم کے سجدہ کا حکم

۱۰۲۶: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ قَرَأْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَالنَّجْمِ فَلَمْ يَسْجُدْ فِيْهَا ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٥٥٤ حديث رقم ١٠٧٢ ـ ومسلم ١/٤٠٦ حديث رقم (١٠٦ ـ ٥٧٧) ـ وأبو داوٗد ٢/١٢١ حديث رقم ١٤٠٤ ـ والترمذي في السنن ٢/٤٦٩ حديث رقم ٥٧٦ ـ

ترجمه: حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۂ نجم کی تلاوت کی اور آپ نے اس میں سجدہ تلاوت نہیں کیا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: اس حدیث مبارکہ میں سورۂ نجم کی آیت سجدہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سجدۂ تلاوت نہ کرنے کی وجہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بیانِ جواز ذکر فرماتے ہیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ مفصلات میں سجدۂ تلاوت ہے ہی نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ حضرت زید بن ثابت کا بوقت قراءت سجدہ نہ کرنا ہے (چونکہ وہ قاری تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سامع، چونکہ انہوں نے فوراً سجدہ نہیں کیا اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فوراً سجدہ نہیں کیا)۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کی وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم باوضو نہ تھے، یا وہ مکروہ وقت تھا، یا بعض اوقات سجدہ

کرنا اور بعض اوقات نہ کرنا فرضیت کے وہم کو ختم کرنے کیلئے تھا، نیز یہ کہ سجدۂ تلاوت کا وجوب علی الفور نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ابوداؤد کا یہ فرمانا باعث تعجب ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدۂ تلاوت اس لئے نہیں کیا کہ امام تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے یعنی قاری وہ تھے، انہوں نے سجدہ نہیں کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تبعاً نہیں کیا۔ جس کی بنیاد یہ اصول ہے کہ سامع کا سجدۂ تلاوت' قاری کے سجدے پر موقوف ہے، حالانکہ ترکِ سجدہ کا یہ سبب پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچ سکا اور ثبوت فعل کے ساتھ ترکِ فعل نسخ کا تقاضا نہیں کرتا، گو کہ اس کا مؤخر ہونے کا بھی علم ہو، اور اسی سے حفاظ وقراء کا یہ اصول بھی ٹوٹ جاتا ہے کہ اگر شاگرد استاد کے سامنے تلاوت کر رہا ہو اور آیت سجدہ آنے پر شاگرد سجدہ نہ کرے تو استاد بھی سجدہ نہ کرے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ نقل صحیح نہیں ہے۔ اسی وجہ سے امام شبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ان لوگوں کی بات صحیح ہو تو حضرت زید رضی اللہ عنہ کی حدیث ان کی دلیل بنے گی، باقی علامہ نووی رحمہ اللہ نے جو اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ مفسر کیلئے سجدۂ تلاوت ضروری طور پر مسنون نہیں، تو اسے اس صورت پر محمول کرنا چاہیے جبکہ اس نے قراءت کا ارادہ نہ کیا ہو۔ تاہم یہ بہت بعید ہے۔ قول اقرب یہ ہے کہ اگر وہ قرآن کے الفاظ نہ پڑھے بلکہ اس کا مفہوم دوسرے الفاظ میں بیان کر دے تو اس پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ،بصورتِ دیگر واجب ہے۔

سورۂ ص کا سجدہ

۱۰۲۷ :وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَجْدَةُ صٓ لَيْسَ مِنْ عَزَائِمِ السُّجُوْدِ وَقَدْ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْجُدُ فِيْهَا۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ سورۂ ص کا سجدہ ضروری سجدوں میں سے نہیں ہے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ ص میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

تشریح: عزیمت کا لغوی معنی ہے دل کا کسی چیز پر مضبوطی کے ساتھ جم جانا اور اصطلاح میں فقہاء' عزیمت اس حکم کو کہتے ہیں جو اصالۃً ثابت ہو جیسے پانچوں نمازوں کا وجوب اور حرمت زنا وغیرہ، اور اس اصطلاح کا استعمال سنت کی نسبت فرائض میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ سورۂ ص کا سجدہ واجب ہے، فرض نہیں ،اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک چونکہ سجدۂ ہائے تلاوت سنت ہیں اس لئے ان کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ سجدۂ تلاوت نہیں، بلکہ سجدۂ شکر ہے۔

۱۰۲۸ :وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ مُجَاهِدٌ قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ آاَسْجُدُ فِيْ صٓ فَقَرَاَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمَانَ حَتّٰى اَتٰى فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ فَقَالَ نَبِيُّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّنْ اُمِرَاَنْ يَقْتَدِيَ بِهِمْ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٥٥٢/٢ حديث رقم ١٠٦٩ ـ والترمذی فی السنن ٤٦٩/٢ حديث رقم ٥٧٧ـ والدارمی فی السنن ٤٠٧/١ حديث رقم ١٤٦٧ـ

ترجمہ: اور ایک دوسری روایت میں مذکور ہے کہ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا

کہ کیا میں سورۂ ص میں سجدہ کروں اس کے بعد حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی: وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ سے فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ تک کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ان لوگوں میں سے ہیں جن کو پہلے انبیاء کی اتباع کا حکم تھا۔

(بخاری)

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان انبیاء کرام کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے جن میں منجملہ دوسرے حضرات کے حضرت داؤد علیہ السلام بھی تھے، تاکہ ان انبیاء کرام علیہم السلام کے متفرق اخلاق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات ہیں اکٹھے ہو جائیں، چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوئے تھے اسلئے آپ کو بطریق اولیٰ ان کی اقتداء کرنی چاہیے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا اور اس آیت پر پہنچ کر سجدہ ریز ہو گئے جو سورۂ ص میں محلِ سجدہ ہے۔ یاد رہے کہ یہ حدیث اپنے اطلاق کی وجہ سے نماز اور غیر نماز دونوں حالتوں کو شامل ہے۔

الفصل الثّانی:

قرآن کریم میں پندرہ سجدے ہیں

۱۰۲۹: عَنْ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ قَالَ اَقْرَأَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمْسَ عَشَرَةَ سَجْدَةً فِي الْقُرْاٰنِ مِنْهَا ثَلَاثٌ فِي الْمُفَصَّلِ وَفِيْ سُوْرَةِ الْحَجِّ سَجْدَتَيْنِ۔ (رواہ ابوداود وابن ماجۃ)

أخرجہ أبوداؤد فی السنن۲/۱۲۰ حدیث رقم ۱٤۰۱۔ وابن ماجہ ۱/۳۳۵ حدیث رقم ۱۰۵۷۔ فی المخطوطۃ "أبی عبدالحق"۔ وفی فتح القدیر عبدالحق [۱/٤٦٥]۔

ترجمہ: حضرت عمرو ابن عاص سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن میں پندرہ سجدے پڑھائے ہیں اور ان میں سے تین سجدے مفصلات کی سورتوں میں سے ہیں اور دو سجدے سورۂ حج میں سے ہیں۔

(ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: اس حدیث مبارکہ میں پورے قرآن کریم کے اندر پندرہ سجدوں کا ذکر کیا گیا ہے، علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول امام احمد اور ابن مبارک کی دلیل یہی حدیث ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس میں سے سورۂ ص کا سجدہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سورۂ حج کا دوسرا سجدہ خارج کر کے سجدوں کی تعداد چودہ بتاتے ہیں، جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مفصلات کے سجدوں کو خارج کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ، نے سبیعی تابعی سے نقل کیا ہے کہ میں نے ستر سال تک لوگوں کو سورۂ ص کا سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، تو یہ قول سورۂ حج کے دوسرے سجدے کے عدم وجوب کے منافی نہیں ہے۔ مفصلات کے ان تین سجدوں دو سورۂ حج کے اس سجدے کے علاوہ باقی سجدوں کی تفصیل یہ ہے۔

① سورۂ اعراف کی آخری آیت میں۔

② سورۂ رعد میں ''الآصال'' پر

③ سورۂ نحل میں ''یؤمرون'' پر اور ''یستکبرون'' والاقول نہایت بعید ہے۔

④ سورۂ اسراء میں ''خشوعا'' پر۔
⑤ سورۂ مریم میں ''بکیا'' پر۔
⑥ سورۂ فرمان میں ''نفورا'' پر۔
⑦ سورۂ نمل میں ''عظیم'' پر یا ''یعلنون'' پر، لیکن یہ دوسرا قول بعید ہے۔
⑧ سورۂ سجدہ میں ''یستکبرون'' پر۔
⑨ سورۂ فصلت، حم السجدہ میں ''یسأمون'' پر، یا ''یعبدون'' پر۔

آیات سجدہ کی تعداد میں اختلاف:

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیات سجدہ کی تعداد میں علماء کرام کا اختلاف ہے، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ آیات سجدہ کی تعداد پندرہ قرار دیتے ہیں۔ اور دلیل میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی زیر بحث حدیث پیش فرماتے ہیں اور سورۂ ص کا سجدہ بھی ان میں شامل کرتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیات سجدہ چودہ ہیں، جن میں سورۂ حج کے دو اور مفصلات کے تین سجدے بھی شامل ہیں لیکن سورۂ ص کا سجدہ شامل نہیں، کیونکہ وہ سجدۂ تلاوت نہیں بلکہ سجدۂ شکر ہے جیسا کہ عنقریب اس مضمون کی حدیث آیا چاہتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''داؤد علیہ السلام نے یہ سجدہ توبۃً کیا تھا اور ہم یہ سجدہ شکراً کرتے ہیں''۔ یعنی اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں جو اس نے حضرت داؤد علیہ السلام کو ''قبول توبہ'' کی صورت میں عطاء فرمائی تھی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آیات سجدہ تو چودہ ہی ہیں لیکن وہ سورۂ حج کا دوسرا سجدہ ساقط اور سورۂ ص کا سجدہ ثابت کرتے ہیں جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ آیات سجدہ گیارہ قرار دیتے ہیں اور سورۂ ص اور مفصلات کے سجدوں کو ساقط قرار دیتے ہیں، اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی قول قدیم ہے اور اس کی دلیل حضرت ابن عباسؓ کی وہ روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مفصلات میں سے کسی ایک مقام پر بھی سجدہ نہیں کیا۔

فائدہ: احقر مترجم عرض گذار ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق آیات سجدہ کی تعداد گیارہ اس وقت قرار پاتی ہے جب اصل تعداد پندرہ ہو۔ اس میں سے چار کو منہا کر لیا جائے اور باقی گیارہ کو تسلیم کر لیا جائے۔ ان چار میں سے ایک تو سورۂ ص کا سجدہ ہو گیا اور تین مفصلات کے۔ لیکن اگر آیات سجدہ کی تعداد چودہ ہو جیسا کہ مشہور عندالجمہور یہی ہے تو پھر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے مطابق آیات سجدہ کی تعداد دس رہ جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

آیات سجدہ کی تعداد میں اس اختلاف کے باوجود اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ ان آیات پر سجدہ کرنا ضروری ہے خواہ فرائض میں تلاوت کی ہو یا نفل میں اور بعض حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ وہ آیات سجدہ جو کسی سورت کے اختتام پر واقع ہیں، ان میں رکوع کر لینا سجدۂ تلاوت کی طرف سے کافی ہو سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا بھی یہی قول ہے اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

اس اجمال کی تفصیل شرح منیہ کے حوالے سے اس طرح ہے کہ ہر وہ سجدۂ تلاوت جو نماز میں واجب ہوا ہو، اور نمازی رکوع کر کے اسی میں سجدے کی بھی نیت کر لے۔ یا رکوع میں نیت نہ کر سکے اور نماز کا سجدہ کرنے لگے تو اس سے واجب سجدہ کی

ادائیگی ساقط ہوگئی اور نماز کا فرض سجدہ ہی اس کی طرف سے کافی ہو جائے گی لیکن اس کی ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ آیت سجدہ کے بعد اس نے تین آیات کی تلاوت نہ کی ہو، اگر اس نے آیت سجدہ کے بعد تین آیات کی تلاوت کر لی تو اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے اور اگر آیت سجدہ کے بعد تین سے زیادہ آیات پڑھ لی ہوں، تو پھر رکوع یا سجدۂ نماز سے سجدۂ تلاوت نہیں ہوگا بلکہ الگ سے قصداً اور ارادۃً اسے ادا کرنا ضروری ہوگا، نیز یاد رہے کہ دوران نماز واجب ہونے والے سجدۂ تلاوت کو خارج از نماز ادا نہیں کیا جا سکتا۔

دو سجدوں کی وجہ سے سورۂ حج کی فضیلت

۱۰۳۰: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فُضِّلَتْ سُوْرَةُ الْحَجِّ بِاَنَّ فِيْهَا سَجْدَتَيْنِ قَالَ نَعَمْ وَمَنْ لَمْ يَسْجُدْهُمَا فَلَا يَقْرَأْ هُمَا۔ رواه ابوداود والترمذى وقَالَ هٰذا حديث لَيْسَ اِسْنَادُهٗ بِالْقَوِيِّ وَفِي الْمَصَابِيْحِ فَلَا يَقْرَأْهَا كَمَا فِيْ شَرْحِ السنة۔ (رواه ابوداود والترمذی)

أخرجه أبو داؤد ٢/ ١٢٠ حديث رقم ١٤٠٢۔ والترمذی ٢/ ٤٧٠ حديث رقم ٥٧٨۔ في المخطوطة "بها"

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامر سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ سورۂ حج کو اس لئے فضیلت حاصل ہے کہ اس میں دو سجدے ہیں آپ نے فرمایا ہاں جو انسان ان دونوں سجدوں کو نہ کرے وہ ان دونوں سجدوں کی آیتوں کو تلاوت نہ کرے۔ (ابوداؤد۔ ترمذی) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند مضبوط نہیں ہے اور مصابیح میں فَلَا يَقْرَأْ هُمَا کے بجائے فَلَا يَقْرَأْهَا کے الفاظ ہیں جیسے شرح السنہ میں ذکر کیا گیا ہے مطلب یہ ہوگا کہ وہ آدمی اس سورت کو نہ پڑھے۔

تشریح: اس حدیث میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ جو شخص سورۂ حج میں موجود آیات سجدہ پر سجدہ نہ کر سکے، وہ ان آیات کی تلاوت ہی نہ کرے تا کہ ترک سجدہ کا گناہ نہ رہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سجدۂ تلاوت بہر حال واجب ہے۔

''قوله فلا يقرأهما'' اس حدیث میں تو یہ لفظ اسی طرح آیا ہے لیکن صحیح نسخہ ''فلم يقرأهما'' ہے اور اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ ان آیاتِ سجدہ پر پہنچ کر تعمیل حکم کی خاطر سجدہ نہیں کرتا تو گویا اس نے ان آیات کی تلاوت ہی نہیں کی، اور ''مصابیح'' میں یہ مفرد کی ضمیر کے ساتھ ''فلا يقرأهما'' آیا ہے اس صورت میں ضمیر کا مرجع ''سورة'' ہوگی۔ اور ابن حجر کے بقول اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے آیتِ سجدہ پر سجدہ نہ کر کے ایسا عمل کیا ہے کہ جس کی وجہ سے اس کی سورت کامل نہیں قرار پا سکتی۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مصابیح کے نسخوں میں یہ لفظ ہم نے بھی اسی طرح مفرد کی ضمیرِ غائب کے ساتھ پایا ہے لیکن یہ غلط ہے۔ صحیح اور درست تثنیہ کی ضمیر کے ساتھ ''فلا يقرأهما'' ہی ہے اور اس ضمیر کا مرجع ''سجدتين'' ہے جیسا کہ ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ کتبِ حدیث میں ہمیں ملتا ہے۔

اور اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت کو تلاوت کرنے والے کے حق میں صرف اس کی تلاوت کی وجہ سے مشروع کیا

گیا ہے۔اس لئے سجدۂ تلاوت حقِ تلاوت ہے،اب اگر کوئی شخص اس حق تلاوت کو ہی ضائع کر دینے کے درپے ہو تو اس کیلئے بہتر یہی ہے کہ وہ آیت سجدہ کی تلاوت ہی نہ کرے، کیونکہ اگر سجدۂ تلاوت واجب ہو جیسا کہ ہمارا مذہب ہے تو ترک واجب کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگا،اور اگر سنت ہو جیسا کہ دوسرے ائمہ فرماتے ہیں تو اس میں سستی اور غفلت کا نقصان ہوگا۔''کذا ذکرہ الطیبی''۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سورۂ حج کا دوسرا سجدہ نماز کیلئے ہے،سجدۂ تلاوت نہیں ہے، کیونکہ اس آیت میں صرف سجدہ کا حکم نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ رکوع کا بھی حکم ملا ہوا ہے،اور تلاش وتتبع سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی مثالوں میں قرآن کریم کا اسلوب بیان امر اور بیانِ رکن کا ہوتا ہے جیسے ذیل کی آیت میں ہے۔

''واسجدی وارکعی مع الراکعین''۔

سند حدیث پر ایک نظر:

زیر بحث حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے سند کے اعتبار سے ''لیس بالقوی'' قرار دیا ہے،میرک کے بقول جس کی وجہ عبداللہ بن لہیعہ اور شرح بن ہامان کا اس کی سند میں ہونا ہے کیونکہ یہ دونوں متکلم فیہ راوی ہیں۔لیکن بنیادی طور پر یہ حدیث صحیح ہے اور حاکم نے اپنی مستدرک میں شیخین کی سند کے علاوہ ایک دوسرے طریق سے اس کی تخریج وتصحیح بھی کی ہے اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی اس تصحیح کو بھی برقرار رکھا ہے۔

امام ابوداؤد نے بھی اپنی مراسیل میں اسے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث مسنداً بھی بیان کی گئی ہے لیکن صحیح نہیں ہے،امام حاکم نے امام ترمذی والی روایت ہی کو نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ عبداللہ بن لہیعہ یوں تو ائمہ حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔بس آخری عمر میں انہیں اختلاط کی بیماری لاحق ہوگئی تھی اور چونکہ یہ حدیث کے ضعیف ہونے کی ایک وجہ وجیہہ ہے اس لئے محدثین ان کی روایت کو زیادہ ترجیح نہیں دیتے۔

اس موضوع سے متعلق فیصلہ کن حدیث وہ ہے جو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے سورۂ حج کی آیات سجدہ سے متعلق نقل فرمائی ہے کہ سورۂ حج کا پہلا سجدہ تو لازمی اور یقینی ہے اور دوسرا سجدہ تعلیمی ہے،یہی ہمارا مذہب ہے اور یہی ہماری دلیل ہے۔

سجدۂ تلاوت نماز میں ادا کرنا

۱۰۳۱:وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَجَدَ فِیْ صَلٰوةِ الظُّهْرِ ثُمَّ قَامَ فَرَكَعَ فَرَاَوْا اَنَّهٗ قَرَاَ تَنْزِيْلَ السَّجْدَةِ ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۵۰۷حدیث رقم ۸۰۷۔

ترجمہ:حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز میں سجدہ کیا پھر کھڑے ہوئے اور رکوع کیا لوگوں نے خیال کیا کہ شاید آپ نے سورۂ الٓم تنزیل پڑھی ہے۔

تشریح: اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ابن ملک فرماتے ہیں کہ جب نبی ﷺ سجدۂ تلاوت فرما چکے اور کھڑے ہوگئے تو سورت کا بقیہ حصہ مکمل کئے بغیر ہی رکوع میں چلے گئے، البتہ مسئلہ کے طور پر معلوم رہے کہ سجدۂ تلاوت کے بعد قیام میں مزید قراءت کی جاسکتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ ہم تو اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ سجدۂ تلاوت کے بعد قیام میں مزید قراءت کرنا افضل ہے، ممکن ہے کہ نبی ﷺ نے طوالت نماز کی وجہ سے ایسا نہ کیا ہو۔ یا بیان جواز کیلئے قراءت نہ کی ہو۔ لیکن اس کے باوجود ایسی کوئی نص نہیں ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ نبی ﷺ نے سورت کے اختتامی حصہ کی قراءت نہیں فرمائی۔

اس موقع پر ہمارے مذہب کے مطابق اگرچہ رکوع میں سجدۂ تلاوت کی نیت کر لینے سے وجوب سجدہ ساقط ہو جاتا ہے اور ایسا کرنا جائز بھی ہے لیکن نبی ﷺ نے فقط رکوع پر اکتفاء اس لئے نہیں فرمایا تا کہ افضل پر عمل کرنے کو ترجیح حاصل ہو جائے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے اس نص صریح کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ یہاں سجدہ کرنا ہی افضل ہوتا ہے اور بدائع میں بھی یہ مسئلہ کسی قید کے بغیر مطلق ذکر کیا گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک آدمی سجدۂ تلاوت بھی کرتا ہے پھر کھڑے ہونے کے بعد رکوع بھی کرتا ہے، اسے دو عبارتیں کرنے کا موقع ملتا ہے اور دہرا ثواب حاصل ہوتا ہے، لیکن اگر وہ صرف رکوع پر ہی اکتفاء کر لے تو اسے یہ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا اور دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ سجدہ کرنے سے واجب کی ادائیگی صورۃً (یعنی دونوں طرح ہو جاتی ہے اور رکوع میں یہ ادائیگی صرف معنیً ہوتی ہے اس لئے یہ بات ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ سجدہ کرنا ہی افضل ہے۔

پھر علماء کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ سجدۂ تلاوت کا رکوع کے ضمن میں ادا ہو جانا ''قیاس'' ہے اور رکوع کے ضمن میں ادا نہ ہونا ''استحسان'' ہے۔ قیاس کی دلیل امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں تعظیم کا معنی تو ایک ہی ہے۔ اسلئے حصول تعظیم میں تو ان کی جنس ایک ہی ہوئی، اور تعظیم خداوندی یا تو اس شخص کی اتباع میں ہوگی جو خود بھی اللہ کی تعظیم کرتا ہے یا اللہ کی تعظیم سے تکبر وانکار کرنے والے کی مخالفت میں ہوگی، دونوں صورتوں میں اسے اختیار کر لینا جائز ہے۔

اور استحسان کی دلیل یہ ہے کہ آیت سجدہ کی تلاوت پر اللہ کی تعظیم ایک مخصوص طریقے یعنی سجدے کی صورت میں واجب ہوتی ہے اسلئے اس ہی کو اختیار کرنا چاہیے۔ لیکن اس سلسلے میں قیاس پر عمل کرنا اور استحسان پر عمل نہ کرنا قوت دلیل کی وجہ سے ہے چنانچہ اس کی تائید حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ان روایات سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق یہ دونوں حضرات سجدۂ تلاوت کی جگہ نماز میں رکوع کو بھی کافی سمجھتے تھے، اس پر مستزاد یہ کہ کسی دوسرے صحابیؓ سے اس کے خلاف ایک روایت بھی نہیں ملتی اس لئے اس پر عمل کیا جائے گا۔

یہاں اس حدیث پر متوجہ ہونے والے اس اشکال کو دور کرنا بھی ضروری ہے کہ نماز ظہر سرّی نمازوں میں سے ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو کیسے پتہ چلا کہ نبی ﷺ نے سورۂ الم السجدہ کی تلاوت کی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ بعض اوقات سری نمازوں میں بھی اپنی آواز معمولی سی بلند فرما لیتے تھے، تا کہ صحابۂ کرامؓ کو اس کی تلاوت مسنون ہونے کا علم ہو جائے ابن ملک فرماتے ہیں کہ بظاہر جن حضرات نے نبی ﷺ کی قراءت سنی تھی، یہ وہ بعض صحابۂ کرامؓ تھے جو آپ ﷺ کے قریب ہی کھڑے

تھے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ جو اکابر مالکیہ میں سے ہیں، اسی حدیث کی روشنی میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ نماز میں سجدۂ تلاوت سے منع کرتے ہیں۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا یہ ہے کہ حدیث کے ظاہری الفاظ تو اس کے مستحب ہونے پر دلالت کرتے ہیں، جواز سے بھی بڑھ کر اور یہاں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جو نماز میں سجدۂ تلاوت کے ممنوع ہونے پر دلالت کرتا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ تلاوت کی آیت پڑھنے پر سجدہ تلاوت کرتے تھے

۱۰۳۲: وَعَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ عَلَيْنَا الْقُرْاٰنَ فَاِذَا مَرَّ بِالسَّجْدَةِ كَبَّرَ وَسَجَدْنَا مَعَهٗ۔

(رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۲/۱۲۵ حديث رقم ۱٤۱۳۔ والدارمی ۱/٤۳۹ حديث رقم ۱۵۵٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سامنے قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور جب سجدے کی آیت پر پہنچتے تو تکبیر کہتے اور سجدہ کرتے پھر ہم بھی آپ کے ساتھ سجدہ کرتے۔ (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث مبارکہ کے تحت ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سجدۂ تلاوت کے وقت صرف سجدہ میں جاتے ہوئے تکبیر کہتے تھے (پہلے تکبیر تحریمہ کہہ کر پھر سجدہ کیلئے تکبیر نہ کہتے تھے) اور یہی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سجدۂ تلاوت کرنے والا پہلے ہاتھ اٹھا کر تکبیر تحریمہ کہے پھر سجدہ کی تکبیر کہے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ صاحب ہدایہ کی اس عبارت "اعتبارا بسجدة الصلوٰة" کے تحت فرماتے ہیں کہ صاحبِ ہدایہ ان دونوں تکبیروں کے مستحب اور مندوب ہونے کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ تکبیر کہتے ہوئے سجدہ میں جانا اور تکبیر کہتے ہوئے سجدے سے سر اٹھانا واجب نہیں، صرف مستحب ہے، اسلئے اس میں رفع یدین بھی نہیں ہوگا کیونکہ رفع یدین تکبیر تحریمہ کے ساتھ خاص ہے اور سجدۂ تلاوت کرنے والا تکبیر تحریمہ نہیں کہتا۔

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اس کے علاوہ سجدۂ تلاوت کی وہی شرائط ہیں جو نماز کی شرائط ہیں۔

سجدۂ تلاوت کیلئے تکبیر کہنے کا وقت:

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اس سلسلے میں ایک قول تو یہ ہے کہ جھکتے ہوئے تکبیر نہ کہے بلکہ پہلے تکبیر کہے پھر جھکے، دوسرا قول یہ ہے کہ جھکتے ہوئے تکبیر کہے یعنی پہلے قول کے عکس، بعض حضرات کہتے ہیں کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا پہلا قول ہی صحیح ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ سجدہ سے اٹھ کر بھی تکبیر کہنی چاہیے یا نہیں، تو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق تکبیر کہنی چاہیے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق نہیں کہنی چاہیے۔ اور بظاہر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ ہی کا قول راجح اور معتبر ہے کیونکہ یہ بھی نماز کے سجدے کی طرح ہی ہوتا ہے۔ اور مستحب یہ ہے کہ بیٹھے بیٹھے سجدہ میں جانے کی بجائے کھڑے ہو کر سجدہ میں جائے

جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے اور گھٹنوں کے بل گر کر سجدہ ریز ہونے والوں کی جو تعریف کی گئی ہے وہ اس صورت میں زیادہ کامل طور پر پائی جاتی ہے۔ اور بعض حضرات اسے مستحب نہیں سمجھتے۔

فائدہ: اس حدیث کی تخریج امام ابوداؤد نے کی ہے لیکن اس کی سند میں عبید اللہ بن عمر بن حفص العمری نام کا ایک راوی بھی ہے جس پر علماء نے کلام کیا ہے۔ اس اعتبار سے اس حدیث کا درجہ کم ہو جاتا ہے لیکن امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو اس کے بھائی عبد اللہ بن عمر سے مقروناً بھی نقل کیا ہے اور اس حدیث کی اصل بنیاد صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالے سے موجود بھی ہے اس لئے اس سے استدلال کرنا صحیح ہے۔ نیز حاکم نے بھی اسے اپنی مستدرک میں نقل کیا ہے اور اسے ''صحیح علی شرط الشیخین'' قرار دیا ہے۔

سجدۂ تلاوت سواری پر ادا کرنے کا حکم

۱۰۳۳: وَعَنْهُ أَنَّهٗ قَالَ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ عَامَ الْفَتْحِ سَجْدَةً فَسَجَدَ النَّاسُ كُلُّهُمْ مِنْهُمُ الرَّاكِبُ وَالسَّاجِدُ عَلَى الْأَرْضِ حَتّٰى أَنَّ الرَّاكِبَ لَيَسْجُدُ عَلٰى يَدِهٖ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۲/ ۱۲۵ حديث رقم ۱۴۱۱۔ في المخطوطة "مفرد"۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے سال سجدہ تلاوت والی آیت پڑھی اور تمام لوگوں نے آپ کے ساتھ سجدہ تلاوت ادا کیا سجدہ کرنے والوں میں سے بعض سواریوں پر تھے اور وہ اپنے ہاتھوں پر ہی سجدہ کر رہے تھے۔ (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث میں سجدہ سے مراد آیتِ سجدہ ہے اور وہ بھی اکیلی نہیں بلکہ ماقبل یا مابعد سے ملا کر، اور اگر کسی آیت سجدہ کی تلاوت مراد ہو تو اس کو بیان جواز پر محمول کیا جائے گا کیونکہ ہمارے نزدیک ماقبل اور مابعد کی آیات کو چھوڑ کر صرف آیت سجدہ کی تلاوت کرنا خلاف اولیٰ ہے کیونکہ اس سے آیات سجدہ کی دوسری آیات پر فضیلت کا وہم پیدا ہوتا ہے حالانکہ کلام اللہ ہونے کے اعتبار سے تو سب آیات برابر ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ جن آیات میں اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان صفات کا ذکر ہے، انہیں دوسری آیات پر ایک درجہ مزید فضیلت حاصل ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت سجدہ کے ساتھ ماقبل یا مابعد سے کچھ آیات کو ملا کر پڑھنا مستحب ہے تاکہ آیت کی مراد اچھی طرح واضح ہو جائے اور سجدۂ تلاوت حق قرأت کی وجہ سے واجب ہو، صرف آیت سجدہ کی وجہ سے نہیں کیونکہ صرف سجدہ کرنے کی غرض سے آیت سجدہ کی تلاوت کرنا مستحب نہیں ہے اس لئے اس کے ساتھ کچھ آیات ملا لینی چاہئیں تاکہ اس کا ارادہ ''تلاوت'' کا سمجھا جائے، ''ایجاب سجدہ'' کا نہیں۔

اس حدیث کے آخری جملے میں ہاتھ پر سجدہ کرنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ سوار اپنے ہاتھ کو اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگا لیتا تھا اور سمجھتا تھا کہ سجدہ ہو گیا بلکہ مراد یہ ہے کہ ہاتھ جو زین پر رکھے ہوئے تھے، انہیں وہاں سے ہٹائے بغیر سر جھکا کر ہاتھوں پر ہی سجدہ کر لیتے تھے، زمین پر نہ اترتے تھے، ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہاتھوں پر سجدہ کرنا صحیح ہے جبکہ وہ گردن جھکا لے، یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔

لیکن یہ ہمارا مشہور مذہب نہیں بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے، چنانچہ شرح منیہ میں ہے کہ اگر کوئی شخص رش کی وجہ سے اپنی ہی ران پر سجدہ کرلے تو جائز ہے، اسی طرح اگر کوئی ایسا عذر ہو جو سجدہ میں مانع ہو تو ران کے علاوہ جسم کے کسی اور حصے پر بھی سجدہ کرنا جائز ہے، یہی راجح قول ہے اور بلا عذر ایسا کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ قول مختار یہی ہے۔ کذا فی الخلاصہ۔

اور اگر کسی شخص نے اپنی ہتھیلی زمین پر رکھ کر اس پر سجدہ کرلیا تو صحیح قول کے مطابق اس کا سجدہ ادا ہو جائے گا اگرچہ بلا عذر ہی ہو، تاہم مکروہ ضرور ہوگا۔ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اگر سواری یا ایسی بیماری کی حالت میں آیت سجدہ کی تلاوت کی، جس کی موجودگی میں وہ سجدۂ تلاوت نہیں کر سکتا تو اس کیلئے اشارہ کرلینا بھی کافی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد مفصلات کی سورتوں میں سجدہ نہیں کیا

۱۰۳۴: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَسْجُدْ فِيْ شَيْءٍ مِنَ الْمُفَصَّلِ مُنْذُ تَحَوَّلَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ۔ (رواه ابو داود)

أخرجه أبو داوٗد ۲/۱۲۱ حديث رقم ۱۴۰۳۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف لانے کے بعد مفصلات کی سورتوں میں سے کسی سورت میں سجدہ ادا نہیں کیا۔ (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث مبارکہ کے تحت حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سند کے اعتبار سے اولاً تو یہ حدیث صحیح نہیں ہے لیکن اگر اسے صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو اسے بطور دلیل کے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سندِ صحیح کے ساتھ مروی ہے کہ ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں سورۂ انشقاق اور سورۂ علق کی آیاتِ سجدہ پر پہنچ کر سجدہ کیا، اور یہ بات طے ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ متاخر الاسلام صحابہ کرامؓ میں سے ہیں۔

ابن ملک اس کی ایک اور وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اکثر صحابہ کرامؓ کی روایات مفصلات میں سجدہ کیلئے مثبت ہیں اور اثبات قبولیت کے ہی قابل ہوتا ہے اس لئے اس کو ترجیح ہوگی، نیز صحاح میں حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نجم کی آیتِ سجدہ پر سجدۂ تلاوت ادا فرمایا اور صحاح کی روایات کا حسان کی روایات سے قوی ہونا ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

اور یہ آخری جواب ہماری رائے کے مطابق اس وقت ہے جبکہ ابوداؤد کی زیر بحث حدیث کو ''حسن'' کے درجے پر تسلیم کیا جائے، لیکن اگر اسے ضعیف قرار دیا جائے جیسا کہ حقیقۃً وہ ضعیف بھی ہے، تو اس سے استدلال کرنا ہی درست نہیں ہے۔ اگر یہ روایت ثابت ہوتی تو فریق مخالف سورۂ نجم کے سجدہ کو ہجرت مدینہ سے قبل پر محمول کر سکتا تھا جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے حافظ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کی بات اور دلیل زیادہ قوی محسوس ہوتی ہے۔

سجدۂ تلاوت کی تسبیح

۱۰۳۵: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ فِيْ سُجُوْدِ الْقُرْآنِ بِاللَّيْلِ

سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِیْ خَلَقَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ۔

(رواہ ابوداود والترمذی والنسائی وقَالَ الترمذی هٰذاحدیث حسن صحیح)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۲/ ۱۲٦ حدیث رقم ۱٤۱٤۔والترمذی ۲/ ٤٧٤ حدیث رقم ۵۸۰۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو قرآن کریم کے سجدوں میں یہ تسبیح پڑھتے تھے: سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِیْ خَلَقَهٗ وَشَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَقُوَّتِهٖ ۔کہ میرے چہرہ نے اس ذات کو سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اپنی قوت اور قدرت سے کان اور آنکھیں بنائیں۔(ابوداؤد۔ترمذی۔نسائی) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سجدۂ تلاوت میں بھی وہی الفاظ کہے جائیں گے جو عام نمازوں کے سجدے میں کہتے ہیں (سبحان ربی الاعلی) اور یہی اصح قول ہے لیکن بعض حضرات اس دعا کو مستحب قرار دیتے ہیں۔

''سبحان ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا''

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی حالت ذکر کرتے ہوئے سجدہ میں ان کے یہ الفاظ بیان فرمائے ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ اس اجمال میں تھوڑی سی تفصیل کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے اور وہ یہ کہ اگر آیت سجدہ نماز میں تلاوت کی ہو اور وہ نماز فرض ہو تو سجدۂ تلاوت میں بھی وہ کہے جو سجدۂ نماز میں کہتا ہے اور اگر نفل نماز ہو تو کوئی بھی منقول دعاء پڑھ لے۔ مثلاً ''سجدوجهی'' یا ''اللهم اكتب لی'' وغیرہ اور اگر آیت سجدہ نماز سے باہر تلاوت کی ہو تو پھر جو چاہے پڑھ لے۔

فائدہ: حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیہقی کی روایت میں ''خلقه'' کے بعد ''وصوّره'' کا لفظ بھی آیا ہے، اور حاکم کی روایت میں ''وقوته'' کے بعد ''فتبارك الله احسن الخالقين'' بھی آیا ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔

سجدہ تلاوت کے وقت درخت کی دعا

۱۰۳٦:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رَاَيْتُنِی اللَّيْلَةَ وَاَنَا نَائِمٌ كَاَنِّیْ اُصَلِّیْ خَلْفَ شَجَرَةٍ فَسَجَدْتُّ فَسَجَدَتِ الشَّجَرَةُ لِسُجُوْدِیْ فَسَمِعْتُهَا تَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِیْ بِهَا عِنْدَكَ اَجْرًا وَضَعْ عَنِّیْ بِهَا وِزْرًا وَاجْعَلْهَا لِیْ عِنْدَكَ ذُخْرًا وَّتَقَبَّلْهَا مِنِّیْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوٗدَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَرَأَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَجْدَةً ثُمَّ سَجَدَ فَسَمِعْتُهٗ وَهُوَ يَقُوْلُ مِثْلَ مَا اَخْبَرَهُ الرَّجُلُ عَنْ قَوْلِ الشَّجَرَةِ (رواہ الترمذی وابنِ مَاجَةَ) اِلَّا اَنَّهٗ لَمْ يَذْكُرْ وَتَقَبَّلْهَا مِنِّیْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوٗدَ وَقَالَ الترمذی هذا حديث غريب۔ (ترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۵/ ٤۵۵ حدیث رقم ۳٤۳٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا اور عرض کی اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نے آج رات اپنے آپ کو خواب میں دیکھا ہے کہ گویا میں ایک

درخت کے نیچے نماز پڑھ رہا ہوں اور میں نے سجدہ تلاوت والی آیت پڑھی ہے اور جب میں نے سجدہ تلاوت ادا کیا تو اس درخت نے بھی میرے ساتھ سجدہ کیا اور میں نے سنا کہ وہ درخت یہ دعا پڑھتا ہے، اے اللہ میرے لئے اپنے پاس میرے اس سجدہ کا ثواب لکھ لے اور اس کی وجہ سے میرے گناہ معاف فرما اور اس سجدہ کو میرے لئے ذخیرہ بنا اپنے پاس، اور اس سجدہ کو میرے طرف سے ایسا قبول کر جیسے تو نے اپنے بندے داؤد کے سجدے کو قبول کیا حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا کو پڑھنے کے غرض سے اسی مجلس میں یا بعد میں سجدہ کی آیت کو تلاوت کیا اور سجدہ ادا کیا اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی کلمات سنے جو اس آدمی نے درخت سے نقل کیے تھے۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ) مگر اس روایت میں وَتَقَبَّلْهَا مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ یہ الفاظ ذکر نہیں کئے اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: اس حدیث مبارک میں جس شخص کا یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے، میرکؒ کے بقول وہ حضرت ابو سعید خدریؓ ہیں جیسا کہ اسی سلسلے کی دوسری روایت میں اس کی تصریح بھی آئی ہے، بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ وہ انسانی شکل میں فرشتہ آیا تھا، لیکن شیخ جزری رحمہ اللہ نے تصحیح المصابیح میں اس قول کو انتہائی بعید اور دور از کار قرار دیا ہے۔

كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ : ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث کے اس جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ سورۂ ص کا سجدہ برائے تلاوت تھا، نہ کہ برائے شکر، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم بھی اس بات کو تسلیم کر لیتے لیکن اس کے مقابلے میں ایک صریح حدیث موجود ہے کہ یہ سجدۂ شکر ہے اس لئے ہم اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتے، لیکن حافظ صاحبؒ کی یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ سجدۂ تلاوت اور سجدۂ شکر میں منافات تو نہیں ہے کہ وہ دونوں جمع ہی نہ ہو سکیں۔

درخت کی دعاء:

ابن ملک فرماتے ہیں کہ حدیث مبارکہ میں ذکر کی گئی دعاء کو پڑھنے والا فرشتہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے درخت کو قوت گویائی عطاء فرما دی ہو جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں ہوا، لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ حدیث میں خواب کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور خواب کی حالت خیالی ہوتی ہے جو تعبیر کی تو محتاج ہوتی ہے لیکن تاویل کی محتاج نہیں ہوتی۔

قال ابن عباس: فقرأ النبی ﷺ سجدۃ: خواب کا واقعہ سننے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود بھی جس آیت سجدہ کی تلاوت کی، بظاہر وہ سورۂ ص کی آیت تھی یا سورۂ الم السجدہ کی۔ اور ایسا کرنے کی وجہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ ممکن ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو سعید خدریؓ کا خواب سن کر اس کے جائز اور مشروع ہونے کو بالفعل ثابت کرنا چاہا ہو جو کہ قول کی نسبت زیادہ بلیغ ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اتفاقاً ایسا ہو گیا، تب بھی اس کی مشروعیت بہر حال ثابت ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حافظ صاحب رحمہ اللہ کا بیان کردہ دوسرا احتمال تو بہت دور کی کہانی ہے اور پہلا احتمال خود شوافع کے اپنے اس قول کے معارض و منافی ہے کہ خارج نماز میں سجدہ کرنے کی غرض سے صرف آیت سجدہ کی تلاوت کرنا نہ مستحب ہے اور نہ مکروہ۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ سجدۂ تلاوت میں یہ دعاء پڑھنا (جس کا حدیث میں تذکرہ ہوا ہے) مسنون ہے کیونکہ نبی ﷺ سے اس کا پڑھنا ثابت ہے اور ہماری رائے کے مطابق خاص طور پر سورۂ ص میں اس کا پڑھنا مسنون ہے اور غالبًا نبی ﷺ نے ''درخت'' سے اپنی ذات اقدس مراد لی ہے اور صحابی مذکور نے اقتداء کی ہو۔ نیز یہ کہ مقتدیٰ بہ کیلئے یہ کلمات کہنا مناسب ہے تا کہ اس کی مقتدیانہ شخصیت واہمیت برقرارر ہے۔

فائدہ: اصل میں یہ ایک ذہنی خلجان کو دور کرنے کی کوشش ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ مقتدی ہیں اور نبی ﷺ مقتدیٰ بہ، جبکہ اس واقع میں حضرت ابوسعید خدریؓ مقتدیٰ بہ بن رہے ہیں اور نبی ﷺ مقتدی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابوسعید خدریؓ نے خواب میں جس درخت کو سجدہ کرتے ہوئے اور دعاء پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، درحقیقت وہ خود نبی ﷺ تھے لیکن چونکہ انہوں نے نبی ﷺ کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا اور نبی ﷺ نے بالفعل بھی ایسا کر کے دکھایا تو وہ یہ سمجھے کہ ان کے سجدہ کرنے کی وجہ سے درخت بھی سجدہ ریز ہوا۔ (مترجم)۔

میرک فرماتے ہیں کہ سنن ابن ماجہ میں اس دعاء کے الفاظ یوں آئے ہیں۔

''اللهم احطط عنى بها وزرا، واكتب لى بها اجرا، واجعلها لى عندك ذخرا''۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے، لیکن امام حاکم نے اس کی تصحیح اور دیگر حضرات نے تحسین کی ہے، بالفرض اگر یہ حدیث ضعیف بھی ہوتی تب بھی اس پر عمل جائز ہوتا کیونکہ اس کا تعلق فضائل سے ہے اور ہم یہ بات پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ کسی حدیث کا غریب ہونا اس کی صحت اور حسن کے منافی نہیں، چہ جائیکہ اس کے غریب ہونے سے اس کا ضعیف ہونا لازم آئے۔

الفصل الثالث:

رسول اللہ ﷺ نے سورۂ نجم کا سجدہ کیا

۱۰۳۷: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ وَالنَّجْمِ فَسَجَدَ فِيْهَا وَسَجَدَ مَنْ كَانَ مَعَهٗ غَيْرَ اَنَّ شَيْخًا مِنْ قُرَيْشٍ اَخَذَ كَفًّا مِنْ حَصًى اَوْ تُرَابٍ فَرَفَعَهٗ اِلٰى جَبْهَتِهٖ وَقَالَ يَكْفِيْنِيْ هٰذَا قَالَ عَبْدُاللّٰهِ فَلَقَدْ رَأَيْتُهٗ بَعْدُ قُتِلَ كَافِرًا (متفق عليه) وزادالبخاری فی رواية وهو امية بن خلف۔

أخرجه البخاري في صحيحه ٦٤٣/٢ حديث رقم ١٠٧٠۔ وأخرجه مسلم ٤٠٥/١ حديث رقم (١٠٥۔٥٧٦) وأبوداؤد في السنن ١٢٢/٢ حديث رقم ١٤٠٦۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن سورۂ نجم کی تلاوت کی اور اس میں سجدہ کیا اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو لوگ موجود تھے انہوں نے بھی سجدہ کیا مگر ایک بوڑھے قریشی نے اپنی ہتھیلی میں کنکریاں یا مٹی لے کر اپنی پیشانی پر لگائی اور کہا کہ میرے لئے یہی کافی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس واقعہ کے بعد دیکھا کہ وہ شخص کفر کی حالت میں قتل کیا گیا۔ (مسلم) بخاری کی ایک روایت میں الفاظ زاید نقل کیے ہیں کہ وہ بوڑھا شخص امیہ بن خلف تھا۔

تشریح: اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کے وقت جتنے بھی مسلمان، مشرک، انسان اور جنات موجود تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھ کر سب ہی سجدے میں گر پڑے، اور لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ اہل مکہ نے اسلام قبول کرلیا ہے (اور مہاجرین حبشہ اسی افواہ کو سن کر مکہ مکرمہ واپس لوٹ آئے)۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مؤرخین اور مفسرین جو کہتے ہیں کہ مشرکین کے اس سجدے کا سبب وہ تعریفی اور توصیفی کلمات تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر ان کے معبودان باطلہ کے بارے میں جاری ہوگئے تھے، سو یہ قصہ باطل ہے جو نہ نقلاً صحیح ہے اور نہ عقلاً، کیونکہ اللہ کے علاوہ کسی بھی باطل معبود کی تعریف کرنا کفر ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت کرنا غیر صحیح ہے اور نہ ہی شیطان یہ کلمات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری کرسکتا ہے۔ کیونکہ اسے اتنی قدرت اور طاقت عطاء نہیں کی گئی۔ کذا ذکرہ الطیبی۔

اس کے بعد حضرت مصنف علیہ الرحمہ نے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تقریر و تاویل کا ذکر کیا ہے جو عنقریب گذر چکی اور پھر قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس قصے کو نقل کرنا اور یہ سمجھنا کہ سہواً نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سبقت لسانی ہوگئی، محققین کے نزدیک مردود ہے، بالفرض! اگر اس واقعے کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو پھر اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ثابت قدم اور متزلزل ایمان والوں میں امتیاز ہوجائے اور حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تاویل مذکور کو رد کرتے ہوئے قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس طرح تو قرآن کریم سے اعتماد اٹھ جائے گا اور لوگ یہ سمجھیں گے معلوم نہیں کون سا حصہ وحی کا ہے اور کون سا شیطان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری کردیا ہے؟

رہی یہ بات کہ "فینسخ اللّٰہ ما یلقی الشیطن" سے اس کا جواب مل جاتا ہے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس میں بھی تو یہ احتمال بہر حال پایا جاتا ہے کہ ہوسکتا ہے یہ بھی شیطان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری کردیا ہو، ہماری رائے یہ ہے کہ امتحان بھی تو اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ احتمال پایا جاتا ہو (پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پر یقین کرلیا جائے)۔

فائدہ: احقر مترجم کے نزدیک قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی بات زیادہ وزنی اور زیادہ قابل قبول ہے۔

وقال یکفینی ھذا: قریش کے اس سردار کا یہ انداز انتہائی متکبرانہ اور مغرورانہ تھا، کیونکہ سجدے کا اصل مقصد تو اضع، انکساری اور پروردگار عالم کے سامنے اپنی ذلت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے جسم کے انتہائی محترم عضو کو مٹی جیسی ادنی چیز پر رکھنا ہے، لیکن اس قریش سردار نے ایسا اس لئے کیا کہ اس کے دماغ میں اپنی بڑائی کی خام خیالی گھسی ہوئی تھی اور وہ مقام اصفیاء سے انتہائی دور تھا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ اس موقع پر جتنے مشرکین بھی سجدے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے، ان سب کو اللہ تعالیٰ نے دولت ایمان سے مالا مال کردیا، لیکن مذکورہ قریشی سردار پھر بھی محروم ہی رہا، اس کا نام بخاری شریف کی روایت میں امیہ بن خلف آیا ہے، بعض حضرات کی رائے میں اس کا نام ولید بن مغیرہ تھا لیکن یہ رائے محل نظر ہے کیونکہ ولید بن مغیرہ طبعی موت مرا تھا، قتل نہیں ہوا تھا، بعض حضرات کی رائے میں اس کا نام سعید بن العاص اور بعض کی رائے میں ابولہب تھا۔

میرک نے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ~~کے حوالے سے~~ نقل کیا ہے کہ شاید حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھا ہی

نہ ہو، یا انہوں نے خصوصیت کے ساتھ صرف اسی کا تذکرہ اس لئے کیا تھا کہ ہتھیلی میں مٹی کو لے کر اسی نے سجدہ کیا تھا، کسی اور نے نہیں، علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ جامع الاصول میں تحریر فرماتے ہیں کہ ابی بن خلف غزوۂ احد میں مشرک ہونے کی حالت میں ہی مارا گیا تھا اور اسے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا، (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کا ایک معمولی زخم لگا تھا اور وہ میدان جنگ سے فرار ہونے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا لیکن آخر کار وہی زخم اس کی موت کا سبب بنا اور مکہ مکرمہ پہنچتے ہی وہ واصل جہنم ہوا) اور امیہ بن خلف غزوۂ بدر میں شرک کی حالت میں مارا گیا تھا، یاد رہے کہ دونوں بھائی تھے اور ان کے باپ کا نام خلف بن وہب بن حذافہ بن جمح الجحان تھا۔

سورۂ ص کا سجدہ

۱۰۳۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَجَدَ فِیْ ص وَقَالَ سَجَدَهَا دَاوٗدُ تَوْبَةً وَنَسْجُدُهَا شُكْرًا ۔ (رواه النسائی)

أخرجه النسائی فی السنن ۲/۱۵۹ حدیث رقم ۹۵۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ ص میں سجدہ کیا اور فرمایا کہ داؤد علیہ السلام نے سورۂ ص کا سجدہ توبہ کی قبولیت کے لئے کیا تھا اور ہم یہ سجدہ (ان کی توبہ کی قبولیت پر) شکر گزاری کے لئے کرتے ہیں۔ (نسائی)

تشریح: حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی وضاحت میں فرماتے ہیں کہ چونکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام فرد واحد کی طرح ہوتے ہیں، اس لئے کسی ایک پر کوئی نعمت نازل ہونا سب پر نعمتوں کی برسات کے مترادف ہے، بناء بریں ان کی توبہ قبول ہونے کی خوشی میں سورۂ ص کی متعلقہ آیت پر سجدۂ شکر کیا جاتا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کے طریقوں کی اقتداء واتباع کا حکم دیا گیا ہے تاکہ ان تمام حضرات کے متفرق فضائل ایک ذات اقدس میں جمع ہو جائیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اس لئے اس پر شکر کرنا واجب ہے۔

مصنف کی رائے یہ ہے کہ اس کے سجدۂ شکر ہونے سے سجدۂ تلاوت نہ ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ یہ بات تو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ سجدۂ تلاوت کا تعلق اس آیت کی تلاوت یا سماع سے ہے، ان دونوں میں سے جو صورت بھی پائی جائے، سجدہ واجب ہو جائے گا، خواہ اس کا سبب کوئی حکم ہو یا کسی نعمت کا شکر وغیرہ۔

محقق ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام اور ہمارے درمیان ایک مشترک حق ہے، نیز اس سجدہ کا برائے شکر ہونا وجوب کے منافی نہیں، کیونکہ جتنے بھی فرائض اور واجبات انسان پر عائد ہوتے ہیں ان کی وجہ بھی یہی ہے کہ انسان مسلسل ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے، اس کے شکریے کیلئے سجدۂ تلاوت بھی واجب ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نبی ﷺ راتوں کو کھڑے ہو کر اتنی عبادت کرتے تھے کہ آپ ﷺ کے مبارک قدموں پر ورم آجاتا تھا۔ صحابہ کرامؓ عرض کرتے کہ یارسول اللہ! اللہ نے تو آپ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف فرمادیئے ہیں، پھر آپ کیوں اتنی مشقت برداشت کرتے ہیں؟ تو نبی ﷺ جواباً ارشاد فرماتے کیا میں اپنے پروردگار کا شکر گذار بندہ نہ بنوں؟

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ بات بھی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوگئی کہ نبی ﷺ نے سورۂ ص کی تلاوت برسرِ منبر فرمائی تھی، آیت سجدہ پر پہنچ کر نبی ﷺ منبر سے نیچے اترے، سجدہ کیا اور آپ ﷺ کے ساتھ تمام حاضرین نے بھی سجدہ کیا، اس کے بعد ایک مرتبہ پھر آپ ﷺ نے یہی آیت برسرِ منبر دوبارہ تلاوت فرمائی، صحابہ کرامؓ سجدے کیلئے تیار ہونے لگے، یہ دیکھ کر نبی ﷺ نے فرمایا، یہ تو ایک نبی کی توبہ کا ذکر ہے، تاہم چونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگ سجدے کی تیاری کر چکے ہیں اس لئے سجدہ کریں، یہ کہہ کر نبی ﷺ نے منبر سے اتر کر سجدہ کیا اور صحابہ کرامؓ نے بھی سجدہ کیا۔

انہی دونوں حدیثوں کی وجہ سے امام شافعی رحمہ اللہ نے یہ قول اختیار کیا ہے کہ سورۂ ص میں سجدۂ تلاوت نہیں ہے، بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول ہونے کی خوشی میں شکرانہ کے طور پر مطلوب ہے، تلاوت تو صرف اس کا سبب ہے جس سے ان کی قبول توبہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

لیکن اس پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سجدۂ شکر تو خاص ہے نعمتوں میں اضافے یا مصیبتوں کے ٹلنے کے ساتھ اور یہاں تو ایسا کچھ نہیں؟ ہم اس حدیث کا جواب امام شافعیؒ کو یہ دیتے ہیں کہ سورۂ ص میں آیت سجدہ کی تلاوت والی حدیث سورۂ نحل کی آیت سجدہ کی تلاوت والی حدیث کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مؤکد ہے، کیونکہ سورۂ نحل میں دوبارہ سجدہ کرنا ثابت نہیں ہے۔

اور ''انما هی توبة نبی'' سے سبب سجدہ کا بیان ہے کیونکہ ہر آیت سجدہ کا کوئی نہ کوئی سبب ہے، چنانچہ کہیں تو سجدہ کا حکم دیا گیا ہے، کہیں سجدہ سے انکار کرنے کی مذمت ہے، اور کہیں سجدہ کرنے والوں کی تعریف ہے، اور یہاں سببِ سجدہ قبولِ توبۂ نبی ہے جو کہ ایک قابل تعریف امر ہے اس لئے ہمیں بھی اس کی پیروی کرنی چاہیے بلکہ اس کی تاکید تو اوروں سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ قرآن کریم میں اتباع انبیاء کا جو حکم ''فبهداهم اقتده'' کے ذریعے دیا گیا ہے، اس میں اس حکم کی بھی اتباع ہے۔

بَابُ اَوْقَاتِ النَّهْيِ

یہ باب اوقاتِ مکروہہ کے بیان میں ہے

الفصل الاول:

سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے

۱۰۳۹: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَتَحَرّٰى اَحَدُكُمْ فَيُصَلِّيْ عِنْدَ

طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَلَا عِنْدَ غُرُوْبِهَا وَفِيْ رواية قَالَ إِذَا طَلَعَ حَاجِبُ الشَّمْسِ فَدَعُوا الصَّلَاةَ حَتّٰى تَبْرُزَ فَإِذَا غَابَ حَاجِبُ الشَّمْسِ فَدَعُوا الصَّلَاةَ حَتّٰى تَغِيْبَ وَلَا تَحَيَّنُوْا بِصَلٰوتِكُمْ طُلُوْعَ الشَّمْسِ وَلَا غُرُوْبَهَا فَإِنَّهَا تَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٦/٣٣٥ حديث رقم ٣٢٧٢۔٣٢٧٣۔ومسلم في صحيحة ١/٥٦٧ حديث رقم (٢٨٩۔٨٢٨)۔والنسائي ١/٢٧٨ حديث رقم ٥٧٠۔ومالك في الموطأ ١/٢١٩ حديث رقم ٤٥ من كتاب القرآن ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی سورج کے طلوع اور غروب کے وقت نماز پڑھنے کا ارادہ نہ کرے اور ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب سورج کا کنارہ نکل آئے تو نماز چھوڑ دو یہاں تک کہ سورج اچھی طرح ظاہر ہو جائے (اور ایک نیزے کے بقدر سورج اچھی طرح بلند ہو جائے) اور جب سورج کا کنارہ ڈوب جائے تو نماز چھوڑ دو یہاں تک کہ وہ اچھی طرح غروب ہو جائے سورج کے طلوع اور غروب کے وقت نماز پڑھنے کا ارادہ نہ کرو اس لئے کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تحری کا معنی ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ قابل اعتماد چیز کی تلاش اور جستجو کرنا، اور اس حدیث کی مراد میں دو احتمال ہو سکتے ہیں۔

① نماز کیلئے ایسے وقت کا قصد نہ کرے جس میں سورج طلوع یا غروب ہوتا ہو کہ اس میں نماز پڑھنے لگے۔

② ایسے وقت میں یہ سوچ کر نماز نہ پڑھے کہ اس نے ''احری'' (زیادہ سے زیادہ قابل اعتماد طریقے) پر عمل کیا ہے۔

لیکن ان دونوں میں سے پہلا معنی زیادہ بلیغ اور اوجہ ہے۔

شیطان کے دوسینگوں سے کیا مراد ہے؟

اس حدیث میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ سورج شیطان کے دوسینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے، اس سے مراد شیطان کے سر کے دونوں حصے ہیں، اصل میں جب طلوع آفتاب کا وقت ہوتا ہے تو شیطان سورج کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوا جاتا ہے تا کہ اس کے سر کے دونوں حصوں کے درمیان وہ طلوع ہوتا ہوا دکھائی دے اور وہ سورج کے پجاریوں کا قبلہ بن سکے، جو بیچارے سورج کو سجدہ کرتے ہیں، درحقیقت وہ شیطان کو سجدہ کرتے ہیں، اسی بناء پر اس وقت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی تا کہ آفتاب پرستوں کے ساتھ عبادت میں بھی مشابہت نہ رہے (نیز شیطان کی پرستش کا بھی کوئی شائبہ برقرار نہ رہے) حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے طلوع وغروب آفتاب دونوں اوقات میں ممانعت نماز کی علت قرار دیا ہے۔

جن اوقات میں نماز ادا کرنا منع ہے

۱۰۴۰: وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ ثَلَاثُ سَاعَاتٍ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهَانَا أَنْ

نُصَلِّيَ فِيهِنَّ اَوْ نَقْبُرَ فِيهِنَّ مَوْتَانَا حِيْنَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ بَازِغَةً حتّٰى تَرْتَفِعَ وَحِيْنَ يَقُوْمُ قَائِمُ الظَّهِيْرَةِ حتّٰى تَمِيْلَ الشَّمْسُ وَحِيْنَ تَضَيَّفُ الشَّمْسُ لِلْغُرُوْبِ حَتّٰى تَغْرُبَ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٥٦٩/١ حديث رقم (٢٩٣۔ ٨٣١)۔ والترمذي ٣٤٨/٣ حديث رقم ١٠٣٠۔ والنسائي ٢٧٧/١ حديث رقم ٥٦٥۔ وابن ماجه ٤٨٦/١ حديث رقم ١٥١٩۔ والدارمي ٣٩٤/١ حديث رقم ١٤٣٢۔ وأحمد في المسند ١٥٢/٤۔

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین اوقات میں نماز پڑھنے سے اور مردوں کو دفن کرنے سے منع کیا ہے۔ طلوع شمس کے وقت یہاں تک کہ بلند ہو جائے اور دوپہر کو سایہ قائم ہونے کے وقت یہاں تک کہ وہ ڈھل جائے اور غروب شمس کے وقت یہاں تک کہ وہ غروب ہو جائے۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث مبارکہ میں جن تین اوقات میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے" اور یہ وہی اوقات ہیں جو ہمارے مذہب میں بھی ممنوع شمار کیے جاتے ہیں" ان کے بارے علماء کرام کا اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا ان اوقات میں نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ (دفن میں اختلاف نہیں کیونکہ اس میں بالاتفاق کسی کے نزدیک بھی کوئی کراہت نہیں ہے) چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ اسے جائز قرار دیتے ہیں اور اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ ان اوقات میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن اوقات میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، ان ہی اوقات میں مردے کو دفن کرنا بھی مکروہ ہے اور یہ بھی اس صورت میں جبکہ تحری کر کے ایسے وقت کا انتخاب نہ کیا گیا ہو، ورنہ ایسا کرنا حرام ہے، جبکہ ہمارے فقہاء احناف کا مسلک یہ ہے کہ ان تینوں ممنوعہ اوقات میں فرائض، نوافل، نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت سب ہی حرام ہیں۔ لیکن اگر جنازہ آجائے یا آیت سجدہ کی تلاوت اسی وقت ہو جائے، تو نماز جنازہ اور سجدۂ تلاوت مکروہ بھی نہیں رہتے البتہ بہتر یہ ہے کہ اوقات ممنوعہ کے نکل جانے تک اسے مؤخر کر دیا جائے۔

قیام شمس سے کیا مراد ہے؟

شرح السنہ میں ہے کہ قیام شمس سے مراد "زوال شمس" ہے اور یہ ماخوذ ہے "قام بمعنی وقف" سے، بعض حضرات کی رائے میں جب سورج نصف النہار کے خط پر پہنچ کر مستوی ہو جائے تو اس استواء کو قیام شمس کہتے ہیں، اس صورت میں یہ "قام بمعنی اعتدل" سے ماخوذ ہوگا، ابن ملک فرماتے ہیں کہ ظہر کے وقت سورج چلتے چلتے رک جاتا ہے اور فضاء آسمانی میں ایک لمحے کیلئے ٹکا ہوا محسوس ہوتا ہے، اس کے بعد دوبارہ چل پڑتا ہے، اسی کو "قیام شمس" کہتے ہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب سورج وسط آسمان تک پہنچتا ہے تو سائے کی حرکت زوال شمس تک سست پڑ جاتی ہے، دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک جگہ ٹھہر گیا ہے، حالانکہ وہ اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہوتا ہے اور اس کی نظیر ہمارے نزدیک یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"وترى الجبال تحسبها جامدة وهي تمر مر السحاب"

علامہ نووی رحمہ اللہ اس جملے کا معنی بیان فرماتے ہیں کہ "جب دوپہر کے وقت کھڑے ہونے والے کا مشرق و مغرب کہیں

بھی سایہ باقی نہ رہے" حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "الظہیرۃ" سے مراد نصف النہار ہے اور قائم الظہیرہ سے مراد اس کا سایہ ہے اور قیام بمعنی وقوف کے ہے اور مطلب یہ ہے کہ دیکھنے والے کو سطحی نظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سورج کی رفتار سست پڑ گئی ہے، اس کی وجہ سے سائے کی رفتار میں جو سستی پیدا ہوتی ہے، وہی اس کا مصداق ہے، یہ الگ بات ہے کہ سورج اس وقت بھی اپنی سابقہ رفتار سے ہی چل رہا ہوتا ہے۔

یا پھر قائم الظہیرہ سے سایہ مراد نہیں بلکہ شخص مراد ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ چونکہ اس وقت سایہ نہ مشرق کی طرف جھکتا ہے اور نہ ہی مغرب کی طرف مائل ہوتا ہے بہر حال! دونوں صورتوں میں یہ استواء شمس سے کنایہ ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ استواء کا یہ وقت اگرچہ اتنا تھوڑا اور تنگ ہوتا ہے کہ جس میں نماز نہیں پڑھی جاسکتی، البتہ تکبیر تحریمہ ضرور کہی جاسکتی ہے اس لئے اس وقت میں تکبیر تحریمہ کہنا بھی حرام ہے، ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اپنے اطلاق کے ساتھ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ایک بہت بڑی دلیل ہے، کیونکہ وہ اس حدیث کو فرائض کے ساتھ خاص کرتے ہوئے ان اوقات ممنوعہ میں صرف قراء کو ممنوع قرار دیتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس کی مزید تفصیل عنقریب آیا چاہتی ہے۔

نمازِ فجر اور عصر کے بعد نماز پڑھنا مکروہ ہے

۱۰۴۱: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَاصَلَاۃَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتّٰی تَرْتَفِعَ الشَّمْسُ وَلَا صَلَاۃَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰی تَغِیْبَ الشَّمْسُ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٦٩ حديث رقم ٥٨١۔ ومسلم في صحيحه ١/٥٦٦ حديث رقم (٢٨٦۔٨٢٦) ۔ وأبوداؤد ٢/٥٦ حديث رقم ١٢٧٦۔ والترمذي ١/٣٤٣ حديث رقم ١٨٣۔ والنسائي ١/٢٧٦ حديث رقم ٥٦٢ وابن ماجه ١/٣٩٦ حديث رقم ١٢٥٠ والدارمي ١/٣٩٤ حديث رقم ١٤٣٣۔ وأحمد في المسند ١/١٨۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صبح کی نماز کے بعد کوئی نماز نہیں یہاں تک کہ سورج بلند ہو جائے اور عصر کی نماز کے بعد کوئی نماز نہیں یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ارتفاع شمس کی وضاحت ایک نیزہ کے بقدر سے کرتے ہیں جو تقریباً سات گز بنتا ہے اور ابونعیم کی روایت میں ارتفاع شمس کی تحدید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "حتی ترتفع کرمح او رمحین"۔

یاد رہے کہ حدیث میں نماز فجر اور عصر کے بعد کسی بھی نماز کی ممانعت جو وارد ہوئی ہے، اس کا تعلق اس شخص کے ساتھ ہے جو فرض نماز پڑھ چکا ہو، اور اگر فرض نماز باجماعت ہو چکی ہو اور کوئی شخص اس میں شامل ہونے سے رہ گیا ہو، اس کیلئے یہ ممانعت نہیں ہے۔

اوقاتِ نماز

۱۰۴۲: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ قَالَ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ فَقَدِمْتُ الْمَدِيْنَةَ فَدَخَلْتُ عَلَيْهِ فَقُلْتُ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الصَّلَاةِ فَقَالَ صَلِّ صَلَاةَ الصُّبْحِ ثُمَّ اقْصِرْ عَنِ الصَّلَاةِ حِيْنَ تَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ وَ حِيْنَئِذٍ يَسْجُدُ لَهَا الْكُفَّارُ ثُمَّ صَلِّ فَاِنَّ الصَّلَاةَ مَشْهُوْدَةٌ مَحْضُوْرَةٌ حَتّٰى يَسْتَقِلَّ الظِّلُّ بِالرُّمْحِ ثُمَّ اقْصِرْعَنِ الصَّلَاةِ فَاِنَّ حِيْنَئِذٍ تُسَجَّرُ جَهَنَّمُ فَاِذَا اَقْبَلَ الْفَيْءُ فَصَلِّ فَاِنَّ الصَّلَاةَ مَشْهُوْدَةٌ مَحْضُوْرَةٌ حَتّٰى تُصَلِّيَ الْعَصْرَ ثُمَّ اقْصِرْعَنِ الصَّلَاةِ حَتّٰى تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَاِنَّهَا تَغْرُبُ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ وَحِيْنَئِذٍ يَسْجُدُ لَهَا الْكُفَّارُ قَالَ قُلْتُ يَانَبِيَّ اللّٰهِ فَالْوُضُوْءَ حَدِّثْنِيْ عَنْهُ قَالَ مَامِنْكُمْ رَجُلٌ يُقَرِّبُ وَضُوْءَ هٗ فَيُمَضْمِضُ وَيَسْتَنْشِقُ فَيَسْتَنْثِرُ اِلَّا خَرَّتْ خَطَايَا وَجْهِهٖ وَفِيْهِ وَخَيَاشِيْمِهٖ ثُمَّ اِذَا غَسَلَ وَجْهَهٗ كَمَا اَمَرَهُ اللّٰهُ اِلَّا خَرَّتْ خَطَايَا وَجْهِهٖ مِنْ اَطْرَافِ لِحْيَتِهٖ مَعَ الْمَاءِ ثُمَّ يَغْسِلُ يَدَيْهِ اِلَى الْمِرْ فَقَيْنِ اِلَّا خَرَّتْ خَطَا يَا يَدَيْهِ مِنْ اَنَامِلِهٖ مَعَ الْمَاءِ ثُمَّ يَمْسَحُ رَاْسَهٗ اِلَّا خَرَّتْ خَطَايَا رَأْسِهٖ مِنْ اَطْرَافِ شَعْرِهٖ مَعَ الْمَاءِ ثُمَّ يَغْسِلُ قَدَمَيْهِ اِلَى الْكَعْبَيْنِ اِلَّا خَرَّتْ خَطَايَا رِجْلَيْهِ مِنْ اَنَامِلِهٖ مَعَ الْمَاءِ فَاِنْ هُوَ قَامَ فَصَلّٰى فَحَمِدَاللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ وَمَجَّدَهٗ بِالَّذِيْ هُوَلَهٗ اَهْلٌ وَفَرَّ غَ قَلْبَهٗ لِلّٰهِ اِلَّا انْصَرَفَ مِنْ خَطِيْئَتِهٖ كَهَيْئَتِهٖ يَوْمَ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۵۶۹/۱ حديث رقم(۲۹۴۔۸۳۲)۔والنسائی ۲۷۹/۱ حديث رقم ۵۷۲۔وأحمد فی المسند ۲۶۳/۴۔

ترجمہ: حضرت عمرو ابن عبسہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام کے مدینہ تشریف لانے کے بعد میں مدینہ میں آیا اور آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے نماز کے اوقات کی تعلیم دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صبح کی نماز ادا کرو اور پھر نماز سے رک جاؤ۔ یہاں تک کہ سورج طلوع ہو کر بلند ہو جائے اس لئے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو شیطان کے دو سینگوں کے درمیان سے طلوع ہوتا ہے اور اس وقت کافر سورج کی پرستش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد (اشراق) کی نماز پڑھو کیونکہ اس نماز کے وقت فرشتوں کی حاضری ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ سورج کا سایہ زمین پر ایک نیزہ کے بقدر ہو جائے۔ مراد یہ ہے کہ دوپہر ہو جائے۔ پھر نماز سے رک جاؤ کیونکہ اس وقت جہنم کی آگ کو بھڑکایا جاتا ہے پھر جب سورج کا زوال ہو جائے تو پھر نماز پڑھو کیونکہ یہ فرشتوں کی حاضری کا وقت ہے ۔ یہاں تک کہ تم عصر کی نماز پڑھو پھر نماز سے رک جاؤ یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے کیونکہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان غروب ہوتا ہے اور اس وقت کافر لوگ اس کی طرف سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ حضرت عمرو ابن عبسہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم وضو کی فضیلت کے بارے میں کچھ بتا دیجئے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی وضو کا پانی لے اور بسم اللہ پڑھنے کے بعد دونوں ہاتھوں کو پہنچوں تک دھوئے پھر کلی کرے اور

ناک میں پانی ڈالے تو ناک اور ناک کے نتھنوں کے اندر کے گناہ گر جاتے ہیں پھر اس کے چہرے کے گناہ اس کی داڑھی کے کناروں سے پانی کے ساتھ گر جاتے ہیں اور جب وہ اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت دھوتا ہے تو اس کے دونوں ہاتھوں کے گناہ اس کی انگلیوں کے کناروں سے پانی کے ساتھ گر جاتے ہیں پھر جب اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر کے گناہ اس کے بالوں کے کناروں سے پانی کے ساتھ گر جاتے ہیں۔ اور پھر جب وہ اپنے دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوتا ہے تو اس کے دونوں پاؤں کے گناہ اس کی انگلیوں کے کناروں سے پانی کے ساتھ گر جاتے ہیں اور پھر وضو سے فارغ ہو کر جب وہ کھڑا ہوتا ہے اور نماز پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتا ہے جس کے وہ لائق ہے اور پھر وہ اپنے دل کو اللہ کے لئے فارغ کرتا ہے اور اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نماز پڑھتا ہے تو وہ گناہوں سے ایسا پاک ہو کر لوٹتا ہے جیسے آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں "قرنی الشیطن" کا لفظ دوبارہ آیا ہے، اس سے پہلے بھی اس کی توجیہہ مذکور ہو چکی، یہاں دو توجیہات مزید ذکر کی جاتی ہیں۔

① "قرنی الشیطن" سے مراد شیطان کے احزاب واتباع ہیں۔

② "قرنی الشیطن" سے مراد شیطان کی قوت وغلبہ اور اس کا فساد پھیلانا ہے۔

لیکن ان دونوں کی نسبت وہی توجیہہ زیادہ راجح ہے جو پیچھے گذر چکی، یعنی قرنی الشیطٰن سے مراد اس کے سر کے دونوں حصے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ان اوقات میں شیطان اپنے سر کو سورج کے قریب کر دیتا ہے، اس طرح سورج کو سجدہ کرنے والا بظاہر شیطان کو سجدہ کر بیٹھتا ہے۔

نمازِ اشراق کا ثبوت:

اس حدیث سے نماز فجر کے بعد جس نماز کے پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے، اس سے یا تو نماز اشراق مراد ہے کیونکہ اسی سے روشنی کی ابتداء ہوتی ہے یا چاشت کی نماز مراد ہے، کیونکہ اس کا وقت استواءِ شمس سے کچھ پہلے ہی ختم ہوتا ہے۔

بہر حال! دونوں صورتوں میں اسے مشہود ومحضور قرار دیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان نمازوں کا اجر وثواب لکھنے کیلئے فرشتے خصوصی طور پر حاضر ہوتے ہیں اور اس نماز کی ادائیگی کرنے والوں کے حق میں گواہ بنتے ہیں، اس مفہوم کی تائید ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "مشهودة مكتوبة"۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ اس نماز کے وقت زمین وآسمان کے نیک، فرمانبردار اور اہل اطاعت افراد حاضر ہوتے ہیں، دونوں معنوں میں سے جو معنی بھی مراد لیا جائے، بہر دو صورت "محضورة" تفسیر ہے "مشهودة" کی اور اس کی تاکید ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ "مشهودة" کو پہلے معنی پر محمول کر لیا جائے اور "محضورة" کو دوسرے معنی پر، یا یہ کہ "مشهودة" شہادت کے معنی میں ہو اور "محضورة" حصول برکت کیلئے حاضری کے معنی میں ہو، ظاہر ہے کہ "تاکید" کی نسبت "تاسیس" زیادہ اولیٰ ہوتی ہے اس لئے تاکیدی معنی کے بجائے تاسیسی معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔

"قولهٗ حتى يستقل الظل بالرمح" اس جملے میں "يستقل" بمعنی "يرتفع" کے ہے، اور مطلب یہ ہے کہ زمین پر

کسی قسم کا سایہ باقی نہ رہے بلکہ اٹھ جائے۔ابن ملک اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ گاڑے ہوئے نیزے کا سایہ باقی نہ رہے، ایسا سال کے طویل ترین دن میں حرمین شریفین اوران کے آس پاس کے علاقوں میں ہوتا ہے، کیونکہ زوال کے وقت تو روئے زمین پر سایہ رہتا ہی نہیں، جب سورج مشرق سے مغرب کی طرف ڈھلنا شروع ہوتا ہے''اور وہی ظہر کا اول وقت ہوتا ہے''تب جا کر سورج کا سایہ زمین پر پڑتا ہے۔

بعض حضرات کی رائے کے مطابق''حتی یستقل'' کا لفظ''قلت'' سے ماخوذ ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ نیزے کا جو سایہ بنا ہے، وہ گھٹتے گھٹتے انتہائی کم اور قلیل رہ جائے اسے''ظل زوال'' بھی کہا جاتا ہے۔

اس روایت میں تو یہ جملہ''حتی یستقل الظل بالرمح'' آیا ہے، جبکہ ایک دوسری روایت میں یہی جملہ''حتی یستقل الرمح بالظل'' بھی آیا ہے، لیکن دونوں صورتوں میں یہ زمین پر نیزہ کا سایہ باقی نہ رہنے سے کنایہ اور مجاز ہے اور ایسا استواء شمس ہی کے وقت ہوتا ہے لہٰذا یوں کہنا چاہیے کہ استواء شمس کے وقت نماز کی ممانعت اصل مقصود ہے۔

رہی یہ بات کہ یہاں خاص طور پر نیزہ کا ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟ تو اصل میں بات یہ ہے کہ اہل عرب کے رواج میں تھا کہ جب وہ وقت معلوم کرنا چاہتے تو زمین میں نیزہ گاڑ دیتے اور پھر اس کا سایہ دیکھ کر وقت کا حساب لگا لیتے۔امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب سورج نہ مغرب کی طرف مائل ہو اور نہ مشرق کی طرف جھکا ہوا ہو، اسی کو''حالت استواء'' کہتے ہیں۔حافظ تو رپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مصابیح کے سارے نسخوں میں یہ جملہ اس طرح ہے لیکن یہ تحریف ہے، صحیح اور درست جملہ یوں ہے۔

''حتی یستقل الرمح بالظل''

صاحب نہایہ بھی حافظ تو رپشتی رحمہ اللہ کی موافقت فرماتے ہیں اور اس جملے کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ زمین میں گاڑے ہوئے نیزے کا سایہ قلت اور نقص کی انتہاء کو پہنچ جائے، اس اعتبار سے''یستقل'' کا لفظ''قلت'' سے ماخوذ ہوگا نہ کہ اقلال سے۔

لیکن علامہ طیبی رحمہ اللہ اس پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مصابیح کے نسخوں کو کیسے رد کیا جا سکتا ہے، بالخصوص جبکہ مسلم شریف اور کتاب حمیدی کے بعض نسخے بھی اس کی موافقت میں پیش کئے جا سکتے ہیں، پھر اس جملے کے کئی صحیح محمل بھی ہو سکتے ہیں مثلاً اس جملے کا ماخذ اہل عرب کا یہ محاورہ ہو:''استقلت السماء ای ارتفعت''۔

اور اس کا مطلب یہ ہو کہ سایہ اوپر اٹھ جائے، زمین پر بالکل نہ پڑے، یا یہ کہ یہاں مضاف کو مقدر مان لیا جائے، اس صورت میں اصل عبارت یہ ہوگی:''یعلم قلة الظل بواسطة ظل الرمح''۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ''عرضت الناقة علی الحوض'' کے قبیل سے ہو، ان صحیح محامل کے ہوتے ہوئے مصابیح کے تمام نسخوں کو بیک قلم غلط قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ استواء شمس کے وقت مطلقاً جواز نماز کا جو قول اختیار کرتے ہیں اور دلیل پیش کرتے ہیں کہ وہ اہل مدینہ کو ہمیشہ جمعے کے دن اس وقت میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے رہے ہیں، اس حدیث میں ان کے اس قول کے خلاف دلیل موجود ہے نیز اہل مدینہ کا یقینی طور پر عین استواء شمس کے وقت نماز پڑھنا محتاج تحقیق ہے اور

ویسے بھی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل کوئی مضبوط دلیل نہیں کیونکہ یوم جمعہ مستثنیات میں سے ہے۔

تسجر جهنم: ابن ملک اس کا معنی یوں بیان کرتے ہیں کہ جہنم کی آگ کو بھڑ کایا جاتا ہے اور اسے بھر دیا جاتا ہے، اس وقت میں جہنم کو بھڑ کانے کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت شیطان سورج کے بالکل سامنے ہوتا ہے اور سورج پرست سورج کے آگے سجدہ ریز ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہوتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کے اس جملے ''فان حینئذٍ'' میں انَّ کا اسم اَنْ مصدر یہ ہے جو کہ مقدر ہے اور اس کی نظیر یہ آیت مبارکہ ہے: ''ومن اٰیٰتہ یریکم البرق خوفًا''۔

یا اس کا اسم ضمیر شان ہے، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ضمیر شان کو حذف نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کا مقصد تو تعظیم ہے اور جب اسے حذف کر دیا جائے تو یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ قول مردود ہے کیونکہ ضمیر شان کے تعظیم پر دلالت کرنے کا سبب اس کا ابہام ہے اور جب اسے حذف کر دیا جائے تو اس میں زیادہ ابہام پیدا ہو جاتا ہے اسی وجہ سے اس آیت مبارکہ میں بھی ضمیر شان کو حذف کر دیا گیا ہے۔

''من بعد ما کاد یزیغ قلوب فریق منھم''

اس حدیث میں غروب آفتاب کے وقت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ علت بیان کی گئی ہے کہ اس وقت کافر سُورج کو سجدہ کرتے ہیں (یہاں کافروں سے مراد عام ہے خواہ وہ مشرک ہوں یا آتش پرست اور سورج کے پجاری)۔

معلوم ہوا کہ مجوسیوں اور مشرکوں کے ساتھ عبادات میں بھی مشابہت نہیں ہونی چاہیے۔ چہ جائیکہ عام زندگی کے معمولات میں مشابہت ہو۔

فجر کی نماز اور طلوع آفتاب کے درمیان، اسی طرح عصر کے فرضوں اور غروب آفتاب کے درمیان کا جو وقت ہے ہمارے نزدیک صرف نوافل کے حق میں وہ مکروہ وقت ہے جس کی حکمت احادیث کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو چیز کسی کے قریب ہو اسے اس ہی کا حکم دے دیا جاتا ہے جیسے ماہانہ ناپاکی کے ایام میں اپنی بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی حرمت، نیز یہ بھی ایک اصول ہے کہ جو آدمی چراگاہ کے ارد گرد اپنے جانوروں کو چراتا ہے اس کے بارے میں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کے جانور شاہی چراگاہ میں داخل نہ ہو جائیں بالکل اسی طرح جب سورج کے پجاری ان دونوں وقتوں کی ابتداء میں سورج کی تعظیم کا ارادہ کرتے ہیں تو وہ اس کے منتظر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ کب سورج ظاہر ہو اور کب وہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں اس لئے اگر ان دو وقتوں میں نوافل کو جائز قرار دے دیا جائے تو ان کے ساتھ تشبیہ لازم آئے گی۔ اگر تشبیہ نہ بھی ہو تو تشبیہ کا وہم تو بہر حال رہے گا یا اس کا سبب اختیار کرنا لازم آئے گا اس لئے اسے مکروہ قرار دیا گیا۔

کما امرہ اللہ: اس جملے میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ چہرے کو دھونا فرض ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

''اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم''

جبکہ اس سے پہلے کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کا جو ذکر ہوا تو وہ دونوں سنتیں ہیں یا اس جملے کا مطلب یہ ہے ''کما

امره الله ان يبدأ بغسله'' اسی وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب آدمی صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کا ارادہ کرے تو اس کیلئے یہ حکم ہے۔

''ابدأوا بما بدأ الله تعالٰی به''

الى المرفقين: اس جملے میں الی بمعنی مع کے ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھوئے اس مسئلے میں امام زفر ؒ دیگر فقہائے احناف سے اختلاف فرماتے ہیں اور وہ کہنیوں کو دھونا فرض نہیں سمجھتے نیز مذکورہ آیت وحدیث میں اہل تشیع کی بھی واضح تردید موجود ہے کیونکہ ان کے یہاں ہاتھ کو دھونے کا معاملہ برعکس ہے اور وہ ہاتھوں انگلیوں کی طرف سے شروع کرکے کہنیوں تک لانے کے بجائے کہنیوں سے شروع کرکے انگلیوں تک لاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی کوئی دلیل قرآن وحدیث میں موجود نہیں ہے۔

عصر کے بعد دو رکعت کا مسئلہ

١٠٤٣: وَعَنْ كُرَيْبٍ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ وَالْمِسْوَرَ بْنَ مَخْرَمَةَ وَعَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ الْاَزْهَرِ اَرْسَلُوْهُ اِلٰى عَائِشَةَ فَقَالُوْا اِقْرَأْ عَلَيْهَا السَّلَامَ وَسَلْهَا عَنِ الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ قَالَ فَدَخَلْتُ عَلٰى عَائِشَةَ فَبَلَّغْتُهَا مَا اَرْسَلُوْنِيْ فَقَالَتْ سَلْ اُمَّ سَلَمَةَ فَخَرَجْتُ اِلَيْهِمْ فَرَدُّوْنِيْ اِلٰى اُمِّ سَلَمَةَ فَقَالَتْ اُمُّ سَلَمَةَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهٰى عَنْهُمَا ثُمَّ رَأَيْتُهُ يُصَلِّيْهِمَا ثُمَّ دَخَلَ فَاَرْسَلْتُ اِلَيْهِ الْجَارِيَةَ فَقُلْتُ قُوْلِيْ لَهُ تَقُوْلُ اُمُّ سَلَمَةَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ سَمِعْتُكَ تَنْهٰى عَنْ هَاتَيْنِ الرَّكْعَتَيْنِ وَاَرَاكَ تُصَلِّيْهِمَا قَالَ يَا ابْنَةَ اَبِيْ اُمَيَّةَ سَاَلْتِ عَنِ الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ وَاِنَّهُ اَتَانِيْ نَاسٌ مِنْ عَبْدِ الْقَيْسِ فَشَغَلُوْنِيْ عَنِ الرَّكْعَتَيْنِ اللَّتَيْنِ بَعْدَ الظُّهْرِ فَهُمَا هَاتَانِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري ١٠٥/٣ حديث رقم ١٢٣٣۔ ومسلم في صحيحه ٥٧١/١ حديث رقم (٢٩٧۔٨٣٤) وأبو داوٗد في السنن ٥٤/٢ حديث رقم ١٢٧٣۔ وابن ماجه ٣٦٦/١ حديث رقم ١١٥٩۔ والدارمي ٣٩٥/١ حديث رقم ١٤٣٦۔ وأحمد في المسند ٣٠٣/٦۔

ترجمہ: حضرت کریب سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت عبدالرحمٰن نے ان کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا کہ ہماری طرف سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں سلام پیش کرنا اور ان سے عصر کے بعد دو رکعت کے بارے میں پوچھنا حضرت کریب فرماتے ہیں کہ جب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان تینوں حضرات کا پیغام میں نے ان تک پہنچایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ تم حضرت ام سلمہؓ کے پاس جاؤ اور ان سے یہ مسئلہ پوچھو میں یہ جواب سن کر ان تینوں حضرات کے پاس واپس آگیا اور انہوں نے مجھے پھر حضرت ام سلمہؓ کے پاس بھیجا۔ حضرت ام سلمہؓ نے میرا سوال سن کر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ان دو رکعتوں کو پڑھنے سے منع کرتے تھے پھر میں نے ایک دن رسول اللہ ﷺ کو ان دو رکعتوں کو پڑھتے

ہوئے دیکھا جب آپ مکان کے اندرونی حصہ میں داخل ہوئے تو میں نے خادمہ کو آپ کی خدمت میں بھیجا اور اس سے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ سے جا کر کہو کہ ام سلمہ کہتی ہیں کہ اے اللہ کے رسول ﷺ میں نے آپ سے سنا ہے کہ آپ ان دو رکعتوں کو پڑھنے سے منع کرتے تھے اور اب میں نے آپ کو دو رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے خادمہ سے کہا کہ ام سلمہ سے جا کر کہو کہ ابو امیہ کی بیٹی تم نے عصر کے بعد کی دو رکعتوں کے متعلق پوچھا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ قبیلہ عبد القیس کے کچھ لوگ اسلامی احکام سیکھنے کے غرض سے میرے پاس آئے تھے انہیں اسلامی فرائض کی تعلیم دینے کی مصروفیت کی وجہ سے ظہر کے بعد دو سنتیں رہ گئی تھی ان کو عصر کے بعد میں نے پڑھا ہے۔ (بخاری، مسلم)

راویٔ حدیث:

کریب بن ابی مسلم۔ یہ "کریب" ہیں جو "ابو مسلم" کے بیٹے تھے۔ عبد اللہ بن عباس کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔ "کریب" تصغیر کے ساتھ ہے۔

المسور بن مخرمۃ۔ یہ "مسور" ہیں "مخرمہ" کے بیٹے ہیں۔ ان کی کنیت "ابو عبد الرحمٰن" ہے۔ "زہری وقرشی" ہیں۔ یہ عبد الرحمٰن بن عوف کے بھانجے ہیں ہجرت نبوی کے دو سال بعد "مکہ" میں ان کی پیدائش ہوئی۔ ذی الحجہ ۸ھ میں مدینہ منورہ لائے گئے۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر آٹھ (۸) سال تھی انہوں نے آنحضرت ﷺ سے حدیث کی سماعت کی اور اس کو یاد رکھا۔ بڑے فقیہ اور صاحب فضل اور دیندار تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک مدینہ ہی میں قیام پذیر رہے۔ بعد شہادت مکہ میں منتقل ہوگئے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات تک وہاں مقیم رہے۔ انہوں نے یزید کی بیعت کو پسند نہیں کیا لیکن پھر بھی مکہ ہی میں رہے۔ جب تک کہ یزید نے لشکر بھیجا اور مکہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت یہاں ابن زبیر رضی اللہ عنہ مکہ میں موجود تھے۔ چنانچہ اس محاصرہ میں "مسور بن مخرمہ" کو منجنیق سے پھینکا ہوا ایک پتھر لگا۔ یہ اس وقت "حجر اسود" کے قریب نماز پڑھ رہے تھے۔ اسی پتھر نے ان کی جان لی۔ یہ واقعہ ربیع الاولی ۶۴ھ کی چاندرات کو ہوا۔ ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی۔

"مسور" میں میم مکسور، سین مہملہ ساکن اور واو مفتوح ہے۔ "مخرمہ" میں میم مفتوح، خاء معجمہ ساکن اور راء مفتوح ہے۔

تشریح: حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اس حدیث کی وضاحت میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ علم وہدایت کی تعلیم عام نوافل پر تو مقدم ہے ہی فرض نماز کے بعد پڑھے جانے والے نوافل وسنن پر بھی مقدم ہے، اشرف فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اوقاتِ معینہ کے معین شدہ نوافل کو بھی اسی طرح قضا کیا جائے گا جس طرح فرائض کی قضا ہوتی ہے نیز یہ کہ جس نماز کا کوئی سبب ہوا سے ان اوقات مکروہہ میں پڑھنا مکروہ نہیں ہے نیز یہ حدیث ابن ملک کے قول کے مطابق اس بات کی بھی دلیل ہے کہ سنتوں کی قضا کرنا بھی سنت ہے۔ یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔

ظاہر حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظہر کی چھوٹی ہوئی آخری دو سنتوں کو نماز عصر کے بعد ادا کرنا جس کا اس واقعے میں تذکرہ کیا گیا ہے وہ نبی ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔ کیونکہ غیر نبی کیلئے جو ممانعت وارد ہوئی ہے وہ عام ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ متعدد احادیث میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حوالے سے منقول ہے کہ آپؐ عصر کے بعد دو رکعتیں ہمیشہ پڑھا کرتے تھے جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے بھی اپنی سند سے حضرت ام سلمہؓ کی روایت اس اضافے کے ساتھ نقل فرمائی ہے کہ میں نے عرض

کیا یا رسول اللہ اگر ہم سے یہ رکعتیں چھوٹ جائیں تو کیا ہم ان کی قضا کریں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔

اس اعتبار سے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے مطابق حدیث کے اس جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کو معلوم ہے میری یہ خصوصیت ہے کہ میں جب بھی کوئی کام کرتا ہوں تو اس پر مداومت بھی کرتا ہوں اس لئے میں خود تو ان دونوں رکعتوں کو ادا کرتا ہوں لیکن دوسروں کو اس سے منع کرتا ہوں۔

لیکن یہ معنی خود حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے کلام کے مخالف ہے جس میں وہ یہ فرماتے ہیں کہ یہیں سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ قول اخذ کیا ہے کہ وہ نماز جو کسی سبب کی بناء پر پڑھی جائے وہ ان اوقات میں مکروہ نہیں ہے ظاہر ہے کہ جب یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے تو اس کے ذریعے غیر کیلئے استدلال کرنا صحیح نہیں ہوسکتا۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان اوقات ثلثہ مکروہہ میں جواز نماز کا مسئلہ علماء کرام کے درمیان مختلف فیہ ہے اسی طرح نماز فجر کے بعد سے لے کر طلوع آفتاب تک اور نماز عصر کے بعد سے غروب آفتاب تک کا وقت بھی مختلف فیہ ہے۔ چنانچہ داؤد ظاہری تو مطلقاً جواز نماز کے قائل ہیں، جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے بھی یہی منقول ہے عین ممکن ہے کہ انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ممانعت کا علم نہ ہوا ہو، یا انہوں نے اس ممانعت کو کراہت تنزیہی پر محمول کرلیا ہو کراہت تحریمی مراد نہ لی ہو لیکن اکثر فقہاء کرام کی رائے اس کے خلاف ہے چنانچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان اوقات میں کوئی ایسی نماز پڑھنا جائز نہیں ہے جس کا کوئی سبب موجود نہ ہو لیکن اگر اس کا کوئی سبب موجود ہو جیسے منت مانی ہوئی نماز یا فوت شدہ نماز کی قضاء تو وہ جائز ہے اور اس کی دلیل کُریب کی وہ حدیث ہے جو حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے اسی طرح مکہ مکرمہ میں اور جمعے کے دن حالتِ استواء میں بھی استثناء برقرار رکھا گیا ہے اور اس کی دلیل حضرت جبیر بن مطعم اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایات ہیں جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ ان تینوں اوقات میں کوئی سی بھی نماز پڑھنا حرام ہے البتہ اس دن کی نماز عصر اصفرارِ شمس کے وقت بھی ادا کی جاسکتی ہے، نیز فجر اور عصر کے بعد منت مانی ہوئی اور نفل نمازیں بھی حرام ہیں یہی حکم سجدہ تلاوت اور نماز جنازہ کا بھی ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان اوقات میں نوافل تو حرام ہیں لیکن فرائض نہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے البتہ فرق یہ ہے کہ وہ ان اوقات ثلثہ مکروہہ میں دوگانہ طواف کے جواز کے قائل ہیں جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس کے قائل نہیں۔

الفصل الثانی:

صبح کی سنتوں کا مسئلہ

۱۰۴۴: عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ قَيْسِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ رَاَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا يُصَلِّيْ بَعْدَ صَلَاةِ الصُّبْحِ رَكْعَتَيْنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةُ الصُّبْحِ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ فَقَالَ الرَّجُلُ اِنِّيْ لَمْ اَكُنْ صَلَّيْتُ الرَّكْعَتَيْنِ اللَّتَيْنِ قَبْلَهُمَا فَصَلَّيْتُهُمَا الْاٰنَ فَسَكَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رواه ابو داود وروى الترمذى نَحْوَهٗ وَقَالَ اِسْنَادُ هٰذَا الْحَدِيْثِ لَيْسَ بِمُتَّصِلٍ لِاَنَّ مُحَمَّدَ ابْنَ اِبْرَاهِيْمَ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ قَيْسِ بْنِ عَمْرٍو وَفِيْ شرح السنة ونسخ

المصابیح عن قیس بن فهد نحوہ۔

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۲/۵۱ حدیث رقم ۱۲۶۷۔

ترجمہ: حضرت محمد بن ابراہیم حضرت قیس بن عمرو سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد دو رکعت نماز پڑھ رہا ہے آپ ﷺ نے اس سے فرمایا صبح کی نماز دو رکعت ہے پھر فرمایا دو رکعت ہی پڑھو اس آدمی نے عرض کیا کہ فجر کی فرض نماز سے پہلے میں نے دو رکعت سنت نہیں پڑھی تھی وہ رکعتیں میں نے اس وقت پڑھی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اس کی یہ بات سن کر خاموش ہو گئے۔ (ابوداؤد) امام ترمذیؒ نے بھی اس کو اس طرح بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اس روایت کی سند متصل نہیں ہے کیونکہ محمد بن ابراہیم کا سماع قیس ابن عمرو سے ثابت نہیں ہے نیز شرح السنہ اور مصابیح کے بعض نسخوں میں قیس بن فہد سے اسی طرح منقول ہے۔

راویٔ حدیث:

محمد بن ابرہیم۔ یہ ''محمد'' ہیں ابراہیم کے بیٹے ہیں۔ قرشی و تیمی ہیں۔ صغار تابعین میں سے ہیں۔ علقمہ بن وقاص اور ابوسلمہ سے حدیث کی سماعت کی۔ امام ترمذی نے صبح کی دو رکعت کے بارے میں ان کی ایک حدیث بیان کی ہے اس کی سند یہ ہے کہ روایت ہے قیس سے جو سعد بن سعید کے دادا ہیں۔ اور قیس یحییٰ بن سعید اور ان کے بھائی سعد کے دادا ہیں۔ انہوں (ترمذی) نے کہا کہ یہ قیس عمرو یا فہد کے بیٹے ہیں۔ پھر کہا کہ اس حدیث کی سند متصل نہیں کیونکہ محمد بن ابراہیم تیمی نے قیس سے نہیں سنا۔ فہد میں یا قاف مفتوح ہے یا فاء ہے اور مفتوح ہے۔

تشریح: اس حدیث میں نمازِ فجر کے لئے ''رکعتین'' کا لفظ دو مرتبہ آیا ہے اور یہی صحیح نسخہ بھی ہے لیکن یہاں دوسرا ''رکعتین'' نفی زیادت کی تاکید کیلئے ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دو رکعتیں سنت ہیں اور دو رکعتیں فرض ہیں، یہ توجیہہ تو ہمارے ذہن کے مطابق ہے، علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''رکعتین'' محلاً منصوب ہے اور اس کا فعل محذوف ہے، تقدیری عبارت اس طرح ہوگی: ''اتصلی بعد صلٰوۃ الصبح رکعتین ولیس بعدها صلٰوۃ؟'' حافظ ابن حجر رحمہ اللہ بھی علامہ طیبی رحمہ اللہ ہی کی پیروی کرتے ہوئے تقدیری عبارت یہ نکالتے ہیں۔

''اتصلی صلٰوۃ الصبح وتصلی بعدها رکعتین، وقد علمت انه لا صلٰوۃ بعدها؟''

اور یہاں استفہام تقدیری برائے انکار ہے، اور دوسرا ''رکعتین'' پہلی کی تاکید لفظی ہے یعنی جب تم نے صبح کی نماز پڑھ لی تو اس کے بعد کیسے کوئی نماز پڑھ سکتے ہو؟ لیکن ان دونوں حضرات کا کلام جس تکلف اور تعسف سے بھرپور ہے، وہ کسی پر مخفی نہیں۔

فصلیتهما الآن: علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کہہ کر اس نماز پڑھنے والے نے نبی ﷺ کے سامنے اپنا عذر پیش کیا کہ اس نے فرض نماز ہی پڑھی تھی، سنتیں چھوٹ گئی تھیں جو اس نے اب پڑھ لی ہیں، یہی امام شافعی اور امام محمد رحمہما اللہ کا مذہب ہے۔

ہماری رائے یہ ہے کہ یہ صرف امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے کیونکہ امام محمد رحمہ اللہ کا مذہب اس سلسلے میں یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی فجر کی سنتیں چھوٹ جائیں تو انہیں طلوع آفتاب کے بعد قضا کیا جائے گا جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ

کا مذہب یہ ہے کہ اگر فجر کی صرف سنتیں ہی چھوٹی ہوں فرض ادا کر لئے ہوں تو ان کی قضا نہیں ہے اور اگر کسی آدمی کے فرض بھی چھوٹ گئے ہوں تو سنتوں کو فرضوں کے تابع کر کے قضا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ بھی زوال سے پہلے اسی طرح ظہر کی نماز میں پہلی چار سنتیں چھوٹ جانے کی صورت میں بعد کی دو سنتیں ادا کرنے کے بعد قضا کی جائیں گی۔ بعض حضرات کی رائے کے مطابق پہلے چار سنتیں ادا کی جائیں گی بعد میں دو سنتیں لیکن یہ اختلاف صرف اولویت میں ہے اور فرض سے بعد والی دو سنتوں کو مقدم کرنا زیادہ صحیح اور راجح ہے جسے ابن ماجہ نے اپنی کتاب میں تخریج کیا ہے اور یہی علامہ ابن ہمام کا مختار مذہب ہے۔

فسکت رسول اللہ ﷺ: ابن ملک فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کا سکوت اس بات کی دلیل ہے کہ جس شخص نے فجر کی سنتیں پہلے نہ پڑھی ہوں فرضوں کے ادا کرنے کے بعد اسے ادا کر لینا چاہیے۔ یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی قول ہے ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث سنداً ثابت ہی نہیں ہے جیسا کہ عنقریب اس کی وضاحت آتی ہے اس لئے اسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے خلاف بطور حجت کے نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اصل میں اس حدیث کا ایک راوی قیس بن عمرو جسے قیس بن قہد بھی کہتے ہیں ان سے محمد بن ابراہیم نے سماع ہی نہیں کیا اس سے یہ متصل نہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس اختلاف کی طرف مؤلف نے بھی اشارہ کیا ہے اور یہ کہ صحیح نام قیس بن عمرو ہی ہے اور یہ صحابی ہیں اور ان کا تعلق قبلہ بنونجار سے ہے بعض حضرات کی تحقیق کے مطابق قیس بن قید بھی بنونجار سے تعلق رکھتا ہے۔ میرک نے بھی تصحیف سے نقل کرتے ہوئے ان دونوں کو بنی نجار میں سے قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک یہ دونوں ایک ہی شخص کے نام ہیں اور یہ بھی کچھ بعید نہیں ہے لیکن علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی یہ بات اور یہ عجیب وغریب بات کہ اگر سنداً یہ روایت صحیح نہ بھی ہو تو نبی ﷺ کا یہ فرمان اس کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔

"لا صلوٰۃ بعد الفجر الا رکعتی الفجر فانہ صادق بصلاتھما بعد الصبح وقبلہ"

حالانکہ یہ بات اس اجماع کے خلاف ہے کہ فجر کی سنتیں ان سنتوں میں سے ہیں جنہیں پہلے ادا کیا جانا چاہیے۔

نیز علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ائمہ ثلاثہ جو اس بات کے قائل ہیں کہ فجر اور عصر کے اول وقت میں کراہت داخل ہو جاتی ہے (نماز فجر اور عصر ادا کرنے کے بعد وہ وقت نوافل کیلئے مکروہ ہو جاتا ہے) تو اس کے مقابلے میں صحیح مسلم کی وہ مذکورہ روایت موجود ہے جو حضرت عمرو بن عبسہ سے مروی ہے جس میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ ممانعت کی قید نماز فجر اور عصر کے بعد سے متعلق ہے بلکہ اس میں تو اس بات کی صراحت بھی موجود ہے کہ نماز عصر کی ادائیگی سے پہلے جو نماز پڑھی جائے اس کا ثواب لکھنے کیلئے فرشتے موجود اور گواہ ہوتے ہیں اور امام ترمذی رحمہ اللہ کا پہلی بات پر علماء کا اجماع نقل کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ انہیں یہاں سہو لاحق ہوا۔

ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ علی الاطلاق اس مسئلے کو ائمہ ثلاثہ کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ہمارے مذہب میں نماز فجر سے پہلے نوافل مکروہ ہیں فجر کی سنتیں مکروہ نہیں ہیں البتہ نماز فجر کے بعد علی الاطلاق سنتیں بھی مکروہ اور نوافل بھی مکروہ ہیں، باقی رہی نماز عصر تو اس میں دخولِ وقت کے بعد نوافل کی کراہت نہیں ہے بلکہ نماز عصر کے بعد نوافل کی ادائیگی مکروہ ہے۔

بیت اللہ کا طواف ہر وقت ہو سکتا ہے

۱۰۴۵: وَعَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَابَنِيْ عَبْدِ مَنَافٍ لَا تَمْنَعُوْا اَحَدًا طَافَ بِهٰذَا الْبَيْتِ وَصَلّٰى اَيَّةَ سَاعَةٍ شَاءَ مِنْ لَيْلٍ اَوْ نَهَارٍ ۔ (رواہ الترمذی و ابو داود و النسائی)

أخرجه أبوداوٗد ۲/ ٤٤٩ حديث رقم ١٨٩٤ ـ والترمذی ۳/ ۲۲۰ حديث رقم ٨٦٨ ـ والنسائی ٥/ ۲۲۳ حديث رقم ۲۹۲٤ ـ وابن ماجه ۱/ ۳۹۸ حديث رقم ۱۲٥٤ ـ والدارمی ۲/ ۹٦ حديث رقم ۱۹۲٦ ـ

ترجمہ: حضرت جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے بنوعبد مناف کسی کو کعبہ کا طواف کرنے سے نہ روکو رات اور دن میں جب چاہے انہیں نماز پڑھنے سے نہ روکو۔ (ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: ''قولہٗ یابنی عبد مناف''

علامہ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس موقع پر تمام قبائل قریش کو چھوڑ کر بنوعبد مناف کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نبی ﷺ اس بات کو جانتے تھے کہ حکومت وخلافت ان ہی کو حاصل ہوتی ہے اس لئے بیت اللہ کے ساتھ متعلق اس مسئلے کو واضح کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ انہی کو مخاطب فرمایا اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بنوعبد مناف کا شمار روسا مکہ میں ہوتا تھا اور انہیں بڑے بڑے مناصب اور عہدے حاصل تھے مثلاً سدانہ، حجابہ، لواء، سقایہ اور رفادہ۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بعض اوقات لوگوں کو طواف کرنے سے روک دیا جاتا تھا اس لئے خصوصیت کے ساتھ تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اس سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ طواف کی قید، قیدِ مانعی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد مسجد حرام میں داخل ہونا ہے کیونکہ عام طور پر مسجد حرام میں داخل ہونے والا ہر شخص طواف کرتا ہی ہے۔

مظہر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے اوقات مکروہہ میں نوافل پڑھنے کی جو ممانعت ہے وہ مکہ مکرمہ میں نہیں رہتی اور اس کی حکمت یہ ہے کہ لوگ ہر وقت وہاں نماز پڑھنے کی فضیلت حاصل کر سکیں یہی امام شافعی رحمۃ اللہ کا قول ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کی رائے یہ ہے کہ اوقات کراہت کا حکم مکہ مکرمہ میں بھی اسی طرح ہے جس طرح دوسرے شہروں میں ہے کیونکہ ہر جگہ علت ایک ہی ہے۔ ابن ملک نصوص میں تعارض کو دور کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بظاہر نبی ﷺ کے اس ارشاد:

''وصلّٰی ایة ساعة شاء'' کا تعلق اوقاتِ غیر مکروہہ سے ہے۔

زوال کے احکام جمعہ کے دن نافذ نہیں ہوتے

۱۰۴۶: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الصَّلَاةِ نِصْفَ النَّهَارِ حَتّٰى تَزُوْلَ الشَّمْسُ اِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ ۔ (رواہ الشافعی)

أخرجه الشافعی فی سنده ص ٦٣ ـ

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوپہر کے وقت نماز پڑھنے سے منع کیا ہے یہاں

تک کہ سورج زائل ہو جائے ہاں البتہ جمعہ کا دن اس سے مستثنیٰ ہے۔

تشریح: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جمعہ کے دن نصف النہار کے وقت نوافل پڑھنا مکروہ نہیں ہے، یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی قول ہے لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسے مکروہ قرار دیتے ہیں تاہم اس مسئلے میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ بھی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے موافق ہیں۔ رہی یہ حدیث تو بظاہر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ثابت ہی نہیں ہے بلکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب بھی اس کو ثابت نہیں مانتے، چنانچہ خود علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات نے نقل فرمایا ہے لیکن اس کی سند پر علماء کو کلام ہے بالفرض اگر اس حدیث کو ثابت مان بھی لیا جائے تو اُن صحیح احادیث کے مقابلے میں اسے نہیں پیش کیا جا سکتا جن میں نصف النہار کے وقت نماز پڑھنے کی ممانعت عام ہے اور کسی صحیح حدیث سے یوم جمعہ کی تخصیص وتقیید ثابت نہیں ہوتی۔

جمعہ کے دن زوال کا انتظار نہیں

۱۰۴۷: وَعَنْ اَبِی الْخَلِیْلِ عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَرِهَ الصَّلَاةَ نِصْفَ النَّهَارِ حَتّٰی تَزُوْلَ الشَّمْسُ اِلَّا یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَقَالَ اِنَّ جَهَنَّمَ تُسْجَرُ اِلَّا یَوْمَ الْجُمُعَةِ رواہ ابوداود وَقَالَ اَبُو الْخَلِیْلِ لَمْ یَلْقَ اَبَا قَتَادَةَ۔

أخرجه أبو داؤد ۱/۶۵۳ حدیث رقم ۱۰۸۳۔

ترجمہ: حضرت ابوالخلیل حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصف النہار کے وقت نماز کو مکروہ سمجھتے تھے یہاں تک کہ سورج ڈھل جائے سوائے جمعہ کے دن اور آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جہنم کو جمعہ کے دن کے علاوہ روزانہ بھڑکایا جاتا ہے۔ (ابوداؤد) اور کہا ہے کہ یہ حدیث متصل نہیں کیونکہ ابوالخلیل کا سماع ابوقتادہ سے ثابت نہیں۔

تشریح: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس ارشاد مبارک کے ذریعے دراصل نماز ظہر کو ٹھنڈے وقت میں ادا کرنے کی ترغیب دینا چاہتے ہیں اور اس کی دلیل وہ دوسری حدیث ہے جو ان الفاظ سے منقول ہے:۔

''ابردوا بالظهر فان شدة الحر من فیح جهنم''۔

رہی بات یہ کہ نصف النہار کے وقت جہنم کی آگ کو کیوں بھڑکایا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سورج کے پجاری اسی وقت سورج کو سجدہ کرتے ہیں جبکہ علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ ان الفاظ کو الفاظ شرعیہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمیں ان کے معنی نہیں معلوم البتہ ان کی تصدیق کرنا ہم پر واجب ہے۔

الفصل الثالث:

مکروہ اوقات کی وضاحت

۱۰۴۸: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ الصُّنَابِحِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ الشَّمْسَ تَطْلُعُ وَمَعَهَا قَرْنُ الشَّيْطَانِ فَإِذَا ارْتَفَعَتْ فَارَقَهَا ثُمَّ إِذَا اسْتَوَتْ قَارَنَهَا فَإِذَا زَالَتْ فَارَقَهَا فَإِذَا دَنَتْ لِلْغُرُوْبِ قَارَنَهَا فَإِذَا غَرَبَتْ فَارَقَهَا نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الصَّلَاةِ فِيْ تِلْكَ السَّاعَاتِ .

(رواہ مالك واحمد والنسائی)

أخرجه النسائی فی السنن ۲۷۵۸۱حدیث رقم ۵۵۹۔وابن ماجه ۳۹۷/۱حدیث رقم ۱۲۵۳۔ومالك فی الموطأ ۲۱۹/۱حدیث رقم ٤٤من کتاب القرآن۔وأحمد فی المسند ۳٤۸/٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ صنابحی سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے اس کے ساتھ شیطان کا سینگ ہوتا ہے جب سورج بلند ہو جاتا ہے تو شیطان اس سے الگ ہو جاتا ہے پھر جب دوپہر ہوتی ہے تو شیطان سورج کے قریب آ جاتا ہے جب زوال شمس ہو جاتا ہے تو وہ اس سے جدا ہو جاتا ہے۔ پھر جب سورج غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے تو شیطان اس کے قریب آ جاتا ہے اور جب سورج غروب ہو جاتا ہے تو شیطان اس سے دور ہو جاتا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ان اوقات میں نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ (مالک احمد نسائی)

تشریح: اس حدیث میں مذکور اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت عام ہے خواہ نماز حقیقتاً ہو یا حکماً، حکمی نماز کی مثال نماز جنازہ اور سجدہ تلاوت ہے اور یہ ممانعت تحریم کے لئے ہے۔

عصر کے بعد کوئی نماز نہیں

۱۰۴۹: وَعَنْ أَبِيْ بَصْرَةَ الْغِفَارِيِّ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمُخَمَّصِ صَلَاةَ الْعَصْرِ فَقَالَ إِنَّ هٰذِهٖ صَلَاةٌ عُرِضَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ فَضَيَّعُوْهَا فَمَنْ حَافَظَ عَلَيْهَا كَانَ لَهٗ أَجْرُهٗ مَرَّتَيْنِ وَلَا صَلَاةَ بَعْدَهَا حَتّٰى يَطْلُعَ الشَّاهِدُ وَالشَّاهِدُ النَّجْمُ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ٥٦٨/١حدیث رقم (٢٩٢۔٨٣٠)۔والنسائی ٢٥٩/١حدیث رقم ٥٢١وأحمد فی المسند ٣٩٧/٦۔

ترجمہ: حضرت ابوبصرہ غفاریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مقام مخمص میں عصر کی نماز پڑھائی اور نماز کے بعد ارشاد فرمایا یہ نماز تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کی گئی تھی۔ مگر ان لوگوں نے اس نماز کو ضائع کر دیا لہٰذا جو آدمی اس نماز کی حفاظت کرے گا اور اس کو ہمیشہ پڑھتا رہے گا اس کو دوگنا ثواب ملے گا اور فرمایا کہ عصر کی نماز کے بعد کوئی نماز جائز نہیں ہے یہاں تک کہ شاہد طلوع ہو جائے شاہد سے مراد ستارا ہے۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے نماز عصر کا حق ادا نہیں کیا اور اس پر محافظت نہیں کی جس کے نتیجے میں اللہ نے انہیں ہلاک کر دیا اس لئے تم اس بات سے ڈرو کہیں تم بھی ان جیسے نہ ہو جاؤ اسی وجہ سے اللہ نے فرمایا ہے۔

"حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ"

اس ارشاد مبارک میں صحیح قول کے مطابق صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد نماز عصر ہے اور اس کی پابندی کرنے والے کو دوہرا اجر ملتا ہے ایک تو یہود و نصاریٰ کے برعکس اس کی پابندی کرنے پر اور دوسرا نفس عمل کا اجر یا ایک اجر تو عبادت پر مداومت اور پابندی اختیار کرنے پر اور دوسرا اجر بیع و شراء کو چھوڑنے پر کیونکہ عصر کا وقت عام طور پر کاروباری اعتبار سے بہت قیمتی وقت ہوتا ہے اور اسی وقت میں گاہکوں کی آمد ہوتی ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نماز عصر کی محافظت پر دوہرا اجر کبھی تو اس کی اپنی فضیلت کی وجہ سے ملتا ہے کیونکہ یہ درمیانی نماز ہے اور کبھی اس کی پابندی کرنے پر دوہرا اجر ملتا ہے۔ رہی یہ بات کہ انسان دوسری نمازوں پر بھی تو پابندی کرتا ہے اس اعتبار سے دوسری نمازیں اس کے شریک ہوئیں پھر اس کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مشارکت نماز عصر کی تخصیص میں مؤثر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کی فضیلت صرف اسی وجہ سے نہیں بلکہ مذکورہ دونوں امور کی وجہ سے بھی ہے۔

نیز اس حدیث میں نماز عصر کے بعد نماز پڑھنے کی جو ممانعت کی گئی ہے اس کی ایک مخصوص علّت ہے اس لئے اشارۃً اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی ذات کے اعتبار سے نماز اس وقت میں ممنوع نہیں ہے خواہ غروب کا وقت ہی کیوں نہ ہو اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی قول ہے۔

نمازِ عصر کے بعد دو رکعتوں کی ممانعت

۱۰۵۰: وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ اِنَّكُمْ لَتُصَلُّوْنَ صَلَاةً لَقَدْ صَحِبْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَا رَاَيْنَاهُ يُصَلِّيْهِمَا وَلَقَدْ نَهٰى عَنْهُمَا يَعْنِي الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٦٣ حديث رقم ٥٨٧۔

ترجمہ: حضرت معاویہ سے روایت ہے انہوں نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگ نماز پڑھتے ہو اور ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے لیکن ہم نے آپ کو یہ دو رکعتیں پڑھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا بلکہ آپ نے ان دو رکعتوں کو عصر کی نماز کے بعد منع فرمایا ہے۔

تشریح: امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث متواترہ کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ نماز عصر کے بعد نماز پڑھنا ممنوع ہے بعد میں کچھ صحابہ کرام سے اس پر عمل کرنا بھی ثابت ہے لیکن ان متواتر روایات کی موجودگی میں اس کے خلاف رائے قائم کرنا صحیح نہیں ہے بالخصوص جبکہ حضرت عمر فاروقؓ سے سند صحیح کے ساتھ یہ بات ثابت ہے کہ وہ نماز عصر کے بعد نوافل پڑھنے والوں کو اتنا مارتے تھے کہ وہ اپنی نماز ختم کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ مارنا صحابہ کرام کی موجودگی میں ہوتا تھا اور کسی صحابی کی

اس پر نکیر بھی ثابت نہیں تو گویا کہ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بعد بھی اس کے عدم جواز پر اجماع ہو گیا۔ پھر کچھ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ جن روایات میں نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی طرف نماز عصر کے بعد نوافل پڑھنے کی نسبت آتی ہے ہماری طرف سے اس کا عذر یہ ہے کہ یہ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خصوصیات میں سے ہے اور اس کی بھی ایک بنیاد ہے اور وہ یہ کہ ایک مرتبہ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے ظہر کے بعد کی دو سنتیں کسی کام میں مصروفیت کی وجہ سے رہ گئیں اس نقصان کی تلافی کیلئے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے نماز عصر کے بعد دو سنتیں پڑھ لیں کیونکہ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ معمول مبارک تھا کہ جب بھی کوئی عمل شروع کرتے تو اس پر دوام فرماتے لیکن دوسرے صحابہ کرام کو نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم دو رکعتیں پڑھنے سے منع فرماتے تھے۔

فجر کی نماز کے بعد اور عصر کے بعد نماز جائز نہیں

۱۰۵۱: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ وَقَدْ صَعِدَ عَلٰی دَرَجَةِ الْكَعْبَةِ مَنْ عَرَفَنِیْ فَقَدْ عَرَفَنِیْ وَمَنْ لَمْ یَعْرِفْنِیْ فَاَنَا جُنْدُبٌ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَاصَلٰوةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ وَلَا بَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰی تَغْرُبَ الشَّمْسُ اِلَّا بِمَكَّةَ اِلَّا بِمَكَّةَ اِلَّا بِمَكَّةَ ۔ (رواہ احمد ورزین)

أخرجه أحمد فی المسند ٥/١٦٥۔

ترجمہ: حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے انہوں نے کعبہ کی سیڑھی پر چڑھ کر فرمایا کہ جس نے مجھے پہچانا تو اس نے مجھے پہچان لیا اور جو شخص مجھے نہیں پہچانتا تو میں اس کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں جندب ہوں میں نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد جب تک سورج طلوع نہ ہو جائے کوئی نماز نہیں اور نہ عصر کے بعد کوئی نماز ہے جب تک کہ سورج غروب نہ ہو جائے مگر مکہ میں اور اس استثناء کو تین مرتبہ ذکر کیا ہے۔ (احمد۔ رزین)

تشریح: اس حدیث میں حضرت ابوذر غفاریؓ کو درجہ کعبہ پر چڑھنے کا جو ذکر آتا ہے، اس سے مراد لکڑی کا وہ ٹکڑا ہے جو باب کعبہ کے ساتھ لگایا جاتا تھا تا کہ خانہ کعبہ میں داخل ہونے والا اس پر چڑھ کر خانۂ کعبہ میں داخل ہو سکے اور جب خانہ کعبہ کر بند کر دیا جاتا تو لکڑی کا وہ حصہ بیر زمزم کے ایک طرف لگا دیا جاتا تو ممکن ہے اس زمانے میں بھی ایسا ہوتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی کوئی اور کیفیت ہوتی ہو اور درجہ سے مراد خانہ کعبہ کی چوکھٹ بھی ہو سکتی ہے۔

من عرفنی فقد عرفنی: اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی مجھے میرے نام سے جانتا ہے وہ مجھے میرے اوصاف سے بھی جانتا ہے کہ میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں اور اس میں درحقیقت نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابوذر غفاریؓ کے باب فضائل میں سے ہے کہ آسمان کے سائے تلے اور روئے زمین پر ابوذر سے زیادہ سچا کوئی نہیں۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کی یہ حدیث دار قطنی اور بیہقی نے نقل کی ہے۔ لیکن یہ چار وجہوں سے معلول ہے۔

① مجاہد اور حضرت ابوذر غفاریؓ کے درمیان انقطاع۔
② ابن مؤمل کا ضعف۔
③ حمید مولیٰ عفراء کا ضعف۔
④ سند کا اضطراب۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو نقل کرتے ہوئے حمید اور مجاہد کے درمیان قیس بن سعد کو داخل کیا ہے جبکہ سعید بن مسلم نے اسی روایت کی اسی سند میں قیس بن سعد کا ذکر نہیں کیا۔خود علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا اعتراف ہے کہ سنداً یہ روایت ضعیف ہے لیکن اس کے باوجود وہ ''یابنی عبد مناف'' والی حدیث کو اس کیلئے مؤید قرار دیتے ہیں۔حالانکہ وہ حدیث تو مؤول ہے اور یہ بات پیچھے گذر چکی ہے کہ وہ لوگ اپنی اغراض فاسدہ کے پیش نظر بعض اوقات لوگوں کو نماز اور طواف سے روکتے تھے۔اس دروازے کو بند کرنے کیلئے یہ حکم دیا گیا اور اسے مطلق رکھا گیا گو کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اوقات مکروہہ میں نماز کو ممنوع قرار دے چکے تھے اور صرف اسی وجہ سے اس حکم کی نسبت بنو عبد مناف کی طرف کی گئی اور خصوصیت کے ساتھ ان ہی سے خطاب فرمایا گیا۔ ''واللّٰہ اعلم بالصواب''۔

بَابُ الْجَمَاعَةِ وَ فَضْلِهَا

جماعت اور اِس کی فضیلت کا بیان

اس باب میں مصنف رحمۃ اللہ علیہ با جماعت نماز پڑھنے کے احکام و آداب اور اسکی فضیلت پر مشتمل احادیث ذکر فرمائیں گے۔

الفصل الاول:

جماعت کی نماز کا ثواب

۱۰۵۲:عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ تَفْضُلُ صَلَاةَ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَعِشْرِيْنَ دَرَجَةً ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/ ١٣١ حديث رقم ٦٤٥۔ ومسلم في صحيحه ١/ ٤٥٠ حديث رقم (٢٤٩۔ ٦٥٠) والنسائي ٢/ ١٠٣ حديث رقم ٨٣٧۔ ومالك في الموطأ ١/ ١٢٩ حديث رقم ١ من كتاب صلاة الجماعة۔ وأحمد في المسند ٢/ ٦٥۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جماعت کی نماز اکیلے نماز پڑھنے سے ستائیس درجے زیادہ ہوتی ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عذر کی وجہ سے تنہا نماز پڑھے تو اسے بھی جماعت کا ثواب حاصل ہو جائے گا۔ نیز یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جماعت صحتِ نماز کیلئے شرط نہیں اور نہ ہی فرض عین ہے جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی دونوں طرح کی روایتیں موجود ہیں۔ ورنہ تنہا نماز پڑھنے والے کیلئے ثواب کا کوئی درجہ نہ ہوتا البتہ اسے معذور پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس حدیث کا مقصد جماعت کی ترغیب دینا ہے فرضیت یا شرطیت کے دلائل دوسرے ہیں۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں با جماعت نماز کو انفرادی نماز پر ستائیس (۲۷) درجے افضل قرار دیا گیا

ہے۔ جبکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث میں پچیس (۲۵) درجے فضیلت کا ذکر آتا ہے ان دونوں حدیثوں میں تطبیق پیدا کرنے کے لئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ فضیلت کا تفاوت اور اس کے مختلف درجات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زائد چیز ناقص سے بعد میں ہی آتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے اپنے فضل سے ثواب میں اضافہ فرمایا اور اللہ کے ہاں یہ اصول ہے کہ وہ وعدے سے کم کبھی نہیں دیتے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو پہلے ایک مقدار کی خوشخبری سنادی، پھر دیکھا کہ اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور امت مسلمہ پر مزید احسان فرمانا چاہتے ہیں اس لئے دوسری مقدار کی خوشخبری دے کر امت کو باجماعت نماز کی ترغیب دلائی۔

باقی رہی یہ بات کہ باجماعت نماز کی فضیلت کو کبھی ۲۵ گنا پر اور کبھی ۲۷ گنا پر محمول کرنے کی کیا وجہ ہے؟ تو جان لینا چاہیے کہ اس کا مرجع وہ علوم نبویہ ہیں جن کا اجمالی ادراک بھی عقل کو نہیں ہوسکتا۔ تفصیلی ادراک تو بڑی دور کی بات ہے۔ البتہ یہ فائدہ ضرور ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کو اس اسلامی شعار کے اظہار میں یکجا اور اکٹھا کرنا مقصود ہو۔

امام نووی رحمہ اللہ نے اس حدیث شریف میں تین تطبیقات بیان کی ہیں۔

① قلیل کے ذکر سے کثیر کی نفی نہیں ہوتی۔

② علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کی ذکر کردہ توجیہہ۔

③ نمازی اور نماز کے احوال بدلنے سے ثواب کے درجات میں بھی تفاوت واقع ہوجاتا ہے، چنانچہ بعض نمازیوں کیلئے یہ ثواب ۲۵ گنا ہے اور بعض کیلئے ستائیس گنا، جس شخص کی نماز میں جتنا کمال، دوام اور خشوع ہوگا جگہ اور امام کی بزرگی جتنی زیادہ ہوگی ثواب میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔

بظاہر یہ فضیلت صرف جماعت کی ہے کیونکہ بعض مقدس مقامات پر نماز پڑھنے کا ثواب کئی گنا زیادہ ہوتا ہے اسی طرح نمازیوں اور نمازوں کے درجات میں بھی واضح فرق موجود ہوتا ہے اس لئے اس حدیث کی وہی توجیہہ قابل اعتماد ہے جو علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمائی ہے۔

اسی حدیث سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جماعت کے مسنون ہونے پر استدلال کیا ہے، علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک بھی یہی قول صحیح ہے اور اسی کو اکثر حضرات نے ترجیح دی ہے لیکن قول اصح اکثر علمائے کرام کے نزدیک جماعت کے فرض کفایہ ہونے کا ہے اور اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو عنقریب آیا چاہتی ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انفرادی نماز پڑھ کر ایک ہی درجے پر قناعت کرکے درجاتِ کثیرہ کو چھوڑ دینے والا یا تو اس حدیث کو سچا نہیں مانتا یا پھر وہ بیوقوف ہے جسے نفع بخش تجارت کرنے کا طریقہ نہیں آتا۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسجدِ حرام میں باجماعت نماز پڑھنے کے ثواب یعنی ستائیس گنا کو ایک لاکھ سے ضرب دیا جائے گا یعنی مسجد حرام میں انفرادی نماز پڑھنے والے کو اگر ایک لاکھ نمازیں پڑھنے کا ثواب ملتا ہے تو باجماعت نماز پڑھنے والے کو ستائیس لاکھ نمازوں کے پڑھنے کا ثواب ہوگا اور سند صحیح سے یہ روایت ثابت ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز کا ثواب پچیس نمازوں کے برابر ہے اور وہی نماز اگر انسان جنگل میں پڑھے اور مکمل رکوع وسجدے کے ساتھ پڑھے تو اس کا ثواب

پچاس گنا ہو جاتا ہے، اسی مضمون کی ایک اور حدیث بھی منقول ہے جس میں رکوع وسجود کے ساتھ وضو کا بھی ذکر ہے اور عبدالرزاق کی حدیث میں مروی ہے کہ جو شخص جنگل میں اقامت کہہ کے نماز پڑھے تو اس کے ساتھ دو فرشتے نماز پڑھتے ہیں اور اگر اذان اور اقامت کہہ کر نماز پڑھے تو اس کے پیچھے اللہ کے لشکر اتنی بڑی تعداد میں نماز پڑھتے ہیں جن کے دونوں کناروں کو نہیں دیکھا جا سکتا اسی طرح عبدالرزاق ہی کی حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ اس کے ساتھ چار ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں اور اذان واقامت دونوں کہنے والے کے ساتھ چار لاکھ فرشتے نماز پڑھتے ہیں اور ابن مسیب فرماتے ہیں کہ اس کے پیچھے پہاڑوں کی طرح پھیلے ہوئے کثیر تعداد کے فرشتے نماز پڑھتے ہیں۔

جماعت ترک کرنے پر وعید

۱۰۵۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اٰمُرَ بِحَطَبٍ فَیُحْطَبَ ثُمَّ اٰمُرَ بِالصَّلٰوةِ فَیُؤَذَّنُ لَهَا ثُمَّ اٰمُرَ رَجُلًا فَیَؤُمُّ النَّاسَ ثُمَّ اُخَالِفَ اِلٰی رِجَالٍ وَفِیْ رِوَایَةٍ لَایَشْهَدُوْنَ الصَّلٰوةَ فَاُحَرِّقَ عَلَیْهِمْ بُیُوْتَهُمْ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْیَعْلَمُ اَحَدُهُمْ اَنَّهٗ یَجِدُ عِرْقًا سَمِیْنًا اَوْمِرْ مَاتَیْنِ حَسَنَتَیْنِ لَشَهِدَ الْعِشَاءَ۔ (رواه البخاری ولمسلم نحوه)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۴۵۱حدیث رقم (۲۵۱-۶۵۱) وأبوداؤد ۱/۳۷۱حدیث رقم ۵۴۸۔والترمذی ۱/۴۲۲حدیث رقم ۲۱۷۔والنسائی ۲/۱۰۷حدیث رقم ۸۴۸۔وابن ماجه ۱/۲۵۹حدیث رقم ۷۹۱۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں نے ارادہ کیا کہ کسی خادم کو لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں جب لکڑیاں جمع ہو جائیں تو (عشاء) کی نماز کے لئے اذان کہنے کا حکم دوں جب اذان ہو جائے تو کسی شخص کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے تو پھر میں ان لوگوں کی طرف جاؤں جو جماعت کی نماز کے لئے نہیں آتے اور ایک دوسری روایت میں اس طرح مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان لوگوں کے پاس جاؤں جو نماز میں حاضر نہیں ہوتے اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر کسی کو یہ معلوم ہو جائے کہ مسجد میں گوشت کی اچھی ہڈی یا گائے اور بکری کے دو اچھے کھر مل جائیں گے تو عشاء کی نماز میں وہ لوگ ضرور حاضر ہوں گے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''قوله وفی روایة لا یشهدون الصلوٰة''

مؤلف فرماتے ہیں صحیح بات یہ ہے کہ ''لا یشهدون الصلوٰة'' کے الفاظ اس روایت میں نہیں بلکہ دوسری روایت میں ہیں جیسا کہ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے لیکن صاحب مصابیح نے ان دونوں روایتوں کو ایک ہی بنا دیا ہے اسی سے ملتی جلتی ایک دوسری حدیث میں ''یصلون فی بیوتهم لیست بهم علة'' کے الفاظ بھی آتے ہیں جنہیں سامنے رکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وعید ترک نماز پر نہیں بلکہ بلاعذر جماعت چھوڑ دینے پر ہے۔

بعض حضرات کی رائے مطابق اس حدیث میں بیان کی گئی وعید سب لوگوں کو شامل ہے اور بعض علمائے کرام کی رائے کے

مطابق اس سے مراد زمانہ نبوی کے منافقین ہیں جیسا کہ ابن ملک نے نقل کیا ہے اور یہی دوسرا قول زیادہ واضح ہے اس لئے کہ عہد نبوی میں جماعت سے وہی آدمی پیچھے رہتا تھا جو منافق ہو اور اس کا نفاق ظاہر ہو یا جسے اپنے دین میں تردد اور شک ہو۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ابتدائے اسلام میں مال و دولت جلا کر بھی سزا دی جاتی تھی، بعض علمائے کرام کے مطابق اس بات پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ آگ کے ذریعے کسی کو کوئی سزا نہ دی جائے سوائے نماز سے پیچھے رہنے والے کے اور مالِ غنیمت میں خیانت اور دھوکہ بازی کرنے والے کے تاہم ان میں بھی جمہور علماء کرام کی رائے یہی ہے کہ ان کا ساز و سامان نہ جلایا جائے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے جماعت کے وجوب عین (فرض عین) ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس حدیث کا تعلق منافقین کے گروہ سے ہے تاہم امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد ظاہری جماعت سے نماز پڑھنے کے وجوب عین کے قائل ہیں لیکن علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات محل نظر ہے کیونکہ اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے خاص سبب کا نہیں اور حدیث کی عام الفاظ بھی اسی کی تائید کر رہے ہیں۔

عرقاً سميناً: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عرق سے مراد وہ ہڈی ہے جس پر گوشت لگا ہوا ہو۔ ابن ملک کی بھی یہی تحقیق ہے اور ان کی رائے کے مطابق سمین کو بطور وصف لانے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ فی نفسہ سمین ہو اور اس سے زیادہ گوشت حاصل ہو سکتا ہو جبکہ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ہڈی موٹی ہو تو اس میں چکنائی زیادہ ہوتی ہے جسے حاصل کرنے کیلئے اسے بڑی رغبت سے چبایا جاتا ہے۔

او مرماتين حسنتين: مِرماۃ میم کے کسرہ یا فتحہ کے ساتھ بکری کے کھر' کو کہتے ہیں بعض اہل لغت کے مطابق بکری کے کھروں کے درمیان جو گوشت ہوتا ہے اسے مرماۃ کہتے ہیں اور بعض حضرات کی تحقیق کے مطابق یہ اس ہڈی کو کہتے ہیں جس پر گوشت نہ ہو اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ اس چھوٹے تیر کو کہتے ہیں جس سے تیر اندازی سیکھی جاتی ہے یا تیر اندازی کے مقابلے میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہاں مرماتین کی صفت حسنتین لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انسان کی رغبت کی وضاحت ہو سکے۔ جبکہ شرح السنۃ کے مطابق اس لفظ کا ماخذ حسن ہے اور اس سے مراد کہنی کی وہ ہڈی ہے جو پیٹ سے ملی ہوئی ہوتی ہے اور کہنی کی جو ہڈی کندھے سے ملی ہوئی ہو اسے قبیح کہتے ہیں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حسنتین کا لفظ مرماتین سے بدل ہے جبکہ اس سے مراد وہ ہڈی ہو جس پر گوشت نہ ہو اگر اس سے مراد چھوٹے تیر ہوں تو پھر حسنتین اس کی صفت ہے اور جید تین کے معنی میں ہے۔

مقصد اس حدیث کا زجر و توبیخ ہے یعنی اگر کسی شخص کو یہ معلوم ہو جائے کہ نماز عشاء میں شرکت کرنے سے کچھ دنیاوی فائدہ بھی ملے گا تو اس میں وہ ضرور شرکت کرے اگرچہ وہ فائدہ انتہائی گھٹیا، حقیر اور معمولی ہی کیوں نہ ہو۔

باجماعت نماز کی فقہی وشرعی حیثیت کا تعین

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ''وجوب جماعت'' پر دلالت کرتی ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کا ظاہر

بھی جماعت کے فرض کفایہ ہونے پر دال ہے، گویا یہ حدیث ان کی دلیل ہے لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ یہ حدیث تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی تردید کرتی ہے کیونکہ اگر جماعت فرض کفایہ ہوتی ہے تو وہ لوگ کبھی مستحق عذاب نہ ہوتے جو جماعت ترک کر دیتے ہیں، حالانکہ اس کے تو آپ بھی قائل نہیں۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فرض کفایہ کا قول اختیار کرنے والا شاید یہ کہنا چاہتا ہے کہ جماعت کو فرض قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی شعار (نماز) کا اظہار ہو سکے اور یہ اظہار بعض لوگوں کے کرنے سے ہو جاتا ہے اسلئے جماعت فرض کفایہ ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ دلیل انتہائی ضعیف ہے، کیونکہ یہ بات تو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ عہد نبوی میں نماز باجماعت کی ادائیگی کا اہتمام کیا جاتا تھا، اس طرح کچھ لوگ تو جماعت میں شریک ہو ہی جاتے تھے، لیکن اس کے باوجود نماز باجماعت سے جان چرانے والوں کیلئے وعید سنائی گئی ہے اور انہیں آگ میں جلانے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ ادھر دوسری طرف نماز جنازہ جو کہ فرض کفایہ ہے، اسے ترک کرنے پر ایسی کوئی وعید نہیں سنائی گئی، اگر پنج وقتہ نماز باجماعت بھی فرض کفایہ ہوتی تو پھر اسے ترک کرنے پر ایسی سخت وعید نہ سنائی جاتی۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ قول نقل کرنے کے بعد یہ بھی کہا ہے کہ اکثر صحابۂ کرام علیہم الرضوان کا یہی مسلک ہے، لیکن ہماری رائے کے مطابق قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات بھی محل نظر ہے، اور قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی دلیل یہ حدیث بیان کی ہے کہ ہر وہ تین آدمی جو کسی گاؤں یا دیہات میں موجود ہوں اور نماز باجماعت ادا نہ کریں، تو شیطان ان پر غالب آجاتا ہے، اس لئے تم اجتماعیت کو لازم پکڑو، ورنہ چرواہے سے دور رہ جانے والی بکری کو بھیڑیا کھا جاتا ہے۔

اور شیطان کا غالب آنا کسی معصیت کی وجہ سے ہو سکتا ہے، جیسے ترک واجب، کیونکہ ترک سنت معصیت نہیں، اس لئے معلوم ہوا کہ جماعت فرض کفایہ ہے، ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی محولہ بالا حدیث تو اس بات کی دلیل ہے کہ جماعت فرض عین ہے، یا کم از کم واجب ہے جیسا کہ ہمارا مختار مذہب یہی ہے، یہ حدیث فرض کفایہ ہونے کی دلیل نہیں۔

نیز اس حدیث میں تین آدمیوں کی جو قید لگائی گئی ہے وہ اس لئے کہ جمعہ کے علاوہ دیگر نمازوں میں جماعت کیلئے کم از کم تین افراد کا ہونا ہی شرط ہے، قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آگے چل کر فرمایا ہے کہ باقی علماء کرام جماعت کو سنت قرار دیتے ہیں اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے اور ان کی دلیل اسی باب کی پہلی حدیث ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گھر میں بلا جماعت نماز پڑھنے کے صحیح ہونے سے اس کی فی الجملہ فضیلت ثابت نہیں ہوئی اور نہ ہی یہ حدیث اس کو مستلزم ہے اور ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کی نماز جماعت سے رہ جائے گی تو وہ نماز تو بہرحال پڑھے گا، اس لئے حدیثِ مذکور کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جماعت کی نماز گھر کی اس نماز سے افضل ہے جس کا گھر میں ادا کرنا صحیح بھی ہو، اگر یہ مطلقاً بلا جماعت اس کے صحیح ہونے کا تقاضا کرتی تو اس سے اس کے سنت ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکے گا۔ کیونکہ اتنی بات تو واضح ہے کہ جماعت نماز کے افعال میں سے نہیں ہے، اس لئے اس کا تارک گنہگار ہوگا، مفسد نہیں۔

پھر کچھ آگے چل کر ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مخالفین اس حدیث کا جواب یہ دیتے ہیں کہ آگ میں جلانے کی جو دھمکی اور وعید سنائی گئی ہے، اس کی وجہ ان کی لاپرواہی اور غفلت ہے جو وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے میں برتتے ہیں، لیکن یہ بات

صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیث کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ وعید ترک جماعت اور منافقین اور اسلام کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار رہنے والے افراد کی مشابہت کی وجہ سے سنائی گئی ہے۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد ظاہری کے نزدیک ''جماعت'' فرض عین ہے اور ان کی دلیل اسی حدیث کے ظاہری الفاظ ہیں، ان کے نزدیک ''جماعت'' صحت نماز کی شرط نہیں ہے، جبکہ بعض اہل ظواہر وجوب جماعت اور نماز کی صحت کیلئے اس کے شرط ہونے کے قائل ہیں۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حاصل اختلاف یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرض عین ہے، ہاں! اگر کوئی عذر ہو تو بات جدا ہے، یہی امام احمد، داؤد ظاہری، عطاء اور ابوثور کا مسلک ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ وغیرہ سے منقول ہے کہ جو شخص اذان سنے اور اس کا جواب نہ دے تو اس کی نماز نہیں ہوتی۔ (جواب نہ دینے سے مراد جماعت میں حاضر نہ ہونا ہے)۔ بعض حضرات جماعت کو فرض کفایہ مانتے ہیں، غایہ میں عامہ مشائخ کے حوالے سے وجوب کا قول منقول ہے، مفید میں بھی اسے واجب قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اسے سنت قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا وجوب سنت سے ثابت ہوا ہے۔ بدائع الصنائع میں ہے کہ عاقل، بالغ، آزاد اور جماعت پر قادر لوگوں کیلئے (جبکہ کوئی عذر نہ ہو) نماز باجماعت واجب ہے، لیکن اگر کسی شخص سے جماعت فوت ہو جائے تو اداءِ نماز کیلئے اس سے مسجد میں آنے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا (بلکہ جہاں اسے موقع ملے، وہیں اپنی نماز پڑھ لے) اور اس میں ہمارے علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

البتہ اگر کسی دوسری مسجد میں جماعت ملنے کا امکان ہو اور وہاں چلا جائے تو اچھی بات ہے اور اگر اپنے محلے کی مسجد میں ہی تنہا نماز پڑھ لے تب بھی کوئی حرج نہیں، امام قدوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر ایک سوال اٹھایا ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد کی جماعت کو چھوڑ کر کبھی کبھار اپنے گھر والوں کو جمع کر کے گھر ہی میں باجماعت نماز کا اہتمام کر لے تو کیا اسے جماعت کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ پھر خود ہی اس کا جواب نفی میں دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ بدعت اور مکروہ ہے، ہاں! اگر کوئی عذر ہو تو پھر گنجائش ہے۔ مثلاً ایسی بیماری لاحق ہو جس کی موجودگی میں تیمّم کرنا جائز ہو۔ ہاتھ پاؤں کا مخالف سمت سے کٹا ہوا ہونا، فالج زدہ ہونا، بادشاہ کے خوف سے روپوش ہونا، تنگدستی کی وجہ سے قرض خواہ کے خوف سے روپوش ہونا، چلنے پھرنے سے عاجز ہونا۔

معذورین کی اس فہرست میں شرح کنز کے مطابق امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نابینا کو بھی داخل فرماتے ہیں، اور بظاہر اس پر بھی سب ہی کا اتفاق ہے کیونکہ اندھے کے بارے میں علماء وفقہاء کے درمیان جو اختلاف پایا جاتا ہے، وہ جمعہ کی نماز سے متعلق ہے، جماعت کی نماز سے متعلق نہیں چنانچہ درایہ میں ہے کہ نابینا شخص پر، بارش کے موسم میں، سخت کیچڑ میں، سخت سردی میں اور گھٹا ٹوپ تاریکی میں نماز فجر کیلئے جماعت واجب نہیں ہے۔

نابینا آدمی کے لئے جماعت کی نماز میں حاضری ضروری ہے

۱۰۵۴: وَعَنْهُ قَالَ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ اَعْمٰى فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ لَيْسَ لِيْ قَائِدٌ يَقُوْدُنِيْ اِلَى الْمَسْجِدِ فَسَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّرَخِّصَ

لَهُ فَيُصَلِّيْ فِيْ بَيْتِهٖ فَرَخَّصَ لَهُ فَلَمَّا وَلّٰى دَعَاهُ فَقَالَ هَلْ تَسْمَعُ النِّدَاءَ بِالصَّلَاةِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَاَجِبْ. (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۳۷۴حديث رقم (۲۵۵-۶۵۳)-وأبوداؤد ۱/۳۷۴حديث رقم ۵۵۲-والنسائي ۲/۱۰۹حديث رقم ۸۵۰-وابن ماجه ۱/۳۶۰حديث رقم ۷۹۲-وأحمد في المسند۳/۴۲۳-

ترجمه:حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک نابینا آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ میرا ایسا کوئی قائد نہیں جو مجھے مسجد میں لے جائے پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ انہیں گھر میں نماز ادا کرنے کی اجازت دی جائے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اجازت دے دی جب وہ واپس لوٹنے لگے تو آپ نے اسے پھر بلایا اسے کہا تم اذان کی آواز سنتے ہو انہوں نے عرض کی جی ہاں پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے لئے مسجد میں آنا ضروری ہے۔(مسلم)

تشریح: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث وجوب جماعت کی دلیل ہے، اور بعض علماء کرام اسے ترغیب وتحریص پر محمول کرتے ہوئے آنے والے صحابیؓ کے حالات کے زیادہ مناسب قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کا شمار فضلاء مہاجرین میں ہوتا تھا، اور نبی ﷺ کا انہیں رخصت دے کر پھر واپس لے لینا یا تو وحی کی وجہ سے تھا، یا تبدیلیٔ اجتہاد ورائے کی وجہ سے۔ بظاہر نبی ﷺ نے پہلے تو ان نابینا صحابیؓ کو مطلق جواب دے دیا، لیکن بعد میں اس جواب کو ''عدم سماع'' کی قید سے مقید فرمادیا کہ اگر تم اذان کی آواز نہیں سنتے، تب تو یہی حکم ہے ورنہ تمہیں جماعت میں شرکت کرنی چاہیے۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے یہ جاننے کے باوجود کہ ان نابینا صحابی کو مسجد میں لانے والا کوئی نہیں ہے انہیں رخصت اس لئے نہیں دی کہ آپ جانتے تھے کہ وہ کسی قائد کے بغیر مسجد میں آنے پر قادر ہیں یا اس سے جماعت کی تاکید مقصود تھی اسی وجہ سے امام ابوثور اس حدیث سے وجوبِ جماعت پر استدلال کرتے ہیں۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ سے یہ روایت منقول ہے کہ انہوں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ میں نابینا ہوں، میرا گھر دور ہے، مجھے مسجد میں کوئی لانے والا نہیں، کیا مجھے آپ اس بات کی اجازت دیں گے کہ میں گھر میں نماز پڑھ لیا کروں؟ نبی ﷺ نے پوچھا کیا تمہیں اذان کی آواز آتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں! فرمایا پھر میں تمہارے لئے اس میں کوئی رخصت نہیں پاتا۔

یہ روایت امام ابوداؤد، احمد اور حاتم وغیرہ نے نقل کی ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ تمہارے سلسلے میں کوئی ایسی رخصت میں نہیں پاتا کہ جماعت میں حاضر ہوئے بغیر تمہیں جماعت کی فضیلت حاصل ہو جائے اس سے نابینا آدمی پر وجوب جماعت کیلئے استدلال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ خود نبی ﷺ نے ہی عتبان بن مالک کو نابینا ہونے کی وجہ سے ترکِ جماعت کی رخصت دی تھی۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے جماعت کے فرض عین ہونے پر استدلال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے، کہ جماعت عذر کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہے، نیز صحیحین کی روایت بھی اس کی دلیل ہے کہ جب حضرت عتبانؓ نے اپنی نظر کی کمزوری کی شکایت کی تو نبی ﷺ نے انہیں ان کے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت مرحمت

فرمائی۔

لیکن حافظ صاحب کی یہ بات محل نظر ہے کیونکہ عذر کے باوجود جماعت کے فرضِ عین ہونے کا تو کسی نے دعویٰ نہیں کیا اور اس کی تائید حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو پیچھے گذر چکا۔

"من سمع النداء فلم یأتہٖ فلا صلوٰۃ لہٗ الا من عذر"

اور یہ دونوں حدیثیں بھی اسی کی تائید کرتی ہیں اور اگر کوئی یہ کہے کہ مندرجہ ذیل دونوں حدیثیں ضعیف ہیں۔

① "لا صلوٰۃ لجار المسجد الا فی المسجد"۔

② "من تخلف عن الجماعۃ لغیر عذر لم تقبل صلوتہ"۔

تو ہمارے لئے مسئلہ واضح ہے کہ ہمارے ائمہ فرضیتِ جماعت کے قائل ہیں بلکہ وجوب جماعت کے قائل ہیں کیونکہ اس کیلئے ہمارے پاس کوئی قطعی دلیل نہیں صرف ظنی دلیل ہے۔

بارش اور سخت سردی میں گھر میں نماز پڑھ لینا جائز ہے

۱۰۵۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّہٗ اَذَّنَ بِالصَّلٰوۃِ فِیْ لَیْلَۃٍ ذَاتِ بَرْدٍ وَرِیْحٍ ثُمَّ قَالَ اَلَا صَلُّوْا فِی الرِّحَالِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ کَانَ یَاْمُرُ الْمُؤَذِّنَ اِذَا کَانَتْ لَیْلَۃٌ ذَاتُ بَرْدٍ وَمَطَرٍ یَقُوْلُ اَلَا صَلُّوْا فِی الرِّحَالِ۔

(متفق علیہ)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۱۵٦ حدیث رقم ٦٦٦۔ ومسلم ۱/٤٨٤ حدیث رقم (۲۲۔٦٩٧)۔ وأبوداوٗد فی السنن ۱/٦٤۲ حدیث رقم ۱۰٦٣۔ والنسائی ۲/۱۵ حدیث رقم ٦۵٤۔ وابن ماجه ۱/۳۰۲ حدیث رقم ٩٣٦۔ والدارمی ۱/۳۲٨ حدیث رقم ۱۲٧۵۔ و مالك فی الموطأ ۱/٧٣ حدیث رقم ۱۰ من کتاب الصلاة۔ وأحمد فی المسند ۲/٧٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک رات جب کہ شدید سردی اور ہوا تھی نماز کے لئے اذان دی اور فرمایا کہ اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھو اور پھر فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سخت سردی والی اور اور بارش والی رات میں مؤذن کو حکم دیتے تھے کہ وہ اپنی اذان میں یہ اعلان کردے۔ **الا صلوا فی الرحال**۔ سن لو اپنے اپنے گھروں میں نماز ادا کرو۔ (بخاری۔ مسلم)

تشریح: علامہ ابن ہمام، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ سخت کیچڑ میں جماعت کیلئے آنے کا کیا حکم ہے؟ تو فرمایا مجھے جماعت کا چھوڑنا پسند نہیں ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ مؤطا میں فرماتے ہیں کہ اگرچہ احادیث سے رخصت بھی ثابت ہوتی ہے اور اس سے مراد نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ جب جوتیاں تر بتر ہوجائیں تو اپنے اپنے ٹھکانے پر نماز پڑھ لو۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم کی یہ روایت بھی کسی کی موافقت میں ہے۔

صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ سفر پر نکلے راستے میں بارش شروع ہوگئی نبی ﷺ نے فرمایا جو

چاہے وہ اپنے اپنے مقام پر ہی نماز پڑھ لے، اسی طرح یہ روایت بھی سند صحیح کے ساتھ ثابت ہے کہ حدیبیہ والے زمانے میں ہم نبی ﷺ کے ساتھ ایک سفر پر تھے کہ اچانک بارش شروع ہوگئی لیکن وہ اتنی تھوڑی اور ہلکی تھی کہ اس سے ہمارے جوتوں کے تلوے بھی پوری طرح گیلے نہیں ہوئے تو نبی ﷺ کے منادی نے یہ ندا لگائی ''صلّوا فی رحالکم''۔

جب جماعت کے وقت کھانا آجائے تو پہلے کھانا کھالیا جائے

۱۰۵۶: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا وُضِعَ عَشَاءُ اَحَدِكُمْ وَاُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ فَابْدَءُ وْا بِالْعَشَاءِ وَلَا يَعْجَلْ حَتّٰى يَفْرُغَ مِنْهُ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يُوْضَعُ لَهُ الطَّعَامُ وَتُقَامُ الصَّلَاةُ فَلَا يَأْتِيْهَا حَتّٰى يَفْرُغَ مِنْهُ وَاِنَّهٗ لَيَسْمَعُ قِرَاءَةَ الْاِمَامِ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۱۵۹حدیث رقم ۶۷۳۔ومسلم ۱/۳۹۴حدیث رقم (۶۶۔۵۵۹)۔والترمذی فی السنن ۲/۱۸۴حدیث رقم ۳۵۳۔والنسائی فی السنن۲/۱۱۱حدیث رقم ۸۵۳۔وأخرجه ابن ماجه ۱/۳۰۱حدیث رقم ۹۳۵۔والدارمی ۱/۳۳۰حدیث رقم ۱۲۸۰۔وأحمد فی المسند ۶/۴۰۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کے سامنے رات کا کھانا آجائے اور دوسری طرف نماز کے لئے تکبیر کہی جائے تو وہ کھانا شروع کر دے اور کھانا کھانے میں جلدی بھی نہ کرے بلکہ اطمینان سے کھائے حضرت عبداللہ بن عمر کے سامنے جب کھانا رکھ دیا جاتا تھا اور نماز شروع ہو جاتی تو کھانے سے فارغ ہو کر پھر نماز کیلئے جاتے تھے۔اور (وہ کھانے کے دوران) امام کی قراءت بھی سنتے رہتے تھے۔ (بخاری،مسلم)

تشریح: اس حدیث میں اکثر شوافع کے اس قول کی تردید پائی جاتی ہے جس کے مطابق اگر کسی آدمی کو سخت بھوک لگ رہی ہو کھانا موجود ہو اور نماز کا وقت بھی آگیا ہو تو اسے اتنے لقمے کھالینے چاہیے جس سے اس کی بھوک ٹوٹ جائے باقی کھانا نماز کے بعد کھانا چاہیے۔ جبکہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم وغیرہ میں اس قول کی تصویب فرمائی ہے کہ ایسا شخص اپنی ضرورت کو پہلے پورا کرے اور مکمل کھانے سے فراغت پائے پھر نماز کو جائے اور دلیل کے طور پر اسی حدیث کو پیش کیا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ''لا یعجل'' اور ''فابدؤا'' میں بظاہر کوئی مناسبت نہیں ہے کیونکہ **فابدؤوا** جمع پر اور **لا یعجل** مفرد پر دلالت کرتا ہے لیکن یہ کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ جمع کے ذریعے جو حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق مخاطبین سے ہے اور مفرد کے ذریعے جو حکم دیا گیا ہے وہ ان مخاطبین میں سے ایک کے ساتھ متعلق ہے علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے۔

لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ یہ توجیہہ اسی صورت میں صحیح ہوسکتی تھی جب ''فابدؤا بالعشاء'' کا لفظ عین کے کسرے کے ساتھ ہوتا حالانکہ تمام نسخ اسے مفتوح العین قرار دینے پر متفق ہیں اس لئے واضح بات یہ ہے کہ جمع حاضر کا صیغہ عمومیتِ حکم کا فائدہ دینے کیلئے ہے یعنی یہ بتانے کیلئے ہے کہ یہ حکم کسی ایک شخص کے ساتھ خاص نہیں ہے یا یہ مراد ہے کہ کھانا بھی کھالے اور کوشش کر کے باجماعت نماز ادا کرنے کی فضیلت بھی حاصل کر لے۔

میرک تصحیح کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ انسان کو بہت زیادہ بھوک لگ رہی ہو، کھانے

کی شدید رغبت ہو اور وقت میں گنجائش بھی ہو اس سلسلے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ میرا سارا کھانا نماز بن جائے بنسبت اس کے میری ساری نماز کھانا بن جائے۔

اگر کسی کو بول و براز کی حاجت ہو تو نماز سے پہلے اس کو پورا کیا جائے

۱۰۵۷: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا صَلٰوةَ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ وَلَا هُوَ يُدَافِعُهُ الْاَخْبَثَانِ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۳۹۳ حدیث رقم (۶۷-۵۶۰)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کھانا حاضر ہونے کی صورت میں نماز کامل نہیں ہوتی اور نہ ہی اس وقت نماز ادا کرنا صحیح ہوتا ہے جب بول و براز کی ضرورت اس توجہ کو ختم کر دے۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں ''اخبثان'' سے مراد پیشاب اور پاخانہ ہے، علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کھانے کی موجودگی میں نماز پڑھنے کی کراہت اس لئے ہے کہ اگر اس صورت میں وہ نماز پڑھنے شروع کر دے تو ذہن پھر بھی کھانے کی طرف ہی لگا رہے گا اور یوں نماز سے خشوع وخضوع مکمل طور پر رخصت ہو جائے گا۔ اسی طرح بول و براز کی شدید ضرورت اور تقاضے کے وقت میں نماز پڑھنے کی کراہت بھی اسی وجہ سے ہے، اور یہی حکم ہے ان کے تمام صورتوں کا جو اس سے ملتی جلتی ہیں، لیکن یہ اسی صورت میں ہے جبکہ وقت میں کچھ گنجائش ہو، اور اگر وقت تنگ ہو تو پھر احترامِ وقت کے پیش نظر نماز میں مشغول ہو جائے اور کھانا بعد میں کھائے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہیں سے ہمارے اکثر ائمہ نے یہ مسئلہ بھی مستنبط کیا ہے کہ ان مذکورہ امور میں سے کسی ایک کا بھی شدید تقاضا ہونے کی صورت میں نماز پڑھنا مکروہ ہے گو کہ جماعت فوت ہو جانے کا اندیشہ ہی کیوں نہ ہو، اور ایک گروہ نے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی نقل فرمایا ہے کہ اگر اس حال میں نماز پڑھنے کی وجہ سے خشوع وخضوع رخصت ہو جائے تو ایسا کرنا حرام اور مفسدِ نماز ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔

''لا يحل لمؤمن يؤمن باللّٰه واليوم الآخر ان يصلي وهو حاقن حتى يتخفف''

''کسی مؤمن کیلئے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، حلال نہیں ہے کہ بول و براز کی حاجت کو دبا کر نماز پڑھے، تا آنکہ اس سے ہلکا نہ ہو جائے''۔

لیکن متقدمین نے اسے شدید تقاضے پر محمول کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر اس کا غالب گمان یہ ہو کہ پیشاب وغیرہ روکنے سے طبعی اور طبی طور پر نقصان ہوگا تو اسے روکنا اور دبانا حرام ہے۔

جب فرض نماز شروع ہو جائے تو دوسری کوئی نماز جائز نہیں

۱۰۵۸: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ فَلَا صَلٰوةَ

إِلَّا الْمَكْتُوبَةُ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۴۹۳ حديث رقم (۶۳۔۷۱۰)۔ وأبوداؤد ۲/۵۰ حديث رقم ۱۲۶۶۔ والترمذي ۱/۲۸۲ حديث رقم ۴۲۱۔ والنسائي ۲/۱۱۶ حديث رقم ۸۶۵۔ وابن ماجه ۱/۳۶۴ حديث رقم ۱۱۵۱۔ والدارمي ۱/۴۰۰ حديث رقم ۱۴۴۸۔ وأحمد في المسند ۲/۳۳۱۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب نماز کھڑی ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی دوسری نماز جائز نہیں۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث کی شرح میں مظہر فرماتے ہیں کہ مؤذن جب اقامت کہنے لگے تو نمازی کیلئے فجر کی سنتیں پڑھنا بھی جائز نہیں ہے بلکہ اسے چاہیے کہ فرائض میں امام کے ساتھ شمولیت اختیار کرے، اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اگر نمازی کو یہ یقین ہو کہ فجر کی سنتیں پڑھنے کے باوجود وہ امام کو پہلی یا دوسری رکعت میں پا لے گا تو اسے چاہیے کہ پہلے فجر کی سنتیں پڑھے، پھر امام کے ساتھ شامل ہو۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ فجر کی سنتوں کی اس اَمر سے تخصیص کر لی گئی ہے اور اس کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ فجر کی سنتیں ضرور پڑھا کرو، اگرچہ تمہیں گھوڑے روند ہی کیوں نہ دیں۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ اگر دوسری رکعت کے فوت ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو تو فجر کی سنتیں پڑھ لی جائیں اور اگر اندیشہ ہو تو انہیں ترک کر دیا جائے تاکہ دونوں دلیلوں پر عمل ہو جائے، مذکورہ روایت کے الفاظ ابوداؤد شریف میں یوں ہیں:۔

"لا تدعوها وان طردتكم الخيل"

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فجر کی سنتیں دوسری نمازوں کی سنتوں کی نسبت زیادہ قوی ہیں، ان کی قوت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حسن نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر کوئی شخص بلا عذر یہ سنتیں بیٹھ کر پڑھے تو یہ ناجائز ہے۔ اسی طرح دیگر علماء وفقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی عالم عوام الناس کیلئے حصول فتویٰ کا مرجع ومرکز ہو تو لوگوں کی ضروریات کی تکمیل اور مسائل حل کرنے کی خاطر وہ ہر نماز کی سنتیں چھوڑ سکتا ہے لیکن فجر کی سنتیں ترک کرنے کی اسے بھی اجازت نہیں ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ مضبوط اور قوی سنتیں ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر فجر کی سنتوں اور فرضوں دونوں کی فضیلت کو اکٹھے حاصل کرنا ممکن ہو تو بہت اچھا، ورنہ فرائض کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ سنتوں کی نسبت جماعت کے ساتھ فرائض بہرحال زیادہ راجح ہیں، اس لئے کہ فرائض کا ثواب ۲۷ گنا ہوتا ہے جبکہ سنتوں کا ثواب صرف اپنا ذاتی ہی ہوتا ہے، اور ترک جماعت پر جو وعید سنائی گئی ہے اس کی موجودگی میں سنتوں کی بجائے فرائض میں شرکت زیادہ ضروری ہے۔

اگر کسی شخص کی سنتیں پڑھنے کی صورت میں یہ امید ہے کہ وہ تشہد میں امام کے ساتھ مل جائے گا۔ تو شیخین کے نزدیک اس کا حکم ایسا ہی ہے جیسے ایک رکعت پالینے کا (یعنی جائز ہے) اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا کوئی اعتبار نہیں اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کو جمعہ کی نماز میں صرف تشہد ملنے کی امید ~~مسلم فقیہ~~ اسماعیل الزاہد سے جو یہ منقول ہے کہ اس موقع پر یہ طریقہ اختیار کرنا

چاہیے کہ پہلے فجر کی سنتیں شروع کر دے، پھر درمیان میں پہنچ کر انہیں توڑ دے، ایسا کرنے سے اس پر ان سنتوں کی قضاء واجب ہو جائے گی (کیونکہ نوافل شروع کرنے کے بعد لازم ہو جاتے ہیں) اور یوں وہ نماز کے بعد انہیں ادا کر سکے گا۔ لیکن امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے اس قول کو رد کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ محض شروع کر لینے سے جو نوافل انسان پر واجب ہو جاتے ہیں، وہ سنت کے ذریعے واجب ہونے والے نوافل سے زیادہ قوی نہیں ہوتے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ منذور نوافل کو بھی نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے ادا نہیں کیا جا سکتا اور دوسری خرابی یہ ہے کہ اس میں عبارت کو شروع ہی اس نیت سے کیا جا رہا ہے کہ وہ اس کو فاسد اور ختم کر دے گا، اور اس کا غلط اور گناہ ہونا واضح ہے۔

اگر کوئی صاحب یہ کہیں کہ ایسا اس لئے کیا جا رہا ہے کہ بعد میں وہ دوبارہ انہیں اداء کر سکے؟ تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ قصداً کسی عمل کو باطل کرنا منہی عنہ ہے اور فساد کا دروازہ بند کرنا جلب مصلحت پر مقدم ہوتا ہے اس لئے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

عورتوں کے مسجد میں جانے کا حکم

۱۰۵۹: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَأْذَنَتِ امْرَأَةُ اَحَدِكُمْ اِلَى الْمَسْجِدِ فَلَا يَمْنَعْهَا۔ (متفق علیه)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۳۲۹ حديث رقم (۶۳-۷۱۰)۔ وأبوداؤد ۲/۵۰ حديث رقم ۱۲۶۶۔ والترمذى ۱/۲۸۲ حديث رقم ۴۲۱۔ والنسائى ۲/۱۱۶ حديث رقم ۸۶۵۔ وابن ماجه ۱/۳۶۴ حديث رقم ۱۱۵۱۔ والدارمى ۱/۴۰۰ حديث رقم ۱۴۴۸۔ وأحمد فى المسند ۲/۳۳۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کی عورت مسجد میں جانے کی اجازت طلب کرے تو وہ اسے نہ روکے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم میں فرماتے ہیں عورتوں کو مسجد میں جماعت کے ساتھ شرکت کرنے کی ممانعت پر مشتمل یہ نہی کراہت تنزیہی کیلئے ہے اور بقول امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے تمام علماء کا یہی قول ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام نووی اور علامہ زرکشی کے قول کی وضاحت یہ ہے کہ جہاں عورتوں کے نکلنے میں مسجد یا راستے میں مردوں کے ساتھ اختلاط کا اندیشہ ہو یا عورتوں کے زیب و زینت اختیار کرنے کی وجہ سے فتنے کا قوی اندیشہ ہو تو عورتوں کیلئے نکلنا حرام ہے، اگر یہ صورتیں نہ ہوں تو پھر انہیں اجازت دی جا سکتی ہے تاہم امام یا نائب امام کے ذمے ضروری ہے کہ وہ انہیں اپنے گھر ہی میں نماز پڑھنے کے فضائل سے آگاہ کرے۔

مظہر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ عورتوں کا نماز کیلئے مسجد جانا جائز ہے لیکن فی زمانہ مکروہ ہے جس کی وجہ ابن ملک کے بقول فتنہ ہے۔

شیخین کی وہ روایت بھی اس کی مؤید ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزوں کو دیکھ لیتے جو عورتوں نے نکال لی ہیں تو انہیں مسجد میں آنے سے روک دیتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا اسی طرح بیہقی

کی وہ روایت بھی اسی کی تائید کرتی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عورتوں کو نکلنے سے منع کیا گیا ہے، اگر کوئی عورت بوڑھی ہو چکی ہو اور وہ گھر کے عام استعمال کے کپڑوں میں نماز کیلئے آنا چاہے تو گنجائش ہے۔

گوکہ یہ ایک صحابی کا قول ہے لیکن حکماً یہ مرفوع حدیث کے زمرے میں آتا ہے اس لئے حدیث میں جو عام ممانعت آئی ہے اس سے اس کی تخصیص کی جاسکتی ہے، مسلم شریف کی یہ حدیث بھی اسی کی تائید کرتی ہے کہ اللہ کی باندیوں کو مسجد میں آنے سے نہ روکو، امام ابوداؤد نے اس کے بعد یہ جملہ بھی زائد نقل کیا ہے لیکن عورتوں کو چاہیے کہ یہ نماز کیلئے اس حلیہ میں نکلیں کہ کسی قسم کی زیب وزینت نہ کریں اور نہ ہی عطر لگائیں۔

نیز مسلم شریف ہی میں یہ روایت بھی آتی ہے کہ جب تمہاری عورتیں رات کے وقت مسجد میں آنے کی اجازت طلب کریں تو تم انہیں اجازت دے دیا کرو۔

عورت جب گھر سے باہر نکلے تو خوشبو استعمال نہ کرے

۱۰۶۰: وَعَنْ زَيْنَبَ امْرَأَةِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَتْ قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا شَهِدَتْ اِحْدَاكُنَّ الْمَسْجِدَ فَلَا تَمَسَّ طِيْبًا۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۴۹۳حدیث رقم (۶۳۔۷۱۰)۔وأبوداوٗد ۲/۵۰حدیث رقم ۱۲۶۶۔والترمذی ۱/۲۸۲ حدیث رقم ۴۲۱۔والنسائی ۲/۱۱۶حدیث رقم ۸۶۵۔وابن ماجه۱/۳۶۴حدیث رقم ۱۱۵۱۔ والدارمی ۱/۴۰۰حدیث رقم ۱۴۴۸۔وأحمد فی المسند ۲/۳۳۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت زینبؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کہا جب تم میں سے کوئی خاتون مسجد میں جائے تو وہ خوشبو استعمال نہ کرے۔ (مسلم)

عورت خوشبو لگا کر عشاء کی نماز کے لئے نہ آئے

۱۰۶۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّمَا امْرَأَةٍ اَصَابَتْ بَخُوْرًا فَلَا تَشْهَدْ مَعَنَا الْعِشَآءَ الْاٰخِرَةَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۳۲۸حدیث رقم (۱۴۳۔۴۴۳)۔وأبوداوٗد فی السنن ۴/۴۰۱حدیث رقم ۴۱۷۵۔والنسائی ۱/۱۵۴حدیث رقم ۵۱۲۸۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو عورت خوشبو لگائے تو وہ ہمارے ساتھ عشاء کی نماز میں شریک نہ ہو۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں عطر لگا کر عشاء آخرہ میں عورتوں کی آنے کی جو ممانعت کی گئی ہے اس کے ذریعے مغرب کو نکالنا مقصود ہے اور عشاء کے وقت مسجد میں آنے کی ممانعت ابن ملک کے بقول اس وجہ سے کی گئی ہے کہ اس وقت اندھیرا چھا چکا ہوتا ہے راستے میں سناٹا ہوتا ہے اور عطر نفسانی خواہشات کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس لئے اندیشہ ہے کہ عورت اس وقت میں

فتنے سے محفوظ نہ رہ سکے گی بخلاف فجر اور مغرب کے کہ ان دونوں وقتوں میں روشنی ہوتی ہے اور یہ بات پہلے بھی گذر چکی ہے کہ عورت کا مطلقاً خوشبو لگا کر مسجد میں آنا منع ہے خواہ کوئی بھی نماز ہو۔

الفصل الثانی:

عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکو

۱۰۶۲: عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَا تَمْنَعُوْا نِسَاءَ کُمُ الْمَسَاجِدَ وَبُیُوْتُھُنَّ خَیْرٌ لَّھُنَّ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/۳۸۲ حدیث رقم ۵۶۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم اپنی عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع نہ کرو لیکن ان کے گھر ان کے لئے بہتر ہیں۔ (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث سے علماء کرام نے حج وعمرے کے طواف کو مستثنٰی قرار دیا ہے کیونکہ ظاہر ہے طواف گھر میں نہیں ہو سکتا۔

عورت کی نماز بند کمرے میں افضل ہے

۱۰۶۳: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَلَاۃُ الْمَرْأَۃِ فِیْ بَیْتِھَا اَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِھَا فِیْ حُجْرَتِھَا وَصَلَاتُھَا فِیْ مَخْدَعِھَا اَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِھَا فِیْ بَیْتِھَا۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد ۱/۳۸۳ حدیث رقم ۵۷۰۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا عورت کا گھر کے اندر نماز پڑھنا صحن میں نماز پڑھنے سے افضل ہے اور بند کوٹھری میں نماز پڑھنا گھر میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث میں ابن ملک کے مطابق حجرے سے مراد وہ کمرہ ہے جس کی طرف گھر کے دروازے کھلتے ہوں اور مخدع سے مراد بڑے گھر میں وہ چھوٹا کمرہ ہے جس میں قیمتی چیزوں کو چوری وغیرہ کے ڈر سے محفوظ کر کے رکھا جاتا ہے اور حدیث میں مذکور حکم پردے پر مبنی ہے۔

خوشبو لگا کر مسجد میں جانے والی عورت کی نماز قبول نہیں ہوتی

۱۰۶۴: وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ اِنِّیْ سَمِعْتُ حِبِّیْ اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ لَا تُقْبَلُ صَلَاۃُ امْرَأَۃٍ تَطَیَّبَتْ لِلْمَسْجِدِ حَتّٰی تَغْتَسِلَ غُسْلَھَا مِنَ الْجَنَابَۃِ۔ (رواہ ابوداود وروی احمد والنسائی نحوہ)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۴/۴۰۱ حدیث رقم ۴۱۷۴۔ والنسائي ۸/۱۵۳ حدیث رقم ۵۱۲۷۔ وابن ماجه

۱۳۲۶/۲ حدیث رقم ۴۰۰۲۔وأحمد فی المسند ۲/ ۲۴۶۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس عورت کی نماز قبول نہیں ہوتی جو مسجد میں جانے کے لئے خوشبو لگائے سوائے اس کے کہ اس خوشبو کو غسل کر کے دور کرے جس طرح جنابت سے غسل کیا جاتا ہے۔(ابوداؤد) امام احمدؒ اور امام نسائیؒ نے بھی اسی طرح کی نقل کیا ہے۔

تشریح: اس حدیث میں جو فرمایا گیا ہے کہ کسی ایسی عورت کی نماز قبول نہیں ہوتی جو مسجد میں خوشبو لگا کر بہائے تاکہ خوشبو زائل ہو جائے لیکن یہ حکم اسی صورت میں ہے کہ جب خوشبو پورے جسم پر لگائی گئی ہو اور اگر کسی ایک عضو پر خوشبو لگائی ہو تو صرف اسی حصے کو اچھی طرح دھو لینا چاہیے۔ اور اگر اپنے کپڑوں کو خوشبو لگائی ہو تو وہ کپڑے تبدیل کر لے یا پھر اس خوشبو زائل کر دے۔

یہ تمام تفصیل اس صورت میں ہے جبکہ عورت مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے جانا بھی چاہے بصورت دیگر اسے خوشبو لگانے کی ممانعت نہیں ہے اور ابن ملک کے مطابق ویسے بھی یہ حدیث کا زجر و توبیخ میں مبالغہ پر محمول ہے کیونکہ اس سے نفس کا تقاضا شدید ہوتا ہے اور فتنوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

خوشبو لگا کر مجلس میں جانے والی عورتوں کے لئے وعید

۱۰۶۵:وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ کُلُّ عَیْنٍ زَانِیَۃٌ وَاِنَّ الْمَرْأَۃَ اِذَا اسْتَعْطَرَتْ فَمَرَّتْ بِالْمَجْلِسِ فَھِیَ کَذَا وَکَذَا یَعْنِیْ زَانِیَۃٌ۔ (رواہ الترمذی ولابی داود والنسائی نحوہ)

أخرجہ أبوداؤد فی السنن ۴/ ۴۰۰ حدیث رقم ۴۱۷۳۔والترمذی فی السنن ۵/ ۹۸ حدیث رقم ۲۷۸۶۔وأحمد فی المسند ۴/ ۴۱۳۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر آنکھ گناہ کرنے والی ہے جو عورت خوشبو لگا کر مجلس سے گزرے تو وہ ایسی اور ایسی ہے یعنی زانیہ ہے۔(ترمذی) امام ابوداؤدؒ اور امام نسائیؒ نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔

تشریح: اس حدیث مبارکہ میں جو ہر آنکھ کو زانیہ قرار دیا گیا ہے اس سے مراد کسی اجنبیہ کی طرف شہوت سے نظر کرنے والی آنکھ ہے کیونکہ آنکھوں کی بدکاری دیکھنا ہے یا یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ نظر مقدمات میں زنا میں سے ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ ہر آنکھ میں میں خوبصورت چیزوں کی طرف دیکھنے کی طاقت رکھی گئی ہے خاص طور پر اگر وہ معطر بھی ہو تو اس سے نفس کے متوجہ ہونے اور اس کی خواہشات میں مزید اضافہ ہوتا ہے جو عام طور پر انسان کو گناہ کے دروازے پر پہنچا ہی کے چھوڑتا ہے جب تک کہ نفس کی اس خواہش کو ریاضت، مجاہدے اور سب سے بڑھ کر اللہ کی توجہ اور عنایت کے ذریعے جڑ سے اُکھاڑ کر نہ پھینک دیا جائے۔

فھی کذا و کذا: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ عدد سے کنایہ ہے یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وہ خصائل ذمیمہ شمار کروائیں جو مستلزم ذمہ ہیں اور مراد اس سے بدکار ~~عورت ہے~~ کیونکہ اس نے اپنے آپ کو معطر کرتے لوگوں کی خواہشات کو برانگیختہ

کیا اور انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اس کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھیں انہیں تو زنا بالعین کا گناہ ہوا اور اس عورت کو زنا بالعین کے سبب بننے کا گناہ ہوگا۔ اس اعتبار سے وہ بھی زانیہ ہی ہے یا اس جیسی ہے۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں انتہائی شدید مبالغہ کے ساتھ عورتوں کو عطر لگا کر گھروں سے باہر نکلنے سے منع کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض نگاہیں اللہ تعالیٰ کے کرم اور مہربانی سے انہیں دیکھنے سے محفوظ رہتی ہیں۔

منافقین کے لئے جماعت مشکل ہوتی ہے

۱۰۶۶: وَعَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمًا الصُّبْحَ فَلَمَّا سَلَّمَ قَالَ اَشَاهِدٌ فُلَانٌ قَالُوْا لَا قَالَ اَشَاهِدٌ فُلَانٌ قَالُوْا لَا قَالَ اِنَّ هَاتَيْنِ الصَّلَاتَيْنِ اَثْقَلُ الصَّلَوَاتِ عَلَى الْمُنَافِقِيْنَ وَلَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا فِيْهِمَا لَاَتَيْتُمُوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا عَلَى الرُّكَبِ وَاِنَّ الصَّفَّ الْاَوَّلَ عَلٰى مِثْلِ صَفِّ الْمَلَائِكَةِ وَلَوْ عَلِمْتُمْ مَا فَضِيْلَتُهٗ لَابْتَدَرْتُمُوْهُ وَاِنَّ صَلَاةَ الرَّجُلِ مَعَ الرَّجُلِ اَزْكٰى مِنْ صَلَاتِهٖ وَحْدَهٗ وَصَلَاتُهٗ مَعَ الرَّجُلَيْنِ اَزْكٰى مِنْ صَلَاتِهٖ مَعَ الرَّجُلِ وَمَا كَثُرَ فَهُوَ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ۔ (رواه ابوداود والنسائی)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۱/ ۳۷۵ حديث رقم ۵۵۴۔ والنسائي ۲/ ۱۰۵ حديث رقم ۸۴۳۔

ترجمہ: حضرت ابی ابن کعبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیر کر فارغ ہوئے تو پوچھا کیا فلاں شخص حاضر ہے صحابہؓ نے عرض کیا نہیں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے آدمی کا نام لے کر پوچھا کیا فلاں ہے صحابہؓ نے عرض کیا نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام نمازوں میں سے فجر اور عشاء کی نماز منافقین پر بہت مشکل ہوتی ہیں۔ اگر تم لوگ جان لیتے ان دو نمازوں کا کتنا ثواب ہے تو تم دوڑ کر اور گھٹنوں کے بل آتے اور پہلی صف فرشتوں کی صف کی طرح ہے اگر تم پہلی صف کی فضیلت جان لو تو اس میں شامل ہونے کے لئے جلدی پہنچنے کی کوشش کرو اور آدمی کا ایک آدمی کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا اکیلے نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور دو آدمیوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھنا ایک آدمی کے ساتھ نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور جس قدر جماعت کے افراد کی تعداد زیادہ ہوگی تو اتنا ہی یہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔ (ابوداود، نسائی)

تشریح: اس حدیث مبارکہ میں جن دو نمازوں کو منافقین کیلئے بھاری قرار دیا گیا، وہ فجر اور عشاء کی نمازیں ہیں، اور اس کی وجہ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق یہ ہے کہ ان میں سے ایک نیند کی ابتداء میں واقع ہے اور دوسری نیند کی انتہاء میں۔ نیز ان دو نمازوں سے مراد نمازِ فجر کی دو رکعتیں بھی ہوسکتی ہیں اور یہ بھی بعد از قیاس نہیں کہ اس سے فجر کی سنتیں اور فرض مراد ہوں۔

فائدہ: احقر مترجم عرض کرتا ہے کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی ذکر کردہ آخری دو توجیہات سہو پر مبنی ہیں کیونکہ صحیح روایات میں ان دونوں نمازوں کی تعیین عشاء اور فجر ہی سے کی گئی ہے، پھر دوسری بات یہ بھی ہے کہ سنت کا تقابل فرض سے اور فرض کا تقابل سنت سے کرنا درایت کے بھی مطابق نہیں ہے اس لئے یہاں پہلا قول ہی راجح ہے کہ ان نمازوں سے مراد فجر اور عشاء کی نمازیں ہیں۔

"قولهٗ علی مثل صف الملائکة": اس جملے میں علامہ طیبی رحمہ اللہ کے مطابق صف اول کے نمازیوں کو ملائکہ کے ساتھ جو تشبیہ دی گئی ہے، اس کا مقصد "قرب" بیان کرنا ہے کہ جس طرح ملائکہ کی صف اوّل کو اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اسی طرح نمازیوں کی صف اول کو امام کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے انتہائی مبالغہ کے ساتھ پہلے جماعت کی فضیلت کو ذکر کیا گیا۔ پھر صف اوّل کی فضیلت کو ثابت کیا گیا اور سب سے آخر میں کثرتِ جماعت کی فضیلت کو بیان کیا گیا۔ چنانچہ گفتگو علی سبیل الترقی ہے نہ کہ علی سبیل التنزل۔

"قولهٗ ما کثر فهو احب الی اللّٰه": ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ "ما" موصولہ ہے اور ہو ضمیر اسی کی طرف راجع ہے، اور مطلب اس جملے کا یہ ہے کہ جس نماز کو جتنے زیادہ نمازی ادا کرنے والے ہوں گے، وہ اللہ کے نزدیک اتنی ہی محبوب ہوگی، اس تقریر کے مطابق ہو ضمیر مذکر لفظِ ما کے اعتبار سے لائی گئی ہے۔

اور اس جملے کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر وہ مسجد جس میں جتنے زیادہ نمازی آئیں، وہ اتنی ہی افضل ہے، اسی وجہ سے علماء کرام فرماتے ہیں کہ جامع مسجد میں نماز پڑھنا زیادہ افضل ہے۔ محلے کی مسجد میں (جو جامع مسجد نہ ہو) نماز پڑھنے کا درجہ دوسرا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی روایت بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ جو شخص اللہ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملاقات کرنا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ ان نمازوں کی پابندی کرے، جب بھی ان نمازوں کیلئے پکارا جائے یعنی اذان دی جائے۔

تین آدمی جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں

۱۰۶۷: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ ثَلَاثَةٍ فِیْ قَرْيَةٍ وَلَا بَدْوٍ لَا تُقَامُ فِيْهِمُ الصَّلَاةُ اِلَّا قَدِ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَعَلَيْكَ بِالْجَمَاعَةِ فَاِنَّمَا يَاْكُلُ الذِّئْبُ الْقَاصِيَةَ۔ (رواہ احمد و ابوداود والنسائی)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۳۷۱ حدیث رقم ۵۴۷۔ والنسائی ۲/۱۰۶ حدیث رقم ۸۴۷۔ وأحمد فی المسند ۶/۴۴۶۔

ترجمہ: حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس بستی یا جنگل میں تین آدمی ہوں اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام نہ کریں تو ان پر شیطان غالب رہتا ہے لہٰذا تم جماعت کی نماز کو اپنے اوپر لازم کرلو کیونکہ ریوڑ سے تنہا رہ جانے والی بکری کو بھیڑیا کھا جاتا ہے۔ (احمد، ابوداؤد، نسائی)

تشریح: اس حدیث میں "تین" سے مراد "تین مرد" ہیں، کیونکہ عورتوں کی جماعت اور عورت کی امامت مکروہ ہے، اور تین کی قید لگانے کا فائدہ یہ ہے کہ عام طور پر اہل قریہ کی کم از کم تعداد تین ہی سمجھی جاتی ہے۔ یا یہ کہ "تین" جمع کا کم از کم فرد ہے۔ اور یہ کہ "تین" جمع کی کامل ترین صورت ہے گو کہ "دو" سے بھی اجتماعیت کا ثبوت مل جاتا ہے۔

یہ حدیث اپنے اطلاق کے ساتھ ہمارے مذہب کی تائید کرتی ہے کہ مسافروں کیلئے بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا سنت ہے، لیکن جب وہ کوئی شہر اپنی رہائش کیلئے منتخب کرے وہاں اقامت گزین ہو جائیں تو اس کی تاکید ختم ہو جاتی ہے۔ تا کہ ان کے

مقاصد میں رکاوٹ نہ ہوا، وہ جلد از جلد اپنی حاجت پوری کر کے اپنے مستقر کو لوٹ سکیں۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں تین آدمیوں کے اکٹھے ہونے کی صورت میں جماعت کو جو ضروری قرار دیا گیا ہے وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ اس جگہ رہائش پذیر بھی ہوں، ورنہ ہمارے نزدیک ان پر جماعت کی پابندی واجب نہیں۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں کہ اس روایت کی تصحیح ابن حبان نے بھی کی ہے، اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنے متعلق یہ یقین ہو کہ انفرادی نماز پڑھنے کی صورت میں اسے جو خشوع وخضوع کی کیفیت حاصل ہو سکتی ہے۔ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی صورت میں وہ کبھی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ اس سے اس کا ذہن بٹتا ہے اور اس کی نماز کا اکثر حصہ خشوع وخضوع سے خالی رہتا ہے تو ایسے شخص کو انفرادی طور پر ہی نماز پڑھنا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے۔

لیکن علماء کرام نے اس فتوے کی تردید فرمائی ہے، گو کہ ابن عبدالسلام نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی موافقت کی ہے تاہم اکثریت کی رائے یہی ہے کہ مختار اور صحیح مسلک کے مطابق جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ہی زیادہ اولیٰ ہے، ظاہر سنت بھی ہے اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی بات مان لینے کی صورت میں لوگوں کیلئے ترک نماز کا ایک عظیم دروازہ کھل جانے کا اندیشہ ہے، اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ جماعت واجتماعیت میں وہ برکت ہے جو تفرقہ کی پراگندگی کو دور کر دیتی ہے۔

عذرِ شرعی کے بغیر جماعت کو چھوڑنا جائز ہے

۱۰۶۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ سَمِعَ الْمُنَادِيَ فَلَمْ يَمْنَعْهُ مِنِ اتِّبَاعِهٖ عُذْرٌ قَالُوْا وَمَا الْعُذْرُ قَالَ خَوْفٌ اَوْمَرَضٌ لَمْ تُقْبَلْ مِنْهُ الصَّلٰوةُ الَّتِيْ صَلّٰى۔ (رواه ابوداود والدارقطنی)

أخرجه أبو داؤد ١/٣٧٣ حديث رقم ٥٥١۔ وابن ماجه ١/٢٦٠ حديث رقم ٧٩٣۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی اذان کہنے والے کی اذان سنے اور مؤذن کی تابعداری سے اسے کوئی عذر نہ روکے لوگوں نے پوچھا عذر سے کیا مراد ہے آپ ﷺ نے فرمایا عذر سے مراد ڈر یا بیماری ہے۔ تو جو نماز اس نے بغیر جماعت کے پڑھی ہے وہ قبول نہ ہوگی۔

(ابوداؤد، دارقطنی)

تشریح: اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں اذان "سننے" کی جو قید لگائی گئی ہے، وہ بناء بر غالب احوال کے ہے کیونکہ عام طور پر انسان با جماعت نماز پڑھنے کیلئے اسی وقت جاتا ہے جب اس کے کانوں میں مؤذن کی آواز جاتی ہے اور اگر وہ مؤذن کی اذان سنے بغیر جماعت میں شرکت کیلئے جاتا ہے تو وہ اس کا اپنا اندازہ ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی شخص اذان نہ سن سکے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا عذر بھی نہ ہو تو اس سے جماعت کی فرضیت ساقط نہیں ہو جائے گی۔ کیونکہ اذان کا نہ سننا عذر شمار نہیں ہوتا۔

جب حضرت ابن عباسؓ یہ حدیث بیان کر رہے تھے تو کسی نے ان سے پوچھا کہ "عذر" سے نبی ﷺ کی کیا مراد تھی؟ تو فرمایا کہ جان، مال اور عزت وآبرو کا خوف، ابن ملک "خوف کی" وضاحت اندھیرے اور قرض خواہ کے خوف سے کرتے ہیں، خوف

کے علاوہ کچھ اور اعذار شرعیہ بھی پیچھے گذر چکے ہیں، مثلاً بارش، شدید قسم کی سردی، بھوک کے شدید تقاضے اور نماز کے وقت پر کھانا موجود ہونا، بول و براز کا شدید تقاضا ہونا وغیرہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ حد سے زیادہ فربہی اور جسم کا بے انتہاء موٹا ہونا بھی ایک عذر ہے۔

شرح السنہ میں ہے کہ بلا عذر ترک جماعت کی رخصت کسی کیلئے بھی نہ ہونے پر تمام علماء کرام کا اتفاق ہے اور اس کی دلیل یہی حدیث ہے۔ نیز پہلے مذکور احادیث بھی اس کی مؤید ہیں، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو اس کی والدہ شفقت کے پیش نظر نماز عشاء کی جماعت میں شرکت کرنے سے روکے تو وہ اس کی اطاعت نہ کرے، امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جمعہ اور دیگر با جماعت نمازوں کے ترک کرنے میں کسی شخص پر اپنے والد کی اطاعت واجب نہیں۔ خواہ اذان کی آواز سنے یا نہیں۔

حدیثِ عراف کی تشریح میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نماز ی قبول نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر اسے کوئی ثواب نہیں لگے، گو کہ اس سے فرضیت ساقط ہو جائے گی۔ اور یہ ایسے ہی ہوگا جیسے غصب شدہ زمین پر نماز پڑھنا کہ اس سے فرضیت تو ساقط ہو جائے گی لیکن اس پر ثواب کچھ نہیں ہوگا، مالِ حرام سے حج کا بھی یہی حکم ہے۔

جب جماعت کھڑی ہو جائے اور کسی کو بول و براز کی حاجت ہو تو پہلے اس سے فارغ ہو جائے

۱۰۶۹: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَرْقَمَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا اُقِيْمَتِ الصَّلٰوةُ وَوَجَدَ اَحَدُكُمُ الْخَلَاءَ فَلْيَبْدَأْ بِالْخَلَاءِ۔ (رواه الترمذى وروى مالك وابوداود والنسائى نحوه)

أخرجه أبوداوٗد فى السنن ١/٦٨حديث رقم ٨٨۔والترمذى ١/٢٦٢حديث رقم ١٤٢۔والنسائى ٢/١١٠ حديث رقم ٨٥٢۔وابن ماجه ١/٢٠٢حديث رقم ٦١٦۔ومالك فى الموطأ ١/١٥٩حديث رقم ٤٩من كتاب قصر الصلاة۔ والدارمى ١/٣٩٢حديث رقم ١٤٢٧۔ وأحمد فى المسند ٤/٣٥۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر نماز کے لئے جماعت کھڑی ہو جائے اور تم میں سے کسی کو بول و براز کی ضرورت ہو تو اسے چاہئے کہ پہلے وہ بول و براز سے فارغ ہو جائے۔ (ترمذی) امام مالکؒ امام ابوداوٗدؒ اور امام نسائیؒ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن ارقم۔ یہ عبداللہ بن ارقم "زہری وقریشی" ہیں۔ فتح مکہ کے سال اسلام لائے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب تھے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے کاتب رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال پر حاکم بنا دیا تھا اور حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی۔ پھر عبداللہ بن ارقم نے اس خدمت سے استعفیٰ چاہا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے استعفیٰ منظور فرما لیا۔ ان سے عروہ اور اسلم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ روایت کرتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں انتقال فرمایا۔

تین چیزوں سے منع کیا گیا ہے

۱۰۷۰:وَعَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثٌ لَا يَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ يَفْعَلَهُنَّ لَا يَؤُمَّنَّ رَجُلٌ قَوْمًا فَيَخُصَّ نَفْسَهُ بِالدُّعَاءِ دُوْنَهُمْ فَاِنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَقَدْ خَانَهُمْ وَلَا يَنْظُرُ فِي قَعْرِ بَيْتٍ قَبْلَ اَنْ يَسْتَأْذِنَ فَاِنْ فَعَلَ ذَالِكَ فَقَدْ خَانَهُمْ وَلَا يُصَلِّ وَهُوَ حَقِنٌ حَتّٰى يَتَخَفَّفَ ۔ (رواہ ابوداود وللترمذی نحوہ)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱/ ۷۰حديث رقم ۹۱۔والترمذی ۲/ ۱۸۹حديث رقم ۳۵۷۔وابن ماجه في السنن ۱/ ۲۹۸ حديث رقم ۹۲۳۔وأحمد في المسند ۵/ ۲۸۰۔

ترجمہ:حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین امور ایسے ہیں جن کا کرنا کسی آدمی کے لئے حلال نہیں ہے ایک یہ کہ کوئی آدمی کسی جماعت کا امام بنے اور دعا میں جماعت کو شریک کئے بغیر اپنے آپ کو مخصوص کرے اگر کسی نے ایسا کیا تو اس نے جماعت کے ساتھ خیانت کی۔دوم یہ کہ کوئی آدمی کسی کے گھر میں اجازت حاصل کرنے سے پہلے نظر نہ ڈالے۔اگر کسی نے ایسا کیا تو اس نے گھر والوں کے ساتھ خیانت کی۔سوم یہ کہ کوئی آدمی ایسی حالت میں نماز نہ پڑھے کہ وہ پیشاب، پاخانے کو روکے ہوئے ہو۔ یہاں تک کہ ضرورت سے فارغ ہو جائے۔(ابوداؤد)امام ترمذیؒ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

تشریح:اس حدیث میں امام کو صرف اپنے لئے دعاء کرنے اور مقتدیوں کو چھوڑ دینے کی صورت میں خائن قرار دیا گیا ہے جس کی وجہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ جماعت کی تو مشروعیت ہی اس مقصد کے تحت ہوئی ہے کہ امام اور مقتدی میں سے ہر ایک قرب الٰہی کی برکت سے دوسرے کیلئے فیضانِ خیر کا ذریعہ بن سکے،اس لئے جو امام خاص اپنی ذات کیلئے دعا کرتا ہے وہ مقتدیوں کے ساتھ خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔

ہماری رائے میں خصوصیت کے ساتھ امام کو خائن قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ دعاء اس ہی نے کروائی ہے،اس اعتبار سے وہ ''صاحب الدعاء''ہوا، بناء بریں خاص طور پر اس کا تذکرہ کیا گیا ورنہ یہ خیانت مقتدی کی جانب سے بھی ہو سکتی ہے۔

اسی طرح علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گھر میں داخلہ سے قبل اجازت لینے کو اسی لئے مشروع کیا گیا ہے کہ کوئی شخص اچانک پہنچ کر گھریلو امور یا پوشیدگی کے امور پر مطلع نہ ہو جائے،اس لئے باہر کھڑے ہو کر گھر کے اندر جھانکنا خیانت ہے،اسی طرح نماز بارگاہ خداوندی میں قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ایک اہم مناجات اور غیر اللہ سے اعراض کی اہم ترین صورت ہے، اس موقع پر بول و براز کے تقاضے کو دبانے والا نماز کے حق میں خیانت کا مرتکب ہوتا ہے۔

اس حدیث میں تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، درمیان میں مسئلہ استیذان کو اور دائیں بائیں نماز کی دو حالتوں کو، تاکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں اکٹھے ہو جائیں، رہی یہ بات کہ حقوق العباد میں سے باقی سب کو چھوڑ کر ''مسئلہ استیذان'' ہی کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے کی کیا وجہ تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص اتنی باریک بات کا خیال رکھے گا، وہ دوسری باتوں اور حقوق کا بطریق اولیٰ خیال رکھ سکے گا، یہ سمجھانے کیلئے خاص طور پر مسئلہ استیذان کو ذکر کیا گیا۔

نماز میں تاخیر کرنے کی ممانعت

۱۰۷۱: وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تُؤَخِّرُوا الصَّلَاةَ لِطَعَامٍ وَّلَا لِغَيْرِهٖ۔

(رواه في شرح السنة)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ٤/١٣٥ حديث رقم ٣٧٥٨۔ والبغوي في شرح السنة ٣/٣٥٥ حديث رقم ٨٠٠۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کھانے کی وجہ سے یا اور کسی وجہ سے نماز میں تاخیر نہ کرو۔ (شرح السنہ)

تشریح: اس حدیث میں نماز کو مؤخر کرنے کی جو ممانعت فرمائی گئی ہے، علامہ تورپشتی رحمہ اللہ کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو اس کے وقتِ مقررہ سے مؤخر نہ کرو، اور اس کی دلیل نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے، ''اذا وضع عشاء احدکم......''۔

بعض علماء کرام اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں کہ نماز کو کھانے کی غرض سے مؤخر نہ کرو، لیکن جب کھانا آجائے تو پھر نماز کو مؤخر کردیا کرو، پہلی صورت میں نماز کو مقدم کرنے کی وجہ اس کی شرافت وعظمت ہے اور دوسری صورت میں اسے مؤخر کرنے کی وجہ ذہنی طور پر یکسوئی کا حصول ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اپنی ذات کے اعتبار سے تو نماز کو تمام کاموں پر تقدم حاصل ہے، لیکن بعض اوقات کسی کام کو نماز پر مقدم کردیا جاتا ہے تاکہ کشادگیٔ وقت کی صورت میں نماز کامل طور پر ادا کی جاسکے، اور تنگیٔ وقت کی صورت میں تو بہرحال نماز ہی کو تقدم حاصل ہوگا، گویا تقدیم وتاخیر امور میں بھی اصل تقدیم نماز ہی ہے۔ صرف اعتباری فرق پیدا ہوجاتا ہے۔

محققین فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سب سے بہترین توجیہ یہ ہے کہ درحقیقت اس ممانعت کا تعلق اداءِ نماز سے پہلے کھانا لانے اور دوسرے کو اس میں مشغول کرنے سے ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جب نماز کا وقت آجائے تو پھر اسے مؤخر کرنے کے درپے ہوکر کھانا وغیرہ لانے میں مصروف نہ ہوجایا کرو۔

لیکن یہ توجیہ محلِ نظر ہے کیونکہ اس حدیث میں حقیقۃً کھانا لے آنا مراد نہیں ہے بلکہ کھانے پینے کی طرف قلبی میلان اور دلی خواہش ہے، جو کہ ظاہر ہے، ایک اضطراری اور غیر اختیاری امر ہے اور یہ ایسے ہے جیسے بول و براز کا تقاضا، جبکہ ابن ملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو اس صورت پر محمول کیا جائے گا جبکہ انسان کو اپنے اوپر اتنا قابو ہو کہ بھوک سے وہ بے حال نہ ہوجائے، اس صورت میں اسے چاہیے کہ نماز پہلے پڑھے، یا یہ کہ وقت تنگ ہو اور کھانا کھانے کی صورت میں وقت ختم ہوجانے کا اندیشہ ہو، تب بھی نماز پہلے پڑھ لے، تاکہ اس موضوع کی ساری احادیث میں تطبیق ہوجائے۔

الفصل الثّالث:

منافق جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے میں سستی کرتا ہے

۱۰۷۲: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَقَدْ رَأَيْتُنَا وَمَا يَتَخَلَّفُ عَنِ الصَّلَاةِ اِلَّا مُنَافِقٌ قَدْ عُلِمَ نِفَاقُهٗ اَوْ

مَرِيْضٌ اِنْ كَانَ الْمَرِيْضُ لَيَمْشِيْ بَيْنَ رَجُلَيْنِ حَتّٰى يَاْتِيَ الصَّلٰوةَ وَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَّمَنَا سُنَنَ الْهُدٰى وَاِنَّ مِنْ سُنَنِ الْهُدٰى اَلصَّلَاةُ فِي الْمَسْجِدِ الَّذِيْ يُؤَذَّنُ فِيْهِ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَلْقَى اللّٰهَ غَدًا مُسْلِمًا فَلْيُحَافِظْ عَلٰى هٰذِهِ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ حَيْثُ يُنَادٰى بِهِنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ شَرَعَ لِنَبِيِّكُمْ سُنَنَ الْهُدٰى وَاِنَّهُنَّ مِنْ سُنَنِ الْهُدٰى وَلَوْاَنَّكُمْ صَلَّيْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ كَمَا يُصَلِّيْ هٰذَا الْمُتَخَلِّفُ فِيْ بَيْتِهٖ لَتَرَكْتُمْ سُنَّةَ نَبِيِّكُمْ وَلَوْتَرَكْتُمْ سُنَّةَ نَبِيِّكُمْ لَضَلَلْتُمْ وَمَامِنْ رَجُلٍ يَّتَطَهَّرُ فَيُحْسِنُ الطُّهُوْرَ ثُمَّ يَعْمِدُ اِلٰى مَسْجِدٍ مِنْ هٰذِهِ الْمَسَاجِدِ اِلَّا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِكُلِّ خَطْوَةٍ يَخْطُوْهَا حَسَنَةً وَرَفَعَهٗ بِهَا دَرَجَةً وَحَطَّ عَنْهُ بِهَا سَيِّئَةً وَلَقَدْ رَاَيْتُنَا وَ مَا يَتَخَلَّفُ عَنْهَا اِلَّا مُنَافِقٌ مَعْلُوْمُ النِّفَاقِ وَلَقَدْ كَانَ الرَّجُلُ يُؤْتٰى بِهَا يُهَادٰى بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ حَتّٰى يُقَامَ فِي الصَّفِّ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۴۵۳/۱ حديث رقم (۲۵۶۔۶۵۴)۔ وأبوداوٗد في السنن ۳۷۳/۱ حديث رقم ۵۵۰۔ والنسائي ۱۰۸/۲ حديث رقم ۸۴۹۔ وابن ماجه ۲۵۵/۱ حديث رقم ۷۷۷۔ وأحمد في المسند ۴۱۴/۱۔

ترجمه: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے کئی مرتبہ دیکھا کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے صرف وہی آدمی بیٹھا رہتا تھا جو منافق ہوا اور اس کا نفاق واضح ہو یا وہ بیمار جو نماز میں حاضر ہونے سے معذور ہے یہاں تک کہ اگر کوئی دو آدمیوں کے درمیان سہارے سے چل کر آسکتا تو وہ بھی نماز میں شرکت کے لئے آتا تھا پھر حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہدایت کے طریقے بتائے اور ہدایت کے ان طریقوں میں مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا بھی ہے جس میں اذان باقاعدہ دی جاتی ہو اور ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس انسان کو یہ بات خوش کرے کہ کل کے دن اللہ تعالیٰ سے کامل مسلمان ہونے کی حیثیت سے ملاقات کرے تو اسے چاہئے کہ وہ ان پانچ نمازوں کی اس جگہ حفاظت کرے جہاں نمازوں کے لئے اذان دی جاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہدایت کے طریقے مقرر کر دیئے ہیں اور پانچ نمازوں کو جماعت کے ساتھ پڑھنا بھی ہدایت کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے اگر تم اپنی نمازوں کو اپنے گھروں کے اندر پڑھو گے جس طرح کہ یہ نماز سے پیچھے رہنے والا یعنی منافق نماز پڑھتا ہے تو تم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑنے والے بن گئے اور اگر اپنے نبی کی سنت کو چھوڑ دو گے تو یقیناً تم گمراہ ہو جاؤ گے جو آدمی اچھی طرح پاک اور صاف ہو کر کسی مسجد کی طرف جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہر قدم کے بدلے جس کو وہ رکھتا ہے ایک نیکی لکھ دیتا ہے اور درجہ بلند کر دیتا ہے اور گناہ کو اس سے دور کر دیتا ہے ہم نے دیکھا ہے کہ واضح منافق کے علاوہ کوئی آدمی جماعت سے پیچھے نہیں رہتا تھا۔ یہاں تک کہ بیمار آدمی کو اس حالت میں نماز میں لایا جاتا تھا کہ وہ کمزوری کی وجہ سے دو آدمیوں کا سہارا لئے ہوئے آتا اور اس کو صف میں لا کر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول جو نقل کیا گیا ہے۔ کہ عہد نبوی میں نماز سے وہی پیچھے رہتا ہے جو منافق ہوتا تھا، اس میں شمنی کے مطابق ''منافق'' سے وہ شخص مراد نہیں ہے جو بظاہر مسلمان اور بباطن کافر ہو، ورنہ جماعت

کے ساتھ نماز پڑھنا فرض نہ ہوتا، کیونکہ کفر کو چھپانے والا درحقیقت بھی کافر ہوتا ہے، نیز اس طرح حدیث کا آخری جملہ پہلے جملے کے مناقض ہو جاتا، اس لئے یہاں حقیقی منافق مراد نہیں۔

لیکن شمنی کی یہ بات محل نظر ہے کیونکہ نفاق جماعت سے پیچھے رہ جانے کا سبب تو ہے لیکن جماعت سے پیچھے رہ جانا نفاق کا سبب نہیں ہے۔ نیز صحیح مذہب کے مطابق جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا واجب ہے، فرض نہیں کیونکہ دلیل ظنی ہے اور یہاں کسی قسم کا تناقض بھی موجود نہیں ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ''وقد علم نفاقه'' پر بحث کرتے ہوئے ایک سوال اٹھاتے ہیں کہ جب صحابہ کرامؓ کو کسی کے منافق ہونے کا علم حاصل تھا، تو اس کے باوجود انہوں نے اسے منافقت پر برقرار کیسے رہنے دیا؟ پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس مصلحت کی بناء پر ایسا نہیں کیا جا سکتا تھا کہ لوگ یہ نہ کہنے لگیں کہ دیکھو جی! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرنے لگے ہیں۔ کیونکہ بظاہر دعوائے اسلام سے لوگ انہیں مسلمان ہی سمجھتے تھے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں ''علم'' بمعنی ''ظن'' کے ہے، کیونکہ سب صحابہ کا مطالعہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ کسی شخصِ معین میں نفاق ہونے کا صحابہ کرامؓ کو یقین نہ تھا، ہاں! علاماتِ نفاق کی وجہ سے کسی پر گمانِ غالب کیا جا سکتا تھا، اور یہاں یہی مراد ہے۔ علامہ ابن ہمام اس کی توجیہ اس طرح فرماتے ہیں کہ وصفِ نفاق جماعت سے پیچھے رہ جانے کا سبب بن جاتا تھا، اس حدیث میں یہ نہیں بتایا جا رہا کہ واقعۃً تخلف عن الجماعۃ منافقین ہی سے ہوتا تھا۔ کیونکہ بعض اوقات انسان صحت اسلام، عقیدۂ توحید اور عدم نفاق کے باوجود سستی کا شکار ہو کر جماعت سے رہ جاتا ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ گذشتہ احادیث کے ضمن میں جو یہ تاویل بیان کی گئی تھی، وہ صحیح ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کے گھروں کو آگ لگانے کے ارادے کا اظہار فرمایا تھا وہ منافقین ہی تھے۔

''قولهٗ لو تركتم سنة نبيكم'':

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ''سنت'' سے مراد ''عزیمت'' ہے، علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس عمل کو سنت قرار دینا جیسا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی ہے، قائلینِ سنت کیلئے دلیل نہیں بن سکتا، کیونکہ یہ وجوب کے منافی نہیں اس لئے کہ لغت کے اعتبار سے سننِ ھدی کا لفظ واجب کے لفظ سے زیادہ عام اور اسے شامل ہے جیسے نماز عید کو سنن ہدی میں سے کہا جاتا ہے حالانکہ وہ واجب ہے، اسی طرح ''لضللتم'' کا لفظ بھی وجوب ہی کو متعین کرتا ہے۔ جبکہ ابوداؤد کی اسی روایت میں ''لکفرتم'' کا لفظ بھی آتا ہے۔

اسی طرح مسند احمد اور طبرانی میں مرفوعاً منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سب سے بڑی زیادتی اور ظلم کفر ہے اور وہ شخص منافق ہے جو اللہ کے منادی (مؤذن) کو نماز کی طرف بلاتے ہوئے سنتا بھی ہے لیکن پھر بھی نماز کیلئے نہیں آتا، اس حدیث میں بھی مسجد میں باجماعت نماز نہ پڑھنے پر وعید سنائی گئی ہے، اور یہ بات پیچھے گذر چکی ہے کہ واجب پر سنت کا اطلاق کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ثبوت سنت سے ہوا ہے۔

جماعت کی نماز ترک کرنے پر وعید

۱۰۷۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْلَا مَا فِی الْبُیُوْتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالذُّرِّیَةِ اَقَمْتُ صَلٰوةَ الْعِشَاءِ وَاَمَرْتُ فِتْیَانِیْ یُحَرِّقُوْنَ مَا فِی الْبُیُوْتِ بِالنَّارِ ۔ (رواه احمد)

أخرجه أحمد فی المسند ۲/۲۶۷۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر گھروں میں عورتیں اور بچے نہ ہوتے تو میں عشاء کی نماز پڑھانے کے لئے کسی کو حکم دیتا اور پھر اپنے خادموں کو حکم دیتا کہ جو لوگ نماز میں حاضر نہیں ہوتے ان کے گھروں کو آگ سے جلا دیا جائے۔ (احمد)

تشریح: اس حدیث کے مفہوم میں معذور افراد بھی شامل ہیں، علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ من النساء میں من بیانیہ ہے۔ جو یا تو وصفیت کے ارادے سے لایا گیا ہے اور یہ بیان کرنے کیلئے کہ عورتیں اور بچے غیر ذوی العقول کے مرتبے میں ہیں اور یہ کہ ان کیلئے جماعت میں حاضر ہونا ضروری نہیں یا یہ بتانے کیلئے کہ گھروں میں عام طور پر عورتین اور بچے ہی ہوتے ہیں اور دوسرا ساز وسامان ہوتا ہے اسی اعتناء کی وجہ سے خاص طور پر ان دونوں کا ذکر کیا گیا لیکن اس دوسرے قول کی صورت میں حدیث کے آخری الفاظ سے اعتراض وارد ہوتا ہے کہ پھر ''یحرقون ما فی البیوت'' کا کیا معنی ہے؟ اس کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ یہاں ما بمعنی من کے ہو اور اس سے مراد جماعت سے پیچھے رہ جانے والے افراد ہوں کیونکہ اگر وہ عقلمند ہوتے تو جماعت سے پیچھے نہ رہتے اور خاص طور پر نماز عشاء کا تذکرہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بہت سے لوگ سستی اور غفلت برتتے ہیں۔

اذان کے بعد مسجد سے نکلنا درست نہیں

۱۰۷۴: وَعَنْهُ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا کُنْتُمْ فِی الْمَسْجِدِ فَنُوْدِیَ بِالصَّلٰوةِ فَلَا یَخْرُجْ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُصَلِّیَ ۔ (رواه احمد)

أحمد فی المسند ۲/۵۳۷۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جب تم لوگ مسجد میں موجود ہو اور نماز کے لئے اذان ہو جائے تو تم میں سے کوئی آدمی بغیر نماز پڑھے مسجد سے نہ نکلے۔ (احمد)

تشریح: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی وضاحت میں فرماتے ہیں کہ یہاں مامور بہ محذوف ہے اور اذا کنتم قول کا مقولہ ہے۔ اور بیانِ محذوف ہے، مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ جب ہم مسجد میں ہوں اور اذان ہو جائے تو نماز پڑھے بغیر مسجد سے نہ نکلیں۔

لیکن علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی اس توجیہہ میں نہ صرف یہ کہ تکلف بلکہ مشقت بھی ہے اس کی مراد کی تعیین اور توضیح میں حافظ صاحب کی بات بڑی مضبوط ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ حکم دے رکھا ہے کہ اذان سن لینے کے بعد ہم مسجد سے باہر نہ نکلیں لیکن یہ حکم صیغہ امر کے ساتھ نہیں بلکہ امر پر دلالت کرنے والے الفاظ کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے یعنی ''اذا کنتم'' کے الفاظ سے۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ اذان ہو جانے کے بعد مسجد سے نکلنا مکروہ ہے جب کہ اس نے نماز نہ پڑھی ہو، علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں یہ قید پیش نظر رہے کہ اگر وہ پہلے سے نماز نہ پڑھ چکا ہو یا کسی دوسری مسجد میں جماعت کا انتظام اس سے وابستہ نہ ہو یا وہ محلّے کی مسجد ہو یا اہل محلّہ اپنی مسجد میں نماز پڑھ چکے ہوں بصورت دیگر اسے مسجد سے جانے کی اجازت ہوگی تاہم افضل پھر بھی یہی ہے کہ اذان ہو چکنے کے بعد مسجد سے باہر نہ نکلے۔

اذان ہونے کے بعد مسجد سے نکلنے والا نافرمان ہے

۱۰۷۵: وَعَنْ اَبِی الشَّعْثَاءِ قَالَ خَرَجَ رَجُلٌ مِنَ الْمَسْجِدِ بَعْدَ مَا اُذِّنَ فِیْهِ فَقَالَ اَبُوْ هُرَیْرَةَ اَمَّا هٰذَا فَقَدْ عَصٰی اَبَا الْقَاسِمِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۴۵۳ حديث رقم (۲۵۸۔۶۵۵)۔ وأبو داؤد ۱/۳۶۶ حديث رقم ۵۳۶۔ والترمذي ۱/۳۹۷ حديث رقم ۲۰۴۔ والنسائي ۲/۲۹ حديث رقم ۶۸۳۔ وابن ماجه ۱/۲۴۲ حديث رقم ۷۳۳۔ والدارمي ۱/۲۹۵ حديث رقم ۱۲۰۵۔ وأحمد في المسند ۲/۴۱۰۔

ترجمہ: حضرت ابوشعثاء سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ اذان ہو جانے کے بعد ایک آدمی مسجد سے نکلا تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس آدمی نے ابوالقاسم کی نافرمانی کی ہے۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

ابوالشعثاء۔ یہ ابوشعثاء ''سلیم بن اسود محاربی کوفی'' ہیں۔ مشہور اور معتبر راویوں میں سے ہیں۔ حجاج کے عہد میں ان کا انتقال ہوا۔

تشریح: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص مسجد میں اذان ہونے کے بعد نکار ہے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے اس حدیث میں اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی گویا علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس حدیث میں لفظ امّا تفصیل کیلئے آیا ہے۔ جو دو یا زیادہ چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔

یہ حدیث مسلم کے علاوہ ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں بھی منقول ہے اور مسند احمد میں یہ اضافہ بھی ہے۔

''ثم قال امرنا رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کنتم فی المسجد فنودی بالصلوٰۃ فلا یخرج احدکم حتی یصلی''

اور سند کے اعتبار سے یہ روایت صحیح ہے، علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ تمام مؤلفین صحاح نے ابوشعثاء کے حوالے سے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہم ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے جب مؤذن نے عصر کی اذان دی تو ان میں سے ایک آدمی مسجد سے باہر نکل گیا۔ تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ اس نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔

بعض محدثین کے نزدیک اس طرح کی روایات موقوف ہوتی ہیں گو کہ ابن عبدالبر نے اس حدیث کے متعلق فرمایا ہے کہ اس کے نظائر میں مسند احادیث بھی موجود ہیں، جیسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث اس کی نظیر بن سکتی ہے۔

''من لم یجب الدعوۃ فقد عصٰی ابا القاسم ﷺ''

اذان ہو جانے کے بعد مسجد سے نکلنے والا منافق ہے

۱۰۷۶: وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَدْرَكَهُ الْاَذَانُ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ خَرَجَ لَمْ يَخْرُجْ لِحَاجَةٍ وَّهُوَ لَا يُرِيْدُ الرَّجْعَةَ فَهُوَ مُنَافِقٌ۔ (رواہ ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه في السنن ١/ ٢٤٢ حديث رقم ٧٣٤۔

ترجمہ: حضرت عثمانؓ بن عفانؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص مسجد میں ہو اور اذان ہو جائے اور پھر وہ بغیر کسی عذر کے مسجد سے نکل جائے اور واپس آنے کا ارادہ بھی نہ ہو تو منافق ہے۔ (ابن ماجہ)

اذان کا جواب نہ دینے والے کا حکم

۱۰۷۷: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ فَلَمْ يُجِبْهُ فَلَا صَلَاةَ لَهٗ اِلَّا مِنْ عُذْرٍ۔ (رواہ الدارقطنی)

أخرجه ابن ماجه في السنن ١/ ٢٥٩ حديث رقم ٧٩٣۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے اذان سنی اور اس کا جواب نہ دیا تو اس کی نماز کامل نہیں ہوگی مگر کسی عذر کی وجہ سے ہو تو کوئی حرج نہیں۔ (دارقطنی)

نابینا آدمی کے لئے جماعت میں شرکت ضروری ہے

۱۰۷۸: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ اُمِّ مَكْتُوْمٍ قَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ الْمَدِيْنَةَ كَثِيْرَةُ الْهَوَامِّ وَالسِّبَاعِ وَاَنَا ضَرِيْرُ الْبَصَرِ فَهَلْ تَجِدُ لِيْ مِنْ رُخْصَةٍ فَقَالَ هَلْ تَسْمَعُ حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَحَيَّ هَلًا وَلَمْ يُرَخِّصْ۔ (رواہ ابوداود والنسائی)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ١/ ٣٧٥ حديث رقم ٥٥٣۔ والنسائي ٢/ ١٠٨ حديث رقم ٨٥١۔ وابن ماجه ١/ ٢٦٠ حديث رقم ٧٩٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ مدینہ میں موذی جانور کثرت سے ہوتے ہیں اور درندے بہت ہیں اور میں نابینا آدمی ہوں کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ میں جماعت کی نماز میں شرکت نہ کروں اور گھر میں نماز پڑھ لیا کروں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کی آواز سنتے ہو میں نے عرض کیا جی ہاں آپ نے فرمایا جماعت میں آیا کرو اور انہیں جماعت چھوڑنے کی اجازت نہیں دی۔ (ابوداؤد، نسائی)

نمازی ہونا رسول اللہ ﷺ کی امت کی علامت ہے

۱۰۷۹: وَعَنْ اُمِّ الدَّرْدَاءِ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ اَبُوْ الدَّرْدَاءِ وَهُوَ مُغْضَبٌ فَقُلْتُ مَا اَغْضَبَكَ قَالَ وَاللّٰهِ مَا اَعْرِفُ مِنْ اَمْرِ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا اِلَّا اَنَّهُمْ يُصَلُّوْنَ جَمِيْعًا۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۱۳۷۔حدیث رقم ۶۵۰۔وأحمد فی المسند ۶/۴۴۳۔

ترجمہ: حضرت ام الدرداءؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ ایک دن میرے خاوند حضرت ابودرداءؓ غصہ کی حالت میں میرے پاس تشریف لائے میں نے پوچھا کہ کس چیز نے آپ کو غصہ دلایا ہے انہوں نے کہا اللہ کی قسم میں رسول اللہ ﷺ کی امت کے بارے میں اب بس یہی پہچان رکھتا ہوں کہ وہ اکٹھے (ہوکر) نماز پڑھ لیتے ہیں۔ (بخاری)

راویٔ حدیث:

امّ الدرداء۔ ام الدرداء ؓ کا نام ''خیرہ'' ہے یہ ''ابوحدرد'' کی بیٹی ہیں۔قبیلہ ''اسلم'' میں سے ہیں۔ یہ حضرت ابوالدرداء ؓ کی بیوی ہیں۔ یہ بڑی فاضل اور عقلمند صحابیات میں سے ہیں اور عورتوں میں بڑی صاحب رائے تھیں۔نہایت عابدہ متبعہ سنت تھیں۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی ہے ان کا انتقال حضرت ابوالدرداء ؓ سے دو سال پہلے ہوگیا تھا ان کی وفات ملک شام میں حضرت عثمان ؓ کی خلافت کے دور میں ہوئی۔

تشریح: اس حدیث مبارکہ کے آخری جملے ''الا انهم یصلون جمیعا'' پر بحث کرتے ہوئے علامہ طیبی ؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوالدرداءؓ نے یہ جملہ اپنی زوجہ محترمہ حضرت ام درداءؓ کے اس سوال ''ما اغضبك'' کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا اور اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ایسے منکر اور غیر معروف کو دین محمدی ﷺ میں رائج ہوتے ہوئے دیکھا ہے جس نے مجھے غضبناک کردیا ہے اور اس سے ان کی مراد ترک جماعت تھی۔

علامہ ابن حجر عسقلانی ؒ بھی اس رائے میں علامہ طیبی ؒ کی موافقت فرماتے ہیں کہ کچھ زیادہ ہی تکلف کرتے ہوئے اس کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں۔ کہ اب میں امت مرحومہ میں ایسے کوئی کام نہیں پاتا جو کثرت ثواب، اپنی عظمت اور بزرگی میں بہت آگے بڑھے ہوئے ہوں، البتہ اتنی ضرور ہے کہ وہ لوگ با جماعت نماز ضرور پڑھ لیتے ہیں لیکن اب اس میں بھی سستی سے کام لینے لگے ہیں۔

لیکن اس حدیث کا واضح ترین مفہوم یہ ہے کہ مجھے ان ناپسندیدہ امور نے غضبناک کردیا ہے جو امت مرحومہ میں نئے ایجاد ہوگئے ہیں۔اس لئے کہ بخدا! مجھے تو کوئی ایسی چیز معلوم نہیں جس میں امت مرحومہ راہ راست پر برقرار رہی ہو۔صرف اتنی بات ضرور ہے کہ یہ لوگ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لیتے ہیں، اس تقریر کے مطابق ''جواب'' محذوف ہوگا اور کلام میں مذکور جملہ ''دلیل جواب'' قرار پائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فائدہ: حدیث کے آخری جملے میں مختلف محدثین نے مختلف نسخے ذکر فرمائے ہیں چنانچہ میرک فرماتے ہیں کہ مشکوۃ کے تمام نسخوں میں تو ''من امر امة محمد ﷺ'' کا لفظ ہی آیا ہے۔ جبکہ بخاری شریف کی اکثر روایات میں ''ما اعرف من

محمد ﷺ شیئا'' وارد ہوا ہے، شرح ابن بطال میں اس پر جزم ظاہر کرتے ہوئے اس کی تشریح ''من شریعة محمد ﷺ'' سے کی گئی ہے، ابوذر اور کریمہ کے مطابق ''ما اعرف من امة محمد ﷺ'' اور ابوالوقت کے مطابق ''من امر محمد ﷺ'' کا نسخہ زیادہ صحیح ہے، مسند احمد، مستخرج اسماعیلی اور مستخرج ابونعیم میں بھی یہی آخری نسخہ ہے۔ حمیدی نے بھی جمع بین الصحیحین میں اسی کی تخریج کی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے لہجے سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے لیکن مجھے بخاری شریف میں وہ الفاظ نہیں مل سکتے جو مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کئے ہیں۔

نمازِ فجر کو جماعت کے ساتھ پڑھنے کی فضیلت

۱۰۸۰: وَعَنْ اَبِیْ بَکْرِ بْنِ سُلَیْمَانَ بْنِ اَبِیْ حَثْمَةَ قَالَ اِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ فَقَدَ سُلَیْمَانَ بْنَ اَبِیْ حَثْمَةَ فِیْ صَلَاةِ الصُّبْحِ وَ اِنَّ عُمَرَ غَدَا اِلَی السُّوْقِ وَمَسْکَنُ سُلَیْمَانَ بَیْنَ الْمَسْجِدِ وَالسُّوْقِ فَمَرَّ عَلَی الشِّفَاءِ اُمِّ سُلَیْمَانَ فَقَالَ لَهَالَمْ اَرَسُلَیْمَانَ فِی الصُّبْحِ فَقَالَتْ اِنَّهٗ بَاتَ یُصَلِّیْ فَغَلَبَتْهُ عَیْنَاهُ فَقَالَ عُمَرُ لَاَنْ اَشْهَدَ صَلَاةَ الصُّبْحِ فِیْ جَمَاعَةٍ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَقُوْمَ لَیْلَةً۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك فی الموطأ ۱/۱۳۱ حدیث رقم ۷ من کتاب صلاة الجماعة۔

ترجمہ: حضرت ابوبکر بن سلیمان بن ابی حثمہ فرماتے ہیں کہ کسی ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز فجر میں میرے والد حضرت سلیمان بن ابی حثمہ کو نہ پایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب صبح کے وقت بازار جانے لگے تو حضرت سلیمان کا مکان مسجد اور بازار کے درمیان تھا اس لئے وہ سلیمان کی والدہ شفاء کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ آج میں نے فجر کی نماز میں سلیمان کو نہیں دیکھا۔ سلیمان کی والدہ نے عرض کیا کہ سلیمان نے آج پوری رات نماز پڑھی اور صبح ہوتے ہی ان کی آنکھوں میں نیند کا غلبہ ہو گیا لہٰذا اس وجہ سے فجر کی نماز میں حاضر نہ ہو سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں فجر کی نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھنا تمام رات کی عبادت کے مقابلے میں بہتر سمجھتا ہوں۔ (مالک)

تشریح: اس حدیث میں ''ان اقوم لیلة'' کے قیام اللیل سے مراد نوافل پڑھنے کیلئے قیام کرنا ہے جو کہ حدیث کے مضمون کو دیکھتے ہوئے بالکل واضح سی بات ہے لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ اس موقع پر حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک طویل کلام کا رد بھی ہو جائے جو انہوں نے لا حاصل طور پر اس جگہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ فجر کی نماز باجماعت پڑھنے کی تاکید دوسری نمازوں کے باجماعت پڑھنے سے زیادہ ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اخذ و استنباط کی دلیل وہ روایت ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح مسلم میں روایت کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''جو شخص عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ لے، گویا اس نے آدھی رات قیام کیا، اور جو شخص پھر فجر کی نماز بھی جماعت کے ساتھ پڑھ لے، گویا اس نے ساری رات قیام کیا۔

کچھ آگے چل کر حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلم شریف کی اس حدیث کے علاوہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس مضمون کی حدیث روایت کی ہے لیکن اس کے الفاظ یوں ہیں:

''من صلی العشاء فی جماعة کان کقیام نصف لیلة، ومن صلی العشاء والفجر فی جماعة کان کقیام لیلة''؟؟ ۔''''

اور ترمذی کے یہ الفاظ نقل کر کے حافظ صاحب ﷫ نے ان دونوں روایتوں کے درمیان تعارض دکھانے کی کوشش کی ہے حالانکہ بات واضح ہے کہ ترمذی شریف کی روایت، مسلم شریف کی روایت کی تفسیر اور وضاحت و بیان ہے اور اجمال و تفصیل میں کبھی تعارض نہیں ہوتا۔ یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسلم شریف کی حدیث ''مبالغہ'' پر محمول ہے کیونکہ نیند کو چھوڑ کر نماز کیلئے آنا واقعۃً ایک مشکل اور مجاہدہ والا کام ہے۔

دو آدمی جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں

۱۰۸۱: وَعَنْ اَبِی مُوسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِثْنَانِ فَمَا فَوقَھُمَا جَمَاعَةٌ ۔ (رواہ ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه فی السنن ۱/۳۱۲ حدیث رقم ۹۷۲ ۔ وأحمد فی المسند ۵/۶۹ ۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دو یا دو سے زیادہ آدمیوں کی جماعت ہوتی ہے۔ (ابن ماجہ)

تشریح: ابن ماجہ کی اس حدیث کی تائید بخاری شریف کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کا مضمون تو یہی ہے، لیکن الفاظ مختلف ہیں اور وہ یہ ہیں: ''اذا حضرت الصلوٰة فاذّنا ثم اقیما فلیؤمکما اکبر کما''۔؟؟''''

عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت ہے

۱۰۸۲: وَ عَنْ بِلَالِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَعَنْ اَبِیْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَمْنَعُوا النِّسَآءَ حُظُوْظَهُنَّ مِنَ الْمَسَاجِدِ اِذَا سْتَأْذَنَکُمْ فَقَالَ بِلَالٌ وَاللّٰہِ لَنَمْنَعُھُنَّ فَقَالَ لَهٗ عَبْدُ اللّٰہِ اَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَتَقُوْلُ اَنْتَ لَنَمْنَعُھُنَّ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۳۲۸ حدیث رقم (۱۴-۴۴۲) وأخرجه أبو داوٗد فی السنن ۱/۳۸۲ حدیث رقم ۵۶۶ ۔ وابن ماجه ۱/۸ حدیث رقم ۱۶ ۔ وأحمد فی المسند ۲/۱۴۰ ۔

ترجمہ: حضرت بلال بن عبداللہ بن عمر ؓ اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب عورتیں تم سے مسجد میں جانے کی اجازت مانگیں تو انہیں روک کر مساجد کے ثواب کے حصہ سے محروم نہ کرو حضرت بلال نے کہا اللہ کی قسم ہم تو ضرور عورتوں کو منع کریں گے حضرت عبداللہ نے بلال سے کہا میں تمہارے سامنے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتا ہوں تم کہتے ہو ہم انہیں ضرور منع کریں گے اور ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت سالم نے اپنے والد سے نقل کیا ہے تو پھر حضرت عبداللہ بلال کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں اس قدر سب وشتم کیا ہے کہ میں نے کبھی حضرت عبداللہ کو اس قدر سب وشتم کرتے ہوئے نہیں سنا اور اس کے بعد فرمایا کہ میں تمہارے سامنے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتا ہوں اور تم کہتے ہو ہم ضرور منع کریں گے۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

بلال بن عبداللہ۔ یہ بلال ہیں۔حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب قرشی عدوی کے بیٹے ہیں۔حدیث میں بڑے سنجیدہ تھے۔

تشریح:اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اپنے بیٹے حضرت بلالؒ پر سرزنش کرنے جو ذکر کیا گیا ہے،اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مبارک سے تقابل محسوس ہوتا ہے جو''معارضه علي وجه المكافحه'' کے ضمن میں آتا ہے اور ہے بھی بلا عذر، گوکہ رائے ان کی صحیح تھی اور اب بھی علماء کرام عورتوں کو گھروں سے نکلنے کی ممانعت فرماتے ہیں، چنانچہ ھدایہ میں ہے کہ امام کو چاہیے کہ فی زمانہ جماعت کی نماز میں عورتوں کی امامت کی نیت نہ کرے،جس کی وجہ ابن ہمام کے مطابق یہی ہے کہ عورتون کو جماعت کی نماز میں شرکت سے روکا گیا ہے،اس مسئلہ کی تفصیل پیچھے گذر چکی ہے۔

۱۰۸۳:وَفِيْ رِوَايَةِ سَالِمٍ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ فَاَقْبَلَ عَلَيْهِ عَبْدُ اللّٰهِ فَسَبَّهٗ سَبًّا مَا سَمِعْتُ سَبَّهٗ مِثْلَهٗ قَطُّ وَقَالَ اُخْبِرُكَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَقُوْلُ وَاللّٰهِ لَنَمْنَعُهُنَّ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۳۲۸/۱حديث رقم (۱۴ـ۴۴۲)وأخرجه أبو داوٗد فی السنن ۳۸۲/۱حديث رقم ۵۶۶ـوابن ماجه ۸/۱حديث رقم ۱۶ـوأحمد فی المسند ۱۴۰/۲ـ

ترجمہ:ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ سالم نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ''پھر سیدنا عبداللہؓ بلال رحمۃ اللہ علیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں اس قدر برا بھلا کہا کہ میں نے کبھی سیدنا عبداللہؓ کی زبان سے انہیں اس قدر برا بھلا کہتے نہیں سنا اور اس کے بعد کہا کہ''میں تو کہتا ہوں کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور تم کہتے ہو کہ اللہ کی قسم ہم انہیں ضرور منع کریں گے''۔(مسلم)

راویٔ حدیث:

سالم بن عبداللہ۔ یہ''سالم'' حضرت عبداللہ بن عمر خطاب کے بیٹے ہیں''ابوعمر''ان کی کنیت ہے۔قریشی عدوی اور مدنی ہیں مدینہ کے فقہاء میں سے یہ بھی ہیں۔تابعین کے سرخیل اور علماء ومعتمدین میں سے ہیں۔ان کا انتقال ۱۰۶ھ میں مدینہ میں ہوا۔

تشریح: واقعۂ مذکورہ کی نظیر کے طور پر امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے یہ روایت سنائی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کدو بہت پسند تھا،اس روایت کو سن کر ایک شخص بولا کہ مجھے تو کدو پسند نہیں ہے،امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً تلوار سونت لی اور فرمایا کہ توبہ کر کے اپنے ایمان کی تجدید کر،ورنہ میں تجھے ابھی قتل کرتا ہوں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ زیر بحث واقعہ کی توجیہہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دراصل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے بلال نے جب مسجد میں عورتوں کی حاضری پر پیش آنے والے مفاسد ومنکرات پر مجتہدانہ نظر ڈالی تو وہ قسم کھا بیٹھے کہ عورتوں کو مساجد میں آنے سے ضرور روکا جائے گا۔لیکن ان کے والد گرامی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان کے اس اجتہاد وقیاس کی تردید فرمادی کیونکہ نص اور رائے کا تو آپس میں کوئی تقابل بنتا ہی نہیں ہے۔اور بہر حال نص کو ترجیح ہونا ایک مسلمہ اصول ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ

۱۰۸۴: وَعَنْ مُجَاهِدٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَايَمْنَعَنَّ رَجُلٌ اَهْلَهٗ اَنْ يَّأْتُوا الْمَسَاجِدَ فَقَالَ ابْنٌ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فَاِنَّا نَمْنَعُهُنَّ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ اُحَدِّثُكَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَقُوْلُ هٰذَا قَالَ فَمَا كَلَّمَهٗ عَبْدُاللّٰهِ حَتّٰى مَاتَ ۔ (رواہ احمد)

أخرجه أحمد في المسند ٢/٣٦۔

ترجمہ: حضرت مجاہد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی آدمی اپنی بیوی کو مسجد میں جانے سے منع نہ کرے یہ سن کر حضرت عبداللہ کے بیٹے بلال نے عرض کیا کہ ہم تو ان کو ضرور منع کریں گے حضرت عبداللہ بن عمر نے ان سے کہا کہ میں تمہارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تم یہ کہہ رہے ہو کہ ہم ضرور منع کریں گے۔ اس حدیث کے راوی فرماتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے بیٹے سے موت تک گفتگو نہیں کی۔ (احمد)

تشریح: اس حدیث کی توضیح وتشریح میں علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے تو اس شخص پر بہت تعجب ہوتا ہے جو اپنے آپ کو "سنی" بھی کہتا ہے اور پھر حدیث معلوم ہونے کے باوجود اپنی رائے کو بھی حدیث پر ترجیح دیتا ہے، ایسے نام نہاد سنی اور بدعتی میں پھر فرق ہی کیا رہ جاتا ہے؟ کیا ایسے لوگوں نے یہ روایت نہیں سن رکھی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائیں۔

اب آپ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی کو دیکھ لیجئے جن کا شمار اکابر اور فقہاءِ صحابہ میں ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں وہ کیسے غضبناک ہوئے کہ اپنے جگر گوشہ سے بات چیت اور گفتگو تک کرنا چھوڑ دی، تاکہ دوسرے لوگ اس واقع سے عبرت حاصل کر سکیں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تقریر سے علماءِ احناف پر سوءِ اعتراض کی بو واضح محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ فقہاء احناف اپنی رائے کو حدیث کو حدیث پر مقدم وراجح قرار دیتے ہیں، اس بناء پر انہیں "اصحاب الرأی" بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ یہ نہیں جانتے کہ فقہاء احناف کو "اصحاب الرائی" کہنے کی وجہ ان کی دقت نظر، پختگی رائے اور حذاقت عقل ہے۔ اسی لئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ فقہی مسائل میں ساری دنیا کے لوگ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بچے ہیں۔ اور علامہ ابن حزم فرماتے ہیں کہ تمام فقہاء احناف کا اپنے امام کے اس مذہب پر اتفاق ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں کوئی ضعیف حدیث بھی اگر مل جائے تو وہ قیاس اور رائے سے زیادہ اولیٰ بالعمل ہے۔ جیسا کہ علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا ہے۔

ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "المناقب الحسان" میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ بات سب کو معلوم ہونی چاہیے کہ بعض علماء کی طرف سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردوں کیلئے "اصحاب الرائی" کا جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے ان کا مقصد امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردوں کی توہین وتنقیص ہرگز نہیں ہوتا، اور نہ ہی وہ ان کی طرف اپنی رائے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت

اور اقوال صحابہ پر مقدم کرنے کی نسبت کرنا چاہتے ہیں کیونکہ فقہاء احناف اس سے بری ہیں۔

چنانچہ خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے متعدد طرق سے منقول ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں سب سے پہلے قرآن حکیم کا حکم لیتے تھے، اگر کسی مسئلہ کا حکم قرآن کریم میں نہ ملتا تو حدیث وسنت سے اس کی رہنمائی حاصل کرتے، اگر حدیث میں بھی کسی مسئلہ کا حکم نہ ملتا تو وہ اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنے لئے مشعل راہ بناتے، اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں کسی مسئلہ میں مختلف ہوتے تو وہ ان میں سے اس قول کو اختیار کرتے جو قرآن وسنت کے زیادہ قریب ہوتا، اور اگر کسی مسئلہ میں اقوال صحابہ بھی ملتے تو وہ تابعین کا قول نہیں لیتے تھے بلکہ تابعین کی طرح خود بھی اجتہاد فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی منقول ہے کہ جب کسی مسئلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث مل جائے تو وہ ہمارے سرآنکھوں پر ہوتی ہے۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مختلف اقوال ہمیں ملتے ہیں تو ہم ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیتے ہیں اور اگر کسی مسئلہ میں تابعین کا کوئی قول ہمارے پاس آتا ہے تو ہم اس کی پیروی کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔

اسی طرح امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے لوگوں پر تعجب ہے، لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے رائے سے فتوی دیتا ہوں، حالانکہ میں تو ان ہی چیزوں کی روشنی میں فتوٰی دیتا ہوں جو مجھ تک اپنے بزرگوں سے منتقل ہو کر پہنچی ہیں۔ نیز امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کسی شخص کیلئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اجماع صحابہ کی موجودگی میں کسی مسئلے میں اپنی رائے دے، ہاں! اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف رہا ہو تو ہم ان کے مختلف اقوال میں سے کتاب وسنت کے قریب ترین قول کو اپنے اجتہاد سے اختیار کر سکتے ہیں، اور جب معاملہ اس سے بھی باہر نکل جائے تو اجتہاد کی اجازت ہے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اسی باریک بینی اور دقت عقل کی وجہ سے امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ (جو خود شافعی المسلک تھے، لیکن اس کے باوجود) فقہ حنفی کی کتابوں کا بکثرت مطالعہ کرتے تھے، اسی وجہ سے ان کے بھانجے اور مشہور فقیہہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ وہ شافعی مسلک کو خیر باد کہہ کر مسلک حنفی اختیار کریں جیسا کہ خود امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے۔

فائدہ: ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ طویل حوالہ نقل کرنے کے بعد حضرت مؤلف نے دوبارہ اسی مسئلہ کو آدھے صفحے میں بیان فرمایا ہے کہ کیا عورتیں جماعت کیلئے اپنے گھروں سے نکل کر مسجد میں آسکتی ہیں یا نہیں؟ تطویل اور تکرار سے بچنے کیلئے ہم اسے حذف کرتے ہیں کیونکہ پہلے بھی یہ مسئلہ مفصل طور پر ذکر کیا جا چکا ہے۔ (احقر مترجم)

بَابُ تَسْوِيَةِ الصَّفِّ

صفوں کے برابر کرنے کا بیان

الفصل الاوّل:

صف سیدھی نہ رکھنے پر وعید

۱۰۸۵: عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُسَوِّيْ صُفُوْفَنَا حَتّٰى كَاَنَّمَا يُسَوِّيْ بِهَا الْقِدَاحَ حَتّٰى رَاٰى اَنَّا قَدْ عَقَلْنَا عَنْهُ ثُمَّ خَرَجَ يَوْمًا فَقَامَ حَتّٰى كَادَاَنْ يُكَبِّرَ فَرَاٰى رَجُلًا بَادِيًا صَدْرُهٗ مِنَ الصَّفِّ فَقَالَ عِبَادَ اللّٰهِ لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَكُمْ اَوْلَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ وُجُوْهِكُمْ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢٠٦/٢ حديث رقم ٧١٧۔ ومسلم في صحيحه ٣٢٤/١ حديث رقم (١٢٨۔٤٣٦) وأبو داؤد في السنن ٤٣٢/١ حديث رقم ٦٦٣۔ والترمذي ٤٣٨/١ حديث رقم ٢٢٧۔ والنسائي ٨٩/٢ حديث رقم ٨١٠۔ وابن ماجه ٣١٨/١ حديث رقم ٩٩٤۔ وأحمد في المسند ٢٧٧/٤۔

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صف اس طرح سیدھی کرتے تھے گویا کہ ان صفوں سے تیر کو سیدھا کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صفوں کی سیدھا کرنے کی اہمیت کو سمجھ گئے ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور نماز کے لئے کھڑے ہو گئے اور تکبیر شروع ہونے کو تھی کہ ایک آدمی کا سینہ سب سے آگے نکلا ہوا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ لیا اور فرمایا اے اللہ کے بندو اپنی صفوں کو سیدھا رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان اختلاف پیدا کر دے گا۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث مبارکہ میں صفوں کی درستگی کو تیروں سے درست کرنے کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے ''قداح'' لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا اطلاق اس تیر پر ہوتا ہے جس کی نوک تیز نہ کی گئی ہو، اور تیر کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ صفوں کے سیدھا ہونے میں انتہائی مبالغہ ثابت کرنا ہے۔ کیونکہ تیر کے ساتھ تشبیہ کا فائدہ صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب صفیں تیر کی طرح سیدھی ہوں۔

رہی یہ بات کہ یہاں ''قداح'' کا لفظ جمع کی صورت میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ ''قدح'' مفرد سے بھی کام چل سکتا تھا؟ تو جمع کا صیغہ صفوں کے اعتبار سے لایا گیا ہے یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہر صف کو علیحدہ علیحدہ سیدھا کروایا کرتے تھے جیسے تیر بنانے والا ہر ہر تیر کو علیحدہ علیحدہ بناتا ہے اور نہ صرف یہ کہ بناتا ہے بلکہ سیدھا بناتا ہے۔ یہ تقریر تو علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ، ابن ملک اور ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے جبکہ ہماری رائے میں یہاں جمع کا لفظ ''صفوں'' کے اعتبار سے نہیں، صفوں میں کھڑے ہونے والے افراد کے اعتبار سے لایا گیا ہے۔

بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ حدیث کے اس جملہ ''یسوی بها القداح'' میں ایک نکتہ کی رعایت ملحوظ خاطر رکھی گئی ہے

(کیونکہ حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ نبی ﷺ ہماری صفوں کو اس طرح سیدھا فرماتے تھے کہ ان کے ذریعے تیروں کو بھی سیدھا کیا جا سکتا تھا) بظاہر یہ جملہ اس طرح ہونا چاہیے تھا: "فانما یسوھا بالقداح"۔ "گویا کہ ان صفوں کو تیروں سے سیدھا فرمایا ہو"۔

"اس صورت میں باء آلہ کیلئے ہوگی"، لیکن یہاں ترتیب بدل کر فرمایا گیا ہے کہ گویا صفوں سے تیروں کو سیدھا کیا گیا ہو، جو کہ صفوں کی درستگی میں انتہائی مبالغہ اور تاکید کی دلیل ہے۔

یہ تقریر تو علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے لیکن اس تقریر کی روشنی میں "بہا" ضمیر کا مرجع "صفوف" کو قرار دینے کی صورت میں "باء" کا آلہ کیلئے ہونا غیر واضح سی بات معلوم ہوتی ہے، اس لئے اس سلسلہ میں اظہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "بہا" ضمیر کا مرجع "تسویۃ" کو قرار دیا جائے جو کہ "یسوی" فعل سے مفہوم ہو رہا ہے، یا پھر ضمیر کا مرجع تو "صفوف" ہی کو قرار دیا جائے لیکن باء کو محذوف کے متعلق قرار دیتے ہوئے تقدیری عبارت یہ نکالی جائے: "کانما یسوی مشبھا بھا القداح"۔

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث مبارکہ میں تسویہ صفوف کی اہمیت اس کی پابندی نہ کرنے کی صورت میں تردیدی کلام کی صورت اختیار کی گئی ہے کہ اگر تم تسویہ صفوف کا اہتمام نہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان اختلاف پیدا فرما دیں گے، کیونکہ کسی شخص کا سینہ نکال کر صف سے آگے ہونا ایک اندرونی و باطنی امتیاز کا مظہر ہے جو آگے چل کر باہمی کینہ اور مخالفت کا سبب بن سکتا ہے اور یوں دل بدل سکتے ہیں، اور جب دل بدل جاتے ہیں تو چہرے بدل جانا بھی آسان ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ پھر ایک دوسرے کو چہرہ پھیر کر دوسری طرف نکلنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔

مظہر فرماتے ہیں کہ ظاہری ادب، باطنی ادب کی علامت اور نشانی ہے، مطلب حدیث کا یہ ہے کہ اگر تم ظاہری طور پر اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت نہیں کرو گے تو اس سے تمہاری باتوں میں اختلاف اور تضاد پیدا ہوگا۔ جس سے کدورتیں پیدا ہو کر ظاہر میں سرایت کر جائیں گی، آہستہ آہستہ تمہارے درمیان عداوت پیدا ہو جائے گی اور تم ایک دوسرے سے منہ موڑنے لگو گے۔

اور بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ "مخالفتِ وجوہ" کا مطلب یہ ہے کہ چہروں کو پیچھے کی طرف پھیر دیا جائے گا یا ان کی شکل وصورت ہی تبدیل کر دی جائے گی۔ اس صورت میں یہ جملہ تہدید پر محمول ہوگا۔ یا اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہوگا کہ بعض اوقات مخالفت اس حالت تک بھی پہنچا دیتی ہے۔

پہلی صف مکمل ہونے کے بعد دوسری صف بنائی جائے

۱۰۸۶: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَاَقْبَلَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَجْهِهٖ فَقَالَ اَقِيْمُوْا صُفُوْفَكُمْ وَتَرَاصُّوا فَاِنِّيْ اَرَاكُمْ مِنْ وَّرَآءِ ظَهْرِيْ (رواہ البخاری وفی المتفق علیہ) قَالَ اَتِمُّوا الصُّفُوْفَ فَاِنِّيْ اَرَاكُمْ مِنْ وَّرَآءِ ظَهْرِيْ۔

أخرجه البخاري في صحيحه ٢٠٨/٢ حديث رقم ٧١٩۔ ومسلم في صحيحه ٣٢٤/١ حديث رقم (١٢٥-٤٣٤) والنسائي ٩٢/٢ حديث رقم ٨١٤۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن نماز کی اقامت کہی گئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنا

رخ ہماری طرف متوجہ کر کے فرمایا کہ اپنی صفیں سیدھی رکھو اور آپس میں مل کر کھڑے ہو جاؤ اور یقیناً میں تمہیں پیٹھ کے پیچھے سے دیکھتا ہوں۔(بخاری) بخاری اور مسلم دونوں کی روایت میں اس طرح آپ نے فرمایا صفوں کو مکمل کرلیا کرو میں تمہیں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔

تشریح: اس حدیث میں بھی بنیادی طور پر صفوں کی درستگی اور درمیان میں خلاء باقی نہ رکھنے کی تاکید کی گئی ہے اور اس کیلئے "تراصوا" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت میں بھی استعمال ہوا ہے:۔

"ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانھم بنیان مرصوص"

گویا اس حدیث میں صفوف نماز کی صفوف جہاد کے ساتھ مشابہت مطلوب و مقصود ہے، کیونکہ آیتِ مذکورہ کا تعلق تو جمہور محدثین کے نزدیک جہاد سے ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر انہیں صفوں کی درستگی کا حکم دیا کرے، تاہم یہ تلقین بھی اسی وقت ضروری ہے جب صفوں میں درستگی نہ ہو، خالی جگہ موجود ہو، بصورت دیگر اس کی تاکید باقی نہیں رہتی لیکن متوجہ کرنا پھر بھی اچھا ہے۔

نیز اس حدیث میں یہ جو فرمایا گیا کہ میں تمہیں اپنی پشت کی طرف سے بھی دیکھتا ہوں، تو اس کا تعلق "مکاشفہ" سے ہے اور یاد رہے کہ ہمیشہ "مکاشفہ" ہونا کوئی ضروری امر نہیں، لہٰذا "لا اعلم ما وراء جداری" کے ساتھ اس کی کوئی منافات بھی نہیں رہتی، پھر زیر بحث حدیث نماز اور نمازیوں کے احوال کے ساتھ خاص ہے اور "لا اعلم" والی حدیث عام ہے۔

صفوں کو سیدھا رکھنا نماز کی تکمیل ہے

۱۰۸۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَةِ الصَّلَاةِ متفق عليه اِلَّا اَنَّ عِنْدَ مُسْلِمٍ مِنْ تَمَامِ الصَّلَاةِ۔

أخرجه البخاري في صحيحه ۲۰۹/۲ حديث رقم ۷۲۳۔ومسلم ۳۲٤/۱ حديث رقم (۱۲٤۔۴۳۳)۔وأبو داوٗد في السنن ٤۳٤/۱ حديث رقم ٦٦٨۔وابن ماجه ۳۱۷/۱ حديث رقم ۹۹۳۔والدارمي ۳۲۳/۱ حديث رقم ۱۳٦۳۔ وأحمد في المسند ۱۷۷/۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم اپنی صفوں کو سیدھا رکھا کرو کیونکہ صفوں کو سیدھا رکھنا نماز کی تکمیل میں سے ہے۔(بخاری، مسلم) اور مسلم کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں من تمام الصلوۃ کہ نماز کی تکمیل اس طرح ہے۔

صفوں کو سیدھا رکھنا ورنہ اختلاف پیدا ہو جائے گا

۱۰۸۸: وَعَنْ اَبِيْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِيِّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْسَحُ مَنَاكِبَنَا فِي الصَّلَاةِ وَيَقُوْلُ اِسْتَوُوْا وَلَا تَخْتَلِفُوْا فَتَخْتَلِفَ قُلُوْبُكُمْ لِيَلِيَنِّيْ مِنْكُمْ اُولُوا الْاَحْلَامِ وَالنُّهٰى ثُمَّ

الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ قَالَ اَبُوْ مَسْعُوْدٍ فَاَنْتُمُ الْيَوْمَ اَشَدُّ اِخْتِلاَ فًا۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۳۲۳حديث رقم (۱۲۲۔۴۳۲)۔وأبوداؤدفي السنن ۱/۴۳۶حديث رقم ۶۷۴۔ والنسائي ۲/۸۷حديث رقم ۸۰۷۔وابن ماجه ۱/۳۱۲حديث رقم ۹۷۶۔والدارمي ۱/۳۲۴حديث رقم ۱۲۲۶۔ وأحمد في المسند ۴/۱۲۲۔

ترجمہ: حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ انصاری سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور اس وقت آپ نے ہمارے کندھوں پر اپنا ہاتھ مبارک رکھا تھا کہ سیدھے اور برابر رہو اور مختلف یعنی آگے پیچھے نہ ہو ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ اور تم میں سے جو لوگ عاقل اور بالغ ہوں وہ میرے قریب کھڑے ہوں پھر وہ لوگ جو ان کے قریب ہوں پھر وہ لوگ جو ان کے قریب ہوں۔ حضرت ابومسعود انصاریؓ نے اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ آج تم لوگوں میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔

اختلافِ ابدان واعضاء سے اختلافِ قلوب کیونکر؟

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک حدیث میں آتا ہے دل تمام اعضاء کے تابع ہے، اگر اعضاء میں اختلاف ہوگا تو دلوں میں بھی اختلاف ہوگا اور جب اختلاف ہوگا تو فساد ہوگا، اس طرح تمام اعضاء میں بھی فساد ہوگا، یہی مطلب ہے اس حدیث کا۔

لیکن ہماری تحقیق کے مطابق دل کی حیثیت اس بادشاہ کی سی ہے جس کی اطاعت کی جاتی ہو اور اس رئیس کی سی ہے جس کی بات لوگ مانتے ہوں اور اعضاء کی حیثیت تابع کی سی ہے، ظاہر ہے کہ جب متبوع صحیح ہوگا تو تابع بھی صحیح ہوگا۔

اور جب بادشاہ مستقیم ہوگا تو تمام اعضاء بھی مستقیم ہوں گے۔ اسی بات کی وضاحت اس مشہور حدیث میں فرمائی گئی ہے۔

''الا ان في الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد، واذا فسدت فسد الجسد الا وهي القلب''

خلاصۂ تحقیق یہ کہ دل اور اعضاء کے درمیان ایک ایسا عجیب تعلق ہے کہ ایک کی مخالفت دوسرے میں اثر انداز ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ مرکز اور مدار کی حیثیت دل ہی کو حاصل ہے، دیکھیے! اگر کسی شخص کو بیرونی طور پر سردی لگ رہی ہو تو وہ جسم کے اندرونی نظام میں بھی اثر کرتی ہے، اس طرح اگر کسی کو اندرونی طور پر سردی لگ رہی ہو تو وہ جسم کے بیرونی نظام پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ دل اور اعضاء کو ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص طرح کا تعلق ہے۔

''اُولُو الْاَحْلَامِ'' سے کیا مراد ہے؟

احلام، حِلم کی جمع ہے اور حلم سے مراد شدید غصہ کے وقت ضبطِ نفس، وقار، سکون، مستقل مزاجی اور بردباری سے کام لینے کی صلاحیت ہے، اس کا اطلاق ''عقل'' پر بھی کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ تمام چیزیں عقل کے تقاضے ہی سے سرزد ہوتی ہیں اور عقلاء کا شعار سمجھی جاتی ہیں، اور بعض حضرات کی رائے کے مطابق اولوالاحلام سے مراد بالغ افراد ہیں، اس صورت میں یہ حلُم کی جمع ہوگی اور اس سے مراد وہ خواب ہوگا جو انسان دیکھتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس پر غسل واجب ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ''والنھٰی'' نھیۃ کی جمع ہے یعنی وہ عقل جو انسان کو ارتکابِ قبائح سے روکتی ہے، حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ عاقل بالغ افراد کو نماز میں میرے قریب رہنا چاہیے تا کہ وہ اپنی شرافت، فطانت، تیقظ و بیداری سے احکام نماز کو بہتر طریقے پر

ضبط کر سکیں، اور اگر نماز میں کوئی امر پیش آ جائے تو وہ لوگوں کی امامت کر سکیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں صاحبانِ عقل وعرفان کو آگے آگے رہنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے تا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ نماز کو اچھی طرح محفوظ کر سکیں، اور احکام وسنن کو صحیح طرح ضبط کر سکیں۔ اور بعد میں آنے والوں کو پہنچا سکیں۔ نیز اس میں انتہائی فصاحت وبلاغت کے ساتھ اس فضیلت کے حصول کی بھی ترغیب دی گئی ہے، اور جو لوگ اس میں حصہ نہ ڈال سکیں، ان کا مرتبہ کم ہونے کی طرف بھی اشارہ موجود ہے۔

ثم الذين يلونهم: اس پہلے جملے کا مصداق قریب البلوغ یا عقل وشعور میں اولوا الاحلام کے قریب افراد مراد ہیں اور دوسرے سے مراد وہ بچے ہیں جو پاکی اور ناپاکی میں فرق کر سکیں، یا وہ لوگ جو عقل وشعور میں پہلوں کے مقابلے میں بچوں کا مرتبہ رکھتے ہوں، بچوں کی صف کے بعد پھر عورتوں کی صف قائم کی جائے گی کیونکہ مذکر کو مؤنث پر مطلقاً بزرگی وبرتری حاصل ہے، اور بعض حضرات کی رائے کے مطابق اس سے مخنث مراد ہیں۔ اس اعتبار سے یہاں ترتیب صفوف کی طرف اشارہ مقصود ہوگا۔

فانتم اليوم اشد اختلافا: علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کو خطاب فرمایا جا رہا ہے جو فتنہ انگیزی کا سبب بنے تھے، اور اس خطاب کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ اس اختلاف اور فتنہ انگیزی کا سبب تسویہ صفوف کا اہتمام نہ کرنا ہے اور بعض حضرات کی رائے کے مطابق "اشد" سے مراد اصل فعل ہے اور یہاں اس سے عدول "مبالغہ" کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

مساجد میں بازاروں کی طرح شور وغل نہ کرو

۱۰۸۹: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيَلِيَنِيْ مِنْكُمْ اُولُوا الْاَحْلَامِ وَالنُّهٰى ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثَلَاثًا وَاِيَّاكُمْ وَهَيْشَاتِ الْاَسْوَاقِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٣٢٣حديث رقم (١٢٣-٤٣٢)۔وأبوداوٗد في السنن ١/٤٣٦حديث رقم ٦٧٥۔والترمذي في السنن ١/٤٤٠حديث رقم ٢٢٨۔والدارمي ١/٣٢٤حديث رقم ١٢٦٧۔وأحمد في المسند ١/٤٥٧۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ عقل مند اور صاحب بصیرت ہوں اور بالغ ہوں وہ نماز میں میرے قریب کھڑے ہوں اور پھر وہ لوگ کھڑے ہوں جو ان کے قریب ہوں یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی اور پھر فرمایا مساجد میں بازاروں کی طرح شور وغل کرنے سے بچو۔ (مسلم)

تشریح: قولہٗ **وایاکم وهيشات الاسواق:** هيشات، هيشة کی جمع ہے جس کا معنی ہے بلند آواز، بازاروں کی طرح مساجد میں اونچی آواز سے بولنے اور گفتگو کرنے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کیونکہ نماز جنابِ الٰہی میں حاضری کا ذریعہ ہے، اس میں سکوت وسکون اور آدابِ بندگی کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

بعض حضرات "هيشة" کا معنی "اختلاط" بیان فرماتے ہیں، اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح بازار

والے آپس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ بالغ اور نابالغ، عاقل اور غیر عاقل، بچے اور بوڑھے، مرد اور عورتیں آپس میں گھل مل جاتے ہیں اور ان میں تقدم و تاخر کے اعتبار سے بھی کوئی امتیاز اور فرق نہیں ہوتا، تم نماز میں اس طرح کے اختلاط سے بچو۔ اور یہی معنی اس مقام کے مناسب ترین ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بازاری کاموں میں اپنے آپ کو زیادہ مشغول ہونے سے بچاؤ، ورنہ تم میرے قریب کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکو گے اور یہ اشتغال تمہارے لئے رکاوٹ بن جائے گا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلی صف میں کھڑے ہونے سے بچتے تھے

۱۰۹۰: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ اَصْحَابِہٖ تَاَخُّرًا فَقَالَ لَھُمْ تَقَدَّمُوْا وَائْتَمُّوْا بِیْ وَلْیَاْتَمَّ بِکُمْ مَنْ بَعْدَکُمْ لَایَزَالُ قَوْمٌ یَتَاَخَّرُوْنَ حَتّٰی یُؤَخِّرَھُمُ اللّٰہُ.

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۳۲۵/۱ حديث رقم (۱۳۰-۴۳۸) وأبو داوٗد في السنن ۴۳۸/۱ حديث رقم ۶۸۰۔ والنسائي ۸۳/۲ حديث رقم ۷۹۵۔ وابن ماجه ۳۱۳/۱ حديث رقم ۹۷۸۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ صحابہ کرام پہلی صف میں کھڑا ہونے سے پیچھے ہٹتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا آگے بڑھو اور میری اقتدا کرو تاکہ تمہارے پیچھے کھڑے ہونے والے لوگ تمہاری اقتدا کریں اور پھر فرمایا کہ لوگ ہمیشہ پیچھے ہوتے رہیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بھی انہیں مؤخر کر دے گا۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ''تاخر'' سے مراد نماز کی صفوں میں پیچھے ہونا ہے یا مقام و مرتبۂ علم میں پیچھے ہونا ہے۔ پہلی صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ اہل عقل و دانش اور اہل علم و فضل کو پہلی صف میں کھڑا ہونا چاہیے اور جو ان سے کم رتبہ ہوں، انہیں دوسری صف میں کھڑا ہونا چاہیے۔ کیونکہ دوسری صف والے اگرچہ حکمًا نہ سہی، لیکن ظاہرًا پہلی صف والوں ہی کی اقتداء کرتے ہیں اور دوسری صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ تم میں سے ہر ایک کو احکام شریعت کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ اسی طرح تمہارے بعد آنے والوں اور ہر زمانے کے لوگوں کو احکام و فرائض کا علم حاصل کرنا چاہیے۔

ملائکہ کی صفوں کی طرح صف بندی کرو

۱۰۹۱: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَۃَ قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَرَاٰنَا حَلَقًا فَقَالَ مَالِیْ اَرَاکُمْ عِزِیْنَ ثُمَّ خَرَجَ عَلَیْنَا فَقَالَ اَلَا تَصُفُّوْنَ کَمَا تَصُفُّ الْمَلٰٓئِکَۃُ عِنْدَ رَبِّھَا فَقُلْنَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَیْفَ تَصُفُّ الْمَلٰٓئِکَۃُ عِنْدَ رَبِّھَا قَالَ یُتِمُّوْنَ الصُّفُوْفَ الْاُوْلٰی وَیَتَرَاصُّوْنَ فِی الصَّفِّ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۳۲۲حدیث رقم (۱۱۹ـ۴۳۰)ـوأخرجه أبو داوٗد فی السنن ۱/۴۳۱حدیث رقم ۶۶۱ـوالنسائی ۲/۹۲حدیث رقم ۸۱۶وابن ماجه ۱/۳۱۷حدیث رقم ۹۹۲ـ

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور ہمیں مختلف حلقوں میں بیٹھا دیکھ کر ارشاد فرمایا کیا وجہ ہے کہ میں تم کو الگ الگ جماعتوں میں بیٹھے ہوئے دیکھ رہا ہوں پھر اسی طرح ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ تم لوگ اس طرح صف بندی کیوں نہیں کرتے کہ جس طرح فرشتے اللہ کے ہاں صف کی حالت میں ہوتے ہیں ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ ملائکہ اللہ کے ہاں کس طرح صف بندی کرتے ہیں؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ پہلی صفوں کو پورا کرتے ہیں اور صف میں اچھی طرح مل کر کھڑے ہوتے ہیں۔ (مسلم)

تشریح: قولهٗ حلقا: جوہری کے مطابق یہ ح اور ل کے فتحہ کے ساتھ حلقة کی جمع خلاف قیاس ہے، اور اصمعی کے نزدیک یہ حاء کے کسرہ اور لام کے فتحہ کے ساتھ حلقة کی جمع ہے جیسے قصعة کی جمع قصع، اور مطلب اس کا بقول علامہ طیبی رحمہ اللہ کے یہ ہے کہ ہم میں سے ہر صف کے لوگ حلقہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے، یا یہ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے قریبی ساتھی سے جڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔

اسی طرح ''عزین'' عزة کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے متفرق ٹولیاں اور جماعتیں، علامہ طیبی رحمہ اللہ کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اس طرح بیٹھے ہوئے دیکھ کر اس پر نکیر فرمائی، گویا اصل مقصد صحابہؓ کرام پر اس طرح بیٹھنے کو ناپسندیدہ واضح کرنا تھا، پھر نبی ﷺ نے صحابہ کرام سے مخاطب ہو کر ''مالكم'' نہیں فرمایا بلکہ ''مالی اراكم'' فرمایا کیونکہ یہ زیادہ بلیغ ہے جیسے ''مالی لا اری الهد هد''۔

مردوں اور عورتوں کی بہترین صف کون سی ہے؟

۱۰۹۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ صُفُوْفِ الرِّجَالِ اَوَّلُهَا وَشَرُّهَا اٰخِرُهَا وَخَيْرُ صُفُوْفِ النِّسَاءِ اٰخِرُهَا وَشَرُّهَا اَوَّلُهَا ـ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۳۲۶حدیث رقم (۱۳۲ـ۴۴۰)ـوأبو داوٗد فی السنن ۱/۴۳۸حدیث رقم ۶۷۸ـوالترمذی ۱/۴۳۵حدیث رقم ۲۲۴ـوالنسائی ۲/۹۳حدیث رقم ۸۲۰ـوابن ماجه ۱/۳۱۹حدیث رقم ۱۰۰۰ـوالدارمی ۱/۳۲۵حدیث رقم ۱۲۶۸ـوأحمد فی المسند ۳/۱۶ـ

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مردوں کی بہترین صف پہلی اور بدترین صف آخری ہے اور عورتوں کی بہترین صف آخری ہے اور بدترین صف پہلی ہے۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث مبارکہ میں مردوں کی پہلی صف کو بہترین قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ امام کے انتہائی قریب اور عورتوں سے بہت دور ہوتی ہے اور آخری صف کو ''شر'' قرار دیا گیا کیونکہ وہ امام سے دور اور عورتوں سے قریب ہوتی ہے، اس میں ''خیر'' کی مراد متعین کرتے ہوئے ابن ملک ''کثرت ثواب'' بیان فرماتے ہیں کیونکہ صف اول کے نمازیوں کو امام کے

حالات کا زیادہ علم ہوتا ہے۔

اسی طرح عورتوں کی آخری صف کو "خیر" قرار دینے کی وجہ مردوں سے دوری اور پہلی صف کو "شر" قرار دینے کی وجہ مردوں سے قرب ہے۔ اور ابن ملک فرماتے ہیں کہ اصل میں عورتوں کا مقام چونکہ مردوں کے بعد ہے اس لئے آخری صف ان کے مرتبے کے زیادہ لائق ہے، علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مردوں کو آگے بڑھنے کا حکم ہے، اس لئے جو جتنا زیادہ آگے بڑھے گا، شریعت کی نگاہوں میں وہ اتنا ہی زیادہ تعظیم کا مستحق ہوگا اور اس طرح اسے ایسی اضافی فضیلت حاصل ہو جائے گی جو دوسروں کو حاصل نہ ہوگی جبکہ عورتوں کو پردہ کا حکم ہے اس لئے ان کے مناسب حال پیچھے ہی رہنا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

"اخروھن کما اخرھن اللّٰہ"۔

"جس طرح اللہ نے ان کا ذکر بعد میں کیا ہے، تم بھی اپنی صفوں کے بعد ان کی صفیں بنایا کرو"۔

اس اعتبار سے آخری صف میں کھڑی عورت کی نسبت پہلی صف والی کو "شر" قرار دیا گیا، لیکن ظاہر ہے کہ جب تک صف اول ختم ہو کر دوسری صف کی ضرورت نہیں پڑے گی، اس وقت تک یہ حکم بھی متوجہ نہیں ہوگا کیونکہ یہاں تقدیم و تاخیر ممکن ہی نہیں ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صف اول سے مراد امام سے متصل والی صف ہے گو کہ درمیان میں منبر بھی کیوں نہ آتا ہو اور اگرچہ پہلی صف میں کھڑے ہونے والے نمازی تاخیر سے ہی کیوں نہ آئیں جبکہ بعض حضرات کی رائے کے مطابق اسے پہلی صف اسی صورت میں قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ درمیان میں کوئی چیز مثلاً منبر وغیرہ حائل نہ ہو، اگرچہ نمازی تاخیر سے ہی آئیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی یہی رائے ہے، اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ ہر وہ شخص پہلی صف میں شمار کیا جائے گا جو پہلے آئے، گو کہ پچھلی صف میں نماز پڑھے۔

پھر بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ صف اول کی افضلیت کا مقام اسی وقت تک ہے جب تک اس میں کوئی منکر نہ پایا جاتا ہو مثلاً ریشمی پردے وغیرہ کے ساتھ ملامست، یا کوئی ایسی چیز جو نماز میں دھیان کسی طرف اور لگا دے، ورنہ پچھلی صف میں ہی نماز پڑھ لینی چاہیے جیسا کہ بعض اسلاف کے حوالے سے منقول ہے۔

فائدہ: حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ اس موقع پر اختصار کی ترکیب اختیار کرتے ہوئے یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ان پانچوں حدیثوں کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے جیسا کہ ان کی عادت بھی ہے لیکن یہاں انہوں نے ہر حدیث کو نقل کرنے کے بعد "رواہ مسلم" کہا ہے، ممکن ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ یہ طریقہ وہاں اختیار کرتے ہوں جہاں تمام احادیث کی سند ایک ہو اور اس کے راویوں میں اتفاق ہو اور جہاں ایسی صورت نہ پائی جاتی ہوں، وہاں مصنف یہ طریقہ اختیار نہ کرتے ہوں۔ واللہ اعلم۔

الفصل الثّانی:

اگر صف میں خلا ہو تو شیطان داخل ہوگا

۱۰۹۳: عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رُصُّوْا صُفُوْفَكُمْ وَقَارِبُوْا بَيْنَهَا وَحَاذُوْا بِالْاَعْنَاقِ فَوَالَّذِيْ

نَفْسِیْ بِیَدِهٖ اِنِّیْ لَاَرَی الشَّیْطَانَ یَدْخُلُ مِنْ خَلَلِ الصَّفِّ کَاَنَّهَا الْحَذَفُ ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/ ٤٣٤ حدیث رقم ٦٦٧۔والنسائی ٢/ ٩٢ حدیث رقم ٨١٥۔

ترجمه: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنی صفوں کو متصل رکھو اور آپس میں قریب قریب رہو اور اپنی گردنیں برابر رکھو قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں شیطان کو بکری کے سیاہ بچے کی طرح تمہاری صفوں کی کشادگی میں داخل ہوتے دیکھتا ہوں۔(ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث میں صفوں کی درستگی کا حکم دیا گیا ہے تاکہ درمیان میں کسی قسم کا خلاء نہ رہے اور دو صفوں میں قرب رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جو اتنا زیادہ ہو کہ درمیان میں کوئی تیسری صف قائم کرنے کی گنجائش نہ رہے، اس طرح جسمانی قرب، باطنی قرب کا سبب بن جائے گا اور شیطان درمیان سے نہیں گذر سکے گا اور بظاہر یہ حکم اس صورت میں ہے جب کوئی عذر نہ ہو جیسے شدید قسم کی گرمی وغیرہ۔

نیز اس حدیث میں گردنوں کے برابر کرنے اور محاذات کا بھی حکم دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص، دوسرے سے اونچی جگہ پر کھڑا نہ ہو، جیسا کہ قاضی صاحب رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے اور علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گردنوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ ایک لمبے قد کا آدمی کسی ٹھگنے قد کے آدمی کے برابر اپنی گردن کیونکر لاسکتا ہے؟

''قولهٗ کانها الحذف: حذف حجاز کی چھوٹی اور کالی بکریوں کو کہا جاتا ہے، بعض حضرات کی رائے کے مطابق اسے یمن سے لایا جاتا ہے، اس کے نہ کان ہوتے ہیں اور نہ دم، اسی طرح اس کے جسم پر بال بھی نہیں ہوتے۔

اور ''کانها'' میں ضمیر کا مرجع ''شیطان'' ہے، رہی یہ بات کہ وہ تو مذکر ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ باعتبار خبر کے اسے مؤنث لایا گیا ہے، اور بعض حضرات کی رائے کے مطابق ''الحذف'' پر الف لام جنسی کی وجہ سے اسے مؤنث لایا گیا ہے جو کہ معنیٰ جمع ہوتا ہے، اور ایک نسخ میں ''کانه'' بھی آیا ہے، اس پر کوئی اشکال نہیں ہوتا، شرح طیبی میں بعض علماء کا یہ قول بھی مذکور ہے کہ اس ضمیر کو مذکر لانا بھی صحیح ہے باعتبار شیطان کے اور مؤنث لانا بھی صحیح ہے باعتبار ''الحذف'' کے ،اسلئے جولوگ یہاں تقدیری عبارت نکالتے ہیں اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

پہلی صف مکمل ہو کمی آخری صف میں ہو

۱۰۹۴: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتِمُّوا الصَّفَّ الْمُقَدَّمَ ثُمَّ الَّذِیْ يَلِيْهِ فَمَا کَانَ مِنْ نَقْصٍ فَلْيَکُنْ فِی الصَّفِّ الْمُؤَخَّرِ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/ ٤٣٥ حدیث رقم ٦٧١۔والنسائی ٢/ ٩٣ حدیث رقم ٨١٨۔

ترجمه: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا پہلی صف کو پورا کرو پھر اس کے بعد والی کو پورا کرو اور صف میں جو کمی رہے تو وہ کمی سب سے آخری صف میں ہو۔(ابوداؤد)

صفوں کے قیام کے وقت سب سے افضل قدم

۱۰۹۵: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ يَلُوْنَ الصُّفُوْفَ الْاُوْلٰى وَمَامِنْ خَطْوَةٍ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ خَطْوَةٍ يَمْشِيْهَا يَصِلُ بِهَا صَفًّا۔

(رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱/ ۴۳۲ حديث رقم ۶۶۴۔ وأخرجه النسائي ۲/ ۸۹ حديث رقم ۸۱۱۔

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ پہلی صفوں کے قریب ہوتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے اور فرشتے ان کے لئے استغفار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس قدم سے افضل کوئی قدم نہیں جو چل کر صف میں ملے اور خالی جگہ کو پر کردے۔ (ابوداؤد)

صف میں دائیں طرف کھڑا ہونا افضل ہے

۱۰۹۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلٰى مَيَامِنِ الصُّفُوْفِ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱/ ۴۳۷ حديث رقم ۶۷۶۔ وابن ماجه ۱/ ۳۲۱ حديث رقم ۱۰۰۵۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صفوں کی دائیں طرف کھڑے ہونے والے پر اللہ اپنی رحمت بھیجتے ہیں اور فرشتے ان کے حق میں استغفار کرتے ہیں۔ (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث کی شرح میں ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ صفوں کی دائیں طرف کو بائیں طرف پر فضیلت حاصل ہے۔ جیسا کہ کتاب التفسیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سب سے پہلے امام کے دائیں طرف متوجہ ہوتی ہے، جو دائیں طرف کے آخری کونے تک پھیل جاتی ہے، پھر بعد میں بائیں طرف متوجہ ہو کر اس کے آخری حصے تک پھیل جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود بعض علماء کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر بائیں جانب کی صف خالی رہ جائے تو اس کی فضیلت دائیں طرف سے بڑھ جائے گی کیونکہ صفوں کی درستگی اور دونوں سمتوں کی رعایت بھی ضروری ہے اور مسلم شریف میں حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ جب ہم نبی ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھتے تھے تو ہماری کوشش یہ ہوتی تھی کہ آپ ﷺ کی دائیں جانب کھڑے ہو کر نماز پڑھیں تاکہ جب آپ ﷺ سلام پھیریں تو رخ انور ہماری طرف متوجہ ہو خواہ سلام پھیرتے وقت یا نماز سے فارغ ہو کر نمازیوں کی طرف رخ انور پھیرنے کے وقت۔

رسول اللہ ﷺ صفوں کو اہتمام سے درست کرتے تھے

۱۰۹۷: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُسَوِّيْ صُفُوْفَنَا اِذَا اُقِيْمَتْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاِذَا اسْتَوَيْنَا كَبَّرَ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ١/ ٤٣٢ حديث رقم ٦٦٥۔

ترجمہ:حضرت نعمان بن بشیر سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم لوگ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو پہلے رسول اللہ ﷺ ہماری صفوں کو درست کرتے تھے جب صفیں برابر اور سیدھی ہو جاتیں پھر تکبیر تحریمہ کہتے۔ (ابوداؤد)

تشریح: ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ امام کیلئے صفوں کو سیدھا کروانے کے بعد تکبیر کہنا سنت ہے۔

رسول اللہ ﷺ دائیں اور بائیں رُخ کر کے صفوں کو سیدھا کرنے کا حکم دیتے تھے

١٠٩٨: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ عَنْ يَمِيْنِهٖ اِعْتَدِلُوْا سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ وَعَنْ يَّسَارِهٖ اِعْتَدِلُوْا سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ۔ (رواه ابو داود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ١/ ٤٣٥ حديث رقم ٦٧٠۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز شروع کرتے تھے تو پہلے اپنی دائیں طرف متوجہ ہو کر فرمایا کرتے تھے کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور اپنی صفیں برابر کر لو پھر بائیں طرف متوجہ ہو کر اسی طرح ارشاد فرماتے تھے کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ اور اپنی صفیں برابر کر لو۔ (ابوداؤد)

نماز میں کندھوں کو نرم رکھو

١٠٩٩: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خِيَارُكُمْ اَلْيَنُكُمْ مَنَاكِبَ فِي الصَّلَاةِ۔

(رواه ابو داود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ١/ ٤٣٥ حديث رقم ٦٧٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں کہ جن کے کندھے نماز میں نرم ہوں۔ (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو اور دوسرا شخص آ کر اسے صف سیدھی کرنے کیلئے کہے یا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خود ہی اسے آگے پیچھے کرنا چاہے تو اکڑنے کی بجائے اپنے آپ کو نرم کر لے اور اس کی بات مان لے، اس توجیہہ کے اعتبار سے ''الینکم'' کا معنی ہے ''اسرعکم انقیادا'' اور بعض حضرات نے اس کا مطلب ''دوران نماز سکون ووقار کو لازم پکڑنا'' بیان فرمایا ہے کہ دوران نماز ادھر ادھر نہ دیکھے، اس اعتبار سے ''الینکم'' کا معنی ہوگا ''اکثرکم سکینة ووقارا''۔

تیسرا معنی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر صف میں کچھ گنجائش ہو اور بعد میں آنے والا کوئی شخص اس خالی جگہ کو پر کرنے کیلئے صف میں داخل ہونا چاہیے اور اس کی وجہ سے تمہاری جگہ کچھ تنگ ہو جاتی ہو، تب بھی اسے نہیں روکنا چاہیے، میرک کے مطابق ان تینوں توجیہات میں سے پہلی توجیہہ زیادہ مناسب ہے اور اس کی تائید حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو

فصل ثالث میں ان الفاظ کے ساتھ آ رہی ہے۔

''ولینوا فی ایدی اخوانکم''

فائدہ: یہاں بھی اختصار کا تقاضا یہی تھا کہ مصف رحمۃ اللہ علیہ تمام احادیث نقل کرنے کے بعد کہہ دیتے کہ اس فصل کی تمام احادیث سنن ابی داؤد میں مروی ہیں' ہر حدیث کے بعد ''رواہ ابوداؤد'' کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ واللہ اعلم۔

الفصل الثّالث:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں

۱۱۰۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اسْتَوُوْا اسْتَوُوْا اِسْتَوُوْا فَوَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ اِنِّیْ لَاَ رَاكُمْ مِنْ خَلْفِیْ كَمَا اَرَاكُمْ مِنْ بَيْنِ يَدَیَّ۔

أخرجه النسائی فی السنن ۹۱/۲ حدیث رقم ۸۱۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم برابر اور سیدھے کھڑے ہوا کرو تین مرتبہ یہ حکم دیتے تھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جس طرح میں اپنے سامنے سے تمہیں دیکھتا ہوں اسی طرح اپنے پیچھے سے بھی تمہیں دیکھتا ہوں۔ (ابوداؤد)

صفِ اوّل کی فضیلت

۱۱۰۱: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى الصَّفِّ الْاَوَّلِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَعَلَى الثَّانِیْ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى الصَّفِّ الْاَوَّلِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَعَلَى الثَّانِیْ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى الصَّفِّ الْاَوَّلِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَعَلَى الثَّانِیْ قَالَ وَعَلَى الثَّانِیْ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ وَحَاذُوْا بَيْنَ مَنَاكِبِكُمْ وَلِيْنُوْا فِیْ اَيْدِیْ اِخْوَانِكُمْ وَسُدُّوا الْخَلَلَ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَدْخُلُ فِيْمَا بَيْنَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْخَذَفِ يَعْنِیْ اَوْلَادَ الضَّاْنِ الصِّغَارَ۔ (رواہ احمد)

أخرجه أحمد فی المسند ۲۶۲/۵۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ پہلی صف والوں پر اپنی رحمت نازل کرتے ہیں اور ملائکہ ان کے لئے استغفار کی دعا کرتے ہیں یہ سن کر صحابہ کرام نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! دوسری صف والوں پر بھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ پہلی صف والوں پر رحمت نازل کرتے ہیں اور ملائکہ پہلی صف والوں کے لئے استغفار کی دعا کرتے ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! دوسری صف والوں پر بھی فرمایئے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ پہلی صف والوں پر رحمت کرتے ہیں اور ملائکہ استغفار کی دعا

کرتے ہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! دوسری صف والوں پر بھی فرمائیے۔ آپ نے فرمایا دوسری صف والوں پر بھی اللہ رحمت نازل کرتے ہیں اور ملائکہ استغفار کی دعا کرتے ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اپنی صفوں کو سیدھا رکھو اور اپنے کندھوں کو ہموار رکھو شیطان بھیڑ کا بچہ بن کر تمہارے درمیان گھس جاتا ہے۔ (احمد)

تشریح: اس حدیث میں اللہ "صلوٰۃ" بھیجنے سے مراد "انزال رحمت" ہے اور فرشتوں کے "صلوٰۃ" سے مراد دعاءِ توفیق ہے اور تین مرتبہ صفِ اوّل کے نمازیوں کیلئے صلوٰۃ اللہ اور صلوٰۃ الملائکہ کا تکرار مفید تاکید ہے اور صف اول کیلئے حصول کمال ثابت کرتا ہے، نیز یہ کہ اللہ کی رحمت سہ گنا کے مستحق صفِ اول کھڑے ہونے والے نمازی ہوتے ہیں۔

صفوں کے متعلق ہدایات

۱۱۰۲: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقِيْمُوا الصُّفُوْفَ وَحَاذُوْا بَيْنَ الْمَنَاكِبِ وَسَدُّوا الْخَلَلَ وَلِيْنُوا بِاَيْدِىْ اِخْوَانِكُمْ وَلَا تَذَرُوْا فُرُجَاتِ الشَّيْطَانِ وَمَنْ وَّصَلَ صَفًّا وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَهٗ قَطَعَهُ اللّٰهُ (رواہ ابو داود وروی النسائی مِنْهُ قَوْلُهٗ مَنْ وَصَلَ صَفًّا اِلٰى اٰخره)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/۴۳۳ حدیث رقم ۹۶۶۔ والنسائی ۲/۹۳ حدیث رقم ۸۱۹۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا صفیں سیدھی رکھو اپنے کندھوں کے درمیان ہموار رکھو صفوں کے خلا کو پر کرو اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں نرم رہو۔ صفوں میں شیطان کے لئے خلا نہ چھوڑو اور آپ نے یہ بھی فرمایا جس انسان نے صف کو ملایا اللہ تعالیٰ اسے ملا دے گا اور جو شخص صف کو توڑے گا اللہ تعالیٰ اسے توڑ دے گا۔ (ابوداؤد) امام نسائیؒ نے اس روایت کو من وصل صفا سے آخر تک نقل کیا ہے اور اس سے پہلے کی عبارت انہوں نے ذکر نہیں کی۔

تشریح: اس حدیث کے اندر صفوں کو سیدھا رکھنے کے متعلق پانچ ہدایات ذکر کی گئی ہیں کہ جب جماعت کی نماز کے لئے صف تیار ہو جائے تو ان ہدایات پر عمل کیا جائے۔ ① صفیں سیدھی اور برابر رکھو۔ ② اپنے کندھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر ہموار رکھو۔ ③ صفوں کے درمیان خلا نہ چھوڑو صفوں کے درمیان کی کشادگی کو اچھی طرح پر کرو یعنی پاؤں کے ساتھ اور کندھوں کے ساتھ کندھا متصل ہو۔ ④ اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں نرم رہو یعنی اگر کوئی آدمی تمہارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تمہیں نماز کے اندر سیدھا اور درست کرنا چاہے تو فوراً اسی طرح سیدھے ہو جاؤ۔ ⑤ صفوں کے درمیان خلا نہ چھوڑو کیونکہ اس خلا کے درمیان سے شیطان داخل ہو جاتا ہے۔ یہ پانچ ہدایات ارشاد فرمانے کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس انسان نے صف کو ملایا یعنی صف کے درمیان خالی جگہ دیکھ کر اس کو پر کر دیا تو اس انسان کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جوڑ دے گا اور جس شخص نے صف کو توڑا یعنی صف کے درمیان خلا اور کشادگی کو پر نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس انسان کو اپنی رحمت سے توڑ دے گا۔

اس حدیث میں جو یہ فرمایا گیا کہ اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں نرم ہو جاؤ، اس کا مطلب یہی ہے کہ اگر وہ صف سیدھی کرنے کیلئے تمہیں آگے پیچھے کریں تو ہو جایا کرو تاکہ تعاون علی البر کی فضیلت بھی حاصل ہو جائے اور ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص اکیلا ہو اور پچھلی صف میں اس کے ساتھ کھڑا ہونے والا کوئی بھی موجود نہ ہو اور وہ تمہیں اپنے ساتھ پچھلی صف

میں کھڑا کرنا چاہے تاکہ وہ انفرادیت جسے بعض ائمہ نے باطل بھی قرار دیا ہے باقی نہ رہے تو تم پیچھے ہو جایا کرو۔ چنانچہ ابوداؤد کی ایک مرسل روایت میں بھی یہ مضمون آیا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز کیلئے اس حال میں آئے کہ اگلی صف میں کھڑے ہونے کی گنجائش نہ ہو، اور اس کے ساتھ کھڑے ہونے کیلئے کوئی دوسرا آدمی بھی موجود نہ ہو تو اسے چاہیے کہ اگلی صف سے کوئی آدمی کھینچ کر پیچھے کر لے اور اس کے ساتھ کھڑا ہو، اس سے اس شخص کے اجر وثواب میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ اگلی صف میں کھڑے ہونے کی جو فضیلت اسے حاصل تھی، پیچھے آنے کی وجہ سے وہ ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ اس کی نیت کیوجہ سے اسے ثواب ضرور ملے گا بلکہ دوسرے حصول فضیلت کا سبب بننے پر زائد اجر وثواب بھی اس کے نامۂ اعمال میں درج کروایا جائے گا۔

امام کو درمیان میں رکھو

۱۱۰۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ تَوَسَّطُوا الْاِمَامَ وَسُدُّوا الْخَلَلَ ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ١/٤٣٩ حدیث رقم ٦٨١۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا امام کو درمیان میں رکھو اور خلا کو پر کرو۔ (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث کا مطلب علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ اپنے امام کو اپنے درمیان اس طرح کھڑا کیا کرو کہ تم اس کے پیچھے اور دائیں بائیں صفوں میں کھڑے ہو، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی مطلب بیان کیا ہے جبکہ لغت کی کتاب قاموس کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ یہ جملہ از قبیل حذف وایصال ہے اور تقدیری عبارت یوں ہے۔
''توسطوا بالامام''۔

صف میں تاخیر کرنے والے کے لئے وعید

۱۱۰۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یَزَالُ قَوْمٌ یَتَاَخَّرُوْنَ عَنِ الصَّفِّ الْاَوَّلِ حَتّٰی یُؤَخِّرَهُمُ اللّٰهُ فِی النَّارِ ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ١/٤٣٨ حدیث رقم ٦٧٩۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کچھ لوگ ہمیشہ پہلی صف سے پیچھے بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں جہنم میں پیچھے ڈال دے گا۔ (ابوداؤد)

تشریح: اس حدیث میں پچھلی صفوں میں رہنے والوں کے متعلق جو یہ فرمایا گیا ہے کہ ''حتی یؤخرھم اللّٰہ فی النار'' اس کا مطلب یہ ہے کہ انجام کار اور بالآخر اللہ تعالیٰ انہیں جہنم میں پھینک دے گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ جہنم میں انہیں سب سے پیچھے رکھے گا، یہ ان کے اعمال کا بدلہ اور ان کے حال کے عین مطابق ہوگا، جبکہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ اور ان ہی کی متابعت میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگلی صفوں سے جان چرا کر پچھلی صفوں میں رہنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انہیں

نیکی کے دوسرے کاموں میں پیچھے کر دیں گے اور انہیں جہنم میں داخل فرمائیں گے۔

صف کے پیچھے اکیلے کھڑے ہونے کی ممانعت

۱۱۰۵: وَعَنْ وَابِصَةَ ابْنِ مَعْبَدٍ قَالَ رَاٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَجُلاً يُّصَلِّيْ خَلْفَ الصَّفِّ وَحْدَهٗ فَاَمَرَهٗ اَنْ يُّعِيْدَ الصَّلَاةَ ۔ (رَوَاهُ احمد والترمذی وابوداود وقال الترمذی هذا حديث حسن)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱/۴۳۹ حديث رقم ۶۸۲۔ والترمذی ۱/۴۴۶ حديث رقم ۲۳۰ وأحمد في المسند ۴/۲۲۸۔

ترجمہ: حضرت وابصہ بن معبد سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھ رہا ہے تو آپ ﷺ نے اسے دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

تشریح: اس حدیث میں صف کے پیچھے ''باوجودیکہ اگلی صف میں گنجائش موجود تھی'' اکیلے نماز پڑھنے والے کو اعادۂ نماز کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ استحباب پر محمول ہے کیونکہ اس میں امر مکروہ کا ارتکاب پایا گیا ہے، لیکن علامہ طیبی رحمہ اللہ کی رائے کے مطابق یہ حکم تغلیظ وتشدید پر محمول ہے، اور اس کی تائید ''باب الموقف'' کی فصل اول کے آخر میں موجود حدیثِ ابی بکرہؓ سے بھی ہوتی ہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ان دونوں میں تو کوئی مناسبت ہی نہیں پائی جاتی، بالخصوص اس حدیث میں ''لا تعد'' کو باب افعال سے مانتے ہوئے اعادہ سے ماخوذ قرار دیں، بلکہ اس صورت میں تو ان دونوں کے درمیان تناقض پایا جاتا ہے، گوکہ اس کا دفاع یوں کیا جاسکتا ہے کہ نہی ''عدم وجوب'' پر محمول ہے، یاوقت کراہت پر محمول ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک کسی صف میں انسان کیلئے تنہا کھڑا ہونا صحیح نہیں ہے اور ان کی دلیل زیر بحث حدیث ہے، جبکہ اس کے جواز پر بخاری شریف کی اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعادۂ نماز کا یہ حکم جو زیر بحث حدیث میں دیا گیا ہے وہ استحباب پر محمول ہے۔

رہی یہ روایت جو سند صحیح کے ساتھ مروی ہے: ''لا صلوٰۃ للذی خلف الصف''۔

تو یہ ہمارے نزدیک ایک نفی کمال پر محمول ہے۔

فائدہ: اس کے بعد حضرت مصنف علیہ الرحمہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کر کے اس پر مختصر بحث فرمائی ہے اور دوبارہ اگلے باب کی فصل اول کے آخر میں اس کا تکرار کیا ہے جس سے بچنے کیلئے ہم یہاں اس بحث کو ترک کر رہے ہیں اور اگلے باب کی فصل اول کے آخر میں ذکر کریں گے۔ انشاء اللہ۔

بَابُ الْمَوْقِفِ

امام اور مقتدی کے کھڑے ہونے کی جگہ کا بیان

الفصل الاول:

ایک مقتدی ہو تو امام کے دائیں جانب کھڑا ہو

۱۱۰۶: عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بِتُّ فِيْ بَيْتِ خَالَتِيْ مَيْمُوْنَةَ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ فَقُمْتُ عَنْ يَسَارِهٖ فَاَخَذَ بِيَدِيْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِهٖ فَعَدَلَنِيْ كَذٰلِكَ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِهٖ اِلَى الشِّقِّ الْاَيْمَنِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۹۰/۲ حديث رقم ۶۹۷۔ ومسلم في صحيحه ۵۳۱/۱ حديث رقم (۱۹۲۔۷۶۳) وأبو داؤد في السنن ۴۰۷/۱ حديث رقم ۶۱۰۔ والترمذي ۴۵۱/۱ حديث رقم ۲۳۲۔ والنسائي ۱۰۴/۲ حديث رقم ۸۴۲۔ وابن ماجه ۳۱۲/۱ حديث رقم ۹۷۳۔ والدارمي ۳۱۹/۱ حديث رقم ۱۲۴۴۔ وأحمد في المسند ۲۴۹/۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ اپنی خالہ حضرت میمونہ کے گھر میں رات گزاری جب رسول اللہ ﷺ تہجد کی نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو میں بھی آپ کے بائیں جانب جا کر کھڑا ہو گیا۔ آپ نے اپنے پیچھے سے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے پیچھے سے پھیر کر دائیں طرف کر لیا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: اس حدیث کے تحت شرح السنہ میں متعدد فوائد پر روشنی ڈالی گئی ہے جو حسب ذیل ہیں:

① نفل نماز باجماعت بھی جائز ہے۔

② اگر مقتدی ایک ہو تو وہ امام کی داہنی جانب کھڑا ہو۔

③ نماز میں عمل قلیل جائز ہے۔

④ مقتدی، امام سے آگے نہیں بڑھ سکتا، کیونکہ نبی ﷺ نے حضرت ابن عباسؓ کو اپنے پیچھے کی طرف سے گھما کر دائیں جانب کیا تھا، حالانکہ آگے سے گھما کر دائیں طرف کرنا زیادہ آسان تھا۔

⑤ جس شخص نے امامت کی نیت نہ کی ہو، اس کے پیچھے اقتداء کرنا جائز ہے کیونکہ جب نبی ﷺ نے نماز شروع فرمائی تھی تو آپ ﷺ تنہا تھے، اور امامت کی نیت بھی نہ فرمائی تھی، بعد میں حضرت ابن عباسؓ نے آپ ﷺ کی اقتداء کی تھی۔

ہدایہ میں لکھا ہے کہ اگر مقتدی اکیلا ہو اور وہ پیچھے یا بائیں جانب کھڑا ہو کر نماز پڑھ لے تو اگرچہ نماز ہو جائے گی لیکن ایسا کرنا برا ہے اور ابن ہمام کے مطابق یہی مفتی بہ مذہب ہے اور بعض حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ پیچھے نماز پڑھنا جائز بھی ہے اور برا بھی نہیں ہے اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے ایسا بھی کیا تھا اور نبی ﷺ سے اس کے متعلق دریافت بھی فرمایا تھا اور عرض کیا تھا کہ کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کھڑے ہونے کی جگہ میں بھی آپ ﷺ کی برابری کرے، اس پر

آپ ﷺ نے انہیں دعاؤں سے نوازا، معلوم ہوا کہ یہ مکروہ نہیں، تو یہ استدلال اور رائے غلط ہے کیونکہ حضرت ابن عباسؓ تو نبی ﷺ کی دائیں جانب کے محاذاۃ اور سیدھ میں کھڑے تھے، اور نبی ﷺ کا انہیں دعاؤں سے نوازنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ انہوں نے یہ کام کیا بلکہ ان کے حسنِ ادب پر تھا۔

پھر کچھ آگے چل کر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ باجماعت نوافل پڑھنا کیسے جائز ہو گئے حالانکہ وہ تو بدعت ہیں؟ اور خود ہی جواب نقل فرماتے ہیں کہ ایک دو آدمیوں کا نوافل کی بلا اذان و اقامت جماعت جائز ہے، علاوہ ازیں ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ تہجد کی نماز کا واقعہ ہے اور نبی ﷺ پر تہجد کی نماز فرض تھی، اس اعتبار سے یہ ''اقتداء المتنفل خلف المفترض'' ہوئی اور اس میں کوئی کراہت نہیں۔

دو مقتدی امام کے پیچھے کھڑے ہوں

۱۰۷۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُصَلِّيَ فَجِئْتُ حَتّٰى قُمْتُ عَنْ يَسَارِهٖ فَاَخَذَ بِيَدِيْ فَاَدَارَنِىْ حَتّٰى اَقَامَنِيْ عَنْ يَمِيْنِهٖ ثُمَّ جَاءَ جَبَّارُ بْنُ صَخْرٍ فَقَامَ عَنْ يَّسَارِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخَذَ بِيَدَيْنَا جَمِيْعًا فَدَفَعَنَا حَتّٰى اَقَامَنَا خَلْفَهٗ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۵۲۵ حديث رقم (۱۸۱-۷۶۳)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے میں آ کر آپ کے بائیں طرف کھڑا ہو گیا۔ آپ نے اپنے پیچھے سے ہاتھ کر کے میرا دایاں ہاتھ پکڑا اور پیچھے سے لا کر اپنے دائیں طرف کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد حضرت جابر بن صخر آئے اور آپ کے بائیں طرف کھڑے ہو گئے پھر رسول اللہ ﷺ نے ہم دونوں کا ہاتھ پکڑ کر ہمیں اپنی جگہ سے ہٹا کر اپنے پیچھے کھڑا کر دیا۔ (مسلم)

تشریح: اس حدیث کی شرح میں علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عین ممکن ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ سے ایک صحابی کو بائیں جانب سے پکڑ کر پیچھے کیا ہو اور بائیں ہاتھ سے دوسرے صحابی کو دائیں جانب سے پکڑ کر پیچھے کر دیا ہو، قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اگر مقتدی ایک ہو تو اسے امام کی دائیں جانب اور دو یا زیادہ ہوں، تو اس کے پیچھے صف بنا کر کھڑا ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔ نیز یہ کہ ہاتھ سے ایک یا دو مسلسل حرکتوں سے نماز نہیں ٹوٹتی، اسی طرح وقفہ وقفہ سے دو مرتبہ ہاتھ سے حرکت کرنا بھی نماز کو نہیں ختم کرتا۔

علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم میں حضرت علقمہ اور اسود کے حوالے سے منقول ہے کہ یہ دونوں حضرات ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے فرمایا کیا میں تم دونوں کو پیچھے کھڑا کر کے نماز پڑھ سکتا ہوں؟ (یعنی کیا تم نے نماز پڑھی ہے یا نہیں؟) ان دونوں نے اثبات میں جواب دیا (یعنی ہم نے ابھی نماز نہیں پڑھی) یہ سن کر وہ ان دونوں کے درمیان اس طرح کھڑے ہوئے کہ ایک کو اپنی دائیں طرف اور دوسرے کو اپنی بائیں طرف کر لیا، مذکورہ دونوں حضرات کہتے ہیں کہ قیام کے بعد ہم نے رکوع کیا اور اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ لیا (جس طرح عام طور پر رکوع میں کیا جاتا

ہے) لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے (ایسا نہیں کیا بلکہ) اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر رانوں کے بیچ میں دبا لیا اور نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرح کیا تھا۔

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو مرفوع قرار دینا صحیح نہیں ہے، محدثین کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ یہ روایت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے، نیز امام نووی رحمۃ اللہ علیہ ''خلاصہ'' میں فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم سے صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا، ان کا یہ قول تو ثابت نہیں ہوتا کہ یہ عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات میں شامل تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اسی طرح نماز پڑھتے تھے، (ابتداء اسلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تھا لیکن بعد میں یہ طریقہ اور بہت سے احکام کی طرح منسوخ ہو گیا۔ مترجم)

بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ اس واقع میں علقمہ اور اسود سے کچھ ذہول ہو گیا ہے کیونکہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت تین طرف سے نقل فرمائی ہے، ان میں سے پہلے دو کو غیر مرفوع اور تیسرے طریق میں اسے مرفوع نقل کیا ہے جس سے اس کا اضطراب واضح ہوتا ہے، تاہم اگر اس کا مرفوع ہونا ہی صحیح ہو تو اس صورت میں جواب یہ ہے کہ جگہ کی تنگی نے ایسا کرنے پر مجبور کیا، جبکہ علامہ حازمی رحمۃ اللہ علیہ رکوع کے اسی طریقے کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اتنی بات تو یقینی ہے کہ نماز میں تطبیق کا یہ واقعہ مکہ مکرمہ میں پیش آیا تھا اور مدینہ منورہ تشریف آوری کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ترک فرما دیا تھا جس کی دلیل حضرت جابرؓ کی روایت ہے اور وہ غزوۂ بدر کے بعد ہونے والے تمام غزوات میں شریک ہوئے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی روایت زمانۂ بعد کی ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ مکی دور کا واقعہ نقل فرما رہے ہیں، ظاہر ہے کہ ترجیح مدنی دور کی روایات کو ہوگی کیونکہ وہ متاخر ہے اور ناسخ ہمیشہ متاخر ہی ہوتا ہے۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حازمی رحمۃ اللہ علیہ کے اس جواب پر زیادہ سے زیادہ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ حکم اور طریقہ منسوخ ہو چکا ہے تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر یہ بات کیسے مخفی رہ گئی؟ حالانکہ یہ بات بھی کچھ بعید نہیں اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں عام طور پر صحابہ کرامؓ کی ایک معتد بہ جماعت نماز پڑھتی تھی، دو آدمیوں کو نماز پڑھانے کا واقعہ شاذ و نادر ہی پیش آتا تھا جیسا کہ یہاں آیا، نیز اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جن کا علم حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو نہیں ہو سکا۔

جماعت کی نماز میں مرد اور عورت میں کھڑے ہونے کی ترتیب

۱۰۸۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ صَلَّيْتُ اَنَا وَيَتِيْمٌ فِيْ بَيْتِنَا خَلْفَ النَّبِيِّ ﷺ وَاُمُّ سُلَيْمٍ خَلْفَنَا ۔(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/ ٥٢٥ حديث رقم (١٨١-٧٦٣)۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اور یتیم نے اپنے گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اور ام سلیم ہمارے پیچھے تھی۔ (مسلم)

تشریح: اس روایت میں لفظ ''یتیم'' کو بعض حضرات نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بھائی کا نام قرار دیا ہے اور میرکؒ نے اپنے شیخ سے اس ''یتیم'' کا نام ''ضمیرہ'' نقل کیا ہے جو کہ حسین بن عبداللہ کے دادا ہوتے ہیں۔ ابن حذاء فرماتے ہیں کہ عبدالملک بن حبیب نے بھی ان کا یہی نام ذکر کیا ہے، لیکن ان کے علاوہ کسی اور نے یہ نام نہیں ذکر کیا، میرا خیال ہے کہ انہوں

نے حسین بن عبداللہ سے براہ راست یا اہل مدینہ میں سے کسی سے سنا ہوگا اور فرماتے ہیں کہ ضمیرہ یہ وہی ضمرہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موالی میں شمار ہوتے تھے، جبکہ علامہ ابن ہمام، نووی رحمۃ اللہ علیہما کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ اس یتیم بچے کا نام "ضمیر بن سعد حمیری" ہے۔

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے شرح السنہ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مردوں کو عورتوں سے آگے ہونا چاہیے اور یہ کہ بچہ بڑوں کے ساتھ کھڑا ہو سکتا ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ دوسری بات اسی صورت میں ثابت ہو سکتی ہے جب کہ یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ اس وقت تک بالغ ہو کر "مردوں" کے درجے میں پہنچ چکے تھے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ تشریف آوری کے وقت ان کی عمر فقط دس برس کی تھی۔

فائدہ: اس حدیث کی نسبت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے صرف صحیح مسلم کی طرف کی ہے، میرک فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں کتاب الصلوۃ کے "باب المرأۃ وحدها تکون صفا" میں اس روایت کی تخریج فرمائی ہے۔ مصنف رحمۃ اللہ علیہ پر تعجب ہے کہ انہوں نے بخاری کے اس حوالے کے باوجود اس کی نسبت صرف مسلم شریف کی طرف کیوں کی؟ اور اس سے بھی زیادہ تعجب شیخ جزری رحمہ اللہ پر ہے کہ انہوں نے مسلم کے ساتھ نسائی کا تو ذکر کر دیا لیکن بخاری شریف کا حوالہ انہوں نے بھی نہیں دیا۔ اس کا جواب سوائے اس کے اور کیا دیا جا سکتا ہے۔ "سبحان من لا یغفل ولا ینسی"۔

عورت محرم ہونے کے باوجود صف کے پیچھے کھڑی ہو

۱۱۰۹: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى بِهٖ وَبِاُمِّهٖ اَوْ خَالَتِهٖ قَالَ فَاَقَامَنِيْ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَاَقَامَ الْمَرْاَةَ خَلْفَنَا ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه النسائي في السنن ۲/۸۶ حديث رقم ۸۰۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ان کی والدہ یا ان کی خالہ کو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں طرف کھڑا کیا اور اس خاتون کو پیچھے کھڑا کیا۔ (مسلم)

اگر امام رکوع میں چلا جائے تو آنے والا مقتدی کیا کرے

۱۱۱۰: وَعَنْ اَبِيْ بَكْرَةَ اَنَّهُ انْتَهٰى اِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ رَاكِعٌ فَرَكَعَ قَبْلَ اَنْ يَّصِلَ اِلَى الصَّفِّ ثُمَّ مَشٰى اِلَى الصَّفِّ فَذَكَرَ ذٰلِكَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ زَادَكَ اللّٰهُ حِرْصًا وَلَا تَعُدْ ۔

(رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۲۶۷ حديث رقم ۷۸۳۔

ترجمہ: حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ایک مرتبہ وہ نماز میں شامل ہونے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے تو اس وقت آپ رکوع میں چلے گئے تھے اس لیے ابوبکرہ صف میں پہنچنے سے پہلے ہی رکوع میں چلے گئے پھر آہستہ آہستہ چل کر

صف میں شامل ہو گئے پھر اس واقعہ کا رسول اللہ ﷺ کے سامنے تذکرہ کیا تو آپ نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری حرص کو اور زیادہ کرے آئندہ ایسا نہ کرنا۔ (بخاری)

تشریح: اس حدیث میں جو لفظ ''لا تعد'' آیا ہے وہ تاء کے فتحہ اور عین کے ضمہ کے ساتھ ''عوذ'' سے ماخوذ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اس طرح کی حرکت دوبارہ مت کرنا۔ بعض حضرات نے اسے عین کے سکون اور دال کے ضمہ کے ساتھ ''عدو'' سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ نماز میں شامل ہونے کیلئے تیزی سے مت چلا کرو اور صف کے قریب پہنچنے تک صبر کیا کرو اور صف میں پہنچ کر نماز شروع کیا کرو۔ اور بعض حضرات نے اسے تاء کے ضمہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ ''اعادہ'' سے ماخوذ قرار دیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جو نماز تم اس طرح پڑھ چکے ہو، اب اس کا اعادہ نہ کرو۔

علامہ نووی رحمہ اللہ نے شرح مہذب میں اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اقوال تحریر فرمائے ہیں۔

① **لا تعد**، عدو سے ماخوذ ہے اور ایسے ہی ہے جیسے ''**لا تاتوھا وانتم تسعون**'' (دونوں کا ایک ہی مطلب ہے)۔
② نماز میں پہنچنے کیلئے اتنی تاخیر مت کیا کرو کہ امام کے ساتھ تمہاری کوئی رکعت ہی چھوٹ جائے۔
③ صف سے پیچھے ہی تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع نہ کیا کرو۔

ظاہر ہے کہ یہ تیسرا معنی ہی اس مقام کے زیادہ مناسب ہے۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی بات سب سے زیادہ جامع ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے اسے تمام روایات میں تاء کے فتحہ اور عین کے ساتھ ضبط کیا ہے جو کہ ''عدو'' سے ماخوذ ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم جو تیزی سے چل کر آئے، پھر صف سے پیچھے ہی رکوع کر لیا پھر اسی حال میں صف کی طرف چل کر آئے، آئندہ ایسا نہ کرنا۔

شیخ جزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''**لا تعد**'' کا لفظ ''عدو'' سے ماخوذ ہے اور مطلب یہ ہے کہ آئندہ اس طرح کی حرکت نہ کرنا، گو کہ ایک دو قدم چلنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، لیکن اس سے احتراز ہی بہتر ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ نبی ﷺ نے انہیں انفرادی طور پر اپنی اقتداء سے منع فرمایا ہو، یا صف میں پہنچنے سے پہلے رکوع کرنے سے منع فرمایا ہو، بظاہر اس ممانعت کا تعلق ان تمام چیزوں سے ہو سکتا ہے، اور جو لوگ اسے ''اعادہ'' سے ماخوذ قرار دیتے ہیں ان کی بات تو بعید از قیاس ہے، اور اس سے بھی زیادہ بعید از قیاس بات ان لوگوں کی ہے جو اسے ''عدو'' سے ماخوذ قرار دیتے ہیں اور کسی راوی نے بھی اسے اعادہ یا عدو سے ضبط نہیں کیا، ایسے لوگ الفاظِ نبوت میں تحریف و تبدیل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ یا تو یہ ہوتی ہے کہ صحیح طرح اسے حفظ و ضبط نہیں کر پاتے، یا یہ وجہ ہوتی ہے کہ ان تک وہ حدیث سماع کے واسطے سے نہیں پہنچی ہوتی۔ اور تحریر میں اعراب نہ ہونے کی وجہ سے لفظ جتنے احتمالات رکھتا ہے وہ ان سب کو ذکر کر دیتے ہیں کیونکہ انہیں اس لفظ کا تو علم ہی نہیں ہوتا جو نقل ہوتا چلا آ رہا ہے اور اس طرح غلط احتمالات رائج ہو جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

صف میں اکیلے نماز پڑھنے کا حکم:

اگلی صف مکمل ہو چکی ہو تو پچھلی صف میں اکیلے نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ قاضی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور علماء کے نزدیک ایسا کرنا مکروہ تو ہے لیکن اس سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ جبکہ ابراہیم نخعیؒ، حمادؒ، ابن ابی لیلیٰؒ، وکیعؒ اور امام احمدؒ اسے مبطل

صلوٰۃ قرار دیتے ہیں، زیر بحث حدیث ان کے خلاف جمہور کی دلیل ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا تھا، اگر ''انفرادیت'' مفسد نماز ہوتی تو ان کی نماز منعقد ہی نہ ہوتی کیونکہ جس وقت انہوں نے تکبیر تحریمہ کہی تھی، مفسد نماز تو اسی وقت موجود تھا۔

اور ''لا تعد'' کو اگر انفرادی اقتداء سے نہی پر محمول کیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ آئندہ اس طرح دوبارہ نہ کرنا، اور اگر صف میں پہنچنے سے پہلے رکوع کرنے کی ممانعت پر محمول کیا جائے تو وہ فسادِ نماز پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ ہر تکبیر تحریمہ مفسد نماز نہیں ہوتی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آہستہ آہستہ چل کر دوران نماز صف تک پہنچنا چاہتے ہوں کیونکہ ایک دو قدم چلنا نماز کو فاسد نہیں کرتا، تاہم بہتر یہی ہے کہ اس سے احتراز ہی کیا جائے۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ اس صورت میں ممانعت کا یہ جملہ درحقیقت اس بات کا حکم ہوگا کہ جہاں تکبیر تحریمہ کہی ہے، وہیں کھڑے رہو اور اپنی نماز کو اکیلے ہی مکمل کر لو۔ علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ اور محی السنہ فرماتے ہیں کہ صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھنے کے باطل نہ ہونے کی دلیل میں اس حدیث کو پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرہؓ کو نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا، بلکہ آئندہ کیلئے ان کی رہنمائی فرما دی تا کہ وہ افضل طریقہ اختیار کر سکیں۔ گویا ''لا تعد'' کراہت تنزیہی پر محمول ہے، نہ کہ کراہت تحریمی پر، کیونکہ کراہت تحریمی کی صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اعادۂ نماز کا ضرور حکم دیتے۔

الفصل الثّانی:

امام اس آدمی کو بنایا جائے جو افضل ہو

۱۱۱۱: عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كُنَّا ثَلَاثَةً اَنْ يَتَقَدَّمَنَا اَحَدُنَا۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱/۴۵۲ حديث رقم ۲۳۳۔

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ جب ہم تین آدمی نماز پڑھنے والے ہوں تو ہم میں سے ایک آدمی جو بہتر ہو وہ ہمارا امام بن جائے۔ (ترمذی)

تشریح: قولہ (ان یتقدمنا أحدنا) ''ابن ملک فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں سے ایک امامت کروائے اور اگر دو ہوں تو ان میں سے بھی ایک امامت کروائے۔ میں کہتا ہوں کہ تین کی صورت میں امام کا تقدم حسی اور معنوی دونوں طرح ہوگا لیکن دو کی صورت میں امام کا تقدم صرف معنوی ہوگا کیونکہ اکیلا مقتدی تو امام کے ساتھ کھڑا ہوگا۔

قولہ (رواہ الترمذی) بعض علماء نے اسماعیل بن مسلم کے بارے کلام کیا ہے۔

امام بلند جگہ پر اکیلا کھڑا نہ ہو

۱۱۱۲: وَعَنْ عَمَّارٍ اَنَّهُ اَمَّ النَّاسَ بِالْمَدَائِنِ وَقَامَ عَلٰى دُكَّانٍ يُصَلِّيْ وَالنَّاسُ اَسْفَلَ مِنْهُ فَتَقَدَّمَ حُذَيْفَةُ

فَلَمَّا فَرَغَ عَمَّارٌ مِنْ صَلَاتِهٖ قَالَ لَهٗ حُذَيْفَةُ اَلَمْ تَسْمَعْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِذَا اَمَّ الرَّجُلُ الْقَوْمَ فَلَا يَقُمْ فِيْ مَقَامٍ اَرْفَعَ مِنْ مَقَامِهِمْ اَوْ نَحْوَ ذٰلِكَ فَقَالَ عَمَّارٌ لِذٰلِكَ اتَّبَعْتُكَ حِيْنَ اَخَذْتَ عَلٰى يَدِيْ ۔

(رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۱/۳۹۹ حدیث رقم ۵۹۸۔

ترجمہ: حضرت عمارؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک دن کوفہ کے قریب شہر مدین میں لوگوں کو نماز پڑھائی چنانچہ وہ نماز پڑھانے کے لئے ایک چبوترے پر کھڑے ہوئے اور لوگ ان سے نیچے کھڑے ہوئے تھے یہ دیکھ کر حضرت حذیفہؓ صف سے نکل کر آگے بڑھے اور عمار کو دو کندھوں سے پکڑ کر نیچے کی طرف کھینچا۔ حضرت عمارؓ جب نماز پڑھا کر فارغ ہوئے تو حضرت حذیفہؓ نے ان سے کہا کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات نہیں سنی کہ جب کوئی آدمی کسی قوم کو امامت کروائے تو وہ ایسی جگہ پر کھڑا نہ ہو جو مقتدیوں کے کھڑا ہونے کی جگہ سے بلند ہو یا اسی کے مثل الفاظ فرمائے۔ حضرت عمار نے جواب میں کہا اسی وجہ سے تو جب آپ نے میرا ہاتھ پکڑا میں نے آپ کی اتباع کی اور نیچے چلا آیا۔ (ابوداؤد)

تشریح: قولہ (بالمدائن) مدائن کوفہ کے قریب کسریٰ کا ایک شہر تھا۔ ابن حجر فرماتے ہیں مدائن دجلہ کے کنارے بغداد کے قریب ایک قدیم شہر کا نام ہے۔

قولہ (قام علی دکان) یعنی امام اکیلا کسی اونچی جگہ پر کھڑا ہوا۔ ایسا کرنا مکروہ ہے لیکن اگر امام کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوں تو مکروہ نہیں ہے امام کا اونچی جگہ کھڑا ہونا تو مکروہ ہے لیکن اگر امام نیچی جگہ کھڑا ہو تو اس کے حکم بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا مکروہ نہیں کیونکہ اس میں اہل کتاب کے ساتھ تشبہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ امام کو اونچی جگہ کھڑا کرتے ہیں۔

ظاہر الروایۃ یہ ہے کہ ایسا کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس میں امام کی تحقیر ہے۔

امام کا کتنا بلند کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ اس بارے میں تین قول ہیں:

① انسانی قد کے برابر اونچی جگہ۔ ② جس سے امتیاز حاصل ہو۔ ③ ایک گز کی مقدار۔ یہی تیسرا قول راجح ہے۔

امام طحاوی کے مذکورہ قول سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ جماعت کی نماز اس امت کی ضروریات میں سے نہیں ہے۔

قولہ (الم تسمع رسول اللہ ﷺ) اس سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث صحابہ کرام کے درمیان مشہور تھی۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ امام کے مقتدیوں سے اونچا کھڑے ہونے کی کراہت اس صورت میں ہے جب امام اس صف سے اونچا کھڑا ہو جو اس کے پیچھے ہے، اگر کچھ لوگ امام کے ساتھ مل جائیں اور وہ تمام صفوں سے اونچے کھڑے ہوں تو اس صورت میں کراہت نہیں ہے۔

قولہ (رواہ ابو داؤد) ابوداؤد نے اسے عدی بن ثابت کے طریق سے نقل کیا، مختلف روایوں میں یہ حدیث مختلف طرق سے وارد ہوئی ہے۔

تعلیم کے لئے امام بلند جگہ پر کھڑا ہو سکتا ہے

۱۱۱۳: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدِنِ السَّاعِدِيِّ اَنَّهُ سُئِلَ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ الْمِنْبَرُ فَقَالَ هُوَمِنْ اَثْلِ الْغَابَةِ عَمِلَهُ فُلَانٌ مَوْلٰى فُلَانَةٍ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَامَ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ عَمِلَ وَوُضِعَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَكَبَّرَ وَقَامَ النَّاسُ خَلْفَهُ فَقَرَأَ وَرَكَعَ وَرَكَعَ النَّاسُ خَلْفَهُ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ ثُمَّ رَجَعَ الْقَهْقَرٰى فَسَجَدَ عَلَى الْاَرْضِ ثُمَّ عَادَ اِلَى الْمِنْبَرِ ثُمَّ قَرَأَ ثُمَّ رَكَعَ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهُ ثُمَّ رَجَعَ الْقَهْقَرٰى حَتّٰى سَجَدَ بِالْاَرْضِ هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ وَفِي الْمتفق عليه نحوه وَقَالَ فِيْ اٰخِرِهٖ فَلَمَّا فَرَغَ اَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا صَنَعْتُ هٰذَا لِتَاْتَمُّوْا بِيْ وَلِتَعَلَّمُوْا صَلَاتِيْ۔

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۳۹۷ حديث رقم ۹۱۷۔ ومسلم في صحيحه ۱/۳۸۶ حديث رقم (۴۴۔۵۴۴) والنسائي ۲/۵۷ حديث رقم ۷۳۹۔

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ سے روایت ہے کہ ان سے ایک دن کسی آدمی نے سوال کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا منبر کون سی لکڑی سے بنا ہوا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ جنگلی جھاؤ کا تھا جس کو فلاں شخص نے جو فلاں عورت کا غلام ہے آپ کے لئے بنایا تھا جب وہ تیار ہو گیا اور مسجد میں رکھا گیا۔ تو اس پر رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور قبلہ کی طرف رخ کر کے تکبیر تحریمہ کہی اور سب لوگ آپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر قراءت کی اور رکوع کیا اور دوسرے لوگوں نے بھی آپ کے پیچھے رکوع کیا پھر آپ نے اپنا سر مبارک رکوع سے اٹھایا اور پچھلے پاؤں ہٹا کر نیچے اترے اور زمین پر سجدہ کیا یہ الفاظ بخاری کے ہیں بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت بھی اسی طرح ہے' حدیث کے راوی نے اس حدیث کے آخر میں یہ بھی کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ فارغ ہوئے تو فرمایا یہ میں نے اس لئے کیا ہے تاکہ تم لوگ میری پیروی کرو اور میری نماز اچھی طرح سیکھو۔

تشریح: قوله (وعن سهل بن سعد الساعدی) ان کا اصل ''حزن'' (غم) تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کا نام سہل (آسانی) رکھا تھا۔

(ای شیء المنبر) المنبر میں الف لام عہد کا ہے کیونکہ سوال نبی کریم ﷺ کے منبر کے بارے میں ہے۔

''اثل الغابة'' مدینہ منورہ سے نو میل کے فاصلہ پر ایک گھنا جنگل تھا، وہیں کے جھاؤ کی لکڑی سے نبی کریم ﷺ کیلئے منبر بنایا گیا تھا۔

''عمله فلان'' اس کا نام ''قوم رومی'' ہے۔ امام تورپشتی فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس منبر میں تین سیڑھیاں بنائی تھیں۔

''مولی: فلانة'' بعض محدثین نے اس کا نام عائشہ انصاریہ اور بعض نے مدینہ کی ایک غیر معروف عورت کو قرار دیا ہے۔

''فاستقبل القبلة'' اس منبر کی سیڑھیاں بہت قریب تھیں نیز نبی کریم آخری سیڑھی پر تھے اس لئے اس صعود و نزول میں فعلِ کثیر لازم نہیں آیا جس سے نماز ٹوٹ جاتی۔

''القهقری'' ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا معنی ہے ''الٹے پاؤں لوٹنا''۔

مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اس منبر پر چڑھنے کیلئے تین سیڑھیاں بنائی گئی تھیں بہت قریب قریب تھیں، ان کے ذریعہ منبر پر ایک یا دو قدم چڑھنا بہت آسان تھا، لہٰذا اس وجہ سے فعل کثیر لازم نہیں آیا کہ آپ کی نماز باطل ہو جاتی۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر امام نماز کی حرکات وسکنات اور کیفیات کو دور ونزدیک کھڑے مقتدیوں کو دکھانا چاہے اور اس کے ذریعہ انہیں نماز کے احکام بتانا چاہتا ہو تو اس کیلئے بلند جگہ کھڑا ہونا جائز ہے۔

''هذا لفظ البخاری'' اس عبارت سے صاحب مشکوٰۃ اس بات کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں کہ اس حدیث کو چونکہ بخاری ومسلم دونوں نے نقل کیا تھا اس لئے اسے فصل اول میں ہونا چاہیے تھا لیکن چونکہ صاحب مصابیح نے اسے حسان میں نقل کیا تھا اس لئے ان کی اتباع میں ہم نے بھی اسے اسی فصل میں نقل کرنا مناسب سمجھا۔

''ایها الناس'' بعض نسخوں میں یاأیها الناس کے الفاظ ہیں۔

''ولتعلموا صلاتی'' اس کے اعراب میں دو قول ہیں۔

① ولتعلموا (سکون العین وتخفیف اللام)۔

② ولتعلموا (بفتح العین وتشدید اللام)۔

اتفاقیہ جماعت

۱۱۱۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِیْ حُجْرَتِهٖ وَالنَّاسُ يَأْتَمُّوْنَ بِهٖ مِنْ وَّرَاءِ الْحُجْرَةِ ۔ (رواہ ابو داود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۶۷۱ حدیث رقم ۱۱۱۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حجرہ کے اندر نماز پڑھی اور لوگوں نے حجرہ کے باہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی۔ (ابوداؤد)

تشریح: ''فی حجرته'' حجرہ سے مراد وہ جگہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مسجد میں اعتکاف کے واسطے بنائی گئی تھی۔

''من وراء الحجرة'' ابن ملک فرماتے ہیں کہ جب امام اور مقتدی مسجد میں ہوں تو مقام کے اختلاف سے نماز کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ نفل نماز میں ہو۔

اس حدیث میں مذکور حجرہ کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں:

① چٹائی کا بنا ہوا کمرہ مسجد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بنایا گیا تھا۔

② حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ، لیکن یہ قول درست نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اگر یہ بات ہوتی تو وہ لفظ ''حجری'' (میر حجرہ) کا لفظ استعمال کرتیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امامت کروانا کچھ شرائط کے ساتھ درست ہو سکتا تھا، لیکن وہ شرائط یہاں مذکور نہیں، اسلئے کہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اس حجرہ کا دروازہ مسجد کی طرف

تھا اس صورت میں حضور ﷺ مسجد میں موجود لوگوں کی امامت کیسے کروا سکتے تھے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اگر حضور ﷺ کیلئے حجرہ مبارکہ میں امامت کروانا ممکن ہوتا تو مرض الوفاۃ میں آپ دو آدمیوں کے سہارے آنے کا تکلف نہ فرماتے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عطاء اور دوسرے فقہاء کا اس حدیث کو اس حکم کی دلیل بنانا کہ کسی شخص کی اقتداء درست ہونے کی صرف یہ شرط ہے کہ اس کی نقل و حرکت کا علم ہو۔ اس استدلال کے درست نہ ہونے کی مختلف وجوہات ہیں:

① شریعت کی دعوت الی الجماعۃ اور اس کی طرف سعی (جو کہ شریعت کی طرف سے مامور بہ ہے) کا بطلان لازم آئے گا۔ اس طرح ہر شخص گھر میں نماز پڑھنے لگے گا اور کتاب و سنت کے احکامات کو ترک کرنا لازم آئے گا۔

② اس استدلال کے باطل ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ محدثین کے قول کے مطابق حجرہ سے مراد مسجد میں نبی کریم ﷺ کیلئے بنائی ہوئی جگہ ہے جو آپ کے اعتکاف کیلئے بنائی گئی تھی۔ ایک صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے چٹائی کا ایک حجرہ بنوایا تھا جس میں کچھ رات تک نماز ادا فرماتے رہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ حجرہ کا دروازہ قبلہ کی طرف تھا اور اس صورت میں ممکن نہیں کہ مسجد میں نماز ادا کرنے والے حضرات آپ کی اقتداء کریں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو مرض الوفاۃ میں آپ دو آدمیوں کے سہارے آنے کا تکلف نہ فرماتے بلکہ مسجد ہی میں نماز ادا فرما لیتے۔

بہر حال یہ بات بھی یاد رکھیں کہ ان دونوں باتوں میں غور کیا جا سکتا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ واقعی حضور ﷺ نے حجرہ عائشہ ہی میں نماز کی امامت کروائی ہو اور آواز مسجد میں جا رہی ہو اور صحابہ کرام نے آپ کی اقتداء بھی کی ہو۔ دوسرا یہ کہ اگر ایسا ممکن ہوتا تو آپ ﷺ مرض الوفاۃ میں دو آدمیوں کے سہارے آنے کا تکلف نہ فرماتے تو اس سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ مسلمانوں کو مسرت پہنچانے کیلئے اور اپنے دیدار سے بہرہ ور کرنے کیلئے مسجد میں تشریف لائے ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

الفصل الثالث:

صف بندی کا طریقہ

۱۱۱۵: وَعَنْ اَبِیْ مَالِكٍ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ اَلَا اُحَدِّثُكُمْ بِصَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَقَامَ الصَّلَاةَ وَصَفَّ الرِّجَالَ وَصَفَّ خَلْفَهُمُ الْغِلْمَانَ ثُمَّ صَلّٰى بِهِمْ فَذَكَرَ صَلَاتَهٗ ثُمَّ قَالَ هٰكَذَا صَلٰوةُ قَالَ عَبْدُ الْاَعْلٰى لَا اَحْسِبُهٗ اِلَّا قَالَ اُمَّتِیْ ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ١/ ٤٣٧ حديث رقم ٦٧٧۔

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ لوگوں سے کہا کہ میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بارے میں نہ بتاؤں پھر انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو نماز کے لئے کھڑا کر کے سب سے پہلے مردوں کی صف بنائی اور ان کے بعد بچوں کی صف بنائی اور پھر انہیں نماز پڑھائی حضرت ابو مالک رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی نماز کی پوری کیفیت بیان کی اور کہا کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ نماز اس طرح ہونی چاہیے۔ عبدالاعلیٰ فرماتے ہیں میرا خیال

ہے کہ ابو مالک نے امتی کا لفظ بھی فرمایا تھا یعنی میری امت کی نماز اس طرح ہونی چاہئے۔ (ابوداؤد)

تشریح: "ألا احدثكم بصلاة رسول الله ﷺ" لفظ "ألا" کی ترکیبی کیفیت میں دو احتمال ہیں:

① اَلا تنبیہ کیلئے ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔

② ہمزہ استفہام کیلئے ہے، اسی وجہ سے حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ لوگوں نے جواب میں "نعم" (جی ہاں) کہا تھا۔

"أمتي" حضور ﷺ کے اس قول کا مطلب ہے کہ یہ میری امت کی نماز ہے اس ارشاد کا منشاء یہ ہے کہ جو لوگ اس طریقہ سے یعنی سنت نبوی کے مطابق نماز ادا نہیں کریں گے وہ اپنے عمل سے یہ ظاہر کریں گے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی تابعدار امت میں سے نہیں ہیں۔

حضور ﷺ کا صحابہ سے لیا ہوا عہد

۱۱۱۶: وَعَنْ قَيْسِ بْنِ عَبَّادٍ قَالَ بَيْنَا اَنَا فِي الْمَسْجِدِ فِي الصَّفِّ الْمُقَدَّمِ فَجَبَذَنِيْ رَجُلٌ مِنْ خَلْفِي جَبْذَةً فَنَحَّانِيْ وَقَامَ مَقَامِي فَوَاللّٰهِ مَاعَقَلْتُ صَلَاتِي فَلَمَّا انْصَرَفَ اِذَا هُوَ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ فَقَالَ يَافَتٰى لَايَسُوْءُكَ اللّٰهُ اِنَّ هٰذَا عَهْدٌ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَيْنَا اَنْ نَلِيَهُ ثُمَّ اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ فَقَالَ هَلَكَ اَهْلُ الْعَقْدِ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ وَاللّٰهِ مَا عَلَيْهِمْ اٰسٰى وَلٰكِنْ اٰسٰى عَلٰى مَنْ اَضَلُّوا قُلْتُ يَا اَبَا يَعْقُوْبَ مَا تَعْنِيْ بِاَهْلِ الْعَقْدِ قَالَ الْاُمَرَاءُ ـ (رواه النسائی)

أخرجه النسائي في السنن ۸۸/۲ حديث رقم ۸۰۸ـ وأحمد في المسند ۱٤۰/۵ـ

ترجمہ: حضرت قیس بن عبادؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن مسجد نبوی میں پہلی صف میں نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک آدمی نے پیچھے سے مجھ کو کھینچا اور مجھ کو ایک جانب کر کے خود میری جگہ کھڑا ہو گیا اللہ کی قسم اس غصہ کی وجہ سے میری توجہ نماز کی طرف نہ رہی جب وہ شخص نماز پڑھ چکا تو معلوم ہوا کہ وہ حضرت ابی بن کعبؓ تھے۔ انہوں نے فرمایا اے جوان میں نے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا ہے اللہ اس کی وجہ سے تمہیں غمزدہ نہ کرے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ وصیت کی ہے کہ ہم آپ کے ساتھ کھڑے ہوا کریں پھر قبلہ کی طرف رخ کر کے فرمایا رب کعبہ کی قسم سردار لوگ ہلاک ہو گئے تین مرتبہ یہ فرمایا مجھے سرداروں کا کوئی غم نہیں غم تو ان لوگوں کا ہے جنہیں سردار گمراہ کرتے ہیں قیس ابن عبادؓ کہتے ہیں کہ میں نے ابی بن کعبؓ سے عرض کیا اے ابو یعقوب اہل عقد سے آپ کی کیا مراد ہے تو انہوں نے فرمایا اس سے مراد حکمران ہیں۔

راوئ حدیث:

قیس بن عباد۔ قیس "عباد" کے بیٹے ہیں۔ بصرہ کے رہنے والے تھے۔ بصرہ کے تابعین میں پہلے طبقہ کے تابعی ہیں۔ صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کا شرف حاصل ہے۔ "عبادہ" میں عین مہملہ پر پیش اور باء موحدہ بلا تشدید ہے۔ "التقریب" میں لکھا ہے کہ یہ دوسرے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں "مخضرمین" میں سے ہیں۔ ان کا انتقال ۸۰ سن کے بعد ہوا۔ جن لوگوں نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے ان کو وہم ہوا ہے اھ۔

تشریح: قوله "وعن قيس بن عباد"، عباد (بضم العين وتخفيف الياء) علامہ طیبی رحمہ اللہ نے لفظ عباد کا یہی اعراب بیان کیا ہے۔ صاحب تقریب فرماتے ہیں کہ حضرت عباد بصری مخضرمی راوی ہیں، ثقہ ہیں اور طبقہ ثانیہ سے آپ کا تعلق ہے۔ ۸۰ھ کے بعد انتقال ہوا۔ بعض حضرات نے انہیں صحابہ میں شمار کیا ہے یہ قول درست نہیں۔

"فوالله ما عقلت صلاتي" یعنی اس غصہ کی وجہ سے کہ اس نے مجھے پہلی صف سے جو افضل بھی ہے اور اس پر میرا استحقاق بھی زیادہ ہے، پیچھے کھینچ لیا ہے۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں نے کتنی نماز پڑھی ہے۔

قوله "يافتي! لا يسوء ك الله" اللہ تمہیں غمگین نہ کرے۔ امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی وجہ سے ایسا کیا تھا اس لئے حضرت قیس کی تسلی کیلئے اس معاملہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا۔

اس کا ایک معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو میری وجہ سے اور میرے عمل کی وجہ سے غمگین نہ کرے۔

"ان هذا عهد من النبي ﷺ" حضرت ابی رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ "جملہ مستانفہ" ہے جس میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرف اشارہ فرمایا ہے: "ليلني منكم اولوا الاحلام والنهى"۔

"نماز میں تم میں صاحبِ عقل بالغ میرے نزدیک کھڑے ہوا کریں"۔

چونکہ قیس بن عبادہ ان لوگوں میں نہیں جنہیں عقل وفہم میں دوسرے لوگوں پر برتری حاصل ہو، اس لئے حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے انہیں پیچھے ہٹا دیا اور خود ان کی جگہ کھڑے ہو گئے۔

"هلك اهل العقد" اہل عقد یعنی سردار اور ذمہ دار لوگ ہلاک ہوئے کیونکہ عوام کی تربیت جس میں صف بندی کا طریقہ بھی ہے، ان کے ذمہ ہے۔

"آسى" یہ افعل کے وزن پر متکلم کا صیغہ ہے، دوسرے ہمزہ کو الف سے بدلا گیا بمعنی میں غم کھاتا ہوں۔

"ولكن آسىٰ على من اضلّوا" مجھے ان ظالموں کا کوئی غم نہیں بلکہ مجھے تو ان لوگوں کا غم ہے جو بعد میں آئیں گے اور ان کی اتباع کی وجہ سے ہلاکت کا شکار ہوں گے۔

"قال: الامراء" اس کی ترکیب میں دو احتمال ہیں:

① منصوب (أعني کو محذوف ماننے کی صورت میں)۔ ② مرفوع (هم کو محذوف ماننے کی صورت میں)۔

بَابُ الْاِمَامَةِ

امامت کا بیان

ابن ملک فرماتے ہیں کہ امامت ''أمّ'' کا مصدر ہے، عربوں کا کہنا ہے ''أم القوم في صلاتهم'' اس نے نماز میں لوگوں کی امامت کی۔

الفصل الاول:

امامت کا مستحق کون ہے؟

۱۱۱۷: عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَأُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ كَانُوْا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَاءً فَاَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ فَاِنْ كَانُوْا فِي السُّنَّةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً فَاِنْ كَانُوْا فِي الْهِجْرَةِ سَوَاءً فَاَقْدَمُهُمْ سِنًّا وَلَا يُؤَمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِيْ سُلْطَانِهٖ وَلَا يَقْعُدُ فِيْ بَيْتِهٖ عَلٰى تَكْرِمَتِهٖ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (رواه مسلم وفي رواية لَهُ وَلَا يُؤَمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِيْ اَهْلِهٖ)۔

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٤٦٥ حديث رقم (٢٩٠-٦٧٣)۔ وأخرجه أبوداوٗد في السنن ١/٣٩٠ حديث رقم ٥٨٢۔ والنسائي ٢/٧٦ حديث رقم ٧٨٠۔ وابن ماجه ١/٣١٣ حديث رقم ٩٨٠۔

ترجمہ: حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگوں کو امامت وہ آدمی کروائے جو قرآن کریم سب سے اچھا پڑھتا ہو اگر قرآن پڑھنے میں سب برابر ہوں تو پھر وہ شخص امامت کرے جو سنت کا علم سب سے زیادہ رکھتا ہو اور اگر وہ سنت کو جاننے میں سب برابر ہوں تو پھر وہ آدمی امامت کروائے جو سب سے پہلے ہجرت کر کے آیا ہو اور اگر ہجرت میں بھی سب برابر ہوں تو پھر وہ آدمی نماز پڑھائے جس کی عمر زیادہ ہو اور کوئی آدمی کسی دوسرے شخص کی امارت کی جگہ امامت نہ کرے اور کسی کے گھر میں اس کی خاص مسند پر اس کی اجازت کے بغیر نہ بیٹھے۔ (مسلم) اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کوئی آدمی کسی دوسرے کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر امامت نہ کرے۔

تشریح: ''عن أبي مسعود'' یہ ابومسعود انصاری ہیں، ابن حجر نے انہیں بدری قرار دیا ہے۔

''يؤم القوم'' یہ امر کے معنی میں ہے یعنی ''ليؤمّ القوم''۔

''أقرؤهم لكتاب الله'' اس کا مطلب ہے قرآن مجید کی کثرت سے تلاوت کرنے والا جسے قرآن مجید خوب یاد ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قراء کو اس لئے مقدم کیا کہ آپ کے زمانہ میں جو قاری ہوتا تھا وہ فقیہہ ہی ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے اگر قاری فقیہہ بھی ہو تو امامت کا زیادہ حق دار ہوگا۔ بشرطیکہ وہ اتنی قراءت جانتا ہو جو نماز کی صحت کیلئے ضروری ہے، اکثر علماء کا تو یہی

مسلک ہے۔ لہٰذا اس معنی کو درست قرار دینے کیلئے ''اقرء هم لكتاب الله'' کو ''أعلمهم بكتاب الله'' کے معنی میں لیا جائے گا۔

بعض علماء کا مسلک یہ ہے کہ قراءت فقہ پر مقدم ہے، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا بھی شرح السنۃ کی حدیث کی بنا پر یہی قول ہے۔ البتہ قراءت اور فقہ کے دوسری چیزوں پر مقدم ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ شاگرد (جیسے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ) حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کا چھا قاری زیادہ علم والوں پر مقدم ہے۔ جبکہ امام مالک اور امام شافعی کا یہ مسلک ہے کہ اگر زیادہ علم والا اتنی قراءت کر سکتا ہو جو نماز کے صحیح ہونے کیلئے ضروری ہے تو وہ دوسروں پر مقدم ہوگا۔ اس لئے کہ عالم ہی نماز کے لاتعداد مسائل سے واقفیت رکھ سکتا ہے۔ اگر وہ عالم نہیں ہوگا تو کوئی ایسا کام کر گزرے گا جس سے نماز فاسد ہو جائے گی اور اسے علم بھی نہیں ہوگا۔

''فان كانوا فى القراءة'' اس برابری کا معیار چار چیزیں ہیں:

① مقدار قراءت۔ ② حسن قراءت۔ ③ اس قراءت پر قاری کا عمل۔ ④ اس کی تفسیر اور معنی کا علم۔

''فأعلمهم بالسنة'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سنت سے مراد یہاں احادیث کا علم ہے کیونکہ عہد صحابہ میں سب سے بڑا فقیہہ وہ ہوتا تھا جو احادیث کا بڑا عالم ہوتا ہے۔

جو حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ قراءت، علم وفقہ پر مقدم ہے انہوں نے حدیث کے اس جملے سے بھی استنباط کیا ہے۔ امام ابو یوسف اور سفیان ثوری کا یہی مسلک ہے۔

امام ابو حنیفہ، امام احمد، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ عالم اور فقیہہ اگر اتنی قراءت جانتا ہو جس کے ذریعے درست نماز پڑھا سکتا ہو تو اس کا حق قاری سے زیادہ ہوگا۔ یہ حضرات حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ آپؐ کے زمانہ کے قراء نماز کے مسائل کو خوب جانتے تھے جبکہ ہمارے زمانے کے قراء ایسے نہیں۔

اس موقع پر ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ہمارے بعض حضرات نے حدیث کی روایت کی بناء پر قاری کو استحقاق امامت میں عالم پر مقدم کیا ہے، امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عالم قاری پر مقدم ہوگا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ امامت میں دوسرے صحابہ پر مقدم رہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات صراحت کے ساتھ بیان فرمادی تھی کہ صحابہ میں ان سے بہتر قرآن پڑھنے والے بھی موجود ہیں۔ یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں صرف چار حضرات نے قرآن مجید حفظ کیا: ① حضرت ابی بن کعب، ② حضرت معاذ بن جبل، ③ حضرت زید بن ثابت اور ④ حضرت زید رضی اللہ عنہم، رواہ البخاری''۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد'' ''فان كانوا فى القراءة سواء فاعلمهم بالسنة'' اس بات کی دلیل ہے کہ قاری مطلقاً تمام لوگوں سے زیادہ امامت کا استحقاق رکھتا ہے۔ اس کا جواب آچکا ہے کہ حدیث میں اقرء سے مراد افقہ فی القرآن ہے۔ اگر وہ قرآن کے بارے میں برابر ہوں تو اس کے علم کے بارے میں بھی برابر ہوں گے اور اگر کسی کو سنت کا علم بھی حاصل ہو تو امامت کیلئے اس کا استحقاق بڑھ جائے گا۔ پس حدیث میں مطلقاً قاری کا استحقاق بتانا مقصود نہیں بلکہ ایسے قاری کا استحقاق بتانا مقصود ہے جو قاری

ہونے کے ساتھ ساتھ عالم بھی ہو۔

''فأقدمهم هجرة''یعنی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے میں جس کو سبقت ہوگی اس کا استحقاق بھی زیادہ ہوگا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿لا یستوی منکم من أنفق قبل الفتح وقاتل۔ ؟؟''تم میں سے کوئی اس شخص کے برابر نہیں ہوسکتا جس نے فتح سے پہلے راہ خدا میں خرچ کیا اور جہاد کیا''۔

علامہ طیبی ﷫ فرماتے ہیں''اب ہجرت تو ختم ہوگئی لیکن اس کی فضیلت باقی ہے،لہٰذا مہاجرین کی اولاد امامت کے استحقاق میں دوسروں پر مقدم ہوگی۔

ابن ملک فرماتے ہیں''آج کل ہجرت چونکہ متروک ہے اس لئے یہاں حقیقی ہجرت کے بجائے معنوی ہجرت یعنی گناہوں اور معاصی کے ترک کا اعتبار ہوگا۔پس جو جتنا زیادہ متقی ہوگا امامت میں اس کا استحقاق بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا''۔

''فأقدمهم سنا''عمر میں محترم کا مطلب پیدائش زمانے کی عمر نہیں بلکہ اسلام کی عمر مراد ہے۔یعنی اگر ایسے لوگ جمع ہوں جو پہلے مسلمان نہ تھے بعد میں اسلام لائے،ان میں امامت کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہوگا جو سب سے پہلے اسلام لایا۔اس کی تائید مسلم شریف کی ایک روایت سے بھی ہوئی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں''فأقدمهم اسلامًا''۔

ابن ملک ﷫ فرماتے ہیں''بڑی عمر والے کی امامت میں تکثیر جماعت کی حکمت کی وجہ سے اسے مقدم کیا''۔

ابن ہمام ﷫ فرماتے ہیں''جمہور کے مختار مسلک کی دلیل یہ حدیث ہے:''مروا أبابکر فلیصل''جب کہ اس زمانے میں ان کی موجودگی میں ان سے بڑے قاری حضرت ابی﷜ بھی موجود تھے۔

اس موقع پر ہم اس بات کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں کہ ہجرت کا حکم چونکہ منسوخ ہو چکا ہے اس لئے اب ہجرت سے مراد گناہوں سے ہجرت یعنی گناہوں کو چھوڑنا ہے۔ایک حدیث میں آتا ہے:

''المهاجر من هجر الخطایا و الذنوب''''مہاجر وہ ہے جو گناہوں اور معاصی سے ہجرت کرے''۔

البتہ اگر کوئی شخص دارالحرب میں اسلام قبول کر لے تو اس کیلئے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنا واجب ہے۔پس دارالاسلام میں پرورش پانے والا ہجرت کرنے والے سے زیادہ استحقاق رکھے گا۔

اس حدیث میں امامت کے صرف اتنے ہی مراتب ذکر کئے گئے ہیں لیکن عطاء نے کچھ اور بھی مراتب ذکر کئے ہیں۔ چنانچہ اگر عمر میں بھی سب برابر ہوں تو وہ شخص امامت کرے جو سب سے زیادہ اچھے اخلاق والا ہو اور اگر اخلاق میں بھی سب برابر ہوں تو وہ شخص امامت کرے جو اچھے چہرے والا ہو اور اگر خوبصورتی میں بھی سب برابر ہوں تو وہ شخص امامت کرے جو سب سے عمدہ لباس پہنے ہوئے ہو یا سب سے زیادہ شریف النسب ہو،اگر تمام اوصاف میں لوگ برابر ہو جائیں تو اس صورت میں بہتر شکل یہ ہے کہ ان کے درمیان قرعہ اندازی کی جائے یا معاملہ لوگوں کے حوالہ کر دیا جائے وہ جسے چاہیں اپنا امام مقرر کرلیں۔

''ولا یؤمن الرجل الرجل فی سلطانه''اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی سلطنت اور امارت میں امامت نہ کرے،اسی طرح ایسی جگہ بھی امامت نہ کرے جس کا مالک کوئی دوسرا شخص ہو جیسا کہ ایک دوسری روایت میں''فی اهله''سے ثابت ہوتا ہے۔اس وجہ سے حضرت ابن عمر﷠ حجاج کے پیچھے نماز ادا فرماتے تھے۔ابن عمر﷜ سے منقول

ہے کہ امام مسجد سلطان کے علاوہ ہر شخص پر مقدم ہے، اس مسئلہ کی حکمت یہ ہے کہ جماعت کی مشروعیت مسلمانوں کی باہمی محبت والفت کیلئے ہے۔ جب کوئی آدمی کسی دوسرے کی سلطنت میں امامت کروائے گا اس کی وجہ سے فتنہ وفساد کا دروازہ کھلے گا۔ امور سلطنت میں کمزوری اور آپس میں بغض وعناد پیدا ہوگا۔

پس معلوم ہوا کہ اگر کسی مقام پر حاکم وقت امامت کرتا ہے یا حاکم وقت کی جانب سے مقرر شدہ اسی کا نائب جو امیر اور خلیفہ کے حکم میں ہوتا ہے امارت کے فرائض سرانجام دیتا ہے تو کسی دوسرے شخص کیلئے مناسب نہیں کہ وہ آگے بڑھ کر امامت کرے خاص طور پر عیدین اور جمعہ کے اجتماع میں تو یہ بالکل مناسب نہیں ہے۔ اس طرح جس مسجد میں امام مقرر ہو یا کسی مکان میں صاحب خانہ کی موجودگی میں مقررہ امام اور صاحب خانہ کی اجازت کے بغیر امامت کی طرف سبقت کرنا کسی دوسرے شخص کا حق نہیں۔

امامت کا مستحق علم والا ہے

۱۱۱۸: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا کَانُوْا ثَلَاثَۃً فَلْیَؤُمُّھُمْ اَحَدُھُمْ وَاَحَقُّھُمْ بِالْاِمَامَۃِ اَقْرَأُھُمْ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۴٦٤حدیث رقم (۲۸۹۔٦۷۲)۔والنسائی فی السنن۱/۷۷حدیث رقم ۷۸۲۔ والدارمی ۱/۳۱۸حدیث رقم ۱۲۵٤۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تین آدمی جمع ہو جائیں تو ان میں سے ایک امام بن جائے اور امامت کا مستحق ان میں سے زیادہ علم والا ہے۔ (مسلم)

تشریح: ''ثلاثة'' ''تین'' آدمیوں کی قید اتفاقی ہے۔ اگر دو آدمی ہوں تب بھی جماعت سے نماز ادا کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ پچھلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

''فلیؤمھم احدھم'' حدیث کے اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مفضول بھی امامت کرا سکتا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم زندگی کا ایک بڑا حصہ طے کر چکے تھے جب اسلام کی دولت نصیب ہوئی تو وہ لوگ قرآن پڑھنے سے پہلے علم دین سیکھتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ صورت نہ رہی بلکہ اب تو لوگ عمر کے ابتدائی حصہ ہی میں علم دین حاصل کرنے سے پہلے قرآن پڑھنا سیکھ لیتے ہیں۔ بہرحال امامت کے مسئلے میں اچھے قاری پر اس فقیہ اور عالم کو برتری حاصل ہوگی جو نماز کے احکام ومسائل کا علم جانتا ہو لہٰذا معاملات کا زیادہ علم رکھنے والا قاری پر مقدم نہیں ہوسکتا۔

''وذکر حدیث مالك بن الحویرث فی باب بعد باب فضل الاذان'' یعنی مالک بن الحویرث کی حدیث باب فضل الاذان کے بعد ایک باب میں ذکر کی جا چکی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے ''قال اتیت النبی ﷺ انا وابن عم لی فقال ''اذا سافرتما فأذنا وأقیما ولیؤمکما اکبر کما'' اس حدیث میں امام کی فضیلت بیان کی گئی ہے اس لیے اس کو امامت کے باب میں ذکر کرنا زیادہ بہتر ہے۔ صاحب مشکوۃ نے یہاں مصابیح کی تصنیف میں تبدیلی کی ہے جس کی خاص ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس میں بھی امامت کی فضیلت موجود ہے۔

اگر وہ یہ وجہ بیان کریں کہ اس میں اذان کا ذکر مقدم ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اذان کا حدیث میں مقدم ہونا وجود میں اس کے مقدم ہونے کی وجہ سے ہے جیسے حضرت بلال حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جنت میں جائیں گے لیکن ایک خادم کی حیثیت سے۔

ابن حجر کو اس مقام پر ایک وہم ہوا ہے اور انہوں نے کہا کہ صاحب مصابیح نے مالک بن حویرث کی حدیث کو باب فضل الاذان کے بعد ایک باب میں ذکر کیا۔ (حالانکہ یہ صاحب مصابیح نے نہیں بلکہ صاحب مشکوٰۃ نے کیا ہے)۔

الفصل الثانی:

امام اور مؤذن بہترین آدمی ہوں

۱۱۱۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُؤَذِّنْ لَكُمْ خِيَارُكُمْ وَلْيَؤُمَّكُمْ قُرَّاءُكُمْ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۱/۳۹۶ حديث رقم ۵۹۰۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ بہترین ہیں وہ اذان دیں اور جو لوگ تم میں زیادہ علم والے ہیں وہ تمہاری امامت کروائیں۔ (ابوداؤد)

تشریح: ''لیؤذن لکم'' یہ امر استحباب کیلئے ہے۔

''خیارکم'' یعنی تم میں سے بہترین شخص اذان دے، اس ہدایت کی دو وجہیں ہیں:

① جب مؤذن بلند جگہ پر کھڑے ہو کر اذان دیتا ہے تو بسا اوقات اس کی نظر لوگوں کے گھروں پر پڑتی ہے، لہٰذا مؤذن دیندار ہو گا تو اپنی نظر کو نامحرم پر پڑنے سے بچائے گا۔

② اوقات کی پابندی کرے گا۔

علامہ جوہری رحمۃ اللہ علیہ نے خیار کی وضاحت امانت دار سے کی ہے کیونکہ روزے اور نماز کے بہت سے مسائل کا تعلق مؤذن سے وابستہ ہے۔

''قُرَّاءُ کم'' بضم القاف وتشدید الراء۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس لفظ کو ''اقرأکم'' نقل کیا ہے جو کہ اصول صحیحہ کے خلاف ہے۔ جو شخص قرآن کا اچھا قاری بھی ہو اور عالم بھی ہو وہ امامت کروانے میں سب پر فضیلت رکھتا ہے کیونکہ نماز کا سب سے افضل، مشکل اور لمبا ذکر قراءت ہے۔ اس حدیث میں کلام اللہ کی تعظیم اور اس کے قاری کی تقدیم کا مضمون موجود ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دونوں جہان میں اس کا مقام بلند ہو گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دفن کرنے میں قاری حضرات کو فوقیت اور تقدم عطا فرماتے ہیں۔

''رواه ابو داؤد'' امام میرک فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔ دار قطنی اور حاکم میں حدیث کے آخر میں ان الفاظ کا اضافہ ہے۔ ''فانهم وفدکم فیما بینکم وبین ربکم''۔

ملاقات کے لیے جانے والا امامت نہ کرائے

۱۱۲۰: وَعَنْ اَبِیْ عَطِيَّةَ الْعُقَيْلِیْ قَالَ كَانَ مَالِكُ بْنُ الْحُوَيْرِثِ يَأْتِيْنَا اِلٰى مُصَلَّانَا يَتَحَدَّثُ فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ يَوْمًا قَالَ اَبُوْعَطِيَّةَ فَقُلْنَا لَهُ تَقَدَّمْ فَصَلِّهِ قَالَ لَنَا قَدِّمُوْا رَجُلًا مِنْكُمْ يُصَلِّیْ بِكُمْ وَسَأُحَدِّثُكُمْ لِمَ لَا اُصَلِّیْ بِكُمْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ زَارَ قَوْمًا فَلَا يَؤُمَّهُمْ وَلْيَؤُمَّهُمْ رَجُلٌ مِنْهُمْ (رواه ابوداود والترمذی والنسائی) اِلَّا اَنَّهُ اقْتَصَرَ عَلٰى لَفْظِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/ ۳۹۹حديث رقم ۵۹۶۔والترمذی ۲/ ۱۸۷حديث رقم ۳۵۶۔والنسائی فی السنن ۲/ ۸۰حديث رقم ۷۸۷۔وأحمد فی المسند ۵/ ۵۳۔

ترجمہ: حضرت ابوعطیہ عقیلیؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت مالک بن حویرث ہماری مسجد میں آیا کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث بیان کرتے تھے ایک روز جب وہ ہمارے درمیان مسجد میں موجود تھے تو نماز کا وقت ہو گیا ابوعطیہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت مالک سے کہا آگے بڑھیں اور ہمیں نماز پڑھائیں مالک نے فرمایا تم اپنے میں سے کسی آدمی کو آگے کرو۔ تاکہ وہ تمہیں نماز پڑھائے اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نماز کیوں نہیں پڑھاتا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ جو آدمی کسی قوم سے ملاقات کے لئے جائے تو وہ ان کی امامت نہ کرے بلکہ ان میں سے ہی کسی شخص کو ان کی امامت کرنی چاہئے۔ (ترمذی، نسائی، ابوداؤد) امام نسائی نے اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن انہوں نے صرف رسول اللہ ﷺ کے الفاظ پر اکتفاء کیا ہے یعنی حضرت مالک کے مسجد میں آنے کا واقعہ اور امامت سے انکار اس کو ذکر نہیں کیا۔

راویٔ حدیث:

ابوعطیہ۔ ابوعطیہ نام ہے بنوعقیل کے آزاد کردہ ہونے کے باعث "عقیلی" کہلاتے ہیں۔ مالک بن الحویرث سے روایت کرتے ہیں۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں عقیل بن کعب کی طرف منسوب ہیں۔ میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو حاتم رضی اللہ عنہ اور ابو عطیہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا نہ یہ معروف ہیں اور نہ ان کا نام معلوم ہے۔ (جزری) مؤلف رحمہ اللہ نے الاکمال میں طبقہ تابعین میں ان کو ذکر نہیں کیا۔ اھ مرتب عرض کرتا ہے مگر ہمارے "الاکمال" کے نسخہ میں ان کا ذکر طبقہ تابعین میں موجود ہے۔ عقیل تصغیر کے ساتھ ہے۔ روایت: ۱۹۹۴ ان کے تابعی ہونے کی صریح دلیل ہے۔

تشریح: "وعن ابی عطیة العقیلی" ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں "یہ ابوعطیہ عقیل بن کعب کی طرف منسوب ہیں"۔ میرک فرماتے ہیں کہ ابو حاتم سے ابوعطیہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا "یہ غیر معروف اور نامعلوم شخصیت ہیں"۔ شیخ جزری رحمہ اللہ نے بھی یہی ذکر کیا ہے۔ مؤلف نے بھی مشکوۃ کے اسماء الرجال میں تابعین کے حصہ میں ان کا ذکر نہیں کیا۔

"مالك بن الحويرث" یہ لیثی ہیں وفد کی صورت میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیس دن آپ کی خدمت میں قیام فرمایا، آپ کی سکونت بصرہ میں تھی۔ مؤلف نے یہ بات فرمائی ہے۔

"وليؤمهم رجل منهم" میزبانوں میں سے کوئی آدمی امامت کروائے کیونکہ وہ وہاں زیادہ حق دار ہے۔ حضرت مالک بن الحویرث نے حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے امامت کروانے سے احتراز کیا ہے۔ حالانکہ انہیں اس کی اجازت مل چکی تھی۔

پس اگر یہ حدیث انہوں نے نماز کے بعد بیان کی تھی تو "وساحدثكم" کا سین استقبال کیلئے وگرنہ تاکید کیلئے ہوگا۔

"رواہ ابوداؤد، والترمذی" ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

نابینا آدمی امام بن سکتا ہے

۱۱۲۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اسْتَخْلَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْنَ اُمِّ مَكْتُوْمٍ يَؤُمُّ النَّاسَ وَهُوَ اَعْمٰى ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۱/ ۳۹۸ حديث رقم ۵۹۵۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو اپنا خلیفہ مقرر کیا تاکہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں حالانکہ وہ نابینا تھے۔ (ابوداؤد)

تشریح: "ابن ام مکتوم" ان کا اصل نام "عبداللہ" تھا۔

"يؤم الناس" ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے حضرت ابن ام مکتوم کو دو مرتبہ مدینہ کا بالعموم اور امامت کا بالخصوص نائب بنایا تھا۔

"وهو اعمٰى" ابن ملک فرماتے ہیں کہ اگر لوگوں میں کوئی بینا ایسا ہو جو نابینا سے زیادہ علم والا ہو یا اس کے برابر ہو تو نابینا کی امامت مکروہ ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے نابینا کی امامت کے جواز پر استدلال کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نابینا کی امامت کے جواز میں کسی کو اختلاف نہیں، اختلاف اس بارے میں ہے کہ وہ بینا سے اولیٰ ہے یا نہیں۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے تبوک جاتے ہوئے حضرت علیؓ کی موجودگی میں ابن ام مکتوم کو نائب بنایا تاکہ حضرت علیؓ آل بیت کی حفاظت پوری تندہی سے انجام دے سکیں کیونکہ دشمن کی طرف سے حملہ کا خطرہ تھا۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو مدینہ میں اپنا نائب اس لئے نہیں بنایا کہ بعد میں کوئی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے معاملہ پر طعن بازی نہ کر سکے۔

(ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں) میرا خیال یہ ہے کہ حضور ﷺ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی نظیر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک امی (ان پڑھ) اور غیر کاتب کو نبی بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''وما كنت تتلو من قبله من كتاب ولا تخطه بيمينك اذ الارتاب المبطلون''۔

''آپ اس سے پہلے کوئی کتاب نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے اسے لکھتے تھے وگرنہ اہل باطل لوگ شک میں پڑ جاتے''۔

مبطلون کے لفظ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر حضور ﷺ لکھنا پڑھنا جانتے تو اہل حق تب بھی شک میں نہ پڑتے۔

حدیث میں مذکورہ واقعہ حضور ﷺ کے تیرہویں غزوہ کا ہے۔

تین آدمیوں کی نماز قبولیت کے درجہ کو نہیں پہنچتی

۱۱۲۲: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَۃٌ لَا تُجَاوِزُ صَلَاتُھُمْ اٰذَانَھُمُ الْعَبْدُ الْاٰبِقُ حَتّٰی یَرْجِعَ وَامْرَاَۃٌ بَاتَتْ وَزَوْجُھَا عَلَیْھَا سَاخِطٌ وَاِمَامُ قَوْمٍ وَھُمْ لَہٗ کَارِھُوْنَ۔

(رواہ الترمذی وَقَالَ ھذاحدیث غریب)

أخرجه الترمذي في السنن ۲/ ۱۹۱ حديث رقم ۳۵۸۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین شخص ایسے ہیں جن کی نماز ان کے کانوں سے بلند نہیں ہوتی ایک وہ غلام جو اپنے مالک سے بھاگ گیا ہو یہاں تک کہ وہ واپس آ جائے دوم وہ عورت جو اس حالت میں رات گزارے کہ اس کا خاوند اس سے ناراض ہو سوم وہ امام کہ اس کی قوم اس کو پسند نہ کرتی ہو۔ (ترمذی) یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: ''لا تجاوز صلاتھم آذانھم'' اس جملہ کے دو معنی ہیں:

① ان کی نماز کو قبول کامل حاصل نہیں ہوتا۔ ② عمل صالح کی طرح ان کی نماز اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچتی۔

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے خصوصی طور پر ''کانوں'' کا ذکر فرمایا کیونکہ دعا اور تلاوت کی آواز کا تعلق کانوں ہی سے ہے۔ یہ حضور ﷺ کے اس قول کی مثل ہے جس میں آپ نے ریاکار قاری کے بارے میں فرمایا:

''یقرأون القرآن لا یجاوز تراقیھم''۔

''وہ قرآن پڑھتے ہیں لیکن قرآن ان کے حلق سے آگے نہیں جاتا''۔

امام طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اعمال کا کانوں کے اوپر نہ جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن عمل صالح کی طرح اس پر سایہ نہ کریں گے۔

بعض علماء نے اس حدیث کی تشریح میں فرمایا کہ ان لوگوں کو نماز، خاوند اور آقا کے حقوق کا خیال رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی جب انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا تو گویا کہ یہ نصیحت و ہدایت ان کے کانوں سے اوپر نہ گئی۔ جیسا کہ قاری کامل وہ ہوتا ہے جو قرآن پڑھ کر اس پر عمل کرے اور اگر عمل نہیں ~~کرتا تو گویا~~ کیا اس کا قرآن حلق سے آگے نہیں آتا۔

''العبد الآبق'' غلام کے حکم میں باندی بھی شامل ہے۔

''وزوجها علیها ساخط'' یہ اس شکل میں ہے جب کہ عورت بداخلاق ہو اور اس کا خاوند اس کی بداخلاقی اور بے ادبی کی وجہ سے اس سے ناراض ہو اگر خاوند ہی بداخلاق ہو اور اپنی بیوی سے ناحق ناراض ہے تو عورت گناہ گار نہ ہوگی مرد ہی گناہ گار ہوگا۔

''امام قوم'' اس سے مراد خلافت (امامت کبریٰ) ہے یا نماز کی امامت۔ دونوں احتمال موجود ہیں۔

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام پر یہ گناہ اس وقت ہوگا جبکہ اس کی بدعت، فسق یا اس کی جہالت کی وجہ سے مقتدی یا عوام اس سے ناراض ہوں اور اگر وہ لوگ کسی دنیاوی غرض سے بغض رکھتے ہوں تو امام بالکل گناہ گار نہیں ہوگا۔ صاحب شرح السنۃ فرماتے ہیں کہ امام سے مراد امامِ ظالم ہے اور اگر کوئی امام سنت کی پیروی اور احیاء کرنے والا ہو تو اس کی مخالفت کرنے والا گناہ گار ہوگا۔

بعض علماء نے اس حدیث کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ اس سے مراد نماز کا ایسا امام ہے جس میں امامت کی صلاحیت تو نہ ہو، زور بازو کی بنا پر امامت کروائے، اگر یہ بات نہ ہو تو اس کو ملامت کرنے والا گناہ گار ہوگا۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ اگر ایک، دو یا تین آدمی اسے ناپسند کرتے ہیں تو اس کی پرواہ نہ کرے باقی لوگوں کو جماعت سے نماز پڑھاتا رہے۔

''رواه الترمذی وقال هذا حدیث غریب'' ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تین آدمیوں کی نماز قبول نہیں ہوتی

۱۱۲۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَا تُقْبَلُ مِنْهُمْ صَلَاتُهُمْ مَنْ تَقَدَّمَ قَوْمًا وَهُمْ لَهٗ كَارِهُوْنَ وَرَجُلٌ اَتَى الصَّلَاةَ دِبَارًا وَالدِّبَارُ اَنْ يَّاْتِيَهَا بَعْدَ اَنْ تَفُوْتَهٗ وَرَجُلٌ اعْتَبَدَ مُحَرَّرَهٗ۔ (رواہ ابوداود وابن ماجة)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/۳۹۷ حدیث رقم ۵۹۳۔ وابن ماجه ۱/۳۱۱ حدیث رقم ۹۷۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین آدمی ایسے ہیں جن کی نماز قبول نہیں ہوتی: ایک وہ آدمی جو کسی قوم کا امام ہو اور قوم اس سے ناراض ہو دوسرا وہ آدمی جو نماز کا وقت نکل جانے کے بعد نماز پڑھے تیسرا وہ آدمی جو آزاد کو غلام بنالے۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: ''ثلاثة لا تقبل منهم صلاتهم'' ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''یہاں عدم قبول سے نماز کے کمال کی نفی مراد ہے''۔ (ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں) میرا خیال یہ ہے کہ قبول کی نفی سے اصل نماز کی نفی لازم نہیں آتی کیونکہ قبول کی نفی سے مراد ثواب کی نفی ہے، اگرچہ نماز علی وجہ الکمال موجود ہے۔

''من تقدم'' اس جملہ میں دو احتمال ہیں:

(۱) امامت کبریٰ یعنی خلافت کیلئے۔ (۲) امامت صغریٰ یعنی نماز کی امامت کیلئے۔

''وھم له کارھون'' یہ شخص قابل مذمت اس وقت ہوگا جب لوگ اسے کسی شرعی دلیل کی بناء پر ناپسند سمجھتے ہوں۔ نیز اس کو مذموم ٹھہرانے کیلئے ضروری ہے کہ اکثر لوگ اسے ناپسند قرار دیں۔ اگر ناپسند کرنے والے لوگ کم ہوں تو اصل اعتبار عالم کا ہے یعنی وہ ناپسند کرنے والا عالم ہو نہ کہ جاہل خواہ وہ اکیلا ہی کیوں نہ ہو۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو راجح قرار دیا ہے کہ اکثر لوگوں کا اعتبار ہے (عالم کا اعتبار نہیں)۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول اس صورت میں محمول ہوگا کہ جب اکثر علماء موجود ہوں، جاہلوں کی کثرت کا کوئی اعتبار نہیں۔

''بعد ان تفوته'' اس جملہ میں دو احتمال ہیں:

(۱) جماعت کی نماز فوت کر دے۔ (۲) نماز کو قضاء کر دے۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ شخص حدیث کا مصداق اس وقت بنے گا جب اُس عمل کو اپنی عادت بنا لے۔

''ورجل اعتبد محررہ'' غلام کو آزاد و سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ غلام کو آزاد کر دے اور پھر بعد میں زبردستی اس سے خدمت لے۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ کسی آزاد کے بارے میں یہ دعویٰ کرے کہ یہ میرا غلام ہے اور پھر اس کا مالک بن بیٹھے۔

تیسرا معنی یہ ہے کہ کسی غلام کو آزاد تو کر دیا لیکن خدمت کے حصول کیلئے اس کی آزادی کو اس سے چھپائے رکھے۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ لفظ ''محررۃ'' مونث استعمال کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے مراد نسمۃ (نفس انسانی) ہے خواہ غلام ہو یا باندی۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ محررہ (باندی) کا ذکر اس کے ضعف کی بنا پر کیا اور المحرر (غلام) کا ذکر اس کی قوت کی بناء پر نہیں کیا۔ (اور اس مسئلہ میں اصل بنیاد ضعف اور کمزوری ہے)۔

صحیح امام نہ ملنا قیامت کی علامت ہے

۱۱۲۴: وَعَنْ سَلَامَةَ بِنْتِ الْحُرِّ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَشْرَاطِ السَّاعَةِ اَنْ يَتَدَافَعَ اَهْلُ الْمَسْجِدِ لَا يَجِدُوْنَ اِمَامًا يُصَلِّيْ بِهِمْ۔ (رواہ احمد وابوداود وابن ماجة)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/ ۳۹۰ حديث رقم ۵۸۱۔ وأحمد في المسند ۶/ ۳۸۱۔

ترجمہ: حضرت سلامہ بنت حُر سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا علامات قیامت میں سے ایک علامت یہ ہے کہ مسجد والے لوگ امامت کو ایک دوسرے کے حوالے کریں گے یعنی امام بننے سے گریز کریں گے اور کوئی نماز پڑھانے والا ان کو نہیں ملے گا۔ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

راویٔ حدیث:

سلامۃ بنت الحر۔ یہ سلامہ بنت الحر''ازدیہ'' اور ''فزاریہ'' ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی حدیث کوفہ والوں میں مروی ہے۔ یہ

وہ لفظ ''حر'' ہے جو ''عبد'' کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔

تشریح: ''سلامۃ'' امام میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''سلامہ، صحابیہ ہیں''۔

''ان من اشراط الساعۃ'' یعنی قیامت کی مذموم علامات میں سے ایک یہ ہے، ''أشراط'' (شرط) کی جمع ہے۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اس تفسیر کو بعض علماء نے ناپسند کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے قائم ہونے سے پہلے لوگوں کے ناپسندیدہ معمولی اور چھوٹے امور میں سے ایک یہ ہے۔

''ان یتدافع اھل المسجد'' یعنی مسجد کے لوگوں میں سے ہر ایک نماز پڑھانے سے جان چھڑائے گا کیونکہ انہیں اتنے مسائل کا علم بھی نہیں ہوگا جن سے نماز صحیح ہو جائے۔ یہ قول علامہ طیبی کا ہے۔

ابن ملک فرماتے ہیں لوگوں میں ہر ایک دوسرے کو مصلی اور محراب کی طرف دھکیلے گا تا کہ وہ نماز پڑھائے کیونکہ ہر ایک نماز کے مسائل سے ناواقف ہوگا اور امامت کی صلاحیت نہ رکھتا ہوگا۔

''یصلی بھم'' یعنی خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے، اسی وجہ سے متاخرین علماء نے امامت، اذان اور تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو جائز کہا ہے جبکہ متقدمین عبادت پر اجرت لینے کو حرام بتاتے تھے۔

''رواہ احمد، وابوداؤد وابن ماجہ'' امام میرک فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں امامت کیلئے ایک دوسرے کو آگے دھکیلنا مکروہ ہے۔

عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں ہے کہ تین آدمیوں کا نماز کی امامت کے بارے میں تنازع ہوا تو انہیں زمین میں دھنسا دیا گیا۔ اس روایت کا ظاہر اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ ان کا یہ تنازعہ کسی شرعی غرض کیلئے نہ تھا۔ ورگرنہ اگر کوئی شخص اپنے سے اعلیٰ سمجھتے ہوئے کسی عالم یا فقیہ کو امامت کیلئے آگے ہونے پر اصرار کرے تو مکروہ نہیں ہے۔

فاسق امام بن سکتا ہے

۱۱۲۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْجِهَادُ وَاجِبٌ عَلَیْکُمْ مَعَ کُلِّ اَمِیْرٍ بَرًّا کَانَ اَوْ فَاجِرًا وَاِنْ عَمِلَ الْکَبَائِرَ وَالصَّلَاةُ وَاجِبَةٌ عَلَیْکُمْ خَلْفَ کُلِّ مُسْلِمٍ بَرًّا کَانَ اَوْ فَاجِرًا وَاِنْ عَمِلَ الْکَبَائِرَ وَالصَّلَاةُ وَاجِبَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ بَرًّا کَانَ اَوْ فَاجِرًا وَاِنْ عَمِلَ الْکَبَائِرَ۔

(رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۳/ ۴۰ حدیث رقم ۲۵۳۳۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے اوپر جہاد واجب ہے ہر امیر کے ساتھ چاہے نیک ہو یا فاجر ہو اگرچہ وہ کبیرہ گناہ کرتا ہو اور تم پر نماز واجب ہے ہر مسلمان کے پیچھے چاہے نماز پڑھانے والا نیک ہو یا فاجر اگرچہ گناہ کبیرہ کرتا ہو اور نماز جنازہ ہر مسلمان پر واجب ہے چاہے نیک ہو یا فاجر اگرچہ کبائر کا مرتکب ہو۔ (ابوداؤد)

تشریح: ''الجهاد واجب عليكم'' یعنی بعض صورتوں میں تم پر جہاد فرض عین ہے اور بعض صورتوں میں فرض کفایہ۔

''برًّا كان اوفاجرا وان عمل الكبائر'' ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق کو امیر بنانا جائز ہے اور اس کے فسق کی وجہ سے اسے معزول نہیں کیا جائے گا۔ جب تک وہ معصیت کا حکم نہ دے اس کی اطاعت ضروری ہے۔ اسلاف کے جن لوگوں نے ظالم حکمرانوں کے خلاف جہاد کیا۔ وہ ظالم حکمران کے خلاف جہاد کی حرمت کے اجماع سے پہلے تھا۔ اب ظالم حاکم کے خلاف جہاد ٹھیک نہیں۔

''واجبة عليكم'' اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنا فرض عملی ہے فرض اعتقادی نہیں ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''جماعت کی نماز فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں ہے''۔ لیکن چونکہ جماعت کی نماز شعائر اسلام ہی سے ہے اور سلف عظام کا معمول رہی ہے اس لئے ابن حجر سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ اگر ایک شہر میں ایک شخص کسی امام کے ساتھ نماز پڑھ لے تو باقی سب سے فرض ساقط ہو جائے گا۔

''برًّا كان اوفاجرا وان عمل الكبائر'' اس حدیث سے فاسق اور بدعتی (جبکہ وہ کسی کفریہ عقیدہ میں مبتلا نہ ہو) کی اقتداء کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فاسق کے پیچھے نماز نہیں ہوتی یہ حدیث ان کے خلاف حجت ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ فاسق اور بدعتی کے پیچھے نماز کے مکروہ ہونے کے باوجود ان کے پیچھے نماز ادا کرنے کا حکم اس بات کی دلیل ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے۔

''وان عمل الكبائر'' ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کے اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کبیرہ گناہ کرے تو وہ اسلام کے دائرے سے خارج نہیں ہوتا (جیسا کہ خوارج کا عقیدہ ہے) اور اس کے اعمال صالحہ بھی ضائع نہیں ہوتے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ حدیث چونکہ منقطع ہے اس لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف حجت نہیں بن سکتی جیسا کہ ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ واللہ اعلم۔

لیکن ابن الہمام نے اس حدیث پر کچھ بحث کی اور اسے مقبول قرار دیا ہے، اب چونکہ یہ مختلف طرف سے مروی ہے وہ تمام طرق تو ضعیف ہیں لیکن کثرت طرق کی وجہ سے یہ حدیث محققین کے نزدیک کے حسن کے درجہ میں آ گئی۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی تائید دارقطنی کی درج ذیل روایت سے ہوتی ہے:

''اقتدوا بكل برّ وفاجر''

یہ حدیث اگر چہ مرسل ہے لیکن اسلاف کا فعل اسے تقویت بخشتا ہے کیونکہ اسلاف سے ظالم حکمرانوں کی اقتداء کرنا ثابت ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ ابن عمر اور حضرت انس رضی اللہ عنہ حجاج کے پیچھے نماز ادا کیا کرتے تھے۔ ان حضرات کے عمل میں ضعف کا احتمال نہیں ہے ~~کیونکہ خلیفہ وقت~~ عبدالملک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بہت تعظیم کرتا تھا، اسی وجہ سے وہ

حج کے موقع پر ابن عمر رضی اللہ عنہما کو آگے کرتا اور حجاج کو ان کی اتباع کا حکم دیتا تھا۔

الفصل الثالث:

نابالغ امام کی امامت

۱۱۲۶: عَنْ عَمْرِو ابْنِ سَلَمَةَ قَالَ كُنَّا بِمَاءٍ مَمَرِّ النَّاسِ يَمُرُّ بِنَا الرُّكْبَانُ نَسْأَلُهُمْ مَا لِلنَّاسِ؟ مَا لِلنَّاسِ؟ مَا هٰذَا الرَّجُلُ فَيَقُوْلُوْنَ يَزْعَمُ اَنَّ اللّٰهَ اَرْسَلَهٗ اَوْحٰى اِلَيْهِ اَوْحٰى اِلَيْهِ كَذَا فَكُنْتُ اَحْفَظُ ذٰلِكَ الْكَلَامَ فَكَاَنَّمَا يُغْرٰى فِيْ صَدْرِيْ وَكَانَتِ الْعَرَبُ تَلَوَّمُ بِاِسْلَامِهِمُ الْفَتْحَ فَيَقُوْلُوْنَ اتْرُكُوْهُ وَقَوْمَهٗ فَاِنَّهٗ اِنْ ظَهَرَعَلَيْهِمْ فَهُوَنَبِيٌّ صَادِقٌ فَلَمَّاكَانَتْ وَقْعَةُ الْفَتْحِ بَادَرَ كُلُّ قَوْمٍ بِاِسْلَامِهِمْ وَبَادَاَبِيْ قَوْمِيْ بِاِسْلَامِهِمْ فَلَمَّا قَدِمَ قَالَ جِئْتُكُمْ وَاللّٰهِ مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ حَقًّا فَقَالَ صَلُّوْا صَلَاةَ كَذَا فِيْ حِيْنِ كَذَا وَصَلَاةَ كَذَا فِيْ حِيْنِ كَذَا فَاِذَا حَضَرَتِ الصَّلَاةُ فَلْيُؤَذِّنْ اَحَدُكُمْ فَلْيَؤُمَّكُمْ اَكْثَرُكُمْ قُرْاٰنًا فَنَظَرُوْا فَلَمْ يَكُنْ اَحَدٌ اَكْثَرَ قُرْاٰنًا مِنِّيْ لِمَا كُنْتُ اَتَلَقّٰى مِنَ الرُّكْبَانِ فَقَدَّمُوْنِيْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَاَنَا اِبْنُ سِتٍّ اَوْ سَبْعِ سِنِيْنَ وَكَانَتْ عَلَيَّ بُرْدَةٌ كُنْتُ اِذَا سَجَدْتُ تَقَلَّصَتْ عَنِّيْ فَقَالَتِ امْرَاَةٌ مِنَ الْحَيِّ اَلَا تُغَطُّوْنَ عَنَّا اِسْتَ قَارِئِكُمْ فَاشْتَرَوْا فَقَطَّعُوْا لِيْ قَمِيْصًا فَمَا فَرِحْتُهٗ بِشَيْءٍ فَرْحِيْ بِذٰلِكَ الْقَمِيْصِ ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢٢/٨ حديث رقم ٤٣٠٢۔ وأحمد في المسند ٣٠/٥۔

ترجمہ: حضرت عمرو ابن سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک پانی کے کنارے رہتے تھے وہاں سے گروہ اور قافلے گزرتے تھے۔ ہم ان سے پوچھتے رہتے تھے کہ لوگوں کے لئے ایک آدمی نیا دین لے کر آیا ہے۔ وہ کیسا ہے وہ لوگ ہمیں بتاتے تھے کہ وہ رسول اللہ ﷺ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نبی بنا کر بھیجا ہے اور قافلہ کے لوگ قرآن کریم کی آیات سنا کر کہا کرتے تھے کہ یہ ان کے پاس وحی آتی ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی صفات قافلے والے لوگ بیان کرتے اور جو آیات پڑھ کر سنایا کرتے تھے میں ان کو اچھی طرح یاد کرلیا کرتا تھا۔ اور وہ میرے سینے میں محفوظ ہو جاتی تھیں اور عرب کے لوگ اسلام لانے کے سلسلے میں مکہ فتح ہونے کا انتظار کر رہے تھے اکثر لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ اگر مکہ فتح ہوگیا تو ہم مسلمان ہو جائیں گے اور یہ بھی کہا کرتے تھے اس رسول کو اور رسول کی قوم کو چھوڑ دو اگر وہ اپنے لوگوں پر غالب آ گیا اور مکہ کو فتح کرلیا تو پھر یہ سچا نبی ہے کیونکہ وہ اپنی کمزوری کے باوجود غالب آجائے گا اور فتح مکہ اس کا معجزہ ہوگا چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو غالب کیا اور مکہ فتح ہوگیا تو لوگ اسلام قبول کرنے کے لئے تیزی سے اسلام میں داخل ہونے لگے میرے والد اپنی قوم سے سبقت کر کے سب سے پہلے اسلام لے آئے جب وہ واپس آئے تو کہنے لگے اللہ کی قسم میں سچے نبی کے پاس سے آیا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے فلاں وقت میں ایسی ایسی اور اتنی نماز پڑھو یعنی نماز

اور رکعات نماز کی تعلیم دی جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے ایک آدمی اذان دے اور تم میں سے جس کو زیادہ قرآن یاد ہو وہ تمہاری امامت کروائے جب نماز کے وقت جماعت کی تیاری ہوئی تو لوگوں نے آپس میں دیکھا تو اس وقت مجھ سے زیادہ قرآن جاننے والا کوئی نہیں تھا کیونکہ میں نے مختلف قافلے والوں سے قرآن سیکھا تھا چنانچہ لوگوں نے مجھے آگے کر دیا اس وقت میری عمر چھے یا سات سال کی تھی اور میرے جسم پر صرف ایک چادر تھی جب میں سجدہ کرتا تو وہ چادر میرے جسم سے ہٹ جاتی اور جسم کا کچھ حصہ برہنہ ہو جاتا تو قوم میں سے ایک عورت نے کہا کہ ہمارے سامنے تم لوگ اپنے امام کی شرمگاہ کیوں نہیں ڈھانپتے اس وقت میری قوم نے کپڑا خریدا اور میرے لئے ایک قمیص بنوائی مجھے اس قمیص کے اتنی خوشی ہوئی کہ اس سے پہلے اتنی خوشی کسی چیز کی نہیں ہوئی تھی۔ (بخاری)

تشریح: ''عمرو بن سلمة'' لفظ ''سلمة'' لام کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ صاحب مصابیح فرماتے ہیں کہ ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔ تقریب اور الأنساب کے مصنف نے انہی صحابی قرار دیا ہے۔

علامہ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وفد کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کے والد حاضر ہوئے وہ خود نہیں تھے۔

طبرانی اور ابن مندہ نے حماد بن سلمہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ وہ خود بھی اس وفد میں شامل تھے۔ ان کی صحابیت کے بارے میں التخفدیب کی رائے یہ ہے کہ یہ صحابی نہیں ہیں۔

''ممر الناس'' اس کی ترکیب میں دو احتمال ہیں: ① ماء کی صفت ہے۔ ② اس سے بدل ہے۔

''الركبان'' راء کے ضمہ کے ساتھ اونٹ سوار معنی خاص ہے کہ راکب کی جمع ہے۔

''یزعم'' یہ لفظ بتا رہا ہے کہ عمر ابن سلمہ کی قوم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بتانے والا شخص آپ کی نبوت کے بارے میں شکوک وشبہات کا شکار تھا کیونکہ اس لفظ کی حقیقت یہی ہے۔

''اوحی الیه بكذا'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن سے کنایہ ہے۔

① ''فكانما یغری'' اس لفظ کی حقیقت صرفیہ میں دو قول ہیں:

① باب تفعیل سے مضارع مجہول ہے۔ ② باب افعال سے مضارع مجہول ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کلام میرے سینہ سے چمٹ جاتا تھا یعنی اچھی طرح یاد ہو گیا اور کبھی نہ بھولا۔ اسلئے کہا جاتا ہے کہ بچپن ہی یاد کی ہوئی چیز پتھر پر لکیر کی طرح ہوتی ہے۔

اس لفظ میں دو روایتیں اور بھی ہیں:

① یقراء۔ یہ القراءة سے مشتق ہے، بمعنی پڑھنا۔ ② یقرّی، یہ التقریه سے مشتق ہے، بمعنی جمع کرنا۔

بعض روایات یقّر (راء کی تشدید کے ساتھ بھی) آیا ہے۔ (اس لفظ کی حقیقت اور روایات کے بارے میں علماء کے انتہائی تفصیلی اور مختلف اقوال بھی ملتے ہیں)۔

''فهو نبی صادق'' ان کی اس بات کا ~~منشا یہ تھا~~ کہ محض معجزات دکھا کر عربوں کو مغلوب نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کیلئے تو

صدق نبوت اور اللہ کی نصرت ضروری ہے۔

"فلما قدم" اس لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عمر ابن سلمہ جو اس واقعے کے راوی ہیں خود ساتھ نہ تھے۔

"فلیؤذن احدکم" یہ بیان جواز ہے۔ اور ایک دوسری حدیث "فلیؤذن لکم خیارکم" بیان افضلیت ہے اس لئے دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

"وانا ابن ست او سبع سنین" اس جملہ سے ان علماء کے قول کی تائید ہوگئی ہے جن کا کہنا یہ ہے کہ تحمل کی کم از کم عمر پانچ سال ہے۔ محمود بن الربیع کی پانچ سالہ عمر کی روایت پر امام بخاری نے "متی یصح سماع الصغیر" کے نام سے ترجمۃ الباب بھی باندھا ہے۔ بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اگر بچہ پانچ سال سے کم بھی ہو پھر بھی اس کی روایت لی جاسکتی ہے۔ ایک مرتبہ مامون کے پاس چار سال کا بچہ لایا گیا۔ جو قرآن پڑھتا تھا اور اس کی تفسیر کرتا تھا اور جب بھوک لگتی تو رونا شروع کر دیتا لیکن علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حکایت ثابت شدہ نہیں۔ البتہ یہ بات بالکل درست ہے کہ محب ابن الہاشم نے پانچ سال کی عمر سے پہلے قرآن مجید، العمدۃ، کافیہ اور شافیہ کو پوری طرح یاد کر لیا تھا اور جب ان سے کسی آیت کے بارے میں سوال کیا جاتا تو بلاتوقف جواب دیتے۔

"فما فرحت بشیء فرحی بذلک القمیص" اس خوشی کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

① اب مکمل پردے کا انتظام ہوگیا، اب بے پردگی کا خوف نہ رہے گا۔

② نئے کپڑے پہننے کی خوشی جو عام طور پر بچوں میں پائی جاتی ہے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ لڑکے کی امامت کے جواز میں اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ لڑکے کی امامت جائز ہے۔ البتہ جمعہ کی نماز میں نابالغ لڑکے کی امامت کے سلسلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں اور امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نابالغ لڑکے کی امامت جائز نہیں ہے۔ البتہ نفل نماز کے بارے میں علماء کے یہاں اختلاف ہے۔ چنانچہ بلخ کے مشائخ نفل نماز میں نابالغ لڑکے کی امامت کے جواز کے قائل ہیں اور اسی پر ان کا عمل ہے نیز مصر اور شام میں اسی پر عمل ہے۔ ان کے علاوہ دیگر علماء نے نفل نماز میں بھی نابالغ لڑکے کی امامت کو جائز قرار نہیں دیا، چنانچہ علماء ماوراء النہر کا عمل اسی پر ہے۔

علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ شرح کنز میں اس مسئلہ کے بارے میں لکھتے ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں نابالغ لڑکے کی امامت کو جائز کہا ہے۔ انہوں نے اسی روایت سے استدلال کیا ہے۔ لیکن حنفیہ کے نزدیک حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول کی روشنی میں کہ "وہ لڑکا جس پر حد واجب نہیں ہوئی امامت نہ کرے"۔ نابالغ لڑکے کی امامت جائز نہیں ہے، اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "لڑکا جب تک بالغ نہ ہوجائے امامت نہ کرے"۔

لٰہذا یہ جائز نہیں کہ فرض نماز پڑھنے والا نابالغ لڑکے کی اقتداء کرے۔ جہاں تک عمرو بن سلمہ کی امامت کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ ان کی امامت آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی بنا پر نہیں تھی بلکہ یہ ان کی قوم کے لوگوں کا اپنا اجتہاد تھا

کہ عمر چونکہ قافلہ کے لوگوں سے قرآن کریم سیکھ چکے تھے اس لئے ان کو امام بنا دیا۔

شافعیہ کے بارے میں بڑے تعجب کی بات ہے کہ شوافع حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور دوسرے بڑے بڑے صحابی رضوان اللہ علیہم کے قول کو تو حجت قرار نہیں دیتے جبکہ ایک نابالغ بچہ کے قول سے استدلال کر رہے ہیں۔

آزاد شدہ غلام کی امامت کا مسئلہ

۱۱۲۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ لَمَّا قَدِمَ الْمُهَاجِرُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ الْمَدِيْنَةَ كَانَ يَؤُمُّهُمْ سَالِمٌ مَوْلٰى اَبِىْ حُذَيْفَةَ وَفِيْهِمْ عُمَرُ وَاَبُوْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِالْاَسَدِ ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۱۸٤ حدیث رقم ٦٩٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں پہلے آنے والے مہاجرین آئے تو ابوحذیفہؓ کے غلام سالم ان کو نماز پڑھاتے تھے اور مقتدیوں میں حضرت عمر اور ابوسلمہ بن اسد وغیرہ موجود ہوتے تھے۔(ابوداود)

تشریح: ''لما قدم المهاجرون الاولون المدينه'' بعض روایات میں ''العصبة'' کا ذکر آیا ہے جو کہ قباء میں ایک جگہ کا نام ہے۔

''کان یؤمهم سالم مولی ابی حذیفه وفیهم عمر وابو سلمة بن عبدالاسد'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ افضل کی موجودگی میں مفضول نماز پڑھا سکتا ہے۔

حضرت سالم، حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام اور بہترین قاریوں میں سے ایک تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار صحابہ کے بارے میں فرمایا تھا کہ ان سے قرآن سے سیکھو، ان میں ایک یہ حضرت سالم بھی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں حضرت سالمؓ کی امامت کروانا اس بات کی دلیل ہے کہ اقرأ امامت میں افقہ پر مقدم ہوگا۔

وہ لوگ جن کی نماز قبول نہیں ہوتی

۱۱۲۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثَةٌ لَا تَرْفَعُ لَهُمْ صَلَاتُهُمْ فَوْقَ رُؤُسِهِمْ شِبْرًا رَجُلٌ اَمَّ قَوْمًا وَهُمْ لَهٗ كَارِهُوْنَ وَامْرَأَةٌ بَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَلَيْهَا سَاخِطٌ وَّاَخَوَانِ مُتَصَارِمَانِ۔

(رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه فی السنن ۱/۳۱۱ حدیث رقم ۹۷۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین آدمی ایسے ہیں کہ جن کی نماز ان کے سر سے ایک بالشت بھی بلند نہیں ہوتی: ① وہ آدمی جو قوم کا امام ہو اور قوم اسے پسند نہ کرے۔ ② وہ عورت جو رات اس طرح گزارے کہ اس کا خاوند اس سے ناراض ہو یعنی اس کی نافرمانی کی وجہ سے۔ ③

ایسے دو بھائی جو آپس میں ناراض ہوں اور تعلقات ختم کیے ہوئے ہوں۔ (ابن ماجہ)

تشریح: ''لا ترفع لهم صلاتهم فوق رؤوسهم شبرًا'' یہ عدم قبول سے کنایہ ہے۔

جن تین حضرات کا اس حدیث میں ذکر ہے ان تینوں میں ایک بات قدر مشترک ہے انہوں نے علی الترتیب حق امامت، حق زوجیت اور حق اخوت کا پاس نہیں رکھا۔

''واخوان متصار مان'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نسبی بھائی بھی ہوسکتا ہے اور مسلمان بھائی بھی۔ کیونکہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ کسی مسلمان کیلئے حلال نہیں کہ وہ تین دن سے زائد اپنے بھائی کو چھوڑے رکھے۔ یعنی بغیر کسی شرعی وجہ کے اس سے مقاطعہ رکھے۔

بَابُ مَا عَلَى الْإِمَامِ

وہ چیزیں جو امام پر لازم وضروری ہیں

اس باب میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ امام مقتدیوں کی رعایت کرے اور مختصر نماز پڑھائے

الفصل الاول:

۱۱۲۹: عَنْ اَنَسٍ قَالَ مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ اِمَامٍ قَطُّ اَخَفَّ صَلَاةٍ وَلَا اَتَمَّ صَلَاةٍ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاِنْ كَانَ لَيَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ فَيُخَفِّفُ مُخَافَةَ اَنْ تُفْتَنَ اُمُّهُ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲۰۱/۲ حديث رقم ۷۰۸۔ ومسلم في صحيحه ۳٤۲/۱ حديث رقم (۱۹۰۔٤٦۹) وأبوداوٗد في السنن ٤۹۹/۱ حديث رقم ۷۸۹۔ والترمذی ۳٤۲/۱ حديث رقم ۳۷٦۔ والنسائی ۹٥/۲ حديث رقم ۸۲٥۔ وابن ماجه ۳۱٦/۱ حديث رقم ۹۹۰۔ وأحمد في المسند ۳۰٥/٥۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے زیادہ ہلکی اور کامل نماز میں نے کسی امام کے پیچھے نہیں پڑھی اور آپ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ اگر آپ کسی بچہ کے رونے کی آواز سن لیتے تو نماز کو مختصر کر دیتے تھے تاکہ اس کی ماں فکرمند ہو کر فتنہ میں نہ پڑ جائے۔

تشریح: ''أنس'' حضرت انس رضی اللہ عنہ بصرہ میں فوت ہونے والے سب سے آخری صحابی ہیں، آپ کا انتقال سن ۹۱ ہجری میں ہوا اور اس وقت آپ کی عمر ایک سو تین سال تھی۔

''أخف صلاة ولا أتم صلوٰة من النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' قاضی رحمہ اللہ اس جملہ کی شرح اس طرح کرتے ہیں کہ خفت صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ لمبی قراءت نہ کی جائے بلکہ قصار مفصل پر اکتفاء کرلیا جائے۔ اور انتقالات لمبی لمبی دعائیں نہ مانگی جائیں۔ تمام صلاۃ کا مطلب یہ ہے تمام ارکان وسنن کو بجالایا جائے اور رکوع وسجدہ میں تین تسبیح کے بقدر ٹھہرا جائے۔

قاضی رحمہ اللہ کی اس تشریح سے یہ وہم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اوساط مفصل اور طوال مفصل سے نہیں پڑھتے تھے۔ حالانکہ

اس کا ثبوت موجود ہے۔ پس معنی یہ ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ کو کھینچ کھینچ کر اور بلا وجہ لمبا کر کے نہیں پڑھتے تھے جیسا کہ ہمارے زمانے میں مکہ مکرمہ کے بڑے ائمہ کرتے ہیں۔ ① وہ مدات کو تین تین الف تک لے جاتے ہیں اور لمبے لمبے سکتے شدو وقوف کرتے ہیں اور تسبیحات کی تعداد میں اس لئے اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں کہ لمبی لمبی بار ترنم تکبیرات کہنے والے مکبّرین تکبیریں پوری کرلیں۔ جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت عمدہ، خوبصورت مرتل اور واضح ہوتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لطیف قراءت کی خصوصیت تھی کہ وہ نفوس پر بار نہیں بنتی تھی۔ اگر طویل بھی ہو جاتی تو پھر بھی اس سے ارواح سیر نہ ہوتی تھیں۔

ہمارا (احناف کا) مسلک یہ ہے کہ امام کیلئے مناسب نہیں کہ تسبیحات وغیرہ کو اتنا طویل کرے کہ لوگ بیزار ہونے لگیں۔ کیونکہ تطویل لوگوں کو بے توجہ کرنے کے مترادف ہے اور یہ مکروہ ہے۔ البتہ اگر لوگوں کی یہی خواہش اور مرضی ہے تو کوئی حرج نہیں۔ اس بات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ لوگوں کی تنگدلی کو مدنظر رکھتے ہوئے نماز کو سنت مقدار سے بھی کم نہ کردے۔

''فیخفف مخافة ان تفتن'' علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے استدلال کیا جا سکتا ہے اگر کوئی امام رکوع کی حالت میں یہ محسوس کرے کہ کوئی شخص نماز میں شریک ہو رہا ہو تو وہ رکوع کو تھوڑا لمبا کردے تاکہ اسے رکعت مل جائے۔ کیونکہ جب امر دنیاوی کی حاجت کیلئے نماز میں کمی بیشی کر سکتا ہے تو امر اخروی کیلئے تو بطریق اولی جائز ہے۔ البتہ بعض علماء نے اسے مکروہ خیال کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ یہ شرک بھی بن سکتا ہے۔ امام مالک کا بھی یہی مسلک ہے۔

حنفی مسلک یہ ہے کہ اگر امام رکوع کو تقرب الی اللہ کی نیت سے نہیں بلکہ اس مقصد سے طویل کرے گا کہ کوئی آنے والا شخص رکوع میں شامل ہو کر رکعت پالے تو یہ مکروہ تحریمی ہوگا۔ بلکہ اس سے بھی بڑے گناہ کے مرتکب ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے تاہم کفرو شرک کی حد تک نہیں پہنچے گا کیونکہ اس سے اس کی نیت غیر اللہ کی عبادت بہر حال نہیں ہوگی۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر امام آنے والے کو پہچانتا نہیں، تو اس شکل میں رکوع کو طویل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ اس کا ترک اولیٰ ہے۔ ہاں اگر کوئی امام تقرب الی اللہ نیت سے رکوع کو طویل کرے اور اس پاک جذبہ کے علاوہ کوئی اور دوسرا مقصد نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ایسی حالت کا ہونا چونکہ نادر ہے اور پھر یہ کہ اس مسئلہ کا نام ہی ''مسئلة الریاء '' ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں کمالِ احتیاط ہی اولیٰ ہے۔

امام ابوداؤد نے ایک روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اس وقت تک انتظار کرتے جب تک جوتوں کی آواز آرہی ہوتی۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اگر اسے صحیح تسلیم کرلیں تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ نماز شروع کرنے میں انتظار کرتے تھے۔ نیز صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی پہلی رکعت کو لمبا کرتے تھے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ شریک ہو جائیں۔

نماز میں طویل قیام کی نیت کے بعد قیام کو مختصر کرنا

۱۱۳۰: وَعَنْ اَبِی قَتَادَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنِّیْ لَاَدْخُلُ فِی الصَّلَاةِ وَاَنَا اُرِیْدُ اِطَالَتَهَا فَاَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِیِّ فَاَتَجَوَّزُ فِیْ صَلَاتِیْ مِمَّا اَعْلَمُ مِنْ شِدَّةِ وَجْدِ اُمِّهٖ مِنْ بُكَائِهٖ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۲۰۲ حدیث رقم ۷۰۹۔ وابن ماجه فی السنن ۱/۳۱۶ حدیث رقم ۹۸۹۔

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نماز میں داخل ہوتا ہوں تو نماز کو طویل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں مگر جب بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو یہ جان کر کہ بچے کے رونے کی وجہ سے اس کی ماں کہیں پریشان نہ ہو جائے نماز میں تخفیف کر دیتا ہوں۔ (بخاری)

تشریح: ''فأتجوز فی صلاتی'' اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کسی لمبی سورت کے پڑھنے کا ارادہ فرما چکے ہوتے تھے لیکن بچہ کی آہ و بکا سن کر چھوٹی سورت کی قراءت فرما لیتے۔ حاصل یہ کہ نبی کریم ﷺ دو فضیلتوں کو جمع فرماتے ایک لمبی نماز، شفقت اور رحمت کا ارادہ اور دوسری لوگوں کو بیزاری سے بچانا۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

امام پر لازم ہے کہ مقتدیوں کی رعایت رکھے

۱۱۳۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ فَاِنْ فِيْهِمُ السَّقِيْمُ وَالضَّعِيْفُ وَالْكَبِيْرُ وَاِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ لِنَفْسِهٖ فَلْيُطَوِّلْ مَاشَاءَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۹۹/۲حدیث رقم ۷۰۳۔ومسلم فی صحیحه ۳۴۱/۱حدیث رقم (۱۸۳۔۴۶۷) وأبوداؤد فی السنن ۵۰۲/۱حدیث رقم ۷۹۴۔والترمذی فی السنن۴۶۱/۱حدیث رقم ۲۳۶۔والنسائی ۹۴/۲حدیث رقم ۸۲۳۔وابن ماجه ۳۱۶/۱حدیث رقم ۹۸۷۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی لوگوں کو نماز پڑھائے اس کو چاہئے کہ نماز کو مختصر کرے کیونکہ مقتدیوں میں کمزور اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور جب کوئی آدمی تنہا نماز پڑھے تو اس کو اختیار ہے جس قدر چاہے نماز کو طویل کرے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''فان فیهم السقیم والضعیف'' ضعیف، جو پیدائشی ضعیف ہے، یا عبادت میں ضعیف مراد ہے۔

''واذا صلی احدکم لنفسه فلیطول ما شاء'' یعنی جب آدمی اکیلا نماز پڑھے یا سب لوگ حضورِ قلب کے حامل ہوں تو وہ لمبی نماز پڑھا سکتا ہے۔

طویل نماز پڑھانے والے امام کی شکایت

۱۱۳۲: وَعَنْ قَيْسِ بْنِ اَبِیْ حَازِمٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ اَبُوْ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَجُلًا قَالَ وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ لَاَتَاَخَّرُ عَنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ مِنْ اَجْلِ فُلَانٍ مِمَّا يُطِيْلُ بِنَا فَمَا رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِیْ مَوْعِظَةٍ اَشَدَّ غَضَبًا مِنْهُ يَوْمَئِذٍ ثُمَّ قَالَ اِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِيْنَ فَاَيُّكُمْ مَا صَلّٰى بِالنَّاسِ فَلْيَتَجَوَّزْ فَاِنَّ فِيْهِمُ الضَّعِيْفَ وَالْكَبِيْرَ وَذَا الْحَاجَةِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲۰۰/۲حدیث رقم ۷۰۴۔ومسلم فی صحیحه ۳۴۰/۱حدیث رقم (۱۸۲۔۴۶۶) وأبوداؤد فی السنن ۵۰۲/۱حدیث رقم ۷۹۵۔وابن ماجه ۳۱۵/۱حدیث رقم ۹۸۴۔والدارمی

۳۲۲/۱ حدیث رقم ۱۲۵۹۔وأحمد فی المسند ۱۱۸/۴۔

ترجمہ: حضرت قیس بن ابوحازم کہتے ہیں کہ مجھے ابومسعود رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہا اے اللہ کے رسول میں صبح کی نماز سے اس وجہ سے رہ جاتا ہوں کہ فلاں آدمی ہمیں بہت لمبی نماز پڑھاتا ہے۔حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو نصیحت کے دوران اتنے غصہ سے بھرے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔آپ نے فرمایا ان میں سے کچھ لوگ لوگوں کو نفرت دلانے والے ہیں خبردار تم میں سے جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے اسے چاہئے کہ وہ ان کو مختصر نماز پڑھائے کیونکہ مقتدیوں میں کمزور، بوڑھے اور حاجت مند بھی ہوتے ہیں۔(بخاری،مسلم)

راویٔ حدیث:

قیس بن ابی حازم۔۔نام ''قیس'' ہے۔ابوحازم کے بیٹے ہیں۔بنو احمس و بجلیہ میں سے ہیں۔زمانہ جاہلیت واسلام دونوں دیکھے۔جس وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بیعت ہونے کی غرض سے آئے اس وقت آپ ﷺ وفات پا چکے تھے۔کوفہ کے تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ان کا نام صحابہ کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے حالانکہ سب کو اعتراف ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی زیارت نہیں کی۔

خصوصیت:

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے علاوہ باقی عشرۂ مبشرہ سے روایت کی ہے۔ان کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ سے روایت کرتے ہیں۔ان کے سوا اور کوئی راوی ایسا نہیں جس نے عشرۂ مبشرہ میں سے نو (۹) سے روایت کی۔

نہروان کے واقعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کے ہمراہ شریک ہوئے۔بڑی عمر پائی۔سو سال سے زیادہ زندہ رہ۔۹۸ھ میں انتقال فرمایا۔

تشریح: ''من اجل فلان مما يطيل بنا'' پہلا ''من'' تعلیلیہ ہے اور دوسرا اس سے بدل ہے۔

''في موعظةٍ اشدّ'' اگر رؤیت بصریہ ہے تو اشد کا نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے اور اگر رؤیت علمیہ ہے تو یہ نصب مفعولیت کی بنا پر ہے۔

''غضبا منه يومئذٍ'' نبی کریم ﷺ کے اس دن انتہائی غضب ناک ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ جوڑنے کیلئے مبعوث ہوئے جبکہ ان امام کا یہ فعل توڑ کے مترادف تھا۔

راوی کا قول ''في موعظة'' دلالت کررہا ہے کہ آپ ﷺ کا غصہ اپنی ذات کیلئے نہ تھا۔اس حدیث میں اس شخص کیلئے وعید ہے جو لوگوں کو جماعت سے ہٹانے کا ذریعہ بنے۔

''فايكم ما صلى'' ''ما'' کی ترکیب میں دو احتمال ہیں:

① ما زائدہ ہے۔② موصوفہ ہے مفعول مطلق کی بنا پر منصوبۃ المحل ہے۔

''الضعيف'' بیماری کا ضعیف یا ہمت کا، دونوں مراد ہیں۔

''الكبير'' یعنی بڑی عمر والا، یہ تخصیص بعد تعمیم ہے۔

غلط نماز پڑھانے والے کیلئے تنبیہ

۱۱۳۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلُّوْنَ لَكُمْ فَاِنْ اَصَابُوْا فَلَكُمْ وَاِنْ اَخْطَأُوْا فَلَكُمْ وَعَلَيْهِمْ ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۱۸۷ حديث رقم ۶۹۴۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تمہیں امام نماز پڑھائیں گے اگر وہ نماز اچھی طرح پڑھائیں گے تو اس کا فائدہ تمہیں ہوگا اور ان کو بھی اور اگر انہوں نے خطا کی تو تمہیں ثواب ملے گا اور انہیں گناہ ہوگا۔ (بخاری)

تشریح: ''یصلون'' مبتدا محذوف کی خبر ہے، اصل عبارت یہ ہے ''ائمتکم یصلون''۔

''لکم'' یعنی تم جماعت کی نماز کے ثواب کو حاصل کرنے کیلئے ان کی اقتداء کرتے ہو تاکہ تمہیں اور انہیں یہ ثواب حاصل جائے۔ اس میں خطاب کو تغلیب حاصل ہے۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز کی ضمیر ائمہ کیلئے ہیں۔ چونکہ وہ مقتدیوں کی نماز کے ضامن ہوتے ہیں اس اعتبار سے وہ ان کے لئے ہی نماز پڑھتے ہیں۔

''فلکم'' اس میں بھی مراد امام اور مقتدی دونوں ہیں لیکن خطاب کو غلبہ حاصل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ارکان اور شرائط کی انجام دہی کے ساتھ نماز پڑھائیں تو تمہیں اور انہیں دونوں کو اجر ملے گا۔

''فلکم وعلیهم'' یعنی اگر وہ نماز درست نہ پڑھا سکیں تو تمہیں تو ثواب مل ہی جائے گا لیکن وبال ان پر ہوگا۔ یہ اس وقت ہے جب مقتدی کو نماز کے مسئلہ کا علم نہ ہو اگر اسے نماز کے مسئلہ کا علم ہو جائے تو اس پر اعادہ لازم ہے اگر اعادہ نہ کرے تو اس پر بھی وبال ہوگا۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث اس مسئلہ کی دلیل ہے کہ اگر امام نے بے وضو یا جنبی ہونے کی حالت میں نماز پڑھائی تو اس پر نماز کا اعادہ واجب ہوگا لیکن لوگوں کی نماز صحیح ہو جائے گی۔ خواہ امام کو اپنی ناپاکی کا علم ہو اور جان بوجھ کر امامت کروائے یا اپنی ناپاکی کا اس کو علم نہ ہو۔ ہمارے نزدیک اگر مقتدی کو امام کی نماز کے بطلان کا علم ہو جائے تو اس پر اعادہ لازم ہے۔ اس کی دلیل کتاب آلا ثار میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے، انہوں نے ایسے شخص کے بارے میں جو لوگوں کو جنبی ہونے کی حالت میں نماز پڑھائے، فرمایا کہ وہ بھی نماز کا اعادہ کرے اور لوگ بھی۔ مسند عبدالرزاق میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حالت جنابت میں یا بے وضو ہونے کی حالت میں نماز پڑھائی، پھر خود ہی نماز کا اعادہ فرمایا اور لوگوں کو بھی اعادہ کا حکم دیا۔ مسند عبدالرزاق ہی میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حالت جنابت میں نماز پڑھا دی، پھر خود تو اعادہ کیا لیکن لوگوں کو اعادہ کا نہیں کہا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر آپ لوگوں کو بھی اعادہ کا کہیں تو زیادہ بہتر ہے پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کی طرف رجوع کر لیا۔

اس حدیث کے ضمن میں یہ مسئلہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اگر کسی شخص نے لوگوں کو ایک عرصہ تک نماز پڑھائی پھر اپنے کافر ہونے کا دعویٰ کیا یا یہ کہا کہ اس نے بغیر طہارت کے نماز پڑھائی ہے تو لوگوں پر اعادہ واجب نہیں۔ کیونکہ اس کی خبر دیانات میں

قابل قبول نہیں اس لئے کہ وہ اپنے فسق کا اعتراف کر چکا ہے۔ابن الہمام کی شرح الہدایۃ (فتح القدیر) میں یہ مسئلہ اسی طرح ہے۔

''هذا الباب خال عن الفصل الثاني'' صاحب مشکوٰۃ اعتراض سے بچنے کیلئے یہ عبارت لارہے ہیں کہ اس باب کی فصل ثانی چونکہ مصابیح میں نہیں تھی اور اس باب میں احادیث حسان موجود نہیں ہیں اس لئے مشکوٰۃ میں فصل ثانی نہیں آئے گی۔

الفصل الثّالث:

امام کو چاہئے کہ مقتدیوں کی رعایت رکھے

۱۱۳۴: وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِی الْعَاصِ قَالَ اٰخِرُ مَا عَهِدَ اِلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَمَمْتَ قَوْمًا فَاَخِفَّ بِهِمِ الصَّلَاةَ رواه مسلم وفی روایة لَهٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَهٗ اُمَّ قَوْمَكَ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ اَجِدُ فِیْ نَفْسِیْ شَیْئًا قَالَ اُدْنُهْ فَاَجْلَسَنِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ ثُمَّ وَضَعَ كَفَّهٗ فِیْ صَدْرِیْ بَیْنَ ثَدْیَیَّ ثُمَّ قَالَ تَحَوَّلْ فَوَضَعَ فِیْ ظَهْرِیْ بَیْنَ كَتِفَیَّ ثُمَّ قَالَ اُمَّ قَوْمَكَ وَمَنْ اَمَّ قَوْمًا فَلْیُخَفِّفْ فَاِنَّ فِیْهِمُ الْكَبِیْرَ وَاِنَّ فِیْهِمُ الْمَرِیْضَ وَاِنَّ فِیْهِمُ الضَّعِیْفَ وَاِنَّ فِیْهِمْ ذَاالْحَاجَةِ فَاِذَا صَلّٰی اَحَدُكُمْ وَحْدَهٗ فَلْیُصَلِّ كَیْفَ شَاءَ۔

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۳۴۱ حديث رقم (۱۸۶-۴۶۸)

ترجمہ: حضرت عثمان بن ابی العاصؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے آخری وصیت یہ فرمائی تھی کہ جب تم لوگوں کو نماز پڑھاؤ تو انہیں مختصر نماز پڑھاؤ۔(مسلم) مسلم کی دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا کہ اپنی قوم کی امامت کرو تو حضرت عثمان کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ مجھے اپنے دل میں کچھ کھٹک محسوس ہو رہی ہے۔آپ نے فرمایا میرے قریب آؤ جب میں قریب گیا تو آپ نے مجھے اپنے سامنے بٹھایا اور میرے سینے پر میری دونوں چھاتیوں کے درمیان اپنا ہاتھ مبارک رکھا پھر فرمایا کہ پشت پھیرو چنانچہ آپ نے میری پشت پر دونوں کندھوں کے درمیان اپنا ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ اپنی قوم کی امامت کرو اور جب بھی کوئی شخص کسی قوم کا امام بنے تو اسے چاہئے کہ ہلکی نماز پڑھائے کیونکہ ان نمازیوں میں بوڑھے بھی ہیں اور بیمار بھی اور کمزور لوگ بھی اور حاجت مند بھی ہوتے ہیں اور جب کوئی اکیلے نماز پڑھے تو اسے اختیار ہے جیسے چاہے نماز پڑھے۔

تشریح: ''قلت یا رسول اللّٰه! انی أجد فی نفسی شیئاً'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے اس قول کا منشاء یہ تھا کہ میں اپنے دل کے وساوس کی وجہ سے خود کو امامت کی شرائط پوری کرنے سے عاجز سمجھتا ہوں اور قرآن وفقہ میں بھی میری معلومات بہت کم ہیں۔پس نبی کریم ﷺ نے ان کے سینہ اور کمر پر ہاتھ پھیرا جس سے ان کے وساوس دور ہو گئے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے اس قول کا معنی یہ ہے کہ امامت کے وقت میرے دل کے اندر ایک قسم کی برتری اور

غرور کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی کی برکت سے ان کے اس مرض کو دور فرما دیا۔

"قال أدنه" یہ دنو سے امر کا صیغہ ہے۔ یہ نون کے ضمہ کے ساتھ ہائے سکتہ کے ساتھ ہے، یعنی میرے قریب ہو جا۔

"وان فیھم ذا الحاجة" لفظ "ان" کے تکرار میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس علت کی موجودگی ہر شخص میں پائی جاسکتی ہے۔

"فلیصل کیف شاء" ہمارے زمانہ کے ائمہ کا یہ حال ہے کہ جب وہ لوگوں کو نماز پڑھاتے ہیں تو بہت زیادہ طوالت سے کام لیتے ہیں مگر جب تنہا نماز پڑھتے ہیں تو صرف اتنے اختصار پر نماز پڑھتے ہیں جس سے نماز ادا ہو جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا جذبہ موجود ہے۔

سورۃ الصّٰفّٰت کی قراءت

۱۱۳۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَأْمُرُنَا بِالتَّخْفِيْفِ وَيَؤُمُّنَا بِالصَّافَّاتِ.

(رواہ النسائی)

أخرجه النسائي في السنن ۲/۹۵ حديث رقم ۸۲۶۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مختصر نماز پڑھانے کا حکم دیا اور جب آپ ہمیں نماز پڑھاتے تو سورۃ الصافات کی قراءت کرتے۔ (نسائی)

تشریح: "یأمرنا بالتخفیف ویؤمنا بالصافات" ان دونوں باتوں میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے کہ ایک طرف تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں تخفیف کا حکم دے رہے ہیں اور دوسری طرف سورۃ الصافات کی تلاوت فرما رہے ہیں جو کہ ایک لمبی سورت ہے۔

اس سوال کے جواب میں علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ لمبی لمبی سورتیں اور بہت زیادہ آیتیں بہت کم عرصہ میں پڑھ لیتے تھے جس سے لوگوں کو گرانی محسوس نہ ہوتی تھی۔

اس کا ایک جواب یہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان جواز کیلئے ایسا کیا تھا۔ یا پھر آپ مناجاتِ الٰہیہ میں ایسے مستغرق ہوئے کہ خیال ہی نہ رہا۔

لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت سے لذت حاصل کرتے تھے۔ اور اتنی لمبی تلاوت ان کیلئے گراں نہیں تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے لمبا ہونے کے وقت فیض الٰہی کا ظہور ہوتا تھا اور سامع اپنے تمام مشاغل کو بھول جاتا تھا اور کمزور کو روحانی قوت حاصل ہو جاتی تھی۔ اور ہر شخص یہ خواہش کرتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر پڑھتے رہیں اور میں سنتا رہوں۔ مبارک ہو اس شخص کو جس کی آنکھیں دیدارِ نبوی سے ٹھنڈی ہوئی ہوں۔

بَابُ مَا عَلَى الْمَامُوْمِ مِنَ الْمُتَابَعَةِ وَحُكْمِ الْمَسْبُوْقِ

مقتدی کے لئے امام کی متابعت کے لزوم اور مسبوق کے حکم کا بیان

الفصل الاول:

امام کی متابعت

۱۱۳۶: عَنْ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّيْ خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ لَمْ يَحْنِ اَحَدٌ مِنَّا ظَهْرَهٗ حَتّٰى يَضَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَبْهَتَهٗ عَلَى الْاَرْضِ۔

(متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۱۸۱ حديث رقم ۶۹۰۔ ومسلم في صحيحه ۱/۳۴۵ حديث رقم (۱۹۷۔۴۷۴) وأبو داوٗد في السنن ۱/۴۱۲ حديث رقم ۶۲۲۔ والترمذي ۲/۷۰ حديث رقم ۲۸۱۔

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے چنانچہ رسول اللہ ﷺ جب سمع الله لمن حمده کہتے تو جب تک آپ سجدہ کے لئے اپنی پیشانی کو زمین پر نہیں رکھتے تھے ہم میں سے کوئی شخص اپنی پیٹھ کو نہیں جھکاتا تھا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''حتی یضع النبی ﷺ جبهته علی الارض'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مقتدی کیلئے سنت یہ ہے کہ وہ اپنی نماز کے ارکان امام کی نماز کے ارکان کے اسی قدر بعد ادا کرے اور اگر امام کے افعال صلوٰۃ اور مقتدی کے افعال صلوٰۃ میں اتنا وقفہ نہ ہو تو بھی جائز ہے مگر تکبیر تحریمہ کے وقت مقتدی کیلئے اتنا توقف کرنا ضروری ہے کہ جب امام تکبیر تحریمہ کہہ کر فارغ ہو تو مقتدی تکبیر تحریمہ کہیں۔

ہمارا (احناف کا) مسلک یہ ہے کہ مقتدی کیلئے امام کی متابعت بطریق مواصلت واجب ہے یعنی مقتدیوں کو ہر رکن امام کے ساتھ ہی بلا تاخیر ادا کرنا چاہیے۔ تحریمہ بھی امام کی تحریمہ کے ساتھ کریں۔ حتی کہ اگر امام نے رکوع یا سجدہ سے اپنا سر اٹھایا لیکن مقتدی اپنی تسبیح سے فارغ نہیں ہوا تھا تو صحیح قول یہ ہے کہ وہ امام کی موافقت کرے اور اگر مقتدی نے امام کے رکوع یا سجدہ سے پہلے سر اٹھالیا تو اس کیلئے ضروری ہے کہ دوبارہ اپنے عمل میں لوٹ جائے۔ پھر امام کے ساتھ سر اٹھائے اس طرح یہ رکوع یا سجدے دو نہیں ہوں گے بلکہ ایک ہی شمار ہوں گے۔

مقتدیوں کو خاص ہدایت

۱۱۳۷: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهٗ اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ اِمَامُكُمْ فَلَا تَسْبِقُوْنِيْ بِالرُّكُوْعِ وَلَا بِالسُّجُوْدِ وَلَا بِالْقِيَامِ وَلَا

بِالْانْصِرَافِ فَاِنِّی اَرَاکُمْ مِنْ اَمَامِیْ وَمِنْ خَلْفِی۔ (رواہ مسلم)

صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب تحریم سبق الامام برکوع او سجود ونحوھما، ح ٦٤٦

اور سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا چکے تو اپنا چہرۂ انور ہماری طرف کر کے متوجہ ہوئے اور فرمایا ''لوگو! میں تمہارا امام ہوں لہٰذا تم رکوع کرنے، سجدہ کرنے، کھڑا ہونے اور پھرنے میں مجھ سے سبقت نہ لے جایا کرو (یعنی نماز کے ارکان کو امام سے پہلے ادا نہ کیا کرو) اور کوئی حرکت تمہاری مجھ سے پوشیدہ نہیں''۔ (مسلم)

''ولا بالانصراف'' انصراف سے مراد سلام پھیرنا ہے۔

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ ارکان فعلیہ میں امام کی متابعت واجب ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انصراف سے مراد سلام پھیرنا بھی ہو سکتا ہے اور مسجد سے نکلنا بھی۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ دوسرا احتمال قطعی طور پر درست نہیں کیونکہ سیاق وسباق اس کی بالکل تائید نہیں کرتے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل مسجد سے نکلنے پر کوئی نہی بھی وارد نہیں ہوئی۔

''فانی أراکم من أمامی ومن خلفی'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا یا تو مکاشفہ کی وجہ سے تھا یا معجزاتی مشاہدہ کی وجہ سے۔

''رواہ مسلم'' امام میرک فرماتے ہیں کہ مشکوۃ میں ذکر کردہ الفاظ حدیث مسلم کے ہیں، مصابیح میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ وارد نہیں ہوئی۔

مقتدیوں کو آمین کہنے کا حکم

١١٣٨: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تُبَادِرُوا الْاِمَامَ اِذَا کَبَّرَ فَکَبِّرُوْا وَاِذَا قَالَ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فَقُوْلُوْا اٰمِیْنَ وَاِذَا رَکَعَ فَارْکَعُوْا وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ متفق علیه اِلَّا اَنَّ البخاری لَمْ یَذْکُرْ وَاِذَا قَالَ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔

أخرجه مسلم فی صحیحه ٣١٠/١ حدیث رقم (٨٧-٤١٥)۔والنسائی ٩٦/٢ حدیث رقم ٨٣٠۔وابن ماجه ٣٠٨/١ حدیث رقم ٩٦٠۔وأحمد فی المسند ٤٤٠/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے امام پر سبقت نہ کیا کرو جب امام تکبیر کہے تم بھی تکبیر کہو۔ اور جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو اور جب امام رکوع میں جائے تو تم بھی رکوع میں جاؤ۔ جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربنا لک الحمد کہو۔ (بخاری، مسلم) امام بخاری نے اپنی روایت میں واذا قال ولا الضالین کے الفاظ نقل کیے ہیں۔

تشریح: ''واذا قال ولا الضالین فقولوا آمین'' اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب امام قراءت کر رہا ہے تو مقتدی خاموش رہے، یہی مضمون ایک حدیث میں بھی آیا ہے۔

''واذا اقرأ فانصتوا'' ''جب امام پڑھے تو تم خاموش رہو''۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب امام ولا الضالین کہنے کا ارادہ کرے تو تم آمین کہو، کیونکہ سنت یہ ہے کہ مقتدی اور امام کی آمین ایک ساتھ ہو۔

میں یہ سمجھتا ہوں کی یہ معنی مطلوب کے خلاف ہے کیونکہ اس صورت میں مقتدی کی آمین امام کے ولا الضالین کے ساتھ ہوجائے گی۔ پس مقتدی کی آمین امام کی آمین سے مقدم ہوجائے گی اور ائمہ اربعہ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔

''واذا رکع فارکعوا'' اس میں فاء تعقیبیہ ہے اور اس سے ہمارے ذکر کردہ مذہب کی تائید ہوتی ہے۔

اگر امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

۱۱۳۹: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَکِبَ فَرَسًا فَصُرِعَ عَنْهُ فَجُحِشَ شِقُّهُ الْاَیْمَنُ فَصَلّٰی صَلَاۃً مِنَ الصَّلَوَاتِ وَهُوَ قَاعِدٌ فَصَلَّیْنَا وَرَاءَهٗ قُعُوْدًا فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِیُؤْتَمَّ بِهٖ فَاِذَا صَلّٰی قَائِمًا فَصَلُّوْا قِیَامًا وَاِذَا رَکَعَ فَارْکَعُوْا وَاِذَا رَفَعَ فَارْفَعُوْا وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَهٗ فَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ وَاِذَا صَلّٰی جَالِسًا فَصَلُّوْا جُلُوْسًا اَجْمَعُوْنَ قَالَ الْحُمَیْدِیُّ قَوْلُهٗ اِذَا صَلّٰی جُلُوْسًا فَصَلُّوا جُلُوْسًا هُوَ فِیْ مَرَضِهِ الْقَدِیْمِ ثُمَّ صَلّٰی بَعْدَ ذٰلِكَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا وَالنَّاسُ خَلْفَهٗ قِیَامٌ لَمْ یَأْمُرْهُمْ بِالْقُعُوْدِ وَاِنَّمَا یُؤْخَذُ بِالْاٰخِرِ فَالْاٰخِرِ مِنْ فِعْلِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِیِّ وَاتَّفَقَ مُسْلِمٌ اِلٰی اَجْمَعُوْنَ وَزَادَ فِیْ رِوَایَةٍ فَلَا تَخْتَلِفُوا عَلَیْهِ وَاِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا .

أخرجه البخاري في صحيحه ١٧٣/٢ حديث رقم ٦٨٩۔ ومسلم ٣٠٨/١ حديث رقم (٧٧۔ ٤١١)۔ وأبوداؤد في السنن ٤٠١/١ حديث رقم ٦٠١۔ والترمذي ١٩٤/٢۔ حديث رقم ٣٦١ والنسائي ٩٨/٢ حديث رقم ٨٣٢ وابن ماجه ٣٩٢/١ حديث رقم ١٢٣٧ ومالك في الموطأ ١٣٥/١ حديث رقم ١٦ من كتاب صلاة الجماعة۔ وأحمد في المسند ١١٠/٣۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں گھوڑے پر سوار تھے اچانک آپ گھوڑے سے نیچے گر گئے۔ اس سے دائیں کروٹ پر چوٹ لگ گئی اور آپ کے لئے کھڑے ہو کر نماز پڑھانا مشکل ہوگیا آپ نے ہمیں پانچ نمازوں میں سے ایک نماز بیٹھ کر پڑھائی۔ اور ہم نے بھی بیٹھ کر نماز پڑھی جب آپ نماز سے فارغ ہوگئے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ امام اس لئے مقرر کیا گیا ہے تاکہ اس کی اقتداء کی جائے لہٰذا جب امام کھڑا ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور جب امام رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو اور جب امام رکوع سے اٹھے تو تم بھی رکوع سے اٹھو اور جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربنا لک الحمد کہو اور جب امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔ حمیدی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو یہ حکم اس بیماری میں دیا گیا تھا جو سابقہ تھی بعد میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوگئے اور بیٹھ کر نماز پڑھائی لوگوں نے آپ کے پیچھے

کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور آپ نے ان کو بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال میں سے آخری امر اور فعل کو اختیار کیا جاتا ہے۔ (بخاری) امام مسلم نے اجمعون کے الفاظ تک اتفاق کیا ہے اور ایک روایت میں ان الفاظ کو زیادہ کیا ہے کہ اختلاف نہ کرو جب امام سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو۔

تشریح: ''فصلی صلاۃ من الصلوات'' اس سے مراد فرض نماز ہے جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ظاہر عبارت بھی یہی ہے۔

''قال انما جعل الامام لیؤتم به'' مصابیح میں ان الفاظ کا اضافہ ہے:

''فلا تختلفوا علیه'' ''تم امام سے اختلاف نہ کرو''۔

یعنی امام سے تقدیم وتاخیر میں اختلاف نہ کرو تا کہ اس اقتداء کے قطع ہونے کا وہم نہ ہو۔

''فصلوا قیامًا'' ''قیامًا'' کی لغوی حقیقت میں دو قول ہیں:

① مصدر یعنی ذوی قیام۔

② جمع یعنی قائمین۔ اس کا نصب حالیت کی بنا پر ہے۔

''فصلوا جلوسًا'' ابن ملک فرماتے ہیں کہ یہ جالس کی جمع ہے اور حالیت کی بنا پر منصوب ہے۔

''أجمعون'' ''فصلوا'' کی ضمیر مرفوع کی تاکید ہے۔

ابن ہشام رحمہ اللہ نے آخری جملہ کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ جب امام تشہد کیلئے بیٹھے تو تم بھی بیٹھ کر تشہد پڑھو۔ لیکن حدیث کے ظاہر الفاظ سے یہ معنی درست معلوم نہیں ہوتا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب امام کسی عذر کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔ اس صورت میں اس حدیث کو ان روایات کی وجہ سے منسوخ مانا جائے گا جن میں یہ ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں بیٹھ کر نماز پڑھائی تھی اور صحابہ کرام پیچھے کھڑے تھے۔

امام احمد، اسحاق بن راہویہ اور امام اوزاعی اس حدیث کے حکم کو منسوخ نہیں بلکہ ثابت مانتے ہیں۔

''قال الحمیدی'' یہ حمیدی امام بخاری کے استاذ ہیں، وہ حمیدی نہیں جو جمع بین الصحیحین کے مؤلف ہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ کے نزدیک اگر امام کسی عذر کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھے تو مقتدی بھی بیٹھ کر ہی نماز پڑھیں گے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی اقتداء جائز نہیں۔ امام مالک کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے:

''لا یؤم احد بعدی جالسًا''

''میرے بعد کوئی بیٹھا ہوا شخص امامت نہ کروائے''۔

یہ حدیث مرسل ہے اور تنزیہ پر محمول ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ یہ بات جان لیجئے کہ امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے والے نے اگر کھڑے

ہوکر نماز شروع کی تھی پھر بیٹھ گیا تو لوگوں کا اس کی اقتداء کرنا درست ہے لیکن اس نے ابتداء ہی بیٹھ کر نماز پڑھنے سے کی تو پھر اقتداء درست نہیں، اور یہ بات تو طے شدہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی جگہ تک کھڑے ہوکر آئے پھر بیٹھ گئے۔ علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اگر کوئی مریض تھوڑی دیر حتی کہ تکبیر تحریمہ کے دوران کے قیام پر قادر ہو تو اتنی مقدار کھڑے رہنا اس پر فرض ہوگا اور یہ صورت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں متحقق ہے۔ تو اس صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء ایک ایسے امام کی اقتداء ہوگی جس نے کھڑے ہوکر نماز شروع کی پھر بیٹھ گیا۔

نماز کے دوران امام کے تغیر کا حکم

۱۱۴۰: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا ثَقُلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَ بِلَالٌ يُؤْذِنُهُ بِالصَّلَاةِ فَقَالَ مُرُوْا اَبَا بَكْرٍ اَنْ يُصَلِّيَ بِالنَّاسِ فَصَلّٰى اَبُوْ بَكْرٍ تِلْكَ الْاَيَّامَ ثُمَّ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَدَ فِيْ نَفْسِهٖ خِفَّةً فَقَامَ يُهَادٰى بَيْنَ رَجُلَيْنِ وَرِجْلَاهُ تَخُطَّانِ فِي الْاَرْضِ حَتّٰى دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَلَمَّا سَمِعَ اَبُوْبَكْرٍ حِسَّهٗ ذَهَبَ يَتَاَخَّرُ فَاَوْمَأَ اِلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ لَا يَتَاَخَّرَ فَجَاءَ حَتّٰى جَلَسَ عَنْ يَسَارِ اَبِيْ بَكْرٍ فَكَانَ اَبُوْبَكْرٍ يُصَلِّيْ قَائِمًا وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ قَاعِدًا يَقْتَدِيْ اَبُوْبَكْرٍ بِصَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالنَّاسُ يَقْتَدُوْنَ بِصَلَاةِ اَبِيْ بَكْرٍ متفق عليه وفي رواية لَهُمَا يُسْمِعُ اَبُوْبُكْرٍ النَّاسَ التَّكْبِيْرَ۔

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۶۷/۲ حديث رقم ۶۸۴۔ ومسلم في صحيحه ۳۱۳/۱ حديث رقم (۹۵۔۴۱۸) والنسائي ۹۹/۲ حديث رقم ۸۳۳۔ وابن ماجه ۳۸۹/۱ حديث رقم ۱۲۳۲۔ والدارمي ۳۵۳/۱ حديث رقم ۱۳۳۶۔ وأحمد في المسند ۱۵۹/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت بیمار تھے ایک روز حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ کو نماز کی اطلاع دینے کے لئے آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابوبکر سے کہو وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں ان دنوں میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی پھر جب آپ نے اپنی طبیعت کو کچھ ہلکا محسوس کیا تو دو آدمیوں کا سہارا لے کر اس طرح چلے کہ آپ نے اپنے ہاتھ صحابہ کے کندھوں پر رکھے تھے اور آپ کے پاؤں زمین پر گھسٹتے جا رہے تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کی آہٹ محسوس کی اور پیچھے ہٹنا شروع ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو اشارہ کیا کہ پیچھے مت ہٹو۔ آپ آگے بڑھ کر ابوبکر کی بائیں طرف بیٹھ گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوکر نماز پڑھا رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر نماز پڑھتے رہے جب کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی اقتداء کر رہے تھے اور لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کر رہے تھے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''لما ثقل'' بفتح العشاء وضم القاف۔ جب مرض زیادہ ہوگیا اور ضعف حد سے بڑھ گیا۔

''مروا ابابكر ان يصلي بالناس'' شرح السنہ میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام لوگوں میں سے افضل ہیں اور خلافت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا تھا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دین کیلئے پسند فرمایا تھا تو کیا ہم انہیں اپنی دنیا کے لئے پسند نہ کریں۔

یہ بات بھی مدنظر رہے کہ متعدد نمازوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت کی بناء پر معاملہ اور زیادہ واضح ہو گیا کہ یہ امر محض اتفاقی نہیں تھا بلکہ ارادۃً ایسا ہوا تھا۔ اس طرح قولی، فعلی، امری اور تقدیری تمام دلیلیں جمع ہو گئیں۔

''**فصلی ابو بکر تلك الایام**'' علامہ دمیاطی نے نقل کیا ہے کہ یہ کل سترہ نمازیں تھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض کی شدت کے دنوں میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پڑھائیں۔

''**بین رجلین**'' یہ دو حضرات کون تھے؟ اس بارے میں تین قول ہیں:

① حضرت عباس و حضرت علی۔

② حضرت عباس و حضرت اسامہ۔

③ حضرت عباس و حضرت فضل۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین

''**فاوما**'' عفیف الدین کے نسخہ میں ''**فاو ما**'' الف مبدلۃ عن العیاء کے ساتھ ہے جو کہ درست نہیں کیونکہ قاموس میں ہمزہ کے ساتھ آیا ہے۔

''**الیہ رسول اللہ ﷺ ان لا یتاخر**'' اس روایت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نماز شروع کروا دینے کی تصریح نہیں ہے۔ لیکن شافعیہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ دوسرے امام کی اقتداء کی نیت کی تجدید کے بغیر دو اماموں کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اس طرح کہ پہلے ایک امام کی اقتداء کرے پھر اسے چھوڑ کر دوسرے کی اقتداء شروع کر دے۔

علامہ عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نائب کے امامت شروع کروا دینے کے بعد اصل امام آجائے تو نائب امام کا مقتدی بن جانا جائز ہے اور اس سے دوسرے مقتدیوں کی نماز بھی باطل نہ ہو۔

ابن عبدالبر نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔ پھر اس پر اجماع کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ لیکن شافعیہ کے اختلاف کی وجہ سے اجماع کا قول تو باطل ہو جاتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ انہوں نے شافعیہ کے اختلاف کو اہمیت کے قابل نہ سمجھا ہو۔

علامہ سیوطی نے بھی اس استخلاف کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت قرار دیا ہے۔

''**فجاء حتی جلس عن یسار**'' اس جملہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے امامت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کر دی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی امام تھے۔ حضرت ابوبکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کر رہے تھے۔ یہی بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول سے معلوم ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قراءت وہیں سے شروع کی جہاں تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پہنچے تھے، بعد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی خاموش رہے کیونکہ یہ ایک جہری نماز تھی۔

اس سے بھی ثابت ہوا کہ امام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے کیونکہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جہری نماز میں مقتدی امام کے

ساتھ نہیں پڑھے گا۔

یہ حدیث اس بات پر بھی دلالت کررہی ہے کہ سورۃ الفاتحہ کا پڑھنا رکن نہیں ہے۔

''یقتدی ابو بکر بصلاۃ رسول اللّٰہ ﷺ'' ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ اس شخص پر صریح رد ہے جس کا کہنا یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء کررہے تھے۔

''والناس یقتدون بصلاۃ أبی بکر'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑے تھے جو عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کرتے تھے اور لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر نماز ادا کررہے تھے۔

''ابو بکر الناس التکبیر'' بعض نسخوں کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر محض مکبّر تھے امام نہیں تھے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ اور عیدین وغیرہ میں مؤذنین کا آواز بلند کرنا جائز ہے۔

''ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں'' ہمارے زمانے میں ابلاغ کیلئے آواز کو اونچا کرنے کے سلسلہ میں بہت سی کوتاہیاں پائی جاتی ہیں۔ مکبّرین آواز زیادہ لوگوں تک پہنچانے کیلئے اللہ اکبر یا اکبر کے ہمزہ کو بہت لمبا کردیتے ہیں۔ اور یہ عمل مفسد نماز ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ضرورت سے زیادہ آوازیں بلند کی جاتی ہیں اور چیخ و پکار اور شور شغب کی سی کیفیت بن جاتی اور اس سے مقصود صرف نغمات صناعیہ کا اظہار ہوتا ہے عبادت کا قیام تو بالکل دب کر رہ جاتا ہے۔ اس بات کی تفصیل آگے بھی آجائے گی۔ کہ جب جنت دوزخ کے تذکرے سے کوئی مضطرب ہو کر آواز بلند کرے تو نماز نہیں ٹوٹتی لیکن جب کسی مصیبت کی وجہ سے آواز بلند کرے گا تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ چونکہ اس میں اصل مقصود لوگوں کو متوجہ کرنا ہوتا ہے تو جو شخص اپنی آواز یا بلند و بالا تکبیرات سے لوگوں کو متوجہ کرنا چاہے تو اس کی کیا نماز رہے گی۔ اسی طرح دعاؤں کے اندر بھی طرز و انداز اپنانے کی اور مخصوص لب و لہجے میں دعائیں مانگنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ تو محض ایک کھیل تماشہ ہے کیا کسی بادشاہ سے مانگنے کیلئے یہی انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ حاجت کے قیام میں تضرع ہوتا ہے تغنی نہیں۔ مکبّرین جب تکبیرات کو لمبا کرتے ہیں تو اس سے ایک اور بڑی عجیب صورتحال سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ائمہ ان کی تکبیرات کے ختم ہونے کا انتظار کرتے رہتے اس طرح امام تابع اور مکبّر متبوع بن جاتا ہے۔

(فقہ حنفی کی روشنی میں) صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والا بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی اقتداء کرسکتا ہے لیکن امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا اس میں اختلاف ہے۔ بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کا کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کی اقتداء بالاتفاق جائز ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تندرست کیلئے کسی ایسے مریض کی اقتداء جائز نہیں جو بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو۔ اگرچہ وہ رکوع سجدہ بھی کرے۔ صحابہ کرامؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔

شافعیہ کا مسلک امام، مقتدی بن سکتا ہے، اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتا کیونکہ یہ بات طے شدہ نہیں ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے امامیت سے ماموميت کی طرف انتقال کی نیت فرمائی تھی، احتمال کے ساتھ استدلال درست نہیں ہوسکتا۔

امام سے سبقت کرنے والے کے لئے وعید

۱۱۴۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا يَخْشَى الَّذِیْ يَرْفَعُ رَأْسَهٗ

قَبْلَ الْإِمَامِ اَنْ یُّحَوِّلَ اللّٰهُ رَأْسَهٗ رَأْسَ حِمَارٍ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۱۸۲ حدیث رقم ۶۹۱۔ ومسلم فی صحیحه ۱/۳۲۰ حدیث رقم (۱۱۴۔۴۲۷) وأبوداؤد فی السنن ۱/۴۱۳ حدیث رقم ۶۲۳۔ والترمذی ۲/۴۷۵ حدیث رقم ۵۸۲۔ والنسائی ۲/۹۶ حدیث رقم ۸۲۸۔ وابن ماجه ۱/۳۰۸ حدیث رقم ۹۶۱۔ والدارمی ۱/۳۴۵ حدیث رقم ۱۳۱۶۔ وأحمد فی المسند ۲/۵۰۴۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص امام سے پہلے رکوع اور سجدہ سے سر اٹھاتا ہے کیا وہ اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو تبدیل کر کے گدھے کے سر جیسا بنا دے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''اما یخشی'' ہمزہ استفہامیہ اور ما نافیہ ہے۔

''رأسه رأس حمار'' یعنی اللہ تعالیٰ اسے حیوانات میں سب سے بے وقوف جانور گدھے کی طرح بے وقوف بنا دیں۔ یہ معنوی اور مجازی مسخ ہے۔ اس کو حقیقت پر محمول کرنا بھی جائز ہے، کیونکہ باب اشراط الساعۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت میں مسخ ممکن ہے۔ اور بعض روایتوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ جس میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی صورت گدھے کی صورت جیسی بنا دیں گے۔

علامہ اشرف رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مجازی معنی پر محمول کیا ہے۔ مسخ اس امت میں ممکن نہیں ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے اس امت میں مسخ کو ممکن قرار دیا ہے، ابن حجر کا بھی یہی مسلک ہے۔ البتہ ان کے خیال میں مسخ عام ناممکن اور مسخ خاص ممکن ہے۔ جیسا کہ صریح احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

مسخ کے امکان والے قول کی تائید ایک محدث کے واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ طلب حدیث کیلئے وہ دمشق کے ایک مشہور محدث کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن ان محدث نے اپنا چہرہ پردہ میں چھپایا ہوا تھا۔

جب یہ کافی عرصہ وہاں رہے اور حدیث کی طلب میں اپنی حرص دکھائی تو انہوں نے پردہ ہٹا دیا، ان کا چہرہ گدھے کے چہرہ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پس انہوں نے اپنے شاگرد سے کہا اے میرے بیٹے امام سے آگے بڑھنے سے ڈرو، جب میں نے یہ حدیث سنی تو اس چیز کو ناممکن خیال کیا اور امام سے پہلے سر اٹھا لیا پس میرا چہرہ ویسا ہو گیا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔

(ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ) میرے خیال میں ان کے مسخ کی وجہ مسخ کو ناممکن سمجھنا ہے۔ ورگرنہ لوگ تو اپنے امام کی مخالفت کرتے ہی رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت سخت وعید ہے اس کی حقیقت برزخ یا جہنم میں ظاہر ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے مسخ عدم خشیت کے ساتھ متعلق ہو۔

الفصل الثانی:

جو آدمی نماز کے لئے آئے اور آتے ہی جماعت میں شریک ہو جائے

۱۱۴۲: وَعَنْ عَلِيٍّ وَمُعَاذِ ابْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اَتٰى اَحَدُكُمُ الصَّلَاةَ وَالْاِمَامُ عَلٰى حَالٍ فَلْيَصْنَعْ كَمَا يَصْنَعُ الْاِمَامُ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/۴۸۵ حديث رقم ۵۹۱۔

ترجمہ: حضرت علیؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی نماز پڑھنے کے لئے آئے تو امام جس حالت میں ہو اور جو کچھ کر رہا ہو یہی کچھ یہ مقتدی کرے۔ (ترمذی) اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: ''اذا أتی احدکم الصلاۃ'' ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یعنی جب نماز کی نیت کرے اور تکبیر تحریمہ کہے۔

''فلیصنع کما یصنع الامام'' ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ امام جس حال میں بھی ہو اس کی موافقت کرنی چاہیے۔ اگر وہ رکوع میں ہو تو اسے بھی رکوع میں چلے جانا چاہیے اگر سجدہ میں ہو تو اسے بھی سجدہ میں چلے جانا چاہیے عام لوگوں کے عمل کی طرح امام کے قیام میں واپس آنے کا انتظار نہ کرے۔

''رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب'' امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے تاہم عطاء کا اس حدیث پر عمل ہے اور علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کی اسناد ضعیف ہیں لیکن جس حدیث پر عطاء کا عمل ہوتا تھا اسے امام ترمذی صحیح قرار دیتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ حدیث کی صحت علماء کے عمل سے ثابت ہو جائے جیسا کہ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچی کہ جو شخص لا الہ الا اللہ ستر ہزار مرتبہ پڑھے تو اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح جس شخص کیلئے پڑھا جائے اس کی بھی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ میں اس کلمہ کو روایت کردہ عدد کے مطابق خاص طور پر کسی کی نیت کئے بغیر پڑھا کرتا تھا، اتفاق سے ایک دن میں ایک جگہ دعوت میں گیا، میرے کچھ ساتھی بھی ساتھ تھے، ان میں ایک نوجوان بھی تھا جو کشف کے بارے میں بہت مشہور تھا۔ کھانے کے دوران اچانک وہ رونے لگا۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر اس سے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں کشف کے ذریعہ دیکھ رہا ہوں کی میری ماں عذاب میں مبتلا ہے، یہ سنتے ہی میں نے کلمہ مذکورہ کا ثواب دل ہی دل میں اس کی ماں کیلئے بخش دیا اب وہ ہنسنے لگا اور کہا کہ اب میں اپنی ماں کو جنت میں دیکھ رہا ہوں۔

اس واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس شخص کے کشف کے صحیح ہونے سے میں نے اس حدیث کو صحیح جانا اور اس حدیث کے صحیح ہونے سے اس شخص کے کشف کو صحیح مانا۔

سجدہ میں شرکت سے رکعت نہیں ہوتی

۱۱۴۳: وَعَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جِئْتُمْ اِلَى الصَّلَاةِ وَنَحْنُ

سُجُوْدٌ فَاسْجُدُوْا وَلَا تَعُدُّوْهُ شَيْئًا وَمَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلَاةَ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/ ۵۵۳ حديث رقم ۸۹۳۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم نماز کے لئے آؤ اور ہم لوگ سجدے کی حالت میں ہوں تو تم بھی سجدہ میں چلے جاؤ اور اس سجدہ کو کسی حساب میں شمار نہ کرو جس شخص نے امام کے ساتھ رکوع کو پالیا تو اس نے پوری رکعت کو پالیا۔ (ابوداؤد)

تشریح: ''ونحن سجود'' سجود، ساجد کی جمع ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے السجود کو معنی مصدری پر محمول کیا ہے۔

''فقد ادراك الصلاة'' اس کے معنی میں مختلف قول ہیں:

① اس نے رکعت کو پالیا۔

② جماعت کی نماز کے ثواب کو پالیا۔

③ ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد جمعہ کی نماز ہے۔ وگرنہ دوسری نمازوں میں نماز کا ایک جز پالینے سے بھی جماعت کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ جماعت کی نماز کا ثواب پوری ایک رکعت کے بغیر حاصل نہیں ہوگا۔ خواہ جمعہ کی نماز ہو یا کوئی دوسری نماز۔

''رواه أبو داؤد'' میرک فرماتے ہیں، اس کی اسناد میں یحیٰی بن ابی سلیمان المدنی میں اور وہ ضعیف ہیں۔ امام بخاری نے اسے منکر الحدیث اور ابوحاتم نے اسے مضطرب کہا ہے۔ امام حاکم نے بھی اسے روایت کیا ہے اور حدیث کو صحیح اور یحیٰی کو ثقہ قرار دیا ہے۔

محدث فقہاء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ رکوع کے پالینے سے رکعت حاصل نہیں ہوتی کیونکہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جسے رکوع ملا وہ رکوع کرلے اور رکعت کو لوٹائے۔ لیکن یہ قول اجماع امت کے خلاف ہے اور اس حدیث کو جمہور علماء نے صحیح قرار نہیں دیا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تمام علماء کا اس قول کی تردید پر اتفاق ہے لہٰذا اسے خاطر میں نہ لایا جائے گا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام میں رکوع پالینے کی صورت میں رکعت پالینے کے قائل وہ حضرات تھے جو قراءت خلف الامام کے قائل نہ تھے، جو حضرات قراءت خلف الامام کے قائل تھے وہ رکوع پالینے سے رکعت کے پالینے کے قائل نہ تھے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا اس قول کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس سلسلہ میں دو قول ملتے ہیں ان کے ایک قول کی بنیاد پر بعد کے علماء کا اسی پر اجماع ہوا کہ اگر رکوع مل جائے تو رکعت مل جائے گی۔

مسلسل چالیس روز تک تکبیر اولیٰ میں شامل ہونے کا ثواب

۱۱۴۴: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى لِلّٰهِ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا فِيْ جَمَاعَةٍ

يُدْرِكُ التَّكْبِيْرَةَ الْاُوْلٰى كُتِبَ لَهٗ بَرَاءَ تَانِ بَرَاءَةٌ مِّنَ النَّارِ وَبَرَاءَةٌ مِّنَ النِّفَاقِ۔ (رواہ الترمذی)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی چالیس روز تک اللہ کی رضا کے لئے جماعت کے ساتھ اس طرح نماز پڑھے کہ وہ تکبیر اولیٰ کو پالے اس کے لئے دو قسم کی نجات لکھ دی جاتی ہے ایک جہنم کی آگ سے دوم نفاق سے۔ (ترمذی)

تشریح: ''التکبیرۃ الاولی'' ظاہر طور پر امام کے ساتھ کہی جانے والی تکبیر تحریمہ مراد ہے لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ رکوع میں ملتے وقت مقتدی کی تکبیر تحریمہ مراد ہے۔ پس اس سے مراد جماعت کے ساتھ پوری نماز کو پڑھنا ہے اور نماز پہلی رکعت کے پالینے سے پوری ہو جائے گی۔

''براء ۃ من النفاق'' نفاق سے بری ہونے کا مطلب یہ ہے دنیا میں اسے منافقین کے عمل سے نجات ملے گی اور اخلاق والا عمل نصیب ہوگا اور آخرت میں اسے منافقین کو ہونے والے عذاب سے محفوظ رکھیں گے اور اس کے بارے میں یہ اعلان ہوگا کہ یہ منافق نہیں ہے۔

چالیس دن کی تعین میں سالکین کیلئے ایک راز پوشیدہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سید المرسلین کی سنت میں بیان کیا گیا ہے ایک حدیث میں آتا ہے جو شخص چالیس دن تک اللہ کیلئے اخلاص کے ساتھ عمل کرے گا تو اس کے دل سے حکمت کے چشمے اس کی زبان پر جاری ہوں گے، گویا کہ اس مقدار کو کسی بھی عمل کے اندر کمال حاصل کرنے میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

''رواہ الترمذی'' یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی نقل کی گئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایسی روایات موقوف بھی ہوں تو مرفوع کے درجہ میں ہوتی ہیں۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے سند منقطع سے نقل کیا اس کے باوجود فضائل اعمال میں ایسی روایات پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

یہی مضمون ایک اور روایت میں بھی وارد ہوا ہے کہ ہر چیز کا ایک کمال ہوتا ہے اور نماز کا کمال تکبیر اولیٰ ہے پس تم اس کی حفاظت کرو۔

انہی روایات کی بنا پر تکبیر اولیٰ کو سنت قرار دیا گیا ہے، اسلاف کا معمول یہ تھا کہ جب ان کی تکبیر اولیٰ فوت ہو جاتی ہو تو تین دن تک افسوس کرتے اور جب جماعت کی نماز فوت ہو جاتی تو سات دن تک افسوس کرتے۔ گویا کہ ان سے کبھی جمعہ فوت نہیں ہوا وگرنہ ستر دن تک اس کا افسوس کرتے۔

جماعت میں شرکت کے ارادہ سے نکلنے والے کو اجر مل جاتا ہے

۱۱۴۵: وَعَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ وُضُوْءَهٗ ثُمَّ رَاحَ فَوَجَدَ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا اَعْطَاهُ اللّٰهُ مِثْلَ اَجْرِ مَنْ صَلَّاهَا وَحَضَرَهَا لَايَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْئًا۔

(رواہ ابو داود والنسائی)

أخرجه أبوداوٗد فى السنن ۳۸۱/۱ حديث رقم ۵۶۴ والنسائى ۱۱۱/۲ حديث رقم ۸۵۵۔ وأحمد فى المسند

۲/ ۳۸۰۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی انسان نے وضو کیا اور اچھی طرح وضو کیا اور پھر مسجد میں گیا وہاں دیکھا کہ لوگ نماز پڑھ چکے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے جماعت میں حاضر ہونے والے کے ثواب کی طرح ثواب دے گا۔ اس سے دوسروں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: ''ثم راح'' یعنی اچھی طرح وضو کر کے کسی بھی وقت مسجد کی طرف گیا۔ نبی کریم ؐ نے لفظ غدا کے بجائے لفظ راح استعمال کر کے ایک خاص نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

''فوجد الناس قد صلوا'' اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ اصل لوگ تو نمازی ہی ہیں باقی سب تو نسناس ہیں۔

''وحضرها'' بعض نسخوں میں مخضرھا ہے جو کہ درست نہیں۔

''لا ینقص ذلك من اجورهم شیئًا'' علامہ مظہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ثواب تب ملے گا جب یہ تاخیر کسی سستی یا کوتاہی کی وجہ سے نہ ہوئی ہو۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ یہ ثواب ملنے کی دو وجہیں ہیں:

(۱) مومن کی نیت اس کے عمل سے بڑھ کر ہے۔ (۲) جماعت کے فوت ہونے پر اس کو جو افسوس ہوا اس پر ثواب ملے گا۔

تحقیق شدہ قول یہ ہے کہ اصل ثواب نیت پر ملے گا اور افسوس پر الگ ثواب ہوگا۔

جماعت پالینے کا اجر

۱۱۴۶: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیِّ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ وَقَدْ صَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلَا رَجُلٌ یَتَصَدَّقُ عَلٰی ھٰذَا فَیُصَلِّیْ مَعَہٗ فَقَامَ رَجُلٌ فَصَلّٰی مَعَہٗ۔ (رواہ الترمذی وابو داود)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/ ۷ حدیث رقم ۲۲۱۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی آیا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ چکے تھے۔ آپ نے فرمایا کیا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اللہ کی راہ میں اس کو صدقہ دے دے اور اس کے ساتھ نماز پڑھے چنانچہ ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے اس کے ساتھ نماز پڑھی۔ (ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: ''جاء رجل وقد صلی رسول اللّٰہ ﷺ'' ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ عصر کی نماز تھی، ہمیں چونکہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا اسلئے یہ ہمارے اس مذہب کے منافی نہیں کہ صبح اور عصر کے بعد نفل پڑھنا مکروہ ہے۔ حدیث عصر، فجر اور مغرب کے علاوہ پر محمول ہوگی، کیونکہ ان تینوں کو نفل نہیں بنایا جا سکتا اور اسے اعادہ پر بھی محمول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ مکروہ ہے۔

''یتصدق علی هذا الرجل فیصلی معه؟'' یعنی کوئی شخص نہیں جو اس کے ساتھ اس طور پر احسان کرے کہ اس کے ساتھ جماعت کی نماز پڑھے تاکہ اسے جماعت کا ثواب حاصل ہو جائے۔ اس طرح وہ شخص گویا کہ صدقہ دے رہا ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کسی کو نیکی کا راستہ دکھانا یا نیکی کی ترغیب دینا صدقہ ہے۔

مظہر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس عمل کو صدقہ سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ یہ آدمی اس پر ستائیس درجہ ثواب کو صدقہ کر رہا ہے

کیونکہ اگر یہ آدمی اکیلا نماز پڑھتا تو اسے ایک نماز کا ثواب ملتا۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''ألا رجل يتصدق على هذا فيصلي معه'' عربوں کے قول ''ألا تنزل بنا فتصيب خيرًا'' کی طرح ہے اور فيصلي، ألا رجل کا جواب ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

اس کی ترکیب میں ایک قول یہ بھی ہے کہ ہمزہ استفہام کیلئے لیس کے معنی میں نہیں ہے اس صورت میں فیصلی خبر پر عطف ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوگا، یہ صورت زیادہ بہتر ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ استفہام کا جواب ہونے کی وجہ سے منصوب ہو جیسے ''هل عندك ماء فاشربه'' ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔

اس کا رفع بھی درست ہے اس میں يتصدق پر اس کا عطف ہوگا جو کہ لا بمعنی لیس کی خبر ہے۔

''فقام رجلٌ'' ابن حجر رحمہ اللہ نے سنن بیہقی کے حوالہ سے کہا ہے کہ یہ آدمی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔

''فصلي معه'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص نے جماعت سے نماز پڑھ لی ہو اس کیلئے امام یا مقتدی بن کر دوسری مرتبہ جماعت سے نماز پڑھنا جائز ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ نماز لوٹانے والے کا امام بننا اس حدیث سے بالکل معلوم نہیں ہوتا، نیز یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں صحابہ کرام کے کسی عمل کو متفق علیہ معاملہ پر محمول کرنا مختلف فیہ معاملہ پر محمول کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔

(ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں) ان تینوں احادیث کو باب فضیلۃ الجماعۃ میں لانا زیادہ مناسب تھا۔

الفصل الثالث:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الوفات میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے امامت کرائی

۱۱۴۷: وَعَنْ عُبَيْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى عَائِشَةَ فَقُلْتُ اَلَا تُحَدِّثِيْنِيْ عَنْ مَرَضِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ بَلٰى ثَقُلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَصَلَّى النَّاسُ فَقُلْنَا لَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَهُمْ يَنْتَظِرُوْنَكَ فَقَالَ ضَعُوْا لِيْ مَاءً فِي الْمِخْضَبِ قَالَتْ فَفَعَلْنَا فَاغْتَسَلَ فَذَهَبَ لِيَنُوْءَ فَاُغْمِيَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَفَاقَ فَقَالَ اَصَلَّى النَّاسُ قُلْنَا لَاهُمْ يَنْتَظِرُوْنَكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ ضَعُوْا لِيْ مَاءً فِي الْمِخْضَبِ قَالَتْ فَقَعَدَ فَاغْتَسَلَ ثُمَّ ذَهَبَ لِيَنُوْءَ فَاُغْمِيَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَفَا قَ فَقَالَ اَصَلَّى النَّاسُ قُلْنَا لَا هُمْ يَنْتَظِرُوْنَكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ ضَعُوْالِيْ مَاءً فِي الْمِخْضَبِ فَقَعَدَ فَاغْتَسَلَ ثُمَّ ذَهَبَ لِيَنُوْءَ فَاُغْمِيَ عَلَيْهِ ثُمَّ اَفَاقَ فَقَالَ اَصَلَّى النَّاسُ قُلْنَا لَاهُمْ يَنْتَظِرُوْنَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَالنَّاسُ عُكُوْفٌ فِي الْمَسْجِدِ يَنْتَظِرُوْنَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِصَلَاةِ الْعِشَاءِ الْاٰخِرَةِ فَاَرْسَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى اَبِيْ بَكْرٍ بِاَنْ يُّصَلِّيَ بِالنَّاسِ فَاَتَاهُ الرَّسُوْلُ فَقَالَ اِنَّ

رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُكَ اَنْ تُصَلِّيَ بِالنَّاسِ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ وَكَانَ رَجُلًا رَقِيْقًا يَاعُمَرُ صَلِّ بِالنَّاسِ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ اَنْتَ اَحَقُّ بِذٰلِكَ فَصَلّٰى اَبُوْبَكْرٍ تِلْكَ الْاَيَّامَ ثُمَّ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَدَ فِيْ نَفْسِهٖ خِفَّةً وَخَرَجَ بَيْنَ رَجُلَيْنِ اَحَدُهُمَا الْعَبَّاسُ لِصَلَاةِ الظُّهْرِ وَاَبُوْبَكْرٍ يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ فَلَمَّا رَاٰهُ اَبُوْبَكْرٍ ذَهَبَ لِيَتَاَخَّرَ فَاَوْمَا اِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَنْ لَّا يَتَاَخَّرَ قَالَ اَجْلِسَانِيْ اِلٰى جَنْبِهٖ فَاَجْلَسَاهُ اِلٰى جَنْبِ اَبِيْ بَكْرٍ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاعِدٌ وَقَالَ عُبَيْدُ اللّٰهِ فَدَخَلْتُ عَلٰى عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ عَبَّاسٍ فَقُلْتُ لَهٗ اَلَا اَعْرِضُ عَلَيْكَ مَاحَدَّثَتْنِيْ عَائِشَةُ عَنْ مَرَضِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هَاتِ فَعَرَضْتُ عَلَيْهِ حَدِيْثَهَا فَمَا اَنْكَرَ مِنْهُ شَيْئًا غَيْرَ اَنَّهٗ قَالَ اَسَمَّتْ لَكَ الرَّجُلَ الَّذِيْ كَانَ مَعَ الْعَبَّاسِ قُلْتُ لَا قَالَ هُوَ عَلِيٌّ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٧٢/٢ حديث رقم ٦٨٧ ـ ومسلم في صحيحه ٣١١/١ حديث رقم ٩٠/٤١٨ـ والنسائي في السنن ١٠١/٢ حديث رقم ٨٣٤ـ

ترجمہ: حضرت عبیداللہ بن عبداللہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کے بارے میں مجھے کچھ بتائیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا آپ کو میں ضرور بتاؤں گی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو نماز کے وقت آپ نے پوچھا کیا لوگ نماز پڑھ چکے ہیں؟ ہم نے عرض کیا ابھی نہیں پڑھی اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے لئے برتن میں پانی رکھو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے ایک برتن میں پانی رکھ دیا چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کیا اور ارادہ کیا کہ کھڑے ہوں مگر آپ پر غشی طاری ہوگئی اور بے ہوش ہو گئے جب ہوش آیا تو پھر فرمایا کیا لوگ نماز پڑھ چکے ہیں؟ ہم نے عرض کیا ابھی نہیں پڑھی اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا برتن میں پانی رکھو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ہم نے عرض کیا کہ پانی رکھ دیا گیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کیا اور کھڑا ہونے کا ارادہ کیا مگر بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو پھر دریافت کیا کہ کیا لوگ نماز پڑھ چکے ہیں؟ ہم نے عرض کیا ابھی نہیں پڑھی لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا برتن میں پانی رکھو جب ہم نے پانی رکھ دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے اور غسل کیا پھر جب اٹھنا چاہا تو بے ہوش ہو گئے جب ہوش آیا تو پوچھا کہ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے؟ ہم نے عرض کیا نہیں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لوگ آپ کے انتظار میں ہیں اور لوگ مسجد میں عشاء کی نماز کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہو لوگوں کو نماز پڑھائیں چنانچہ قاصد ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے آپ لوگوں کو نماز پڑھا دیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نرم دل آدمی تھے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا اے عمر تم ان لوگوں کو نماز پڑھا دو لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس عظیم الشان کام کے لئے سب سے زیادہ اہل آپ ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان دنوں میں لوگوں کو سترہ نمازیں پڑھائیں۔ اس کے بعد ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی

بیماری میں کچھ تخفیف محسوس کی تو دو آدمیوں کا سہارا لے کر نماز ظہر کے لئے مسجد میں تشریف لائے ان سہارا دینے والوں میں ایک حضرت عباسؓ تھے۔اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے جب انہوں نے آپ کی تشریف آوری کی آہٹ محسوس کی تو پیچھے ہٹنے کا ارادہ فرمایا لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں نہ ہٹنے کا اشارہ کیا اور سہارا دینے والوں کو فرمایا مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بٹھا دو۔انہوں نے آپ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بائیں پہلو میں بٹھا دیا اور رسول اللہ ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھانے لگے۔حضرت عبیداللہ جو اس حدیث کے راوی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث سنی اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گیا اور ان سے عرض کیا کیا میں آپ کے سامنے وہ حدیث بیان نہ کروں جو میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی بیماری کے بارے میں سنی ہے؟ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہاں بیان کرو میں نے پھر ان کے سامنے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بیان کی۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس میں سے کسی بات کا انکار نہیں کیا البتہ یہ کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تم کو اس شخص کا نام بتایا جو حضرت عباسؓ کے ساتھ آپ کو سہارا دینے والے تھے۔میں نے کہا نہیں تو حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا وہ حضرت علیؓ تھے۔(بخاری،مسلم)

تشریح: ''عن عبید اللہ بن عبد اللہ'' یہ عتبہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں،ابن الہمام رحمہ اللہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ ابن عمرو ہیں۔یہ قول درست نہیں۔صاحب مشکوٰۃ فرماتے ہیں کہ یہ کبار تابعین میں سے ہیں۔

''عن مرض رسول اللہ ﷺ'' مرض سے مرض الموت ہے۔

''وھم ینتظرونك'' یعنی لوگ آپ ﷺ کے تشریف لانے یا حکم کا انتظار کر رہے تھے۔

''فاغمی علیه'' اعضاء کے فتور اور ضعف کی شدت کی وجہ سے آپ ﷺ پر بے ہوشی طاری ہوگئی تھی۔اس میں حکمت انبیاء کے اجر میں اضافہ اور لوگوں کو صبر آزما حالات میں تسلی دینا ہے کہ انبیاء پر ایسے سخت حالات آسکتے ہیں عام لوگوں کا کیا کہنا؟ ایک حکمت یہ بھی ہے کہ جب انبیاء کے ہاتھ پر معجزات کا ظہور ہوتا رہے تو کہیں وہ فتنے کا شکار نہ ہو جائیں۔اس لئے انہیں تکلیف دہ حالات سے گزارا جاتا ہے۔

''فقعد فاغتسل'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ بے ہوشی کے بعد غسل کرنا مستحب ہے۔جتنی مرتبہ بے ہوشی ہوتی ہے اتنی ہی مرتبہ غسل کرنا مستحب ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ غسل ٹھنڈک کے حصول اور اعمال پر تقویت حاصل کرنے کیلئے ہو۔

''فاغمی علیه ثم افاق'' یہ بے ہوشی اور افاقہ تین مرتبہ ہوا تھا،قاضی حسین نے نقل کیا ہے کہ انبیاء پر بے ہوشی کا طاری ہونا صرف ایک یا دو ساعت کیلئے ہوتا ہے،ایک دو مہینے تک بے ہوشی کا قرار انبیاء علیہم السلام پر ممکن نہیں ہے۔

''ھم ینتظرونك یا رسول اللہ ﷺ!'' اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پوری طرح اپنی امت کے ساتھ نماز پڑھنے کی چاہت رکھتے تھے۔

''الصلاۃ العشاء الآخرۃ'' یوں تو صحابہ کرام ہر نماز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار فرمایا کرتے تھے لیکن اس واقعہ میں جس نماز کا ذکر ہے وہ عشاء کی نماز ہے۔

''فأتاہ الرسول'' یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد، حضرت بلال مؤذن رضی اللہ عنہ۔

''رقیقًا'' یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نرم دل والے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ کھڑے ہونے کی طاقت نہ رکھیں گے۔ یا یہ کہ وہ رحیم لطیف متواضع اور خلیق انسان ہیں۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت ''مھینا لینا ضعیفًا'' کے الفاظ سے کی ہے۔ ایک روایت میں أسیف کا لفظ آیا ہے اس سے بھی مراد رقیق القلب ہی ہے۔

''یا عمر! صل بالناس'' گویا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قرائن سے معلوم ہو گیا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو معین نہیں میا اس لئے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کا کہا۔ یا پھر تواضع اور دوسرے کو اجازت دینے کے جواز کی بنا پر ایسا کیا۔ نیز وہ جانتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھانا ان کے رقیق دل کے بس کی بات نہیں جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مضبوط دل والے ہیں۔

''انت احق بذلك'' یعنی نفس الامر میں زیادہ حق دار ہیں یا اختصاص کی وجہ ہے۔

''فصلی ابو بکر تلك الایام'' یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایام مرض میں سترہ نمازیں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پڑھائیں۔

''شیئًا'' مصدر ہے یعنی ما أنکر شیئًا من الانکار۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے مفعول کے مطلق قرار دیا ہے۔ راجح یہ ہے کہ یہ مفعول بہ ہے۔ یعنی ما انکر شیئا من الاشیاء۔

''اسمّت لك الرجل الذی کان مع العباس'' بعض حضرات کا کہنا ہے کہ حضرت عائشہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام اس لئے نہیں لیا کہ ان کے دل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ ناراضگی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کسی کے بغض کی وجہ سے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کی مختلف وجوہ تھیں۔

① دوسرے شخص کا نام بھول سے رہ گیا۔

② وقتی طور پر ذہن سے خطا ہو گیا۔

③ دوسرے شخص کا نام متعین نہیں، بعض نے حضرت اسامہ کا نام لیا ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے یہ خیال کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام اس لئے نہیں لیا کہ واقعہ افک میں انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا۔ ''عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ اور بھی بہت سی عورتیں ہیں''۔ لیکن اس بات سے اتفاق نہیں ہو سکتا کیونکہ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لیا تھا البتہ اس روایت میں مبہم رکھا کیونکہ روایات میں آیا ہے کہ حضرت عباس کے ساتھ کبھی ان کے بیٹے تھے، کبھی اسامہ اور کبھی علی رضی اللہ عنہم تھے۔ اس لئے انہوں نے کسی ایک کی تعیین نہیں کی۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت امام نماز ادا کی تھی، جبکہ ترمذی، نسائی اور بیہقی کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز ادا فرمائی تھی۔ اس تعارض کا حل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے ہفتہ یا اتوار کے دن ظہر کی نماز بطور امام کے پڑھائی تھی، جبکہ پیر کے دن فجر کی نماز آپ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں پڑھی تھی۔ (اس واقعہ میں مختلف محدثین نے مختلف روایات نقل کی ہیں جو اس واقعہ کی جزئی تفصیلات سے آگاہ کرتی ہیں)۔

امام شافعی نے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ بعض صحابہ کرام سے منقول ہے کہ جب انہوں نے کسی عذر کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھائی تو لوگوں کو بھی بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ ان حضرات کا یہ عمل نسخ کا علم نہ ہونے پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ خاص واقعات کا علم ہر ایک کو نہیں ہوتا۔

سورۂ فاتحہ کے ترک سے خیر کثیر سے محروم ہیں

۱۱۴۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ مَنْ اَدْرَكَ الرَّكْعَةَ فَقَدْ اَدْرَكَ السَّجْدَةَ وَمَنْ فَاتَتْهُ قِرَاءَةُ اُمِّ الْقُرْاٰنِ فَقَدْ فَاتَهٗ خَيْرٌ كَثِيْرٌ۔ (رواہ مالک)

أخرجه مالك في الموطأ ١/١١ حديث رقم ١٨ من كتاب وقوت الصلاة۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جس انسان نے رکوع کو پالیا اس نے پوری رکعت پالی اور جس آدمی نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی یعنی سورۂ فاتحہ کی قراءت فوت ہوگئی تو وہ خیر کثیر سے محروم ہو گیا۔ (مالک)

تشریح: ''وعن أبي هريرة، أنه كان يقول'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہوسکتا ہے یقول کی ضمیر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف لوٹ رہی ہو اس صورت میں یہ حدیث موقوف ہوگی۔

میرا خیال ہے کہ بظاہر یہ موقوف ہی ہے اور مرفوع ہونے کا احتمال بعید ہے لیکن اس قسم کی موقوف احادیث بھی مرفوع کے حکم میں ہوتی ہیں۔ ''الركعة'' سے مراد رکوع ہے۔ ''السجدة'' سے مراد رکعت یا جماعت کی نماز کا ثواب ہے۔

''فقد فاته خير كثير'' کیونکہ سورۃ الفاتحہ قرآن مجید کی اصل ہے، پس جس کی سورۂ فاتحہ رہ گئی اس کی نماز کا ثواب ناقص ہے۔ ایک حدیث سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جس شخص کو امام کے ساتھ رکوع مل گیا لیکن سورۂ فاتحہ کی قراءت رہ گئی وہ بہت بڑے ثواب سے محروم ہو گیا۔ ابن حجر کی بھی یہی رائے ہے۔ البتہ یہ بات اس صورت میں لاگو ہوگی۔ جب یہ تاخیر سستی تقصیر یا سستی کی وجہ سے ہو۔ یہ حکم ہر اس عمل کے بارے میں ہے جو مقتدی سے فوت ہو جائے۔

امام سے سبقت کرنے والے کے لئے وعید

۱۱۴۹: وَعَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ الَّذِیْ يَرْفَعُ رَأْسَهٗ وَيَخْفِضُهٗ قَبْلَ الْاِمَامِ فَاِنَّمَا نَاصِيَتُهٗ بِيَدِ الشَّيْطَانِ۔

(رواہ مالک)

أخرجه مالك في الموطأ ١/٩٢ حديث رقم ٥٧ من كتاب وقوت الصلاة۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جو انسان اپنے سر کو امام سے پہلے اٹھائے یا جھکائے تو سمجھ لو کہ اس کی پیشانی شیطان کے ہاتھ میں ہے۔ (مالک)

تشریح: ''الذی یرفع راسه ویخفضه'' یعنی رکوع وسجدہ سے سر اٹھاتا ہو یا جھکاتا ہو۔

''ناصیته بید الشیطان'' حقیقی معنی بھی مراد ہو سکتا ہے۔ اور مجازی بھی اس طرح کہ شیطان کا اس پر تصرف ہے اور وہ شیطان کی اتباع کرتا ہے۔

بَابُ مَنْ صَلَّى الصَّلٰوةَ مَرَّتَيْنِ

دومرتبہ نماز پڑھنے والے کا بیان

خواہ حقیقۃً پڑھتا ہے یا صورۃً۔

الفصل الاول:

ایک نماز کو دو مرتبہ پڑھنا

۱۱۵۰: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ يُصَلِّي مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ يَأْتِي قَوْمَهُ فَيُصَلِّي بِهِمْ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۹۲/۲ حدیث رقم ۷۰۰۔ ومسلم ۳۳۹/۱ حدیث رقم (۱۸۸۔۴۶۵) وأبوداؤد فی السنن ۵۰۰/۱ حدیث رقم ۷۹۰۔ والنسائی ۱۷۲/۲ حدیث رقم ۹۹۷۔ وابن ماجه ۲۷۳/۱ حدیث رقم ۸۳۶۔ والدارمی ۳۳۷/۱ حدیث رقم ۱۲۹۶۔ وأحمد فی المسند ۳۰۸/۳۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبلؓ پہلے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے پھر اپنی قوم کے ساتھ آ کر نماز پڑھتے تھے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: حضرت معاذ بن جبلؓ کا یہ معمول تھا کہ وہ عشاء کی سنتیں یا نفل حضور ﷺ کے ساتھ پڑھتے تھے تا کہ حضور ﷺ کے ہمراہ اور مسجد نبوی کی فضیلت وسعادت حاصل ہو جائے اور نماز کے آداب بھی سیکھ لیں، پھر اپنی قوم میں آ کر لوگوں کو فرض پڑھایا کرتے تھے۔ حدیث کی مذکورہ تشریح پر سب کا اتفاق ہے۔

قاضی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں نماز کو جماعت کے ساتھ دوبارہ پڑھنے کے جواز کی دلیل موجود ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس بات کی کوئی دلیل موجود نہیں کہ انہوں نے دونوں نمازوں میں عشاء کے فرض کی نیت کی تھی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مطلقاً اس کے جواز کے قائل ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صرف ظہر اور عشاء کا اعادہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ظہر اور عشاء کا اعادہ نفلی طور پر ہو سکتا ہے۔ فجر اور عصر کا اس لئے نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں نمازوں کے بعد نفل پڑھنا جائز نہیں، باقی مغرب میں چونکہ تین رکعتیں ہیں اور نفل تو دو ہوتے ہیں۔ اگر چار رکعات پڑھ لے تو امام کی مخالفت لازم آئے گی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس نے نماز جماعت سے پڑھی ہے تو اس کا اعادہ نہ کرے اور اگر اس نے اکیلے پڑھی ہے تو پھر جماعت کے ساتھ اعادہ کرے لیکن مغرب کا اعادہ نہ کرے۔

ان حضرات کا کہنا ہے کہ چونکہ نفل پڑھنے والا فرض پڑھنے والے کی اقتداء کر سکتا ہے۔ اس لئے حضرت معاذؓ کی دوسری نماز

کو نفل کہا جائے گا۔

(متفق علیہ) ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلم کے الفاظ یہ ہیں: ''فیصلی بھم الصلاۃ''۔

جبکہ بخاری میں یہ الفاظ ہیں: "فیصلی بھم الصلاۃ المکتوبۃ"۔

لیکن اس سے بھی ان کا مدعیٰ ثابت نہیں ہوتا۔

۱۱۵۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ مُعَاذٌ يُصَلِّيْ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى قَوْمِهٖ فَيُصَلِّيْ بِهِمُ الْعِشَاءَ وَهِيَ لَهٗ نَافِلَةٌ۔ (رواه البَيْهَقِيُّ والبخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۹۲/۲ حديث رقم ۷۰۱۔ومسلم في صحيحه ۳۴۰/۱ حديث رقم (۱۸۰۔۴۶۵)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبلؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھتے تھے اس کے بعد اپنی قوم کی طرف جاتے اور ان کو بھی عشاء کی نماز پڑھاتے اور وہ نماز حضرت معاذؓ کے لئے نفل ہوتی۔ (بیہقی، بخاری)

تشریح: ''وھی لہ نافلۃ'' اس جملہ کے دو معنی ہیں:

① ان کا یہ عمل یعنی دو مرتبہ نماز پڑھنا ان کے لئے نفل یعنی ثواب کا کام ہے۔

② پہلی نماز ان کیلئے نفل ہے۔

جن حضرات نے یہ کہا کہ وہ دوسری نماز نفل کی نیت سے پڑھتے تھے اور لوگ ان کے پیچھے فرض کی نیت کرتے تھے تو یہ ایک ایسا قول ہے جس کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ نیت کا تعلق تو دل کے ساتھ ہے۔ نیز ابن الہمام نے لکھا ہے کہ زبان سے نیت کرنا بدعت ہے، زبان سے نیت کرنا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام سے منقول نہیں۔

(رواہ......) مصنف نے یہاں بیاض چھوڑی ہے۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مصنف نے اس کے روایت کرنے والے کو اصحاب سنن میں سے بیان نہیں کیا۔

الفصل الثانی:

فرض نماز پڑھنے کے بعد دوبارہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم

۱۱۵۲: عَنْ يَزِيْدَ بْنِ الْاَسْوَدِ قَالَ شَهِدْتُّ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَجَّتَهٗ فَصَلَّيْتُ مَعَهٗ صَلَاةَ الصُّبْحِ فِيْ مَسْجِدِ الْخَيْفِ فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهٗ وَانْحَرَفَ فَاِذَا هُوَ بِرَجُلَيْنِ فِيْ اٰخِرِ الْقَوْمِ لَمْ يُصَلِّيَا مَعَهٗ قَالَ عَلَيَّ بِهِمَا فَجِيْءَ بِهِمَا تَرْعَدُ فَرَائِصُهُمَا فَقَالَ مَا مَنَعَكُمَا اَنْ تُصَلِّيَا مَعَنَا فَقَالَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا كُنَّا قَدْ صَلَّيْنَا فِيْ رِحَالِنَا قَالَ فَلَا تَفْعَلَا اِذَا صَلَّيْتُمَا فِيْ رِحَالِكُمَا ثُمَّ اَتَيْتُمَا مَسْجِدَ جَمَاعَةٍ فَصَلِّيَا مَعَهُمْ فَاِنَّهَا لَكُمَا نَافِلَةٌ۔ (رواه الترمذي وابوداود والنسائي)

أخرجه أبوداود في السنن ۳۸۶/۱ حديث رقم ۵۷۵۔والترمذي ۴۲۴/۱ حديث رقم ۲۱۹۔والنسائي ۱۱۲/۲

حديث رقم ۸۵۸۔والدارمی ۱/ ۳۶۶ حديث رقم ۱۳۶۷۔وأحمد فی المسند ۴/ ۱۶۰۔

ترجمہ: حضرت یزید بن اسود سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع میں شریک تھا چنانچہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد خیف میں فجر کی نماز پڑھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو دیکھا دو آدمی لوگوں کے آخر میں بیٹھے ہوئے ہیں جنہوں نے آپ کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان دونوں کو میرے پاس لے آؤ' وہ دونوں آپ کی خدمت میں لائے گئے اور ان کے کندھوں کا گوشت کانپ رہا تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا تمہیں ہمارے ساتھ نماز پڑھنے سے کس چیز نے روکا انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم اپنے ٹھہرنے کی جگہ نماز پڑھ آئے تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا آئندہ ایسا نہ کرنا اگر تم اپنے مقام پر نماز پڑھ چکے ہو اور اس کے بعد مسجد میں آؤ جہاں جماعت ہو رہی ہو تو لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ لیا کرو کہ یہ نماز تمہارے لئے نفل ہو جائے گی۔(ترمذی،ابوداؤد،نسائی)

راویٔ حدیث:

یزید بن الاسود۔ یہ یزیدؓ اسود کے بیٹے ہیں اور باعتبار خاندان سوائی ہیں۔ان سے ان کے بیٹے ''جابر رضی اللہ عنہ'' نے روایت کی۔ ان کا شمار اہل طائف میں ہوتا ہے۔اور ان کی حدیث اہل کوفہ کے یہاں پائی جاتی ہے۔''سوائی'' میں سین مہملہ مضموم' واو بلاتشدید اور الف ممدودہ ہے۔

تشریح:''مع النبی ﷺ حجتہ''یعنی حجۃ الوداع میں۔

''**فی مسجد الخیف**''مسجد خیف کی وجہ تسمیہ کے بارے میں علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔خیف ایسی جگہ کو کہتے ہیں جو پہاڑی ٹیلوں سے نیچے ہو اور سیلاب وغیرہ سے بھی محفوظ ہو،یہ مسجد ایک ایسی ہی جگہ واقع ہے۔

''**وانحرف**''ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں جانب کو مقتدیوں کی طرف اور بائیں جانب کو قبلہ کی طرف کیا جیسا کہ سنت ہے۔

''**علی بھما**''یہ اسم فعل ہے بمعنی ان دونوں کو میرے پاس لاؤ۔علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علیّ فعل محذوف کا متعلق ہے اور بھما حال ہے،اصل عبارت یہ ہوگی۔''أقبلا علیّ و أتیا بھما''۔یا علیّ اسم فعل ہے اور بھما اسی کے ساتھ متعلق ہے۔

''**فرائصھما**''فرائص، فریصۃ کی جمع ہے،اس سے مراد وہ گوشت ہے جو جانور کے پہلو اور شانے کے درمیان ہوتا ہے اور خوف کے وقت کانپنے لگتا ہے۔مطلب یہ کہ وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈر رہے تھے۔

ابن حجر کا یہ کہنا کہ فرائص،فریصۃ کی تثنیہ ہے،بالکل وہم ہے،البتہ اس سے تثنیہ مراد ہو سکتا ہے۔لفظی تثنیہ اس لئے نہیں لایا گیا کہ اس طرح دو تثنیہ کا اجتماع ہو جاتا جنہیں ان کے امتزاج کی وجہ سے ایک ہی کلمہ شمار کیا گیا ہے،اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

''**فقد صغت قلوبکما**''

البتہ زیادہ بہتر بات یہ ہے کہ حقیقت میں یہاں مراد بھی جمع ہی ہے کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک کے دو دو فریضہ تھے۔
''ان تصلیا معنا؟''یعنی مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ۔
''فانها لكما نافلة''یعنی آخر میں پڑھی جانے والی نماز نفل ہو جائے گی خواہ پہلی نماز جماعت سے پڑھی ہو یا تنہا پڑھی ہو۔

ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الفصل الثالث:

جو آدمی نماز پہلے پڑھ چکا ہو وہ دوبارہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لے

۱۱۵۳: عَنْ بُسْرِ بْنِ مِحْجَنٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهٗ كَانَ فِيْ مَجْلِسٍ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاُذِّنَ بِالصَّلَاةِ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى وَ رَجَعَ وَمِحْجَنٌ فِيْ مَجْلِسِهٖ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مَنَعَكَ اَنْ تُصَلِّيَ مَعَ النَّاسِ اَلَسْتَ بِرَجُلٍ مُسْلِمٍ فَقَالَ بَلٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَلٰكِنِّيْ كُنْتُ قَدْ صَلَّيْتُ فِيْ اَهْلِيْ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا جِئْتَ الْمَسْجِدَ وَكُنْتَ قَدْ صَلَّيْتَ فَاُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَصَلِّ مَعَ النَّاسِ وَاِنْ كُنْتَ قَدْ صَلَّيْتَ۔

(رواہ مالك والنسائی)

أخرجه النسائی فی السنن ۲/ ۱۱۲ حدیث رقم ۸۵۷۔ومالك فی الموطأ ۱/ ۱۳۲ حدیث رقم ۸ من باب صلاة الجماعة۔

ترجمہ: حضرت بسر بن محجن اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے والد ایک مجلس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔نماز کے لئے اذان دی گئی اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے کھڑے ہو گئے آپ جب نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو دیکھا کہ محجن اپنی جگہ بیٹھے ہوئے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنے سے تمہیں کس چیز نے روکا ہے؟ کیا تم مسلمان نہیں ہو؟ انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مسلمان ہوں لیکن میں اپنے گھر والوں کے ساتھ نماز پڑھ چکا تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا جب تم مسجد میں آؤ تو باوجود اس کے کہ تم نماز پڑھ چکے ہو جب مسجد میں جماعت کھڑی ہو جائے تو لوگوں کے ساتھ دوبارہ نماز پڑھ لو۔(مالک،نسائی)

راویٔ حدیث:

بسر بن محجن ۔یہ''بسر بن محجن دیلمی حجازی'' ہیں۔اپنے والد سے روایت کرتے تھے اور ابن مندہ نے ان کا نام صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذیل میں درج کیا اور کہا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث روایت کی ہے۔اور بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے ان کو''تابعی'' کہا ہے اور یہ ٹھیک ہے۔ان سے''زید بن اسلم'' نے روایت کی ہے۔بسر باء کے ضمہ اور سین مہملہ کے ساتھ ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ بکسر الاول اور معجمہ کے ساتھ ہے مرتب عرض کرتا ہے علامہ طاہر پٹنی لکھتے ہیں کہ ثوری رحمہ اللہ اس کو شین معجمہ کے

ساتھ بھی بیان کرتے تھے پھر انہوں نے رجوع کر لیا۔ اھ (المغنی فی ضبط اسماء الرجال ص: ۲۷) ''محجن'' میں میم مکسور حاء ساکن جیم مفتوح اور آخر میں نون ہے ''دیلمی'' میں دال مکسور ہے اور دو نقطوں والی یاء ساکن ہے۔

تشریح: ''عن بسر'' بضم وسکون ومهملة، البداية الجزوية اور التقریب میں یونہی درج ہے البتہ التقریب میں ''بكسر أوله والمعجمة'' کا قول بھی ملتا ہے، بعض حضرات نے انہیں صحابی کہا ہے لیکن ان کا تابعی ہونا راجح ہے، صاحب جامع الاصول نے انہیں حجازی قرار دیا ہے۔ مؤلف نے انہیں صدوق الروایۃ لکھا اور فرمایا کہ یہ اپنے والد سے بھی روایت کرتے ہیں۔

''ابن محجن'' بکسر المیم وفتح الجیم۔

''كان في مجلس'' یہ مجلس مسجد کے اندر تھی۔

''فأذن'' صیغۂ مجہول کے ساتھ۔

''فصل'' یعنی بطور نفل کے نہ کہ اعادہ اور قضاء کیلئے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول ''و كنت قد صليت'' کا تکرار اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے:

''ثم ان ربك للذين عملوا السوء بجهالة ثم تابوا من بعد ذالك وأصلحوا ان ربك من بعدها لغفور رحيم''۔

(اس آیت میں ''ان ربك'' دو مرتبہ مذکور ہے)۔

دوسری روایات کی بنا پر اس حکم سے صبح، عصر اور مغرب کی نماز خارج ہوں گی۔

اگر گھر میں نماز پڑھ لی تو مسجد میں دوبارہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھے

۱۱۵۴: وَعَنْ رَجُلٍ مِنْ اَسَدِ بْنِ خُزَيْمَةَ اَنَّهٗ سَأَلَ اَبَا اَيُّوْبَ الْاَنْصَارِيَّ قَالَ يُصَلِّيْ اَحَدُنَا فِيْ مَنْزِلِهِ الصَّلَاةَ ثُمَّ يَأْتِي الْمَسْجِدَ وَتُقَامُ الصَّلَاةُ فَاُصَلِّيْ مَعَهُمْ فَاَجِدُ فِيْ نَفْسِيْ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ فَقَالَ اَبُوْ اَيُّوْبَ سَاَلْنَا عَنْ ذٰلِكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَذٰلِكَ لَهٗ سَهْمُ جَمْعٍ۔ (رواه مالك وابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۳۸۸/۱ حديث رقم ۵۷۸۔ ومالك في الموطأ ۱۳۳/۱ حديث رقم ۱۱ من كتاب صلاة الجماعة۔

ترجمہ: قبیلہ اسد بن خزیمہ کے ایک آدمی سے روایت ہے کہ اس نے حضرت ابوایوب انصاری سے سوال کیا کہ ہم میں سے کوئی آدمی اپنے گھر میں نماز پڑھ لیتا ہے پھر وہ مسجد میں آتا ہے اور وہ دیکھتا ہے وہاں جماعت سے نماز پڑھی جا رہی ہے کیا وہ آدمی ان کے ساتھ نماز پڑھ لے۔ اس کے متعلق میں اپنے دل میں تردد محسوس کرتا ہوں تو حضرت ابوایوب انصاری نے فرمایا ہم نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا یہ دوبارہ نماز پڑھنا اس کے لئے جماعت کا حصہ ہے۔ (مالک، ابوداود)

تشریح: ''فاصلي معهم'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں غیوبیت سے خطاب کی طرف التفات ہے،

کیونکہ اصل میں ''یصلی احدنا'' کی جگہ ''اصلی فی منزلی'' ہونا چاہیے۔ یا پھر ''فاصلی معھم'' کی جگہ ''فیصلی معھم'' ہوتا۔ لیکن اس کلام میں التفات آیا ہے۔

''فاجد فی نفسی شبھۃ'' یعنی مجھے شبہ ہو جاتا ہے کہ میرا فائدہ کس چیز میں ہے اور نقصان کس میں؟۔

''سالنا عن ذلك النبی ﷺ'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دوسرے ''ذلك'' کا مشار الیہ وہی ہے جو پہلے اور تیسرے مشار الیہ کا ہے۔ (لیکن ملا علی قاری رحمہ اللہ کا خیال یہ ہے کہ تیسرے ذلك کا مشار الیہ الرجل ہے) یعنی آدمی کا عمل کہ وہ اکیلے نماز پڑھنے کے بعد اسے جماعت کے ساتھ لوٹایا کرتا تھا۔

''سھم جمع'' یعنی جماعت کا ثواب۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس شخص کے قول ''فاجد فی نفسی کے دو معنی ہیں:

① میں اس بارے میں اپنے دل میں کشمکش پاتا ہوں کہ نامعلوم یہ عمل میرے فائدہ میں ہے یا نقصان میں اس کی وضاحت ہوگئی کہ اس میں سراسر اس کا فائدہ ہے۔

② مجھے اس عمل سے خوشی اور راحت ملتی ہے تو اسے بتایا گیا کہ اس کی یہ راحت جماعت کی نماز کا ثواب ملنے کی وجہ سے ہے۔ پہلا معنی راجح ہے۔

یہ جواب اپنی عمومیت کے ساتھ ہمارے زمانہ کی صورتحال کو بھی شامل ہے کہ ہمارے مساجد میں متعدد جماعتیں ہوتی ہیں۔ اس میں حرمین شریفین کے رہنے والے بھی مبتلا ہیں۔ بلاشبہ موافق امام کے ساتھ فرض پڑھنا اولیٰ ہے پھر جب فرض سے پہلے یا بعد میں مخالف امام کے ساتھ مکروہ اوقات کے علاوہ میں نفل پڑھے گا تو اسے دوگنا ثواب ملے گا۔

دوسری مرتبہ پڑھی ہوئی نماز نفل ہو جائے گی

۱۱۵۵: وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ جِئْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِي الصَّلَاةِ فَجَلَسْتُ وَلَمْ اَدْخُلْ مَعَهُمْ فِي الصَّلَاةِ فَلَمَّا انْصَرَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰنِيْ جَالِسًا فَقَالَ اَلَمْ تُسْلِمْ يَايَزِيْدُ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَسْلَمْتُ قَالَ وَمَا مَنَعَكَ اَنْ تَدْخُلَ مَعَ النَّاسِ فِيْ صَلَاتِهِمْ قَالَ اِنِّيْ كُنْتُ قَدْ صَلَّيْتُ فِيْ مَنْزِلِيْ اَحْسَبُ اَنْ قَدْ صَلَّيْتُمْ فَقَالَ اِذَا جِئْتَ الصَّلَاةَ فَوَجَدْتَّ النَّاسَ يُصَلُّوْنَ فَصَلِّ مَعَهُمْ وَاِنْ كُنْتَ قَدْ صَلَّيْتَ تَكُنْ لَكَ نَافِلَةٌ وَهٰذِهٖ مَكْتُوْبَةٌ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/۳۸۸ حديث رقم ۵۷۷۔

ترجمہ: حضرت یزید بن عامرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور ان لوگوں کے ساتھ نماز میں شامل نہ ہوا جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ کر فارغ ہوئے اور مجھے ایک طرف بیٹھے ہوئے دیکھا تو فرمایا اے یزید کیا تم مسلمان نہیں ہو

؟میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ یقیناً میں مسلمان ہوں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کے ساتھ نماز میں شریک ہونے سے تمہیں کس چیز نے منع کیا؟ میں نے عرض کیا میں اپنے گھر میں نماز پڑھ چکا تھا اور میرا یہ خیال تھا کہ آپ بھی نماز سے فارغ ہو چکے ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم نماز کے لئے آؤ اور لوگوں کو پاؤ کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں تو تم بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ اگر چہ تم اس سے پہلے نماز پڑھ چکے ہو یہ نماز تمہارے لئے نفل ہو جائے گی اور وہ فرض ہو جائے گی۔ (ابوداؤد)

راوئ حدیث:

یزید بن عامر۔ یہ یزید ہیں۔ عامر کے بیٹے ہیں۔ اور سوائی وحجازی ہیں۔ غزوہ حنین میں مشرکین کی جانب سے شریک ہوئے تھے۔ اس کے بعد مسلمان ہوئے۔ ان سے سائب ابن یزید رضی اللہ عنہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔

تشریح: ''ولم ادخل معهم'' دفع وہم کیلئے یہ بات ارشاد فرمائی کہ جلست کے الفاظ مفہوم ہوتا تھا کہ بیٹھ کر اقتداء کرنی ہوگی۔

''انما كنت قد صليت في منزلي، أحسب أن قد صليتم'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ حالیہ ہے یعنی میں نے گمان کرتے ہوئے نماز پڑھ لی تھی کہ آپ نماز پڑھ چکے ہوں گے۔ اس جملہ میں نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کے دو عذر بیان کئے۔ ایک یہ کہ میں نے نماز پڑھ لی ہے اور دوسرا یہ کہ اس لئے پڑھی کہ میرا خیال یہ تھا کہ نماز ہو چکی ہوگی۔

''تكن لك نافلةً وهذه مكتوبة'' بالرفع والنصب۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکیلے پڑھی گئی نماز کو نفل اور جماعت کی نماز کو فرض قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اصل نماز وہ ہے جو جماعت کے ساتھ پڑھی جائے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہوا کہ جماعت کی نماز واجب، فرض یا شرط ہے۔

دوبارہ پڑھی جانے والی نماز کا حکم

۱۱۵۶: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلاً سَأَلَهُ فَقَالَ اِنِّیْ اُصَلِّیْ فِیْ بَیْتِیْ ثُمَّ اُدْرِكُ الصَّلَاةَ فِی الْمَسْجِدِ مَعَ الْاِمَامِ اَفَاُصَلِّیْ مَعَهٗ قَالَ لَهٗ نَعَمْ قَالَ الرَّجُلُ اَیَّتُهُمَا اَجْعَلُ صَلَاتِیْ قَالَ ابْنُ عُمَرَ وَ ذٰلِكَ اِلَیْكَ اِنَّمَا ذٰلِكَ اِلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ یَجْعَلُ اَیَّتَهُمَا شَاءَ۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ١/١٣٣ حديث رقم ٩ من كتاب صلاة الجماعة۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان سے ایک آدمی نے سوال کیا کہ میں اپنے گھر میں نماز پڑھ لیتا ہوں پھر میں مسجد میں امام کے ساتھ نماز کو پالیتا ہوں کیا میں بھی اس امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جاؤں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہاں اس کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ پھر اس آدمی نے پوچھا میں اپنی کون سی نماز کو فرض قرار دوں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ تیری ذمہ داری نہیں ہے اس کا اختیار اللہ کو ہے اس کی مرضی وہ جسے چاہے

تمہارے لئے فرض قرار دے۔ (مالک)

تشریح: ''أيتهما اجعل صلاتي ''یعنی ان دونوں ادا کردہ نمازوں میں سے میں کس کو فرض بناؤں۔

''قال ابن عمر و ذلك اليك ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ جواب اس صورت پر محمول ہوگا کہ اس شخص نے نماز کا اعادہ تو کرلیا لیکن نفل کیلئے کسی کی تعیین نہیں کی تھی۔ شاید حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو نسخ اور اعادۂ حقیقیہ کی کراہت کا علم نہ ہوگا جیسا کہ بعض روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

''انما ذلك الى الله عزوجل يجعل أيتهما شاء ''یعنی ان نمازوں میں فرض اور نفل کی تعیین کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کا مدار تو قبولیت پر ہے اور قبولیت بندوں پر مخفی ہے۔ اگرچہ جمہور پہلی نماز کو فریضہ قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلی نماز فاسد ہوگئی ہو اور اللہ نفل کو فریضہ کی جگہ رکھ کر ثواب عطا فرمائیں۔ یعنی اس معاملہ کو فقہی اور دنیوی اعتبار سے دیکھنے کے بجائے آخرت پر چھوڑ دیا جائے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی تائید کرتی ہے کہ ان دونوں میں سے ایک نماز بلا تعیین فرض ادا ہوتی ہے خواہ پہلی نماز ہو یا دوسری۔ لیکن مسلم شریف میں روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ائمہ سے فرمایا جو نماز کو مؤخر کرتے تھے کہ تم اپنی نماز کو اول وقت میں پڑھو اور اپنی نماز کو ان کے ساتھ نفل بنالو۔ اس میں بحث ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس فرض کو چاہے نفل بنادے اور جس نفل کو چاہے فرض بنادے۔

ایک نماز کو ایک دن میں دومرتبہ پڑھنا منع ہے

۱۱۵۷: وَعَنْ سُلَيْمَانَ مَوْلٰى مَيْمُوْنَةَ قَالَ اَتَيْنَا ابْنَ عُمَرَ عَلَى الْبَلَاطِ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ فَقُلْتُ اَلَا تُصَلِّيْ مَعَهُمْ قَالَ قَدْ صَلَّيْتُ وَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ لَا تُصَلُّوْا صَلَاةً فِيْ يَوْمٍ مَرَّتَيْنِ۔

(رواه احمد وابوداود والنسائی)

أخرجه أبوداوٗد فى السنن ٣٨٩/١ حديث رقم ٥٧٩۔ والنسائي ١١٤/٢ حديث رقم ٨٦۔ وأحمد في المسند ١٩/٢۔

ترجمہ: حضرت میمونہ کے آزاد کردہ غلام حضرت سلیمان سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس مقام بلاط میں آئے لوگ اس وقت نماز ادا کر رہے تھے۔ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے عرض کیا کہ آپ لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا میں نماز پڑھ چکا ہوں اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تم ایک دن میں ایک نماز دو مرتبہ نہ پڑھو۔ (احمد، ابوداود، نسائی)

تشریح: ''أتينا ابن عمر على البلاط ''بفتح الفاء ''بلاط ''پتھروں کی ایک خاص قسم ہے جو زمین پر بچھائے جاتے ہیں۔ یہ مدینہ میں ایک مشہور جگہ کا نام ہے۔

''قد صليت ''اس جملہ میں دو احتمال ہیں:

① انہوں نے یہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تھی۔ ② یہ وقت فجر، عصر یا مغرب کا تھا۔

''لا تصلوا صلاۃ'' یعنی دو نمازوں کو فریضہ بنا کر نہ پڑھو (بلکہ ایک کو نفل اور دوسری کو فرض بناؤ)۔

''فی یوم مرتین'' البتہ اگر پہلی نماز نہ ہوئی ہو تو دوسری مرتبہ فرض بھی پڑھ سکتے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر محمول کیا ہے لیکن میرک فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام مالک کے مذہب پر محمول کرنا حدیث معاذ کے منافی ہے۔ کیونکہ حضرت معاذؓ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تھے پھر آ کر اپنی قوم کو نماز پڑھاتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت معاذؓ کا عمل عدم اعادہ پر مشتمل تھا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ پہلے انہوں نے نفل کی نیت کی پھر فرض کی جیسا کہ ہمارا مذہب ہے، یا پہلے فرض کی نیت کی پھر نفل کی جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ احادیث میں تعارض کو ختم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس حدیث کی وجہ یہ ہے کہ جس شخص نے اس نیت سے نماز پڑھی کہ بعد میں اس کو تنہا لوٹائے گا تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ کیونکہ جب تک دلیل نہ ہو اعادہ ممنوع ہے اور اعادہ کی صرف جماعت کی صورت میں گنجائش وارد ہوئی ہے۔

اس کے بعد میرک فرماتے ہیں کہ اس صورت میں یہ حدیث کسی دوسری حدیث یا مذہب کے مخالف نہ رہے گی۔

میں کہتا ہوں کہ ہمارے مذہب کی مخالفت کے باوجود یہ حدیث سائل کا جواب بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی کیونکہ اس کا کلام جماعت کے ساتھ اعادہ کے بارے میں تھا اور اس کے ساتھ یہ کہ احادیث میں اعادۂ حقیقیہ کی تصریح موجود نہیں۔ بلکہ اعادہ صوریہ کا ذکر ہے پس نہی اعادہ حقیقیہ پر محمول ہوگی تا کہ احادیث میں تعارض بھی ختم ہو جائے اور فقہاء کے درمیان اتفاق بھی ہو جائے۔

نمازِ مغرب اور فجر کو ادا کر لینے والا اگر جماعت کو پائے تو اس کیلئے کیا حکم ہے؟

۱۱۵۸: وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ اِنَّ عَبْدَ اللّٰهِ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يَقُوْلُ مَنْ صَلَّى الْمَغْرِبَ اَوِ الصُّبْحَ ثُمَّ اَدْرَكَهُمَا مَعَ الْاِمَامِ فَلَا يَعُدْ لَهُمَا۔ (رواہ مالک)

أخرجه مالك في الموطأ ١/١٣٣ حديث رقم ١٢ من كتاب صلاة الجماعة۔

ترجمہ: حضرت نافع سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے جس انسان نے مغرب یا فجر کی نماز ادا کر لی ہو پھر دونوں نمازوں کو امام کے ساتھ پائے تو وہ ان کو دوبارہ نہ پڑھے۔ (مالک)

تشریح: ''عن نافع'' نافع، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام ہیں۔

''من صلی المغرب او الصبح''۔ عصر کی نماز کا بھی یہی حکم ہے۔

بَابُ السُّنَنِ وَفَضَائِلِهَا

سنتوں اور اُس کی فضیلتوں کا بیان

یہ بات یادرکھنے کے قابل ہے کہ سنت، نفل، تطوع، مندوب، مستحب، مرغب فیہ اور حسن یہ تمام الفاظ مترادفہ ہیں۔ یہ ان اعمال پر صادق آتے ہیں کہ جن کے کرنے کو شارع نے فضیلت وثواب کی چیز بتایا لیکن ان کے چھوڑ دینے کی بھی اجازت دی، البتہ بعض مسنون چیزیں عمل کے اندر بالاتفاق دوسری مسنون چیزوں سے بڑھ کر ہیں۔

ایک صحیح حدیث میں آتا ہے:

''قیامت کے دن آدمی کے اعمال میں سب سے پہلے نماز کے بارے میں سوال کیا جائے گا اگر نماز ٹھیک نکل آئی تو وہ شخص کامیاب اور بامراد ہوگا اور اگر خراب نکلی تو وہ خسارے اور گھاٹے میں ہوگا۔ اگر اس کے فرائض میں کوئی کمی ہوئی اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اس کے نوافل کو دیکھو۔ اگر نوافل بھی ہوئے تو ان کے ذریعہ اس کے فرضوں کو مکمل کر دیا جائے گا۔ یہی حال باقی تمام اعمال میں بھی ہوگا''۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر فرائض میں کمی ہو پھر بھی نوافل صحیح ہی ہوتے ہیں اور قبول ہوجاتے ہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے جس میں ذکر ہے:

''نمازی کے نوافل اس وقت تک قبول نہیں ہوتے جب تک وہ فرائض کو پورا نہ کرے''۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی بات ارشاد فرمائی اور فرمایا کہ اگر اس کے فرائض میں نقص ہے تو وہ گناہ گار ہوگا لیکن یہ کسی امر خارجی کی وجہ سے ہے اس سے نوافل کا بطلان تو لازم نہیں آتا۔

الفصل الاول:

سنتوں کی تعداد کا بیان

۱۱۵۹: وَعَنْ اُمِّ حَبِيْبَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى فِيْ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً بُنِيَ لَهٗ بَيْتٌ فِي الْجَنَّةِ اَرْبَعًا قَبْلَ الظُّهْرِ وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ وَرَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلٰوةِ الْفَجْرِ (رواه الترمذي وفي رواية لمسلم) اَنَّهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يُصَلِّيْ لِلّٰهِ كُلَّ يَوْمٍ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً تَطَوُّعًا غَيْرَ فَرِيْضَةٍ اِلَّا بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ اَوْ اِلَّا بُنِيَ لَهٗ بَيْتٌ فِي الْجَنَّةِ۔

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۵۰۳ حديث رقم حديث رقم (۱۰۳-۷۲۸)۔ وأبوداؤد في السنن ۲/۴۲ حديث رقم ۱۲۵۰۔والترمذي ۲/۲۷۴ ~~حديث رقم~~ ۴۱۴۔والنسائي ۳/۲۶۰ حديث رقم ۱۷۹۴۔وابن ماجه

۳٦١/١ حديث رقم ١١٤٠ ـ والدارمي ٣٩٧/١ حديث رقم ١٤٣٨ ـ وأحمد في المسند ٣٢٦/٦ ـ

ترجمہ: حضرت ام حبیبہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی دن اور رات میں بارہ رکعتیں نماز پڑھے اس کے لئے جنت میں گھر بنایا جاتا ہے۔ چار رکعت ظہر سے پہلے اور دو رکعت ظہر کے بعد اور دو رکعت مغرب کے بعد اور دو رکعت فجر سے پہلے۔ (ترمذی) مسلم کی ایک روایت اس طرح ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو مسلمان بندہ ہر روز اللہ تعالیٰ کے لئے فرض نماز کے علاوہ بارہ رکعت پڑھتا ہو تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ جنت میں گھر بناتا ہے یا یہ فرمایا کہ اس کے لئے جنت میں گھر بنایا جاتا ہے۔

تشریح: "عن أم حبيبة" ام حبیبہ، حضرت معاویہ بن ابی سفیان کی بہن اور حضور ﷺ کی زوجہ محترمہ ہیں۔

"ثنتي عشرة" بسكون الشين وكسرها۔

"ركعة" بسكون الكاف۔ حالانکہ بہت سے لوگ اسے کاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ کیونکہ اس کی جمع اس وزن پر آتی ہے۔

"اربعا" یہ بدل تفصیل ہے۔

"قبل الظهر وركعتين بعدها وركعتين بعد المغرب وركعتين بعد العشاء وركعتين قبل صلاة الفجر" یہ تمام سنن مؤکدہ ہیں۔ فجر کی سنتوں کی بہت تاکید آئی ہے حتی کہ بعض علماء نے تو انہیں واجب قرار دیا ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے حسن بصری اور بعض حنفیہ کے اس قول کی تردید ہوگئی کہ فجر کی دو سنتیں واجب ہیں۔ اسی طرح حسن بصری کے مغرب کی دو سنتوں کو واجب قرار دینے کے قول کی بھی تردید ہوگئی۔

سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر فجر کی دو رکعتیں چھوٹ گئیں تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری بخشش نہ ہو۔

"رواه الترمذي" اس میں صاحب مصابیح پر ایک اعتراض ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو صحاح میں ذکر کیا اور اگلی صحیح حدیث کو چھوڑ دیا۔

"تطوعا" ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تطوع سے مراد وہ عمل ہے جو واجب نہ ہو، یہاں اس سے مراد سنت ہے۔

"غير فريضة" علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تطوع کی مزید تاکید کیلئے ہے۔

اگر تطوع کو ریاء اور شہرت پسندی کے مقابلہ میں خوشی اور رغبت کے معنی میں لیں تو غیر فریضہ مفعول سے بدل، بیان یا حال ہوگا۔

تطوع کی دو قسمیں ہیں: ① راتبہ۔ ② غیر راتبہ۔

راتبہ وہ ہے جس پر نبی کریم ﷺ نے دوام اختیار فرمایا ہو اور غیر راتبہ وہ ہے جس پر آپ نے دوام نہیں فرمایا۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں کہ محی السنۃ کو چاہیے تھا کہ مسلم کی حدیث کو صحاح میں اور ترمذی کی حدیث کو حسان میں ذکر کرتے تاکہ یہ مسلم کے اجمال کا بیان ہو جاتا۔

ظہر کی سنن قبلیہ اور بعد یہ کا ذکر

۱۱۶۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ فِيْ بَيْتِهٖ وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ فِيْ بَيْتِهٖ قَالَ وَحَدَّثَتْنِيْ حَفْصَةُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ حِيْنَ يَطْلُعُ الْفَجْرُ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۴۲۵ حدیث رقم ۹۳۷ومسلم فی حدیث ٥ ۱/٥۰٤ حدیث رقم (۱۰٤-۷۲۹) والدارمی فی السنن ۱/۳۹٦ حدیث رقم ۱٤۳۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ظہر سے پہلے دو رکعتیں اور ظہر کے بعد دو رکعتیں اور مغرب کے بعد دو رکعتیں گھر میں اور عشاء کے بعد دو رکعتیں گھر میں پڑھی ہیں۔ اور انہوں نے فرمایا کہ حضرت حفصہؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ ہلکی سی دو رکعت نماز طلوع فجر کے وقت بھی پڑھتے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''صلیت مع رسول اللہ ﷺ'' یہاں معیت سے مشارکت مراد ہے۔ معیتِ جماعت مراد نہیں کیونکہ نفل میں سوائے تراویح کے جماعت کی نماز مکروہ ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت مبارکہ ہے:

''واسلمت مع سلیمان للّٰہ رب العالمین''

''رکعتین قبل الظہر'' یہ تثنیہ جمع کے منافی نہیں ہوگا۔ یہ معنی لینے کی صورت میں اس حدیث سے تعارض ختم ہو جائے گا جس میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ظہر سے پہلے کی چار رکعات کبھی نہ چھوڑتے تھے۔

''ورکعتین بعدھا ورکعتین بعد المغرب فی بیتہ'' ظاہر یہ ہے کہ فی بیتہ کا تعلق صرف رکعتین بعد المغرب کے ساتھ ہے، جبکہ ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اس قید کا تعلق پچھلی تمام سنن مذکورہ کے ساتھ ہے۔ ان کے اس قول کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آیا ہے آدمی کی بہترین نفل نماز وہ ہے جو گھر میں پڑھی جائے۔ جبکہ ہمارے قول کی تائید اگلے جملہ ورکعتین بعد العشاء فی بیتہ سے ہوتی ہے۔

''کان یصلی رکعتین خفیفتین'' امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض علماء کا مسلک یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ فجر کی سنتوں میں قراءت نہیں کرتے تھے، بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ صرف سورۃ الفاتحہ پڑھتے تھے۔ پھر امام طحاوی نے ان دونوں قولوں کے بطلان پر احادیث پیش کیں۔ جن میں سے ایک روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم سورۂ فاتحہ کے بعد ''قل یایھا الکفرون'' اور سورۃ الاخلاص پڑھتے تھے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ پہلی رکعت میں ''قولوا امنا باللّٰہ وما انزل الینا'' اور دوسری رکعت میں ''وقولوا آمنا باللّٰہ'' سے لے کر ''ونحن لہ مسلمون'' تک پڑھتے تھے۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ دوسری رکعت میں ''ربنا آمنا بما انزلت واتبعنا الرسول فاکتبنا مع الشاھدین'' پڑھتے تھے۔ مسلم شریف کی ایک روایت میں آیا ہے کہ دوسری رکعت میں ''قل یا أھل الکتاب'' سے پڑھتے تھے۔

علامہ جزری فرماتے ہیں ان دونوں سورتوں کو پڑھنے میں حکمت یہ ہے کہ یہ سورتیں اللہ تعالیٰ کی عبادت وتوحید، کافروں کی

تردیداور بتوں کی نفی پر مشتمل ہیں، ان مضامین سے صبح کرنے سے فرشتے اس کے ایمان کی گواہی دیں گے۔نوفل اشجعیؓ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "قل یا ایھا الکفرون" پڑھو پھر اس کے مکمل ہونے پر سو جاؤ۔ یہ شرک سے براءت کی علامت ہوگی۔مذکورہ دو آیات بھی توحید اور ایمان کے مضامین پر مشتمل ہیں۔

فجر کی سنتوں میں تخفیف کی وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین تہائی یا اس سے بھی زیادہ رات کو قیام فرماتے تھے۔پس فرض نماز کے نشاط کیلئے تخفیف کی ضرورت تھی۔

نماز جمعہ کے بعد گھر میں دو رکعت پڑھ لے

۱۱۶۱: وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايُصَلِّيْ بَعْدَ الْجُمُعَةِ حَتّٰى يَنْصَرِفَ فَيُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ فِيْ بَيْتِهٖ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲ حدیث رقم ۹۳۷۔ومسلم ۲/ ۶۰۰ حدیث رقم (۷۱۔۸۸۲) والنسائی فی السنن ۳/ ۱۱۳ حدیث رقم ۱۴۲۷۔ومالك فی الموطأ ۱/ ۱۶۶ حدیث رقم ۶۹۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز جمعہ کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے یہاں تک کہ آپ واپس تشریف لے آتے اور اپنے گھر میں دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔(بخاری،مسلم)

تشریح: "حتی ینصرف فیصلی" علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔کہ اس کا من حیث الجملہ ینصرف پر عطف ہے۔یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے بعد گھر جا کر دو رکعات نماز پڑھتے تھے۔اس کو کا صرف ینصرف پر عطف ڈال کر منصوب ماننا درست نہیں کیونکہ اس صورت میں لازم آئے گا کہ دو رکعات کے بعد نماز پڑھتے تھے۔ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

"رکعتین" ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد جمعہ کی سنتیں ہیں۔

صحیح احادیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد چار رکعات نماز پڑھتے تھے۔ایک روایت میں جمعہ کے بعد چھ رکعات کا ذکر ہے۔امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفل نماز کی تعداد

۱۱۶۲: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ شَقِيْقٍ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ عَنْ صَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ تَطَوُّعِهٖ فَقَالَتْ كَانَ يُصَلِّيْ فِيْ بَيْتِيْ قَبْلَ الظُّهْرِ اَرْبَعًا ثُمَّ يَخْرُجُ فَيُصَلِّيْ بِالنَّاسِ ثُمَّ يَدْخُلُ فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ وَكَانَ يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ الْمَغْرِبَ ثُمَّ يَدْخُلُ بَيْتِيْ فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ وَكَانَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ تِسْعَ رَكْعَاتٍ فِيْهِنَّ الْوِتْرُ وَكَانَ يُصَلِّيْ لَيْلاً طَوِيْلاً قَائِمًا وَلَيْلاً طَوِيْلاً قَاعِدًا وَكَانَ اِذَا قَرَأَ وَهُوَ قَائِمٌ رَكَعَ وَسَجَدَ وَهُوَ قَاعِدٌ وَكَانَ اِذَاطَلَعَ الْفَجْرُ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ (رواہ مسلم ورواہ ابوداود)

ثُمَّ يَخْرُجُ فَيُصَلِّيْ بِالنَّاسِ صَلَاةَ الْفَجْرِ۔ (متفق علیه)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/ ٥٠٤ حديث رقم (١٠٥ ـ ٧٣٠)۔وأبو داوٗد في السنن ٢/ ٤٣ حديث رقم ١٢٥١۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن شقیق سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھتے تھے پھر مسجد میں تشریف لے جاتے وہاں لوگوں کو جماعت کی نماز پڑھاتے پھر میرے گھر تشریف لاتے اور دو رکعت نماز پڑھتے۔اسی طرح مغرب کی نماز مسجد میں لوگوں کو پڑھاتے پھر میرے گھر تشریف لا کر دو رکعت نماز پڑھتے اور عشاء کی نماز لوگوں کے ساتھ مسجد میں پڑھتے پھر میرے گھر تشریف لا کر دو رکعت نماز پڑھتے پھر صلوۃ اللیل یعنی تہجد کی نماز نو رکعت پڑھتے تھے ان میں وتر کی نماز شامل ہوتی تھی اور رات میں دیر تک کھڑے ہو کر اور دیر تک بیٹھ کر دونوں حالتوں میں نماز پڑھا کرتے تھے جب آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تو کھڑے کھڑے رکوع اور سجدہ میں چلے جایا کرتے تھے اور جب بیٹھ کر نماز پڑھتے اسی حالت میں رکوع اور سجدہ میں چلے جایا کرتے تھے اور جب فجر طلوع ہو جاتی تو فجر کی دو سنتیں پڑھتے تھے۔(مسلم) امام ابوداؤد نے یہ الفاظ زیادہ نقل کیے ہیں کہ فجر کی دو سنتیں پڑھنے کے بعد مسجد میں تشریف لے جاتے اور لوگوں کو فجر کی نماز پڑھاتے تھے۔(بخاری،مسلم)

تشریح: ''وعن عبداللّٰہ بن شقیق'' تابعی ہیں۔

''عن تطوعه'' یہ ''صلاة رسول الله ﷺ'' سے بدل ہے۔صحیح مسلم میں بھی یہ عبارت اسی طرح ہے۔جبکہ مصابیح میں یہ عبارت ''من تطوعه'' ہے۔مصابیح کی عبارت کو عمدہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔البتہ اس صورت میں من کو بیانیہ قرار دیا جائے گا۔

''في بيتي قبل الظهر اربعا'' یہ ہمارے مختار مذہب کی دلیل ہے کہ ظہر سے پہلے چار رکعات سنت مؤکدہ ہیں۔اس حدیث میں عصر کی چار سنتوں کا ذکر اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ سنن مؤکدہ میں سے نہیں۔

''يدخل بيتي فيصلي ركعتين'' ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سنتوں کو گھر میں ادا کرنا مستحب ہے۔ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ سنتیں لوگوں کے سامنے پڑھی جائیں تا کہ دوسرے لوگوں کو بھی رغبت ہو۔البتہ سنت کی متابعت ہی اولیٰ ہے۔

''تسع ركعات'' ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نو رکعات پڑھتے تھے، کبھی گیارہ اور کبھی اس سے بھی کم کر دیتے ہیں۔مسلم شریف میں تیرہ رکعات کا بھی ذکر ہے۔

''فيهن الوتر'' ابن ملک فرماتے ہیں وتر اور تہجد برابر ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ وتر تہجد کے علاوہ ہیں۔اگر کسی آدمی نے تیرہ رکعات سے زیادہ پڑھا تو کیا تمام رکعات وتر ہوں گی۔یا ایک رکعت وتر ہوگی اور باقی تہجد؟ تو احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ تمام رکعات وتر ہوں گی، تہجد کی نماز غیر وتر صرف اس وقت ہوگی جب کسی نے پہلے وتر پڑھ لئے پھر سو گیا اور پھر اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھی۔اس صورت میں یہ تہجد کی نماز ہوگی۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہمارے مذہب کے خلاف ہے کیونکہ وتر غیر تہجد ہے کیونکہ وتر تو ایک سلام کے ساتھ تین رکعات پڑھنے کا نام ہے اور اس کا وقت بھی وہی ہے جو عشاء کا ہے۔البتہ رات کے آخری حصہ میں پڑھنا مستحب ہے اس شخص کیلئے جسے

جاگ جانے کا یقین ہو۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''اجعلوا آخر صلاتکم باللیل وترا''۔

''اپنی رات کی آخری نماز وتر کو بناؤ''۔

جہاں تک تہجد کا معاملہ ہے تو وہ بالا تفاق سنت ہیں۔ یہ مطلق طور پر رات کے آخری حصہ کے ساتھ یا سو کر اٹھنے کے بعد کے وقت کے ساتھ خاص ہیں۔ اس کی احادیث کا ذکر آگے آرہا ہے۔

''کان یصلی لیلاً طویلاً قاعداً ولیلا طویلاً قاعدًا'' مصابیح میں اس جملہ کے دو معنی مذکور ہیں:

① زیادہ قیام قعود والی نمازیں پڑھتے تھے۔

② لمبی لمبی رکعت والی نمازیں اس طرح پڑھتے تھے کہ بعض مرتبہ قیام لمبا ہوتا تھا اور بعض اوقات تھوڑا لمبا ہوتا تھا۔

''وکان اذا قرأ وهو قائم رکع وسجد وهو قائم'' ابن حجر رحمہ اللہ نے اس جملہ کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ رکوع سے پہلے بیٹھتے نہ تھے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ اس جملہ کی شرح میں فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ قیام سے رکوع وسجود کی طرف جاتے تھے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض علماء کا مسلک یہ ہے کہ جس شخص نے نماز بیٹھ کر شروع کی ہو اس کیلئے کھڑے ہو کر رکوع کرنا مکروہ ہے۔ کچھ دوسرے علماء نے اس کو مکروہ نہیں سمجھا کیونکہ یہ افضل کی طرف انتقال ہے۔

دوسرے فریق کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت ہے:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو آخر عمر تک کبھی تہجد کی نماز بیٹھ کر پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا، آپ بیٹھ کر قراءت کرتے اور جب رکوع کرنے کا ارادہ فرماتے تو کھڑے ہوتے اور تیس یا چالیس آیات پڑھتے پھر رکوع فرماتے''۔

اس روایت سے کھڑے ہو کر رکوع کرنا معلوم ہوتا ہے اور جن روایات میں بیٹھ کر رکوع کرنے کا ذکر آیا ہے وہ اس کے منافی نہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کسی حال میں کھڑے ہو کر رکوع فرماتے تھے اور کبھی بیٹھ کر ہی رکوع فرما لیتے ہوں گے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔

''وزاد ابو داؤد'' میرک فرماتے ہیں کہ اس عبارت میں شیخ محی الدین پر ہونے والے ایک اعتراض کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اس جملہ کو حدیث عائشہ میں ذکر کیا حالانکہ صحیحین میں سے کسی ایک میں بھی یہ جملہ موجود نہیں۔

فجر کی سنتوں کی تاکید

۱۱۶۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى شَيْءٍ مِنَ النَّوَافِلِ اَشَدَّ تَعَاهُدًا مِنْهُ عَلٰى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ۔ (متفق علیه)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۵۰۱ حدیث رقم (۹۵۔۷۲۴)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نوافل پڑھنے میں کسی اور نفل کی اتنی حفاظت

نہیں کرتے تھے جتنی کہ فجر کی دوسنتوں کو پڑھنے کی حفاظت کرتے تھے۔(بخاری، مسلم)

تشریح: ''علی رکعتی الفجر'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کا قول ''علی'' ان کے قول ''معاهدا'' سے متعلق ہے اور تمیز کے معمول کو مقدم کرنا جائز ہے۔''أشد تعاهدًا'' حال یا فعل مطلق ہے۔اس تاویل کے ساتھ کہ تعاهدا، متعاهدا کے معنی میں ہو۔اس صورت میں ''رکعتی الفجر'' ''تعاهدا'' کے ساتھ متعلق ہوگا۔

ایک روایت میں آتا ہے۔''میں نے رسول اللہ ﷺ کو کسی نیکی یا کسی غنیمت کی طرف صبح کی دو رکعتوں سے بڑھ کر لپکتے ہوئے نہیں دیکھا''۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے۔جس سے اللہ تعالیٰ مجھے فائدہ عطا فرمائیں۔حضور ﷺ نے فرمایا صبح کی دو رکعتوں کو ضرور پڑھا کر یہ بڑی فضیلت کی چیز ہیں۔(رواہ الطبرانی فی الکبیر)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ہی ایک روایت منقول ہے،فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ''تم فجر کی نماز سے پہلے دو رکعتوں کو نہ چھوڑو کیونکہ اس میں بہت سی رغبت کی چیزیں ہیں''۔

فجر کی سنتیں دُنیا و مافیہا سے بہتر ہیں

۱۱۶۴:وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَكْعَتَا الْفَجْرِ خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا۔ (رواه مسلم)

أخرجه الترمذي في السنن ۲/ ۲۷۵ حديث رقم ۴۱۶۔وأحمد في المسند ۶/ ۵۰۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فجر کی دوسنتیں دنیا اور دنیا کے ساز و سامان سے بہتر ہیں۔(مسلم)

تشریح: ''خير من الدنيا وما فيها'' اس سے دنیا کی مال و جاہ مراد ہے،بندوں سے صادر ہونے والے اعمال صالحہ مراد نہیں ہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر دنیا سے مراد اس کی اعراض اور زیب و زینت مراد ہو تو خیر میں دو معانی کا احتمال ہے:

① خیر سے مراد ہر وہ چیز ہوگی جس کا کرنے والا اسے خیر سمجھتا ہو۔

② یہ ''ای الفريقين خير مقاما'' کی قبیل سے ہوگا۔

اگر اس سے مراد اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا ہو تو یہ دو رکعتیں اس سے بہتر ہوں گی۔

مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے ''یہ دو رکعتیں مجھے دنیا و مافیہا سے محبوب ہیں''۔مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے ''فرائض کے بعد سب افضل نماز رات کی نماز ہے اور یہ مطلق ہے سب رات کے نوافل اس میں شامل ہیں جس میں فجر کی دو سنتیں بھی ہیں۔

مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعتوں کا حکم

۱۱۶۵: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلُّوْا قَبْلَ صَلٰوةِ الْمَغْرِبِ رَكْعَتَيْنِ صَلُّوْا قَبْلَ صَلٰوةِ الْمَغْرِبِ رَكْعَتَيْنِ قَالَ فِی الثَّالِثَةِ لِمَنْ شَاءَ كَرَاهِيَةَ اَنْ يَّتَّخِذَ هَا النَّاسُ سُنَّةً۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۱۱۰/۲ حديث رقم ۶۲۷۔ومسلم فی صحيحة ۵۷۳/۱ حديث رقم (۳۰۴۔۸۳۸) وأبوداؤد فی السنن ۵۹/۲ حديث رقم ۱۲۸۱۔ والترمذی ۳۵۱/۱ حديث رقم ۱۸۵۔وابن ماجه ۳۶۸/۱ حديث رقم ۱۱۶۲۔وأحمد فی المسند ۵۵/۵۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت نفل پڑھو اور آپ نے یہ الفاظ دو مرتبہ ارشاد فرمائے اور تیسری مرتبہ ارشاد فرمایا جو چاہے پڑھ لے اور یہ وضاحت آپ نے اس لئے کی تاکہ لوگ اس نماز کو سنت نہ بنالیں۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''صلوا قبل صلاۃ المغرب'' محی الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس روایت سے غروب آفتاب اور مغرب کی نماز کے درمیان دو رکعات کا استحباب معلوم ہوتا ہے یا اذان اور اقامت کے درمیان دو رکعات کا استحباب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حدیث میں آتا ہے۔ ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔

اس بارے میں دو قول ہیں: ① یہ رکعات مستحب نہیں۔ (مشہور قول یہی ہے)۔ ② دوسرا قول وہی ہے کہ یہ مستحب ہیں بعض صحابہ، تابعین، امام احمد اور امام اسحاق وغیرہ کا یہی مسلک ہے۔ خلفاء راشدین، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور اکثر فقہاء نے اسے مستحب نہیں سمجھا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی کہ اس کی وجہ سے مغرب کے اول وقت میں تاخیر لازم آتی ہے۔

''قال فی الثالثة لمن شاء'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث کے اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات (اوامر) وجوب کیلئے ہوتے ہیں الا یہ کہ اس کے غیر پر کوئی دلیل قائم ہو۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صلّوا، امر تھا اور اس سے وجوب معلوم ہوتا تھا اور جب اسے لوگوں کی مشیت پر چھوڑ دیا گیا تو اس نے محض مندوب ہونے کا فائدہ دیا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ مغرب سے پہلے دو رکعات نماز پڑھنا اول اسلام میں تھا تاکہ لوگوں کو ممنوع وقت کے نکل جانے کا یقین ہو جائے، پھر مغرب کو تعجیل کے ساتھ پڑھنے کا حکم دے دیا گیا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مغرب سے پہلے کی دو رکعتوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کسی کو یہ نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ابراہیم نخعی رحمہ اللہ انہیں بدعت قرار دیتے تھے۔

صحیح ابن حبان میں جو روایت آتی ہے کہ نبی کریم ﷺ یہ دو رکعات پڑھا کرتے تھے تو اس حدیث کو اوّل اسلام یا بیان جواز یا خصائص پر محمول کیا جائے گا۔

صحیحین کی روایت بین کل اذانین صلاۃ مطلق ہے اور اسے مغرب کے علاوہ باقی نمازوں کیلئے مقید کیا جانا چاہیے۔

درحقیقت یہ اختلاف لفظی ہے کیونکہ اس کے ثبوت کی روایات کا تعلق اول اسلام اور نفی کی روایات کا تعلق آخر کے ساتھ ہے۔

اس مقام کا تحقیقی اور تفصیلی مطالعہ کرنے کیلئے ابن الہمام کی فتح القدیر کا مطالعہ فرمائیں۔

جمعہ کے بعد چار رکعتیں

۱۱۶۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُصَلِّيًا بَعْدَ الْجُمُعَةِ فَلْيُصَلِّ اَرْبَعًا (رواه مسلم) وَفِیْ اُخْرٰی لَهٗ قَالَ اِذَا صَلّٰی اَحَدُكُمُ الْجُمُعَةَ فَلْيُصَلِّ بَعْدَهَا اَرْبَعًا۔

أخرجه مسلم في صحيحه ۲/۶۰۰ حديث رقم (۱۷۔۸۸۱)۔وأبوداوٗد في السنن ۱/۱۷۳ حديث رقم۔ والترمذي في السنن ۲/۳۹۹ حديث رقم ۵۲۳۔وأحمد في المسند ۲/۴۹۹۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جو آدمی جمعہ کی فرض نماز کے بعد نماز پڑھے اسے چاہئے کہ وہ چار رکعت پڑھے (مسلم) اور مسلم ہی کی ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی جمعہ کی نماز پڑھے تو اسے چاہئے کہ اس کے بعد چار رکعت سنت بھی پڑھے۔

تشریح: ''اذا صلی احدکم الجمعة فلیصل بعدها أربعًا'' ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے بعد چار رکعات سنت ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے چھ رکعات کو سنت قرار دیا، اس طرح وہ دونوں طرح کی احادیث پر عمل کرتے ہیں۔ نیز حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جو شخص جمعہ کے بعد نماز پڑھے تو چھ رکعات پڑھے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا مختار مسلک بھی یہی ہے۔

اس حدیث کے مفہوم سے بعض شافعیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ جمعہ سے پہلے کوئی نماز مسنون نہیں ہے۔ حتی کہ بعض حضرات نے اسے بدعت قرار دیا ہے۔ حالانکہ حافظ عراقی نے صحیح اسناد سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے پہلے چار رکعات پڑھا کرتے تھے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا عمل نقل کیا ہے کہ وہ جمعہ سے پہلے اور بعد میں چار چار رکعات پڑھا کرتے تھے۔

الفصل الثانی:

ظہر سے قبل اور بعد میں چار رکعتوں کا حکم

۱۱۶۷: عَنْ اُمِّ حَبِيْبَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ حَافَظَ عَلٰی اَرْبَعِ رَكْعَاتٍ قَبْلَ الظُّهْرِ وَاَرْبَعٍ بَعْدَهَا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَی النَّارِ۔

(رواه احمد والترمذی وابوداود والنسائی وابن ماجة)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۲/۵۲ حديث رقم ۱۲۶۹۔والترمذي ۲/۲۹۲ حديث رقم ۴۲۷۔والنسائي ۳/۲۶۵ حديث رقم ۱۸۱۵۔وأحمد في المسند ۶/۳۲۶۔

ترجمہ: حضرت ام حبیبہؓ سے روایت ہے ~~وہ فرماتی ہیں~~ کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو آدمی

نماز ظہر سے پہلے چار رکعت اور نماز ظہر کے بعد چار رکعت کی حفاظت کرتا ہے تو اللہ اس پر جہنم کی آگ کو حرام کر دیتا ہے۔(احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: بعد کی چار رکعتوں میں دو سنت مؤکدہ اور دو مستحب ہیں، ان کو دو سلاموں کے ساتھ پڑھنا مستحب ہے جبکہ پہلی چار رکعات کو ایک سلام سے۔

ظہر سے پہلے چار رکعتوں کی فضیلت

۱۱۶۸: وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ قَبْلَ الظُّھْرِ لَیْسَ فِیْھِنَّ تَسْلِیْمٌ تُفْتَحُ لَھُنَّ اَبْوَابُ السَّمَاءِ۔ (رواہ ابوداود وابن ماجۃ)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۲/۵۳ حدیث رقم ۱۲۷۰۔

ترجمہ: حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے ظہر کی نماز سے پہلے ایک سلام کے ساتھ چار رکعتیں پڑھیں اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔(ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: ''لیس فیھن تسلیم'' اس جملہ کی شرح میں ابن ملک فرماتے ہیں کہ ایک سلام کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ ان چار رکعات میں یہی افضل ہے۔

''تفتح'' اس کو مذکر و مونث اور مخفف و مشدد پڑھنا درست ہے۔

''لھن ابواب السماء'' یہ قبولیت سے کنایہ ہے۔

طبرانی نے معجم الکبیر اور معجم الاوسط میں اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ نقل فرمایا ہے کہ جب سورج ڈھل ہو جاتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اور ظہر کی نماز تک ان میں سے ایک دروازہ بھی بند نہیں ہوتا۔ پس میں چاہتا ہوں کہ اس وقت میں میری بھی کوئی نیکی آسمان کی طرف اٹھالی جائے۔

شرح السنۃ میں مذکور ہے کہ دن کی سنتوں کے بارے میں اختلاف ہے بعض کا خیال یہ ہے کہ رات کے نوافل کی طرح یہ بھی دو دو ہیں۔ جبکہ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ یہ چار ہی مستحب ہیں۔ امام ابویوسف امام محمد اور امام ابوحنیفہ کا یہی مسلک ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اختلاف تو وہاں ہونا چاہیے جہاں ایک یا دو سلام اور دو یا چار رکعات کی تعیین وارد نہ ہوئی ہو۔ واللہ اعلم۔

صلوٰۃ زوال کی فضیلت

۱۱۶۹: وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ السَّائِبِ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یُصَلِّیْ اَرْبَعًا بَعْدَ اَنْ تَزُوْلَ الشَّمْسُ قَبْلَ الظُّھْرِ وَقَالَ اِنَّھَا سَاعَۃٌ تُفْتَحُ فِیْھَا اَبْوَابُ السَّمَاءِ فَاُحِبُّ اَنْ یَّصْعَدَ لِیْ فِیْھَا عَمَلٌ صَالِحٌ۔(رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/۳۴۲ حدیث رقم ۴۷۸۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سائب سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز ظہر سے پہلے زوال کے بعد چار رکعت نماز پڑھتے تھے اور فرمایا کہ یہ ایسی گھڑی ہے کہ اس میں آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں لہٰذا میں پسند کرتا ہوں کہ اس وقت میں میرا اچھا عمل آسمان کی طرف چڑھ جائے۔ (ترمذی)

تشریح: ”یصلی اربعا بعد ان تزول الشمس قبل الظهر“ ہمارے بعض علماء نے اس کی یہ شرح بیان کی کہ اس سے مراد ظہر سے پہلے کی چار سنتیں ہیں۔ اس تشریح سے ان حضرات کی تردید کرنا مقصود ہے جن کا کہنا یہ ہے کہ اس حدیث میں ذکر کردہ نماز ظہر کی چار سنتیں نہیں بلکہ سنت الزوال مراد ہیں۔

”ان یصعدلی فیها عمل صالح“ اس میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف تلمیح ہے:

”الیه یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعه“

نمازِ عصر سے پہلے چار رکعت کا بیان

۱۱۷۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَحِمَ اللّٰهُ اِمْرَأً صَلّٰى قَبْلَ الْعَصْرِ اَرْبَعًا۔

(رواه احمد والترمذی وابوداود)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۲/۵۳ حدیث رقم ۱۲۷۱۔ والترمذی ۲/۲۹۵ حدیث قم ۴۳۰۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحمت نازل فرمائے جو نمازِ عصر سے پہلے چار رکعت نماز پڑھے۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد)

تشریح: ”رحم الله امراء“ ابن ملک نے فرمایا کہ یہ جملہ دعا بھی بن سکتا ہے اور خبر بھی۔ دوسرا احتمال زیادہ راجح ہے۔ لیکن حضور ﷺ کی دعا کی قبولیت اتنی یقینی ہے کہ خبر کے معنیٰ کو بھی شامل ہے۔

”صلی قبل العصر اربعا“ اس سے مراد عصر کی سنت غیر مؤکدہ ہیں۔

۱۱۷۱: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّيْ قَبْلَ الْعَصْرِ اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ يَفْصِلُ بَيْنَهُنَّ بِالتَّسْلِيْمِ عَلَى الْمَلَائِكَةِ الْمُقَرَّبِيْنَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُؤْمِنِيْنَ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/۴۹۳ حدیث رقم ۵۹۸۔ والنسائی ۲/۱۱۹ حدیث رقم ۸۷۴۔ وابن ماجه ۱/۳۶۷ حدیث رقم ۱۱۶۱۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نمازِ عصر سے پہلے چار رکعت نماز پڑھتے تھے اور ان چار رکعت کے درمیان۔ مقرب فرشتوں اور ان کی اتباع کرنے والے مسلمانوں اور مومنوں پر سلام بھیجنے کے ساتھ فصل کرتے تھے۔ (ترمذی)

تشریح: ”من تبعهم من المسلمین والمؤمنین“ مسلمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ظاہرًا و باطنًا اسلام کو اختیار کرنے والے ہیں اور مؤمنین سے مراد وہ لوگ جو دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کرنے والے ہیں، لغت کے مفہوم کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ شریعت کے عرف میں ان میں فرق ہے۔

"یفصل بینھن بالتسلیم" علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں تسلیم سے مراد اسلام نہیں بلکہ تشہد ہے۔ ابن ملک کی بھی یہی رائے ہے اور علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مراد کی تائید حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات سے اختلاف کیا ہے اور انہی کا قول زیادہ مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حدیث کا سیاق وسباق اس معنی کو تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ سنت یہ ہے کہ آدمی سلام پھیرتے وقت اپنے دائیں، بائیں اور پیچھے کے فرشتوں اور مومن انسان وجنات کی نیت کرے۔ حدیث میں بھی اسی کا ذکر ہے۔

البتہ پہلی توجیہہ مذہب حنفیہ کے زیادہ مناسب ہے۔ واضح رہے کہ ایک یا دو سلاموں سے چار سنتیں پڑھنے کا اختلاف اولویت میں ہے جواز میں نہیں ہے۔ انہی روایات کے اختلاف کی وجہ سے امام محمد بن الحسن اور علامہ قدوری نے اس بارے میں اختیار دیا ہے کہ چاہے تو عصر سے پہلے چار رکعات پڑھ لے چاہے تو دو پڑھ لے۔

نمازِ عصر سے پہلے دو رکعتوں کا بیان

۱۱۷۲: وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ قَبْلَ الْعَصْرِ رَكْعَتَيْنِ۔

(رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن حديث رقم ۱۲۷۲۔

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز سے پہلے دو رکعتیں نماز پڑھتے تھے۔ (ابوداؤد)

نمازِ مغرب کے بعد چھ رکعتوں کا بیان

۱۱۷۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى بَعْدَ الْمَغْرِبِ سِتَّ رَكْعَاتٍ لَمْ يَتَكَلَّمْ فِيْمَا بَيْنَهُنَّ بِسُوْءٍ عُدِلْنَ لَهٗ بِعِبَادَةِ ثِنْتَيْ عَشَرَةَ سَنَةً (رواہ الترمذی) وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ لَانَعْرِفُهٗ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ عُمَرَ بْنِ اَبِيْ خَثْعَمٍ وَسَمِعْتُ مُحَمَّدَ بْنَ اِسْمَاعِيْلَ يَقُوْلُ هُوَ مُنْكَرُ الْحَدِيْثِ وَضَعَّفَهٗ جِدًّا)۔

أخرجه الترمذي في السنن ۲۹۹/۲ حديث رقم ٤۳٥۔ وابن ماجه ٤۳۷/۱ حديث رقم ۱۳۷۳۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی نمازِ مغرب کے بعد چھ رکعت نماز پڑھے اور ان کے درمیان فحش گفتگو نہ کرے تو ان کا ثواب بارہ سال کی عبادت کے برابر ہوگا۔ (ترمذی) اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے کیونکہ ہم اس حدیث کو سوائے عمر بن ابی خثعم کے کسی اور سند سے نہیں جانتے اور میں نے امام محمد بن اسماعیل بخاری سے سنا ہے وہ فرماتے ہیں کہ عمر بن ابی خثعم منکر الحدیث ہے اور انہوں نے اس حدیث کو بہت ضعیف قرار دیا ہے

تشریح: ''ست رکعات'' مفہوم یہی ہوتا ہے کہ دو سنت مؤکدہ ان چھ میں داخل ہیں، اگلی روایت میں ذکر کردہ بیس رکعات کے بارے میں بھی علماء کا یہی قول ہے۔ البتہ ان دو رکعات کو ایک سلام کے ساتھ پڑھے گا باقی کے بارے میں اسے اختیار ہے۔

''عدلن له، بعبادة ثنتی عشرة سنة'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ترغیب وتحریض کے باب سے ہے۔ غیر معروف کو معروف پر افضلیت دینا جائز ہے خواہ وہ معروف افضل ہی کیوں نہ ہو۔ علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ قلیل کا ثواب کثیر کے ثواب سے کئی گنا بڑھا دیا جائے۔ قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس وقت اور حال میں قلیل عمل کثیر عمل سے کئی گناہ زیادہ ہوتا ہے۔

ابن ملک نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اس نماز کو صلاۃ الاوّابین کہتے ہیں۔ اس حدیث کے بارے میں علامہ میرک فرماتے ہیں کہ عجیب بات ہے کہ محی السنۃ نے اس حدیث کو ذکر کیا اور اس پر سکوت اختیار کیا حالانکہ محدثین کے اجماع کے ساتھ یہ حدیث ضعیف ہے؟ میں کہتا ہوں کہ ابن خزیمہ نے اسے اپنی صحیح میں ذکر کیا۔ نیز فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے بارے میں محدثین کا اتفاق ہے۔

محمد عمار بن یاسر فرماتے ہیں کہ میں نے عمار بن یاسر کو دیکھا کہ وہ مغرب کے بعد چھ رکعت پڑھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں نے اپنے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کے چھ رکعات پڑھتے دیکھا ہے۔ اور آپ نے فرمایا:

''جو شخص مغرب کے بعد چھ رکعت پڑھے اس کے سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں خواہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں''۔

نمازِ مغرب کے بعد بیس رکعتوں کی فضیلت

۱۱۷۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلّٰى بَعْدَ الْمَغْرِبِ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً بَنَى اللّٰهُ لَهٗ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲۹۹/۲ حديث رقم ۴۳۵۔ وابن ماجه ۴۳۷/۱ حديث رقم ۱۳۷۳۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی مغرب کی نماز کے بعد بیس رکعتیں پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بناتے ہیں۔ (ترمذی)

تشریح: ''عشرین رکعة'' مغرب کی نماز کے بعد دو سے لے کر بیس رکعات تک پڑھنے کا ذکر احادیث میں آیا ہے۔ اس کے حل کی صورت میں یہ ہے کہ مغرب کے بعد کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ بیس رکعات پڑھنا منقول ہے۔

نمازِ عشاء کے بعد کی سنتوں کا بیان

۱۱۷۵: وَعَنْهَا قَالَتْ مَا صَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِشَاءَ قَطُّ فَدَخَلَ عَلَيَّ اِلَّا صَلّٰى اَرْبَعَ رَكَعَاتٍ اَوْ سِتَّ رَكَعَاتٍ ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ۲/۷۱ حديث رقم ۱۳۰۳۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی مسجد میں عشاء کی نماز پڑھ کر میرے پاس تشریف لاتے تو چار رکعت یا چھ رکعت نماز ضرور پڑھتے تھے۔ (ابوداؤد)

تشریح: ''الاصلّی اربع رکعات اؤست رکعات'' اس جملہ میں شک کا بھی احتمال ہے کہ حضرت عائشہ نے چار رکعات کا ذکر فرمایا یا چھ کا۔ اور تنویع کا احتمال بھی ہے کہ آپ کبھی چار رکعات پڑھتے کبھی چھ۔ اس صورت میں دو رکعات سنت، دو مستحب اور دو زائد نوافل شمار ہوں گی۔

فجر اور مغرب کی سنتوں کا بیان

۱۱۷۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ الرَّكْعَتَانِ قَبْلَ الْفَجْرِ وَاِدْبَارَ السُّجُوْدِ الرَّكْعَتَانِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ۵/۳٦٦ حديث رقم ۳۲۷۵۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ادبار نجوم سے مراد فجر کی دو رکعتیں ہیں جو نماز فجر سے پہلے پڑھی جاتی ہیں۔ اور ادبار سجود سے مراد مغرب کے بعد کی دو رکعتیں ہیں۔ (ترمذی)

تشریح: ''ادبار النجوم'' اس کی ترکیبی کیفیت میں دو احتمال ہیں:

① راء منصوب ہے، اس صورت میں یہ قرآن مجید کی اس آیت سے حکایت ہوگی اور اعراب حکائی ہوگا:

''وسبح بحمد ربك حين تقوم ومن الليل فسبحه وادبار النجوم''

② راء مرفوع ہے۔ اس میں یہ مبتدا ہوگا اور اس کی خبر اگلا جملہ ''الرکعتان قبل الفجر'' ہوگا۔

''وادبار السجود'' یہ ہمزہ کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ پڑھنا جائز ہے، اس آیت میں یہ دونوں قراءتیں متواتر ہیں:

''ومن الليل فسبحه وأدبار السجود''

ادبار النجوم کی نماز سے مراد فجر کی دو سنتیں اور أدبار السجود سے مراد مغرب کی فرض نماز ہے۔

ابن ملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں لفظ سجود بول کر پوری نماز مراد ہے کیونکہ جزء اعظم سے کل مراد لیا جا سکتا ہے۔

الفصل الثّالث:

ظہر سے قبل چار رکعت کا بیان

۱۱۷۷: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اَرْبَعٌ قَبْلَ الظُّهْرِ بَعْدَ الزَّوَالِ تُحْسَبُ بِمِثْلِهِنَّ فِيْ صَلَاةِ السَّحَرِ وَمَا مِنْ شَيْءٍ اِلَّا وَهُوَ يُسَبِّحُ اللّٰهَ تِلْكَ السَّاعَةَ ثُمَّ قَرَأَ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ

الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِلّٰهِ وَهُمْ دَاخِرُوْنَ - (رواه الترمذي والبيهقي في شعب الايمان)

أخرجه الترمذي في السنن ۵/۲۷۹ حديث رقم ۳۱۲۸۔ والبيهقي في شعب الايمان۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ نے فرمایا کہ ظہر سے پہلے زوال کے بعد چار رکعت نماز تہجد کی چار رکعتوں کے برابر ہوتی ہیں اور یہ وہ وقت ہے کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرنے میں مصروف ہوتی ہیں۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت کی **یتفیأظلاله عن الیمین والشمائل سجد الله وهم داخرون**۔ ہر چیز کا سایہ دائیں اور بائیں اللہ کے لئے سجدہ کرنے میں مصروف ہوتا ہے اس حال میں کہ وہ حقیر ہے ہو۔ (ترمذیؒ، بیہقیؒ نے شعوب ایمان میں نقل کیا ہے)

تشریح: "**اربع قبل من الظهر بعد الزوال تحسب بمثلهن في صلاة السحر**" سورج کے زوال کے بعد ساری کائنات اللہ کے سامنے جھک جاتی ہے کیونکہ کائنات میں سب سے بڑی مخلوق سورج بھی بارگاہ الٰہی میں جھک جاتا ہے تو جس چیز پر اس کا سایہ پڑتا ہے وہ بھی اللہ کے سامنے جھک جاتی ہے۔

"**في صلاة السحر**" اس کی مراد میں علماء کے دو قول ہیں: ① تہجد کی نماز۔ ② فجر کی نماز۔

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے تہجد کی نماز مراد ہو لیکن اس صورت میں معنوی خرابی لازم آتی ہے وہ کہ تہجد کی نماز ظہر کی چار سنتوں سے زیادہ افضل نہیں حالانکہ مشبہ بہ کو مشبہ سے زیادہ قوی ہونا چاہیے اسی نکتہ کے پیش نظر محدثین نے اس سے مراد ظہر کی نماز لی ہے جو بہرحال ظہر کی چار سنتوں سے زیادہ افضل ہے۔

ظاہری معنی یعنی تہجد کی نماز مراد لینے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ تشبیہ مشقت کے اعتبار سے ہو کہ تہجد کی مشقت ظہر کی سنتوں کی مشقت سے بہت زیادہ ہے اس صورت میں مشبہ بہ مشبہ سے قوی ہو گا۔

"**وهو يسبح الله تلك الساعة**" بظاہر یہ جملہ ایک آیت سے متعارض ہے۔

"**وان من شيء الا يسبح بحمده**" ہر چیز اللہ کی تعریف کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ اوقات کی تعیین کے بغیر ہر چیز اللہ کی تسبیح میں لگی ہوئی ہے جبکہ حدیث میں تسبیح کو ایک خاص ساعت کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔

اس تعارض کو ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یوں حل فرمایا کہ اس وقت میں مخلوق ایک خاص قسم کی تسبیح و تنزیہ بیان کرتی ہے جو دوسرے اوقات میں نہیں کرتی۔

"**ثم قرأ**" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ حدیث میں ذکر کردہ آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"کیا لوگ نہیں دیکھتے کہ زوال کے وقت ہر سایہ دار چیز اللہ کے سامنے جھک جاتی اور اظہارِ عاجزی و بندگی کرتی ہے، سورج جو اس کائنات میں سب سے بڑی، اعلیٰ اور عظیم الشان مخلوق ہے وہ زوال کے وقت عاجز ہو کر اپنی بندگی کا اظہار کر بیٹھتا ہے۔ یہ خضوع و افتقار کا وقت تھا اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سحری کے وقت کے تشبیہ دی جو تجلی حق، غفلت خلق اور استغفار کا

وقت ہے''۔

عصر کی نماز کے بعد دو رکعت کا بیان

۱۱۷۸: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَا تَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ عِنْدِيْ قَطُّ (متفق علیه وفی روایة للبخاری) قَالَتْ وَالَّذِيْ ذَهَبَ بِهٖ مَا تَرَكَهُمَا حَتّٰى لَقِيَ اللّٰهَ۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ۶۴/۲ حدیث رقم ۵۹۱۔ومسلم فی صحیحه ۵۷۲/۱ حدیث رقم (۲۹۹۔۸۳۵)وأبوداوٗد فی السنن ۵۸/۲ حدیث رقم ۱۲۷۹۔والترمذی ۳۴۷/۱ حدیث رقم ۱۸۴۔والنسائی فی السنن ۲۸۰/۱ حدیث رقم ۵۷۴۔وأحمد فی المسند ۱۶۹/۶۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی میرے گھر عصر کے بعد کی دو رکعت نماز نہیں چھوڑی۔(بخاری)اور بخاری کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کی روح قبض کی آپ نے عصر کے بعد کی دو رکعتیں کبھی بھی نہیں چھوڑیں یہاں تک کہ آپ کا وصال ہوگیا۔

تشریح: ''ما ترك رسول اللّٰه ﷺ ركعتين بعد العصر'' علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ عبدالقیس کی قوم کے وفود آنے کے بعد کبھی یہ دو رکعتیں نہیں چھوڑیں۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ دو رکعات حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا نذر کی وجہ سے پڑھتے تھے یا آپ کی خصوصیات میں سے تھیں۔(دوسرے لوگوں کیلئے یہ ٹھیک نہیں)اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو سزا دی جو عصر کے بعد نفل میں مشغول ہوا جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

مغرب سے پہلے دو رکعتوں کا بیان

۱۱۷۹: وَعَنِ الْمُخْتَارِ بْنِ فُلْفُلٍ قَالَ سَأَلْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ عَنِ التَّطَوُّعِ بَعْدَ الْعَصْرِ فَقَالَ كَانَ عُمَرُ يَضْرِبُ الْاَيْدِيَ عَلٰى صَلَاةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ وَكُنَّا نُصَلِّيْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ غُرُوْبِ الشَّمْسِ قَبْلَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ فَقُلْتُ لَهٗ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْهِمَا قَالَ كَانَ يَرَانَا يُصَلِّيْهِمَا فَلَمْ يَأْمُرْنَا وَلَمْ يَنْهَنَا ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۵۷۳/۱ حدیث رقم (۳۰۲۔۸۳۶)۔

ترجمہ: مختار بن فلفل سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن حضرت انس رضی اللہ عنہ سے عصر کے بعد نفل نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا انہوں نے ارشاد فرمایا اس معاملہ میں امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رویہ اتنا شدید تھا کہ وہ عصر کے بعد نفل نماز کی نیت باندھنے پر ہاتھوں پر مارتے تھے یعنی سختی کے ساتھ منع کرتے تھے اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سورج غروب ہونے کے بعد اور نمازِ مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے یہ بات سن کر مختار کہتے ہیں کہ

میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس نماز کو پڑھتے تھے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ ہم یہ نماز پڑھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں دیکھتے تھے آپ نے نہ ہمیں کبھی حکم دیا اور نہ کبھی منع کیا۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

المختار بن فلفل۔ یہ مختار ہیں جو فلفل کے بیٹے ہیں۔ مخزومی و کوفی ہیں۔ انس بن مالک سے حدیث کی سماعت کی۔ ان سے ثوری وغیرہ نے روایت کی ہے "فلفل" میں دونوں فاء مضموم ہیں۔ واضح رہے کہ "فلفل" مرچ کو کہتے ہیں۔ لفظ "فلفل" جب مرچ کے معنی میں ہو تو دونوں فاء مضموم پڑھنے کے علاوہ مکسور بھی پڑھ سکتے ہیں۔ (قاموس)

تشریح: "عن المختار بن فلفل" بضمتین۔ مرچ کو بھی فلفل (بفحتین و کسرتین) کہتے ہیں۔

"کان عمر یضرب الأیدی علی صلاۃ بعد العصر" یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرماتے تھے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شاید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کا علم نہیں تھا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات درست نہیں اور یہ قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علمی کمال سے ناواقفیت کا شاخسانہ ہے یہ نماز وہی شخص پڑھتا ہے جسے تخصیص کا علم نہیں تھا۔

"رکعتین بعد غروب الشمس قبل صلاۃ المغرب" پہلے بھی یہ بات گذر چکی ہے کہ خلفاء راشدین ان رکعات کی مشروعیت کے قائل نہ تھے، ہمارے لئے ان کی اقتداء کافی ہے۔

"کان یرانا نصلیھما فلم یأمرنا ولم ینھنا" یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تقریر ہے۔ اکثر فقہاء نے ان سے منع کیا ہے کیونکہ اس سے مغرب کی نماز میں تاخیر لازم آتی ہے۔

ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ مغرب سے پہلے کی دو رکعات کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ان رکعات کا مستحب نہ ہونا تو ثابت ہے، البتہ ان کی کراہت ثابت نہیں، جہاں تک مغرب کی نماز میں تاخیر کی بات ہے تو تاخیر وقت قلیل کی صورت میں مکروہ نہیں اور دو رکعات کا وقت، وقت قلیل ہی ہوتا ہے"۔

۱۱۸۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كُنَّا بِالْمَدِيْنَةِ فَاِذَا اَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ لِصَلَاةِ الْمَغْرِبِ ابْتَدَرُوا السَّوَارِيَ فَرَكَعُوْا رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى اِنَّ الرَّجُلَ الْغَرِيْبَ لَيَدْخُلُ الْمَسْجِدَ فَيَحْسَبُ اَنَّ الصَّلَاةَ قَدْ صُلِّيَتْ مِنْ كَثْرَةِ مَنْ يُّصَلِّيْهَا۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۵۷۳ حدیث رقم (۳۰۳-۸۳۷)۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ مدینہ میں تھے جب مؤذن مغرب کی اذان دیتا اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مسجد کے ستونوں کی طرف سبقت کرتے اور دو رکعت نماز پڑھنے لگتے یہاں تک کہ اگر کوئی مسافر آدمی مسجد میں آجاتا تو لوگوں کو الگ الگ نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر وہ خیال کرتا کہ مغرب کی نماز ہو چکی ہے یعنی اس

کثرت سے لوگ ان دونوں رکعتوں کو پڑھتے تھے۔ (مسلم)

تشریح: "ابتدروا السواری" یعنی بعض صحابہ یا تابعین ستون تلاش کرتے تھے تاکہ انہیں سترہ بنا کر دو رکعات ادا کرسکیں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ان دو رکعتوں کے اثبات پر صریح دلیل موجود ہے۔

بلاشبہ یہ عمل نادر ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بالاجماع مغرب کی نماز جلدی پڑھاتے تھے جبکہ اس عمل سے مغرب میں تاخیر لازم آتی ہے حتی کہ بعض علماء کے نزدیک تو مغرب کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی ایک دن بعض لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کرلیا ہو کہ مغرب کی اذان سنتے ہی مسجد میں آگئے ہوں اور وہاں مغرب سے پہلے دو رکعات نماز نفل پڑھ لی ہو۔

اس کی سب سے بہتر تاویل یہ ہے کہ یہ نماز پہلے پڑھی جاتی تھی پھر اسے چھوڑ دیا گیا، خلفاء راشدین کا بھی یہی مسلک ہے۔

۱۱۸۱: وَعَنْ مَرْثَدِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ اَتَيْتُ عُقْبَةَ الْجُهَنِيَّ فَقُلْتُ اَلَا اُعَجِّبُكَ مِنْ اَبِيْ تَمِيْمٍ يَرْكَعُ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ فَقَالَ عُقْبَةُ اِنَّا كُنَّا نَفْعَلُهٗ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْتُ فَمَا يَمْنَعُكَ الْاٰنَ قَالَ الشُّغْلُ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٥٩/٣ حديث رقم ١١٨٤۔ وأحمد في المسند ١٥٥/٤۔

ترجمہ: حضرت مرثد بن عبداللہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عقبہ جہنی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے کہا کہ میں آپ کو ابوتمیم کا ایک عجیب کام بتاتا ہوں وہ یہ کہ ابوتمیم مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعت نماز پڑھتے ہیں۔ حضرت عقبہؓ نے فرمایا یہ نماز تو ہم بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پڑھا کرتے تھے میں نے ان سے عرض کیا کہ پھر یہ نماز پڑھنے سے آپ کو کس چیز نے روک دیا۔ انہوں نے فرمایا دنیا کی مصروفیت نے۔ (بخاری)

راویٔ حدیث:

مرثد بن عبداللہ۔ یہ "مرثد" ہیں "عبداللہ" کے بیٹے ہیں۔ "ابوالخیر" کنیت سے عزنی ومصری ہیں۔ عقبہ بن عامر، ابوایوب، عبد اللہ بن عمرو اور عمرو بن العاص سے حدیث کی سماعت کی ان سے یزید بن ابو حبیب نے روایت کی ہے۔ مرثد کے میم اور ثاء دونوں پر فتحہ ہے۔

تشریح: "من ابی تمیم" میرک فرماتے ہیں کہ ان کا پورا نام عبداللہ بن مالک بن ابی الاخم الجیشانی ہے، تابعی کبیر، ثقہ اور مخضرم ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام قبول کیا اور حضرت معاذ بن جبلؓ سے قرآن پڑھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مدینہ آئے اور مصر کی فتح میں شریک ہوئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ ۷۷ ہجری میں انتقال ہوا۔

"قال الشغل" اس میں اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ یہ نماز محض مباح ہے وگرنہ شغل دنیا کسی تابعی کو سنت سے روک نہیں سکتا تھا۔

نفل نماز گھر میں پڑھی جائے

۱۱۸۲: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ قَالَ إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتٰى مَسْجِدَ بَنِيْ عَبْدِ الْاَشْهَلِ فَصَلّٰى فِيْهِ الْمَغْرِبَ فَلَمَّا قَضَوْا صَلَاتَهُمْ رَاٰهُمْ يُسَبِّحُوْنَ بَعْدَهَا فَقَالَ هٰذِهٖ صَلَاةُ الْبُيُوْتِ (رواه ابوداود وفي رواية الترمذی والنسائی) قَامَ نَاسٌ يُصَلُّوْنَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيْكُمْ بِهٰذِهِ الصَّلَاةِ فِي الْبُيُوْتِ۔

أخرجه أبوداؤد في السنن ٢/٦٩ حديث رقم ١٣٠٠۔والترمذی ٢/٥٠٠ حديث رقم ٦٠٤۔وأحمد في المسند ٥/٤٢٧۔

ترجمہ: حضرت کعب بن عجرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ قبیلہ بنو عبدالاشھل کی مسجد میں تشریف لائے اور وہاں مغرب کی نماز پڑھی۔ جب لوگ نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ لوگ فرض نماز پڑھنے کے بعد نفل پڑھ رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ نماز گھر میں پڑھی جائے۔ (ابوداؤد) ترمذی اور نسائی کی ایک روایت میں اس طرح سے ہے کہ جب لوگ نفل نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم پر لازم ہے کہ یہ نماز اپنے گھروں میں پڑھو۔

تشریح: ''هذه صلاة البيوت'' کیونکہ گھر میں پڑھی جانے والی نماز ریا سے پاک اور اخلاص سے بھرپور ہوگی اور گھر پر بھی برکات کا نزول ہوگا۔ البتہ معتکف بلا کراہت مسجد میں نماز پڑھ سکتا ہے۔

مغرب کی سنتوں میں قراءت کا مسئلہ

۱۱۸۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُطِيْلُ الْقِرَاءَةَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ حَتّٰى يَتَفَرَّقَ اَهْلُ الْمَسْجِدِ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ٢/٧٠ حديث رقم ١٣٠١۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نمازِ مغرب کے بعد مغرب کی سنتوں میں اتنی طویل قراءت کرتے تھے کہ لوگ اپنی اپنی نماز سے فارغ ہو کر چلے جاتے تھے۔ (ابوداؤد)

تشریح: ''يطيل القراءة في الركعتين بعد المغرب'' ایسا بعض مرتبہ ہوتا تھا، کیونکہ ابن ماجہ نے نقل کیا ہے کہ ان رکعات میں حضور سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص پڑھتے تھے۔

''حتى يتفرق اهل المسجد'' ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ رکعات مسجد میں ادا فرماتے تھے، پس اسے اس پر محمول کیا جائے گا کہ کسی عذر کی وجہ سے گھر تشریف نہ لے جاتے تھے۔ لیکن سب سے بہتر تاویل یہ ہے کہ اسے بیان جواز یا حالت اعتکاف پر محمول کیا جائے۔

نمازِ مغرب کے بعد دو یا چار رکعت کی فضیلت

۱۱۸۴: وَعَنْ مَكْحُوْلٍ يَبْلُغُ بِهٖ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَلّٰى بَعْدَ الْمَغْرِبِ قَبْلَ اَنْ يَتَكَلَّمَ رَكْعَتَيْنِ وَفِيْ رِوَايَةٍ اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ رُفِعَتْ صَلَاتُهٗ فِيْ عِلِّيِّيْنَ مُرْسَلاً۔

لم أجده عند البيهقي في شعب الايمان بل عزاه في كنز العمال إلى ابن أبي شيبة ـ

ترجمہ: حضرت مکحول سے روایت ہے اور وہ اس حدیث کو مرفوعاً بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی مغرب کی نماز پڑھ کر عام گفتگو سے پہلے دو رکعت اور دوسری روایت کے مطابق چار رکعت نماز پڑھے تو اس کی یہ نماز علیین میں پہنچادی جاتی ہے۔ (رزین)

تشریح: ''عن مکحول'' یہ حدیث مرسل ہے کیونکہ مکحول تابعی ہیں اور انہوں نے صحابی راوی کا ذکر نہیں کیا۔

''من صلی بعد المغرب قبل ان یتکلم رکعتین'' رکعتین کی مراد میں دو احتمال ہیں:

① مغرب کی دو سنتیں۔ ② صلاۃ الغفلۃ۔

''وفی روایۃ اربع رکعات'' اس جملہ کی مراد میں تین احتمال ہیں:

① دو مغرب کی سنتیں اور دو صلاۃ الغفلۃ۔ ② چاروں رکعات اسلاۃ الغفلہ۔

یہ دونوں احتمال ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کئے ہیں۔

③ اوابین کی نماز مراد ہے۔ (ملا علی قاری نے اس احتمال کو راجح قرار دیا ہے)۔

''رفعت صلاۃ فی علیین'' قبولیت کی انتہا اور ثواب کی عظمت سے کنایہ ہے۔

قاموس میں لکھا ہے کہ علیون، علیّ کی جمع ہے۔ یہ ساتویں آسمان میں ایک مقام ہے جہاں مؤمنین کی ارواح و اعمال پہنچائے جاتے ہیں۔

''مرسلاً'' ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مرسل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ مرسل اس ضعیف کی طرح ہے جس کا ضعف بہت زیادہ نہ ہو۔ فضائل اعمال میں اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق تو درست ہو سکتی ہے وگرنہ جمہور کے نزدیک مرسل حجت ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ نمازیں گھر میں ہی پڑھتے تھے اور ابن عباسؓ کو اسی کا علم تھا۔

۱۱۸۵: وَعَنْ حُذَيْفَةَ نَحْوَهٗ وَزَادَ فَكَانَ يَقُوْلُ عَجِّلُوا الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ فَاِنَّهُمَا تُرْفَعَانِ مَعَ الْمَكْتُوْبَةِ رَوَاهُمَا رَزِيْنٌ۔ (وَروی البیهقی الزیادة عنه نحوها فی شعب الایمان)

ذکره المنذری فی الترغیب ـ

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے اسی طرح کی روایت مروی ہے لیکن اس میں یہ الفاظ زیادہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے تھے کہ تم لوگ مغرب کی نماز کے بعد دو سنتیں جلدی پڑھ لیا کرو کیونکہ وہ فرض کے ساتھ مقام علیین پر پہنچائی جاتی

ہیں۔(رزین) اور امام بیہقیؒ نے حضرت حذیفہؓ کی روایت کے زائد الفاظ کو شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔

تشریح: ''عجلوا الركعتين بعد المغرب'' اس تعجیل کے دو معنی ہیں:

① تخفیف کے ساتھ پڑھو، بہت لمبی نہ کرو۔ ② جلدی پڑھو، (فرائض اور سنتوں میں وقفہ نہ کرو)۔

''فانهما ترفعان مع المكتوبة'' یعنی دن کے فرشتے فرائض کے ساتھ ان کو بھی لے جاتے ہیں کیونکہ سنتیں فرائض کے تابع اور ان کو مکمل کرنے والی ہیں۔

''رواهما رزين'' علامہ میرک نے منذری کے حوالہ سے ذکر کیا کہ یہ روایتیں اصول میں نہیں تھیں۔

فرض اور نفل کے درمیان فرق کرنا چاہیے

۱۱۸۶: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَطَاءٍ قَالَ إِنَّ نَافِعَ بْنَ جُبَيْرٍ أَرْسَلَهُ إِلَى السَّائِبِ يَسْأَلُهُ عَنْ شَيْءٍ رَآهُ مِنْهُ مُعَاوِيَةُ فِي الصَّلَاةِ فَقَالَ نَعَمْ صَلَّيْتُ مَعَهُ الْجُمُعَةَ فِي الْمَقْصُورَةِ فَلَمَّا سَلَّمَ الْإِمَامُ قُمْتُ فِي مَقَامِي فَصَلَّيْتُ فَلَمَّا دَخَلَ أَرْسَلَ إِلَيَّ فَقَالَ لَا تَعُدْ لِمَا فَعَلْتَ إِذَا صَلَّيْتَ الْجُمُعَةَ فَلَا تَصِلْهَا بِصَلَاةٍ حَتَّى تَتَكَلَّمَ أَوْ تَخْرُجَ فَإِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَنَا بِذٰلِكَ أَنْ لَا نُوْصِلَ بِصَلَاةٍ حَتَّى نَتَكَلَّمَ أَوْ نَخْرُجَ ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٦٠١/٢ حديث رقم ٧٣-٨٨٣- وأبوداؤد في السنن ٦٧٢/١ حديث رقم ١١٢٩- وأحمد في المسند ٩٥/٤-

ترجمہ: حضرت عمرو ابن عطاء سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضرت نافع بن جبیر نے ان کو حضرت سائب کے پاس بھیجا تا کہ وہ ان سے ان چیزوں کے متعلق پوچھیں جو حضرت معاویہ نے انہیں نماز میں کرتے ہوئے دیکھا اور ان کے کرنے سے روکا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرو حضرت سائب کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضرت معاویہ کے ساتھ مقصورہ میں جمعہ کی نماز ادا کی جب امام نے سلام پھیرا تو میں اپنی جگہ میں کھڑا ہو گیا اور نماز پڑھنے لگا جب حضرت معاویہ اپنے گھر چلے گئے تو میرے پاس ایک آدمی کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ جو کچھ تم نے کیا ہے آئندہ ایسا نہ کرنا جب تم جمعہ کی نماز پڑھو تو اس نماز کو دوسری نماز سے مت ملاؤ یہاں تک کہ درمیان میں کوئی گفتگو نہ کرلو یا جگہ نہ تبدیل کرلو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس بات کا حکم دیا ہے کہ ہم ایک نماز کو دوسری نماز کے ساتھ نہ ملائیں یہاں تک کہ ہم ان دونوں کے درمیان گفتگو کے ساتھ یا جگہ تبدیل کرنے کے ساتھ فرق کرلیں۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

عمر بن عطاء۔ یہ عمر بن عطا بن ابی الخوار ''مکی'' ہیں۔ طبقہ تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی حدیثیں اہل مکہ میں پائی جاتی ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان کا روایت کرنا مشہور ہے۔ سائب بن یزید اور نافع بن جبیر سے بھی روایت کرتے ہیں۔ ابن جریج وغیرہ نے ان سے حدیث سنی یہ بکثرت روایت کرتے ہیں۔ ''خوار'' میں خاء معجمہ پر پیش اور واؤ پر زبر اور آخر میں مہملہ ہے۔

نافع بن جبیر۔ یہ نافع ''جبیر'' کے بیٹے اور ''مطعم'' کے پوتے ہیں۔ خاندان قریش میں سے ہیں' حجاز کے رہنے والے ہیں' اپنے والد سے اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے زہری وغیرہ نے روایت کی ہے۔

تشریح: ''صليت معه الجمعة في المقصورة'' المقصورہ سے مراد بادشاہوں کی نماز کیلئے جامع مسجد میں بنائی ہوئی خاص جگہ ہے۔

''**فصليت**'' یعنی میں فرائض اور سنتوں میں وقفہ کئے بغیر سنتوں میں مشغول ہو گیا۔

''**واذا صليت الجمعة**'' یہ قید اتفاقی ہے یعنی بطور مثل کے جمعہ کا ذکر کیا گیا ورنہ باقی نمازوں کا بھی یہی حکم ہے۔

''**حتى تكلم**'' تکلم سے مراد لوگوں سے بات کرنا۔ ذکر اللہ والا تکلم مراد نہیں (کیونکہ اس سے مقصود حاصل نہیں ہوگا)۔ اس لئے کہ تکلم سے مقصود فعل ہے۔

''**أو تخرج**'' خروج حقیقۃً ہو (یعنی مسجد سے باہر نکل آئے) یا حکماً یعنی اپنی جگہ سے پیچھے ہٹ جائے۔

ان تمام باتوں سے مقصود دو نمازوں کے درمیان فصل کرنا ہے تاکہ وصل کا وہم نہ ہو، پس یہ امر استحباب اور نہی تنزیہ کیلئے ہے۔

۱۱۸۷: وَعَنْ عَطَاءٍ قَالَ كَانَ ابْنُ عُمَرَ اِذَا صَلَّى الْجُمُعَةَ بِمَكَّةَ تَقَدَّمَ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ يَتَقَدَّمُ فَيُصَلِّيْ اَرْبَعًا وَاِذَا كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ صَلَّى الْجُمُعَةَ ثُمَّ رَجَعَ اِلٰى بَيْتِهٖ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ وَلَمْ يُصَلِّ فِي الْمَسْجِدِ فَقِيْلَ لَهٗ فَقَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُهٗ (رواه ابوداود وفي روايةالترمذي) قَالَ رَاَيْتُ ابْنَ عُمَرَ صَلّٰى بَعْدَ الْجُمُعَةِ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ صَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ اَرْبَعًا۔

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۱/۶۷۲ حديث رقم ۱۱۲۹۔ وأخرجه الترمذي ۲/۳۹۹ حديث رقم ۵۲۲۔

ترجمہ: حضرت عطاء سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب مکہ میں جمعہ کی نماز پڑھ چکتے تو آگے بڑھ جاتے اور دو رکعت پڑھتے اس کے بعد پھر آگے بڑھتے اور چار رکعت پڑھتے اور آپ جب مدینہ میں ہوتے تو جمعہ کی نماز پڑھ کر اپنے گھر واپس آ کر دو رکعت نماز پڑھتے تھے اور مسجد میں نہیں پڑھتے تھے۔ جب ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا میں ایسا اس لئے کرتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ (ابوداؤد) ترمذی کی روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ وہ جمعہ کے بعد دو رکعت پڑھ کر اس کے بعد چار رکعتیں پڑھتے تھے۔

تشریح: ''تقدم فصلى ركعتين'' یہ تقدم تکلم کے درجہ میں ہے لیکن راجح یہ ہے کہ یہ تقدم خروج کے درجہ میں لیا جائے۔

''**ثم يتقدم**'' بار بار جگہ بدلنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ جگہیں نیکی کی گواہی دیں۔

''**فيصلي أربعا**'' اس جملہ سے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ جمعہ کی سنت چھ رکعات ہے، البتہ بالاتفاق چار رکعات کو پہلے پڑھنا اولیٰ ہے کیونکہ چار رکعات بلا اختلاف سنت ہیں۔

"ثم رجع" علامہ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے قول میں خروج کی طرح ہے، لیکن راجح یہ ہے کہ یہ اپنی حقیقت اور اصل معنی پر ہے۔

"فصلی رکعتین ولم یصل فی المسجد" یہ دو رکعات گھر میں پڑھتے تھے، اس کی حکمت جمعہ کی نماز کی تعظیم اور اس کو غیر جمعہ سے ممتاز کرنا ہے۔

اس روایت سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما صرف جمعہ کی نماز میں ایسا کرتے تھے باقی نمازوں میں وہ فصل نہ فرماتے تھے۔ حالانکہ راجح اور معتمد قول یہ ہے کہ فصل تمام نمازوں میں مستحب ہے۔

راوی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس فعل کی مکہ کے ساتھ بھی تخصیص کی ہے اس پر علامہ طیبی رحمۃ اللہ نے انتہائی انوکھا تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ مکہ کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ مکہ میں اوقات مکروہ میں بھی نماز پڑھنا جائز ہے۔

حالانکہ جمعہ کی نماز کے بعد کا وقت کسی کے نزدیک بھی مکروہ اوقات میں نہیں ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ فعل محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی وجہ سے تھا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں سنتیں مسجد میں اس لئے ادا فرماتے تھے کہ گھر دور تھا اور مدینہ میں گھر میں سنتیں پڑھنے کی وجہ گھر کا قریب ہونا تھا۔

الفصل الاول:

عشاء اور فجر کے درمیان کتنی رکعتیں ہیں

۱۱۸۸: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي فِيْمَا بَيْنَ اَنْ يَّفْرُغَ مِنْ صَلَاةِ الْعِشَاءِ اِلَى الْفَجْرِ اِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً يُسَلِّمُ مِنْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَيُوْتِرُ بِوَاحِدَةٍ فَيَسْجُدُ السَّجْدَةَ مِنْ ذٰلِكَ قَدْرَمَا يَقْرَأُ اَحَدُكُمْ خَمْسِيْنَ اٰيَةً قَبْلَ اَنْ يَرْفَعَ رَأْسَهٗ فَاِذَا سَكَتَ الْمُؤَذِّنُ مِنْ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَتَبَيَّنَ لَهُ الْفَجْرُ قَامَ فَرَكَعَ رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ ثُمَّ اضْطَجَعَ عَلٰى شِقِّهِ الْاَيْمَنِ حَتّٰى يَاْتِيَهُ الْمُؤَذِّنُ لِلْاِقَامَةِ فَيَخْرُجُ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/ حديث رقم ٩٩٤۔ ومسلم ١/٥٠٨ حديث رقم (١٢٢۔٧٣٦)۔ وأبو داوٗد في السنن ٢/٤٨ حديث رقم ١٤٤٧۔ والنسائي ٣/٢٤٢ حديث رقم ١٧٢٦۔ وابن ماجه ١/٣٧٨ حديث رقم ١١٩٨۔ والدارمي ١/٤٠٠ حديث رقم ١٤٤٧ ومالك في الموطأ ١/١٢٠ حديث رقم ٨ من كتاب صلاة الليل ۔ وأحمد في المسند ٦/١٢١۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر فجر کی نماز تک اکثر گیارہ رکعت پڑھتے تھے۔ اور ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے اور وتر کی ایک رکعت کے ساتھ تمام نماز کو طاق کر لیتے تھے۔ اور اس نماز میں اتنا طویل سجدہ کرتے تھے کہ جتنی دیر میں کوئی آدمی اپنا سر اٹھانے سے پہلے پچاس آیتیں تلاوت کرے پھر جب مؤذن فجر کی اذان دے کر خاموش ہو جاتا اور فجر طلوع ہو جاتی تو آپ کھڑے ہو جاتے اور مختصر دو رکعتیں

پڑھتے تھے اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے داہنی کروٹ پر لیٹ جاتے یہاں تک کہ مؤذن اقامت کہنے کے لئے اجازت طلب کرتا پھر آپ مسجد میں تشریف لاتے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''ویوتر بواحدۃٍ'' ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی یہ توجیہہ کی ہے کہ پچھلی دو رکعات کو اس ایک رکعت کے ساتھ ملاتے تھے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ وتر کی کم از کم مقدار ایک رکعت ہے۔

ائمہ ثلاثہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

''فیسجد السجدۃ من ذلک'' علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ سجدہ تلاوت اور سجدہ شکر کے علاوہ سجدہ کرنے سے بھی اللہ کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فیسجد کے فاء سے یہی معلوم ہوتا ہے لیکن ''من ذلک'' کا قول اس کی تائید نہیں کرتا۔

البتہ اگر من کو ابتدائیہ متصل بالفعل مانا جائے تو پھر یہ توجیہہ درست ہے۔ اس صورت میں یہ سجدہ شکر ہوگا۔

راجح یہ ہے کہ فاء مجمل کی تفصیل کیلئے ہے یعنی ان تمام رکعات میں لمبے سجدہ کرتے تھے یعنی پچاس آیات کے بقدر۔ سجدہ منفردہ (جو نہ سجدہ شکر ہو نہ سجدۂ تلاوت) کے جواز عدم جواز کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے صحیح قول اس کے حرام ہونے کا ہے جس طرح رکوع منفرد حرام ہے۔ ایک قول اس کے جواز کا بھی ہے صاحب تقریب نے اسے ذکر کیا ہے۔

بہت سے جاہل، مشائخ کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔ یہ قطعی طور پر ہر حال میں حرام ہے خواہ رخ قبلہ کی طرف ہو یا نہ ہو، چاہے اس میں اللہ کو سجدہ کرنے کی نیت ہو پھر بھی حرام ہے۔

''تبین لہ الفجر'' فجر سے مراد روشنی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ فجر کی نماز حتی کہ اس کی سنتوں کو بھی روشنی میں پڑھنا مستحب ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی معنی ذکر کیا اور فرمایا کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عشاء کی اذان اندھیرے میں دینا مستحب ہے کہ لوگوں کو نماز کیلئے آنے میں کافی وقت مل سکے۔

''ثم اضطجع علی شقہ الأیمن'' ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رات کے قیام کی تھکاوٹ کو دور کرنے کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم استراحت فرماتے تھے تاکہ فرائض کو نشاط کے ساتھ ادا کر سکیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں فجر کی دو سنتوں کے بعد پہلو کے بل لیٹنا مستحب ہے۔

بعض علماء نے کہا کہ یہ اضطجاع فرائض اور سنتوں میں فصل کیلئے تھا۔ یہ قول درست نہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنتیں گھر میں اور فرائض مسجد میں ادا فرماتے تھے۔

فجر کی سنتوں کے بعد گفتگو کرنا

۱۱۸۹: وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ فَاِنْ كُنْتُ مُسْتَيْقِظَةً

حَدَّثَنِیْ وَ اِلَّا اضْطَجَعَ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/ ۵۱۱ حدیث رقم (۱۳۳۔۷۴۳)۔وأبوداوٗد فی السنن ۲/ ۴۸ حدیث رقم ۱۲۶۳۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی سنتیں پڑھ لیتے، اگر میں جاگ رہی ہوتی تو مجھ سے بات چیت کر لیتے اور اگر میں سوئی ہوئی ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی لیٹ جاتے تھے، اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''کان النبی ﷺ اذا صلی رکعتی الفجر'' اس سے مراد فجر کی سنتیں ہیں۔

''فان کنت مستیقظة حدثنی'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، شرط جزاء مل کر شرط اول کیلئے جزاء ہیں۔ نیز شرط اول کی جزاء کو محذوف بھی مانا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں فاء تفصیلیہ ہوگی۔

''اضطجع'' ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

① صبح کی سنتوں اور فرائض کے درمیان فصل کرنا جائز ہے۔

② اس وقت میں اہلیہ کے ساتھ باتیں کرنا سنت ہے۔

اس حدیث سے ان حضرات کے قول کی بھی تردید ہوگئی جن کا کہنا یہ ہے کہ فرائض و سنتوں کے درمیان کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے یا ثواب سے محرومیت ہو جاتی ہے۔

واضح رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سے مراد آخرت کی گفتگو ہے، دنیاوی باتیں تو ہر صورت میں خلاف اولیٰ ہیں کیونکہ فرائض سے پہلے سنتیں رکھنے کی حکمت ہی حالت کی درستگی اور غفلت سے نجات ہے۔ یہ حالت اس وقت باقی رہے گی جب نماز سے پہلے آخرت کی باتیں ہو۔

فجر کی سنتوں کے بعد استراحت کا بیان

۱۱۹۰: وَعَنْهَا قَالَتْ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰی رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ اضْطَجَعَ عَلٰی شِقِّهِ الْاَیْمَنِ. (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳/ ۴۳ حدیث رقم ۱۱۶۰۔والنسائی ۳/ ۲۵۲ حدیث رقم ۱۷۶۲۔وابن ماجه ۱/ ۳۷۸ حدیث رقم ۱۱۹۹۔وأحمد فی المسند ۲/ ۱۷۳۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دو رکعت سنت ادا کرنے کے بعد اپنی دائنی کروٹ پر لیٹ جایا کرتے تھے۔

تشریح: ''اضطجع علی شقه الایمن'' ان روایات کی بناء پر امام شافعی رحمہ اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ ہر شخص کیلئے (خواہ وہ تہجد گزار ہو یا نہ ہو) فجر کے فرائض اور سنتوں کے درمیان دائیں پہلو پر (قبلہ رخ ہو کر) لیٹنا مستحب ہے۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر پہلو کے بل نہ لیٹے تو محض مسجد کی طرف چلنے سے فصل حاصل نہ ہوگا۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ اضطجاع استراحت اور تحصیل نشاط کیلئے تھا تاکہ فرائض کے ادا کرنے میں چستی اور تازگی حاصل ہو جائے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضور ﷺ فجر کے وقت سے پہلے پہلو کے بل لیٹا کرتے تھے، ابن عمر رضی اللہ عنہما اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے سنتوں کے بعد لیٹنے کو بدعت قرار دیا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ان حضرات کے کلام کو عدم واقفیت پر محمول کیا ہے جو کہ بڑی بعید چیز ہے۔

ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے تو ایک بڑی انوکھی بات کہی کہ اس طرح کا اضطجاع واجب ہے اور اس چھوڑنے کی صورت میں صبح کی نماز ادا نہ ہوگی۔

ابن حزم کا یہ قول صحیح احادیث کے مخالف ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ بیان جواز یا استراحت کی حاجت نہ ہونے کی صورت میں اضطجاع کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔

صلوٰۃ اللیل کی رکعات

۱۱۹۱: وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ ثَلَاثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً مِنْهَا الْوِتْرُ وَرَكْعَتَا الْفَجْرِ. (رواہ مسلم)

أخرجه البخاري في صحيحه ۳/ ۲۰ حديث رقم ۱۱۴۰۔ ومسلم ۱/ ۵۱۰ حديث رقم (۱۲۷۔۷۳۸)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رات کو تیرہ رکعت نماز پڑھتے تھے ان میں وتر اور فجر کی سنتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''ثلاث عشر رکعة منها الوتر'' ان میں سے تین رکعات وتر کی ہیں تمام علماء کے نزدیک افضل تین رکعات ہی ہیں۔

شمائل ترمذی میں امام ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول نقل کیا ہے:

''ثم یصلی ثلاثا''

امام مسلم نے بھی ایک روایت نقل کی ہے:

''ثم اوتر بثلاث''

یہ روایات بھی ہمارے مسلک کی تائید کرتی ہیں۔

''ورکعتا الفجر'' ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فجر کی سنتوں کو وتر اور تہجد کے ساتھ ملایا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ رات کے آخری حصہ میں وتر پڑھتے تھے، پھر جاگتے رہتے اور پھر فجر کی دو سنتیں پڑھ لیتے۔

۱۱۹۲: وَعَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ عَنْ صَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاللَّيْلِ فَقَالَتْ سَبْعٌ وَتِسْعٌ وَاِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً سِوٰى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ۳/ ۲۰ حديث رقم ۱۱۳۹۔

ترجمہ: حضرت مسروقؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی رات کی

نماز کے بارے میں پوچھا کہ آپ ﷺ کتنی رکعت پڑھا کرتے تھے تو انہوں نے فرمایا کہ کبھی آپ سات رکعت پڑھتے تھے، اور کبھی گیارہ رکعت پڑھتے تھے فجر کی سنتوں کے علاوہ۔

راوئ حدیث:

مسروق بن الاجدع۔ یہ ''مسروق'' ہیں۔ ''اجدع'' کے بیٹے ہیں۔ ہمدانی اور کوفی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی وفات سے قبل مشرف باسلام ہوئے۔ صحابہ کے صدرِ اول ابوبکر' عمر' عثمان' علی رضی اللہ عنہم کا زمانہ پایا۔ سرکردہ اور فقہاء میں سے تھے۔ مروہ بن شرحبیل نے فرمایا کہ کسی ہمدانی عورت نے مسروق رحمۃ اللہ علیہ جیسا سپوت نہیں جنا۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر کسی گھرانے کے لوگ جنت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں تو وہ یہ ہیں' اسود' علقمہ اور مسروق۔ محمد بن المنتشر نے فرمایا کہ خالد ابن عبداللہ بصرہ کے عامل (گورنر) تھے۔ انہوں نے بطور ہدیہ تیس ہزار (۳۰۰۰۰) کی رقم دی۔ مسروق نے (باوجودیکہ محتاج تھے) اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بچپن میں ان کو چرالیا گیا تھا پھر مل گئے تو ان کا نام ''مسروق'' ہو گیا۔ ان سے بہت سے لوگوں نے روایت کی۔ بمقام کوفہ ۶۲ھ میں وفات پائی۔

تشریح: ''واحدی عشر رکعة سوی رکعتی الفجر'' حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ایک صحیح حدیث منقول ہے:

''نبی کریم ﷺ تیرہ رکعات پڑھا کرتے تھے جب عمر زیادہ ہوگئی اور کمزوری لاحق ہوئی تو آپ ﷺ سات رکعات پڑھا کرتے تھے''۔

جس روایت میں پندرہ رکعات کا ذکر ہے وہ اس صورت پر محمول ہے کہ رکعات سے ابتداء فرماتے تھے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ فجر کی دوسنتوں کو اس میں شمار کر لیا جائے۔ نیز بارہ رکعات تہجد اور تین رکعات وتر بھی شمار کی جاسکتی ہیں۔ آخری بات کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ جب نیند کے غلبہ کی وجہ سے آپ ﷺ کی تہجد رہ جاتی تو آپ ﷺ دن میں بارہ رکعات پڑھا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ تہجد کی نماز ہلکی دو رکعتوں سے شروع کرتے تھے

۱۱۹۳: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ لِيُصَلِّيَ اِفْتَتَحَ صَلَاتَهُ بِرَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۵۳۲/۱ حديث رقم (۱۹۷-۷۶۷)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کو تہجد کی نماز کیلئے کھڑے ہوتے، تو اپنی نماز کو دو مختصر رکعتوں سے شروع کرتے تھے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''افتتح صلاته برکعتین خفیفتین'' صاحب ازھار فرماتے ہیں:

''اس سے مراد تحیۃ الوضوء کی نماز ہے، اس میں تخفیف مستحب ہے''۔

راجح یہ ہے کہ یہ دو رکعات تہجد کا حصہ شمار کی جاتی تھیں تو تحیۃ الوضو کے قائم مقام ہوں، کیونکہ وضو کیلئے علیحدہ کوئی نماز نہیں

ہے۔

اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب بھی کوئی کام شروع کیا جائے تو تھوڑے سے شروع کیا جائے تا کہ اس میں چلنا آسان ہو۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شروع میں خفیف رکعات پڑھنے کی حکمت نشاط کا حصول اور طبیعت کو نماز پر لانا ہے۔

۱۱۹۴: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ اَحَدُكُمْ مِّنَ اللَّيْلِ فَلْيَفْتَتِحِ الصَّلَاةَ بِرَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۵۳۲ حديث رقم(۱۹۸۔۷۶۸)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے کیلئے رات کے وقت اٹھے اُسے چاہئے کہ وہ اپنی نماز کی ابتداء ہلکی دو رکعتوں سے کرے، اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''فلیفتتح'' ایک نسخہ میں فلیفتح آیا ہے۔

تہجد کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت

۱۱۹۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بِتُّ عِنْدَ خَالَتِیْ مَيْمُوْنَةَ لَيْلَةً وَالنَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَهَا فَتَحَدَّثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَ اَهْلِهٖ سَاعَةً ثُمَّ رَقَدَ فَلَمَّا كَانَ ثُلُثُ اللَّيْلِ الْاٰخِرِ اَوْ بَعْضُهٗ قَعَدَ فَنَظَرَ اِلَی السَّمَآءِ فَقَرَاَ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ حَتّٰی خَتَمَ السُّوْرَةَ ثُمَّ قَامَ اِلَی الْقِرْبَةِ فَاَطْلَقَ شِنَاقَهَا ثُمَّ صَبَّ فِی الْجَفْنَةِ ثُمَّ تَوَضَّاَ وُضُوْءً حَسَنًا بَيْنَ الْوُضُوْئَيْنِ لَمْ يُكْثِرْ وَقَدْ اَبْلَغَ فَقَامَ فَصَلّٰی فَقُمْتُ وَتَوَضَّاْتُ فَقُمْتُ عَنْ يَّسَارِهٖ فَاَخَذَ بِاُذُنِیْ فَاَدَارَنِیْ عَنْ يَّمِيْنِهٖ فَتَتَامَّتْ صَلَاتُهٗ ثَلَاثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً ثُمَّ اضْطَجَعَ فَنَامَ حَتّٰی نَفَخَ وَكَانَ اِذَا نَامَ نَفَخَ فَاٰذَنَهٗ بِلَالٌ بِالصَّلَاةِ فَصَلّٰی وَلَمْ يَتَوَضَّاْ وَكَانَ فِیْ دُعَآئِهٖ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَّفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَّفِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَّعَنْ يَّمِيْنِیْ نُوْرًا وَّعَنْ يَّسَارِیْ نُوْرًا وَّفَوْقِیْ نُوْرًا وَّتَحْتِیْ نُوْرًا وَّاَمَامِیْ نُوْرًا وَّخَلْفِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ لِّیْ نُوْرًا وَّزَادَ بَعْضُهُمْ وَفِیْ لِسَانِیْ نُوْرًا وَّذَكَرَ وَعَصَبِیْ وَلَحْمِیْ وَدَمِیْ وَشَعْرِیْ وَبَشَرِیْ (متفق عليه وفي رواية) لَهُمَا وَاجْعَلْ فِیْ نَفْسِیْ نُوْرًا وَّاَعْظِمْ لِیْ نُوْرًا وَّفِیْ اُخْرٰی لِمُسْلِمٍ اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا۔

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۱/۱۱٦ حديث رقم ٦۳۱٦۔ومسلم في صحيحه ۱/۵۲٦ حديث رقم (۱۸۱۔۷٦۳) ۔والترمذي في السنن ۵/٤۵۵ حديث رقم ۳٤۱۹۔والنسائي ۲/۲۱۸ حديث رقم ۱۱۲۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں، کہ ایک مرتبہ میں نے اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس رات گذاری اور رسول اللہ ﷺ بھی اُس دن انہی کے پاس تھے، رات کا کچھ حصہ آپ ﷺ اپنی اہلیہ سے باتیں کرتے رہے پھر آپ ﷺ سو گئے، پھر رات کا تیسرا حصہ یا اس سے کچھ کم باقی رہ گیا، تو آپ ﷺ اٹھے اور آسمان کی طرف دیکھ کر یہ آیت پڑھی: ﴿ان في خلق السموٰت﴾ ۔ یہاں سے شروع کر کے سورت کے اختتام تک تلاوت کی، پھر اٹھ کر پانی کی مشک کے پاس گئے، اور اس کا منہ کھول کر برتن میں پانی ڈالا، پھر اچھی طرح وضو کیا اور مناسب مقدار میں پانی استعمال کیا، چنانچہ حدیث کے راوی کا بیان ہے کہ درمیانہ وضو کیا (یعنی اتنا کم پانی بھی استعمال نہیں کیا کہ اعضاء اچھی طرح تر نہ ہوں اور نہ ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کیا) پھر آپ ﷺ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے آپ کے بعد میں بھی اٹھا جس طرح آپ کر رہے تھے ایسا ہی میں نے بھی کیا اور وضو کر کے آپ کی بائیں طرف جا کر کھڑا ہو گیا، آپ ﷺ نے میرا کان پکڑ کر اپنی بائیں طرف سے گھما کر اپنی دائیں طرف کھڑا کر دیا، اور آپ نماز پڑھتے رہے اور میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتا رہا۔ جب آپؐ نے تیرہ رکعت نماز پڑھ لی تو لیٹ کر سو گئے، یہاں تک کہ آپ خراٹے لینے لگے، آپ ﷺ سوتے وقت خراٹے لیتے تھے، اتنے میں حضرت بلالؓ آئے اور نماز کی اطلاع دی، آپ ﷺ نے دوبارہ وضو کئے بغیر سنت کی دو رکعتیں ادا کیں اور یہ دعا کرنے لگے: "اللّٰھم اجعل في قلبي نورًا" (اے اللہ میرے دل میں نور پیدا کر دے اور میری آنکھوں میں اور میرے کانوں میں اور میری دائیں طرف اور میری بائیں طرف اور میرے اوپر اور میرے نیچے میرے آگے اور میرے پیچھے نور ہی نور بنا دے)۔ اور بعض روایتوں میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ میری زبان کو نور بنا دے اور بعض روایات میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ میرے پٹھوں میں میرے گوشت میں میرے خون میں میرے بالوں میرے چمڑے میں نور پیدا کر دے۔ اور بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ میرے نفس میں نور پیدا کر دے، اور میرے لیے نور میں بڑائی دے، اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "اے اللہ مجھے نور عطا کر دے"۔

تشریح: "فتحدث رسول الله ﷺ مع أهله ساعة" اس سے معلوم ہوا کہ اگر عشاء کے بعد آخرت یا وعظ ونصیحت یا حسن معاشرت کی گفتگو ہو تو مکروہ نہیں ہے۔

"نظر الی السماء" اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں تفکر اور عالم جبروت میں استغراق کیلئے آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔

"واختلاف اللیل والنهار" رات دن کا اختلاف تین طرح سے ہے:

① طول وقصر کے اعتبار سے۔ ② تاریکی روشنی کے اعتبار سے۔ ③ گرمی وسردی کے اعتبار سے۔

"لأولي الألباب" اولو الالباب سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں عقل سلیم حاصل ہو اور وہ توحید اور نبوت کے طریق مستقیم اور ملتِ قومیہ پر ہوں۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"اس شخص کیلئے ہلاکت ہے جو اس آیت کو پڑھے اور تفکر نہ کرے"۔

حتی ختم السورة" کیونکہ یہ سورت بہت سے لطائف عظیمہ اور عوارف جسمیہ پر مشتمل ہے لیکن یہ اس کو ملیں گے جو اس کے بیان میں عذر کرے گا۔

''بین الوضوئین'' اس جملہ کے دو معنی بیان کیے گئے ہیں:

① ایسا وضو فرماتے جو اسراف اور بخل کے درمیان میں ہوتا (یعنی نہ زیادہ پانی ڈالتے کہ اسراف کی حد کو پہنچ جائے اور نہ اتنا کم کہ اعضاء بھی پوری طرح تو نہ ہو) اس سے معلوم ہوا کہ افراط و تفریط کے درمیان رہ کر وضو کرنا مستحسن ہے۔

② دو مرتبہ وضو فرماتے تھے۔

''لم یکثر'' یہ وضو کی دوسری صفت ہے یا وضو اور حسن کی وضاحت ہے۔ بہرحال عدم افراط کی طرف اشارہ ہے۔

''وقد أبلغ'' عدم تفریط کی طرف اشارہ ہے۔

''عن یسارہ'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہجرت سے تین سال قبل پیدا ہوئے تھے، ابھی چھوٹے بچے تھے اس لئے نماز کے مسائل سے واقف نہ تھے۔

''فأخذ بأذني'' شمائل ترمذی میں وارد ہے:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دایاں دست مبارک میرے سر پر رکھا اور پھر میرے دائیں کان پکڑا''۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں برکت عطا کرنے کیلئے اپنا درست مبارک ان کے سر پر رکھا تا کہ انہیں اس مجلس کے سارے افعال نبوی یاد ہو جائیں۔

''فادارنی عن یمینہ'' ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، من جانب کے معنی میں ہے، اصل عبارت یہ ہوگی:

''أدارنی عن جانب یسارہ الی جانب یمینہ''۔

بعض روایات میں ذکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے کان کو مروڑا تا کہ ان کی غفلت دور ہو جائے اور پوری بیدار مغزی کے ساتھ افعال کو یاد کر سکیں۔

''صلاتہ ثلاث عشرۃ رکعۃ'' شمائل میں ہے:

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت، پھر دو رکعت، پھر دو رکعت، پھر دو رکعت، پھر دو رکعت، پھر دو رکعت پڑھیں پھر وتر پڑھے''۔

یعنی آخری دو رکعات کو آخری رکعت کے ساتھ ملا کر پڑھا جس سے وتر تین ہو گئے۔ جیسا کہ امام مسلم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

''ثم اضطجع فنام حتی نفخ'' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سونے کے بعد ایسی طرح سانس لیتے تھے کہ سانس کی آواز محسوس ہوتی تھی اور سنائی دیتی تھی۔

''وکان اذا نام نفخ'' یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جب آرام فرماتے تھے تو بلند آواز سے سانس لیتے تھے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بلند آواز سے سانس لینا کسی امر خارج کی وجہ سے نہ تھا بلکہ یہ فطرتی تھا جو جسم کے پر گوشت ہونے کی بنا پر پیدا ہوا تھا۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام حاجتوں کو اللہ تعالیٰ نے پورا فرما دیا اور آپ کا غم امت ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک میں

اضافہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ اس بارے میں دو قول ہیں:

① اللہ تعالیٰ کی عنایات اور امت محمدیہ ﷺ کی کثرت کو دیکھ کر آپ کے جسم میں اضافہ ہوا۔

② اللہ تعالیٰ کی عبدیت کا احساس اور اللہ رب العزت کی نوازشات کی وجہ سے ایسا ہوا۔

جن روایات میں پر گوشت اور فربہ لوگوں کی مذمت آئی ہے وہاں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو غفلت اور ناز و نعمت کی زندگی کی وجہ سے موٹے ہو جائیں، یا زیادہ گوشت کھانے کی وجہ سے ایسا ہو۔

''فصلي ولم يتوضا'' علماء فرماتے ہیں کہ سونے کے باوجود نبی کریم ﷺ کا وضو نہ فرمانا اس حکمت کی بناء پر تھا کہ نیند بذات خود ناقض وضو نہیں بلکہ کسی امر خارج کی وجہ سے ہے اور امر خارج ناقضِ وضو چیز کا خروج ہے۔ اور چونکہ نیند میں نبی کریم ﷺ کا دل بیدار رہتا تھا اس لئے حضور ﷺ کے بارے میں یہ گمان کرنا ممکن نہیں کہ کوئی ناقض وضو چیز خارج ہوئی ہو۔ یہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قلب کی بیداری حدث سے مانع ہے اور دل کی بیداری کی حکمت' وحی کی حفاظت ہے، نبی کریم ﷺ پر نیند میں بھی وحی نازل ہوتی تھی۔

اب رہی یہ بات کہ پہلی مرتبہ اٹھنے کے بعد وضو کیوں فرمایا؟ تو وہ وضو کسی اور نقص، تجدید یا تنشیط کیلئے تھا۔

''وكان في دعائه'' اس جملہ کی مراد میں دو احتمال ہیں:

① اس رات کی دعاؤں میں سے ایک یہ تھی۔

② گھر سے مسجد کی طرف جانے کی دعاؤں میں سے ایک یہ تھی، علامہ جزری نے الحصن میں یہی ذکر کیا ہے۔

''اجعل في قلبي نورا'' نور کی تعریف یہ ہے:

''هو ما يتبين به الشئ ويظهر''۔ ''جس سے کوئی چیز واضح اور ظاہر ہو''۔

علامہ کرمانی فرماتے ہیں نورًا کی تنوین تعظیم کیلئے ہے، یعنی نورًا عظیمًا۔

دل کو باقی اعضاء پر مقدم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ دل اعضاء کا حکمران اور بادشاہ ہے۔

''وفي بصري نورًا وفي سمعي نورًا'' بصارت وسماعت میں نور کی دعا اس لئے مانگی گئی کہ یہ دلائل عقلیہ اور نقلیہ کے حصول کا ذریعہ ہیں۔

''وعن يميني نورا وعن يساري نورًا'' یعنی دائیں اور بائیں طرف نور کر دے۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ نور سے مراد حق کی روشنی ہے۔ یعنی میرے اعضاء کو حق میں استعمال فرما اور میرے تصرف کو سیدھے راستہ پر چلا۔

''وفوقي نورًا وتحتي نورا وامامي نورًا وخلفي نورًا'' ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ان جوانب میں میں حرف جر نہ لانے کی حکمت یہ ہے کہ ان اعضاء میں کامل، اکمل اور محیط نور کا سوال کیا جا رہا ہے کیونکہ انسان کو ظلمات بشریہ نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور انسان صرف انوار الٰہیہ کی بدولت ان سے بچ سکتا ہے''۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان انوار کو ظاہر پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے اپنے اعضاء کی نورانیت کا سوال کیا تا کہ قیامت کے دن آپ اور آپ کے متبعین اس نور کی روشنی میں چل سکیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ نور سے مراد علم اور ہدایت لئے جائیں، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''فهو علی نور من ربه''۔

اسی طرح فرمایا: ''وجعلنا له نورا یمشی به فی الناس''۔

البتہ ان دونوں معانی کو جمع کرنا بھی ممکن ہے (کہ ظاہری نور بھی مراد ہو اور علم و ہدایت بھی)۔

نور کے معنی میں تحقیق شدہ بات یہ ہے کہ نسبت کے اختلاف سے اس کے معنی میں بھی اختلاف آتا ہے۔ سماعت کا نور مسموعات میں، بصارت کا نور مبصرات میں، دل کا نور معلومات میں اور اعضاء کا نور اعمالِ اطاعات میں ظاہر ہوتا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر ہر عضو میں نور مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نور معرفت اور طاعت کے انوار سے منور ہو اور جہالت اور گمراہی کی ظلمت سے پاک ہو۔ کیونکہ جہالت کی ظلمات سر سے پاؤں تک انسان کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اور شیطان ہر طرف سے اسے وسواس وشبہات میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان برائیوں سے بچنے کیلئے ایسے انوار کی ضرورت ہے جو ان تاریکیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اس میں امت کیلئے تلقین و راہنمائی کا سامان موجود ہے۔

دوسرا نکتہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان کیا ہے کہ قلب، سمع اور بصر میں فی ظرفیہ کو لائے کیونکہ دل انعام الٰہیہ کے نزول کا مستقر ہے۔ ''بصر آفاق وانفس میں اللہ کی نشانیوں کو دیکھنے والی ہے اور سماعت انبیاء پر اترنے والی نشانیوں کو سننے والی ہے۔ یمین اور شمال کو عن کے ساتھ ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ انوار قلب، بصر اور سمع سے نکل کر دائیں بائیں پہنچ جائیں، فوق، خلف، امام اور تحت کو حروف جارہ سے خالی اس لئے کیا گیا کہ مکمل اور کامل نور حاصل ہو جائے۔

''واجعل لی نورًا'' یہ اجمال بعد التفصیل ہے۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نور عظیم ہے جو تمام انوار کو جامع ہے۔ نسائی اور حاکم کی روایت میں واجعلنی نورًا کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ مذکورہ الفاظ سے زیادہ جامع ہیں۔

''وعصبی'' کیونکہ بدن کی مضبوطی کا مدار اسی پر ہے۔

''ولحمی'' کیونکہ بدن کی نشوونما اور زیادتی اسی پر منحصر ہے۔

''ودمی'' زندگی اس کے بغیر ممکن نہیں۔

''وشعری'' بال حسن وخوبصورتی میں اضافہ کا موجب ہے۔

''وبشری'' کھال کی وجہ سے انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے۔

''وفی روایة لهما'' شیخین کی روایت مراد ہے۔

''أعظم لی نورًا'' ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ، یعنی میرے نور کو عظیم فرما۔

وتر تین رکعت ہے

۱۱۹۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهُ رَقَدَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْتَيْقَظَ وَتَسَوَّكَ وَتَوَضَّأَ وَهُوَ يَقُوْلُ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ حَتّٰى خَتَمَ السُّوْرَةَ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ اَطَالَ فِيْهِمَا الْقِيَامَ وَالرُّكُوْعَ وَالسُّجُوْدَ ثُمَّ انْصَرَفَ فَنَامَ حَتّٰى نَفَخَ ثُمَّ فَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ سِتَّ رَكَعَاتٍ كُلَّ ذٰلِكَ يَسْتَاكُ وَيَتَوَضَّأُ وَيَقْرَأُ هٰؤُلَاءِ الْاٰيَاتِ ثُمَّ اَوْتَرَ بِثَلَاثٍ ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/ ٥٣٠ حديث رقم (١٩١ـ٧٦٣)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ ایک رات رسول اللہ ﷺ کے پاس سوئے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رات کو بیدار ہوئے، مسواک کی اور وضو کیا پھر یہ آیت پڑھی ﴿ان فی خلق السمٰوٰت والارض﴾ یہاں تک کہ سورت کو ختم کیا پھر کھڑے ہوئے اور دو رکعت نماز پڑھی جس میں قیام رکوع، اور سجدہ طویل کیا دو رکعت سے فارغ ہو کر آپ ﷺ لیٹ گئے اور خراٹے لینے لگے پھر تین مرتبہ اس طرح کیا۔ اس طرح آپ ﷺ نے تین مرتبہ میں چھ رکعتیں پڑھیں اور تین مرتبہ میں سے ہر بار مسواک بھی کرتے اور وضو بھی کرتے اور یہ آیات بھی پڑھتے، پھر آخر میں آپ نے وتر کی تین رکعتیں پڑھیں۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''فاستیقظ'' شمائل میں اس کے بعد یہ اضافہ ہے کہ آپ ﷺ نے بیداری کے بعد چہرہ پر ہاتھ پھیرا اور نیند کے اثر کو ختم فرمایا۔

''فتسوك وتوضأ'' ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ وضو محض تجدید کیلئے تھا کیونکہ آپ ﷺ کی نیند ناقض وضو نہیں۔ حتمی طور پر تجدید کا حکم لگا دینا درست نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ یہ وضو کسی اور نقص کی وجہ سے فرمایا ہو۔

''وهو يقول ان فی خلق السموات والارض'' بظاہر اس واقعہ کا پہلے ذکر کردہ واقعہ سے تعارض معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں پہلے قراءت اور پھر وضو کا ذکر ہے جبکہ اس میں پہلے وضوء اور پھر قراءت کا ذکر ہے، محدثین نے اس کے حل میں تین باتیں فرمائی ہیں:

① دو مرتبہ پڑھا تھا (ایک مرتبہ پہلے ایک مرتبہ بعد میں)۔
② یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔
③ یہ عطفِ محض ہے، عطف رتبی نہیں ہے۔

''ثلاث مرات ست رکعات'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ست رکعات بدل ہے ثلاث مرات سے۔ یہ بھی کہا گیا کہ ست رکعات، اعنی فعل محذوف کا مفعول یا ثلاث کیلئے بدل ہے۔

''کل ذلك يستاك'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''کل ذلك'' متعلق یستاک کے ساتھ۔

حضرت ابن عباسؓ کے قول ''ثم فعل ذلك'' میں ثم تراخی کیلئے ہے جس کو تقدیرًا وتاکیدًا لایا گیا ہے۔ یہ عطف مجر

کیلئے نہیں ہے تا کہ چار مرتبہ پرعمل کرنا لازم نہ آئے۔

"یتوضا" یہ وضو تجدید کیلئے تھا۔ جبکہ علامہ طیبی رحمہ اللہ کا خیال یہ ہے کہ شاید اس موقع پر حدث کا احساس ہوا تھا۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی دوسرا واقعہ ہے کیونکہ حالات اور رکعات کی تعداد یہاں مختلف ہے۔ البتہ اگر رکعات کو صلوات پر محمول کیا جائے تو ٹھیک ہے۔

"ثم اوتر بثلاث" ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ رکعات تہجد کی تھیں اور تین وتر تھے۔ امام ابوحنیفہ کا بھی یہی مسلک ہے، امام شافعی بھی اس کے خلاف نہیں بلکہ ان کے نزدیک ایک رکعت پر اکتفا کرنا مکروہ ہے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تہجد کی نماز کی کیفیت

۱۱۹۷: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدِ الْجُهَنِيِّ اَنَّهُ قَالَ لَاَرْمُقَنَّ صَلَاةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّيْلَةَ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ طَوِيْلَتَيْنِ طَوِيْلَتَيْنِ طَوِيْلَتَيْنِ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ وَهُمَادُوْنَ اللَّتَيْنِ قَبْلَهُمَا ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ وَهُمَادُوْنَ اللَّتَيْنِ قَبْلَهُمَا ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ وَهُمَادُوْنَ اللَّتَيْنِ قَبْلَهُمَا ثُمَّ اَوْتَرَ فَذٰلِكَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً رواه مسلم قَوْلُهُ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ وَهُمَادُوْنَ اللَّتَيْنِ قَبْلَهُمَا اَرْبَعَ مَرَّاتٍ هٰكَذَا فِيْ صَحِيْحِ مُسْلِمٍ وَاَفْرَادِهِ مِنْ كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَمُوَطَّا مَالِكٍ وَسُنَنِ اَبُوْدَاوٗد وجامع الاصول۔

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٥٣١ حديث رقم(١٩٥-٧٦٥)۔وأخرجه أبوداؤد في السنن ٢/٩٩ حديث رقم ١٣٦٦۔وابن ماجه ١/٤٣٣ حديث رقم ١٣٦٢۔ ومالك في الموطأ ١/١٢٢ حديث رقم ١٢من كتاب صلاة الليل ۔وأحمد في المسند ٥/١٩٣۔

ترجمہ: حضرت زید بن خالد جہنی سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ آج رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو دیکھتا رہوں گا، چنانچہ میں نے دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دو رکعتیں مختصر پڑھیں پھر دو رکعتیں بہت طویل پڑھیں، پھر آپ نے دو رکعتیں پڑھیں جو ان دو رکعتوں سے کچھ مختصر تھیں اور اس کے بعد پھر آپ نے دو رکعتیں پڑھیں جو ان دو رکعتوں سے کچھ مختصر تھیں پھر اس کے بعد آپ نے دو رکعتیں پڑھیں جو طویل کے مقابلہ میں مختصر تھیں اس طرح آپ نے تیرہ رکعتیں پڑھیں صحیح مسلم میں یہ روایت اسی طرح ہے اور حضرت زیدؓ کا یہ قول کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھیں جو طویل رکعتوں سے مختصر تھیں صحیح مسلم میں حمیدی کی کتاب میں جس میں صرف مسلم کی روایات نقل کی گئی ہیں اور موطا امام مالک، سنن ابی داوٗد، اور جامع الاصول میں سب میں چار مرتبہ ذکر کیا گیا ہے، صرف یہاں پانچ مرتبہ کا ذکر ہے۔

تشریح: "وعن زید بن خالد الجهنی" مشہور مدنی صحابی ہیں، تقریب میں اسی طرح ہے۔

"أنه قال لأرمقن" یعنی میں دیکھوں گا، غور کروں گا، یاد کروں گا اور ذہن میں بٹھاؤں گا۔

اس جملہ میں ماضی سے مضارع کی طرف عدول کیا گیا ہے اس کی حقیقت کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں:
علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ عدول سامع کے ذہن میں اصل حالت کے تقرر اور استحضار کی وجہ سے ہے۔
بعض کا خیال یہ ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم وعمل سے پہلے کا ہو۔
ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ آپ نے یہ بات اپنے ساتھیوں سے دن کے وقت کہی اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کو بنظر تامل ملاحظہ کیا۔ اس صورت میں مضارع اپنی حالت پر ہوگا۔
ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا قول انتہائی بعید ہے اس کو درست ثابت کرنے کیلئے بہت سی تقدیری عبارتیں ماننا پڑیں گی۔
''الیلة'' یعنی آج رات میں ایسا کروں گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس رات حجروں سے باہر نماز ادا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔

''ثم صلی رکعتین طویلتین طویلتین طویلتین'' یہ تکرار محض تاکید کیلئے ہے، ہر طویلتین سے دو رکعات مراد نہیں۔
علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تین مرتبہ اس لفظ کو ذکر کر کے طوالت کی انتہاء کو بیان کیا پھر آہستہ آہستہ اس کی تخفیف کی طرف آتے گئے۔

''ثم اوتر'' مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ وتر تین رکعات پر مشتمل تھے کیونکہ راوی نے وتر سے پہلے کی رکعات کو دس تک شمار کیا ہے کیونکہ پہلے رکعتین حفیفتین کہا، پھر رکعتین طویلتین کہا پھر تین مرتبہ صلی رکعتین کہا۔ پس یہ دس رکعات ہوگئیں۔ (مصابیح کے نسخہ کے مطابق مظہر اور طیبی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا یہ قول درست ہے، البتہ اگر مشکوٰۃ کے نسخہ کو لیا جائے تو پہلی دو رکعات خفیفہ اس گنتی میں نہ آئیں گی ان کے بعد کی رکعات کو اس میں شمار کریں گے)۔
''فذلك ثلاث عشرة ركعة'' ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ وتر تین رکعات تھے کیونکہ پہلے پانچ سلاموں میں آپ نے دس رکعات پڑھی تھیں (یعنی دو رکعات خفیفہ کے علاوہ یا مصابیح کے نسخہ کی روایت کے مطابق)۔
''ثم صلی رکعتین وهما دون اللتین قبلهماأربع مرات هكذا فی صحيح مسلم وافراده من كتاب الحميدی ومؤطا مالك وسنن ابی داؤد جامع الاصول'' اس عبارت سے صاحب مشکوٰۃ صاحب مصابیح پر اعتراض کر رہے ہیں کہ انہوں نے مصابیح میں ثلاث مرات ذکر کیا جبکہ مذکورہ کتابوں میں اربع مرات مذکور ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر عمر میں نفل بیٹھ کر پڑھتے تھے

۱۱۹۸: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا بَدَّنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَثَقُلَ كَانَ اَكْثَرُ صَلَاتِهٖ جَالِسًا۔

(متفق علیه)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۵۰٦ حديث رقم (۱۱۷۔۷۳۲)۔وأحمد فی المسند ٦/۱۱٤۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک جب بھاری ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر نفل نماز بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: "لمّا بدّن رسول اللہ ﷺ" دال کی تشدید کے ساتھ التبدین سے ماخوذ ہے یعنی بڑھاپے اور کمزوری کا لاحق ہو۔ اگر دال کی تخفیف کے ساتھ لیں تو اس کا معنی ہوگا گوشت کا بڑھ جانا۔ مرادی معنی یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کا جسم اطہر جب بوجھل ہوگیا اور حرکت میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔

"وثقل" یہ عطف تفسیر ہے۔

محدثین فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو سمین (موٹا) کہنا آپ کی بے ادبی ہے۔ البتہ ان روایات کا مفہوم یہ ہے کہ جسم پر گوشت عام حالت سے بڑھ گیا تھا۔ عمر کے بڑھنے کی وجہ سے ضعف، بیماری اور کمر دردی لاحق ہوگئی تھی۔

"کان اکثر صلاته" نفل نماز مراد ہے۔

"جالسًا" ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خصوصیات سے ہے کہ آپ بیٹھ کر بھی نماز پڑھتے تھے۔ تو آپ کو حالت قیام کی نماز کا ثواب ملتا تھا۔ کیونکہ جو سستی ثواب کو آدھا کرتی ہے آپ اس سے مامون ومحفوظ تھے۔

اس سے معلوم یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص فرض یا نفل نماز کو بیٹھ کر کسی عذر کی وجہ سے پڑھے تو اسے بھی پورا ثواب ملے گا۔ اس صورت میں یہ خصائص نبوی ﷺ میں سے نہ ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ کو عذر یا بلا عذر بیٹھنے کے باوجود پورا ثواب ملتا تھا تو یہ خصائص میں سے ہوگا۔

"متفق علیه" میرکؒ فرماتے ہیں کہ مسلم اور بخاری کے الفاظ میں بہت فرق ہے۔

نمازِ تہجد میں رسول اللہ ﷺ کی قراءت

۱۱۹۹: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ لَقَدْ عَرَفْتُ النَّظَائِرَ الَّتِیْ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقْرِنُ بَیْنَهُنَّ فَذَکَرَ عِشْرِیْنَ سُوْرَةً مِنْ اَوَّلِ الْمُفَصَّلِ عَلٰی تَالِیْفِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ سُوْرَتَیْنِ فِیْ رَکْعَةٍ اٰخِرُهُنَّ حٰمٓ الدُّخَانُ وَعَمَّ یَتَسَآءَ لُوْنَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۲۵۵ حدیث رقم ۷۷۵۔ومسلم ۱/۵۶۵ حدیث رقم (۲۷۹۔۸۱۲) والنسائی ۲/۱۷۴ حدیث رقم ۱۰۰۴ وأحمد فی المسند ۱/۴۳۶۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے وہ سورتیں معلوم ہیں جو آپس میں مشابہ ہیں اور رسول اللہ ﷺ جنہیں جمع کرتے تھے وہ بیس سورتیں ہیں جو مفصلات کے شروع میں ہیں، ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے شمار کر کے بتائیں۔ رسول اللہ ﷺ ان سورتوں کو اس طرح جمع کیا کرتے تھے کہ ایک رکعت میں دو دو سورتیں ملا کر پڑھا کرتے تھے اور ان بیس سورتوں میں آخری دو سورتیں سورۃ حٰمٓ الدُّخَانُ اور عَمَّ یَتَسَآءَ لُوْنَ ہیں۔

تشریح: "قال لقد عرفت النظائر" النظائر جمع النظیرة کی بمعنی مثل اور شبہ، مراد یہ ہے کہ میں نے ان سورتوں کو پہچان لیا جو طول وقصر میں ایک جیسی ہیں۔

شیخ جزری نے تصحیح المصابیح میں اس روایت کو امام ابوداؤد کے حوالہ سے یوں بیان کیا ہے کہ حضرت علقمہ اور حضرت اسود روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، انہوں نے کہا میں آج رات ایک رکعت میں

مفصلات کی تمام سورتوں کی تلاوت کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت میں ایک جیسی دوسورتیں پڑھتے تھے، آپ ایک رکعت میں الرحمن اور النجم، ایک رکعت میں واقتربت اور الحاقة، ایک رکعت میں والطور اور لذاریات، ایک رکعت میں واذا وقعت اور والنون، ایک رکعت میں وسأل سائل اور والنازعات، ایک رکعت میں ویل للمطففین اور عبس، ایک رکعت میں المدثر اور المزمل، ایک رکعت میں هل أتى اور لا اقسم بيوم القيامة، ایک رکعت میں عم يتسألون اور المرسلات اور ایک رکعت میں الدخان اور اذالشمس كورت کی قراءت کرتے تھے۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تالیف عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے۔

صحیح ابن خزیمہ میں یہ حدیث موجود ہے البتہ وہاں کچھ کمی اور ترتیب کے اختلاف کے ساتھ آئی ہے۔

علامہ جزری فرماتے ہیں کہ سورتوں کی ترتیب کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ ترتیب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے توقیف پرمبنی ہے یا صحابہ کرام کا اس ترتیب پر اجماع ہوا ہے۔ یا بعض کی ترتیب توقیفی اور بعض کی اجماع پرمبنی ہے۔ البتہ اس بات پر اجماع ہے کہ قرآن مجید اس ترتیب پر نازل نہیں ہوا جس پر آج موجود ہے۔ نیز اس کو اسی موجودہ ترتیب پر پڑھنے پر بھی اجماع ہے۔ البتہ حفظ کرنے والے بچوں کیلئے ضرورت تعلیم کی بنا پر آخر سے پڑھنا بھی درست ہے۔ نماز میں غیر مرتب پڑھنا غیر اولی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غیر مرتب پڑھنا مکروہ ہے۔

اگر ایک آدمی نے پہلی رکعت میں سورۃ الناس پڑھی تو اب وہ دوسری رکعت میں کیا پڑھے؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سورۃ الناس ہی دوبارہ پڑھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سورۂ بقرہ شروع سے المفلحون تک پڑھ لے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ یہ راجح ہے کیونکہ افادہ اعادہ سے بہتر ہے۔

اس حدیث کے بارے میں یہ بات واضح رہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اس شخص کو ڈانٹنا محض ترغیب کیلئے تھا وگرنہ ایک رکعت میں مفصلات کی قراءت بھی جائز ہے۔

الفصل الثانی:

نمازِ تہجد کی کیفیت

۱۲۰۰: عَنْ حُذَيْفَةَ اَنَّهٗ رَأَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ فَكَانَ يَقُوْلُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ ثَلَاثًا ذُوالْمَلَكُوْتِ وَالْجَبَرُوْتِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ ثُمَّ اسْتَفْتَحَ فَقَرَأَ الْبَقَرَةَ ثُمَّ رَكَعَ فَكَانَ رُكُوْعُهٗ نَحْوًا مِّنْ قِيَامِهٖ فَكَانَ يَقُوْلُ فِيْ رُكُوْعِهٖ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمُ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ فَكَانَ قِيَامُهٗ نَحْوًا مِّنْ رُكُوْعِهٖ يَقُوْلُ لِرَبِّيَ الْحَمْدُ ثُمَّ سَجَدَ فَكَانَ سُجُوْدُهٗ نَحْوًامِّنْ قِيَامِهٖ فَكَانَ يَقُوْلُ فِيْ سُجُوْدِهٖ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ السُّجُوْدِ وَكَانَ يَقْعُدُ فِيْمَا بَيْنَ السَّجْدَ تَيْنِ نَحْوًامِّنْ سُجُوْدِهٖ وَكَانَ يَقُوْلُ رَبِّ اغْفِرْلِيْ رَبِّ اغْفِرْلِيْ فَصَلّٰى اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ قَرَأَفِيْهِنَّ الْبَقَرَةَ

وَآلَ عِمْرَانَ وَالنِّسَاءَ وَالْمَائِدَةَ اَوِالْاَنْعَامَ شَكَّ شُعْبَةُ ۔(رواہ ابو داود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ١/ ٥٤٤ حديث رقم ٨٧٤ـ والنسائي ٢/ ٢٣١ حديث رقم ١١٤٥ـ

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو رات کے وقت تہجد کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا چنانچہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ اللہ اکبر کہا، اور اس کے ساتھ پڑھا **ذوالملکوتِ والجبروتِ والکبریاء والعظمة** پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے ثناء پڑھی اور **سورۃ بقرہ** کی تلاوت کی اور اس کے بعد رکوع کیا اور آپ کا رکوع تقریباً قیام کے برابر تھا اور رکوع میں آپ ﷺ نے **سبحان ربی العظیم** پڑھا، پھر رکوع سے سر اٹھایا اور تقریباً آپ کا قومہ رکوع کے برابر تھا اور آپ نے اٹھتے ہوئے (**سمع اللہ لمن حمدہ**) کہنے کے بعد **لربی الحمد** کے الفاظ دہرائے پھر سجدہ کیا اور آپ کا سجدہ تقریباً قومہ کے برابر تھا اور سجدہ میں آپ ﷺ نے **سبحان ربی الاعلیٰ** کہا، پھر آپ ﷺ نے سجدہ سے سر اٹھایا اور دو سجدوں کے درمیان جلسہ کیا تقریباً سجدہ کے برابر اور اس میں کہتے رہے **رب اغفر لی رب اغفر لی**، اس طرح آپ ﷺ نے چار رکعتیں پوری کیں اور ان چار رکعتوں میں سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران، سورۂ نساء، سورۂ مائدہ یا سورۂ انعام کی قراءت کی۔ شعبہ کو مائدہ یا انعام میں شک ہے۔

تشریح: ''**فکان**'' علامہ طیبی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کی فاء تفصیل کیلئے ہے۔ ایک نسخہ میں ''**و کان**'' (لواو) کے ساتھ ہے۔

''**یفعل**'' یعنی نیت قلبی کے بعد۔

''**اللّٰہ اکبر**'' وہ اللہ جو ہر چیز سے بڑا اور عظمت والا ہے۔ بعض علماء نے اکبر کی تفسیر کبیر سے کی ہے۔ یہ تفسیر ضعیف ہے۔ اللہ اکبر کا ایک معنی یہ بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے بالاتر اور بلند ہے کہ اس کی کبریائی اور عظمت کی تہہ تک پہنچا جائے۔

''**ذوالملکوت**'' ملکوت مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا مطلب ہے ظاہر اور باطنی بادشاہت کا مالک۔

''**والجبروت**'' فعلوت کے وزن پر ہے۔ جبر سے مشتق ہے اس کا معنی ہے غلبہ وقہر۔ جبار سے مراد وہ ذات جو بندوں کو زبردستی اپنے ارادے پر ڈال سکے۔ جبار کا ایک معنی مخلوق سے برتر و بلند بھی کیا گیا ہے۔

''**والکبریا والعظمة**'' یعنی کبریائی اور عظمت کی انتہاء والا۔ ان الفاظ کے معنی کے پیش نظر انہیں غیر اللہ کے لیے وصف نہیں بنا سکتے۔ ان دو الفاظ کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں:

① اللہ تعالیٰ تمام مخلوق سے بلند و رفیع ہے اور ساری مخلوق اس کی تابعدار ہے۔

② یہ الفاظ ذات وصفات کے کمال سے عبارت ہیں۔

③ کبریاء سے مراد ہر نقص سے پاک ہونا اور عظمت سے مراد احاطہ وادراک میں نہ آنا ہے۔

تحقیق شدہ قول یہ ہے کہ ان دونوں الفاظ میں فرق ہے۔ کیونکہ ایک حدیث قدسی میں آیا ہے۔

''کبریائی میری چادر اور عظمت میرا انداز ہے جو ان کے بارے میں مجھ سے منازعہ کرے گا میں اسے توڑ دوں گا اور اسے

ہلاک کردوں گا''

''ثم استفتح'' اس کی مراد میں دو قول ہیں:

① ثناء پڑھی، ثناء کو دعاء الاستفتاح بھی کہتے ہیں۔

② قراءت سے شروع فرمایا۔ یعنی بیان جواز کیلئے ثناء نہ پڑھی یا ثناء کے بعد قراءت سے شروع فرمایا۔

دوسرا معنی لینے کی صورت میں دوسری روایات سے اس کا تعارض ختم ہو جائے گا۔

''فقرأ البقرة'' سورۂ بقرہ پوری پڑھی یا سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ بقرہ کا کچھ حصہ پڑھا۔ اس میں سورۂ فاتحہ کا ذکر معلوم ہونے کی بنا پر نہیں۔ (یعنی سورۂ فاتحہ تو پڑھی ہی ہے البتہ اس کے بعد سورۂ بقرہ پڑھی)۔

''فکان رکوعه نحوا من قیامه'' یعنی رات کی نماز میں آپ ﷺ کا رکوع معمول کے مطابق نہ تھا بلکہ قیام کی طرح طویل تھا۔

ثم رفع رأسه من الرکوع 'فکان قیامه: رکوع سے اٹھنے کے بعد۔ نحواً قریباً من رکوعه ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض نسخوں میں ''من رکوعه'' کی جگہ ''من قیامه'' کے الفاظ ہیں اس صورت میں سیدھا کھڑا ہونا (قومہ) مزید طویل ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ ہمارے نزدیک رکن قصیر ہے۔ اسی وجہ سے علامہ نووی نے اس کے طویل ہونے کو اختیار کیا اور اپنی بعض کتابوں میں اس کے لزوم پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ ایک متفق علیہ حدیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہے جس میں آیا ہے:

''اذا صلی احدکم لنفسه فلیطول ما شاء''

البتہ شیخ ابن حجر رحمہ اللہ نے جن نسخوں کا ذکر کیا ہے اصول مقررہ تصحیح شدہ میں یہ الفاظ موجود نہیں۔

''نحواً من قیامه'' اس قیام سے قراءت والا قیام مراد ہے جیسا کہ عصام الدین نے کہا ہے۔ گویا کہ آپ چاہتے تھے کہ سجدہ رکوع سے کم نہ ہو۔

البتہ راجح یہ ہے کہ اس قیام سے مراد رکوع کے بعد والا قیام (قومہ) لیا جائے، ابن حجر رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے۔

''وکان یقول'' یعنی دونوں سجدوں کے درمیانی جلسہ میں۔

''رب اغفرلی رب اغفرلی'' اس دعا کے تکرار میں دو مقصد ہو سکتے ہیں:

① یہ جملہ دو مرتبہ ہی ادا فرمایا۔

② اکثار کی طرف اشارہ ہے یعنی بہت زیادہ مرتبہ اس جملہ کو ادا فرمایا (لیکن راوی نے دو مرتبہ کا ذکر کیا) اس کی نظائر موجود ہیں۔

''والمائدة او الانعام شك شعبة'' شعبہ راوی کو شک ہے کہ سورۂ انعام پڑھی یا سورۂ مائدہ۔ سورۂ مائدہ کا پڑھنا زیادہ راجح ہے کیونکہ اس میں ترتیب کی رعایت ہے۔

''رواہ ابو داؤد'' میرکؒ فرماتے ہیں کہ نسائی اور ترمذی نے ابو حمزہ مولی الانصار عن رجل من بنی عبس عن حذیفه کی سند سے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ ابو حمزہ ہمارے نزدیک طلحہ بن زید ہیں جبکہ امام نسائی نے انہیں

طلحہ بن یزید کہا ہے۔ امام نسائی کا قول راجح ہے۔
نامعلوم شخص سے مراد ''صلة نبي زفر العنبسي الكوفي'' ہیں۔

تہجد کی نماز میں طویل قیام کی فضیلت

۱۲۰۱: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ قَامَ بِعَشْرِ اٰيَاتٍ لَمْ يُكْتَبْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ وَمَنْ قَامَ بِمِائَةِ اٰيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْقَانِتِيْنَ وَمَنْ قَامَ بِاَلْفِ اٰيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْمُقَنْطِرِيْنَ۔

(رواہ ابوداود)

أخرج أبوداؤد في السنن ۲/ ۱۱۸ حديث رقم ۱۳۹۸۔ والدارمي ۲/ ۵۵۷ حديث رقم ۳۴۵۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی دس آیتوں کی قراءت کے ساتھ قیام کرے، تو وہ غافلین میں سے شمار نہیں کیا جاتا، اور جو آدمی سو آیتوں کی قراءت کرے اور اتنی مقدار میں قیام کرے تو اس کو فرماں برداروں میں لکھا جاتا ہے، اور جو آدمی ہزار آیتوں کی قراءت کرے تو اس کا نام بہت زیادہ ثواب حاصل کرنے والوں میں لکھا جاتا ہے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''من قام بعشر آيات'' یعنی جس شخص نے دس آیات کو غور وفکر کے ساتھ پڑھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دس آیات کھڑے ہو کر پڑھ لے اور اس میں نماز کی نیت نہ کرے تو اس کو بھی یہ فضیلت حاصل ہوگی۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص ان آیات کو عزم وقوت کے ساتھ پڑھے اسے یہ فضیلت ملے گی۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو شخص دو یا زیادہ رکعات میں دس آیات پڑھے اسے بھی یہ فضیلت مل جائے گی۔ سیاق کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دس آیات سورۂ فاتحہ کے علاوہ ہیں۔

راجح یہ ہے کہ اس جملہ میں نماز کے اقل مرتبہ کو بیان کرنا مقصود ہے۔ وہ اس طرح کہ سات آیات سورۂ فاتحہ کی اور کم از کم تین آیات نماز میں فرض مقدار ہیں۔

''لم يكتب من الغافلين'' یعنی اس کا نام غافلین کے صحیفہ میں نہ لکھا جائے گا۔

''ومن قام بمائة آية كتب من القانتين'' قانتین سے مراد وہ لوگ جو اطاعت پر استقامت اختیار کرنے والے اور عبادت میں انتہائی کوشش کرنے والے ہیں۔ قنوت سے مراد طاعت اور قیام ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قانتین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے حکم کو پورا کرنے، اس کی طاعت کا التزام کرنے والے اور اس کے دربار میں عاجزی کرنے والے ہیں۔ یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت ہر حال میں موجب فضیلت وبرکت ہے۔ لیکن اس کا بلند ترین مرتبہ نماز کی قراءت ہے۔ خاص طور پر جب تہجد کی نماز ہو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَّأَقْوَمُ قِيْلًا﴾ [المزمل:٦]

''کچھ شک نہیں کہ رات کا اٹھنا (نفس بہیمی کو) سخت پامال کرتا ہے اور اس وقت ذکر بھی خوب درست ہوتا ہے۔''

اسی وجہ سے محی السنۃؒ اس حدیث کو تہجد کے باب میں لائے ہیں۔

''من قام بألف آية'' ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سورۂ ملک سے آخر قرآن تک سو آیات ہیں۔

''کتب من المقنطرين'' مقنطرین سے مراد بہت سا اجر حاصل کرنے والے ہیں۔ یہ لفظ قنطار سے ماخوذ ہے۔ قنطار مال کثیر کو کہتے ہیں۔

ابوعبیدہ رحمہ اللہ کا خیال یہ ہے کہ ہم نے عربوں میں قنطار نام کا کوئی پیمانہ نہیں دیکھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عربوں سے قنطار کی مقدار وزن میں مختلف اقوال منقول ہیں:

① قنطار چار ہزار دینار کو کہتے ہیں۔ جب قناطیر قنطرہ کہا جائے تو بارہ ہزار دینار مراد ہوتے ہیں۔

② ایک بیل کی کھال بھر سونا کو قنطار کہتے ہیں۔

③ مال کثیر کی نامعلوم مقدار، علامہ طیبی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

④ ستر ہزار دینار۔ ابن ملک رحمہ اللہ کی رائے ہے۔

⑤ امام میرکؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ قنطار بارہ اوقیہ کا ہوتا ہے اور ایک اوقیہ زمین وآسمان کے درمیان کی چیزوں سے بہتر ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت کیا گیا ہے کہ ایک قنطار بارہ سو اوقیہ کا ہوتا ہے اور ایک اوقیہ زمین وآسمان کی چیزوں سے بہتر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس طرح کی ایک حدیث حضرت ابوامامہؓ سے بھی منقول ہے جس میں وارد ہے:

''جس نے ایک رات میں ہزار آیات کی تلاوت کی اسے ایک قنطار ملے گا اور ایک قنطار بارہ سو اوقیہ کے برابر ہے''۔

ابن حبان نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن اس میں ''ومن قام بمائتي آية كتب من المقنطرين'' کے الفاظ ہیں۔

تہجد کی نماز میں قراءت کا طریقہ

۱۲۰۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ كَانَتْ قِرَاءَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاللَّيْلِ يَرْفَعُ طَوْرًا وَيَخْفِضُ طَوْرًا ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۲/۸۱ حديث رقم ۱۳۲۸۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رات کی نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کبھی بلند آواز سے ہوتی تھی اور کبھی پست آواز سے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''كانت قراءة النبي ﷺ بالليل'' اس سے مراد نماز کی قراءت بھی ہو سکتی ہے۔ اور تلاوت بھی۔ اس جملہ کی خبر محذوف ہے اور وہ ''مختلفه'' ہے۔

''ويخفض طورًا'' یعنی اگر کوئی سویا ہوتا تو آہستہ آواز سے پڑھتے۔ حاصل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر موقع محل کی مناسبت

سے قراءت فرماتے تھے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یرفع' کان کی خبر ہے اور عائد محذوف ہے اصل عبارت یہ ہوگی۔

''یرفع علیہ السلام فیھا طورًا صوتہ''۔

اگر ان الفاظ کو مجہول روایت کیا جائے تانیث کے صیغہ کے ساتھ اس کی خبریت ظاہر ہوگی۔ اور مفعول مقدر ماننے کی ضرورت نہ ہوگی۔

۱۲۰۳: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَتْ قِرَاءَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى قَدْرِ مَا يَسْمَعُهُ مَنْ فِي الْحُجْرَةِ وَ هُوَ فِي الْبَيْتِ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ۲/ ۸۱ حديث رقم ۱۳۲۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی آواز سے قراءت کرتے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ کے اندر پڑھ رہے ہوں، تو باہر صحن میں موجود آدمی سن لیتا تھا۔ اس حدیث کو امام ابوداوٗد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''علی قدر ما یسمعه'' یسمعه میں مفعول کی ھو ضمیر کی تذکیر مقرو کے اعتبار سے ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یسمعه کی ھو ضمیر صوت یا رفع کی طرف لوٹتی ہے۔

''من فی الحجرۃ وھو فی البیت'' حجرہ سے مراد گھر کا صحن ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ بیت سے مراد ہی حجرہ ہو۔

علامہ عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو قراءت کرتے تو آواز نہ زیادہ بلند کرتے اور نہ زیادہ آہستہ کرتے کہ کوئی سن ہی نہ سکے اور جب مسجد میں قراءت کرتے تو اکثر بلند آواز سے کرتے تھے۔ (ذکرہ ابن ملک)

حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو کیفیت قراءت کی ہدایت

۱۲۰۴: وَعَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ لَيْلَةً فَاِذَا هُوَ بِاَبِيْ بَكْرٍ يُصَلِّيْ وَيَخْفِضُ مِنْ صَوْتِهٖ وَمَرَّ بِعُمَرَ وَهُوَ يُصَلِّيْ رَافِعًا صَوْتَهٗ قَالَ فَلَمَّا اجْتَمَعَا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا اَبَا بَكْرٍ مَرَرْتُ بِكَ وَاَنْتَ تُصَلِّيْ تَخْفِضُ صَوْتَكَ قَالَ قَدْ اَسْمَعْتُ مَنْ نَاجَيْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! وَقَالَ لِعُمَرَ مَرَرْتُ بِكَ وَاَنْتَ تُصَلِّيْ رَافِعًا صَوْتَكَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اُوْقِظُ الْوَسْنَانَ وَاَطْرُدُ الشَّيْطَانَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَا بَكْرٍ اِرْفَعْ مِنْ صَوْتِكَ شَيْئًا وَقَالَ لِعُمَرَ اِخْفِضْ مِنْ صَوْتِكَ شَيْئًا۔ (رواہ ابوداود وروی الترمذی نحوہ)

أخرجه أبو داؤد في السنن ۲/ ۸۱ حديث رقم ۱۳۲۹۔ والترمذي ۲/ ۳۰۹ حديث رقم ۴۴۷۔

ترجمہ: حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت باہر نکلے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے، وہ نماز پڑھ رہے تھے، اور پست آواز سے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے پھر

آپ ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے وہ بھی نماز پڑھ رہے تھے، اور بلند آواز سے قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ حضرت ابو قتادہؓ فرماتے ہیں جب صبح کے وقت یہ دونوں حضرات رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جمع ہوئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! آج رات میں تمہارے پاس سے گزرا، تو تم اپنی نماز میں پست آواز کے ساتھ قراءت کر رہے تھے، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں جس ذات سے مناجات کر رہا تھا اسی کو سنا رہا تھا، پھر آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ! آج رات میں تمہارے پاس سے گزرا، تو تم اپنی نماز میں بلند آواز سے قرآن پڑھ رہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں بلند آواز سے قراءت کر کے سوئے ہوئے لوگوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا، آپ ﷺ نے دونوں کی بات سن کر فرمایا اے ابوبکر! آپ اپنی آواز کو کچھ بلند کریں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ اپنی آواز کو کچھ پست کریں۔ اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے، اور امام ترمذیؒ نے بھی اس کے مثل روایت نقل کی ہے۔

تشریح: ''قد اسمعت من ناجيت يا رسول الله'' حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آہستہ پڑھنے کی علت کو بیان فرما رہے ہیں۔ یعنی میں اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہوں اور وہ بلند آواز کا محتاج نہیں۔

''أوقظ الوسنان'' الوسنان سے مراد ایسا سویا ہوا شخص جو اپنی نیند میں مستغرق نہ ہو۔

''وأطرد الشيطان'' یعنی شیطان کے وسوسہ کو دور کرتا ہو جو اللہ کی یاد سے غافل کرتا ہے۔

ان دونوں حضرات کے مقام و مرتبہ میں تامل فرمائیں۔ ان دونوں حضرات کی نیت اپنے اپنے فعل میں بہت اچھی اور عمدہ تھی۔ لیکن سب سے کامل حالت نبی کریم ﷺ کی تھی۔ آپ نے طبیب حاذق اور حبیب مشفق کی حیثیت سے دونوں ساتھیوں کی تربیت فرمائی۔

''يا أبا بكر ارفع من صوتك شيئا'' یعنی اے ابوبکر! تم اپنی آواز کو تھوڑا سا بلند کر لو تا کہ سننے والے کو اس سے فائدہ ہو اور ہدایت کا طالب اس سے نصیحت حاصل کرے۔ اب چونکہ ان کے مزاج پر توحید کا اثر غالب تھا جو غیر اللہ کو مکمل طور پر نگاہوں سے ہٹا دیتا ہے۔ یہ اکمل المراتب اور افضل المناصب ہے۔ رسل کرام اور اولیاء عظام کا یہی وظیفہ حیات ہوتا ہے۔

''وقال لعمر اخفض من صوتك شيئا'' یعنی اے ابوعمر! تم اپنی آواز کو تھوڑا سا پست کر لو تا کہ نمازی اور سونے والے کو تکلیف نہ ہو۔ حضور ﷺ کے ارشاد کا منشاء ان کے مزاج کو معتدل بنانا تھا کیونکہ برودتِ خلق اور کافوریتِ شیطان ان کے مزاج پر غالب تھی۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں توحید کا غسل کرنے کا حکم دیا جس میں لوگوں کی شفاء ہے۔ انہیں مناجات کی حلاوت استعمال کرنے کو کہا جس میں عبادات کی لذت ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قول کی نظیر یہ آیت ہے:

﴿ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴾ [الاسراء: ۱۱۰]

''اور نماز نہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ آہستہ بلکہ اس کے بیچ کا طریقہ اختیار کرو۔''

گویا کہ حضور ﷺ نے صدیق اکبرؓ سے فرمایا کہ اپنے رب سے مناجات میں کچھ کمی کر کے اپنی قراءت میں مخلوق کا حصہ بھی

رکھو اور حضرت عمرؓ نے فرمایا مخلوق سے تھوڑا سا الگ ہو کر اپنے رب سے مناجات کی طرف بھی توجہ دو۔

رسول اللہ ﷺ کا پوری رات ایک آیت کو بار بار پڑھنا

۱۲۰۵: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی اَصْبَحَ بِاٰیَۃٍ وَالْاٰیَۃُ اِنْ تُعَذِّبْھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْلَھُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔ (رواہ النسائی وابن ماجۃ)

أخرجه النسائي في السنن ۱۷۷/۲ حدیث رقم ۱۰۱۰۔وابن ماجه في السنن ۴۳۹/۱ حدیث رقم ۱۳۵۰۔ وأحمد في المسند ۱۴۹/۵۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ تہجد کی نماز میں صبح تک کھڑے رہے اور یہ آیت پڑھتے رہے ﴿ان تعذبھم......﴾ اگر تو انہیں عذاب دے تو تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں معاف کردے تو تُو غالب اور حکمت والا ہے۔ اس حدیث کو امام نسائیؒ، امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''قام رسول اللّٰہ ﷺ حتی اصبح'' ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے پوری رات قیام کیا۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن ملک کے اس قول پر گرفت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ آپ ﷺ سے پوری رات عبادت کرنا ثابت نہیں ہے۔

اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے نیند کے بعد قیام فرمایا اور صبح تک عبادت کرتے رہے۔

''بایۃ'' یہ قام کے متعلق ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ قیام کے دوران ایک آیت کو پڑھتے رہے اور اس کے معانی میں بار بار غور و فکر کرتے رہے۔

''والایۃ ان تعذبھم فانھم عبادك'' یعنی اگر تو امت اجابت کو عذاب دے تو وہ اس کے مستحق ہیں کیونکہ تیرے بارے میں ظلم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں استعطاف لطیف ہے (یعنی انتہائی عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا سوال کیا جا رہا ہے)

''وان تغفرلھم'' یعنی اگر تو ان کے گناہوں کو معاف کر دے تو وہ تیرے بندے ہیں۔

''فانك انت العزیز'' یعنی تو اپنے ارادے پر غالب ہے۔

''الحکیم'' ایسا حاکم جس کے حکم میں تبدیلی کرنے والا کوئی نہیں یا ایسا حکم چیزوں کو ان کی جگہ رکھتا ہے۔ عزیز سے مراد وہ ذات جو اپنے مخالفین سے انتقام لے۔ اور حکیم سے مراد وہ ذات جو اپنے موافق لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے۔

ابن ملک فرماتے ہیں:

''اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حضرت عیسیٰؑ نے ان الفاظ میں سرگوشی کی اے اللہ! اگر تو میری امت کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں۔ اب اللہ اگر اپنے بندے کو سزا دے تو کوئی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایمان و اطاعت کی وجہ سے معاف کر دے تو وہ عزیز و حاکم ہے''۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس آیت کا تعلق چونکہ قیامت کے دن کے ساتھ ہے اس لئے مغفرت کی تفسیر توفیق ایمان سے کرنا زیادہ مناسب نہیں ہے۔

فجر کی سنتوں کے بعد لیٹنے کا حکم

۱۲۰۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ فَلْیَضْطَجِعْ عَلٰی یَمِیْنِهٖ۔ (رواہ الترمذی وابو داود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۴۷/۲ حدیث رقم ۱۲۶۱۔والترمذی ۲۸۱/۲ حدیث رقم ۴۲۰۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی فجر کی دو سنتیں پڑھ لے تو اس کو چاہیئے کہ اپنی دائیں کروٹ پر لیٹ جائے۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ اور امام ابو داؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''اذا صلی احدکم رکعتی الفجر'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد فجر کی سنتیں ہیں۔

''فلیضطجع علی یمینه'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیام لیل کی تھکاوٹ کو دور کرنے کیلئے آرام فرماتے تھے پھر نشاط وانبساط کے ساتھ فرض نماز پڑھتے تھے۔ جبکہ یہی بعض علماء کا مسلک ہے۔

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ تہجد پڑھنے والے کے حق میں یہ امر استحبابی ہے''۔

اس بنیاد پر مسجد کے بجائے گھر میں لیٹنا زیادہ بہتر ہے تاکہ نمازِ تہجد کا اخفاء ہو سکے۔ یہ بھی اہتمام رہے کہ اگر نیند کا غلبہ ہو جائے تو وضو ضرور کر لے۔ ہمارے شیخ اور استاذ الحدیث سید ذکریا رحمہ اللہ یہی فرمایا کرتے تھے۔

الفصل الثالث:

عمل پر مداومت محبوب ہے

۱۲۰۷: عَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ سَاَلْتُ عَائِشَةَ اَیُّ الْعَمَلِ کَانَ اَحَبَّ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَتِ الدَّائِمُ قُلْتُ فَاَیَّ حِیْنٍ کَانَ یَقُوْمُ مِنَ اللَّیْلِ قَالَتْ کَانَ یَقُوْمُ اِذَا سَمِعَ الصَّارِخَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۶/۳ حدیث رقم ۱۱۳۲۔ومسلم فی صحیحه ۵۱۱/۱ حدیث رقم (۱۳۱۔۷۴۱) وأبوداوٗد ۷۷/۲ حدیث رقم ۱۳۱۷۔والنسائی ۲۰۸/۳ حدیث رقم ۱۶۱۶۔

ترجمہ: حضرت مسروقؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں، کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب عمل کونسا تھا تو انہوں نے فرمایا جس عمل کو ہمیشہ کیا جائے، میں نے پھر دریافت کیا کہ کونسا وقت؟ تو انہوں نے فرمایا رات کے وقت تہجد کی نماز۔ میں نے پھر دریافت کیا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس وقت کھڑے ہوتے تھے، تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کھڑے ہو جاتے تھے، جب مرغ کی آواز سنتے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''ای العمل کان أحب الی رسول اللہ ﷺ قالت الدائم'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''الدائم''

سے مراد وہ عمل ہے جس پر صاحب عمل دوام اور ہمیشگی اختیار کرے۔ اسی وجہ سے مندرجہ ذیل آیت میں صرف لفظ "ثم" حرف تراخی کو داخل کیا گیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ [فصلت: ۳۰]

"جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے پھر وہ (اس پر) قائم رہے۔"

"اذا سمع الصارخ" الصارخ سے مراد مرغ کی بانگ ہے۔

آپ ﷺ کا معمول مرغ کی بانگ پر جاگنے کا نہ تھا بلکہ اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کا رات کے وقت اٹھنے کا عمل

۱۲۰۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ مَا كُنَّا نَشَاءُ اَنْ نَّرٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي اللَّيْلِ مُصَلِّيًا اِلَّا رَاَيْنَاهُ وَلَا نَشَاءُ اَنْ نَّرَاهُ نَائِمًا اِلَّا رَاَيْنَاهُ۔ (رواه النسائی)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲۲/۳۔ حدیث رقم ۱۱۴۱۔والترمذی ۱۴۰/۳ حدیث رقم ۷۶۹۔وأحمد فی المسند ۱۰۴/۳۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں اگر ہم چاہتے کہ رسول اللہ ﷺ کو رات کے وقت نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں تو ہم آپ کو نماز پڑھتے دیکھ لیتے اور اگر یہ چاہتے کہ ہم آپ کو سوئے ہوئے دیکھیں تو آپ کو سوتے دیکھ لیتے۔ اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے۔

تشریح: "ما كنا" ما نافیہ ہے۔ "فی اللیل" یعنی رات کے بعض حصہ میں۔

"مصليا الا رأيناه ولا نشاء أن نراه نائما الا رأيناه" علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم ان دو حالتوں میں سے جس حالت پر آپ کو دیکھنا چاہتے تھے دیکھ لیتے تھے، یعنی آپ ﷺ کا معمول اعتدال پر مبنی اور افراط وتفریط سے پاک تھا۔ آپ ﷺ جس حصہ میں سونا مناسب تھا اس میں سو جاتے اور جب اٹھ کر نماز پڑھنا بہتر تھا اس میں اٹھ کر نماز میں مشغول ہو جاتے۔

علامہ عسقلانی رحمہ اللہ نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ کی نیند اور نماز کا رات میں کوئی خاص وقت مقرر نہ تھا بلکہ آپ جب چاہتے سو جاتے جب چاہتے نماز میں مشغول ہو جاتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گذشتہ حدیث گھر کے معمول پر محمول ہوگی جبکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کا مصداق دوسرے مواقع ہوں گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے ظاہر سے نبی کریم ﷺ کے قیام ومنام کا تعدد معلوم ہو رہا ہے۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نقل کیا ہے جو کہ پہلے گزر چکا ہے۔

رات کی نماز کیلئے کئی بار جاگنا اور نماز پڑھنا پھر سو جانا

۱۲۰۹: وَعَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ قَالَ قُلْتُ وَاَنَا فِيْ سَفَرٍ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللّٰهِ لَاَرْقُبَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلصَّلَاةِ حَتّٰى اَرٰى فِعْلَهٗ فَلَمَّا صَلّٰى صَلَاةَ الْعِشَاءِ وَهِيَ الْعَتَمَةُ اِضْطَجَعَ هَوِيًّامِنَ اللَّيْلِ ثُمَّ اسْتَيْقَظَ فَنَظَرَ فِي الْاُفُقِ فَقَالَ رَبَّنَامَاخَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا حَتّٰى بَلَغَ اِلٰى اِنَّكَ لَاتُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ثُمَّ اَهْوٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى فِرَاشِهٖ فَاسْتَلَّ مِنْهُ سِوَاكًا ثُمَّ اَفْرَغَ فِيْ قَدَحٍ مِّنْ اِدَاوَةٍ عِنْدَهٗ مَاءً فَاسْتَنَّ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى قُلْتُ قَدْ صَلّٰى قَدْرَ مَانَامَ ثُمَّ اضْطَجَعَ حَتّٰى قُلْتُ قَدْ نَامَ قَدْرَ مَا صَلّٰى ثُمَّ اسْتَيْقَظَ فَفَعَلَ كَمَا فَعَلَ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَقَالَ مِثْلَ مَاقَالَ فَفَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَبْلَ الْفَجْرِ۔ (رواہ النسائی)

أخرجه النسائي في السنن ۳/۲۱۲ حديث رقم ۱۶۲۶۔

ترجمہ: حضرت حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابیؓ نے بیان کیا کہ میں ایک مرتبہ سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا، میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اللہ کی قسم میں نماز کے وقت آپ کو دیکھتا رہوں گا تاکہ میں رسول اللہ ﷺ کے افعال کو دیکھوں، جب آپ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھی جسے ہم عتمہ کہتے ہیں، تو اس کے بعد آپ ﷺ لیٹ گئے، پھر آپ ﷺ بیدار ہوئے اور آپ ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر یہ آیت پڑھی: ﴿ربنا ما خلقت هذا باطلاً﴾ یہاں تک کہ ﴿انك لا تخلف الميعاد﴾ تک پڑھا، پھر آپ ﷺ اپنے بستر کی طرف متوجہ ہوئے اور وہاں سے مسواک اتاری، پھر آپ ﷺ نے ایک چھاگل سے ایک برتن میں پانی ڈالا پھر مسواک کرنے کے بعد کھڑے ہو گئے اور آپ نے نماز پڑھی، میں نے کہا کہ جتنی دیر آپ ﷺ سوئے تھے اتنی ہی دیر آپ ﷺ نے نماز پڑھی پھر آپ لیٹ گئے، میں نے دل میں خیال کیا کہ جتنی دیر آپ ﷺ نے نماز پڑھی اتنی ہی دیر سوئے، پھر آپ بیدار ہوئے جو کچھ پہلے کیا تھا وہی اب کیا۔ جو کچھ پہلے پڑھا تھا وہی اب پڑھا اور آپ نے فجر کی نماز سے پہلے تین مرتبہ اس طرح کیا۔ اس حدیث کو امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

حمید بن عبدالرحمٰن۔ یہ ''حمید'' عبدالرحمٰن بن عوف زہری قریشی مدنی کے بیٹے ہیں۔ یہ کبار تابعین میں سے ہیں۔ ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔ ان کی عمر تہتر (۷۳) سال کی ہوئی۔

تشریح: ''عن حميد بن عبدالرحمن بن عوف'' مؤلف نے انہیں کبار تابعین میں ذکر کیا ہے۔

''قال ان رجلاً'' بظاہر اس سے مراد زید بن خالد جہنی ہیں۔

''من اصحاب النبي'' (علم اصول حدیث کی روشنی میں) ظہور عدالت کی بنا پر صحابی کا مجہول ہونا روایت کی صحت کو متاثر نہیں کرتا۔

''قلت'' اپنے دل میں کہا یا اپنے کسی ساتھی سے کہا۔

"وانا فی سفر" کسی غزوہ، عمرہ یا حج کا سفر مراد ہو سکتا ہے۔

"فلما صلی صلاۃ العشاء، وھی العتمۃ" عتمہ کا لفظ لا کر یا تو مغرب کی نماز سے احتراز ہے یا پھر عشاء کی تفسیر کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان حضرات میں عتمہ کا لفظ عشاء کے لفظ سے زیادہ مشہور تھا۔

"ھویًا" لفظ "ھاء" کے فتحہ اور لفظ "یاء" کے تشدید کے ساتھ کافی دیر تک۔

"حتی بلغ انك لا تخلف المیعاد" دوسری روایات میں یہ مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے سورت کے آخر تک تلاوت فرمائی تھی۔ اس روایات کے بارے میں محدثین نے دو باتیں کی ہیں:

① اس رات اتنا ہی پڑھا تھا۔

② راوی نے اتنا ہی سنا تھا چنانچہ یہیں تک نقل کر دیا۔

"ثم قام فصلّی" نئے وضو سے نماز پڑھی یا پہلے وضو سے، دونوں احتمال ہیں۔

"ثم اضطجع" اضطجاع سے مراد پہلو کو زمین پر رکھنا (سوئے بغیر) اور استیقاظ سے مراد پہلو کو زمین سے اٹھانا بھی ہو سکتا ہے۔ (حاصل یہ کہ نبی کریم ﷺ سوئے نہیں تھے محض لیٹے تھے)۔

رسول اللہ ﷺ کی تہجد کے بارے میں حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا بیان

۱۲۱۰: وَعَنْ يَعْلَى بْنِ مُمْلَكٍ اَنَّهٗ سَاَلَ اُمَّ سَلَمَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قِرَاءَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصَلَاتِهٖ فَقَالَتْ وَمَالَكُمْ وَصَلَاتَهٗ كَانَ يُصَلِّيْ ثُمَّ يَنَامُ قَدْرَمَاصَلّٰى ثُمَّ يُصَلِّيْ قَدْرَ مَا نَامَ ثُمَّ يَنَامُ قَدْرَ مَا صَلّٰى ثُمَّ يُصَلِّيْ قَدْرَ مَا نَامَ ثُمَّ يَنَامُ قَدْرَ مَا صَلّٰى حَتّٰى يُصْبِحَ ثُمَّ نَعَتَتْ قِرَاءَتَهٗ فَاِذَاهِيَ تَنْعَتُ قِرَاءَتَهٗ مُفَسَّرَةً حَرْفًا حَرْفًا۔ (رواہ ابوداود والترمذی والنسائی)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۲/۱۵۴ حديث رقم ۱۴۶٦۔ والترمذی ۵/۱٦۷ حديث رقم ۲۹۲۳۔ والنسائی ۳/۲۱۴ حديث رقم ۱٦۲۹۔ وأحمدفی المسند ٦/۳۰۰۔

ترجمہ: حضرت یعلی بن مملک سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ام سلمہؓ سے جو کہ رسول اللہ ﷺ کی زوجہ ہیں آپ کی قراءت اور نماز کے متعلق پوچھا، تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی قراءت اور نماز بیان کرنے سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ لیکن اگر آپ معلوم کرنا ہی چاہتے ہو تو سن لو! رسول اللہ ﷺ نماز پڑھتے تھے پھر جتنی دیر آپ نماز پڑھتے تھے اتنی دیر سو جاتے تھے پھر اٹھتے، پس اتنی دیر نماز پڑھتے تھے جتنی دیر سو جاتے تھے پھر اتنی دیر سو جاتے جتنی دیر تک نماز پڑھتے یہ سلسلہ صبح تک جاری رہتا تھا یہاں تک کہ آپ کی رات کی نماز مکمل ہو جاتی اور نیند پوری کر لیتے۔ اس کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے قراءت کی کیفیت بیان کی یہاں تک کہ انہوں نے اچھی طرح ایک ایک حرف کی ادائیگی وضاحت کے ساتھ بتائی اس حدیث کو امام ابوداودؒ، امام ترمذیؒ اور امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

یعلیٰ بن مملک ۔ یہ یعلیٰ ہیں۔ تابعی ہیں۔ مملک کے بیٹے (مملک بروزن جعفر ہے یعنی پہلا میم مفتوح دوسرا میم ساکن لام مفتوح اور آخر میں کاف ہے)۔ مقبول رواۃ میں سے ہیں اور تیسرے طبقہ کے روای ہیں۔ انہوں نے امّ سلمہ سے اور ان سے ابن ابی ملیکہ نے روایت کی۔

تشریح: ''**وعن یعلی بن مملك**'' مملك بروزن جعفر۔ طبقہ ثالثہ کے مقبول راویوں میں سے ہیں۔ تقریب میں یہی مذکور ہے۔

''**ام سلمة زوج النبی ﷺ**'' زوج النبی بدل ہے یا عطف بیان۔

''**فقالت مالكم و صلاته**'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں و مالکم کا عطف پچھلے پورے جملہ پر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا۔ ''**مالكم وقراء ته وما لكم وصلاته**'' وصلاته کی ''واؤ'' ''مع'' کے معنی میں ہے۔ عبارت یہ ہوگی۔ ''**ما تصنعون مع قراء ته و صلاته**''۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات اظہار افسوس وحسرت کیلئے کی کہ انہیں حضور ﷺ کے احوال یاد آگئے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ انہیں سائل کا سوال برا لگا۔

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے اس انداز بیان میں ایک احتمال یہ بھی کہ وہ سائل کو یہ کہنا چاہتی ہیں کہ جب تمہارے سامنے حضور ﷺ کی قراءت ونماز کی حالت بیان کروں گی تو تمہیں اس سے کیا فائدہ ہوگا حالانکہ تم ان جیسے اعمال کی طاقت نہیں رکھتے۔

اس میں ایک قسم کا تعجب ہے اور اس کی نظیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول:

''تم میں سے کون ان اعمال کی طاقت رکھتا ہے جن کی طاقت آپ ﷺ میں تھی''۔

''**كان يصلی ثم ينام قدر ما صلی، ثم يصلی قدر ما نام، ثم ينام قدرما صلی، حتی يصبح**'' اس جملہ کی مراد میں دو احتمال ہیں:

① صبح تک آپ کی نماز تین مختلف اوقات میں ہوتی تھی۔
② صبح تک سونے اور اٹھنے کی یہ حالت جاری رہتی تھی۔

''**تنعت قراء ة مفسرة حرفاً حرفاً**'' یعنی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ایسی تلاوت فرمائی جو واضح، ترتیل کے ساتھ قواعد تجوید کے مطابق، ممیز اور غیر مختلط تھی۔

حرفاً حرفاً کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے۔ وقف کی رعایت رکھتی تھیں۔

علامہ میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ میں دو احتمال ہیں:

① حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے (خود قراءت نہ کی بلکہ) صرف یہ بتلایا کہ نبی کریم ﷺ کی قراءت ایسی ایسی ہوتی تھی۔
② حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ایسی قراءت خود کر کے دکھائی جیسی قراءت نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے۔ اس کی مثال عربوں کا یہ قول ہے:

''**وجهها يصف الجمال**''۔ ''اس کا چہرہ حسن وجمال کو بیان کرتا ہے''

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ''وتصف السنتهم الكذب'' بھی اسی قبیل سے ہے۔
ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں دوسرا معنی قرین قیاس ہے۔

بَابُ مَا يَقُوْلُ اِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز میں جو کچھ پڑھتے تھے اُس کا بیان

الفصل الاول:

نمازِ تہجد کی دعا

۱۲۱۱: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ يَتَهَجَّدُ قَالَ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَيِّمُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ مَلِكُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ الْحَقُّ وَلِقَاءُكَ حَقٌّ وَّقَوْلُكَ حَقٌّ وَّالْجَنَّةُ حَقٌّ وَّالنَّارُ حَقٌّ وَّالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ وَّمُحَمَّدٌ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ حَقٌّ اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْكَ اَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ وَاِلَيْكَ حَاكَمْتُ فَاغْفِرْلِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۳/۳ حديث رقم ۱۱۲۰۔ ومسلم في صحيحه ۵۳۲/۱ حديث رقم ۹ (۱۹۹/ ۷۶۹)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات میں تہجد کی نماز کیلئے اٹھتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے اللهم لك الحمد'' اے میرے رب! تیرے ہی لیے تمام تعریفیں ہیں تو آسمانوں اور زمینوں کو قائم رکھنے والا ہے اور اس چیز کو جو ان دونوں کے درمیان ہے اور تمام تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں تو ہی زمینوں اور آسمانوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کو روشن کرنے والا ہے، اور تمام تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں اور تو ہی زمینوں کا اور آسمانوں کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک ہے' سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں' تو حق ہے' تیرا وعدہ حق ہے' تیری ملاقات حق ہے' تیرا کلام حق ہے' جنت حق ہے' جہنم حق ہے' تمام نبی حق ہیں' محمد صلی اللہ علیہ وسلم حق ہیں' قیامت حق ہے، اے اللہ! میں تیرا تابعدار ہوں میں نے تیرے تمام احکام قبول کیے۔ میں تجھ پر ایمان لایا تجھ پر بھروسہ کیا تیری طرف میں نے رجوع کیا۔ تیری ہی مدد سے میں دشمنوں سے جھگڑتا ہوں اور تیرے پاس اپنی فریاد لایا ہوں تو میرے ان گناہوں کو بخش دے جو مجھ سے سرزد ہوئے اور ان کو بھی جو بعد میں مجھ سے سرزد ہونگے میرے ایسے گناہوں کو بھی معاف فرما جو میں نے پوشیدہ طور پر

کئے اور جو ظاہری طور پر کیے اور جو میری خطائیں ہیں جنہیں تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے، معاف کر دے تو ہی آگے کرنے والا ہے اور تو ہی پیچھے کرنے والا ہے تو معبود ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: ''یتھجد'' یہ قام کی ''ھو'' ضمیر سے حال ہے۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ یہ دعا نماز شروع کرنے سے پہلے پڑھتے تھے۔ لیکن راجح یہ ہے کہ افتتاح کے بعد یا قومۂ اعتدال میں یہ دعا پڑھتے تھے جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔

''لک الحمد'' خبر کی تقدیم اختصاص پر دال ہے۔ اسی طرح لام جر اور ''الحمد'' میں لام جنس یا عہد کا اجتماع بھی تخصیص کا فائدہ دیتا ہے۔ اگر لام کو استغراق کیلئے ''لیس تو تیندد لالتیں'' جمع ہو جائیں۔

''انت قیم السموات والارض'' قیم اس ذات کو کہتے ہیں جو مخلوق کے امور کا اہتمام اور تدبیر کرے اور سارے عالم کے تمام حالات میں ان کے امور میں تصرف و تدبر کا ذمہ دار ہو۔

قیوم اس ذات کو کہتے ہیں جو خود بھی قائم ہے اور موجود چیز کا وجود اس کی وجہ سے ہے۔

''من فیھن'' یعنی تمام علوی اور سفلی مخلوقات۔

''انت نور السموت والارض'' اس جملہ کی مراد میں مختلف اقوال ہیں:

① زمین و آسمان کو منور کرنے والا۔

② ان دونوں کو ظاہر کرنے والا۔

③ ان کے نور کو پیدا کرنے والا۔

④ اس کا معنی یہ ہے کہ تو ہی وہ ذات ہے جس کی وجہ سے ہر چیز کا ظہور ہے اور تو ہی وہ ذات ہے جس کی وجہ سے مخلوق روشن ہوئی اور عدم کی ظلمت سے نکل کر وجود کی روشنی میں آئی۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نور کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''النور الذی یبصر بنورہ ذو العمایۃ ویرشد بھداہ ذو الغوایۃ''

''جس کی روشنی میں نابینا دیکھ سکے اور گمراہ ہدایت حاصل کر سکے''۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زمین و آسمان کی طرف نور کی اضافت اس کی روشنی کی وسعت اور اس کی ضیاء کی قوت کو بتانے کیلئے ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ النور سے مراد الھادی ہے۔ لیکن یہ معنی محل اعتراض ہے۔ کیونکہ ہدایت کی اضافت زمین و آسمان کی طرف کسی طرح بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس طرح تو من فیھن جو کہ معطوف ہے۔ اپنے معطوف علیہ سے اس کا اتحاد لازم آئے گا۔

اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کو نور فرمایا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا ''ہاں میں نے ایک نور دیکھا''۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں ایک نام النور بھی ہے۔

"ولك الحمد انت ملك السموات والارض ومن فيهن" یعنی تو زمین وآسمان میں کلی، ملکی، ظاہری اور باطنی تصرف کا مالک ہے۔ اس بادشاہت میں تیرا نہ کوئی شریک ہے نہ حصہ دار۔

"أنت الحق" یعنی تیرا وجود ثابت، حقیقی، دائمی، ازلی اور ابدی ہے۔

"ووعدك الحق" یعنی بندوں سے انعام وانتقام کے وعدوں اور وعیدوں کی تو کبھی مخالفت نہیں کرتا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "انت الحق اور ووعدك الحق میں لفظ "حق" کو معرفہ اور باقی جملوں میں نکرہ رکھا گیا۔ کیونکہ سلف وخلف میں اللہ تعالیٰ کے دائمی وجود اور بقاء اور غیر اللہ کے زوال کے بارے میں کسی کا انکار نہیں ہے:

"ألا كل شيءٍ ما خلا الله باطل"

"خبردار، اللہ کے علاوہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے"۔

وعدہ کے ایفاء کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ اللہ کے غیر کا وعدہ عجز یا مقصد کے بسبب ٹوٹ سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو نہ تو کوئی عجز ہے نہ وہ جان بوجھ کر اپنے وعدے کو توڑے گا۔

"ولقاء ك حق" اللہ تعالیٰ کی لقاء سے مراد دار آخرت کی طرف روانگی اور اللہ کے خزانوں سے حاصل کرنا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: زیارت الٰہی بھی لقاء میں داخل ہے۔

علامہ میرکؒ فرماتے ہیں: لقاء سے مراد قبروں سے اٹھنا یا اللہ تعالیٰ کی رؤیت ہے۔

اگر بطور سوال کے کہا جائے کہ لقاء تو وعدہ میں داخل ہے اس کا ذکر دوبارہ کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وعدہ مصدر ہے۔ اور جن چیزوں کا ذکر بعد میں ہے۔ وہ موعود ہیں یہ تخصیص بعد تعمیم ہے۔ جیسے اگلے جملہ "وقولك حق" میں قول کا ذکر وعد کے بعد تمیم بعد تخصیص ہے۔

"وقولك حق" حق سے مراد وہ چیز جو محقق الوجود اور ثابت ہوتی ہے۔ نیز قول کو صدق وکذب کا موصوف کرنا ایک الگ حیثیت ہے۔

پہلی دو چیزوں میں لفظ "حق" کو معرفہ اور بعد میں لفظ حق کو نکرہ لانے کی حکمت یہ ہے کہ معرف بلام الجنس اور نکرہ کے درمیان زیادہ فرق نہیں بلکہ اہل لغت نے صراحتاً ذکر کیا ہے کہ ان کا مصداق ایک ہے۔ ان میں صرف اتنا فرق ہے کہ معرفہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جس ماہیت پر لام داخل ہے وہ سامع کو معلوم ہے۔ نکرہ میں یہ اشارہ تو نہیں ہوتا۔ لیکن معلوم وہ بھی ہوتا ہے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں "وقولك الحق" (الحق کو معرفہ لایا گیا ہے)۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلے دو جملوں میں لفظ "الحق" کو معرفہ بنانا حصہ کی غرض کیلئے ہے۔

"ومحمد حق" امام میرکؒ فرماتے ہیں کہ تمام انبیاء میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنا اس امر کی طرف متوجہ کرنے کیلئے ہے کہ آپ کی شان سب سے جدا ہے اور آپ کو کچھ اوصاف کی بناء پر متوجہ کرنے کیلئے ہے کہ آپ کی شان سب سے جدا ہے۔ اور آپ کو کچھ ایسے اوصاف کی بنا پر فوقیت حاصل ہے جو آپ ہی کا خاصہ ہیں۔ کیونکہ تغایر وصف تغایر ذات پر دلالت کرتا ہے۔

"والساعة" قیامت اور قیامت کے دن کے احوال جیسے میزانِ اعمال، پل صراط، حوض کوثر اور حساب وکتاب سب مراد

ہیں۔

"وبك امنت" یعنی تیری تصدیق کی اور جن چیزوں پر تو نے ایمان کا حکم دیا ان سب پر ایمان لایا یا ترے کلام پر ایمان لایا۔

اس کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تیرے رسول کی خبروں پر ایمان لایا۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تیری توفیق سے ہر اس چیز پر ایمان لایا جو مجھے تیرے عذاب سے بچائے گی۔

"وعليك توكلت" علامہ میرکؒ نے اس کی مراد یہ بیان کی ہے کہ میں نے اپنے امور کو اسباب عادیہ سے قطع نظر کر کے تیرے سپرد کر دیا۔

"واليك انبت" ابن ملک فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ میں نے اپنے تمام احوال سے رجوع کر کے اپنے معاملہ کو تیرے سپرد کر دیا۔

صوفیاء فرماتے ہیں کہ توبہ کی حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان معصیت سے رجوع کر لے اور غفلت کو چھوڑ دے۔

"وبك" تیری قوت سے۔ یا تیری حجت سے یا تیری مدد سے۔

علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ مذکورہ تمام افعال کے صلات کی تقدیم تخصیص اور افادہ حصر کیلئے ہے۔

"فاغفرلي ما قدمت" "حسنات الابراء سيئات المقربين" کے تحت یہ دعا فرمائی۔

"وما أخرت" عبادت میں کمی مراد ہے۔

"وما اسررت" خفیہ کیا ہو یا دل میں اس کا خیال پیدا ہوا۔

"وما أعلنت" یعنی اقوال، افعال اور احوال میں پائی جانے والی بشری کمیاں بھی معاف کر دے۔ اگر سوال کیا جائے کہ نبی کریم ﷺ بخشے بخشائے ہیں آپ کو مغفرت کا سوال کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی مختلف توجیہات ہیں:

① تواضع کی وجہ سے۔ ② کسرنفسی کی وجہ سے۔

③ اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان اور جاہ وجلال کے پیش نظر۔ ④ تعلیم امت کیلئے۔

"وما انت اعلم به مني" تعمیم بعد التخصیص ہے۔

"أنت المقدم وأنت المؤخر" ابن بطال ؒ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت تو سب سے آخر میں ہوئی لیکن قیامت کے دن آپ سب سے آگے ہوں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"نحن الآخرون السابقون"

"ہم سب سے آخر میں آنے والے اور سب سے پہلے (جنت میں) جانے والے ہیں"۔

تہجد کے وقت کی دُعا

۱۲۱۲: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ اِفْتَتَحَ صَلَاتَهُ فَقَالَ

اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَاِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٥٣٤ حديث رقم (٢٠١ـ ٧٧١)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وقت تہجد کی نماز کیلئے کھڑے ہوتے اور تہجد کی نماز شروع کرتے تو یہ دعا پڑھتے تھے: اللھم رب جبرائیل ''اے اللہ! جو پروردگار جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل کا ہے، اے زمینوں اور آسمانوں کے پیدا کرنے والے! پوشیدہ و ظاہر کو جاننے والے، تو ہی اپنے بندوں کے درمیان اُس چیز میں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں فیصلہ کرے گا۔ اے اللہ! حق کے معاملے میں جو اختلاف کیا گیا ہے اُس میں میری رہنمائی فرما کیونکہ جسے تو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''اذا قام من اللیل افتتح صلاتہ'' صلاتہ سے مراد ''صلاۃ نفسہ'' بھی ہوسکتا ہے اور ''صلاۃ اللیل'' بھی۔ دوسرے معنی کی تائید حصن کی روایت سے ہوتی ہے۔

''فقال اللھم رب جبرئیل، ومیکائیل واسرافیل'' ان فرشتوں کی شرافت وفضیلت کی بنا پر ان کو ذکر کیا گیا جبکہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز کا رب ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جبرئیل علیہ السلام کو سب سے مقدم رکھا کیونکہ وہ کتب سماویہ کے امین ہیں، سارے امور دینیہ کا اہتمام ان کے پاس ہے۔ اسرافیل کو آخر میں رکھا کیونکہ وہ لوح محفوظ اور صور پھونکنے کے امین ہیں۔ زندگی اور موت کا معاملہ ان کے حوالہ ہے۔ میکائیل کو درمیان میں رکھا کیونکہ وہ دونوں اطراف سے متعلق ہیں وہ بارش اور پودوں وغیرہ کے امین ہیں، دین، دنیا اور آخرت کی روزی کا تعلق ان سے وابستہ ہے۔ جبرائیل اور اسرافیل، میکائیل سے افضل ہیں جبکہ پہلے دونوں کی افضلیت میں اختلاف ہے''۔

''اللھم رب'' کی نحوی کیفیت کے بارے میں واضح رہے کہ بعض علماء کا کہنا یہ ہے کہ صفت ہونے کی بنا پر اس کا نصب درست نہیں کیونکہ میم مشددہ اصوات کے درجے میں ہے اور وہ لفظ جس کے ساتھ جیم ملا ہوا ہے موصوف نہیں بن سکتا۔ تقدیری عبارت ''یارب جبرئیل'' ہوگی۔

زجاج فرماتے ہیں یہ سیبویہ کا قول ہے میرے نزدیک یہ صفت بن سکتا ہے۔ جب ''یا'' کے ساتھ صفت ممتنع نہیں تو میم کے ساتھ بھی نہیں۔

ابوعلی فرماتے ہیں کہ سیبویہ کا قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ اسماء موصوفہ میں اللھم جیسا کوئی لفظ نہیں اس وجہ سے وہ تمام اسماء سے مختلف ہے اور ان جگہوں میں شامل ہے جو موصوف نہیں بنتے جیسے لفظ ''حیھل'' یہ دونوں صوتِ مضموم الی اسم کے درجہ میں ہیں لہٰذا موصوف نہیں بن سکتے۔

''فاطر السموات والارض ''تو زمین وآسمان کا خالق، مبدع اور مخترع ہے۔

''انت تحکم بین عبادك ''یعنی قیامت کے دن تو اپنے وعدے کے مطابق حق وباطل کا ثواب وعقاب کے ذریعہ فیصلہ کرے گا۔

''فيه يختلفون ''یعنی دنیا کی زندگی میں، دین کے معاملہ میں جو اختلاف کرتے تھے۔

''اهدنی ''یعنی میری ہدایت میں اضافہ فرما اور مجھے اس پر استقامت نصیب فرما۔

''لما اختلف فیه ''لام ''الی'' کے معنی میں ہے۔

لفظ ہدایت کبھی بذات خود متعدی ہوتا ہے اور کبھی الی یا لام کے واسطہ سے، بذات خود متعدی ہونے کی مثال:

﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ (الفاتحہ۔ ٦)

الی کے واسطہ سے متعدی ہونے کی مثال:

﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [الشوریٰ۔ ٥٢]

لام کے واسطہ سے متعدی ہونے کی مثال:

﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ﴾ [الاسراء۔ ٩]

''ما'' موصولہ ہے۔ عبارت کا معنی یہ ہوگا:

''انبیاء کی آمد اور ان کی صراط مستقیم کی دعوت میں، جو اختلاف کیا گیا''۔

''من الحق ''لما کا بیان ہے۔

''انك تهدی من تشاء الی صراط مستقیم ''جملہ استینافیہ ہے جو کہ تعلیل کو متضمن ہے اور تعلیل کے قائم مقام ہے۔

بیدار ہونے کے بعد کی دعا

١٢١٣: وَعَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَعَارَّ مِنَ اللَّيْلِ فَقَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ثُمَّ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ اَوْقَالَ ثُمَّ دَعَا اُسْتُجِيْبَ لَهٗ فَاِنْ تَوَضَّاَ وَصَلّٰى قُبِلَتْ صَلَاتُهٗ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٣/٢٩ حدیث رقم ١١٥٤۔ وأبوداوٗد فی السنن ٥/٣٠٥ حدیث رقم ٥٠٦٠۔ والترمذی ٥/٤٧٧ حدیث رقم ٣٤١٤۔ وابن ماجه ٢/١٣٧٦ حدیث رقم ٣٨٧٨۔

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی رات میں بیدار ہو، تو یہ دعا پڑھے لا اله الا الله ...... ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کے لئے

بادشاہی ہے اور اس کے لئے تمام تعریفیں ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ پاک ہے تمام تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ بہت بڑا اور گناہوں سے بچنے اور عبادت کی قوت اللہ کے پاس ہے''۔ پھر اس کے بعد یہ دعا پڑھے: اے اللہ! میرے گناہ بخش دے یا یہ فرمایا کہ پھر یہ دعا کرے تو اس کی دعا قبول کی جائے گی پھر اگر وہ وضو کرے اور نماز پڑھے تو اس کی نماز قبول کی جائے گی۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''من تعارّ'' بتشدید الراء۔ نیند سے بیدار ہونا۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ایسی بیداری ہے جو آواز کے ساتھ ہو، پس نبی کریم ﷺ نے اس بات کو پسند فرمایا کہ اٹھنے کے وقت کا کلام تسبیح وتہلیل میں ڈھل جائے۔ یہ بات اسی میں پائی جاتی جا سکتی ہے جس نے ذکر کو وظیفہ حیات بنا لیا ہو۔

واضح رہے کہ لفظ تعارّ کی حقیقت کے بارے میں علماء لغت نے مزید بھی کچھ اقوال پیش فرمائے ہیں۔ یہ اقوال ابو عبید مروی نے اپنی کتاب میں امام ثعلب کے حوالہ سے نقل کیے ہیں، ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

① بیدار ہونا۔ ② جاننا۔

البتہ راجح یہی ہے کہ اس سے مراد ایسی بیداری ہے جس میں آواز بھی ہو۔ نبی کریم ﷺ کو چونکہ کلمات کی جامعیت کی گئی تھی اس لئے آپ نے ایسا لفظ استعمال فرمایا جو بیک وقت دو معانی کو ادا کر رہا ہے۔ آپ ﷺ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ آدمی کو اس حال میں بیدار ہونا چاہیے کہ اس کی زبان ذکر الٰہی میں مشغول ہو اور یہ مقام اسے ہی مل سکتا جو ذکر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

؎ یھیم فؤادی ما حییت بذکرھا ☆ ولو أننی ارممت أن به الصوی

ابن التین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ تعارّ کا معنی محض بیدار رہنا ہے۔ (تکلم اس میں شامل نہیں) کیونکہ آگے فقال کے ذریعہ قول کو علیحدہ لایا گیا۔

ممکن ہے یہ فاء تفسیریہ ہو اور تعارّ کی تفسیر فقال کے ذریعہ کی گئی ہو۔

''فقال لا اله الا اللّٰه وحده'' یعنی اس کائنات میں اپنی ذات، صفات، افعال اور آثار وغیرہ کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ سب سے منفرد ہے۔

''لا شریك له'' الوہیت اور ربوبیت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

''له الملك'' ظاہری وباطنی بادشاہت اسی کی ہے۔

''وهو علی كل شیء قدیر'' یعنی ہر چیز اس کے ارادے سے متعلق اور اس کی مشیت کی پابند ہے۔

''قدیر'' قدرت تامہ اور کامل ارادے والا ہے۔

''وسبحان اللّٰه'' اللہ تعالیٰ صفات نقص اور زوالِ کمال سے پاک ہے۔

''والحمد للّٰه'' جمال اور کمال کی صفات کی بنا پر سب تعریفیں اسی کیلئے ہیں۔

علامہ عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ باقی راویوں نے حمد کو تسبیح پر مقدم رکھا لیکن اسماعیلی نے اس کے برعکس کیا ہے۔ تسبیح کی تقدیم میں ترتیب کی رعایت ہے کیونکہ تصفیہ اور تخلیہ پہلے ہوتا ہے اور تجلیہ اور تحلیہ بعد میں۔

حاصل یہ کہ سبحان اللہ کی الحمد للہ پر تقدم روایت شاذہ ہے اور جمہور اس کے مخالف ہیں۔

''واللہ اکبر'' جو چیز بھی دل میں آسکتی ہے اللہ تعالیٰ اس سے بھی بڑا ہے۔

''ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ'' تمام احوال میں نیکی کرنے کی طاقت گناہ سے بچنے کی قوت اللہ تعالیٰ کی مدد، مشیت، ارادہ اور مہربانی سے مل سکتی ہے۔

''اوقال ثم دعا'' ''اَوْ'' شک کیلئے ہے۔ ممکن ہے تنویع کیلئے ہو۔ پہلے قول کی تائید اسماعیلی کی روایت سے ہوتی ہے۔

اس میں یہ الفاظ ہیں: ''ثم قال رب اغفرلی غفرلہ اوقال فدعا استحیب لہ''

''استجیب لہ'' ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ اس سے مراد یقینی قبولیت ہے کیونکہ احتمالی قبولیت کا امکان تو ہر دعا میں ہوتا ہے۔

''فان توضا وصلّی'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''فان توضأ'' کا عطف ''دعا'' پر بھی جائز ہے اور ''قال لا الہ الا اللّٰہ'' پر بھی۔ پہلی صورت زیادہ بہتر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ گا کہ جو شخص نیند سے بیدار ہوا اور اس نے یہ الفاظ کہے اب اگر وہ دعا کرے گا تو دعا قبول ہوگی اور اگر نماز پڑھے تو نماز قبول ہوگی۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے قرب لفظی کی بنا پر قول اول کو راجح کہا ہے لیکن اس میں شک وتردید کا ثبوت ہے اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ دوسرا قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ اصل مدار معانی پر ہے۔

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دعا کی یقینی قبولیت کے بعد نماز کی قبولیت بھی یقینی ہے۔

الفَصْلُ الثَّانِیْ:

بیدار ہونے کے وقت کی دُعا

۱۲۱۴: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَيْقَظَ مِنَ اللَّيْلِ قَالَ لَآاِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَسْتَغْفِرُكَ لِذَنْبِيْ وَاَسْاَلُكَ رَحْمَتَكَ اللّٰهُمَّ زِدْنِيْ عِلْمًا وَلَا تُزِغْ قَلْبِيْ بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنِيْ وَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ٣٠٦/٥ حديث رقم ٥٠٦١۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے تھے **لا الہ الا انت سبحانک** ''اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تیری ذات پاک ہے اے اللہ! میں تیری تعریف کے ساتھ تیری تسبیح کرتا ہوں اپنے گناہوں کی بخشش مانگتا ہوں اور تجھ سے تیری رحمت کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! میرے علم میں زیادتی کر اور ہدایت کے بعد میرے دل کو ٹیڑھا نہ کر اور اپنے پاس سے میرے لیے رحمت عطا کر' بے شک تو ہی عطا

کرنے والا ہے''۔اس حدیث کو امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''فقال لا اله الا انت'' توحید سے ابتداء ہے کیونکہ ارباب تفرید کے مقامات کی یہی انتہاء ہے۔

''سبحانك اللهم وبحمدك'' اس کی ترکیبی کیفیت میں دو احتمال ہیں:

① باء زائد ہے، معنی ہوگا ''اسبحك مع حمدی ایاك''۔

② واؤ عاطفہ ہے۔یعنی ''وبحمدك اسبح''

''أستغفرك لذنبی'' استغفار تعلیم امت یا اللہ رب العزت کی تعظیم اور جلالت شان کے پیش نظر ہے۔افضل کی مخالفت کو ذنب (گناہ) سے تعبیر کرنا کمالِ طاعت کی بنیاد پر ہے۔

''اللهم زدنی علما'' علمًا کی تنوین تفخیم کیلئے ہے۔

''ولا تزغ قلبی'' یعنی میرے دل کو حق سے ہٹا کر باطل کی طرف نہ پھیر دے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے اس کا معنی کیا ہے ''میرے اوپر ایسی آزمائش نہ ڈال جو میرے دل کو حق سے باطل کی طرف موڑ دے''۔

''وهب لی من لدنك رحمة'' یعنی مجھے ایسی توفیق عطا فرما جو مجھے ایمان، اطاعت، ہدایت اور تیری رحمت کے موجبات پر ثابت قدم رکھے۔

''انك انت الوهاب'' تھوڑے عمل پر بہت سا اجر عطا کرنے والا ہے۔

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس دعا میں امت کیلئے تعلیم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترنے والی آزمائش اور زوال نعمت سے بے خبر اور غافل نہ ہوں۔

رات کو سوتے وقت اور جاگتے وقت کا عمل

۱۲۱۵: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَبِيْتُ عَلٰى ذِكْرٍ طَاهِرًا فَيَتَعَارُّ مِنَ اللَّيْلِ فَيَسْأَلُ اللّٰهَ خَيْرًا اِلَّآ اَعْطَاهُ اللّٰهُ اِيَّاهُ. (رواہ احمد و ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ٥/٢٩٦ حديث رقم ٥٠٤٢ وابن ماجه ٢/١٢٧٧ حديث رقم ٣٨٨١۔ وأحمد في المسند ٥/٢٤٤۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو بھی مسلمان رات کے وقت باوضو ہو کر اللہ کا ذکر کرتے ہوئے سو جائے اور پھر رات کے وقت بیدار ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ سے خیر کی دعا مانگ لے، تو اللہ تعالیٰ اُسے خیر دے دیتا ہے۔اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''یبیت علی ذکر'' اس کے معنی میں دو احتمال ہیں:

① سوتے وقت کے اذکار مستحبہ میں مشغول رہے۔② مطلق طور پر رات کو اللہ کا ذکر کرے۔

''طاهرًا'' یہ پاکی ظاہری بھی ہوسکتی ہے جو وضو یا تیمّم سے حاصل کرے اور باطنی بھی، یعنی اپنے دل کو حسد، کھوٹ، کینہ اور

غیر اللہ سے پاک کرے۔

نمازِ تہجد سے پہلے کی دُعا

۱۲۱۶: وَعَنْ شَرِيقِ الْهَوْزَنِيِّ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰى عَائِشَةَ فَسَأَلْتُهَا بِمَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْتَتِحُ اِذَا هَبَّ مِنَ اللَّيْلِ فَقَالَتْ سَأَلْتَنِيْ عَنْ شَيْءٍ مَا سَأَلَنِيْ عَنْهُ اَحَدٌ قَبْلَكَ كَانَ اِذَا هَبَّ مِنَ اللَّيْلِ كَبَّرَ عَشْرًا وَحَمِدَ اللّٰهَ عَشْرًا وَقَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عَشْرًا وَقَالَ سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ عَشْرًا وَاسْتَغْفَرَ اللّٰهَ عَشْرًا وَهَلَّلَ اللّٰهَ عَشْرًا ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ ضِيْقِ الدُّنْيَا وَضِيْقِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ عَشْرًا ثُمَّ يَفْتَتِحُ الصَّلَاةَ۔ (رواہ ابو داود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۵/۳۲۲ حديث رقم ۵۰۸۵ والنسائي ۸/۲۸۴ حديث رقم ۵۵۳۵۔

ترجمہ: حضرت شریق ہوزنی سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نیند سے بیدار ہونے کے بعد اپنی عبادت کو کس چیز سے شروع کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا آپ نے آج مجھ سے اس چیز کے بارے میں پوچھا ہے جس کے بارے میں آپ سے پہلے کسی نے مجھ سے نہیں پوچھا، تو سن لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وقت نیند سے بیدار ہوتے تو پہلے اللہ اکبر دس مرتبہ الحمد للہ دس مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ دس مرتبہ سبحان الملک القدوس دس مرتبہ پڑھتے تھے اور دس مرتبہ استغفار کرتے تھے اور لا الٰہ الا اللہ دس مرتبہ پڑھتے تھے، پھر یہ دعا پڑھتے تھے **اللّٰھم انی اعوذبك**...... دس مرتبہ اے اللہ! میں تجھ سے دنیا کی تنگی اور آخرت کی تنگی سے پناہ چاہتا ہوں، پھر نماز شروع کرتے تھے۔ اس حدیث کو امام ابوداوٗد نے روایت کیا ہے۔

راویٔ حدیث:

شریق الہوزنی۔ یہ شریق ہوزنی تابعی ہیں۔ ''حمص'' کے رہنے والے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت فرماتے ہیں۔ اور ان سے ''ازہر حرازی'' روایت کرتے ہیں۔ ''شریق'' بروزن ''امیر'' ہے ھوزنی ھاء کے فتح اور زاء کے ساتھ 'ذی کلاع کے ایک قبیلہ کی طرف منسوب ہے۔ (الانتساب)

تشریح: ''**وعن شريق الهوزني**'' بفتح الهاء والزاء'' ذوالکلاع کے ایک قبیلہ کی طرف نسبت ہے۔ صاحب جامع نے ان کے بارے میں لکھا ہے ''**خمصي مقبول تابعي**''

''**فقالت سألتني عن شيءٍ ما سألني عنه احدٌ قبلك**'' اس میں ان کے سوال کی تحسین اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے لوگوں کی غفلت کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہیں۔

''**من الليل كبر عشرًا**'' اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے دس مرتبہ اللہ اکبر پڑھتے اور اپنے دن کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور عظمت کے بیان سے فرماتے تھے۔

''**القدوس**'' جو ہر عیب اور آفت سے محفوظ ہے۔

"واستغفر الله عشرًا" یہ استغفار اپنی تقصیر کے اعتراف کیلئے تھا۔

"وهلل الله عشرًا" اذکار کو توحید پر ختم کرنے میں اہل تجرید و تفرید کیلئے ایک لطیف اشارہ ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا کہ "اللہ تعالیٰ کی توحید کے بیان میں آواز کو بلند فرماتے تھے" ۔حدیث کی دلالت کے خلاف ہے۔

"اعوذ بالله من ضيق الدنيا" جس شخص کو کوئی مرض، قرض یا ظلم کی مشقت لاحق ہو یہ دنیا اس کی آنکھ میں تنگ پڑ جاتی ہے۔

"ثم يفتتح الصلاة" یعنی تہجد کی نماز۔

الفصل الثّالث:

تہجد کے وقت کی ایک دُعا

۱۲۱۷: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِالْخُدْرِیِّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا قَامَ مِنَ اللَّیْلِ کَبَّرَ ثُمَّ یَقُوْلُ سُبْحَانَكَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰی جَدُّكَ وَلَآ اِلٰہَ غَیْرُكَ ثُمَّ یَقُوْلُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْرًا ثُمَّ یَقُوْلُ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ (رواه الترمذی وابوداود والنسائی و زاد ابوداود) بَعْدَقَوْلِهٖ غَیْرُكَ ثُمَّ یَقُوْلُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ثَلَاثًا وَ فِیْ اٰخِرِ الْحَدِیْثِ ثُمَّ یَقْرَأُ۔

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/ ۴۹۰ حدیث رقم ۷۷۵۔ والترمذی ۲/ ۹ حدیث رقم ۲۴۲۔ وابن ماجه ۱/ ۲۶۴ حدیث رقم ۸۰۴۔ والدارمی ۱/ ۳۱۰ حدیث رقم ۱۲۳۹۔ وأحمد فی المسند ۳/ ۵۰۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کی نماز میں کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہہ کر یہ دعا پڑھتے تھے سبحانك اللهم "اے اللہ! تو پاک ہے، ہم تیری تعریف کرتے ہیں تیرا نام برکت والا ہے، تیری ذات بلند ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے"۔ پھر الله اکبر کبیرا کہتے، پھر اس کے بعد یہ دعا پڑھتے اعوذ بالله السميع العليم میں اللہ سننے والے اور جاننے والے کی شیطان مردود سے اور اس کے وسوسے سے اور اس کے تکبر سے اور اس کے بُرے شعر سکھانے سے پناہ چاہتا ہوں۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ، امام ابوداوٗدؒ اور امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔ امام ابوداوٗد نے اپنی روایت میں و لا اله غيرك کے بعد یہ الفاظ نقل کئے لا اله الا اللہ تین مرتبہ پڑھتے تھے، اور اس کے بعد قراءت شروع کر دیتے تھے۔

تشریح: "اذا قام من الليل كبر" بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد تکبیر تحریمہ ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ثم تراخی اخبار کیلئے ہے اور ساعات لیل میں اسے تراخی اقوال کیلئے بھی مانا جاسکتا ہے۔

"وتبارك اسمك" یعنی تیرے نام کی اتنی برکتیں ہیں تو جس کا یہ نام ہے اس کی برکت کا کیا عالم ہوگا۔ یا یہ معنی ہے کہ تیرا نام اس بات سے بالاتر ہے کہ اس میں الحاد کیا جائے۔

بعض علماء نے یہ معنی بھی بیان کیا ہے کہ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان ہدایت الٰہی کے بغیر اللہ تعالیٰ کا کوئی نام تجویز نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کیلئے لائق اسماء کو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

''وتعالٰی جدك'' یعنی تیری عظمت ہر عظمت سے بالاتر ہے۔ یا اس کا معنی ہے کہ تیرا غنا ہر چیز سے بلند ہے اور اتنا بلند ہے کہ ہر محتاج تیری طرف متوجہ ہے۔

''من الشیطان الرجیم'' رجیم سے مراد دھتکارا ہوا اور مردود ہے۔ اس نے فخر و زیادتی کا دعویٰ کیا اور عبادت سے انکار کیا۔ جس کے نتیجہ میں اسے بارگاہ الٰہی سے دھتکار دیا گیا۔

شیطان، شطون سے نکلا ہے جس کا معنی ہے دوری۔ شیطان کا اطلاق انسان اور جنات میں ہر اس نافرمان پر ہوتا ہے جو سرکشی کی انتہاء کو پہنچا ہو۔

لفظ الرجیم فاعل کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے۔ شیطان بندوں کو رب سے دور کر کے ان میں وسوسے ڈال کر انہیں رجیم کرتا ہے۔

''من همزہ'' همزہ کے مختلف معانی بیان کئے گئے۔ ① شیطان کا وسوسہ۔ ② شیطان کی گمراہی۔ ③ جادو۔ ④ پاگل پن۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز

۱۲۱۸: وَعَنْ رَبِيْعَةَ بْنِ كَعْبٍ الْأَسْلَمِيِّ قَالَ كُنْتُ اَبِيْتُ عِنْدَ حُجْرَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكُنْتُ اَسْمَعُهٗ اِذَاقَامَ مِنَ اللَّيْلِ يَقُوْلُ سُبْحَانَ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الْهَوِيَّ ثُمَّ يَقُوْلُ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ الْهَوِيَّ (رواه النسائی وللترمذی نحوه وَقَالَ هذاحديث حسن صحيح)۔

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/٤٤٨ حديث رقم ٣٥١٦۔ والنسائی ٣/٢٠٨ حديث رقم ١٦١٨۔ وأحمد فی المسند ٤/٥٨۔

ترجمہ: حضرت ربیعہ ابن کعب اسلمیؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ کے قریب رات بسر کیا کرتا تھا تو میں سنتا تھا کہ جب رات کی نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو آپ کافی دیر تک سبحان رب العالمین کہتے تھے اور پھر کافی دیر تک سبحان اللہ وبحمدہ کہتے تھے۔ اس حدیث کو امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذیؒ نے بھی اس طرح کی روایت نقل کی ہے اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

تشریح: ''وعن ربيعة بن كعب الأسلمي'' یہ اصحاب صفہ میں سے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم تھے۔

''الھوِیّ'' بفتح الهاء ونصب الياء المشددة۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد طویل زمانہ ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ رات کے اوقات کے ساتھ مختص ہے۔ الھوی کا معرفہ ہونا لمبے وقت کا ذکر کے ساتھ خاص ہونے کے استغراق کیلئے ہے۔ تنکیر سے استغراق کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا جیسے: قام زيد اليوم اور قام زيد يومًا میں فرق یہ ہے کہ پہلے میں پورا اور دوسرے میں بعض دن مراد ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قول: اسریٰ بعبدہ لیلاً (الاسراء۔۱) میں بھی بعض لیل مراد ہے۔

بَابُ التَّحْرِيْضِ عَلٰى قِيَامِ اللَّيْلِ

رات کے قیام پر رغبت دلانے کا بیان

الفصل الاول:

رات کی عبادت سے روکنے کیلئے شیطان کی چال

۱۲۱۹: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْقِدُالشَّيْطَانُ عَلٰى قَافِيَةِ رَأْسِ اَحَدِكُمْ اِذَا هُوَ نَامَ ثَلَاثَ عُقَدٍ يَضْرِبُ عَلٰى كُلِّ عُقْدَةٍ عَلَيْكَ لَيْلٌ طَوِيْلٌ فَارْقُدْ فَاِنِ اسْتَيْقَظَ فَذَكَرَاللّٰهَ انْحَلَّتْ عُقْدَةٌ فَاِنْ تَوَضَّاَ انْحَلَّتْ عُقْدَةٌ فَاِنْ صَلّٰى انْحَلَّتْ عُقْدَةٌ فَاَصْبَحَ نَشِيْطًا طَيِّبَ النَّفْسِ وَاِلَّا اَصْبَحَ خَبِيْثَ النَّفْسِ كَسْلَانَ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲۴/۳ حدیث رقم ۱۱۴۲۔ ومسلم فی صحیحه ۵۳۸/۱ حدیث رقم (۲۰۷۔ ۷۷۶)۔ وأبو داوٗد فی السنن۷۲/۲ حدیث رقم ۱۳۰۶۔ وابن ماجه ۴۲۱/۱ حدیث رقم ۱۳۲۹۔ ومالك فی الموطأ ۱۷۶/۱ حدیث رقم ۹۵من کتاب قصر الصلاۃ ۔ وأحمد فی المسند ۴۳/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی رات کو سوتا ہے تو شیطان اس کے سر کی گدی پر تین گرہیں لگاتا ہے۔ ابھی بہت رات باقی ہے سو جاؤ، جب کوئی آدمی بیدار ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اس کی ایک گرہ کھل جاتی ہے پھر جب وضو کرتا ہے دوسری گرہ کھل جاتی ہے پھر اگر اس کے بعد نماز پڑھتا ہے تو تیسری گرہ کھل جاتی ہے۔ ایسا آدمی خوشی کی حالت میں پاک نفس ہو کر صبح کرتا ہے ورنہ خبیث نفس اور سستی کی حالت میں صبح کرتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''یعقد'' بکسر القاف بمعنی باندھنا۔ ''الشیطان'' ابلیس یا اس کا کوئی چیلا۔ دونوں مراد ہیں۔

''علی قافیة رأس أحدکم'' قافیة رأس سے مراد گدی (یعنی سر کا پچھلا حصہ) ہے، بعض کے خیال کے مطابق سر کا درمیان حصہ ہے۔ ''اذا هو نام ثلاث عقد'' اس سے مراد یہ ہے کہ شیطان سستی کی گرہیں باندھ دیتا ہے۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ شیطان اسے سستی پر ابھارتا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسے بوجھل پن اور سستی میں اس طرح باندھ دیتا ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوتی۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ شیطان کے مکروفریب سے استعارہ ہے کہ شیطان نیند کو اس کیلئے محبوب بنا دیتا ہے اور استراحت و آرام سے نکلنے نہیں دیتا۔ تین کے ساتھ مقید کرنا تاکید کیلئے ہے۔ کیونکہ جن چیزوں سے شیطان روکتا ہے وہ تین

ہیں۔ذکر، وضواور نماز۔گدی کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ (گدی) وہم کا محل ہے۔

"**یضرب**" یعنی اپنے ہاتھ سے مارتا ہے تاکید کیلئے یا مضبوط کرنے کیلئے۔

"**علی کل عقدة**" یہ یضرب سے متعلق ہے۔ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں "**یضرب**" کا مفعول ظاہر نہیں ہے اس کا ایک معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ شیطان سونے والے کی حس پر چھا جاتا ہے اور وہ اٹھ نہیں سکتا۔اللہ تعالیٰ کے قول "**فضربنا علی آذانھم**" کا معنی ہے ہم نے انہیں سلا دیا۔

علامہ میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس عقد کے بارے میں اختلاف ہے۔بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ حقیقت پر محمول ہے۔جیسے جادوگر اپنے جادو کے ذریعہ گرہ لگا دیتا ہے۔اس معنی کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ ہر آدمی کے سر میں ایک رسی ہے جس میں تین گرہیں ہیں۔اس حدیث کو ابن ماجہ، احمد، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے نقل کیا ہے۔بعض علماء نے اسے مجاز پر محمول کیا ہے گویا کہ شیطان کے فعل کو جادوگر کے فعل سے تشبیہ دی گئی ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد دل کی گرہ ہے اور اس کو کسی چیز پر مضبوط کرنا ہے یعنی شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ ابھی بہت رات باقی ہے۔

"**علیك لیل طویل**" ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں بخاری کی تمام روایات میں لیلٌ رفع کے ساتھ ہے۔قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسلم کی اکثر رویات میں لیلاً منصوب آیا ہے۔

"**فذکر**" ذکر دل سے کرے یا زبان سے۔دونوں کا احتمال ہے۔

"**فان صلی انحلت عقدة**" ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بخاری کی تمام روایات میں یہ لفظ جمع کے ساتھ ہے جبکہ مؤطا میں مفرد لفظ کے ساتھ ہے۔پس مناسب تھا کہ مصابیح میں جمع کے صیغہ کے ساتھ ہو کیونکہ آخر میں "متفق علیہ" کے الفاظ ہیں۔لیکن اس کے تمام نسخوں میں مفرد کے ساتھ ہی یہ الفاظ آئے ہیں۔

"**نشیط طیب النفس**" اس کی تازگی اور مسرت کی تین وجوہات ہیں:

① شیطانی چنگل سے نجات۔② اسباب غفلت سے چھٹکارا۔③ رضائے الٰہی کا حصول۔

"**أصبح خبیث النفس**" مغموم، پریشان اور حیران سرگرداں۔

عبادت سے شکر کی ادائیگی

۱۲۲۰: وَعَنِ الْمُغِيْرَةِ قَالَ قَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهُ فَقِيْلَ لَهُ لِمَ تَصْنَعُ هٰذَا وَقَدْ غُفِرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ قَالَ اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٥٨٤/٨ حديث رقم ٤٨٣٦۔ والنسائي في السنن ١٩/٣ حديث رقم ١٦٤٤۔ وابن ماجه ٤٥٦/١۔

ترجمہ: حضرت مغیرہؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ رات کو طویل قیام کیا، آپ کے قدمین پر ورم آ گیا۔رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ آپ اس قدر طویل قیام کیوں کرتے ہیں آپ کے تو اللہ تعالیٰ نے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ (بخاری و مسلم)

تشریح: ''وعن المغیرۃ قال، قام النبی ﷺ'' ''ایک نسخہ میں ''من اللیل'' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

''فقیل لہ لم تصنع ھذا'' عصام الدین رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ استفہام تعجب کیلئے ہے۔

''أفلا اکون عبدًا شکورًا'' یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے مغفرت کی نعمت عطا فرمائی اور دوسری بہت سی نعمتوں سے نوازا۔ کیا میں تمام نعمتوں پر اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ ابن حجر رحمۃ اللہ نے بھی اس کا یہی معنی بیان کیا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ فاء، محذوف کیلئے مسبب ہے یعنی کیا میں قیام لیل اور تہجد کو اس لئے چھوڑ دوں کہ اس نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ اور میں اس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا مجھے معاف کرنا اس بات کا سبب ہے کہ میں اس کیلئے قیام کروں اور تہجد پڑھوں۔

ابن حجر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے اتنی مشقت برداشت کرنے کے متعلق سوال کرنے والے کا خیال یہ تھا کہ اس مشقت کا سبب گناہ کا خوف یا بخشش کی امید ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے سمجھا دیا اور اس کا سبب حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

> ''کچھ لوگ جنت کے شوق میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں یہ تاجروں کی عبادت ہے۔ کچھ لوگ اللہ کے خوف سے عبادت کرتے ہیں یہ غلاموں کی عبادت ہے اور کچھ لوگ شکر کیلئے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ آزاد لوگوں کی عبادت ہے''۔

یہ قول ربیع الابراء میں موجود ہے۔

فجر کی نماز کے لئے نہ اٹھنے والے کا حال

۱۲۲۱: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ ذُكِرَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ فَقِيْلَ لَهٗ مَازَالَ نَائِمًا حَتّٰى اَصْبَحَ مَا قَامَ اِلَى الصَّلَاةِ قَالَ ذٰلِكَ رَجُلٌ بَالَ الشَّيْطَانُ فِيْ اُذُنِهٖ اَوْقَالَ فِيْ اُذُنَيْهِ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣/٢٨ حديث رقم ١١٤٤۔ ومسلم ١/٥٢٧ حديث رقم (٢٠٥/٧٧٤)۔ والنسائي في السنن ٣/٢٠٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایک آدمی کا کچھ تذکرہ کیا گیا تو رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ وہ آدمی صبح تک سویا رہتا ہے اور فجر کی نماز کیلئے نہیں اٹھتا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر فی الواقع وہ انسان ایسا ہی ہے تو پھر اس کے کان میں، یا یہ فرمایا کہ اس کے کانوں میں شیطان پیشاب کرتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: ''ما قام الی الصلاۃ'' الصلاۃ سے مراد میں دو احتمال ہیں:

① صبح کی نماز۔ ② تہجد کی نماز۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ نے اس جملہ کی نحوی ترکیب میں مختلف احتمال بیان کئے ہیں:

① أصبح تامہ ہے اور وما قام محل نصب میں فاعل سے حال ہے۔

② أ... ناقصہ ... اور ما قام ... کی خبر ...

③ ما قام جملہ مستانفہ اور پہلے جملہ کیلئے مبینہ ہے یا مؤکدہ مقررہ ہے۔

''ذلك الرجل بال الشيطان في أذنه'' موذن کی آواز کی طرف التفات اور توجہ نہ کرنے والے کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے کان میں پیشاب کر کے اسے بوجھل بنا دیا اور اس کی حس سماعت میں خرابی پیدا ہوگئی۔

علامہ تورپشتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ کنایہ ہے کہ شیطان اس کا مذاق اڑاتا ہے اور اس پر ہنستا ہے اور اسے ہلکا اور معمولی سمجھتا ہے۔ جب آدمی کسی چیز کو معمولی سمجھتا ہے تو اس پر پیشاب کرتا ہے۔ کان کو خاص طور پر ذکر کرنے کی یہ ہے کہ کسی چیز کی توجہ اور انتباہ کانوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نہایہ میں فرماتے ہیں کہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ شیطان اس کی سماعت کو باطل اور جھوٹی باتوں سے بھر دیتا ہے۔ اور اس سے دعوت حق کے سننے سے محروم کر دیتا ہے۔

''أو قال في أذنيه'' تثنیہ کے ساتھ ہے یہ مبالغہ کیلئے ہے۔

اس حدیث میں بعض علماء نے شیطان کے پیشاب کرنے کو حقیقت پر محمول کیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک بزرگ سوئے تھے اور نماز نہ پڑھ سکے انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک سیاہ رنگت والا شخص آیا اور اس کے کان میں پیشاب کر دیا۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس حدیث کو حقیقت پر محمول کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ازواج رضی اللہ عنہن کو نماز کے لئے اٹھانا

۱۲۲۲: وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتِ اسْتَيْقَظَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً فَزِعًا يَقُوْلُ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَاذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْخَزَائِنِ وَمَاذَا أُنْزِلَ مِنَ الْفِتَنِ مَنْ يُّوْقِظُ صَوَاحِبَ الْحُجُرَاتِ يُرِيْدُ أَزْوَاجَهٗ لِكَيْ يُصَلِّيْنَ رُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ فِي الْاٰخِرَةِ۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣/ ١٠ حديث رقم ١١٢٦۔ والترمذي في السنن ٤/ ٤٢٢ حديث رقم ٢١٩٦۔ ومالك في الموطأ ٢/ ٩١٣ حديث رقم ٨ من كتاب اللباس۔

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھبراہٹ کی حالت میں بیدار ہوئے اور کہہ رہے تھے سبحان اللہ آج رات کس قدر خزانے نازل کئے گئے اور کس قدر فتنے اتارے گئے، کوئی ہے جو ان حجروں والیوں کو اٹھا دے، مراد اس سے ازواج مطہرات تھیں اور مطلب آپ کا یہ تھا کہ ازواج مطہرات اٹھیں اور نماز پڑھیں اکثر عورتیں ایسی ہیں کہ دنیا میں کپڑے پہننے والی ہیں اور آخرت میں ننگی ہونگی۔ اس حدیث کو امام بخاری نے نقل کیا ہے۔

تشریح: ''فزعًا'' بکسر الزاء۔

''ما ذا أنزل الليلة من الخزائن'' یہ جملہ تقریر اور بیان کے لئے ہے کیونکہ اس میں ما استفہامیہ ہے۔ جو تعجب اور تعظیم کے معنی کو شامل ہے۔

''وما ذا انزل من الفتن'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رحمت کو خزانوں سے تعبیر فرمایا اور عذاب کو فتنوں سے۔ کیونکہ فتنے ہی عذاب کا دروازہ ہیں جبکہ رحمت خزانوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔

ان دونوں الفاظ کو جمع لانے کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خزانے اور اس کا عذاب بہت وسیع اور کثیر ہے۔

''لکی یصلین'' تاکہ وہ (ازواج مطہرات) بھی نماز پڑھ لیں اور انہیں بھی رحمت حاصل ہو جائے اور فتنوں سے چھٹکارا مل جائے۔

رب کاسیۃ فی الدنیا عاریۃ فی الآخرۃ کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں:

① اپنی حقیقت پر محمول ہے کہ دنیا میں بہت سی لباس پہننے والی عورتیں آخرت میں حساب کے وقت ننگی ہوں گی۔

② بہت سی عورتیں لباس تو پہنیں گی لیکن اللہ کے شکر سے عاری ہوں گی۔

③ ایک قول یہ ہے کہ اس حدیث میں ایسے لباس کی ممانعت ہے جو بدن کو چھپا نہ سکے۔

محدثین فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو اس لئے ذکر فرمایا کہ جب ان کیلئے تہجد کی نماز ضروری ہے تو دوسری عورتوں کیلئے بطریق اولیٰ ضروری ہے۔

رات کے وقت اللہ عزوجل کی رحمت کا نزول

۱۲۲۳: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالٰی كُلَّ لَیْلَةٍ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْیَا حِیْنَ یَبْقٰی ثُلُثُ اللَّیْلِ الْاٰخِرِ یَقُوْلُ مَنْ یَّدْعُوْنِیْ فَاَسْتَجِیْبُ لَهٗ مَنْ یَّسْاَلُنِیْ فَاُعْطِیَهٗ مَنْ یَّسْتَغْفِرُنِیْ فَاَغْفِرَلَهٗ (متفق علیه وفی روایة لمسلم) ثُمَّ یَبْسُطُ یَدَیْهِ یَقُوْلُ مَنْ یُّقْرِضُ غَیْرَ عَدُوْمٍ وَّلَا ظَلُوْمٍ حَتّٰی یَنْفَجِرَ الْفَجْرُ۔

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۵۲٦ حدیث رقم (۱٦۸۔ ۷۵۸)۔ والترمذی فی السنن ۲/۳۰۷ حدیث رقم ٤٤٦۔ وابن ماجه ۱/٤۳۵ حدیث رقم ۱۳٦٦۔ والدارمی ۱/٤۱۳ حدیث رقم ۱٤۷۹۔ وأحمد فی المسند ۲/۲٦٤۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر رات کے آخری ثلث میں ہمارا رب آسمان دنیا پر نزول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کون ہے جو مجھے پکارے اور میں اس کو قبولیت بخشوں، کون ہے جو مجھ سے سوال کرے اور میں اُسے عطا کروں، کون ہے جو مجھ سے مغفرت مانگے میں اس کی مغفرت کر دوں۔ (بخاری و مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں اس طرح ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتا ہے اور کہتا ہے کون ہے جو ایسے کو قرض دے جو نہ فقیر ہے نہ ظلم کرنے والا ہے اور صبح ظاہر ہونے تک یہی اعلان ہوتا رہتا ہے

تشریح: ''قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینزل ربنا'' ینزل ربنا کے دو معنی ہیں:

① اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کو زمین پر اترنے کا حکم دیتا ہے۔

② اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان کرنے والے فرشتے کا نزول ہوتا ہے۔

''تبارك'' اس کی خیر، رحمت اور آثار جمال بہت زیادہ ہیں۔

''تعالٰی'' اللہ تعالیٰ مخلوق کی صفات سے بالاتر ہے اور حدوث و زوال سے محفوظ ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ دونوں جملے معترضہ ہیں۔ جو فعل اور ظرف کے درمیان آئے ہیں۔ یہ تنزیہ پر دلالت کرتے ہیں تا کہ جملہ کی اسناد کے حقیقی ہونے کا وہم نہ ہو۔

''کل لیلة الی السماء الدنیا'' ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نزول سے مراد یہ ہے کہ اللہ کا حکم، اس کی رحمت یا اس کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ امام مالک نے بھی اس حدیث کا یہی معنی بیان کیا ہے اور اس کی تائید ایک صحیح حدیث سے ہوتی ہے۔ جس میں آیا ہے:

''اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے اور جب آدھی رات گزر جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک اعلان کرنے والے فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ وہ اعلان کرے کہ کوئی دعا مانگنے والا ہے کہ اس کی دعا کو قبول کیا جائے''۔

دوسری تاویل یہ ہے کہ (یہ تفسیر بھی امام مالک کی طرف منسوب ہے) یہ کلام علی سبیل الاستعارۃ استعمال ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں دعا مانگنے والے پر قبولیت، رحمت، لطف اور قبول مغفرت کے ساتھ توجہ ہوتا ہے۔

علامہ نووی، شرح مسلم میں اس حدیث اور اس جیسی دوسری احادیث کی شرح میں صفات باری تعالیٰ کی حقیقت کے بارے میں مندرجہ ذیل بحث فرماتے ہیں۔

اس بارے میں دو مشہور مذہب ہیں ایک مذہب جمہور سلف اور بعض متکلمین کا ہے۔ ان حضرات کے نزدیک ان کی حقیقت **کما یلیق بشانہ** کے اعتبار سے ایمان لانا واجب ہے۔

دوسرا مذہب اکثر متکلمین اور ایک جماعت سلف کا ہے یہ مذہب امام مالک اور امام اوزاعی وغیرہ سے بھی منقول ہے۔ ان صفات کو ان کے باطن کے اعتبار سے تاویل کر کے ان پر ایمان لایا جائے گا۔ ان دو مذاہب اور اسی طرح شیخ ربانی ابو اسحاق شیرازی، امام الحرمین اور امام غزالی جیسے دوسرے ائمہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کی تمام نصوص کے ظاہر پر عمل اور عقیدہ نہ ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا آنا' اللہ تعالیٰ کے رجل' قدم' ید' وجہ وغیرہ کا ذکر۔ ان تمام صفات کے بارے میں یہی حکم ہے۔ کیونکہ ان کے ظاہر سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ قطعی طور پر باطل ہے (کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کیلئے جسم ماننا لازم آئے گا)۔ اور بالا جماع ان چیزوں کو ثابت کرنے والے پر کفر لازم آتا ہے۔

بعض حضرات نے ان احادیث کی تفصیلی تاویل کی ہے۔ اس قسم کی تاویل کا مقصد اسلاف کے مسلک سے انحراف نہیں بلکہ ان کے زمانہ میں اس کی ضرورت پیش آئی تھی کیونکہ مجسمیہ اور جہمیہ بہت زیادہ ہو گئے تھے وہ عوام الناس کو گمراہی اور فسادِ عقیدہ میں مبتلا کر رہے تھے۔ ان کی گمراہی اور لوگوں کی عقلوں پر غلبہ حاصل کرنے سے بچنے کیلئے امام مالک، اوزاعی، سفیان ثوری اور امام جعفر صادق نے اس حدیث کی تفصیلی تاویل کی ہے۔

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث متشابہ ہے۔

بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات صفات جلال سے صفات رحمت اور صفات جمال کی طرف انتقال فرماتے ہیں۔

میں یہ کہتا ہوں کہ انتقال کی تعبیر کو اہل کمال نے پسند نہیں کیا کیونکہ اس میں نقص اور زوال کا وہم ہے۔ البتہ اگر اس سے

ظہور اور صفت جمال کی تجلی مراد ہو تو یہ معنی درست ہو سکتا ہے۔

''حتی یبقی ثلث اللیل الأخر'' صاحب نہایہ فرماتے ہیں کہ ثلث آخر کی تخصیص اس بنیاد پر ہے کہ یہ تہجد اور لوگوں کی غفلت کا وقت ہے اس وقت نیت خالص اور رغبت کامل ہو گی۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد رحمت، رحمانیت اور اُلطاف سبحانیہ کا نزول ہے اور صفت ربوبیت کے مقتضی کے مطابق ذات عالی کا بندوں سے قرب ہے۔ یا اس سے مراد خواص ملائکہ کا نزول ہے۔ اس وقت میں یہ فرشتے کلام ربانی کو نقل کرتے ہیں۔

یہ روایت ان روایات کے منافی نہیں ہے جن میں یہ الفاظ آئے ہیں:

''اذا مضٰی شطر اللیل أوثلثاہ''

کیونکہ ممکن ہے کہ یہ نزول بعض راتوں میں ثلثِ لیل آخر میں اور بعض راتوں میں آدھی رات اور بعض راتوں میں ثلث لیل میں ہوتا ہو۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ عسقلانی فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ نزول ثلث اول، نصف اور ثلث آخر میں تین مرتبہ ہوتا ہو۔ راجح اور ظاہر یہ ہے کہ یہ نزول کسی خاص وقت کے ساتھ خاص نہیں۔ ان اوقات کا تذکرہ غفلت کی نیند سے بیدار ہونے والوں کے زمانوں اور اوقات کے اعتبار سے ہے۔

''یقول من یدعونی فأستجیب لہ'' فاستجیب لہ' منصوب ہے جواب استفہام میں اُن مقدر سے۔ استیناف ماننے کی صورت میں یہ مرفوع ہوگا۔ اسی طرح فأعطیہ فأغفرلہ کی بھی یہی ترکیب ہے۔

''من یسألنی فأعطیہ'' اس کی اعرابی کیفیت میں دو قول ہیں:

① بفتح الھاء وضم الھاء۔ ② بسکون الیاء وکسر الھاء۔

''من یستغفرنی فاغفرلہ'' اس حدیث سے مقصود ترغیب وابارنا ہے، اس وقت کی تخصیص فضیلت میں اضافہ کیلئے ہے۔ وگرنہ مکلّف کا ہر فعل ہی قابل قبول اور نافع ہوتا ہے۔

''فی روایۃ لمسلم ثم یبسط یدیہ'' ''یدیہ'' سے مراد لطف ورحمت ہے۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یدیہ کے مظہر کو پھیلا دیتے ہیں۔ اس میں تجلی صوری کا بھی احتمال ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات نزول حسی سے پاک ہے۔

''یقول'' یعنی اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں یا خاص فرشتوں کے ذریعہ منادی ہوتی ہے۔

''من یقرض'' یعنی کون ہے جو عبادت مالیہ یا بدنیہ کے ذریعہ قرض دے اور اس کا عوض لے۔

اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات عالی کو ان دو صفات کے ساتھ متصف کرنا اس غرض سے ہے کہ ان دو صفات کی عدم موجودگی قرض دینے سے مانع ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو شخص دنیا میں اچھا عمل کرے گا آخرت میں اس کی جزا پائے گا۔

''حتی'' یہ بسط کی غایت ہے یعنی اللہ تعالیٰ طلوع فجر تک طالبین کے دلوں کو متوجہ کرنے کیلئے یہ اعلان فرماتے رہتے

ہیں۔

''يتفجر الفجر'' اس جملہ میں اس لطف کے ابتداء کی طرف اشارہ ہے۔

رات میں قبولیتِ دُعا کی گھڑی

۱۲۲۴: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ فِي اللَّيْلِ لَسَاعَةً لَا يُوَافِقُهَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ يَسْاَلُ اللّٰهَ فِيهَا خَيْرًا مِّنْ اَمْرِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اِلَّا اَعْطَاهُ وَاِيَّاهُ وَذٰلِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۵۲۱ حديث رقم (۱۶۶۔ ۷۵۷)۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ رات میں ایک گھڑی ہوتی ہے جو مسلمان اُسے حاصل کرتا ہے اور اُس گھڑی میں اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت کی جس خیر کا سوال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اُسے عطا کرتا ہے اور قبولیت کی یہ گھڑی ہر رات میں ہوتی ہے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''ان في الليل لساعة'' رات میں ایک ساعت مبہمہ ہے۔

''لا يوافقها رجل مسلم'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ ''لساعة'' کی صفت ہے۔

''يسأل الله'' نسخہ صحیحہ میں ''لا يسأل الله فيها'' ہے یہ جملہ صفت ثانیہ یا حال ہے۔

''الا أعطاه اياه'' حقیقی طور پر یا حکمی طور پر اسے عطا ہو جاتی ہے۔

''كل ليلة'' یعنی یہ ساعت کسی ایک رات کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر رات میں یہ ساعت پائی جا سکتی ہے۔

صوفیہ فرماتے ہیں کہ تمہارے رب کے پاس تمہاری زندگی کے لمحات میں نفحات ہیں۔ انہیں ضرور تلاش کرو کیونکہ حق کے جذبات میں سے ایک جذبہ جن وانس کے عمل کے برابر ہے۔

اس حدیث کو ان حضرات نے اپنا مستدل بنایا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ رات دن سے افضل ہے کیونکہ ہر رات میں قبولیت اور اجابت کی ایک ساعت ہے اور یہ سوائے جمعہ کے دن کے کسی دن میں نہیں۔ پس آدمی کو چاہئے کہ ساری رات یا کم از کم رات کا کچھ حصہ اللہ کی عبادت میں مشغول رہے۔

دوسری ساعات قبولیت کی طرح اس ساعت کو بھی مبہم رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ مقصد کے حصول کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے، اس کے گزر جانے پر ناامیدی کا شکار نہ ہو اور عبادت کیلئے کسی وقت کو مخصوص کئے بغیر ہر وقت اللہ کی عبادت کرے۔ تا کہ اس کا دل خود پسندی اور غرور سے محفوظ رہے۔ ایمان کی اصل کیفیت جو امید اور خوف کے درمیان ہے وہ حاصل ہو جائے۔

داؤد علیہ السلام کا صوم وقیام اللہ کو پسند تھا

۱۲۲۵: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ الصَّلَاةِ اِلَى اللّٰهِ

صَلَاةُ دَاوُدَ وَاَحَبُّ الصِّيَامِ اِلَى اللّٰهِ صِيَامُ دَاوُدَ كَانَ يَنَامُ نِصْفَ اللَّيْلِ وَيَقُوْمُ ثُلُثَهٗ وَيَنَامُ سُدُسَهٗ وَيَصُوْمُ يَوْمًا وَيُفْطِرُ يَوْمًا ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۱۶/۳ حدیث رقم ۱۱۳۱۔ والنسائی ۲۱٤/۳ حدیث رقم ۱۶۳۰۔ وابن ماجه ۵٤۶/۱ حدیث رقم ۱۷۱۲۔ وأحمد فی المسند ۱۶۰/۲۔

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کو تمام نمازوں میں سے حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز زیادہ محبوب ہے اور اسی طرح تمام روزوں میں سے داؤد علیہ السلام کا روزہ زیادہ محبوب ہے وہ نصف رات سوتے تھے اور رات کا تیسرا حصہ قیام کرتے تھے اور پھر رات کے چھٹے حصے میں سوتے تھے اور وہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: ''احب الصلاۃ الی اللہ صلاۃ داؤد'' یعنی نفلی نمازوں میں وقت کی فضیلت اور نفس پر زیادہ مشقت کے اعتبار سے سب سے محبوب نماز۔

''کان'' یہ استیناف مبین ہے جو دونوں سابقہ جملوں کی وضاحت کر رہا ہے۔

''ینام نصف اللیل ویقوم ثلثه وینام سدسه'' ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبارت کی اس نوع کے محبوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی رات کے دوثلث میں آرام کرے گا تو اس کا بدن ہلکا اور چست ہو جائے گا۔

شاید نبی کریم ﷺ نے اس انداز استراحت کو اس لئے اختیار نہیں فرمایا کہ آپ کا قیام تمام انبیاء مقام کو جامع ہو اور قیامت کے دن امت پر آسانی کی جائے رات کو زندہ کرنے کے وظیفہ کی وجہ سے۔

''یصوم یومًا ویفطر یومًا'' ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں روزوں کی یہ ترتیب نفس پر زیادہ شاق ہے کیونکہ اس میں ایک مانوس چیز کو ایک وقت میں چھوڑنا اور دوسرے وقت میں اپنانا لازم آتا ہے۔

حضور ﷺ نے روزے رکھنے میں بھی اس ترتیب وانداز کا التزام نہیں فرمایا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بعض مرتبہ اتنے روزے رکھتے تھے کہ ہم سمجھتے کہ اب آپ روزے نہ چھوڑیں گے اور کبھی آپ روزے بالکل چھوڑ دیتے اور ہم یہ سمجھتے کہ اب آپ روزے نہ رکھیں گے۔ اگر آپ انہیں رات کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھنا چاہتے تو دیکھ سکتے تھے اور اگر نیند کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تو دیکھ سکتے تھے۔

پس معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ اپنی عبادت میں اوقات کے پابند نہیں تھے بلکہ حکمت وشوق کے وقت جب مناسب خیال فرماتے اللہ کی عبادت شروع کر دیتے۔

آپ ﷺ کا رات کے آخری حصہ میں عبادت کرنا

۱۲۲۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ تَعْنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنَامُ اَوَّلَ اللَّيْلِ وَيُحْيِىْ اٰخِرَهٗ ثُمَّ اِنْ كَانَتْ لَهٗ حَاجَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ قَضٰى حَاجَتَهٗ ثُمَّ يَنَامُ فَاِنْ كَانَ عِنْدَ النِّدَاءِ الْاَوَّلِ جُنُبًا وَثَبَ

فَاَفَاضَ عَلَیْهِ الْمَاءَ وَاِنْ لَمْ یَكُنْ جُنُبًا تَوَضَّأَ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ صَلّٰی رَكْعَتَیْنِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳/ ۳۲۔ حدیث رقم ۱۱٤٦۔ ومسلم فی صحیحه ۱/ ۵۱۰ حدیث رقم (۱۲۹۔ ۷۳۹)۔ وأخرجه النسائی فی ۳/ ۲۱۸ حدیث رقم ۱٦٤۰۔ وابن ماجه ۱/ ٤۳٤ حدیث رقم ۱۳٦۵۔ وأحمد فی المسند ٦/ ۱۰۲۔

ترجمه: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے شروع حصہ میں سو جاتے تھے اور رات کے آخری حصہ کو زندہ رکھتے تھے، پھر اگر آپ کو اپنی زوجہ سے کوئی ضرورت ہوتی تو اُس ضرورت کو پورا کرتے، پھر سو جاتے تھے، پھر اگر پہلی اذان کے وقت غسل کی حاجت ہوتی تو غسل کرتے اور اگر غسل کی حاجت نہ ہوتی تو نماز کیلئے وضو کرتے پھر فجر کی دو سنت ادا کرتے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: ''کانت تعنی رسول اللّٰه'' لفظ ''رسول اللہ'' بظاہر تعنی کا مفعول اور معنوی طور سے کان کا اسم ہے۔

''ینام اول اللیل ویحیی آخره ثم'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ ''ثم'' تراخی اخبار کیلئے ہے۔

''قضٰی حاجته ثم ینام'' ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عبادت کو قضاء حاجت پر مقدم کرنے میں ایک نکتہ ہے جو پوشیدہ نہیں ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مباشرت رات کے آخری حصہ میں کرنا اولیٰ ہے کیونکہ رات کے اول حصہ میں عام طور سے پیٹ بھرا ہوتا ہے اور پیٹ بھرے ہونے کی حالت میں جماع کرنا بالاتفاق نقصان دہ ہے۔ نیز یہ کہ اس میں امکان ہے کہ بغیر غسل کے سو جائے گا اور جنابت کی حالت میں سونا مکروہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وطی کے بعد غسل سے پہلے سونا بیان جواز کیلئے تھا۔

یہ بھی جان لینا چاہیے۔ کہ اس حدیث میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بغیر وضو کے سو جاتے تھے۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کو کمال پر محمول کرنا اولیٰ ہے۔

''فان کان عند النداء الاوّل'' اس جملہ کے معنی میں دو احتمال ہیں:

① نداء اول سے مراد حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان ہے جو آدھی رات گزر جانے کے بعد دیتے تھے اور حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی اذان جو صبح صادق کے وقت ہوتی تھی اسے نداء ثانی کہتے ہیں۔

② راجح قول یہ ہے کہ نداء اول سے مراد اذان اور نداء ثانی سے مراد اقامت ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے قول کو غلط فاحش قرار دیا ہے۔

''فافاض لم یکن جنبًا توضأ للصلاۃ'' یہ وضو تجدیدیا کسی اور سبب کی وجہ سے ہوگا (وگرنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند ناقض وضو نہیں)۔

''ثم صلی رکعتین'' اس سے مراد فجر کی سنتیں ہیں۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دو رکعات سے ابتداء فرماتے تھے جیسا کہ تہجد کی نماز کے بیان میں ذکر کیا

گیا''۔ یہ ان کے پہلے کلام کے مناقض ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وضو کی دو سنتیں ہیں۔

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو تفصیل کے ساتھ شمائل میں ذکر کیا ہے جس سے اس حدیث کے مضمون کی بھی تشریح ہوتی ہے۔اس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں:''والا توضا وخرج الی الصلاۃ''۔

ملا حنفی فرماتے ہیں کہ فجر کی دو رکعتیں پڑھنے کے بعد مسجد کی طرف جاتے تھے۔

الفصل الثانی:

نماز تہجد کی فضیلت

۱۲۲۷: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَیْکُمْ بِقِیَامِ اللَّیْلِ فَاِنَّہٗ دَاْبُ الصَّالِحِیْنَ قَبْلَکُمْ وَھُوَ قُرْبَۃٌ لَّکُمْ اِلٰی رَبِّکُمْ وَمُکَفِّرَۃٌ لِلسَّیِّئَاتِ وَمَنْھَاۃٌ عَنِ الْاِثْمِ۔(رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/٥١٦ حدیث رقم ٣٥٤٩۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رات کے قیام کو ضروری سمجھو کیونکہ یہ طریقہ تم سے پہلے نیک لوگوں کا ہے اور قیام اللیل سے تمہیں اپنے رب کا قرب نصیب ہوگا اور گناہ ختم ہوں گے اور یہ تمہیں گناہوں سے باز رکھے گا۔اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح:''عن أبی أمامة قال قال رسول اللہ ﷺ علیکم بقیام اللیل''یعنی رات میں نماز کو لازم پکڑو۔

''فانه دأب الصالحین''یعنی یہ صالحین کا طریقہ ہے۔

صالحین سے مراد انبیاء اور اولیاء ہیں۔اس جملہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص تہجد کی نماز کا اہتمام نہیں کرتا وہ کامل صالحین کے درجہ میں نہیں بلکہ مزکی کے درجہ میں ہوسکتا ہے۔ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے انبیاء سابقین بھی مراد لئے جاسکتے ہیں۔

''وھو قربة لکم الی ربکم''یعنی صالحین کی طرز کی پیروی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس میں رب تعالیٰ کی قربت ہے۔اس جملہ میں ایک حدیث قدسی کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں''بندہ نفلوں کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں''۔

''ومکفرة للسیئات ومنھاة'' یہ دونوں مصدر میمی ہیں۔یعنی یہ گناہوں کو ڈھانپنے والی اور عیوب کو مٹانے والی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''ان الحسنات یذھبن السیئات''(ھود:۱۱۴) ''نیکیاں گناہوں کو ختم کردیتی ہیں''۔

''عن الاثم''یعنی یہ نماز گناہوں سے بچانے والی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ﴾ [العنکبوت۔٤٥] ''بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے''۔

تہجد پڑھنے والوں کے لئے خوشخبری

۱۲۲۸: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِالْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَۃٌ یَضْحَکُ اللّٰہُ اِلَیْھِمُ الرَّجُلُ اِذَاقَامَ بِاللَّیْلِ یُصَلِّیْ وَالْقَوْمُ اِذَاصَفُّوْا فِی الصَّلَاۃِ وَالْقَوْمُ اِذَا صَفُّوْا فِیْ قِتَالِ الْعَدُوِّ۔

رواہ فی شرح السنۃ۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ دیکھ کر ہنستا ہے، وہ آدمی جو رات کے وقت تہجد کی نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے، وہ لوگ جو نماز پڑھنے کیلئے اپنی صفوں کو درست کرتے ہیں، وہ لوگ جو دشمنوں سے قتال کرنے کیلئے صفوں کو درست کرتے ہیں۔ (شرح السنہ)

تشریح: ''قال رسول اللہ ﷺ ثلاثۃ'' ثلاثۃ کی مراد میں چار احتمال ہیں:

① رجال، علامہ طیبی نے اسی کو بیان کیا ہے۔ ② اشخاص۔ ③ اصناف۔ ④ انفس۔ صاحب مصابیح نے اسی کو ذکر کیا ہے۔

''یضحک اللّٰہ الیھم'' یعنی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوتے ہیں۔ اور انہیں نظرِ عنایت سے دیکھتے ہیں۔ اور ان پر انتہائی مہربانی اور رحم فرماتے ہیں۔

''الرجل'' غلبیت کی بنا پر رجل کا ذکر کیا گیا۔ نیز اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تہجد کی نماز پڑھنا مردوں کا کام ہے۔

''والقوم اذا صفوا فی الصلاۃ'' یعنی جہاد اصغر کیلئے صفیں بنائیں۔

''والقوم اذا صفوا فی قتال العدوّ'' یعنی جہاد اکبر کیلئے صفیں بنائیں۔

حدیث کی ترتیب ترقی من الادنیٰ الی الاعلیٰ'' کی قبیل سے ہے کیونکہ جہاد سب سے افضل ہے پھر جماعت کی نماز ہے کیونکہ اس کی فرضیت میں اختلاف ہے۔

''رواہ فی شرح السنۃ'' علامہ میرکؒ کہتے ہیں کہ ابن ماجہ نے اس حدیث کو لفظی تفسیر کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

۱۲۲۹: وَعَنْ عَمْرِوبْنِ عَنْبَسَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الرَّبُّ مِنَ الْعَبْدِ فِیْ جَوْفِ اللَّیْلِ الْاٰخِرَۃِ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَکُوْنَ مِمَّنْ یَّذْکُرُ اللّٰہَ فِیْ تِلْکَ السَّاعَۃِ فَکُنْ۔

(رواہ الترمذی وقال ھذاحدیث حسن صحیح غریب اسناد)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥٣٢/٥ حدیث رقم ٣٥٧٩۔ وابن ماجه ٤٣٤/١ حدیث رقم ١٣٦٤۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن عنبسہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری حصہ میں ہوتا ہے، لہٰذا اگر تم بھی اُس وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں میں ہو سکتے ہو تو ضرور ہو جاؤ۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور سند

کے اعتبار سے غریب ہے۔

تشریح: ''اقرب ما یکون الرب'' رب کے قرب سے مراد اس کی رضا ہے۔

''من العبد فی جوف اللیل'' یہ اقرب کی خبر ہے۔

حدیث کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے سب سے زیادہ قریب رات کے وقت میں ہوتے ہیں کیونکہ یہ تجلی کا وقت ہے جسے نزول سے تعبیر کیا گیا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ یا تو ''من الرب'' سے حال ہے اس صورت میں معنی ہوگا ''قائلاً فی جوف اللیل'' اور اگر اس کو ''من العبد'' سے حال مانیں تو معنی ہوگا ''قائمًا فی جوف اللیل''۔

یہ ''الأقرب'' کی خبر بھی بن سکتا ہے۔ اس کا معنی تفصیل کے ساتھ باب السجدۃ میں گزر چکا ہے۔

اگر آپ یہ سوال اٹھائیں کہ یہاں ''اقرب مایکون الرب من العبد'' کے الفاظ ہیں اور وہاں تو ''اقرب مایکون العبد من ربہ'' کے الفاظ ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث سے معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت آگے بڑھی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا قرب محسنین کے احسان سے آگے ہے۔ جب وہ سجدہ کرتے ہیں تو اپنے رب کے قریب ہو جاتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''فاسجد واقترب'' (العلق) ''تم سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ''۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم اور اس کی طرف سے ملنے والی توفیق آدمی کے عمل پر سابق اور عمل کا سبب ہے اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق نہ ہوتی تو بندے سے کبھی خیر کا صدور نہ ہوتا۔

علامہ میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس حدیث کی عبارت اور باب السجدۃ کی عبارت ''أقرب مایکون العبد من ربہ وھو ساجد'' میں کیا فرق ہے؟ تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ اس حدیث میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے سب سے قریب رات کے وقت ہوتے ہیں اور بندے اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب سجدہ کی حالت میں ہوتے ہیں۔

''فکن'' یعنی تو بھی ان لوگوں میں سے ہو جا جو ذکر کرتے ہیں تا کہ ان کی برکت سے تجھے بھی اللہ کا قرب مل جائے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تو بھی ان لوگوں میں سے ہو جا جو اپنے تقدم کی بناء پر ذاکرین میں شمار ہوتے ہیں اور ان کی برکت سے تیرے اوپر بھی رحمت کا فیضان برسے گا۔ یہ انداز بیان زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ ''انہ لمن الصالحین'' کی بلاغت ''انہ صالح'' سے بڑھی ہوئی ہے۔

''ھذا حدیث حسن صحیح غریب اسنادًا'' اسنادًا، تمیز ہے غریب کیلئے۔ یعنی اس کی سند غریب ہے۔ ان دونوں کے درمیان فرق علم الاصول میں معلوم ہوتا ہے اور غرابت وصحت میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

خاونداور بیوی کا ایک دوسرے کو عبادت کے لئے جگانا

۱۲۳۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلّٰى وَاَيْقَظَ اِمْرَاَتَهٗ فَصَلَّتْ فَاِنْ اَبَتْ نَضَحَ فِیْ وَجْهِهَا الْمَاءَ رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأَةً قَامَتْ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّتْ وَاَيْقَظَتْ زَوْجَهَا فَصَلّٰى فَاِنْ اَبٰى نَضَحَتْ فِیْ وَجْهِهِ الْمَاءَ ۔ (رواه ابوداود والنسائی)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲/۱٤٦ حديث رقم ۱٤٥۰۔ والنسائی ۳/۲۰٥ حديث رقم ۱٦۱۰۔ وابن ماجه ۱/٤۲٤ حديث رقم ۱۳۳٦۔ وأحمد فی المسند ۲/۲٥۰۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُس آدمی پر اپنی رحمت نازل فرمائے جو رات کو اُٹھ کر نماز پڑھے اور اپنی بیوی کو جگائے تا کہ وہ بھی نماز پڑھے اور اگر اُس کی بیوی نہ جاگے تو اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اللہ تعالیٰ اُس عورت پر بھی اپنی رحمت نازل فرمائے جو رات کو اُٹھ کر خود بھی نماز پڑھے اور اپنے خاوند کو بھی جگائے تا کہ وہ بھی نماز پڑھے اور اگر خاوند نہ جاگے تو وہ اُس کے منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام نسائیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''رحم الله رجلاً قام من الليل فصلی ''یعنی تہجد کی نماز پڑھے اور اگر اس پر کچھ قضاء بھی ہے تو قضاء کو پہلے پڑھنا زیادہ مناسب ہے۔

''وأيقظ امرأته''اس میں تنبیہ اور موعظت دونوں کا احتمال ہے۔ البتہ بیوی کے معنی میں تمام رشتہ دار بھی داخل ہیں۔

''فان أبت''یعنی غلبہ نیند یا سستی کی وجہ سے بیوی اُٹھنے سے انکار کرے۔

''نضح فی وجهها الماء''اس سے مراد بیوی کے ساتھ مہربانی اور اسے اللہ کی اطاعت کیلئے تیار کرنے کی پوری کوشش کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:''وتعاونوا علی البرّ والتقوٰی''''نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو''۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی کو نیکی کے کام پر زبردستی کرنا جائز بلکہ مستحب ہے۔

''فان أبی نضحت فی وجهه الماء''اس میں بھی حسن معاشرت اور موافقت وملاطفت کے کمال کا بیان ہے۔

دُعا قبول ہونے کا وقت

۱۲۳۱: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَیُّ الدُّعَاءِ اَسْمَعُ قَالَ جَوْفُ اللَّيْلِ الْاٰخِرِ وَدُبُرَ الصَّلٰوتِ الْمَكْتُوْبَاتِ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/٤۹۲ حديث رقم ۳٤۹۹۔

ترجمه: حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، اے اللہ کے رسول! کس وقت دعا زیادہ قبول ہوتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رات کے آخری یعنی تیسرے حصہ میں اور فرض نمازوں

کے بعد۔ اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''یا رسول اللہ! أی الدعاء أسمع؟'' یعنی قبولیت کے قریب تر دعا کون سی ہے؟

علامہ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ درحقیقت وہی دعا سنی جاتی ہے جس نے قبول ہونا ہو۔

''الآخر'' اس کی ترکیبی کیفیت میں مختلف احتمال ہیں:

ابن ملک رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ صرف'' اللیل'' کی صفت ہے۔

امام میرک رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ جوف اللیل ظرفیت کی بنا پر منصوب ہے۔ اگر مضاف کو محذوف مانا جائے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کیا جائے تو اس میں رفع کا احتمال بھی ہے۔ عبارت ہوگی۔ ''الدعاء جوف اللیل الاخر''۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ رات کے چھ حصوں میں سے آخری حصہ مراد ہے۔

جنت کے بالا خانے

۱۲۳۲: وَعَنْ اَبِیْ مَالِكِ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِی الْجَنَّۃِ غُرَفًا یُرٰی ظَاھِرُھَا مِنْ بَاطِنِھَا وَبَاطِنُھَا مِنْ ظَاھِرِھَا اَعَدَّھَا اللّٰہُ لِمَنْ اَلَانَ الْكَلَامَ وَاَطْعَمَ الطَّعَامَ وَتَابَعَ الصِّیَامَ وَصَلّٰی بِاللَّیْلِ وَالنَّاسُ نِیَامٌ۔ (رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

أخرجه أحمد فی المسند ٥/٣٤٢۔ والبیھقی فی شعب الایمان ٣/٤٠٤ حدیث رقم ٣٨٩٢۔

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں ایسے بالا خانے ہیں کہ جن کے باہر کی چیزیں اندر سے اور اندر کی چیزیں باہر سے نظر آتی ہیں اور یہ بالا خانے اللہ نے ان لوگوں کیلئے تیار کیے ہیں جو دوسرے لوگوں سے نرمی کے ساتھ گفتگو کریں اور غریبوں کو کھانا کھلائیں اور زیادہ سے زیادہ نفلی روزے رکھیں اور رات کے وقت اُٹھ کر ایسے اوقات میں تہجد کی نماز پڑھیں جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ اس روایت کو امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں بیان کیا ہے۔

تشریح: ''ان فی الجنۃ غرفًا'' جنت میں ایسے بلند کمرے ہیں جو لطافت، پاکیزگی اور عمدگی کی انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں۔

''لمن ألان الکلام'' اس کا معنی یہ ہے کہ جو شخص مخلوق کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلامًا'' (الفرقان۔ ٦٣)۔

''اور جب جاہل ان سے مخاطب ہوتے تو وہ سلامتی کی بات کرتے ہیں''۔

اس میں یہ رحمٰن کے بندے بن جاتے ہیں اور زمین پر نرمی کے ساتھ چلتے ہیں اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

''اولئک یجزون الغرفۃ بما صبروا''

''ان لوگوں کوان کے صبر کے بدلہ میں (جنت کے) کمرے دیئے جائیں گے''۔

''**واطعم الطعام**'' یعنی خالص اور مکمل سخاوت کے ساتھ لوگوں کو کھانا کھلائے۔

''**تابع الصیام**'' ابن ملک رحمہ اللہ نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ ان روزوں سے مراد نفلی روزے ہیں۔ اور معنی یہ ہے کہ پے در پے روزے رکھتا رہے بالکل چھوڑ نہ دے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ متابعت صیام سے مراد یہ ہے کہ ہر مہینے کم از کم تین روزے رکھے۔ ان تمام جملوں میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے:

''**والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلك قوامًا**'' (الفرقان۔ ۲۷)

''**وصلی باللیل والناس نیام**'' لوگوں کے نینداور غفلت میں پڑے ہونے کی وجہ سے یہ عبادت ریاء سے یکسر خالی اور اخلاص سے بھرپور ہوگی، اس جملہ میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے:

''**والذین یبیتون ربهم سجدًا وقیامًا**'' (الفرقان۔ ٦٧)

''وہ لوگ جو اپنے رب کیلئے قیام اور سجدے میں رات گزارتے ہیں''۔

(**رواہ البیهقی فی شعب الایمان**) امام میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن حبان نے اپنی صحیح میں اس جیسی روایت نقل کی ہیں۔

۱۲۳۳: وَرَوَى التِّرْمِذِيُّ عَنْ عَلِيٍّ نَحْوَهُ وَفِيْ رِوَايَتِهِ لِمَنْ اَطَابَ الْكَلَامَ .

ترجمہ: نیز ترمذی نے بھی اس طرح کی روایت (سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے) نقل کی ہے مگر اُن کی روایت میں **لمن اطاب الکلام** کا ذکر آیا ہے (لیکن **لمن الان الکلام** کا جو مفہوم ہے وہی **لمن اطاب الکلام** کا ہے)۔

تشریح: ''**لمن اطاب الکلام**'' اس حدیث میں ''**لمن اطاب الکلام**'' کا ذکر ہے جبکہ پہلی حدیث میں ''**لمن ألان الکلام**'' کا ذکر ہے۔

الفصل الثالث:

تہجد کی نماز شروع کرنے کے بعد چھوڑنے کی ممانعت

۱۲۳۴: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَبْدَاللّٰهِ لَاتَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ كَانَ يَقُوْمُ مِنَ اللَّيْلِ فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيْلِ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳/۳۷۔ حدیث رقم ۱۱۵۲۔ والنسائی ۳/۲۵۳ حدیث رقم ۱۷۶۳۔ وابن ماجه ۱/۴۲۲ حدیث رقم ۱۳۳۱۔ وأحمد فی المسند ۲/۱۷۰۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بن العاصؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن

فرمایا: اے عبداللہ! فلاں آدمی کی طرح نہ ہو جائیں کہ وہ رات کا قیام کرتا تھا پھر اس نے رات کا قیام چھوڑ دیا۔

(بخاری و مسلم)

تشریح: ''قال قال لی'' یعنی یہ بات صرف مجھے ہی کہی میرے ساتھ کوئی اور شریک نہ تھا۔

''یاعبداللّٰہ لاتکن مثل فلان'' یعنی اس خصلت میں اس فلاں کی طرح نہ ہو جا۔

''فترك قیام اللیل'' یعنی اب اس نے بغیر عذر کے سستی کی وجہ سے تہجد کی نماز چھوڑی ہے۔

فلاں کا ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ وہ اس کلام کو سن لے اور غفلت کو ترک کر دے۔ اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کسی عبادت کو چھوڑ دینا اور کسی اچھی عادت کو ترک کر دینا ایسے ہے جیسے چلتے چلتے الٹے پاؤں لوٹ آنا۔ لہٰذا سالک اور زاہد کو چاہیے کہ ہمیشہ زیادتی اور اضافے کی کوشش کرتا رہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ جو شخص اضافے میں نہیں وہ نقصان میں ہے۔ جس کے دو دن برابر ہو گئے وہ نقصان اور خسارے میں ہے۔ یاد رہے کہ اس زیادتی سے مراد علم و عمل کی زیادتی ہے مال کی زیادتی مراد نہیں۔

ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ــــــ ''زیادة المرء فی دنیاہ نقصان ☆ وربحه غیر محض الخیر خسران''

''آدمی کا دنیا میں آگے بڑھتے جانا نقصان کی چیز ہے اور نیکی کے بغیر دنیا کا نفع نقصان ہی نقصان ہے''۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی عبادت

۱۲۳۵: وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِی الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ كَانَ لِدَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ اللَّيْلِ سَاعَةٌ يُوْقِظُ فِيْهَا اَهْلَهٗ يَقُوْلُ يَا اٰلَ دَاوُدَ قُوْمُوْا فَصَلُّوْا فَاِنَّ هٰذِهٖ سَاعَةٌ يَسْتَجِيْبُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِيْهَا الدُّعَآءَ اِلَّا لِسَاحِرٍ اَوْ عَشَّارٍ۔ (رواہ احمد)

أخرجه أحمد فی المسند ٤/ ٢٢۔

ترجمہ: حضرت عثمان بن ابی عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کیلئے رات میں ایک وقت مقرر تھا جس میں وہ اپنے گھر والوں کو بیدار کرتے اور فرماتے اے آل داؤد! اٹھو اور نماز پڑھو کیونکہ یہ ایسی گھڑی ہے جس میں اللہ عز وجل دعا کو قبول کرتا ہے، سوائے جادوگر اور ٹیکس وصول کرنے والے کے (کہ ان کی دعا کو قبول نہیں کرتا)۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''ساعة'' کان کا اسم ہے۔

''یستجیب اللّٰہ عزوجل فیھا الدعاء'' نماز کو دعا اس لئے ہی کہہ سکتے ہیں کہ نماز ایسی دعا پر مشتمل ہوتی ہے جسے ذکر اور ثناء نے ڈھانپا ہوا ہے۔

''أو عشار'' یعنی وہ شخص جو لوگوں سے زبردستی بھتہ وصول کرے۔ خواہ عشر سے کم ہی لے پھر بھی وہ اس وعید کا مستحق ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں عبودیت نام ہے اللہ کے حکم کی تعظیم اور اللہ کی مخلوق پر شفقت کا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ساری مخلوق میں جادوگر اور عشار کو بطورِ خاص اس لئے ذکر کیا گیا کہ اس میں ان کیلئے سخت وعید اور دھمکی ہے۔ گویا کہ یہ لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس کرنے والے ہیں۔

یعنی یہ اگر رات کو قیام بھی کریں اور پیروی بھی کریں تو ان کے گناہ کی نحوست اور ان کی توبہ کی صعوبت کی بنا پر ان کی نماز اور دعا قبول نہ ہوگی۔

یا اس کا معنی یہ ہے کہ انہیں اپنے جرم عظیم کی وجہ سے اس خیر کی توفیق نہ ملے گی۔

پہلے معنی کی صورت میں استثناء متصل اور دوسرے معنی کی صورت میں استثناء منفصل ہوگا۔

''افضل الصلاۃ بعد المفروضۃ صلاۃ فی جوف اللیل'' امام میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں شافعیہ کے عالم ابو اسحاق روزی کی دلیل ہے کہ وہ تہجد کی نماز کو تمام نفلوں سے افضل قرار دیتے ہیں۔

اکثر علماء فرماتے ہیں کہ نماز کے بعد والے نوافل افضل ہیں۔ لیکن ابو اسحاق روزی کا قول اس حدیث کی نص کی بناء پر قوی ہے۔

البتہ اس حدیث کی یہ تاویل کی جا سکتی ہے کہ اس میں مطلقاً افضل نمازوں کا ذکر ہے۔ یعنی افضل الصلاۃ کا معنی ہوگا ''من افضل الصلاۃ''۔

علماء یہ بھی فرماتے ہیں کہ نفس پر زیادہ مشقت کے اعتبار سے اور ریا سے دور ہونے کی وجہ سے تہجد کی نماز افضل ہے اور فرض نمازوں کے بعد پڑھے جانے والے نوافل فرائض کی مشابہت کی بنا پر افضل ہیں۔ اس طرح دونوں میں کوئی منافات نہ رہے گا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رات کی نماز وتر (جو کہ واجب ہے) پر مشتمل ہونے کی وجہ سے افضل ہے۔

فرض نماز کے بعد صلوٰۃ اللیل کا درجہ ہے

۱۲۳۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْمَفْرُوْضَةِ صَلَاةٌ فِیْ جَوْفِ اللَّیْلِ۔ (رواہ احمد)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۲/ ۸۲۱ حدیث رقم (۲۰۲/ ۱۱۶۳)۔ وأبوداود فی السنن ۲/ ۸۱۱ حدیث رقم ۲۴۲۹۔ وأحمد فی المسند ۲/ ۵۳۵۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز وہ ہے جو رات میں پڑھی جائے۔ اس حدیث کو امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔

تہجد کی نماز برائی سے روکتی ہے

۱۲۳۷: وَعَنْهُ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنَّ فُلَانًا یُصَلِّیْ بِاللَّیْلِ فَاِذَا اَصْبَحَ سَرَقَ فَقَالَ اِنَّهُ سَیَنْهَاهُ مَاتَقُوْلُ۔ (رواہ احمد والبیهقی فی شعب الایمان)

أخرجه أحمد في المسند ٢/٤٤٧ والبيهقي في شعب الايمان ٣/١٧٤ حديث ٣٢٦١۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور اُس نے عرض کیا کہ فلاں آدمی رات کو تہجد کی نماز پڑھتا ہے مگر صبح کو اٹھ کر چوری کرتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عنقریب اس کی نماز اس کو اس برائی سے روک دے گی جو تو کہتا ہے۔ اس حدیث کو امام احمدؒ اور امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

تشریح: ''سرق ''یعنی دن کو چوری کرتا ہے اور رات کو نماز پڑھتا ہے۔ اس چوری کی دو صورتیں ہو سکتی ہے یا تو کسی کی چیز میں چرائے یا ناپ تول میں کمی کرے۔

''سینھاہ'' اگر اسے تاء کے ساتھ پڑھیں تو اس صورت میں اس کی ضمیر الصلاۃ کی طرف لوٹے گی، معنی یہ ہوگا کہ اس کی نماز اسے اس گناہ سے روک دے گی۔

اگر یاء کے ساتھ سینھاہ پڑھیں تو فاعل 'ما'' ہوگا جو کہ آگے ما تقول میں آرہا ہے اس کی تذکیر لفظ کے اعتبار سے ہوگی۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ستنھاہ کا سین تاکید کیلئے ہے۔ اس کے عدم کی طرف نسبت کرتے ہوئے جیسے 'لن'' نفی میں تاکید کیلئے ہوتا ہے لا کی طرف نسبت کرتے ہوئے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سین اپنی اصل پر یعنی مستقبل قریب کے معنی میں ہے یعنی یہ نماز عنقریب اسے چوری سے روک دے گی۔ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے قول کی طرف اشارہ ہے:

''ان الصلاۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر'' (العنکبوت۔۴۵) ''بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے''۔

سب گھر والے تہجد پڑھیں

١٢٣٨: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَاَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَیْقَظَ الرَّجُلُ اَهْلَهٗ مِنَ اللَّیْلِ فَصَلَّیَا اَوْصَلّٰی رَكْعَتَیْنِ جَمِیْعًا كُتِبَ فِی الذّٰكِرِیْنَ وَالذّٰكِرَاتِ۔

(رواہ ابوداود وابن ماجۃ)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ٢/٧٣ حديث رقم ١٣٠٩۔ وابن ماجه في السنن ١/٤٢٣ حديث رقم ١٣٣٥۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دونوں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی آدمی رات کے وقت اپنی بیوی کو جگائے اور وہ دونوں نماز پڑھیں یا یہ فرمایا دونوں میں سے ہر ایک دو رکعتیں اکٹھی پڑھیں تو ان کو ذکر کرنے والے مردوں اور ذکر کرنے والی عورتوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ اور امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''اذا أیقظ الرجل اھلہ'' اھل سے مراد بیویاں، اولاد، رشتہ دار، غلام اور باندیاں ہیں۔

''فصليا أو صلى ركعتين جميعًا'' ''جميعا'' ''فصليا'' یا ''صلى'' کی ضمیر کیلئے تاکید ہے۔ جبکہ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے فصليا کی تثنیہ ضمیر سے حال موکدہ بنایا ہے۔

''كتبا في الذاكرين والذاكرات'' اس حدیث میں اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے:

''والذاكرين كثيرًا والذاكرات أعدّلهم مغفرة وأجرًا عظيمًا'' (الاحزاب۔۳۵)

''اللہ کا ذکر کرنے والے مراد اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کیلئے مغفرت اور اجر عظیم رکھا ہے''۔

رواہ ابو داؤد و ابن ماجه: علامہ میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو نسائی، ابن حبان اور حاکم نے بھی نقل کیا ہے ان کے الفاظ ملتے جلتے ہیں۔

بلند مرتبہ لوگ

۱۲۳۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَشْرَافُ اُمَّتِىْ حَمَلَةُ الْقُرْاٰنِ وَاَصْحَابُ اللَّيْلِ۔ (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ۵۵٦/۲ حديث رقم ۲۷۰۳۔

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کے بلند مرتبہ لوگ قرآن کریم کے اٹھانے والے اور رات کے وقت اٹھنے والے ہیں۔ اس حدیث کو امام بیہقی نے روایت کیا شعب الایمان میں۔

تشریح: ''حملة القرآن'' حاملین قرآن سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس کے معانی کو یاد کریں' اس کے معانی کو سمجھیں' اس کے اوامر ونواہی پر عمل کریں۔ جس کے پاس قرآن کا جتنا زیادہ علم ہوگا اس کا رتبہ اتنا ہی بڑھتا جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''جس نے قرآن مجید کو حفظ کیا اس نے علوم نبوت کو اپنے سینہ میں لے لیا البتہ اس کی طرف وحی جلی نہیں کی جاتی لیکن وحی خفی کی جاتی ہے''

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حاملین قرآن سے مراد ہے کہ وہ شخص قرآن مجید کو حفظ کرے اور اس کے مقتضا پر عمل کرے۔ اگر وہ قرآن مجید پر عمل نہیں کرتا تو اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''كمثل الحمار يحمل أسفارا'' (الجمعۃ۔۵) ''(ان کی مثال) اس گدھے کی سی ہے جس نے کتابیں اٹھا رکھی ہیں''۔

''وأصحاب الليل'' اصحاب لیل سے مراد ریا سے پاک وقت میں خالص اللہ کی عبادت کرنے والے لوگ ہیں جن کی عبادت مشقت اور تکلیف سے بھری ہوئی ہے۔

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اس امت کے برگزیدہ اور اشراف وہ ہیں جو علم نافع اور عمل صالح کے جامع ہوں۔ یا اس کا یہ معنی ہے کہ ان میں سے ہر ایک باقی امت سے ممتاز ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اصحاب کی اضافت لیل کی طرف کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ رات کو کثرت سے نماز پڑھنے والے ہیں۔ جیسے ابن السبیل اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بہت زیادہ سفر کرنے والا ہو اور ابن الوقت اسے کہتے ہیں جو وقت کی بہت زیادہ پابندی اور اہتمام کرنے والا ہو۔

علامہ میرک رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن ابی الدنیا نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صلوۃ اللیل

۱۲۴۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ اَبَاهُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ مَاشَاءَ اللّٰهُ حَتّٰى اِذَا كَانَ مِنْ اٰخِرِ اللَّيْلِ اَيْقَظَ اَهْلَهٗ لِلصَّلَاةِ يَقُوْلُ لَهُمُ الصَّلَاةُ ثُمَّ يَتْلُوْ هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَأْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْاَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ۔ (رواہ مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ١/١١٩ حديث رقم ٥ من كتاب صلاة الليل۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ ان کے والد حضرت عمر بن الخطاب رات کے وقت جتنا اللہ چاہتا نماز پڑھتے تھے، اور جب رات کا آخر ہوتا تو اپنی بیوی کو بھی نماز کے لئے بیدار کرتے اور کہتے اٹھو اور نماز پڑھو اس کے بعد قرآن کریم کی آیت پڑھتے کہ اپنی اہل کو نماز کا حکم دو، اور خود بھی اس کی مشقتوں پر صبر کرو، ہم آپ سے رزق نہیں مانگتے آپ کو بھی رزق ہم دیتے ہیں اور اچھا انجام پرہیز گار لوگوں کیلئے ہے۔ اس حدیث کو امام مالک نے روایت کیا ہے۔

تشریح: ''عن ابن عمر ان اباه عمر بن الخطاب رضی اللہ عنه'' ایک ضعیف نسخہ میں عنہما ہے لیکن اس سے وہم پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس سے مراد حضرت عمر اور ان کے بیٹے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے والد نہیں۔

''کان یصلی من اللیل ماشاء اللہ'' یعنی جتنے وقت اور جتنی رکعات اللہ تعالیٰ چاہتے نماز پڑھتے تھے۔

''ایقظ اهله للصلاۃ'' تاکہ گھر والے بھی اس چیز کو حاصل کرسکیں۔

''یقول لھم الصلاۃ'' الصلاۃ کی ترکیبی کیفیت میں دو احتمال ہیں:

① منصوب۔ اس صورت میں أقیموا یا صلوا فعل محذوف ہوگا۔

② مرفوع۔ اس صورت میں حضرت کا لفظ محذوف ہوگا۔

''ثم یتلو هذه الایة (وامر اهلك بالصلاۃ)'' یہ آیت اپنے عموم کی وجہ سے تہجد کو بھی شامل ہے۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ اپنے فقر کو ادا کرنے کیلئے اللہ سے مدد طلب کرو۔ رزق کے حصول کا زیادہ اہتمام نہ کرو۔ بلکہ اپنے دل کو آخرت کیلئے فارغ کرلو۔ کیونکہ روزی کا انتظام ہمارے ذمہ ہے۔

''والعاقبة للتقوی'' یعنی دنیا اور آخرت کا اچھا انجام ان متقین کیلئے جو علم، عمل اور اخلاص والے ہیں اور مقام اختصاص تک پہنچنے والے ہیں۔

بعض بزرگوں کے بارے میں منقول ہے کہ جب انہیں کوئی تنگی پیش آتی تو فوراً نماز پڑھنے کا حکم دیتے اور فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اسی عمل کا حکم دیا ہے۔ پھر اسی آیت کریمہ کی تلاوت فرماتے ہیں۔

بَابُ الْقَصْدِ فِي الْعَمَلِ

اعمال میں میانہ روی اختیار کرنے کا بیان

اس باب میں ایسی احادیث ذکر کی جائیں گی جن میں یہ مذکور ہوگا کہ جس طرح دنیاوی امور میں حد سے آگے بڑھنا غیر نفع بخش ہے اسی طرح دینی امور میں بھی حدِ اعتدال سے آگے بڑھنا غیر مفید اور تھکا دینے والا ہے بلکہ دینی کاموں میں بھی میانہ روی اختیار کرنا ضروری ہے تاکہ افراط وتفریط سے محفوظ رہے اور اعمال پر مداومت ہو جو کہ اصل مطلوب ہے اور اس لئے بھی اعتدال ضروری ہے کہ دین متین کا مزاج ہی میانہ روی ہے۔

الفصل الاول:

حضور ﷺ کے اعمال میں بھی اعتدال تھا

۱۲۴۱: عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُفْطِرُ مِنَ الشَّهْرِ حَتّٰى نَظُنَّ اَنْ لَّا يَصُوْمَ مِنْهُ وَيَصُوْمُ حَتّٰى نَظُنَّ اَنْ لَّا يُفْطِرَ مِنْهُ شَيْئًا وَّكَانَ لَا تَشَاءُ اَنْ تَرَاهُ مِنَ اللَّيْلِ مُصَلِّيًا اِلَّا رَاَيْتَهٗ وَلَا نَائِمًا اِلَّا رَاَيْتَهٗ ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲۲/۳۔ حديث رقم ۱۱٤۱۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ مہینہ کے اکثر ایام میں نفلی روزہ نہ رکھتے، یہاں تک کہ ہم گمان کرتے کہ حضور ﷺ اس مہینہ میں نفلی روزے نہیں رکھیں گے اور آپ ﷺ اسی مہینہ یا کسی دوسرے مہینہ میں نفلی روزے رکھتے یہاں تک کہ ہم گمان کرتے کہ آپ ﷺ اس مہینہ کا کوئی دن بھی بغیر روزے کے نہیں رہیں گے۔ اور اگر آپ ﷺ کو رات میں (نفل) نماز پڑھتے ہوئے تم دیکھنا چاہتے تو نماز پڑھتے ہوئے بھی دیکھ لیتے اور اگر تم حضور ﷺ کو رات کو سوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تو بھی دیکھ لیتے۔ یہ بخاری کی روایت ہے۔

تشریح: ''حتی نظن ان لا یصوم'' **لا یصوم** کی ترکیبی کیفیت میں دو احتمال ہیں:

① منصوب، اس صورت میں اَن ناصبہ ہوگا۔ ② مرفوع، اَن مخففہ من المثقلہ ہوگا۔

''**ان لا یفطر**'' اس کی ترکیب میں بھی مذکورہ دونوں احتمال ہیں۔

''**وکان لا تشاء**'' علامہ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ لفظ ''**لا**'' ''**لیس**'' یا ''**لم**'' کے معنی میں ہے۔ ای **لست تشاء یالم تکن تشاء**''۔

حاصل اس حدیث کا یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ روزوں میں بھی اعتدال سے کام لیتے اور رات کی نماز کے بارے میں بھی،

اگر کوئی شخص آپ کو سوتے ہوئے دیکھنا چاہتا تو دیکھ سکتا تھا اور اگر نماز پڑھتے ہوئے چاہتا تو دیکھ سکتا تھا۔ یعنی آپ ﷺ اس معاملہ میں بھی اعتدال اور میانہ روی سے کام لیتے تھے۔ سونے کے وقت میں آرام فرماتے تھے یعنی رات کے اول حصہ میں اور تہجد کے وقت میں تہجد پڑھتے تھے یعنی رات کے آخری حصہ میں۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے کہا کہ میں پوری رات نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روز رکھوں گا کبھی افطار نہ کروں گا۔ جب حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ ہم میں سے نہیں۔

''رواہ البخاری'' امام ترمذی نے بھی شمائل میں اس حدیث کو مختلف الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے پسندیدہ عمل

۱۲۴۲: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ اَدْوَمُهَا وَاِنْ قَلَّ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١١/ ٢٩٤۔ حديث رقم ٦٤٦٢۔ ومسلم في صحيحه ١/ ٥٤١ حديث رقم (٢١٨۔ ٧٨٣)۔ والترمذي في السنن ٥/ ١٣١ حديث رقم ٢٨٥٦۔ والنسائي ٣/ ٢٢٢ حديث رقم ١٦٥٥۔ ومالك في الموطأ ١/ ١٧٤ حديث رقم ٩٠ من كتاب قصر الصلاة۔ وأحمد في المسند ٦/ ٤٠۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (بندوں کے نیک اعمال میں) اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے پسندیدہ عمل وہ ہے جو کہ ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بخاری کی روایت ہے۔

تشریح: ''أحب الأعمال الى الله أدومها'' اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب عمل وہ ہے جس پر ہمیشگی اختیار کی جائے۔ کیونکہ نفس اس کا عادی اور مانوس ہو جاتا ہے۔ اور اس میں مکمل یکسوئی اور توجہ حاصل ہوتی ہے۔

علامہ مظہرؒ اس حدیث کی روشنی میں کہتے ہیں کہ صوفیاء کے نزدیک اولاد کو چھوڑنا اسی طرح ہے جیسے فرائض کو چھوڑنا۔ کسی اطاعت کے کام کو بلاوجہ چھوڑنے والا اللہ تعالیٰ کی عبادت سے اعراض کرنے والا ہے لہٰذا اسے ملامت کا مستحق ہونا چاہیے۔

''وان قلّ'' یعنی مداومت والا عمل اگرچہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ عمل قلیل مداومت اور ہمیشگی کی وجہ سے اس عمل کثیر سے آگے بڑھ جاتا ہے جس میں مداومت اور استقامت نہ ہو۔

''متفق علیه'' علامہ ابہری فرماتے ہیں کہ مصنف نے شاید اس حدیث کو اس بنا پر متفق علیہ قرار دیا ہے کہ بخاری میں ہے کہ حضرت مسروق نے حضرت عائشہؓ سے سوال کیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کو سب سے محبوب عمل کون سا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا جس پر ہمیشگی اختیار کی جائے۔ پس بخاری کی روایت معنوی طور پر مسلم کی روایت جیسی ہوگی۔

عبادت ہمیشہ اپنی طاقت کے مطابق کرنی چاہیے

۱۲۴۳: وَعَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُذُوْا مِنَ الْاَعْمَالِ مَا تُطِيْقُوْنَ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوْا ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢١٣/٤۔ حديث رقم ١٩٧٠۔ ومسلم في صحيحه ٥٤٠/١ حديث رقم (٢١٥۔ ٧٨٢)۔ والنسائي ٢١٨/٣ حديث رقم ١٦٤٢۔ وابن ماجه ١٤١٦/٢ حديث رقم ٤٢٣٨۔ و مالك في الموطأ ١١٨/١ حديث رقم ٤ من كتاب صلاة الليل ۔ وأحمد في المسند ٦١/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اعمال میں سے اتنی ہی مقدار عمل کرنا اختیار کرو جتنی مقدار (ہمیشہ) کرنے کی طاقت رکھتے ہو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ (ثواب دینے سے) نہیں اکتاتا، یہاں تک کہ تم خود اُکتا جاؤ (یعنی تنگ ہو کر عبادت چھوڑ دو)۔ یہ بخاری و مسلم کی روایت ہے۔

تشریح: ''خذوا من الأعمال'' یعنی اقوال وافعال اوراذکار مراد ہیں جس عمل کی جتنی طاقت ہو اسی کے بقدر عمل کرنا چاہیے۔

''ما تطیقون'' ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اپنی جانوں پر بہت سے اوراد ووظائف بوجھ نہ ڈالو کہیں تنگ آ کر انہیں چھوڑ نہ دو۔

بعض علماء نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے اس وقت تک اپنا فضل نہیں ہٹاتا جب تک تم اس سے سوال کرنا نہ چھوڑ دو۔ اس عبارت کو ازدواج کے لئے ذکر کیا گیا جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ''نسوا الله فنسيهم'' وگرنہ ملول کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا درست نہیں کیونکہ ملال ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو کسی چیز کے کثرت عمل کی وجہ سے فتویٰ کی صورت میں بدن کو لاحق ہوتی ہے اس سے اس فعل کے بارے میں اعراض اور کھچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے اور اس کا تصور اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کے بارے میں کرنا ناممکن ہے۔

جب تک دِلجمعی ہو تب تک عبادت کرنی چاہیے

۱۲۴۴: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لِيُصَلِّ اَحَدُكُمْ نَشَاطَهٗ وَاِذَا فَتَرَ فَلْيَقْعُدْ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣٦/٣۔ حديث رقم ١١٥٠۔ ومسلم في صحيحه ٥٤١/١ حديث رقم ٧٨٤/٢١٩۔ وأبوداؤد في السنن ٧٥/٢ حديث رقم ١٣١٢۔ والنسائي ٢١٨/٣ حديث رقم ١٦٤٣۔ وابن ماجه ٤٣٦/١ حديث رقم ١٣٧١۔ وأحمد في المسند ١٠١/٣۔

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چاہیے کہ تم میں سے کوئی اسی وقت تک نماز پڑھے جب تک نشاط و چستی رہے اور جب طبیعت بوجھل ہو جائے تو بیٹھ جائے (یعنی نفل نماز چھوڑ دے)۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ''ليصل احدكم نشاطه'' یعنی نشاط وانبساط کے وقت نشاط والی نماز پڑھو۔

''واذا فتر'' یعنی جب وہ کمزوری محسوس کرے طبیعت اچاٹ ہونے لگے اور اس کا نشاط ختم ہونے لگے یا تھک جائے تو

بیٹھ جائے۔

"فلیقعد" یعنی قیام نہ کرے بلکہ بیٹھ جائے۔ لیترك (چھوڑ دے) کے بجائے فلیقعد (بیٹھ جائے) کا لفظ استعمال کرنے میں ایک مخفی نکتہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے اس کا معنی یہ ہو کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے جب تھک جائے تو بیٹھ کر نماز شروع کر دے۔

حاصل یہ ہے کہ آخرت کے رستے پر چلنے والے کیلئے ضروری ہے کہ وہ ہر وقت نماز و عبادات کی کوشش کرتا رہے۔ جہاں تک اس کی ہمت اجازت دے اطاعت میں اعتدال کے ساتھ چلتا رہے اور سلوک طریقت میں بیزاری اور تھکاوٹ والے اعمال سے اجتناب کرے۔ کیونکہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہے کہ آپ سستی اور بیزاری کے ساتھ اس سے مناجات کریں۔ جب تھکاوٹ ہو جائے تو قیام کو چھوڑ کر کسی مباح کلام میں مصروف ہو جائے یا عبادت میں نشاط کیلئے تھوڑا سا آرام کرے۔ اس کا یہ آرام بھی عبادت شمار ہو گا۔ اس وجہ سے کہا جاتا ہے:

"نوم العالم عبادة"۔ "عالم کی نیند بھی عبادت ہے"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمانا "کلمینی یا حمیراء" "اے حمیراء! مجھ سے باتیں کرو، اسی قبیل سے ہے۔

علامہ میرک فرماتے ہیں کہ ابوداؤد اور نسائی نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

سخت نیند کی حالت میں نماز نہ پڑھنی چاہیے

۱۲۴۵: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا نَعَسَ اَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّيْ فَلْيَرْقُدْ حَتّٰى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ فَاِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا صَلّٰى وَهُوَ نَاعِسٌ لَا يَدْرِیْ لَعَلَّهٗ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبُّ نَفْسَهٗ۔ (متفق علیه)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۵٤۲ حدیث رقم ۲۲۲/۷۸٦۔ وأبوداؤد فی السنن ۲/۷٤ حدیث رقم ۲/۷٤ حدیث رقم ۱۳۱۰۔ والترمذی ۲/۸٦ حدیث رقم ۳۵۵۔ وابن ماجه ۱/٤۳٦ حدیث رقم ۱۳۷۰۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی دوران نماز اونگھنے لگے تو اسے چاہئے کہ وہ سو جائے یہاں تک کہ نیند چلی جائے، اس لئے کہ جب تم میں سے کوئی ایک اُونگھتا ہوا نماز پڑھتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ وہ استغفار کر رہا ہے یا کہ اپنے نفس کو گالی دے رہا ہے (یعنی اپنے لئے بددعا کر رہا ہے)۔

تشریح: "وهو يصلی" یہ جملہ حالیہ ہے۔

"فلیرقد" یہ امر استحباب کیلئے ہے، اس حالت میں نماز پڑھنے سے ثواب تو ملے گا لیکن نماز مکروہ ہوگی۔

"لا یدری" لا یدری کا مفعول محذوف ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:

"لا یدری ماذا یصدر عنه وما یقول من غلبة النوم"

"نیند کے غلبہ کی بنا پر اس کو علم نہیں ہوگا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے"۔

"فیسب" علامہ عسقلانی کے نزدیک اس کو منصوب و مرفوع دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔

فیسب نفسہ کی تفسیر میں ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ استغفار کی جگہ اپنے آپ کو بددعا کرنے کی یہ صورت ہوگی کہ ''اللھم اغفر (اے اللہ! معاف فرما) کے بجائے ''اللھم اعفر'' (اے اللہ، مٹی کر دے) کہنے لگے گا۔ پس رفع نہ تو اصول میں سے ہے اور نہ ہی روایت ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فلیسب کی فاء سببیت کیلئے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل قول میں لام سببیت کیلئے ہے۔

''فالتقطه' آل فرعون ليكون'' (القصص۔۸)

مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فیسب میں رفع بھی جائز ہے اس صورت میں فعل کا فعل پر عطف ہوگا اور نصب بھی جائز ہے۔ اس صورت میں مذہب فیسب اول کا جواب ہوگا کیونکہ ھل کا جواب منصوب کے تقاضا میں لیس کی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

''لعله يزكی او يذكر فتنفعه الذكری'' (العبس۔ ۳۔۴)

امام عاصم نے اسے منصوب اور باقی حضرات نے مرفوع پڑھا ہے۔

بہر حال نصب ہی بہتر اور اولیٰ معلوم ہوتا ہے اور اس لئے بھی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرے گا تاکہ پاکیزہ ہو پس وہ ایسی بات کرے گا جو اسے گناہ میں مبتلا کر دے گی۔ اور اس کا گناہ اور معصیت اور بڑھ جائے گی۔ حقیقت میں گویا کہ وہ اپنے آپ کو گالی دینے لگے گا۔

عبادت میں اپنے اوپر سختی کرنا

۱۲۴۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ وَّلَنْ يُّشَادَّ الدِّيْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهٗ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاَبْشِرُوْا وَاسْتَعِيْنُوْا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَیْءٍ مِّنَ الدُّلْجَةِ ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۲/۵۸۷۰۔ حديث رقم ۱۱۱۷۔ والترمذی فی السنن ۲/۲۰۸ حديث رقم ۳۷۲۔ وابن ماجه ۱/۳۷۶ حديث رقم ۱۲۲۳ وأحمد فی المسند ٤/٤٢٦۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک دین آسان ہے اور ہرگز نہیں سختی کرتا دین میں کوئی شخص مگر دین اس پر غالب آجاتا ہے (یعنی زائد کام جو شروع کیا ہے اس کو ادا نہیں کر سکتا) لہٰذا دینی امور میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی بساط کے مطابق عمل کرو اور خوش رہو (اللہ تعالیٰ کے اکرام اور انعامات کے ساتھ) اور اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کرو صبح اور شام اور رات کے آخری حصہ میں۔ (بخاریؒ)

تشریح: ''ان الدين يسرٌ'' دین سے مراد بندوں کیلئے اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ احکامات ہیں۔ یہ دین آسانی پر مبنی ہے۔

ارباب لغت کا کہنا ہے کہ یسرٌ مصدر ہے اور مبالغہ کیلئے مفعول کے قائم مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر'' (البقرہ۔۱۸۵)

''اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتا ہے مشکل کا ارادہ نہیں کرتا''۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وما جعل علیکم فی الدین من حرج'' (الحج۔۷۸) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دین میں کوئی سختی نہیں رکھی''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ رخصت دیں جیسا کہ عزیمتوں کو پسند فرماتے ہیں''۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ تم بوڑھوں کے دین پر عمل کرو، علامہ سخاوی کے مطابق اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

''ولن یشاد الدین احدٌ'' یعنی دین کے مقابلہ میں ہرگز کوئی سختی کے ساتھ نہیں آسکتا۔

اس کا معنی یہ ہے کہ جو شخص اپنے نفس پر سختی کرے اور دین کے معاملہ میں تعمق سے کام لے اور غیر واجب چیزوں سے خود کو الجھائے اور پہنائے رکھے تو عین ممکن ہے کہ اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکے اور واجب چیزوں پر بھی عمل پیرا نہ ہو سکے گا۔

''یشاد، المشادۃ سے مشتق ہے اس کا معنی ہے ''التشدّد علی وجہ المبالغۃ''۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ظاہر کو مضمر کی جگہ رکھنا اس کی تعظیم میں مبالغہ کیلئے ہوتا ہے۔ وہ اس حدیث کا یہ معنی بیان کرتے ہیں۔

''جب بھی کوئی شخص آسان دین کو مشکل بنانے کی کوشش کرے گا تو یہ دین اپنی آسانی کے ساتھ اس پر غالب آ کر رہے گا۔ اس میں رہبانیت اور ترک دنیا کی بھی ممانعت ہے جس کا مقصد اولین خواہشات نفس کو کچلنا ہے کیونکہ یہ چیزیں انسان کو فتور اور عجز تک پہنچا کے چھوڑتی ہیں۔ اس بناء پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو سختی سے منع فرمایا جنہوں نے اپنے نفسوں پر سختی کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب عمر رسیدہ ہو گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصیت کردہ اعمال کے ادائیگی میں مشقت پیش آنے لگی تو انہوں نے کہا کہ کاش میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رخصت کو قبول کر لیتا''۔

''فسدّدوا'' یعنی اعتدال اور میانہ روی کے رستہ کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور منہج قدیم و صراط مستقیم پر کاربند رہو۔

''وقاربوا'' یعنی آسانی کے ساتھ امر کے قریب رہو اور صعوبت اور پریشانی کی وجہ سے اس سے دور مت ہو جاؤ۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فاء شرط محذوف کا جواب ہے۔ اصل عبارت یہ ہوگی:

''اذا بینت لکم ما فی المشادۃ فی الوھن فسدّدوا''۔

یعنی تمہارے لئے دین میں سختی اور تشدد کی راہ بیان کر دی گئی۔ تو تمہیں چاہیے کہ صراط مستقیم اور راہِ اعتدال کو تلاش کرو جس میں کوئی ٹیڑھا پن نہ ہو۔ قاربو تاکید ہے تشدید کیلئے ہے معنی کے اعتبار سے۔

''وأبشروا'' اور بشارت حاصل کرو جنت کی۔ سلامتی کی اور ہر نعمت و اعزاز کی کیونکہ اللہ تعالیٰ تھوڑے عمل پر بھی بہت سا اجر عطا فرماتے ہیں۔

''واستعینوا'' اور اوقات کے دوران عبادات میں اللہ کی مدد طلب کرو۔

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ طاعت کے ذریعہ جنت کے حصول پر ان تینوں اوقات میں عبادت کے ذریعہ مدد حاصل کرو۔

استراحت اس لئے ضروری ہے کہ کہیں تھکاوٹ، سستی اور بیزاری کا شکار نہ ہو جاؤ۔

ایک معنی یہ بیان کیا گیا ہے کہ اپنی ضروریات کی تکمیل اور مقاصد کی برآوری میں دن کے دونوں حصوں اور رات کے ایک ٹکڑے میں اللہ کی مدد حاصل کرو۔

علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ امام نسائی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک حدیث مرسل میں آیا ہے:

''یہ دین آسان ہے اسے نرمی سے حاصل کرو اور اللہ کی عبادت کو اپنے نزدیک قابل نفرت نہ بناؤ کیونکہ جو آدمی سواری کو طاقت سے زیادہ دوڑاتا ہے وہ نہ کوئی زمین چھوڑتا ہے اور نہ سواری۔ یعنی سواری ہلاک ہو جاتی ہے اور منزل ادھوری رہ جاتی ہے۔

رات کے وظائف کی قضا دن میں

۱۲۴۷: وَعَنْ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِهٖ اَوْعَنْ شَیْءٍ مِنْهُ فَقَرَاَهٗ فِيْمَا بَيْنَ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَصَلَاةِ الظُّهْرِ كُتِبَ لَهٗ كَاَنَّمَا قَرَاَهٗ مِنَ اللَّيْلِ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه البخاري في صحيحه ۵۸۶/۲۔ حديث رقم ۱۱۱۶۔ والترمذي في السنن ۲۰۷/۲ حديث رقم ۳۷۱۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنا رات کا پورا وظیفہ پڑھے بغیر یا اس کے کچھ حصہ کو پڑھے بغیر سو گیا اور پھر وہ اس کو نماز فجر اور نماز ظہر کے درمیان پڑھ لیتا ہے تو اس کے لئے (ثواب میں) یہی لکھا جائے گا کہ گویا اس نے اس کو رات میں ہی پڑھا ہے۔ (مسلمؒ)

تشریح: ''من نام عن حزبه'' جو شخص اپنا وظیفہ پورا کئے بغیر سو گیا۔ نماز کا بھی یہی حکم ہے۔ یعنی آدمی کسی بھی قسم کا وظیفہ، ورد یا عمل کیا کرتا تھا اگر رات کو نہ کر سکا اور فجر اور ظہر کے درمیان اس کو پورا کرے تو اسے پورا پورا اجر دے دیا جاتا ہے۔

''کانما قرأه'' یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ اصل عبارت یہ نکلے گی:

''أثبت أجره فی صحیفة عمله اثباتاً مثل اثباته حین قرأة''

بعض علماء فرماتے ہیں کہ ظہر سے پہلے کے وقت کا ذکر اس بنا پر ہے کہ یہ وقت پوری رات کے برابر ہے اسی وجہ سے زوال سے پہلے نیت کر لینے سے روزہ درست ہو جاتا ہے۔

البتہ اس بات سے اتفاق نہیں ہو سکتا کیونکہ زوال سے پہلے نیت کا درست ہونا اس وجہ سے نہیں کہ یہ وقت رات کے برابر ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ دن کا اکثر حصہ روزہ کی حالت میں گزر جائے۔ قبل از زوال سے مراد ضحوۂ کبریٰ ہے۔

میرے خیال میں زیادہ بہتر توجیہ یہ ہے کہ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف اشارہ ہے:

''وھو الذی جعل اللیل والنھار خلفة لمن أراد أن یذکر أو اراد شکوراً''

''اللہ وہ ذات ہے جس نے دن اور رات ایک دوسرے کے آگے پیچھے آنے جانے والے بنائے اس شخص کیلئے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے یا شکر کرنا چاہے''۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دن اور رات میں سے ہر ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں پس اگر ان میں سے کسی ایک وقت کے اوراد رہ جائیں تو وہ دوسرے وقت میں پورے کیے جاسکتے ہیں۔

یہ معنی بہت سے حضرات سے منقول ہے جیسے ابن عباس، قتادہ، حسن بصری اور سلمان رضی اللہ عنہم۔ جیسا کہ امام سیوطیؒ نے ذکر کیا ہے۔

حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو رات کو کسی عمل سے رہ جائے تو دن کے ابتدائی حصہ میں اسے پورا کرلے اور اگر دن کا کوئی عمل رہ جائے تو رات کے ابتدائی حصہ میں اسے پورا کرلے۔

زوال سے پہلے کی تخصیص میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ فوت شدہ اعمال کی قضاء موت سے پہلے جلدی کرنے کی کوشش کرے کیونکہ تاخیر میں بہت سی آفات ہیں خاص طور سے طاعات اور عبادات کے حق میں۔

اس تخصیص کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کسی شے کے قریب والی چیز کو اس شے کا حکم دیا جاتا ہے۔

اس لئے بھی کہ وقتِ قضا کو قضاء میں صرف کرنا چاہیئے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ان تمام باتوں کو اس کی حکمت قرار دیا جائے کیونکہ جس ذات نے یہ بات فرمائی ہے اسے کلمات کی جامعیت عطا کی گئی تھی۔

نماز ہر حالت میں پڑھی جائے

۱۲۴۸: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلِّ قَائِمًا فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَعَلٰى جَنْبٍ۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/ ۵۸۷۰۔حديث رقم ۱۱۱۷۔والترمذي في السنن ۲/ ۲۰۸ حديث رقم ۳۷۲۔وابن ماجه ۱/ ۳۷٦ حديث رقم ۱۲۲۳ وأحمد في المسند ٤/ ٤۲٦۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نماز کھڑے ہو کر پڑھو، اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی طاقت نہ رکھتے ہو تو بیٹھ کر پڑھو اور اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی طاقت نہ رکھتے ہو تو کروٹ کے بل لیٹ کر نماز پڑھو۔ (بخاریؒ)

تشریح: "وعن عمران بن حصين" لفظ حصین تصغیر کے ساتھ ہے۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آیا ہے کہ اگر کوئی شخص کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکے تو بیٹھ کر نماز پڑھ لے اور اگر بیٹھ کر بھی نماز نہ پڑھ سکے تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھو۔ کیونکہ اصول یہ ہے:

"ما لا يدرك كله لا يترك كله"۔ "جو چیز پوری حاصل نہیں کی جاسکتی پوری چھوڑی بھی نہیں جاسکتی"۔

البتہ اگر اس میں حرکت کرنے کی سکت بھی نہ ہو اور اسکو حرکت دینے والا کوئی مددگار بھی نہ ہو تو اب نماز نہ پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ اصول یہ ہے کہ:

"الضرورات تبيح المحظورات"۔ "مجبوریاں، ممنوع چیزوں کو مباح کردیتی ہیں"۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ امام مسلم کے علاوہ باقی حضرات نے اس حدیث کو مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ "اگر بیٹھنے کی طاقت نہ ہو تو چت لیٹ کر نماز پڑھ لے اور اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتے"۔

احناف کے نزدیک استلقاء (چت لیٹنا) اضطباع (پہلو کے بل لیٹنا) سے زیادہ افضل ہے۔ استلقاء کا معنی ہے کہ کندھوں کے نیچے تکیہ رکھے بغیر ٹانگیں سیدھی رکھے تاکہ ارشادہ کرنا اس کیلئے ممکن ہو وگرنہ حقیقی استلقاء کی صورت میں تو صحیح بھی اشارہ نہیں کر سکتا مریض کیسے کرے گا۔

استلقاء کے افضل ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس صورت میں نمازی کا اشارہ جہتِ قبلہ کی طرف ہوتا ہے اور اسے یہ فرض بھی ادا ہو جائے گا جبکہ دوسری صورت میں ایسا نہیں۔

ہماری تائید دار قطنی کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ مریض کھڑے ہو کر نماز پڑھے گا اگر اس کی طاقت نہ ہو تو پاؤں قبلہ کی طرف چت لیٹے نماز پڑھے گا۔

جب فرض میں قدرت اور طاقت شرط ہے اور ضرر و نقصان سے ساقط ہو رہی ہے تو نفل میں بطریق اولیٰ ایسا ہو گا۔

بغیر عذر کے نفل نماز بیٹھ کر پڑھنا

۱۲۴۹: وَعَنْهُ اَنَّهٗ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَلَاةِ الرَّجُلِ قَاعِدًا قَالَ اِنْ صَلّٰى قَائِمًا فَهُوَ اَفْضَلُ وَمَنْ صَلّٰى قَاعِدًا فَلَهٗ نِصْفُ اَجْرِ الْقَائِمِ وَمَنْ صَلّٰى نَائِمًا فَلَهٗ نِصْفُ اَجْرِ الْقَاعِدِ ۔

(رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٥٨٦ ـ حديث رقم ١١١٦ ـ والترمذي في السنن ٢/٢٠٧ حديث رقم ٣٧١ ـ

ترجمہ: حضرت عمران بن حصینؓ سے ہی روایت ہے کہ انہوں نے آقائے نامدار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کی نماز کے متعلق پوچھا جو کہ نفل نماز (بلا عذر) بیٹھ کر پڑھتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر وہ کھڑے ہو کر پڑھ لے تو یہ زیادہ افضل ہے اور جو شخص (بلا عذر) بیٹھ کر نفل نماز پڑھے گا تو اس کے لئے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کے نصف اجر کے برابر اجر و ثواب ہو گا اور جو شخص لیٹ کر نفل نماز پڑھے، اس کیلئے بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کے اجر کے نصف کے برابر اجر ہو گا۔ (بخاریؒ)

تشریح: "انه سأل ﷺ عن صلاة الرجل قاعدا" اس سوال کا منشا یہ ہے کہ اس شخص کا کیا حکم ہے؟ جو قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھے۔

"قال ان صلی قائما فھو افضل" ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص بلا عذر فرض نماز بیٹھ کر پڑھے تو اس کی نماز بالاتفاق باطل ہے اور جو شخص قیام کی فرضیت کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ کیونکہ اس کا ضروریاتِ دین میں سے ہونا طے شدہ بات ہے۔

"من صلی قاعدًا فله نصف اجر القائم" ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ نے اس جملہ کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر عذر کے نفل نماز بیٹھ کر پڑھے تو اسے آدھا ثواب ملے گا لیکن اگر کوئی عذر کی وجہ سے نفل نماز بیٹھ کر پڑھتا ہے تو اسے پورا ثواب ملے

گا۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ کی اس تشریح میں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ اگر اس کی نیت پہلے سے کھڑے ہو کر پڑھنے کی تھی لیکن بعد میں کوئی عذر لاحق ہو گیا تو اسے پورا ثواب ملے گا۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے۔

"من صلی نائما فلہ نصف اجر القاعد" نائم سے مراد سویا ہوا شخص نہیں بلکہ وہ ہے جو پہلو کے بل یا چت لیٹا ہو۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کیلئے ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام کے علاوہ کسی اور حالت میں نفل پڑھنا قیام کی طرح ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سستی اور بیزاری سے مامون و محفوظ تھے۔

میری رائے یہ ہے کہ اس امر کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت قرار دینے میں کسی اور دلیل کی ضرورت ہے وگرنہ بشریت کی بنا پر آپ دوسرے مسلمانوں کی طرح ہیں۔ البتہ آپ ایسی سستی سے بہر حال محفوظ و مامون تھے جو فرض سے غافل کر دے۔ باقی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلق سستی سے محفوظ ہونا محل بحث ہے۔ باوجود اس کے کہ عدم کسل، عدم ضعف کو مستلزم نہیں اور عذر ان دونوں سے زیادہ عام ہے۔ پھر یہ واقعہ بھی کتابوں میں موجود ہے کہ جب نماز کی کثرت کی وجہ سے آپ کے پاؤں مبارک ورم آلود ہو گئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

"طٰہٰ ما انزلنا علیک القرآن لتشقٰی" (طٰہٰ۔۱،۲) "طٰہٰ، ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ تھک جائیں"۔

ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے اکثر نماز بیٹھ کر ہوتی تھیں" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت بھی ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نیند کی وجہ سے رات کو نماز نہ پڑھ سکتے تو دن کو بارہ رکعات پڑھا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "قل انما انا بشر مثلکم" (الکھف۔۱۱۰) "آپ کہہ دیجئے میں تمہارے جیسا ہی ایک انسان ہوں"

ان دلائل کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تخصیص کیلئے کسی قطعی دلیل کی ضرورت ہے وگرنہ اصل یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے احکام میں اپنی امت کی طرح ہیں۔

البتہ فصل ثالث میں آنے والی حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ثواب کم نہیں ہوتا ہے۔ اس حدیث میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ عام ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹھ کر نماز پڑھنا عذر کی بنا پر تھا یا بغیر عذر کے تھا۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ حدیث اس صورت پر محمول ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بغیر عذر کے بیٹھ کر نماز نہ پڑھتے تھے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بلا عذر لیٹ کر نفلی نماز پڑھنے کے جواز کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک جائز اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے۔ حسن بصری اس کے جواز کے قائل ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ لیٹ کر نماز پڑھنے والے کا اجر بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کے اجر سے نصف ہوگا۔ یہ قول زیادہ صحیح اور بہتر ہے۔ مذکورہ احادیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ لیٹ کر نوافل پڑھنا درست نہیں، پھر اس حدیث کی ان کے نزدیک یہ تاویل ہے کہ یہ فرض پڑھنے والے ایسے مریض کے بارے میں جس کیلئے قیام یا قعود ممکن تو ہو لیکن اس کی وجہ سے مرض میں شدت اور زیادتی کا یقین ہو۔

اس حدیث سے ان حضرات کے قول کی بھی نفی ہوگئی جو قعود پر قدرت کی صورت میں اضطجاع کو حرام کہتے ہیں۔

الفصل الثّانی:

باوضو ہو کر لیٹنے اور سونے کی فضیلت

۱۲۵۰: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ اَوٰی اِلٰی فِرَاشِهٖ طَاهِرًا وَّذَکَرَاللّٰهَ حَتّٰی یُدْرِکَهُ النُّعَاسُ لَمْ یَتَقَلَّبْ سَاعَةً مِّنَ اللَّیْلِ یَسْأَلُ اللّٰهَ فِیْهَا خَیْرًا مِّنْ خَیْرِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ اِلَّآ اَعْطَاهُ اِیَّاهُ ذَکَرَالنَّوَوِیُّ فِیْ کِتَابِ الْاَذْکَارِ بِرِوَایَةِ ابْنِ السُّنِّیِّ۔

أخرجه ابن السني في اليوم والليلة ص ٢٣٤ حديث رقم (٧٢٢)۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے آقا مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص بحالت پاکی اپنے بستر پر لیٹنے کیلئے آئے اور نیند آنے تک "اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہے، تو وہ رات کی کسی گھڑی میں کروٹ نہیں بدلے گا مگر یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی خیر مانگ رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو یہ ضرور عطا فرما دیتے ہیں۔ اس کو امام نوویؒ نے کتاب الاذکار میں ابن السنی کی روایت سے نقل کیا ہے۔

تشریح: "سمعت النبی ﷺ" ایک نسخہ میں رسول اللہ ﷺ بھی ہے۔

"طاهرًا" اس لفظ کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

① ناپاکی اور احداث سے پاک ہو۔ ② گناہوں کی آلودگی سے پاک ہو۔

"یسأل اللّٰه" یہ یتقلب کے فاعل سے حال ہے۔

"خیرًا" خیر یہاں شر کے مقابلہ میں ہے۔

"من خیر الدنیا والاخرة" ضمیر ثانی جنس کے درجہ میں ہے اور خیر اول کی تنوین تنکیر کیلئے ہے۔

"الا أعطاه ایاه" علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی من یسأل سے حال ہے۔

النووی فی کتاب الأذکار بروایة ابن السنی" علامہ منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے عن شهر بن حوشب عن ابی امامة کی سند سے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے

۱۲۵۱: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَجِبَ رَبُّنَا مِنْ رَجُلَیْنِ

رَجُلٌ ثَارَعَنْ وِطَائِهٖ وَلِحَافِهٖ مِنْ بَيْنِ حِبِّهٖ وَاَهْلِهٖ اِلٰى صَلَاتِهٖ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ لِمَلَائِكَتِهٖ اُنْظُرُوْا اِلٰى عَبْدِىْ ثَارَعَنْ فِرَاشِهٖ وَوِطَائِهٖ مِنْ بَيْنِ حِبِّهٖ وَاَهْلِهٖ اِلٰى صَلَاتِهٖ رَغْبَةً فِيْمَا عِنْدِىْ وَشَفَقًا مِمَّا عِنْدِىْ وَرَجُلٌ غَزَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَانْهَزَمَ مَعَ اَصْحَابِهٖ فَعَلِمَ مَاعَلَيْهِ فِى الْاِنْهِزَامِ وَمَالَهٗ فِى الرُّجُوْعِ فَرَجَعَ حَتّٰى هُرِيْقَ دَمُهٗ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ لِمَلَائِكَتِهٖ اُنْظُرُوْا اِلٰى عَبْدِىْ رَجَعَ رَغْبَةً فِيْمَا عِنْدِىْ وَشَفَقًا مِّمَّا عِنْدِىْ حَتّٰى هُرِيْقَ دَمُهٗ۔ (رواه فى شرح السنة)

أخرجه أحمد فى المسند ٤١٦۔ والبغوى فى شرح السنة ٤/٤٢ حديث رقم: ٩٣٠۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہمارا ربّ کریم دو آدمیوں سے بہت ہی خوش ہوتا ہے، ایک تو اُس آدمی سے جو رات اپنے نرم بستر اور لحاف اور اپنی محبوب بیوی کے پاس سے اُٹھ کر تہجد کی نماز پڑھنے کیلئے آتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے ارشاد فرماتے ہیں کہ دیکھو میرے بندے کی طرف اپنے نرم بستر اور لحاف اور اپنی محبوب بیوی کے پاس سے اپنی نماز پڑھنے کیلئے اُٹھ گیا ہے اس چیز کے شوق میں جو میرے پاس ہے (یعنی جنت اور اس کی نعمتیں) اور اس چیز کے ڈر سے جو میرے پاس ہے (یعنی دوزخ اور اس کی مصیبتیں)۔ اور دوسرے اس شخص سے جس نے اپنے رب کی راہ میں جہاد کیا اور اپنے ساتھیوں سمیت میدانِ جنگ سے بھاگ گیا، مگر جب اس کو میدان کارزار سے بھاگنے کی سزا اور پھر میدان جنگ واپس آنے کا ثواب یاد آیا تو وہ واپس میدان جنگ میں لوٹ کر آ گیا (اور لڑتا رہا) یہاں تک کہ اس کا خون بہا دیا گیا (یعنی شہید ہو گیا) تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرے بندے کی طرف دیکھو کہ وہ میدانِ جنگ میں واپس آ گیا ان چیزوں کے شوق میں جو میرے پاس ہیں (یعنی جنت اور اس کی نعمتیں) اور ان چیزوں کے ڈر سے جو میرے پاس ہیں (یعنی دوزخ اور اس کی تکالیف) یہاں تک کہ لڑتا رہا، حتیٰ کہ اس کا خون بہا دیا گیا۔ (شرح السنہ)

تشریح: ''قال رسول اللّٰہ ﷺ عجب ربنا من رجلین'' یعنی اللہ تعالیٰ ان دو آدمیوں کے فعل سے راضی اور خوش ہوتے ہیں۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تعجب کا ذکر بطور مجاز کیلئے کیونکہ تعجب اس چیز پر ہوتا ہے جس کا سبب پوشیدہ ہو اور اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

''رجل'' اس کی ترکیب میں دو احتمال ہیں:

① جر، اس صورت میں یہ من رجلین سے بدل ہوگا۔ ② رفع، اس صورت میں احدھما، منھما یا ھما مقدر ہوگا۔

''ثار'' وہ شخص جو ہمت، نشاط اور رغبت کے ساتھ اٹھے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ کچھ لوگ بستر پر اللہ کا ذکر کرتے ہیں جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انہیں بلند درجات تک پہنچا دیتے ہیں۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو صحیح میں ذکر کیا ہے۔

حاصل اس حدیث کا یہ ہے کہ یہ شخص مخلوق سے منہ موڑ کر اللہ کی عبادت کی طرف متوجہ ہو گیا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ساری

مخلوق قبر و حشر میں اس کے کسی کام نہیں آسکتی جبکہ نیک عمل تو ہمیشہ اس کے کام آئیں گے۔

جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ انہوں نے فرمایا:

''تمام لکھی ہوئی عبارتیں ضائع ہوگئیں علم وفن کی تمام مجلسیں ہمارے کسی کام نہ آئیں ہمیں تو صرف ان چند رکعات نے نفع دیا جو ہم رات کے آخری حصہ میں پڑھا کرتے تھے''۔

''فیقول اللّٰہ لملائکۃ'' اللہ تعالیٰ فخر کے طور پر فرشتوں سے کہتے ہیں کہ اس بندے کو دیکھو جس کی صفات ملکیت اس کے احوال بشریت پر غالب ہیں باوجود اس کے کہ شیطان، وساوس، نفس اور طلب شہوت جیسے مسائل سے وہ دوچار ہے۔

دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ اسے نظر رحمت سے دیکھو جس کا نتیجہ استغفار وشفاعت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

''و شفقا مما عندی'' اس بندے کا عمل میرے عذاب، جہنم، ناراضگی اور اس حجاب کے خوف سے ہے جو میرے اور نافرمانوں کے درمیان ڈال دیا جائے گا۔

پہلا شخص جس کا تذکرہ ہوا یہ ایسا مجاہد ہے جو جہاد اکبر کرنے والا ہے یہ لوگوں کے آرام کے وقت میں وجوب کے بغیر اللہ کی عبادت کیلئے کمربستہ ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ شخص اہل سعادت میں سے ہے۔

''فرجع حتی هریق دمه'' یعنی اس کو بھی شہید کر دیا جائے۔

ایک حدیث میں آیا ہے:

''غفلت والوں میں اللہ کا ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے (میدان جنگ سے) بھاگنے والوں میں (دشمن کے سامنے) صبر کرنے والا''۔

''رواہ فی شرح السنة'' صاحب مصابیح نے اس روایت کو شرح السنۃ میں ذکر کیا ہے۔

شیخ جزری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام احمد نے اس حدیث کو اسناد صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس سند میں عطاء بن سائب بھی ہیں۔ محدثین اربعہ اور امام بخاری نے ان سے روایت لی ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے بھی نقل کیا ہے۔

علامہ منذری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام احمد، ابویعلی، طبرانی اور ابن حبان نے اسے نقل کیا ہے، طبرانی نے سند حسن کے ساتھ اسے موقوف بھی نقل کیا ہے لیکن اس کے الفاظ میں کچھ فرق ہے۔

ان تمام احادیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ثواب کی امید سے عمل کرنا اخلاص ہے کمال کے منافی نہیں، البتہ اکمل کے منافی ہے، اکمل صورت یہ ہے کہ عمل محض اللہ کیلئے ہو کسی بھی غرض یا عوض کیلئے نہ ہو۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد امام فخر الرازی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا معنی بھی سمجھ میں آ گیا کہ اگر کوئی شخص ثواب کے حصول یا سزا کے خوف سے عبادت کرے تو اس کی عبادت درست نہیں۔ معلوم ہوا کہ اس سے مراد وہ عبادت کرنے والا ہے جو محض ثواب یا عتاب کو دیکھ کر چلے اسے رضائے الٰہی سے کوئی غرض نہ ہو، یقیناً اس کی عبادت درست نہیں بلکہ بعض علماء نے تو اسے کافر قرار دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی اپنی ذات کے اعتبار سے عبادت کا استحقاق رکھتا ہے۔ واللہ اعلم۔

الفصل الثالث:

بعض عبادات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز

۱۲۵۲: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ حُدِّثْتُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ صَلَاةُ الرَّجُلِ قَاعِدًا نِصْفُ الصَّلَاةِ قَالَ فَاَتَيْتُهُ فَوَجَدْتُّهُ يُصَلِّيْ جَالِسًا فَوَضَعْتُ يَدِيْ عَلٰى رَأْسِهٖ فَقَالَ مَالَكَ يَاعَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَمْرٍو قُلْتُ حُدِّثْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِنَّكَ قُلْتَ صَلَاةَ الرَّجُلِ قَاعِدًا عَلٰى نِصْفِ الصَّلَاةِ وَاَنْتَ تُصَلِّيْ قَاعِدًا قَالَ اَجَلْ وَلٰكِنِّيْ لَسْتُ كَاَحَدٍ مِّنْكُمْ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه البخاري في صحيحه ۵۸۷/۲۔ حديث رقم ۱۱۱۷۔ ومسلم في صحيحه ۵۰۷/۱ حديث رقم (۱۲۰۔ ۷۳۵)۔ والنسائي ۲۲۳/۳ حديث رقم ۱۶۵۹۔ وأحمد في المسند ۴۴۳/۴۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ مجھ سے یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ انسان کی نماز نفل جو بغیر عذر کے بیٹھ کر پڑھی گئی ہو کھڑے ہو کر پڑھی ہوئی نماز کے نصف کے برابر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بیٹھ کر نفل نماز پڑھ رہے تھے، تو میں نے اپنا ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر رکھ دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (نماز سے فراغت کے بعد) فرمایا کیا ہوا تجھے اے ابن عمرو! تو میں نے جواباً عرض کیا کہ مجھے یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی نماز آدھی ہوتی ہے اور حال یہ ہے کہ آپ خود بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں ایسا ہی ہے لیکن میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ (مسلم)

تشریح: ''فوضعت یدی علی رأسه'' حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز سے فارغ ہونے کے بعد اپنا ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر رکھا تا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آنے کے بجائے یہ انداز زیادہ بہتر تھا اور عربوں کے نزدیک اسے بے ادبی پر بھی محمول نہیں کیا جا سکتا اس کی وجہ ان کا عدم تکلف اور کمال تالف ہے۔ اسی طرح ان کا أنتم کے بجائے أنت کہنا بھی خطاب کے مقتضی میں خلاف ادب نہیں اور اس کا قائل عتاب کا مستحق نہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے اس مقام پر تکلف سے کام لیتے ہوئے صحابہ کرام کی طرف قلت ادب کی نسبت کی ہے اور بات کو بلاوجہ سوال وجواب کے ذریعہ طول دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اگر آپ یہ سوال کریں کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کو تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر کوئی اور انداز اختیار کرنا چاہیے تھا تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ عمل ان سے ارادتاً اور قصداً سرزد نہیں ہوا بلکہ جب انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ بات کے خلاف کا صدور دیکھا اور اسے ناممکن خیال کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر ہاتھ رکھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس عمل کو ناپسندیدہ خیال فرمایا اور ان کا نام لیا اور ان کی نسبت ان کے والد کی طرف بھی ذکر کی۔ اسی طرح حضرت عبداللہؓ کا ''انت تصلی قاعدًا'' کہنا بھی جہت اشکال کیلئے حال مقررہ ہے۔ پھر میں نے ابن حجر رحمہ اللہ کو دیکھا کہ انہوں نے لکھا ہے کہ کسی

مستغرب اور بعید چیز کو وقوع پذیر ہوتا دیکھ کر اس طرح کرتے ہیں۔ البتہ یہ عمل ان کے نزدیک خلاف ادب ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ بعض عرب مفاوضہ کے موقع پر داڑھی کو ہاتھ لگاتے ہیں''۔

ہمارے زمانے میں اس کی نظیر یہ ہے کہ ایک عربی شخص نے رئیس مکہ کی داڑھی چھوا کہ ''اے حسن! میں آپ پر فدا ہو جاؤں'' حالانکہ اس کی جوتی اس کی انگلی میں لٹک رہی تھی۔

''**فقال مالك**'' اس جملہ کے معانی میں تین احتمال ہیں:

① **ما شانك**، تجھے کیا مسئلہ۔

② **ای غرض لك**۔ تیری کیا غرض ہے؟

③ ''**ای شیء أقلقك و اذعجك**'' کس چیز نے تجھے بے چین ور پریشان کر دیا؟

''**یا عبدالله بن عمرو**'' عربوں کے ہاں نام لینا معرفت اور خصوصیات پر دلالت کرتا ہے۔ اسی بنا پر ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا معنی یہ ہے کہ تم علم و تقدم کے معروف مقام پر ہو۔ اسی وجہ سے علماء فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ فقیہ اور حافظ حدیث تھے۔

''**وأنت تصلي قاعدًا**'' حالانکہ یہ بات تو ثابت شدہ ہے کہ آپ کے اعمال اکملیت اور افضلیت کے بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ کیا ان کا یہ حدیث بیان کرنا صحیح ہے۔

''**قال أجل**'' اس جملہ کے معانی میں دو احتمال ہیں:

① ہاں ان کا حدیث بیان کرنا صحیح ہے۔ ② ہاں تمہاری بات ٹھیک ہے۔

''**ولكن لست كأحدمنكم**'' یعنی یہ میری خصوصیات میں سے ہے کہ میری نماز کا ثواب کم نہیں ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنا فضل عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''**وكان فضل الله عليك عظيمًا**'' (النساء۔۱۱۳) ''اور تم پر اللہ کا عظیم فضل ہے''۔

نماز راحت و آرام کا سبب ہے

۱۲۵۳: وَعَنْ سَالِمِ بْنِ اَبِی الْجَعْدِ قَالَ قَالَ رَجُلٌ مِّنْ خُزَاعَةَ لَيْتَنِی صَلَّيْتُ فَاسْتَرَحْتُ فَكَاَنَّهُمْ عَابُوْا ذٰلِكَ عَلَيْهِ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اَقِمِ الصَّلَاةَ يَا بِلَالُ اَرِحْنَابِهَا۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ٥/٢٦٢ حديث رقم ٤٩٨٥۔

ترجمہ: حضرت سالم بن ابی الجعدؒ فرماتے ہیں کہ قبیلہ بنو خزاعہ کے آدمی نے ایک دن کہا کاش! میں نماز پڑھتا اور راحت پاتا، جب لوگوں نے اسکے اس قول کو برا سمجھا تو وہ کہنے لگا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے اے بلال! نماز کیلئے اقامت یعنی تکبیر کہو تا کہ ہم نماز کے ذریعے راحت حاصل کریں۔ (ابوداوٗد)

راویٔ حدیث:

سالم بن ابی الجعد۔ یہ سالم بن ابی الجعد کوفی ہیں۔ ''ابوالجعد'' کا نام رافع ہے۔ مشہور معتبر راویوں میں سے ہیں۔ ابن عمر اور جابر وانس رضی اللہ عنہم سے حدیث کو سنا اوران سے منصور واعمش روایت کرتے ہیں۔ ۹۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

تشریح: ''رجل من خزاعه'' خزاعہ ایک بڑے اور مشہور قبیلے کا نام ہے۔

''لیتنی صلیت فاسترحت'' یعنی کاش! میں نماز پڑھتا اور اپنے رب کی عبادت، اس کے ساتھ مناجات اور تلاوت قرآن سے لذت وراحت حاصل کرتا۔

''عابوا ذلك'' بعض لوگوں نے حصول راحت کی اس خواہش کو ناپسند خیال کیا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے نماز میں استراحت کی خواہش کو ناپسند سمجھا کیونکہ ان کے خیال میں نماز ایک بامشقت عمل ہے۔ شاید وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کو بھول گئے تھے:

''وانها لكبيرة الا على الخاشعين'' (البقرۃ۔۴۵) ''نماز بھاری ہے لیکن خشوع رکھنے والوں پر نہیں''۔

''یا بلال أرحنا بها'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا معنی یہ ہے کہ اے بلال! دل کو نماز کی مشغولی میں مصروف کر کے راحت پہنچاؤ۔

علماء فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز میں مشغول ہونا ہی آپ کیلئے ذریعہ راحت تھا کیونکہ دنیاوی اعمال آپ کیلئے بوجھ تھے۔ آپ نماز سے استراحت حاصل کرتے تھے کیونکہ اس میں مناجات ہیں اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''۔ یہی قول زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے اور ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی معنی کی تائید کی ہے۔

بَابُ الْوِتْرِ

نماز وتر کا بیان

وتر کا لغوی معنی ہے طاق، اور فقہاء کی اصطلاح میں صلوٰۃ وتر اس نماز کو کہتے ہیں، جس کا وقت عشاء کے بعد ہوتا ہے اور عام طور پر فوراً عشاء کی نماز کے بعد ادا کیا جاتا ہے، اس باب میں اسی نماز کے بارے میں بیان ہوگا۔

صلوٰۃ وتر کا حکم:

صلوٰۃ وتر واجب ہے یا سنت؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صلوٰۃ وتر واجب ہے۔

امام شافعیؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وتر سنت ہے۔

رکعاتِ وتر:

تعداد وتر میں بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔

احناف کے نزدیک وتر کی تین رکعات ہیں، اور جمہور ائمہ کے نزدیک وتر کی ایک ہی رکعت ہے لیکن ان حضرات کے نزدیک بھی وتر کے لیے صرف ایک رکعت پڑھنا مکروہ ہے بلکہ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے اور پھر ایک رکعت وتر پڑھے۔اس سے معلوم ہوا کہ جمہور ائمہ کے نزدیک بھی وتر کی تین رکعتیں ہیں صرف فرق یہ ہے کہ احناف کے نزدیک ایک سلام کے ساتھ ہے اور جمہور کے نزدیک دو سلاموں کے ساتھ ہیں۔

طریقۂ وتر:

احناف کے نزدیک مغرب کی نماز کی طرح وتر کی تین رکعات پڑھی جائیں گی۔فرق صرف یہ ہوگا کہ فرض کی صرف دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورت ملائی جاتی ہے جبکہ وتر کی تینوں رکعات میں سورۂ فاتحہ کے بعد دوسری سورت ملائی جاتی ہے اور تیسری رکعت میں سورت ملانے کے بعد ہاتھ کانوں تک اٹھا کر پھر باندھے اور آہستہ آواز کے ساتھ دعائے قنوت پڑھے، اور دعائے قنوت یہ ہے:

اللهم انا نستعينك ونستغفرك ونؤمن بك ونتوكل عليك ونثني عليك الخير ونشكرك ولا نكفرك ونخلعُ ونترك من يفجرك. اللهم اياك نعبد ولك نصلي ونسجد واليك نسعٰى ونحفد ونرجو رحمتك ونخشي عذابك ان عذابك بالكفار ملحق.

اے اللہ! ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں اور تجھ سے ہی اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، اور تجھ ہی پر ایمان لاتے ہیں اور تجھ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں اور تیری ہی تعریف کرتے ہیں، اور تیرا شکر ادا کرتے ہیں، اور تیری ناشکری نہیں کرتے۔اور ہم الگ ہوتے ہیں اور چھوڑتے ہیں اس شخص کو جو تیری نافرمانی کرے۔اے اللہ! بے شک ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے لیے ہی نماز پڑھتے ہیں اور تیرے لیے ہی سجدہ کرتے ہیں، اور تیری طرف ہی دوڑتے ہیں، اور عبادت میں مستعدی اور جلدی کرتے ہیں، اور ہم تیری رحمت کے ہی امیدوار ہیں، اور تیرے عذاب سے ہی ڈرتے ہیں، بے شک تیرا عذاب کافروں کو ملنے والا ہے۔

اگر اس کے بعد یہ دعا پڑھ لے تو نور علی نور ہے:

اللهم اهدني فيمن هديت وعافني فيمن عافيت وتولني فيمن توليت وبارك لي فيما اعطيت وقني شر ما قضيت فانك تقضي ولا يقضى عليك فانه لا يذل من واليت ولا يعز من عاديت تباركت ربنا وتعاليت۔

اے اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت عطا فرما ان لوگوں کے ساتھ جن لوگوں کو تو نے ہدایت دی اور مجھے مصائب سے ان لوگوں کے ساتھ بچا جن کو تو نے بچایا اور مجھ سے محبت کر ان لوگوں میں جن سے تو نے محبت کی، اور تو برکت ڈال اس میں جو تو نے مجھے عطا کیا، اور مجھے ان برائیوں سے بچا جو مقدر ہیں اور بے شک تو فیصلہ وحکم کرنے والا ہے تیرے خلاف فیصلہ اور تجھ پر حکم نہیں کیا جا سکتا، بے شک نہیں ذلیل ہوتا وہ شخص جس سے تو محبت کرے اور نہیں عزت پا سکتا وہ شخص جس سے تو دشمنی کرے،

برکت والی ہے تیری ذات، اے ہمارے رب! تو بزرگ و برتر ہے۔

فائدہ: اگر کسی کو دعائے قنوت یاد نہ ہو تو وہ یہ دعا پڑھ لے۔ ربنا اتنا فی الدنیا حسنةً وفی الآخرة حسنةً وقنا عذاب النار "اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں اچھائی عطا فرما، اور آخرت میں بھی اچھائی عطا فرما، اور ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ فرما۔

اگر کوئی شخص یہ بھی نہ جانتا ہو تو وہ تین بار اللھم اغفر لی یا یا رب پڑھ لے۔

الفصل الاول:

ایک رکعت وتر

۱۲۵۴: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَلٰوۃُ اللَّیْلِ مَثْنٰی مَثْنٰی فَاِذَا خَشِیَ اَحَدُکُمُ الصُّبْحَ صَلّٰی رَکْعَةً وَّاحِدَةً تُوْتِرُ لَهٗ مَا قَدْ صَلّٰی (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۴۷۷/۲۔ حدیث رقم ۹۹۰۔ ومسلم فی صحیحه ۵۱۶/۱ حدیث رقم (۱۴۵۔ ۷۴۹)۔ وأبو داؤد فی السنن ۸۰/۲ حدیث رقم ۱۳۳۶ والترمذی ۳۰۰/۲ حدیث رقم ۴۳۷۔ والنسائی ۲۳۳/۳ حدیث رقم ۱۶۹۴۔ والدارمی ۴۰۴/۱ حدیث رقم ۱۴۵۸۔ ومالك فی الموطأ ۱۲۳/۱ حدیث رقم ۱۳ من کتاب صلاۃ اللیل۔ وأحمد فی المسند ۵۸/۲۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رات کی نماز دو رکعت ہے، جب خوف ہو تم میں سے کسی کو صبح ہونے کا تو ایک رکعت پڑھ لے یہ پہلی پڑھی ہوئی رکعتوں کو طاق کر دے گی۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: "قال رسول اللہ ﷺ صلاۃ اللیل "ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک روایت صحیحہ میں "صلاۃ اللیل والنھار" کے الفاظ ہیں۔

"مثنٰی" یہ بغیر تنوین کے ہے غیر منصرف ہونے کی وجہ سے۔ کیونکہ اس میں دو سبب عدل اور وصف پائے جا رہے جیسا کہ علامہ سیبویہ کا مذہب ہے، اس کا معنی ہے دو دو۔

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعیؒ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رات کے نوافل میں دو رکعات کے بعد سلام پھیرنا افضل ہے۔

"مثنٰی" یہ پہلے مثنٰی کی تاکید کے لئے ہے۔

"صلی رکعة واحدة توتر" ایک رکعت کی طرف اسناد مجازی ہے کیونکہ ایک رکعت نماز پڑھنے سے نہی وارد ہوئی ہے یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے۔ لیکن مرسل جمہور کے نزدیک حجت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"ما اجزأت رکعة قط" ایک رکعت کبھی جائز نہیں ہو سکتی۔

یہ حدیث اگرچہ موقوف ہے لیکن مرفوع کے حکم میں ہے۔ نیز امام شافعی رحمہ اللہ کے پاس ایسی کوئی صحیح یا ضعیف حدیث نہیں جو رکعت مفردہ کے ثبوت پر دلالت کر رہی ہو۔ پس احادیث میں تطبیق کے لیے مجمل احادیث کی تاویل کرنی پڑے گی۔

ان حضرات کا یہ کہنا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک رکعت وتر پر اکتفاء فرمایا ہے۔اس قول کو ابن صلاح نے رد کیا ہے۔ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا ابن صلاح کے اس قول کو ان کی غفلت قرار دینا ان کا دعویٰ محض ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں اسی وجہ سے اصحابہ شافعی کی ایک جماعت ایک رکعت وتر پڑھنے کی کراہت کی قائل ہے۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس ایک رکعت کو اس سے پہلے کی دو رکعتوں کے ساتھ ملا لے۔

ابن ہمام جواب تسلیمی کے طور پر کہتے ہیں کہ یہ واقعہ وتروں کی تین رکعات طے ہونے سے پہلے کا ہے۔البتہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ کہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وتروں کیلئے الگ تکبیر تحریمہ کہی جائے۔لہٰذا اس کا جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ایک رکعت اس طرح پڑھے کہ اس سے پہلے دو رکعتیں پڑھے تاکہ یہ رکعت پہلے شفع یعنی اس ایک رکعت سے پہلے پڑھی گئی دونوں رکعتوں کو طاق کردے۔گویا ایک رکعت علیحدہ نہ پڑھی جائے بلکہ دو رکعتوں کے ساتھ ملا کر پڑھی جائے۔

ہمارا مذہب قیاس کے اعتبار سے بھی درست ہے کیونکہ وتر ہوں گے یا فرض ہوں گے یا سنت۔اگر فرض ہیں تو فرض دو، تین یا چار ہیں، وتر دو یا چار نہ ہونے پر علماء کا اجماع ہے معلوم ہوا کہ وتر تین ہی ہیں۔اگر سنت ہیں تو ہر سنت کی نظیر فرض میں موجود ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر بڑی انوکھی اور عجیب بات کہی وہ لکھتے ہیں:

''ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سنت صحیحہ اور حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کی مخالفت کی ہے جس میں آیا ہے کہ حضور ﷺ دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیتے تھے اور ایک رکعت وتر کی پڑھتے تھے۔ان روایات کے علاوہ کسی روایت کی رعایت اس وجہ سے نہیں کی جائے گی کہ آپ جان چکے ہیں کہ دلیل مع الاحتمال استدلال کی صلاحیت نہیں رکھتی۔باقی رہی وہ حدیث جس میں آیا ہے ''مغرب کی تین رکعت کی طرح وتر کی بھی تین رکعات ہیں'' یہ مرفوعاً ثابت نہیں بلکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے''۔

اگر ہم اس کو مرفوعاً صحیح قرار نہ دیں تو یہ موقوف بھی مرفوع ہی کے حکم میں ہے، ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ عسقلانی مزید لکھتے ہیں:

''وہ حدیث جس میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ وتر کی رکعات میں سلام نہیں پھیرتے تھے یہ تطبیق روایات کیلئے جواز پر محمول ہے''۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی اس تعجب خیز بات کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''**كان لا يسلم في ركعتي الوتر**''۔

اس میں لفظ ''کان'' آیا ہے۔جو لغۃً اور عرفاً استمرار پر دلالت کر رہا ہے۔نیز یہ ایک صریح منطوق ہے۔پس دوسری احادیث کی تاویل اسی کے مطابق کرنی چاہیے۔

اس سے بڑی عجیب بات یہ ہے کہ بعض علماء نے تو تین رکعات ملا کر پڑھنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔قاضی حسین نے ایک غیر معروف حدیث کو بنیاد بنا کر یہ فتویٰ دیا ہے اس میں آیا ہے ''تم تین رکعات وتر نہ پڑھو بلکہ پانچ یا سات رکعات پڑھو اور وتر دن

کو مغرب کی نماز کے مشابہ نہ کرو"۔

اگر اس روایت کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ ابتداء اسلام پر محمول ہوگی کیونکہ صحیح احادیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ وتر تین رکعات ملا کر پڑھتے تھے۔ اس روایت کا ایک معنی یہ بھی ہو سکتا ہے رات کی نماز میں تین رکعات پر اکتفاء کرنے سے نہی تنزیہی وارد ہوئی ہے اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اس میں پانچ یا سات رکعات پڑھنے کا ذکر ہے جبکہ تین رکعات کے جواز اور پانچ یا سات رکعات عدم وجوب پر فقہاء کا اجماع ہیں۔

نماز وتر رات کے آخری حصہ میں پڑھنا

۱۲۵۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْوِتْرُ رَكْعَةٌ مِّنْ اٰخِرِ اللَّيْلِ۔

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٥١٨ حديث رقم (١٥٣ـ ٧٥٢)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وتر کی ایک رکعت ہے رات کے آخری حصہ میں پڑھنا افضل ہے۔ (مسلمؒ)

تشریح: "الوتر رکعة" یعنی وتر ایک رکعت اس سے پہلے پڑھے ہوئے شفع (دو رکعت) کے ساتھ مل کر ہے۔ اس طرح تمام احادیث میں تطبیق ہو جائے گی۔

"من اخر اللیل" یعنی وتر کا آخر وقت آخر لیل تک ہے یا اس کا بہترین وقت رات کا آخری حصہ ہے۔

آنحضرت ﷺ کی صلوٰۃ اللیل کے مختلف طریقے

۱۲۵۶: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ ثَلَاثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً يُّوْتِرُ مِنْ ذٰلِكَ بِخَمْسٍ لَايَجْلِسُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا فِيْ اٰخِرِهَا۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣/٢٠۔ حديث رقم ١١٤۔ ومسلم في صحيحه ١/٥٠٨ حديث رقم (١٢٣ـ ٧٣٧)۔ وأبوداوٗد في السنن ٢/٨٥ حديث رقم ١٣٣٨۔ والترمذي ٢/٣٢١ حديث رقم ٤٥٩۔ والدارمي ١/٤٤٨ حديث رقم ١٥٨١۔ وأحمد في المسند ٦/١٦١۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سرور کونین ﷺ رات میں (تہجد کیلئے) تیرہ رکعات پڑھتے تھے جن میں سے پانچ رکعتیں بطور وتر کے پڑھتے تھے۔ اور ان میں تشہد کیلئے صرف آخری رکعت میں ہی بیٹھتے تھے۔ (بخاریؒ ومسلمؒ)

تشریح: "یصلی من اللیل ثلاث عشر رکعة" ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان میں سے آٹھ رکعات دو سلاموں کے ساتھ ہوتی تھیں۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں شرح الشمائل میں ہے کہ یہ تمام رکعات چار سلاموں کے ساتھ پڑھی ہیں۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان تیرہ رکعات میں دو رکعات تو حقیقی ہیں باقی گیارہ رکعات وتر ہیں جن میں سے چھ مفصول (الگ الگ) ہیں۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی یہ توجیہہ درست نہیں کیونکہ اس طرح مشار الیہ وہ ہوگا جو اصل میں مذکور نہیں۔

''بخمس ''یعنی پانچ رکعات وتر کی نیت سے پڑھتے تھے۔

''لا یجلس فی شیء الا فی اخرھا ''یعنی تشہد کے لیے صرف آخر ہی میں بیٹھتے تھے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے اور ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں پانچ رکعات کے وصل کا جواز معلوم ہو رہا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ وتر پہلے پانچ تھے اور اب اس پر اجماع ہے کہ ہر دو رکعات کے پورا کرنے پر اس تشہید پڑھنی ہوگی۔

اس جملہ کا ایک معنی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ''سلام کیلئے صرف آخر ہی میں بیٹھتے تھے''۔ واللہ اعلم۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق قرآن تھا

۱۲۵۷: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ هِشَامٍ قَالَ انْطَلَقْتُ اِلٰى عَائِشَةَ فَقُلْتُ يَا اُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْبِئِيْنِىْ عَنْ خُلُقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ اَلَسْتَ تَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ قُلْتُ بَلٰى قَالَتْ فَاِنَّ خُلُقَ نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ الْقُرْاٰنُ قُلْتُ يَااُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْبِئِيْنِىْ عَنْ وِتْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ كُنَّا نُعِدُّ لَهٗ سِوَاكَهٗ وَطَهُوْرَهٗ فَيَبْعَثُهُ اللّٰهُ مَاشَاءَ اَنْ يَّبْعَثَهٗ مِنَ اللَّيْلِ فَيَتَسَوَّكُ وَيَتَوَضَّأُ وَيُصَلِّىْ تِسْعَ رَكْعَاتٍ لَايَجْلِسُ فِيْهَا اِلَّا فِى الثَّامِنَةِ فَيَذْكُرُ اللّٰهَ وَيَحْمَدُهٗ وَيَدْعُوْهُ ثُمَّ يَنْهَضُ وَلَا يُسَلِّمُ فَيُصَلِّى التَّاسِعَةَ ثُمَّ يَقْعُدُ فَيَذْكُرُ اللّٰهَ وَيَحْمَدُهٗ وَيَدْعُوْهُ ثُمَّ يُسَلِّمُ تَسْلِيْمًا يُّسْمِعُنَا ثُمَّ يُصَلِّىْ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ مَايُسَلِّمُ وَهُوَ قَاعِدٌ فَتِلْكَ اِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً يَا بُنَيَّ فَلَمَّا اَسَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَخَذَ اللَّحْمُ اَوْتَرَ بِسَبْعٍ وَّصَنَعَ فِى الرَّكْعَتَيْنِ مِثْلَ صَنِيْعِهٖ فِى الْاُوْلٰى فَتِلْكَ تِسْعٌ يَابُنَيَّ وَكَانَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلّٰى صَلَاةً اَحَبَّ اَنْ يُّدَاوِمَ عَلَيْهَا وَكَانَ اِذَا غَلَبَهٗ نَوْمٌ اَوْوَجَعٌ عَنْ قِيَامِ اللَّيْلِ صَلّٰى مِنَ النَّهَارِ ثِنْتَىْ عَشَرَةَ رَكْعَةً وَّلَا اَعْلَمُ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَاَ الْقُرْاٰنَ كُلَّهٗ فِىْ لَيْلَةٍ وَّلَا صَلّٰى لَيْلَةً اِلَى الصُّبْحِ وَلَاصَامَ شَهْرًا كَامِلًا غَيْرَ رَمَضَانَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۵۱۲ حدیث رقم (۱۳۹ ـ ۷۴۶)۔

ترجمہ: حضرت سعد بن ہشامؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے عرض کیا کہ ام المؤمنین! مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کے بارے میں بتلائیں۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، کیا آپ نے قرآن

مجید نہیں پڑھا؟ تو میں نے عرض کیا کیوں نہیں (میں نے پڑھا ہے) تو فرمایا کہ حضور ﷺ کا خلق قرآن مجید تھا (یعنی آنحضرت ﷺ کی اخلاقی زندگی قرآن مجید کا عملی نمونہ تھی اور قرآن مجید پر عمل کرنا) آپ ﷺ کی عادت میں ہی سما چکا تھا پھر میں نے عرض کیا کہ مجھے حضور ﷺ کے وتر کے بارے میں خبر دیں (کہ وتر کی کتنی رکعات پڑھتے تھے اور کس طرح اور کس وقت پڑھتے تھے)۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں حضور ﷺ کیلئے پہلے ہی مسواک اور وضو کا پانی تیار کر دیتی تھی جب اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کو رات میں اٹھانا چاہتے تو اس وقت اٹھا دیتے چنانچہ بیداری کے بعد حضور ﷺ مسواک کرتے اور پھر وضو کرتے اور نو/۹ رکعات پڑھتے تھے اور آٹھویں رکعت کے سوا کسی رکعت کے بعد قعدہ نہیں کرتے تھے جب آٹھویں رکعت پڑھ لیتے تو اب تشہد کیلئے بیٹھتے اور خدا کا ذکر کرتے اور حمد باری تعالیٰ بجالاتے اور دعا مانگتے (یعنی التحیات پڑھتے) پھر سلام پھیرے بغیر نویں رکعت کیلئے کھڑے ہو جاتے پھر نویں رکعت پڑھ کر تشہد کیلئے بیٹھتے پھر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے اور اس کی حمد بیان کرتے اور اس سے دعا مانگتے پھر سلام پھیرتے ہمیں سناتے ہوئے (یعنی با آواز بلند سلام پھیرتے) پھر سلام پھیرنے کے بعد بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے تو یہ کل گیارہ رکعتیں ہو جاتی تھیں، اے میرے بیٹے! پھر جب حضور ﷺ عمر رسیدہ ہو گئے (اور بڑھاپے کی وجہ سے) جسم پر گوشت زیادہ ہو گیا (یعنی جسم مبارک بھاری ہو گیا) تو وتر سمیت سات رکعتیں پڑھتے تھے اور وہی کرتے تھے (وتر کے بعد والی) دو رکعتوں میں جس طرح پہلے کرتے تھے یعنی ان کو بیٹھ کر پڑھتے تھے، پس یہ نو رکعتیں ہو گئیں، اے بیٹے! حضور ﷺ کی یہ خواہش تھی کہ جب کوئی نماز شروع فرماتے تو اس کو ہمیشہ جاری رکھنا پسند فرماتے تھے۔ اور آپ ﷺ پر جب نیند غالب آجاتی یا کوئی تکلیف پیش آجاتی جو کہ قیام اللیل سے مانع ہو جاتی تو آپ ﷺ دن میں بارہ رکعتیں پڑھتے تھے (زوال سے قبل) اور مجھے معلوم نہیں کہ حضور ﷺ نے کبھی ایک رات میں پورا قرآن پڑھا ہو یا مسلسل صبح تک نماز پڑھی ہو اور مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان المبارک کے علاوہ کسی اور مہینے کے پورے روزے رکھے ہوں۔ (مسلمؒ)

راویٔ حدیث:

سعید بن ہشام۔ یہ سعید بن ہشام انصاری ہیں۔ اونچے درجہ کے تابعین میں سے ہیں۔ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ سے سنا اور ان سے حسن رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں۔ ان کی حدیث اہل بصرہ میں پائی جاتی ہے۔ مرتب عرض کرتا ہے کہ مرقاۃ کے فوقانی اور تحتانی دونوں متون میں ''سعد بن ہشام'' ہے جبکہ ''الاکمال'' میں ''سعید بن ہشام'' لکھا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تشریح: ''وعن سعد بن هشام'' یعنی نبی کریم ﷺ کے اخلاق وشمائل سے مجھے آگاہ کر دیجئے۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنی طبیعت وعادات کیا ہے۔

''**فان خلق رسول اللّٰه ﷺ کان القرآن**'' یعنی نبی کریم ﷺ ان تمام مکارم اخلاق سے مزین تھے جو قرآن حکیم میں بیان کئے گئے۔

اس کا ایک معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کے اخلاق قرآن مجید کی اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں:

''وانك لعلی خلق عظیم''(القلم۔۴) ''آپ عظیم اخلاق پر فائز ہیں''۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمانا یہ چاہتی ہیں کہ عظیم الشان ذات جب کسی چیز کو عظمت والا قرار دے تو اس کی رفعت کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔

صاحب احیاء فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقصود ان آیات کو بتلانا تھا جن میں اخلاق ذمیمہ کی تہذیب اور اخلاق حمیدہ کی تحصیل کا ذکر ہے ان میں سے چند آیات درج ذیل ہیں:

① ''خذ العفو''(الاعراف۔۱۹۹) معاف کرنے کو لازم پکڑیئے۔

② ''ان اللّٰه یامر بالعدل والاحسان''(النمل۔۹۰) اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

③ ''فاصبر علی ما اصابك''(لقمان۔۱۷) مصیبت پر صبر کیجئے۔

④ فاعف عنهم واصفح''(المائدہ۔۱۳) ان کو معاف کیجئے اور درگزر فرمائیں۔

⑤ ''والكاظمین الغیظ والعافین عن الناس''(آل عمران۔۱۳۴) غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے۔

⑥ ''یاایها الذین اٰمنوا اجتنبوا كثیرًا من الظن''(الحجرات۔۱۲) اے ایمان والو! بہت سے گمان کرنے سے بچو!۔

''ما شاء ان یبعثه'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی اصل عبارت یہ ہوگی:

''فی الوقت المقدر الذی شاء بعثه فیه''۔

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ما موصولہ ہے اور عائد محذوف ہے اور معنیٰ ہوگا''ماشاء فیه''۔

''من اللیل'' ابن ملک کے نزدیک من بیانیہ ہے جبکہ اس کا تبعیضیہ ہونا راجح ہے۔

''فیذكر اللّٰه'' یعنی تشہد پڑھتے تھے۔

''ویحمده'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حمد یہاں مطلق ثناء وتعریف کے معنیٰ میں ہے کیونکہ التحیات میں حمد نہیں ہے۔

''ثم یصلی ركعتین بعد ما یسلم وهو قاعدٌ'' یہ حدیث بظاہر ایک اور حدیث کے معارض ہے جس میں آیا ہے:

''اجعلوا آخر صلاتكم وترًا''۔''اپنی آخری نماز وتر کو بناؤ''۔

شرح طیبی میں اس تعارض کے بارے میں یہ تفصیل مذکور ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نہ یہ دو رکعتیں پڑھتا ہوں اور نہ ان سے منع کرتا ہوں۔

امام مالک رحمہ اللہ انہیں پسند نہ کرتے تھے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر کے بعد نماز کے بیان جواز کیلئے یہ دو رکعات بیٹھ کر پڑھی ہیں۔اس میں بیٹھ کر نفل پڑھنے کا جواز اور ان پر ہمیشگی اختیار نہ کرنے کا بیان بھی ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے دو رکعات نماز والی ~~حدیث~~ کی تردید کی ہے۔یہ تردید درست نہیں کیونکہ احادیث جب صحیح ہوں تو

ان کے مابین تطبیق کی جائے گی۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "جو شخص ان رکعات کو سنت سمجھے اس سے دھوکہ مت کھاؤ۔ وہ شخص اپنی جہالت اور عدم انس کی وجہ سے ان کی طرف دعوت بھی دیتا ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ (ان رکعات کی کراہت کے حکم سے) مسافر مستثنیٰ ہے، کیونکہ ابن حبان نے اپنی صحیح میں مسافر کے لئے وتر کے بعد دو رکعات پڑھنے کا حکم نقل کیا ہے کیونکہ مسافر کے بارے میں گمان ہے کہ وہ تہجد کیلئے نہیں اٹھ سکے گا۔

حضرت ثوبانؓ فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ سفر جہد و مشقت سے عبارت ہے اگر تم میں سے کوئی وتر پڑھ چکے تو دو رکعات نماز پڑھ لے۔ اگر بیدار ہو جائے تو (تہجد کی) نماز پڑھ لے اور اگر نہ اٹھ سکے تو یہ نماز اس کی تہجد بن جائے گی۔

"أخذ اللحم" جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک پر گوشت بڑھ گیا۔ ابن ملک نے اس کی تعبیر کمزوری سے کی ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عمر کے آخری حصہ میں وصال سے تقریباً ایک سال پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک بڑھ گیا تھا۔

"اذا صلی صلاۃ" صرف نماز ہی نہیں ہر عبادت کا یہی حال تھا۔

"أحب ان یداوم علیها" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی عذر یا بیان جواز کیلئے کسی عمل کو چھوڑ بھی دیتے تھے۔

اس جملہ سے ان دو رکعات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مواظبت معلوم ہوئی۔ جس سے ظاہر ہوا کہ علامہ نووی کی یہ توجیہہ ٹھیک نہیں کہ یہ رکعات بیان جواز کیلئے ہیں۔

شاید قاضی عیاضؒ نے اس حدیث کو اس بنا پر رد کیا ہے کہ دوسری ثابت احادیث میں ان رکعات کے عدم مواظبت کا ذکر ہے۔ واللہ اعلم۔

"ولا صام شهرًا کاملاً غیر رمضان" اس جملہ میں ایک اور حدیث معارض معلوم ہوتا ہے جس میں وارد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پورا شعبان روزہ رکھا کرتے تھے۔

اس تعارض کے دو حل ہیں:

① آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ پورے شعبان میں روزہ نہیں رکھتے تھے۔

② آپ صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے اکثر دنوں میں روزہ رکھتے تھے اس کو راوی نے پورے مہینے سے تعبیر کر دیا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم کے دن رات، حاضر و غیوبت کے اوقات کے اعمال و افعال کا باقاعدہ تجزیہ کیا کرتی تھیں۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کا کلام وہی کر سکتا ہے جسے اس چیز کا مکمل علم ہو۔ یعنی حضرت عائشہؓ نے جو سختی سے نفی فرماتی ہے اس کے پیچھے ان کی با اعتماد معلومات ہیں۔

وتر کا مستحب وقت

۱۲۵۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اجْعَلُوْا اٰخِرَ صَلَاتِكُمْ بِاللَّيْلِ وِتْرًا۔

(رواہ مسلم)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۴۸۸۔ حدیث رقم ۹۹۸۔ ومسلم فی صحیحه ۱/۵۱۷ حدیث رقم (۱۵۱۔ ۷۵۱)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنی رات کی نمازوں میں سے آخری نماز وتر کی نماز کو بناؤ۔ (مسلم)

تشریح: یہ امر استحبابی ہے۔

۱۲۵۹: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بَادِرُوْا الصُّبْحَ بِالْوِتْرِ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۵۱۷ حدیث رقم (۱۴۹۔ ۷۵۰)۔ والترمذی فی السنن ۲/۳۳۱ حدیث رقم ۴۶۷۔ وأحمد فی المسند ۲/۳۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صبح کے آثار ظاہر ہونے پر وتر پڑھنے میں جلدی کرو۔ (مسلم)

تشریح: یعنی صبح سے پہلے وتر پڑھ لو۔ یہ امر ہمارے نزدیک وجوب کیلئے ہے۔ عطاء بن ابی رباح، امام احمد رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک صبح کے بعد وتر نہ پڑھے۔

سفیان بن ثوری اور امام شافعی رحمہ اللہ کے راجح قول کے مطابق جب اسے موقع ملے قضاء کر لے، کیونکہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص وتر پڑھے بغیر سو جائے تو جب صبح ہو تو پڑھ لے''۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ وتر کی قضاء واجب ہے یہاں تک کہ اگر نمازی صاحب ترتیب ہو اور وتر سے پہلے صبح کی نماز پڑھ لے اور اسے وتر یاد ہوں تو فجر صحیح نہ ہوگی۔

(رواہ مسلم) اس روایت کو ترمذی، ابن حبان اور امام احمد نے بھی نقل کیا ہے۔

رات کے آخری حصہ میں وتر پڑھنا

۱۲۶۰: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ خَافَ اَنْ لَّايَقُوْمَ مِنْ اٰخِرِ اللَّيْلِ فَلْيُوْتِرْ اَوَّلَهٗ وَمَنْ طَمِعَ اَنْ يَّقُوْمَ اٰخِرَهٗ فَلْيُوْتِرْ اٰخِرَ اللَّيْلِ فَاِنَّ صَلَاةَ اٰخِرِ اللَّيْلِ مَشْهُوْدَةٌ وَّذٰلِكَ اَفْضَلُ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۵۲۰ حدیث رقم (۱۶۲۔ ۷۵۵)۔ والترمذی فی السنن ۲/۳۱۷ حدیث رقم ۴۵۵۔ وابن ماجه ۱/۳۷۵ حدیث رقم ۱۱۸۷۔ ومالك فی الموطأ ۱/۱۲۴ حدیث رقم ۱۸ کتاب صلاۃ اللیل۔ وأحمد فی المسند ۳/۳۸۹۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو خوف ہو کہ وہ رات کے آخر میں بیدار نہیں ہو سکے گا تو اس کو چاہئے کہ وہ شروع رات میں ہی وتر پڑھ لے اور جس شخص کو آخر لیل میں اٹھنے کی امید ہو تو وہ

رات کے آخر میں ہی وتر پڑھے کیونکہ رات کے آخری نماز وتر ہوتی ہے (یعنی اس وقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے نازل ہوتے ہیں) اور یہی افضل ہے یعنی رات کے آخری حصہ میں وتر پڑھنا۔ (مسلمؒ)

تشریح: ''من خاف ان لا یقوم من اخر اللیل'' من تبعیض کیلئے ہے یا فی کے معنی میں ہے۔

''فلیوتر اوّله'' فوت ہونے کے خوف سے وتروں کو رات کے اول حصہ میں پڑھنے کا حکم ان کے وجوب پر دلالت کرتا ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہی ہے۔

''ان یقوم اخره'' یہ منصوب بنزع الخافض ہے۔ اصل عبارت یہ ہوگی ''ان یقوم فی اخرہٖ''

''فان صلاۃ اخر اللیل مشھودۃ'' یعنی اس وقت میں رات کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ اس وقت دن اور رات کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں کہ دن کے فرشتے نیچے اترتے ہیں اور رات کے فرشتے اوپر جاتے ہیں۔

اس جملہ کا ایک معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس وقت بہت سے نمازی نماز میں مشغول ہوتے ہیں۔

''وذلك'' اس کا مشارالیہ ''ایثار فی اخر اللیل'' ہے۔ بعض حضرات نے اس کا مشارالیہ ''ایثار فی اول اللیل'' قرار دیا جسے درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

''افضل'' کیونکہ اس کا ثواب ملائکہ رحمت، برکت واستغفار کے حضور کی وجہ سے اکمل ہے، نیز یہ نماز سب سے افضل وقت میں اور نیکوکار نمازیوں کے ساتھ مشارکت پر مبنی ہے۔

اس روایت کو ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

صلوٰۃ وتر رات کے ہر حصہ میں پڑھی جاسکتی ہے

۱۲۶۱: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مِنْ كُلِّ اللَّيْلِ أَوْتَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَوَّلِ اللَّيْلِ وَاَوْسَطِهٖ وَاٰخِرِهٖ وَانْتَهٰى وِتْرُهٗ اِلَى السَّحَرِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۴۸۶/۲۔ حدیث رقم ۹۹۶۔ ومسلم فی صحیحه ۵۱۲/۱ حدیث رقم (۱۳۷۔ ۷۴۵) والترمذی فی السنن ۳۱۸/۲ حدیث رقم ۴۵۶۔ والنسائی ۲۳۰/۳ حدیث رقم ۱۶۸۱۔ وابن ماجه ۳۷۵/۱ حدیث رقم ۱۱۸۶۔

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے ہر حصہ میں نماز وتر پڑھی، یعنی ابتدائی رات میں بھی اور اس کے درمیانی حصہ میں بھی اور رات کے آخری حصہ میں بھی، لیکن آخری عمر میں وتر کیلئے رات کا آخری حصہ یعنی وقت سحر مقرر کرلیا تھا۔ (بخاریؒ)

تشریح: ''قالت من کل اللیل'' من ابتدائیہ اور منصوب ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک من، فی کے معنی میں ہے۔

''من اول اللیل واوسطه واخره'' یہ بدل یا بیان ہے۔

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلا من تبعیضیہ اور دوسرا من اس سے بدل ہے یا بعضیت کے معنی میں بیان ہے۔ پہلا قول راجح ہے۔

''وانتھٰی وترہ الی السحر'' کشاف کے مطابق سحر سے مراد رات کا آخری سدس ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثری معمول کا ذکر ہے۔

صلوٰۃ ضحیٰ کی اہمیت

۱۲۶۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ اَوْصَانِیْ خَلِیْلِیْ بِثَلَاثٍ صِیَامِ ثَلَاثَةِ اَیَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ وَرَكْعَتِي الضُّحٰی وَاَنْ اُوْتِرَ قَبْلَ اَنْ اَنَامَ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣/٥٦۔ حديث رقم ١١٧٨۔ ومسلم ١/٤٩٩ حديث رقم (٨٥۔ ٧٢١)۔ وأبوداؤد في السنن ٢/١٣٨۔ حديث رقم ١٤٣٢۔ والترمذي ٣/١٣٣ حديث رقم ٧٦٠۔ والنسائي ٣/٢٢٩ حديث رقم ١٦٧٧۔ والدارمي ١/٤٠٢ حديث رقم ١٤٥٤۔ وأحمد في المسند ٢/٤٥٩۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ مجھے میرے محسن دوست نے تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی۔ ہر مہینہ میں تین دن روزے رکھنے کی۔ دو رکعت چاشت کی نماز پڑھنے کی اور تیسری یہ کہ میں وتر پڑھ لوں سونے سے پہلے پہلے۔ (بخاری)

تشریح: ''قال: أوصانی'' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد لیا اور مجھے سختی سے حکم دیا۔

''وأن أوتر قبل أن أنام'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''والوتر قبل النوم'' کہا جاتا لیکن ان مصدریہ اور فعل کو اسے فاعل بنایا گیا اور اس کا مقصد اہتمام شان ہے اور یہ ان کے حال کے زیادہ لائق تھا کیونکہ سو جانے کی صورت میں وتر کے فوت ہو جانے کا اندیشہ تھا ورنہ وتر رات کے آخری حصہ میں پڑھنا افضل ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو یہ رعایت دینے کا مقتضا یہ تھا کہ وہ رات کے ابتدائی حصہ میں حضرت ابو ہریرہؓ احادیث یاد کرنے میں مشغول رہتے تھے، رات کا بہت بڑا حصہ اسی عمل میں گزر جاتا تھا۔ لہٰذا صبح تہجد کے وقت ان کیلئے اٹھنا ممکن نہ تھا، اس صورتحال کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وتر جلدی پڑھنے کا حکم دیا کیونکہ وہ ایک ایسے کام میں مشغول ہے جو زیادہ افضل ہے۔

(متفق علیه) یہ روایت ابوداؤد اور نسائی نے بھی نقل کی ہے۔

الفصل الثانی:

آنحضرت کا عمل میں آسانی اختیار کرنا

۱۲۶۳: عَنْ غُضَیْفِ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ قُلْتُ لِعَائِشَةَ اَرَاَیْتِ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ كَانَ یَغْتَسِلُ مِنَ الْجَنَابَةِ فِیْ اَوَّلِ اللَّیْلِ اَمْ فِیْ اٰخِرِهٖ قَالَتْ رُبَّمَا اغْتَسَلَ فِیْ اَوَّلِ اللَّیْلِ وَرُبَّمَا اغْتَسَلَ

فِيْ اٰخِرِهٖ قُلْتُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ فِي الْاَمْرِ سَعَةً قُلْتُ كَانَ يُوْتِرَ فِيْ اَوَّلِ اللَّيْلِ اَمْ فِيْ اٰخِرِهٖ قَالَتْ رُبَّمَا اَوْتَرَ فِيْ اَوَّلِ اللَّيْلِ وَرُبَّمَا اَوْ تَرَفِيْ اٰخِرِهٖ قُلْتُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ فِي الْاَمْرِ سَعَةً قُلْتُ كَانَ يَجْهَرُ بِالْقِرَاءَةِ اَمْ يَخْفِتُ قَالَتْ رُبَّمَاجَهَرَبِهٖ وَرُبَّمَا خَفَتَ قُلْتُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَ فِي الْاَمْرِ سَعَةً۔ (رواه ابوداود وروى ابن ماجة الفصلَ الآخِيرَ)

أخرجه أبو داؤد في السنن ١/ ١٥٣ حديث رقم ٢٢٦۔ وابن ماجه ١/ ٤٣٠ حديث رقم ١٣٥٤۔

ترجمہ: حضرت غضیف بن حارثؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شروع رات میں غسل جنابت فرمالیتے تھے یا کہ رات کے آخر میں (یعنی جماع سے فراغت کے بعد فوراً غسل کرتے تھے یا کہ اس وقت سو جاتے اور بوقت سحر اٹھ کر غسل کرتے تھے) تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کبھی شروع رات میں ہی غسل کر لیتے تھے اور کبھی رات کے آخر میں غسل کرتے تھے، میں نے اللہ اکبر کہا کہ اللہ سب سے بڑا ہے اور تمام تعریفیں اس ذات کیلئے ہیں جس نے ہر معاملہ دینی میں آسانی پیدا فرمائی۔ میں نے پھر پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وتر اول لیل میں پڑھتے تھے یا کہ آخر لیل میں پڑھتے تھے تو فرمایا کبھی اول لیل میں یعنی سونے سے قبل ہی وتر پڑھ لیتے اور کبھی آخر لیل میں وتر پڑھتے تھے۔ میں نے کہا اللہ اکبر تمام تعریفیں اس ذات کیلئے ہیں جس نے دینی معاملات میں آسانی عطا فرمائی۔ میں نے پھر پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قراءت بلند آواز سے فرماتے تھے یا کہ پست آواز میں تو فرمایا کبھی بلند آواز میں پڑھتے تھے اور کبھی پست آواز میں پڑھتے تھے تو میں نے کہا اللہ اکبر! تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں جس نے دین کے ہر امر میں آسانی عطا فرمائی۔ یہ ابوداؤد کی روایت ہے ابن ماجہ نے اس کا صرف آخری حصہ نقل کیا ہے۔

تشریح: ”عن غضیف“ اس لفظ کی کیفیت میں دو احتمال ہیں:

① غضيف۔ بضم الغين وفتح الصاد المعجمتين وياء ساكنة وآخره فاء۔

② غطيف۔ بالطاء المهملة“

ان کے صحابی ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض حضرات نے غضیف اور غطیف الگ الگ افراد کے نام قرار دیئے ہیں۔ میرک رحمہ اللہ کا کہنا یہ ہے کہ غضیف صحابی اور غطیف تابعی ہیں۔

مؤلف فرماتے ہیں کہ غضیف نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا ہے اور ان کے صحابی ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔

”قلت لعائشة، أرأيت“ ابن ملک رحمہ اللہ نے اس کا معنی بیان کیا ہے۔ ”أخبريني“ مجھے خبر دیجئے۔

زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس سے مراد استفہام ہو خواہ رؤیت بصری ہو یا علمی، اس کا معنی ہے هل رأيت کیا آپ نے دیکھا ہے۔

”قالت ربما اغتسل في اول الليل وربما اغتسل فی اخره“ ان دونوں جملوں میں لفظ رب تکثیر کیلئے ہے یا پہلے جملہ میں تکثیر اور دوسرے میں تقلیل کیلئے ہے۔ یعنی کبھی کبھی بیان جواز یا حصول نشاط کے لئے رات کے آخری حصہ میں بھی غسل فرماتے تھے۔

''فقلت: اللّٰہ اکبر'' انہوں نے تعجب اور فرحت کی وجہ سے اللہ اکبر کہا۔

''الحمد للّٰہ الذی جعل فی الامر سعۃً'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ احکامات کے اندر اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی رعایت ملتی ہے تو یہ ایک ایسی نعمت ہے جس کا شکر ادا کرنا واجب ہے اور اللہ اکبر اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ یہ نعمت بہت بڑی ہے۔

''قالت ربما جهر به وربما خفت'' اس جملہ کے دو معنی ہیں:

① کسی رات میں اونچی آواز سے تلاوت فرماتے اور کسی رات میں آہستہ آواز سے

② ایک ہی رات میں کبھی اونچی آواز سے تلاوت فرماتے کبھی آہستہ آواز سے۔

رکعات صلوٰۃ تہجد

۱۲۶۴: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ قَیْسٍ قَالَ سَاَلْتُ عَائِشَةَ بِكَمْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ قَالَتْ كَانَ يُوْتِرُ بِاَرْبَعٍ وَّثَلَاثٍ وَّسِتٍّ وَّثَلَاثٍ وَّثَمَانٍ وَّثَلَاثٍ وَّعَشْرٍ وَّثَلَاثٍ وَلَمْ يَكُنْ يُوْتِرُ بِاَنْقَصَ مِنْ سَبْعٍ وَّلَا بِاَكْثَرَ مِنْ ثَلَاثَ عَشْرَةَ۔ (رواه ابو داود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ۲/ ۹۷ حديث رقم ۱۳۶۲۔ وأحمد في المسند ۶/ ۱۴۹۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن قیس فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کتنی رکعتوں کے ساتھ وتر پڑھتے تھے تو فرمایا کبھی چار اور تین (یعنی سات) اور کبھی چھ اور تین (یعنی نو/۹) اور کبھی آٹھ اور تین (یعنی گیارہ) اور کبھی دس اور تین (یعنی ۱۳) رکعتوں کے ساتھ وتر ادا کرتے تھے اور آپ نے وتروں سمیت سات سے کم اور تیرہ سے زیادہ صلوٰۃ تہجد نہیں پڑھی۔ (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

عبداللہ بن ابی قیس۔ یہ عبداللہ بن ابی قیس تابعی ہیں۔ ان کی کنیت ''ابوالاسود'' ہے۔ شام کے رہنے والے ہیں۔ عطیہ بن عازب رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ ہیں۔ ان کا شمار شامیوں میں کیا جاتا ہے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی۔ ان سے ایک جماعت نے احادیث کی روایت کی ہے۔

تشریح: ''عبداللّٰہ بن ابی قیس'' یہ تابعی ہیں۔

''بکم کان رسول اللّٰہ ﷺ یوتر؟'' اس سوال کے منشا میں دو احتمال ہیں:

① کتنی رکعات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم وتر بناتے تھے۔

② وتر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کتنی رکعات پڑھتے تھے۔

''کان یوتر باربع'' یہ چار رکعات ایک سلام کے ساتھ پڑھتے تھے یا دو سلاموں کے ساتھ، دونوں احتمال ہیں۔

''وثلاث'' یعنی ایک سلام کے ساتھ ~~علامہ ملک~~ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس طرح سات رکعات بن جاتی ہیں۔

''وست'' یہ چھ رکعات دو سلاموں کے ساتھ پڑھتے تھے یا تین کے ساتھ، دونوں احتمال ہیں۔
''وثلاث'' اس طرح نو رکعات بن جائیں گی۔
''وثمان وثلاث'' اس طرح گیارہ رکعات بن جائیں گی۔
''وعشر وثلاث'' اس طرح تیرہ رکعات بن جائیں گی۔

حضرت عائشہؓ نے ہر عدد کے بعد ''ثلاث'' کا ذکر کیا ہے اس سے صریح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ وہ تو حقیقت میں تین ہیں۔ اس کے پہلے کی نماز نماز تہجد ہے۔ اور ان تمام پر وتر کا اطلاق بطور مجاز کے ہے۔ ایک صحیح حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے جس میں آیا ہے کہ ''رات میں اپنی آخری نماز وتر کو بناؤ''۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رکعات کے اس اختلاف کی بنیاد مندرجہ ذیل چیزوں پر ہے:
① وقت کی وسعت۔ ② قراءت کی طوالت۔ ③ نیند۔ ④ مرض۔ ⑤ عمر کی زیادتی۔

امام میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد یا منذری نے اس روایت کو ضعیف قرار نہیں دیا۔

صلوٰۃِ وتر کا پڑھنا واجب ہے

۱۲۶۵: وَعَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَلْوِتْرُ حَقٌّ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ فَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّوْتِرَ بِخَمْسٍ فَلْیَفْعَلْ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّوْتِرَ بِثَلَاثٍ فَلْیَفْعَلْ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ یُّوْتِرَ بِوَاحِدَۃٍ فَلْیَفْعَلْ۔

(رواہ ابوداود والنسائی وابن ماجۃ)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱۳۲/۲ حدیث رقم ۱۴۲۲۔ والنسائي ۲۳۸/۳ حدیث رقم ۱۷۱۲۔ وابن ماجه ۳۷۶/۱ حدیث رقم ۱۱۹۰۔

ترجمہ: حضرت ابو ایوبؓ فرماتے ہیں کہ سرکار طیبہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وتر کی نماز پڑھنا ہر مسلمان پر حق (یعنی واجب) ہے۔ جس کا دل چاہے پانچ رکعات پڑھنا تو وہ پانچ رکعات پڑھ لے اور جو شخص تین پڑھنا پسند کرتا ہے وہ تین پڑھ لے اور جو ایک ہی رکعت پڑھنا پسندیدہ سمجھتا ہے وہ ایک ہی پڑھ لے۔ (ابن ماجہ)

تشریح: ''الوتر حق علی کل مسلم'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حق کے دو معنی آتے ہیں: ① الثبوت۔ ② الوجوب۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے دوسرا معنی لیا اور وہ وتر کے وجوب کے قائل ہیں۔ جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے پہلا معنی لیا ہے یعنی وتر شریعت اور سنت میں ثابت ہے اور اس میں تاکید بھی پائی جا رہی ہے، ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تاکید ایک اور حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے جس میں آیا ہے۔ ''وتر پڑھو کہ اللہ تعالیٰ وتر (طاق یعنی ایک) ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے وجوب وتر کو اختیار کیا ہے۔ اس پر ابن المنذر رحمہ اللہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی امام بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے موافق نہیں۔ ابن المنذر رحمہ اللہ کے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اجتہادی مسائل میں موافقت شرط نہیں۔

مسلک حنفیہ کی تائید ایک اور حدیث سے ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک نماز کا اضافہ کیا ہے اس کی پابندی کرو اور وہ نماز وتر ہے''۔

ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن ان کے جواب میں ہم یوں کہیں گے کہ اگر ابن حجر رحمہ اللہ کی بات کو درست تسلیم کر لیا جائے تو ضعیف حدیث ایک صحیح حدیث کی تائید بہر صورت کر سکتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کی سند میں ضعف ایک ایسے راوی کی وجہ سے آیا ہے جو مجتہد کے بعد کا ہے۔ اس لئے اس کا ضعف ہمارے مسلک کیلئے نقصان دہ نہیں ہوسکتا۔

''**فمن أحب ان یوتر بخمس فلیفعل**'' وتر کی پانچ رکعات پڑھنے کی صورت یہ ہے کہ پہلے دو رکعات پڑھے پھر تین رکعات۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے یہی طریقہ منقول ہے اور کسی امام نے ان کی مخالفت بھی نہیں کی۔ البتہ امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ پانچ رکعات کے بعد ہی سلام پھیرے۔

''**ومن احب ان یوتر بثلاث**'' فقہ حنفی میں اصل یہی ہے کہ تین وتر ایک سلام کے ساتھ پڑھے جائیں۔ ان کے جواز پر تو سب علماء متفق ہیں البتہ افضل اور غیر افضل ہونے میں اختلاف ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ وصل اور فصل کے درمیان تفضیل کا اختلاف تین رکعات وتر میں ہے۔ اگر تین سے زیادہ رکعات پڑھے تو اس میں قطعی طور پر فصل (الگ سے پڑھنا) افضل ہے''۔

''**فلیفعل**'' اس حدیث میں تین رکعات پڑھنے کا حکم ہے۔ یہ روایت بظاہر ابن حجر رحمہ اللہ کی ذکر کردہ اس روایت کے خلاف ہے جس میں یہ ذکر ہے:

''تین رکعات وتر نہ پڑھو بلکہ پانچ یا سات رکعات وتر پڑھو۔ تم وتروں کو مغرب کی نماز کے مشابہ نہ بناؤ''۔

اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کی تاویل یہ ہوگی کہ اس میں اس شخص کے عمل پر نہی تنزیہ ہے جو تہجد کی نماز چھوڑ دے اور محض تین رکعت وتر پر اکتفا کر لے۔ آپ ﷺ اسے فرمانا چاہتے ہیں کہ مغرب کی نماز کی طرح وتر صرف تین رکعات نہ پڑھو بلکہ اس کے ساتھ چار یا دو رکعات تہجد کی بھی ملاؤ۔

''**ومن أحب ان یوترا بواحدة فلیفعل**'' امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ وتر کی کم از کم مقدار ایک رکعت ہے اور ایک رکعت وتر پڑھنا بھی صحیح ہے ہمارا اور جمہور کا یہی مذہب ہے جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک رکعت وتر پڑھنا درست نہیں اور ایک رکعت سے نماز نہ ہوگی۔ جبکہ احادیث صحیحہ سے ان کی تردید ہوتی ہے۔

امام ابن ہمام فرماتے ہیں کہ وتر کے وجوب کے ثبوت میں ہماری دلیل وہ حدیث ہے جسے امام ابوداؤد نے کچھ یوں روایت کیا ہے:

''**عن ابی المنیب عبید اللہ العتکی، عن عبداللہ بن بریدة عن أبیه قال قال رسول اللہ ﷺ الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منی الوتر حق فمن لم یوتو فلیس منی الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منی**''۔

امام حاکم نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ انہوں نے اور ابن معین نے ابوالمنیب کو ثقہ قرار دیا ہے۔

ابن ابی حاتم نے ابوحاتم کا قول ذکر کیا ہے کہ ابوالمنیب صالح الحدیث ہیں۔ انہوں نے امام بخاری کی اس بات کو درست نہیں

سمجھا کہ ابوالمنیب ضعیف راوی ہیں۔

نسائی اور ابن حبان رحمہ اللہ نے ان کے بارے میں کلام کیا ہے اور ابن عدی فرماتے ہیں لا باس به ۔ پس مذکورہ تفصیل کی روشنی میں یہ حدیث حسن ہے۔

''والوتر واجب علی کل مسلم''۔''وتر ہر مسلمان پر واجب ہیں''۔

اگر ان احادیث کی تاویل میں یہ کہا جائے کہ امر کبھی استحباب کیلئے بھی آتا ہے اور واجب ثبوت کے معنی میں بھی آتا ہے اسی طرح حق کا معنی بھی ثبوت ہے۔ نیز ان روایات کی معارض روایات بھی موجود ہیں۔ اور ایسا قرینہ بھی موجود ہے جو امر کو استحباب اور واجب و حق کو ثبوت کے معنی میں لینے پر دلالت کر رہا ہے وہ معا معارض روایات درج ذیل ہیں:

① بخاری اور مسلم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اونٹ پر وتر پڑھ لیا کرتے تھے۔

② متفق علیہ روایت ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن بھیجا تو ان سے فرمایا کہ یمن والوں کو بتا دینا کہ اللہ تعالیٰ نے دن رات میں ان پر پانچ نمازیں فرض فرمائی ہیں۔ ابن حبان فرماتے ہیں کہ حضرت معاذ کو یمن بھیجنا وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ عرصہ پہلے کا واقعہ ہے۔ موطا مالک سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

③ ابن حبان نے بھی ایک روایت نقل کی ہے جس میں ہے رمضان میں ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو آٹھ رکعات نماز اور وتر پڑھائے۔ اگلے دن لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہ لائے۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مجھے ڈر ہوا کہ کہیں تم پر وتر فرض نہ کر دیئے جائیں''۔

وتر کو واجب نہ کہنے والے فقہاء کے پاس ان کے علاوہ کچھ اور روایات بھی ہیں جو ضعف اور عدم دلالت تامہ سے خالی نہیں۔

واجب اور حق کو ثبوت کے معنی میں لیے جانے پر دلالت کرنے والا قرینہ ترمذی کی یہ روایت ہے:

''الوتر واجب علی کل مسلم، فمن أحب ان یوتر بخمس فلیوتر، ومن أحب ان یوتر بثلاث، فلیفعل، ومن أحب أن یوتر بواحدۃ فلیوتر''۔

ابن حبان اور حاکم نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔

وجہِ قرینہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے وجوب کا حکم دیا پھر مختلف صورتوں کے درمیان اختیار دیا۔ اگر وتر واجب ہوتے تو ان صورتوں میں سے ہر صورت واجب ہوئی اور پانچ رکعات وتر کے واجب نہ ہونے پر سب کا اجماع ہے۔ پس واجب کو ثبوت کے معنی میں لینا پڑے گا۔

فریق مخالف کی پہلی دلیل (انواع معارضہ کا وجود) کا جواب یہ ہے کہ یہ سارے خصوصی واقعات ہیں اور عمومیت سے خالی ہیں ممکن ہے کہ یہ کسی عذر کی وجہ سے ہوں۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ فرض نماز بارش یا کیچڑ وغیرہ کے عذر سے سواری پر پڑھی جا سکتی ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ابن عمر کا ذکر کردہ واقعہ وتروں کے وجوب سے پہلے کا ہو کیونکہ وتر کا وجوب پانچ نمازوں کی فرضیت کے

بعد عمل میں آئی۔ روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ وتروں کے وقت سواری سے اتر جاتے تھے، اس سلسلہ میں امام طحاوی نے مندرجہ ذیل روایت نقل کی ہے:

''عن حنظلة بن سفیان عن نافع عن ابن عمر أنه كان یصلی علی راحلته ویوتر بالأرض''۔

پس معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کا سواری پر وتر پڑھنا کسی عذر کی وجہ سے تھا یا وتروں کے وجوب سے پہلے کا تھا۔

ان کی ذکر کردہ دوسری حدیث (یعنی حضرت معاذ کی یمن روانگی) کی تاویل یہ ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ وتر حضرت معاذؓ کے سفر کے بعد واجب ہوئے ہوں۔

تیسری حدیث کی توجیہ بھی یہی ہے کہ یہ واقعہ وجوب سے پہلے کا ہے یا پھر اس سے مراد وتر اور تہجد کی نماز کا مجموعہ ہے۔ حالانکہ اس مجموعہ کے وجوب کے تو ہم بھی قائل نہیں۔ اس کی تائید ایک اور روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:

''خشیت ان یکتب علیکم صلاۃ اللیل''

جس قرینہ کا انہوں نے ذکر کیا اس کا جواب بھی یہ ہے کہ یہ واقعہ وتروں کے بارے میں کوئی بھی حکم طے ہونے سے پہلے کا ہے۔ ممکن ہے پہلے ایسا ہی ہوتا ہو۔

مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رات کو تیرہ رکعات نماز پڑھتے تھے جن میں سے پانچ رکعت وتر پڑھتے اور صرف ان کے آخر میں ہی بیٹھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شروع میں وتر پانچ تھے۔ حالانکہ اب اس بات پر اجماع ہے کہ ہر دو رکعات کو پورا کر کے بیٹھا جائے گا۔

اسی طرح دارقطنی کی ایک روایت میں آتا ہے۔ کہ ''تین رکعات وتر نہ پڑھو بلکہ پانچ یا سات رکعات پڑھو''۔

اسے لغوی معنی پر محمول کرنا کسی طرح درست نہیں کیونکہ اس میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو وجوب کے مقتضا کی بھرپور تائید کر رہے ہیں، خاص طور پر آپ ﷺ کا یہ ارشاد مبارک: ''فمن لم یوتر فلیس منی''

اسے تین مرتبہ لا کر اور زیادہ مؤکد کیا گیا ہے۔

امام طحاویؒ نے مختلف اسانید کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے:

''عن ابی ایوب عن النبی ﷺ قال الوتر حق فمن شاء اوتر بخمس ومن شاء اوتر بثلاث ومن شاء اوتر بواحدة''

اس کے بعد امام طحاویؒ فرماتے ہیں:

''اگر اس کے خلاف پر اجماع ہوتا ہے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ جو شخص وتر پڑھنا چاہے تو اس کو ان تین صورتوں میں سے ایک کا اختیار ہے۔ (حالانکہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں) پس معلوم ہوا کہ اس حدیث کے منسوخ ہونے پر اجماع ہے''۔

''رواہ ابو داؤد، والنسائی، وابن حاجة'' امام نووی رحمہ اللہ نے اس کو اسناد کو صحیح قرار دیا ہے۔

امام حاکم نے اسے بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو داؤد کی صحیح ہے ابن حبان اور حاکم نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔

ابن القطان نے اس کو مرفوع قرار دیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کی صحت کے اختلاف کی بناء پر ایک رکعت وتر پر اس سے استدلال کرنا ٹھیک نہیں۔
اس حدیث سے متعلق بحث پیچھے گذر گئی ہے اور یہ بات بھی گزری کہ ابن صلاح نے اس حدیث کو محفوظ قرار نہیں دیا۔

صلوٰۃ وتر کی فضیلت

۱۲۶۶: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ فَاَوْتِرُوْا يَآاَهْلَ الْقُرْاٰنِ ۔ (رواه الترمذی وابوداود والنسائی)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۲۱٤/۱۱ حديث رقم ٦٤١٠۔ ومسلم ٢٠٦٢/٤ حديث رقم٥/٢٦٨٨۔ وأبو داوٗد فی السنن ۱۲۷/۲ حديث رقم١٤١٦۔ والترمذی ۳١٦/۲ حديث رقم ٤٥٣۔ والنسائی ۲۲۸/۳ حديث رقم ١٦٧٥۔ وابن ماجه ۳۷۰/۱ حديث رقم ١١٦٩۔ والدارمی ٤٤٨/١ حديث رقم ١٥٨٠۔ وأحمد فی المسند ١/١٠٠۔

ترجمہ: امیر المؤمنین حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ وتر ہے (یعنی اکیلا اور طاق ہے) اور وتر کو پسند کرتا ہے لہٰذا تم وتر پڑھو اے اہل قرآن! (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: ''ان اللّٰہ وتر'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے وتر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں یکتا ہے۔ اور اپنی صفات میں بھی یکتا ہے اس کے مشابہ کوئی نہیں نہ اس کے مثل کوئی ہے۔ وہ اپنے افعال میں تنہا ہے اس کا کوئی شریک ہے نہ مددگار۔

''یحب الوتر'' یعنی وتروں پر ثواب دیتا ہے اور انہیں قبول کرتا ہے۔

قاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس چیز کی ادنیٰ مناسبت بھی ہو وہ حضور ﷺ کو اس چیز سے زیادہ پسند ہوتی تھی جس کی بالکل مناسبت نہ ہو۔

ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ اشارتاً یہ فرمانا چاہتے ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہی اس عبادت کو پسند کرتا ہے جو اللہ کے ہر غیر سے الگ تھلگ اور مستغنی ہو کر کی جائے۔

''فأوتروا'' علامہ طیبی رحمہ اللہ نے اس کا معنی بیان کیا ''پس تم وتر پڑھو''۔

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فاء شرط مقدر کو بتا رہی ہے گویا کہ یہ فرمایا ''اذا اهتديتم الى أن اللّٰه يحب الوتر فأوتروا''۔ امر کا مقتضا وجوب ہے اس لئے اس سے وتروں کا واجب ہونا بھی معلوم ہوتا ہے۔

''یا أهل القرآن'' یعنی اے اہل ایمان! کیونکہ وہ شخص اہل قرآن میں سے ہے جو اس پر ایمان لے آیا خواہ قرآن پڑھے یا نہ پڑھے۔ البتہ سب سے کامل اہل قرآن وہ ہے جو قرآن پڑھے یا حفظ کرے اس کے احکامات کو حاصل کرے اور پر عمل بھی کرے۔

تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل قرآن کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے محبوب چیزوں کو قربان کرنے کی کوشش

کرتے رہتے ہیں۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں مقام قرآنیہ میں اہل قرآن کی تخصیص شاید اس وجہ سے ہے کہ قرآن صرف توحید کے ثبوت کیلئے نازل ہوا ہے۔

''رواہ الترمذی وابو داؤد والنسائی'' علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام ابن ماجہؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

نمازِ وتر دنیا کے ہر چیز سے بہتر ہے

۱۲۶۷: وَعَنْ خَارِجَةَ بْنِ حُذَافَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ اَمَدَّكُمْ بِصَلَاةٍ هِيَ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ الْوِتْرُ جَعَلَهُ اللّٰهُ لَكُمْ فِيْمَا بَيْنَ صَلَاةِ الْعِشَاءِ اِلٰى اَنْ يَّطْلُعَ الْفَجْرُ۔

(رواہ الترمذی وابو داود)

أخرجه أبوداؤد ۱۲۸/۲ حديث رقم ۱٤۱۸۔ والترمذی فی السنن ۳۱٤/۲ حديث رقم ٤٥۲۔ وابن ماجه ۳٦۹/۱ حديث رقم ۱۱٦۸۔ والدارمی ٤٤٦/۱ حديث رقم۱٥۷٦۔

ترجمہ: حضرت خارجہ بن حذافہؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ ایک مرتبہ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی نماز کے ساتھ تمہاری امداد فرمائی ہے (یعنی صلوٰۃ خمسہ کے علاوہ ایسی نماز کا تمہارے لیے اضافہ کیا ہے) جو کہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے اور وہ وتر کی نماز ہے اور مقرر کی گئی ہے یہ نماز تمہارے لیے عشاء کی نماز کے بعد سے فجر کے طلوع ہونے تک۔ (ترمذیؒ، ابوداؤدؒ)

راویٔ حدیث:

خارجۃ بن حذافۃؓ۔ یہ ''حذافہ قریشی عدوی'' کے بیٹے ہیں۔ یہ قریش کے ماہر سواروں میں سے ایک شہسوار ہیں ان کے متعلق یہ مشہور ہے کہ یہ ایک ہزار (۱۰۰۰) سواروں کے برابر ہیں۔ ان کا شمار ''مصریوں'' میں کیا جاتا ہے یہی وہ شخص ہیں جن کو خارجی شخص نے یہ سمجھ کر کہ ''عمرو بن العاص ؓ'' ہیں قتل کر دیا تھا اور یہ خارجی ان تین شخص میں کا ایک شخص ہے جنہوں نے حضرت علی اور حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص ؓ کے قتل پر اتفاق کیا تھا اور ان سے ہر ایک ان تینوں اصحاب میں سے ہر ایک کے قتل کی کوشش میں تھا۔ اللہ کا فیصلہ حضرت علی ؓ کے بارے میں پورا ہوا اور باقی دونوں اصحاب بچ گئے اور خارجہ کا قتل ۴۰ھ میں پورا ہوا۔ ابن حجر کے نسخہ میں حذافہ بن خارجہ ہے یہ قلم کا سہو ہے۔

تشریح: ''وعن خارجة من حذافة'' حذافۃ حاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

ابن حجر ؒ کے ایک نسخہ میں حذافہ بن خارجۃ ہے جو کہ ایک قلمی غلطی ہے۔

''ان اللّٰہ أمدکم'' اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک نماز کا اضافہ کیا ہے۔

ایک نسخہ میں أمرکم ہے جس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے۔

''ھی خیر لکم من حمر النعم'' الحمر (بضم الحاء وسکون المیم) احمر کی جمع ہے۔

النعم کا معنی ہے اونٹ۔ یہ عبارت اضافت صفت الی الموصوف کی قبیل سے ہے۔ عربوں کے نزدیک سب سے بہترین مال اونٹ ہیں اس لئے ترغیب میں اونٹوں کا ذکر کیا گیا۔ یہ اس بات سے کنایہ ہے کہ یہ نماز دنیا کی ہر خیر سے بہتر ہے کیونکہ یہ آخرت کا ذخیرہ ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

''الوتر'' اس کی ترکیبی کیفیت میں تین احتمال ہیں:

① جر، اس صورت میں یہ صلاۃ سے بدل ہے۔

② رفع۔ اس صورت میں یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے ای ھی الوتر۔

③ نصب، أعني مقدر ہوگا۔

ایسی ترکیب میں جر زیادہ صحیح ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول: ''الحمد للّٰه رب العالمین'' (الفاتحۃ۔۱)

اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے: ''بني الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا اللّٰه''۔

''فیما بین صلاۃ العشاء الی ان یطلع الفجر'' ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ وتروں کو عشاء کے فرضوں سے پہلے پڑھنا جائز نہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''فی وقت العشاء'' کے الفاظ نہیں فرمائے تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ وتروں کو عشاء کے فرضوں پر مقدم کرنا جائز ہے۔ نیز یہ کہ ان کو ''زیادۃ'' کہا گیا ہے اور زیادۃ مزید فیہ کے کمال کے بعد ہوتی ہے۔

''رواہ الترمذی وابو داؤد'' اس روایت کو ابن ماجہؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے یزید بن ابی حبیب کے علاوہ کسی سے منقول نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا سماع معروف نہیں۔

ابوتمیم الجیشانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے عمرو بن عاصؓ کو فرماتے ہوئے سنا کہ مجھے ایک صحابی نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ان اللّٰه عزوجل زادكم صلاة فصلوها فيما بين العشاء والصبح الوتر الوتر''

اس روایت کو امام احمد اور طبرانی نے نقل کیا ہے اور امام احمد کی ایک روایت کے سب راوی صحیح ہیں۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام حاکم اور ابن السکنؒ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور امام نوویؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے۔

اگر ابن السکن کی اس بات کو مان بھی لیا جائے پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ابن منذر نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ وتر کا وقت یہی ہے جو حدیث میں ذکر کیا گیا۔

بہر صورت یہ حدیث کم از کم حسن کے درجہ میں تو ہوگی اور صاحبِ ہدایہ نے وتر کے وجوب پر اسی حدیث سے استدلال کیا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ حاکم نے اسے روایت کیا اور صحیح قرار دیا ہے۔

امام ترمذیؒ کا اس حدیث کو غریب قرار دینا صحت کے منافی نہیں جیسا کہ معلوم ہو چکا اسی وجہ سے وہ اپنی کتاب میں بارہا فرماتے ہیں حسن صحیح غریب۔

امام بخاری کا اس حدیث کو معلول قرار دینا اس بنیاد پر ہے کہ امام بخاری کے نزدیک لقاء کا علم ضروری ہے جبکہ صحیح قول یہ ہے کہ صحت حدیث کیلئے امکان لقاء کافی ہے۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں یہ بات طے ہوگئی کہ یہ حدیث صحت کے اعلیٰ معیار پر ہے۔ اگر اسے تسلیم نہ کیا جائے تو کم از کم یہ حدیث اپنے کثرت طرق کی وجہ سے حسن کے درجہ کو پہنچ جائے گی۔

قضاوتر کا حکم

۱۲۶۸: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ نَامَ عَنْ وِتْرِهٖ فَلْيُصَلِّ اِذَا اَصْبَحَ۔

(رواه الترمذی مرسلا)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲/۱۳۷ حديث رقم ۱۴۳۱۔ والترمذی فی السنن ۲/۳۳۰ حديث رقم ۴۶۶۔

ترجمہ: حضرت زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص وتر پڑھے بغیر سو جائے تو چاہئے کہ وہ ان کو جب صبح ہو جائے تو پڑھ لے۔ (ترمذی، مرسل روایت)

تشریح: "زيد بن أسلم" مشہور تابعی ہیں۔ ایک قول کے مطابق ان کے والد صحابی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔

"فليصل اذا أصبح" یعنی جب صبح ہو تو بطور قضاء کے انہیں پڑھ لے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر یہ شخص صاحب ترتیب ہو تو اسے چاہیے کہ صبح کی نماز سے پہلے وتر پڑھے (اگر نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ ہو) اس حدیث سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے۔

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ صبح کی نماز کے بعد جب اسے موقع ملے وتروں کی قضاء کر لے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی راجح مذہب ہے۔

امام مالک اور امام احمد رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ وتر کی قضاء نہیں کرے گا۔

"رواه الترمذی مرسلاً" امام میرکؒ نے تصحیح کے حوالہ سے فرمایا ہے کہ طبرانی میں اغر مدنی کی حدیث اسناد جید کے ساتھ اس کا شاہد ہے۔

البتہ واضح رہے کہ مرسل حدیث جمہور کے نزدیک حجت ہے اور جب اس کا شاہد ہو تو امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسے حجت مانتے ہیں۔

ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنی جہالت کی بنا پر کہا ہے کہ "ان هذا المرسل مقولاً انه الحجة وحده"۔

صلوٰۃ وتر میں خاص سورتیں پڑھنا

۱۲۶۹: وَعَنْ عَبْدِالْعَزِيْزِ بْنِ جُرَيْجٍ قَالَ سَأَلْنَا عَائِشَةَ بِاَيِّ شَيْءٍ كَانَ يُوْتِرُ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ كَانَ يَقْرَأُ فِي الْاُوْلٰى بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى وَفِي الثَّانِيَةِ بِقُلْ يٰاَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ وَفِي الثَّالِثَةِ بِقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ وَالْمُعَوِّذَتَيْنِ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱۳۲/۲ حديث رقم ۱۴۲۳۔ والترمذی ۳۲۶/۲ حديث رقم ۴۶۳۔ وابن ماجه ۳۷۱/۱ حديث رقم ۱۱۷۳۔

ترجمہ: حضرت عبدالعزیز بن جریجؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ وتر میں کون کون سی سورتیں تلاوت فرماتے تھے؟ تو امّ المؤمنینؓ نے ارشاد فرمایا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی رکعت میں سبح اسم ربك الاعلی پڑھا کرتے تھے، اور دوسری رکعت میں قل یا ایھا الکافرون اور تیسری رکعت میں قل ھو اللہ احد ومعوذتین پڑھا کرتے تھے۔ اس کو امام ترمذی اور امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

راوئ حدیث:

عبدالعزیز بن جریجؒ ۔ یہ عبدالعزیز بن جریج مکی مشہور تابعی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں۔ فقیہ عبدالملک ان کے بیٹے ہیں اور خصیف ان سے روایت کرتے ہیں۔

''جریج'' جیم کے ضمہ، راء مہملہ کے فتحہ، اور یائے تحتیہ کے سکون کے ساتھ ہے۔

تشریح: ''وعن عبدالعزیز'' مشہور تابعی ہیں۔

''بأی شیءٍ کان یوتر رسول اللّٰہ ﷺ'' ابن حجر رحمہ اللہ نے اس جملہ کی یہ توجیہ کی ہے:

''بای شیء من القرآن یقرأ فی وترہ''

جبکہ اس کی بہتر تعبیر یہ ہے۔

''بای شیء من السور یقرأ فی وترہ''

''وفی الثالثة بقل ھو اللّٰہ احد'' اس جملہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تینوں رکعات ایک سلام کے ساتھ ہوتی تھیں۔ ورنہ حضرت عائشہؓ ''فی رکعته'' کا لفظ استعمال فرماتی۔

''رواہ الترمذی'' امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب قرار دیا ہے۔

۱۲۷۰: وَرَوَاهُ النَّسَائِيُّ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ اَبْزٰى۔

ترجمہ: اور اس روایت کو امام نسائی نے عبدالرحمٰن بن ابزی سے نقل کیا ہے۔

''عن عبدالرحمن بن أبزٰی'' بفتح الهمزة وسکون الموحدة بعد ھاذ زای مقصور۔

قبیلہ خزاعہ سے تعلق رکھنے والے ایک نوعمر صحابی ہیں۔ حضرت علیؓ کی جانب سے خراسان کے گورنر تھے۔

مؤلف فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کا زمانہ پایا ہے اور آپ ﷺ کے پیچھے نماز بھی پڑھی ہے۔ ان سے ان کے بیٹوں نے روایت لی ہے۔

۱۲۷۱: وَرَوَاهُ أَحْمَدُ عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ۔

ترجمہ: امام احمد نے ابی بن کعب سے اس روایت کو نقل کیا ہے۔

۱۲۷۲: وَالدَّارِمِيُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَلَمْ يَذْكُرُوا وَالْمُعَوِّذَتَيْنِ۔

ترجمہ: اور امام دارمی نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے مگر امام دارمی نے اپنی روایت میں لفظ معوذتین ذکر نہیں کیا (یعنی انہوں نے صرف یہ نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ وتر کی تیسری رکعت میں سورہ اخلاص کی قراءت فرماتے تھے"۔

امام احمد اور داری نے معوذتین کا ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے لیکن المعوذتین کا ذکر نہیں کیا۔ حضرت ابی کی حدیث کا اعتماد حضرت عائشہؓ کی حدیث سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ عبدالعزیز بن جریج کو تقریب میں "فیه لین" قرار دیا گیا۔

علامہ عجلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عبدالعزیز بن جریج کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سماع ثابت نہیں۔ خصیف کا صراحت کے ساتھ ان کے سماع کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت کرنا ان کی خطا ہے۔ اس روایت کے ضعف کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ کا بر عمل انہوں نے نقل کیا ہے۔ یہ عمومی عمل کے خلاف ہے کیونکہ اس میں آخری رکعت پہلی دو رکعات سے زیادہ لمبی ہو جائے گی۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ وتر کی تیسری رکعت میں ہمارے اصحاب سے صرف سورۂ اخلاص ہی منقول ہے۔ اگرچہ حدیث کے بعض طرق میں سورۂ اخلاص اور معوذتین کا ذکر آیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی سند میں اس مسئلہ کی حدیث کچھ ان الفاظ میں آئی ہے:

"عن حماد عن ابراهيم عن الاسود عن عائشه قالت كان رسول الله ﷺ يوتر بثلاث يقرأ في الاولى سبح اسم ربك الاعلى وفي الثانية قل يا أيها الكافرون وفي الثالثة قل هو الله احدٌ"

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ وتر تین رکعات ہیں۔

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام حاکم نے شیخین کی شرط پر حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ تین رکعات وتر پڑھتے تھے اور ان کے آخر میں ہی سلام پھیرتے تھے۔

امام نسائی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ وتر کی رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے۔

امام حاکم نے نقل کیا ہے کہ حسن بصری رحمہ اللہ سے یوں کہا گیا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما وتر کی دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرتے تھے۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے زیادہ فقیہ تھے اور وہ دوسری رکعت میں تکبیر کے بعد اٹھ جاتے تھے امام طحاوی رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ابوخالد بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابوالعالیہ سے وتروں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا نبی کریم ﷺ کے صحابہ ہمیں سکھایا کرتے تھے کہ وتر مغرب کی طرح ہیں۔ یہ رات کے

وتر ہیں اور وہ دن کے وتر ہیں۔

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے رات کے وتر دن کے وتروں کی طرح تین رکعات منقول ہیں۔محدثین نے اس حدیث کے مرفوع ہونے کو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ ''اعمش عن ابن مسعود عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' تک صرف یحییٰ ابن أبي الحواجب نے مرفوع کیا اور اسے ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے:

''حدثنا ابو العوام محمد عبد الجبار المرادی حدثنا خالد بن نزار الأیلی حدثنا عبدالرحمٰن بن ابی زیادۃ عن أبیه عن الفقهاء السبعة سعید بن المسیب وعروۃ بن الزبیر، والقاسم بن محمد وأبی بکر بن عبدالرحمٰن وخارجة بن زید وعبید اللّٰه بن عبداللّٰه وسلیمان بن یسار فی مشییخه سواهم اهل فقه وصلاح''

امام طحاویؒ ان تمام اکابر علماء وفقہاء کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''فکان مما وعیت عنهم أن الوتر ثلاث لا یسلم الا فی آخرهن''

''ان سب حضرات کے بارے میں ہمیں یہی معلوم ہے کہ وتر تین ہیں اور صرف آخر میں سلام پھیرا جائے گا۔

مذکورہ تفصیل کی روشنی میں امام نووی کا یہ قول حیرت سے خالی نہیں کہ ایک رکعت وتر جمہور کا مذہب ہے۔

دُعاوتر

۱۲۷۳: وَعَنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ عَلَّمَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَلِمَاتٍ اَقُوْلُهُنَّ فِيْ قُنُوْتِ الْوِتْرِ اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا اَعْطَيْتَ وَقِنِيْ شَرَّمَا قَضَيْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَايُقْضٰى عَلَيْكَ اِنَّهٗ لَايَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ۔

(رواہ الترمذی وابوداود والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱۳۷/۲ حدیث رقم ۱۴۳۰۔ والنسائی ۲۵۰/۳ حدیث رقم ۱۷۵۱۔

ترجمه: حضرت حسن بن علیؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کچھ کلمات سکھائے تا کہ میں ان کو قنوتِ وتر میں پڑھوں۔ ''اے اللہ! مجھے ہدایت دے اُن لوگوں کے ساتھ جن کو تو نے ہدایت دی (یعنی انبیاء کرام) اور مجھے عافیت دے ان لوگوں کے ساتھ جن کو تو نے عافیت دی اور مجھ سے محبت کر ان لوگوں کے ساتھ جو تیرے محبوب ہیں، اور مجھے برکت عطا کر اس مال میں جو کہ تو نے مجھے عطا کیا ہے، اور مجھے ان برائیوں سے بچا جن کا تو نے فیصلہ کیا ہے، بے شک تو جو چاہتا ہے حکم اور فیصلہ کرتا ہے اور تجھ پر حکم اور فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک ذلیل نہیں ہو سکتا وہ شخص جس سے تو محبت رکھتا ہو بابرکت ہے تو اے ہمارے رب! اور تیری ذات بلند و بالا ہے''۔ (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

حسن بن علی رضی اللہ عنہ۔ یہ حضرت حسن علی بن ابی طالب کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی کنیت ''ابو محمد'' ہے۔ رمضان المبارک کی پندرھویں تاریخ کو ۳ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ قول ان تمام اقوال میں سے جو حضرت حسن کی ولادت کے بارے میں لکھے گئے ہیں ۔زیادہ صحیح ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے ہیں اور آپ کے روحانی پھول ہیں۔ جنت کے تمام جوانوں کے سردار ہیں۔ ان کی وفات ۵۰ھ میں واقع ہوئی۔ بعض نے ۵۸ھ اور بعض نے ۴۹ھ کہا ہے اور بعض نے ۴۴ھ بھی کہا ہے۔ جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔ ان سے ان کے بیٹے حسن بن حسن اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور بڑی جماعت نے روایت کیا ہے اور جب کہ ان کے والد بزرگوار حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کوفہ میں شہید کیا گیا تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر چالیس ہزار (۴۰۰۰) افراد نے بیعت علی الموت کی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ بن ابی سفیانؓ کے سپرد خلافت کا کام پندرھویں جمادی الاولیٰ ۴۱ھ میں کیا۔

تشریح: ''علمنی رسول اللہ ﷺ کلمات'' کلمات سے مراد مفید جملے ہیں۔

''أقولهن'' یعنی میں ان کے ذریعہ دعا کروں۔ ''في قنوت الوتر'' ایک روایت میں ''في الوتر'' ہے۔

ظاہری طور پر اس حدیث کا اطلاق پورے سال پر ہو رہا ہے جیسا کہ ہمارا مذہب ہے جب کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وتر میں قنوت پڑھنے کو رمضان کے آخری پندرہ دن کے ساتھ مقید کرتے ہیں۔

''اللهم اهدني'' اس جملہ کے دو معنی ہیں:

① اے اللہ! مجھے ہدایت پر ثابت قدم فرما۔

② اے اللہ! مجھے زیادہ سے زیادہ ہدایت کے اسباب عطا فرما جس کی وجہ سے مجھے کمال کے اعلیٰ مراتب حاصل ہو جائیں۔

''فیمن هدیت'' اس جملہ کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں:

① مجھے ان انبیاء و اولیاء کے زمرے میں داخل فرما جنہیں تو نے ہدایت سے نوازا۔ جیسا کہ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا تھا ''اے اللہ! مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما''۔

② ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے ''اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں داخل فرما جنہیں تو نے صراط مستقیم کی ہدایت عطا فرمائی ہے''۔

③ بعض علماء کا کہنا کہ اس جملہ میں اور اس کے بعد والے جملوں میں فی، مع کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''فاولئك مع الذين أنعم الله عليهم'' (النساء۔۶۹) ''یہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا''۔

''وعافنی فیمن عافیت'' یعنی مجھے بری عادات، اخلاق اور خواہشات کے چنگل سے آزادی نصیب فرما۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''مجھے عافیت عطا فرما جو مجھے برائی سے دور کر دے''۔

''وتولنی فیمن تولیت'' یعنی میرے معاملات کا نگہبان بن جا اور مجھے ان لوگوں کے زمرے میں داخل کر دے جنہیں تو نے اپنا قرب عطا کر کے فضیلت بخشی ہے۔

ابن ملک نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ مجھے ان لوگوں کے زمرے میں داخل کر دے جن سے تو محبت کرتا ہے۔ اور ان کے امور کی نگہبانی کرتا ہے۔

علامہ مظہرؒ نے تولنی کا معنی بیان کیا ''کسی سے محبت کرنا، اس کی حفاظت کرنا اور اس کے معاملات کی نگہبانی کرنا''۔

''**وبارك لى فيما أعطيت**'' یعنی جو عمر، مال، علوم اور اعمال تو نے مجھے عطا فرمائے ہیں ان میں برکت اور خیر کثیر عطا فرما۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''اس جملہ میں ''في'' پچھلے جملہ کی طرح نہیں ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ دارین کی نعمتوں میں جو تو نے مجھے عطا فرمائی ہیں اس میں برکت عطا فرما''۔ اور ''**فيمن هديت**'' کا معنی یہ ہے کہ انبیاء اور اولیاء میں سے جن لوگوں کو تو نے ہدایت عطا کی ہے مجھے بھی ان میں شامل فرما اور ہدایت کا کثیر حصہ مجھے عطا فرما۔

''**وقنى شر ما قضيت**'' یعنی تجھ سے دوستی رکھنے حقیقتاً یا صورتاً ذلیل نہیں ہوسکتا۔ بعض روایات میں ''**لا يعز من عاديت**'' کے الفاظ بھی موجود ہیں۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے:

''تیرے بندوں میں تجھ سے تعلق اور دوستی رکھنے والا آخرت یا دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل نہیں ہوسکتا خواہ اس پر کتنی ہی آزمائشیں آئیں اور اس پر ایک شخص مسلط ہو جو اسے ذلیل کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے اولیاء کے نزدیک عزت ورفعت کی انتہا یہی ہے اور اصل اعتبار تو انہی کا ہے اسی وجہ سے انبیاء کرام علیہم السلام پر بڑے مشکل اور بڑے امتحانات آئے۔ جیسے حضرت زکریا علیہ السلام کو آرے سے چیرا گیا اور ان کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ذبح کر دیا گیا''۔

طبرانی نے مختلف طرق سے **ولا يعز من عاديت** کا اضافہ نقل کیا ہے یعنی دنیا و آخرت میں وہ شخص عزت نہیں پا سکتا جو اللہ تعالیٰ سے دشمنی رکھے خواہ اسے دنیا کی نعمتیں اور بادشاہت عطا کی گئی ہو کیونکہ وہ اللہ کے اوامر پر عمل نہیں کرتا تھا اور اس کی منع کردہ باتوں سے نہیں بچتا تھا۔

ابن ابی عاصم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں اس کے بعد **نستغفرك ونتوب اليك** کا ذکر بھی موجود ہے۔

''**وتعاليت**'' اس جملہ کے معنی میں دو قول ہیں:

① اللہ تعالیٰ کی عظمت، قدرت اور قہر ساری کائنات پر حاوی ہے۔

② اللہ تعالیٰ ہر شے کی مشابہت سے بالاتر ہے۔

''**رواه الترمذى ابوداؤد والنسائى وابن ماجه والدارمى**'' تصحیح میں ہے کہ احمد، ابن حبان، ابن ابی شیبہ اور حاکم رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے اور قنوت کے باب میں ہمیں اس سے بہتر حدیث کوئی نہیں ملی۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت میں ذکر کیا ہے محمد ابن الحنفیہ فرماتے تھے کہ میرے والد فجر کی نماز میں دعا مانگا کرتے تھے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ ہی نے ابن عباسؓ کے طریق سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی قنوت میں پڑھنے کیلئے ہمیں یہ دعا سکھایا کرتے تھے۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ صبح کی نماز اور رات کے وتروں میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دعا کی تعلیم وتر اور صبح کے قنوت کیلئے تھی۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس میں پر تین اختلاف ہیں، پہلا یہ کہ جب وتر میں دعاء قنوت پڑھے۔تو رکوع سے پہلے پڑھے یا رکوع کے بعد۔دوسرا اختلاف یہ ہے کہ وتروں میں دعاء قنوت پورا سال پڑھی جائے گی یا رمضان کے آخری پندرہ دن میں۔تیسرا اختلاف اس بارے میں ہے کہ وتر کے علاوہ کسی نماز میں دعاء قنوت پڑھی جائے گی یا نہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک وتروں میں دعا قنوت رکوع کے بعد پڑھی جائے گی جبکہ احناف کا مسلک یہ ہے کہ دعاء قنوت رکوع سے پہلے پڑھی جائے گی۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی دلیل امام حاکم کی حسن بن علیؓ سے نقل کردہ یہ حدیث ہے:

”علمنی رسول اللہ ﷺ کلمات اقولھن فی وتری اذا رفعت رأسی ولم یبق الا السجود“

امام حاکم رحمہ اللہ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

ہماری دلیل ابن ماجہ اور نسائی کی ذکر کردہ یہ روایت ہے، حضرت ابی بن کعبؓ راوی ہیں:

”ان رسول اللہ ﷺ کان یوتر فیقنت قبل الرکوع“۔

خطیب نے کتاب القلوب میں ابن مسعود سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ رکوع سے پہلے دعاء قنوت پڑھا کرتے تھے۔

ابن جوزی نے بھی تحقیق میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔

ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تین رکعات وتر پڑھی اور رکوع سے پہلے دعاء قنوت پڑھی۔

طبرانی نے اوسط میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ تین رکعات وتر پڑھا کرتے تھے اور رکوع سے پہلے دعا قنوت پڑھتے تھے۔

حضرت انسؓ کی جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ رکوع کے بعد دعاء قنوت پڑھتے تھے۔اس کی تاویل یہ ہے کہ یہ صرف ایک مہینہ ہوا تھا۔اس کی دلیل باب القنوت میں آجائے گی۔صحیح بات یہ ہے کہ اکثر صحابہ کرام کا عمل فقہ حنفی کے مسلک کے مطابق تھا۔

ابن ابی شیبہؒ نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور نبی کریم ﷺ کے صحابہ وتر میں رکوع سے پہلے دعاء قنوت پڑھا کرتے تھے۔

جب رکوع سے پہلے قنوت کے پڑھنے کا معاملہ راجح ہو گیا تو اب رکوع کا مابعد محل قنوت نہیں ہے۔اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اگر کوئی شخص دعاء قنوت پڑھنا بھول جائے اور پھر اگر اسے اعتدال کے بعد (یعنی قومہ میں) یاد آئے تو دعا قنوت نہیں پڑھے گا اور اگر رکوع کی حالت میں یاد آیا تو اس بارے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے دو روایتیں ہیں۔ایک یہ کہ دعاء قنوت نہ پڑھے گا اور دوسری روایت میں یہ ہے کہ واپس قیام میں لوٹ آئے اور دعاء قنوت پڑھے۔فتاویٰ قاضی خان میں اس

بارے میں درج ذیل حکم آیا ہے:

''صحیح یہ ہے کہ نہ رکوع میں دعاء قنوت پڑھنے گا اور نہ قیام کی طرف لوٹے گا اگر وہ قیام کی طرف لوٹا اور اس نے دعاء قنوت پڑھی اور رکوع کا اعادہ نہ کیا تو نماز فاسد نہ ہوگی کیونکہ اس کا رکوع قائم ہے۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ دو رکعتوں کا مسبوق اگر تیسری رکعت میں امام کے ساتھ دعاء قنوت پڑھے تو وہ دوسری مرتبہ دعاء قنوت نہیں پڑھے گا۔ اگر امام مقتدی سے آگے نکل جائے اور رکوع کر لے، اگر مقتدی قنوت سے ابھی فارغ نہیں ہوا تو پھر بھی امام کی متابعت کرے۔ اگر امام نے دعاء قنوت پڑھے بغیر رکوع کر لیا جبکہ مقتدی نے بھی دعاء قنوت نہ پڑھی تھی۔ تو اگر اسے رکوع کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو تو رکوع کر لے وگرنہ دعاء قنوت پڑھنے کے بعد رکوع کرے''۔

دوسرے دونوں اختلافوں کو ہم باب القنوت میں ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قنوت رمضان کے دوسرے نصف کے ساتھ خاص ہے۔ کیونکہ حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ سنت یہ ہے کہ جب آدھا رمضان گزر جائے تو وتر میں **سمع اللہ لمن حمدہ** کے بعد کفار پر لعنت کی جائے۔ اسی وجہ سے لوگ جب حضرت اُبی کے پاس جمع ہوتے تو وہ انہیں آدھے نصف تک دعاء قنوت نہ پڑھاتے تھے۔ اس روایت کو ابوداؤد نے بھی نقل کیا ہے۔ اس روایت کے بارے میں حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض ہے کہ جس حدیث کو انہوں نے صحیح قرار دیا ہے وہ غریب اور مردود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ طرق متعددہ سے مروی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ متعدد طرق سے منقول ہونا صحت کو لازم نہیں کرتا۔ اگر اس کو صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ کفار کے غلبہ کی حالت میں قنوت پر محمول ہوگی اور یہ اس قنوت کے منافی نہیں ہے جو پورا سال پڑھا جائے۔ واللہ اعلم۔

صلوٰۃِ وتر کے بعد کی تسبیح

۱۲۷۴: وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا سَلَّمَ فِی الْوِتْرِ قَالَ سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْقُدُّوْسِ رواہ ابوداود والنسائی وزاد ثَلَاثَ مَرَّاتٍ یُطِیْلُ فی آخرھن۔

سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب فی الدعاء بعد الوتر، ح ۱۲۱۸

ترجمہ: سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب وتر کی نماز کا سلام پھیرتے تو یہ فرماتے ''سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْقُدُّوْسِ'' یعنی پاک ہے بادشاہ نہایت پاک'' (ابوداؤد، نسائی) نسائی نے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تسبیح تین مرتبہ فرماتے تھے اور تیسری مرتبہ بآوازِ بلند فرماتے تھے''۔

تشریح: ''اذا سلّم فی الوتر'' ایک نسخہ میں من الوتر کے الفاظ ہیں۔

''سبحان الملک القدوس'' بعض حضرات نے ''رب الملائکہ والروح'' کا اضافہ کیا ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق حدیث میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قدوس سے مراد وہ ذات ہے جو عیوب اور نقائص سے پاک اور منزہ ہو۔ فعول (ضمہ کے

ساتھ) مبالغہ کے صیغوں میں سے ہے۔

علامہ میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ امام نسائی کے ہیں۔ دارقطنی اور ابن ابی شیبہؒ نے ''رب الملائكة والروح'' کا اضافہ کیا ہے۔

۱۲۷۵: وَفِيْ رواية لِلنِّسَآئِ عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ ابْنِ اَبْزٰى عَنْ اَبِيْهِ قَالَ كَانَ يَقُوْلُ اِذَا سَلَّمَ سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ ثَلَاثًا وَّ يَرْفَعُ صَوْتَهُ بِالثَّالِثَةِ۔

ترجمہ: نیز نسائی نے ایک روایت عبدالرحمٰن بن ابزیٰ سے نقل کی ہے جس میں وہ یعنی عبدالرحمٰن اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیر لیتے تو تین مرتبہ "سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ" فرماتے اور تیسری مرتبہ میں آواز بلند فرماتے۔

تشریح: ''وفي رواية اللنسائي عن عبدالرحمٰن بن أبزى عن أبيه'' علامہ میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ درست عبارت یہ ہے:

''عن ابن عبدالرحمٰن بن أبزى عن أبيه''

''ويرفع صوته بالثالثة'' ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس روایت کو امام احمد، دارقطنی نے بھی نقل کیا ہے۔

علامہ مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ اگر ریاء سے پاک ہو کر بلند آواز سے سامعین کی تعلیم اور انہیں غفلت کی نیند سے جگانے کیلئے بلند آواز سے ذکر کرنا جائز ہے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ جہاں تک ذکر کی آواز پہنچے وہاں تک موجود ہر حیوان، شجر و حجر تک اس کی برکت پہنچ جائے اور دوسرے بھی اس خیر کی اقتداء کریں۔ نیز خشک و تر چیز جو اس کی آواز سن رہی ہے۔ اس کے حق میں گواہی دے۔

بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ ذکر کو آہستہ آواز سے کرنا مستحق ہے کیونکہ یہ ریاء سے بہت بعید ہے۔ اس بات کا تعلق نیت کے ساتھ ہے۔

صلوٰۃ وتر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا بھی پڑھتے تھے

۱۲۷۶: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُوْلُ فِيْ اٰخِرِ وِتْرِهٖ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِرِضَآئِكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْكَ لَا اُحْصِيْ ثَنَآءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ۔

(رواه ابوداود والترمذى والنسائى وابن ماجة)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱۳۴/۲ حديث رقم ۱۴۲۷۔ وابن ماجه ۳۷۳/۱ حديث رقم ۱۱۷۹۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وتر کی نماز کے آخر میں یہ دعا پڑھا کرتے تھے "اے اللہ! میں تیری رضا کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں تیرے غصے سے اور میں تیری معافی کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں تیرے عذاب سے، اور میں تیرے ساتھ پناہ چاہتا ہوں تجھ سے (یعنی تیری صفات غضبیہ کے ظہور سے)، میں تیری تعریف کا شمار نہیں کر سکتا تو ویسے

ہے جیسے کہ تو نے اپنی تعریف خود کی"۔ (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: "کان یقول فی اخر وترہ" یعنی سلام کے بعد، علامہ میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نسائی کی ایک روایت میں ہے:

"کان یقول اذا فرغ من صلاته وتبوأ مضجعه"۔

"اللهم انی أعوذ برضاك" رضاك سے مراد تمام صفات جمالیہ ہیں۔

"من سخطك" سخطك سے مراد صفات جلالیہ ہیں۔

"وبمعا فاتك" اس سے مراد افعال اکرام وانعام ہیں۔ "من عقوبتك" اس سے مراد افعال غضب وانتقام ہیں۔

"وأعوذبك منك" ای بذاتك من اثار صفاتك" اس میں اللہ کے مندرجہ ذیل اقوال کی طرف اشارہ ہے۔

① ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَه﴾ [آل عمران۔ ۲۸] اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے۔

② ففروا الی الله "(الزاریات۔۵۰) اللہ کی طرف دوڑو۔

③ ﴿وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾ [المزمل۔ ۸] ہر طرف سے یکسو ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

صوفیہ کی اصطلاح کے مطابق پہلے جملہ میں توحید صفات، دوسرے جملہ میں توحید افعال اور تیسرے جملہ میں توحید ذات کی طرف اشارہ ہے۔

اس بارے میں امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض روایات میں فقرۂ ثانیہ، فقرۂ اولیٰ سے مقدم ہے جو کہ زیادہ مناسب ہے۔ اگر واؤ مطلق جمع کیلئے ہوا اس لیے کہ ترتیب لفظی کا تناسب معنوی میں خاص اثر رکھتی ہے۔ اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحقق افعال، ثبوت صفات کے بعد ہوتا ہے۔ پس ان دونوں کی حیثیت اصل اور نوع کی سی ہے اور اصل کا مقدم ہونا ہی اصل ہے ان دونوں کو توحید ذاتی پر مقدم رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں خارج میں توحید ذاتی سے مقدم ہیں۔

"لا أحصی ثناء علیك" یعنی میں تیری تعریف کی طاقت نہیں رکھتا اور میں حصر اور عدد کے اعتبار سے اس تک نہیں پہنچ سکتا۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض حضرات نے لا احصی سے پہلے سبحانك کا اضافہ کیا۔ حدیث میں اس کی کوئی اصل میری نگاہ سے نہیں گزری۔

"أنت کما أثنیت علی نفسك" ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اللہ کی ذات کے حق اور اس کی تعریف تک نہ پہنچنے پر استغفار کا معنی پایا جاتا ہے۔

نسائی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

"لا أحصی ثناء علیك ولو حرصت، ولكن أنت كما أثنیت علی نفسك"

علامہ میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے "کما" میں کاف کو زائد قرار دیا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا "انت الذی أثنیت علی نفسك" بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ کما کا ما موصوفہ یا موصولہ ہے اور کاف مثل کے معنی میں ہے۔ معنی

یہ ہوگا ''تو ہی وہ ذات ہے جسے جلال واکرام کی صفات حاصل ہیں وہ علم شامل اور قدرتِ کاملہ کی مالک ہے۔ تو اپنی تعریف کے احصاء پر قادر ہے۔ یہ تعریف خواہ فعل سے ہو یا قول سے۔

''رواہ ابو داؤدو والترمذی والنسائی وابن ماجۃ'' علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے حسن غریب قرار دیا ہے نیز طبرانی اور ابن ابی شیبہ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وجوب قنوت کے اثبات کی ضرورت ہے اور یہ اثبات صیغہ امر کے ثبوت پر موقوف ہے۔ یعنی صاحبِ ہدایہ کا قول ''اجعل ھذا فی وترك'' میرے نزدیک ثابت نہیں۔ بعض حضرات نے احادیث سے معلوم ہونے والی مواظبت کے ذریعہ وجوبِ قنوت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بات بھی اس کے غیر مقرونۃ بالترک ہونے پر موقوف ہے لیکن مطلق مواظبت مقرونہ بھی ہوتی ہے اور غیر مقرونۃ بالترک بھی۔ اور اعم کی اخص پر کوئی دلالت ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ان کلمات کا واجب لعینہٖ ہونا یا دوسرے کلمات سے اولیٰ ہونا لازم آئے گا حالانکہ احناف کے نزدیک ثابت شدہ کلمات اس روایت کے ہے جسے امام ابوداؤد نے مراسیل میں ذکر کیا ہے۔ حضرت حضرت خالد بن عمرانؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قبیلہ حضر پر بددعا فرما رہے تھے۔ کہ جبرئیلؑ حاضرِ خدمت ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاموش ہوجانے کا اشارہ کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہوتے۔ حضرت جبرئیل نے آپ کو برا بھلا کہنے والا اور لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا۔ پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی: ''لیس من الامر شئی'' پھر آپ کو قنوت کی یہ دعا سکھائی:

''**اللھم ان نستعینك ونستغفرك ونؤمن بك ونخضع لك ونخلع ونترك من یکفرك اللھم ایاك نعبد ولك نصلی ونسجدوا الیك نسعی ونحفدو نراجو رحمتك ونخاف عذابك ان عذابك الجد بالکفار ملحق**''

علامہ سیوطی نے درمنثور میں ذکر کیا ہے کہ امام بیہقی نے اس روایت کو ان الفاظ کے ساتھ معاویہ بن صالح کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔

حصن حصین میں یہ دعا ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے:

''**اللھم انا نستعینك ونستغفرك ونثنی علیك الخیر ولا نکفرك ونخلع ونترك من یفجرك اللھم ایاك نعبد ولك نصلی ونسجد والك نسعی ونحفدو نخشی عذابك ونرجو رحمتك ان عذابك الجد بالکفار ملحق**''۔

ابن ابی شیبہ نے اسے موقوفاً ابن مسعود سے اور ابن السنی نے موقوفاً ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ بعض مشائخ سے منقول ہے کہ دعاءِ قنوت کے الفاظ مخصوص نہیں کیونکہ الفاظ کی تعیین کی صورت میں دل کا اخلاص ورغبت شامل حال نہ رہیں گے اور مقصود حاصل نہ ہوگا۔

دوسرے بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ یہ حکم ''اللھم انا نستعینك'' کے علاوہ کا ہے۔ کیونکہ صحابہ کا اس پر اتفاق ہے۔ اگر اس نے اس کے علاوہ بھی پڑھا تو جائز ہے ~~بہتر یہ ہے کہ~~ اس کے بعد قنوتِ حسن پڑھے۔

جو شخص دعاء قنوت نہ پڑھ سکتا ہو تو اسے چاہیے کہ "ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار" پڑھے۔

ابواللیث فرماتے ہیں تین مرتبہ اللهم اغفر لی پڑھ لے۔

الفصل الثالث:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک رکعت وتر پڑھنا

۱۲۷۷: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قِيْلَ لَهُ هَلْ لَّكَ فِيْ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ مُعَاوِيَةَ مَا اَوْتَرَ اِلَّا بِوَاحِدَةٍ قَالَ اَصَابَ اِنَّهٗ فَقِيْهٌ وَّفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ ابْنُ اَبِيْ مُلَيْكَةَ اَوْتَرَ مُعَاوِيَةُ بَعْدَ الْعِشَاءِ بِرَكْعَةٍ وَعِنْدَهٗ مَوْلًى لِابْنِ عَبَّاسٍ فَاَتَى ابْنَ عَبَّاسٍ فَاَخْبَرَهٗ فَقَالَ دَعْهُ فَاِنَّهٗ قَدْ صَحِبَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰۳/۷۔ حديث رقم ۳۷٦٥۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ آپ حضرت امیر معاویہؓ کے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں جو کہ وتر کی صرف ایک رکعت پڑھتے ہیں تو فرمایا وہ درست ہیں اس لئے کہ وہ فقیہ ہیں۔ ایک دوسری روایت میں منقول ہے کہ حضرت ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ نے عشاء کے بعد ایک رکعت وتر کی نماز پڑھی اور ان کے پاس حضرت ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، پس وہ جب ابن عباسؓ کے پاس تشریف لائے تو ان کو خبر دی کہ حضرت امیر معاویہؓ وتر کی ایک ہی رکعت پڑھتے ہیں تو ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اُن کو چھوڑیں (یعنی ایسی بات ان کے بارے میں نہ کریں) کیونکہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میسر ہوئی ہے۔ (بخاریؒ)

تشریح: "هل لك" یعنی کوئی جواب یا فتوی اس کے بارے میں آپ کے پاس ہے۔

"ما أوتر الا ابواحدة" اس کا ظاہر یہ ہے کہ انہوں نے ایک ہی رکعت پر اکتفاء کیا، جبکہ کلام میں اس کا بھی احتمال موجود ہے کہ انہوں نے اس ایک رکعت کو پہلے کی دو رکعتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا ہو۔ دوسری صورت میں ان پر انکار یا تو اس اعتبار سے ہوگا کہ انہوں نے وتروں پر اکتفا کیا اور تہجد کی نماز نہیں پڑھی یا اس اعتبار سے کہ انہوں نے عشاء کی سنتوں کو چھوڑ دیا۔ واللہ اعلم۔

"أصاب" یعنی انہوں نے اپنے اجتہاد کا ثواب پا لیا۔

"انه فقيه" یعنی وہ مجتہد ہیں اور مجتہد کو اس کے اجتہاد کا ثواب ملتا ہے خواہ اس سے خطا ہی کیوں نہ ہو جائے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی بنا پر (یعنی حضرت معاویہؓ کے مجتہد ہونے کی بنا پر) جب وہ سنتے کہ کسی فقیہ نے خلاف سنت کوئی بات کی ہے تو منبر پر چڑھ جاتے اور فرماتے "اے مدینہ والو! تمہارے علماء کہاں ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے یا انہیں اس طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے"

"مولى لابن عباس" علامہ میرکؒ نے شیخ کریب سے نقل کیا ہے کہ محمد بن نصر امروزیؒ نے کتاب الوتر میں اس روایت

کو نقل کیا ہے۔

انہوں نے اس روایت کو علی بن عبداللہ بن عباس کے طریق سے بھی روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کو یہ عمل کرتے ہوئے دیکھا تو اپنے والد سے سوال کیا۔ پہلی روایت میں ''قيل لابن عباس'' سے یہی مراد ہے۔

''فقال دعه'' یعنی اس معاملہ کو چھوڑ دو اور انکار کر کے ان پر اعتراض نہ کرو۔

''فانه قد صحب النبی ﷺ'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس قول کا منشا یہ ہے کہ وہ صحابی رسول ہیں اس لئے وہ صرف وہی عمل کریں گے جو ثابت ہیں۔ شاید یہ عمل ان کے نزدیک ثابت شدہ ہوگا۔ اور رسول اللہ ﷺ کے سارے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں جس کی اقتداء بھی کی جائے گی ہدایت ملے گی۔ وہ سارے کے سارے عدول ہیں وہ اپنی طرف سے کوئی عمل نہیں کرتے۔ لیکن یہ حدیث اس بارے میں صریح ہے کہ حضرت معاویہؓ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے منفرد ہیں اسی وجہ سے ابن عباسؓ نے ان کا انکار فرمایا۔ اس کی تائید پہلے ذکر کردہ اجماع مسلمین سے بھی ہوتی ہے۔

وتر نہ پڑھنے والے کے بارے میں وعید نبوی ﷺ

۱۲۷۸: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلْوِتْرُ حَقٌّ فَمَنْ لَّمْ يُوْتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا اَلْوِتْرُ حَقٌّ فَمَنْ لَّمْ يُوْتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا اَلْوِتْرُ حَقٌّ فَمَنْ لَّمْ يُوْتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا۔ (رواه ابو داود)

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وتر حق ہیں یعنی لازم ہیں جو آدمی وتر نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں۔ وتر حق ہے جو شخص وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔ وتر حق ہے جو شخص وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں (یعنی ایسا شخص ہمارا تابعدار نہیں)۔ (ابو داؤد)

أخرجه أبو داؤد فی السنن ۲/۱۲۹ حديث رقم ۱۴۱۹۔

تشریح: ''يقول الوتر حق'' حق سے مراد واجب ہے جیسا ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

''فليس منا'' یعنی ہمارے متبعین میں سے نہیں۔ ہم فلیس منا کو اس بات پر محمول کریں گے وہ ہمارے طریقہ اور ہماری سنت پر نہیں ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اس جملہ میں من اتصالیہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول: ''المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض'' اسی طرح نبی کریم ﷺ کا قول ''فانی لست منك ولست منی'' پس فليس منا کا معنی یہ ہوگا کہ جو شخص وتر نہ پڑھے وہ ہمارے رستے پر نہیں ہے۔ یعنی وتر شریعت میں ثابت ہیں اور سنت مؤکدہ ہیں اور جملوں کا تکرار اس کی حقیقت کے ثبوت کیلئے ہے۔ اس سے امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کا اثبات بھی ہوتا ہے۔ اور وجوب کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہ کے مسلک کا بھی''۔

بعض اوقات لیس منا غیر واجب کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے نبی کریم ﷺ کا قول: ''ليس منامن استنجى من الريح''

یہ لفظ فرض کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا قول۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ﴾[الانعام: ۱۵۹]
اور ہم وجوب وتر کے قائل دلیل ظنی کی وجہ سے ہے۔
(رواہ ابو داوٗد) علامہ میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد امام حاکم نے بھی اسے نقل کیا اور اسے صحیح الاسناد قرار دیا ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ کے قول کو ائمہ نے ضعیف قرار دیا ہے اور امام حاکم کی تصحیح کو رد کیا۔

فرض کی طرح وتر کی بھی قضا واجب ہے

۱۲۷۹: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ نَّامَ عَنِ الْوِتْرِ اَوْ نَسِیَهٗ فَلْیُصَلِّ اِذَا ذَکَرَ وَاِذَا اسْتَیْقَظَ۔ (رواه الترمذی وابوداود وابن ماجة)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲/۱۳۷ حدیث رقم ۱٤۳۱۔ والترمذی ۲/۳۳۰ حدیث رقم ٤٦٥ وابن ماجه ۱/۳۷۵ حدیث رقم ۱۱۸۸۔

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص وتر پڑھے بغیر سو جائے یا وتر پڑھنا بھول جائے تو اس کو چاہیے کہ جب اس کو یاد آئے یا بیدار ہو جائے تو اس کو پڑھ لے۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح: "او نسیه فلیصل" یعنی قضا پڑھ لے۔ قضا وجوب کی علامت ہے۔
"اذا ذکر" یہ نسیان کی طرف راجع ہے۔ "واذا استیقظ" یہ نوم کی طرف راجع ہے۔
واؤ "اَو" کے معنی میں ہے اور ترتیب سامع کی رائے کے پیش نظر ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا مسائل کے جواب میں محتاط انداز

۱۲۸۰: وَعَنْ مَّالِكٍ بَلَغَهٗ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ ابْنَ عُمَرَ عَنِ الْوِتْرِ اَوَاجِبٌ هُوَ؟ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ قَدْ اَوْتَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَوْتَرَ الْمُسْلِمُوْنَ فَجَعَلَ الرَّجُلُ یُرَدِّدُ عَلَیْهِ وَعَبْدُاللّٰهِ یَقُوْلُ اَوْتَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَوْتَرَ الْمُسْلِمُوْنَ۔ (رواه فی الموطأ)

أخرجه مالك فی الموطأ ۱/۱۲٤ حدیث رقم ۱۷ من کتاب صلاة اللیل۔

ترجمہ: حضرت امام مالکؒ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ پوچھا کہ کیا وتر کی نماز واجب ہے؟ تو حضرتؓ نے فرمایا کہ وتر کی نماز آنحضرت ﷺ نے بھی پڑھی ہے اور دیگر مسلمانوں نے بھی پڑھی ہے (یعنی صحابہ کرام نے)۔ وہ شخص بار بار یہ سوال دہراتا رہا اور ابن عمر رضی اللہ عنہما یہی جواب ارشاد فرماتے رہے کہ حضور ﷺ نے بھی وتر کی نماز پڑھی ہے اور دیگر مسلمانوں نے بھی پڑھی ہے۔ (مؤطا امام مالک)

تشریح: "أوتر رسول الله ﷺ وأوتر المسلمون" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے دلیل کے ذریعہ محمول کے بیان پر اکتفا کیا ہے گویا کہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وتر واجب ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی مواظبت اور اہل اسلام کے اجماع کی وجہ سے۔
"فجعل الرجال یرد علیه" یعنی آدمی نے صریح جواب کو طلب کیا اور اشارہ پر اکتفا نہ کیا۔

"وعبد الله يقول أوتر رسول اللهﷺ وأوتر المسلمون" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے احتیاط کا پہلو اختیار کیا اور صراحت کے ساتھ جواب نہ دیا کیونکہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلہ میں کوئی حکم نہ سنا تھا۔ یہ طریق زیادہ احتیاط والا ہے اور صوفیہ کا طرز عمل بھی یہی ہے کہ وہ ثابت شدہ عمل کو ہمیشگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ اس بحث میں نہیں پڑتے کہ یہ عمل فرض ہے یا مستحب، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ جس عمل کو واجب ہونے کے اعتقاد کے ساتھ کیا جائے اس کا ثواب سنیت کے اعتقاد سے زیادہ ہوتا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے جواب کی تلخیص یہ ہے کہ میں قطعی طور پر اس کے وجوب یا عدم وجوب کا فیصلہ نہیں کرتا۔ اگر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی مواظبت کو دیکھوں تو یہ واجب معلوم ہوتے ہیں اور اگر میں اس کے بارے میں نص کو تلاش کروں تو مجھے اس قول سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے پہلی شق کو لیا اور ہم اس کے وجوب کے قائل ہیں اگر ہمیں اس بارے میں قطعی دلیل مل جائے تو ہم اس کے فرضیت کا قول کریں گے اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ نہیں تھا کہ وہ یہ فرماتے یہ فرض یا واجب یا سنت ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ ائمہ کا اختلاف رحمت ہے۔ لیکن اصولیین کے نزدیک اصل چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مواظبت اور خاص طور پر اس کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی مواظبت بھی مل جائے تو یہ وجوب کی دلیل ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کیلئے وجوب وتر میں یہ دلیل ہی کافی ہے۔

ایک رکعت میں ایک سورت سے زائد بھی پڑھی جاسکتی ہیں

۱۲۸۱: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ بِثَلَاثٍ يَقْرَأُ فِيْهِنَّ بِتِسْعِ سُوَرٍ مِّنَ الْمُفَصَّلِ يَقْرَأُ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ بِثَلَاثِ سُوَرٍ اٰخِرُهُنَّ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/۳۲۳ حديث رقم ٤٦٠۔

ترجمہ: حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی تین رکعتیں پڑھتے تھے، اور ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مفصل کی نو/۹ سورتیں اس انداز میں قراءت فرماتے تھے کہ ہر رکعت میں تین تین سورتیں تلاوت فرماتے تھے اور آخر میں پڑھی جانے والی سورت قل هو الله احد ہوتی تھی۔ (ترمذی)

تشریح: "كان رسول اللهﷺ يوتر بثلاث" یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعات وتر پڑھتے تھے۔

"يقرأ فی كل ركعة بثلاث سور اخرهنّ قل هو الله أحد" ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ میں یہ احتمال بھی ہے کہ ان تینوں رکعات میں دو سورتیں پڑھتے تھے اور اختتام سورہ اخلاص پر فرماتے تھے اور یہ احتمال بھی ہے کہ صرف آخری رکعت میں سورۂ اخلاص پڑھتے تھے۔ پہلا معنی لینے کی صورت میں معلوم ہوتا ہے کہ ایک سورت کو دو رکعتوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔

بظاہر پہلا معنی ہی متبادر ہے اور دوسرا معنی مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ایک ضمیر ماننی پڑے گی جو السور التسع کی طرف لوٹے گی۔ جو کہ بہت بعید ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ

۱۲۸۲: وَعَنْ نَّافِعٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ ابْنِ عُمَرَ بِمَكَّةَ وَالسَّمَآءُ مُغِيْمَةٌ فَخَشِيَ الصُّبْحَ فَاَوْتَرَ بِوَاحِدَةٍ ثُمَّ انْكَشَفَ فَرَاٰى اَنَّ عَلَيْهِ لَيْلاً فَشَفَعَ بِوَاحِدَةٍ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ فَلَمَّاخَشِيَ الصُّبْحَ اَوْتَرَبِوَاحِدَةٍ۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ١/١٢٥ حديث رقم ١٩ من كتاب صلاة الليل ۔

ترجمہ: حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ مکہ میں تھا اور آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا یعنی مطلع ابر آلود تھا، پس ابن عمر رضی اللہ عنہما کو صبح ہو جانے کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے ایک رکعت وتر پڑھ لی۔ پھر مطلع ساف ہو گیا اور آپؓ نے دیکھا کہ کافی رات باقی ہے، پس آپؓ نے ایک رکعت اور پڑھ کے اس کو دوگانہ کر دیا پھر دو دو رکعت کر کے نوافل پڑھتے رہے یہاں تک کہ جب صبح ہونے کا اندیشہ ہوا تو وتر کی ایک رکعت پڑھ لی۔ (امام مالکؒ)

تشریح: ''والسماء مغيمه'' اس کے اعراب میں مختلف احتمال ہیں:

① بضم الميم الاولى و كسر الثانية ''نسخہ صحیحہ میں یوں ہی ہے۔

② ''مغيمة'' بکسر الیاء المشددہ۔

③ مغيمه، بفتح الياء المشدده ۔

④ مغيمة ۔ بضم الميم و كسرا الياء۔

⑤ مضيمة ۔ بكسر الغين۔

⑥ مغماة، مشددة و مخففة۔

⑦ مغميمة كمرضية ۔

ان تمام کا معنی ایک ہی ہے۔

''فرأى أن عليه ليلاً فشفع بواحدة'' ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک رکعت ملائی تا کہ نماز دو رکعات بن جائے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''اجعلوا اخر صلاتكم بالليل وترًا''

''رات میں اپنی آخری نماز وتر کو بناؤ''۔

اس حدیث میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے نماز سے نکلنے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ وگرنہ وتر کا تکرار لازم آتا جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

''لا وتر ان فی ليلة''۔ ''ایک رات میں دو وتر نہیں ہیں''۔

جس معنی پر حدیث کو ہم نے محمول کیا ہے اس معنی سے ابن حجر رحمہ اللہ لاعلم رہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اکثر صحابہ نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور دونوں حدیثوں پر عمل کیا ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ دوسری حدیث پر عمل کرتے ہوئے وتروں کا اعادہ نہ کیا جائے اور مذکورہ کیفیت پر وتروں کو توڑتا دونوں حدیثوں کے معنی سے خارج ہے پس اس کو خاص کرنے کیلئے کسی دلیل کی ضرورت ہے اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کا فعل ہمارے نزدیک حجت نہیں کیونکہ انہوں نے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ یہ ان کا اپنا اجتہاد ہے اور ان کا اجتہاد کسی دوسرے کیلئے حجت نہیں''۔

میں کہتا ہوں کہ ان کا اجتہاد ہمارے نزدیک حجت ہے۔

ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جو شخص سونے سے پہلے وتر پڑھ لے پھر رات کو اٹھ کر نماز پڑھے تو دوبارہ وتر نہ پڑھے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہیں۔ البتہ یہ شخص ایک مستحب عمل کو چھوڑنے والا ہوگا جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے ''رات میں اپنی آخری نماز وتر کو بناؤ''۔ اس لئے کہ پہلی نماز کو نفل بھی نہیں بنا سکتا کیونکہ ایک یا تین رکعت نفل پڑھنا ممنوع ہے''۔

فلما خشي الصبح اوتر بواحدة ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا مذہب ایک رکعت وتر پڑھنے کا تھا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے زیادہ فقیہ تھے اور وہ تین رکعت پڑھا کرتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹھ کر نماز شروع کرنا پھر کھڑے ہو جانا

۱۲۸۳: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْ جَالِسًا فَيَقْرَأُ وَهُوَ جَالِسٌ فَاِذَا بَقِيَ مِنْ قِرَاءَتِهٖ قَدْرَ مَا يَكُوْنُ ثَلَاثِيْنَ اَوْ اَرْبَعِيْنَ اٰيَةً قَامَ وَقَرَأَ وَهُوَ قَائِمٌ ثُمَّ رَكَعَ ثُمَّ سَجَدَ ثُمَّ يَفْعَلُ فِي الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ مِثْلَ ذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٥٠٥ حديث رقم (١١٢۔ ٧٣١)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر نماز پڑھتے اور بیٹھ کر ہی قراءت بھی کرتے (قراءت کی طوالت کی وجہ سے) اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کی تیس یا چالیس آیات رہ جاتیں تو کھڑے ہو جاتے اور انہیں کھڑے ہو کر پڑھتے، پھر رکوع کرتے اور پھر سجدہ کرتے اور پھر دوسری رکعت میں بھی ایسا ہی کرتے۔

(مسلم)

تشریح: ''**ان رسول اللّٰه ﷺ كان يصلي جالسًا**'' یہ آخر عمر کی بات ہے جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحت میں ضعف آ گیا تھا۔

''**ما يكون ثلاثين او اربعين آية**'' او شک یا تنویع کیلئے ہے۔

''**قام وقرأ وهو قائم ثم ركع ثم سجد**'' اس سے معلوم ہوا کہ قومہ نماز کا رکن نہیں ہے۔

''**ثم يفعل في الركعة الثانية مثل ذلك**'' یہ صورت بالاتفاق جائز ہے بخلاف اس کے عکس کے۔ اگر ایک آدمی نے کھڑے ہو کر نماز شروع کی پھر بیٹھ گیا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے جبکہ صاحبین کا اس کا اختلاف ہے۔ صاحب

ہدایہ نے یہی ذکر کیا ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس بات میں کوئی فرق نہیں کہ پہلی رکعت میں بیٹھے یا دوسری رکعت میں۔ جیسا کہ اس اطلاق سے معلوم ہوتا ہے۔

(رواہ مسلم) اس حدیث کی ترجمۃ الباب سے مناسبت ظاہر نہیں۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ حدیث تیسری رکعت کے بارے میں خاموش ہے۔ یا اس میں شفع کا ذکر وتر کے مقدمہ کے طور پر ہے۔ یا اس کا شفع وتر کے مابعد پر محمول ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اس حدیث کو باب کے آخر میں ذکر کیا جائے۔

وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھنا مسنون ہے

۱۲۸۴: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيْ بَعْدَ الْوِتْرِ رَكْعَتَيْنِ (رواه الترمذی وزاد ابن ماجة) خَفِيْفَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ.

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/۳۳۵ حديث رقم ٤٧١۔ وابن ماجه ١/٣٧٧ حديث رقم ١١٩٦۔

ترجمہ: امّ المؤمنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ وتر کے بعد بھی دو رکعات پڑھتے تھے۔ (یہ ترمذی کی روایت ہے) اور ابن ماجہ نے خفيفتين وهو جالسٌ کے الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے کہ دو رکعات ہلکی پڑھتے تھے اور بیٹھ کر پڑھتے تھے۔

تشریح: ''عن ام سلمة ان النبی'' ایک نسخہ صحیحہ میں ''ان رسول اللّٰہ ﷺ'' کا ذکر رہا۔

وتروں کے بعد کی دو رکعات کا ایک اور طریقہ

۱۲۸۵: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُوْتِرُ بِوَاحِدَةٍ ثُمَّ يَرْكَعُ رَكْعَتَيْنِ يَقْرَأُ فِيْهِمَا وَهُوَ جَالِسٌ فَإِذَا اَرَادَ اَنْ يَّرْكَعَ قَامَ فَرَكَعَ (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه فی السنن ١/٣٧٧ حديث رقم ١١٩٦۔

ترجمہ: حضرت امّ المؤمنین عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ وتر کی ایک رکعت پڑھتے تھے اور پھر دو رکعتیں نوافل پڑھتے اور ان میں بیٹھے بیٹھے قراءت کرتے جب رکوع کرنے کا ارادہ ہوتا تو کھڑے ہو کر پھر رکوع کرتے۔ (ابن ماجہ)

تشریح: ''قالت كان رسول اللّٰه ﷺ يوتر بواحدة'' ایک رکعت کو اس سے پہلے شفع کے ساتھ ملا کر پڑھتے تھے۔ یہ معنی لینے کی صورت میں تمام احادیث میں تطبیق ہو جائے گی۔

''فاذا اراد أن يركع قام فركع'' ابن حجر ؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ماقبل کے منافی نہیں کیونکہ کبھی ان دو رکعات کو بغیر قیام کے بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ اور کبھی رکوع سے پہلے قیام فرما لیتے تھے۔

شاید ان احادیث کا تعلق بیان جواز کیلئے ہے یا رات کی آخری نماز وتر کو بنانے کا حکم نافذ ہونے سے پہلے کا ہے۔

وتر کے بعد کی دو رکعات کا تہجد کے قائم مقام ہونا

۱۲۸۶: وَعَنْ ثَوبَانَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ هٰذَا السَّهْرَ جُهْدٌ وَّثِقْلٌ فَإِذَا أَوْتَرَ أَحَدُكُمْ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ فَإِنْ قَامَ مِنَ اللَّيْلِ وَإِلَّا كَانَتَا لَهٗ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه أحمد في المسند ٥/٢٦٠۔

ترجمہ: حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رات کو تہجد کیلئے بیدار ہونا انتہائی مشقت اور بوجھ والا کام ہے اس لئے جب تم میں سے کوئی شخص (نیند سے پہلے) وتر پڑھے تو اس کو چاہیئے کہ وہ دو رکعتیں نفل پڑھ لے کیونکہ اگر وہ صلوٰۃ تہجد کیلئے بیدار ہو گیا تو فبہا، اور اگر بیدار نہ ہو سکا تو یہ دو رکعتیں اس کیلئے کافی ہونگی (یعنی تہجد کا کچھ ثواب مل جائے گا)۔ (ترمذیؒ)

تشریح: ''جهد'' بضم الجيم وفتحها'' بمعنی مشقت۔

''وثقل'' بكسر المثلثة وسكون القاف وفتحها۔

حاصل یہ ہے کہ رات کی بیداری طبعی عادت کی وجہ سے نفوس بشریہ کیلئے بوجھ اور مشقت ہے۔

''فليركع ركعتين'' ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اجعلوا اخر صلاتكم بالليل وترا' کے منافی نہیں۔ کیونکہ اَوتر سے مراد ارادہ وتر ہے۔

''فليركع ركعتين'' یعنی دو رکعات پڑھے پھر وتر پڑھے۔ یا وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھے اس صورت میں یہ دو رکعتیں بیان جواز کیلئے ہوں گی۔ دوسرا قول صحیح نہیں کیونکہ امر بیان جواز کے لئے نہیں آیا کرتا۔ پس پہلی تاویل ہی متعین ہوگی۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک رکعت وتر پڑھنا ممنوع ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ وتر سے مراد تین رکعتیں ہیں اس سے پہلی کی دو رکعتیں نفل اور تہجد کے قائم مقام ہو جائیں گی۔

''فان قام من الليل والا كانتا له'' یعنی اگر وہ رات کو اٹھ گیا اور اس نے نماز پڑھ لی تو اس نے اچھا کام کیا اور نور علی نور ہوگا اور اگر وہ نیند کے غلبہ کی وجہ سے نہ اٹھ سکا تو وہ دو رکعتیں تہجد کے بارے میں کافی ہو جائیں گی۔

وتروں کے بعد دو رکعات میں حضور ﷺ کی قراءت

۱۲۸۷: وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّيهِمَا بَعْدَ الْوِتْرِ وَهُوَ جَالِسٌ يَقْرَأُ فِيهِمَا إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ وَقُلْ يَا أَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ۔ (رواہ احمد)

أخرجه البخاري في صحيحه ١١/١٩٣۔ حديث رقم ٦٣٩٣۔ ومسلم في صحيحه ١/٤٦٦ حديث رقم (٢٩٤۔ ٦٧٥) وأبوداؤد في السنن ٢/١٤٢ حديث رقم ١٤٤٢۔ والنسائي في السنن ٢/٢٠١ حديث رقم ١٠٧٤۔ وابن ماجه ١/٣٩٤ حديث رقم ١٢٤٤۔ والدارمي ١/٤٥٣ حديث رقم ١٥٩٥۔ وأحمد في المسند ٢/٢٥٥۔

ترجمہ: حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ وتر کی نماز کے بعد دو رکعات بیٹھ کر پڑھتے تھے اور ان میں سورۂ زلزال اور سورۂ کافرون تلاوت کرتے تھے۔ (امام احمدؒ)

تشریح: ''أن النبی ﷺ کان یصلیھما'' یعنی شروع میں یا کبھی کبھی ایسا کرتے تھے۔ ایک نسخہ میں یصلیھا ہے اور اس سے مراد الصلاۃ المعھودۃ ہے اور وہ دو رکعتیں مراد ہیں جن کا ذکر پہلے کیا گیا۔ ان کا مقصد وتروں کے بعد نفل کا جواز بتانا ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ کے اصل میں افراد کے صیغہ کے ساتھ ہے انہوں نے تثنیہ کو ایک نسخہ قرار دیا ہے اور یہ اصول معتمدہ کے مخالف ہے۔

''بعد الوتر'' اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ وتر کے بعد سونے سے پہلے پڑھتے پھر اٹھ کر نفل نماز بیٹھ کر پڑھتے تھے۔

بابُ القُنُوت

قنوت کا بیان

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قنوت کا اصل معنی طاعت ہے پھر نماز میں طویل قیام کو بھی قنوت کہا جانے لگا۔ یہاں یہی مراد ہے۔

راجح یہ ہے کہ قنوت سے مراد یہاں دعا ہے۔ دعا بھی قنوت کے معانی میں سے ایک معنی ہے۔ نہایہ میں یوں ہی ہے اور ابہری نے زین العرب سے یونہی نقل کیا ہے۔

قنوت کی دو تعریفیں ہیں: لغوی، اصلاحی۔ لغت کے اعتبار سے قنوت کے چند معنیٰ ہیں۔ طول القیام۔ طول القیام فی الصلوٰۃ' دعا' عاجزی اور انکساری۔ اور اصطلاحی معنیٰ ہے دعائے مخصوصہ، جو کہ وتر میں پڑھی جاتی ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک قنوت وتر سے مراد اللھم اھدنی فیمن ھدیت ہے۔ اور اسی کو وتر میں پڑھنا مسنون اور اولیٰ ہے۔

احناف کے نزدیک قنوت وتر اللھم انا نستعینك...... ہے، اور اس کو وتر میں پڑھنا اولیٰ اور مستحب ہے، اور صحیح سند کے ساتھ یہ قنوت طبرانی وغیرہ سے منقول ہے۔

علامہ ابن ہمامؒ ترجمانِ احناف نے امام ابوداؤد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ قبیلہ مضر کے ظلم وستم کی وجہ سے ان کے خلاف قنوت نازلہ پڑھتے تھے اور بددعا فرماتے تھے اور حضرت جبریل امین نے آ کر عرض کیا کہ **یا محمد ان اللہ لم یبعثك سباباً ولا لعاناً انما بعثك رحمةً** کہ اے رحمت دو جہاں! اللہ تعالیٰ نے آپ کو بُرا بھلا کہنے والا اور لعنت کرنے والا نہیں بنا کر مبعوث کیا، بلکہ رحمت بنا کر اس دنیا میں مبعوث کیا ہے، یہ بددعا اب چھوڑ دیئے اور **لیس لك من الامر شیٔ** کی آیت کا بھی حوالہ پیش کیا اور اس کے بعد آپ ﷺ کو قنوت وتر یعنی **اللھم انا نستعینك** سکھائی، جس کو آپ ﷺ نے وتر میں پڑھنے کا معمول بنالیا۔

علامہ جلال الدین السیوطیؒ الاتقان میں رقم طراز ہیں کہ قنوت وتر یعنی **اللھم انا نستعینك** یہ قرآن مجید کی دو سورتیں

ہیں الحفد' سورۃ الخلع ۔ بعد میں بطور قراءت کے ان کو منسوخ کر دیا، اس کو دعا بنا دیا لہٰذا اب جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ بالکل ثابت نہیں وہ غلط کہتا ہے۔ لہٰذا وتر میں اسی کو پڑھنا بہتر ہوگا لیکن اگر یہ دعائے وتر یاد نہ ہو تو پھر جو بھی یاد ہو اس کو پڑھ لے۔
اور اسی طرح علامہ سیوطیؒ نے درمنثور میں اس کو کچھ تغیر الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

الفصل الاول:

رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت

۱۲۸۸: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَّدْعُوَ عَلٰى اَحَدٍ اَوْ يَدْعُوَ لِاَحَدٍ قَنَتَ بَعْدَ الرُّكُوْعِ فَرُبَّمَا قَالَ اِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ اَللّٰهُمَّ اَنْجِ الْوَلِيْدَ ابْنَ الْوَلِيْدِ وَسَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ وَّعَيَّاشَ بْنَ اَبِیْ رَبِيْعَةَ اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْاَتَكَ عَلٰى مُضَرَ وَاجْعَلْهَا سِنِيْنَ كَسِنِیْ يُوْسُفَ يَجْهَرُ بِذٰلِكَ وَكَانَ يَقُوْلُ فِیْ بَعْضِ صَلَاتِهٖ اَللّٰهُمَّ الْعَنْ فُلَانًا وَّفُلَانًا لِاَحْيَاءٍ مِنَ الْعَرَبِ حَتّٰى اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ الْاٰيَةَ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٨٩/٢۔ حديث رقم ١٩٠٢۔ ومسلم ٤٦٨/١ حديث رقم (٣٠١۔ ٦٧٧)۔ وأبوداؤد في السنن ١٤٣/٢ حديث رقم ١٤٤٤ وأحمد في المسند ١٦٧/٣۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کسی کے لئے دعا کرنے کا یا بددعا کرنے کا ارادہ کرتے، تو رکوع کے بعد قنوت نازلہ پڑھتے اور بسا اوقات **سمع الله لمن حمده ربنا لك الحمد** کہنے کے بعد یہ پڑھتے **اللهم انج الوليد بن الوليد وسلمة بن هشام وعياش بن ابی ربيعة اللهم اشدد وطأتك على مضر واجعلها سنين كسني يوسف** ۔اے اللہ! ولید بن ولید، مسلمہ بن ہشام اور عیاش بن ربیعہ کو نجات عطا فرما، اے اللہ! قوم مضر پر اپنا سخت عذاب نازل فرما اور ان پر عذاب کو قحط کی شکل میں نازل فرما ایسا قحط جو قوم یوسف علیہ السلام کے قحط کی طرح شدید ہو۔ یہ دعا آپ بلند آواز میں فرماتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعض نمازوں میں یہ بددعا فرماتے تھے، اے اللہ! فلاں فلاں پر لعنت فرما۔ عرب کے (ان) قبائل کا ارادہ کرتے ہوئے (جو کہ کافر تھے) یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: **ليس لك من الامر شيء**۔ اس معاملہ میں آپ کی دخل اندازی نہیں ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: "**وكان اذا اراد أن يدعو على أحد أو يدعو على حد قنت**" اس قنوت کے بارے میں دو احتمال ہیں:

① یہ صبح کی نماز کے ساتھ خاص ہے۔ ۲۔ یہ تمام نمازوں کیلئے عام ہے، یہ قول زیادہ راجح ہے۔
ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے کسی عمومی مصیبت (جیسے وباء، قحط یا طاعون) یا خصوصی مصیبت (جیسے کسی مجاہد یا عالم کی قید کی صورت میں) تمام فرض نمازوں کے آخر میں دعاءِ قنوت پڑھنا مسنون ہے۔ امام طحاویؒ کا یہ کہنا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ حضرت

علی رضی اللہ عنہ نے صفین کے مقام پر مغرب کی نماز میں دعاء قنوت پڑھی تھی۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا اس قول کی نسبت امام طحاویؒ کی طرف کرنا درست نہیں کیونکہ ہمارے علماء کے نزدیک مصیبت کے وقت دعاقنوت پڑھنا جائز ہے۔

''بعد الركوع'' علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رکوع سے قبل قنوت کا پڑھنا بھی روایات سے ثابت ہے۔لیکن رکوع کے بعد دعاءقنوت پڑھنے کی روایات زیادہ ہیں اور ان کے راوی احفظ ہیں لہٰذا انہی کا اعتبار ہوگا۔نیز فقہاء راشدین کی صحیح روایات میں بھی یہی مذکور ہے۔

''اذا قال'' ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر ایک بڑی ناممکن بات کی ہے وہ کہتے ہیں ''ای قال ابو هريرة في رواية اذا قال النبی ﷺ''۔

''أنج الوليد بن الوليد'' یہ حضرت خالد بن ولیدؓ کے بھائی ہیں اور جنگ بدر میں کافروں میں قیدی بنا کر لائے گئے تھے۔جب ان کا فدیہ دے دیا گیا تو انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ نے فدیہ دینے سے پہلے اسلام قبول کیوں نہیں کیا تو فرمایا کہ میں اس بات کو ناپسند سمجھتا ہوں کہ کوئی یہ خیال کرے کہ میں نے دب کر اسلام قبول کیا ہے۔قبول اسلام کے بعد مشرکین نے انہیں مکہ میں قید کر دیا پھر حضورؐ کی دعا کی برکت سے انہیں رہائی نصیب ہوئی اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

''وعياش بن أبي ربيعة'' یہ ابوجہل کے ماں شریک بھائی تھے۔شروع میں ایمان قبول کر دیا تھا جس کے نتیجے میں ابو جہل نے انہیں بیڑیوں سے باندھ دیا۔یہ تینوں حضرات مغیرہ کی اولاد میں سے تھے اور ایک دوسرے کے چچازاد بھائی تھے۔ حضور ﷺ نے ان تینوں کیلئے کفار کی قید سے نجات کی دعا فرمائی۔

''اللهم اشدد وطأتك على مضر'' وطأة (بفتح الواؤ وسکون الطاء) بمعنی سختی اور سزا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الوطء کا اصل معنی ہے ''پاؤں سے روندنا'' پھر اسے جہاد وقتال اور لڑائی کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔

''واجعلها سنين'' سنین، سنۃ کی جمع ہے اس کا معنی ہے قحط۔بددعا کا معنی یہ ہوگا کہ اے اللہ! تو ان پر اپنا عذاب اس طرح نازل کر کہ ان پر سات سال یا اس سے زائد عمر تک اپنا عذاب عظیم قحط کی صورت میں بھیج۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''واجعلها'' کی ضمیر کا مرجع الوطأة ہے یا الایام ہے۔

میں کہتا ہوں کہ دوسری نمازوں میں دعاء قنوت پڑھنے کی اباحت حالات کی دشواری اور نزول مصیبت کے ساتھ خاص ہے اور اس میں کسی کا اختلاف بھی نہیں ہے۔

اور فرماتے ہیں کہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کا نام لے کر دعا کرنے اور کفار وظالموں کے حق میں بددعا کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صبح کی نماز میں ہمیشہ دعاء قنوت پڑھنا مسنون ہے۔دوسری نمازوں کے بارے میں تین

اقوال ہیں صحیح اور مشہور قول یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت نازل ہو تو تمام فرض نمازوں میں دعا قنوت پڑھی جائے۔
واضح رہے کہ اس حدیث سے صبح کی نماز میں دعاء قنوت کی مسنونیت معلوم نہیں ہوتی۔

''و کان یقول فی بعض صلاته'' یہ الفاظ بالکل مطلق ہیں۔اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ صبح کی نماز کے بارے میں ہو یا وتروں کے بارے میں یا دوسری نمازوں کے بارے میں، یہ تینوں احتمال اس میں موجود ہیں۔رکوع سے پہلے ہے یا بعد میں دونوں احتمال ہیں۔

''الأحیاء من العرب'' أحیاء، حی کی جمع ہے بمعنی قبیلہ۔مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! انہیں اپنی رحمت سے دور کر۔
ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ (بطور اعتراض) کے کہیں کہ ''فلانا'' کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو ان کے ناموں کے ساتھ ذکر کیا تھا اور جو ''الاحیاء من العرب'' کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ان کے قبیلوں کے نام سے ذکر فرمایا تھا۔دوسرے احتمال کی تائید ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں ''علی أحیاء بن سلیم علی رعل'' کے الفاظ آئے ہیں۔(آپ کے اس اعتراض کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ ممکن ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے خاص ناموں کو ذکر کیا ہے پھر عمومی قبائل کو ذکر فرمایا یا آپ نے ''فلانًا و فلانًا'' سے نفس قبائل مراد لے رہے ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ ''لأحیاء'' محذوف کے ساتھ متعلق ہے۔

درست بات یہ ہے کہ یہ یقول سے متعلق ہے خواہ عام مراد ہو خاص۔

''حتی أنزل اللّٰه تعالٰی لیس لك من اللأمر شيء'' یعنی لوگوں کو ہدایت دینا اور کفار کو ہلاک کرنے کا اختیار آپ کو نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ تو صرف اللہ جل شانہ کے ہاتھ میں ہے اللہ چاہے تو اسلام کی توفیق دے کر ان کی توبہ قبول کر لے اور اگر چاہے تو انہیں کفر کی حالت میں ہی موت دے کر عذاب سے دوچار کر دے۔

''أو یتوب علیهم أو یعذبهم فانهم ظالمون'' أو 'الی أن کے معنی میں ہے۔
معنی اس جملہ کا یہ ہے کہ آپ اس مصیبت پر صبر کریں یہاں تک کہ اللہ ان کی توبہ قبول کر لے۔یا انہیں عذاب دے لیکن آپ کی رضا اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے موافق ہونی چاہیے۔آپ اپنے اختیار سے نہ کوئی بات کریں نہ کوئی کام۔
علامہ میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث کے ائمہ اربعہ نے بھی اس کو نقل کیا ہے اور الفاظ بخاری کے ہیں۔

قنوتِ نازلہ رکوع کے بعد پڑھی جائے

۱۲۸۹: وَعَنْ عَاصِمِ الْاَحْوَلِ قَالَ سَأَلْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ عَنِ الْقُنُوْتِ فِي الصَّلَاةِ كَانَ قَبْلَ الرُّكُوْعِ اَوْبَعْدَهٗ قَالَ قَبْلَهٗ اِنَّمَا قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ الرُّكُوْعِ شَهْرًا اِنَّهٗ كَانَ بَعَثَ اُنَاسًا يُّقَالُ لَهُمُ الْقُرَّآءُ اِلٰی اَحْيَاءِ الْعَرَبِ سَبْعُوْنَ رَجُلًا فَاُصِيْبُوْا فَقَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ الرُّكُوْعِ شَهْرًا يَّدْعُوْا عَلَيْهِمْ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحیحه ۲/۴۹۰ حدیث رقم ۱۰۰۳۔ ومسلم في صحیحه ۱/۴۶۸ حدیث رقم (۲۹۹۔

٦٧٧)۔ والنسائي في السنن ٢/ ٢٠٠ حديث رقم ١٠٧٠۔

ترجمہ: حضرت عاصم احولؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے نماز میں پڑھی جانے والی قنوت کے بارے میں پوچھا کہ وہ رکوع سے پہلے پڑھی جائے گی یا کہ بعد میں تو انہوں نے فرمایا کہ پہلے پڑھی جاتی ہے اور فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کے بعد صرف ایک مہینہ قنوتِ (نازلہ) پڑھی تھی اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ صحابہ کو جو کہ قراء کہلاتے تھے جو کہ ستر آدمی تھے (تبلیغ) کیلئے بھیجا تھا تو ان کو شہید کر دیا گیا تھا پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینہ رکوع کے بعد قنوت پڑھ کر ان کے خلاف یعنی صحابہ کے قاتلوں کے خلاف بددعا فرمائی تھی۔ (بخاریؒ و مسلمؒ)

تشریح: ''عاصم بن الأحول'' مشہور تابعی ہیں۔

''سألت أنس بن مالك عن القنوت في الصلاۃ'' اس نماز کے مصداق میں تین احتمال ہیں:

① فجر کی نماز۔ ② وتر کی نماز۔ ③ مصیبت کے وقت کی نماز۔

''قال: قبله'' یعنی دعاء قنوت رکوع سے پہلے پڑھی جاتی تھی۔ یہ جملہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ کی دلیل ہے۔

ابن حجر کا کہنا یہ ہے کہ صبح کی نماز میں رکوع سے پہلے اور بعد میں دونوں طرح پڑھنے کے بارے میں صحیح روایات موجود ہیں البتہ رکوع کے بعد قنوت کو نقل کرنے والے راویوں کی تعداد زیادہ ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ بات پہلے بھی گزر چکی ہے کہ (ترجیح کیلئے) اکثریت کا کوئی اعتبار نہیں۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رکوع کے بعد دعا قنوت پڑھنے کا عمل منسوخ ہو چکا ہے کیونکہ آگے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان موجود ہے:

''انما قنت رسول اللہ ﷺ بعد الرکوع شهراً''

''یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (فجر کی نماز میں یا مطلق طور پر) صرف ایک مہینہ دعائے قنوت پڑھی ہے''۔

''یقال لهم القراء'' ان لوگوں کو قراء کہنے کی دو وجہیں تھیں:

① کثرت قراءت کی وجہ سے۔ ۲۔ حفظ قرآن کی وجہ سے۔

''الی أحیاء من العرب'' ① ان قراء کو تعلیم القرآن اور ایمان کے احکام سکھانے کیلئے بھیجا گیا تھا۔

''سبعون رجلاً'' یہ ستر آدمی اصحاب صفہ میں سے تھے۔ ان تمام حضرات کا قیام بھی صفہ میں تھا اور یہ وہاں رہ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی تو یہ اپنی بہادری کے بل بوتے پر ان کی مدد بھی کرتے تھے۔ یہ دن کو لکڑیاں چنتے تھے اور اس سے کھانا خریدتے تھے۔ یہ انتہائی غریب فقیر اور زاہد لوگ تھے۔

ابن حجر رحمہ اللہ کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ ان حضرات کی تعداد ستر سے زائد نہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دعوت اسلام اور تعلیم قرآن کیلئے اہل نجد کی طرف بھیجا تھا۔ جب یہ لوگ مکہ اور عسفان کے درمیان بئر معونہ نامی جگہ پہنچے تو عامہ بن طفیل نے بنو سلیم کے کچھ قبیلوں کے ساتھ مل کر ان پر چڑھائی کر دی اور سب کو شہید کر دیا۔ البتہ کعب بن زید انصاری اس طرح بچ گئے کہ ان میں زندگی کے آثار باقی تھے وہ لوگ انہیں مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ پھر غزوہ خندق میں شہید ہوئے تھے۔

عامر بن فہیرہؓ کا جسد مبارک شہداء میں نہ ملا انہیں فرشتوں نے دفن کر دیا تھا۔ یہ واقعہ سن ۴ ہجری کا ہے۔ اس کا حضور ﷺ کو شدید دکھ تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میں نے حضور ﷺ کو کسی اور موقع پر اتنا غمگین ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔

"فقنت رسول اللهﷺ بعد الركوع شهرًا يدعو عليهم" یعنی حضور ﷺ ان کے قاتلوں کیلئے بددعا فرماتے تھے۔

ایک روایت میں "یدعولهم" کے الفاظ میں یعنی حضور ﷺ ان کی ہدایت کی دعا فرماتے تھے۔ یا پھر یہ لهم بھی عليهم کے معنی میں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس فرمان کا منشا یہ ہے کہ اس واقع کے بعد کبھی بھی حضور ﷺ نے فجر کی نماز میں رکوع کے بعد دعا قنوت نہیں پڑھی۔

"متفق عليه" بخاری مسلم کی ایک روایت میں "ثم تركه" (پھر دعاء قنوت کو چھوڑ دیا) کے الفاظ ہیں اس کے تین معنی ہو سکتے ہیں:

① مطلق طور پر چھوڑ دیا۔ ② رکوع کے بعد قنوت کو چھوڑ دیا۔ ③ ان کے حق میں بددعا ترک دیا۔

"دعاء عليه الصلوٰة والسلام على الذين قتلوا أصحاب بئر معونة ثلاثين صباحا يدعو على رعل ولحيان وعيصه عصت الله ورسوله"۔

ابن حجر رحمہ اللہ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مقام پر لحیان کا ذکر کرنے سے وہم ہوتا ہے کہ قراء پر چڑھائی کرنے والوں میں لحیان بھی شریک تھے حالانکہ ایسا نہیں ہے درحقیقت لحیان نے بعث الرجیع پر چڑھائی کی تھی اور ان دونوں واقعات کی خبر رسول اللہ ﷺ کو ایک ہی وقت میں دی گئی تھی اس لئے آپ نے دونوں کیلئے ایک ہی وقت میں بددعا فرمائی۔

بعث الرجیع کا سبب یہ تھا کہ عضل اور قارہ کے کچھ لوگوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ ان کی تعلیم کیلئے کسی کو بھیجا جائے۔ حضور ﷺ نے اپنے چھ صحابہ کرام کو بھیجا۔ اور عاصم بن ثابت کو ان کا امیر بنایا۔ جب وہ رجیع آئے تو بنو لحیان نے ان پر حملہ کر کے حضرت عاصم کو شہید کر دیا۔ اور زید بن سدانہ اور حضرت خبیب کو قید کر دیا اور انہیں مکہ میں بیچ دیا۔ امام بخاری کے ترجمۃ الباب میں بھی یہی وہم ہوتا ہے کہ بعث الرجیع بئر معونہ ایک ہی ہیں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ ان دونوں کے قریب ہونے کی وجہ سے انہیں خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ یہ دونوں واقعات ایک ہی مہینہ میں وقوع پذیر ہوئے۔

الفصل الثاني:

حضور ﷺ کا ایک ماہ تک قنوتِ نازلہ پڑھنا

۱۲۹۰: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَهْرًا مُتَتَابِعًا فِي الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ

وَالْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ وَصَلَاةِ الصُّبْحِ اِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ مِنَ الرَّكْعَةِ الْآخِرَةِ يَدْعُوْ عَلٰى اَحْيَاءٍ مِّنْ بَنِيْ سُلَيْمٍ عَلٰى رِعْلٍ وَّذَكْوَانَ وَعُصَيَّةَ وَيُؤَمِّنُ مَنْ خَلْفَهٗ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۲/۴۹۰ حديث رقم ۱۰۰۳۔ ومسلم فی صحيحه ۱/۴۶۸ حديث رقم (۲۹۹۔ ۶۷۷)۔ والنسائی فی السنن ۲/۲۰۰ حديث رقم ۱۰۷۰۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے: فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مسلسل ایک مہینہ تک ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی نماز میں آخری رکعت میں (رکوع سے) سمع الله لمن حمده کہنے کے بعد قنوت پڑھی جس میں آپ بنی سلیم کے چند قبیلوں یعنی رعل، ذکوان اور عصیہ کے لئے بد دعا کرتے تھے اور آپ ﷺ کے پیچھے والے لوگ یعنی مقتدی آمین کہتے تھے۔ (ابوداؤد)

تشریح: قنت رسول اللهﷺ شهرًا متتابعًا'' متتابعا سے مراد یہ ہے کہ ایک ماہ تک روزانہ یا اپنی نمازوں میں بلاناغہ دعائے قنوت پڑھتے تھے۔

''من الركعة الآخرة'' ایک نسخہ میں الركعة الأخيرة' ہے۔

''على رعل'' بکسر الراء وسکون المهملة۔ یہ بنو سلیم کی ایک شاخ کا نام ہے۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ فرضوں میں دعائے قنوت صرف اس وقت پڑھی جائے گی جب مسلمانوں پر قحط، دشمن یا کسی اور صورت میں مصیبت نازل ہو۔

حضور ﷺ نے قنوتِ نازلہ کتنا عرصہ پڑھی

۱۲۹۱: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَنَتَ شَهْرًا ثُمَّ تَرَكَهٗ۔ (رواه ابو داود والنسائی)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۱/۴۶۹ حديث رقم (۳۰۴۔ ۶۷۷)۔ وأبوداوٗد فی السنن ۲/۱۴۳ حديث رقم ۱۴۴۵۔ والنسائی ۲/۲۰۳ حديث رقم ۱۰۷۹۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، کہ حضور ﷺ نے قنوتِ نازلہ ایک مہینہ پڑھی پھر ترک کر دی۔ (ابوداؤد، نسائی)

تشریح: ''ثم تركه'' یعنی مطلق طور پر فرض میں قنوت کو چھوڑ دیا یا رکوع کے بعد قنوت کو چھوڑ دیا۔

علامہ میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح مسلم میں اس سے زیادہ مکمل روایت ہے اس میں ثم تركه کے الفاظ نہیں ہیں۔

شرح السنہ میں ہے: اکثر اہل علم کا مذہب یہ ہے کہ اس حدیث اور اس کے بعد والی حدیث کی بناء پر تمام نمازوں میں دعائے قنوت نہیں پڑھی جائے گی۔ اور بعض حضرت کہتے ہیں کہ دعائے قنوت پڑھی جائے گی۔ یہی امام مالک اور امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں پر کوئی مصیبت نازل ہو تو تمام نمازوں میں دعائے قنوت پڑھی جائے گی۔

بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد منقول ہے کہ ہماری فجر کی نماز حضور ﷺ کی نماز کے قریب تر ہے۔ نیز حضرت

ابوہریرۃ کا معمول یہ تھا کہ وہ فجر کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد دعائے قنوت پڑھتے تھے اور مؤمنین کیلئے دعا اور کافروں کے لئے بددعا فرماتے تھے۔

ابن ابی فدیک، عبداللہ بن سعید' حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب فجر کی دوسری رکعت میں رکوع سے سر اٹھاتے تو دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا پڑھتے:

''اللهم اهدني فيمن هديت، وعافني فيمن عافيت ، وتولني فيمن توليت وبارك لي فيها أعطيت وقني شر ما قضيت انك تقضي ولا يقض عليك انه لا يزل من واليت تباركت وتعاليت''۔

اس روایت اور گذشتہ روایات سے شوافع کے مسلک کی تردید ہوتی ہے کیونکہ وہ اللهم واهدنا وعافنا'' جمع کے صیغوں کے ساتھ قرار۔ وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ دعا صرف امام کی طرف سے نہیں بلکہ مقتدی بھی ساتھ شریک ہیں۔ اس لئے جمع کا صیغہ ہونا چاہیے۔ اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ نبی کریم ﷺ بھی تو امام تھے۔ فجر کی نماز منفرد تو نہ پڑھتے تھے اس کے باوجود دعائے قنوت میں واحد کے صیغے استعمال فرماتے تھے۔

ان حضرات کے ذکر کردہ دلائل کا جواب درج ذیل ہے۔

ابن ابی فدیک کی وایت جوان کے ذکر کردہ دلائل میں بنیاد اور نص کا درجہ رکھتی ہے۔ ضعیف ہے۔ اس میں عبداللہ بن سعید مقبری ضعیف راوی ہے۔ نیز اس سے ماقبل کی روایت کو صاحب ہدایہ نے بزاز، ابن ابی شیبہ' طبرانی اور طحاوی سے روایت کردہ حدیث کی بنا پر منسوخ قرار دیا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:

''شريك القاضي عن ابي حمزة القصاب، عن ابراهيم ، عن علقمة، عن عبدالله بن مسعود قال: لم يقنت رسول الله ﷺ في الصبح الاشهرا، ثم لم يقنت قبله ولا بعده۔

اس روایت کے بارے میں شافعیہ کا کہنا یہ ہے کہ اس میں ابوحمزۃ القصاب راوی ضعیف ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابوجعفر رازی کی بھی تو ایک جماعت نے تضعیف کی۔ اس طرح تو قصاب ابوجعفر کے برابر ہوگئے۔ برابری کے بعد دیکھا یہ جائے گا کہ وجہ ترجیح کس کے پاس ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ابوحمزہ القصاب کے ظن کی تقویت اس روایت سے ہوتی ہے جس کو شبابہ نے قیس بن ربیع اور انہوں نے عاصم بن سلیمان سے نقل کیا ہے کہ ہم نے حضرت انس بن مالکؓ سے کہا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نبی پاک ﷺ نے ہمیں فجر میں دعائے قنوت پڑھتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک مہینہ اس پر عمل فرمایا جس میں آپ مشرک قبائل کیلئے بددعاء فرماتے تھے۔

اس حدیث کی سند کو صاحب تنقیح التحقیق نے صحیح قرار دیا ہے۔

قنوت کی عام نفی کے بارے میں ان سب سے زیادہ صریح روایت وہ ہے جسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے ''**عن حماد بن ابي سليمان، عن ابراهيم ، عن علقمة، عن عبدالله بن مسعود**'' کی سند سے نقل کیا۔ اس حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فجر میں صرف ایک مہینہ تک مشرکین کیلئے بددعا کی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ خود بھی فجر میں دعائے قنوت نہ پڑھتے تھے، طبرانی نے غالب بن فرقد طحان سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے

ہیں کہ میں نے دو ماہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پاس قیام کیا۔ انہوں نے اس دوران فجر کی نماز میں دعائے قنوت نہ پڑھی۔

جب قراءت قنوت کا نسخ ثابت ہو گیا تو ابو جعفر رازی کی روایت کو غلطی پر یا طول قیام پر محمول کریں گے۔ طول قیام پر عمل کرنے کی دلیل ایک صحیح روایت میں ہے جس میں آتا ہے:

''افضل الصلاۃ طول القنوت'' ''افضل نماز لمبے قنوت (یعنی قیام) والی ہے''۔

یقینی طور پر صبح کی نماز سب نمازوں سے لمبے قیام والی ہے۔

بعض محدثین کا مسلک یہ ہے کہ اسے قنوتِ نازلہ پر محمول کیا جائے گا۔ اس کا معنی ہو گا کہ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نزول مصائب کے وقت دعائے قنوت پڑھا کرتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے قنوت کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مومنین کیلئے دعا اور کفار کیلئے بددعا فرمایا کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ دعائے قنوت پڑھتے تھے کیونکہ روایات سے یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی سند سے نقل کیا ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں صرف اس وقت دعائے قنوت پڑھتے تھے جب کسی قوم کیلئے دعا یا بددعا کرنے کا ارادہ ہوتا۔

اس حدیث کی سند بھی صحیح ہے۔

ابن ہمام کے کلام کا باقی حصہ ہم آئندہ ذکر کریں گے۔ ان شاء العزیز۔

حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی وتر کے علاوہ قنوت نہیں پڑھتے تھے

۱۲۹۲: وَعَنْ اَبِیْ مَالِكِ نِ الْاَشْجَعِیِّ قَالَ قُلْتُ لِاَبِیْ یَا اَبَتِ اِنَّكَ قَدْ صَلَّیْتَ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِیْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَعَلِیٍّ هٰهُنَا بِالْكُوْفَةِ نَحْوًا مِّنْ خَمْسِ سِنِیْنَ اَكَانُوْا یَقْنُتُوْنَ قَالَ اَیْ بُنَیَّ مُحْدَثٌ۔ (رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجۃ)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/۲۵۲ حدیث رقم ۴۰۲ والنسائی ۲/۲۰۴ حدیث رقم ۱۰۸۰۔ وابن ماجه ۱/۳۹۳ حدیث رقم ۱۲۴۱۔

ترجمہ: حضرت ابو مالک اشجعیؒ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے والد گرامی سے دریافت کیا کہ اے ابا جی! آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ اور عثمان غنیؓ اور اسی شہر کوفہ میں پانچ سال تک حضرت علیؓ کے پیچھے نماز پڑھی ہے کیا یہ حضرات نمازِ فجر میں قنوت پڑھتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ بیٹے یہ قنوت بدعت ہے۔ (ترمذی)

تشریح: ''أبی مالك الأشجعی'' صاحب تقریب فرماتے ہیں کہ ان کے والد صحابی ہیں۔ ان کا نام سعد بن طارق بن اشیم ہے۔

''ھٰھنا بالكوفة'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں طرف راوی کے قول ''وعلی'' کے ساتھ تو متعلق ہیں، لیکن اس صورت میں عطف کو انسحاب کے بجائے تعدید پر محمول کیا جائے گا۔

''نحوًا من خمس سنین'' یعنی ان سب کے ساتھ آپ کی رفاقت کا عرصہ اتنا ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ درحقیقت یہ چار سال اور کچھ ماہ ہیں۔ظاہر یہ ہے کہ ان کی مراد حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ ہے۔

''أکانوا یقنتون'' کیا وہ حضرات دعائے قنوت پڑھتے تھے، یعنی صبح کی نماز میں۔علامہ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ترمذی اور جامع الاصول میں''أکانوا''ہمزہ کے اثبات کے ساتھ ہے اور مصابیح کے نسخوں میں اس کے سقوط کے ساتھ ہے۔

ابن ماجہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں''وکانوا یقنتون فی الفجر''

''أی بنی''بفتح الیاء وکسرھا۔

''محدث''بفتح الدال یعنی فجر میں دعائے قنوت کا پڑھنا بدعت ہے جسے بعض تابعین نے ایجاد کیا ہے۔ان صحابی کے اس قول کی مراد میں فریق مخالف کے محدثین کے مختلف اقوال ہیں:

① اس صحابی کی نفی سے قنوت کی نفی لازم نہیں آتی، کیونکہ ممکن ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی اقتداء میں آخری صفوں میں نماز پڑھتے ہوں اور دعائے قنوت کی آواز ان تک نہ پہنچتی ہو، البتہ یہ بات انتہائی بعید ہے۔

② یہ صبح اور وتر کے علاوہ میں قنوت کی نفی کر رہے ہے، یہ قول بھی بعد سے خالی نہیں۔

③ انہوں نے اپنے زمانے کے لوگوں سے قنوت کے کچھ ایسے الفاظ سنے جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے نہ سنا تھا۔پس ان کلمات کا انکار کیا۔البتہ ان کے جواب کے اطلاق سے اس قول کا صحیح نہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔

④ علامہ طیبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ان صحابی کی نفی سے قنوت کی نفی لازم نہیں آتی، کیونکہ یہ نفی کی شہادت دے رہے ہے جبکہ کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جو اثبات کی گواہی دیتے ہیں جیسے حضرت حسن، حضرت ابو ہریرہ، حضرت انس اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم۔

ان میں سے بعض قول کا جواب تو گزر گیا، کچھ کا جواب آگے آئے گا۔بعض لوگوں نے تو اس جملہ کی انتہائی عجیب وغریب تاویل کی ہے کہ قنوت کا نہ پڑھنا بدعت ہے۔اس قول کی تردید صراحت کے ساتھ آگے آئے گی۔

(رواہ الترمذی) علامہ میرکؒ کے نزدیک امام ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ قنوت کے عدم ثبوت کی مندرجہ ذیل روایات ضعیف ہیں:

① عن ابن مسعود أنه علیہ السلام لم یقنت فی شیء من صلاته۔

② عن ابن عباس انه بدعة۔

③ عن أم سلمة انه علیه الصلاة واسلام نهی عن القنوت فی الصبح۔

وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول''ما احفظه من احد من اصحابنا''ان لوگوں کے معارض ہے جنہوں نے محفوظ کیا۔میں کہتا ہوں کہ اس مقام پر کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب دونوں طرح دلائل متعارض ہو گئے تو دونوں ساقط ہو گئے۔اور اصل اور قیاس عدم قنوت ہے۔

ابن ہمام رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ قنوت ~~کیا پیسے~~ راتبہ جہریہ کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ ابو مالک سعد بن طارق اشجعی اپنے

والد سے روایت کرتے ہیں:

"میں نے نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی آپ نے قنوت نہ پڑھی، میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی انہوں نے بھی قنوت نہ پڑھی، میں نے عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی انہوں نے بھی قنوت نہ پڑھی میں نے عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھی انہوں نے بھی قنوت نہ پڑھی۔ میں نے علیؓ کے پیچھے نماز پڑھی انہوں نے بھی قنوت نہ پڑھی۔ اے میرے بیٹے! یہ بدعت ہے"۔ نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ نے اسے نقل کیا ہے۔

اس روایت سے حازمیؒ کے اس قول کی بھی نفی ہوتی ہے کہ قنوت پڑھنا خلفاء اربعہ کا مسلک ہے۔ اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ "جمہور کا مسلک یہی ہے۔" یہ قول بھی حافظ کے ایک قول کے معارض ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ "جمہور کا مسلک اس کے خلاف ہے"۔

میں یہ کہتا ہوں کہ جمہور سے مراد خلفاء راشدین اور ان کے بعد کے حضرات ہیں۔ ان کے بعد کون ہیں جو جمہور کہلانے کے لائق ہوں۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کی ہے کہ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم فجر میں دعائے قنوت نہ پڑھتے تھے۔ اسی طرح حضرت علیؓ کے بارے میں انہوں نے نقل کیا کہ جب انہوں نے صبح کی نماز میں دعا قنوت پڑھی تو لوگوں نے انہیں منع کیا۔ انہوں نے فرمایا ہم نے اپنے دشمن کے خلاف مدد طلب کی ہے۔ واضح رہے کہ جن لوگوں نے منع کیا وہ صحابہ اور تابعین ہی تھے۔ ابن ابی شیبہ نے ابن عباس، ابن مسعود، ابن عمر اور ابن الزبیر رضی اللہ عنہم کے بارے میں نقل کیا ہے کہ یہ حضرات فجر میں دعائے قنوت نہ پڑھتے تھے۔ فجر کی قنوت کے بارے میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ میں نے یہ کبھی ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور نہ مجھے اس کے بارے میں کچھ علم ہے۔

حازمی نے سعید بن مسیّب کے حوالے سے ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول قنوت کے بارے میں ذکر کیا۔ فرمایا کہ انہوں نے اپنے والد کے ساتھ دعائے قنوت پڑھی لیکن وہ بھول گئے پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ذکر کیا کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم بوڑھے ہو گئے اور بھول گئے۔

اس مسئلہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف نسیان کی نسبت کرنا غایت بعد میں ہے۔ نسیان کا دعویٰ ان امور میں ہو سکتا ہے جن کو سنا جائے اور یاد کیا جائے۔ اور ان افعال میں جو عمر میں کبھی کبھی انجام دیئے جائیں وہ افعال جو ہر صبح انجام دیئے جاتے ہوں ان میں بھول کا تصور نہیں ہو سکتا۔

گذشتہ دلائل سے یہ بات بھی قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ قنوت سنت راتبہ نہیں ہے کیونکہ اگر یہ سنت راتبہ ہوتی تو نبی کریم ﷺ ہر صبح بلند آواز سے اسے پڑھتے اور آپ کے مقتدی آپ کے پیچھے آمین کہتے جیسا کہ امام شافعی کا مسلک ہے یا آپ ﷺ آہستہ آواز سے پڑھتے جیسا کہ امام مالک کا مذہب ہے۔ اگر یہ صورتحال ہوتی تو کسی قسم کا اختلاف پیدا نہ ہوتا۔ بلکہ قراءت کے جہر و سر اور تعداد رکعات کی طرح یہ بھی منقول ہوتا۔

سعید بن مسیب نے نسیان کی جو نسبت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف کی ہے اس کی بہترین توجیہہ یہ ہے کہ اس سے مراد قنوت

نازلہ ہے۔ کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے مطلق طور پر قنوت کی نفی کی ہے اور سعید بن میسب رحمہ اللہ کا کہنا یہ تھا کہ انہوں نے اپنے والد کے ساتھ قنوت پڑھی تھی یعنی قنوت نازلہ، لیکن وہ اس کو بھول گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں منقول ہے کہ مسیلمہ سے جنگ کے وقت اور اہل کتاب سے جنگ کے وقت انہوں نے دعائے قنوت پڑھی تھی، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی دعائے قنوت پڑھی تھی۔ حضرت علیؓ نے حضرت معاویہؓ اور حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ سے قتال کے وقت بھی قنوت نازلہ پڑھی تھی۔

الفصل الثالث:

وتر میں قنوت پڑھنے کا مسئلہ

۱۲۹۳: عَنِ الْحَسَنِ اَنَّ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ جَمَعَ النَّاسَ عَلٰی اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ فَكَانَ يُصَلِّيْ لَهُمْ عِشْرِيْنَ لَيْلَةً وَّلَايَقْنُتُ بِهِمْ اِلَّا فِي النِّصْفِ الْبَاقِيْ فَاِذَا كَانَتِ الْعَشْرُ الْاَوَاخِرُ تَخَلَّفَ فَصَلّٰى فِيْ بَيْتِهٖ فَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اَبَقَ اُبَيٌّ۔ (رواہ ابو داود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۲/۱۳۶ حديث رقم ۱۴۲۹۔

ترجمہ: حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ نے لوگوں کو رمضان میں تراویح کیلئے جمع کیا اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو امام بنایا۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے ان کو بیس دن تک نماز تراویح پڑھائی اور انہوں نے لوگوں کے ساتھ قنوت (وتر میں) نہیں پڑھی، مگر رمضان کے نصف اخیر میں اور جب دس روزے باقی رہ گئے تو حضرت ابی بن کعبؓ مسجد سے رُک گئے اور اپنے گھر میں نماز تراویح پڑھی لوگ کہنے لگے کہ ابی بن کعبؓ بھاگ گئے۔ یہ ابوداؤد کی روایت ہے۔

تشریح: ''عن الحسن'' حسن سے مراد حسن بصری رحمہ اللہ ہیں۔

''ان عمر بن الخطاب، جمع الناس'' الناس سے مراد مرد ہیں کیونکہ عورتوں کو سلیمان بن ابی حثمہ کے پاس جمع کیا تھا۔

''لا يقنت بهم'' یعنی وتر میں انہیں دعائے قنوت نہیں پڑھاتے تھے۔ شاید کہ یہ کفار کیلئے بددعا کے ساتھ مقید ہے جیسا کہ سند صحیح یا حسن کے ساتھ گذر چکا ہے۔ کہ سنت یہ ہے کہ جب آدھا رمضان گزر جائے تو وتروں میں کفار پر لعنت کی جائے۔ نصف اخیر کو اختیار کرنے کی حکمت تفاؤل ہے کہ اس مہینہ کے زوال کی طرح کافروں کو بھی زوال ہو جائے، جیسا کہ پچھنے لگوانے کیلئے ہر مہینے کے نصف اخیر کو اختیار کیا گیا ہے تاکہ خروج مرض اور زوال عیب کیلئے تفاؤل ہو جائے۔

''يقولون أبق أبي'' علامہ طیبی رحمہ اللہ لوگوں کے اس قول کے بارے میں فرماتے ہیں کہ حضرت ابی کے تخلف کو بھگوڑے غلام کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول:

''اذ أبق الى الفلك المشحون'' میں حضرت یونس علیہ السلام کے اپنے رب کی اجازت کے بغیر جانے کو مجازی طور پر اباق کہا گیا ہے۔

بعض محدثین کا کہنا ہے کہ حضرت ابیؓ کا تخلف نبی کریم ﷺ کی اتباع میں تھا، آگے آئے گا کہ نبی کریم ﷺ لوگوں کو نماز پڑھا کر گھر تشریف لے جاتے تھے، لیکن ممکن ہے کہ نبی کریم ﷺ کا تخلف کسی ایسی علت کی بنا پر ہو جو حضرت ابیؓ میں موجود نہ ہو۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اسے حضرت ابیؓ کے کسی عذر پر محمول کیا جائے۔

ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت ابیؓ اس عشرہ میں خلوت کو ترجیح دیتے تھے۔ تاکہ کمال خلوت حاصل ہو اور جلوت سے نکل جائیں۔

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس متن کے کچھ اور طرق بھی ہیں جنہیں امام نووی نے ضعیف قرار دیا ہے۔

خلاصہ میں مذکور ہے کہ ابن عدی نے انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے نصف میں دعائے قنوت پڑھتے تھے۔ الخ۔ یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس میں ابو عاتکہ راوی ضعیف ہے۔ اس روایت کو بیہقی نے ضعیف قرار دیا ہے باوجود اس کے کہ اس میں اور اس سے قبل عالی روایت میں قنوت سے مراد طول قیام ہے نیز نصف اخیر کی تخصیص زیادتی اجتہاد کے ساتھ ہے۔ اس طرح یہ حدیث متنازع معنی سے خارج ہو جائے گی۔

ہماری دلیل وہ مشہور دلیل ہے جو سنن اربعہ میں حسن بن علیؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے کچھ کلمات سکھائے جنہیں میں وتر میں پڑھا کرو۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی اسناد کو صحیح قرار دیا ہے۔

۱۲۹۴: وَسُئِلَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ عَنِ الْقُنُوْتِ فَقَالَ قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ الرُّكُوْعِ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَبْلَ الرُّكُوْعِ وَبَعْدَهُ۔ (رواه ابن ماجة)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۲/۱۳۶ حدیث رقم ۱۴۲۹۔

ترجمہ: اور حضرت انس بن مالکؓ سے قنوت وتر کے بارے میں پوچھا گیا (کہ کیا پڑھی جائے؟) تو فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے قنوت رکوع کے بعد پڑھی ہے اور دوسری روایت میں وارد ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی دعائے قنوت رکوع سے قبل اور کبھی بعد میں پڑھی ہے۔ (یہ ابن ماجہ کی روایت ہے)۔

بَابُ قِيَامِ شَهْرِ رَمَضَانَ

ماہ رمضان میں قیام کا بیان

یعنی رمضان کی راتوں کے قیام اور تراویح و تلاوت قرآن وغیرہ کے ذریعہ راتیں گزارنے کی فضیلت کا بیان۔ اس باب میں شعبان کے نصف کے قیام کی فضیلت کا بیان بھی موجود ہے۔

شہر رمضان میں قیام سے مراد تراویح کی نماز کی ادائیگی ہے اور قرآن مجید سننے کیلئے بیداری مراد ہے اس باب میں زیادہ تر وہ احادیث منقول ہونگی جو کہ تراویح کے اثبات اور اس کی فضیلت اور حکم پر دلالت کرنے والی ہونگی۔ لہٰذا اس باب میں تراویح کے متعلق چند مسائل کا معلوم کرنا ضروری ہے۔

مَسْئَلَة: نمبر۱: صلوٰۃِ تراویح ہر مرد اور عورت پر سنت مؤکدہ ہے اگر نہیں پڑھیں گے تو ترکِ سنت کی وجہ سے گناہ گار ہونگے۔

مسئلہ نمبر۲: جس رات رمضان المبارک کا چاند نظر آئے، تراویح اسی رات سے شروع کرے، کیونکہ رمضان کا مہینہ چاند نظر آتے ہی شروع ہو جاتا ہے اور جب عید کا چاند نظر آئے تو تراویح چھوڑ دے کیونکہ اب شوال کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر۳: تراویح روزے کے تابع نہیں بلکہ مستقل سنت ہے اگر کوئی کسی عذر کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتا تو اس پر بھی تراویح لازم ہیں اگر تراویح بھی چھوڑ دیگا تو سنت کے ترک کی وجہ سے گناہ گار ہوگا۔

مسئلہ نمبر۴: اگر عشاء کی نماز جماعت سے نہیں پڑھ سکا تو تراویح بھی اکیلے ہی پڑھے، ہاں اگر مسجد میں آ گیا تو پھر جماعت کے تابع ہو کر جماعت کے ساتھ ہی پڑھے گا۔

مسئلہ نمبر۵: تراویح عشاء کے تابع ہے اگر عشاء کی نماز کسی وجہ سے معلوم ہوا کہ فاسد ہوگئی ہے تو تراویح کا بھی اعادہ کرنا چاہئے۔

مسئلہ نمبر۶: اگر کوئی عشاء کی نماز ہو جانے کے بعد مسجد میں آیا اور تراویح کی جماعت ہو رہی تھی تو وہ پہلے عشاء کی نماز پڑھے اور پھر تراویح کی جماعت میں شریک ہو اور جو تراویح رہ جائیں ان کو وتر کے بعد پڑھ لے۔

مسئلہ نمبر۷: ایک مرتبہ تراویح کی نماز میں قرآن مجید کو مکمل کرنا لازم ہے یعنی سنت مؤکدہ ہے اگر سستی اور کاہلی کی وجہ سے چھوڑ دے تو درست نہیں۔ ہاں! اگر جماعت کے کم ہونے کا خطرہ ہو تو پھر آخری دس سورتوں سے یا جہاں سے چاہے پڑھ لے۔

مسئلہ نمبر۸: پورے رمضان المبارک میں ایک قرآن ختم کرنا چاہئے اس سے زائد اگر اشتیاق ہو تو ٹھیک ہے ورنہ نہیں۔

مسئلہ نمبر۹: ایک رات میں بھی تراویح کے اندر قرآن مجید کو مکمل کرنا جائز ہے اگر لوگ شوق رکھتے ہوں اور مکمل کھڑے ہو کر سنیں اور اگر اشتیاق نہ ہو لوگوں میں سے کوئی بیٹھ جائیں، کوئی لیٹ جائیں، کوئی بھی کھڑے ہوں، جس طرح کہ مروجہ شبینہ میں ہوتا ہے ایسا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس سے قرآن کی بے حرمتی ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر۱۰: قرآن سنانے والے حافظ کو ایک مرتبہ کسی بھی سورت کے شروع میں بلند آواز سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا ضروری ہے کیونکہ بسم اللہ قرآن مجید کی علی سبیل التعیین ایک آیت ہے، اگر بسم اللہ ایک مرتبہ بھی بلند آواز سے نہ پڑھی تو ایک آیت نامکمل ہوگی اور قرآن مجید بھی تراویح میں مکمل نہ ہوگا۔

مسئلہ نمبر۱۱: قرآن مجید مکمل بھی ہو جائے تو پھر بھی پورے رمضان میں تراویح پڑھنا لازم ہے، قرآن مجید مکمل ہونے کے بعد اگر دوسری دفعہ قرآن مکمل کرنے کا ارادہ نہ ہو، تو تراویح سورتوں سے پڑھائے۔

مسئلہ نمبر۱۲: اہل بدعت کا طریقہ ہے کہ تراویح میں تکمیل قرآن کے لئے سورۂ اخلاص تین دفعہ پڑھتے ہیں، یہ غلط اور خلاف اصل ہے۔

مسئلہ نمبر۱۳: تراویح پڑھنے کا وہی طریقہ ہے جو کہ دیگر نمازوں کا طریقہ ہے۔

مسئلہ نمبر۱۴: رمضان المبارک میں تراویح کے بعد وتر جماعت سے پڑھے جائیں گے۔ رمضان کے علاوہ وتروں کو جماعت سے پڑھنا درست نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر۱۵: تراویح کی نیت یوں کرنی چاہئے: "نویت ان اصلی رکعتی صلاۃ التراویح سنۃ النبی ﷺ واصحابہ" یاد رکھنا چاہئے کہ نیت کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔

الفصل الاوّل:

آنحضرت ﷺ نے بھی تراویح کی نماز پڑھائی ہے

۱۲۹۵: عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اتَّخَذَ حُجْرَةً فِي الْمَسْجِدِ مِنْ حَصِيْرٍ فَصَلّٰى فِيْهَا لَيَالِيَ حَتّٰى اجْتَمَعَ عَلَيْهِ نَاسٌ ثُمَّ فَقَدُوْا صَوْتَهٗ لَيْلَةً وَّظَنُّوْا اَنَّهٗ قَدْ نَامَ فَجَعَلَ بَعْضُهُمْ يَتَنَحْنَحُ لِيَخْرُجَ اِلَيْهِمْ فَقَالَ مَازَالَ بِكُمُ الَّذِيْ رَاَيْتُ مِنْ صَنِيْعِكُمْ حَتّٰى خَشِيْتُ اَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ كُتِبَ عَلَيْكُمْ مَاقُمْتُمْ بِهٖ فَصَلُّوْا اَيُّهَا النَّاسُ فِيْ بُيُوْتِكُمْ فَاِنَّ اَفْضَلَ صَلَاةِ الْمَرْءِ فِيْ بَيْتِهٖ اِلَّا الصَّلَاةَ الْمَكْتُوْبَةَ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢١٤/٢ حديث رقم ٦٧٣١۔ ومسلم ٥٣٩/١ حديث رقم (٢١٣۔ ٧٨١)۔ وأخرجه أبوداؤد في السنن ١٤٥/٢ حديث رقم ١٤٤٧۔ والترمذي في السنن ٣١٢/٢ حديث رقم ٤٥٠۔ والنسائي ١٩٧/٣ حديث رقم ١٥٩٩ ومالك في الموطأ ١٣٠/١ حديث رقم ٤ من كتاب صلاة الجماعة۔ وأحمد في المسند ١٨٢/٥۔

ترجمہ: حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے (رمضان المبارک میں) مسجد میں چٹائی یعنی بوریے کا ایک خیمہ بنایا اور کئی راتیں اس میں نمازِ نفل ادا کرتے رہے (کیونکہ آپ ﷺ معتکف تھے اور صرف فرض اور تراویح پڑھانے کیلئے باہر تشریف لے جاتے اور تراویح اور فرض پڑھ کر حجرہ میں واپس آ جاتے)۔ یہاں تک کہ ایک دن لوگ تراویح کیلئے جمع ہوئے تو حضور ﷺ حجرہ سے باہر تشریف نہ لائے (یعنی فرض پڑھا کر خیمہ میں تشریف لے گئے تھے) پھر لوگوں نے حضور ﷺ کی آہٹ و آواز محسوس نہ کی تو وہ سمجھے کہ آپ ﷺ سو گئے ہیں، تو لوگوں نے کھنکارنا شروع کر دیا تاکہ آپ ﷺ تراویح کے لئے باہر تشریف لائیں، تو فرمایا مسلسل میں دیکھتا رہا تمہارا فعل (یعنی تمہارا تراویح پڑھنے کا شوق) یہاں تک کہ مجھے خوف ہوا کہ یہ تم پر فرض ہی نہ ہو جائے اگر یہ تم پر فرض ہو جاتی تو تم اس کو باقاعدگی سے ادا نہ کر سکتے لہٰذا تم اپنے گھروں میں نمازِ نفل پڑھا کرو، کیونکہ فرض نمازوں کے علاوہ آدمی کی سب سے افضل نماز وہ ہے جو گھر میں پڑھتا ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''ان النبی ﷺ اتخذ حجرة فی المسجد من حصیر'' یعنی نفلی نماز اور ذکر و فکر کیلئے تنہائی کی غرض سے یہ حجرہ بنایا گیا تھا۔

ابن حجر ؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے بیٹھنے کی جگہ پر چٹائی کا ایک حجرہ بنوایا تھا تاکہ لوگوں سے پردہ ہو جائے کیونکہ جو اسرار خلوت میں حاصل ہوتے ہیں وہ جلوت میں حاصل نہیں ہو سکتے۔

علماء کا کہنا کہ لوگوں سے اختلاط گوشہ نشینی سے بہتر ہے۔ اس کا مصداق ایسی گوشہ نشینی ہے جو مستقل طور پر اختیار کر لی جائے۔ نیز یہ کہ اس سے ایسی گوشہ نشینی مراد ہے جس میں لوگوں کو ملاقات کی اجازت نہ ہو۔ جبکہ نبی کریم ﷺ کا اعتزال ایسا نہ تھا

بلکہ ہر ایک آپ سے مل سکتا تھا۔ اور اپنی ضرورت کا سوال کر سکتا تھا۔

اس روایت سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ نے مسجد میں اعتکاف فرمایا تھا۔ آپ نے چٹائی اس لئے لگوائی تھی کہ عبادات' کھانے' پینے اور آرام کی حالت کا لوگوں سے پردہ ہو سکے اور یہ چیز مسئلہ اعتزال میں داخل نہیں۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے مسجد میں چٹائی وغیرہ کا حجرہ بنانے کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے لیکن اس کیلئے شرط یہ ہے کہ اس کی تعداد ضرورت سے زیادہ نہ ہو ورنہ ایسا کرنا حرام ہوگا۔ کیونکہ اس میں نمازیوں کیلئے تنگی ہے۔ اگر اس بات کا یقین ہو کہ کثرت کے ساتھ نمازی آجائیں تو انہیں اس جگہ کی ضرورت نہ ہوگی تو اس صورت میں حرمت بالکل نہیں ہوتی۔

''فصلی فیها لیالی حتی اجتمع علیه ناس'' نبی کریم ﷺ اپنے حجرہ سے باہر تشریف لاتے تھے اور فرائض وتراویح جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

اس مقام پر ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''فأتموا به'' کے الفاظ کہے ہیں، اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے حجرہ میں ہی ہوتے تھے اور لوگ آپ ﷺ کی اقتداء کر لیتے تھے۔ ان کا یہ قول محل بحث ہے۔ اس کیلئے نقل صحیح کی ضرورت ہے۔

''ثم فقدوا صوته لیلة'' یعنی نبی کریم ﷺ فرض نماز پڑھنے کے بعد حجرہ میں داخل ہوئے تو اپنی عادت مبارکہ کے مطابق تراویح کیلئے باہر تشریف نہ لائے۔

''فجعل بعضهم یتنحنح'' اس سے معلوم ہوا کہ اجازت طلب کرنے یا اپنی موجودگی کی اطلاع دینے یا کسی شخص کو باہر بلانے کیلئے گلہ صاف کرنے کی آواز نکالنا ممنوع نہیں۔

''فقال'' یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ارشاد حجرہ کے اندر سے ہی فرمایا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ باہر آکر یہ بات فرمائی ہو۔

''ما زال بکم الذی رأیت'' بکم، زال کی خبر ہے جسے اسم پر مقدم کیا گیا ہے۔

''من صنیعکم'' یعنی جماعت کے ساتھ تراویح ادا کرنے پر تمہاری حرص کو دیکھ کر۔ من الذی کیلئے بیان ہے۔

''ولو کتب علیکم ما قمتم به'' یعنی اگر یہ نماز تم پر فرض کر دی جاتی تو تم اس کے ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتے اس میں حضور ﷺ کی اپنی امت کیلئے نرمی وشفقت کا بیان ہے۔

اس جملہ میں اس بات کی دلیل بھی ہے کہ تراویح جماعت کے ساتھ پڑھنا بھی سنت ہے اور اکیلے پڑھنا بھی، البتہ ہمارے زمانہ میں لوگوں کی سستی کی بناء پر جماعت کے ساتھ پڑھنا افضل ہے۔

اس حدیث میں اس بات کی دلیل بھی موجود ہے کہ (فرض نماز جماعت سے پڑھنا ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے اس پر ہمیشگی اختیار فرمائی ہے۔ اور صرف منافق ہی اس سے پیچھے رہتا تھا۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کو اس بات کا خوف تھا کہ لوح محفوظ میں تراویح کی فرضیت اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کے دوام کے ساتھ معلق ہو۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی یہ توجیہ ضعیف ہے۔

''فصلوا أیها الناس'' یہ امر استحبابی ہے۔

''فی بیوتکم'' گھروں میں نفلی نماز پڑھنے کا حکم اس وجہ سے ہے کہ گھروں کو نفل کیلئے بنایا گیا ہے۔ کیونکہ گھروں میں نماز

پڑھنا ریا سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

''فان افضل صلاۃ المرء فی بیتہ'' یہ جملہ عام ہے۔ اور تمام سنن ونوافل کو شامل ہے۔ لیکن وہ سنن جو شعائر اسلام ہیں اس میں داخل نہیں جیسے عید، کسوف اور استسقاء۔

''الا الصلاۃ المکتوبۃ'' سوائے فرض نماز کے کیونکہ اسے مسجد میں پڑھنا افضل ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے ہمارے ائمہ نے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ نوافل جنہیں مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھنا مسنون نہیں ہیں۔ انہیں گھر میں پڑھنا سنت ہے اور انہیں گھر میں پڑھنا مسجد میں پڑھنے سے افضل ہے۔ خواہ خانہ کعبہ یا روضہ رسول کے پاس ہی ادا کیوں نہ کرے۔ کیونکہ اتباع کی فضیلت مضاعف کی فضیلت سے بہت بڑھ کر ہے۔ اس سے گھر میں برکت بھی ہوگی اور ریا سے حفاظت بھی۔

اس روایت کو ائمہ اربعہ نے نقل کیا ہے اور یہ الفاظِ بخاری کے ہیں۔

ابن ہمام ؒ فرماتے ہیں کہ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں نماز پڑھی، لوگوں نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مثل نماز پڑھی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلے دن نماز پڑھی تو لوگ اور زیادہ ہو گئے۔ تیسرے دن مزید لوگ جمع ہو گئے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہ لے آئے اور صبح کے وقت فرمایا ''میں نے تمہارا عمل دیکھ لیا تھا اور میں صرف اس وجہ سے نہیں آیا کہ مجھے خوف ہوا کہ یہ نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے''۔

یہ رمضان کا واقعہ ہے۔ امام بخاری نے کتاب الصوم میں اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک معاملہ یوں ہی رہا۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں یونہی ہوتا رہا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں بھی یہی معمول رہا پھر مرد حضرت ابی اور عورتیں حضرت سلیمان بن ابی حثمہؓ کے پاس جمع ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابیؓ اور حضرت سلیمانؓ کو حکم دیا کہ لوگوں کو جمع کریں۔ اس وقت صورتحال یہ تھی کہ قراءت کرنے والا دو سو آیات تک پڑھتا تھا اور لوگوں کو طول قیام کی تھکاوٹ کی وجہ سے عصا کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اور حضرت عمرؓ لوگوں کی ایک جماعت میں جمع ہونے کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ بڑی اچھی بدعت ہے۔ اس کو بدعت اس صورت کے اعتبار سے قرار دیا گیا ورنہ درحقیقت یہ بدعت کے حکم میں نہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو گھروں میں نماز پڑھنے کا حکم صرف اس وجہ سے دیا تھا کہ کہیں اسے فرض قرار نہ دے دیا جائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جماعت سے پڑھنے کا حکم اس وجہ سے نہ دیا کہ وہ اس سے زیادہ اہم کام میں مشغول تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی عرصہ میں بھی یہی حال رہا۔ اسی وجہ سے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''علماء وائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تراویح کی نماز میں جماعت افضل ہے بلکہ بعض نے تو اس کی افضلیت پر صحابہ کرام کے اجماع کا دعویٰ بھی کیا ہے۔ جبکہ امام بیہقی کے مطابق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع تو نہ تھا البتہ اکثر کی رائے یہی تھی''۔

بعض علماء کا مسلک یہ بھی ہے کہ تراویح کو بغیر جماعت کے پڑھنا افضل ہے۔ لیکن اس کا مصداق وہ شخص ہے جسے قرآن

یاد ہو اور اسے نیند اور سستی وغیرہ کا خوف بھی نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ بھی قیام رمضان کیلئے ترغیب دیتے تھے

۱۲۹۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُرَغِّبُ فِیْ قِیَامِ رَمَضَانَ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَّاْمُرَهُمْ فِیْهِ بِعَزِیْمَةٍ فَیَقُوْلُ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ فَتُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَالْاَمْرُ عَلٰی ذٰلِكَ ثُمَّ کَانَ الْاَمْرُ عَلٰی ذٰلِكَ فِیْ خِلَافَةِ اَبِیْ بَکْرٍ وَّصَدْرًا مِّنْ خِلَافَةِ عُمَرَ عَلٰی ذٰلِكَ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٥٢٣ حديث رقم (١٧٤-٧٥٩)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ قیام رمضان کی ترغیب دیا کرتے تھے، لیکن صحابہ کو اس معاملہ میں پکا حکم نہیں دیتے تھے، آپ ﷺ (ترغیبا) فرماتے تھے جس شخص نے ایمان کی حالت میں ثواب کے حصول کیلئے رمضان میں قیام کیا، تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا وصال ہو گیا اور یہ معاملہ اسی طرح تھا اور پھر حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ خلافت میں بھی یہی (ترغیب) معمول جاری رہا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی ایام میں بھی معاملہ یہی رہا۔ (مسلم)

تشریح: ''کان رسول اللّٰہ ﷺ یرغب من غیر أن یامرھم فیہ بعزیمۃ'' یعنی اسے فرض قرار دیئے بغیر آپ ﷺ اس کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عزیمت اور عزم سے مراد ہے کہ دل کو کسی کام پر پابند کرنا۔

''فیقول من قام رمضان'' اس جملے کے تین معنی ہیں:

① رمضان کی راتوں کو عبادت کے ذریعہ آباد کرے۔
② قیام رمضان یعنی تراویح کو ادا کرے۔
③ رمضان کی نماز کا اہتمام کرے۔

''ایمانًا'' یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہ وہ اللہ کا قرب حاصل کر رہا ہے۔

''واحتسابًا'' اپنے اس عمل پر اللہ سے اجر کی امید رکھے، اجر کے علاوہ کوئی چیز اس کا مقصود نہ ہو۔

یہ دونوں لفظ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہیں۔ انہیں مفعول لہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔

''غفرلہ ما تقدم من ذنبہ'' امام احمد کی روایت میں ''وما تأخر'' کے الفاظ بھی ہیں۔ اس سے مراد صغیرہ گناہوں ہیں۔ کبیرہ گناہوں کی معافی کی امید بھی کی جا سکتی ہے۔

''فتوفی رسول اللّٰہ ﷺ والأمر علی ذلك'' یعنی نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں بعض لوگ اپنے گھروں میں منفرد نماز پڑھتے تھے۔ بعض مسجد میں اس لئے پڑھتے تھے کہ معتکف کی حالت میں ہوتے تھے یا وہ اصحاب صفہ میں سے تھے یا ان کے

گھروں میں ایسے مشاغل تھے جو نماز سے رہنے والے تھے اس لئے وہ مسجد میں نماز پڑھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ پاس ان کا عمل حضور ﷺ کے اس زمان کے مخالف نہیں جس میں گھروں میں نماز تراویح پڑھنے کا حکم ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو کمی وزیادتی کے ساتھ نقل کیا ہے۔

نوافل نماز گھر میں پڑھنے کے اثرات

۱۲۹۷: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَضٰى اَحَدُكُمُ الصَّلَاةَ فِيْ مَسْجِدِهٖ فَلْيَجْعَلْ لِبَيْتِهٖ نَصِيْبًا مِّنْ صَلَاتِهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ جَاعِلٌ فِيْ بَيْتِهٖ مِنْ صَلَاتِهٖ خَيْرًا۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٥٣٩ حديث رقم (٢١٠- ٧٧٨)- وابن ماجه في السنن ١/٤٣٨ حديث رقم ١٣٧٦- وأحمد في المسند ٣/١٥-

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی اپنی فرض نماز اپنی مسجد میں پڑھ لے تو اس کو چاہیئے کہ اپنے گھر کے لیے بھی اس میں سے حصہ رکھے (یعنی نوافل اور سنن گھر میں پڑھے) اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس کی اس نماز کی وجہ سے اس کے گھر میں خیر پیدا فرمادیں گے۔ (مسلم)

تشریح: ''اذا قضی أحدکم الصلاۃ'' الصلاۃ میں الف لام عہد ذہنی ہے۔ اس سے مراد فرض نماز ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی کہنا ہے اور اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد وہ مطلق نماز ہو جسے آدمی مسجد میں پڑھے۔

''فلیجعل لبیتہ نصیبا من صلاتہ'' گھر کو بابرکت بنانے کیلئے سنن ونوافل یہاں تک کہ قضا نماز بھی گھر میں پڑھے۔

''فان اللّٰہ تعالیٰ جاعل فی بیتہ من صلاتہ خیراً'' یعنی گھر میں نماز پڑھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق وہدایت کے راستے کھلیں گے اور زندگی ورزق میں برکت ہوگی۔ اسی وجہ سے نفل نماز گھر میں پڑھنا افضل ہے خواہ مسجد بالکل خالی ہی کیوں نہ ہو۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا قول تو یہی ہے البتہ یہ ارشاد اس مسجد کے ساتھ تو خاص ہے جس میں نیکی کا اجر بڑھایا نہیں جاتا یا اس قول کی نسبت اس شخص کی طرف ہے جسے ریاء کا خوف ہو یا یہ نفاق کے وہم کو دور کرنے کیلئے ہے یا یہ تمام نوافل کو گھر میں پڑھنے کی ترغیب کیلئے ہے۔

واضح رہے کہ تراویح بالاتفاق اس ارشاد سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس پر نبی کریم ﷺ کا فعل بھی موجود ہے اور اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع بھی وارد ہے۔

مصنفؒ کے اس حدیث کو زیر بحث باب میں لانے سے ایک وہم ہوتا ہے جو ارباب دانش پر مخفی نہیں (یعنی یہ شبہ ہوتا ہے کہ تراویح کو بھی گھر میں ادا کرنا چاہیے)۔

الفصل الثانی:

حضور ﷺ کا آخری عشرہ کے بعض راتوں میں تراویح پڑھانا

۱۲۹۸: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ صُمْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَقُمْ بِنَا شَيْئًا مِنَ

الشَّھرِ حتّٰی بَقِیَ سَبْعٌ فَقَامَ بِنَا حَتّٰی ذَھَبَ ثُلُثُ اللَّیْلِ فَلَمَّا کَانَتِ السَّادِسَۃُ لَمْ یَقُمْ بِنَا فَلَمَّا کَانَتِ الْخَامِسَۃُ قَامَ بِنَا حَتّٰی ذَھَبَ شَطْرُ اللَّیْلِ فَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ لَوْنَفَّلْتَنَا قِیَامَ ھٰذِہِ اللَّیْلَۃِ فَقَالَ اِنَّ الرَّجُلَ اِذَا صَلّٰی مَعَ الْاِمَامِ حَتّٰی یَنْصَرِفَ حُسِبَ لَہٗ قِیَامُ لَیْلَۃٍ فَلَمَّا کَانَتِ الرَّابِعَۃُ لَمْ یَقُمْ بِنَا حَتّٰی بَقِیَ ثُلُثُ اللَّیْلِ فَلَمَّا کَانَتِ الثَّالِثَۃُ جَمَعَ اَھْلَہٗ وَنِسَاءَہٗ وَالنَّاسَ فَقَامَ بِنَا حَتّٰی خَشِیْنَا اَنْ یَّفُوْتَنَا الْفَلَاحُ قُلْتُ وَمَا الْفَلَاحُ قَالَ السَّحُوْرُ ثُمَّ لَمْ یَقُمْ بِنَا بَقِیَّۃَ الشَّھْرِ (رواہ ابوداود والترمذی والنسائی وروی ابن ماجۃ نحوہ اِلَّا اَنَّ الترمذی لَمْ یذکر) ثُمَّ لَمْ یَقُمْ بِنَابَقِیَّۃَ الشَّھْرِ۔

أخرجہ الترمذی فی السنن ۳/۱۶۹ حدیث رقم ۸۰۶۔ والنسائی ۳/۸۳ حدیث رقم ۱۳۶۴۔ وابن ماجہ ۱/۴۲۰ حدیث رقم ۱۳۲۷۔ والدارمی ۲/۴۲ حدیث رقم ۱۷۷۷۔ وأحمد فی المسند ۵/۱۵۹۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ رمضان المبارک کے روزے رکھے، پس آپ ﷺ نے مہینہ کے اکثر ایام میں (راتوں کو) ہمارے ساتھ قیام نہیں کیا (یعنی تراویح کی نماز نہیں پڑھائی) یہاں تک کہ جب سات راتیں باقی رہ گئیں، تو آپ ﷺ نے ہمارے ساتھ تہائی رات تک قیام کیا (یعنی ہمیں تراویح کی نماز پڑھائی) پس جب چھ راتیں رہ گئیں (یعنی چوبیسویں شب آگئی) تو آپ ﷺ نے ہمارے ساتھ قیام نہیں فرمایا، پھر جب پانچ راتیں رہ گئیں تو ہمارے ساتھ نصف اللیل تک قیام کیا میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کاش آج آپ ہمارے ساتھ قیام کو اور زیادہ کرتے (یعنی بڑھاتے تو کیا ہی مزہ تھا) تو آنحضرت نے ارشاد فرمایا کہ بے شک آدمی جب امام کے ساتھ فرض نماز پڑھ کر واپس آجاتا ہے تو اس کے لئے پوری رات کی عبادت کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ پس جب چار راتیں باقی رہ گئیں (یعنی چھبیسویں رات آئی) تو آپ ﷺ نے ہمارے ساتھ رات کو قیام نہ فرمایا (ہم انتظار کرتے رہے آپ ﷺ کے آنے کا) یہاں تک کہ تہائی رات باقی رہ گئی اور جب تین راتیں باقی بچ گئیں (یعنی ستائیسویں شب آئی) تو آپ ﷺ نے اپنے گھر کی عورتوں اور اپنے اہل خانہ اور تمام لوگوں کو جمع کیا، پس ہمارے ساتھ قیام کیا (یعنی ہمیں نماز پڑھاتے رہے) یہاں تک کہ ہمیں خوف لاحق ہوا کہ کہیں ہم سے فلاح فوت نہ ہو جائے، راوی کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا حضرت فلاح کیا چیز ہے تو فرمایا کہ وہ سحری ہے (یعنی سحری کھانا ہے) پھر بقیہ ایام رمضان کی راتوں میں حضور ﷺ نے ہمارے ساتھ قیام نہیں کیا۔ یہ ابوداؤد و ابن ماجہ ترمذی اور نسائی کی روایت ہے لیکن امام ترمذی نے آخری الفاظ کہ ثم لم یقم بنا بقیۃ الشھر نقل نہیں کیے۔

تشریح: ''فلم یقم بنا شیئا من الشھر'' یعنی نبی کریم ﷺ نے ہمیں رمضان میں فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہ پڑھائی جب آپ فرض ادا فرما لیتے تو حجرہ مبارک میں تشریف لے جاتے۔

''حتی بقی سبع'' یعنی سات دن باقی رہ گئے اور بائیس دن گزر گئے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سات دنوں کا ذکر یقینی دنوں کو دیکھتے ہوئے ہے کہ مہینہ کم از کم انتیس دن کا تو ہوگا۔

''فقام بنا'' یعنی تیسویں رات میں آپ نے قیام فرمایا۔

''حتی ذھب ثلث اللیل ''یعنی آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا، قرآن مجید کی تلاوت فرمائی اور معارف وحقائق سے لبریز گفتگو فرمائی

''فلما کانت السادسہ''اس سے مراد چوبیسویں رات ہے۔''فلما کانت الخامسۃ''اس سے مراد پچیسویں رات ہے۔

''یا رسول اللہ!لو نفلتنا''بالتشدید۔''قیام ھذہ اللیلۃ''ایک روایت بقیۃ لیلتنا کے الفاظ ہیں۔

علامہ مظہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ''لو''تمنی کیلئے ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اگر آپ قیام لیل میں نصف رات پر اضافہ فرمائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

ابن حجر نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ اسے پوری رات عبادت کرنے کا ثواب حاصل ہوگا یعنی یہ اجر فرض پڑھنے سے حاصل ہوجائے گا اور نوافل کی زیادتی نشاط پر موقوف ہے۔نیز یہاں امام کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز سے عشاء اور فجر کی نماز ہے۔

''فلما کانت الرابعۃ''اس سے مراد چھبیسویں رات ہے۔ابن حجر نے اسے ستائیسوں رات قرار دیا ہے جو کہ ان کی لغزش قلم ہے۔

علامہ حلیمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رمضان کی تمام راتوں میں برابر قیام کرنا سنت ہے اور مناسب یہ ہے کہ مساجد میں اس پر عمل کیا جائے،آخری عشرہ میں زیادہ کوشش کرنا مستحب ہے اور اس کیلئے جمع ہونا بدعت ہے۔سنت نہیں ہے۔

اس حدیث سے علامہ حلیمیؒ کے قول کی تردید ہورہی ہے کیونکہ اس سے فضیلت کے فرق والی راتوں میں قیام کی مقدار کا فرق بھی معلوم ہورہا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ستائیسویں رات میں پوری رات قیام فرمایا کیونکہ یہ اکثر علماء کے نزدیک شب قدر ہے،نیز اس میں مرد خواتین جمع ہوئے۔اس لئے بڑی وضاحت سے حلیمی کے قول کی تردید ہوگئی۔

''فلما کانت الثالثۃ''اس سے مراد ستائیسویں رات ہے۔

''جمع اھلہ ونساء والناس''الناس سے مراد خواص ہیں۔''السحور''بالضم والفتح۔

اگر فتحہ کے ساتھ تو اس کا معنی سحری میں کھایا جانے والا کھانا ہے اور اگر ضمہ کے ساتھ ہو تو یہ مصدر ہے اور اس سے مراد فعل سحری(سحری کا کھانا)ہے اکثر نے فتحہ کے ساتھ روایت کیا ہے لیکن صحیح ضمہ کے ساتھ ہے کیونکہ برکت' اجر اور ثواب فعل میں ہوتا ہے کھانے میں نہیں۔

قاضی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فلاح کو سجود سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ سحری کی وجہ سے روزہ پورا کرنے میں مدد ملتی ہے۔اور روزے کا اتمام آخرت میں فلاح کا سبب ہے۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فلاح کا معنی ہے بقاء،سحری کو فلاح سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ روزہ کی بقاء سحری کی وجہ سے ہوتی ہے۔

بعض محدثین کا کہنا یہ ہے کہ سحری روزہ کے اتمام پر مددگار رہوتی ہے اور روزہ کا اتمام آخرت کی کامیابی اور بقاء تک پہنچانے

والا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "السحر" کا لفظ متن حدیث ہے مؤلف کا کلام نہیں ہے جیسا کہ ابوداؤد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

ابن ملک نے اس موقع پر بڑی عجیب بات کہی کہ بعض کے خیال کے مطابق یہ ابوذرؓ کے الفاظ ہیں اور بعض کے نزدیک یہ متن حدیث ہے۔ درحقیقت ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں۔

ابن ملک رحمہ اللہ کی یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اسی قسم کی بات کی ہے انہوں نے لکھا ہے:

"قلت ای للنبی ﷺ" جیسا کہ ابوداؤد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے"۔

"ثم لم یقم بنا بقية الشهر" یعنی اٹھائیسویں اور انتیسویں رات کو آپ ﷺ نے ہمارے ساتھ قیام نہ فرمایا۔

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں نبی کریم ﷺ نے جماعت کے ساتھ جو نمازیں پڑھائی تھیں ان کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ تراویح تھی، واجب تہجد تھی، وتر کی نماز تھی یا صلاۃ قدر تھی؟"۔

درحقیقت ان تمام نمازوں کو جمع نہیں کیا جا سکتا ہے کیونکہ صلاۃ قدر تو غیر معروف ہے، وتر تین رکعات سے زیادہ نہیں ہو سکتے اور تہجد کو وجوب کے ساتھ مقید کرنا غیر مناسب ہے کیونکہ اس کا وجوب مشہور قول کے مطابق نبی کریم ﷺ سے بھی منسوخ ہو گیا ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ترمذی اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے اور اس کی تائید ابن حبان کی عبداللہ بن اُنیس کی نقل کردہ حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ ان دونوں احادیث سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان راتوں میں گھر کے بجائے مسجد میں نماز پڑھنا ہی زیادہ بہتر ہے۔ لہٰذا یہ دونوں احادیث "صلوا فی بیوتکم" کے امر سے خارج ہوں گی۔

شعبان کی پندرہویں رات کی فضیلت

۱۲۹۹: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ فَقَدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْلَةً فَإِذَا هُوَ بِالْبَقِيْعِ فَقَالَ أَكُنْتِ تَخَافِيْنَ أَنْ يَحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْكِ وَرَسُوْلُهُ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنِّيْ ظَنَنْتُ إِنَّكَ أَتَيْتَ بَعْضَ نِسَائِكَ فَقَالَ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَنْزِلُ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَغْفِرُ لِأَكْثَرَ مِنْ عَدَدِ شَعْرِ غَنَمِ كَلْبٍ (رواه الترمذی وابن ماجة وزاد رزين مِمَّنِ اسْتَحَقَّ النَّارَ وَقَالَ الترمذی سَمِعْتُ مُحَمَّدًا يَعْنِي الْبُخَارِيَّ يُضَعِّفُ هٰذَا الْحَدِيْثَ)

أخرجه الترمذی فی السنن ۳/۱۱۵ حديث رقم ۷۳۹۔ وابن ماجه ۱/۴۴۴ حديث رقم۱۳۸۹۔ وأحمد فی المسند ۶/۲۳۸۔

ترجمہ: حضرت اُمّ المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے ایک رات اللہ کے رسول اللہ ﷺ کو گم پایا (یعنی دیکھا کہ وہ میرے بستر پر نہیں ہیں میں نے آپ ﷺ کو تلاش کیا) تو اچانک آپ کو جنت البقیع میں پایا، تو آپ ﷺ نے

ارشاد فرمایا کیا تمہیں اس بات کا خوف دامن گیر ہوا کہ اللہ اور اس کا رسول اللہ ﷺ تجھ پر ظلم کریں گے۔ تو میں نے عرض کیا مجھے خیال گذرا کہ آپ کسی اور بیوی کے پاس تشریف لے گئے ہونگے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ماہِ شعبان کی نصف رات (یعنی پندرھویں شعبان کی شب) کو آسمانِ دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور قبیلہ بنو کلب کی بکریوں کے بالوں سے بھی زیادہ لوگوں کی مغفرت فرماتے ہیں۔ (یہ ترمذی وابن ماجہ کی روایت ہے) اور رزینؒ نے ممن استحق النار (یعنی ان لوگوں میں سے جو اپنی برائیوں کی وجہ سے جہنم کے مستحق ہو چکے ہیں بخشتا ہے) کے الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے محمد بن اسماعیل یعنی امام بخاری کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔

تشریح: ''فقدت رسول اللّٰہ ﷺ لیلۃ'' اس رات سے مراد حضرت عائشہؓ کے حصہ کی رات ہے۔

''فاذا ھو بالبقیع'' یہاں کچھ الفاظ محذوف ہیں جو ایک دوسری عبارت سے معلوم ہو رہے ہیں۔

''فشددت علی ثیابی وخرجت أتبع أثرہ فاذا ھو ساجد بالبقیع فأطال السجود حتی ظننت أنہ قبض، فلما سلم التفت الی''۔

''أکنت تخافین أن یحیف اللّٰہ علیك ورسولہ؟'' اللہ تعالیٰ کا ذکر بارگاہ الٰہی میں اپنے تقرب کو بتانے کیلئے ارشاد فرمایا جیسا کہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ کا ارشاد ہے۔

''ان الذین یبایعونك انما یبایعون اللّٰہ''

''بے شک جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے در حقیقت وہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں''۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کلام کو خوبصورت اور مزین بنانے کیلئے ہے۔ یا قرآن مجید کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔

''أم یخافون أن یحیف اللّٰہ علیھم ورسولہ'' محدثین فرماتے ہیں کہ أحیف أنا کے بجائے یحیف رسولہ کی تعبیر اختیار کرنے میں ایک خاص امر کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ حیف سے مراد ہے غیر مستحق کو دینا اور مستحق کو زبردستی محروم رکھنا اور یہ عمل رسول کے شایانِ شان نہیں ہے۔

علامہ طیبی نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ ''(اے عائشہ!) تو یہ خیال کرتی ہے کہ میں تیرے اوپر ظلم کروں گا اور تیری باری کسی اور کو دے دوں گا یہ تو منصب رسالت کے منافی ہے۔

نیز ماضی سے مضارع کی طرف عدول کرنے کی علت گزری ہوئی حالت کا استحضار ہے۔

''انی ظننت انك اتیت بعض نسائك'' یعنی میں سمجھی کہ شاید آپ کسی ضرورت کے سلسلہ میں کسی دوسری بیوی کے ہاں چلے گئے ہیں۔ سو میں اس کی تحقیق کیلئے نکلی تھی اور مجھے ایسا کرنے پر اس غیرت نے ابھارا جو عورتوں کو انجام سے بے خبر کر کے دائرہ عقل سے خارج کر دیتی ہے۔ حاصل یہ کہ میں نے یہ گمان نہیں کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ظلم کریں گے بلکہ میں تو یہ سمجھی کہ اللہ کے حکم یا اپنے اجتہاد کی بنا پر آپ کسی دوسری بیوی کے پاس چلے گئے ہیں کیونکہ آپ کی عادت مبارکہ تو یہ ہے کہ آپ گھر میں نوافل ادا کرتے ہیں۔

محدثین فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ہاں میں جواب دینے کے بجائے یہ ساری بات اس لئے ارشاد فرمائی کہ نبی کریم ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے خصوصی عفو و درگزر، محتسب و عاطفت اور شفقت و عنایت کا معاملہ فرماتے تھے۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ان سوکن کا پیالہ توڑا جنہوں نے حضور ﷺ کیلئے کھانا تیار کیا تھا تو آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ڈانٹا نہ تھا۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ''نعم'' (جی ہاں) کے ساتھ تو جواب دیتیں تو کفر لازم آتا اور ''لا'' (نہیں) کے ساتھ جواب اس لئے نہیں دیا کہ انکار کا نہ ہونا ظاہر تھا۔ چنانچہ ساری بات کو تفصیل سے بیان کر دیا، گھر سے نکلنے پر معذرت کی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا، نبی کریم ﷺ نے بھی شفقت و کرم کا معاملہ فرمایا اور ان کی تسلی کیلئے اپنے باہر آنے کا عذر بھی بیان کر دیا۔

''**ليلة النصف من شعبان**'' شعبان کی پندرہویں رات کو لیلۃ البراءت (شب برات) کہا جاتا ہے۔ اس مبارک رات میں اس سال میں وقوع پذیر ہونے والے تمام امور کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

''**الى السماء الدنيا**'' یعنی اللہ تعالیٰ دنیا والوں سے قریب ترین آسمان کا قصد فرماتا ہے جو مغفرت کے حصول اور رحمت کے نزول کا محتاج ہوتے ہیں۔ ظاہر حدیث یہ ہے کہ اس نزول سے مراد تجلی اعظم، رحمت کبریٰ کا نزول اور مغفرت عامہ ہے۔ خاص طور پر اہل بقیع کیلئے۔ یہ رات ان خصوصیات کی بنا پر باقی راتوں سے ممتاز ہے۔ اس لئے کہ باقی راتوں میں نزول رحمت ثلث لیل کے ساتھ خاص ہے۔

حاصل یہ کہ یہ وقت تجلیات رحمانیہ، تنزلات صمدانیہ اور تقربات سبحانیہ کا وقت ہے۔ یہ چیزیں عام و خاص کو حاصل ہوتی ہیں لیکن سب زیادہ حصہ ارباب اختصاص کو ملتا ہے، پس مناسب یہی ہے کہ غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر نفحات رحمت کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ گویا کہ نبی کریم ﷺ فرماتے رہے ہیں کہ میں بخشش طلب کرنے والوں کا رئیس، رحم طلب کرنے والوں کا فلیس (ساتھی)' گناہ گاروں کا شفیع اور بالخصوص رحمۃ اللعالمین ہوں تو میرے لئے یہی مناسب ہے کہ میں بارگاہ الٰہی میں زیادہ کروں اور اپنی امت کے لیے بخشش طلب کروں اور اپنے لئے رحمت کی زیادتی کا سوال کروں۔ کیونکہ کوئی شخص بھی اللہ کی رحمت سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

میں یہ کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہو تو کون ایسا شخص ہے جو جہنم کا مستحق نہ ہو۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے **من المؤمنين** کی قید کا اضافہ کیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے صراحتاً معلوم ہو رہا ہے:

''**ان الله لا يغفر ان يشرك به ويغفر مادون ذلك لمن يشاء**'' ۔

''اللہ تعالیٰ شرک کو تو معاف نہیں فرمائیں اس کے علاوہ جس کو چاہیں گے معاف فرمائیں گے''۔

''**وقال الترمذی: سمعت محمدًا۔ يعنی البخاری۔ يضعف هذا الحديث**'' اس حدیث کے بارے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ ''یحییٰ بن ابی کثیر کا سماع عروہ سے ثابت نہیں، اسی طرح حجاج بن ارطاۃ نے ابن ابی کثیر سے نہیں سنا''۔ اس تفصیل کو امام میرکؒ نے نقل کیا ہے۔ بہر حال علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فضائلِ اعمال میں ضعیف حدیث معمول بہ ہوتی ہے۔

شارحین کا کہنا یہ ہے کہ اس حدیث کی ترجمۃ الباب سے مناسبت یہ ہے کہ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ شعبان کی

پندرہویں رات کی عبادت میں بے انتہاء ثواب ہے تو گویا کہ یہ حدیث رمضان کے قیام کیلئے مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔
ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کلام چونکہ رات کے قیام کے بارے میں ہے اور اس کی مراد اعظم شب قدر پالینا ہے تو شب برات کا ذکر مقدمہ کے طور پر ہے کیونکہ بعض اولی الالباب کے نزدیک شب برات ہی شب قدر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

گھر میں نفل پڑھنے کی فضیلت مسجد نبوی پر

۱۳۰۰: وَعَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةُ الْمَرْءِ فِيْ بَيْتِهٖ اَفْضَلُ مِنْ صَلَاتِهٖ فِيْ مَسْجِدِيْ هٰذَا اِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ۔ (رواہ ابوداود والترمذی)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ١/٦٣٢ حديث رقم ١٠٤٤۔ والترمذي في السنن ٢/٣١٢ حديث رقم ٤٥٠۔

ترجمہ: حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کی اپنے گھر میں پڑھی جانے والی نماز میری اس مسجد میں پڑھی ہوئی نماز سے زیادہ بہتر ہے سوائے فرض نمازوں کے۔ (ابوداؤد، ترمذی)

تشریح: علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس میں نماز کو پوشیدگی سے پڑھنے کی ترغیب دینا ہے کیونکہ مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب مسجد حرام کے سوا دوسری مسجدوں میں ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ اس میں بتانا مقصود ہے کہ نوافل کی مشروعیت تقرب الی اللہ کیلئے ہے۔ پس مناسب یہ ہے کہ یہ ریاء سے بعید ہوں۔ فرائض کی مشروعیت دین کی اشاعت اور شعائر اسلام کے اظہار کیلئے ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ انہیں مسجد میں لوگوں کے سامنے ادا کیا جائے۔
''ھذا'' یہ مسجد کی صفت ہے۔ مسجد سے مراد مسجد نبوی ہے مطلقاً مسجد مراد نہیں ہے۔

الفصل الثالث:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تراویح کے لئے لوگوں کو ایک امام کے پیچھے جمع کرنا

۱۳۰۱: عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَبْدِالْقَارِيِّ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ لَيْلَةً اِلَى الْمَسْجِدِ فَاِذَا النَّاسُ اَوْزَاعٌ مُتَفَرِّقُوْنَ يُصَلِّي الرَّجُلُ لِنَفْسِهٖ وَيُصَلِّي الرَّجُلُ فَيُصَلِّيْ بِصَلَاتِهِ الرَّهْطُ فَقَالَ عُمَرُ اِنِّيْ لَوْجَمَعْتُ هٰؤُلَاءِ عَلٰى وَاحِدٍ لَكَانَ اَمْثَلَ ثُمَّ عَزَمَ فَجَمَعَهُمْ عَلٰى اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ ثُمَّ خَرَجْتُ مَعَهٗ لَيْلَةً اُخْرٰى وَالنَّاسُ يُصَلُّوْنَ بِصَلَاةِ قَارِئِهِمْ قَالَ عُمَرُ نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهٖ وَالَّتِيْ تَنَامُوْنَ عَنْهَا اَفْضَلُ مِنَ الَّتِيْ تَقُوْمُوْنَ يُرِيْدُ اٰخِرَ اللَّيْلِ وَكَانَ النَّاسُ يَقُوْمُوْنَ اَوَّلَهٗ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤/٢٥٠ حديث رقم ٢٠١٠۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن عبدالقاریؒ فرماتے ہیں کہ میں (رمضان المبارک کی) ایک رات حضرت عمر بن خطاب کے ساتھ مسجد کی طرف نکلا (تو ہم نے دیکھا) کہ لوگ بکھرے ہوئے متفرق تھے۔ کوئی تنہا نماز پڑھ رہا تھا اور کوئی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ مل کر نماز پڑھ رہا تھا (یعنی لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے فرمایا، اگر میں ان کو ایک قاری کے پیچھے جمع کر دوں تو یہ زیادہ مناسب ہوگا، پس آپؓ نے اس کا ارادہ فرمایا اور تمام لوگوں کو حضرت ابی بن کعبؓ کے پیچھے جمع کر دیا۔ راوی فرماتے ہیں کہ پھر ایک رات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد میں گیا تو دیکھا کہ وہاں سب لوگ اپنے امام (یعنی ابی بن کعب) کی اقتداء میں نمازِ تراویح پڑھ رہے تھے، تو عمر رضی اللہ عنہ نے (دیکھ کر) فرمایا کہ یہ اچھی بدعت ہے۔ اس وقت کی نماز جب تم سوتے رہتے ہو اس نماز سے بہتر ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مراد یہ تھی کہ تراویح کی نماز آخری شب میں پڑھنا اول شب سے زیادہ بہتر ہے یہ اسلئے فرمایا کہ لوگ اول شب میں پڑھ لیا کرتے تھے۔

راویٔ حدیث:

عبدالرحمٰن بن عبدالقاری۔ ان کا نام ''عبدالرحمٰن القاری'' ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوئے لیکن نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث کی سماعت کی' نہ روایت بیان کی۔ مؤرخ واقدی رحمہ اللہ نے ان صحابہ کے ذکر میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوئے میں ان کا بھی شمار کیا ہے لیکن مشہور یہ ہے کہ یہ تابعی ہیں۔ مدینہ کے تابعین اور وہاں کے علماء میں سے ہیں۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے احادیث سنی ہیں۔ ۸۱ھ میں بعمر ۷۸ سال وفات پائی۔ القاری میں قاف' راء زیر اور یاء مشدد ہے۔ آخر میں ہمزہ نہیں ہے۔ قبیلہ ''قارۃ'' کی طرف نسبت ہے۔

مرتب عرض کرتا ہے' علامہ طاہر پٹنی رحمہ اللہ لکھتے ہیں' کہا گیا ہے کہ اس کا نام ''دیش بن محلم'' (بروزن محدث) تھا۔

تشریح: ''عن عبدالرحمٰن بن عبدٍ القاری'' بالیاء المشددہ، قبیلہ قارۃ کی طرف نسبت ہے۔ مؤلف کا کہنا یہ ہے کہ عبدالرحمٰن مدینہ کے جلیل القدر تابعین میں سے ہیں۔ بعض کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رؤیت اور سماع ثابت نہیں۔ علامہ واقدی نے انہیں ان صحابہ میں شمار کیا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔

''الی المسجد'' مسجد سے مراد مسجد نبوی ہے۔

''فاذا الناس أوزاع'' بسکون الواو بعدھا زای''۔ یعنی لوگ عشاء کی نماز جماعت سے ادا کرنے کے بعد بکھر چکے تھے۔

''متفرقون'' علامہ ابہریؒ نے اس لفظ کو تاکید قرار دیا ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ کے نزدیک عطف بیان ہے۔ یہی قول راجح ہے۔

''یصلی الرجل نفسہ'' یہ ماقبل کے اجمال کی تفصیل ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ کچھ لوگ اکیلے نماز پڑھ رہے تھے اور کچھ جماعت سے۔ راوی کے اگلے قول ''ویصلی الرجل فیصلی بصلاتہ الرھط'' کا یہی معنی ہے۔

''فیصلی بصلاتہ الرھط'' ایک صحیح نسخہ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

''ویصلی الرجل فیصلی ای یتتدي بصلاتہ الرھط''

سید اصیل الدین کہتے ہیں کہ بخاری میں یونہی ہے اور اس کا ہونا بھی ضروری ہے لیکن مشکوٰۃ میں ان الفاظ کا سقوط ہے۔

بظاہر یہ سقوط نسخہ لکھنے والے کی طرف سے ہے۔

یہ الفاظ مشکوٰۃ کے بعض نسخوں میں بھی موجود ہیں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس جملے کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ ایک آدمی دس سے کم افراد کی امامت کر رہا تھا۔ ابن حجر کا کہنا بھی یہی ہے۔ بظاہر اس سے ان کی مراد مطلق جماعت، یا ان کی قوم یا ان کا قبیلہ ہے۔

''فقال عمر: انی لو'' ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک نسخہ میں ''انی أری لو'' کے الفاظ ہیں۔ انہی الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے ابن ملک نے کہا کہ کے فعل سے متعلق ہوتا ہے۔

''لكان أمثل'' یعنی اگر یہ سب ایک امام کی کی اقتداء کر لیں تو زیادہ ثواب اور فضیلت حاصل ہو کیونکہ اس طرح قلوب کا اجتماع ہوگا اور شیطان کی کمر ٹوٹے گی۔ نیز اعمال میں وزن پیدا ہوگا۔ علاوہ ازیں اس میں جماعت کے فضائل بھی حاصل ہوں گے جو ستائیس گنا تک بڑھ جاتے ہیں۔

''فجمعهم علی أبی بن کعب'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب لوگوں کو حضرت ابی بن کعبؓ کے پاس جمع کیا کیونکہ وہ صحابہ کرام میں سب سے بڑے قاری تھے۔ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قرآن پڑھنے کا حکم دیا تو انہوں نے سورۃ البینہ کی تلاوت کی تھی۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو تمیم داریؓ کے پاس جمع کیا تھا۔ ان دونوں روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ یہ دونوں الگ الگ واقعات تھے۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورتوں کو حضرت سلیمان بن ابی حثمہؓ کے پاس جمع کیا تھا۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کا مصداق نماز تراویح ہے کیونکہ یہ مقام مدح ہے۔ اور جماعت کے ساتھ اسے پڑھنے کی ترغیب دینا ہے۔ اگرچہ تراویح میں جماعت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نہ تھی لیکن اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا تھا اور اسے اس وجہ سے چھوڑ دیا تھا کہ کہیں یہ امت پر فرض نہ کر دی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر سے اس کی طرف توجہ دلائی اور اسے ہمیشہ کیلئے سنت قرار دیا۔ اب اس کی وجہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی ثواب ملے گا اور قیامت تک ادا کرنے والوں کا ثواب بھی ان کو ملتا رہے گا۔

''والتی تنامون عنها افضل من التی تقومون'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس جملے سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ تراویح کو رات کے آخری حصہ میں پڑھنا افضل ہے۔ اہل مکہ کا عمل اسی روایت کی بنا پر ہے کہ وہ تراویح سونے کے بعد اٹھ کر پڑھتے ہیں۔

اس جملہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے ساتھ نہ ملنے کی وجہ کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔

''یرید اخر اللیل'' یہ جملہ عبدالرحمٰن یا کسی اور راوی کی طرف سے ہے۔ اسی طرح اگلا جملہ ''وکان الناس یقومون أوّله'' بھی ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

تراویح کی تعداد رکعات

۱۳۰۲: وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ اَمَرَ عُمَرُ اُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ وَتَمِيْمًا الدَّارِيَّ اَنْ يَّقُوْمَا لِلنَّاسِ فِيْ رَمَضَانَ بِاِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً فَكَانَ الْقَارِئُ يَقْرَاُ بِالْمِئِيْنَ حَتّٰى كُنَّا نَعْتَمِدُ عَلَى الْعَصَاءِ مِنْ طُوْلِ الْقِيَامِ فَمَا كُنَّا نَنْصَرِفُ اِلَّا فِيْ فُرُوْعِ الْفَجْرِ۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ١/ ١١٥ حديث رقم ٤ من كتاب الصلاة في رمضان۔

ترجمہ: حضرت سائب بن یزیدؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعبؓ اور تمیم داریؓ کو حکم دیا کہ وہ رمضان میں لوگوں کو تراویح کی گیارہ رکعتیں پڑھائیں اور قاری سو سو ۱۰۰، ۱۰۰ آیات پڑھتا (ہر رکعت میں) یہاں تک ہم (طول قیام کی وجہ سے تھک کر) اپنی لاٹھیوں پر سہارا لیکر کھڑے ہوتے اور ہم نماز سے نہیں فارغ ہوتے تھے، مگر فجر کے قریب۔ (امام مالک)

تشریح: ''السائب بن یزید'' مؤلف فرماتے ہیں کہ یہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر اپنے والد کے ساتھ آئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر سات سال تھی۔

''ان یقوما للناس'' ایک نسخہ میں بالناس ہے۔ یعنی یہ دونوں حضرات باری باری امام بنیں۔ یہ باریاں نماز کے اعتبار سے بھی ہو سکتی ہیں۔ اور راتوں کے اعتبار سے بھی۔

''باحدیٰ عشرۃ رکعۃ'' شروع زمانہ میں گیارہ رکعات تھیں۔ جیسا کہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ یہ روایت راوی کا وہم ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی بیس رکعت تراویح پڑھی جاتی تھی۔

ابن عبدالبرؒ کے اس قول پر اعتراض ہوتا ہے کہ اس حدیث کی سند تو صحیح ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ گیارہ رکعات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عمل سے تشبیہ کیلئے پڑھی گئی ہوں کیونکہ روایات میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو آٹھ رکعات تراویح اور تین وتر پڑھائے تھے اگرچہ آپ کا معمول بیس رکعات پڑھنے کا تھا۔ تئیس رکعات والی نماز اس بنیاد پر ہے کہ راوی نے تین وتروں کو بھی اس میں شمار کیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وتر تین ہی ہیں۔ اور یہ تہجد کی نماز میں داخل نہیں ہیں۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ امام وہ سورتیں پڑھتے تھے جو سو آیات سے زیادہ تھیں، اس میں نہ تو زیادتی کو بتانا مقصود ہے اور نہ کسی مخصوص سورت کی نشاندہی کرنا مقصود ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ قرآن ختم کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ قول صحیح کے مطابق تراویح میں ختم قرآن سنت ہے۔

''فما کنا تنصرف الا فی فروع الفجر'' مراد یہ ہے کہ فجر کے آثار کی ابتداء میں نماز ختم ہوتی تھی اس لئے یہ آگے آنے والی اس روایت سے متعارض نہیں جس میں ذکر ہے کہ وہ لوگ واپس جانے کے بعد سحری کھایا کرتے تھے۔ شاید اتنی لمبی نماز آخری زمانے میں تھی۔ اس لئے یہ اس قول کے منافی نہیں جس میں آیا ہے ''والتی تنامون عنها افضل''۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس روایت سے حضرت عائشہؓ کی اس روایت کی تائید ہوتی ہے جس میں انہوں نے تراویح کی رکعات کی تعداد بیان کی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی تعداد کا حکم دیا اور ان کے زمانے میں لوگ بیس رکعات تراویح ہی پڑھتے تھے۔ پھر وہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بھی لمبی سورتیں پڑھتے تھے۔ اور طول قیام کی وجہ سے لاٹھیوں پر سہارا لیتے تھے۔ اسے سائب بن یزید نے نقل کیا ہے۔

حضرت علیؓ کے شاگرد شبر مہ بن شکل فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ لوگوں کو رمضان میں پانچ ترویحات میں بیس رکعات پڑھایا کرتے تھے۔

ابوعثمان نہدی کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین قاریوں کو بلوا کران سے قرآن سنا اور سب سے تیز پڑھنے والے سے کہا کہ لوگوں کو رمضان میں تیس آیات پڑھو اور درمیانی رفتار سے پڑھنے والے کو حکم دیا کہ پچیس (۲۵) آیات پڑھو اور سب سے آہستہ پڑھنے والے کو حکم دیا کہ وہ بیس آیات پڑھیں۔ امام سیوطیؒ نے اپنے رسالہ میں امام بیہقی کی ایک روایت نقل کی ہے جس سے مذکورہ روایت کی تائید ہوتی ہے۔

تراویح میں لمبی قراءت

۱۳۰۳: وَعَنِ الْاَعْرَجِ قَالَ مَا اَدْرَکْنَا النَّاسَ اِلَّا وَھُمْ یَلْعَنُوْنَ الْکَفَرَۃَ فِیْ رَمَضَانَ قَالَ وَکَانَ الْقَارِئُ یَقْرَأُ سُوْرَۃً فِیْ ثَمَانِیَ رَکْعَاتٍ فَاِذَا قَامَ بِھَا فِیْ ثِنْتَیْ عَشَرَۃَ رَکْعَۃً رَأَی النَّاسُ اَنَّہٗ قَدْ خَفَّفَ۔ (رواہ مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ۱/ ۱۱۵ حديث رقم ٦۔

ترجمہ: حضرت اعرجؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے نہیں پایا لوگوں کو مگر یہ کہ وہ کفار پر لعنت کرتے تھے رمضان المبارک میں اور قاری سورۂ بقرۃ کو تراویح کی آٹھ رکعتوں میں پڑھتا تھا اور کبھی کبھار سورۂ بقرہ کو بارہ رکعات میں پڑھتا، تو لوگ سمجھتے تھے کہ نماز ہلکی پڑھی گئی ہے۔ (امام مالک)

تشریح: ''الأعرج'' مشہور تابعین میں سے ہیں۔ ''ما أدركنا الناس'' الناس سے مراد صحابہ اور کبار تابعین ہیں۔

''الا وهم يلعنون الكفرة فى رمضان'' اس سے مراد یہ ہے کہ وتر کی نماز میں دعائے قنوت میں کفار پر لعنت کرتے تھے جیسا کہ علامہ جزری نے حصن میں یہ دعائے قنوت نقل کیا ہے:

''اللهم اغفر لنا وللمؤمنين والمؤمنات والمسلمين والمسلمات وألف بين قلوبهم وأصلح ذات بينهم وانصرهم على عدوهم اللهم العن الكفرة الذين يصدون عن سبيلك ويكذبون رسلك ويقاتلون أولياء ك، اللهم خالف بين كلمتهم وزلزل اقدامهم وأنزل بهم بأسك الذى لا ترده عن القوم المجرمين''

اس دعاء کو ابن ابی شیبہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً نقل کیا ہے اور یہ رمضان کے نصف اخیر کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ معنی لینے کی صورت میں اختلاف بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور روایات کے درمیان تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کے منافی بھی نہیں ہوگی جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ جب رمضان کا نصف گزر جائے تو کافروں پر

لعنت کرنا سنت ہے۔ اسی طرح یہ ابوداؤد کی روایت کے بھی متعارض نہ ہوگی۔ جس میں آیا ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حضرت ابی کے پاس جمع فرمایا تو انہوں نے رمضان کے نصف ثانی میں یہی دعائے قنوت پڑھی۔

اس روایت میں قنوت سے مراد وہ مخصوص قنوت ہے جس میں کافروں پر بالعموم لعنت کی جاتی ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں "اس حدیث کی وجہ سے ہمارے اصحاب نے اس بات کو مستحب قرار دیا ہے کہ وتر میں مندرجہ ذیل دعائے قنوت پڑھی جائے:

اللهم اهدنا فيمن هديت الخ "اور" اللهم انا نستعينك ونستغفرك ونستهديك ونؤمن بك......"

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ جب مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ مہینوں کی تعظیم نہ کی اور قرآن مجید سے ہدایت حاصل نہ کی تو وہ اس بات کے مستحق ہوگئے کہ ان کے حق میں بددعا کی جائے اور انہیں اللہ کی رحمت سے دور کیا جائے۔

نصف اخیر کی تخصیص میں ان کے زوال اور انجام بد کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

ابن تیمیہ حنبلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح میں عدد متعین کی تعیین نہیں فرمائی بلکہ کبھی رمضان اور غیر رمضان میں تیرہ رکعات پر اضافہ نہیں فرمایا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم لمبی لمبی رکعات پڑھا کرتے تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حضرت ابیؓ کے پاس جمع فرمایا تو وہ انہیں تراویح کی بیس رکعات پڑھایا کرتے تھے پھر وتر پڑھاتے وہ قراءت میں بھی تخفیف فرماتے تھے کیونکہ ایک رکعت کے بجائے زیادہ اور مختصر رکعات میں لوگوں کیلئے آسانی ہے۔ اسلاف کی ایک جماعت کے بارے میں منقول ہے کہ وہ چالیس رکعات تراویح پڑھتے تھے پھر تین رکعات وتر پڑھا کرتے تھے۔ کچھ حضرات چھتیس رکعات وتر پڑھنے کے بعد تین رکعات وتر پڑھتے تھے۔ یہ تمام کے تمام اعمال اچھے عمدہ ہیں۔ جس شخص کا یہ خیال ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رمضان کی تراویح میں کوئی معین اور طے شدہ مقدار منقول ہے۔ اس پر کمی زیادتی نہیں ہوسکتی تو یہ اس کی غلطی ہے۔

ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ باب النوافل میں ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن کا قول گزرا ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تراویح کی کیفیت کیا تھی؟ انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں بارہ رکعات سے زیادہ نہ پڑھتے تھے۔ باقی وہ حدیث جسے ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں، نیز طبرانی اور بیہقی نے بھی نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں وتر کے علاوہ بیس رکعات پڑھتے تھے۔ یہ روایت ابوبکر بن ابی شیبہ کے دادا ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان کی وجہ سے ضعیف ہے۔ اس کے ضعف پر اتفاق ہے۔ نیز یہ صحیح حدیث کی مخالف بھی ہے۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بیس رکعات تراویح پڑھنا ثابت ہے۔ موطا میں یزید بن رومانؒ سے منقول ہے کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ۲۳ رکعت پڑھا کرتے تھے۔

بیہقیؒ نے معرفۃ میں سائب بن یزید سے نقل کیا ہے کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں وتر کے علاوہ بیس رکعات پڑھا کرتے تھے۔ امام نووی نے خلاصہ میں اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ موطا میں گیارہ رکعات کی روایت ہے۔

ان دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ پہلے گیارہ رکعات (یعنی آٹھ تراویح) ہی پڑھی جاتی تھیں۔ بعد میں بیس رکعات تراویح پر سب کا اتفاق ہوگیا اب یہی منقول ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے خلفاء کی سنت کو اپنے سنت کا حکم دیا ہے۔لیکن اس سے بیس رکعات تراویح کا نبی کریم ﷺ کی سنت ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ حضور ﷺ کی سنت تو وہ ہوتی ہے جس پر آپ ﷺ نے ہمیشگی اختیار فرمائی ہو۔

مشائخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ سنت بیس رکعات تراویح پڑھنا ہے۔اس اعتبار سے قدوری کی عبارت (جس میں تراویح کے استحباب کا ذکر ہے) صاحب ہدایہ کی عبارت سے بہتر ہے (جس میں تراویح کے مسنون ہونے کا ذکر ہے۔البتہ قدوری کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے تمام رکعات مستحب ہیں جیسا کہ صاحب ہدایہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام رکعات مسنون ہیں۔پس ان دونوں کے کلام کو صحیح قرار دینے کی صورت یہ ہے کہ انہیں تغلیب پر محمول کیا جائے۔اس اعتبار سے صاحب ہدایہ کی عبارت زیادہ راجح ہوگی کیونکہ مسنون رکعات کی تعداد مستحب رکعات سے زیادہ ہے۔نیز یہ کہ نبی کریم ﷺ کا فعل صحابہ کے فعل سے افضل ہے۔اس میں صاحب ہدایہ کا قول عوام الناس کو اس کے عمل پر زیادہ ابھارنے والا ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہمارے جن مشائخ نے بیس رکعات تراویح کا قول اختیار کیا ہے شاید انہوں نے مصنف ابن ابی شیبہ کی اس روایت کو بنیاد بنایا ہے جس میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان میں وتر کے علاوہ بیس رکعات پڑھتے تھے۔اسی طرح امام بیہقی کی روایت جس میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رمضان کی دو راتوں میں دس سلاموں کے ساتھ بیس رکعات ادا فرمائیں اور تیسری رات میں تشریف نہیں لائے۔لیکن یہ دونوں روایتیں ضعیف ہیں۔ابن خزیمہ اور ابن حبان کی صحیح میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو آٹھ رکعات تراویح اور وتر پڑھائے۔لیکن صحابہ کرامؓ کا اس پر اجماع ہے کہ تراویح بیس رکعات پڑھی جائے گی۔

تراویح دیر سے پڑھنا بھی جائز ہے

۱۳۰۴: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ ابْنِ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَ سَمِعْتُ اُبَیًّا یَقُوْلُ کُنَّا نَنْصَرِفُ فِیْ رَمَضَانَ مِنَ الْقِیَامِ فَنَسْتَعْجِلُ الْخَدَمَ بِالطَّعَامِ مَخَافَةَ فَوْتِ السُّحُوْرِ وَفِیْ اُخْرٰی مَخَافَةَ الْفَجْرِ ۔ (رواہ مالک)

أخرجه مالك في الموطأ ١/١١٦ حديث رقم ٧ من كتاب الصلاة في رمضان ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابی ابن کعبؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہم جب رمضان مبارک میں قیام یعنی تراویح سے فارغ ہوتے تھے تو ہم خادموں سے کہتے تھے کہ جلدی کھانا لے آؤ، سحری کے وقت کے ختم ہونے کے خوف سے اور ایک دوسری روایت میں سحور کی بجائے فجر کے الفاظ ہیں، ہم فجر ہو جانے کے خوف سے خادموں سے جلدی کھانا لانے کا کہتے تھے۔(یہ مؤطا امام مالک کی روایت ہے)

تشریح: ''وعن عبداللّٰہ بن ابی بکر'' یہ ابن محمد بن عمرو بن حزم الانصاری المدنی ہیں۔یہ مدینہ کے بڑے علماء میں سے ہیں اور تابعی ہیں۔امام احمد ان کے بارے میں فرماتے ہیں: ''حدیثہ شفاء''۔

(کنا ننصرف فی رمضان من القیام) تراویح کو قیام اس وجہ سے کہا گیا کہ وہ لوگ تراویح میں لمبا قیام کیا کرتے تھے۔علامہ حلیمی نے اس کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ وہ لوگ نیند سے قیام کے بعد تراویح پڑھتے تھے۔اس لئے اسے قیام سے تعبیر کیا گیا۔علامہ حلیمی کی یہ بات درست نہیں کیونکہ اکثر حضرات نیند سے پہلے تراویح پڑھ لیا کرتے تھے۔

اللہ کی رحمت کے بغیر کوئی بھی جنت میں نہیں جا سکتا

۱۳۰۵: وَعَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هَلْ تَدْرِیْنَ مَافِیْ هٰذِهِ اللَّیْلَةِ یَعْنِیْ لَیْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ قَالَتْ مَافِیْهَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَالَ فِیْهَا اَنْ یُّکْتَبَ کُلُّ مَوْلُوْدٍ بَنِیْ اٰدَمَ فِیْ هٰذِهِ السَّنَةِ وَفِیْهَا اَنْ یُّکْتَبَ کُلُّ هَالِكٍ مِّنْ بَنِیْ اٰدَمَ فِیْ هٰذِهِ السَّنَةِ وَفِیْهَا تُرْفَعُ اَعْمَالُهُمْ وَفِیْهَا تُنَزَّلُ اَرْزَاقُهُمْ فَقَالَتْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَامِنْ اَحَدٍ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی فَقَالَ مَا مِنْ اَحَدٍ یَّدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی ثَلَاثًا قُلْتُ وَلَا اَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَوَضَعَ یَدَهٗ عَلٰی هَامَّتِهٖ فَقَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ مِنْهُ بِرَحْمَتِهٖ یَقُوْلُهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ۔ (رواہ البیهقی فی الداعوت الکبیر)

أخرجه ابن ماجه فی السنن ۱/ ٤٤٥ حدیث رقم ۱۳۹۰۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تم جانتی ہو کہ اس رات میں یعنی شعبان کی پندرہویں رات میں کیا ہوتا ہے؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے عرض کیا آپ ہی بتائیں کیا ہوتا ہے؟ تو فرمایا کہ اس رات میں یہ ہوتا ہے کہ بنی آدم کا ہر وہ شخص جو اس سال میں پیدا ہونے والا ہوتا ہے اس رات میں لکھ دیا جاتا ہے اور بنی آدم کا وہ شخص جو اسی سال میں ہلاک ہونے والا ہوتا ہے وہ بھی اس رات میں لکھا دیا جاتا ہے اور اس رات میں بندوں کے اعمال اوپر اٹھائے جاتے ہیں' اس میں ان کے رزق اتارے جاتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، اے اللہ کے رسول! اللہ کی رحمت کے بغیر کوئی شخص بھی جنت میں داخل نہیں ہوگا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نہیں ہے کوئی ایک بھی جو جنت میں داخل ہو، سوائے اللہ کی رحمت کے، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا۔ میں نے کہا، اور آپ بھی اللہ کی رحمت کے بغیر جنت میں داخل نہیں ہونگے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھا اور فرمایا میں بھی (یعنی میں بھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا) مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے رحمت سے ڈھانپ لے اور یہ الفاظ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ارشاد فرمائے۔ (بیہقی، کتاب الدعوات)

تشریح: ''قال هل تدرین ما فی هذه اللیلة'' یعنی اے عائشہ! کیا تم اس رات میں پائی جانے والی عظمت وقدرت اور تقدیری فیصلوں کے بارے میں جانتی ہو۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم استفہام تقریری کے ذریعہ اس رات اور اس میں پیش آنے واقعات کی طرف تنبیہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ امت پوری طرح اس کو جان لے اور اس میں عبادت، دعا اور غور و فکر کے ذریعہ اس کو زندہ کرے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ نے بھی استفہام تقریری لینے کے سلسلہ میں ابن حجر کی اقتداء کی ہے۔ لیکن اس استفہام کو تقریر کے معنی میں لینا منقول نہیں ہے۔

''فیها أن یکتب'' کتابت سے کتابت ثانیہ ہے۔ لوح محفوظ کے بعد کا لکھنا مراد ہے۔

''کل مولود من بنی آدم'' بنو آدم کی تخصیص ان کی شرافت کی وجہ سے ہے۔

''وفیھا ان یکتب کل ھالك من بنی ادم فی ھذہ السنة'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں بھی یہی ارشاد ہے:

''فیھا یفرق کل أمر حکیم''۔''اس رات میں ہر اہم حکم کو تقسیم کر دیا جاتا ہے''۔ جیسے بندوں کے رزق اور ان کی زندگیاں وغیرہ۔

''وفیھا ترفع أعمالھم'' یعنی اس رات میں ان تمام اعمال صالحہ کو لکھا جاتا ہے جو اس سال میں واقع ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت عائشہؓ نے ما من أحدٍ...... کے الفاظ سے سوال کیا۔ یہ استفہام علی سبیل التقریر ہے یعنی جب اس رات میں اعمال صالحہ اپنے وجود سے پہلے ہی لکھ لئے جاتے ہیں تو اس سے لازم آتا ہے کہ جنت میں اللہ کی رحمت کے بغیر کوئی داخل نہیں ہوسکتا ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں آیا ہے کہ اس رات میں بندوں کے اعمال ملا اعلیٰ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں۔ جبکہ دوسری روایت میں آتا ہے کہ رات کے اعمال فجر کی نماز کے بعد اور دن کے اعمال عصر کی نماز کے بعد بارگاہ الٰہی میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ پیر اور جمعرات کے دن بھی بندوں کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ اس تعارض کا حل یہ ہے کہ نصف شعبان میں رفع اعمال سے مراد عام ہے یعنی پورے سال کے اعمال کو عمومی طور پر بارگاہ الٰہی میں پیش کیا جاتا ہے۔ جبکہ دوسرے ارفع سے مراد اسی دن اور رات کے خاص اعمال ہیں۔ جبکہ تیسرے رفع سے مراد اس ہفتہ کے اعمال ہیں۔ اس تکرار کی حکمت اعمال صالحہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی اور اعمال بد کرنے والوں کی حوصلہ شکنی ہے۔

شارح نے اعمال کو اعمال صالحہ کے ساتھ مقید کیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''الیه لصیعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعه''

''اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور عمل صالح اسی کی طرف اٹھتے ہیں''۔

یہ بات واضح ہے کہ آیت سے یہ بات معلوم نہیں ہورہی کیونکہ آیت میں رفع سے مراد قبولیت ہے۔ جبکہ حدیث میں یہ مراد نہیں۔

''ازراقھم'' رزق سے مراد اس کے اسباب اور مقدار ہیں۔ یہ حسی اور معنوی دونوں طرح کے فرق کو شامل ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل اس صورت میں درست قرار دی جاسکتی ہے جب ''فیھا یفرق کل امر حکیم'' سے شب برات مراد ہو حالانکہ قرآن مجید صراحت کے ساتھ اس کی تردید کر رہا ہے کیونکہ ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں قرآن مجید نازل ہوا جبکہ ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید لیلۃ القدر میں نازل ہوا۔ لیکن ان دونوں آیات میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ شب قدر رمضان کی ایک رات ہے۔ اور اس نزول سے مراد قرآن مجید کا لوح محفوظ تک یکبارگی نازل ہونا مراد ہے۔ پھر نبی کریم ﷺ پر لوح محفوظ سے آہستہ آہستہ مصالح کے پیش نظر نازل ہوتا رہا۔ جب یہ ثابت ہوا کہ قرآن کا نزول لیلۃ القدر میں ہے اور یہ رات وہی ہے جس میں ہر امر حکیم کا فیصلہ ہوتا ہے تو اس آیت سے شب قدر ہی مراد ہے شب برات مراد نہیں ہوسکتی۔ نیز یہ بات اس حدیث سے معلوم ہورہی ہے کہ شب برات میں ہر اہم امر کا فیصلہ ہوتا ہے۔ تو یہ کہا جائے گا کہ آیت میں شب برات نہیں بلکہ شب قدر مراد ہے البتہ شب قدر اور شب برات دونوں میں ہر اہم امر کا فیصلہ طے ہوتا ہے۔

اس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ فیصلے شب برات میں شروع ہوتے ہیں اور شب قدر تک جاری رہتے ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ایک رات میں دنیاوی اعمال اور دوسری رات میں اخروی اعمال کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

اس میں اور بھی عقلی احتمالات موجود ہیں۔

''فقالت یا رسول اللّٰہ! مامن احد'' ما زائدہ اور استغراق کی تاکید کیلئے ہے۔

''ما من أحد یدخل الجنة الا برحمة اللّٰہ تعالٰی'' یعنی ہر شخص جنت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہی داخل ہوگا۔ یہ حدیث قرآن مجید کی اس آیت سے بظاہر متعارض نظر آتی ہے:

''وتلك الجنة التی أورثتموها بما کنتم تعملون''۔ ''تم اس جنت کے وارث بنائے گئے اپنے اعمال کی وجہ سے''۔

اس تعارض کا جواب یہ ہے کہ عمل دخول جنت کا سبب صوری ہے اور سبب حقیقی رحمت باری تعالیٰ ہے۔ ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ دخول جنت تو رحمت باری تعالیٰ کی بنا پر ہوگا لیکن تفاوت درجات تفاوت طاعات کی بنا پر ہوگا۔

''ثلاثا'' یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قول کو تین مرتبہ ارشاد فرمایا۔ یہ تکرار تاکید کیلئے ہے یا حالات ثلثہ کے اعتبار سے ہے۔ عفیف کے نسخہ میں لفظ ''ثلاثہ'' مذکور نہیں۔

''أن یتغمدنی اللّٰہ'' یتغمد، الغمد سے ماخوذ ہے، اس کا معنی ہے نیام۔

''ثلاث مرات'' اس جملہ کو بھی تاکید کیلئے پہلے کے مطابق کرنے کیلئے تین مرتبہ ارشاد فرمایا۔

بعض بدبخت اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ سے بھی محروم ہوتے ہیں

۱۳۰۶: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَیَطَّلِعُ فِیْ لَیْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَیَغْفِرُ لِجَمِیْعِ خَلْقِهٖ اِلَّا لِمُشْرِكٍ اَوْ مُشَاحِنٍ (رواہ ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه فی السنن ۱/۴۴۴ حدیث رقم ۱۳۸۸۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ متوجہ ہوتے ہیں نصف شعبان کی رات میں (دنیا والوں کی طرف) پس اپنی تمام مخلوق کی بخشش فرما دیتے ہیں، سوائے مشرک اور کینہ رکھنے والے کے۔ یہ ابن ماجہ کی روایت ہے۔

تشریح: ''قال ان اللّٰہ تعالٰی لیطلع'' بتشدید الطاء۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر اپنی رحمت کے مظہر کے ساتھ تجلی فرماتے ہیں۔ ابن حجر رحمہ اللہ کا کہنا یہی ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یطلع، ینزل کے معنی میں ہے۔

بہتر اور راجح یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ بندوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

''فیغفر لجمیع خلقه'' اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنے گناہ کا اقرار اور کوتاہی کا اعتراف کرنے والا ہو۔

''الا لمشرك'' یعنی کافر، خواہ وہ کسی بھی قسم کا کفر کرنے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ شرک کرنے والے کو معاف نہیں فرماتے۔

''مشاحن'' وہ شخص جو کسی سے دشمنی اور کینہ رکھنے والا ہو۔ یہ دشمنی دین کی وجہ سے نہ ہو (بلکہ اس کے پیچھے کوئی دنیاوی غرض ہو)۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رات میں اپنے بندوں سے درگزر فرماتے ہیں لیکن کفر کرنے والے کو اور بندوں کے حقوق میں کمی کرنے والوں کو معاف نہیں فرماتے۔ یہاں تک کہ وہ توبہ کرلے ورنہ اس کے عذاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شحناء سے مراد عداوت و دشمنی ہے۔ اس سے مراد وہ دشمنی ہے جو مسلمانوں کے درمیان نفس امارہ بالسوء کی وجہ سے پیدا ہوا اور کوئی دوسرا ان کے ہاتھ اور زبان سے محفوظ نہ رہے کیونکہ یہ عمل قتل تک پہنچانے والا ہے اور اس سے بعض اوقات کفر کا اندیشہ بھی ہوتا ہے کیونکہ کبھی انسان اپنے دشمن کی جان و مال فرط غضب میں آکر حلال اور مباح سمجھنے لگتا ہے۔ اسی وجہ سے ایک روایت میں مشاحن کو قاتل النفس کے ساتھ لایا گیا ہے۔ ان دونوں میں تہدید علی سبیل التغلیظ ہے۔

۱۳۰۷: ورواه احمد عن عبدالله بن عمرو بن العاص وفی روایته اِلَّا اثْنَيْنِ مُشَاحِنٌ وَقَاتِلُ نَفْسٍ۔

ترجمہ: اور امام احمد نے اس روایت کو عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور ان کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ کینہ رکھنے والے اور کسی کو ناحق قتل کرنے والے (کے علاوہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی بخشش فرما دیتا ہے)۔

''فی روایة'' یعنی امام احمد رحمہ اللہ کی روایت میں۔

''مشاحن'' بالرفع ای هما مشاحن''۔

''وقاتل نفس'' یعنی جان بوجھ کر کسی کو ناحق قتل کرنے والا۔ ان دونوں کو بدلیت کی بنا پر مجرور پڑھنا بھی جائز ہے۔

پندرھویں شعبان کے روزے اور رات کی عبادت کی فضیلت

۱۳۰۸: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَتْ لَيْلَةُ النِّصْفُ مِنْ شَعْبَانَ فَقُوْمُوْا لَيْلَهَا وَصُوْمُوْا يَوْمَهَا فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَنْزِلُ فِيْهَا لِغُرُوْبِ الشَّمْسِ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ اَلَامِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَاَغْفِرَلَهٗ اَلَامُسْتَرْزِقٌ فَاَرْزُقَهٗ اَلَا مُبْتَلًى فَاُعَافِيَهٗ اَلَا كَذَا اَلَا كَذَا حَتّٰى يَطْلُعَ الْفَجْرُ۔

(رواه ابن ماجة).

أخرجه البخاري في صحيحه ١/٤٨٤۔ حديث رقم ٣٥٧۔ ومسلم في صحيحه ١/٤٩٨ حديث رقم (٨٢۔ ٣٣٦) و ابوداود في السنن حديث رقم ١٢٩١ والترمذي ٢/٣٣٨ حديث رقم ٤٧٤۔ والنسائي ١/٢٠٢ حديث رقم ٤١٥۔ والدارمي ١/٤٠٢ حديث رقم ١٢٩١۔ وفي الموطأ ١/١٥٢ حديث رقم ٢٨ من كتاب قصر الصلاة۔ وأحمد في المسند ٦/٤٢٣۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب نصف شعبان کی رات ہو تو اس رات میں نماز پڑھو اور اس کے دن کا روزہ رکھو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس رات میں سورج غروب ہوتے ہی آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے (یعنی اپنی رحمت کے ساتھ بندوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے) اور فرماتا ہے خبردار کیا کوئی ہے بخشش مانگنے والا کہ میں اس کو بخش دوں، کیا کوئی ہے رزق مانگنے والا کہ میں اس کو رزق دوں، کیا ہے کوئی مصیبت میں مبتلا کہ میں اس کو

نجات دوں، کیا ہے کوئی ایسا ایسا (یعنی اللہ تعالیٰ ضرورتوں کے نام لے لے کر پکارتے رہتے ہیں، مثلاً ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اس کو دوں وغیرہ) یہاں تک کہ صبح ہو جاتی ہے۔ (ابن ماجہ)

تشریح: ''اذا كانت ليلة نصف من شعبان، فقوموا ليلها'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ظاہر تو یہ ہے کہ ''فقوموا فيها'' کہا جائے لیکن جب ظاہر کو ضمیر کے قائم مقام رکھا گیا تو ليلة النصف کہا جائے گا۔ پس نصف کا اعتبار کرتے ہوئے ضمیر کو مونث لایا گیا وہ اس رات کا عین ہے۔

''الی السماء الدنيا'' یہ ناظر کی تضمین کے ساتھ ینزل کے ساتھ متعلق ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں لیل سے مراد رات کا بعض حصہ ہے کیونکہ رات کے بعض حصہ پر بھی رات کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں بھی یہی مراد ہے:

''كان يصلي ليلاً طويلاً قائمًا''

میں کہتا ہوں کہ یہ بعضیت تنکیر سے ماخوذ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول: ''ليلاً من المسجد الحرام''

یہ بات درست نہیں کہ لفظ لیل کو مطلق بولا جائے تو اس سے بعض لیل مراد لیا جائے۔ اضافت کے ساتھ تو یہ معنی کسی صورت میں درست نہیں ہو سکتا۔

''فيقول'' اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کا منادی اللہ کی طرف سے اعلان کرتا ہے۔

''فأعافيه'' بہت سے پریشان حال لوگ عافیت کی دعا کرتے ہیں لیکن دعا کی شرائط پوری نہ ہونے کی وجہ سے ان کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

حضرت عمر بن خطاب اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور بہت سے اکابرین سے منقول ہے کہ وہ یہ مانگا کرتے تھے:

''اللهم ان كنت كتبتنا أشقياء فامحه واكتبنا سعداء وان كنت كتبتنا سعداء فاثبتنا فانك تمحوما تشاء وتثبت وعندك أم الكتاب''۔

اس دعا کے بارے میں حدیث میں منقول ہے کہ نصف شعبان کی رات کو یہ دعا پڑھنی چاہیے لیکن یہ حدیث قوی نہیں ہے۔ جیسا کہ سید معین الدین صفوی کی تفسیر میں مذکور ہے۔

اس حدیث میں کتابت سے مراد کتابت اولیٰ معلقہ ہے کیونکہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی بات تبدیل نہیں ہو سکتی۔

اللالی میں مذکور ہے کہ نصف شعبان میں سو رکعات اس طرح پڑھنا کہ ہر رکعت میں دس مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھے، بڑے ثواب کا عمل ہے۔ اس قسم کی روایات موضوع ہیں۔

علی بن ابراہیم اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں کہ شب برات میں پائی جانے والی بدعات میں سے ایک دس دس مرتبہ سورۂ اخلاص کے ساتھ سو رکعات پڑھنا بھی ہے۔ بہت سے لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں حالانکہ اس کے بارے کوئی خبر یا اثر معلوم نہیں سوائے ایک ضعیف یا موضوع حدیث کے۔

صاحب قوت اور صاحب احیاء وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عوام الناس کیلئے یہ نماز بہت

بڑا فتنہ ثابت ہوئی اور بزرگان دین اس بدعت کی بنا پر بہت خشت کا شکار ہوئے اور اسے بڑے فتنوں میں شمار کیا۔

اس نماز کی ابتداء بیت المقدس میں سن ۴۴۸ ھ میں ہوئی۔ مساجد کے جاہل ائمہ نے لوگوں کو جمع کرنے، سرداری و شہرت کے حصول اور لوگوں کو قابو کرنے کیلئے اسے صلاۃ الرغائب وغیرہ کے ساتھ ملا کر پڑھنا شروع کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ائمہ ہدیٰ کو اس فتنہ کو ختم کرنے کی طرف متوجہ کیا اور انہوں نے آٹھویں صدی کی ابتداء تک مصر اور شام کے علاقوں سے اسے ختم کر دیا۔

میں کہتا ہوں کہ خبر ضعیف پر عمل کرنا جائز ہے۔ نیز علماء نے اس سے صرف اس لئے منع کیا کہ یہ نماز اپنے ساتھ بہت سی منکرات کو لائی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''ارایت الذی ینھی عبدا اذا صلی'' کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو بندے کو نماز سے منع کرتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتداء برامکہ سے ہوئی۔ وہ پہلے آگ کی پوجا کرتے تھے جب وہ اسلام میں داخل ہوئے تو انہوں نے ان چیزوں کو اسلام میں داخل کیا جنہیں وہ دین کی سنتوں میں سمجھتے تھے اور ان کا مقصود آگ کی عبادت کرنا ہوتا ہے وہ مسلمانوں کے ساتھ رکوع سجدہ بھی آگ کو کرتے تھے۔

علامہ طرطوسی رحمۃ اللہ علیہ نے تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر جمع ہونے اور سٹیج لگانے کو بدعت قرار دیا ہے میں کہتا ہوں کہ علامہ طرطوسی کی فطانت وفراست پر قربان جائیں۔ اب تو اس عمل میں اہل حرمین شریفین بھی شریک ہیں حتی کہ ختم قرآن کے موقع پر مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کا ایسا اجتماع ہوتا ہے جو عید اور جمعہ کے دن بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ اس کی وجہ سے بہت سے منکرات جنم لیتے ہیں وہ آگ کی طرف رخ کرتے ہیں اور بیت اللہ کی طرف پشت پھیر لیتے۔ وہ مطاف میں آگ کی پوجا کرنے والوں کی طرح کھڑے ہو کر طواف کرنے والوں کیلئے جگہ تنگ کر دیتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے عفو و عافیت اور غفران ورضوان کا سوال کرتے ہیں۔ و اللہ المستعان۔

بَابُ صَلٰوةِ الضُّحٰی

نمازِ ضحیٰ کا بیان

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چاشت کے وقت سے مراد دن کا وہ حصہ ہے جب سورج پوری طرح بلند ہو جائے اور اس کی شعاعیں زمین پر چھا جائیں۔

اس کی ترکیب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اصل عبارت ''صلاۃ وقت الضحی'' ہے۔ لیکن راجح یہ ہے کہ صلاۃ کی اضافت الضحیٰ کی طرف فی کے معنی میں ہے جیسے صلاۃ اللیل و صلاۃ النھار۔

علامہ میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الضحوۃ (بفتح المعجمۃ وسکون المھملۃ) کا معنی ہے ارتفاع النھار، اسی طرح الضحیٰ (بالمد و القصہ) کا معنی ہے دن کا روشن ہونا۔

چاشت کے وقت کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ دن کے چوتھائی حصہ کے گزرنے کے بعد زوال سے تھوڑی دیر پہلے

تک ہوتا ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ تو وقت متعارف ہے وگرنہ اس کا اصل وقت وہی ہے جو اشراق کی نماز کا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اشراق کے وقت سے چاشت کے وقت کی ابتداء ہوتی ہے۔

ضحی مشتق ہے ضحو اور ضحوۃ سے، اس کا معنی ہے سورج کا بلند ہونا، دن کا چڑھنا اور چاشت کا وقت ہونا اور اس وقت پڑھی جانے والی نماز کو صلوٰۃ ضحیٰ کہتے ہیں، ضحیٰ کی عموماً دو نمازیں ہیں: نماز اشراق، نماز چاشت۔

نماز اشراق:

یہ جب سورج ایک نیزہ بلند ہو جائے اور مکروہ وقت ختم ہو جائے یہ اس وقت پڑھی جاتی ہے اور عربی کی اصطلاح میں اس کو ضحوہ صغریٰ بھی کہتے ہیں۔ نماز اشراق کی کم از کم دو رکعتیں ہیں، اور زیادہ سے زیادہ چھ رکعتیں ہیں۔

نماز چاشت:

یہ نماز اس وقت پڑھی جاتی ہے جب سورج بلند ہو جائے اور دوپہر شروع ہو جائے اور گرمی پیدا ہو جائے، اور عربی میں اس کو ضحوہ کبریٰ کہتے ہیں۔ نماز چاشت کی کم از کم دو رکعتیں ہیں اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعتیں ہیں، لیکن مختار مذہب یہ ہے کہ چاشت کی چار رکعتیں پڑھنا بہتر ہے کیونکہ صحیح احادیث اور آثار صحابہؓ سے چار رکعتیں پڑھنا ہی منقول ہیں۔ امام نسائی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اشراق اور چاشت دونوں پڑھتے تھے، فرماتے ہیں کہ جب آفتاب مشرق کی جانب ایسا ہوتا جیسا کہ عصر کے وقت مغرب کی جانب ہوتا ہے تو آنحضرت ﷺ دو رکعت نماز پڑھتے تھے (یہ نماز اشراق ہوتی تھی) اور جب آفتاب شرق کی جانب ایسا ہوتا جیسا کہ ظہر کے وقت مغرب کی جانب ہوتا ہے تو آپ ﷺ چار رکعتیں پڑھتے تھے (یہ صلوٰۃ چاشت تھی)۔

صلوٰۃ ضحیٰ کا حکم:

اکثر علماء کے نزدیک یہ مستحب ہے کیونکہ اس کی فضیلت بہت زیادہ منقول ہے۔ شیخ ولی الدین ابن عراقی فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ ضحیٰ کے بارے میں صحیح اور مشہور روایتیں بہت زیادہ منقول ہیں یہاں تک کہ محمد ابن جریر طبرانی فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ ضحیٰ کے متعلق جو احادیث منقول ہیں وہ تواتر کا درجہ رکھتی ہیں۔

علامہ سیوطی نے علامہ دیلمی کے حوالے سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ صلوٰۃ ضحیٰ حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز ہے وہ اکثر اسے پڑھا کرتے تھے۔ اور علامہ ابن نجار نے حضرت ثوبانؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ صلوٰۃ ضحیٰ وہ عظیم نماز ہے جسے حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام نے ہمیشہ پڑھا، اور علامہ قاضی ابوبکر فرماتے ہیں کہ یہ پچھلے انبیاء اور رسل کی نماز ہے۔

الفصل الاول:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چاشت کی نماز

۱۳۰۹: عَنْ اُمِّ هَانِيءٍ قَالَتْ اِنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ بَيْتَهَا يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ فَاغْتَسَلَ وَصَلّٰى ثَمَانِيَ رَكْعَاتٍ فَلَمْ اَرَ صَلَاةً قَطُّ اَخَفَّ مِنْهَا غَيْرَ اَنَّهُ يُتِمُّ الرُّكُوْعَ وَالسُّجُوْدَ وَقَالَتْ فِيْ رِوَايَةٍ اُخْرٰى وَذٰلِكَ ضُحًى۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٨٤/١۔ حديث رقم ٣٥٧۔ ومسلم في صحيحه ٤٩٨/١ حديث رقم (٨٢۔ ٣٣٦) و ابوداود في السنن حديث رقم ١٢٩١ والترمذى ٣٣٨/٢ حديث رقم ٤٧٤۔ والنسائي ٢٠٢/١ حديث رقم ٤١٥۔ والدارمي ٤٠٢/١ حديث رقم ١٢٩١۔ وفي الموطأ ١٥٢/١ حديث رقم ٢٨ من كتاب قصر الصلاة۔ وأحمد في المسند ٤٢٣/٦۔

ترجمہ: حضرت ام ہانیؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن میرے گھر میں تشریف لائے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کیا اور پھر آٹھ رکعات نماز (چاشت) پڑھی میں نے اس سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے ہلکی نماز نہیں دیکھی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع و سجود پورا کرتے تھے۔ ایک دوسری روایت میں فرماتی ہیں کہ یہ چاشت کی نماز تھی۔ (بخاری)

تشریح: ''عن أم هانيء'' بهمزة بعد النون۔ ان کا اصل نام فاختہ تھا اور حضرت علیؓ کی بہن ہیں۔

''وصلى ثماني ركعات'' دو سلاموں کے ساتھ یا چار کے ساتھ، دونوں احتمال ہیں۔

''أخف منها'' اس نماز کی تخفیف لمبی سورتوں اور ذکر طویل کو ترک کرنے کی بنا پر تھی۔

''غير أنه أيتم الركوع والسجود'' علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''غیر'' استثناء کی بنا پر منصوب ہے۔ اس جملہ میں، رکوع و سجود کی طمانیت کے مہتم بالشان ہونے کو بتانا مقصود ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع و سجود کے علاوہ باقی تمام ارکان میں تخفیف فرمائی لیکن ان دونوں کو خوب طمانیت سے ادا فرمایا۔

ملا حنفی کہتے ہیں کہ غیر استثناء کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ اس سوال مقدر کو دور کرنے کیلئے ہے جو ما رأيته کے قول سے پیدا ہوا تھا۔

وہ سوال یہ تھا کہ اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع و سجود کو پوری طرح ادا نہیں فرمایا۔ ان دونوں کی تخصیص اس وجہ سے ہے کہ اکثر تساہل انہی دو میں ہوتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ تر چاشت میں چار رکعات پڑھتے تھے

۱۳۱۰: وَعَنْ مُعَاذَةَ قَالَتْ سَاَلْتُ عَائِشَةَ كَمْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ صَلَاةَ الضُّحٰى قَالَتْ اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ وَيَزِيْدُ مَاشَاءَ اللّٰهُ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤٩٧/١ حديث رقم (٧٩۔ ٧١٩)۔ وأحمد في المسند ١٤٥/٦۔

ترجمہ: حضرت معاذۃؓ فرماتی ہیں کہ میں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صلوۃ ضحیٰ کی کتنی رکعات پڑھا کرتے تھے؟ تو انہوں نے جواباً ارشاد فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چار رکعتیں پڑھتے تھے، اور اس سے زیادہ بھی جس قدر اللہ تعالیٰ چاہتا تھا، تو پڑھتے تھے۔ (مسلم)

تشریح: ''وعن معاذة'' یہ معاذۃ بنت عبداللہ العدویۃ الصہباء البصریۃ ہیں۔ تقریب کے مطابق یہ ثقہ اور طبقہ ثالثہ سے ہے۔

''قالت سألت عائشة: كم كان رسول الله ﷺ'' یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کتنی رکعات پڑھتے تھے۔ یہ عبارت اگلے قول ''يصلي صلاة الضحى'' کیلئے مفعول مطلق ہے۔

''قالت: أربع ركعات'' یعنی چار رکعات سے کم نہیں پڑھتے تھے۔ احیاء میں لکھا ہے مناسب یہ ہے کہ ان چار رکعات میں سورۃ الشمس، سورۃ اللیل، سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح پڑھی جائیں۔

''ويزيد'' یہ عبارت مقدر پر عطف ہے اور وہ قول کا مقول ہے یعنی ی صلى أربع ركعات ويزيد۔

''ما شاء الله'' علامہ مظہرؒ نے اس کی یہ توجیہہ کی ہے کہ بلا حصہ کے چار رکعات پر اضافہ فرماتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم بارہ رکعات سے زیادہ چاشت کی نماز میں نہ پڑھتے تھے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سعید بن منصور نے ابراہیم سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی نے اسود سے پوچھا کہ میں کتنی رکعات چاشت پڑھوں؟ انہوں نے فرمایا ''جتنی چاہو پڑھ لو''۔

ابونعیم نے حلیۃ الأولیاء میں عون بن شداد سے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ چاشت میں سو رکعات نماز پڑھتے تھے۔

صلوٰۃ ضحیٰ جسم کے تمام جوڑوں کا صدقہ ہے

۱۳۱۱: وَعَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصْبِحُ عَلٰى كُلِّ سُلَامٰى مِنْ اَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ فَكُلُّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةٌ وَّكُلُّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةٌ وَكُلُّ تَحْلِيْلَةٍ صَدَقَةٌ وَ كُلُّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةٌ وَاَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ وَيُجْزِئُ مِنْ ذٰلِكَ رَكْعَتَانِ يَرْكَعُهُمَا مِنَ الضُّحٰى۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/۴۹۸ حديث رقم (۸۴۔ ۷۲۰)۔ وأحمد في المسند ۵/۱۷۸۔

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صبح ہوتے ہی تم میں سے ہر ایک کے ہر جوڑ پر صدقہ لازم ہے لہٰذا ہر تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے اور ہر تحمید یعنی الحمد للہ کہنا صدقہ ہے اور تکبیر یعنی اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے اور امر بالمعروف صدقہ ہے اور نہی عن المنکر صدقہ ہے۔ اور ان تمام کے قائم مقام ہے کہ بندہ صلوٰۃ ضحیٰ کی دو رکعتیں پڑھ لے (یعنی صلوٰۃ ضحیٰ کی دو رکعتیں پڑھنا تمام جوڑوں کا صدقہ ادا کر دیتا ہے)۔ (مسلم)

تشریح: ''سلامی من أحدکم'' سلامی، بضم السین و فتح المیم بمعنی جوڑ۔ اس سے مراد پوری ہڈیاں ہیں۔
نہایہ میں لکھا ہے کہ سلامی جمع ہے سلامیۃ کی، سلامیۃ انگلی کے پورے کو کہا جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کی واحد وجمع برابر ہے اور اس کی جمع سلامیات کے وزن پر بھی آتی ہے۔

''صدقۃ'' اس جملہ میں 'علی'' ندب کی تاکید کیلئے ہے اور تصدق وجوب اصطلاحی کے معنی میں ہے۔
علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یصبح کا اسم یا تو صدقہ ہے یعنی ہر صبح ہر جوڑ کے بدلے صدقہ واجب ہوتا ہے۔ یا اس کا اسم من أحدکم ہے اور ظرف خبر بنے گا۔ صدقہ ظرف کا فاعل ہوگا۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تم میں سے ہر ایک اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اس پر ہر جوڑ کے بدلے صدقہ واجب ہوتا ہے۔

قاضی رحمہ اللہ اس جملہ کی شرح میں فرماتے ہیں کہ ابن آدم جب ہر جوڑ کی سلامتی کے ساتھ صبح کرتا ہے تو اس پر اس ذات کے شکر کیلئے صدقہ واجب ہوتا ہے جس نے اسے صورت بخشی اور ہر تکلیف دہ چیز سے محفوظ رکھا۔
مفاصل کی تعداد کو ذکر نہ کرنا طوالت سے بچنے کیلئے ہے۔ اس کے ترک میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف اشارہ بھی ہے:

''وان تعدوا نعمۃ اللّٰہ لا تحصوھا'' ''اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتے''۔
اس حدیث میں یہ بتانا مقصود ہے کہ صدقہ صرف مال خرچ کرنے کا نام نہیں بلکہ ہر نیکی صدقہ ہے۔ انسان اپنے افعال اور حرکات وسکنات کے ذریعہ بھی صدقہ کا ثواب حاصل کر سکتا ہے۔

''وأمر بالمعروف صدقۃ، ونھی عن المنکر صدقۃ'' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فائدہ اس عمل کو انجام دینے والے کو بھی ہوتا ہے۔ اور اس کی منفعت عام مسلمانوں کو بھی پہنچتی ہے۔
پچھلے جملے میں لفظ ''کل'' استعمال ہوا تھا لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذکر میں لفظ کل استعمال نہیں۔ شاید پچھلے ذکر کو کافی سمجھا گیا۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی یہ توجیہہ کی ہے کہ اس میں ان دونوں عملوں کی ندرت وقوع کی طرف اشارہ ہے۔ جبکہ گذشتہ اذکار تو ہر وقت کر سکتا ہے۔ خاص طور پر وہ شخص جو لوگوں سے الگ تھلگ ہوتا ہو وہ تو ان دونوں افعال میں مشغول ہو ہی نہیں سکتا۔ لفظ کل کو ذکر نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان دونوں میں کلیت بالکل ظاہر ہے کیونکہ یہ باقی اذکار سے افضل ہیں۔

اس حدیث میں صدقہ حقیقیہ (مال خرچ کرنا) کا عدم ذکر فقراء اور مساکین کی تسلی اور دل جوئی کیلئے ہے۔
''ویجزی'' بالتذکیر و التانیث۔ علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس لفظ کو یاء کے ضمہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ اس صورت میں اجزاء سے ماخوذ ہوگا۔ یہ بفتح الیاء بھی نقل کیا گیا ہے اس صورت میں یہ جزی یجزی سے مشتق ہوگا۔

''رکعتان'' یعنی اعضاء وجوارح کی سلامتی پر جن صدقات کا ذکر کیا گیا ان کیلئے یہ دو رکعات بھی کافی ہیں۔
اصل بات یہ ہے کہ نماز تمام اعضاء کی عبادت ہے۔ اس میں ہر ہر عضو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔ نماز صدقات مذکورہ پر بھی مشتمل ہے۔ نیز اس میں انسان اپنے نفس کیلئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سامان بھی کرتا ہے۔ علاوہ ازیں نماز بے

حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

"یر کعھا من الضحی" اس نماز پر مداومت اختیار کرنا بہت ضروری ہے۔اسی وجہ سے بعض علماء نے ترک چاشت کو مکروہ قرار دیا ہے۔اس کی کم از کم مقدار دو رکعات کو قرار دیا گیا اس میں نہی بتیراء کی طرف مخفی اشارہ ہے۔

ان دو رکعات کو اجزاء سے تعبیر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اس وقت میں لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور حق عبودیت کے قیام سے غافل ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے سورۃ الفجر کی آیت "والشفع والوتر" کی تفسیر چاشت کی نماز سے کی گئی ہے۔اور وتر بھی رات میں پڑھے جاتے ہیں۔اور یہ دونوں وقت آرام کے اوقات ہیں۔

صلوٰۃ ضحیٰ یعنی چاشت کا بہترین وقت

۱۳۱۲: وَعَنْ زَيْدِ ابْنِ اَرْقَمَ اَنَّهٗ رَاٰى قَوْمًا يُصَلُّوْنَ مِنَ الضُّحٰى فَقَالَ لَقَدْ عَلِمُوْا اَنَّ الصَّلَاةَ فِيْ غَيْرِ هٰذِهِ السَّاعَةِ اَفْضَلُ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ صَلَاةُ الْاَوَّابِيْنَ حِيْنَ تَرْمَضُ الْفِصَالُ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٥١٥ حديث رقم (١٤٣-٧٤٨)۔

ترجمہ: حضرت زید بن ارقمؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے کچھ لوگوں کو صلوٰۃ ضحیٰ پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ اس نماز کو اس وقت کے علاوہ دوسرے وقت میں پڑھنا افضل ہے (پھر اس وقت کیوں پڑھتے ہیں) بے شک رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والوں کی (صلوٰۃ ضحیٰ) نماز کا وقت وہ ہے جبکہ اونٹوں کے بچے گرم ہونے لگیں۔ (مسلم)

تشریح: "انه رأى قومًا يصلون من الضحى فقال لقد علموا أن الصلاة في غير هذه الساعة أفضل" علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "من الضحی" میں من زائدہ ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ چاشت کی نماز پڑھتے ہیں۔من تبعیضیہ بھی ہو سکتا ہے اس پر لقد علموا کا قول بھی صادق آتا ہے یعنی حضرت زید بن ارقم نے چاشت کے بعض وقت میں نماز کو ناپسندیدہ خیال کیا ہے گویا کہ وہ چاشت کے اول وقت میں نماز پڑھ لیتے ہیں اور مستحب وقت کا انتظار نہیں کرتے حالانکہ وہ جانتے بھی ہیں کہ نماز دوسرے وقت میں افضل ہے۔من کو ابتدائیہ بھی بنایا جا سکتا ہے۔اس سے مراد وہ نماز ہوگی جو اول وقت میں شروع کی جائے اور حضرت زید کا قول کا معنی یہ ہوگا کہ وہ اول وقت میں نماز شروع کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے من کو مقدر عبادت کیلئے بیانیہ قرار دیا ہے۔"ای صلاة هي الضحى" میرے خیال میں اس کا ابتدائیہ ہونا راجح ہے اس کی تائید "ان رسول اللہ ﷺ" سے بھی ہوتی ہے۔

محققین صوفیاء کا خیال یہ ہے کہ تواب اسے کہتے ہیں جو معصیت سے بار بار توبہ کرنے والا ہو اور اَوّاب سے مراد وہ شخص ہے جو غفلت سے بار بار توبہ کرنے والا ہو۔

''حین ترمض الفصال'' الفصال جمع ہے الفصیل کی۔ فصیل اونٹنی کے بچہ کو کہتے ہیں جب وہ اپنی ماں سے جدا ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب اونٹ کا بچہ دن کی گرمی کی شدت کو محسوس کرتا ہے اور گرمی کی وجہ سے اس کے سم جلنے لگتے ہیں۔ اس میں بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ وقت راحت و آرام کا وقت ہے۔ لہٰذا اس میں نماز میں مشغول ہونا نفس کی خواہش کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی رضا کی طرف متوجہ ہونے کے مترادف ہے۔

محدثین کا کہنا یہ بھی ہے کہ اس حدیث مبارک کا شان ورود یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مسجد قباء تشریف لائے اور یہاں کے لوگوں کو اس نماز میں مشغول پایا تو یہ ارشاد فرمایا۔ حاصل یہ ہے کہ چاشت کا اول وقت وہ ہے جب سورج طلوع ہو جائے۔ آخری وقت سورج کے استواء کا وقت ہے اور افضل وقت ان دونوں کے درمیان کا ہے اور وہ ربع نہار ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ اس طرح انسان کے پورے دن کا کوئی ربع نماز سے خالی نہ رہے گا۔

الفصل الثانی:

صلوٰۃ ضحیٰ پڑھنے پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ

۱۳۱۳: وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ وَاَبِیْ ذَرٍّ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ اللّٰهِ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی اَنَّهٗ قَالَ یَا ابْنَ اٰدَمَ اِرْكَعْ لِیْ اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ مِنْ اَوَّلِ النَّهَارِ اَكْفِكَ اٰخِرَهٗ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/ ۳٤۰ حدیث رقم ٤٧٥۔

ترجمہ: حضرت ابو درداءؓ اور حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے پروردگار سے نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اے ابن آدم! تو دن کے شروع حصہ میں میرے لیے چار رکعتیں پڑھ لیا کر میں تیری اس دن کی شام یعنی آخر تک تیری کفالت کرونگا۔ یہ ترمذیؒ کی روایت ہے اور ابوداؤد اور دارمیؒ نے نعیم بن حماز غطفانی سے نقل کیا ہے اور امام احمد نے ان سب سے یہ روایت نقل کی ہے۔

تشریح: ''قالا، قال رسول الله ﷺ عن الله'' لفظ ''عن الله'' کی ترکیب کے بارے میں دو قول ہیں:

① یہ مقولہ کا حصہ ہے۔ ② تقدیری عبارت یہ ہے ناقلا أو قائلاً عن الله''۔

''تبارك'' وہ ذات جس کی خیر و برکت کثیر ہے۔ ''وتعالیٰ'' وہ ذات جس کی عظمت و بزرگی بلند ہے۔

''أنه'' بفتح الهمزه، ایک نسخہ میں بکسر الہمزۃ بھی ہے۔

''أربع رکعات من اول النهار'' اس کے مصداق میں تین قول ہیں:

۱۔ چاشت۔ ۲۔ اشراق۔ ۳۔ فجر کے دو فرض اور سنتیں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا معنی یہ ہے میں تیری ضروریات و حوائج کو پورا کروں گا اور تیری ناپسندیدہ چیزوں کو تجھ سے دور کروں گا۔ معنی یہ ہے کہ تو دن کے شروع میں اپنے دل کو میری عبادت کیلئے فارغ کرنے میں دن کے آخر میں تیری ضروریات سے تیرے دل کو فارغ کر دوں گا۔

صاحب تخریج المصابیح فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے اس حدیث میں ذکر کردہ رکعات کو چاشت کی نماز پر محمول کیا ہے۔ اسی وجہ سے امام ابوداؤد اور امام ترمذیؒ نے اسے باب الضحیٰ میں ذکر کیا ہے۔ میرکؒ نے نقل کیا ہے کہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ نہار سے مراد طلوع شمس اور غروب شمس کا درمیانی وقت ہے۔ یہ قول ماہرین فلکیات اور حکماء کی رائے کے مطابق ہے۔ تو درست ہوسکتا ہے۔ لیکن شرعی طور پر نہار کا اطلاق طلوع صبح سے مغرب تک ہوتا ہے۔

امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن غریب قرار دیا ہے۔ اس کی سند میں اسماعیل بن عیاش قاضی راوی متکلم فیہ ہیں۔

شمائل میں ''ابن آدم'' کے الفاظ منقول ہیں، صرف نداء وہاں مذکور نہیں۔

۱۳۱۴: وَرَوَاهُ اَبُوْ دَاوٗدَ وَالدَّارِمِیُّ عَنْ نُعَیْمِ بْنِ هَمَّازٍ الْغَطْفَانِيِّ وَاَحْمَدُ عَنْهُمْ۔

ترجمہ: ابوداؤد دارمی نے نعیم بن حمار غطفانی سے اور امام احمد نے ان سب سے یہ روایت نقل کی ہے۔

راویٔ حدیث:

نعیم بن ہمار۔ یہ نعیم ''ہمار'' کے بیٹے ہیں۔ ''ہمار'' میں ہاء مفتوح' میم مشدد اور راء مہملہ ہے۔ اور ایک نسخہ میں زاء معجمہ کے ساتھ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سمام آخر میں میم ہے۔ قبیلہ غطفان کے آدمی ہیں۔ ابوادریس خولانی نے ان سے روایت کی۔

تشریح: ''ورواه'' ایک نسخہ میں ''وابوداؤد'' کے الفاظ ہیں اور یہ غلط ہے۔

''ابو داؤد والدارمی'' میرکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام نسائی نے بھی ذکر کیا ہے۔

''عن نعیم بن هماز'' بتشدید المیم وبالراء المہملہ، ایک نسخہ میں ہماز (بالزای) بھی ہے۔ علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ اکثر علماء کے نزدیک نعیم کے والد کا نام ہمار ہے۔ علاوہ ازیں هدار، هبار، خمار، ہمام اور حماز بھی نقل کئے گئے ہیں۔

''وأحمد منهم'' یعنی امام احمد نے بھی ان تین مذکورہ صحابہ سے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ اس موقع پر ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے ''عن الثلاثة الأولین ونعیم'' یہ قول وہم ہے۔

صلوٰۃ ضحیٰ جسم کے ہر جوڑ کا صدقہ ہے

۱۳۱۵: وَعَنْ بُرَیْدَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِي الْاِنْسَانِ ثَلَاثُ مِائَةٍ وَّسِتُّوْنَ مَفْصِلًا فَعَلَیْهِ اَنْ یَتَصَدَّقَ عَنْ کُلِّ مَفْصِلٍ مِّنْهُ بِصَدَقَةٍ قَالُوْا وَمَنْ یُّطِیْقُ ذَاكَ یَانَبِیَّ اللّٰهِ قَالَ النُّخَاعَةُ فِي الْمَسْجِدِ تَدْفِنُهَا وَالشَّيْءُ تُنَحِّیْهِ عَنِ الطَّرِیْقِ فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فَرَکْعَتَا الضُّحٰی تُجْزِئُكَ۔

(رواہ ابو داود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ٥/٤٠٦ حدیث رقم ٥٢٤٢ـ وأحمد في المسند ٥/٣٥٩ـ

ترجمہ: حضرت بریدہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، پس انسان پر لازم ہے کہ وہ ہر جوڑ کے بدلہ میں صدقہ دے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اس کی کون طاقت رکھتا ہے اے اللہ کے رسول! تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسجد میں پڑا ہوا تھوک اس کو دفن کرنا بھی صدقہ ہے اور اسی طرح راستہ

سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اگر تو یہ چیزیں نہ پائے تو پھر دو رکعتیں چاشت کی پڑھ لینا تیرے لئے کافی ہے۔(ابوداؤدؒ)

تشریح:''ثلاثمائة وستون مفصلا''بفتح الميم و كسر الصاد''

''فعليه أن يتصدق عن كل مفصل منه بصدقة''فعليه لزوم اور وجوب کیلئے استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مراد لزوم وتاکید ہے شرعی وجوب مراد نہیں۔ کیونکہ کوئی بھی چاشت کی نماز اوران احادیث میں مذکور صدقات کی وجوبیت کا قائل نہیں ہے۔البتہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اجمالی اور تفصیلی شکر بجالانا شرعاً واجب ہے۔

''قالوا: ومن يطيق ذالك''ایک نسخہ میں''ذلك''ہے۔

شاید لوگوں نے صدقہ کو صدقہ متعارف یعنی خیرات مالیہ پر محمول کیا اور یہ سوال کر دیا کہ اس کی طاقت کون رکھے گا۔ کیونکہ اکثر لوگ فقراء تھے۔''تدفنها''اس میں صیغہ جمع سے اس لئے عدول کیا گیا کہ کہیں اس عمل وفضیلت کے صحابہ کرامؓ کے ساتھ خاص ہونے کا وہم نہ ہو۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بظاہر تعبیر یہ ہونی چاہیے تھی''من يدفن النخاعة في المسجد''لیکن ان صفات کے اہتمام شان کو بیان کرنے کیلئے خطاب عام استعمال کیا گیا کہ ہر وہ شخص جس سے یہ خطاب ہو اس کو چاہیئے کہ اس پر عمل کرے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں نخامہ (تھوک) سے مراد کسی دوسرے کی تھوک ہے کیونکہ اسے دفن کرنا سنت مؤکدہ ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور اس کی ترغیب دی۔ اپنی تھوک کو دفن کرنا تو واجب اور ضروری ہے کیونکہ اس نے حرام کا ارتکاب کیا اور اس کا ختم کرنا اس پر واجب ہے اور شارع نے اسے اس کا کفارہ قرار دیا ہے۔

''فركعتا الضحى تجزئك''خبر کا افراد معنی کے اعتبار سے ہے اصل عبارت ہوگی۔''فصلاة الضحى تجزئك''۔

''رواه ابو داؤد''۔علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں علی بن حسین بن واقد ہیں۔علامہ ذہبی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ابوحاتم نے انہیں ضعیف اور دوسرے بعض حضرات نے انہیں قوی قرار دیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا''اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو تین سو ساٹھ جوڑ عطا فرمائے ہیں۔ جو اللہ اکبر کہے، الحمد للہ کہے، لا الٰہ الا اللہ کہے۔ استغفر اللہ کہے، راستے سے پتھر، کانٹے اور ہڈی کو ہٹائے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور یہ تمام اعمال تین سو ساٹھ مرتبہ کرے۔ تو اس دن اس حال میں چلتا ہے کہ اسے دوزخ سے دور کر دیا گیا ہوتا ہے۔

وكم لله من لطف خفيى ☆ يدق خفاه عن فهم ذكى

''اللہ تعالیٰ کے پوشیدہ کتنے ہی ایسے انعامات ہیں جن کی پوشیدگی کسی عالی دماغ پر بھی واضح نہ ہو سکی''۔

صلوٰۃ ضحیٰ پڑھنے پر جنت میں محل ملتا ہے

۱۳۱۶: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَلَّى الضُّحٰى ثِنْتَىْ عَشَرَةَ رَكْعَةً بَنَى اللّٰهُ لَهٗ قَصْرًا مِنْ ذَهَبٍ فِي الْجَنَّةِ رَوَاهُ التِّرْمِذِىْ وَابْنُ مَاجَةَ وَقَالَ التِّرْمِذِىْ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ لَا نَعْرِفُهٗ اِلَّا مِنْ هٰذَا الْوَجْهِ۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۳۳۷/۲ ـ وابن ماجه فی السنن ۴۳۹/۱ حديث رقم ۱۳۸۰ ـ

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا جو شخص چاشت کی بارہ رکعتیں پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں سونے کا محل بناتا ہے۔

اسنادی حیثیت: اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے کیونکہ ہم بجز اس سند کے جو ترمذی نے نقل کی ہے اور کسی سند سے اسے نہیں جانتے۔

تشریح: ''من صلی الضحی ثنتی عشرۃ رکعۃ'' یہ بارہ رکعات اکٹھی پڑھے یا الگ الگ، دونوں طرح درست ہے۔ علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ امام نوویؒ نے اس حدیث کو احادیث ضعیفہ میں ذکر کیا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً منقول ہے ''اگر تم چاشت کی دو رکعات پڑھو تو غافلوں میں شمار ہو گے۔ اگر چار رکعات پڑھو گے تو محسنین میں لکھ دیئے جاؤ گے، اگر چھ رکعات پڑھو گے تو قانتین میں لکھ دیئے جاؤ گے۔ اگر آٹھ رکعات پڑھو گے تو فائزین میں لکھ دیئے جاؤں گے اگر دس رکعات پڑھو گے تو اس دن تمہارا کوئی گناہ نہ لکھا جائے گا۔ اور اگر بارہ رکعات پڑھو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے جنت میں ایک گھر بنا دے گا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوذرؓ سے عرض کیا ''اے چچا جان! مجھے نصیحت فرمادیجئے۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ جو سوال تم نے مجھ سے کیا یہ سوال میں نے بھی رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا ''اگر تم چاشت کی دو رکعات پڑھو تو غافلین میں شمار نہ ہو گے''۔

طبرانی نے حضرت ابودرداءؓ کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے کہ جو شخص چاشت کی چار رکعات پڑھے عبادت گزاروں میں شمار ہوگا۔ جو چھ رکعات پڑھے اس دن کی تمام حاجات پوری ہو جائیں گی اور جو آٹھ رکعات پڑھے اللہ تعالیٰ اسے قانتین میں لکھ دیں گے۔

نمازِ اشراق کی فضیلت

۱۳۱۷: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسِ نِ الْجُهَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَعَدَ فِيْ مُصَلَّاهُ حِيْنَ يَنْصَرِفُ مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ حَتّٰى يُسَبِّحَ رَكْعَتَيِ الضُّحٰى لَا يَقُوْلُ اِلَّا خَيْرًا غُفِرَ لَهٗ خَطَايَاهُ وَاِنْ كَانَتْ اَكْثَرَ مِنْ زَبَدِ الْبَحْرِ ـ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۶۲/۲ حديث رقم ۱۲۸۷ ـ وأحمد فی المسند ۴۳۹/۳ ـ

ترجمہ: حضرت معاذ بن انس الجہنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص فجر کی نماز پڑھ کر اپنی نماز کی جگہ پر بیٹھا رہے یہاں تک کہ اشراق کی دو رکعتیں پڑھ لے (اور نماز فجر اور نماز اشراق کے درمیان) اپنی زبان سے سوائے کلمہ خیر کے دوسری بات نہ کرے تو اس کے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں، اگر چہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔

تشریح: ''وعن معاذ بن أنس الجهني'' قبیلہ جہینہ کی طرف نسبت ہے۔

''غفرله خطاياه'' یہاں مراد صغائر ہیں البتہ کبائر کا احتمال بھی موجود ہے۔

ابوداؤد نے اسے سهل بن معاذ الجهني عن أبيه کی سند سے نقل کیا، سہل ضعیف ہیں اور اس کے ایک اور راوی زبان بھی ضعیف ہیں۔ البتہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث بھی معمول بہ ہوتی ہے اور اس کی تحقیق گزر چکی کہ اس جملہ میں یہ حجۃ تامہ کی طرح مکمل اور تمام حجت ہے۔

الفصل الثالث:

۱۳۱۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ حَافَظَ عَلٰى شَفْعَةِ الضُّحٰى غُفِرَتْ لَهٗ ذُنُوْبُهٗ وَاِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ ۔ (رواه احمد والترمذی وابن ماجة)

أخرجه الترمذي في السنن ۲/۳۴۱ حديث رقم ۴۷۶۔ وابن ماجه ۱/۴۴۰ حديث رقم ۱۳۸۲۔ وأحمد في المسند ۲/۴۹۹۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص صلوۃ ضحیٰ کی دو رکعتوں پر ہمیشگی اختیار کرے گا اس کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے اگر چہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ ترمذی ابن ماجہ اور مسند امام احمد کی روایت ہے۔

تشریح: ''غفرت له ذنوبه وان كانت مثل زبد البحر'' کثرت کو سمندر کی جھاگ کے ساتھ تشبیہ دینے میں حکمت یہ ہے کہ مخاطبین کے نزدیک مشہور و متعارف ہے۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں ''مثل'' کی تعبیر اختیار کی گئی جبکہ اس سے پہلی حدیث میں ''اکثر'' کا لفظ استعمال کیا گیا تھا اس کی حکمت یہ ہے کہ وہاں ذکر کردہ صورت زیادہ مشکل ہے پس اس میں مغفرت کی مقدار بھی زیادہ ہونی چاہیے۔

ابن حجر کا یہ قول محل نظیر ہے کیونکہ مواظبت مذکورہ (جو کہ دوسری حدیث میں ہے) اس قعود سے قوی معلوم ہوتی ہے۔ جو پہلی حدیث میں ذکر کیا گیا۔ البتہ اگر یہ کہا جائے کہ قعود میں بھی مواظبت شرط ہے تو پھر اس کے افضل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

(رواه احمد والترمذی وابن ماجه) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو بہت سے ائمہ نے نہاس بن قہم سے نقل کیا ہے۔

علامہ میرکؒ نے نہاس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

امّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا معمول

۱۳۱۹: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا كَانَتْ تُصَلِّي الضُّحٰى ثَمَانِيَ رَكَعَاتٍ ثُمَّ تَقُوْلُ لَوْ نُشِرَلِيْ أَبَوَايَ مَا تَرَكْتُهَا۔

(رواه مالك)

أخرجه مالك في الموطأ ١/١٥٣ حديث رقم ٣٠ من كتاب قصر الصلاة۔

ترجمہ: حضرت امّ المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں مروی ہے کہ وہ صلوٰۃ ضحیٰ کی آٹھ رکعتیں پڑھا کرتی تھیں اور پھر فرماتی تھیں اگر میرے لئے میرے ماں باپ بھی زندہ کر دیئے جائیں تو پھر بھی میں اس نماز کو نہ چھوڑوں گی۔ (امام مالک)

تشریح: ''انها كانت تصلي الضحى ثماني ركعات'' شاید وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عام الفتح والے عمل کی اتباع کرتی تھیں۔

''ثم تقول لو نشري ابواي ماتركتها'' پھر ترغیب دینے کیلئے فرماتیں کہ اگر میرے ماں باپ کو زندہ کر دیا جائے تو پھر بھی میں ان رکعات کو نہ چھوڑوں گی۔ یعنی میں اس لذت کے حصول کیلئے اس لذت کو نوازش نہ کروں گی۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ مبالغہ کیلئے تعلیق بالمحال کی قبیل سے ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ اگر میرے والدین کو زندہ کر کے مجھے خصوصیت بخشی جائے تو یہ بھی میرے لئے ان آٹھ رکعات کی لذت سے زیادہ نہ ہوگی۔ یعنی اگر مجھے کہا جائے کہ اپنے اس عمل کی لذت کو اس لذت کیلئے چھوڑ دوں تو میں کبھی نہ چھوڑوں گی۔ حالانکہ فطرت طبعی کا تقاضا اس کے برخلاف ہوگا۔ اس جملہ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اگر میرے والدین زندہ ہو جائیں۔ تو انہیں خوش آمدید کہنے یا ان کی خدمت کے لئے بھی اس نماز کو نہ چھوڑوں گی۔ یہ مواظبت کی انتہاء سے کنایہ ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چاشت کے بارے میں اور بھی روایات منقول ہیں ترمذی میں حضرت عبداللہ بن شقیق رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے سوال کیا کہ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کی نماز پڑھتے تھے؟ انہوں نے فرمایا نہیں البتہ جب سفر سے واپس آتے تو پڑھتے تھے۔

اس حدیث میں سفر سے واپسی کے علاوہ چاشت پڑھنے کی نفی معلوم ہو رہی ہے جبکہ حضرت معاذہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ روایت میں اس کا مطلقاً اثبات معلوم ہو رہا تھا۔

صحیحین میں حضرت عروہؓ کے حوالے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول بھی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چاشت کی نماز پڑھتے نہیں دیکھا جبکہ میں چاشت کی نماز پڑھا کرتی تھی۔

اس روایت میں مطلقاً رؤیت کی نفی ہو رہی ہے۔ پس ان روایات کی بنا پر محدثین کا اختلاف پیدا ہوا۔ ابن عبدالبرؒ اور کچھ محدثین کے نزدیک شیخان کی متفق علیہ روایت کو اس روایت پر ترجیح دیں گے جس میں امام مسلم منفرد ہیں۔ نیز معاذہ اور عبداللہ بن شقیقؒ والی روایتیں امام مسلم کے مفردات میں سے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عدم رؤیت عدم وقوع کو مستلزم نہیں۔ لہٰذا ان صحابہ کی روایات کو ترجیح دی جائے گی جنہوں نے چاشت کے اثبات کو نقل کیا ہے۔

دوسرے محدثین نے دونوں قسم کی روایات میں تطبیق کا راستہ اختیار کیا چنانچہ امام بیہقی ؒ حضرت عروہؒ والی روایت کی یہ توجیہہ کرتے ہیں کہ اس میں دوام کی طرف اشارہ ہے یعنی میں نے حضور ﷺ کو اس نماز پر دوام اور ہمیشگی اختیار کرتے نہیں دیکھا جبکہ میں اس پر ہمیشگی اختیار کرتی تھی۔

محب طبری ؒ فرماتے ہیں کہ محدثین نے حضرت عائشہ ؓ کے دو متعارض اقوال:

''ما كان يصلي الا ان يجئ من مغيبه'' اور ''كان يصلي اربعًا......'' کے درمیان جمع کی یہ صورت بتائی کہ قول اول مسجد میں نماز پڑھنے پر محمول ہے۔ اور قول ثانی گھر میں۔ اس تطبیق پر اس متفق علیہ روایت کی بنا پر اشکال ہوتا ہے جس میں آیا ہے ''ما رأيته سبح سبحة الضحى'' اس کا جواب یہ دیا گیا کہ منفی صفت مخصوصہ ہے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں: ''ما صلاها'' کا معنی ہے: ''ما رأيته صلاها'' میں نے حضور ﷺ کو یہ نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یعنی حضور ﷺ یہ نماز تو پڑھتے تھے لیکن حضرت عائشہ اپنے مشاہدہ کی نفی کر رہی ہیں۔

علامہ سیوطی ؒ نے بیس سے زائد صحابہ کرام کو شمار کیا ہے جو چاشت کی نماز پڑھا کرتے تھے۔

آنحضرت ﷺ کی اُمت پر شفقت

۱۳۲۰: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُصَلِّی الضُّحٰی حَتّٰی نَقُوْلَ لَایَدَعُھَا وَیَدَعُھَا حَتّٰی نَقُوْلَ لَایُصَلِّیْھَا۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٢/٣٤٢ حديث رقم ٤٧٧ ـ وأحمد في المسند ٣/٣٦ ـ

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب صلوٰۃ ضحیٰ پڑھنا شروع کرتے تو ہم کہتے اب آپ اس نماز کو نہیں چھوڑیں گے اور آپ اس کو کبھی چھوڑ دیتے، یہاں تک ہم یہ کہتے اب آپ اس کو نہیں پڑھیں گے۔

تشریح: نبی کریم ﷺ کا یہ ترک فعل اوقات کے مقتضی کے مطابق رخصت و عزیمت کے پیش نظر تھا اس کی نظیر صلاۃ تہجد اور صوم نفل میں گذر چکی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ترک سے مراد عدد اور زمانہ و مکان کی صفت مخصوصہ کی ترک ہو اور حضور ﷺ پر چاشت کے واجب ہونے کے منافی نہیں کیونکہ مراد یہ ہے کہ چاشت نبی کریم ﷺ پر فی الجملہ واجب تھی ہر روز کیلئے واجب نہ تھی۔

۱۳۲۱: وَعَنْ مُوَرِّقِ الْعَجْلِیِّ قَالَ قُلْتُ لِابْنِ عُمَرَ تُصَلِّی الضُّحٰی قَالَ لَا قُلْتُ فَعُمَرُ قَالَ لَا قُلْتُ فَاَبُوْبَکْرٍ قَالَ لَا قُلْتُ فَالنَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا اِخَالُہٗ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣/٥١ ـ حديث رقم ١١٧٥ ـ

ترجمہ: حضرت مورق عجلیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے سوال کیا، کیا آپ صلوٰۃ ضحیٰ پڑھتے ہو؟ انہوں نے فرمایا نہیں۔ تو میں نے پھر پوچھا کہ حضرت عمر ؓ؟ (یعنی حضرت عمر ؓ چاشت کی نماز پڑھتے تھے) فرمایا نہیں پڑھتے تھے۔ پھر میں نے پوچھا کیا حضرت ابوبکر ؓ؟ (پڑھتے تھے) انہوں نے فرمایا، کہ نہیں۔ تو پھر میں نے

عرض کیا کہ آنحضرت ﷺ پڑھتے تھے؟ فرمایا کہ نہیں' میرا خیال یہی ہے۔(بخاری)

تشریح: ''وعن مورق'' بالتشدید اسم فاعل۔

''العجلی'' بکسر فسکون۔ بنوعجل نامی قبیلہ کی طرف نسبت ہے۔

''قلت فأبو بکر؟ قال لا'' ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی افضلیت کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سوال میں مقدم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ انسان اپنے والد کے افعال سے جو آگاہی رکھتا ہے وہ کسی اور کے افعال کے خیال نہیں رکھ سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ توجیہہ اس صورت میں درست ہے جب فاء تعقیب کیلئے ہو لیکن اس کلام میں فاء ترقی کیلئے ہے جیسا کہ ''قلت فالنبی ﷺ'' سے معلوم ہوتا ہے۔

''لا اخالہ'' بکسر الہمزۃ، اس طرح پڑھنا زیادہ فصیح ہے، کبھی اس کو موفق قیاس بفتح الہمزہ بھی پڑھا جاتا ہے۔

رواہ البخاری شرح السنۃ میں ہے کہ بعض علماء نے چاشت کی نماز کو مکروہ قرار دیا ہے ابوبکرہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے انہوں نے کچھ لوگوں کو چاشت کی نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا ''تم لوگ ایسی نماز پڑھتے ہو جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں پڑھی''۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ روایات جن سے نماز چاشت کی نفی معلوم ہوتی ہے دوسری وہ روایات جن میں اس نماز کا اثبات عیاں ہو رہا ہے ان سب میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کبھی تو اس نماز کی فضیلت حاصل کرنے کیلئے اسے پڑھ لیا کرتے تھے۔ اور کبھی اس کے فرض ہو جانے کے خوف سے چھوڑ بھی دیا کرتے تھے۔ نیز یہ بات بھی بہت واضح ہے کہ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ چاشت کے وقت نبی کریم ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ہوتے۔ کبھی آپ مسجد میں ہوتے کبھی کسی اور جگہ ہوتے کبھی دوسری ازواج کے پاس ہوتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں نو دن کے بعد تشریف لاتے اور اس دن نماز چاشت نہ پڑھتے ہوں گے۔ اس طرح تمام روایات کی تطبیق ہو جاتی۔ باقی رہی یہ بات کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے چاشت کو بدعت قرار دیا ہے۔ تو اس کی توجیہہ یہ ہے کہ انہوں نے اسے مسجد میں پڑھنے اور اس کا کو کھلم کھلا کرنے کو بدعت قرار دیا ہے کیونکہ اس بارے میں اصل یہ ہے کہ انہیں گھر میں ادا کیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کا فعل اور آپ کا عمل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما تک نہ پہنچا ہو۔ نیز ممکن ہے کہ انہوں نے اس کی پابندی ومواظبت کو بدعت قرار دیا ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرض ہونے کے خوف سے اس پر مواظبت نہ فرمائی تھی۔

ملا حنفی کہتے ہیں اس بات میں کوئی شک نہیں کی حضور ﷺ کے وصال کے بعد اب اس نماز کے فرض ہونے کا خوف باقی نہیں رہا۔ لہٰذا درست یہ ہے کہ اس نماز پر مواظبت اختیار کرنا مستحب ہے۔ اکثر علماء ومشائخ کا یہی مذہب ہے۔

بَابُ التَّطَوُّعِ

(نفل نماز کا بیان)

ان تمام نفل نمازوں کا بیان جو حضور ﷺ سے ثابت ہیں۔ جیسے تحیۃ الوضوء، صلاۃ استخارہ، صلاۃ توبہ، صلاۃ احاجۃ اور صلوٰۃ تسبیح وغیرہ۔

تطوع یہ طَوْعٌ اور طاعۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنی تابعداری کے ہیں، نفلی عبادت کو تطوع اور نفل عبادت کرنے والے کو متطوِّع کہتے ہیں، عموماً تطوع کا اطلاق فرض کے علاوہ ہر نماز پر ہوتا ہے چاہے وہ سنت ہو مستحب ہو یا نفل ہو، لیکن زیادہ تر تطوع کا اطلاق ان نمازوں پر ہوتا ہے جو کہ سنن غیر مؤکدہ کہلاتی ہیں۔ صاحب مشکوٰۃ نے اس باب میں مندرجہ ذیل نفل نمازوں کا تذکرہ کیا ہے۔ تحیۃ الوضو، صلوٰۃ استخارہ، صلوٰۃ توبہ، صلوٰۃ حاجت، صلوٰۃ تسبیح مطلق نفل کے بارے میں بھی چند احادیث نقل کی ہیں۔

الفصل الاول:

تحیۃ الوضو کی وجہ سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا منفرد اعزاز

۱۳۲۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِبِلَالٍ عِنْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ يَا بِلَالُ حَدِّثْنِیْ بِاَرْجٰی عَمَلٍ عَمِلْتَهٗ فِی الْاِسْلَامِ فَاِنِّیْ سَمِعْتُ دَفَّ نَعْلَيْكَ بَيْنَ يَدَیَّ فِی الْجَنَّةِ قَالَ مَاعَمِلْتُ عَمَلًا اَرْجٰی عِنْدِیْ اَنِّیْ لَمْ اَتَطَهَّرْ طُهُوْرًا فِیْ سَاعَةٍ مِّنْ لَيْلٍ وَّلَا نَهَارٍ اِلَّا صَلَّيْتُ بِذٰلِكَ الطُّهُوْرِ مَاكُتِبَ لِیْ اَنْ اُصَلِّیَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳۴/۳۔ حدیث رقم ۱۱۴۹۔ ومسلم فی صحیحه ۱۹۱۰/۴ حدیث رقم (۱۰۸۔ ۲۴۵۸)۔ وأحمد فی المسند ۳۳۳/۲۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز فجر کے وقت حضرت بلالؓ سے فرمایا، اے بلال! مجھے یہ بتاؤ وہ عمل جس پر آپ کو ثواب کی سب سے زیادہ امید ہو جو آپ نے حالت اسلام میں کیا ہو، وہ کیا ہے؟ بے شک میں نے سنی ہے تمہارے جوتوں کی آواز جنت میں اپنے سامنے۔ تو حضرت بلالؓ نے فرمایا، میں نے نہیں کیا کوئی ایسا عمل جو کہ زیادہ امید والا ہو میرے ہاں سوائے اس کے کہ میں پاکی حاصل نہیں کرتا دن رات کے کسی بھی حصے میں مگر میں پڑھ لیتا ہوں اس وضو کے ساتھ جو میرے مقدر میں ہوتی ہے کہ میں اس نماز کو پڑھ لوں۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''قال رسول اللہ ﷺ للبال عند صلاۃ الفجر'' عند بمعنی عقب یاقبیل کے ہے۔ نیز صلاۃ سے مراد فرض یا سنت قول ہے۔

افعل التفضيل يجوز أن يكون للفاعل أي :أخبرني بعمل يكون رجاؤك بثوابه أكثر.

ابن ملک کے اس مذکورہ قول میں دو غلطیاں ہیں ایک یہ کہ انہوں نے افعل التفضیل کو فاعل کے معنی میں ہونے کو جائز قرار دیا (یعنی ان کا یہ کہنا کہ ہوسکتا ہے کہ افعل التفضیل فاعل کے معنی میں ہو) حالانکہ اصل یہی ہے کہ افعل التفضیل فاعل کے معنی میں ہوتا ہے دوسرا یہ کہ انہوں نے کلام کا جو ترجمہ کیا وہ مبنی للمفعول ہونے کے اعتبار سے مبنی للفاعل ہونے کے اعتبار سے نہیں۔

"فاني سمعت دف نعليك" أي: صوتهما عند مشيك فيهما" ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کا معنی کیا ہے "صوت مشيك فيهما" یہ درست نہیں کیونکہ مشی کے معنی مصدری میں صوت کو دخل نہیں۔ اس کا اصل معنی ہے آہستگی سے چلنا اور یہاں صوت سے مراد ایسی ہلکی اور معمولی آواز ہے جو چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔

"في الجنة" ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس امر کا عالم غیب سے حالت نوم، حالت بیداری یا حالت نوم وحالت بیداری کی درمیانی کیفیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کشف ہوا تھا یا آپ نے شب معراج میں اسے دیکھا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے چلنا اسی طرح ہے جیسے خادم مخدوم کی حفاظت کیلئے اس کے آگے چلتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی تطییب خاطر اور ترغیب سامعین کیلئے یہ بات ارشاد فرمائی۔

"أرجى عندى أني" بالفتح۔ اسے کسرہ کے ساتھ پڑھنا بھی درست ہے اس صورت میں یہ جملہ مستانفہ ہے۔

"لم أتطهر طهورا" بضم الطاء۔ اس سے مراد عام طہارت ہے جو وضو، غسل اور تیمم کو شامل ہے۔ ابن ملک رحمہ اللہ نے اسے بفتح الطاء پڑھا ہے اس صورت میں اس سے مراد صرف وضو ہوگا۔

اس حدیث سے بظاہر اوقات مکروہہ میں نماز پڑھنے کا جواز معلوم ہو رہا ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ وہ احادیث جن میں حرمت کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا اس حدیث پر مقدم ہوں گی جس میں جواز کا احتمال ہے۔ نیز اس حدیث میں یہ کہیں نہیں کہ وضو کے فوراً بعد نفل پڑھتے تھے بلکہ مراد مطلق بعد میں پڑھنا ہے۔

امام میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث میں کچھ دوسرے امور کو بھی نقل فرمایا ہے۔ یا تو راویوں کے بیان کا اختلاف ہے یا واقعہ مکرر ہے۔

صلوٰۃ استخارہ کا طریقہ اور دُعا

۱۳۲۳: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُنَا الْإِسْتِخَارَةَ فِي الْاُمُوْرِ كَمَا يُعَلِّمُنَا السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرْاٰنِ يَقُوْلُ اِذَا هَمَّ اَحَدُكُمْ بِالْاَمْرِ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ مِنْ غَيْرِ الْفَرِيْضَةِ ثُمَّ لِيَقُلْ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْاَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَيْرٌ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَمَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِيْ اَوْقَالَ فِيْ عَاجِلِ اَمْرِيْ وَاٰجِلِهٖ فَاقْدِرْهُ لِيْ وَيَسِّرْهُ لِيْ ثُمَّ بَارِكْ لِيْ فِيْهِ وَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّيْ فِيْ دِيْنِيْ وَمَعَاشِيْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِيْ اَوْقَالَ فِيْ عَاجِلِ اَمْرِيْ وَاٰجِلِهٖ فَاصْرِفْهُ عَنِّيْ

وَاصْرِفْنِي عَنْهُ وَاقْدِرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ ثُمَّ ارْضِنِي بِهِ قَالَ وَيُسَمِّي حَاجَتَهُ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۳/ حدیث رقم ۱۱۶۶۔ والترمذی فی السنن ۲/ ۲۴۵ حدیث رقم ۴۸۰۔ وابن ماجه ۱/ ۴۴۰ حدیث رقم ۱۳۸۳۔

ترجمه: حضرت جابرؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں استخارہ سکھاتے تھے تمام امور میں جس طرح کہ قرآن مجید کی کوئی سورت ہمیں سکھاتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے جب بھی ارادہ کرے تم میں سے کوئی کسی بھی کام کا تو اس کو چاہئے کہ وہ دو رکعتیں نماز پڑھ لے فرض کے علاوہ (یعنی نفل اور پھر یہ دعا پڑھے **اللهم انی استخيرك بعلمك**...... اے اللہ میں تجھ سے خیر طلب کرتا ہوں تیرے علم کے وسیلہ سے اور میں تجھ سے قدرت طلب کرتا ہوں تیری قدرت کے واسطہ سے اور میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے بڑے فضل کا، بے شک تو قادر ہے اور میں قادر نہیں ہوں اور تو سب چیزوں کو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا اور تو جاننے والا ہے تمام غیب کی باتوں کو، اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام بہتر ہے میرے لیے، میرے دین میں اور میری دنیا میں، اور میرے انجام کے اعتبار سے۔ راوی کہتے ہیں یا فرمایا، میرے جلد آنے والے معاملے یا بدیر آنے والے معاملے میں یعنی میری دنیا میں یا آخرت میں تو اس کو مہیا فرما دے میرے لیے اور اس کو آسان کر دے میرے لیے پھر تو اس میں برکت ڈال دے میرے لیے اور اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے لیے برا ہے میرے دین اور میری معاش اور میرے انجام کے اعتبار سے یا میری دنیا و آخرت میں، تو اس کو مجھ سے پھیر دے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے لیے مہیا فرما جس میں خیر ہو جہاں بھی کہیں ہو اور پھر مجھے اس پر راضی فرما دے، اور لفظ ہٰذا الامر کی جگہ اپنی ضرورت اور چاہت کا نام لے۔ (بخاری)

تشریح: ''**كان رسول الله ﷺ يعلمنا الاستخارة**'' استخارہ سے مراد یہ ہے کہ دو امور میں خیر کو طلب کرنا۔

''**اذاهم أحدكم بالأمر**'' یعنی جب تم میں سے کوئی کسی کام مثلاً نکاح یا سفر وغیرہ کا ارادہ کرے۔

ابن ابی حمزہؒ فرماتے ہیں: ''دل پر وارد ہونے والے خیالات کے مختلف مراتب ہیں:

① **الهمة**۔ ② **اللمة**۔ ③ **الحظرة**۔ ④ **النية**۔ ⑤ **الارادة**۔ ⑥ **العزيمة**۔

پہلے تین میں مواخذہ نہیں جب کہ دوسرے تین میں مواخذہ ہے۔

نبی کریم ﷺ کے فرمان ''**اذاهم**'' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب دل میں کسی کا خیال آئے تو فوراً استخارہ کر لے تا کہ دعا و نماز کی برکت سے خیر فوراً ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بات دل میں بیٹھ جائے عزم مصمم کر لے اس کی طرف میلان ہو جائے تو خیر شر کی طرف پلٹنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ حدیث میں **هم** سے مراد عزیمت ہو کیونکہ دل پر آنے والے خیالات پختہ نہیں ہوتے۔ اس لئے استخارہ کرنے لگے تو بہت سا وقت اسی میں ضائع کر دے گا۔ ابن مسعود ؓ کی حدیث یہ الفاظ آئے ہیں: ''**اذا اراد أحدكم أمرًا**''۔

اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

''**فليركع ركعتين**'' یعنی کم از کم دو رکعات استخارہ کی نیت سے پڑھے۔ پہلی رکعت میں سورۂ کافرون اور دوسری میں

سورۂ اخلاص پڑھے۔ یا پہلی میں سورۂ قصص کی آیت ۶۸ اور دوسری رکعت میں سورۂ احزاب کی آیت ۳۶ پڑھے۔

"من غیر الفریضة" یہ اکملیت کا بیان ہے۔ اس کی نظیر تحیة المسجد اور تحیة الوضوء ہیں۔ علامہ میرک فرماتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے کہ صلوٰۃ استخارہ کیلئے فرض نماز میں نیت کافی نہیں۔ بلکہ اسے الگ ادا کرنا ہوگا۔ کچھ حضرات کا مسلک یہ ہے کہ چونکہ اس کے وقت کی تعیین نہیں کی گئی اس لئے صلوٰۃ استخارہ اوقات مکروہہ میں بھی جائز ہے لیکن جمہور کا مسلک یہ ہے استخارہ کی نماز اوقات مکروہہ کے علاوہ میں پڑھی جائے گی۔

"اللهم انی استخیرك" اے اللہ! میں تجھ سے دو امروں میں سے بہتر کا سوال کرتا ہوں۔

"بعلمك" بسبب علمك" معنی اس قول کا یہ ہے کہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو اپنے علم کے ذریعے میرے دل کو خیر الامرین کیلئے کھول دے کیونکہ اشیاء کی حقیقت کا علم صرف تجھے ہی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

(البقرة: ۲۱۶) "ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو برا سمجھو اور وہ تمہارے لئے اچھی ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو لیکن وہ تمہارے لئے بری ہے اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ أستخیرك بعلمك اور أستقدرك بقدرتك۔ دونوں میں باء استعانت کے لئے ہے یا استعطاف کیلئے ہے۔

"وأستقدرك بقدرتك" یعنی میں تجھ سے قوت طلب کرتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ نیکی کرنے کی قوت اور گناہ سے بچنے کی طاقت اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے۔ "قال رب بما أنعمت علی"۔

"وأنت علام الغیوب" بضم الغین و کسرها۔ یہ باب الاکتفاء یا طریق البرہان کی قبیل سے ہے۔ معنی یہ ہوگا تو کثیر علم والا ہے اور غائب اشیاء کو بھی جانتا ہے ظاہر چیزوں کا کیا کہنا تو تو پوشیدہ اور مخفی اسرار سے بھی واقف ہے۔

یہ کلام ماقبل کی تکمیل و تاکید کیلئے ہے۔ مقام دعا میں ایسی ہی الحاح وزاری ہونی چاہیے جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا میں الحاح وزاری کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

پہلے کلام میں علم کو مقدم کرنے اور دوسرے میں تقدیر کو مقدم کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اصل یہ ہے کہ علم کے بعد فعل خیر کو انجام دینے کی قدرت بھی حاصل ہو جائے۔

"اللهم ان کنت تعلم ان هذا لأمر" ایک روایت میں آتا ہے کہ اس موقع پر اپنی حاجت کو بیان کرے، یا دل میں اس کا استحضار کرے۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اللهم ان کنت تعلم" میں کلام کو موقع شک میں لایا گیا اور اس سے تفویض اور خفا کا اظہار کیا گیا اس کو بلاغت کی اصطلاح میں تجاہل عارف اور مزج الشک بالیقین کہا جاتا ہے۔ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ شک اس علم میں ہے جو خیر و شر سے متعلق ہو اصل علم میں شک نہیں۔

دوسرا قول زیادہ بہتر اور راجح ہے پہلے قول کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے میں ہمیں توقف ہے۔

''خیرلی فی دینی ومعاشی'' صحاح میں لکھا ہے ''العیش الحیاۃ''۔ العیش اور معاش کا ایک ہی معنی ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کو مصدر بنایا جا سکتا ہے۔ طبرانی اوسط میں حضرت ابن سلامؓ کی روایت میں آیا ہے ''فی دینی ودنیای'' جبکہ طبرانی کبیر میں ابوایوب انصاری کی روایت میں آیا ہے۔ ''فی دنیای وآخرتی''۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ راوی کا شک یہ ہے کہ نبی کریم نے عاقبة أمری فرمایا یا عاجل أمری واجله فرمایا۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ اس کی چار صورتیں ہیں:

① دین کی خیر ہو دنیا کی نہ ہو یہ ابدال کا مقصود ہے۔ ② محض دنیا کی خیر ہو۔ یہ حقیر شخص کا مقصود ہے۔
③ خیر عاجل ہو نہ کہ آجل۔ ④ خیر آجل ہو نہ کہ عاجل۔ یہ اولیٰ ہے اور دونوں کو جمع کرنا افضل ہے۔

اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ شک اس بارے میں ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''فی دینی ومعاشی وعاقبة أمری'' فرمایا یا ان تین الفاظ کی جگہ ''فی عاجل أمری وآجله'' فرمایا: عاجل الأمر دینی اور دنیوی دونوں کو شامل ہے۔ جبکہ لفظ آجل ان دونوں کو اور عاقبت کو بھی شامل ہے۔

''فاقدرہ'' بضم الدال وکسرہ۔

نہایہ میں لکھا ہے کہ تقدیر کے ذکر کو اس حدیث میں مکرر لایا گیا ہے۔ تقدیر سے مراد وہ چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما لیا۔ یہ قدر یقدر قدورا سے مصدر ہے۔ لیلۃ القدر کو بھی لیلۃ القدر اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس میں رزق کی تقدیر لکھی جاتی ہے اور اس کا فیصلہ ہوتا ہے۔

''ویسرہ لی'' تقدیر کے بعد تیسیر (آسانی) کا سوال ہے۔ بعض نے تقدیر سے تیسیر مراد لی ہے اس صورت میں ویسرہ لی عطف تفسیری ہوگا۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بزار کی روایت ''فوفقه وسهله'' کے الفاظ منقول ہیں۔

شہاب الدین قرافی اپنی کتاب ''القواعد'' میں لکھتے ہیں:

''جو دعا استئنافِ مشیت پر مشتمل ہو حرام ہوتی ہے جیسے ''اقدرلی الخیر'' کیونکہ وہ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے مستقبل پر صادق آتی ہے۔ نہ کہ ماضی پر۔ کیونکہ دعا نام ہے طلب کا اور طلب زمانہ ماضی میں محال ہے۔ پس اس دعا کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ تقدیر کو مستقبل میں مرتب فرمائیں حالانکہ یہ بات محال ہے کیونکہ تقدیر تو ازل سے لکھی جا چکی ہے۔ پس اس دعا سے اس مسلک کو تقویت ملتی ہے جس کے مطابق تقدیر کی کوئی حیثیت نہیں اور ہر کام خود بخود ہوتا ہے جیسا کہ خوارج کا مسلک ہے اور بالاجماع فسق ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ حدیث استخارہ میں ''واقدرلی الخیر حیث کان'' کے الفاظ آئے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ یہاں تقدیر سے مراد مجازی طور پر تیسیر ہے۔ لہٰذا دعا مانگنے والا اگر اس مجاز کو پیش نظر رکھے تو پھر جائز ہے''۔

''ثم بارك لی فيه'' ثم ترتیب کیلئے ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ثم کو لانے میں حکمت یہ ہے کہ سوال کے بعد حصول میں عام طور پر کچھ تراخی ہوتی ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات سے اتفاق مشکل ہے کیونکہ اگر یہ دعا ابتداء سے برکت کے ساتھ ملی ہوئی نہ ہوتی تو وہ مضمحل ہوتا۔ البتہ

برکت کا ظہور کبھی مؤخر ضرور ہوتا ہے لیکن وہ یہاں مراد نہیں۔ اگر ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی بات کو خارج میں تسلیم کر بھی لیا جائے تو دعا وطلب کے مقام میں یہ معنی بالکل بھی درست نہیں۔

"فاصرفه عني واصرفني عنه" ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: واصرفني عنه ماقبل فاصرفه عني کے لئے تاکید ہے کیونکہ جب وہ عمل شر سے دور ہوگا تو یہ بھی اس سے دور ہو جائے گا۔ اس کے معنی میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ فاصرفه عني سے مراد ہے لا تقدرني عليه اور اصرفني عنه سے مراد ہے اصرف خاطري عنه۔

"واقدر لي الخير حيث كان" نسائی میں "حيث كنت" کے الفاظ ہیں۔ بزار کی روایت میں "وان كان غير ذلك خيرًا فوفقني الخير حيث كان" کے الفاظ ہیں۔ ابن حبان کی روایت میں "وان كان غير ذلك خيرًا لي فاقدر لي الخير حيثما كان" کے الفاظ ہیں۔ انہی کی ایک روایت میں "اينما كان لاحول ولا قوة الا بالله" کے الفاظ منقول ہیں۔

"ثم ارضني به" ای بالخير۔ نسائی کی روایت میں "بقضائك" کے الفاظ ہیں۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ نے اس جملہ کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ پھر مجھے اپنی اس خیر سے راضی کر دے جو تو نے میرے مقدر میں لکھی ہے کیونکہ بعض اوقات مقدر میں خیر لکھی ہوئی ہے لیکن انسان اسے ناپسند سمجھتا ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔ لیکن اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ یہ الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے ہوں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اصول سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ نیز کسی امر کے اظہار وتعیین میں مقرر کرنا شرط نہیں بلکہ محض نیت بھی کافی ہے۔

علامہ میرک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محدثین اربعہ، ابن حبان اور ابن ابی شیبہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا۔

ابن حبان اور ابن ابی شیبہ کی ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ والی روایت میں ذکر ہے کہ آدمی جب کسی عورت سے شادی کرنا چاہے تو پیام نکاح سے پہلے اچھی طرح وضو کرے پھر نماز پڑھے پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے:

"اللهم انك تقدر ولا أقدر وتعلم ولا أعلم وأنت علام الغيوب فان رأيت ان في فلانة خيرا لي في ديني ودنياي واخرتي فاقدر بها لي وان كان غيرها خيرا لي منها في ديني واخرتي فاقدرها لي"۔

دوسرے فقرے میں دنیا کا ذکر نہ کرنے میں ایک نکتہ ہے جو مخفی نہیں۔

علماء فرماتے ہیں کہ استخارہ کے بعد دل میں اس کام کے بارے میں انشراح محسوس کرے گا۔ اگر دل میں انشراح محسوس نہ ہو تو اس وقت تک نماز میں مشغول رہے جب تک خیر ظاہر نہ ہو جائے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں سات مرتبہ استخارہ کرے۔

اگر وقت کم ہو اور لمبی دعا نہ پڑھ سکے تو اتنا پڑھ لے۔ "اللهم خر واخترلي واجعل لي الخيرة"۔

یا یہ دعا پڑھ لے: "اللهم خرلي واخترلي ولا تلكني الى اختياري"

يا خائر العبيدة ○ لاتتركن أحدًا سدًّى

خرلي اليك طريقة ○ بيديك أساب الهدى

''اے اپنے بندے کی ضمیر چاہنے والے! تو کسی کو بے راہ نہ چھوڑ میرے لئے حق کا راستہ واضح کر دے کہ سارے اسباب ہدایت تیرے قبضے میں ہیں''۔

منقولہ دعاؤں میں سے ایک یہ ہے: اے اللہ! مجھے اچھے اعمال اور اچھے اخلاق کی توفیق دے، اچھے اخلاق اور عمدہ اعمال کا راستہ تو ہی دکھاتا ہے۔ اے اللہ مجھ سے اعمال و اخلاق کی برائی کو دور کر دے اس برائی کو صرف تو ہی دور کر سکتا ہے۔

الفصل الثّانی:

برائی کے بعد فوراً توبہ کرنی چاہیے

۱۳۲۴: عَنْ عَلِيٍّ قَالَ حَدَّثَنِي اَبُوْبَكْرٍ وَصَدَقَ اَبُوْبَكْرٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَامِنْ رَّجُلٍ يُذْنِبُ ذَنْبًا ثُمَّ يَقُوْمُ فَيَتَطَهَّرُ ثُمَّ يُصَلِّي ثُمَّ يَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ اِلَّاغَفَرَ اللّٰهُ لَهُ ثُمَّ قَرَأَ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ (رواہ الترمذی وابن ماجة الا ان ابن ماجة لم يذكر الآية) وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ۔

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۲/ ۱۸۰ حديث رقم ۱۵۲۱۔ والترمذي في السنن ۲/ ۲۵۷ حديث رقم ۴۰۶۔ وابن ماجه ۱/ ۴۴۶ حديث رقم ۱۳۹۵۔ وأحمد في المسند ۱/ ۲۔

ترجمہ: فاتح خیبر حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ خلیفہ بلافصل حضرت صدیق اکبرؓ نے میرے سامنے بیان کیا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا، فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص بھی کوئی گناہ کرتا ہے اور پھر نادم ہوتے ہوئے اٹھتا ہے اور وضو کرتا ہے اور نماز پڑھتا ہے تو پروردگار اس کی بخشش فرما دیتے ہیں پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً......﴾ وہ لوگ جب کوئی ایسا کام کر بیٹھیں جو برائی والا ہو یا ظلم کر بیٹھیں اپنی ذات پر وہ یاد کرنا شروع کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کو اور معافی چاہتے ہیں اپنے گناہوں کی۔ یہ ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت ہے لیکن ابن ماجہ میں آیت کا حوالہ نہیں۔

تشریح: ''عن علی رضی اللہ عنہ قال حدثنی ابو بکر'' یہ روایۃ الأقران کی قبیل سے ہے جیسے امام ابو حنیفہ کا امام مالک سے اور امام مالک کا امام ابو حنیفہ سے رویت کرنا اور امام شافعی کا امام محمد بن حسن شیبانی سے روایت کرنا۔

''وصدق أبوبکر رضی اللہ عنہ'' ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ معترضہ ہے اس کے ذریعے حضرت علیؓ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی جلالت شان اور ان کی سچائی کی رفعت کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

''مامن رجل'' ای أمرأۃ۔ من زائدہ ہے اس کا مقصد افادۂ استغراق کی زیادتی ہے۔

''یذنب ذنبا ثم یقوم'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے ثم کو تراخی رتبی کیلئے قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس کا تراخی زمانی کیلئے ہونا راجح ہے۔ یعنی اگر اس گناہ کرنے والے کا عزم توبہ گناہ سے متاخر بھی ہو تب بھی یہ فضیلت اسے حاصل ہوگی کیونکہ توبہ کی قبولیت

کیلئے گناہ کے فوراً بعد توبہ کرنا شرط نہیں۔

''ثم یصلی'' ابن السنی کی روایت میں ثم یصلی کے بعد رکعتین کا اضافہ ہے ان رکعات میں پہلی رکعت میں سورۂ کافرون اور دوسری میں سورۂ اخلاص پڑھے۔ یا پہلی رکعت میں آل عمران کی آیت ۱۳۵ اور دوسری میں سورۂ نساء کی آیت ۱۱۰ پڑھے۔

''ثم یستغفر اللّٰہ'' استغفار سے مراد ماضی کے گناہوں پر ندامت اور مستقبل میں گناہ نہ کرنے کا عزم مراد ہے۔ انسان تہیہ کرے کہ آئندہ گناہ نہ کرے گا نیز اگر کسی کی حق تلفی کی ہے تو اس کے حقوق ادا کرے۔ ثم دونوں جگہوں میں محض عطف تعقیبی کیلئے ہے۔

''الاغفر اللّٰہ لہ'' حصن میں ہے: ''الاغفر لہ ذنوبہ کلھا'' اللہ تعالیٰ نہ صرف بندے کے گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں بلکہ انہیں نیکیوں سے تبدیل کر دیتے ہیں۔

''ثم قرأ'' اس جملہ کے معنی میں دو احتمال ہیں:

① حضور ﷺ نے استشہاد و اعتضاد کیلئے یہ آیت پڑھی۔ ② حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تصدیق و توفیق کیلئے یہ آیت پڑھی۔

''والذین'' یہ ''علی المتقین'' پر عطف ہے۔ بیان یہ کرنا مقصود ہے کہ جنت جس طرح متقین کیلئے بنائی گئی اسی طرح تائبین کیلئے بھی بنائی گئی ہے۔ یا یہ مبتدا ہے اس کی خبر آگے آئے گی۔ یہی ظاہر حدیث ہے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ دو متعاطفین کے درمیان فصل نہ کیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عطف تفسیری ہو۔ پس تقدیری عبارت یہ ہوگی ''وھم الذین''

''اذا فعلوا فاحشۃ'' یعنی ایسا فعل جو اپنی قباحت میں انتہاء کو پہنچا ہو جیسے زنا اور کلمۂ کفر۔

''ذکروا اللّٰہ'' یعنی اللہ کی سزا کو یاد کریں یا اس کی وعید کو یاد کریں۔ علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہی کہا ہے لیکن ظاہر حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا معنی ہے نماز پڑھیں۔ لیکن اعتبار چونکہ عموم لفظ کا ہوتا ہے خصوصی سبب کا نہیں۔ اس لئے اس کا معنی ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو کسی بھی طرح یاد کریں خواہ اس کی سزا کے ساتھ، خواہ گناہوں کی بدولت پڑنے والے حجاب کے ساتھ، خواہ رب الارباب کی تعظیم کے ساتھ، تسبیح و تہلیل کے ساتھ، قرآن مجید کی تلاوت کے ساتھ یا نماز کے ساتھ جو ان سب کو جامع ہے۔

''فاستغفروا'' یعنی توبہ و ندامت کے وجود کے ساتھ مغفرت کو طلب کریں۔ توبہ ندامت کے ساتھ ہی استقامت حاصل ہو سکتی ہے۔

''لذنوبھم'' ابن ملک فرماتے ہیں کہ لام معدیہ یا تعلیلیہ ہے۔

آیت کا اگلا حصہ یہ ہے:

''ومن یغفر الذنوب الا اللّٰہ ولم یصروا علی ما فعلوا وھم یعلمون''

''اللہ کے سوا کون گناہ معاف کر سکتا ہے اور اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے اس حال میں کہ وہ جانتے ہیں''۔

یعنی اللہ ہی وہ ذات ہے جو صفت غفور اور صفت غفار کے ساتھ موصوف ہے۔ پہلی صفت کثرت ذنوب کے مبالغہ کو بتانے کیلئے ہے اور دوسری صفت کثرت مذنبین کے مبالغہ کو بتانے کیلئے ہے۔ اس آیت کا استفہام نفی کے معنی میں ہے۔

''ولم يصرّوا'' کا معنی ہے کہ وہ اپنے گناہوں پر اصرار اور مداومت اختیار نہیں کرتے۔ صغیرہ گناہ پر اصرار اسے کبیرہ بنا دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب بھی ان سے گناہ صادر ہوتا ہے تو فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''ما أصر من استغفر وإن عاد في اليوم سبعين مرة''

جس نے استغفار کر لیا اس نے اصرار نہیں کیا خواہ ایک دن میں ستر مرتبہ ہی توبہ کیوں نہ کرے''۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی سے گناہ کا صدور ہو گیا تو اس نے کہا اے میرے رب! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے مجھے معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو اس کے گناہ معاف کرتا ہے اور اس کا ہاتھ تھامتا ہے۔ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا''۔ بندہ کچھ عرصہ تک رکا رہتا ہے۔ پھر گناہ کرتا ہے۔ پھر کہتا ہے ''اے میرے رب! میں نے ایک اور گناہ کیا مجھے معاف کر دیجئے''۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو اس کے گناہ کو معاف کرتا ہے۔ اور اسے سہارا دیتا ہے۔ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا''۔ بندہ کچھ عرصہ ٹھہرتا ہے پھر گناہ کرتا ہے۔ پھر کہتا ہے۔ ''اے میرے رب! میں نے ایک اور گناہ کیا مجھے معاف کر دیجئے''۔ ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو گناہ معاف کرتا ہے اور اس کو سہارا دیتا ہے۔ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا پس بندہ جو چاہے عمل کرے''۔

اس حدیث کے آخری جملہ ''فليعمل ماشاء'' بندہ جو چاہے عمل کرے، کے بارے میں کہا گیا ہے کہ کبھی کبھی تلطف، مہربانی اور عنایت کے اظہار کیلئے ایسا ہوتا ہے جیسے جو شخص آپ سے دور ہو رہا ہے اور آپ کی حق تلفی کر رہا ہو آپ اس کو قریب کرنے کیلئے کہیں ''تم جو چاہو کر لو میں تم سے اعراض نہیں کروں گا اور تمہاری محبت کو ترک نہیں کروں گا'' اس حدیث میں یہی معنی موجود ہے۔ کہ تو نے جتنے گناہ کئے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ گناہ بھی کر لے پھر مجھ سے استغفار کرے تو میں تیرے سارے گناہوں کو معاف کر دوں گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم جو چاہو کرتے رہو۔

آیت مذکورہ کی خبر اگلی آیت ہے:

''اولئك جزاء هم مغفرة من ربهم وجنات تجرى من تحتها الأنهار خالدين فيها ونعم أجر العاملين''

حضرت علیؓ نے اس روایت کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے ''وصدق أبو بكر'' کے جو الفاظ ذکر کیے ہیں اس کا پس منظر سمجھنے کیلئے حضرت علیؓ کا یہ قول ملاحظہ کیجئے، فرماتے ہیں:

''میں جب رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث سنتا تو اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے مطابق مجھے اس سے فائدہ پہنچاتے۔ اور جب صحابہ کرام میں سے کوئی مجھ سے حدیث بیان کرتا تو میں ان سے قسم لیتا اگر وہ قسم کھا لیتے تو ان کی تصدیق کر دیتا ہے۔ اور جب ابو بکر رضی اللہ عنہ مجھ سے حدیث بیان کرتے تو میرا نظریہ یہ ہوتا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ تو سچ ہی کہتے ہیں''۔

میں کہتا ہوں کہ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی وہ یہ کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ روایت باللفظ کا التزام کرتے تھے جبکہ اکثر صحابہ روایت بالمعنی بھی کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی روایات بہت کم ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس خصوصیت میں ابو بکر رضی اللہ عنہ

کے تابع ہیں۔

امام میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں ابن مسعود، انس، ابوامامہ، معاذ، واثلہ، ابی الیسر (کعب بن عمرو) رضی اللہ عنہم کی روایات بھی موجود ہیں۔

''وابن ماجة الا ان ابن ماجة'' ظاہر کو ضمیر کے قائم مقام کیا گیا ہے وگرنہ اصل یہ تھا کہ ''انه'' سے بیان کرتے۔

علامہ جزری رحمہ اللہ نے حصن میں ابوالدرداءؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ بندہ گناہ کے بعد جب توبہ کرنے کا ارادہ کرے تو ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگے:

''اے اللہ! میں توبہ کرتا ہوں آئندہ کبھی یہ گناہ نہیں کروں گا''۔

ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کو معاف فرما دیتے ہیں۔ جب تک وہ دوبارہ اس میں مشغول نہ ہو۔ (رواہ الحاکم)

امام غزالی رحمہ اللہ منہاج میں فرماتے ہیں:

''جب آپ توبہ کا ارادہ کریں تو غسل کریں صاف ستھرے کپڑے پہنیں پھر جتنا اللہ نے مقدر میں لکھا ہو نوافل پڑھیں۔ پھر کسی ایسی جگہ جہاں اللہ کے علاوہ کوئی آپ کو نہ دیکھے۔ اپنے چہرے کو زمین پر رکھیں، اپنے سر پر مٹی ڈالیں اور بہتے آنسوؤں غمگین دل اور بلند آواز کے ساتھ اپنے سب سے معزز عضو یعنی چہرے کو مٹی میں ملیں۔ جہاں تک ہو سکے اپنے ایک ایک گناہ کو یاد کریں۔ اور اپنے گناہ گار نفس کو ملامت کریں، اور کہیں ''اے نفس! تجھے شرم نہیں آتی؟ لیکن تیرے توبہ کرنے کا وقت نہیں آیا؟ کیا تو اللہ کے عذاب کو برداشت کر سکتا ہے؟ کیا تجھے کوئی اللہ کی ناراضگی سے بچا سکتا۔ خوب روئیں اور اپنے ہاتھ رب رحیم کی طرف اٹھا کر عرض کریں۔ ''اے الٰہی! تیرا بھاگا ہوا غلام تیرے دروازے پر حاضر ہے۔ تیرا گناہ گار بندہ صلح کیلئے لوٹ آیا ہے۔ تیرا عاصی بندہ معافی کا خواستگار ہے۔ اپنے فضل سے مجھے معاف فرما اور اپنی رحمت سے مجھے بخش دے اور میری طرف نظر رحمت فرما۔ اے اللہ! میرے پچھلے گناہوں کو معاف فرما اور آئندہ زندگی میں میری حفاظت فرما۔ ساری کی ساری خیر تیرے ہاتھ میں ہے تو ہمارے ساتھ نرمی اور مہربانی کرنے والا ہے''۔

مصیبت کے وقت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل

۱۳۲۵: وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ صَلّٰى۔ (رواہ ابو داود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ۷۸/۲ حديث رقم ۱۳۱۹۔ وأحمد في المسند ۳۸۸/۵۔

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی مصیبت پیش آتی، تو نماز (نفل) پڑھتے تھے۔

(ابوداؤد)

تشریح: ''اذا حزبه'' جب آپ کو اہم امر پیش آتا۔ ایک روایت ''حزنه'' ہے یعنی جب آپ غمگین ہوتے۔

''صلّٰی'' اس اہم یا غمگین کرنے والے معاملہ کیلئے آپ نماز پڑھتے تاکہ اس میں آسانی پیدا ہو اور اللہ تعالیٰ کے اس قول پر عمل بھی ہو جائے: ''واستعينوا بالصبر والصلاة''۔ ''مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ذریعے''۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وأمر أهلك بالصلاة واصطبر عليها''۔ ''اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود

بھی اس پر صبر اختیار کرو"۔

اس نماز کو صلاۃ حاجت کہا جاسکتا ہے کیونکہ یہ کسی کیفیت یا وقت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

ہر وقت باوضو رہنے اور تحیۃ الوضو پڑھنے کی فضیلت

۱۳۲۶: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ أَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَدَعَا بِلَالًا فَقَالَ بِمَا سَبَقْتَنِيْ إِلَى الْجَنَّةِ مَا دَخَلْتُ الْجَنَّةَ قَطُّ إِلَّا سَمِعْتُ خَشْخَشَتَكَ أَمَامِيْ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا أَذَّنْتُ قَطُّ إِلَّا صَلَّيْتُ رَكْعَتَيْنِ وَمَا أَصَابَنِيْ حَدَثٌ قَطُّ إِلَّا تَوَضَّأْتُ عِنْدَهُ وَرَأَيْتُ أَنَّ لِلّٰهِ عَلَيَّ رَكْعَتَيْنِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِهِمَا۔

(رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٥/ ٦٢٠ حديث رقم ٣٦٨٩۔ وأحمد فی المسند ٥/ ٣٦٠۔

ترجمہ: حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ نے صبح کے وقت حضرت بلالؓ کو بلا کر دریافت فرمایا کس عمل کے ذریعے تم نے جنت میں مجھ سے پیش روی اختیار کی ہے اس لئے کہ میں جب بھی جنت میں داخل ہوا تو میں نے اپنے آگے تمہارے قدموں کی چاپ سنی تو عرض کیا، اے اللہ کے رسول! میں نے جب بھی اذان دی ہے تو اس کے بعد دو رکعتیں ضرور پڑھی ہیں اور جب بھی مجھے کوئی حدث لاحق ہوتو میں نے اسی وقت وضو کرلیا اور میں نے ضروری سمجھا ہے کہ مجھ پر اللہ کی طرف سے دو رکعتیں پڑھنا لازم ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ اعزاز انہی دونوں کی وجہ سے ہے۔

تشریح: "فدعا بلالاً فقال بما سبقتنی الی الجنة؟" حضور ﷺ کے اس سوال کا منشا یہ تھا کہ آخر کسی وجہ سے تمہیں یہ سعادت حاصل ہوئی کہ جنت میں داخل ہوتے وقت تمہاری خدمت کی ذمہ داری میرے آگے پھر مقرر ہوئی؟ کیونکہ جنت کے درجات کا دارومدار تو نیکیوں پر ہے۔

بعض محدثین نے اس کی یہ تشریح کی ہے کہ میرے حکم دیئے بغیر تم نے کون سا عمل کرلیا جس سے جنت میں دخول واجب ہوگیا؟ یعنی سبقتنی سے مراد دخول جنت میں سبقت نہیں بلکہ عمل میں سبقت مراد ہے۔

"ما دخلت الجنة قطّ" اس جملہ سے معلوم ہورہا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت بلال کو جنت میں کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ شاید ایک مرتبہ شب معراج، دوسری مرتبہ خواب میں اور تیری مرتبہ عالم کشف میں۔

"الا سمعت خشخشتك أمامی" اس سے ظاہر تو یہ معلوم ہورہا ہے کہ حضرت بلال حضور ﷺ سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ حالانکہ ایسا نہیں، کیونکہ کوئی نبی حضور ﷺ سے پہلے جنت میں داخل نہ ہوگا تو کوئی امتی کیسے داخل ہوسکتا ہے؟ اس کی توجیہ گذر گئی کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا داخل ہونا ایسے ہے جیسے کوئی خادم مخدوم کے آگے چلتا ہے۔

"قال یا رسول الله! ما أذنت" أذنت سے مراد ارادۂ اذان ہے۔

"قط الا صلیت رکعتین" یعنی اذان سے پہلے نفل دو رکعات پڑھتا ہوں۔ البتہ راجح معنی یہ ہے کہ میں اذان کے بعد اقامت سے پہلے دو رکعات پڑھتا ہوں۔ اس حدیث سے مغرب کی نماز کو مستثنی کہا جاسکتا ہے اس لئے کہ ہر عام کے لئے کوئی

خاص ہوتا ہے اور اس عام کو بھی خاص کیا گیا ہے۔

"قط الا توضات عنده" بعده کے بجائے عنده کی تعبیر اختیار کرنے میں یہ بتانا مقصود ہے کہ طہارت کی مداومت پر سخت پابندی اور محافظت کر رہا ہوں۔

"ورأیت" "توضأت" پر عطف ہے۔ابن ملک رحمۃ اللہ نے اسے ظننت اور ابن حجر نے اعتقدت کے معنی میں لیا۔ ابن حجر رحمۃ اللہ کا قول اس وقت درست ہوگا جبکہ مبالغہ مراد ہو، میرے خیال میں یہ اخترت کے معنی میں ہے۔

"ان للّٰه علی رکعتین" "تکلیف دہ چیز کے ازالہ اور طہارت کی توفیق کے شکر کے طور پر مجھ پر یہ دو رکعتیں واجب ہیں۔علامہ طیبیؒ نے اس جملہ کو مواظبت ومحافظت سے کنایہ قرار دیا ہے۔

ممکن ہے کہ حضرت بلالؓ نے ہر طہارت کے بعد دو رکعات پڑھنے کی نذر مانی ہو۔

"فقال رسول اللّٰه ﷺ بهما" "لفظ بهما کی مراد میں مختلف اقوال ہیں:

① تو نے یہ سعادت انہی رکعات کے ذریعہ حاصل کی، بهما نلت ما نلت۔

② تجھ پر ان کی پابندی لازم ہے، علیك بهما۔

③ انہی دو خصلتوں کی وجہ سے وہ جنت میں داخل ہوا۔

ظاہر یہ ہے کہ بهما کی هما ضمیر کا مرجع دو قریب ترین مذکور چیزوں کو قرار دیا جائے یعنی دوام طہارت اور تمام طہارت ۔اسی طرح یہ حدیث باب کی پہلی حدیث کے موافق ہو جائے گی۔اس کا مرجع الصلاة بین کل أذانین اور الصلاة بعد کل طهارة کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔اسی طرح الصلاۃ بین الاذانین اور دوام وضو و تمام وضو کے مجموعہ کو مرجع بنا سکتے ہیں۔

امام میرکؒ فرماتے ہیں کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔

صلوٰۃ حاجت کا طریقہ اور دعا

۱۳۲۷: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتْ لَهٗ حَاجَةٌ اِلَی اللّٰهِ اَوْ اِلٰی اَحَدٍ مِّنْ بَنِیْ اٰدَمَ فَلْیَتَوَضَّاْ فَلْیُحْسِنِ الْوُضُوْءَ ثُمَّ لِیُصَلِّ رَكْعَتَیْنِ ثُمَّ لِیُثْنِ عَلَی اللّٰهِ تَعَالٰی وَیُصَلِّ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ لِیَقُلْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِیْمُ الْكَرِیْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ اَسْاَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْغَنِیْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَّالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ لَا تَدَعْ لِیْ ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ وَلَا حَاجَةً هِیَ لَكَ رِضًی اِلَّا قَضَیْتَهَا یَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔

(رواه الترمذی وابن ماجة وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/ ۳۴۴ حدیث رقم ۴۷۹۔ وابن ماجه ۱/ ۴۴۱ حدیث رقم ۱۳۸۴۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیؓ ~~سے روایت ہے~~ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کی کوئی

حاجت ہو اللہ تعالیٰ یا بنی آدم میں سے کسی ایک کی طرف، اس کو چاہئے کہ وہ وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے پھر دو رکعتیں نماز پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرے، اور پھر آنحضرت ﷺ پر درود پڑھے، پھر یہ دعا پڑھے **لا الہ الا اللہ الحلیم الکریم سبحان اللہ رب العرش العظیم** ...... کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے جو بردبار اور کریم ہے پاک ہے اور عرش عظیم کا مالک ہے تمام تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو جہانوں کا پالنے والا ہے، اے اللہ! میں تجھ سے وہ چیز مانگتا ہوں جو تیری رحمت کا سبب ہو اور تیری بخشش کا سبب ہو اور میں حصہ مانگتا ہوں ہر نیکی سے اور میں سلامتی مانگتا ہوں ہر برائی سے اے اللہ! نہ چھوڑ میرے کسی گناہ کو مگر یہ کہ تو نے اس کو بخش دیا ہو نہ میرے کسی غم کو مگر یہ کہ تو نے اس کو دور کر دیا ہو اور نہ چھوڑ میری کسی ایسی عادت کو جو تجھے پسند ہو مگر یہ کہ تو نے اس کو پورا کر دیا ہو، اے بہت زیادہ رحم کرنے والے رحم کرنے والوں میں سے۔ یہ ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: ''من کانت لہ حاجۃ'' حاجت دینی ہو یا دنیوی، دونوں مراد ہیں۔

''فلیحسن الوضوء'' حصن میں فلیحسن وضوء کے الفاظ ہیں۔

''ثم لیقل'' حصن میں ولیقل کے الفاظ ہیں۔

''لا الہ الا اللہ الحلیم'' الحلیم سے مراد وہ ذات جو بدلہ لینے میں جلدی نہ کرے۔

''الکریم'' وہ ذات جو بلا استحقاق اور بغیر احسان جتلائے عطا کرے۔

''سبحان اللہ رب العرش'' وہ ذات جو تمام کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ اضافت تشریفی ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کی کسی چیز کی طرف احتیاج معلوم نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کا حدوث کی تمام جہات جیسے استواء، استقرار، جہت، مکان اور زمان سے پاک ہونا واضح ہو جائے۔

''العظیم'' اس لفظ کی ترکیب کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ لورب کی صفت ہے یا العرش کی جیسے نبی کریم ﷺ کے اس قول میں ''لا الہ الا اللہ رب العرش العظیم''

ابن التین نے راوی سے العظیم کو مرفوع روایت کیا ہے اس صورت میں ''الرب'' کی صفت ہوگا۔ البتہ جمہور کے نزدیک العرش کی صفت ہے۔

قرآن مجید کی آیت ''رب العرش العظیم'' اور ''رب العرش الکریم'' میں جمہور کی قراءت جر کے ساتھ ہے (یعنی العظیم اور الکریم، العرش کی صفت ہیں) ابن محیصن نے ان دونوں لفظوں کو مرفوع پڑھا ہے۔ ابن کثیر اور ابو جعفر المدنی سے بھی شاذ قراءت یہی ہے۔

رب العرش العظیم کا مرادی معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عجز سے پاک ہے کیونکہ جو ذات عرش عظیم پر قادر ہے وہ اپنے بندے کو اس کی مانگی چیز دینے سے ہرگز عاجز نہیں ہو سکتا۔

''والحمد للہ رب العالمین'' یعنی اللہ تعالیٰ عالمین کا خالق، مالک، مربی اور مصلح ہے۔ وہ ان کی حاجات کو عطا

کرنے والا ہے ان کی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ثناء کا اختتام ایسے جملے پر کیا گیا ہو تو تمام تعریفوں کی جامع ہے۔ بلکہ بعض حضرات کی رائے تو یہ ہے کہ یہ حمد کے الفاظ میں سب سے افضل لفظ ہے کیونکہ قرآن مجید کو اس سے شروع کیا گیا۔

''أسالك موجبات رحمتك'' موجبات سے مراد اسباب ہیں۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ : موجبات ،موجبة کی جمع ہے اس سے مراد وہ بات جو قائل کیلئے جنت کو واجب کردے۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں موجبات سے مراد ایسے افعال، اقوال اور صفات ہیں جن کے سبب سے انسان کو اللہ کی رحمت حاصل ہوتی ہے۔

''وعزائم مغفرتك'' علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنی بیان کیا ہے ''ایسے اعمال جن کی بنیاد پر تیری مغفرت پختہ اور مؤکد ہو جائے''۔

ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''عزائم ، عزیمة کی جمع ہے، اس سے مراد وہ خصلت ہے جسے انسان پختگی سے پکڑ لے۔ حاصل یہ کہ اے اللہ! مجھے وہ خصال عطا فرما جن کی بنا پر تیری مغفرت حاصل ہوتی ہے۔

''والغنيمة من كل بر'' اس سے مراد طاعت وعبادت ہے۔ اس کو غنیمت اس لئے کہا گیا کہ انسان کی روح کا لشکر نفس کی فوجوں کے خلاف برسر پیکار ہو کر انہیں حاصل کرتا ہے۔ چونکہ روح ونفس کے درمیان ہمیشہ سے جنگ جاری ہے اس لئے اس جہاد کو جہادِ اکبر کہا جاتا ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے ہفتہ کی صبح کا انتظار کرنا چاہیے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے:

''جو شخص اپنی حاجت ہفتہ کی صبح کو پوری کرنے کی کوشش کرے اس کی حاجت کو پورا ہونے کا میں ضامن ہوں''

علامہ جزری نے حصن میں تمام حاجات انسانی میں سے حفظ قرآن کی دعا کا ذکر کیا ہے میں بھی اس مقام پر اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ لکھتے ہیں کہ جو شخص قرآن مجید حفظ کرنے کا ارادہ کرے تو اسے چاہیئے کہ شب جمعہ کو تہائی رات کے بعد قیام کرے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو نصف شب میں قیام کرے اگر اس کی استطاعت بھی نہ ہو تو رات کے ابتدائی حصہ میں قیام کرے۔ اور چار رکعات پڑھے۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ اور سورہ یٰسین پڑھے۔ دوسرے رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورہ دخان پڑھے، جب تشہد سے فارغ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے۔ ثناء پڑھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے۔ تمام انبیاء علیہ السلام کیلئے رحمت کی دعا کرے۔ تمام مومن مردوں اور مومن عورتوں کے استغفار کرے اور آخر میں یہ دعا پڑھے:

''اللهم ارحمني بترك المعاصي أبدا ما أبقيتني وارحمني أن أتكلف مالا يعنيني وارزقني حسن النظر فيما يرضيك عني اللهم بديع السموات والارض ذا الجلال الاكرام والعزة التي لا ترام أسالك يا الله يا رحمن بجلالك ونور وجهك أن تلزم قلبي حفظ كتابك كما علمتني وارزقني ان أتلوه على

النحو الذی یرضیك عنی، اللھم بدیع السموات والارض ذا الجلال والاکرام والعزۃ التی لا ترام أسالك یا اللّٰہ یا رحمٰن بجلالك ونور وجھك ان تنور بکتابك بصری وأن تطلق بہ لسانی وأن تفرج بہ عن قلبی وأن تشرح بہ صدری وأن تستعمل بہ بدنی فانہ لا یعیننی علی الحق غیرك ولا یؤتیہ الا انت ولاحول ولاقوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم"۔

تین یا پانچ یا سات مرتبہ یہ عمل کرے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے قبول فرمائے گا۔(رواہ الترمذی والنسائی)

بَابُ صَلٰوۃِ التَّسْبِیْحِ

نمازِ تسبیح کا بیان

صلوٰۃ تسبیح انتہائی اجر وثواب کی حامل نماز ہے اس کی چار رکعتیں پڑھنی آنحضرت ﷺ سے منقول ہیں اور یہ نماز آپ ﷺ نے اپنے محبوب چچا حضرت عباسؓ کو سکھلائی۔

صلوٰۃ تسبیح کا طریقہ:

صلوٰۃ تسبیح کی ان الفاظ میں نیت کرے نویت ان اصلی اربع رکعاتِ صلوٰۃ التسبیح کہ میں نے چار رکعات صلوٰۃ تسبیح پڑھنے کا ارادہ کیا۔ اس کے بعد تکبیر تحریمہ کہہ کر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جائے اور سبحانك اللھم یعنی ثنا پڑھ کر اس کے بعد پندرہ مرتبہ سبحان اللّٰہ الحمد للّٰہ ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر. اور تعوذ تسمیہ اور سورۂ فاتحہ اور دوسری سورت ملانے کے بعد رکوع میں جانے سے قبل دس مرتبہ پھر یہی تسبیح پڑھے پھر رکوع وقومہ اور سجدہ اور جلسہ اور سجدہ ثانی میں دس دس مرتبہ یہی تسبیح پڑھے اور سجدہ ثانی کے بعد جلسہ استراحت کی ضرورت نہیں پھر ہر رکعت میں پندرہ مرتبہ قراءت سے پہلے اور دس مرتبہ قراءت کے بعد اور باقی دس دس مرتبہ رکوع اور دونوں سجدوں اور قومہ اور جلسہ میں پڑھے یہ کل تین سو دفعہ ہو جائے گی۔ یہ طریقہ ابن مبارکؒ سے منقول ہے۔

طریقہ ثانی مشہور ہے:

اس کا مشہور طریقہ وہی ہے جو کہ حدیث ابن عباسؓ میں منقول ہے کہ ہر رکعت میں قراءت سے فارغ ہو کر رکوع سے قبل پندرہ مرتبہ یہ تسبیح پڑھے اور پھر دس مرتبہ رکوع میں' دس مرتبہ قومہ میں اور دس مرتبہ پہلے سجدہ میں اور دس مرتبہ جلسہ میں اور دس مرتبہ سجدہ ثانی میں اور دس مرتبہ دوسری رکعت سے قبل جلسہ استراحت کر کے پڑھے۔ نیز رکوع اور سجدہ میں تسبیحاتِ رکوع وسجدہ کے بعد یہ تسبیح پڑھے۔ تو یہ تسبیح کل ۳۰۰ بار ہو جائیں گی۔

الفصل الاول:

صلوٰۃ تسبیح گناہوں کا کفارہ ہے

۱۳۲۸: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِلْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ يَاعَبَّاسُ يَاعَمَّاهُ اَلَا اُعْطِيْكَ اَلَا اَمْنَحُكَ اَلَا اُخْبِرُكَ اَلَا اَفْعَلُ بِكَ عَشْرَ خِصَالٍ اِذَا اَنْتَ فَعَلْتَ ذٰلِكَ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ ذَنْبَكَ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ قَدِيْمَهٗ وَحَدِيْثَهٗ خَطَأَهٗ وَعَمْدَهٗ صَغِيْرَهٗ وَكَبِيْرَهٗ سِرَّهٗ وَعَلَانِيَتَهٗ اَنْ تُصَلِّيَ اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ تَقْرَأُ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَسُوْرَةً فَاِذَا فَرَغْتَ مِنَ الْقِرَاءَةِ فِيْ اَوَّلِ رَكْعَةٍ وَاَنْتَ قَائِمٌ قُلْتَ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ خَمْسَ عَشْرَةَ مَرَّةً ثُمَّ تَرْكَعُ فَتَقُوْلُهَا وَاَنْتَ رَاكِعٌ عَشْرًا ثُمَّ تَرْفَعُ رَأْسَكَ مِنَ الرُّكُوْعِ فَتَقُوْلُهَا عَشْرًا ثُمَّ تَهْوِيْ سَاجِدًا فَتَقُوْلُهَا وَاَنْتَ سَاجِدٌ عَشْرًا ثُمَّ تَرْفَعُ رَأْسَكَ مِنَ السُّجُوْدِ فَتَقُوْلُهَا عَشْرًا ثُمَّ تَسْجُدُ فَتَقُوْلُهَا عَشْرًا ثُمَّ تَرْفَعُ رَأْسَكَ فَتَقُوْلُهَا عَشْرًا فَذٰلِكَ خَمْسٌ وَّسَبْعُوْنَ فِيْ كُلِّ رَكْعَةٍ تَفْعَلُ ذٰلِكَ فِيْ اَرْبَعِ رَكْعَاتٍ اِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تُصَلِّيَهَا فِيْ كُلِّ يَوْمٍ مَرَّةً فَافْعَلْ فَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَفِيْ كُلِّ جُمُعَةٍ مَرَّةً فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَفِيْ كُلِّ شَهْرٍ مَرَّةً فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَفِيْ كُلِّ سَنَةٍ مَرَّةً فَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَفِيْ عُمُرِكَ مَرَّةً۔

(رواه ابوداؤد وابن ماجة والبيهقي في الدعوات الكبير)

أخرجه أبو داؤد في السنن ۲/۶۷ حديث رقم ۱۲۹۷۔ وابن ماجه ۱/۴۴۲ حديث رقم ۱۳۸۶۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ سرکار مدینہ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے فرمایا اے عباسؓ! اے میرے چچا! کیا نہ دوں آپ کو کیا نہ عطیہ کروں آپ کو کیا نہ بتاؤں آپ کو کیا آپ کو دس خصلتوں کا متولی اور فاعل نہ بنا دوں کہ جب آپ ان کو کریں تو اللہ آپ کے اگلے پچھلے نئے اور پرانے چھوٹے اور بڑے پوشیدہ اور ظاہر تمام گناہوں کو بخش دے۔ وہ یہ ہے کہ آپ چار رکعت نماز پڑھیں اور ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور دوسری کوئی بھی سورت پڑھیں جب پہلی رکعت میں قراءت سے فارغ ہو جائیں تو کھڑے کھڑے ہی پندرہ مرتبہ پڑھیں: ''سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر'' پھر آپ رکوع کریں اور رکوع کی حالت میں (تسبیحات رکوع کے بعد دس مرتبہ) یہ تسبیح پڑھیں، پھر رکوع سے سر اٹھائیں، پھر اس کو دس مرتبہ پڑھیں پھر سجدہ میں جائیں اور سجدہ کی حالت میں (تسبیح سجدہ کے بعد) دس مرتبہ یہ تسبیح پڑھیں پھر سجدہ سے سر اٹھائیں اور دس مرتبہ اس کو پڑھیں، پھر دوسرا سجدہ کریں اور اس میں دس مرتبہ یہ تسبیح پڑھیں، پھر (جب دوسرے) سجدہ سے سر اٹھائیں تو بیٹھ کر دس مرتبہ یہ پڑھیں، پس یہ ہر رکعت میں پچھتر/۷۵ تسبیحات ہو جائیں گی۔ اگر اس نماز کو روزانہ پڑھنے کی آپ طاقت رکھتے ہوں تو روزانہ پڑھیں اور اگر آپ روزانہ نہ پڑھ سکیں تو ہفتہ میں ایک مرتبہ پڑھیں، اگر ہفتہ میں نہ ہو سکے تو مہینہ میں ایک مرتبہ پڑھ لیں، اگر مہینہ میں نہ پڑھ سکیں تو سال میں ایک مرتبہ پڑھ لیں، اگر

ہر سال میں ایک مرتبہ نہ پڑھ سکیں تو عمر میں ایک مرتبہ پڑھ لیں۔ یہ ابو داؤد، ابن ماجہ کی روایت ہے اور بیہقی نے کتاب الدعوت الکبیر میں بھی نقل کیا ہے۔

تشریح: ''یا عباس، یا عماه'' عزت وشرافت اور استحقاق کے بیان کیلئے یہ انداز تخاطب اختیار فرمایا۔ منادی یاء متکلم کی طرف مضاف ہے۔ یاء کو الف سے بدل کر آخر میں ہائے سکتہ کو لگایا گیا جیسے ''یا غلاماہ'' ابن ملک کا کہنا یہی ہے۔

''الا أعطيك'' لفظ الا تنبیہ کے لئے ہے یا اس میں ہمزہ استفہام کے لئے ہے درستگی کے ظاہر ہونے کی وجہ سے بغیر جواب کے ہی آپ ﷺ نے ان کو جواب دیا۔

''الا أمنحك'' ای الا أعطيك منحة'' منحه سے مراد خصال عشر کی انجام دہی کا موقع فراہم کرنا ہے۔ مغرب کے مطابق المنح سے مراد یہ ہے ایک آدمی دوسرے کو کوئی بکری یا اونٹنی اس لئے دے کہ وہ اس کا دودھ پی لے۔ پھر جب اس کا تھن خشک ہو جائے تو واپس کر دے۔ اس کا اصل معنی تو یہی ہے پھر یہ ہر چیز کے عطا کرنے میں استعمال ہونے لگا۔

''الا أخبرك'' حصن میں ألا أحبوك کے الفاظ ہیں حبو کے معنی ہیں عطا کرنا۔

''الا أفعل بك'' مصابیح کے بعض نسخوں میں لك ہے۔ علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ صحیح روایت باء کے ساتھ ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ نے اس جملے کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ بات ایک سے زیادہ مرتبہ ارشاد فرمائی۔ اسی طرح مصابیح کے نسخوں میں ہے اور درست روایت ألا أفعل لك ہے۔

اس قول سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اصول معتمدہ میں یہ لفظ باء کے ساتھ ہے۔ یہ مشکوٰۃ کے نسخہ میں ہونے والی تحریف وتصحیف سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ درحقیقت نبی کریم ﷺ نے فعل خصال کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا کیونکہ آپ ﷺ ہی ان پر ابھارنے والے اور ان کی راہ نمائی کرنے والے ہیں اور آپ ﷺ نے قریب المعنی الفاظ کو تاکید وتائید کیلئے مکرر ذکر فرمایا تاکہ سننے والوں میں اس نماز کا داعیہ پوری طرح پیدا ہو جائے۔

''عشر خصال'' اس کی ترکیب میں دو احتمال ہیں:

① مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب، اس کا عامل افعال متقدمہ علی سبیل التنازع ہیں۔

② مرفوع، اس صورت میں بھی کہ محذوف مانیں گے۔

علامہ تورپشتی رحمہ اللہ فرماتے ہیں خصلت سے مراد خلت ہے اور خلت نفس کو لاحق ہونے والی کیفیت کا نام ہے جو کسی چیز کی شدید خواہش یا ضرورت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔

علامہ تورپشتی ؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کو منصوب پڑھنے کی صورت میں اس کا عامل خذها، دونك یاعدها ہوگا۔

''غفر الله لك ذنبك'' میرک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خصال عشر سے مراد گناہ کی دس اقسام ہیں۔ چونکہ مصابیح کے اکثر قدیم وجدید نسخے اس سے خالی تھے اس لئے شارحین نے عشر خصال سے تسبیحات، تحمیدات، تہلیلات اور تکبیرات مراد لی ہیں۔

''أوله و آخره'' منصوب ہے، تورپشتی رحمہ اللہ نے اس کا معنی 'مبدأه و منتهاه' کیا ہے۔ وہ اس لئے کہ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جنہیں انسان یکدم نہیں کرتا بلکہ آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھتا ہے۔ اس میں ماتقدم من ذنبه و ما تاخر کا احتمال

بھی ہے۔

"**قديمه و حديثه**" ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مصابیح کے نسخوں میں ان دونوں الفاظ کا اثبات ان کے سقوط سے زیادہ راجح ہے۔

شارح مصابیح علامہ تورپشتی کی رائے اس کے مخالف ہے۔

"**خطأه**" **بفتحتين**، اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خطا میں انسان کو گناہ گار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطا و نسیان کو اور جو چیز ان پر بار ہو، معاف کر دیا ہے"۔

پس خطا کو گناہوں میں کس بنا پر شمار کیا گیا؟

جواب اس سوال کا یہ ہے کہ ذنب سے مراد ہے "**مافيه نقص**" جس میں نقص ہو خواہ آدمی اس سے گناہ گار ہوتا ہو یا نہیں۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے:

"**ربنا لا تؤاخذنا ان نسينا أو أخطانا**"

"اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے تو ہمارا مؤاخذہ نہ فرما"۔

"**صغيره و كبيره سره وعلانية**" ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان تمام الفاظ میں ھو ضمیر "**ذنبك**" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ مشکوۃ میں اس مقام پر لفظ "**عشر خصال**" ساقط ہے، جبکہ اصل میں موجود ہے جیسا کہ حصن وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے۔

صاحب ازہار فرماتے ہیں کہ اگر آپ بطور سوال کے یہ کہیں کہ **اوله و آخره** کے تحت سارے گناہ داخل ہیں تو گناہوں کو علیحدہ ذکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو میں جواب میں کہوں گا کہ وہم کو دور کرنے کیلئے ان گناہوں کا ذکر کیا گیا کہ اول و آخر بعض مرتبہ عمداً ہوتے ہیں۔ بعض مرتبہ خطأ۔ اسی طرح باقی گناہوں میں بھی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اقسام کو منصوص علیہ کرنا مقصود ہے تاکہ مخاطب کو پوری طرح محثوث علیہ پر ابھارا جائے۔ پھر ہر قسم اپنے بعد والی قسم سے أعم ہے کیونکہ اول و آخر کبھی قدیم ہوں گے کبھی جدید۔ قدیم و جدید کبھی خطأ ہوں گے، کبھی عمداً، خطا اور عمد کبھی صغیرہ ہوں گے کبھی کبیرہ، صغیرہ اور کبیرہ کبھی سراً ہوں گے کبھی علانیہ۔ اسی طرح جانب اسفل کو لیجئے کہ سراً اور علانیہ کبھی صغیرہ ہوں گے کبھی کبیرا اور اول و آخر چلتے جائیں۔

"**أن تصلي**" **أن مفسره** ہے کیونکہ قول کے معنی میں ہے یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور ضمیر مقدر ذلك کی طرف لوٹتی ہے۔ ای **هو يعني المامور به أن تصلي**" ایک قول یہ ہے کہ **هي** مقدر ہے اور وہ **الخصال العشر** کی طرف لوٹتی ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنی بیان کیا ہے "**ان تصلي بنية صلاة التسبيح**" خواہ وہ وقت مکروہ ہی میں کیونکہ نہ ہو جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ایسی کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ وہ احادیث صحیحہ جو اوقات مکروہ میں نماز کے بارے میں وارد ہوئیں وہ اس حدیث کا اطلاقی مفہوم لینے سے مانع ہیں۔ شوافع نے اس حکم سے ان نمازوں کو مستثنیٰ کیا ہے جن کا کوئی سبب مقدم ہے اور اس

نماز کا بالاجماع کوئی سبب نہیں لہٰذا ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا بطلان بالکل واضح ہو گیا۔

''اربع رکعات'' ظاہر یہ ہے کہ یہ چار رکعات ایک سلام کے ساتھ ہوں گی خواہ دن میں پڑھے یا رات میں۔

''تقرأ فی کل رکعة فاتحة الکتاب وسورة'' صلوٰۃ تسبیح کے افضل اوقات قراءت کی تعیین کے بارے میں روایات آگے آرہی ہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ صلاۃ تسبیح میں مسبحات سورتوں میں سے پڑھنا افضل ہے۔ سورۂ مسبحات یہ ہیں: ① حدید۔ ② حشر۔ ③ صف۔ ④ الجمعہ۔ ⑤ تغابن۔ اسی طرح نماز کے ٹائم اور سورتوں میں مناسبت ہو جائے گی۔

''ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر'' امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر ''ولا حول ولا قوة الا باللّٰہ العلی العظیم'' کا اضافہ کیا ہے۔

''خمس عشرة مرة'' بسکون الشین وتکسر۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ تسبیح قراءت کے بعد کی جائے گی جیسے کہ ہمارے ائمہ کا مسلک ہے۔ ابن مبارک کے نزدیک قراءت سے پہلے پندرہ مرتبہ اور قراءت کے بعد دس مرتبہ تسبیح پڑھیں گے۔ اور قومہ میں تسبیح نہ پڑھیں گے۔ ان کا یہ قول اس حدیث کے مخالف ہے۔ لیکن ہمارے ائمہ فرماتے ہیں کہ ابن مبارک کی شان اس بات کی مقتضی ہے کہ ان کی مخالفت سے توقف کیا جائے۔ الاذکار میں امام نووی نے بھی ابن مبارک کی تائید کی ہے اور سورۂ فاتحہ سے پہلے دس مرتبہ تسبیح پڑھنے کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں جلسہ استراحت کی تسبیح کو ساقط کر دیا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ابن مبارک سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ سجدہ ثانیہ میں بیس مرتبہ تسبیح پڑھتے تھے۔ یہ عمل بھی اثر سے ثابت ہے۔ البتہ قراءت سے پہلے پڑھنے والے عمل کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔

''وانت راکع عشرا'' یعنی رکوع کی تسبیح کے بعد دس مرتبہ یہ تسبیح پڑھے۔ شرح السنۃ میں یہی مذکور ہے۔ اسی طرح سجدے میں سجدہ کی تسبیح کے بعد یہ تسبیح پڑھی جائے گی۔

''ثم تسجد فتقولها عشرا ثم ترفع رأسك فتقولها عشرًا'' یہ دس مرتبہ کھڑا ہونے سے پہلے پڑھے گا جیسا کہ حصن میں مذکور ہے۔ اس میں جلسہ استراحت اور جلسہ تشہد دونوں کا احتمال ہے۔

''ان استطعت'' استئناف ہے ای ان قدرت۔

''ففی کل جمعة'' بضم المیم وتسکن' مراد یہ ہے کہ ہر ہفتہ میں ایک مرتبہ پڑھ لے۔ اس میں یہ اشارہ مقصود ہے کہ ہفتے کے دنوں میں سب سے افضل جمعہ کا ہے۔

۱۳۲۹: وَرَوَى التِّرْمِذِیُّ عَنْ اَبِیْ رَافِعٍ نَحْوَهُ۔

ترجمہ: امام ترمذی نے اس طرح کی روایت ابورافع سے نقل کی ہے۔

تشریح: ''وروی الترمذی عن ابی رافع نحوه'' امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلوٰۃ تسبیح کے بارے میں بہت سی احادیث منقول ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر صحیح نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس باب میں ابن عباس، ابن عمر، فضل بن عباس رضی اللہ عنہم سے روایات منقول ہیں۔ نیز عبداللہ بن مبارک اور دوسرے اہل علم نے صلاۃ

تسبیح اور اس کی فضیلت کا ذکر کیا ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کو روایت کرنے والوں میں طبرانی، خطیب، آجری، ابوسعید سمعانی اور ابوموسیٰ مدینیؒ شامل ہیں۔ متقدمین اور متاخرین کا اس حدیث کی تصحیح کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابن خزیمہ اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے جبکہ ایک جماعت محدثین نے اس کی تحسین کی ہے۔

عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ ابن جزری نے اسے موضوعات میں ذکر کر کے اچھا نہیں کیا۔

دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سورتوں کے فضائل میں صحیح ترین حدیث سورۂ اخلاص کی فضیلت کے بارے میں ہے اور نمازوں کے فضائل میں صحیح تر حدیث صلاۃ تسبیح کی فضیلت کے بارے میں ہے۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صلاۃ تسبیح کی بہت سی ترغیب دی گئی ہے آدمی کو چاہیئے کہ اس کی عادت بنائے اور اس سے غفلت نہ برتے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رکوع میں تین مرتبہ سبحان ربی العظیم اور سجدہ میں تین مرتبہ سبحان ربی الاعلیٰ کہے پھر مذکورہ تسبیحات پڑھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ اگر کسی کو اس نماز میں سہو ہو جائے تو کیا سہو کے دو سجدوں میں دس دس مرتبہ پڑھے گا انہوں نے فرمایا نہیں۔ یہ تین سو تسبیحات ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر اس نے بھول کر کسی معین محل میں تسبیح کی تعداد کو کم کر دیا تو کسی اور محل میں اس تعداد کو پورا کرے گا۔

امام ترمذیؒ نے عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اگر آدمی رات میں صلوٰۃ تسبیح پڑھے تو زیادہ بہتر یہ ہے دو رکعات کے بعد سلام پھیرے اور اگر دن میں پڑھے تو چاہے تو دو کے بعد سلام پھیر لے اور چاہے تو چار کے بعد البتہ وہ تسبیح جو اس نے دوسرے سجدے سے فارغ ہو کر کہنی ہے وہ جلسہ استراحت میں ادا کرے۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا معمول یہ تھا کہ وہ قراءت سے پہلے پندرہ مرتبہ تسبیح پڑھتے باقی نماز کو حدیث میں مذکورہ طریقے کے مطابق ادا کرتے تھے۔ وہ دونوں سجدوں سے اٹھنے کے بعد تسبیح نہیں پڑھتے تھے۔

علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مبارکؒ کی جلالت شان ان کی مخالفت سے مانع ہے لیکن بہترین عمل وہی جو ابن عباسؓ کی حدیث میں موجود ہے مجھے دو سجدوں کے بعد تسبیح پڑھنے سے رفع اور قیام کے درمیان فصل منع نہیں کرتا کیونکہ جلسہ استراحت اس مقام پر مشروع ہے۔ عبادت گزار کو چاہیئے کہ کبھی ابن عباسؓ کی حدیث پر عمل کرے اور کبھی ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث پر۔ نیز صلوٰۃ تسبیح زوال کے بعد ظہر کی نماز سے پہلے پڑھنا مناسب ہے۔ اس میں کبھی تو سورۂ زلزال، سورۂ اعادیات، سورۂ فتح اور سورۂ اخلاص پڑھے اور کبھی سورۂ الہاکم (التکاثر)، سورۂ عصر، سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص پڑھے۔ تشہد کے بعد سلام سے پہلے دعا مانگے پھر سلام پھیر کر اپنی حاجات کیلئے دعا مانگے۔ جن چیزوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے بارے میں روایات موجود ہیں۔ زوال کے بعد پڑھنے کے بارے میں امام ابوداؤد نے ابو جوزاء کی روایت نقل کی ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تم کل میرے پاس آنا میں تمہیں ایک چیز دوں گا، عطیہ دوں گا، بخشش دوں گا"۔ میں سمجھتا رہا کہ وہ کوئی حسی عطیہ ہوگا لیکن جب اگلے دن حاضر خدمت ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب سورج زائل ہو جائے تو کھڑے ہو جاؤ اور چار رکعت پڑھو۔ اس کے بعد صلاۃ تسبیح کا ذکر فرمایا اور آخر میں فرمایا اگر تمہارا گناہ ساری دنیا کے انسانوں میں

سب سے بڑا ہو تو اس نماز کی برکت سے معاف ہو جائے گا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا اگر میں اس وقت میں نہ پڑھ سکوں تو کیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دن یا رات میں کسی بھی وقت پڑھ لو۔

امام غزالیؒ احیاء میں فرماتے ہیں۔ آدمی نماز کے شروع میں یہ پڑھے:

''سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالٰى جدك ولا اله غيرك''

پھر پندرہ مرتبہ قراءت سے پہلے اور دس مرتبہ قراءت کے بعد تسبیح پڑھے اور باقی ارکان میں دس دس مرتبہ تسبیح پڑھے۔ جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے۔ سجدہ اخیرہ کے بعد بیٹھ کر تسبیح نہ پڑھے۔ یہ اس کا احسن طریقہ ہے اور عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا اختیار کردہ ہے۔ اگر تسبیح کے بعد ان الفاظ کا اضافہ کرے:

''ولا حول ولا قوة الا باللّٰه العلي العظيم''

تو بہت بہتر ہے، بعض روایات میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں۔

ابن ابی الصیف نے کتاب اللمعة فی رغائب یوم الجمعة میں نقل کیا ہے کہ جمعہ کے دن زوال کے بعد صلوٰۃ تسبیح پڑھنا مستحب ہے۔ سورۂ فاتحہ کے بعد پہلی رکعت میں سورۂ تکاثر دوسری میں سورۂ عصر، تیسری میں سورۂ کافرون اور چوتھی میں سورۂ اخلاص پڑھے۔ جب تین سو تسبیحات پوری ہو جائیں تو تشہد سے فارغ ہونے کے بعد سلام پھیرنے سے پہلے یہ دعا پڑھے:

''اللهم انی أسئلك توفيق أهل الهدٰى وأعمال أهل اليقين ومناصحة أهل التوبة وعزم أهل الصبر وحذر اهل الخشية وتعبد أهل الورع وعرفان أهل العلم حتى أخافك اللهم انی أسالك مخافة تحجزنی عن معاصيك وحتى أعمل بطاعتك عملا أستحق به الرضاء حتى أنا صحك فی التوبة خوفا منك وحتى أخلص لك النصيحة حبًا لك وحتى أتوكل عليك فی الامور كلها حسن ظن بك سبحان خالق النور بنا أتمم لنا نورنا واغفرلنا انك على كل شيء قدير برحمتك يا ارحم الراحمين''

پھر سلام پھیرے دے۔ مومن کیلئے مناسب ہے کہ ہر جمعہ کو صلوٰۃ تسبیح پڑھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا معمول یہی تھا وہ جمعہ کے دن زوال کے وقت صلوٰۃ تسبیح پڑھتے تھے۔ اور اس میں مذکورہ طرز عمل اختیار کرتے تھے۔

شیخ علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے الکلم الطیب میں نقل کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ صلوٰۃ تسبیح میں سلام سے پہلے یہ دعا مانگتے تھے:

''اللهم انی أسألك توفيق اهل الهدى، وأعمال اهل اليقين ومناصحة أهل التوبة وعزم أهل الصبر وجد أهل الخشية وطلب اهل الرغبة وتعبد اهل الورع وعرفان اهل العلم حتى أخافك۔ اللهم انی أسالك مخافة تحجزنی عن معاصيك حتى أعمل بطاعتك عملا أستحق به رضا وحتى أنا اصحك فی لتوبة خوفاً منك وحتى أخلص لك النصيحة حياء منك وحتى أتوكل عليك فی الامور كلها حسن ظن بك سبحان خالق النار''۔

یہ دعا حسن سند کے اعتبار سے پہلی دعا سے اولیٰ ہے۔

نوافل کا ذخیرہ بھی ہونا چاہیے

۱۳۳۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اَوَّلَ مَا یُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ مِنْ عَمَلِهٖ صَلَاتُهٗ فَاِنْ صَلُحَتْ فَقَدْ اَفْلَحَ وَاَنْجَحَ وَاِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ فَاِنِ انْتَقَصَ مِنْ فَرِیْضَتِهٖ شَیْءٌ قَالَ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى اُنْظُرُوْا هَلْ لِعَبْدِیْ مِنْ تَطَوُّعٍ فَیُكَمَّلُ بِهَا مَاانْتَقَصَ مِنَ الْفَرِیْضَةِ ثُمَّ یَكُوْنُ سَائِرُ عَمَلِهٖ عَلٰى ذٰلِكَ وَفِیْ رِوَایَةٍ ثُمَّ الزَّكَاةُ مِثْلُ ذٰلِكَ ثُمَّ تُؤْخَذُ الْاَعْمَالُ عَلٰى حَسْبِ ذٰلِكَ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/ ۵۴۰ حدیث رقم ۸۶۴۔ والترمذی ۲/ ۲۶۹ حدیث رقم ۴۱۳۔ والنسائی ۱/ ۲۳۲ حدیث رقم ۴۹۵ و ابن ماجه ۱/ ۴۵۸ حدیث رقم ۱۴۲۵۔ وأحمد فی المسند ۲/ ۲۹۰۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت والے دن سب سے پہلے بندے سے اس کے اعمال میں سے نماز کا حساب لیا جائے گا۔ پس اگر وہ درست نکل آئی تو وہ فلاح پا گیا اور کامیاب ہو گیا اور اگر وہ خراب نکل آئی (یعنی ادا میں کمی ہو یا خشوع و خضوع میں کمی ہو) تو نقصان اور خسارے میں ہوگا۔ پس اگر اس کے فرض میں کوئی کمی نکل آئی تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا کہ دیکھو میرے بندے کے پاس کچھ نوافل بھی ہیں (اگر نفل نماز نکل آئی) تو ان کے ساتھ جو فرائض میں کمی رہ گئی ہے اس کو پورا کیا جائے گا پھر اسی طرح بندے کے دیگر اعمال کا حساب ہوگا (یعنی فرائض میں کمی آئی تو نوافل سے پوری کی جائے گی) اور ایک روایت میں ہے پھر ایسے ہی زکوٰۃ کا حساب ہوگا پھر بقیہ اعمال کا حساب بھی اسی طریقے پر ہوگا۔ یہ ابوداؤد کی روایت ہے۔

تشریح: ''ان اوّل ما یحاسب به العبد'' العبد سے نائب فاعل ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔

''عمله'' سے مراد طاعات ہیں۔ ''صلاته'' سے مرا فرض نماز ہے۔

علامہ ابہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ''قیامت کے دن سب سے پہلے خون کا حساب ہوگا'' کے درمیان وجہ تطبیق یہ ہے کہ نماز کا حساب حقوق اللہ میں سب سے پہلے ہوگا اور خون کا حساب حقوق العباد میں سب سے پہلے ہوگا۔ ایک وجہ تطبیق یہ بھی ہے کہ ترکِ عبادات میں سب سے پہلے نماز کا سوال ہوگا اور فعل سیئات میں سب سے پہلے خون کا حساب ہوگا۔

''فان صلحت ''بضم اللام و فتحها'' ابن ملک فرماتے ہیں کہ صلاح صلاۃ سے مراد اس کو صحیح طریقہ پر ادا کرنا ہے۔ نماز کا قبول ہونا بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔

''فقد أفلح و أنجح'' افلح کا معنی ہے مقصود کو حاصل کر لینا۔ أنجع بھی اسی معنی میں ہے اس صورت میں أنجح، افلح کے لئے تاکید ہوگا۔ لیکن ایک صورت اور بھی ہے وہ یہ کہ افلح سے مراد سزا سے نجات اور أنجح سے مراد حصول ثواب

ہے۔

"فقد خاب وخسر" "خاب" کا معنی ثواب سے محرومی اور خسر کا معنی عذاب کا وقوع ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ خاب کا معنی ہے نرم ہوا اور خسر کا معنی ہے فوز وخلاص سے محروم ہوا۔

"ھل لعبدی من تطوع؟" اللہ تعالیٰ باوجود جاننے کے فرشتوں سے فرمائیں گے کہ دیکھو میرے بندے کے اعمال نامے میں نوافل بھی ہیں؟ نوافل سے مراد فرض نماز سے پہلے پڑھی جانے والی سنتیں اور نوافل بھی ہیں۔ اور مطلق نوافل بھی۔

"فیکمل" بالتشدید والتخفیف، اسے منصوب اور مرفوع پڑھا گیا ہے۔

"بھا" بھا ضمیر کا مرجع نفل نماز ہے۔ ابن ملکؒ فرماتے ہیں کہ ضمیر کا مرجع "التطوّع" ہے اور تانیث کی ضمیر النافلۃ کے اعتبار سے ہے۔ علامہ طیبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فیکمل کا منصوب ہونا راجح ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ کلام الٰہی کا حصہ ہے اور استفہام کا جواب ہے۔ اس کی تائید سند احمد کی روایت سے ہوتی ہے جس میں آیا ہے۔ "فکملوا بھا فریضۃ" اور بھا میں ضمیر کی تانیث الصلاۃ کے اعتبار سے ہے۔

"ثم یکون سائر عملہ" جیسے روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ۔

"علی ذلك" یعنی اگر فرضوں میں کمی رہ جائے تو نفلوں کے ذریعہ پوری کردی جاتی ہے۔

"وفی روایۃ: ثم الزکاۃ مثل ذلك" یعنی اعمال مالیہ، اعمال بدنیہ کی طرح ہیں۔

"ثم تؤخذ الأعمال" یعنی جنایات اور سیئات میں سے تمام اعمال کا حساب ہوگا۔

"علی حسب ذلك" طاعات اور حسنات میں سے کیونکہ نیکیاں گناہوں کو مٹادیتی ہیں۔

ابن ملک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مثال مذکور کے اعتبار سے ایسا ہوگا لہٰذا جس کا کسی پر حق ہوگا تو اس کی نیکیوں میں سے لے کر صاحب حق کو دے دیا جائے گا۔

۱۳۳۱: وَرَوَاہُ اَحْمَدُ عَنْ رَّجُلٍ۔

ترجمہ: اس روایت کو امام احمدؒ نے کسی آدمی سے نقل کیا ہے

تشریح: میرکؒ فرماتے ہیں کہ ترمذی نے انہی الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

نمازِ نفل اور تلاوت کی برکات

۱۳۳۲: وَعَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَذِنَ اللّٰہُ لِعَبْدٍ فِیْ شَیْءٍ اَفْضَلَ مِنَ الرَّکْعَتَیْنِ یُصَلِّیْھِمَا وَاِنَّ الْبِرَّ لَیُذَرُّ عَلٰی رَأْسِ الْعَبْدِ مَادَامَ فِیْ صَلَاتِہٖ وَمَا تَقَرَّبَ الْعِبَادُ اِلَی اللّٰہِ بِمِثْلِ مَاخَرَجَ مِنْہُ یَعْنِی الْقُرْاٰنَ۔ (رواہ احمد والترمذی)

أخرجہ الترمذی فی السنن ۵/۱۷۶ حدیث رقم ۲۹۱۱۔ وأحمد فی المسند ۵/۲۶۸۔

ترجمہ: حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت تامہ کے ساتھ

بندے کے کسی عمل پر اتنا زیادہ متوجہ نہیں ہوتے جتنا کہ اس کے دو رکعت نماز پڑھنے پر متوجہ ہوتے ہیں اور بے شک نیکی اور جب تک کہ وہ نماز میں رہتا ہے بھلائی اس کے سر پر مسلسل انڈیلی جاتی ہے اور بندے خدا بزرگ و برتر کی طرف جتنا کہ اس سے نکلے ہوئے سے یعنی قرآن سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں اتنا کسی اور چیز سے نہیں کر سکتے۔ (احمد، ترمذی)

تشریح: ''ما أذن الله'' یہ أذنت الشيء أصغيت له سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد غایت اصغاء ہے۔ اس کا معنی ہے لطف رحمت اور رضا کے ساتھ متوجہ ہونا۔

''لعبد في شيء'' من العبادات۔

''أفضل من ركعتين يصليهما'' یعنی تمام عبادات میں افضل ترین نماز ہے۔ جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں آیا ہے ''الصلاة خير موضوع'' یعنی اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو اپنے قرب کیلئے وضع کیا ہے ان میں سب سے بہتر نماز ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ أذن کا معنی ہے أقبل (توجہ ہونا)۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندے کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے رب کے ساتھ مناجات کے دوران کلی طور پر زبان، دل اور قالب کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ رہے۔

''وان البرّ ليذر'' بالذال المعجمة والراء المشددة۔ بمعنی بکھرنا، پھیلنا، بعض نسخوں میں ليدر (بالدال المهملة) بمعنی اترنا، لیکن یہ تصحیف ہے اصل روایت پہلی ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے نسخے کو راجح قرار دیا ہے۔ جبکہ علامہ تورپشتیؒ نے اسے تصحیف اور پہلے کو راجح کہا ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے نسخہ اول کے راجح ہونے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس مقام میں ملک کریم کے ساتھ تشبیہ کا بیان مقصود ہے جو اپنے اس غلام کے ساتھ احسان کرتا ہے جس نے اس کی اچھی خدمت کی اور بادشاہ اس سے خوش ہوا۔ تو اب اس کے بھلائی یہی طریقہ مناسب ہے کہ اس کی عظمت کی خاطر قیمتی جواہر اس کے سر پر لٹائے جائیں اور اس کے مرتبہ کو واضح کرنے کی خاطر۔

''علی راس العبد'' یعنی رحمت اور ثواب جو نیکی کی علامات میں سے ہیں نمازی پر نازل ہوتی ہے۔

''بمثل ما خرج منه'' اس جملہ کی مراد میں مختلف اقوال ہیں:

① ظهر من الله من شرائعه ومن أحكامه۔

② منہ کی ضمیر کا مرجع کتاب مبین یعنی لوح محفوظ ہے۔

③ ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کا علم کامل ہے۔

④ ضمیر کا مرجع العبد ہے اور اس سے خروج کا معنی یہ ہے کہ اس کے سینے میں محفوظ بات کا اس کی زبان پر ظاہر ہونا۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسلاف کے قول ''کلام الله خرج منه واليه يعود'' کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ذریعے اوامر ونواہی بیان فرمائے ہیں۔ اور وہ اس میں مذکور اوامر ونواہی کا حساب لے گا۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو مخلوق کے حق میں اور ان کے خلاف حجت بنا کر اتارا ہے تا کہ یہ عالمین کیلئے نذیر بنے۔ پھر اس میں بیان کردہ وعدہ ووعید کی حقیقت صدق کی وضاحت اسی کی طرف سے ہے۔ اسی وجہ سے جب عبداللہ بن عباسؓ نے ایک آدمی کو یا رب القرآن کہتے سنا تو اسے منع کیا اور فرمایا ''کیا تو نہیں جانتا کہ قرآن اللہ سے ہے'' یعنی قرآن اللہ تعالیٰ کی صفت قدیمہ ہے جو اس

کے ساتھ قائم بالذات ہے اس لئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ اسے ایسی ربوبیت کے ساتھ موصوف کیا جائے جو حدوث اور انفصال کی مقتضی ہے۔

"یعنی القرآن" یہ کسی راوی کی تفسیر ہے صحابی کی نہیں۔ ابن ملک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ابوالنصر راوی کی تفسیر ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ماخوج من العبد وہی ہے جس کی زبان سے وہ تلاوت کرتا ہے۔

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مصنف نے اس تفسیر کو مطلق رکھا جس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ تفسیر کسی کی طرف سے ہے۔ اس حدیث کو مؤلف نے ترمذی سے نقل کیا اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے۔ قال ابو الخیر: یعنی القرآن۔

محدثین عام طور پر ان امور میں تسامح سے کام نہیں لیتے کیونکہ یہاں یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ کسی صحابی کی تفسیر ہے اس طرح تو یہ متن حدیث کا حصہ بن جاتی۔

بَابُ صَلٰوةِ السَّفَرِ

سفر کی نماز کا بیان

سفر کا لغوی معنی ہے "قطع مسافت" ہر سفر سے احکام سفر لاگو نہیں ہوتے بلکہ اس کی کچھ شرائط ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سفر شرعی یہ ہے کہ انسان درمیانی رفتار سے تین دن تین رات کی مسافت کا ارادہ کرے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک سفر شرعی سے مراد ہے "ھو میسرۃ مرحلتین بسیر الأثقا" یہ دو دن یا ایک دن اور ایک رات بنتے ہیں۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن کی مسافت پر قصر کیا جائے۔ داؤد ظاہری کے نزدیک ہر بڑے چھوٹے سفر میں قصر نماز پڑھے گا۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر کوئی شخص سفر شرعی کے ارادے سے اپنے گاؤں و شہر کی عمارات سے نکل جائے تو اس پر صلوٰۃ سفر پڑھنا واجب ہو جاتا ہے یعنی اس پر لازم ہے کہ چار رکعات والے فرائض کی دو رکعتیں پڑھے اگر چار پڑھے گا تو گنہگار ہوگا یعنی امام صاحب کے نزدیک قصر واجب ہے اب اگر وہ پوری پڑھتا ہے تو واجب کو ترک کرے گا، قصر کا تارک ہے جو کہ واجب ہے۔ قعدہ اول ہی اس کے لئے قعدہ اخیرہ ہے لہٰذا اس کے بعد فوراً سلام پھیرنا واجب تھا اس نے دو رکعتوں کے ساتھ تاخیر کردی تو اس نے یہ واجب چھوڑ دیا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اولیٰ اور بہتر ہے اگر کر لے تو ٹھیک ہے اگر نہیں بھی کرتا بلکہ چار رکعات پڑھتا ہے تو جائز ہے اس کو کوئی گناہ نہیں ہے۔

مدتِ قصر:

جب سفر شرعی کے ارادہ سے انسان نکل جائے اور اپنے گاؤں کی عمارات سے تجاوز کر جائے تو قصر نماز پڑھے گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے وطن اصلی میں واپس آ جائے، یا کسی جگہ پندرہ دن سے زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ کر لے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مقام

ٹھہرنے کے قابل ہو اگر کوئی شخص دریا میں یا بیابان میں یا جنگل میں ٹھہرنے کی نیت کرتا ہے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، ہاں اگر خانہ بدوش جنگلات میں کسی جگہ ٹھہرنے کا ارادہ کر لے تو اس کی نیت معتبر ہے کیونکہ وہ زیادہ تر جنگلوں میں ہی رہتے ہیں۔

سفرِ شرعی کی مقدار:

وہ سفر جس میں قصر پڑھنا واجب ہے اس کی مقدار متوسط چال کے اعتبار سے تین دن کی مسافت ہے جو کہ انسان یا اونٹ وغیرہ کی چال کے اعتبار سے ہے اور وہ پورا دن بھی نہ چلے بلکہ صبح سے دو پہر تک چلے اور پھر پڑاؤ ڈال لے۔ موجودہ دور میں فقہاء نے اس کی مسافت کا اندازہ کر کے ۴۸ میل مقرر کی ہے جو کہ کلو میٹر کے حساب سے ۷۸ کلو میٹر بنتی ہے اب یہ اڑتالیس ۴۸/ میل اور ۷۸ کلو میٹر معتبر ہے اگر کوئی گاڑی یا گھوڑے وغیرہ پر بہت کم وقت میں طے کر لے تو اس کا بھی حکم وہی ہے یعنی وہ مسافر ہے۔

مسائل متفرقہ

مَسْئَلَہ :نمبر ا: اگر کسی شخص کا ارادہ پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کا ہو اور وہ پندرہ دن سے زیادہ ٹھہر جائے تو مسافر ہی ہوگا قصر واجب ہوگی۔

مَسْئَلَہ :نمبر ۲: اگر بالکل ٹھہرنے کا ارادہ نہ ہو بلا ارادہ کئی ماہ بھی ٹھہر جائے تو قصر ہی کرے گا مثلاً یہ ارادہ کرتا ہے شام کو چلا جاؤں گا یا صبح چلا جاؤں گا لیکن دن زیادہ گزر جاتے ہیں تو وہ مسافر ہی ہوگا۔

مَسْئَلَہ :نمبر ۳: اگر پندرہ دن سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت کرے مگر وہ مقام ٹھہرنے کا نہ ہو مثلاً دریا یا جنگل ہو پھر بھی قصر واجب ہے۔

مَسْئَلَہ :نمبر ۴: اگر پندرہ دن سے زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ ہو مگر دو جگہ پر اور اُن میں اتنا فاصلہ ہو کہ ایک جگہ کی اذان دوسری جگہ نہیں سنائی دیتی تو پھر بھی قصر واجب ہے مثلاً (۲۰) دن ٹھہرنے کا ارادہ کرتا ہے مدینہ اور قبا میں اور دس دن مدینہ میں اور دس دن قبا میں۔

ہاں اگر دن کو مختلف جگہ پھرتا ہے رات ایک جگہ ہی رہتا ہے مثلاً مدینہ میں تو پھر نیت اقامت معتبر ہوگی اور پوری نماز پڑھے گا، قصر جائز نہیں ہوگی، اور اقامت میں اعتبار رات کا ہوتا ہے۔

مَسْئَلَہ :نمبر ۵: مقیم مسافر کی اقتداء کر سکتا ہے چاہے نماز ادا ہو یا کہ قضاء ہو امام مسافر دو رکعات پر سلام پھیر دے گا اور مقتدی کھڑا ہو کر اپنی نماز پوری کر لے گا۔

مَسْئَلَہ :نمبر ۶: مسافر صرف ادا نماز میں مقیم کی اقتدا کر سکتا ہے کیونکہ وقتی نماز یعنی ادا امام کے پیچھے پڑھنے سے امام کی متابعت میں پوری لازم ہوگی لیکن قضا میں مسافر مقیم کی اقتدا نہیں کر سکتا کیونکہ اب اس کی دو رکعات متعین ہو چکی ہیں اب اگر وہ مقیم کی اقتداء کرے گا تو اس کیلئے قعدہ اولیٰ فرض ہوگا اور امام کے حق میں واجب ہوگا پس قعدہ کے اعتبار سے فرض پڑھنے والے کی نماز نفل پڑھنے والے کے پیچھے ہوئی جو کہ جائز نہیں ہے۔

سفر میں نمازِ سنن کا حکم:

اگر سفر اقامت ہو یعنی کسی جگہ ٹھہرا ہوا ہو تو پھر سنتوں کو پڑھ لینا مستحب ہے اور اگر سفر سیر ہو یعنی چل رہا ہو تو نہ پڑھے۔

الفصل الاول:

سفر شروع کرتے ہی نماز قصر شروع ہو جاتی ہے

۱۳۳۳: عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى الظُّهْرَ بِالْمَدِيْنَةِ اَرْبَعًا وَصَلَّى الْعَصْرَ بِذِى الْحُلَيْفَةِ رَكْعَتَيْنِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٥٦٩۔ حديث رقم ١٠٨٩۔ ومسلم في صحيحه ١/٤٨٠ حديث رقم (١١۔ ٦٩٠)۔ وأبو داوٗد في السنن ٢/٨ حديث رقم ١٢٠٢۔ والترمذي ٢/٤٣٢ حديث رقم ٥٤٦۔ والنسائي ١/٢٣٥ حديث رقم ٤٦٩۔ والدارمي ١/٤٢٤ حديث رقم ١٥٠٧۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے، حضور ﷺ نے مدینہ میں ظہر کی نماز چار رکعات پڑھی اور عصر کی نماز ذوالحلیفہ میں دو رکعات پڑھی۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''صلى الظهر بالمدينة أربعا'' یعنی جس دن آپ نے حج یا عمرہ کیلئے مکہ جانے کا ارادہ فرمایا اس دن مدینہ میں ظہر کی چار رکعات نماز پڑھی۔

''وصلى الظهر بذى الحليفة'' ذوالحلیفہ اہل مدینہ کا میقات ہے جو ابِ بئر علی کے نام سے مشہور ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ذوالحلیفہ (صحیح قول کے مطابق) مدینہ سے تین میل کے فاصلے میں ایک جگہ کا نام ہے جیسے ''أبيار علي'' کے نام سے جانا جاتا ہے، عوام الناس کا خیال ہے کہ اس جگہ حضرت علیؓ نے ایک اژدہے سے لڑائی کی تھی۔

''ركعتين'' دو رکعات پڑھنے کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ مسافر تھے۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعیؒ، امام احمد اور ایک روایت کے مطابق امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ اپنے شہر کی آبادی سے جدا ہوتے ہی قصر نماز شروع کر دی جائے۔

امام مالک کی رائے یہ ہے کہ اپنی آبادی سے تین میل کی دوری پر پہنچ کر قصر نماز شروع کرے گا۔

بعض تابعین کی رائے یہ ہے کہ (سفر کے ارادے کے بعد) اپنے گھر سے ہی قصر شروع کر دے۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت علیؓ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ بصرہ سے نکلے اور چار رکعات ظہر کی نماز پڑھی، پھر فرمایا اگر ہم اس مقام کو پار کر لیتے تو دو رکعات پڑھتے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ظاہریہ نے اس حدیث سے اپنے اس دعویٰ پر استدلال کیا ہے کہ سفر قصیر میں قصر کیا جائے گا۔ یہ استدلال بالکل غلط ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ مکہ کے ارادے سے نکلے تھے آپ کی منزل سفر ذوالحلیفہ تھی۔

قصر نماز سفر کی وجہ سے ہے لہٰذا حالت امن میں بھی پڑھی جائے

۱۳۳۴: عَنْ حَارِثَةَ بْنِ وَهْبِ الْخُزَاعِيِّ قَالَ صَلَّى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ أَكْثَرُ مَا كُنَّا قَطُّ وَآمَنَهُ بِمِنٰى رَكْعَتَيْنِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۵۶۳۔ حديث رقم ۱۰۸۳۔ ومسلم في صحيحه ۱/۴۸۳ حديث رقم (۲۰۔ ۶۹۶)۔

ترجمہ: حضرت حارثہ بن وہب خزاعیؓ فرماتے ہیں کہ حضورﷺ نے ہمیں منیٰ میں دو رکعت نماز پڑھائی اور اس وقت ہماری تعداد اتنی تھی کہ اس سے قبل اتنی مقدار کبھی بھی نہ تھی اور حالت بھی امن کی تھی۔ (بخاری، مسلم)

راویٔ حدیث:

حارثہ بن وہب۔ یہ حارثہ بن وہب خزاعی عبید اللہ ابن عمر بن الخطاب کے ماں شریک بھائی ہیں۔ صحابہ میں سے ہیں۔ ان کا شمار کوفیین میں کیا جاتا ہے۔ ان سے ابو اسحٰق سبیعی (سین کے زبر اور بائے موحدہ کے کسرہ کے ساتھ) نے روایت حدیث کی ہے۔

تشریح: ''نحن اکثر ما کنا'' بالرفع۔ ایک قول اس کے منصوب ہونے کا بھی ہے۔ رفع نحن کی خبر ہونے کی بنا پر ہے اور ما مصدر یہ ہے اور اس کا معنی جمع کا ہے کیونکہ جو فعل تفضیل اس کی طرف مضاف ہو وہ جمع ہوتا ہے۔

''قط'' بمعنی الدھر۔ یہ ظرف زمان کنا کے ساتھ متعلق ہے۔

اشرفؒ فرماتے ہیں کہ قط ماضی منفی کے ساتھ مختص ہے اور یہاں کوئی منفی نہیں اس لئے تقدیری عبارت یہ ہوگی۔ ''ما کنا اکثر من ذلك ولا آمنه قطّ''

''وآمنه'' یہ اکثر پر عطف ہے اور قط یہاں مقدر ہے اس کی ضمیر ما کنا کی طرف راجع ہے۔ ''ونحن'' میں جو واؤ ہے وہ صلی اور اس کے معمول ''بمنا'' میں حال معترضہ کیلئے ہے۔

''بمناً'' یہ منصرف ہے اور ایک نسخہ میں ''بمعنیٰ'' غیر منصرف ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس سے منیٰ کا خاص علاقہ مراد ہو تو یہ غیر منصرف ہوگا اور یاء کے ساتھ لکھا جائے گا اور اگر اس سے مقام مراد ہو تو منصرف ہوگا اور الف کے ساتھ لکھا جائے گا اس لفظ کو مذکر پڑھنا راجح ہے۔ منی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کہا جاتا ہے ''لکثرة ما یمنی فیه من الدواء'' یہاں کثرت سے خون بہایا جاتا ہے۔

ایک قول یہ ہے ''لانه تعالی فیها علی عباده بالمغفرة'' اللہ تعالیٰ اس میں بندوں کو معاف کر کے ان پر احسان فرماتے ہیں۔ ابن حجر کی رائے بھی یہی ہے۔ لیکن اس قول میں ذکر کردہ مادہ اشتقاق کی لفظ منی سے مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔

ایک قول یہ ہے کہ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام نے کہا تھا ''میں جنت کی تمنا کرتا ہوں''۔

''رکعتین'' یعنی حجۃ الوداع میں۔ یعنی اس حال میں کہ نبی کریمﷺ تمام اوقات میں سب سے زیادہ امن کی حالت

میں تھے اس کے باوجود آپ نے قصر نماز ادا فرمائی۔ امن کی اسناد اوقات کی طرف بطور مجاز کے ہے۔

شارح کا کہنا یہ ہے کہ آمنہ کی ضمیر ''ما'' کی طرف لوٹتی ہے اگر یہ ما موصوفہ ہو۔ تقدیری عبارت یہ ہوگی۔ ''ونحن حینئذٍ أکثر عدد کنا قبل اياه وآمن عدد کنا قبل اياه'' اگر ما مصدریہ ہو تو یہ ضمیر مصدر مقدر کی طرف راجع ہوگی اور تقدیری عبارت یہ ہوگی۔ ''ونحن أکثر کون ای وجوده آمن کون ماکنا قبل'' لفظ قط کو نفی پر مشتمل ہونے کی وجہ سے لایا گیا ہے۔ عبارت یہ ہوگی: ''ما کنا قبل ذلك الزمان مثل ذلك العدد ومثل ذلك العدد قطّ''۔

مفاتیح میں ہے یہ لفظ ''آمنة'' بھی روایت کیا گیا جو کہ آمن کی جمع ہے اس صورت میں اکثر کو کثیر کے معنی میں بھی لیا جاسکتا ہے۔ ما نافیہ ہے اور کنا کی خبر محذوف ہے، اصل عبارت یہ ہوگی:

''ونحن کثیرون ما کنا مثل ذلك قط ونحن أمنة''

ایک قول یہ بھی ہے کہ آمنہ فعل ماضی ہے، فاعل کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف اور مفعول کی ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف مضاف ہے۔ اصل عبارت یہ ہوگی ''آمن اللہ بنیّه حینئذٍ''۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں یہ قول اس صورت میں درست ہوگا کہ اکثر کو کان کی خبر بنائیں کیونکہ ''وآمنہ'' کا عطف ''اکثر'' پر کرنا درست نہیں۔

واضح رہے کہ علماء کا اس بات تو اتفاق ہے کہ سفر میں قصر نماز پڑھی جائے گی لیکن اختلاف اس بارے میں ہے کہ سفر میں قصر کرنا عزیمت ہے یا رخصت؟

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کو عزیمت اور دوسرے حضرات اسے رخصت قرار دیتے ہیں۔

داؤد ظاہری سے نقل کیا گیا ہے کہ قصر نماز صرف سفر میں واجب ہوگی۔ ان سے یہ بھی منقول ہے کہ قصر خوف کی حالت کے ساتھ خاص ہے۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سفر کی رخصتیں سفرِ معصیت میں لاگو نہیں ہوتیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سفر طاعت اور سفر معصیت دونوں میں تمام رخصتوں کا حق مسافر کو ہوگا۔

سفر میں قصر کرنا واجب ہے

۱۳۳۵: وَعَنْ يَعْلَى بْنِ اُمَيَّةَ قَالَ قُلْتُ لِعُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ اِنَّمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنْ تَقْصُرُوْامِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَقَدْاَمِنَ النَّاسُ قَالَ عُمَرُعَجِبْتُ مِمَّا عَجِبْتَ مِنْهُ فَسَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهٗ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/۴۷۸ حدیث رقم ۴/۶۸۶ وأبوداوٗد فی السنن ۲/۷ حدیث رقم ۱۱۹۹۔ والترمذی ۵/۲۲۷ حدیث رقم ۳۰۳۴۔ وابن ماجه ۱/۳۳۹ حدیث رقم ۱۰۶۵۔ والدارمی ۱/۴۲۳ حدیث رقم ۱۵۰۵۔ وأحمد فی المسند ۱/۲۵۔

ترجمہ: حضرت یعلی بن امیہ فرماتے ہیں کہ میں نے امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم نماز میں قصر کرو اگر تم کو خطرہ ہو کہ کافر تمہیں فتنہ میں ڈال دیں گے، پس تحقیق اب ہم لوگ حالت امن میں ہیں (لہٰذا قصر کی ضرورت نہیں ہے) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، کہ جس چیز سے تمہیں تعجب ہوا ہے اس چیز سے مجھے تعجب ہوا تھا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا ایک صدقہ اور احسان ہے جو تم پر کیا لہٰذا اللہ تعالیٰ کے صدقہ کو قبول کرو۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

یعلی بن امیہ۔ یہ یعلیٰ۔ امیہ کے بیٹے ہیں۔ خاندانی اعتبار سے تمیمی اور حنظلی ہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔ غزوہ حنین وطائف وتبوک میں شریک ہوئے۔ ان کا شمار اہل حجاز میں ہوتا ہے۔ ان سے صفوان، عطاء، مجاہد رحمہم اللہ وغیرہ نے روایت کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کے ساتھ جنگ صفین میں شریک ہوئے اور اسی میں شہید کیے گئے۔ ''امیۃ'' تصغیر کے ساتھ ہے۔

تشریح: ''وعن یعلی بن أمیّۃ'' مصغرًا۔ مؤلف فرماتے ہیں کہ انہوں نے فتح مکہ والے سال اسلام قبول کیا اور حنین، طائف اور تبوک کے غزوات میں شریک ہوئے۔

''فسألت رسول اللہ ﷺ صدقۃ'' یعنی سفر میں نماز کو قصر کرنا صدقہ ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ قصر کرنا رخصت ہے واجب نہیں ہے اگر اسے صدقہ نہ کیا جاتا۔ میں کہتا ہوں کہ لفظ صدقہ عام ہے واجب اور غیر واجب سب کیلئے استعمال ہے ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول:

''انما الصدقات للفقراء......''

اس آیت میں زکوٰۃ کو ''الصدقات'' سے تعبیر کیا گیا حالانکہ زکوٰۃ بالاتفاق فرض ہے۔

''تصدق اللہ بھا علیکم فاقبلوا'' یعنی تم قصر کرو خواہ خوف ہو یا نہ ہو۔ آیت میں جو ان خفتم کی قید آئی ہے وہ اغلب کو ظاہر کرنے کیلئے ہے۔ کیونکہ اس کو حقیقت پر محمول کریں تو معنی یہ ہوگا کہ اگر خوف نہ ہو تو قصر نہ کیا جائے۔

اس حدیث سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ قصر کرنا عزیمت ہے اور پوری نماز پڑھنا ناپسندہ فعل ہے۔

علامہ بغویؒ فرماتے ہیں کہ اکثر حضرات وجوب قصر کے قائل ہیں۔

گھر واپسی تک مسافر قصر پڑھے

۱۳۳۶ وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْمَدِيْنَةِ اِلٰى مَكَّةَ فَكَانَ

يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى رَجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ قِيْلَ لَهٗ اَقَمْتُمْ بِمَكَّةَ شَيْئًا قَالَ اَقَمْنَا بِهَا عَشْرًا۔

(متفق علیه)

أخرج البخاري في صحيحه ٢/٥٦١۔ حديث رقم ١٠٨١۔ ومسلم في صحيحه ١/٤٨٠ حديث رقم (١٥۔ ٦٩٣)۔ وأبوداؤد في السنن ٢/٢٦ حديث رقم ١٢٢٣۔ والترمذي ٢/٤٣١ حديث رقم ٥٤٨۔ والنسائي ٣/١٢١ حديث رقم ١٤٥٢۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آقائے کائنات ﷺ کے ساتھ ہم مدینہ سے مکہ مکرمہ کی طرف گئے، تو آپ ﷺ دودو رکعتیں پڑھاتے رہے یہاں تک کہ ہم مدینہ منورہ واپس پہنچ گئے۔ آپؓ (حضرت انسؓ سے) پوچھا گیا کہ آپ لوگ مکہ میں کچھ دیر ٹھہرے تھے، تو فرمایا کہ ہم وہاں پر دس دن ٹھہرے تھے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''من المدينة الى مكة'' ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے حجۃ الوداع کا سفر مراد ہے۔

''فكان'' نسخہ صحیحہ میں ''و كان'' واؤ کے ساتھ ہے۔

''يصلي ركعتين ركعتين'' یعنی رباعی نمازوں میں دودو رکعتیں پڑھتے تھے۔

''قال أقمنا بها عشرًا'' علامہ مظہر نے اس کی تشریح اس ''لیالی'' سے کی ہے۔

ابن حجرؒ نے اس کی تفسیر ''من الليالي أو من الأيام'' سے کی ہے۔ اس صورت میں تاء کو حذف کیا گیا اس لئے کہ جب معدود کو حذف کیا جائے تو تاء کو حذف کرنا اور ثابت رکھنا دو طرح جائز ہے۔

یہ حدیث اپنے ظاہر کے ساتھ امام شافعیؒ کے مسلک کے منافی ہے کیونکہ ان کا مسلک یہ ہے کہ جب آدمی کا چار دن قیام کرنے کا ارادہ ہو تو اس پر پوری نماز پڑھنا واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر پندرہ دن قیام کی نیت نہ ہو تو قصر کرے گا۔ اس وقت کے بارے میں صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یہی منقول ہے۔

امام طحاوی فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ پر اثر صحابی حدیث رسول کی طرح ہے کیونکہ مقدرات شرعیہ میں رائے کو دخل نہیں ہوتا۔

عبدالرزاق نے اپنی سند کے ساتھ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ ہم چھ مہینہ آذربائیجان میں مصروفِ جہاد رہے۔ اس دوران برف باری شروع ہو گئی تھی، وہاں ہم دو رکعات نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس میں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اس واقعہ میں ان کے ساتھ دوسرے صحابہ بھی تھے جو یہی عمل فرمایا کرتے تھے۔

عبدالرزاق نے حضرت حسن سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم عبدالرحمٰن بن سمرۃ کے فارس کے کچھ علاقوں میں دو سال تک رہے وہ دو رکعات پر کمی زیادتی نہ کرتے تھے۔

عبدالرزاق نے انس بن مالکؓ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ شام میں عبدالملک بن مروان کے ساتھ دو مہینے رہے اور وہ دو دو رکعات نماز پڑھا کرتے تھے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حضرت انسؓ کے قول ''أقمنا بها عشرا'' میں بها کو مطلق رکھا گیا ہے حالانکہ حضور ﷺ نے حجۃ

الوداع کے موقع پر ایک جگہ دس دن قیام نہیں فرمایا اس لئے کہ آپ ہفتہ کے دن مکہ میں داخل ہوئے اور جمعرات کی صبح وہاں سے نکلے، پھر منیٰ میں قیام فرمایا اور جمعہ عرفات میں گزرا۔ پھر ادائیگی نسک کیلئے ہفتہ کو منیٰ واپس آئے۔ پھر طواف افاضہ کیلئے مکہ آئے پھر اسی دن منیٰ تشریف لے گئے اور باقی دن ہفتہ، اتوار اور پیر زوال تک وہیں قیام فرمایا پھر وہاں سے کوچ فرمایا اور محصب میں قیام فرمایا اور اسی رات طواف وداع فرمایا اور صبح کی نماز سے پہلے کوچ فرمایا۔ پس آپؐ نے اپنی اقامت کے تفرق کی وجہ سے ہر جگہ دخول وخروج کے دن کے علاوہ چار دن ٹھہرنے کی نیت نہ کرے وہ قصر کرے گا۔ (ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ) اس استدلال کے ماخذ کا خفا مخفی نہیں ہے۔

اس روایت کو محدثین اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔

بلا ارادہ پندرہ دن سے زائد بھی رہنے سے مقیم نہیں بنتا

۱۳۳۷: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ سَافَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَفَرًا فَأَقَامَ تِسْعَةَ عَشَرَ يَوْمًا يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَنَحْنُ نُصَلِّيْ فِيمَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَكَّةَ تِسْعَةَ عَشَرَ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ فَإِذَا أَقَمْنَا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ صَلَّيْنَا أَرْبَعًا ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحة ۲/۵۶۱۔ حدیث رقم ۱۰۸۰۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ سفر کیا، اور وہاں انیس دن قیام فرمایا، تو دورانِ قیام دو دو رکعتیں پڑھتے رہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ بھی جب اپنے اور مکہ کے درمیان جب انیس دن قیام کرتے ہیں تو دو دو رکعتیں پڑھتے ہیں۔ (بخاری)

تشریح: ''فاقام تسعة عشر یومًا یصلی رکعتین رکعتین'' اس روایت کی بنا پر امام شافعیؒ کے ایک قول میں انیس دن تک قیام کی صورت میں قصر کے جواز کا حکم ملتا ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ قابل اعتماد عدد اٹھارہ دن کا ہے لیکن یہ اس وقت ہے جب چار دن یا چار دن سے زیادہ قیام کی نیت نہ کرے۔

حدیث کا ظاہر ان کے قابل اعتماد قول کے منافی ہے اور حدیث میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جس سے معلوم ہو کہ جب اقامت کی نیت کے بغیر اس عدد پر اضافہ کرے گا تو اتمام واجب ہوگا۔

''قال ابن عباس ''یعنی ابن عباسؓ اس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''فاذا أقمنا اکثر من ذلك صلّینا أربعًا'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ عدد سابق میں قیام مراد ہے سیر یعنی چلنا مراد یہ ہوگی:

''نحن اذا أقمنا فی منزل بین مکة والمدینة تسعة عشر یومًا نصلی رکعتین واذا أقمنا أکثر من ذلك نصلی أربعًا''۔

شاید دخول اور کوچ کا دن اس میں داخل ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک ابن عباسؓ کا یہ مذہب ان کا تفرد ہے۔ اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ انہوں نے انیس دن قیام فرمایا کیونکہ وہ طائف کا محاصرہ کئے ہوئے تھے یا حرب ھوازن میں وہ ہر لحہ فتح کے انتظار میں تھے پھر وہاں سے کوچ کیا اس اعتبار سے وہ وہاں بالکل مقیم نہ ہوئے کیونکہ ان کا خروج ان کی حاجت کے پورا ہونے یعنی فتح پر موقوف تھا۔

حالتِ سفر میں نوافل نہ پڑھنے پر بھی مواخذہ نہیں

۱۳۳۸ وَعَنْ حَفْصِ بْنِ عَاصِمٍ قَالَ صَحِبْتُ ابْنَ عُمَرَ فِيْ طَرِيْقِ مَكَّةَ فَصَلّٰى لَنَا الظُّهْرَ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ جَاءَ رَحْلَهٗ وَجَلَسَ فَرَاٰى نَاسًا قِيَامًا فَقَالَ مَايَصْنَعُ هٰؤُلَآءِ قُلْتُ يُسَبِّحُوْنَ قَالَ لَوْكُنْتُ مُسَبِّحًا اَتْمَمْتُ صَلَاتِيْ صَحِبْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ لَايَزِيْدُ فِي السَّفَرِعَلٰى رَكْعَتَيْنِ وَاَبَابَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ كَذَالِكَ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۵۷۷۔ حديث رقم ۱۱۰۱۔ وأبو داوٗد في السنن ۲/۲۰ حديث رم ۱۲۲۳۔ والنسائي ۳/۱۲۳ حديث رقم ۱۴۵۸۔ وابن ماجه ۱/۳۴۰ حديث رقم ۱۰۷۱۔

ترجمہ: حضرت حفص بن عاصمؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مکہ کے راستہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا رفیق سفر بن گیا تو انہوں نے ظہر کی نماز ہمیں دو رکعت پڑھائی، پھر وہ اپنے کجاوے میں واپس آ کر بیٹھ گئے، کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ کھڑے (نوافل پڑھ رہے) ہیں تو پوچھا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ تو میں نے عرض کیا کہ نفلیں پڑھ رہے ہیں تو فرمایا اگر مجھے نفل پڑھنے ہوتے تو میں اپنی فرض نماز کو مکمل کرتا مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں دو رکعات فرض قصر پر اضافہ نہیں کرتے تھے اور اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمانؓ بھی (یعنی یہ حضرات بھی حالت سفر میں صرف دو رکعت نماز فرض پڑھتے تھے) (بخاری، مسلم)

راوئ حدیث:

حفص بن عاصم۔ یہ حفص بن عاصم بن عمر ابن خطاب قریشی عدوی ہیں۔ محدثین کے یہاں قابل اعتماد ہیں۔ ان پر لوگوں کا اجماع ہے۔ اجلہ تابعین میں سے ہیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے احادیث کو سنا ہے۔ بہت زیادہ احادیث نقل کرنے والے ہیں۔

تشریح: ''لو كنت مسبحا أتممت صلاتي'' یعنی میں نفل پڑھتا تو بجائے اس کے فرض کو پورا کرتا۔ یہی بعض علماء کا مسلک ہے کہ سفر میں نفل نہ پڑھے گا۔

''وأبا بكرو عمرو عثمان رضي الله عنهم كذلك'' یعنی یہ تمام حضرات سفر میں دو رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ قصر پر مواظبت امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی تائید کرتی ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ان حضرات کی دلیل ہے جن کے نزدیک سفر میں نوافل نہیں پڑھے جائیں گے۔ اور

نفلوں کی عدم مشروعیت قصر کے رخصت ہونے کی وجہ سے نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض حضرات کا کہنا ہے۔ اس لئے ترک نفل کی رخصت کسی دلیل کی محتاج نہیں کیونکہ اس کے جواز پر اجماع ہے۔

مسافر جمع صوری کر سکتا ہے

۱۳۳۹ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْمَعُ بَيْنَ صَلَاةِ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ اِذَا كَانَ عَلٰى ظَهْرِ سَيْرٍ وَيَجْمَعُ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۵۷۹۔ حدیث رقم ۱۱۰۷۔ ومسلم ۱/۴۹۰ حدیث رقم (۵۲۔ ۷۰۶)۔ وأبوداوٗد فی السنن ۲/۱۰ حدیث رقم ۱۲۰۶۔ والترمذی ۲/۴۳۸ حدیث رقم ۵۵۳۔ والنسائی ۱/۸۵ حدیث رقم ۵۸۷۔ والدارمی ۱/۴۲۶ حدیث رقم ۱۵۱۵ ومالك فی الموطأ ۱/۱۴۳ حدیث رقم ۲ من کتاب قصر الصلاۃ۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ سفر پر ہوتے تو ظہر اور عصر کی نمازوں کو ایک ساتھ پڑھتے تھے اور اسی طرح مغرب اور عشاء کو ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ (بخاری)

تشریح: ''کان رسول اللّٰہ ﷺ یجمع بین صلاۃ الظھر والعصر'' جمع سے جمع صوری یعنی تقدیم وتاخیر والی جمع ہے۔

''اذا کان علی ظھر سیر'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ ''ظھر'' کو تاکید کیلئے لایا گیا اور بعض کا کہنا یہ ہے کہ سیر کیلئے ظہر کو اس لئے بیان کیا گیا کہ چلنے والا جب تک چلتا رہتا ہے تو گویا کہ وہ اس پر سوار ہوتا ہے معنی اس کا یہ ہے کہ کبھی ظہر کو تاخیر کرنے کی نیت کرتے تو اسے عصر کے وقت میں پڑھتے اور کبھی عصر کو ظہر میں وقت میں ادا کرتے۔

ابن الملک نے بھی یہی کہا ہے لیکن معنی مخالفِ مذہب ہے اور یہ حدیث اپنے ظاہر کے اعتبار سے امام شافعی کے مسلک کی تائید کرتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ جمع صوری پر محمول ہے یعنی ظہر کو اس کے آخر وقت میں اور عصر کو اس کے اول وقت میں پڑھتے تھے۔

''ویجمع بین المغرب والعشاء'' اس کے بارے میں بھی ہماری توجیہ وہی ہے۔ اس بحث کی تفصیل مشکل الآثار للطحاوی میں موجود ہے۔

نفل نماز سواری پر بھی پڑھی جا سکتی ہے

۱۳۴۰: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ فِي السَّفَرِ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ حَيْثُ تَوَجَّهَتْ بِهٖ يُوْمِيْ اِيْمَاءً صَلَاةَ اللَّيْلِ اِلَّا الْفَرَائِضَ وَيُوْتِرُ عَلٰى رَاحِلَتِهٖ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٨٩/٢۔ حديث رقم ١٠٠٠ ومسلم في صحيحه ٤٨٧/١۔ حديث رقم (٣٩۔ ٧٠٠)۔ وأبوداوٗد في السنن ٢١/٢ حديث رقم ١٢٢٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ جب آقا مدنی ﷺ سفر پر ہوتے تو رات کی نماز سوائے فرض کے اپنی سواری پر پڑھتے تھے اشارہ کے ساتھ اور سواری کا منہ جس طرف متوجہ ہوتا تھا اسی طرف نماز پڑھتے تھے اور صلوٰۃ وتر بھی اپنی سواری پر ہی پڑھتے تھے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''حیث توجهت به'' اس ضمیر کا مرجع حیث یا نبی ﷺ ہیں۔ باء تعدیہ کیلئے ہے اور عائد الی حیث محذوف ہے۔ اور وہ ''الیہ''۔

''یؤمی'' علامہ طیبیؒ نے اس لفظ کو یصلی کے فاعل سے حال قرار دیا ہے۔ علی راحلته کے بارے میں بھی یہی فرماتے ہیں۔

''صلاة الليل'' یہ یصلی کا مفعول ہے۔

''الاّ الفرائض'' یہ صلاۃ اللیل سے مستثنیٰ ہے یعنی استثناء منقطع ہے۔ علامہ طیبیؒ کی رائے تو یہی ہے۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ اسے استثناء متصل مانا جائے۔ کیونکہ تمام فرائض کو بغیر عذر کے سواری پر ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

''ویوتر علی راحلة'' ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے اس عمل مبارک سے وتر کے عدم وجوب کا ثبوت ملتا ہے۔

علامہ طحاویؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس روایت کی توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ وجوب وتر سے پہلے سواری پر وتر پڑھ لیتے تھے لیکن جب بعد میں ان کی تاکید آگئی تو ایسا نہ کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابن عمر ؓ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نماز (نفل) سواری پر پڑھتے اور وتر زمین پر اور ان کا خیال یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

١٣٤١ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كُلُّ ذَالِكَ قَدْ فَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَصَرَ الصَّلَاةَ وَاَتَمَّ۔

(رواه في شرح السنة)

أخرجه الدارقطني في السنن ١٨٩/٢ حديث رقم ٤٣ من باب القبلة للصائم۔

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے یہ سب کیا ہے حالت سفر میں صلوٰۃ قصر بھی پڑھی ہے اور پوری بھی پڑھی ہے۔ (شرح السنہ)

تشریح: ''عن عائشة قالت كل'' منصوب و مرفوع دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔

''ذلك'' یہ بعد میں آنے والے قصر اور اتمام کی طرف اشارہ ہے۔

راجح یہ ہے کہ یہ اس سائل کے کلام کی طرف اشارہ ہے جس نے قصر اور اتمام کے بارے میں سوال کیا تھا اور کل مفعولیت کی بنا پر منصوب ہے۔ کل کو حذف عائد کی صورت میں مبتدا بھی بنا سکتے ہیں اصل عبارت یہ ہوگی۔ ''كل ذلك فعله رسول الله ﷺ''

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایک ذی شان امر مبہم کی طرف اشارہ ہے جس کا علم تفسیر کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔اور اس کی تفسیر حضرت عائشہؓ کا قول ''قصر و أتم'' ہے۔

''قصر و أتم'' یعنی سفر میں رباعی نماز کو قصر کر کے بھی پڑھا اور مکمل بھی پڑھا۔

اس قول میں اتمام سے مراد سفر میں اس جگہ اتمام کرنا ہے جہاں اقامت کا ارادہ ہو۔ نیز اتمام کا ایک معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نماز اپنی اول وضع کے اعتبار سے قصر ہی ہے کیونکہ روایات کے مطابق پہلے دو دو رکعات فرض ہوئی تھیں۔پس سفر میں اس کو اس کی حالت پر باقی رکھا گیا اور حضر میں اس پر اضافہ کر دیا گیا۔اس صورت میں عطف تفسیری ہوگا۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس روایت کو حجت بنا کر امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں کہ سفر میں قصر اور اتمام دونوں کی اجازت ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اتمام جائز نہیں ایسا کرنے سے آدمی گناہ گار ہوگا۔

میرکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو شافعی اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ابراہیم بن یحییٰ ہیں۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ عدم وجوب کے بارے میں نسائی اور دارقطنی کی روایت صریح تر ہے اس کی اسناد ہی حسن ہے۔اسی طرح بیہقی کی روایت جسے انہوں نے صحیح قرار دیا۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان کے عمرہ کی قضاء کیلئے گئی،حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ نہیں رکھا میں نے روزہ رکھا،حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر کیا میں نے پوری نماز پڑھی میں نے عرض کیا۔''یا رسول اللہ! آپ نے قصر کیا اور میں نے پوری نماز پڑھی آپ نے روزہ نہیں رکھا میں نے روزہ رکھا''۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''اے عائشہ! تو نے اچھا کیا'' آپ نے میرے اس عمل کو معیوب قرار نہ دیا۔نسائی کی روایت میں عمرۃ رمضان کا ذکر نہیں ہے۔

ابن حجرؒ کی اس دلیل کی تاویل یہ ہے کہ عمرہ رمضان غیر صحیحہ ہے کیونکہ ارباب سیر کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے فرماتے کہ چاروں ذی القعدہ میں تھے البتہ حج کے ساتھ والے عمرہ کے اعمال اسی میں تھے۔اگر اس کو صحیح بھی مان لیں تو یہ اپنے سے صحیح روایات کے متعارض ہے ایک وہ روایت جس میں آتا ہے کہ نماز اولا دو دو رکعات فرض ہوئی تھیں پھر سفر کی نماز تو اسی پر طے ہوئی اور حضر کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا۔

ان دونوں متعارض روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: ''اے عائشہ! تو نے اچھا کیا'' کو اس پر محمول کیا جائے کہ تو نے جائز فعل کیا اس لئے کہ اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل قصر سے افضل بالاجماع قرار نہیں دیا جاسکتا۔

باقی دارقطنی اور بیہقی کی یہ روایت کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں قصر بھی فرماتے اور اتمام بھی،روزہ بھی رکھتے اور افطار بھی۔

بیہقی کہتے ہیں کہ دارقطنی نے اس کی اسناد کو صحیح قرار دیا ہے۔اس کی صحت کو تسلیم کر لینے کی صورت میں اسے اس پر محمول کریں گے۔کہ سفر میں اتمام جائز تھا یا حضور نے ایک آدھ مرتبہ بیان جواز کیلئے اتمام کیا تھا یا ابتداء میں ایسا تھا بعد میں یہ حکم منسوخ ہوگیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے سفر میں بالاتفاق قصر فرمایا تھا۔

مسافر امامت کرواسکتا ہے

۱۳۴۲ وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ غَزَوْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ وَشَهِدْتُ مَعَهُ الْفَتْحَ فَاَقَامَ بِمَكَّةَ ثَمَانِيَ عَشَرَةَ لَيْلَةً لَا يُصَلِّي اِلَّا رَكْعَتَيْنِ يَقُوْلُ يَا اَهْلَ الْبَلَدِ صَلُّوْا اَرْبَعًا فَاِنَّا سَفْرٌ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۲/۲۳ حديث رقم ۱۲۲۹۔ وأحمد في المسند ٤/٤۳۰۔

ترجمہ: حضرت عمران بن حصین فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کے ساتھ جہاد کیا، چنانچہ میں آپ ﷺ کے ساتھ فتح مکہ میں بھی شریک تھا، آپ ﷺ نے اس موقع پر مکہ میں اٹھارہ دن قیام کیا۔ تو آپ دو دو رکعتیں ہی پڑھتے تھے، اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ اے اہل شہر تم چار رکعتیں پڑھو، ہم مسافر ہیں۔ (ابوداؤد)

تشریح: ''فانا سفر'' بسکون الفاء جمع مسافر۔

ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے مکہ میں نماز پڑھائی اور سلام پھیرنے کے بعد کہا ''اپنی نماز پوری کرلو میں مسافر ہوں'' یہ سن کر ایک بے وقوف کہنے لگا ''ہم اس مسئلے کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔'' امام صاحب اس کی یہ بات سن کر مسکرا دیئے اور فرمایا ''اگر تم جانتے تو بات نہ کرتے''۔ (یعنی وہ نماز میں تھا اور بولنے سے اس کی نماز فاسد ہوگئی)۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں ''فانا سفر'' کی فاء لغت فصیحہ ہے۔ یہ اس محذوف کلام پر دلالت کر رہی ہے۔ جو فاء کے بعد آنے والے کلام کا سبب ہے۔ اصل عبارت یہ ہوگی: ''صلوا أربعا ولا تقتدو ابنا فانا سفر''

اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا قول ''فانفجرت'' ہے۔

قصر صرف چار رکعت والی نماز میں ہوگی

۱۳۴۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ فِي السَّفَرِ رَكْعَتَيْنِ وَبَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ وَفِي رِوَايَةٍ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ فَصَلَّيْتُ مَعَهُ فِي الْحَضَرِ الظُّهْرَ اَرْبَعًا وَبَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ وَصَلَّيْتُ مَعَهُ فِي السَّفَرِ الظُّهْرَ رَكْعَتَيْنِ وَبَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ وَلَمْ يُصَلِّ بَعْدَهَا شَيْئًا وَالْمَغْرِبَ فِي الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ سَوَاءً ثَلَاثَ رَكْعَاتٍ وَلَا يَنْقُصُ فِيْ حَضَرٍ وَلَا سَفَرٍ وَهِيَ وِتْرُ النَّهَارِ وَبَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ۲/۴۳۷ حديث رقم ۵۵۲۔

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے ظہر کی نماز آنحضرت ﷺ کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھیں (یعنی سنت) ایک اور روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ سفر و حضر میں نماز پڑھی، پس میں نے آپ ﷺ کے ساتھ حضر میں چار رکعتیں پڑھیں اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھیں، اور میں نے آپ ﷺ کے ساتھ سفر میں ظہر کی دو رکعتیں پڑھی ہیں اور اس کے بعد دو رکعتیں اور اسی

طرح عصر کی دو رکعتیں پڑھی ہیں، اس کے بعد کچھ نہیں پڑھا۔ اور مغرب کی سفر وحضر میں تین رکعتیں پڑھتے تھے۔ اور سفر وحضر میں اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی تھی۔ یہ مغرب کی نماز وتر النہار کہلاتی ہے۔ اس کے بعد دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

(ترمذی)

تشریح: ''والمغرب في الحضر والسفر سواء'' یہ حال ہے ای مستو یا عدوھا فیھما۔

''وھی وتر النھار'' علامہ طیبیؒ نے اسے جملہ حالیہ قرار دیا جو اس میں کمی نہ کرنے کی علت کو بیان کر رہا ہے۔ اس جملہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو تقویت ملتی ہے کہ وتر تین رکعات ہیں اس سے کم نہ پڑھے جائیں گے۔

''بعدھا رکعتین'' ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ نمازوں کے بعد سنتوں اور نوافل کو سفر میں ادا کیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں راجح بات یہ ہے کہ راستہ میں انہیں ادا نہ کرے البتہ منزل پر پہنچ کر پڑھ سکتا ہے۔

غزوۂ تبوک کے سفر کا واقعہ

۱۳۴۴: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ غَزْوَةِ تَبُوْكَ إِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ أَنْ يَرْتَحِلَ جَمَعَ بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ وَإِنِ ارْتَحَلَ قَبْلَ أَنْ تَزِيْغَ الشَّمْسُ أَخَّرَ الظُّهْرَ حَتّٰى يَنْزِلَ الْعَصْرَ وَفِي الْمَغْرِبِ مِثْلَ ذَالِكَ إِذَا غَابَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ أَنْ يَرْتَحِلَ جَمَعَ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ فَإِنِ ارْتَحَلَ قَبْلَ أَنْ تَغِيْبَ الشَّمْسُ أَخَّرَ الْمَغْرِبَ حَتّٰى يَنْزِلَ لِلْعِشَاءِ ثُمَّ يَجْمَعُ بَيْنَهُمَا۔ (رواہ ابوداود والترمذی)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۲/۱۸ حديث رقم ۱۲۲۰۔ والترمذي ۲/۴۳۸ حديث رقم ۵۵۳۔ والنسائي ۱/۲۸۴ حديث رقم ۵۸۶۔ وأحمد في المسند ۵/۲۴۱۔

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک میں تھے جب سورج ڈھل جاتا تو کوچ کرنے سے پہلے پہلے ظہر اور عصر کے درمیان جمع کرتے تھے (یعنی ظہر اور عصر کو ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے) اور جب آپ سورج کے ڈھلنے اور زوال سے پہلے ہی کوچ کر لیتے تو ظہر کو مؤخر کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ عصر کیلئے اترتے (یعنی ظہر اور عصر کو ساتھ پڑھتے) اور مغرب میں بھی یہ معمول تھا کہ جب سورج غروب ہو جاتا تو کوچ کرنے سے پہلے پہلے مغرب اور عشاء کو ایک ساتھ پڑھ لیتے تھے۔ اور اگر آپ سورج غروب ہونے سے پہلے کوچ کر لیتے تو مغرب کو مؤخر کرتے یہاں تک کہ عشاء کیلئے اترتے اور ان دونوں نمازوں کو اکٹھا پڑھ لیتے۔ (ابوداود، ترمذی)

تشریح: ''في غزوة تبوك'' لفظ تبوک مشہور قول کے مطابق غیر منصرف ہے۔ یہ شام کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔

''قبل ان یرتحل'' یہ ماقبل اور مابعد دونوں کیلئے ظرف بن سکتا ہے۔

''جمع بین الظھر والعصر'' یعنی ظہر کو ~~اس کے آخری~~ وقت میں اور عصر کو اس کے ابتدائی وقت میں ادا فرمایا۔

علامہ میرکؒ نے امام ابوداؤد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ وقت کی تقدیم کے بارے میں کوئی مضبوط حدیث نہیں ہے۔ یہ اس حدیث کے ضعیف ہونے اور شافعیہ کے قابل استدلال نہ ہونے کی شہادت ہے۔ اس سے ابن حجرؒ کا اس حدیث کو صحیح قرار دینے کا قول بھی باطل ہو گیا اور یہ ان احادیث میں سے ہے جو اپنے میں نص ہیں اور تقدیم وتاخیر کی جمع کے جواز میں یہ کسی تاویل کا احتمال نہیں رکھتیں۔

ابن اہمامؒ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں ہماری دلیل صحیحین میں منقول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی مقررہ وقت کے علاوہ نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔

شاید ابن مسعودؓ نے عرفات کی جمع کو شہرت کی بنا پر چھوڑ دیا۔

سفر میں سواری پر نفل پڑھتے ہوئے بوقت تحریمہ قبلہ رو ہونا ضروری ہے

۱۳۴۵: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا سَافَرَ وَاَرَادَ اَنْ يَّتَطَوَّعَ اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ بِنَاقَتِهٖ فَكَبَّرَ ثُمَّ صَلّٰى حَيْثُ وَجَّهَهٗ رِكَابُهٗ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲/ ۲۱ حديث رقم ۱۲۲٤ والدارقطنی ۱/ ۳۹٦ حديث رقم ۳ من باب صفة صلاة التطوع فی السفر واستقبال القبلة عند الصلاة علی الدابة۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ سفر کی حالت میں ہوتے اور نفل پڑھنے کا ارادہ ہوتا تو اپنی سواری (یعنی اونٹنی) کا منہ قبلہ کی طرف کرتے اور تکبیر تحریمہ کہتے پھر آپ اسی طرف نماز پڑھتے، جس طرف آپ کی سواری رخ کرتی۔

تشریح: **اذا سافر** سے مراد یہ ہے کہ اپنے شہر سے باہر تشریف لے جاتے خواہ مسافر ہوتے یا مقیم۔ کنایہ میں یہی ہے اور صحیح قول بھی یہی ہے۔ بعض نے اس سے سفر شرعی مراد لیا ہے۔

باقی شہر میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے جائز اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مکروہ قرار دیا ہے۔

''استقبل القبلة بناقته'' اس میں دونوں احتمال ہیں کہ سواری کا جانور خود چل رہا ہو یا کوئی آدمی اسے چلا رہا ہو۔

''کبّر'' تکبیر تحریمہ کہتے کہ یہ نماز کی شرائط میں سے ہے۔

بعض حضرات نے تکبیر تحریمہ کے وقت قبلہ رخ ہونے کی شرط بھی لگائی ہے یعنی اس شرط کے ساتھ کہ ایسا کرنا آسان ہو اور لگام اس کے ہاتھ میں ہو، امام شافعیؒ بھی اسی کے قائل ہیں جبکہ ہمارے اصحاب نفل میں اس کی شرط نہیں لگاتے۔ البتہ فرض میں تکبیر تحریمہ کے وقت قبلہ رخ ہونا نماز کی شرائط میں سے ہے۔

''خلاصہ'' میں مذکور ہے کہ عذر کی صورت میں سواری پر فرض پڑھنا جائز ہیں جیسے بارش یا دشمن و درندہ کا خوف وغیرہ۔

مولانا ابو المکارم نے شرح النقایہ میں بھی یہی لکھا ہے۔

''ثم صلّى'' اس سے معلوم ہوا کہ تکبیر تحریمہ کہنا شرط ہے رکن نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے قول ''وذكر اسم ربه

فصلّی'' سے بھی معلوم ہوتا ہے۔اس لئے کہ عطف میں اصل مغایرت ہے۔ابن حجر نے اس کا معنی کیا ہے پھر اپنی نماز میں مشغول رہے۔علامہ طیبیؒ نے ثم تراخی فی الرتبہ کیلئے قرار دیا ہے۔اور جب تکبیر کا اہتمام نیت کے ساتھ ملے ہونے کی وجہ سے اشد ہے تو اسے توجہ الی القبلہ کے ساتھ خاص کر دیا گیا۔

اگر اشارے سے نماز پڑھ رہا ہو تو سجدے کا اشارہ رکوع سے پست ہونا ضروری ہے

۱۳۴۶: وَ عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ بَعَثَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ حَاجَةٍ فَجِئْتُ وَھُوَ یُصَلِّیْ عَلٰی رَاحِلَتِہٖ نَحْوَالْمَشْرِقِ وَیَجْعَلُ السُّجُوْدَ اَخْفَضَ مِنَ الرُّکُوْعِ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداؤد في السنن ٢/٢٢ حديث رقم ١٢٢٨۔ والترمذي ٢/١٨٢ حديث رقم ٣٥١۔ وأحمد في المسند ٣/٣٣٢۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے کسی کام کیلئے بھیجا، جب میں واپس آیا تو آپ اپنی سواری پر مشرق کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے اور سجدے کا اشارہ رکوع سے پست کرتے تھے۔

تشریح: ''وھو یصلی'' یہ حال ہے۔

''علی راحلۃ نحو المشرق'' یہ ظرف ہے، عبارت یہ ہوگی: ''یصلی الی جانب المشرق'' یا حال ہے۔اس صورت میں عبارت یہ ہوگی۔ ''متوجھا نحو المشرق'' اور ''کانت متوجھۃ الی جانب المشرق''۔

الفصل الثالث:

مسافر امام کے ساتھ چار رکعتیں پڑھے اور اکیلا دو ہی رکعتیں پڑھے

۱۳۴۷: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِمِنٰی رَکْعَتَیْنِ وَ اَبُوْ بَکْرٍ بَعْدَہٗ وَعُمَرُ بَعْدَ اَبِیْ بَکْرٍ وَعُثْمَانُ صَدْرًا مِّنْ خِلَافَتِہٖ ثُمَّ اِنَّ عُثْمَانَ صَلّٰی بَعْدُ اَرْبَعًا فَکَانَ ابْنُ عُمَرَ اِذَا صَلّٰی مَعَ الْاِمَامِ صَلّٰی اَرْبَعًا وَ اِذَا صَلَّاھَا وَحْدَہٗ صَلّٰی رَکْعَتَیْنِ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٥٦٣۔ حديث رقم ١٠٨٢۔ ومسلم في صحيحه ١/٤٨٢ حديث رقم (١٦۔ ٦٩٤)۔ والنسائي ٣/١٢١ حديث رقم ١٤٥١۔ والدارمي ١/٤٢٣ حديث رقم ١٥٠٦۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے منیٰ میں دو رکعت نماز پڑھی اور آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بھی دو رکعت پڑھی ان کے بعد حضرت فاروق اعظمؓ نے بھی دو رکعت نماز پڑھی، اور حضرت عثمانؓ نے بھی اپنی خلافت کے شروع میں دو رکعت نماز پڑھی (یعنی قصر نماز پڑھی) لیکن پھر حضرت عثمانؓ باقی زمانہ خلافت میں چار رکعتیں پڑھنے لگے تو عبداللہ ابن عمر ؓ کی یہ حالت تھی کہ جب امام کے ساتھ پڑھتے تو چار رکعتیں پڑھتے تھے اور جب اکیلے پڑھتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

تشریح: ''صلی رسول اللہ ﷺ بمنًا'' یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے۔

''وعثمان صدرا من خلافته'' یعنی حضرت عثمان بھی اپنی خلافت کے ابتدائی زمانہ یعنی تقریباً چھ سال تک ہمیں دو رکعات نماز ہی پڑھاتے رہے۔

''ثم ان بعد أربعًا'' اس کی وجہ یہ تھی وہ مکہ میں مقیم ہوگئے تھے۔ امام احمدؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں چار رکعات نماز پڑھائی لوگوں نے اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا ''اے لوگو! میں جب سے مکہ آیا ہوں میں نے یہاں کی سکونت اختیار کر لی ہے اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کسی شہر کی رہائش اختیار کر لے تو وہاں مقیم کی نماز پڑھے''۔

لوگوں کا حضرت عثمان پر اعتراض کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ سفر میں رباعی نماز کا اتمام نہ فرماتے تھے اور یہ کہ قصر ہی عزیمت ہے۔ وگرنہ اعتراض کیوں کیا جاتا۔

اس مقام پر ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ لوگوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ قصر اور اتمام دونوں جائز ہیں۔

ابن حجرؒ کی یہ بات درست نہیں کیونکہ جواز اور عدم جواز بتانا صرف نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔

اور ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ اس عمل کا حضرت عثمان سے کئی مرتبہ صادر ہونا اور صحابہ کا اس پر انکار نہ کرنا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ قصر واجب نہیں۔

ابن حجر کی یہ بات بالکل غلط ہے اور یہ علم کی کمی کی علامت اور پیش خیمہ ہے۔

''فکان ابن عمر اذا صلی مع الامام'' ظاہر تو یہ ہے کہ امام سے مراد حضرت عثمان ہیں۔ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ کوئی ایسا امام تلاش کرتے ہوں جو پوری نماز پڑھائے۔

''صلی أربعًا'' اس لئے کہ مسافر مقتدی پر واجب ہے کہ وہ امام کی اتباع کرے خواہ امام قصر کرے یا پوری نماز پڑھے۔

''واذا صلاها وحده صلاها رکعتین'' اس لئے کہ وہ مسافر تھے اور مسافر کیلئے قصر افضل اور احوط ہے اور اس میں کسی کا اختلاف بھی نہیں۔

ابتداءً سفر وحضر کی نماز برابر تھی

۱۳۴۸: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ فُرِضَتِ الصَّلَاةُ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ هَاجَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَفُرِضَتْ اَرْبَعًا وَتُرِكَتْ صَلَاةُ السَّفَرِ عَلَى الْفَرِيْضَةِ الْاُوْلٰى قَالَ الزُّهْرِيُّ قُلْتُ لِعُرْوَةَ مَابَالُ عَآئِشَةَ تُتِمُّ قَالَ تَاَوَّلَتْ كَمَا تَاَوَّلَ عُثْمَانُ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٤٦٤/١۔ حدیث رقم ٣٥٠۔ ومسلم فی صحيحه ٤٧٨/١ حدیث رقم (٦٨٥/١) وأبوداؤد فی السنن ٥/٢ حدیث رقم ١١٩٨۔ والدارمی ٤٢٤/١ حدیث رقم ١٥٠٩۔ ومالك فی الموطأ ١٤٦/١ حدیث رقم ٨ من كتاب قصر الصلاة۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ابتداء میں نماز دو رکعتیں ہی فرض ہوئی، پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی، تو حضر کیلئے چار رکعتیں فرض کی گئیں اور صلوٰۃ سفر کو پہلی مقرر کردہ دو رکعتوں پر باقی چھوڑ دیا گیا۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے عروہ بن زبیر سے عرض کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کیا ہوا کہ سفر میں بھی پوری نماز پڑھتی ہیں، تو حضرت عروہ نے فرمایا وہ ایسی ہی تاویل کرتی ہیں جیسی کہ حضرت عثمانؓ نے کی ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ''فرضت الصلاۃ رکعتین'' یعنی ابتداء مکہ میں واقعہ معراج کے موقعہ پر دو رکعات فرض ہوئیں۔

''وترکت صلوۃ السفر علی الفریضۃ الأولی'' پس اگر سفر میں پوری نماز پڑھے گا تو ہمارے نزدیک گناہ گار ہوگا۔ اور اس کی دو رکعتیں نفل ہو جائیں گی اور اگر اس نے قعدہ اولیٰ نہ کیا جو حکمی طور پر قعدہ اخیرہ ہے تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔ اس معنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک اور روایت بھی منقول ہے۔

ابن حجرؒ کا یہ قول درستگی سے بہت دور ہے کیونکہ شریعت میں کوئی ایسا فرض نہیں جو پڑھنے والے کے ارادے پر موقوف ہو۔ اس قول کے بطلان کی وجہ سے ائمہ میں سے کوئی بھی اس قول کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔

''قال الزھری: قلت لعروہ ما بال عائشہ تتم؟ قال تأولت کما تأوّل عثمان'' امام نووی فرماتے ہیں کہ محدثین کا ان دونوں حضرات کی تاویل کے بارے میں اختلاف ہے۔ محققین کی رائے یہ ہے ان دونوں حضرات نے قصر اور اتمام دونوں کو جائز قرار دیا ہے۔ پس انہوں نے دونوں جائز اعمال میں سے ایک یعنی اتمام کو اختیار کر لیا۔

امام نوویؒ کی یہ تشریح محل نظر ہے کیونکہ حضرت عائشہؓ کو اتمام کا یقین تھا جبکہ حضرت عثمانؓ کی تاویل تو گزر چکی۔ کہ انہوں نے مکہ میں سکونت کے ذریعے اتمام کو واجب کو لیا تھا لہٰذا ان دونوں کی تاویل ایک کیسے ہوگئی ان میں تو مناسبت نہیں ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے مکہ میں اقامت کی نیت کر لی تھی۔ اس قول کو محدثین نے اس طرح روایت کیا ہے کہ مکہ میں مہاجرین کیلئے تین دن سے زائد قیام کرنا حرام ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ منی میں حضرت عثمانؓ کی ایک زمین تھی اس قول کی وجہ بطلان یہ ہے کہ زمین کی موجودگی اقامت کا تقاضا نہیں کرتی۔

ابن بطال کہتے ہیں کہ ان دونوں کی رائے یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت پر آسانی کیلئے قصر کو اختیار کیا تھا۔ جب کہ یہ دونوں حضرات سختی پر عمل کرنا چاہتے تھے۔

علامہ عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان کا اتمام کرنے کا سبب یہ تھا کہ وہ قصر کو اس شخص کے ساتھ خاص مانتے تھے جو چل رہا ہو اور جو شخص سفر کے دوران کسی جگہ ٹھہر جائے اس کیلئے مقیم کا حکم ہوگا لہٰذا وہ اتمام کرے گا۔

ابن اہمامؒ فرماتے ہی کہ حضرت عائشہؓ کے اتمام کی وجہ یہ تھی کہ انہیں اس بارے میں؟ تھا اور ان کا خیال یہ تھا کہ سفر میں قصر کا حکم اس مسافر کیلئے ہے جسے اتمام کرنے سے نقصان ہوتا۔ اس احتمال کی تائید بیہقی اور دارقطنی کی ایک صحیح روایت سے ہوتی ہے کہ حضرت عروہؓ فرماتے ہیں کی حضرت عائشہؓ سفر میں چار رکعات پڑھتی تھیں۔ میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے اس میں کچھ دقت پیش نہیں آتی۔

حضرت عروہ کے قول ''انها تاولت'' کا معنی بھی یہی ہے کہ ان کی تاویل یہ تھی کہ اسقاطِ صلوٰۃ حرج کی صورت میں ہے۔ واللہ اعلم بمرادہ۔

اس صورت میں کما تأوّل کا کاف تنظیر کیلئے ہوگا تمثیل کیلئے نہیں ہوگا۔

صلوٰۃ سفر کو اللہ نے فرض ہی قصر یعنی دو رکعتیں کیا ہے

۱۳۴۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ فَرَضَ اللّٰهُ الصَّلَاةَ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْحَضَرِ اَرْبَعًا وَفِي السَّفَرِ رَكْعَتَيْنِ وَفِي الْخَوْفِ رَكْعَةً۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ۱/ ٤٧٩ حديث رقم ٦/ ٦٨٧۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کی زبانی حضر میں چار رکعتیں فرض کی ہیں اور سفر میں دو رکعتیں اور خوف کی حالت میں ایک رکعت۔ (مسلم)

تشریح: ''فرض الله الصلاة'' اس سے مراد رباعی نماز ہے۔

''علی لسان بینکم'' علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ قول قرآن مجید کی آیت ''وما ينطق عن الهوٰى'' کی طرح ہے۔

''في الحضر أربعا وفي السفر ركعتين'' یہ ہمارے مذہب کی صریح دلیل ہے۔ جو جواب ابن حجر نے نقل کئے ہیں۔ وہ سارے کے سارے تردید شدہ ہیں۔ اور یہ جو نقل کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک سفر میں تھے اور حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ کی موجودگی میں اتمام کیا تو حضور ﷺ نے حضرت عائشہ کے عمل کی تائید فرمائی۔ یہ غیر صحیح ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو اختلاف نہ ہوتا۔

''وفي الخوف ركعة'' یعنی صلوٰۃ الخوف میں ہر جماعت کے ساتھ ایک رکعت پڑھی جیسا کہ آیۃ الخوف میں ہے۔ خواہ وہ ثنائی حقیقی ہو یا حکمی۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اسلاف کی ایک جماعت نے اس کے ظاہر کو لیا ہے۔ ان میں حسن بصری اور اسحاقؒ بھی شامل ہیں جبکہ امام شافعیؒ، امام مالک اور جمہور کا کہنا یہ ہے کہ صلوٰۃ الخوف رکعات کی تعداد میں صلوٰۃ الأمن کی طرح ہے اور انہوں نے اس حدیث کی یہ تاویل کی ہے کہ اس سے مراد امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھنا ہے اور دوسری رکعت کو وہ منفرد ادا کرے گا جیسا کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کی صلوٰۃ الخوف کے بارے میں صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

باقی حضر کی چار رکعات اور تین رکعات میں امام کے ساتھ دو رکعتیں اور باقی نماز اکیلے پڑھے گا۔

قولہ: ''رواہ مسلم'' امام مسلم نے اس روایت کو موقوفاً نقل کیا ہے لیکن یہ مرفوع کے درجہ میں ہے۔

سفر میں دو رکعتیں پڑھنا عظمت ہے

۱۳۵۰: وَعَنْهُ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَا سَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ السَّفَرِ رَكْعَتَيْنِ

وَهُمَا تَمَامٌ غَيْرُ قَصْرٍ وَالْوِتْرُ فِي السَّفَرِ سُنَّةٌ۔ (رواه ابن ماجة)

أخرجه ابن ماجه في السنن ١/٣٧٧ حديث رقم ١١٩٤۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ سفر دو رکعتیں مقرر فرمائی ہے، اور وہ پوری ہیں ناقص نہیں ہیں۔ اور وتر سفر میں سنت ہیں۔

تشریح: ''قالا: سنّ رسول اللّٰہ ﷺ صلاة السفر رکعتین'' اس سے مراد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان مبارک سے قصر کے حکم کو بیان فرمایا وگرنہ اس کا ثبوت تو قرآن مجید سے ملتا ہے۔ اس جملہ کی مراد میں ایک قول یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قول و فعل کے اس حکم کی وضاحت فرمائی جو کتاب اللہ میں موجود تھا۔

ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمایا کہ جو قصر کرنا چاہے اس کا یہ طریقہ ہے۔ یہ قول تردید شدہ ہے کیونکہ دلیل مخصص موجود نہیں۔

''وهما تمام غير قصر'' یہ سفر میں دو رکعتیں پڑھنا بھی پوری نماز ہے۔ پس آیت میں قصر کا اطلاق مجاز یا اضافی ہے۔

ابن حجرؒ کا کہنا یہ ہے کہ وهما تمام کا مطلب ہے تمام بالنسبة لى الثواب۔ یعنی قصر کا ثواب اتمام کے ثواب کے مقارب ہے۔

ابن حجر کا یہ قول ان کے قول کے مناقض ہے کہ سفر میں قصر کرنا افضل ہے۔ نیز یہ کہ کلام رکعات کی تعداد میں ثواب کے فرق کو بیان کرنے میں نہیں۔

''والوتر فی السفر سنة'' لفظ ''سنۃ'' کے معنی میں دو احتمال ہیں:

① سنت سے ثابت ہے۔

② اسلام کی سنن میں سے ایک سنت ہے۔ یہ معنی وجوب کے منافی نہیں۔

بلاشبہ یہ جملہ دو صحابیوں کا قول ہے لیکن مرفوع کے حکم میں ہے۔

مسافتِ قصر کی مقدار

۱۳۵۱: وَعَنْ مَالِكٍ بَلَغَهُ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ كَانَ يَقْصُرُ الصَّلَاةَ فِيْ مِثْلِ مَايَكُوْنُ بَيْنَ مَكَّةَ وَالطَّائِفِ وَفِيْ مِثْلِ مَا بَيْنَ مَكَّةَ وَعُسْفَانَ وَفِي مِثْلِ مَابَيْنَ مَكَّةَ وَجَدَّةَ قَالَ مَالِكٌ وَذٰلِكَ اَرْبَعَةُ بُرُدٍ۔ (رواه في الموطا)

أخرجه مالك في الموطأ ١/١٤٨ حديث رقم ١٥ من كتاب قصر الصلاة في السفر۔

ترجمہ: حضرت امام مالکؒ سے روایت ہے کہ ان کو حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں یہ بات پہنچی ہے کہ بے شک حضرت ابن عباسؓ مکہ اور طائف کے درمیان مسافت کی مقدار سفر میں قصر کرتے تھے۔ اور اسی طرح اتنی مقدار جو مکہ اور عسفان کے درمیان ہے اس میں بھی قصر نماز پڑھتے تھے، اسی طرح وہ مسافت جو مکہ اور جدہ کے درمیان ہے اس میں بھی قصر نماز پڑھتے تھے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ مسافت چار برید ہے۔

تشریح: ''وعن مالك بلغه'' یہ دوراستوں میں سے ایک کا ذکر ہے جو تین مراحل پر مشتمل ہے۔

''وفی مثل مابین مكة وعسفان'' یہ دو مراحل پر مشتمل ہے۔

''وفی مثل مابین مكة وجدة'' بضم الجيم وتشديد الدال۔ یہ ساحل سمندر پر واقع ایک شہر ہے جو مکہ سے دو دشوارگزار مرحلوں کے فاصلے پر ہے۔

''وقال مالك وذلك اربعة برد'' یعنی ذکر کی گئی مقدار میں کم از کم چار برید ہے۔ برید دو فرسخ کو اور فرسخ تین میل کو کہتے ہیں ایک میل چار ہزار گز کا ہوتا ہے۔

(رواه فی المؤطا) مؤلف کو ''عن مالك انه بلغه'' کی تعبیر کے بجائے ''عن ابن عباس انه كان يقصر الصلاة'' کی تعبیر اختیار کرنی چاہیے تھی اور آخر میں کہتے۔ ''رواه مالك فی الموطا بلاغا ثم يقول قال وذلك'' جیسا کہ تمام احادیث میں کیا جاتا ہے۔ کہ صحابی سے شروع کرتے ہیں اور مخرج پر اختتام کرتے ہیں۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے موافق ایک صحیح روایت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ عرفہ میں قصر نماز پڑھیں گے؟ انہوں نے کہا نہیں، البتہ عسفان، جدہ اور طائف میں قصر کروں گا۔ اسی طرح ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کے بارے میں صحیح روایت ہے کہ وہ دونوں حضرات چار برید کے فاصلے پر قصر کرتے تھے اور روزہ نہیں رکھتے تھے۔ اور یہ عمل توقیف شرعی کی بنا پر ہی ہوسکتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر یہ توقیف ہوتی تو ظاہر ہوتی اور نقل کی جاتی۔ ظاہر یہی ہے کہ یہ ان دونوں حضرات کا اجتہاد تھا۔ باقی امام لیث کا یہ کہنا کہ ''هذا هو الذی عليه عمل الناس'' تو یہ دعویٰ ''الناس'' کی مراد کی چھان بین کا محتاج ہے۔ ابن حجرؒ کا یہ قول کتنا بعید از جواب ہے کہ ''یہ اختلاف کے حدث سے پہلے کا اجماع ہے'' کیونکہ جس شخص کو فقہ سے ادنیٰ سی مناسبت بھی ہو وہ آسانی سے جان لے گا کہ مجتہد اجماع کی مخالفت نہیں کرتا۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ قصر کی مسافت تین دن سے کم ہونے پر حدیث ابن عباسؓ دلالت کرتی ہے۔ وہ نقل کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے مکہ والو! مکہ سے عسفان تک چار برید سے کم میں قصر نہ کرو''۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ قصر چار برید میں ہے اور چار برید تین دن سے کم میں طے کیا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ، عبدالوھاب بن مجاہد کی روایت کی وجہ سے یہ حدیث ضعیف ہے لہٰذا تین دن سے کم میں قصر کا دعویٰ بغیر دلیل کے رہ گیا۔

ہمارے مسلک کی تائید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: ''يمسح المسافر ثلاثة ايام'' مسافر تین دن تک مسح کرے گا''۔

سفر میں سنت پڑھنے کا بیان

۱۳۵۲: وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ صَحِبْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَمَانِيَةَ عَشَرَ سَفَرًا فَمَا رَأَيْتُهُ تَرَكَ رَكْعَتَيْنِ اِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ الظُّهْرِ ۔ (رواه ابوداود والترمذی وقال هذا حديث غريب)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۲/ ۱۹ حدیث رقم ۱۲۲۲۔ والترمذی فی السنن ۲/ ۴۳۵ حدیث رقم ۵۵۰۔

ترجمہ: حضرت براءؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں اٹھارہ دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمسفر رہا، میں نے نہیں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر سے پہلے اور سورج کے ڈھلنے کے بعد دو رکعتوں کو چھوڑا ہو۔ یہ ابوداؤد اور ترمذی کی روایت ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: ''فما رأيته ترك ركعتين'' شاید یہ تحیۃ الوضو کی رکعات ہوں گی یا ظہر کی سنتوں میں آپؐ نے انہی پر اکتفا فرمایا۔

''قبل الظهر'' یہ ترک کیلئے ظرف ہے۔

۱۳۵۳: وَعَنْ نَافِعٍ قَالَ اِنَّ عَبْدَ اللّٰهِ ابْنِ عُمَرَ كَانَ يَرٰى ابْنَهٗ عُبَيْدَاللّٰهِ يَتَنَفَّلُ فِي السَّفَرِ فَلَا يُنْكِرُ عَلَيْهِ۔

(رواه مالك)

أخرجه مالك فی الموطأ ۱/ ۱۵۰ حدیث رقم ۲۴ من کتاب قصر الصلاة۔

ترجمہ: حضرت نافع فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے بیٹے عبیداللہ کو سفر میں نفل پڑھتا دیکھتے تھے اور منع نہیں فرماتے تھے۔ (امام مالک)

تشریح: ''ان عبدالله بن عمر كان يرى ابنه عبيدالله فى السفر فلا ينكر عليه'' شاید یہ نوافل نماز کے بعد پڑھے جانے والے نوافل ہوں گے یا وہ وقت کی وسعت کی بنا پر جواز ترک کے علم کے باوجود نہیں پڑھتے ہوں گے۔ ان صورتوں میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے انکار سابق کو وقت کی تنگی میں نفل مجرد یا وقت کی وسعت میں بھی اسی طرح پورا کرنا ضروری ہے جس طرح حضر میں۔ حالانکہ ایسا نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ مسافر، بوڑھے اور مریض کے ثواب کو عمل کئے بغیر بھی لکھ دیتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو نماز تقرب الٰہی کا موثر ترین ذریعہ ہے اور اس سے روکنا جائز نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''أرأيت الذى ينهٰى عبدًا اذا صلّٰى''

''کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو بندے کو نماز پڑھنے سے منع کرتا ہے''۔

(رواہ مالک) ای فی المؤطا۔ اس میں بھی مسامحت ہے اس لئے کہ امام مالک اور نافع کے درمیان اسناد نہیں ہے۔ اس لئے رواہ مالک کیسے کہا جا سکتا ہے۔

بَابُ الْجُمُعَةِ

جمعہ کا بیان

''قولہ الجمعہ''،فصیح ترین لغت کے مطابق لفظ جمعہ جیم اور میم کے ضمہ کے ساتھ ہے اور میم میں سکون کے ذریعے تخفیف بھی کی جاتی ہے ای الیوم المجموع فیہ۔اس لئے کہ فعلۃ کا وزن (عین کلمہ) سکون کے ساتھ مفعول کے معنی میں آتا ہے۔جیسے ھزأۃ کا وزن۔اور میم کے فتحہ کے ساتھ فاعل کے معنی میں ہوگا ای الیوم الجامع۔

اور لفظ جمعہ کی تا مبالغے کیلئے ہے جیسے ضحکۃ جو ضحک میں کثرت کرنے والے کیلئے ہے ثانیت کیلئے نہیں ہے ورنہ یوم کو اس کے ساتھ موصوف نہ کیا جاتا۔ایک قول یہ ہے کہ جمعہ کو یہ نام اس لئے دیا گیا کہ اس میں حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت جمع کی گئی اور ایک قول یہ ہے زمین میں حضرت آدم اور حضرت حواء کا اجتماع اسی دن ہوا۔اور ایک قول یہ ہے کہ اس میں خبریں اکٹھی کی گئی۔ابن حجرؒ فرماتے ہیں میم کا کسرہ بھی نقل کیا گیا ہے۔میں کہتا ہوں یہ ان سے وہم ہے یہ تو فتح ہے قاموس کے اندر ہے۔

اور جب انہوں نے فتحہ نقل نہیں کیا اور کسرہ نقل کیا حالانکہ وہ احاطے کے درپے تھے یہ دلالت کرتا ہے۔اس بات پر کہ یہ ان سے وہم ہے۔ہاں اگر تینوں قول نقل کرتے،پھر کہتے کسرہ بھی منقول ہے تو اس کے وقوع کا احتمال تھا اس کے ساتھ صرف کی کتابوں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ وزن اوزان عربیہ میں سے نہیں ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں (لفظ جمعہ) میم کے فتحہ اور اس کے ضمہ اور اس کے سکون کے ساتھ ہے ان سے امام فراء نے فتحہ کی وجہ نقل کی ہے۔بے شک یہ لوگوں کے جمع ہونے کا دن ہے اور اس میں لوگ کثرت سے ہوتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے۔**ھمزۃ لمزہ**،اور زمانے جاہلیت میں اسے عروبہ کہا جاتا تھا۔

جمعہ ایامِ ہفتہ میں سے ایک دن ہے لفظ جمعہ میں چند لغات ہیں:

① جیم اور میم کے ضمہ کے ساتھ یعنی جُمُعَۃ۔

② جیم کے ضمہ کے ساتھ اور میم کے سکون کے ساتھ جُمْعۃ۔

③ جیم کے ضمہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ جیسے جُمَعَۃ،لیکن فصیح لغت پہلی ہے۔

وجہ تسمیہ:

جمعہ کی وجہ تسمیہ میں چند اقوال ہیں۔

① اس دن میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مکمل ہوئی۔

② جب حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کو جنت سے زمین پر اُتارا تو اس دن میدانِ عرفات میں ان کی ملاقات ہوئی۔

③ بعض کے ہاں جمعہ کو جمعہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس دن میں زمین وآسمان کی تخلیق مکمل ہوئی۔

④ جمعہ کو جمعہ اسلئے کہتے ہیں کہ اس دن مختلف محلوں اور گاؤں کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر خدا عزوجل کی عبادت کرتے ہیں۔ اور اسلام سے قبل اس دن کا نام عروبہ تھا، اسلام نے اس کو تبدیل کر کے جمعہ نام رکھا ہے لیکن بعض محققین فرماتے ہیں کہ عروبہ بہت ہی پرانا نام ہے، اسلام سے قبل آنحضرت ﷺ کے دادھیال میں سے کعب بن لوئی نے اس کا نام جمعہ رکھا اور اس دن کی تعظیم شروع کی یوں تو جمعہ کا دن ہر مذہب وملت میں ممتاز تھا، لیکن اسلام نے اس کو حقیقی فضیلت وعظمت کے پیش نظر انتہائی معظم دن قرار دیا۔

نمازِ جمعہ کی مشروعیت کی وجہ:

نماز جمعہ کی مشروعیت کی عموماً دو وجہ بیان کی جاتی ہیں:

وجہ نمبر ۱: اللہ تعالیٰ کو تمام عبادات میں نماز بہت محبوب ہے اور جو نعمتیں اللہ تعالیٰ کی بندوں پر ہوتی ہیں ان کا شکر یہ بھی نماز سے زیادہ اور کسی چیز کے ساتھ ادا نہیں کیا جا سکتا تو ہر دن اللہ تعالیٰ کی نعمتیں انسان کی طرف متوجہ ہوتی ہیں تو ان کے شکر کے لئے دن رات میں پانچ نمازیں شروع کی گئیں کہ ان کو ادا کر کے بندہ ربّ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کر لے اور جمعہ والے دن چونکہ بندہ پر اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتیں نازل ہوتی ہیں اور اس دن میں انسانیت کی ابتداء ہوئی ہے لہٰذا اس دن خاص نعمتوں کے شکر کے لئے خاص نمازِ جمعہ شروع کی گئی ہے۔

وجہ نمبر ۲: مسلمان ایک دوسرے کیلئے ایک جسم کی مانند ہیں روزمرہ کے معاملات میں ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں اس لیے روزانہ پانچ نمازیں ایک محلہ والوں کو مسجد میں پڑھنے کا حکم دیا تاکہ ایک دوسرے کی دادرسی ہو سکے اور ایک دوسرے کی پریشانی وحالات معلوم ہوں، اور پھر جمعہ کا دن مقدر فرمایا کہ اس دن میں مختلف محلوں اور گاؤں کے لوگ جمع ہو کر ایک جگہ نماز پڑھیں تاکہ ایک دوسرے کے حالات معلوم ہوں اور اسی طرح روزانہ اتنا اجتماع ممکن نہیں تھا جمع کا دن مقرر فرمایا کہ اس فضیلت والے دن میں مسلمان جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔

جمعہ اور اہلِ کتاب:

اہل کتاب کو بھی اللہ تعالیٰ نے جمعہ کے دن کی تعظیم کا حکم دیا تھا لیکن انہوں نے اس میں اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سعادت سے محروم کر دیا اور یہودیوں نے ہفتہ کے دن کی تعظیم شروع کر دی یہ تاویل کرتے ہوئے کہ یہ دن عظمت والا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس دن میں تمام مخلوقات کو پیدا کرنے سے فارغ ہوئے ہیں اور اب بھی یہودی اس دن میں اپنے اپنے عبادت خانوں میں جا کر عبادت کرتے ہیں۔

اور عیسائیوں نے اتوار کا دن مقرر کر لیا یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی تخلیق شروع فرمائی اس لیے عیسائی لوگ اور عیسائی حکومتیں اتوار والے دن ہی چھٹی کرتے ہیں۔ اور دفاتر اور تعلیمی ادارے اور مراکز تجارت بند رکھتے ہیں اور اپنے گرجوں میں جا کر مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں افسوس صد افسوس کہ بعض مسلمان حکومتیں بھی عیسائیوں سے مرعوب ہو کر بجائے جمعہ کے اتوار کی چھٹی کرتی ہیں، اور آئی دن کی تعظیم بھی کی جاتی ہے۔

مشروعیت صلوٰۃ جمعہ:

نمازِ جمعہ ہجرت سے قبل مکہ مکرمہ میں ہی فرض ہوگئی تھی لیکن اسلام کا غلبہ نہ ہونے کی وجہ سے پڑھنا مشکل تھا اس لئے جب آنحضرت ﷺ مدینہ آئے تو فوراً ہی نماز جمعہ پڑھانا شروع کردی۔

اور آپ ﷺ کے مدینہ آنے سے قبل ہی حضرت اسعد بن زرارہؓ نے اپنے اجتہاد اور نورِ ایمان کی فراست سے نماز جمعہ پڑھانا شروع کردی تھی۔

حکم نمازِ جمعہ:

نماز جمعہ فرض عین ہے اس کا ثبوت کتاب اللہ اور احادیثِ متواترہ اور اجماع امت میں ہے لہٰذا اس کا منکر کافر ہے اور بلا عذر چھوڑنے والا فاسق ہے، چنانچہ خالق کائنات کا ارشاد ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (الجمعه : ۹) اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز کیلئے اذان کہی جائے تو تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت کو چھوڑ دو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

اس آیت میں ذکر اللہ سے مراد نماز جمعہ ہے اور خطبہ جمعہ ہے اور خرید و فروخت کو چھوڑو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دنیا کے تمام مشاغل کو چھوڑ دو ہر وہ کام جو کہ جمعہ کی تیاری میں رکاوٹ ہے وہ اس حکم میں داخل ہے اور ایسا کام اذانِ جمعہ کے بعد مکروہ تحریمی ہے اور اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم جمعہ کی نماز کیلئے انتہائی اہتمام کے ساتھ جاؤ۔

الفصل الاول:

امتِ محمدیہ کا منفرد اعزاز

۱۳۵۴: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بَيْدَ اَنَّهُمْ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا وَاُوْتِيْنَاهُ مِنْ بَعْدِهِمْ ثُمَّ هٰذَا يَوْمُهُمُ الَّذِیْ فُرِضَ عَلَيْهِمْ يَعْنِیْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَاخْتَلَفُوْا فِيْهِ فَهَدَانَا اللّٰهُ لَهٗ وَالنَّاسُ لَنَا فِيْهِ تَبَعٌ اَلْيَهُوْدُ غَدًا وَالنَّصَارٰى بَعْدَ غَدٍ۔

(متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣٥٤/٢۔ حديث رقم ٨٧٦۔ ومسلم ٥٨٥/٢ حديث رقم (١٩۔ ٨٥٥)۔ والنسائي في السنن ٨٥/٣ حديث رقم ١٣٦٧۔ وأحمد في المسند ٣٤١/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہم (دنیا میں) سب سے آخر میں آئے اور قیامت کے دن سب سے سبقت لے جانے والے ہیں، علاوہ ازیں اہل کتاب کو کتاب دی گئی ہم سے قبل اور ہمیں بعد میں دی گئی ہے پھر یہ دن اُن پر فرض کیا گیا یعنی جمعہ کا دن پس انہوں نے اس میں اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ

نے ہماری اس دن کی طرف راہنمائی فرمائی اور لوگ (یعنی یہود ونصاریٰ) ہمارے تابع ہیں، یہود نے کل (یعنی ہفتہ) اور نصاریٰ نے پرسوں (یعنی اتوار) کو اختیار کیا۔ (یہ بخاری ومسلم کی روایت ہے) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہونگے علاوہ ازیں پھر آخر تک یہی حدیث منقول ہے اور امام مسلم ہی کی ایک اور روایت میں حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت حذیفہؓ دونوں سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے حدیث کے آخر میں فرمایا: ہم اہل دنیا میں سے سب سے پیچھے ہیں اور سب سے پہلے ہونگے قیامت کے دن جن کے لئے (حساب وکتاب کے بعد) جنت کا فیصلہ کیا جائے گا تمام مخلوقات سے قبل۔

تشریح: "نحن" ای انا وامتی۔ (الآخرون) فی الدنیا وجودًا (السابقون) شهودًا (یوم القیامة) یا مراد ہے دنیا میں تمام انبیاء علیہم الصلاۃ والی امتوں سے آخر میں ہیں اور آخرت میں دخول جنت میں ان سے آگے ہوں گے۔

میرکؒ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہم تمام انبیاء کی امتوں سے بعثت کے اعتبار سے یا دنیا سے خروج کے اعتبار سے آخر میں ہیں۔ اور آخرت میں ان پر فضیلت کے اعتبار سے سابق ہیں۔

اس لئے کہ حضور ﷺ کی امت کو ساری امتوں سے پہلے اکٹھا کیا جائے گا اور یہ امت پل صراط سے سب سے پہلے گزرے گی۔ اور ان کا فیصلہ تمام مخلوقات سے پہلے کیا جائے گا۔ کما صرح به فی روایة اخریٰ۔

قوله۔ بید با کے فتحہ کے سکون کے ساتھ خیر کے معنی میں ہے۔ ای خیر۔

قوله انهم ای غیرنا من الیهود والنصاریٰ اور ان کے علاوہ انبیاء سابقین کے ادیان کے پیروکار ہیں۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں پھر یہ کلام "ولا عیب فیهم غیر ان سهو فهم" یعنی تاکید المدح بما یشبه الذم کی قبیل سے ہے۔ یعنی مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان کمالات کی بناء پر سابق میں جو ہم عطا کئے گئے ہیں۔ مگر وہ (یعنی امم سابقہ والے) کتاب ہم سے پہلے دیئے گئے ہیں اور ہمیں کتاب ان کے بعد عطا کی گئی ہماری کتاب قابل مدح اور با کمال صفات کی بناء پر مؤخر ہے۔ اس لئے کہ یہ ان کی کتابوں کیلئے ناسخ ہے۔ اور ان کی رسوائیوں کے بارے میں بتلانے والی ہے۔ پس وہ فضیلت کے اعتبار سے سابق ہے اگرچہ وجود کے اعتبار سے مسبوق ہے۔

مولوی رومیؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی کاریگری سے یہ عجیب بات ہے ان کو ہمارے لئے عبرت بنایا ہے اور ان کی رسوائیوں کو ہمارے لئے نصیحتیں بنایا ہے اور ان پر آنے والے عذاب کو ہمارے لئے سبق سیکھنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور معاملہ اس کے الٹ نہیں بنایا اور حالت کو دشوار نہیں بنایا اور ساتھ یہ بھی کہ ہم اخیر میں ہونے کی وجہ سے زیادہ انتظار سے بھی بچ گئے۔ پس باری تعالیٰ کا ہم پر فضل بڑا ہے اور وہ ہر شی پر قادر ہے۔ اور کیا ہی اچھا کارساز ہے اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔

قولہ (**ثم**) اس کے ذکر سے مقصود ہے بے شک اس سے پہلے والا کلام بعد میں آنے والے کلام کے لئے تمہید اور بنیاد ہے۔

(هذا) ای هذا الیوم وهو یوم الجمعة"

(قوله یومهم) یوم کی اضافت هم کی طرف ادنیٰ ملابست ومناسبت کی وجہ سے ہے۔

فانه(الذی فرض علیهم)اولاً، اس کی تخریج ان کی غور وخوض کے سپرد تھی۔اوراس کی تعیین ان کے اجتہاد کیلئے تھی۔

قولہ(یعنی یوم الجمعة) یہ مجمل یعنی هذا یوم مبہم کی تفسیر ہے۔راوی کی جانب سے۔

(فاختلفوا)ای اهل الکتاب۔

(فیه) ای فی تعینه للطاعة وقبوله للعبادة وضلوا عنه۔ واما نحتن بحمده

(فهدانا الله له) ای لهذا الیوم وقبوله والقیام لحصوقه۔

ہمارے ائمہ میں کچھ محققین کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر یہ لازم کیا کہ وہ کسی دن جمع ہوں اور اس میں اپنے خالق کی عبادت کے ساتھ تعظیم بجالائیں لیکن ان کیلئے بیان نہیں کیا بلکہ ان کو حکم دیا کہ اس کو اپنی فکروں کے ذریعے نکالیں اور اپنے اجتہاد سے متعین کریں۔اور ہر ایک گروہ پر لازم کیا کہ وہ روایت کریں اس کی جہاں تک یا جس طرف ان کے اجتہاد کا رجحان ہو درست ہو یا خطا جیسے کہ مسائل اختلافیہ میں ہوتا ہے۔پس یہود نے کہا ہفتے کا دن اس لئے کہ یہ فراغت اور کام کے مکمل ہونے کا دن ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس میں ارض وسماء کی تخلیق سے فارغ ہوئے۔

پس مناسب یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے کاموں سے الگ ہو جائیں اور اپنے مولیٰ کی عبادت کیلئے فارغ ہو جائیں نصاریٰ نے اس سے مراد اتوار کا دن ہے۔اس لئے کہ یہ پیدائش کی ابتداء کا دن ہے جو شکر اور عبادت کو واجب کرنے والا ہے۔پس اللہ نے مسلمانوں کو ہدایت دی۔ان کو درست بات تک پہنچنے کی توفیق دی یہاں تک کہ انہوں نے جمعہ متعین کیا اور کہنے لگے بے شک اللہ تعالیٰ نے انسان کو عبادت کیلئے پیدا کیا ہے۔جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے وما خلقت الجن والانس الاّ لیعبدون۔ انسان کی تخلیق جمعہ والے دن ہوئی۔پس اس میں عبادت اس کی فضیلت کی بناء پر اولیٰ ہوگی۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام دنوں میں ان چیزوں کو پیدا کیا جن کا نفع انسان کی طرف لوٹتا ہے۔اور جمعہ والے دن نفس انسان کو پیدا کیا اور وجود والی نعمت پر شکر زیادہ اہم اور زیادہ لائق ہے۔

اور بعض محققین کا قول ہے یہ بھی احتمال ہے بے شک باری تعالیٰ نے ہمارے لئے اس (یعنی یوم جمعہ) کو بیان کر دیا اور بے شک اسی نے ہمیں درست تک پہنچنے کی توفیق دی۔اس لئے کہ ابن سیرینؒ سے صحیح طور پر ثابت ہے فرماتے ہیں: اہل مدینہ حضور ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے قبل اور جمعہ کے بارے میں نازل ہونے سے اسے اکٹھے ہوئے۔انصار کہنے لگے بے شک یہود کیلئے ایک دن مقرر ہے جس میں وہ ہر ہفتے جمع ہوتے ہیں اور نصاریٰ کیلئے بھی ایسے ہی ہے۔پس ہم بھی ایک دن مقرر کر لیں جس میں ہم اللہ کا ذکر اور نماز پڑھیں اور شکر کریں۔انہوں نے یوم العروبہ مقرر کیا اور سعد بن زرارہؓ کے پاس اکٹھے ہو گے انہوں نے ان کو اس دن دو رکعتیں پڑھاتیں اور ان کو وعظ ونصیحت کی پھر انہوں نے اس کا نام یوم الجمعۃ رکھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد اتاری یہ آیت اذا نودی للصلاۃ من یوم الجمعۃ......

اور یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے اور جمہور کے نزدیک علی الاطلاق حجت ہے لیکن اس کے ساتھ اس کا شاہد حسن بھی موجود ہے بلکہ ابن خزیمہؒ نے اسے (شاہد حسن کو) صحیح قرار دیا ہے۔اور وہ یہ ہے کہ بے شک پہلے وہ شخص جنہوں نے ہمیں ہجرت سے پہلے جمعہ پڑھایا وہ سعد بن زراۃ ہیں۔اور ابن ابی الحاتم نے روایت کیا ہے۔سدیؒ سے اللہ تعالیٰ نے یہود پر جمعے والا دن فرض کیا۔

پس انہوں نے انکار کیا اور کہنے لگے یا موسیٰ ہمارے لئے ہفتے کا دن مقرر کریں پھر انہوں نے ان پر مقرر کیا اور یہ سب تائید کرتا ہے اس قول کی جو شارح نے فرمایا۔ ہم نے اجتہاد کیا پس ہم اس میں درست رائے تک پہنچے اور انہوں نے اجتہاد کیا اور خطاء کی۔ اور باقی ابن حجرؒ کا یہ قول کہ یہ درست تین ہے اور اس کا معنی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کی زبانی ہماری رہنمائی کی بایں طور ان کو ہمارے لئے اس دن کی تعیین کا والی بتایا اور ہمارے اجتہاد کی طرف سے سپرد نہیں کیا اس بات پر کہ اگر ہماری طرف اسے سپرد کرتے تو ہمیں درستگی کی توفیق مرحمت فرماتے۔ حضور ﷺ کی برکت سے۔ پس ابن حجرؒ کا یہ کلام نقلی صریح دلائل کے مخالف ہونے کے ساتھ سیاق کلام کو بھی ظاہر نہیں کرتا اس لئے کہ اس وقت اس امت کی کوئی فضیلت سابقہ امتوں پر ظاہر نہ ہوگی۔ کیونکہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات اس قضیے سے خارج ہیں۔ واللہ اعلم۔

شمنیؒ فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ مدینہ تشریف لائے تو پیر منگل بدھ اور جمعرات کے دن بنی عمرو بن عوف میں ٹھہرے اور ان کی مسجد کی بنیاد رکھی۔ پھر ان کے پاس سے نکلے پس پالیا ان کو جمعہ نے بنی سالم بن عوف میں۔ پس اس جمعہ کو آپ ﷺ نے بطن وادی والی مسجد میں ادا کیا۔

(فیہ) ای فی اختیار ھذا الیوم للعبادۃ۔

قولہ (تبع) بے شک وہ رہنمائی کئے گئے ان دنوں کے بارے میں جو جمعہ کے بعد جمعہ کے پیچھے آنے والے ہیں اس لئے کہ جب یوم الجمعہ انسان کی پیدائش کی ابتداء ہے اور پیدائش کے ایام میں پہلا دن ہے تو عادۃً اس میں عبادت قابل اتباع ہے اور اس کے بعد آنے والے دو دنوں میں عبادت تابع ہے۔ اسی طرح ہمارے کچھ ائمہ نے تحقیق کی ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یوں کہا جائے بے شک تینوں دن لگا تار ہفتے کے اعتبار سے قطع نظر کرتے ہوئے اس میں شک نہیں کہ جمعے والا دن انہیں وجود کے اعتبار سے بھی مقدم ہے۔ چہ جائیکہ رتبہ کے اعتبار سے (رتبہ کے اعتبار سے تو وہ بہر حال مقدم ہے) اس بات کا بیان حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ (**الیھود غدًا والنصارٰی بعد غدٍ**" یعنی مطلب یہ ہے کہ ہم نے جمعہ کے دن کا چناؤ کیا اور یہود نے اس کے بعد والے دن کا اور نصاریٰ نے یہود کے دن کے بعد والے دن کا انتخاب کیا اور اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ سبقت معنوی بھی ہمارے لئے ہے یعنی مراد یہ ہے کہ بے شک وہ تقدم خارجی کے باوجود ہم سے تأخر کو اختیار کر چکے ہیں۔ اور اپنے اوپر تقدم ہمارے لئے چھوڑ چکے ہیں۔ (**لئلا یعلم اھل الکتاب الا یقدرون علی شیءٍ من فضل اللہ وان الفضل بید اللہ یؤتیہ من یشآء واللہ ذوالفضل العظیم** اور ظاہر ہوا۔ میرے لئے ایک باریک قسم کا نکتہ اور عمدہ قسم کی حکمت وہ یہ کہ لا کی زیادتی باری تعالیٰ کے قول لئلا میں اس لئے ہے تا کہ ان کی طرف علم کی نسبت بالکل نہ کی جائے اور یہ الہام نبی ﷺ کی برکت سے سید الایام یوم الجمعہ میں لکھتے ہوئے میرے اہتمام پر پہنچنے کی حالت میں ہوا۔

اور باقی ابن حجرؒ کا قول ہے کہ حضور ﷺ کے ارشاد **والناس متبع** سے معلوم ہوا ہے بے شک جمعے والا دن اگر چہ وجود میں مؤخر ہے اور ہمیں ان کے بعد عطاء کیا گیا لیکن فضل و کمال میں مقدم ہے۔ یہ قول درست نہیں ہے کیونکہ یہ باعتبار وجود کے بھی ان دونوں سے مؤخر نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں میں واسطہ عقد (یعنی ملانے والا واسطہ ہے) ہے کیونکہ جمعہ اتوار سے مؤخر ہے۔

اور ہفتے سے مقدم ہے۔ کما فیھم من قضیۃ رد علیھم۔ گویا کہ انہوں نے وہم کیا ہے۔ اور جمعہ کو ان دونوں دنوں سے مؤخر سمجھا ہے۔ ہفتوں کے دور میں آجکل کے تعارف کا اعتبار کرتے ہوئے اور زمان سابق میں جو وجود اصلی کی ترتیب تھی اس سے غافل رہے۔ (یعنی ہفتے کی ابتدا ہفتے کے دن سے معتبر سمجھی جاتی ہے حالانکہ جمعہ حقیقتاً ہفتے کا پہلا دن ہے۔ واللّٰہ المستعان۔

قولہ وفی روایۃ لمسلم قال(نحن الاخرون)ای خلقۃ (الاوّلون) حاۃ ورتبۃً۔

یوم القیامۃ : اور اعتبار اس دن اور اس میں ٹھہرنے کی جگہوں کا ہے۔

ونحن اول من یدخل الجنۃ : یعنی مطلب یہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ تمام انبیاء سے پہلے تھے اور ان کی امت بھی ساری امتوں سے پہلے تھی۔ سبقت معنوی کے اعتبار سے نہ کہ وجود حسی کے اعتبار سے۔ اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بے شک جب صحابہ کرام کی ایک جماعت حضور ﷺ کے دروازے پر جمع ہونے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ ان میں حضرت عباس اور ابوسفیان و بلال رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ کچھ اور حضرات تھے حضور ﷺ کو خادم نے ان حضرات کے آنے کے بارے میں بتایا۔

حضرت بلالؓ کو داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ پس ابوسفیانؓ کے دل میں کچھ غیرت سی آئی اور حضرت عباسؓ سے کہنے لگے کیا آپ دیکھتے نہیں ہم عرب کے سرداروں کی جماعتوں پر ہمارے غلام کو مقدم کرتے ہیں عباسؓ نے کہا گناہ ہمارا ہے ہم نے دخول اسلام میں تاخیر کی اور حضرت بلالؓ مخالفت و دشمنی کے باوجود احکام کو قبول کرنے کیلئے آگے بڑھے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

والسابقون السابقون اولئك المقربون فی جنات النعیم۔ وقال عز من قائل والسابقون الاولون من المهاجرین والانصار الآیۃ۔

نحوہ : یعنی متفق علیہ روایت کے ہم معنی نقل کیا ہے۔

الی اخرہ یعنی۔ یعنی اختلاف دونوں روایتوں کے ابتدائی حصے سابقون کی جگہ الاولون کو رکھنے میں ہے۔

اور ایک روایت میں روایت بالمعنی ہے اور زیادتی ہے۔ ونحن اول من یدخل ...... مسلم والی روایت میں ہے۔

۱۳۵۵: وَفِیْ رِوَایَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَنَحْنُ اَوَّلُ مَنْ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ بَیْدَاَنَّهُمْ وَذَکَرَ نَحْوَهٗ اِلٰی اٰخِرِهٖ وَفِیْ اُخْرٰی لَهٗ عَنْهُ وَعَنْ حُذَیْفَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ اٰخِرِ الْحَدِیْثِ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ مِنْ اَهْلِ الدُّنْیَا وَالْاَوَّلُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ الْمَقْضِیُّ لَهُمْ قَبْلَ الْخَلَائِقِ۔

ترجمہ: اور مسلم کی ہی ایک روایت میں سیدنا ابو ہریرہؓ اور حذیفہؓ سے منقول ہے دونوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث کے آخر میں فرمایا کہ دنیا والوں میں ہم سب سے پیچھے ہیں اور قیامت کے دن ہم سب سے آگے ہوں گے کہ تمام مخلوقات سے پہلے ہمارے لئے (جنت میں داخل ہونے کا) فیصلہ کیا جائے گا''۔

تشریح: (وفی اخری له عنه) ای وفی روایة اخری لمسلم عن ابی ہریرةؓ

(وعن حذیفةؓ) اس کا عطف ہے عنہ پر ای عنهما جمیعًا (دونوں سے مروی ہے)۔

(قالا قال رسول اللهﷺ فی آخر الحدیث نحن الاخرون) ۔(الاخرة فی السبق لهم) طیبیؒ فرماتے ہیں الاخرون میں الف لام موصولہ ہے اور من اهل الدنیا صلہ میں جو ضمیر ہے اس سے حال واقع ہورہا ہے۔اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ ماقبل اس کیلئے خبر ہے اور پھر مبتداء خبر مل کر جملہ خبر ہے ضمیر (یعنی نحن) کیلئے۔یا یہ صفت ہے اور موصوف محذوف ہے تقدیر عبارت نحن الناس الاخرون الموجو دون من اهل الدنیا ہے۔

(المقضی لهم قبل الخلائق) طیبیؒ فرماتے ہیں (یہ جملہ) الاخرون کی صفت ہے۔ای الذین یقضی لهم قبل الناس لید خلوا الجنة اوّلاً۔گویا کہ کہا جارہا ہے الآخرون السابقون۔(یعنی دنیا میں مؤخر اور قیامت میں دخول جنت میں مقدم)۔اور اس میں قیامت کے دن ٹھہرنے کی جگہوں میں سے ہر جگہ اور فیصلے کے مرتبوں میں سے ہر مرتبہ میں ان کے تقدم رتبہ کی طرف اشارہ ہے۔اور حضور ﷺ کے قول لهم میں ان کے کمال اہتمام اور عظمت کی طرف اشارہ ہے۔اور اشارہ ہے ان کے رفعت شان اور بلندی مکان کی طرف گویا کہ تمام مخلوقات ان کے تابع ہیں بلکہ انہی کیلئے پیدا کئے گئے ہیں۔اللہ تعالیٰ ہمارا ان کے ساتھ حشر کرے۔

تمام دنوں میں بہترین جمعہ کا دن ہے

۱۳۵۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ فِيْهِ خُلِقَ آدَمُ وَفِيْهِ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ وَفِيْهِ اُخْرِجَ مِنْهَا وَلَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا فِیْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۲/۵۸۵ حدیث رقم (۱۸۔ ۸۵۴)۔ والترمذی فی السنن ۲/۳۵۹ حدیث رقم ۴۸۸۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان دنوں میں سے جن میں آفتاب طلوع ہوتا ہے سب سے بہتر دن جمعہ کا ہے اس میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے اور اسی دن میں ان کو جنت میں داخل کیا گیا اور اسی دن میں انہیں جنت سے نکالا گیا (یعنی زمین پر اتارا گیا) اور اسی دن میں قیامت قائم ہوگی۔ (مسلم)

تشریح: قوله : خیر یوم طلعت علیه ای علی ما سکن فیه قال تعالٰی وله ما سکن فی اللیل والنهار ذکره الطیبی۔

ابن حجرؒ کا قول ہے کہ یہ بہترین دن ہے جو سورج کے ظاہر ہونے کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اس لئے کہ یوم لغت کے اندر طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک ہوتا ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ یوم سے مراد اہتمام پر نہار شرعی ہے۔اس لئے کہ یہی شارع کی زبان پر اصل ہے اور جیسے آئندہ چل کر حضور ﷺ کے ارشاد میں آئے گا۔ان ساعتها بعد الفجر قبل طلوع الشمس پھر ابن حجرؒ نے فرمایا یہ شارح کے قول سے بہتر ہے پھر اس کی توجیہ بیان کی ہے جس کے ذکر کرنے میں کچھ فائدہ نہیں۔

اور میرے نزدیک زیادہ ظاہر یہ ہے کہ علی ظرفیت کیلئے ہے جیسے باری تعالیٰ کے کلام کے اندر ہے۔ ودخل المدينة على حين غفلة جیسا کہ اس کی تصریح صاحب قاموس نے کی ہے۔ اور معنی نے بھی ان کی پیروی کی ہے اور اس کی تائید وہ نسخہ بھی کرتا ہے جس میں طلعت فیہ ہے۔ (الشمس يوم الجمعة فيه خلق آدم) جو تمام اجناس عالم سے افضل تھے اور بعض حفاظ نے حوآء لفظ بھی بڑھایا ہے۔ (وفيه ادخل الجنة) اولاً لفضل السالق (وفيه اخرج منها)۔ تاکہ بعد میں آنے والے اس کے ساتھ مل جائیں اور ان کی اولاد میں سے باطل پرست اور حق پرست کے احوال ظاہر ہو جائیں اور بعض محدثین کا قول ہے کہ اخراج زمین میں خلافت کے قائم کرنے کیلئے ہوا اور ان پر اور ان کی اولاد پر عظیم کتابیں نازل کرتا۔ یہ ساری باتیں اس دن کی فضیلت پر دال بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

پس خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ ان کا اخراج تذلیل وتحقیر کی وجہ سے نہ تھا بلکہ منصب خلافت پر فائز کرنے کیلئے تھا۔ پس یہ (یعنی اخراج) کامل کرنے کیلئے تھا نہ کہ رسوا کرنے کیلئے اور یہ بھی ممکن ہے یوں کہا جائے۔ بے شک جب ان سے جدا ہوا اس دن میں جو عظمت کے ساتھ متصف ہے تو مستحق اخراج ہو گئے بلند مرتبے سے اس میں تنبیہ ہے اور اپنے نبی کیلئے اشارہ ہے اس دن کی تعظیم کی طرف برائی سے رک کر اور نیکی کے حصول پر مداومت اختیار کر کے پھر احتمال یہ ہے کہ ان کی پیدائش اور دخول جنت ایک دن میں ہوا اور یہ احتمال بھی ہے ایک جمعے والے دن ان کو پیدا کیا۔ اور پھر ان کو چھوڑ دیا دوسرے جمعے تک۔ پھر اس میں جنت کے اندر داخل کیا اور یہی احتمال ہے اخراج والے دن میں۔ بعض شارحین کا قول ہے جب خروج۔ (من الجنة) نسل انسانی کو زیادہ کرنے کیلئے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو زمینوں میں پھیلانے کیلئے اور اس نماز کے اظہار کیلئے تھا جس کے لئے مخلوق کو پیدا کیا تھا اور نہیں قائم کیا گیا آسمانوں اور زمینوں کو مگر اس نماز کیلئے۔ اور ان چیزوں تک رسائی ممکن نہ تھی مگر حضرت آدم علیہ السلام کے اس سے نکلنے کے ساتھ۔

تو پس زیادہ لائق ہوا فضیلت کا (جمعے والا دن) بوجہ جاری ہونے خروج کے اس میں اور قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ یہ مذکورہ قضایا اس کی فضیلت کو بیان کرنے کیلئے نہیں ہیں۔ اس لئے حضرت آدم علیہ السلام کا اخراج اور قیامت کا قائم ہونا یہ فضیلت شمار نہیں ہوتے تو یہ ان بڑے امور کا ذکر ہے جو اس دن واقع ہو چکے یا عنقریب واقع ہوں گے تاکہ بندے اس میں نیک اعمال اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو پانے کیلئے اور اس کے عذاب سے بچنے کیلئے۔

اور کوئی تضاد نہیں ہے ان کے قول اور بعد میں آنے والے قول کے اندر اسلئے کہ انہوں نے (یعنی عیاضا) کلام کی بنیاد ظاہر پر رکھی ہے اور شارح نے تاویل ظاہر کے خلاف کی ہے۔

ابن حجرؒ کا قول کہ عیاضؒ کا کلام شارح کے کلام کے مقابلے میں مردود ہے۔ ساتھ یہ بھی ہے کہ ان کا اپنا کلام اس کے (یعنی عیاضؒ) خلاف دلیل نہیں ہے پھر کہا (ابن حجرؒ نے) اور اس کے مردود ہونے پر صراحت کر رہا ہے وہ مضمون جو حدیث کے اندر ہے بے شک حضور ﷺ نے اس اخراج اور قیامت کے قائم ہونے کو اچھی وخیر والی چیزوں میں بتایا ہے۔ اور اس میں یہ بات ہے کہ بے شک عیاضؒ نے اس کو بری چیزوں میں سے شمار نہیں کیا اور نہ ہی اس کے اچھی چیزوں میں سے ہونے کا انکار کیا ہے۔ انہوں نے تو اسے بقیہ نعمتوں کے ساتھ فضیلت سے شمار کرنے کی نفی کی ہے۔ واللہ اعلم۔

(ولا تقوم الساعة) ای القیامۃ اور یہ دوسرے صور کے بعد ہوگی۔

(الّا فی یوم الجمعة) وهو المجمع الاعظم والموقف الافخم والمظهر لمن هو بين الخلائق افضل واكرم والله اعلم"۔

قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں اس کو شمار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ باکمال لوگوں کو ان ہمیشہ رہنے والی نعمتوں تک پہنچاتا ہے جو ان کے لئے تیار کی گئی ہیں۔ میں کہتا ہوں جب اپنے دشمنوں کو جہنم اور آگ میں دیکھیں گے۔ طیبیؒ فرماتے ہیں سب سے افضل دن کے بارے میں ایک قول یہ ہے یوم عرفہ ہے اور ایک قول یہ ہے کہ جمعہ ہے لیکن یہ اس وقت ہے جب کلام مطلق ہو۔ اور جب کہا جائے کہ سال کے دنوں میں افضل دن کونسا ہے تو وہ عرفہ ہے اور ہفتے کے دنوں میں سے افضل دن پوچھا جائے تو وہ جمعہ ہے۔ طیبیؒ کا کلام مکمل ہوا اور جب عرفہ والے دن جمعہ ہو تو یہ مطلقاً تمام دنوں سے افضل ہوگا اور اس میں عمل زیادہ افضل اور زیادہ نیکی والا ہوگا۔ اور اسی سے حج اکبر ہے۔ اور ابن مسیبؒ کا قول ہے جمعہ نفلی حج سے اللہ کے نزدیک محبوب ہے اور جامع صغیر کے اندر ہے حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعًا۔ الجمعۃ حج المساکین اور ایک روایت میں حج الفقراء کے الفاظ ہیں

جمعہ کے دن قبولیت کی گھڑی

۱۳۵۷: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ فِي الْجُمُعَةِ لَسَاعَةً لَا يُوَافِقُهَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ يَسْئَالُ اللّٰهَ فِيْهَا خَيْرًا اِلَّا اَعْطَاهُ اِيَّاهُ متفق عليه وَزَادَ مُسْلِمٌ قَالَ وَهِيَ سَاعَةٌ خَفِيْفَةٌ وَفِي رواية لَهُمَا قَالَ اِنَّ فِي الْجُمُعَةِ لَسَاعَةً لَايُوَافِقُهَا مُسْلِمٌ قَائِمٌ يُصَلِّيْ يَسْئَالُ اللّٰهَ خَيْرًا اِلَّا اَعْطَاهُ اِيَّاهُ۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۴۱۵۔ حدیث رقم ۹۳۵۔ ومسلم فی صحیحه ۲/۵۸۴ حدیث رقم (۱۵۔ ۸۵۲)۔ والترمذی فی السنن ۲/۳۶۲ حدیث رقم ۴۹۱۔ والنسائی ۳/۱۱۵۔ ۱۴۳۱۔ وابن ماجه ۱/۳۶۰ حدیث رقم ۱۱۳۷۔ والدارمی ۱/۴۴۳ حدیث رقم ۱۵۶۹۔ ومالك فی الموطأ ۱/۱۰۸ حدیث رقم۵ من كتاب الجمعة ۔ وأحمد فی المسند ۵/۴۵۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آقا مدنی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک جمعہ میں البتہ ایک گھڑی ایسی ہے کہ نہیں موافقت کرتا اس کی کوئی مسلمان بندہ کہ سوال کرے اس میں اللہ تعالیٰ سے مگر اللہ تعالیٰ وہ بھلائی اس کو عطا کر دیتے ہیں۔ (بخاری، مسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ زائد نقل کیے گئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ گھڑی بہت مختصر ہے، اور بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ والے دن میں ایک ایسی گھڑی ہے کہ اگر کوئی مؤمن بندہ اس کو پائے اور اس میں کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کے سامنے نماز پڑھے اور خدا سے خیر مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کو بھلائی اور خیر ضرور عطا فرماتے ہیں۔

تشریح: ان فی الجمعة لساعة ای شريفة عظمية اور اس گھڑی کے پوشیدہ رکھنے میں حکمت یہ ہے کہ لوگ اس دن کے سارے اجزاء میں عبادت کے اندر مشغول رہیں اس امید میں کہ ان کی عبادت و دعا اس گھڑی میں ہو جائے۔

(لا یوافقها) ای لا یصادقها

(مسلم)وفی نسخة صحيحةٍ عبد مسلم۔

(یسأل اللّٰه فیها) ای بلسان الحال او بلسان القال

(خیرًا) یعنی ایسی بھلائی جس میں سوال مناسب ہو۔

(الا اعطاه)ای ذلك المسلم۔

(ایاه)ای ذلك الخير۔یعنی یا تو اسے جلدی عطا کردیتے ہیں یا اس کے لئے مؤخر کردیتے ہیں۔ذخیرہ کردیتے ہیں جیسے کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔

(وزاد مسلم، قال) ای النبی ﷺ

(وهی ساعة خفيفة)اور ظاہر ہے بے شک حضور ﷺ کا قول خفیفۃ اور حدیث میں ہاتھ سے اشارہ کرنا قلت کی طرف یہ بیان ہے اس بات کا کہ یہ گھڑی لیلۃ القدر کی طرح ممتد نہیں ہے۔پس اس حدیث کے منافی نہیں ہے جو ابن حبانؒ اور حاکمؒ کے نزدیک صحیح ہے۔جس میں ہے یوم الجمعه اثنا عشر ساعة فیها ساعة لا یوافقها عبد مسلم یسأل اللّٰه شیئا الا أعطاه ایاه اور ابن حجرؒ اس مقام پر ایک لمبی بحث کر چکے ہیں۔جس میں تعارض وتناقض کی وجہ سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔فتأمل۔

(وفی روایة لهما) ای بخاری ومسلم

(قال:ان فی الجمعة لساعة)جزریؒ فرماتے ہیں وہ گھڑی قبولیت کے اوقات میں سے سب سے پر امید ہے۔

(لا یوافقها مسلم قائم)ای ملازم مواظبت علی حدّ قوله مادمت علیه قائمًا۔ وفی روایة بخاری وهو قائم۔محدثین نے ظاہر پر بناء کرتے ہوئے اسے (یعنی قائم کو) غالب واکثر کے مطابق قرار دیا ہے۔اس کا مفہوم مخالف نہیں ہے۔یا اس لئے قائم کو ذکر کیا۔اس لئے کہ تاکہ مناسب ہو حضور ﷺ کے قول یصلی کے عموم روایات میں موافقت ہو جائے۔

"یسأل اللّٰه خیرًا" ابن حجرؒ فرماتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ بے شک مراد اس خیر سے وہ ہے جو مباح کو شامل ہے۔اور اس میں یہ بات ہے کہ مباح خیر اور شر کے ساتھ موصوف نہیں ہوتا زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ خیر عطا کر رہے ہیں تو مباح کہنے سے بھی مانع نہ ہوگی۔

"الا اعطاه ایاه" طیبیؒ فرماتے ہیں۔قائم یصلی سب کے سب مسلم کی صفات میں اور جائز ہے کہ یصلی حال ہو قائم سے متصف ہونے کی وجہ سے اور یسأل یا تو حال مترادفہ ہے یا حال متداخلہ۔زاد النووی۔ اذ معنی یصلی یدعو۔

جمعہ میں فضیلت والی ساعت کا تعین

۱۳۵۸ وَعَنْ اَبِیْ بُرْدَةَ بْنِ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ سَمِعْتُ اَبِیْ یَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ شَأْنِ سَاعَةِ الْجُمُعَةِ مَابَیْنَ اَنْ یَجْلِسَ الْاِمَامُ اِلٰی اَنْ تُقْضَی الصَّلَاةُ۔(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٢/٥٨٤ حديث رقم أخرجه أبو داوٗد في السنن ١/٦٣٥ حديث رقم ١٠٤٨۔

ترجمہ: حضرت ابو بردہ بن ابی موسیٰؒ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جمعہ کی اس گھڑی کے بارے میں کہ وہ امام کے منبر پر بیٹھنے سے نماز پڑھے جانے تک کے درمیان کا عرصہ ہے (یعنی جب امام خطبہ کیلئے بیٹھ جائے، اس سے لے کر نماز ختم ہونے تک وہ ساعت ہے)۔(مسلم)

راویٔ حدیث:

ابو بردۃ۔ یہ ابو بردہ عامر ہیں، عبداللہ بن قیس کے بیٹے ہیں۔ابو موسیٰ اشعری کا نام عبداللہ بن قیس ہے۔''ابو بردہ'' ایک مشہور کثیر الروایت تابعی ہیں اپنے والد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہما سے روایت کرتے تھے۔اور قاضی شریح کے بعد ان کی جگہ عہدہ قضاء پر کوفہ میں مقرر کئے گئے تھے۔ان کو حجاج ابن یوسف نے معزول کر دیا تھا۔

تشریح: ''**هي ما بين ان يجلس الامام اي بين الخطبتين**'' اور یہ بھی احتمال ہے کہ امام کے منبر پر چڑھنے کے بعد والا بیٹھنا مراد ہو۔

(**الى ان تقضى**) مؤنث اور مذکر کے صیغے کے ساتھ۔

(**الصلاة**) **اي يفرغ منها**۔طیبیؒ فرماتے ہیں ظاہر یہ ہے یوں کہا جائے۔خطیب کے بیٹھنے اور اس نماز کے پورا ہونے کے درمیان کا وقت۔مگر یہ کہ بے شک حدیث میں الا ہے جو واضح کر رہا ہے۔اس بات کو کہ ابتداء کا سارا زمانہ جلوس سے لے کر خاص اسی نماز کے مکمل ہونے تک ہے۔اور اسی کی مثال ہے۔اللہ تعالیٰ کے قول (**من بيننا وبينك حجاب**'' میں جو حجاب کے احتساب پر دلالت کر رہا ہے درمیانی مدت کیلئے اگر یہ من نہ ہوتا تو یہ معنی سمجھ نہ آتا۔

رواه مسلم، وكذا ابوداؤد ذكره في الحصن ثم قالي ومن حين تقام الصلاة الى اسلام منها رواه الترمذي وابن ماجة عن عمرو بن عوف المزني۔

شیخینؒ اور امام نسائیؒ اور ابن ماجہ سب نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے بے شک حضور ﷺ نے جمعے والے دن کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا اس میں ایک گھڑی ہے نہیں موافقت کرتا۔اس کی کوئی مسلمان بندہ مگر وہ کھڑا نماز پڑھ رہا ہو اللہ سے سوال کرتا ہے کسی چیز کا مگر اللہ اسے مرحمت فرما دیتے ہیں۔اور اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اس گھڑی کی قلت بتاتے ہوئے اور ایک قول یہ ہے کہ فجر کے طلوع کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے تھے۔اور ایک قول یہ ہے کہ یہ گھڑی طلوع آفتاب کے بعد ہے۔حضرت ابو ذر غفاریؓ اس بات کی طرف گئے ہیں یہ گھڑی تقریباً ایک ہاتھ سورج ڈھل جانے کے بعد ہے۔**رواه ابن المنذر وابن عبدالبر باسناد قوي عنه قاله ميرك۔**

جزریؒ فرماتے ہیں جس بات کا میں اعتقاد کرتا ہوں بے شک وہ گھڑی امام کے جمعے میں سورۃ فاتحہ کی قراءۃ شروع کرنے سے آمین کہنے تک ہے۔نبی کریم ﷺ سے صحیح طور سے ثابت روایات میں جمع کرتے ہوئے۔امام نوویؒ فرماتے ہیں صحیح بلکہ صواب وہ روایت ہے جو ابی موسیٰؓ سے مسلمؒ میں ثابت ہے یعنی جس کا ذکر ابھی گزرا ہے۔اور اسی قول کی تائید کرتا ہے وہ قول جو

بیہقیؒ نے مسلم سے نقل کیا ہے بے شک یہ روایت قبولیت کی گھڑی کے بارے میں صحیح ترین اور عمدہ ترین روایت ہے۔

میرکؒ فرماتے ہیں ان اقوال سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ گھڑی بعینہٖ اس سارے وقت کو گھیرتی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ انہی اوقات کے درمیان ہوتی ہے جیسے کہ بخاری کی روایت کے آخر میں ہے **و اشار بیده یقللها** اور مسلم کی روایت میں ہے۔ **ساعة خفیفة**۔

اور مخفی نہیں ہے نوویؒ اور جزریؒ دونوں کے مختار قول اس گھڑی کی تعیین کا فائدہ نہیں دیتے خطبے کے اوقات مختلف ہونے اور مسلمانوں کی مساجد میں نماز جمعہ کے زمانے مختلف ہونے کی وجہ سے۔ اور بے شک جو ان دونوں (نوویؒ و جزریؒ) نے کہا ہے وہ ساعت اجابت کے احوال میں سے ہے۔ اس کے اوقات میں سے نہیں ہے مگر یوں کہا جائے بے شک یہ گھڑی۔ اس حالت کے ساتھ گھومتی ہے یا حضور ﷺ کے خطبے کا وقت ضبط شدہ ہوگا جیسے اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حضرت ابو ذرؓ کا قول لیکن عنقریب آئے گا۔ کہ حضور ﷺ سردیوں میں جلدی کرتے تھے دور گرمیوں میں تاخیر کرتے تھے۔ واللہ اعلم۔

اور شافعیہ میں سے کچھ متاخرین کو میں نے دیکھا کہ انہوں نے نوویؒ کی تصویب پر اعتراض کیا اور کہا باقی عصر سے غروب تک والا قول ضعیف ہے اور حدیث جس میں یہ ہے نماز کھڑی ہونے سے لے کر نماز مکمل ہونے تک یہ بھی ضعیف ہے۔ اگرچہ امام ترمذیؒ نے اسے حسن کہا ہے اور باقی جو حدیث میں صحیح طور سے ثابت ہے اس گھڑی کی تلاش کے بارے میں دن کی آخری گھڑی عصر کے بعد۔ پاس احتمال ہے یہ گھڑی منتقل ہوتی رہتی ہے ایک دن ایک وقت میں ہوتی ہے اور دوسرے دن دوسرے وقت میں۔ جیسا کہ مختار قول ہے لیلۃ القدر کے بارے میں اور اسی قول یعنی اس گھڑی کے منتقل ہونے کے بارے میں اس کی تائید کرتا ہے امام غزالیؒ کا وہ قول جو احیاء میں ہے بے شک یہ گھڑی احادیث میں مذکورہ اوقات میں گھومتی ہے اور اس قول پر سارے اقوال کا اجتماع ہو جاتا ہے پس ایک جمعہ والے دن وہ گھڑی امام کے بیٹھنے (منبر پر) اور نماز سے فراغت کے درمیان ہوتی ہے۔ اور ایک دن نماز کھڑی ہونے سے لے کر سلام تک اور ایک دن عصر سے غروب آفتاب تک ہوتی ہے۔ اور ایک دن جمعے کے دن کی آخری گھڑی میں ہوتی ہے۔

لیکن عسقلانیؒ فرماتے ہیں جلوس الامام اور سلام کے درمیان والے قول کے علاوہ **آخر الساعة من یومها و لاقول** یا تو اسناد کے اعتبار سے ضعیف ہے یا موقوف ہے۔ اس کے قائل نے اس کی نسبت اجتہاد کی طرف کی ہے۔ توقیف کی طرف نہیں۔ اور اس گھڑی کو یقینی طور پر حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے ایک جماعت جمعے والے دن کو تقسیم کر لیں ان میں سے ہر ایک اپنا حصہ لے لے اور اس میں اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کیلئے دعا کرے۔ یا لازم کر لیں اپنے دل پر دعا کا استحضار جمعہ کی فجر سے غروب آفتاب تک۔ اور امام بلقینیؒ سے سوال کیا گیا خطبہ کی حالت میں کیسے دعا کرے گا حالانکہ وہ خاموش رہنے کا مأمور ہے۔ پس جواب دیا۔ تلفظ بالدعاء دعا میں ضروری نہیں دل سے متوجہ ہونا کافی ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں مجھے یہ بات پہنچی ہے جمعے والی رات میں بھی دعا قبول ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

الفصل الثّانی:

قبولیت والی ساعت ہر جمعے میں ہوتی ہے

۱۳۵۹: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ خَرَجْتُ اِلَی الطُّوْرِ فَلَقِیْتُ كَعْبَ الْاَحْبَارِ فَجَلَسْتُ مَعَهٗ فَحَدَّثَنِیْ عَنِ التَّوْرَاةِ وَحَدَّثْتُهٗ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَكَانَ فِیْمَا حَدَّثْتُهٗ اَنْ قُلْتُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَیْرُیَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَیْهِ الشَّمْسُ یَوْمُ الْجُمُعَةِ فِیْهِ خُلِقَ آدَمُ وَفِیْهِ اُهْبِطَ وَفِیْهِ تِیْبَ عَلَیْهِ وَفِیْهِ مَاتَ وَفِیْهِ تَقُوْمُ السَّاعَةُ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا وَهِیَ مُصِیْخَةٌ یَوْمَ الْجُمُعَةِ مِنْ حِیْنَ تُصْبِحُ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ شَفَقًا مِنَ السَّاعَةِ اِلَّا الْجِنَّ وَالْاِنْسَ وَفِیْهِ سَاعَةٌ لَایُصَادِفُهَاعَبْدٌ مُسْلِمٌ وَهُوَ یُصَلِّیْ یَسْاَلُ اللّٰهَ شَیْئًا اِلَّااَعْطَاهُ اِیَّاهُ قَالَ كَعْبٌ ذَالِكَ فِیْ كُلِّ سَنَةٍ یَوْمٌ فَقُلْتُ بَلْ فِیْ كُلِّ جُمُعَةٍ فَقَرَاَكَعْبُ التَّوْرَاةَ فَقَالَ صَدَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ لَقِیْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ سَلَامٍ فَحَدَّثْتُهٗ بِمَجْلِسِیْ مَعَ كَعْبِ الْاَحْبَارِوَمَاحَدَّثْتُهٗ فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ فَقُلْتُ لَهٗ قَالَ كَعْبٌ ذَالِكَ فِیْ كُلِّ سَنَةٍ یَوْمٌ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ كَذَبَ كَعْبٌ فَقُلْتُ لَهٗ ثُمَّ قَرَاَكَعْبٌ التَّوْرَاةَ فَقَالَ بَلْ هِیَ فِیْ كُلِّ جُمُعَةٍ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ صَدَقَ كَعْبٌ ثُمَّ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ قَدْ عَلِمْتُ اَیَّةَ سَاعَةٍ هِیَ قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ فَقُلْتُ اَخْبِرْنِیْ بِهَاوَلَا تَضِنَّ عَلَیَّ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ هِیَ اٰخِرُ سَاعَةٍ فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ فَقُلْتُ وَكَیْفَ تَكُوْنُ اٰخِرَسَاعَةٍ فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یُصَادِفُهَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ وَهُوَ یُصَلِّیْ فِیْهَا فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ اَلَمْ یَقُلْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ جَلَسَ مَجْلِسًا یَنْتَظِرُ الصَّلٰوةَ فَهُوَ فِیْ صَلَاةٍ حَتّٰی یُصَلِّیَ قَالَ اَبُوْ هُرَیْرَةَ فَقُلْتُ بَلٰی قَالَ فَهُوَ ذٰلِكَ۔

(رواه مالك وابو داؤد والترمذی والنسائی وروٰی احمدالٰی قَوْلِهٖ صَدَقَ كَعْبٌ)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۶۳۴ حدیث رقم ۱۰۴۶۔ والترمذی ۲/۳۶۲ حدیث رقم ۴۹۱۔ والنسائی ۳/۱۱۳ حدیث رقم ۱۴۳۰۔ ومالك فی الموطأ ۱/۱۰۸ حدیث رقم ۱۶من كتاب الجمعة۔ (۱بلفظ الخیل التی تركب یضاف إلی بقیع الخیل فی سوق المدینة عنددار زید بن ثابت والخیل خیل ذكر فی المغاری [المعالم الأثیرة]۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں ایک دن کوہ طور کی طرف گیا، میں وہاں کعب احبار سے ملا، اور میں ان کے پاس بیٹھ گیا تو انہوں نے میرے سامنے تورات کی کچھ باتیں بیان کیں اور میں نے ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی کچھ احادیث بیان کیں۔ من جملہ جو احادیث میں نے ان کے سامنے بیان کیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ میں

نے کہا، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ان تمام ایام میں سے جن میں سورج طلوع ہوتا ہے افضل دن جمعے کا ہے اسی میں آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا اور اسی میں ان کو زمین پر اتارا گیا، اور اسی دن میں ان کی توبہ قبول ہوئی اور اسی دن میں فوت ہوئے اور اسی دن میں قیامت قائم ہوگی اور کوئی بھی چوپایہ نہیں ہے مگر وہ قیامت قائم ہونے کے انتظار میں رہتا ہے، صبح سے لے کر سورج غروب ہونے تک قیامت سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں قیامت نہ آ جائے۔ سوائے جنوں اور انسانوں کے اور اس جمعہ کے دن میں ایک ایسی ساعت ہے کہ نہیں پاتا اس کو کوئی مسلمان بندہ کہ وہ نماز پڑھتا ہو اور اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مانگے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ وہ چیز اس کو عطا کر دیتے ہیں۔ تو کعب کہنے لگے یہ پورے سال میں ایک دن ہے (یعنی وہ مقبولیت والی ساعت سال کے جمعہ میں سے ایک جمعہ میں ہوتی ہے) میں نے کہا نہیں بلکہ یہ ہر جمعہ میں ہوتی ہے، پس حضرت کعب نے تورات پڑھی اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں حضرت عبد اللہ ابن سلامؓ سے ملا، پس میں نے حضرت کعب کے ساتھ اپنی مجلس کو ان کے سامنے بیان کیا اور اس حدیث کا تذکرہ کیا جو میں نے حضرت کعب کو سنائی تھی جمعہ کی فضیلت کے بارے میں پھر میں نے ان سے کہا کہ حضرت کعب نے کہا ہے کہ یہ گھڑی سال میں ایک مرتبہ ہے (یعنی ایک جمعہ میں ہے) تو حضرت عبداللہ ابن سلامؓ نے فرمایا کعبؓ نے غلط کہا ہے۔ پھر میں نے عرض کیا کہ یہ کہنے کے بعد حضرت کعب نے تورات پڑھی اور پھر فرمایا کہ یہ ہر جمعہ میں ہے (یعنی رسول اللہ ﷺ نے سچ کہا ہے) تو پھر حضرت عبداللہ ابن سلامؓ نے کہا کہ کعب نے سچ کہا ہے اس کے بعد عبداللہ ابن سلام نے کہا تحقیق میں جانتا ہوں وہ کونسی گھڑی ہے تو حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا مجھے ضرور بتائیں اور مجھے بتانے میں بخل نہ کریں، تو حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا وہ جمعہ کے دن کی آخری گھڑی ہے تو حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا وہ جمعے کی آخری گھڑی کیسے ہو سکتی ہے حالانکہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ مومن بندہ اس کو پالے اور وہ اس میں نماز پڑھتا ہو...... (یعنی اس میں تو یہ تذکرہ ہے کہ وہ نماز پڑھتا ہو حالانکہ جمعے کے دن کا آخری وقت مکروہ وقت ہے اس میں نماز پڑھنا جائز نہیں) تو حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے فرمایا کیا آنحضرت ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص بیٹھا ہو اپنی جگہ پر اس حال میں کہ وہ نماز کا انتظار کر رہا ہے، پس وہ نماز ہی کے حکم میں ہے، یہاں تک کہ وہ نماز پڑھ لے، تو حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں، میں نے عرض کیا کہ ہاں آپ نے یہی فرمایا ہے۔ تو حضرت عبداللہ نے فرمایا، پس نماز سے مراد انتظار ہی ہے۔ یہ موطا امام مالک، ترمذی اور نسائی کی روایت ہے۔ امام احمد نے اس کو روایت کیا ہے۔ صدق کعب تک۔

تشریح: "خرجت الى الطور: طور معروف جگہ ہے متبادر الی الذہن یہ ہے کہ اس سے مراد طور سیناء ہے۔

(**فلقيت كعب الاحبار**) طیبیؒ فرماتے ہیں الاحبار فتحہ اور کسرہ کے ساتھ اس میں اضافت زید الخیل جیسی ہے ان کا نام ابو اسحاق تھا کعب بن ماتع حمیر قبیلے سے حضور ﷺ کا زمانہ پایا لیکن ان کی زیارت نہیں کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا۔

(**فجلست معه فحدثني عن التوراة وحدثته عن رسول الله ﷺ**) اى عن احاديثه (**فكان فيما حدثته**) خبر کان (**ان قلت**) اسم كان قاله الطيبیؒ اى مع القول ومقوله فيما حدثته۔ کان کی خبر مقدم اور ان قلت مقولہ کے ساتھ مل کر اسم کان)

(قال رسول اللهﷺ خیریوم) ای نهار ۔

(طلعت علیه) ای علی مافیه

(الشمس یوم الجمعة فیه خلق آدم) وہ آدم جو کہ تمام عالم کے منی واصل ہیں۔

(فیه اهبط) یعنی اس میں اتارے گئے جنت سے زمین کی طرف۔ان کے جمعے والے دن کی تعظیم نہ کرنے کی وجہ سے بسبب اس لغزش کے جوان سے ہوگئی تھی تا کہ اترنے کے بعد اطاعت وعبادت میں لگ کراس کا تدارک کرلیں اور جنت کے اعلیٰ درجات تک پہنچ جائیں اوراس لئے بھی تا کہ نعمت کی قدر جان لیں اس لئے کہ نعمت وعطاء کی قدر محنت ومشقت کے وقت ظاہر ہوتی ہے۔اور ظاہر ہے لفظ اهبط اس حدیث میں اخرج کے معنی میں ہے۔جیسے پیچھے گزری ہوئی روایت کے اندر ہے۔

اور ایک قول یہ ہے اخراج جنت سے آسمان دنیا کی طرف تھا۔اور الاهباط وہاں سے زمین کی طرف یہ قول یہ فائدہ دیتا ہے کہ ان میں دونوں سے (یعنی الاهباط و اخراج) ہر ایک جمعے والے دن ہوا تو ایک دن میں یا دو دنوں میں۔ واللہ اعلم۔

(فیه) ای فی یوم الجمعة۔اور ظاہر ہے بے شک خاص اس دن میں ان کی توبہ قبول کی گئی۔

(تیبت علیه) یہ تاب سے ماضی مجہول ہے یعنی وفق للتوبة وقبلت التوبة منه۔اور یہ ان پر عظیم الشان احسان کا بیان ہے۔جیسے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ثم اجتباه ربه فتاب علیه وهدٰی۔

(وفیه تقوم الساعة اوراس میں مومنین کیلئے دو عظیم نعمتیں ہیں ایک تو ان کا ہمیشہ رہنے والی نعمتوں تک پہنچنا اوران کے دشمنوں کیلئے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب حاصل ہونا۔

(وما من دابة) من کی زیادتی نفی میں استغراق کے افادے کیلئے ہے۔

(الا وهی مصیخة) ای منتظرة لقیام الساعة۔

(یوم الجمعة) اور مصابیح السنہ کے اکثر نسخوں کے اندر یہ مصیخة سین کے ساتھ ہے۔تو اس میں دو لغتیں ہوئیں۔ تورپشتی فرماتے ہیں مصیغة۔ مصغیة ومستمعته کے معنی میں ہے یعنی کان لگاتے ہیں۔اور مصیخۃ سین کے ساتھ بھی مروی ہے۔صاد کو سین کے ساتھ بدل کر اور چوپاؤں کے منتظر قیامت ہونے کی وجہ یہ ہے۔کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے ان پر اس (یعنی قیامت جمعے والے دن ہوگی)۔کا الہام کیا ہے۔اوران کو اس بارے میں باشعور بنایا ہے۔

پس اس میں اللہ کی قدرت سے تعجب نہیں ہے۔اور شاید جنوں وانسانوں سے مخفی رکھنے میں حکمت یہ ہے بے شک اگر ان پر اس میں سے کچھ کشف کیا جاتا تو ابتلاء وتکلیف کے قاعدے وقانون میں خلل ہو جاتا اوران پر بات واضح ہو جاتی اس کو طیبیؒ نے ذکر کیا ہے۔اور ابن حجرؒ نے ان کی پیروی کی ہے۔اوراس میں یہ بات ہے اگر ان پر (یعنی جن وانس پر) اس کا الہام کردیا جاتا جس کا چوپاؤں پر کیا گیا ہے اور یہ بھی قیامت کے وقوع کے انتظار میں لگ جاتے اس سے تکلیف کے قاعدے میں خلل پیدا ہونا لازم نہیں آتا۔اور نہ ہی وقوع قیامت میں۔

(شفقًا) ای خوفًا۔

(من الساعة) ای من قیام القیامة ~~یا روایت~~ ساعت اس لئے کہتے ہیں کہ یہ گھڑی میں واقع ہوگی۔ میں کہتا ہوں یہ

حدیث اس آدمی کیلئے ماخذ ہے جو اس کا قائل ہے۔ بے شک ساعۃ جمعۃ صبح کے ظاہر ہونے اور طلوع آفتاب کے درمیان ہے مطلب یہ ہے کہ بے شک حیوانات جب اس گھڑی میں ذکر کر رہے ہوتے ہیں۔ اور خوف زدہ وحاضر ہوتے ہیں۔ تو بے شک کامل انسان کیلئے زیادہ مناسب ہے کہ وہ اپنے مولی کے ذکر میں مشغول ہو اسلئے کہ چوپاؤں کو تو اپنے مٹی پر ہو جانے کا خوف ہے۔ اور عقل والوں کا خوف (صفحہ ۴۴۹) دروازے سے مردود ہونے اور بڑے عذاب اور پوشیدہ ناراضگی سے ہے۔ پس ان چوپاؤں کا خوف انجام کے اعتبار سے ہلکا ہے۔ اسی وجہ سے کافر کہیں گے۔ **یا لیتنی کنت ترابًا قوله (الا الجن والانس)** ابن حجرؒ فرماتے ہیں بے شک یہ نہیں جانتے اس کے بارے میں۔ اور بہتر یہ ہے کہ ان کو (یعنی جن وانس) اس بات کا القاء نہیں کیا جاتا کہ یہ دن وقوع قیامت کا احتمال رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر اس سے غافل ہوتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ جانتے نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

ابن مالکؒ فرماتے ہیں ان دونوں کا مصیحہ سے استثناء اور ان سے اس کا اخفاء اس لئے ہیں تاکہ ان کیلئے ایمان بالغیب ثابت رہے۔ اور اگر یہ اس کے بارے میں جان لیتے تو ان پر ان کی زندگی تنگ ہو جاتی۔ اور گزارے کے موافق روزی کے حاصل کرنے میں بھی مشغول نہ ہوتے اس کے خوف کی وجہ سے۔ اور اس میں بحث ہے۔

(وفيه) ای فی جنس یوم الجمعة۔

(ساعة لا يصادفها) ای لا یوافقها۔

(عبد مسلم وهو يصلی) یا تو حقیقتاً نماز پڑھ رہا ہو یا حکماً کہ نماز کے انتظار میں ہو یا اس کا معنی ہے دعا کر رہا ہو۔

(يسأل الله) ماقبل کیلئے حال ہے یا بدل ہے۔

(شيئًا) دنیا یا آخرت کے کسی معاملے میں۔

(الا اعطاه اياه) مگر اسے مل جاتی ہے۔ عطاء ہو جاتی ہے۔ دعا میں معتبر شرائط کی رعایت کے ساتھ۔

قولہ **(قال)** اور ایک نسخے میں وقال ہے۔

(كعب ذلك فی سنة يوم) طیبیؒ فرماتے ہیں **(ذلك سے)** اشارہ اس مذکورہ یوم کی طرف ہے جو اس عظیم گھڑی پر مشتمل ہے اور لفظ یوم اس کی خبر ہے۔

(فقلت بل فی كل جمعة) طیبیؒ فرماتے ہیں (مطلب ہے) یہ ہر جمعے میں ہے یا ہر ہفتے میں ایک دن ہے۔ یعنی یہ دن جو مذکورہ صفات پر مشتمل ہوتا ہے۔ وہ ہر ہفتے میں ہوتا ہے۔ اور یہ جواب کی مطابقت کے لحاظ سے زیادہ ظاہر ہے۔ اسی وجہ سے ابن حجرؒ نے اسی پر اختصار کیا ہے۔

(فقرأ كعب التوراة) زبانی پڑھا یا دیکھ کر

(فقال) ای کعب

(صدق رسول اللهﷺ) اور اس میں عظیم معجزہ ہے جو حضور ﷺ کے کمال علمی پر دلالت کرتا ہے۔ کہ باوجود امی ہونے کے ایسی بات کی خبر دے دی جو اہل کتاب کے بڑے عالم پر مخفی رہی۔

(قال ابو هريرة لقيت عبدالله بن سلام) جو جلیل القدر صحابی ہیں پہلے یہود کے علماء میں سے تھے۔ پھر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

(فحدثته بمجلسي)ای بجلوسی

(مع كعب الاحبار وما حدثته)یعنی جو حدیث میں نے ان سے بیان کی تھی۔

(في يوم الجمعة) ای في شأنه

فقلت له)ای لعبد الله

(قال كعب ذلك في كل سنة يوم قال عبدالله بن سلام كذب كعب) ای في هذا القول۔

اور جزری نے کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام کیلئے یہ علم ضروری کھول دیا گیا جو کعب کیلئے نظری امر تھا۔ حضور ﷺ کی صحبت کی برکت سے اور قبول اسلام کی سعادت میں سبقت کی وجہ سے اور باقی ابن حجرؒ کا قول (حضرت عبداللہ کے قول کے بارے میں) ان کا قول کذب کعب اس گمان سے تھا کہ بے شک کعب اس کی خبر دینے والے ہیں۔ اس کے بارے میں سوال کرنے والے نہیں ہیں۔ پس یہ درست نہیں اس لئے اگر وہ سوال کرنے والے ہوتے تو حضرت ابو ہریرہؓ ان کو بل في كل جمعةٍ کے قول کے ساتھ جواب نہ دیتے۔ پس درست یہ ہے کہ انہوں نے اپنی خبر دینے میں غلطی کی۔ لہٰذا ان پر یہ بات صادق آئی کہ انہوں نے جھوٹ بولا ہے تو پھر اس حدیث سے کسی عالم کا اس آدمی پر جسے اس بارے میں اسے خبر پہنچتی ہو۔ کہ اس نے فتویٰ دینے میں غلطی کی ہے سختی کرنے کے جواز پر استدلال درست نہ ہوا جیسے اسے ذکر کیا ہے ابن حجرؒ نے۔

(في كل جمعةٍ) باقی ابن حجرؒ کا قول مطلب یہ ہے جمعہ ہر ہفتے میں ہے وہ ایسی بحث ہے۔ جس میں کچھ فائدہ نہیں۔

(فقال عبدالله بن سلام: صدق كعب) ای الآن یعنی اب سچ بولا ہے۔

(ثم قال عبدالله بن سلام قد علمت اية ساعة هی) اية کے نصب کے ساتھ معنی ہوگا عرفت تلك الساعة۔

اور ایک نسخے میں ایتہ کے درفع کے ساتھ اور اسی پر بنا کی ہے۔ ابن حجرؒ نے اس لئے کہ انہوں نے کہا ہے یہ اس مقام پر ایسے ہی ہے جیسے لنعلم ایُّ الحزبين میں (ای مرفوع ہے)۔

(قال ابوهريرة فقلت) ای لعبد الله۔

(اخبرنی بها)ای بتلك الساعة۔

(ولا تضن) ضاد کے کسرہ کے ساتھ اور اسے فتح بھی دیا جاتا ہے اور نون مشددہ کے فتحہ کے ساتھ لا تبخل بها کے معنی میں یعنی بخل نہ کرنا۔ (علی) اور عفیف کے نسخے میں (لاتضن) رفع کے ساتھ ہے اس پر کہ وہ نفی ہے جو نہی کے معنی میں ہے یا یہ کہ وہ حال ہے۔

(قال عبدالله بن سلام هی آخر ساعة في يوم الجمعة) اشرف کہتے ہیں یہ (جملہ) دلالت کرتا ہے حدیث میں موجود قول رسول اللہ ﷺ التمسوا الساعة پر جو آگے آرہا ہے۔

"قال ابو هريرة فقلت وكيف تكون ای تلك الساعة۔

(آخر ساعة في يوم الجمعة وقد قال رسول اللهﷺ)اى والحال انه قال صلى الله عليه وسلم اى فى شانها۔

(لا يصاد دفها عبدمسلم وهو يصلي فيها)اورایک نسخے میں وھو یصلی کے الفاظ ہیں اور یہ گھڑی اس میں نماز تو نہیں پڑھی جاتی۔میرکؒ فرماتے ہیں اسی طرح واقع ہے امام مالکؒ کی روایت میں مؤطا کے اندر۔

(فقال)اور ایک نسخہ میں قال ہے۔(بغیر فا کے)

(عبدالله بن سلام الم يقل رسول اللهﷺ من جلس مجلسًا) اى جلوسًا اومكان جلوس (یعنی مجلسًا یا تو مصدر میمی ہے یا ظرف مکان کا صیغہ ہے)۔

(ينتظر الصلاة) لاى فيه۔

(فهو في صلاةٍ) اى حكمًا یعنی نماز کا منتظر حکمًا نماز میں ہی ہوتا ہے۔

(فهو) اى المراد بالصلاة۔ (ذلك) الانتظار اور نماز سے یہی انتظار مراد ہے۔

اور ایک قول ہیں مراد وہ چھوٹی گھڑی جو آخری گھڑی ہے جمعے والے دن سے۔اور ضمیر کو مذکر لانا وقت کے اعتبار سے ہے۔

رواه مالك وابو داؤد والترمذى والنسائى اى الى آخر الحديث وروى احمد الى قوله صدق كعب۔

۱۳۶۰: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلْتَمِسُوا السَّاعَةَ الَّتِىْ تُرْجٰى فِىْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ بَعْدَ الْعَصْرِ اِلٰى غَيْبُوْبَةِ الشَّمْسِ ۔ (رواه الترمذى)

أخرجه الترمذى فى السنن ٢/ ٣٦٠ حديث رقم ٤٨٩۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ محبوب خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تلاش کرو جمعہ کی اس گھڑی کو جس میں دعا کی قبولیت کی امید ہے،عصر کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک۔(ترمذی)

تشریح: ''الساعة التى ترجى'' صیغہ مجہول کے ساتھ مطلب ہے۔تطمع اجابة الدعاء فيها (دعا کی قبولیت کی اس گھڑی میں امید ہے)۔(فى يوم الجمعة بعد العصر الى غيبوبة الشمس'' ابن مالکؒ فرماتے ہیں اور یہ (جملہ) حضرت عبداللہ بن سلام کے قول کی تائید کر رہا ہے۔

(رواه الترمذى) وقال غريب ۔

اور اس روایت کو طبرانی نے ابن مہیمۃ کی روایت سے نقل کیا ہے اور اس کے آخر میں زیادہ کہا ہے۔وہ گھڑی اتنی مقدار میں ہے اور اشارہ کیا اپنی مٹھی کی طرف اور اس کی سند ترمذی کی سند سے زیادہ صحیح ہے۔اس کو میرکؒ نے نقل کیا ہے۔عسقلانیؒ نے فرمایا ہے بخاری شریف کی شرح میں اور اس روایت کو حضرت ابن عباسؓ سے ان پر موقوفاً نقل کیا ہے۔اس روایت کو ابن جریرؒ نے روایت کیا ہے اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہر جمعہ میں قبولیت کی گھڑیاں ہوں اور گھڑیوں میں سے زیادہ عظمت والی گھڑی مبہم ہو یا یہ گھڑی جمعہ کے دنوں میں گھومتی ہو جیسے لیلۃ القدر کے بارے میں کہا گیا ہے اور یہ گھڑیاں باقی گھڑیوں سے زیادہ قبولیت والی ہیں۔ جیسے طاق راتیں رمضان المبارک کے آخری عشرے میں۔

جمعہ کے دن درود زیادہ سے زیادہ پڑھنا چاہئے کیونکہ مقبول عبادت ہے

۱۳۶۱: وَعَنْ اَوْسِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ اَفْضَلِ اَيَّامِكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فِيْهِ خُلِقَ اٰدَمُ وَفِيْهِ قُبِضَ وَفِيْهِ النَّفْخَةُ وَفِيْهِ الصَّعْقَةُ فَاَكْثِرُوْا عَلَيَّ مِنَ الصَّلَاةِ فِيْهِ فَاِنَّ صَلَاتَكُمْ مَعْرُوْضَةٌ عَلَيَّ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَكَيْفَ تُعْرَضُ صَلَاتُنَا عَلَيْكَ وَقَدْ اَرِمْتَ قَالَ يَقُوْلُوْنَ بَلِيْتَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْاَرْضِ اَجْسَادَ الْاَنْبِيَاءِ۔

(رواه ابوداود والنسائی وابن ماجة والدارمی والبیهقی فی الدعوات الکبیر)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ٦٣٥/١ حدیث رقم ١٠٤٧۔ والنسائی ٩١/٣ حدیث رقم ١٣٧٤۔ وابن ماجه ٩١/٣ حدیث رقم ١٣٧٤۔ والدارمی ٤٤٥/١ حدیث رقم ١٥٧٢۔ وأحمد فی المسند ٨/٤۔

ترجمہ: حضرت اوس بن اوسؓ فرماتے ہیں کہ سرکار طیبہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ جمعے کا دن تمہارے بہترین دنوں میں سے ہے اسی دن میں آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے اور اسی دن میں ان کی وفات ہوئی اور اسی دن میں صور پھونکا جائے گا، یعنی نفخہ ثانیہ ہوگا، اور اسی دن میں ہلاک کر دینے والا ہوگا، یعنی نفخہ اولیٰ جس میں ساری چیزیں مر جائیں گی، پس تم اس دن میں مجھ پر زیادہ درود پڑھو کیونکہ تمہارا درود میرے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ تو صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ ﷺ پر ہمارا درود کیسے پیش کیا جاتا ہے جبکہ آپ کی ہڈیاں تو بوسیدہ ہو چکی ہوں گی۔ راوی کہتے ہیں کہ صحابہ کی مراد ارمت سے بلیت تھی کہ آپ ﷺ کا جسد اطہر بوسیدہ ہو چکا ہوگا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے زمین پر انبیاء کے جسم کو کھانا (یعنی زمین انبیاء کے جسم کو فنا نہیں کرتی)۔ یہ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی اور بیہقی کی روایت ہے۔

راویٔ حدیث:

اوس بن اوس۔ اوس بن اوس "ثقفی ہیں"۔ اور ایک قول یہ ہے کہ اوس بن ابی اوس۔ اور یہ عمرو بن اوس کے والد ہیں۔ ان سے ابواشعث سمعانی اور ان کے بیٹے عمرو غیرہما نے روایت کی ہے۔

تشریح: "اور اس میں اشارہ ہے اس کی طرف بے شک عرفہ کا دن اس سے افضل ہے یا برابر ہے۔

(فیه خلق آدم) یعنی ان کا خمیر پیدا کیا گیا جیسے پہلے گذر چکا۔

(وفیه) ای فی جنسه۔

(قبض) ای روحہ۔

(وفیہ النفخۃ) مراد نفخہ ثانیہ ہے جو نیکوں کو باقی رہنے والی نعمتوں تک پہنچانے والا ہے۔ طیبیؒ نے کہا ہے اور انہی کی پیروی کی ہے ابن حجرؒ نے اس قول میں) مراد نفخہ اولی ہے کیونکہ وہ بھی قیام کے قائم ہونے کیلئے مبدأ ہے۔ اور دوسرے مرتبہ رکن ہونے کا مقدم ہے اور دونوں کو جمع کرنے میں مانع موجود نہیں۔

(وفیہ الصعقۃ) ای الصعۃ کما فی نسخۃٍ۔ اور مراد اس (صعقہ) سے خوفناک آواز ہے جس کے خوف سے انسان مرجائیں گے اور وہ نفخہ اولیٰ ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ (ونفخ فی الصور فصعق من فی السموات ومن فی الارض الا ماشاء اللّٰہ) پس تکرار دو وصفوں کے تغایر کے اعتبار سے ہے اور پہلی صورت جسے ہم نے اختیار کیا ہے تغایر حقیقی سے ہے۔ اور جز این نیست نفخہ اولیٰ کو صعقۃ کے نام کے ساتھ موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسی صعقۃ پر مترتب ہوتا ہے اور اسی وصف کی بناء پر وہ نفخہ ثانیہ سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ اور ایک قول یہ ہے اس لئے اشارہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بے ہوش ہونے کی طرف جوان کو اس تجلی الٰہی سے لاحق ہوئی۔ جس کے برداشت سے مضبوط پہاڑ عاجز آ گیا۔ پس ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر گئے۔ پس جب ان کو افاقہ ہوا تو فرمایا۔ سبحانک تبت الیک وانا اول المؤمنین۔

(فاکثروا علی من الصلاۃ فیہ) ای فی یوم الجمعۃ اس لئے کہ درود افضل ترین عبادات میں سے ہے۔ اور وہ اس دن میں افضل ہے دوسری عبادات کی بہ نسبت بوجہ خاص ہونے اس درور کے ستر تک دوگنا ہونے کے ساتھ تمام اوقات میں اور اس لئے بھی کہ افضل وقت کے اندر افضل عمل میں مشغول ہونا بھی زیادہ کمال اور جمال والی بات ہے۔ اور اس لئے جمعہ سید الایام ہے لہٰذا اسے سید الانام علیہ الصلاۃ والسلام کی خدمت میں صرف کیا جائے۔ پھر جب تم نے جان لیا افضل دن کے بارے میں۔

(فان صلاتکم معروضۃ علی ''یعنی اس میں قبولیت کے طریقے پر ورنہ تو ہمیشہ حضور ﷺ پر فرشتوں کے واسطے سے درود پیش کیا جاتا ہے۔ سوائے ان کی قبر کے پاس کہ قبر کے پاس آنحضرت ﷺ خود سنتے ہیں۔ اور جمعہ والے دن اور اس کی رات میں درود پڑھنے کی فضیلت کے بارے میں اور سید الابرار ﷺ پر درود کی کثرت کی فضیلت کے بارے میں بہت ساری روایات وارد ہوئی ہیں اور ہزار اس سے زیادہ مقدار جو وارد ہوئی ہے۔ اسے اپنے اذکار میں سے ورد بنالو۔

(قالوا یا رسول اللّٰہ وکیف تعرض صلاتنا علیک وقد أرمت)

(وقد ارمت) جملہ حالیہ ہے را کے فتحہ کے اور میم کے سکون اور تاء مخففہ کے فتحہ کے ساتھ۔ اور را کے کسرے کے ساتھ بھی مروی ہے۔ بلیت کے معنی میں (یعنی بوسیدہ ہو جائیں گے) اور ایک قول یہ ہے کہ یہ مجہول کا صیغہ ہے۔ الارم سے جس کا معنی ہوتا ہے کھانا اس صورت میں مطلب ہوگا صرف ما کولاً للارض (یعنی زمین کے کھائے ہوئے ہو جائیں گے) اور ایک قول ہے اترمت میم مشدد اور تائے ساکنہ کے ساتھ معنی ہوگا ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی اور ہو جائیں گی ریزہ ریزہ اسی طرح ذکر کیا ہے حافظ تورپشتیؒ نے طیبیؒ نے فرمایا۔ ارممت دو میموں میں سے ایک کے حذف کے ساتھ ہو جیسے ظلت پھر راء کو کسرہ دے

دیا گیا ہو التقاء ساکنین کی وجہ سے یا فتحہ دیا گیا۔ اخف الحرکات ہونے کی بناء پر یا نقل کے طور پر جیسے یہ امجان اپنے میں مذکور بھی خطابیؒ نے کہا ہے۔ اس کی اصل اتممت ہے۔ پس انہوں نے ایک کو دونوں میموں سے حذف کر دیا اور وہ بعض عرب کی لغت ہے اور خطابیؒ کے علاوہ کا قول ہے۔ ارممت راء کے فتحہ اور میم مشدد اور تا کے سکون کے ساتھ ہے۔ ای ارممت العظام(ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی)۔ اور اس میں اور بھی کچھ اقوال ہیں جیسے امام نوویؒ کی کتاب الاذکار کے اندر جسے انہوں نے سید جمال الدین سے نقل کیا ہے۔

(قال) ای اوس الراوی۔

(یقولون) ای الصحابة ۔راوی فرماتے ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مراد اس قول (ارممت) سے بلیت ہے اور اس کی تائید اس لفظ سے ہوتی ہے جو مصابیح کے اندر ہے۔ **یقول**: ملیت الہذا طیبیؒ کے قول پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جو مصابیح کے اندر وارد ہے۔ اور ان کا قول۔ **ارممت یقول بلیت** ہے۔ اور باقی مشکوٰۃ کے اندر حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: **قال یقولون بلیت** اور یہ ظاہر ہے۔ اس لئے کہ قائل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات استبعاداً (یعنی بعید جانتے ہوئے) کہی تھی۔ تأمل اس کو سید جمال الدینؒ نے ذکر کیا اور تأمل کی وجہ یہ بے شک لوٹتی ہے۔ اس پر غیبت **یقولون** کے قول میں اور **قال** کا تکرار ہے۔ اور منافی ہے اس کے جو مصابیح کے اندر ہے **وقد ارممت یقول**۔

توربشتیؒ نے فرمایا یعنی راوی نے کہا بلیت **ارم المال والناس** سے مشتق ہے۔ غنا ہونے کے معنی میں اور ارض ارمۃ ایسی زمین جو کچھ نہ اگائے۔ پس معنی جو مشکوٰۃ کے اندر ہے۔ راویؒ نے فرمایا **یقولون** یعنی انہوں نے ارمت سے مراد بلیت یعنی اس کا معنی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے اس پر کوئی غبار نہیں جیسے مخفی نہیں۔ اور یہ جملہ معترضہ حدیث کے مشکل لفظ کیلئے بیان ہے سوال اور جواب کے درمیان (جواب) امیری مراد۔

(اجساد الانبیاء) ای من ان تأکلها۔

اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔ طیبیؒ فرماتے ہیں۔ اگر تو کہے **ان اللّٰه حرم علی الارض اجساد الانبیاء**، اپنے اس قول کے ساتھ جواب دینے کی کیا وجہ ہے۔ حالانکہ عرض اور سماع سے جو چیز مانع ہے۔ وہ موت ہے جو قائم ہے۔ میں کہوں گا اس میں شک نہیں ان کے اجساد کی بوسیدہ ہونے سے حفاظت جاری عادت کیلئے خارق ہے۔ پس جیسے بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کے اجساد کی بوسیدگی سے حفاظت کی اسی طرح انبیاء علیہم الصلاۃ پر عرض بھی ممکن ہے۔ اور انبیاء علیہم الصلاۃ کا اپنی امت کے درود کا سننا بھی ممکن ہے۔ اور اس کی تائید فصل ثالث کی تیسری حدیث میں عنقریب وارد ہوگا۔ **فنبی اللّٰه حتی یرزق۔**

سید جمال الدینؒ نے فرمایا۔ جواب کو مطابق کرنے کی وجہ میں اس تطویل کی چنداں حاجت نہیں۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول **ان اللّٰه حرم**...... ان کے قول **قد ارممت** کے مقابل ہے۔ اور جواب کا حاصل و خلاصہ ہے انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہوتے ہیں۔ ان کیلئے جو ان پر درود پڑھے اس کا سننا ممکن ہوتا ہے۔ تأمل تم کلامہ۔ پس ان کے کلام میں غور کرو۔ اس لئے جو انہوں نے ذکر کیا ہے یہ جواب کا حاصل ہے وہ اسی سوال کا خلاصہ ہے جو طیبیؒ نے ذکر کیا ہے اور جواب زیادہ سے زیادہ

وضاحت واطناب کے طریقے پر ہے۔

اور باقی سید جمال الدینؒ کا قول کہ حضور ﷺ کا قول ان اللہ حرم سائل کے قول قد ارمت کے مقابل ہے خوبصورت کلام ہے۔ جومحتاج بیان نہیں ہے۔ اور وہ یہ ہے صحابہ ؓ نے عرض کی ایک کیفیت کے بارے میں سوال کیا بعد اعتقاد امکان کے کہ عرض (امحالہ طور پر ہوگا۔ صادق ﷺ کے قول فان صلاتکم عروضة علی کی بناء پر لیکن ان کو اشتباہ ہوا عرض کیا خالی روح پر ہوگا۔ یا روح متصل بالجسم پر اور انہوں نے گمان کیا نبی ﷺ کا جسد ہر ایک کے جسم کی طرح ہے۔ پس جواب میں کافی ہے جو حضور ﷺ نے درست طریقے پر ارشاد فرمایا۔ اور باقی جو طیبیؒ نے پہلے ذکر کیا جزیں نیست عرض اور سماع بعد الموت انبیاء علیہم السلام پر بند کرنے کا فائدہ دیتا ہے۔ اور معاملہ ایسے نہیں ہے اس لئے کہ تمام اموات بھی سلام وکلام سنتے ہیں اور بعض دنوں میں ان پر ان کے اقارب کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں ہاں انبیاء علیہم السلام کی حیات زیادہ کامل طریقے پر ہوتی ہے اور ان کے کچھ وارثوں شہداء اولیاء علماء کو اس سے وافر حصہ ملتا ہے ان کے ظاہری جسموں کی حفاظت کے ساتھ بلکہ ان کو نماز اور تلاوت قرآن اور ان جیسی دوسری چیزوں سے اپنی پاکیزہ قبروں میں قیام قیامت تک لذت بھی حاصل ہوتی ہے۔ ان تمام مسائل کو السیوطیؒ نے اپنی کتاب شرح الصدور فی احوال القبور کے اندر ذکر کیا ہے صحیح احادیث اور صریح قسم کے آثار کے ساتھ۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس سے جو انبیاء علیہم السلام کی ایسی حیات کے ثبوت کا افادہ ہوتا ہے۔ جس حیاۃ کے ذریعے وہ عبادت بھی کرتے ہیں۔ اور اپنی قبور میں نماز بھی پڑھتے ہیں باوجودیکہ فرشتوں کی طرح طعام وشراب سے مستغنی ہیں ایسا امر ہے جس میں کوئی شک نہیں اور تحقیق بیہقیؒ نے ایک جزء اس میں تصنیف کیا ہے۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجة والدارمی)

(رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجة والدارمی) میرکؒ نے کہا اس روایت کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ اور حاکم نے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اور ابن حجرؒ نے زیادہ کہا ہے اپنے اس قول کے ساتھ اور کہا ہے صحیح علی شرط البخاری اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اسے روایت کیا ہے۔

(والبیہقی فی: الدعوات الکبیر) نوویؒ نے کہا اس کی سند صحیح ہے۔ اور منذری نے کہا اس میں باریک قسم کی علت ہے جس کی طرف بخاریؒ نے اشارہ کیا ہے جسے میرک نے نقل کیا ہے۔ ابن دحیۃ کہتے ہیں یہ صحیح ہے عدل کے عدل سے نقل کرنے کی وجہ سے اور جس نے کہا ہے۔ یہ منکر ہے یا غریب ہے اس میں علۃ خفیفۃ کی وجہ سے تحقیق کمزور ہے اس لئے کہ دارقطنی نے اسے رد کر دیا ہے۔

جمعہ کی فضیلت

۱۳۶۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْيَوْمُ الْمَوْعُوْدُ يَوْمُ الْقِيَامَةِ وَالْيَوْمُ الْمَشْهُوْدُ يَوْمُ عَرَفَةَ وَالشَّاهِدُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ وَمَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَلَا غَرَبَتْ عَلٰى يَوْمٍ اَفْضَلَ مِنْهُ فِيْهِ سَاعَةٌ لَا يُوَافِقُهَا عَبْدٌ مُؤْمِنٌ يَدْعُوا اللّٰهَ بِخَيْرٍ اِلَّا اسْتَجَابَ اللّٰهُ لَهٗ وَلَا يَسْتَعِيْذُ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا اَعَاذَهُ مِنْهُ رواه احمد والترمذی وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ لَا يُعْرَفُ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ مُوْسٰى ابْنِ

عُبَيْدَةَ وَهُوَ يُضَعَّفُ۔

أخرجه الترمذي في السنن ٥/ ٤٠٦ حديث رقم ٣٣٣٩۔ وأحمد في المسند ٣/ ٤٣٠۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قرآن میں **اليوم الموعود** سے مراد قیامت کا دن ہے اور یوم مشہود سے مراد عرفہ کا دن ہے اور **شاهد** سے مراد جمعہ کا دن ہے اور نہیں طلوع ہوتا سورج اور نہ ہی غروب ہوتا ہے کسی ایسے دن جو کہ جمعہ کے دن سے افضل ہو۔ اس میں ایک ایسی گھڑی ہے کہ نہیں پاتا اس کو مومن بندہ کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے خیر کی مگر اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور قبول فرماتے ہیں اور نہیں پناہ مانگتا کسی چیز سے مگر اللہ تعالیٰ اس کو ضرور پناہ دیتے ہیں۔ یہ امام احمد اور ترمذی کی روایت ہے۔ اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے یہ صرف موسیٰ ابن عبیدہ سے منقول ہے اور وہ ضعیف ہے۔

تشریح: ''قال رسول اللہ ﷺ **اليوم الموعود**'' یعنی وہ جسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ البروج میں ذکر کیا ہے۔

''**يوم القيامة**'' اور ابن حجرؒ کی اصل میں یوم العید ہے جو کہ فحش قسم کی غلطی ہے اور اس کی علت بیان کی ہے کہ اہل بوادی (گاؤں والے) اس شہر میں آنے کے آپس میں وعدے کرتے ہیں۔

''**والشاهد يوم الجمعة**'' اور شاید یوم مشہود کو مقدم کرنے میں باوجود یکہ قرآن کریم میں وشاھد ومشھود ہے اشارہ ہے یوم عرفہ کی عظمت اور فضیلت کی طرف یا اس میں مجمع کی اکثریت کی طرف اشارہ ہے۔ پس یہ مجمع اور احرام کی حالت کی بنا پر قیامت کے مشابہہ ہے گویا کہ یہ چھوٹی قیامت ہے (گویا) وہ (حاجی) اپنے رب کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ بڑے پیش ہونے کی طرح اور شاید آیت قرآنی میں شاہد کو مشہود پر مقدم کرنے میں نکتہ رعایت تو اصل ہے جیسے الاخدود وغیرہ میں یا اس وجہ سے کہ جملہ اکثر اوقات عرفہ پر وجود میں بھی مقدم ہوتا ہے۔ طیبیؒ نے کہا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس (یعنی یوم جمعہ) کی عظمت شان کو سورۃ البروج میں ذکر کیا ہے۔ اس لئے کہ اس کے ساتھ قسم اٹھائی اور اس کو دو عظیم دنوں کے ہار کیلئے درمیانی گرہ قرار دیا اور اس کو نکرہ ذکر کیا عظمت کی طرف اشارہ کرنے کیلئے اور اس کی طرف شہادت کی نسبت کی مجازاً کیونکہ اس میں لوگ حاضر ہوں گے۔ جیسے نھارہ صائم مراد یہ ہے اس عظیم دن میں مخلوقات حاضر ہوں گی۔ بڑی سعادت کو حاصل کرنے کیلئے۔

زیادہ ظاہر یہ ہے یہ دن گواہی دے گا ان نمازیوں اور ذاکرین اور مبلغین کیلئے جو اس میں حاضر ہوتے ہیں اور عنقریب آئے گا۔ یہ دن مشہود بھی۔ کیونکہ فرشتے اس میں حاضر ہوتے ہیں پس یہ شاھد بھی ہے اور مشھود بھی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ وہ حامد بھی ہے اور وہی محمود بھی ہے۔

(**فيه ساعة لا يوفقها عبد مومن**'' عبارت تفنن کی قبیل سے ہے۔ دونوں حدیثوں سے معلوم ہو گیا۔ مومن اور مسلم شریف میں دونوں ایک ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **فاخرجنا من كان فيها من المؤمنين فما وجدنا فيها غير بيت من المسلمين**''۔

''**يدعو الله بخير**'' اس میں حضور ﷺ کے قول یصلی کی تفسیر ہے خیر کی قید بڑھانے کے ساتھ۔ پھر دعا ثناء کو شامل ہے اور یہ دونوں زبان سے ہوتی ہیں اور کبھی دونوں ولیے بندھے ہوتے ہیں۔

"الا استجاب اللّٰہ لہ" ای بنوع من الاجابۃ۔

"ولا یستعیذ" لفظاً او قلباً۔

(من شیءٍ) کسی نفس کے شر سے یا شیطان یا معصیت یا آفت یا عار اور آگ سے۔

(الاّ اعاذہ) ای اجارہ (منہ) بقسمٍ من الاعاذۃ۔

ای موسیٰ (یضعف) لیکن میں کہتا ہوں اس کو دوسری احادیث جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور اس کے علاوہ تقویت بخشتی ہیں۔

الفصل الثّالث:

جمعہ سیّد الایام ہے

۱۳۶۳: عَنْ اَبِیْ لُبَابَةَ بْنِ عَبْدِ الْمُنْذِرِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ یَوْمَ الْجُمُعَةِ سَیِّدُ الْاَیَّامِ وَاَعْظَمُھَا عِنْدَ اللّٰہِ وَھُوَ اَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰہِ مِنْ یَوْمِ الْاَضْحٰی وَیَوْمِ الْفِطْرِ فِیْہِ خَمْسُ خِلَالٍ خَلَقَ اللّٰہُ فِیْہِ اٰدَمَ وَاَھْبَطَ اللّٰہُ فِیْہِ اٰدَمَ اِلَی الْاَرْضِ وَفِیْہِ تَوَفَّی اللّٰہُ اٰدَمَ وَفِیْہِ سَاعَةٌ لَّا یَسْئَالُ الْعَبْدُ فِیْھَا شَیْئًا اِلَّا اَعْطَاہُ مَالَمْ یَسْاَلْ حَرَامًا وَفِیْہِ تَقُوْمُ السَّاعَةُ مَامِنْ مَلَکٍ مُقَرَّبٍ وَلَا سَمَاءٍ وَلَا اَرْضٍ وَلَا رِیَاحٍ وَلَا جِبَالٍ وَلَا بَحْرٍ اِلَّا ھُوَ مُشْفِقٌ مِنْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

أخرجہ ابن ماجہ فی السنن ۳۴۴/۱ حدیث رقم ۱۰۸۴ وأحمد فی المسند ۴۳۰/۳۔

ترجمہ: حضرت ابولبابہ ابن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک جمعے کا دن تمام دنوں کا سردار ہے اور تمام دنوں میں سے زیادہ اللہ کے ہاں عظمت والا ہے۔ اور وہ اللہ کے ہاں عید اضحیٰ اور عید فطر سے بھی زیادہ عظمت والا ہے۔ اس میں پانچ خصلتیں ہیں (جن کی وجہ سے اس کو فضیلت ملی ہے) اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اسی دن میں پیدا کیا ہے اور اسی دن میں اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین کی طرف اُتارا ہے اور اسی دن میں اللہ تعالیٰ نے آدم کو وفات دی ہے اور اس میں ایک ایسی گھڑی ہے کہ بندہ جس چیز کا سوال کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو عطا کر دیتے ہیں جب تک کہ وہ حرام چیز نہ مانگے اور اسی میں قیامت قائم ہوگی۔ اور نہیں ہے کوئی مقرب فرشتہ اور نہ آسمان اور نہ ہی زمین اور نہ ہی ہوائیں اور نہ ہی پہاڑ اور نہ ہی سمندر مگر وہ ڈرتے ہیں جمعہ کے دن سے (اس لئے کہ اس میں قیامت قائم ہوگی)۔ یہ ابن ماجہ کی روایت ہے

راویٔ حدیث:

ابولبابہ۔ یہ ابولبابہ ہیں ان کا رفاعہ نام تھا۔ عبدالمنذر کے بیٹے ہیں۔ انصار و اوس میں سے ہیں۔ ان کی کنیت نام پر غالب ہے۔ نقیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ بیعت عقبہ اور غزوۂ بدر اور اس کے بعد دوسرے غزوات میں ہم رکاب ہوئے۔ بیان کیا گیا کہ غزوۂ

بدر میں شریک نہیں ہوئے بلکہ آپ ﷺ نے ان کو مدینہ کا امیر بنا دیا تھا اور غازیانِ بدر کی طرح ان کا حصہ بھی مال غنیمت میں مقرر فرمایا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انتقال فرمایا۔ ان سے ابن عمر اور نافع وغیرہ نے روایت کی۔

''لبابہ'' میں لام مضموم اور بائے موحدہ تخفیف کے ساتھ ہے۔

تشریح: ''قال رسول اللّٰہ ان یوم الجمعة سید الایام ای افضلها او ارید بالسید المتبوع کما قال: والناس لنا تبع۔

(واعظمها عند اللّٰہ) اور ظاہر ہے یہ جملہ یوم عرفہ کو بھی شامل ہے لیکن حضور ﷺ کا قول:

(وهو اعظم عند اللّٰہ من یوم الاضحی ویوم الفطر) یہ قول تساوی کا فائدہ دیتا ہے یا عرفہ کی فضیلت کا لیکن رزین کی حدیث میں ہے تمام دنوں میں افضل دن عرفہ کا دن ہے۔ اور اگر عرفہ کا دن اور جمعہ والا دن ایک ہوں تو وہ ستر حجوں سے افضل ہے اس جمعے والے دن کے علاوہ میں اور اس سے حنابلہ کی ایک جماعت نے لیا ہے۔ جمعہ کی رات لیلۃ القدر سے افضل ہے۔ اور اس کا دن عرفہ کے دن سے افضل ہے۔ اھ۔ اس میں یہ بات ہے بے شک صحیح احادیث لیلۃ القدر کی باقی تمام راتوں پر افضلیت پر صریح ہیں۔ اور قرآن کریم میں اسی پر ناطق ہے۔ اور یہ (اور اس جیسی نصوص) یوم الجمعہ کی عیدین کے دنوں پر اس اعتبار سے عظمت کا احتمال رکھتی ہیں۔ کہ جمعہ والا دن عبادت میں مشغولیت کا دن ہے اور وہ دونوں خوشی اور مسرت کے دن ہیں۔

''مالم یسأل حرامًا'' جب تک اس کی مانگی ہوئی چیز حرام نہ ہو ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ اس سے یہ بات ماخوذ ہوگی جو میں نے پہلے ذکر کی تھی کہ خیر سے مراد وہ ہے جو مباح کو شامل ہے بلکہ یہ مکروہ کو بھی شامل ہے اور اس میں یہ بات ہے یہ حدیث عموم کا فائدہ دیتی ہے۔ اور وہ پہلی معصیت کی خیر کی خصوصیت کے ساتھ تقید کے منافی نہیں ہے۔ جو مانگنے والے کو تنبیہ کرنے کیلئے ہے۔ وہ نہ سوال کرے اللہ سے مگر بھلائی کا جیسے پہلے ہم نے اس طرف اشارہ کیا تھا۔ باوجود یکہ مکروہ امر کا سوال اللہ تعالیٰ سے مناسب نہیں۔ جیسے اس کے محل میں یہ بات موجود ہے اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے یوں کہا جائے حرام ممنوع کے معنی میں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے۔ ''وحرام علی قریةٍ۔ الآیة۔ واللہ اعلم۔

وفیه تقدم الساعة: اور اسی میں اہل اطاعت کی عید ہے اسی وجہ سے یوم الجمعہ کو مؤمنین ومساکین کی عید کہا جاتا ہے۔

''ما من ملك مقربٍ ولا سماءٍ والارض ولا ریاح ولا جبال ولا بحر'' ای ولا من دآبةٍ کما تقدم۔

''من یوم الجمعة'' ای خوفا من فجأة الساعة وعظمة الساعة۔

بے شک اللہ تعالیٰ اس بڑے دن میں غضب کی صفت کے ساتھ تجلی فرمائیں گے۔ ایسی تجلی اس جیسی تجلی نہ پہلے کی اور نہ اس کے بعد کریں گے۔ (رواہ ابن ماجۃ)۔

۱۳۶۴: وروی احمد عَنْ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ اَنَّ رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَخْبِرْنَا عَنْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ مَاذَا فِیْهِ مِنَ الْخَیْرِ قَالَ فِیْهِ خَمْسُ خِلَالٍ وَسَاقَ اِلٰی آخِرِ الْحَدِیْثِ ۔

أخرجه ابن ماجه فی السنن ١/٣٤٤ حدیث رقم ١٠٨٤ وأحمد فی المسند ٣/٤٣٠۔

ترجمہ: اور احمد نے سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے اس طرح نقل کیا ہے کہ ایک انصاری صحابی نبی کریم ﷺ کی خدمت

میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ مجھے جمعہ کے دن کے بارے میں بتایئے کہ اُس دن کی کون سی خوبیاں ہیں۔
آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس دن کی پانچ خوبیاں ہیں اور باقی حدیث آخر تک اس طرح نقل کی ہے''۔

راوئ حدیث:

سعد بن معاذ۔ یہ معاذ کے بیٹے ہیں ''انصاری اشہلی'' اوسی ہیں۔ عقبہ اولیٰ اور ثانیہ کے درمیان مدینہ میں اسلام لائے۔ ان کے اسلام کو دیکھ کر ''عبدالاشہل'' کا قبیلہ اور ان کے تمام خاندان والے اسلام لے آئے۔ انصار کے تمام خاندانوں میں سے یہ پہلا خاندان تھا کہ جو اسلام لایا۔ آنحضور ﷺ نے ان کو ''سید الانصار'' کا خطاب عطا فرمایا۔ یہ اپنی قوم میں بڑے بزرگ اور سردار تسلیم کیے جاتے تھے۔ جلیل القدر اکابر اور اخیار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔ آنحضور ﷺ کے ساتھ غزوۂ بدر اور احد میں شریک ہوئے اور مقابلہ پر بہادرانہ ڈٹے رہے۔ جنگ خندق میں ان کی شہ رگ پر تیر لگا اور خون بند نہیں ہوا یہاں تک کہ ایک مہینہ کے بعد ان کی وفات ہوگئی۔ یہ واقعہ ذی قعدہ ۵ ھ کا ہے اس وقت ان کی عمر سینتیس (۳۷) برس کی تھی جنت البقیع میں سپرد خاک کیے گئے صحابہ کی ایک جماعت ان سے روایت کرتی ہے۔

تشریح: ''ما ذا فيه من الخير: قال فيه خمس خلال'' طیبیؒ نے فرمایا یہ حدیث) دلالت کرتی ہے کہ یہ خصال بھلائیاں ہیں جو اس دن کی فضیلت کو لازم کرتیں ہیں۔ قاضیؒ نے کہا حضرت آدم کی تخلیق اس دن کیلئے شرافت و امتیاز کو لازم کرتی ہے۔ اسی طرح ان کی وفات اس لئے کہ وہ ان کے جناب اقدس تک پہنچنے کا سبب و وسیلہ ہے۔ اور ان کے مصیبتوں سے خلاصی پانے کا سبب ہے اور اسی طرح قیامت کا قائم ہونا یہ بھی بھلائی ہے اس لئے کہ کمال والوں کے لئے ہمیشہ رہنے والی نعمتیں جو ان کیلئے تیار کی گئی ہیں ان تک پہنچنے کا سبب و ذریعہ ہے۔

''وساق: ای ذکر ها مرتبا الی آخر الحدیث''۔

اور ظاہر ہے پانچ خصال سے مراد حصر ہے کیونکہ ایک طریق سے وارد ہوا ہے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا یہ ہمارے ہاں یوم مزید ہوتا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے فردوس میں ایک کشادہ وادی بنائی ہے۔ مشک کے ٹیلے پر اس میں سارے انبیاء علیہم السلام بیٹھتے ہیں پھر صدیقین اور شہداء پس اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔ میں تمہارا رب ہوں میں نے تم سے اپنا وعدہ سچا کیا پس مجھ سے مانگو میں تمہیں عطاء کروں گا۔ وہ عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب ہم آپ سے آپ کی رضا کا سوال کرتے ہیں اللہ رب العزت فرماتے میں تم سے راضی ہوگیا ہوں اور تمہارے لئے مجھ پر وہ ہے جو تم تمنی کرو اور میرے پاس کچھ اور بھی ہے۔

اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ اپنی نشست گاہوں میں لوگوں کے جمعہ سے واپس ہونے کے وقت تک ٹھہرتے ہیں پھر اپنے بالا خانوں کی طرف لوٹتے ہیں اور ان کی دوسری روایت میں ہے بے شک اہل جنت جب اس وادی میں داخل ہوتے ہیں تو اپنے اعمال کی فضیلت کے اعتبار سے منازل میں اتارے جاتے ہیں پس اس کیلئے ایام دنیا میں سے جمعے والے دن کی بقدر اجازت ہوتی ہے۔ وہ اللہ کی زیارت کرتے ہیں اللہ رب العزت ان کیلئے اپنا عرش ظاہر کرتے ہیں جنت کے باغوں میں سے ایک باغیچے میں اور ان کیلئے نور کے منبر رکھے جاتے ہیں اور موتیوں کے منبر اور یاقوت کے منبر اور سونے کے منبر اور چاندی

کے منبر اور بیٹھتے ہیں ان میں سے ادنی اور ان سے بھی ادنی کافور اور مشک کے ٹیلوں پر بیٹھیں گے۔ وفی اخرٰی له ایضًا۔ بے شک اہل جنت اپنے رب کی ہر جمعہ میں زیارت کریں گے کافور کے ٹیلوں میں اور ان میں سے مجلس میں مجھ سے زیادہ قریب جمعہ والے دن جمعے کی طرف جلدی جانے والے ہوں گے۔ اور سویرے سویرے نکلنے والے ہوں گے۔ اھ۔ اور اللہ تعالیٰ مسافت وجہت سے پاک ہے یہ تو مرتبہ اور قربت سے کنایہ ہے۔

جمعہ کے دن کی خصوصیات

۱۳۶۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قِیْلَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِاَیِّ شَیْءٍ سُمِّیَ یَوْمُ الْجُمُعَةِ قَالَ لِاَنَّ فِیْهَا طُبِعَتْ طِیْنَةُ اَبِیْكَ اٰدَمَ وَفِیْهَا الصَّعْقَةُ وَالْبَعْثَةُ وَفِیْهَا الْبَطْشَةُ وَفِیْ اٰخِرِ ثَلَاثِ سَاعَاتٍ مِنْهَا سَاعَةٌ مَنْ دَعَا اللّٰهَ فِیْهَا اسْتُجِیْبَ لَهٗ۔ (رواه احمد)

أخرجه أحمد في المسند ۲/ ۳۱۱۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ شفیع عالم ﷺ سے پوچھا گیا کہ جمعہ کا نام جمعہ کیونکر رکھا گیا ہے، فرمایا اس لئے کہ اس میں تمہارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی جمع کر کے خمیر بنایا گیا اور اسی دن میں سب کو فنا کیا جائے گا (یعنی نفخہ اولیٰ ہوگا) اور اسی دن میں زندہ ہونا ہے (یعنی نفخہ ثانیہ ہے) اور اسی دن میں سخت پکڑ ہوگی (یعنی حساب وکتاب ہو گا) اور اس کی آخری تین ساعات میں ایک ایسی گھڑی ہے جو بندہ بھی اس میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا اس کی دعا قبول ہوگی۔ (امام احمد)

تشریح: ''یوم الجمعة'' نصب کے ساتھ اس لئے کہ یہ مفعول ثانی ہے۔

''قال لان فیها'' (ضمیر کو) مونث ذکر کیا ہے۔ مضاف الیہ (الجمعہ) کا لحاظ کرتے ہوئے۔

''طبعت ای خمرت و جمعت۔

''طینة ابیك آدم'' جو کہ عالم کا مجموعہ میں اور خطاب سوال کرنے والے قائل کیلئے ہے۔

''فیها الصعقة'' یعنی وہ پہلی چیخ جس سے سارے دنیا والے مر جائیں گے۔

''والبعثة'' با کے کسرہ کے ساتھ اور باء کو فتحہ بھی دیا جاتا ہے یعنی نفخہ ثانیہ جس سے تمام فانی اجساد زندہ ہو جائیں گے۔

''وفیها البطشة'' یعنی بڑی پکڑ، بڑی مصیبت قیامت والے دن میں جو مخلوقات کیلئے عام ہوگی اور جو یہ کہا گیا ہے اس سے مراد قیامت ہے وہ ضعیف ہے و کمزور ہے۔ اس لئے کہ تاسیس بہتر ہے۔ تاکید کے مقابلے میں طیبیؒ نے فرمایا ان سے اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں دریافت کیا گیا انہوں نے جواب دیا بے شک جمعہ اس کا نام یہ اس وجہ سے رکھا گیا کہ اس میں بڑے امور کا اجتماع ہو گیا۔

اور یہ بات مخفی نہیں ہے جو ہم نے ذکر کیا اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف بے شک امور مذکورہ میں جمعیت والا معنی موجود ہے۔ ہیئت مجموعیہ سے قطع نظر کرتے ہوئے۔

''وفی آخر ثلاث ساعات فیھا)ای من یوم الجمعۃ۔

''ساعۃ''طیبیؒ فرماتے ہیں اس میں صنعت تجرید ہے اس لئے کہ ساعۃ آخر ثلاث ساعاتِ کا حصہ ہے۔جیسے تیسرے قول فی البیضۃ عشرون منا من حدید میں اور بیضہ ارطال کا حصہ ہے۔

اوران کے قول کا پیچھا کیا ہے ابن حجرؒ نے جس میں بحث کا چنداں فائدہ نہیں اورشاید عدول کیا ہے۔وفی آخرھا ساعۃ کہنے سے۔

''من دعا اللّٰہ فیھا استجیب لہ''اس میں اشارہ ہے اس گھڑی سے پہلے کی دوگھڑیوں کی محافظت کی طرف اس سے قرب کی وجہ سے واللہ اعلم۔

(رواہ احمد) یعنی علی بن ابی طلحہ کی روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے اورعلی بن ابی طلحہ کا سماع حضرت ابو ہریرہؓ سے نہیں ہے اوراس کے رواۃ سے صحیح میں احتجاج کیا گیا ہے جسے میرکؒ نے منذری سے نقل کیا ہے۔

جمعہ کے دن درود پڑھنے کے فضائل

۱۳۶۶: وَعَنْ اَبِیْ الدَّرْدَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَکْثِرُوا الصَّلَاۃَ عَلَیَّ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ فَاِنَّہٗ مَشْھُوْدٌ یَشْھَدُہُ الْمَلَائِکَۃُ وَاِنَّ اَحَدًالَّمْ یُصَلِّ عَلَیَّ اِلَّا عُرِضَتْ عَلَیَّ صَلَاتُہٗ حَتّٰی یَفْرُغَ مِنْھَا قَالَ قُلْتُ وَبَعْدَ الْمَوْتِ قَالَ اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ فَنَبِیُّ اللّٰہِ حَیٌّ یُرْزَقُ ۔ (رواہ ابن ماجۃ)

أخرجہ ابن ماجہ فی السنن ۱/ ۵۲٤ حدیث رقم ۱٦۳۷۔

ترجمہ: حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں کہ شفیع کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھ پر جمعہ کے دن زیادہ درود بھیجو کیونکہ یوم جمعہ مشہود ہے اس میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور جو شخص مجھ پر درود پڑھتا ہے تو اس کا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ فارغ ہو جائے۔حضرت ابو درداء فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا،کیا وفات کے بعد بھی؟ (یعنی وفات کے بعد بھی پیش کیا جاتا ہے) تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء کے اجسام کو کھائے،چنانچہ اللہ تعالیٰ کے نبی (قبر مبارک میں) زندہ ہیں رزق دیئے جاتے ہیں۔(ابن ماجہ)

تشریح:''مشھود تشھدہ''تشہد،یا اورتا کے ساتھ یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کی تائید کرتی ہے۔کہ بے شک مشھود وہ جمعہ ہے جیسے حدیث سابق تائید کرتی ہے حضرت علیؓ کی تفسیر کی بے شک شاھد وہ جمعہ ہے اور یہی صحیح ترین ہے جو حضور ﷺ کی تفسیر کے تمام الفاظ کے موافق ہے اوراس مقام پر مشھود کا اطلاق دوسرے اختیار سے اس کے منافی نہیں ہے۔ فتدبر۔باوجودیکہ اجتماع فانہ کی ضمی اس حدیث میں ہے۔اکثار صلاۃ کی طرف راجع ہو جو اکثر اسے سمجھ میں آرہا ہے اوراس کی تائید کررہا ہے۔اسلوب کلام۔

''وان احد الم یصل علی''اطلاق اورتقیید دونوں کا احتمال ہے۔

''الا عرضت علی'' یا تو یہ عرض مکاشفے کے ذریعے ہوتا ہے یا فرشتوں کے واسطے سے۔

''صلاته'' یعنی اگرچہ ابتداء کے بعد مدت زیادہ ہو جائے۔

''حتی یفرغ منها ای من الصلاۃ یعنی سارے درود مجھ پر پیش کئے جاتے ہیں۔

''قال'' یعنی (قال کے قائل) حضرت ابوالدرداءؓ نے اس گمان سے کہا کہ یہ حیات ظاہرہ کے ساتھ مختص ہے۔

(قلت وبعد الموت) ای ایضًا اور استفہام مقدر ہے اور استبعاد پر محمول کرنا حسن اعتقاد کے خلاف ہونے کی وجہ بعید ہے یا مراد ہے موت کے بعد اس بارے میں کیا حکم ہوگا۔

(ان تأکل اجساد الانبیاء) ای جمیع اجزائهم۔ لٰہذا دونوں حالتوں میں کوئی فرق نہیں۔ اسی وجہ سے یہ قول ہے اولیاء اللہ مرتے نہیں ہیں بلکہ ایک گھر (دنیا) سے دوسرے گھر (آخرت) کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف بے شک عرض روح اور جسم کے مجموعے پر ہوان کے (انبیاء علیہم السلام) غیر کے خلاف اور جوان کے معنی میں ہیں۔ شہداء اولیاء میں سے بے شک امور کا عرض اور استیاء کی معرفت جزا ایں نیت ان کو ارواح مع الاجساد سے ہوتی ہے۔

''فنبی الله'' جنس کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ اور کسی فرد کامل کے ساتھ اختصاص کا احتمال بھی ہے۔ اور ظاہر ہے وہ پہلا قول ہے اس لئے کہ حضور ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر میں نماز پڑھتے دیکھا اور اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جیسے مسلم کی حدیث میں ہے اور حدیث صحیح ہے۔ الانبیاء احیاء فی قبورهم یصلون۔ بیہقی فرماتے ہیں اور ان کا اترنا مختلف اوقات میں متعدد جگہوں میں عقلاً ممکن ہے کما ورد به خبر الصادق''۔

''حیٌّ ای دائمًا۔ (یرزق) معنوی رزق سے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی امت کے شہداء کے حق میں فرمایا۔ بل احیاء عند ربهم یرزقون۔ پس کیا حال ہوگا ان کے سردار اور بلکہ ان کے رئیس و بڑے کا اس لئے کہ حضور ﷺ کو بھی شہادت کا مرتبہ حاصل ہے۔ مزید سعادت کے ساتھ زہر آلود بکری کے کھانے کی وجہ سے اور اس کے پوشیدہ زہر کے لوٹنے کی وجہ سے بھی دوبارہ اثر کرنے کی وجہ سے اور جزا ایں نیست اللہ نے ان کو شہادت حقیقیہ سے بچایا۔ صورۃً بشاعت کی وجہ سے اور اپنی کامل قدرت کو ظاہر کرنے کیلئے ایک آدمی کی حفاظت کے ساتھ مخلوق میں سے شریر دشمنوں کے درمیان اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ وہاں پر حسی طور پر بھی رزق موجود ہو اور وہی ظاہرُ اتبادر ہے۔

اور صحیح طور سے ثابت ہے بے شک شہداء کی ارواح سبز پرندوں کے پیٹوں میں جنت کے پھلوں سے کھاتے ہیں۔

رواہ الترمذی عن کعب مالك وفی روایۃٍ ارواح الشهداء فی اجواف طیر خضر تسرح فی الجنة حیث شاء ت وتأکل من ثمرها ثم تأوی الی قنادیل من تحت العرش۔ شہداء کی ارواح سبز پرندوں کے پیٹوں میں جنت کے اندر جہاں چاہتے ہیں گھومتی ہے۔ اور اس کے پھلوں کو کھاتی ہیں۔ پھر اللہ عرش کے نیچے قندیلوں کی طرف ٹھہر جاتے ہیں۔ پھر یہ جملہ احتمال رکھتا ہے۔ نبی ﷺ کا مقولہ ہو بطور نتیجۂ کلام کے۔ اور یہ بھی احتمال رکھتا ہے راوی کا قول ہے حضور ﷺ کے کلام سے استفادت کے طور پر یا ان کے ارشاد پر تفریع کے طور پر۔

(رواہ ابن ماجہ) ای بسناد جید نقله میرك عن المنذریؒ وله طرق کثیرة بالفاظٍ مختلفةٍ''

جمعہ کو مرنے والا فتنہ قبر سے محفوظ رہتا ہے

۱۳۶۷: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَوْ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ اِلاَّ وَقَاهُ اللّٰهُ فِتْنَةَ الْقَبْرِ رواه احمد والترمذی وَقَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَلَيْسَ اِسْنَادُهٗ بِمُتَّصِلٍ۔

أخرجه الترمذي في السنن ٣/٣٨٦ حديث رقم ١٠٧٤۔ وأحمد في المسند ٢/١٦٩۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ مدنی سرکار ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو مسلمان بھی جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات میں فوت ہو اللہ تعالیٰ اس کو فتنہ قبر (یعنی عذاب قبر سے) سے محفوظ فرماتے ہیں۔ یہ ترمذی اور مسند احمد کی روایت ہے۔

اسنادی حیثیت: امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے اس کی سند متصل نہیں ہے۔

تشریح: "قال رسول اللہ ﷺ ما من مسلم) من کی زیادتی عموم کے افادے کیلئے ہے تاکہ فاسق کو بھی شامل ہوگا مریوں کہا جائے تنوین تعظیم کیلئے ہے۔ (پس مسلم کامل کو شامل ہے)

"یموت یوم الجمعة اولیلة الجمعة" اور ظاہر ہے اور نوع بیان کرنے کیلئے ہے شک کیلئے نہیں ہے۔

"الا وقاہ اللہ ای حفظه فتنة القبر۔ یعنی اس کے عذاب اور سوال سے۔ اور یہ (جملہ) اطلاق اور تقیید دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ اور اول (اطلاق) ہی بہتر ہے مولیٰ کے فضل کی طرف دیکھتے ہوئے اور یہ (حدیث) دلالت کرتی ہے کہ شرف زمان کو بڑی تاثیر حاصل ہے۔ جیسے فضیلت مکان کو اثر جسیم حاصل ہے۔

(رواہ احمد والترمذی وقال هذا حدیث غریب ولیس اسناد بمتصل) میں کہتا ہوں۔ اس (روایت) کو سیوطیؒ نے باب من لا یسئل فی القبر میں ذکر کیا ہے اور کہا ہے اس کی تخریج احمدؒ اور امام ترمذی نے کی ہے۔ اور اسے حسن درجے کی روایت قرار دیا ہے۔ اور ابن ابی الدنیا نے ابن عمروؓ سے پھر کہا اور اس کی تخریج ابن وهب نے اپنی جامع میں کی ہے۔ اور بیہقیؒ نے بھی ایک تیسرے طریق سے موقوفاً وفی الفتان کے الفاظ کے ساتھ اس کی تخریج کی ہے۔

قرطبیؒ فرماتے ہیں یہ احادیث جو قبر کے سوال کی نفی پر دلالت کرتی ہیں گزشتہ سوال والی احادیث کے معارض نہیں ہیں۔ یعنی ان احادیث کے معارض نہیں بلکہ ان کو خاص کر دیتی ہیں۔ اور بیان کر دیتی ہیں۔ اس آدمی کے بارے میں جو قبر میں سوال نہ کیا جائے گا اور نہ ہی اس میں آزمائش میں ڈالا جائے گا۔ ان میں سے جن پر سوال جاری ہوگا۔ اور ان ہولناکیوں کو برداشت کریں گے۔ اور یہ ساری باتیں ان میں قیاس کو دخل نہیں اور نہ ہی غور وفکر کیلئے ان میں وسعت ہے۔ جز ایں نیست اس میں تو ماننا اور انقیاد ہے۔ صادق مصدوق ﷺ کے قول کی وجہ سے حکیم ترمذیؒ فرماتے ہیں جو آدمی جمعے والے دن مر گیا اس کے اور اللہ کے درمیان جو پردہ ہوتا ہے کھل جاتا ہے۔ اس لئے کہ جمعے والے دن جہنم نہیں بھڑکائی جاتی اور اس کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور آگ پر مقرر فرشتہ اس میں وہ کام نہیں کرتا جو وہ بقیہ ایام میں کرتا ہے۔ جب اللہ رب العزت اپنے بندوں

میں سے کسی بندے کی روح قبض کریں اور یہ قبض جمعے والے دن ہو جائے تو یہ اس کی سعادت اور اس کے خاتمہ بالخیر کی دلیل ہے۔ اور اللہ رب العزت نہیں قبض کرتے اس دن میں مگر اس آدمی کی روح جو اللہ کے ہاں سعادت مندوں میں سے ہو۔ اسی وجہ سے اسے قبر کے فتنہ سے بچاتے ہیں اس لئے کہ عذاب قبر سے بچانے کا سبب منافق اور مومن کے درمیان تمیز ہے۔ میں کہتا ہوں اسی کے تمتہ میں سے ہے کہ جو آدمی جمعے والے دن وفات پا جائے اس کیلئے شہید کا اجر ہے۔ لہٰذا شھداء سے سوال نہ ہونے کے قاعدے کے مطابق ہوگا۔

جیسے ابونعیمؒ سے حلیہ میں حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے حضرت جابر روایت کرتے ہیں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جو جمعے والے دن اور یا اس کی رات میں وفات پا جائے عذاب قبر سے بچا لیا جائے گا۔ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس پر شھداء کی مہر ہوگی۔ حمید نے اپنی ترغیب میں ایاس بن بکیرؓ سے تخریج کی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا **من مات یوم الجمعة کتب له اجر شهید ووقی فتنة القبر**۔ جو جمعے والے دن وفات پا جائے اس کے لئے شہید جیسا اجر لکھا جاتا ہے اور فتنہ قبر سے بچا لیا جاتا ہے۔ اور ابن جریدعن عطاء کے طریق سے تخریج کی ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ کوئی مسلمان عورت یا مرد جمعے والے دن یا جمعے والی رات وفات پا جائے اسے فتنہ قبر اور عذاب قبر سے بچایا جاتا ہے اور وہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ اس پر حساب نہیں ہوگا۔ اور قیامت والے دن اس حال میں حاضر ہوگا کہ اس کے ساتھ گواہ ہوں گے جو اس کے حق میں گواہی دیں گے یا مہر ہوگی۔ اور یہ حدیث لطیف ہے اس میں فتنہ قبر اور عذاب قبر دونوں کی تصریح کی گئی ہے۔ اھ۔ کلام السیوطی رحمۃ اللہ۔

جمعہ وعرفہ مسلمانوں کی عیدین ہیں

۱۳۶۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ قَرَاَ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الْاٰيَة وَعِنْدَهٗ يَهُوْدِيٌّ قَالَ لَوْ نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ عَلَيْنَا لَاتَّخَذْنَاهَا عِيْدًا فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَاِنَّهَا نَزَلَتْ فِيْ يَوْمِ عِيْدَيْنِ فِيْ يَوْمِ جُمُعَةٍ وَيَوْمِ عَرَفَةَ۔ (رواه الترمذی وَقَالَ هذا حديث حَسَنٌ غَرِيْبٌ)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۸/ ۲۷۰۔ حدیث رقم ۶/ ۴۶۰۔ والترمذی فی السنن ۵/ ۲۳۳ حدیث رقم ۳۰۴۴۔

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ یہ آیت پڑھی ﴿الیوم اکملت لکم دینکم﴾ (یعنی آج کے دن ہم نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا) تو آپؓ کے پاس ایک یہودی بیٹھا تھا اس نے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو اپنی عید کا دن بنا لیتے، تو ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ آیت دو عیدوں کے دن میں نازل ہوئی یعنی یوم عرفہ اور یوم جمعہ میں۔ یہ ترمذیؒ کی روایت ہے اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: "**الیوم اکملت لکم دینکم الآیة**" **قال الطیبیؒ ای کفیتکم شر عدوّکم وجعلت لکم الید العلیا** جیسے کوئی بادشاہ کہے: **الیوم اکمل لنا الملك**۔ جب وہ لوگ ملک میں جھگڑا کرنے والے سے نجات پا لیں اور اپنے اغراض ومقاصد تک پہنچ جائیں یا مطلب ہے۔ **اکملت لکم ما تحتاجون الیه فی تکلیفکم من تعلیم الحلال**

والحرام وقوانين القياس واصول الاجتهاداه۔

دوسرا آیت کے اول حصے کیلئے ظاہر ہے اور پہلا زیادہ مقام کے مناسب ہے۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے قول واتممت علیکم نعمتی میں باقی ہے۔پس مطلب ہے میں نے تم پر تمہارے دین کے ارکان کامل کر دیئے اور تم پر تمہارے دنیاوی امور بھی مکمل کر دیتے۔جو تمہاری اخروی نعمتوں کو شامل ہیں اور تمہیں تمہارے مولیٰ کی رضا تک پہنچانے والے ہیں۔

"ورضيت لكم الاسلام ديناً" ای اخترت ان يكون الاسلام وهو الانقياد التام دينا لكم۔اس لئے کہ کامل دین اللہ کے ہاں اسلام ہے جس پر کامل انعامات کا ترتب ہوگا۔

(وعنده) وعند ابن عباسؓ۔

(يهودی) ای حاضر۔

(فقال) ای اليهودی۔

(لو نزلت هذه الآية علينا لا تخذناها) ای جعلنا يوم نزولها۔

(فی يوم الجمعة ويوم عرفة) جار کے اعادے کے ساتھ ما قبل سے بدل واقع ہو رہا ہے۔مطلب یہ ہے ہم اسے خود کیا عید بناتے اللہ تعالیٰ نے ہم پر فضل واحسان کرتے ہوئے ہمارے ایسے دو دونوں میں اس آیت کو نازل فرمایا ہے۔جو ہمارے لئے عید ہیں یا مطلب یہ ہے ہمارے لئے اس آیت کے نزول کی وجہ سے خوشی دو چند ہوگی کیونکہ ہم اس وقت کی بھی تعظیم کرتے ہیں جس میں یہ نازل ہوئی۔اگر چہ اس آیت کے نزول کا وقت دو دنوں پر مشتمل ہے۔یہ نبی ﷺ پر عرفہ میں اتری جو جمعے والا دن تھا۔اسی وجہ سے اسے حج اکبر کہا جاتا ہے۔جو عام طور پر مشہور ہے۔پھر حضرت ابن عباسؓ کا جمعہ کو عرفہ پر ذکر میں مقدم کرنا یا تو اس وجہ سے ہے کہ جمعہ عرفہ سے افضل ہے یا اس وجہ سے کہ عرفہ والا دن عبادت والا دن ہے۔عرفہ کی عبادت حرمین کے ساتھ خاص ہے۔اور جمعہ والا دن مسلمانوں کیلئے عام ہے۔

قال الطیبیؒ ابن عباسؓ کا یہودی کو جواب سوال کے جواب میں زیادتی کی طرف مشیر ہے۔یعنی ما اتخذناه عيدًا واحدًا بل عيدين اور یوم کا تکرار ہر دن کو اس کے رکھے ہوئے نام کے ساتھ استقلال کی پختگی کے لئے ہے۔اور یوم کی اضافت عہدین اور یوم تکرار ہر دن کو اس کے رکھے ہوئے نام کے ساتھ استقلال کی پختگی کیلئے ہے۔اور یوم کی اضافت عیدین کی طرف ایسے ہی ہے جیسے یوم کی اضافت جمع کی طرف ہے۔ای يوم الفرح المجموع والمعنى يوم الفرح الذی يعودون مرة بعد اخرىٰ فيه الى السرور قال الراغب العيد ما يحاود مرة بعد اخرىٰ ۔اور شریعت میں یوم الفطر اور یوم النحر کے ساتھ خاص ہے۔اور جب یہ دن شریعت کے اندر خوشی کیلئے مقرر کیا گیا ہے۔جیسے جس کی طرف نبی ﷺ نے اپنے قول: ايام منى ايام اكل وشرب وبعالٍ کے ساتھ تنبیہ کی ہے پھر یہ لفظ عید ہر اس دن کیلئے استعمال ہونے لگا جس میں مسرت وخوشی ہو۔

واخرج ايضًا من طريق جعفر بن عون حدثنا ابو العميس اخبرنا قيس بن مسلم عن طارق بن شهاب عن عمر بن الخطاب یہود میں سے ایک آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا اے امیر المؤمنین آپ کی کتاب میں ایک آیت

ہے جسے آپ لوگ پڑھتے ہو اگر ہم یہود کی جماعت پر اترتی ہم اس کو عید قرار دے دیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کونسی آیت ہے اس یہودی نے کہا (الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینًا) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا ہم اس دن کو پہچانتے ہیں۔ اور اس جگہ کو بھی پہچانتے ہیں جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اتریا اور وہ یہ ہے عرفہ میں کھڑے تھے جمعے والے دن وفی روایة الطبرانی فی تفسیرہ من روایة اسحاق بن قبیصة نزلت یوم جمعة یوم عرفة و کلاھما بحمد للّٰہ لنا عید۔

وعند الطبرانی فی الاوسط وھما لنا عیدان، والرجل المبھم المذکور فی الروایة الثانیة بلخاری ھو کعب الاحبار کذا جاء مسمی فی مسند مسدد با سناد حسن۔

اوردہ ابن عساکر فی اول تاریخ دمشق من طریقه وھو فی المعجم الاوسط للطبرانی من ھذا الوجه۔ وکان بسؤاله لعمر قبل ان یسلم ولعل سواله کان فی جماعة منھم ولذا قال فی الروایة الاولی قالت الیھود واللّٰہ اعلم۔

۱۳۶۹: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا دَخَلَ رَجَبٌ قَالَ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ رَجَبَ وَشَعْبَانَ وَبَلِّغْنَا رَمَضَانَ قَالَ وَكَانَ يَقُوْلُ لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ لَيْلَةٌ اَغَرُّوَيَوْمُ الْجُمُعَةِ يَوْمٌ اَزْهَرُ۔

(رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي الدَّعواتِ الْكَبِيْرِ)

أخرجه البيهقي في شعب الايمان ۳/۳۷۵ حديث رقم ۳۸۱۵۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب رجب کے مہینے میں داخل ہوتے (یعنی رجب کا مہینہ شروع ہوتا) تو فرماتے اے اللہ ہمارے لیے برکت ڈال دے رجب اور شعبان میں، اور ہمیں رمضان تک پہنچا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی فرماتے تھے کہ جمعہ کی رات روشن رات ہے اور جمعہ کا دن چمکتا دن ہے۔ (بیہقی)

تشریح: (قال: اللھم بارك لنا) ای فی طاعتنا وعبادتنا۔

(فی رجب وشعبان وبلغنا رمضان) ای ادراکه بتمامه والتوفیق لصیامه وقیامه

(قال) ای انس۔

وکان یقول ﷺ لیلة الجمعة لیلة اغرّ: طیبیؒ نے فرمایا ای انور من الغرة اھ۔ اس کی رات کو اس کے دن کی جگہ اتارا گیا ہے اور اس کی اغر صفت ذکر کی گئی ہے۔ مشاکلت کے طریقے پر۔ یا (اغتر کو) مذکر اس اعتبار سے ذکر کیا ہے کہ لیلۃ لیل کے معنی میں ہے۔ تا وحدت جنس کیلئے ہے نہ کہ تانیث کیلئے۔

"یوم الجمعة یوم ازھر" قال الطیبیؒ الازھر الابیض ومن الکفروا الصلاة علی فی اللیلة القرآ والیوم الازھر ای لیلة الجمعة ویومھا۔ اھ۔

اور نورانیت ان دونوں میں معنوی یا تو ان دونوں کی ذاتی ہے۔ پھر تو نسبت حقیقی ہے۔ یا جمعہ روز اس کی رات میں عبادت

کی وجہ سے تو پھر نسبت مجازی ہے۔

بَابُ وُجُوبِهَا

جمعہ کے واجب ہونے کا بیان

شرح السنہ میں ہے جمعۃ المبارک فرض عین چیزوں میں سے ہے عند اکثر اهل العلم اور کچھ اہل علم کے نزدیک فرض کفایہ چیزوں میں سے ہے نقله الطیبیؒ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں جمعہ کتاب اللہ اور سنت اور اجماع کی بنیاد پر فریضہ محکمہ ہے۔ اور ہمارے اصحاب نے تصریح کی ہے۔ جمعہ نماز ظہر سے زیادہ مؤکد ہے اور اس کے منکر کے کفر کی بھی تصریح کی ہے۔ کتاب الرحمۃ میں اختلاف الامۃ کے تحت ہے۔ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ جمعہ فرض عین ہے اور ان کی تغلیط کی ہے۔ جو فرض کفایۃ ہونے کے قائل ہیں۔

الفصل الاول:

ترکِ جمعہ پر مہر جباریت کا لگنا

۱۳۷۰: عَنِ ابْنِ عُمَرَ وَ اَبِی هُرَیْرَةَ اَنَّهُمَا قَالَا سَمِعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ عَلٰى اَعْوَادِ مِنْبَرِهٖ لَيَنْتَهِيَنَّ اَقْوَامٌ عَنْ وَدْعِهِمُ الْجُمُعَاتِ اَوْلَيَخْتِمَنَّ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ثُمَّ لَيَكُوْنُنَّ مِنَ الْغَافِلِيْنَ - (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٢/٥٩١ حديث رقم (٤- ٨٦٥)- والنسائي في السنن ٣/٨٨ حديث رقم ١٣٧٠- وابن ماجه ١/٢٦٠ حديث رقم ٧٩٤ والدارمي في السنن ١/٤٤٤ حديث رقم ١٥٧٠- وأحمد في المسند ٢/٨٤-

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ دونوں سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے اپنے منبر کی لکڑی پر (یعنی منبر پر بیٹھ کر) فرما رہے تھے لوگ جمعہ چھوڑنے سے ضرور باز آ جائیں ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دیں گے پھر وہ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔

تشریح: "سمعنا رسول اللہ ﷺ یقول علی اعواد منبره) ای درجاته او متکئًا علی اعواد منبره فی المدینة" (یعنی منبر کے درجوں پر تھے یا منبر کی لکڑیوں کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے)۔ اور اس جملے کو کمال نصیحت پر دلالت کی وجہ سے ذکر کیا اور اس حدیث کے مشہور ہونے کی طرف اشارے کیلئے ذکر کیا۔

(لینتھین اقوام) لام اس میں ابتدائیہ ہے اور وہ جواب قسم ہے اور اس کے بارے میں تفصیلی بحث باب المفاخرہ میں آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

(ودعهم) واؤ کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ اور پہلے یہ گزر چکا کہ اس جیسے کلمے کو مابعد کے ساتھ ملانے میں تین صورتیں ہیں۔

(الجمعات) ای عن ترکهم ایاها والتخلف عنها ودع یدع ودعًا بمعنی ترک سے ہے کذا فی النہایہ طیبیؒ فرماتے ہیں نحاۃ کا قول ہے۔ اہل عرب نے یدع کے مصدر اور ماضی کو گویا مار دیا ہے اور اس سے بے نیاز ہو گئے ترک کی وجہ سے۔ اور نبی ﷺ افصح العرب ہیں لہٰذا کے قول کو قلت استعمال پر محمول کیا جائے گا۔ یہ استعمال میں شاذ ہے لیکن قیاسی قاعدے میں درست ہے۔

اور ایک قراءۃ شاذہ میں ما ودعك ربك دال کی تخفیف کے ساتھ بھی آیا ہے۔ اور صوفیوں پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے کہا ہے یدع میں واؤ کا حذف دلالت کرتا ہے۔ اس بات پر کہ محذوف واؤ ہے۔ یا نہیں اس لئے کہ اگر یا ہوتا تو حذف نہ ہوتا گویا کہ انہوں نے قراۃ وحدیث کی معرفت میں غور نہیں کیا۔

اس لئے ہمارے ائمہ میں سے تورپشتیؒ فرماتے ہیں نحاۃ کے قول کا اعتبار نہیں نبی ﷺ کا قول وہ دلیل فیصل ہے۔ ہر فصاحت والے پر۔

(او لیختمن الله علی قلوبهم) ای لیمنعنهم لطفه وفضله۔ یعنی ان سے اپنے فضل ولطف کو روک لے گا اور ختم طبع ہے۔ اور وہ ران رین ہے۔ (یعنی رنگ جس کا ذکر کلا بل ران علی قلوبهم میں ہے)۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں متکلمین نے اس میں بہت اختلاف کیا ہے ایک قول ہے اس ختم وطبع سے مراد الطاف ربانی اور اسباب خیر کا نہ ہونا ہے۔ اور ایک قول ہے اس سے مراد ان کے سینوں میں کفر کی تخلیق ہے اور یہی اکثر اہل سنت کے متکلمین کا قول ہے۔ نقله المیرك عن التصبح

(ثم لیکونن من الغافلین) ای معدودین فی جملتهم طیبیؒ فرماتے ہیں ثم تراخی رتبہ کیلئے ہے۔ ان کا غافلین کے مجموعے میں سے ہونا جو ان کی غفلت کو بتلاتا ہے زیادہ رائی ہے ان کی بدبختی کیلئے اور زیادہ ناطق ہے۔ ان کے خسارے کے بارے میں ان کے مطلق مہر زدہ ہونے کے مقابلے میں ہے۔

قاضیؒ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے دونوں باتوں میں سے ایک ابدی ہے۔ یا تو جماعت چھوڑنے سے رک جائیں۔ یا اللہ ان کے دلوں کو مہر زدہ کر دیں گے جمعہ چھوڑنے کی عادت بنانا دل پر زنگ کو غالب کرتا ہے اور اطاعت کے بارے میں نفوس میں اعراض پیدا کرتا ہے۔ اور یہ مؤدی ہوتا ہے اس بات کی طرف کہ وہ غافلین میں سے ہو جاتے۔

(رواہ مسلم) وابن ماجة وغیرهما قاله میركؒ۔

الفصل الثانی:

۱۳۷۱: عَنْ اَبِی الْجَعْدِ الضُّمَرِیْ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَكَ ثَلَاثَ جُمَعٍ تَهَاوُنًا بِهَا طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قَلْبِهٖ (رواہ ابوداود والترمذی والنسائی وابن ماجة والدارمی)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ١/٦٣٨ حديث رقم ١٠٥٢۔ والترمذی فی السنن ٢/٣٧٣۔ حديث رقم ٥٠٠۔ والنسائی ٣/٨٨ حديث رقم ١٣٦٩۔ وابن ماجه ٢/٣٥٧ حديث رقم ١١٢٥۔ والدارمی فی السنن ١/٤٤٤ حديث رقم ١٥٧١وأحمد فی المسند ٣/٤٢٤۔

ترجمه: حضرت ابو جعد ابن ضمری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرتاج انبیاء کرام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص محض سستی کی وجہ سے تین جمعہ کو چھوڑ دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دے گا۔ یہ ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی کی روایت ہے۔

راویٔ حدیث:

ابو الجعد۔ یہ ابو جعد ضمیری ہیں۔ ان کے نام کے بارے میں کئی اقوال ہیں: ① وہب۔ ② اُدرع ③ عمرو بن بکر ④ جنادہ ⑤ عمرو بن الجابر۔ امام تروذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے بخاری رحمہ اللہ سے ان کا نام پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہی ان کا نام ہے اور یہی ان کی کنیت ہے ابو جعد کا شمار صحابہ میں ہوتا ہے ان کا نام وہب ہے ان سے روایت حدیث عبیدہ بن سفیان نے کی ہے۔ ان سے صرف ایک حدیث مروی ہے۔ جنگ جمل کے دن قتل کر دیئے گئے۔ عبیدہ عین کے زبر اور باء کے زیر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

ضمیری کے ضبط کے بارے میں اختلاف ہے: ① ضمیری' صاد معجمہ کے ضمہ اور میم کے فتح کے ساتھ۔ ② ضمری ضاد معجمہ کے فتحہ اور میم کے سکون کے ساتھ۔ بنو ضمرہ بن بکر بن عبد مناف کی طرف منسوب ہے' اور ایک قول یہ ہے کہ رمرو بن امیہ ضمری کی طرف منسوب ہے۔

تشریح: ''عن ابی الجعد الضمیری'' ضاد کے ضمہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ اسی طرح سارے نسخوں کے اندر ہے۔ میرک رحمہ اللہ نے اپنے نسخے کے حاشیے میں لکھا ہے۔ صوابہ الضمر ی پھر اس کے نیچے لکھا ہے من بنی ضمرة بن بکر بن عبد مناف اور یہی معتمد کتب کے موافق ہے۔ جامع الاصول میں ضاد کے فتحہ اور میم کے سکون کے ساتھ ضمرة بن بکر بن عبد مناف کی طرف منسوب ہے۔ اس طرح منقول ہے مغنی ابن قدامہ میں اور اسی طرح منضبط کیا ہے الانساب کے اندر اور کہا ہے منسوب الی ضمرة رهط عمرو بن امية الضمری اھ۔

ان کے نام کے بارے میں ایک قول ہے کہ ان کا نام ادرع ہے۔ اور ایک قول میں عمرو بن بکر اور جنادۃ بھی ذکر کیا ہے اور عمرو بن ابی بکر بھی منقول ہے۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں امام بخاری رحمہ اللہ سے ابی الجعد کے نام کے بارے میں دریافت کیا وہ نہیں جانتے تھے اور وہ صحابی رضی اللہ عنہ تھے اور ان کیلئے حدیث ہے۔ یوم الجمل والے دن شہید ہوئے۔ نقلہ میرک مؤلف کہتے ہیں ان کا نام کنیت ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ان کا نام وھب ہے۔

قال: قال رسول الله ﷺ من ترك ثلاث جمع ''لفظ جمع جیم کے ضمہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ جمعۃ کی جمع ہے۔

''تهاونًا بها'' قال الطيبیؒ ای اهانةً وقال ابن الملك ای تساهلاً عن التقصير لا عن عذرٍ۔

(طبع الله) ای ختم

(علی قلبه) (اس کے دل پر مہر لگا دیتے ہیں) خیر کے پہنچنے کو روک کر اور ایک قول ہے اس کو منافق لکھ دیتے ہیں۔

"رواہ ابوبکر والترمذی" میرک کہتے ہیں امام ترمذیؒ نے اسے حسن درجے کی روایت قرار دیا ہے۔

(والنسائی ابن ماجة والدارمی) یہ روایت مختلف طرق سے منقول ہے اور محدثین نے اسے حسن درجے کی روایت قرار دیا ہے بعض نے صحیح علی شرط مسلم بھی کہا ہے۔ بعض نے یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔ من ترک الجمعة ثلاثًا من غیر عذرٍ فھو منافق۔

۱۳۷۲: ورواہ مالك عَنْ صَفْوَانَ بْنَ سُلَيْمٍ ۔

ترجمہ: اور امام مالکؒ نے اس روایت کو صفوان بن مسلم سے۔

"ورواہ مالك عن صفوان بن سلیم" سلیم تصغیر کے ساتھ ہے۔

راویٔ حدیث:

صفوان بن سلیم۔ یہ صفوان بن سلیم "زہری" ہیں۔ حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف کے آزاد کردہ ہیں۔ مدینہ کے مشہور اور جلیل القدر تابعین میں سے ہیں۔ انس ابن مالک رضی اللہ عنہ اور کچھ تابعین سے روایت کرتے ہیں۔ اللہ کے صالح اور برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ چالیس (۴۰) سال تک پہلو زمین کو چھوایا تک نہیں۔ لوگ کہتے تھے کہ ان کی پیشانی کثرتِ سجود کی وجہ سے زخمی ہوگئی تھی۔ شاہی عطیات کو قبول نہیں کرتے تھے۔ ان کے مناقب بہت زیادہ ہیں۔ ۱۳۲ھ میں انتقال ہوا ان سے ابن عیینہ روایت کرتے ہیں۔

۱۳۷۳: وَاَحْمَدَ عَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ ۔

ترجمہ: اور امام احمدؒ نے ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

تشریح: (واحمد) قال میرك باسناد جید

(عن ابی قتادة) میرک فرماتے ہیں اس کے الفاظ یہ ہیں "من ترك الجمعة ثلاث مرات من غیر ضرورة طبع الله علی قلبه)۔

محدثین عظام نے اس روایت کو مختلف طرق اور مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض روایات میں ہے جس نے تین جمعے بغیر عذر کے چھوڑ دیئے اللہ اس کے دل پر مہر لگا دیتے ہیں اور ایک میں ہے اسے منافقین میں سے لکھ دیتے ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے اس نے اسلام کو پس پشت ڈال دیا۔ انتہیٰ۔

نمازِ جمعہ کا کفارہ

۱۳۷۴: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ فَلْيَتَصَدَّقْ بِدِيْنَارٍ فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ فَبِنِصْفِ دِيْنَارٍ ۔ (رواہ احمد وابوداود وابن ماجة)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ١/٦٣٨ حديث رقم ١٠٥٣۔ والنسائي ٣/٨٩ حديث رقم ١٣٧٢۔ وابن ماجه ١/٣٥٨ حديث رقم ١١٢٨۔ وأحمد في المسند ٥/٨۔

ترجمہ: حضرت سمرہ ابن جندبؓ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ خاتم الانبیاء ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص بغیر عذر کے نماز جمعہ ترک کردے، تو اسے چاہئے کہ وہ ایک دینار صدقہ دے، اگر ایک دینار نہ پائے تو آدھا دینار دے۔

(مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: "وعن سمرة بن جندب" (جندب) دال کے ضمہ اور اس کے فتحہ کے ساتھ (دونوں طرح درست ہے) مفاتیح کے اندر ہے۔ امر یہاں ندب کیلئے ہے تا کہ ترک جمعہ کا گناہ زائل ہو جائے۔

(بدينارٍ) الازھار میں ہے دینار صدقہ کرے بطور کفارہ گناہ کے۔

(فان لم يجد) یعنی اگر دینار کامل نہ پائے۔

(فبصف دينار) اى فليتصدق بنصفه"

(رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجۃ) قال میرک والنسائی۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں یہ تصدق گناہ کو بالکل نہیں اٹھاتا کہ یہ حدیث من ترك الجمعة من غير عذر لم يكن لها كفارة دون يوم القيامة کے منافی ہو جائے ہاں اس تصدق سے گناہ میں تخفیف کی امید ہے۔ اور دینار اور نصف دینار کا ذکر کامل مقدار کا بیان ہے۔ لہٰذا درہم اور نصف درہم اور گندم کا صاع یا نصف صاع کے منافی نہیں جو ابوداؤد کی راویت میں مذکور ہے۔ ابوداؤد کی روایت میں اس کم از کم مقدار کا بیان ہے۔ جس سے لذت حاصل ہو جاتا ہے۔

اذانِ جمعہ سن کر جمعہ کی تیاری واجب ہو جاتی ہے

۱۳۷۵: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْجُمُعَةُ عَلٰى مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ۔

(رواه ابو داود)

أخرجه أبو داوٗد في السنن ١/٦٤٠ حديث رقم ١٠٥٦۔ والدارقطني ٢/٦ حديث رقم ٢ من باب الجمعة على من سمع النداء۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ خاتم الرسل ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ ہر اُس شخص پر فرض ہے جو اذان سُنے۔ (ابوداؤد)

تشریح: "الجمعة على من سمع النداء" وهو الاذان اول الوقت۔ یہ اول وقت کی اذان ہے جیسے ہمارے زمانے میں متعارف ہے تا کہ لوگ جمعے کے وقت کو جان جائیں اور اللہ کے ذکر کیے سعی کر سکیں۔ اور حاضر ہو سکیں۔ ابن الملک نے ذکر کیا ہے اس اذان کو حضرت عثمانؓ نے زیادہ کیا تھا تا کہ آواز مدینہ کے اطراف تک پہنچ سکے۔ (ملا علی قاریؒ علیہ الرحمۃ الباری فرماتے ہیں) اس حدیث کو ظاہر پر محمول کرنا بہت بعید ہے۔ بہتر یہ ہے یوں مراد بیان کی جائے کہ جمعہ اس شخص پر واجب

ہے جس کے مقام اور شہر کے درمیان آواز پہنچنے کی مقدار فاصلہ ہو (یعنی شہر سے اسے کوئی پکارے تو جہاں وہ ہے وہ سن سکے) ھذا ای خذ ھذا۔

منیہ کی شرح میں مذکور ہے جمعہ اس شخص پر واجب ہے جو شہر مصر کے اطراف میں ہو اس کے اور شہر کے درمیان فاصلہ نہ ہو بلکہ مکانات ملے ہوئے ہوں۔ مراد یہ ہے اذان اگرچہ نہ سن سکے۔ اور اگر اس کے اور شہر کے درمیان کھیت اور چراگاہوں کے حائل ہونے کی وجہ سے فاصلہ ہو تو اس پر جمعہ واجب نہیں اگرچہ اذان سنتا ہو۔

امام محمدؒ سے منقول ہے اگر اذان کی آواز سنتا ہو تو اس پر جمعہ واجب ہے۔ اھ۔ اور مسافر پر بالاتفاق جمعہ واجب نہیں۔

۱۳۷۶: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ الْجُمُعَةُ عَلٰی مَنْ اٰوَاهُ اللَّیْلُ اِلٰی اَهْلِهٖ۔

(رواہ الترمذی وقَالَ هٰذَا حَدِیْثٌ اِسْنَادُہٗ ضَعِیفٌ)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/۳۷٦ حدیث رقم ۵۰۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ صاحب شریعت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نماز جمعہ ہر اس شخص پر فرض ہے کہ جو رات کو اپنے گھر واپس آسکے۔ یہ ترمذی کی روایت ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

تشریح: ''اللیل الی اهله'' نہایہ میں ہے عرب کہتے ہیں اویت الی المنزل و آویت غیری و اویته۔ اور حدیث باب متعدی سے ہے۔ مظہر کہتے ہیں جمعہ اس شخص پر واجب ہے۔ جس کے وطن اور وہ جگہ جس میں جمعہ ادا کیا جاتا ہے اتنا فاصلہ ہو کہ وہاں سے ادائیگی جمعہ کے بعد رات ہونے سے قبل وطن لوٹ آئے۔ یہی قول امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ اور حضرت امام صاحبؒ کے نزدیک یہ شرط ہے کہ اس شخص کے وطن کا خراج اس شہر کے دفتر میں منتقل ہوتا ہو جہاں جمعہ کیلئے جاتا ہے۔ اور اگر اس کے وطن کا دیوان و دفتر شہر کے دیوان و دفتر سے الگ ہے تو پھر اس پر جانا واجب نہیں ذکرہ الطیبی اور معتمد وہ ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے۔

اور علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں جو شہر کے توابع میں سے ہے۔ ان کا حکم جمعہ کے واجب ہونے میں مثل شہر والوں کے ہے۔ پھر توابع مصر میں بھی اختلاف ہے۔ امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ اگر کوئی ایسی جگہ ہے جس میں شہر سے اذان سنائی دیتی ہو تو وہ توابع مصر میں داخل ہے۔ ورنہ نہیں۔ اور امام ابو یوسفؒ ہی سے منقول ہے اس کی مقدار تین فرسخ تک ہے بعض کا قول ہے ایک میل کی بقدر عند البعض دو میلوں کی بقدر۔ اور ایک قول ہے چھ امیال کی بقدر۔ اور ایک قول یہ بھی ہے اگر کسی آدمی کیلئے ممکن ہو جمعہ میں شریک ہو اور بغیر مشقت و تکلف کے رات اپنے اہل وعیال کے ساتھ گزار سکتا ہو تو اس پر جمعہ واجب ہے ورنہ نہیں۔ اور بدائع الصنائع کے اندر ہے۔ و ھذا حسن۔

(رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث اسنادہ ضعیف)

نمازِ جمعہ کیلئے جماعت شرط ہے

۱۳۷۷: وَعَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ

عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ فِیْ جَمَاعَۃٍ اِلَّا عَلٰی اَرْبَعَۃٍ عَبْدٍ مَّمْلُوْکٍ اَوِامْرَاَۃٍ اَوْصَبِیٍّ اَوْمَرِیْضٍ۔

(رواہ ابوداود وفی شرح السنۃ بِلَفْظِ الْمِصَابِیْحِ عَنْ رَجُلٍ مِنْ بَنِی وَائِلٍ)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲/۶٤٤ حدیث رقم ۱۰٦۷۔ والدارقطنی ۲/۳ حدیث رقم ۲ من باب من تجب علیه الجمعة۔

ترجمہ: حضرت طارق بن شہابؓ راوی ہیں فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا جمعہ حق ہے اور سوائے چار آدمیوں کے ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب ہے (وہ چار آدمی یہ ہیں) غلام جو کسی کی ملکیت میں ہو عورت یا بچہ یا مریض۔ (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

طارق بن شہاب۔ یہ طارق بن شہاب ہیں جن کی کنیت ''ابوعبیداللہ'' ہے ''بجلی وکوفی'' ہیں۔ زمانہ جاہلیت (یعنی اسلام سے پہلے زمانہ) میں موجود تھے۔ آنحضور ﷺ کو بھی دیکھا۔ آپ ﷺ سے سماع حدیث میں بہت کم احادیث سنی ہیں۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ۳۳ غزوات میں شریک ہوئے۔ ۸۲ھ میں وفات پائی۔

تشریح: ''وعن طارق بن شهاب قال: قال رسول اللّٰه الجمعة حق''۔

مراد یہ ہے اس کی فرضیت کتاب وسنت سے ثابت ہے۔

(**واجب**) واجب سے مراد فرض تاکیدی ہے۔

(**علی کل مسلم**) اس میں رد ہے اس شخص کا جو اس کے فرض علی الکفایۃ ہونے کا قائل ہے۔

(**فی جماعۃ**) اس لئے کہ جمعہ مخصوص جماعت کے ساتھ ہی درست ہوتا ہے اجماع کی بناء پر۔ پھر اس جماعت کے عدد میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی کم سے کم مقدار ہے۔ کہ امام کے علاوہ تین آدمی ہوں۔ اور یہ بھی شرط نہیں کہ ان میں سے ہوں جنہوں نے خطبہ سنا ہے اور صاحبینؒ فرماتے ہیں امام کے علاوہ دو ہوں۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا مذہب یہ ہے پورے چالیس ہونے ضروری ہیں۔ دار قطنی کی اس روایت کی بناء پر جو انہوں نے اپنی سنن میں ذکر کی ہے۔ عن جابرؓ: **مضت السنة ان فی کل اربعین فما فوقه جمعة** اھ۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں حدیث جابرؓ ضعیف حدیث ہے امام بیہقیؒ نے کہا ہے۔ **لا یحتج بمثله**۔

(**الا علی اربعۃ**) طیبی کہتے ہیں الا غیر کے معنی میں ہے اور اس کا مابعد مجرور صفت ہے۔ مسلم کی تقدیر ہوگی۔ **علی کل مسلم غیر**۔

(**عبد مملوك او امرأة او صبی**) اور ان کے حکم میں مجنون ہے۔

''**او مریض**) مطلب یہ ہے ایسا مرض لاحق ہو جس کی وجہ سے عادۃً جمعہ میں شریک ہونا مشکل ہوتا ہے۔ اور اس کے حکم میں داخل ہے مسافر اور مسافر کا صراحتاً ذکر آئندہ حدیث میں آئے گا۔ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ کمزور قسم کا بوڑھا آدمی مریض کے ساتھ لاحق ہے۔ لہٰذا اس پر بھی جمعہ واجب نہیں اھ۔

اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اندھے پر مطلقاً جمعہ واجب نہیں اور صاحبین کے نزدیک اندھے پر جمعہ واجب ہے اگر اسے لے جانے والا موجود ہو۔ اور لنجے اور جس کے دونوں پاؤں کٹے ہو اس پر جمعہ واجب نہیں اگر چہ ان کو اٹھا کر لے جانے والا موجود ہو۔ اور ایسا تیمار دار مریض کی طرح ہے۔ (فی عدم الوجوب)۔ جس کے جانے سے مریض کے ضائع ہو جانے کا خوف ہو۔ علی الاصح۔ کذا فی شرح المنیه اور کچھ نسخوں میں عبد اور اس کا مابعد رفع کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں یہ مبتدأ محذوف کی خبر ہوگی۔ وہ ہے هم ضمیر اور أو واؤ کے معنی میں ہوگا۔

(رواه ابو داؤد) ابوداؤدؒ فرماتے ہیں طارق بن شہابؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا لیکن ان سے سماع نہیں کیا خطابیؒ کہتے ہیں پس اسناد هذا الحدیث بذالک۔

نوویؒ فرماتے ہیں اس سند کے رجال صحیحین کے رجال ہیں۔ اور جو ابوداؤد نے ذکر کیا وہ اس سند کی صحت میں عیب و جرح کا باعث نہیں اگر چہ ان کا سماع ثابت نہیں تو یہ مرسل صحابی ہے جو بالاتفاق حجت ہے۔ ذکرہ میرکؒ۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں یہ ان کی حجت اور نہ ہی حدیث میں عیب ہے۔ بلکہ بیان واقع ہے امام بیہقیؒ نے بخاری کے طریق سے نقل کیا ہے۔ عن تمیم الداریؓ مرفوعًا الجمعه واجبة الاعلی بها او مملوك او مسافر ورواه الطبرانی عن الحکم بن عرویه وزادفیه المرأة والمریض۔

(من بنی وائل) یہ شرح السنہ کے الفاظ ہیں اسی طرح محمد بن کعب سے ہے انہوں نے بنی وائل کے ایک آدمی سے سنا۔ یقول قال النبی ﷺ تجب الجمعة علی کل مسلم الا امرأة اوجی او مملوك۔ اور ان سے نقل کیا ہے طارق بن شہابؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے وزاد اور مریض اور طارق بن شہابؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا لیکن ان سے سماع نہیں کیا اور مصابیح السنہ میں بھی اور مریض کی زیادتی نہیں ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں یہ روایت سند صحیح کے ساتھ علی شرط الشیخین انہی الفاظ کے ساتھ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے بھی آتی ہے۔ لیکن انہوں نے الاربعۃ کے بعد والے کلام کو ساقط کر دیا۔

(شارح کہتے ہیں) میں کہتا ہوں یہ روایت ابن ہمامؒ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے۔ الجمعة حق واجب علی کل مسلم فی جماعة الا اربعة مملوك او امرأة اوصبی او مریض۔ اور کہا ہے امام ابوداؤد نے اس روایت کو طارق بن شہاب سے نقل کیا ہے۔

الفصل الثالث:

تارکِ جمعہ کیلئے وعید شدید

۱۳۷۸: عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِقَوْمٍ يَتَخَلَّفُوْنَ عَنِ الْجُمُعَةِ

لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اٰمُرَ رَجُلاً يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ ثُمَّ اُحَرِّقُ عَلٰى رِجَالٍ يَتَخَلَّفُوْنَ عَنِ الْجُمُعَةِ بُيُوْتَهُمْ۔

(رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١/٤٥٢ حديث رقم (٢٥٤۔ ٦٥٢)۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جمعہ سے پیچھے رہ جانے والوں کے متعلق فرمایا کہ میں نے ارادہ کیا کہ میں کسی آدمی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو نماز جمعہ پڑھائے اور پھر میں ایسے لوگوں کے گھر جلادوں جو کہ جمعہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ (مسلم)

تشریح: (عن ابن مسعود ان النبی ﷺ قال لقوم) ای فی شأنهم،

ابن حجرؒ نے اععتهم کہا ہے جو کہ درست نہیں جیسا کہ مخفی نہیں۔

(يتخلفون عن الجمعة) طیبیؒ فرماتے ہیں حدیث کا مطلب باب الجماعات میں گزر چکا۔

(لقد هممت ان آمر رجلا يصلی الناس ثم احرق) احرق نصب کے ساتھ اور ایک نسخہ میں تشدید کے ساتھ بھی ہے۔

(علی رجال يتخلفون) ای بغير عذرٍ۔

(عن الجمعة) ای عن اتيانها۔

(بيوتهم) باء کے ضمہ کے ساتھ احرق کا مفعول ہے حدیث کا مطلب یہ ہے میں ارادہ کرتا ہوں نماز میں اپنا خلیفہ مقرر کرو۔ پھر اپنے خدام کے ساتھ متخلفین کی طرف جاؤں اور ان کے گھر ان کے جانوں اور مال ومتاع سمیت جلا دوں۔ اس میں ایسی وعید ہے جو بیان سے باہر ہے۔

السیر بادشاہ رحمہ اللہ کہتے ہیں اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ حضور ﷺ جمعہ فرض چھوڑ کر کیسے ان متخلفین کے معاملے میں مشغول ہو سکتے تھے۔

میں جواب دیتا ہوں کہ اس کلام سے مقصود تغلیظ ومبالغہ ہے۔ حقیقت مقصود نہیں اور یہ بھی ہے کہ کسی مصلحت کی بناء پر بدل کی طرف چھوڑنا جائز ہو جبکہ حضور ﷺ کے اجتہاد میں یہ بات آجاتی۔ لیکن احراق اس وقت متصور ہے۔ جبکہ ان کا پیچھے رہنا انکار کی وجہ سے ہو اور شاید یہ واقعہ تحریق کے نسخ سے پہلے کا ہے۔

(قلت) میں کہتا ہوں خلیفہ مقرر کرنے میں جمعہ کو شروع سے چھوڑ دینا لازم نہیں آتا۔ اس میں تکرار کا تصور ہے۔ جیسا کہ اب یہ مسئلہ مسائل اختلافیہ میں سے ہے۔

شرح منیہ میں ہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ظاہر الروایۃ میں ہے شہر میں جمعہ صرف ایک جگہ ہو سکتا ہے۔ نہ کہ زیادہ میں اور انہی سے امام محمدؒ کے قول کے مطابق بھی منقول ہے جس میں ہے کہ جمعہ شہر میں متعدد جگہوں پر بھی درست ہے۔ اور ایک قول کے مطابق یہی صحیح ترین قول ہے۔ امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے دو جگہوں میں ہو سکتا ہے۔ نہ کہ زیادہ میں۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب میں صحیح ترین قول یہ کے مطابق جمعہ کے شہر کے اندر دو اور دو سے زیادہ

مساجد میں قائم کرنا جائز ہے۔اور اسی قول کو ہم لیتے ہیں۔حدیث لا جمعة الافی مصر کے اطلاق کی وجہ سے جب جمعہ شہر میں ثابت ہوگیا تو سارے شہر میں اس کا ثبوت ہوگا۔ابن ہمامؒ فرماتے ہیں یہی صحیح ترین قول ہے۔اس سے اشکال سرے سے دور ہوگیا۔پھر صاحب شریعت کی پر حقیقت کا امکان ضروری ہے اگر چہ تغلیظ اور مبالغہ ہی کیوں نہ ہو۔اور یہ بات ثابت ہو چکی ان کا پیچھے رہنا انکار کی وجہ سے تھا۔اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جماعت سے چہ جائیکہ جمعہ سے پیچھے رہنے والے صرف ایسے منافق تھے جو ظاہر النفاق تھے اور انکی بدبختی چھپی ہوئی نہ تھی۔(رواہ مسلم)

بلا عذر نمازِ جمعہ چھوڑنے والا عملی منافق بن جاتا ہے

۱۳۷۹ : وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ مِنْ غَيْرِ ضَرُوْرَةٍ كُتِبَ مُنَافِقًا فِیْ كِتَابٍ لَا يُمْحٰی وَلَا يُبَدَّلُ وَفِیْ بَعْضِ الرِّوَايَاتِ ثَلَاثًا ۔ (رواه الشافعي)

أخرجه الشافعي في سنده ص ٧٠۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے نماز جمعہ بغیر عذر کے چھوڑ دی وہ ایسی کتاب میں منافق لکھ دیا جاتا ہے جو نہ کبھی مٹائی جائے گی اور نہ کبھی تبدیل ہوگی اور بعض روایات میں تین جمعے چھوڑنے کا ذکر ہے۔(امام شافعیؒ)

تشریح: (من غیر ضرورۃٍ) ضرورۃ سے مراد جیسے خوف ظالم وغیرہ سے بارش برفباری اور کیچڑ وغیرہ اور اس جیسی چیزیں (ان کے بغیر چھوڑا) کذا فی شرح المنیہ۔

(کتب منافقًا) شدید قسم کی وعید ہے۔

(فی کتاب لا یمحی) مافیہ۔

(وفی بعض الروایات ثلاثًا) ای قال ومن ترك الجمعة ثلاثا۔(یہ جملہ تین مرتبہ کہا)۔رواہ الشافعی۔

بلا عذر جمعہ کی نماز کو چھوڑنے والا اللہ تعالیٰ کی توجہ اور رحمت خاصہ سے محروم ہے

۱۳۸۰ : وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَعَلَيْهِ الْجُمُعَةُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اِلَّا مَرِيْضٌ اَوْمُسَافِرٌ اَوِامْرَاَةٌ اَوْصَبِیٌّ اَوْمَمْلُوْكٌ فَمَنِ اسْتَغْنٰی بِلَهْوٍ اَوْتِجَارَةٍ اسْتَغْنَی اللّٰهُ عَنْهُ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَمِيْدٌ ۔ (رواه الدارقطني)

أخرجه الدارقطني في السنن ٢/٣ حديث رقم ١ من باب من تجب عليه الجمعة۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس پر جمعہ کے دن نماز جمعہ فرض ہے، سوائے مریض، مسافر، اور عورت اور بچے اور مجنون اور غلام کے، جو شخص جمعہ سے لہو ولعب یا تجارت میں مشغول ہو کر بے پرواہی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے بے پروائی کرتے ہیں اس لئے کہ

اللہ تعالیٰ بے پرواہ اور قابل تعریف ہے۔

تشریح: ''وعن جابر ان رسول اللہ ﷺ قال: من کان یومن باللّٰہ والیوم الاخر) یہ جملہ ہمارے مذہب کی تائید کرتا ہے کہ کفار فروع کے مخاطب نہیں ہیں۔

(فعلیه الجمعة) ای یجب علیه صلاۃ الجمعة۔ (یوم الجمعة)۔ جمعہ کیلئے ظرف ہے۔

(الا مریض اومسافر) سفر چاہے مباح ہو یا غیر مباح ان کے خلاف جنہوں نے اسے مباح کے ساتھ مقید کیا ہے۔

(اوامرأۃ او صبی او مجنون او مملوك) طیبیؒ فرماتے ہیں یہ (یعنی امرأۃ وغیرہ) کلام موجب سے استثناء کی وجہ سے مرفوع ہیں۔ منج کان یومن فلا یترك الجمعة الا مریض وما کی تأویل پر، پس یہ یترک کی ضمیر مستکن سے بدل ہے جو من کی طرف راجع ہے۔

تورپشتی فرماتے ہیں اسی طرح رفع کے ساتھ مصابیح السنہ کے اندر ہے۔

میں کہتا ہوں اس کی تقدیر عبارت ہوگی۔ فلا یحرم احد من الغفران الا عبد اور اسی قبیل سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد۔ فشربوا منه الا قلیل وما قلیل رفع کے ساتھ کشاف میں ہے۔ ای فلم یطیعوہ الا قلیل اور ابن حجرؒ نے عجیب بات کہی وہ یا تو لغۃً ہے یا تأویل کے ذریعے۔

(فمن استغنی بلهوٍ اوتجارةٍ) ای استغنی بهما عن طاعة اللّٰہ۔

(استغنی اللّٰہ عنه) ای فلیعلم انه تعالیٰ مستغن عنه وعن عبادته وعن جمیع عباده وانما امرهم بالعبادة لیتسرفوا بالطاعة۔

(واللّٰہ غنی) بذاته (حمید) محمود فی جمیع صفاته سوآء حمد اولم یحمد۔ او

(ملناه) حامد یثنی علی مطیعه بالجمیل ویشکره باعطاء الجزیل علی العمل القلیل۔ اور حدیث میں آیت: واذا راؤو تجارة وأولهوًا انفضوا الیها وترکوك قائمًا قل ما عند اللّٰہ خیر من اللهو ومن التجارة واللّٰہ خیر الرازقین، اور اس میں فقراء و مساکین اور متوکل قسم کے عبادت گزار لوگوں کیلئے تسلی ہے۔ کیونکہ لہب ولہو میں لگنا متنعمین کے احوال میں سے ہے۔ اور تجارت یہ کمائی کرنے والوں کے احوال میں سے ہے۔

(رواہ الدار قطنی) وروی الطبرانی من حدیث ابی سعید الخدری بمعناه۔

یعنی بدن کو اور کپڑوں کو میل کچیل سے پاک کرنا اور اس کے کمال میں سے تیل اور خوشبو لگانا۔

بَابُ التَّنْظِيْفِ وَالتَّبْكِيْرِ

جمعہ کے دن پاکی حاصل کرنے اور جمعہ کیلئے جلدی جانے کا بیان

پاکی حاصل کرنے سے مراد یہ ہے کہ جمعہ کے دن غسل کرے اور اسی طرح مونچھوں کو کتروائے۔ اور ناخن کاٹے اور زیر ناف اور بغلوں کے بال صاف کرے۔ نئے یا دھلے ہوئے پاک کپڑے پہنے اور خوشبو لگائے۔

تبکیر: اس کا معنی ہے صبح سویرے جانا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ والے دن نماز جمعہ پڑھنے کیلئے اگر کوئی شخص جلدی جامع مسجد میں پہنچ جاتا ہے اور دن کے اول حصہ میں جا کر بیٹھ جاتا ہے تو یہ اس کیلئے بہت بہتر اور باعث ثواب ہے۔ امام غزالی اور بہت سارے سلف وصالحین کا معمول تھا کہ وہ ان برکات کو حاصل کرنے کیلئے صبح سویرے ہی جامع مسجد میں پہنچ جایا کرتے تھے۔

فائدہ: بعض لوگوں نے خاص کر مدینہ والوں نے یہ معمول بنا رکھا ہے کہ وہ جمعہ کے روز دن کے اول حصہ میں مسجد میں جا کر مصلے وغیرہ بچھا دیتے ہیں لیکن خود جا کر وہاں نہیں بیٹھتے بلکہ واپس آ جاتے ہیں اور مصلےٰ اس لئے بچھاتے ہیں تا کہ جگہ قبضہ میں رہے، یہ طریقہ ناجائز ہے اور باعث ثواب نہیں۔ کیونکہ اس سے دوسرے لوگوں کو تکلیف میں مبتلا کرنا ہے اور ان کا حق مارنا ہے، ایسے لوگ آ کر وہاں ہی بیٹھ کر ذکر وفکر کریں، تو مناسب ہے، لیکن اگر مصلےٰ بچھا کر کھانا کھانے یا کسی اور کام کیلئے گھر چلے جائیں، تو یہ نامناسب ہے، ایسے لوگوں کو ایسے فعل سے روکنا چاہئے۔

(والتبکیر) فی النہایۃ بکر بالتشدید اتی الصلاۃ فی اول وقتہا، وکل من اسرع الی شیءٍ فقد بکر الیہ۔ اور جمعہ والی حدیث میں ہے بکر وابتکر۔ ان کے بارے میں ایک قول یہ ہے ان دونوں کا معنی ایک ہے اور تکرار مبالغہ کیلئے ہے اور ایک قول یہ ہے ابتکر کا معنی ہے خطبہ کے اول حصے کو پا لیا اور ہر چیز کا اول اس کی باکورت ہے۔

الفصل الاول:

نمازِ جمعہ پورے ہفتہ کے صغیرہ گناہوں کا کفارہ ہے

۱۳۸۱: عَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَغْتَسِلُ رَجُلٌ يَّوْمَ الْجُمُعَةِ وَيَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ وَيَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهٖ اَوْيَمَسُّ مِنْ طِيْبِ بَيْتِهٖ ثُمَّ يَخْرُجُ فَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ ثُمَّ يُصَلِّيْ مَا كُتِبَ لَهٗ ثُمَّ يَنْصِتُ اِذَا تَكَلَّمَ الْاِمَامُ اِلَّا غُفِرَلَهٗ مَا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْاُخْرٰى ۔

(رواہ البخاری)

أخرجہ البخاری فی صحیحہ حدیث رقم ۸۸۳۔ والنسائی فی السنن ۱۰۴/۳ حدیث رقم ۱۴۰۳۔ والدارمی ۴۳۵/۱ حدیث رقم ۱۵۴۱۔

ترجمہ: حضرت سلمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے اور حسب

استطاعت پاکی حاصل کرے، اور اپنے پاس سے تیل لگائے اور اپنے گھر کی خوشبو میں سے خوشبو لگائے اور پھر جمعہ کیلئے نکلے (مسجد میں پہنچ کر) دو آدمیوں کے درمیان حائل نہ ہو اور پھر وہ نماز جو اس کے مقدر میں ہے پڑھ لے، اور پھر خاموش رہے امام کے خطبہ پڑھنے کے دوران، تو اللہ تعالیٰ اس آدمی کے اس جمعہ اور گزشتہ جمعہ کے درمیان کے گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ (بخاری)

تشریح: ''عن سلمان قال: قال رسول اللہ ﷺ لا یغتسل : لا یغتسل، رفع کے ساتھ ہے۔

(رجل یوم الجمعۃ) ابن حجرؒ فرماتے ہیں اور اس کی مثل ہے عورت بھی جیسے صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے: من اتی الجمعۃ من الرجال او النسآء فلیغتسل ومن لم یأتھا فلیس علیہ غسل من الرجال والنسآء۔ اور اس میں یہ بحث ہے کہ عورتوں کا حکم ہمارے زمانے میں بدل چکا ہے اس لئے ان کیلئے جمعہ کیلئے نکلنا پسندیدہ نہیں۔

(ویتطھر) اور ایک صحیح نسخے میں فیتطھر ہے۔ یتنظف کے معنی میں۔

(ما استطاع) ای ما قدر۔

(طھرٍ) تنوین تکفیر کہتے ہیں قالہ الطیبیؒ، مظہر کہتے ہیں طھر سے مراد حدیث میں لبوں کتروانا اور ناخن تراشنا اور زیر ناف بال صاف کرنا اور بغلوں کے بال لینا اور کپڑوں کو صاف کرنا ہے۔

(ویدھن) بتشدید الدال ای ھندھن۔

(من دُھنہ) اول صرف کے ضمہ کے ساتھ۔

(اویمس) ایک قول او کے بارے میں ہے کہ یہ نوع بیان کرنے کیلئے ہے مطلب ہوگا: ان لم یجد الدھن یمس اور ایک قول ہے او شک کیلئے ہے اھ اور زیادہ ظاہر بات یہ ہے اُو واؤ کے معنی میں ہے اس لئے کہ مطلوب ان دونوں کا اجتماع ہے یا منع الخلو مراد ہے۔ والمعنی انہ یستعمل۔

(من طیب بیتہ) طیبیؒ کہتے ہیں طیب کو بیت کے ساتھ مقید کرنا یا تو وسعت پیدا کرنے کیلئے ہے۔ جیسے ابو سعیدؓ کی حدیث میں ہے ''ومن من طیبہ ان کان عندہ یا استحباب کو ظاہر کرنے کے لئے ہے تاکہ ہر آدمی جان جائے کہ سنت یہ ہے خوشبو اپنے پاس رکھے اور اس کے استعمال کی عادت بنائے۔ اور اپنے گھر کے اندر اس کا ذخیرہ رکھے جمعے والے دن کو خوشبو کے استعمال میں خاص نہ کرے۔

سید جمال الدین فرماتے ہیں لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خوشبو کے استعمال کا اہتمام اس دن کی خصوصیت ہے اور یہ بات تو معلوم ہے خوشبو ہمیشہ مستحب ہے لیکن جمعہ میں حاضری کے وقت اس کی بہت زیادہ تاکید وارد ہوئی ہے۔

لیکن ابن عمر ؓ کی روایت جو امام ابوداؤد نے نقل کی ہے: یمس من طیب امرأتہ۔ یہ حدیث ابو سعیدؓ کی روایت عند مسلم۔ قال ولو من طیب المرأۃ کے موافق ہے اھ۔

اس میں یہ بحث بھی ہے کہ آدمی کا گھر بولا جاتا ہے اور اس سے اس کی بیوی مراد ہوتی ہے اور اس میں بھی بحث ہے۔ اس لئے کہ روایت: ''ولو من طیب المرأۃ'' تقاضہ کرتی ہے بیت سے مراد اسکا معنی حقیقی ہے تأمل قالہ میرك ہم نے غور وفکر کیا

اور معاملہ ہم نے اس سے وسیع پایا حضور ﷺ کے ارشاد من طیب بیتہ سے آدمی کا حقیقی گھر مراد ہے اور وہ آدمی عام ہے شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہو۔

اور یہ ارشاد من طیب امرأتہ کے منافی نہیں اس لئے کہ بیوی کی خوشبو عام طور پر آدمی کے پاس ہوتی ہے۔ اور اس پر طیب بیتہ کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ اضافت ادنی ملابست کی وجہ سے درست ہوتی ہے۔ اور جب عورت کی خوشبو آدمی کی خوشبو سے جدا ہوتی ہے متعین ہونے کے ساتھ عورت کیلئے ممیز بھی ہوتی ہے۔ تو حضور ﷺ نے اشارہ فرمایا آدمی کیلئے مناسب ہے اپنے استعمال کیلئے خوشبو مختص کرے اور جمعہ والے دن خوشبو لگانے کی تاکید اور تنبیہ کی اور یہاں تک کہہ دیا، ولو من طیب المرأۃ یعنی اگر چہ حقیقتاً عورت کی ملک سے خوشبو استعمال کرے کیونکہ میاں بیوی کے درمیان حسنِ معاشرت اس کشادگی کی تو مقتضی ہوتی ہے واللہ اعلم۔

(ثم یخرج) ای ابتغاء لوجہ اللہ تعالیٰ لا لسمعۃٍ وریاءٍ ولا لخوفٍ وحیاءٍ

(فلا یفرق) راء مکسورہ کی تشدید کے ساتھ۔

(بین اثنین) (اثنین سے مراد) جیسے باپ بیٹے کے درمیان یا دو مانوس ساتھیوں کے درمیان یا نہ تفریق کرے ایسے دو آدمیوں کے درمیان جن کے درمیان میں فاصلہ نہ ہو، کیونکہ ان کو تکلیف ہوگی۔ طیبیؒ فرماتے ہیں اس سے مراد تبکیر ہے یعنی مراد یہ ہے اس پر لازم ہے صبح سویرے آئے اور لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے اور دو آدمیوں کے درمیان تفریق نہ کرے اور یا عبارۃ ہے الابطاء سے یعنی تاخیر نہ کرے اسے تفریق کرے۔ اس وقت یہ حدیث باب یعنی تنظیف وتبکیر دونوں کے ساتھ مناسب ہو جائے گی۔ اور دونوں پر منطبق ہو جائے گی لیکن یہ بات مخفی نہیں کہ پورے عنوان کا باب کی ہر حدیث میں پایا جانا لازمی نہیں۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس سے ظاہری مضمون یعنی طلب عدم التخطی مراد لینا بھی درست ہے۔ اگر چہ جلدی نہ آئے بایں طور کہ مجلس کے اخیر میں بیٹھ جاتے۔ اور لوگوں میں سے کسی کی گردن نہ پھلانگے۔ فصل اول میں آنے والی روایت اس معنی ومقصود میں واضح ہے۔

(ثم یصلی ما کتب لہ) قال ابن حجر ای ما فرض علیہ من الجمعۃ وھو غیر صحیح لقولہ الآتی ثم ینصت ولقولہ لہ، درست یہ ہے جو آئندہ آنے والی حدیث میں ہے۔ ما قدر لہ ای من سنۃ الجمعۃ سنن جمعہ چار ہیں یا اس کے علاوہ قضاء ونوافل وغیرہ اور کم از کم دو رکعت تحیۃ المسجد ہی پڑھ لے اگر امام خطبے میں نہ ہو، اور اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے ان کا قول (ثم ینصت) یا کے ضمہ کے ساتھ یقال انصت ینصت انصاتاً اذا سکت سکوت سمعٍ وقد نصت ایضاً وانصتہ اذا السکتہ فھو لازم متعد کذا فی النھایہ۔

ابن حجرؒ کا قول فتحہ کے ساتھ وہم میں مبتلا کرنا ہے کہ یہ روایت ہے یہ نسخہ ہے اور اس طرح سے نہیں۔

(اذا تکلم الامام) ای خطیب، علامہ ابن ہمام کہتے ہیں دوران خطبہ کلام حرام ہے اگر چہ امر بالمعروف یا تسبیح ہی کیوں نہ ہو اور کھانا پینا اور کتابت وغیرہ بھی اور چھینک مارنے والے کا جواب دینا اور سلام کا جواب دینا مکروہ ہے اور چھینکنے والا کیا خود الحمد للہ کہے گا تو صحیح یہ ہے اپنے جی میں کہہ ~~لے اگر چہ تکلم نہ~~ کرے اور منکر کو دیکھ کر آنکھ یا ہاتھ سے اشارہ کر دینا صحیح قول کے مطابق

مکروہ نہیں اور یہ ساری بحث اس وقت ہے جب یہ قریب ہو جہاں سے (خطبہ) سن رہا ہو۔ اور اگر دور ہو ایسی جگہ جہاں سے (خطبہ) نہ سن رہا ہو تو متاخرین کا اس میں اختلاف ہے محمد بن سلمۃ نے سکوت کو پسند کیا ہے اور نصیر بن یحییٰ قراءۃ کو پسند کرتے ہیں اور امام احمد حنبلؒ فرماتے ہیں جو آدمی (خطبہ) نہ سن رہا ہو اس کے ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں اور باقی امام مالکؒ کا قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرح ہے۔

(الا غفرله ما بينه وبين الجمعة الاخرىٰ) ''الاخرىٰ'' سے مراد یا تو گزرا ہوا جمعہ ہے یا آنے والا جمعہ ہے اور پہلا احتمال زیادہ بہتر ہے کیونکہ مغفرت کا گزشتہ سے متعلق زیادہ بہتر ہے۔

کرمانیؒ فرماتے ہیں دونوں احتمال ہی ممکن ہیں عسقلانیؒ کہتے ہیں الاخرىٰ سے مراد وہ جمعہ ہے جو گزر چکا ہے جیسا صحیح ابن خزیمہ میں ہے اور اس کے الفاظ ہیں غفرله ما بينه وبين الجمعة التي قبلها۔

میرکؒ فرماتے ہیں میں کہتا ہوں سنن ابی داؤد میں ابو سعیدؓ کی حدیث اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث فصل ثانی کے شروع میں اس کے الفاظ میں ''كانت كفارة لما بينها وبين الجمعة التي قبلها '' (یہ عسقلانی کے قول کے مؤید ہیں) لیکن جو سنن ابی داؤد ہی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ان الفاظ کے ساتھ: فهي كفارة الى الجمعة التي تليها وزيادة ثلاثة ايام، کرمانی کے قول کی تائید کرتی ہے تأمل اھ۔ پس ہم نے غور وفکر کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول التي تليها میں جو احتمال پائے پس ہم نے اس معنی پر محمول کر دیا جو بطور نصاً آخری دو حدیثوں میں وارد ہوا ہے۔ اور اس پر اشکال ہوتا ہے جو جمعہ بعد میں آنے والا ہے اس میں تو کوئی چیز مکفر نہیں (یعنی جو جمعہ بعد میں آئے گا اس کیلئے یہ جمعہ مکفر کیسے ہوگا۔

اس کا یہ جواب ہے کوئی مکفر جو زمانے یا عمل کے ساتھ مربوط ہو اس میں قاعدہ ہے اگر کوئی چیز (یعنی معصیت) ہو تو یہ کفارہ بن جاتا ہے ورنہ فاعل کی اطاعت کے بقدر رفع درجات کا باعث ہوتا ہے۔

نمازِ جمعہ پڑھنے اور خطبہ سننے کی فضیلت

۱۳۸۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنِ اغْتَسَلَ ثُمَّ اَتَى الْجُمُعَةَ فَصَلّٰى مَا قُدِّرَ لَهٗ ثُمَّ اَنْصَتَ حَتّٰى يَفْرُغَ مِنْ خُطْبَتِهٖ ثُمَّ يُصَلِّیْ مَعَهٗ غُفِرَلَهٗ مَابَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْاُخْرٰى وَفَضْلُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٢/٥٨٧ حديث رقم (٢٦/٨٥٧)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے غسل کیا، پھر نماز جمعہ پڑھنے آیا، اور جو نماز اس کے مقدر میں تھی پڑھی، پھر امام کے خطبہ سے فارغ ہونے تک خاموش بیٹھا رہا، پھر امام کے ساتھ نماز پڑھی، تو اس کے اس جمعہ اور پچھلے جمعہ کے درمیان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں بلکہ تین دن زیادہ کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ (مسلم)

تشریح: ''وعن ابی هريرة ...... الجمعة) اس میں ہمارے مذہب کے قول کے صحیح کی طرف اشارہ ہے۔ کہ غسل

نماز کیلئے ہے نہ کہ دن کیلئے اور اس پر یہ بات متفرع ہوتی ہے اگر کوئی صبح سے پہلے غسل کرے اور اسی کے ساتھ نماز پڑھ لے تو وہ سنت ادا کرنے والا ہوگا اور اگر غسل اور فجر کے بعد غسل کیا پھر محدث ہوگیا اور وضو کیا اور نماز پڑھی یہ سنت ادا کرنے والا نہ ہوگا اسی طرح نماز عید کے غسل کے بارے میں ہے۔ اور اصل ابن حجرؒ میں یوم الجمعۃ کی زیادتی واقع ہے من اغتسل فبنی علیھا کے بعد اور ابن حجرؒ نے کہا ہے اس سے لیا گیا وہ قول جس کے قائل ہمارے ائمہ ہیں اس دن غسل کا وقت اس کی فجر کا وقت داخل ہونے سے شروع ہوجاتا ہے اھ۔

اور یہ معتمد اصول اور تصحیح شدہ نسخہ جات کے مخالف ہے۔

(فصلی ما قدر له) ''قدر'' دال کی تشدید کے ساتھ۔

(ثم انصت حتی یفرغ) ای الخطیب

(من خطبتہٖ ثم یصلی معه) ''یصلی'' نصب کے ساتھ یفرغ پر معطوف ہے یہ (جملہ) خطبہ اور نماز کے درمیان خاموش رہنے کا افادہ کرتا ہے اور ایک قول رفع کے ساتھ ثم انصت پر معطوف ہے پہلا احتمال لفظ اور معنی کے لحاظ سے انسب ہے۔

(وبین الجمعة الأخرٰی وفضل ثلاثة ایامٍ) فضل رفع کے ساتھ واؤ بمعنی مع کے ذریعے ما بینہ میں ما پر معطوف ہے مطلب ہوگا ای بین یوم الجمعة الذی فعل فیه ما ذکر مع زیادة ثلاثة ایام علی السبعة لتکون الحسنة بعشر امثالھا۔ اور فضل میں علی الجمعۃ پر عطف کی وجہ سے جر بھی روا رکھی گئی ہے اور نصب بھی مفعول معہ ہونے کی وجہ سے اس قال الخطابیؒ سے مراد ہے جس گھڑی میں جمعہ کی نماز پڑھ رہا ہے وہاں سے اسی طرح اگلے جمعہ تک پھر عدد سات اور تین دن کی زیادتی ہوگا۔ پس ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہوجائے گی۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں یہ ماقبل روایات کے منافی نہیں۔ (تطبیق یہ ہے) اولاً حضور ﷺ نے سات دن کے گناہ معاف ہونے کی خبر دی پھر حضور ﷺ کیلئے تین دن کی زیادتی کردی گئی پھر الحسنة بعشر امثالھا کے بارے میں بتانے کیلئے خبر دے دی۔

(رواہ مسلم) قال میركؒ ورواہ ابو داؤد والترمذی وابن ماجه بمعناہ۔

خطبہ کے وقت کسی چیز سے کھیلنا بھی لغو ہے

۱۳۸۳: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ اَتَى الْجُمُعَةَ فَاسْتَمَعَ وَاَنْصَتَ غُفِرَلَهٗ مَابَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ وَزِيَادَةُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ وَمَنْ مَسَّ الْحَصٰى فَقَدْ لَغَا۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۲/۵۸۸ حدیث رقم (۲۷ ۔ ۸۵۷)۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ~~ہے فرماتے~~ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے وضو کیا اور اچھا

وضو کیا (یعنی آداب کا لحاظ رکھ کر) پھر جمعہ کے لئے آیا اور بغور خطبہ سنا اور خاموش بیٹھا رہا تو اس کے لئے اس جمعہ اور گذشتہ جمعہ کے درمیان کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں بلکہ تین دن مزید گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور جس شخص نے کنکریوں کو چھوا اُس نے لغو کام کیا۔ (مسلم)

تشریح: ''وعنہ'' ای: عن ابی ھریرۃ

(قال: قال رسول اللّٰہ: من توضا) اس میں رخصت کی طرف اشارہ ہے اور اس بات پر دلالت ہے کہ غسل جمعہ سنت ہے واجب نہیں اور اس میں امام مالکؒ کے خلاف دلیل بھی ہے۔

(فاحسن الوضوء) یعنی وضو کو اس کے مکملات سنن و مستحبات کے ساتھ کیا اور ابن حجرؒ کا قول وضو کے واجبات کے ساتھ وضو کیا درست نہیں کیونکہ واجبات کی ادائیگی قول توضأ سے معلوم ہوگی ساتھ یہ بھی بات ہے کہ واجبات پر اکتفاء کرنے والا مسئی ہے محسن نہیں ہے۔

(فاستمع) ان کان قریبًا اور استماع کو انصادت بھی لازم ہے اس کا عکس نہیں۔

(وانصت) ای سکت ان کان بعیدًا لیکن ہمارے کچھ مشائخ نے اس وقت قرأۃ قرآن کو جائز کہا ہے اور اس میں اشارہ ہے خطیب کا قرب بہتر ہے اور ایک قول ہے خطیب سے بعد ہمارے زمانے میں کامل ہے ابن حجرؒ نے غرابت اختیار کرتے ہوئے کہا انصت تاکید بلکہ تاسیس ہے کیونکہ کبھی استماع کا قصد ہوتا ہے اور کلام بھی کیا جاتا ہے ان کے کلام سے افادہ ہوتا ہے دو امروں کا ہونا ضروری ہے۔ قصد الاستماع اور انصات اھ۔

ان کے قول میں غرابت کی وجہ ہے تاکید بلکہ تاسیس اور ان کا قول قصد الاستماع حالانکہ درست یہ ہے قصد السماع وہ استماع ہی ہوتا ہے (یعنی کسی چیز کو سننے کا قصد وہ استماع ہی ہوتا ہے پھر قصد الاستماع کہنا چہ معنی دارد)

(وزیادۃ ثلاثۃ ایام ومن مسّ الحصٰی) یعنی ایک سے زیادہ مرتبہ نماز میں کنکریوں کو برابر کرے اور ایک قول ہے کھیل کے طریقے پر نماز اور خطبہ کی حالت میں۔

(فقد لغا) یہ الف اور یا کے ساتھ لکھا جاتا ہے' مطلب یہ ہے ایسی آواز نکالی جو استماع کو روکتی ہے لہٰذا ان لوگوں کے مشابہ ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد وقال الذین کفروا لا تسمعوا لھذا القرآن والغوافیہ لعلکم تغلبون کے ساتھ مذمت کی تھی۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں حدیث میں آیا ہے جس نے بیکار کام کیا یعنی جو بات شریعت میں اس کیلئے مشروع نہیں وہ بات کی یا کھیلا ایسی چیز کے ساتھ جس کی آواز ظاہر ہو تو اس کا جمعہ کامل نہیں اھ۔

وقیل لغاعن الصواب ای مال یعنی ایک قول ہے درستگی سے ہٹ گیا لغا عن الصواب کا معنی ہے نہایۃ میں ہے لغی یلغی ولغا یلغوا اذا تکلم بمالا یعنی وھو اللغو۔ اور کنکریوں کے چھونے سے مراد زمین کو سجدے کیلئے ہموار کرنا ہے کیونکہ وہ زمین پر سجدہ کرتے تھے۔ اور ایک قول یہ ہے اس سے مراد تسبیح کو پلٹنا اور اس کو شمار کرنا لیکن معروف تسبیح حضور ﷺ کے زمانے میں نہیں تھی۔

(رواہ مسلم) قال میرک ورواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی۔

جمعہ کیلئے پہلے آنا اونٹ صدقہ کرنے کے برابر ہے

۱۳۸۴: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كَانَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ وَقَفَتِ الْمَلَائِكَةُ عَلٰى بَابِ الْمَسْجِدِ يَكْتُبُوْنَ الْاَوَّلَ فَالْاَوَّ لَ وَمَثَلُ الْمُهَجِّرِ كَمَثَلِ الَّذِيْ يُهْدِيْ بَدَنَةً ثُمَّ كَالَّذِيْ يُهْدِيْ بَقَرَةً ثُمَّ كَبْشًا ثُمَّ دَجَاجَةً ثُمَّ بَيْضَةً فَإِذَا خَرَجَ الْإِمَامُ طَوَوْا صُحُفَهُمْ وَيَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ۔

(متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۴۰۷۔ حدیث رقم ۹۲۹۔ ومسلم فی صحیحه ۲/۵۸۷ حدیث رقم(۲۴/۸۵۰)۔ وأبوداؤد فی السنن ۱/۲۴۹ حدیث رقم ۳۵۱۔ والترمذی ۲/۳۷۲ حدیث رقم ۴۹۹۔ والنسائی ۳/۹۷ حدیث رقم ۱۳۸۵۔ وابن ماجه ۱/۳۴۷ حدیث رقم ۱۰۹۲۔ ومالك فی الموطأ ۱/۱۰۱ حدیث رقم ۱ من کتاب الجمعة ۔ وأحمد فی المسند ۲/۲۵۹۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت نے ارشاد فرمایا جب جمعہ کا دن آتا ہے تو فرشتے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں، تو وہ پہلے آنے والوں کے نام لکھتے ہیں کہ اور سب سے پہلے آنے والا (ثواب میں) ایسا ہے جیسا کہ کعبۃ اللہ میں اونٹ قربانی کیلئے بھیجنے والا، پھر اس کے بعد میں آنے والا ایسا ہے جیسا کہ گائے کی قربانی کعبۃ اللہ بھیجنے والا اس کے بعد آنے والا ایسے ہے جیسا کہ بکری قربانی کیلئے کعبۃ اللہ بھیجنے والا، پھر اس کے بعد آنے والا ایسے ہے جیسا کہ مرغی صدقہ کرنے والا اور اس کے بعد آنے والا ایسا ہے جیسا کہ انڈہ صدقہ کرنے والا اور جب امام خطبہ کیلئے آ جائے تو وہ اپنے رجسٹر کو لپیٹ لیتے ہیں، اور بغور خطبہ سننے لگتے ہیں۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: ''ابن حجر کہتے ہیں حفظہ کے علاوہ دوسرے فرشتے مراد ہیں اھ۔ مطلب یہ ہے یہ فرشتے صبح سے یا طلوع آفتاب سے یا زوال کے وقت سے یہ احتمال زیادہ قریب ہے برابر کھڑے رہتے ہیں۔

(یکتبون الاوّل فالاوّل) طیبیؒ کہتے ہیں پہلے داخل ہونے والا کا نام لکھتے ہیں فالاول میں فا اور ثم حضور ﷺ کے قول ثم کالذی یهدی بقرة میں دونوں اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف نزول میں ترتیب کے لیے ہیں لیکن دوسرے میں تراخی ہے جو پہلے میں نہیں۔

(ومثل المهجر) ای المبکر الی الجمعة والتبکیر الی کل شیٔ هو المبادرة الیه وهی لغة حجازیة کذا فی النهایه'' (مہجر سے مراد مبکر الی الجمعة ہے تبکیر ہر چیز کی طرف مبادرۃ ومسابقت ہے)۔ ہمارے ائمہ میں سے کچھ شارحین نے مہجر کا معنی کیا ہے السائر الی المسجد بعد الزوال اس لئے کہ تہجیر دوپہر کے وقت چلنے کو کہتے ہیں اور یہ نصف النہار ہی ہوتا ہے۔

اور ایک قول ہے التهجیر الی الصلاة سے مراد اس کی طرف جلدی جانا ہی ہے مجاز واتساع کے طریقے پر وہ وقت جس میں دن بلند ہوتا ہے اور گرمی بڑھنا شروع ہو جاتی ہے اس کو دوپہر کا حصہ ہی قرار دے دیا جیسے دن کے پہلے آدھے حصے کو غدوہ کہا

جاتا ہے اور دوسرے آدھے حصے کو عشیہ کہا جاتا ہے اور و مثل المھجر میں واؤ کے ذریعے پورے جملے کا عطف پہلے والے جملے پر ہے اور ترتیب ذہن کے سپرد ہے اس لئے کہ یہ فاتفصیلیہ کے موقع میں واقع ہے اور واؤ کا یہاں واقع ہونا فا سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ (فاء) (الاول فالاول میں سے) اول ثانی پر عطف کا وہم پیدا کرتا ہے۔ حالانکہ اس کا عطف یکتبون پر ہے۔

(کمثل الذی یھدی) یہ الاہداء سے ہے۔

(بدنۃً) ای ناقۃ تنحر بمکۃ (ایسی اونٹنی جو مکۃ میں ذبح ہو) لفظ بدنۃً فتحہ اور ضمہ کے ساتھ بدن الرجل سے مشتق ہے جس کا معنی ہے بڑے جسم والا ہونا۔ اور لفظ بدنہ کا اطلاق عندالاطلاق ہمارے نزدیک اگرچہ گائے پر بھی ہوتا ہے لیکن یہاں اس کا تقابل ان کے قول (ثم کالذی یھدی بقرۃ) کے ساتھ اس کو اونٹنی کے ساتھ خاص کر رہا ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں اس کو بدنہ جسیم ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے اور یہ خاص طور پر اونٹ ہوتا ہے۔ اور ھدی کے ذکر اختصاص ہے حالانکہ وہ کعبہ میں قربان کی جانے والی قربانی کے ساتھ خاص ہے۔ بہتر ترتیب سے جمعات کے ابتدائی لحات میں عظمت والے معنی کا ذکر ہے اور یہ عرفات میں حاضر ہونے کے برابر ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں بدنہ سے مراد یہاں اکیلا اونٹ ہے اگرچہ اس کا اطلاق گائے بلکہ بکری پر بھی ہوتا ہے اور کبھی ایک معنی مراد ہوتا ہے شارح فرماتے ہیں یھدی کا مطلب یہ ہے اسے حرم مکۃ کی طرف منتقل کرے تاکہ اسے اللہ رب العزت کا تقرب حاصل کرنے کیلئے ذبح کرے۔ اور اس میں اس فرمان کی طرف اشارہ ہے جو وارد ہے الجمعۃ حج المساکین۔

(ثم کبشاً) وہ بھیڑ کا حمل ہوتا ہے جبکہ مؤنث ہو یا کبش اس مینڈھے کو کہتے ہیں جس کے رباعی دانت نکل آئے ہوں کذا فی القاموس اور ایک روایت میں کبشا اقرن کے الفاظ ہیں اس کے حسن میں مبالغے کے طور پر

(ثم دجاجۃ) دال کے فتحہ کے ساتھ دال کے کسرہ سے زیادہ فصیح ہے کذا فی الصحاح۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں دال کا ضمہ بھی منقول ہے اور ایک صحیح روایت میں الدجاجہ کی جگہ بطۃ کا لفظ ہے۔ اور ایک روایت میں ہے ثم کالذی یھدی عصفوراً۔

(ثم بیضۃً) اور آخری دو اعداد کی جمعہ میں قبولیت اور حج میں عدم قبولیت میں اشارہ ہے کرم وفضل کی وسعت کی طرف اور اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حج اغنیاء پر فرض کیا گیا ہے اور جمعہ میں حاضر ہونے والے اکثر فقراء ہوتے ہیں۔

(فاذا خرج الامام) اس حضور ﷺ نے اپنی ذات مراد لی (اس صورت میں) حجرہ شریفہ سے حقیقی خروج مراد ہے۔ یا مراد ہے جب مسجد میں داخل ہو یا جب منبر پر ظاہر ہوں آخری معنی انسب ہے۔

(صحفھم) یعنی ان دفاتر کو جن میں وہ پہلے آنے والوں کے نام لکھتے ہیں اور اجر و ثواب ان کے سبقت میں مراتب کے اعتبار سے ہوتا ہے فرع واصل کا لحاظ رکھتے ہوئے اور نسائی شریف کی روایت میں ہے طووا صحفھم فلا یکتبون شیئاً ای من ثواب التبکیر۔ (یستمعون) ای الملائکۃ مع الناس)

(الذکر) ذکر سے مراد ہے خطبہ قال تعالیٰ: فاسعوا الی ذکر اللہ اور خطبہ کو ذکر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس ذکر پر مشتمل ہوتا ہے بلکہ خطبے کے جمال وکمال سے مقصود یہی ہے۔ و استمعوا کی جگہ یستمعون ذکر کرنے میں حالانکہ وہ طووا پر

عطف کرنے میں مناسب تھا۔ خطبہ سننے میں فرشتوں کے ساتھ دوسروں کو شامل کرنے کیلئے ہے اور بطور اجتماع کے فرشتوں کو مؤمنین کے مداخل میں شامل کرنے کیلئے ہے۔

طیبیؒ فرماتے ہیں فاذا خرج الامام کا جملہ یہ بتلاتا ہے کہ امام کیلئے مناسب ہے منبر پر چڑھنے سے پہلے اپنے لئے ایک خالی مکان بنائے اپنی عظمت شان بتلانے کیلئے کذا وجدناہ فی دمشق المحروسۃ اھ۔

اور یہ بدعت ہے جسے امراء نے ایجاد کیا ہے جب وہ خطباء تھے اپنے فقراء پر تکبر اور اولیاء سے نہ ملنے کیلئے اور ان امراء کے طالب دنیا علماء پر تسلط کی وجہ سے (متفق علیہ)

شمنی کہتے ہیں امام بخاری نے ابو الدرداءؓ کی حدیث سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا من اغتسل یوم الجمعۃ غسل الجنابۃ ثم راح فکانما قرب بدنۃً ومن راح فی الساعۃ الثانیۃ فکانما قرب بدنہ ومن راح فی الساعۃ الثالثۃ فکانما قرب کبشاذا قرن ومن راح فیٔ الساعۃ الرابعۃ فکانما قرب دجاجۃً ومن راح فی الساعۃ الخامسۃ فکانما قرب بیضۃً فاذا خرج الامام حضرت الملائکۃ یستمعون الذکر پس امام مالک اور کچھ شوافع جیسے امام الحرمین نے یہ قول اختیار کیا ہے ساعات سے مراد بعد الزوال چند خفیف سے لحات ہیں اس لئے کہ الرواح لغت میں زوال کے بعد جانے کو کہتے ہیں۔

جمہور کہتے ہیں اس سے مراد دن کے زوال کا حصہ ہے اور رواح کے بارے میں علامہ الازہری کہتے ہیں اس کا معنی جانا ہے چاہے دن کے پہلے حصے میں ہو یا آخری میں، یا رات میں اس لئے کہ ساعات کا ذکر صرف جمعہ کی طرف جلدی جانے پر ابھارنے اور سبقت کی فضیلت اور جمعہ کے انتظار اور ذکر و نوافل میں مشغولیت اختیار کرنے کی ترغیب کیلئے ہے اور یہ چیزیں زوال کے بعد جانے میں حاصل نہیں ہوتیں اھ۔

اور سلف تو چراغ کی روشنی میں چل کر جمعے والے دن جامع مسجد پہنچ جاتے تھے اور العیاء میں ہے پہلی بدعت جو اسلام میں پیدا ہوئی وہ مساجد میں جلدی جانے کا ترک تھی۔

خطبہ سننا واجب ہے کسی کو چپ کرانا بھی لغو ہے

۱۳۸۵: وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَنْصِتْ وَالْاِمَامُ يَخْطُبُ فَقَدْ لَغَوْتَ۔ (متفق علیہ)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۴۱۴۔ حدیث رقم ۹۳۴۔ ومسلم فی صحیحه ۲/۵۸۳ حدیث رقم (۱۱۔ ۸۵۱) وأبو داوٗد فی السنن ۱/۶۶۵ حدیث رقم ۱۱۱۲۔ والترمذی ۲/۳۸۷ حدیث رقم ۵۱۲۔ والنسائی ۳/۱۰۴ حدیث رقم ۱۴۰۲ ومالك فی الموطأ ۱/۱۰۳ حدیث رقم ۶ من كتاب الجمعة وأحمد فی المسند ۲/۲۷۲۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تو اپنے ساتھ والے سے کہے چپ

ہو جا جمعہ کے دن جبکہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو تم نے بھی لغو کام کیا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: "وعنہ" ای عن ابی۔

(قال: قال رسول اللّٰہ ﷺ اذا قلت لصاحبك) ای فی المسجد

(یوم الجمعة) ظرف

(انصت) الانصات سے مشتق سکوت کے معنی میں قول کا مقولہ ہے۔

(والامام یخطب) جملہ حالیہ ہے۔

(فقد لغوت) شرط کی جزا ہے اور ایک روایت میں لغیت ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ والغوا فیہ۔ میرکؒ کہتے ہیں اس میں دلیل ہے اس پر کہ انصات کا وجوب اور کلام سے نہی وہ خطبہ کی حالت میں ہی ہے یہ تو ہمارا مذہب ہے اور جمہور اور امام مالکؒ کا مذہب ہے امام ابو قیصرؒ فرماتے ہیں الانصات امام کے نکلنے سے ہی واجب ہے اھ۔

اور حضور ﷺ کے قول لغوت کے مطالب درج ذیل ہیں لغوت ای تکلمت بما لا یعنیك اور ایک قول ہے ھبت وخسرت اور ایک قول ہے۔ ملت وعدلت عن الصواب طیبیؒ کہتے ہیں یہ حکم اس وجہ سے ہے کیونکہ خطبہ دو رکعتوں کے قائم مقام ہے جیسے اصل ومنوب میں کلام جائز نہیں نائب میں بھی جائز نہیں تم کلامہ۔

اور اس میں یہ بحث ہے یہ طیبیؒ کے طریقے اور روش کے لحاظ سے ضعیف رائے ہے باوجودیکہ کلام کی حرمت حضور ﷺ کی نہی کی بناء پر ہے اور یہ علت نہی کی حکمت ہے یہ قیاس نہیں ہے کیونکہ اگر یہ قیاس ہو تو اس کی نماز جمعہ باطل ہو جانی چاہیے حالانکہ ایسا نہیں۔

پھر طیبیؒ نے کہا یہ حکم اس آدمی کے حق میں ہے جو بھلائی کا حکم کرے اس آدمی کے حق میں کیا حکم ہوگا جو کسی منکر کا ارتکاب کرے یا خود کلام شروع کرے؟

اور ابن حجرؒ اس قول کے بارے میں کہتے ہیں یہ قول معتمد مذہب کے مخالف ہے دوران خطبہ کلام اگرچہ بے کار ہے لیکن مکروہ ہے حرام نہیں اھ۔

مظہر کہتے ہیں (دوران خطبہ) کلام سے نہی یا تو استحبابی طور پر ہے یا وجوبی طور پر پس طریقہ یہ ہے کہ خاموش کرنے کیلئے ہاتھ سے اشارہ کر دے اھ۔

امام مالکؒ کے مذہب میں ہے خاموشی اختیار کرنا واجب ہے چاہے خطبہ سنے یا نہ سنے۔

ابن ہمامؒ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کا ارشاد "فقد لغوت ودلالة النص" کے طریقے پر نماز اور تحیۃ المسجد دونوں کے منع کا فائدہ دیتا ہے کیونکہ جب امر بالمعروف سے روک دیا حالانکہ وہ سنن اور تحیۃ المسجد سے اعلیٰ ہے تو ان سے منع تو بطریق اولیٰ ہو گیا۔

اور اگر یہ اعتراض کیا جائے معارضے کی صورت میں عبادت دلالت پر مقدم ہوتی ہے درآنحالیکہ یہ بات ثابت ہے ایک آدمی حضور ﷺ کے خطبہ دینے کی حالت میں حاضر ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے فلاں کیا تو نے نماز پڑھی ہے اس نے

جواب دیا نہیں تو ارشاد فرمایا دو رکعتیں پڑھ اور اس میں اختصار کر۔

جواب یہ ہے معارضہ لازم نہیں کیونکہ ممکن ہے حضور ﷺ نے خطبہ روک دیا ہو اور یہ بات ایسے ہی ہے حضرت انسؓ کی حدیث کی بنا پر ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا درانحالیکہ حضور ﷺ خطبہ دے رہے تھے نبی ﷺ نے اس سے فرمایا کھڑا ہو جا دو رکعتیں ادا کر اور حضور ﷺ خطبہ سے رک گئے یہاں تک کہ وہ اپنی نماز سے فارغ ہو گیا اھ۔

اور میرے نزدیک اسے حضور ﷺ کے خطبہ کے روکنے پر محمول کرنا بعید ہے کیونکہ علامہ ابن ہمامؒ نے ذکر کیا ہے خطیب کیلئے مکروہ ہے کہ وہ دوران خطبہ مخل نظم کلام کا تکلم کرے ہاں کسی معروف کا امر ہو تو وہ اور بات ہے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمانؓ کا مشہور قصہ ہے اھ۔

زیادہ بہتر بات یہ ہے یوں توجیہ کی جائے راوی کے قول یخطب کا مطلب ہے یرید ان یخطب (خطبہ دینے کا ارادہ رکھتے تھے) اور وامسك عن الخطبة یہ قول خطبہ کے قطع کرنے میں نص نہیں ہے کیونکہ ہم یہ کہیں گے امسك عن شروعها (خطبہ شروع کرنے سے ٹھہر گئے) ہاں اس میں صاحبینؒ کے قول کو تقویت ملتی ہے ان کا قول ہے کہ کلام کرنا مباح ہے یہاں تک کہ خطیب خطبہ میں شروع ہو جائے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب امام منبر پر چڑھ جائے تو نفلی نماز اور کلام کا ترک واجب ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے حضور ﷺ نے جان لیا ہو (بطریق وحی الکلام) آنے والے پر فجر کی دو رکعتوں کی قضاء ہے لہٰذا اسے ان کی ادائیگی کا حکم دیا ترتیب کی رعایت کرتے ہوئے جو کہ ہمارے نزدیک واجب ہے۔ واللہ اعلم۔

اور یہ بات بعید نہیں کہ اسے خصوصیت یا نسخ پر محمول کیا جائے ادلہ شرعیہ میں جمع کرنے کیلئے۔ (متفق علیہ)

ابن حجرؒ کہتے ہیں بعد کے زمانے میں جو یہ عادت بن گئی کہ ایک شخص اس حدیث کو بلند آواز سے خطیب کے سامنے اذان سے فراغت اور اس کے خطبہ شروع کرنے سے پہلے پڑھتا ہے یہ اگرچہ بدعت مگر اچھی ہے کیونکہ اس میں لوگوں کو ہمہ تن گوش ہونے اور توجہ سے سننے اور کلام نہ کرنے پر ابھارنا ہے اور یہ امر بالمعروف ہے اور اس پر شاہد ہے کہ حضور ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر جب خطبے ارشاد فرمانے کا ارادہ کیا تو ایک آدمی کو حکم دیا جو خاموش رہنے کا کہے۔ پس اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ بھی مسنون ہے پس جو آدمی یہ گمان کرتا ہے یہ بدعت ہے اور اس کے فاعل کی شفاعت بیان کرتا ہے تو وہ اس سے غافل ہے جو میں نے ذکر کیا فتأمل اھ۔ پس ہم نے غور وفکر کیا تو ہم نے ان کے کلام اول جبکہ انہوں نے کہا یہ بدعت ہے اور کلام ثانی جبکہ یہ کہا ومن زعم ان ذلك بدعة اھ میں تناقض پایا۔ پھر اس میں شک نہیں یہ بدعت غیر مستحسن ہے اس لئے کہ خطیب کا منبر پر دوسرے آدمی کے کلام سے فراغت کا منتظر بیٹھنا شرعاً وضعاً اور طبعاً ناپسندیدہ ہے۔

اور باقی حضور ﷺ کا خاموشی کے بارے میں کہنے کا امر کرنا اس کو صحیح تسلیم کرنے لینے کی صورت میں جواب یہ ہے یہ اس وقت کہا جب خطبہ دینے کا ارادہ کر چکے تھے منبر پر جلوہ افروز ہونے سے پہلے لہٰذا قیاس فاسد ہوا۔

اور اس زمانے میں ان کے قبیح افعال میں سے یہ بات بھی ہے کہ شافعی خطیب بمقتضی مذہب خویش منبر پر چڑھنے کے بعد سلام کرتا ہے اور کوئی بھی اس کے سلام کا جواب نہیں دیتا پس جو اس کے قریب ہوتا ہے اور اس کے سلام کو سنتا ہے وہ اس کے

جواب نہ دینے کی وجہ سے گنہگار ہوتا ہے اور اگر کوئی اس کا جواب دینا بھی چاہے تو متصور نہیں کیونکہ مؤذنین سلام کے بعد بغیر فصل کے اذان شروع کر دیتے ہیں۔

میں نے ایک خطیب سے کہا یا تو اس سنت کو چھوڑ دے تاکہ اس کی وجہ سے لوگوں کو ترک فرض میں مبتلا نہ کر یا مؤذن کو حکم دو کہ وہ تمہارے سلام کا جواب تم پر لوٹائے اور پھر اذان کہے اس نے کہا یہ عادت ہے اور اس کو بدلنا ممکن نہیں۔

اور اس وقت مؤذنین کی بری عادتوں میں بری عادت یہ ہے ان کا دوران خطبہ اپنی آوازیں بلند کرنا اور خطیب کے برے فعل میں سے یہ بات ہے کہ وہ کبھی ان کی متابعت کرتا ہے اور ان کے سکوت کا انتظار کرتا ہے پھر سلاطین کے تذکرہ کے وقت آواز بلند کرنے میں مبالغہ آرائی کرتے ہیں۔ اور یہ سب سنت کے ترک اور بدعت کی نحوست ہے۔

اور اس کا منشأ علماء کو امراء کے سامنے ذلیل ظاہر کرنا ہے اور ان کا سلاطین کے ناموں کو خطبہ میں خلفائے اربعہ اور دوسرے حضرات کے ساتھ ذکر کرنا اپنی فاسد اغراض کے حصول کے وسیلے کے طور پر ہے۔ یہاں تک کہ ان کے مخالفین اور معاندین روافض کو گمراہی کا زائد راستہ مل گیا وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی اہل سنت کی مدح کی جگہ اپنے منبروں پر صحابہ کو سب وشتم کرتے ہیں یہ ساری چیزیں بدعت ہیں پس اے مخاطب تو ان کا منکر ہو جا اپنے دل سے اگرچہ تجھے مفتیان فتوی دیں۔

اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا کیا ہی اچھا کام تھا جبکہ انہوں نے بنو امیہ کے منبروں پر اہل بیت کے سب وشتم کی جگہ خطبے کے اخیر میں اس آیت شریفہ کو مقرر کر دیا: **ان اللّٰہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاءِ ذی القربٰی وینھٰی عن الفحشاء والمنکر والبغی الایۃ۔**

پس یہ بدعت حسنہ ہے بلکہ سنت مستحسنہ ہے جیسے حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے **ما رآہ المسلمون حسناً فھو عند اللّٰہ حسن** اور مسلمین سے مراد ان کے عمدہ اور بہتر لوگ مراد ہیں اور وہ کتاب وسنت کے علماء ہیں جو حرام اور شبہ حرام اور سے بھی بچنے والے ہیں:

"**جعلنا اللّٰہ منھم فی الدنیا والآخرۃ**"۔

پھر اس حدیث کی باب کے عنوان سے مناسبت کی وجہ یہ ہے کہ اس سے تبکیر پر ابھارنا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس سے جمعہ کی سنتیں اور تحیۃ المسجد بھی فوت نہ ہو یا وجہ مناسبت یہ ہے **افسحوا** (مجلس کھلی کر لو) کے قول کی ضرورت پیش نہ آئے اور باقی جو ابن حجرؒ کا قول ہے اس حدیث کے عنوان سے مناسبت کی وجہ یہ ہے کہ کبھی دوران خطبہ کلام کی ضرورت ہوتی ہے پس اس کا حکم بیان کر دیا۔ واللہ اعلم۔

مسجد میں کسی کو اُٹھا کر خود بیٹھنا جائز نہیں

۱۳۸۶: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَایُقِیْمَنَّ اَحَدُکُمْ اَخَاہُ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ ثُمَّ یُخَالِفُ اِلٰی مَقْعَدِہٖ فَیَقْعُدُ فِیْہِ وَلٰکِنْ یَقُوْلُ افْسَحُوْا۔ (رواہ مسلم)

اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۱۷۱۵/۴ حدیث رقم (۳۰۔ ۲۱۷۸)۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ مدنی سرکار ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص ہرگز اپنے بھائی کو جمعہ کے دن (یعنی مسجد میں) اس کی جگہ سے نہ اٹھائے پھر اس کے بیٹھنے کی جگہ کی طرف جائے اور خود بیٹھ جائے بلکہ وہ کہے کہ جگہ کشادہ کرو۔ (مسلم)

تشریح: (**فیعقد فیه**) طیبیؒ فرماتے ہیں مخالفت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے ساتھی کو اس کی جگہ سے اٹھائے اور پھر اس کی جگہ پہنچ جائے پس اس میں بیٹھ جائے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وما اُرید ان اخالفکم الی ما انهٰا کم عنه**۔ اور اس میں متکبرین کیلئے ڈانٹ کا بیان ہے۔

ای کیف تقیم اخاك المسلم وهو مثلك فی الدین ولا مزیة لك فیه، یعنی تو اپنے مسلمان بھائی کو کیسے اٹھاتا ہے حالانکہ وہ تیرے جیسا ہے دین میں اور تجھے دین ان پر فوقیت نہیں۔

ابن حجرؒ نے مزید کہا ہے۔ یہ (یعنی کسی کو اس کی جگہ سے اٹھانا) بیٹھنے والے کی حقیقی رضا مندی کے بغیر حرام ہے نہ کہ خوف اور حیاء کی وجہ سے۔ اس (اٹھانے والے نے) اسے بھیجا ہوتا کہ زحمت سے پہلے اس کیلئے ہے بلکہ جسے بھیجا جا رہا ہے وہ اس جگہ میں بیٹھنے کا زیادہ حق دار ہے اس کے اس جگہ کی طرف سبقت کی وجہ سے اگر چہ اس نے یہ نسبت کی ہو کہ یہ بھیجنے والے کی ہے۔ بلکہ خود اس شخص کا اپنے بھیجنے والے کیلئے اٹھنا یا اس کے ساتھ اس سلسلے میں ایثار کا معاملہ کرنا مکروہ ہے بشرطیکہ وہ شخص جس کیلئے کھڑا ہو رہا ہے فضیلت میں اول سے کم درجہ کا ہو اس لئے کہ یہ صف اول میں ہوگا پس اس کیلئے دوسری کی طرف بیٹھے گا اس لئے کہ قرب کا ایثار عبادت میں بلا عذر مکروہ ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ کا ارشاد "**ویؤثرون علی انفسهم**" اس سے حظِّ نفس (یعنی طبعی ضروریات وخواہشات) کا ایثار مراد ہے۔ لطائف میں سے ہے ایک ظالم کے خدّام جامع مسجد میں داخل ہوئے انہوں نے فقرآء کو کھڑا کر دیا اور ان کے جائے نماز اٹھا دیئے ان کو دھکے دیئے اور ان کو مارا اس وقت ایک عارف سے پوچھا اے ہمارے سردار آپ ان کا ظلم دیکھ رہے ہیں تو انہوں نے فرمایا یہ تو ان کی عبادت کا حال ہے ان کے ظلم اور معصیت کو اس پر قیاس کر لو۔

(**افسحوا**) اور ایک روایت میں **تفسحوا وتوسعوا** اور اگر **رحمکم اللّٰه** یا **یفسح اللّٰه لکم** جیسے اس کی طرف آیت اور دوسری چیزیں مشابہ ہیں لہٰذا اس میں کوئی حرج نہیں۔

اور اس میں اللہ تعالیٰ کے قول "**یایها الذین آمنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللّٰه لکم**" الآیۃ، کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ حکم اس وقت ہے جبکہ جگہ میں وسعت موجود ہو ورنہ کسی کو تنگ نہ کیا جائے بلکہ نماز پڑھ لے اگر چہ مسجد کے دروازے پر ہی۔

(**رواہ مسلم**) حدیث کی ترجمۃ الباب سے مناسبت کی صورت یہ ہے یہ حدیث تکبیر پر ابھارنے کو شامل ہے تاکہ آدمی اپنے مسلمان بھائی کو اس کی جگہ سے اٹھانے اور کلام اگر چہ **فافسحوا یفسح اللّٰه لکم** کے قول کے ساتھ ہی ہو ان میں نہ پڑ جائے جن سے بچنا ضروری ہے۔

جمعہ کے دن عمدہ لباس پہننا اور خوشبو لگانا سنت ہے

۱۳۸۷: عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ وَاَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اغْتَسَلَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلَبِسَ مِنْ اَحْسَنِ ثِیَابِهٖ وَمَسَّ مِنْ طِیْبٍ اِنْ كَانَ عِنْدَهٗ ثُمَّ اَتَی الْجُمُعَةَ فَلَمْ یَتَخَطَّ اَعْنَاقَ النَّاسِ ثُمَّ صَلّٰی مَاكَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ ثُمَّ اَنْصَتَ اِذَاخَرَجَ اِمَامُهٗ حَتّٰی یَفْرُغَ مِنْ صَلَاتِهٖ كَانَتْ كَفَّارَةً لِمَابَیْنَهَا وَبَیْنَ جُمُعَتِهِ الَّتِیْ قَبْلَهَا۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/ ۲٤٤ حدیث رقم ۳٤۳۔ وأحمد فی المسند ۳/ ۸۱۔ الطبرانی فی الكبیر ذكره فی كنز العمال ۱۵/ ۳۰۲ حدیث رقم ٤۱۱۱۸۔

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے دونوں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے جمعہ کے دن غسل کیا اور عمدہ لباس پہنا اور خوشبو لگائی اگر اس کے پاس ہو پھر جمعہ کیلئے آئے اور لوگوں کی گردنوں کو نہ پھلانگے، پھر نماز پڑھے جتنی اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں لکھ دی ہے یہاں تک کہ پھر جب امام خطبہ کیلئے نکلے خاموش ہو کے بیٹھ جائے' جمعہ کی نماز سے فارغ ہو جائے تو یہ اس کیلئے اس جمعہ اور گذشتہ جمعہ کے درمیان کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔ (ابوداؤد)

تشریح: "عن ابی سعید ...... یوم الجمعة" اور دوسری روایت میں ہے واستن یعنی مسواک کی۔

(ولبس من احسن ثیابه) طیبیؒ فرماتے ہیں اس سے سفید کپڑے مراد ہیں اھ۔

مطلب یہ ہے کپڑوں میں رنگ کے لحاظ سے سفید رنگ افضل ہے صحیح حدیث البسوا من ثیابكم البیاض فانها خیر ثیابكم و كفنوا فیها "موتاكم" کی بناء پر اور ایک صحیح روایت میں ہے فانها اطهروا طیب اور خطابیؒ نے الجدد کے لفظ زیادہ ذکر کئے ہیں۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں اگر سفید نہ پائے تو وہ کپڑا پہنے جو بننے سے پہلے رنگا گیا ہو اور اس میں بہتر دھاری دار ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ایک دھاری دار کپڑا تھا جسے عیدین اور جمعہ میں پہنتے تھے باقی جو بننے کے بعد رنگا جائے تو اس کا پہننا مکروہ ہے اھ۔ اور شاید ان کی مراد وہ کپڑا ہے جسے سرخ یا زرد رنگ کیا گیا ہو کیونکہ یہی دونوں ہمارے نزدیک مکروہ ہیں لیکن عام اسے بننے سے پہلے رنگے گئے ہوں یا بننے کے بعد۔

(ومس من طیب ان كان عنده) اگر سہولت سے اسے حاصل کر سکتا ہو بایں طور کہ اس کے گھر میں موجود ہو یا اس کی بیوی کے پاس ہو اور کسی دوسرے سے طلب نہ کرے کیونکہ تحقیق یہ ہے کہ طلب میں ذلت ہے اگرچہ کسی طریقے سے ہو۔

(ثم اتی الجمعة فلم یتخط اعناق الناس) بایں طور کہ جلدی کی اور مجلس کے اختتام پر بیٹھ گیا جو شخص متاخر ہونے کے باوجود تقدم کو چاہتا ہے وہ پیروی کی حد سے نکل جاتا ہے۔

(ما كتب الله) یعنی جو اللہ نے اس کیلئے فیصلہ کیا اور مقدر کیا ہے اسے ادا کیا۔

(له ثم انصت اذا خرج) ای ظهر (امامه) بطلوع المنبر۔

(حتی یفرغ من صلاتہ) ابن حجرؒ کہتے ہیں گویا کہ نماز سے فراغت کے ذکر میں حکمت یہ ہے کہ خطبہ اور نماز کے درمیان خاموشی اختیار کرنے کی (از روئے شرح) طلب ظاہر ہوا گرچہ ہمارے نزدیک کلام کی کراہت اور ہمارے علاوہ دوسروں کے نزدیک کلام کی حرمت خطبہ سے فراغت کے ساتھ منتہی ہو جاتی ہے۔

(رواہ ابو داؤد) یعنی انہی الفاظ کے ساتھ امام ابوداؤد کہتے ہیں حضرت ابو ہریرۃ وزیادہ ثلاثۃ ایام بھی نقل ہے اور ان الحسنۃ بعشر امثالھا بھی ذکر کیا ہے۔

بیہقی نے اس روایت کو جید اسناد کے ساتھ روایت کیا اور حاکم نے بھی اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ باقی مختلف محدثین نے مختلف طرق سے اس روایت کو نقل کیا ہے۔

باقی شارح علیہ الرحمۃ کا ابن حجر کی اس حدیث کے بارے میں قول کہ امام ابوداؤد نے اسے جید اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے اور صحیحین میں اس مضمون کی روایات گذر چکیں اور اسی وجہ سے حاکم اور حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے الخ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تصحیح وغیرہ کا مدار حدیث کی اسناد پر ہے صحیح حدیث میں دوسرے طریق سے ذکر نہیں جیسے کہ علم اصول حدیث میں یہ بات ثابت ہے ہاں ایسی احادیث واسناد میں یوں تعبیر اختیار کی جاتی ہے یہ حسن لذاتہ صحیح لغیرہ ہے۔

۱۳۸۸: وَعَنْ اَوْسِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ غَسَّلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَاغْتَسَلَ وَبَكَّرَ وَابْتَكَرَ وَمَشٰى وَلَمْ يَرْكَبْ وَدَنَا مِنَ الْاِمَامِ وَاسْتَمَعَ وَلَمْ يَلْغُ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ خُطْوَةٍ عَمَلُ سَنَةٍ اَجْرُ صِيَامِهَا وَقِيَامِهَا۔ (رواہ الترمذی وابوداود والنسائی وابن ماجۃ)

أخرجه أبوداؤد في السنن ١/ ٢٤٦ حديث رقم ٣٤٥۔ والترمذي في السنن ٢/ ٣٦٧ حديث رقم ٤٩٦۔ والنسائي ٣/ ٩٧ حديث رقم ١٣٨٤۔ وابن ماجه ١/ ٣٤٦ حديث رقم ١٠٨٧۔ وأحمد في المسند ٤/ ١٠٤۔

ترجمہ: حضرت اوس بن اوسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن نہلائے اور خود بھی غسل کرے اور سویرے جائے اور پیدل جائے سوار نہ ہو اور امام کے قریب بیٹھے اور توجہ سے خطبہ سنے اور کوئی بے ہودہ بات زبان سے نہ نکالے تو اس کیلئے ہر قدم اٹھانے کے بدلے ایک سال کے روزوں اور رات کو قیام کی عبادت کا ثواب ہو گا (ترمذی، ابن ماجہ، نسائی، ابوداؤد)

تشریح: ''یوم الجمعۃ'' علامہ تورپشتیؒ کہتے ہیں (غسل) تخفیف وتشدید دونوں طرح مروی ہے اگر تشدید والی روایت کو لیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا دوسرے کو غسل پر ابھارا (اس کی صورت ہوگی) بایں طور کہ اپنی بیوی سے وطی کی اور یہی قول اختیار کیا ہے عبدالرحمٰن بن الاسودؒ اور ہلالؒ نے اور یہ دونوں تابعین میں سے ہیں گویا جن حضرات نے یہ قول اختیار کیا ہے وہ اس بات کی طرف گئے ہیں اس میں آنکھ کی پاکیزگی ہے اور نفس کو ایسے خیالات سے محفوظ کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف پوری توجہ سے مانع ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ تشدید اس میں مبالغہ کیلئے ہے۔ تعدیہ کیلئے نہیں ہے جیسے قطع و کسر میں کیونکہ اہل عرب کی چوٹیاں اور لمبے بال ہوتے تھے اور ان کے دھونے میں مشقت ہوتی تھی اسی وجہ سے سر کے دھونے کو الگ سے ذکر کر دیا اور یہی قول اختیار کیا ہے مکحول نے اور یہی قول ابوعبیدہ کا ہے اور اگر اس میں تخفیف کی جائے تو اس کا معنی یا تو تاکید ہے یا مراد ہے پہلے

خطمی وغیرہ کے ساتھ اپنے سر کو دھوئے پھر جمعہ کیلئے غسل کرے۔

(**واغتسل**)ای **تغسل بنفسه**" حاشیہ السید جمال الدین میں ہے زین العرب نے کہا **غسل الرجل امرأته** تشدید وتخفیف دونوں کے ساتھ جب وہ اس سے جماع کرے۔اور ایک قول یہ ہے تشدید والی صورت میں اس کا معنی ہوگا جماع کے بعد غسل کیا پھر جمعہ کیلئے غسل کیا اسی معنی کیلئے تکرار سے ادا کیا اور ایک قول یہ ہے غسل کا مطلب ہے اعضاء کے غسل میں تکمیل اور تثلیث کے اعتبار سے مبالغہ کیا اور ایک قول یہ ہے یہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں تاکید کیلئے تکرار سے ذکر کیا گیا قال (**وبکر وابتکر**)ان میں سے بعض نے غسل کو تخفیف کے ساتھ نقل کیا ہے اس صورت میں فاغتسل زیادتی سے خالی نہیں جیسے **کسب واکتسب** یا اول کو وضوء پر محمول کیا جائے گا یا اول کو غسل الجمعہ پر اور دوسرے کو سر کو خطمی وغیرہ سے دھونے پر کیونکہ جو آدمی ایسے کرے گا اس کی پاکیزگی زیادہ عمدہ ہوگی اھ۔

زیادہ ظاہر یہ ہے اول کو سر کے دھونے پر محمول کیا جائے اور دوسرے کو (یعنی دوسرے اغتسل کو) جمعہ کے غسل کرنے پر طیبیؒ فرماتے ہیں امام احمدؒ کا رجحان پہلے اول (یعنی تشدید والے قول) کی طرف تھا پھر تخفیف کی طرف رجوع کر لیا امام نوویؒ فرماتے ہیں غسل میں مختار وہ قول ہے جو بیہقی اور دوسرے محققین نے اختیار کیا ہے کہ یہ تخفیف کے ساتھ ہے اور اس کا معنی ہے اس نے اپنے سر کو دھویا اور اسی قول کی تائید کرتی ہے ابوداؤد کی روایت: **ومن غسل رأسه یوم الجمعة واغتسل** اور ابوداؤدؒ نے اور بیہقیؒ نے یہ تفسیر مکحولؒ وغیرہ سے روایت کی ہے۔بیہقیؒ فرماتے ہیں یہ تفسیر حضرت ابوہریرہؓ اور ابن عباسؓ کی نبی ﷺ سے روایت کے بین بین ہے۔

سیدؒ فرماتے ہیں بکر تشدید کے ساتھ اس کا معنی ہے **اتی الصلاة فی اول وقتها** اور جو آدمی کسی چیز میں جلدی کرے تو اس کی طرف تبکیر کرنے والا ہوتا ہے کسی بھی وقت میں ہو۔حضور ﷺ کے ارشاد گرامی: **لا تزال امتی علی سنتی ما بکروا بصلاة المغرب**! طیبیؒ فرماتے ہیں **وابتکر** کا معنی ہے ادرک اول الخطبۃ اور ہر چیز کا اول اس کا باکورۃ کہلاتا ہے اور کہا جاتا ہے **وابتکر اذا لقی باکورة الفاکحة** (یعنی جب سے میوے کو پایا)

حافظ تورپشتیؒ فرماتے ہیں یہ حضرت ابوعبیدہ کا قول ہے اور ابن الانباریؒ کہتے ہیں بکر کا معنی ہے نکلنے سے پہلے صدقہ کیا یہ تأویل وہ حدیث میں مروی: **باکروا بالصدقة فان البلاء لا یتخطاها** کے مضمون کی وجہ سے کرتے ہیں انہی کی متابعت کی ہے خطابیؒ نے۔

(ملا علی قاریؒ کہتے ہیں) میری رائے یہ ہے ابوعبیدہ کی نقل اصول لغت کے مطابق ہونے کی وجہ سے تقدیم کے لائق ومناسب ہے اور اس قول کی صحت پر ترتیب کلام بھی شاہد ہے کیونکہ اس میں تبکیر اور پھر الابتکار پر شوق دلاتا ہے اس لئے کہ انسان پہلے مسجد کی طرف جائے گا پھر ثانیا خطبہ توجہ سے سنے گا۔(تورپشتی کا کلام مکمل ہوا) (ملا علی قاریؒ کہتے ہیں) میں کہتا ہوں کلام کی ترتیب کی شہادت کا دعوی ابوعبیدہ کے قول کی صحت ثابت کیلئے مقبول نہیں بلکہ یہ (یعنی ترتیب کلام) ابن الانباری کے قول کیلئے شاہد ہے کیونکہ اس میں تبکیر پر شوق دلاتا ہے۔

(**ومشی ولم یرکب**)اور باقی اسے مباکرۃ صدقہ پر محمول کرنا ترتیب کلام سے خارج امر ہے۔اور تورپشتی کا قول لغت

کے اصول کے مطابق ابن الانباری کا قول لغت کے مادّوں کے موافق نہیں ایسے ہی ہے اس لئے کہ بکر کا مادّہ تصدق کے معنی میں نہیں آتا ہے اور جو حدیث انہوں نے ذکر کی ہے اس میں لفظ کے اعتبار سے اس پر بالکل بھی دلالت نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس میں اس اصل معنی کی تقویت ہے جس کا انہوں نے ارادہ کیا ہے فتأمل غور وفکر کر یہ غلطی سے خالی نہیں۔

اور باقی ابن حجرؒ کا قول بکر تخفیف کے ساتھ ای خرج من بيته باكرًا صحیح اصول اور لغت کی کتابوں کے مخالف ہے قاموس میں ہے بكر عليه واليه وفيه بكورًا وبكر وابتكر وبكرو باكره اتاه بكرةً اھ۔

اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ بکر تخفیف کے ساتھ حرف جارہ مذکورہ میں سے کسی ایک کے بغیر مستعمل نہیں ہاں یہ کہا گیا ہے بکر بکر تخفیف کے ساتھ جو الکور سے مشتق ہے کا مبالغہ ہے علی ما ذکرہ الطیبیؒ اور باقی جو یہ کہا گیا ہے یہ دونوں اس معنی میں ہیں کہ دونوں کو بطور تاکید کے جمع کیا گیا ہے۔

اور باقی ومشى ولم يركب دونوں کو جمع کرنا ایک قول ان کے بارے ہیں یہ ہے کہ ان دونوں کو تاکید کے طور پر جمع کیا گیا ہے۔ اور امام نوویؒ کہتے ہیں مختار یہ ہے کہ حضور ﷺ کا قول: ولم یرکب مشی کو جانے پر اگر چہ سوار ہو کر ہی کیوں نہ ہو محمول کرنے کے وہم کو دور کرنے کا فائدہ دیتا ہے۔ اور اس احتمال کی نفی ہو کہ مشی سے مراد اولاً کچھ راستے پر چلنا پھر ثانیاً صدقہ کرنا اور پھر چلنا اور امام سے قریب ہونا مراد ہو: تم کلامہ: میں کہتا ہوں یہ کمزور ضعیف قسم کی رائے ہے کیونکہ نسق کلام سے مراد حضور ﷺ کے قول میں غسل واغتسل ایک ہی باب سے تاکید حقیقی یا تغایر اعتباری کی قبیل سے ہیں اسی طرح ان کے کلام میں بعد والا قول بھی ہوگا۔

(كان له بكل خطوة)(خطوة) خاء کے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ۔

(عمل سنةٍ)ای ثواب اعمالها۔

(اجر صيامها قيامها) یہ (جملہ) بدل ہے عمل سنۃ سے۔

(رواہ الترمذی) اور اسے حسن کہا ہے نووی کہتے ہیں اس کی اسناد جید ہیں میرکؒ نے نقل کیا۔

(وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ) مختلف محدثین نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے جیسے میرک حاکمؒ اور ابن حجرؒ کہتے ہیں امام احمدؒ نے اسے نقل کیا ہے ابن حبان وحاکم نے اس کی تصحیح کی ہے اور کہا ہے یہ علی شرط الشیخین ہے۔

کچھ ائمہ کا قول ہے ہم نے شریعت میں کوئی صحیح حدیث اتنے بڑے ثواب پر مشتمل نہیں سنی۔ مطلب یہ ہے عمل کی تاکید ہوگی تاکہ امید کو پالیا جائے۔

جمعہ کیلئے مخصوص لباس بنانا مستحب ہے

۱۳۸۹: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاعَلٰى اَحَدِكُمْ اِنْ وَجَدَاَنْ يَتَّخِذَ ثَوْبَيْنِ لِيَوْمِ الْجُمُعَةِ سِوٰى ثَوْبَىْ مِهْنَتِهٖ۔ (رواه ابن ماجة)

أخرجه أبوداؤد في السنن ١/ ٦٥٠ حديث رقم ١٠٧٨ـ وابن ماجه ١/ ٣٤٨ حديث رقم ١٠٩٥ـ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے روایت ہے کہ سرتاج دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی حرج نہیں تم میں سے کسی ایک پر کہ اگر طاقت ہو تو وہ دو کپڑے بنالے جمعہ کیلئے کام کاج والے کپڑوں کے علاوہ۔ (ابن ماجہ)

امام مالک نے یہ روایت یحییٰ بن سعید سے نقل کی ہے۔

راوی حدیث:

عبداللہ بن سلام۔ یہ عبداللہ بن سلام ہیں۔ جلیل القدر صحابہ کرام ؓ میں سے ہیں۔ ان کی کنیت ابو یوسف ہے۔ اسرائیلی تھے یوسف بن یعقوب علیٰ نبینا وعلیہما السلام کی اولاد میں سے تھے۔ یہ بنی عوف بن الخزرج کے حلیف تھے۔ علماء یہود میں سے تھے اور تورات کے سب سے بڑے عالم تھے۔ ان لوگوں میں سے جن کے لئے آنحضور ﷺ نے جنت کے داخلہ کی بشارت دی ہے ان سے ان کے دو بیٹے یوسف ومحمد وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ مدینہ میں ۴۳ھ انتقال ہوا۔ "سلام" میں لام پر تشدید نہیں ہے۔

تشریح: "کہا گیا ہے ما موصولہ ہے طیبیؒ کہتے ہیں ما لیس کے معنی میں ہے اور اس کا اسم محذوف ہے اور علی احد کم اس کی خبر ہے۔

اور حضور ﷺ کا قول (ان وجد) ای سعة یقدر بھا علی تحصیل زائدٍ علی ملبوس مھنةٍ یہ شرطیہ اور معترضہ ہے۔

اور ان کا قول (ان یتخذ) محذوف اسم کے ساتھ متعلق ہے اور اس کیلئے معمولی ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ علی محذوف سے متعلق ہو اور ان یتخذ خبر ہو جیسے اللہ تعالیٰ کے قول: لیس علی الاعمٰی حرج سے اس کے قول ان تأکلوا من بیوتکم اور مطلب ہے لیس علی حد حرج ای نقص یخل بذھدہ فی ان یتخذ

(ثوبین لیوم الجمعة) ای یلبسھما فیہ وفی امثالہ من العھد وغیرہ۔ اس میں یہ بات ہے کہ بے شک یہ (یعنی کپڑے خصوصیت سے بتانا ہے اگر جمعہ کی تعظیم اور اسلامی شعار کی رعایت نہ ہو تو متقین کا شعار نہیں۔

(سوی ثوبی مھنتہ) "مھنة" میم کے فتحہ اور کسرہ کے ساتھ ای بذلتہ و خدمتہ کے معنی میں ہے مطلب یہ ہے عمدگی کے لحاظ سے بقیہ ایام کے دو کپڑوں کے علاوہ۔ (لفظ مھنۃ میں) میم کا فتحہ اور کسرہ بھی مروی ہے اور کسرہ اثبات کے وقت غلط ہے۔ الاصمعی کہتے ہیں فتحہ کے ساتھ یعنی الخدمۃ۔

اور نہایہ میں بھی فتحہ پر ہی اکتفا کیا گیا ہے لیکن قاموس کے اندر ہے المھنة بالکسر والفتح والتحریك وككلمة الحذق بالخدمة والعمل مھنة كمنعه ونصره مھنا ومھنةً ويكسر۔

(رواہ ابن ماجہ) میرکؒ کہتے ہیں اس حدیث کو ابوداؤدؒ نے حضرت عبداللہ بن سلام ہی کی روایت سے نقل کیا ہے جس میں ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو منبر پر یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔

۱۳۹۰: ورواہ مالك عن یحی بن سعید۔

ترجمہ: اور امام مالکؒ نے یہ روایت یحییٰ بن سعید سے نقل کی ہے"۔

راویٔ حدیث:

یحییٰ بن سعید۔ یہ "یحییٰ" ہیں "سعید" کے بیٹے ہیں، اور انصاری و مدنی ہیں۔ انس بن مالک، سائب بن یزید اور ان کے علاوہ بہت سے لوگوں سے حدیث کی سماعت کی۔ ان سے ہشام بن عروہ، مالک بن انس، شعبہ، ثوری، ابن عیینہ، ان المبارک وغیرہ نے روایت کی۔ مدینۃ الرسول میں بنوامیہ کے دور میں فصل خصومات کے ذمہ دار تھے۔ خلیفہ منصور نے ان کو عراق بلالیا اور ہاشمیہ میں قاضی مقرر کردیا۔ اسی مقام پر ۱۴۳ھ میں انتقال فرمایا۔ حدیث وفقہ کے ائمہ میں سے تھے۔ عالم دین، پرہیز گار، زاہد، نیک نہاد اور دینی اور فقہی بصیرت میں مشہور تھے۔

تشریح: "ورواه مالك عن يحيٰى بن سعيد" (یحییٰ بن سعید) یعنی جو انصاری اور تابعی ہیں: قاله الطيبيؒ۔

بوقتِ جمعہ امام سے دور بیٹھنا جنت سے دوری کا سبب ہے

۱۳۹۱: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُحْضُرُوْا الذِّكْرَ وَ ادْنُوْا مِنَ الْاِمَامِ فَاِنَّ الرَّجُلَ لَايَزَالُ يَتَبَاعَدُ حَتّٰى يُؤَخَّرَ فِي الْجَنَّةِ وَاِنْ دَخَلَهَا۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/۶۶۳ حديث رقم ۱۱۰۸۔

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خطبہ کیلئے حاضر ہو جاؤ اور امام کے قریب ہو کر بیٹھ جاؤ اس لئے کہ آدمی مسلسل دور ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہونے میں بھی پیچھے رہتا ہے، اگرچہ جنت میں داخل ہو بھی جائے۔ (ابوداؤد)

تشریح: "عن سمرة بن جندب" (جندب) دال کے فتحہ اور اس کے ضمہ کے ساتھ۔

(قال: قال رسول اللّٰهﷺ احضروا الذكر) اى الخطبة المشتملة على ذكر اللّٰه وتذكير الأنام۔

(وادنوا) یعنی اقربوا قدر ما امکن (یعنی جتنا ہو سکے قریب ہو جائے امام کے)۔

(وان دخلها) طیبیؒ مسلسل آدمی خطبہ سننے سے دور پہلی صف سے جو مقربین کا مقام ہے اس سے دور رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے متسفلین (یعنی نیچے والے لوگوں) کی آخری صف کی طرف پیچھے کردیا جاتا ہے اور اس میں متاخرین کے امر کی توہین ہے اور ان کی رائے کو نامقبول سمجھنا ہے اپنے نفوس کو بلند درجے کے امور کے بجائے نچلے (درجے کے) امور میں رکھ دیا۔ اور حضور ﷺ کے قول وان دخلها میں اشارہ ہے کہ داخل ہونے والے نے جنت اور بلند درجات اور رفعت والے مقامات سے محض دخول پر قناعت کرلی ہے۔

(رواہ ابوداؤد) منذریؒ کہتے ہیں اس کی سند میں انقطاع ہے ورواہ الطبرانی۔ نقلہ میرک۔

جمعہ کے روز گردنوں کو پھلانگنے کا بدلہ

۱۳۹۲: وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسِ الْجُهَنِيِّ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَخَطّٰى رِقَابَ النَّاسِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اتُّخِذَ جِسْرًا اِلٰى جَهَنَّمَ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ١/٦٦٤ حديث رقم ١١١٠۔ والترمذی فی السنن ٢/٣٩٠ وأحمد فی المسند ٣/٤٣٩۔

ترجمہ: حضرت معاذؓ بن انس الجہنی اپنے والد مکرم سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے (جامع مسجد میں) جمعہ کے دن لوگوں کی گردنوں کو پھلانگا تو وہ جہنم کی طرف پُل بنایا جائے گا۔ یہ ترمذی کی روایت ہے، امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: ''وعن معاذ بن انس الجهنی عن ابيه'' سید جمال الدین نے فرمایا یہ (سند) سہو ہے اس لئے کہ معاذ کے والد انس ہیں ان کو نہ شرف روایت اور نہ صحبت حاصل ہے۔ اور درست یہ ہے عن سھل بن معاذ عن ابیہ جیسے ترمذی میں ہے یا (یہی سند) بغیر راوی کے قول عن ابیہ کے ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

(يوم الجمعة) (جمعہ والا دن کو) تعظیم کے طور پر خصوصیت کی گئی۔

(اتخذ) مبنی للفاعل سے اور مبنی للمفعول والا قول بھی ہے۔

(الی جهنم) قاضی کہتے ہیں پہلے احتمال (یعنی معروف ماننے) کی صورت میں اس کا معنی ہوگا اس کا یہ فعل اسے جہنم کی طرف لے جانے والا ہے کیونکہ اس میں لوگوں کو تکلیف دینا اور ان کی تحقیر کرنا ہے گویا کہ یہ پل ہے۔ جسے اس نے جہنم کی طرف بنایا جائے گا اس پر وہ لوگ گزریں گے جو جہنم کی طرف کھنچے جائیں گے اس کے فعل کے مثل اس کیلئے بدلے کے طور پر۔

طیبیؒ کہتے ہیں الشیخ تورپشتی نے مبنی للمفعول کو روایۃً اور درایۃً ضعیف قرار دیا ہے انتھیٰ کلامہ۔ اور اس حکم سے وہ صورت مستثنیٰ ہے جب کہ صف کے سامنے خالی جگہ ہو کیونکہ اس وقت پھلانگنے والا ان کی یعنی پہلے بیٹھنے والوں کی کوتاہی کی وجہ سے معذور ہوگا۔

(رواه الترمذی وقال: هذا حديث غريب) لا نعرفه الا من حديث رشد بن سعد وقد تكلم اهل العلم فيه: خلاصہ یہ ہے امام ترمذیؒ کہتے ہیں یہ حدیث غریب ہے کیونکہ یہ صرف رشید بن سعد کی طرف سے آئی ہے اور اس کے بارے میں اہل علم نے کلام کیا ہے نقلہ میرکؒ۔

لیکن صحیح طور سے آتا ہے حضور ﷺ نے ایک آدمی کو لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے دیکھا تو حضور ﷺ نے فرمایا بیٹھ جا تحقیق تو نے تکلیف دی اور تاخیر کی۔

اور باقی جو یہ مروی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کی گردنیں پھلانگیں درانحالیکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے ان پر کسی نے بھی انکار نہیں کیا یہ محمول ہے اس پر کہ صف کے سامنے خالی جگہ تھی یا اس پر کہ پھلانگا جانے والا شخص ان کیلئے راضی تھا۔

۱۳۹۳: وَعَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنِ الْحَبْوَةِ یَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْاِمَامُ یَخْطُبُ۔

(رواه الترمذی)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ٦٦٨/١ حديث رقم ١١١٩۔ والترمذی ٤٠٤/٢ حديث رقم ٥٢٦ وأحمد فی المسند ٣٢/٢۔

ترجمہ: حضرت معاذ ابن انس سے روایت ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کے دن جب امام خطبہ پڑھ رہا ہو گوٹ مار کر بیٹھنے سے منع فرمایا۔ (ترمذی، ابوداؤد)

اسنادی حیثیت: ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: ''ان النبی ﷺ نهی عن الحبوة)'' حبوة'' حاء کے ضمہ اور اس کے کسرہ کے ساتھ اسی طرح ہمارے علماء میں کچھ شارحین نے ذکر کیا ہے اور یہی صحیح اصولوں کے موافق ہے اور ابن حجرؒ نے کسرہ پر اقتصار کیا ہے اور نہایہ میں حا کے کسرہ اور ضمہ کے ساتھ۔ الاحتباء اسم ہے اور احتباء کا معنی ہے، پنڈلی کو پیٹ کی طرف ملانا کپڑے کے ساتھ یا دونوں ہاتھوں کے ساتھ (مراد اس سے گوٹ مار کا بیٹھنا ہے جس میں کپڑے یا ہاتھوں کے ذریعے گھٹنے اور رانیں پیٹ کے ساتھ ملائی جاتیں ہیں) اور اس طرح بیٹھنے سے اس لئے روکا ہے کیونکہ یہ (بیٹھنے کا طریقہ) نیند کو کھینچتا ہے لہٰذا آدمی خطبہ نہ سن سکے گا اھ۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات آدمی اس حالت میں پہلو پر گر جاتا ہے تو اس کی طہارت ٹوٹ جائے گی پس طہارت میں مشغول ہونا اسے خطبہ سننے سے روک دے گا۔ اور ایک قول یہ ہے (کہ اس طرح بیٹھنے سے اسلئے روکا) کیونکہ یہ متکبرین کے بیٹھنے کا طریقہ ہے هذا۔

قاموس سے مفہوم ہوتا ہے حبوة واؤ کے ساتھ مثلث الحاء ہے۔ حباه ای اعطاه سے اسم ہے اور باقی الاحتباء سے اسم وہ الحبية کسرہ کے ساتھ ہے۔ اس کلام سے صاحب قاموس نے دونوں کے مادوں کے درمیان فرق کی طرف اشارہ کیا ہے بایں طور کہ پہلا واوی ہے اور دوسرا یائی ہے۔

(یوم الجمعة والامام یخطب) یہ قید احترازی ہے اور پہلی (یعنی یوم الجمعہ) واقعی اتفاقی یا تاکیدی ہے۔

(رواه الترمذی) وقال حسن ذكره ميرك۔

(ابو دائود) ورواه احمد والحكم بسند صحيح۔ نوویؒ کا اعتراض اپنے مجموعے میں کہ ترمذی کی سند میں دو ضعیف راوی ہیں لہٰذا اس کا حسن تام نہیں اور ان کا (نوویؒ کا) اعتراض بھی تام نہیں۔

۱۳۹۴: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا نَعَسَ اَحَدُكُمْ یَوْمَ الْجُمُعَةِ فَلْیَتَحَوَّلْ مِنْ مَجْلِسِهٖ ذَالِكَ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٦٢/١١۔ حديث رقم ٦٢٧٠۔ ومسلم ١٧١٤/٤ حديث رقم (٢٧۔ ٢١٧)۔ وأبوداود فی السنن ١٦٥/٥ حديث رقم ٤٨٢٨ والترمذی ٨٢/٥ حديث رقم ٢٧٤٩۔ والدارمی ٣٦٥/٢ حديث رقم ٢٦٥٣۔ وأحمد فی المسند ١٧/٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کسی کو جمعہ کے دن اونگھ

آ جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی جگہ بدل لے، اس سے نیند کا غلبہ کم ہو جائے گا۔ (ترمذی)

تشریح: "وعن ابن عمر قال: قال رسول اللهﷺ اذا نعس) "نعس" عین کے فتحہ کے ساتھ۔

(احدكم يوم الجمعة فليتحول من مجلسه ذلك) ای الی غیره كما فی روایةٍ اخرٰی پھر چاہے اسی کی طرف لوٹ آئے یا نہ لوٹے کیونکہ اس جگہ سے بیٹھنے کی وجہ سے بوجھ دور ہو جائے گا۔

(رواه الترمذی) ورواہ احمد وابوداؤد ذکرہ ابن حجر اور سیوطی کی جامع صغیر میں ہے ان الفاظ کے ساتھ ہے، اذا نعس احدكم وهو فى المسجد فليتحول من مجلسه ذلك الى غيره رواه ابوداؤد والترمذی عن ابن عمر رضی الله عنهما۔

الفصل الثالث:

۱۳۹۵: عَنْ نَافِعٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عُمَرَ يَقُوْلُ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُقِيْمَ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَقْعَدِهٖ وَيَجْلِسُ فِيْهِ قِيْلَ لِنَافِعٍ فِى الْجُمُعَةِ قَالَ فِى الْجُمُعَةِ وَغَيْرِهَا۔ (متفق عليه)

۱۳۹٦ : أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/ ٦٦٥ حديث رقم ۱۱۱۳۔

ترجمہ: حضرت نافعؒ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اسکی جگہ سے اٹھائے اور پھر اس کی جگہ خود بیٹھ جائے۔ نافع سے پوچھا گیا کیا یہ ممانعت جمعہ کیلئے ہے؟ تو فرمایا جمعہ اور غیر جمعہ دونوں کیلئے ہے۔

تشریح: "عن نافع قال...... مقعده) یعنی مراد ہے دوسرے آدمی کے بیٹھنے کی جگہ سے یا مطلب ہے کہ پہلا آدمی اپنی جگہ سے نہ اٹھائے بایں طور کہ جگہ چھوڑ کر چلا جائے اور اس میں دوسرا بیٹھ جائے پھر یہ پہلا لوٹے اور اس دوسرے کو اٹھانا چاہے۔

ابن حجر عسقلانیؒ کہتے ہیں یہ نصب کے ساتھ اور اگر رفع والی روایت صحیح ہو جائے تو مجموعہ منہی عنہ ہو جائے گا۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں نصب کے ساتھ یقیم پر معطوف ہے ان میں سے ہر ایک علیحدہ طور پر منع ہے اور رفع بھی مروی ہے اس صورت میں یہ جملہ حالیہ ہوگا اور نہی مجموعے سے ہوگی۔ یہاں تک کہ اگر کسی نے کسی کو اٹھایا اور اس کی جگہ پر بیٹھا نہیں اس نے منہی عنہ کا ارتکاب نہیں کیا اور بہتر وہ پہلی روایت اور اس کا افادہ ہے کیونکہ علت نہی کی ایذاء مسلم ہے اور وہ ہر ایک سے الگ الگ طور پر بھی حاصل ہوتی ہے لہٰذا ہر ایک حرام ہے کیونکہ یہ صحیح حدیث کی رو سے قاعدہ ہے۔ من سبقت الى المباح فهو احق به جو کسی مباح چیز کی طرف سبقت کرے وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔ (حدیث یہ ہے) من سبق الى ما يسبق غيره فهو احق به اھ۔ اور ایذاء کا دارومدار وہ دوسرے آدمی کو اٹھانے پر ہے اس جگہ بیٹھنے پر نہیں پس اگر اسے اٹھائے اور خود نہ بیٹھے تو یہ بھی ممنوع ہے اور اگر خود بخود کھڑا ہو جائے اور کوئی بیٹھ جائے تو اس میں کوئی بھی حرج نہیں اسی طرح اگر کسی کو کھڑا کیا اور خود نہیں بیٹھا اور کوئی اس کی جگہ بیٹھ گیا تو اس کیلئے یہ جائز ہوگا اگرچہ اس کی اجازت کے بغیر ہی ہو پس جلوس کا ذکر سبب عادی کے طور پر ہے اور حدیث میں

اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اگر کسی غرض شرعی کیلئے کسی کو اس کی جگہ سے اٹھایا تو جائز ہے لہٰذا ان کا یعنی ابن حجرؒ کا قول کہ انہیں سے ہر ایک علیحدہ طور پر ممنوع ہے علی الاطلاق درست نہیں۔

(قال فی الجمعة وغیرها) ابن حجرؒ نے کہا آدمی کیلئے اجازت ہے کہ وہ بھیجے اس آدمی کو جو مقرر کرے اس کیلئے جگہ مسجد میں مقام ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور روضہ شریفہ اور ان جیسی جگہوں میں جیسے میزاب رحمت کے نیچے۔ پس حرام ہے اس میں مصلوں کا بچھانا اور جو آدمی آئے اور مصلیٰ بچھا ہوا پائے تو اسے ہٹانے کی اجازت ہے اور اس کی جگہ پر بیٹھ سکتا ہے اور یہ آدمی اپنے ہاتھ سے ہٹانے سے بچے کیونکہ اس وقت یہ اس کے ضمان میں داخل ہو جائے گا۔ متفق علیہ۔

دعا بھی بے موقع فائدہ مند نہیں

۱۳۹۶: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْضُرُ الْجُمُعَةَ ثَلَاثَةُ نَفَرٍ فَرَجُلٌ حَضَرَهَا بِلَغْوٍ فَذَالِكَ حَظُّهُ مِنْهَا وَرَجُلٌ حَضَرَهَا بِدُعَاءٍ فَهُوَرَجُلٌ دَعَااللّٰهَ اِنْ شَاءَ اَعْطَاهُ وَاِنْ شَاءَ مَنَعَهُ وَرَجُلٌ حَضَرَهَا بِاِنْصَاتٍ وَسُكُوْتٍ وَلَمْ يَتَخَطَّ رَقَبَةَ مُسْلِمٍ وَلَمْ يُؤْذِ اَحَدًا فَهِيَ كَفَّارَةٌ اِلَى الْجُمُعَةِ الَّتِيْ تَلِيْهَا وَزِيَادَةُ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ وَذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أحمد في المسند ١/ ٢٣٠۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کیلئے تین قسم کے لوگ حاضر ہوتے ہیں، ایک وہ شخص جو لغو اور بے کار کام کے ساتھ حاضر ہوا، پس اس آدمی کیلئے اس کی حاضری سے یہی حصہ ہوگا (یعنی ثواب سے محروم ہوگا)۔ اور ایک آدمی ہے جو جمعہ میں حاضر ہوتا ہے دعا کی غرض سے پس وہ آدمی ہے جو اللہ سے دعا کرتا ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو دے دے گا اگر نہیں چاہے گا تو نہیں دے گا۔ اور ایک وہ شخص ہے جو جمعہ کیلئے آتا ہے خاموشی اور سکوت کے ساتھ یعنی خاموش ہو کر خطبہ سنتا ہے اور کسی مسلمان کی گردن نہیں پھلانگتا اور کسی مسلمان کو تکلیف بھی نہیں دیتا، پس یہ جمعہ اس کیلئے دوسرے جمعہ تک جو اس کے ساتھ ملا ہوا ہے اور تین دن زیادہ تک کیلئے کفارہ بن جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿من جاء بالحسنة فله عشر امثالها﴾ کہ جو شخص نیکی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو دس گنا زیادہ ثواب دے گا۔

تشریح: "فرجل" میں فاء تفصیلیہ ہے کیونکہ تقسیم حصر والی ہے اس لئے کہ حاضرین جمعہ تین قسم کے لوگ ہیں۔

(پہلی قسم) کا وہ آدمی ہے جو بیکار کام کرنے والا ہے لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر تکلیف دینے والا ہے اس کا حصہ حاضری سے لغو اور اذی ہے۔

دوسری قسم کا وہ آدمی ہے جو اپنے ثواب کے حصے کا طالب ہے درانحالیکہ کسی کو تکلیف دینے والا بھی نہیں نہ تو اس پر کچھ وبال ہے اور نہ اس کیلئے کچھ ثواب ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس پہ فضل فرما دیں اور اس کے مطلوب کو پورا کریں۔

تیسری قسم کا وہ آدمی جو حاضری سے رضائے الٰہی کا طالب ہے مخلوق کے احترام کا قصد رکھتا ہے۔ پس وہ تو پھر وہی ہے (یعنی ایسا آدمی تو قابل رشک ہے) ذکرہ الطیبیؒ۔

اور باقی ابن حجرؒ کا قول (فرجل) میں فا زائدہ ہے یہ فائدہ سے غفلت ہے اور باقی ان کا قول اس کا (یعنی امام کا) تضریع کیلئے قرار دینا بھی درست ہے کیونکہ تفصیل اجمال پر مفرع ہوتی ہے (ان کا قول) تضریع اور تفصیل کے درمیان فرق نہ کرنے پر مبنی ہے۔

(**فذلك حظه منها**) علامہ طیبیؒ کہتے ہیں فاء جزائیہ ہے کیونکہ مبتدا متضمن ہے معنی شرط کو کیونکہ نکرہ ہے جس کی صفت جملہ فعلیہ ذکر کی گئی ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں مطلب یہ ہے اس کیلئے کامل حصہ نہیں ہوگا کیونکہ بیکار کام جمعہ کے کام ثواب سے مانع ہے۔

یہ بھی جائز ہے لغو سے مراد تخطی اور ایذاء وغیرہ مراد ہوں کیونکہ تیسرے سے تخطی وغیرہ کی نفی کی گئی ہے۔ **ای فلذلك الاذی حظه**۔

(**ورجل حضرها بدعاءٍ**) یعنی وہ آدمی دوران خطبہ دعا میں مشغول ہوں یہاں تک کہ مشغولیت اسے بالکل خطبہ سننے سے روک دے یا کامل طور پر سننے سے یہ (یعنی اصل خطبہ یا کمال خطبہ والامفہوم) تیسرے شخص کے بارے میں منقول حضور ﷺ کے قول انصاتِ وسکوت سے ماخوذ ہے۔

(**فهو رجل دعا الله ان شآء اعطاه وان شاء منعه**) یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنے کرم و بردباری کی کشادگی کی وجہ سے اس کا مسئول عطاء کردیں یا چاہے تو اس سے وہ چیز روک لے اس کے سماع خطبہ کی بجائے دعا میں مشغول ہونے پر عذاب کے طور پر کیونکہ ہمارے نزدیک یہ حرام مکروہ ہے اور باقیوں کے نزدیک حرام ہے قالہ ابن حجرؒ۔

(**وسکوت**) صرف خاموش ہو۔ پہلی صورت تو اس وقت ہوگی جبکہ قریب ہو اور دوسری صورت اس وقت ہوگی جبکہ دور ہو اور یہ قول ہمارے اصحاب میں سے محمد بن ابی سلمۃ کے قول کی تائید کرتا ہے اور یہی ابن ہمامؒ کا مختار ہے۔

وفي القاموس انصت سكت وانصت له سكت له واستمع حديثه وانصته اسكته اھ۔ اور ممکن ہے سکوت کو متعدی پر محمول کیا ہے معنی یہ ہوگا کہ وہ لوگوں کو اشارے سے خاموش کروائے کیونکہ تاسیس تاکید سے بہتر ہے۔

وقال ابن حجرؒ (تقديره) بانصاتٍ للخطيب وسكوت عن اللغو۔

(**ولم يؤذ احدًا**) یعنی کسی قسم کی تکلیف نہ دی مثلاً کسی کو اس کی جگہ سے اٹھانا یا کسی دوسرے کے اعضاء پر بیٹھ جانے یا دوسرے کے مصلّٰی پر اس کی رضا کے بغیر بیٹھ جانا۔ یا لہسن و پیاز (جیسی چیزوں) کی بدبو سے مذکورہ کسی چیز سے تکلیف نہ دی)۔

(**فهي**) **اى جمعة الشاملة للخطبة والصلاة والاوصاف المذكورة**۔

(**وزيادة ثلاثة ايام**) ''وزیادۃ'' جر کے ساتھ الجمعۃ پر معطوف ہے۔

(**وذلك**) اور مذکورہ کفارہ جو کہ دو جمعوں کے درمیان سات اور تین دن کی زیادتی پر مشتمل ہے۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کے قول **من جآء بالحسنة فله عشر امثالها** کے مطابق ہے کیونکہ جب اس نے اس دن کی تعظیم میں اہتمام کیا تو اس نے ایک نیکی

کی جو اس کے گناہ کا اس وقت میں کفارہ ہوگی اور کفارہ گزرے ہوئے دنوں کی طرف بھی متعدی ہو جائے گا نیکی میں تضاعف کے کم سے کم قاعدے کی بناء پر۔

(رواہ ابو داؤد) قال میرك وابن خزیمة فی صحیحة۔

علم پر عمل نہ کرنے والے کی مثال

۱۳۹۷: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَكَلَّمَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ فَهُوَ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا وَالَّذِي يَقُوْلُ لَهٗ اَنْصِتْ لَيْسَ لَهٗ جُمُعَةٌ۔ (رواہ احمد)

أخرجه ابن ماجه فی السنن ۳۴۹/۱ حدیث رقم ۱۰۹۸۔ ومالك فی الموطأ ۶۵/۱ حدیث رقم ۱۱۳ من كتاب الطهارة۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے جمعہ کے دن بات چیت شروع کر دی اس حال میں کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو وہ شخص گدھے کی مانند ہے جس پر کتابیں لاد دی گئی ہوں اور جو شخص اس کو کہے چپ ہو جا تو اس کیلئے جمعہ کا ثواب نہیں۔

تشریح: "ابن حجرؒ کہتے ہیں غیر مشروع کلام کیا اور حدیث کے ظاہر سے اطلاق معلوم ہوتا ہے جیسے امام حنیفہ ؒ اور امام مالکؒ نے اختیار کیا ہے ہاں امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابوحنیفہ ؒ کے کچھ اصحاب نے ذکر کو جائز قرار دیا ہے جبکہ وہ آدمی خطبہ نہ سن سکے۔ (آواز وغیرہ نہ آنے کی وجہ سے)۔

(یحمل) یہ جملہ صفت ہے یا حال ہے۔

(اسفارًا) ای كتبا كبارًا من كتب العلم علامہ طیبیؒ کہتے ہیں متکلم کو جو کہ دوران خطبہ کلام کرنے کے حرام ہونے کو جانتا ہے اس گدھے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو احکام کی بڑی کتابیں اٹھائے ہوئے چلتا ہے لیکن جانتا نہیں ہوتا اس پر کیا چیز لادی گئی ہے۔

ان روایات میں سے صحیحین کی روایت ہے: جمعہ والے دن ایک دیہاتی نے حضور ﷺ سے عرض کیا درانحالیکہ حضور ﷺ خطبہ دے رہے تھے اے اللہ کے رسول ﷺ میرا مال تباہ ہو گیا اور اہل وعیال بھوکے ہو گئے ہمارے لئے اللہ سے دعا کیجئے تو حضور ﷺ نے ہاتھ اٹھائے اور دعا فرمائی بیہقیؒ کی روایت کی سند صحیح ہے ایک آدمی نے اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اس نے اشارہ قبول نہ کیا اس نے دوبارہ کلام کیا لوگوں نے دوبارہ روکا پھر اس نے دوبارہ کلام لوگوں نے پھر روکا نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا تو نے اس کیلئے کیا تیاری کی ہے۔

اس آدمی نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کی محبت تو ارشاد فرمایا تو اس کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ تو نے محبت کی۔ (یہ روایات) ابن حجرؒ کے مقصود پر دلالت نہیں کر رہیں۔ کیونکہ یہ ایسے حال کے واقعہ ہے جو قابل استدلال نہیں اس احتمال کی بناء پر کہ ان میں سے ہر ایک نے حضور ﷺ کے منبر پر بیٹھنے سے پہلے کلام کیا ہو یا خطبہ شروع کرنے سے پہلے یا خطبہ سے فراغت کے بعد۔

اور احادیث میں مذکور اللغو کو ترک ادب کے معنی میں لینا انتہائی بعید ہے کیونکہ حضور ﷺ ترک ادب سے گدھے کے ساتھ تشبیہ نہیں دیتے اور جمہور کے قول کیلئے باری تعالیٰ کا قول مؤید ہے کیونکہ بہت سارے مفسرین کا قول ہے اس سے مراد خطبہ شامل تھا۔

اس کی تائید کرتا ہے ابی رضی اللہ عنہ کا قول اس آدمی کیلئے جس نے ان سے سوال کیا درانحالیکہ نبی ﷺ خطبہ ارشاد فرمارہے تھے۔اس نے سورۃ براءۃ پڑھی اور پوچھا یہ کب اتری۔

حضرت ابی نے اس سے کلام نہ کیا جب سب نماز پڑھ چکے تو اس آدمی نے حضرت ابیؓ سے کہا مجھے جواب دینے میں آپ کو کیا رکاوٹ پیش آئی۔ابیؓ نے فرمایا تم ہمارے ساتھ جمعہ میں حاضر نہ تھے۔

وہ آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ابی نے سچ کہا۔

اور یہ روایت جواز کلام کی سابقہ بحث کیلئے ناسخ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے کیونکہ سورۃ برائۃ آخری نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے ہاں جمہور کے نزدیک اس کے نفی مشہود سے مراد اس کے کامل ثواب کی نفی ہے ورنہ تو اسے نماز کے اعادے کا حکم دیتے ہیں۔

امام نوویؒ کہتے ہیں بلا خلاف کلام کی وجہ سے جمعہ باطل نہیں ہوتا اگر چہ ہم اس کی حرمت کے قائل ہیں اور حدیث: ''فلا جمعة له '' کا مطلب ہے کاملة (اس کا جمعہ کامل نہیں ہوتا)۔

جمعہ کے دن مسواک ضرور کرنی چاہیئے

۱۳۹۸: وَعَنْ عُبَيْدِبْنِ السَّبَّاقِ مُرْسَلاً قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ جُمُعَةٍ مِنَ الْجُمُعَةِ يَامَعْشَرَ الْمُسْلِمِيْنَ اِنَّ هٰذَا يَوْمٌ جَعَلَهُ اللّٰهُ عِيْدًا ا فَاغْتَسِلُوْا وَمَنْ كَانَ عِنْدَهٗ طِيْبٌ فَلَا يَضُرُّهٗ اَنْ يَمَسَّ مِنْهُ وَعَلَيْكُمْ بِالسِّوَاكِ۔ رواه مالك ورواه ابن ماجة عنه)

أخرجه الترمذي في السنن ٢/ ٤٠٧ حديث رقم٥٢٨ وأحمد في المسند ٤/ ٢٨٢۔

ترجمہ: حضرت عبید بن سباقؒ مرسلاً سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جمعوں (جمع جمعہ) میں سے ایک جمعہ میں فرمایا کہ اے مسلمانوں کی جماعت بے شک یہ ایسا دن ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے عید بنایا ہے، پس تم غسل کرو، اور وہ شخص جس کے پاس خوشبو ہو اس پر کوئی حرج نہیں کہ اس کو لگا لے اور تم پر مسواک لازم ہے۔ یہ امام مالک کی روایت ہے۔ اور اسی روایت کو ابن ماجہ نے عبید اللہ سے نقل کیا ہے۔

راوئ حدیث:

عبید بن السباق۔عبید ''سباق'' کے بیٹے ہیں۔حجاز کے باشندہ ہیں۔ان کا شمار تابعین میں ہے۔یہ ''قلیل الروایۃ'' راوی ہیں۔ اہل حجاز کے یہاں ان کی حدیثیں ملتی ہیں۔زید بن ثابت' سہل بن حنیف اور جویریہ سے روایت کی۔

تشریح: ''... ... '' ... ... تصغیر کے ساتھ ...

ابن السباق : باء کی تشدید کے ساتھ مؤلف (صاحب مشکوۃ) کہتے ہیں ابن السباق حجازی ہیں ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔

قال:قال رسول اللهﷺ في جمعة من الجمع : جمعہ جیم کے ضمہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ جمعہ کی جمع ہے۔

يا معشر المسلمين :اى جماعة المؤمنين (ان هذا)اى اليوم۔

يوم :اى عظيم

جعله الله عيدًا :اى يوم سرور وتزيين للفقر آء والمساكين والاولياء والصالحين۔

فاغتسلوا :اى بالغو في الطهارة والنظافة۔

(ومن كان عنده طيب)اى من طيب الرجال مردوں والی خوشبو ہو جس کا رنگ نہ ہو اور اس کی مہک ہو۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں خوشبو میں افضل وہ مشک ہے جس میں عرق گلاب کی آمیزش ہو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشک کو ہی بطور خوشبو کے استعمال کرتے تھے۔

(فلا يضره ان يمس منه) اگر چہ وہ دنیوی لذات اور شہوات نفسانیہ کو چھوڑنے والا اور عبادت بدنیہ میں مشغول ہونے والا ہے کیونکہ خوشبو سنن نبویہ میں سے ہے اور ثواب کی بنیاد تصحیح نیت ہے۔

علامہ طیبیؒ کہتے ہیں اگر یہ اشکال کیا جائے کہ یہ پیرائیہ بیان تو وہاں اختیار کیا جاتا ہے جہاں کسی قسم کے حرج کا گمان ہو اور خوشبو لگانا خاص طور پر جمعے والے دن سنت مؤکدہ ہے پھر اس کا کیا مطلب ہے۔ تو جواب ہے کچھ مسلمانوں کو یہ وہم ہو گیا کہ خوشبو لگانا عورتوں کی عادت ہے۔ لہٰذا مردوں کیلئے درست نہیں تو حرج کی نفی فرمادی جیسے کہ اس طرح کے پیرائیہ بیان کو اختیار کرنے کی وجہ ہے اللہ تعالیٰ کے قول (فلا جناح عليه ان يطوف بهما) میں حالانکہ سعی واجب ہے (كما عندنا) یا رکن ہے (كما عند غيرنا)۔

(وعليكم بالسواك) مطلب یہ ہے جمعہ والے دن مسواک کو لازم پکڑو خاص طور پر وضو اور غسل کے وقت طہارت وصفائی ستھرائی کامل کرنے کیلئے۔

۱۳۹۹:وَ هُوَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ مُتَّصِلاً۔

ترجمہ: ابن ماجہ نے بھی یہ حدیث عبداللہ بن سباق سے انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما متصل نقل کی ہے۔

تشریح: "وهو" اى عبيد (عن ابن عباس متصلاً)

میرکؒ کہتے ہیں ابن عباسؓ والی حدیث کے الفاظ ابن ماجہ میں یوں ہیں:

قال: قال رسول اللهﷺ ان هذا يوم عيد جعله الله للمسلمين فمن جآء الى الجمعة فليغتسل وان كان طيب فليمس منه وعليكم بالسواك" امام منذریؒ کہتے ہیں اس کی سند حسن درجے کی ہے۔

بیوی سے خوشبو لے کر لگانا جائز ہے

۱۴۰۰: وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَقًّا عَلَی الْمُسْلِمِيْنَ اَنْ يَّغْتَسِلُوْا يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَلْيَمَسَّ اَحَدُهُمْ مِنْ طِيْبِ اَهْلِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَجِدْ فَالْمَاءُ لَهٗ طِيْبٌ۔

(رواہ احمد والترمذی وقال ھذ حدیث حسن)

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/ ۴۰۷ حدیث رقم ۵۲۸ وأحمد فی المسند ۴/ ۲۸۲۔

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں پر جمعہ کے دن غسل واجب ہے اور چاہئے کہ ہر شخص اپنے گھر میں سے خوشبو لے کر استعمال کرے۔ پس اگر خوشبو نہ پائے تو پانی بھی اس کیلئے خوشبو ہے۔ (ترمذی، مسند احمد) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

تشریح: **وعن البرآء...... المسلمین** : علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں حقا مصدر مؤکد ہے تقدیر عبارت ہوگی **حق ذلك حقا**: اختصار کی غرض سے فعل کو حذف کر دیا گیا اور مصدر کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا۔ حق تو یہ تھا کہ اسے کلام کے بعد تاکید کلام کیلئے ذکر کیا جاتا اسے اس کی یعنی (غسل یوم الجمعۃ) کی عظمت شان بتلانے کیلئے مقدم کیا ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس جملے سے یہ بات ماُخوذ ہوتی ہے کہ غسل کا وقت فجر سے داخل ہوتا ہے لہٰذا فجر سے پہلے جائز نہیں امام اوزاعیؒ کا اس میں اختلاف ہے اور جانے پر موقوف نہیں امام مالکؒ کا اس میں اختلاف ہے اس بناء پر کہ حدیث: **من اغتسل ثم راح**'' یہ واضح دلیل ہے غسل کے حصول پر اگر چہ اس کے بعد جانا نہ بھی ہو ہاں اس میں افضل یہ ہے کہ جتنا ہو سکے جانے کے قریب کیا جائے، کیونکہ یہ بات صفائی کی غرض کے زیادہ مناسب ہے اور یہ غسل جمعہ میں حاضر ہونے کا ارادہ رکھنے والے کے ساتھ خاص ہے اگر چہ عورت ہی کیوں نہ ہو۔ امام احمد اور ہمارے کچھ اصحاب اس میں اختلاف کرتے ہیں لیکن صحیح حدیث ''**من اتی الجمعة من الرجال والنسآء فلیغتسل ومن لم یأتها فلیس علیه غسل من الرجال والنسآء**'' کی بناء پر اور اسے حدث اور جنابت کا طاری ہونا باطل نہیں کرتا۔ خلافاً للاوزاعی اھ۔

اور اس میں یہ بحث ہے کہ حدیث میں ایک دن پہلے غسل جائز نہ ہونے کے بارے میں دلالت موجود نہیں کیونکہ مقصود ہے نظافت وغیرہ نماز کے وقت موجود ہو اسی وجہ سے ہمارے کچھ اصحاب نے کہا ہے صحیح یہ ہے غسل نماز جمعہ کیلئے ہے۔ جمعہ کے دن کے کیلئے نہیں ہے۔ اس دلیل کے ساتھ کہ اگر نماز کے بعد غسل کرے تو بالاجماع کفایت نہیں کرے گا۔

پھر اس حدیث کا ظاہر اور اس سے پہلے والی حدیث میں غسل کا امر اور شیخین کی روایت **اذا اتی احدکم الجمعة فلیغتسل** کا مضمون امام مالکؒ کے مذہب کیلئے مؤید ہے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح قول **غسل الجمعة** واجب ہے جیسے شیخینؒ نے روایت کیا ہے موجود ہے لیکن جمہور نے اسے سنت مؤکدہ پر محمول کیا ہے۔ اس کا ترک مکروہ قرار دیا ہے۔ جن درجے کی روایت کی بناء پر اسے سنت مؤکدہ پر محمول کیا ہے) بلکہ ابو حاتم الرازیؒ نے اسے صحیح قرار دیا ہے: **من توضأ یوم الجمعة فبها ای فبا لرخصة اخذ ونعمت ومن اغتسل فالغسل افضل**، اور وجوب والی حدیث کا صحیح ہونا اسے لذب کی تاکید پر

محمول کرنے سے مانع نہیں اس حدیث کے قرینے کی بناء پر کیونکہ احادیث میں جمع کرنا اگر چہ حجۃ میں برابر نہ ہی ہو کچھ کے الغاء کرنے اور کچھ کے لینے سے بہتر ہے اور بخاری میں ہے حضرت عثمانؓ تاخیر سے تشریف لائے درانحالیکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے پس حضرت عمر نے ان پر نکار کیا انہوں نے عذر بیان کرتے ہوئے کہا ان کو شغل تھا وضوء سے زیادہ نہ کر سکے اور حاضر ہو گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا الوضوء کہا صرف وضو کیا ہے ایضاً اھ۔

یہ واقعہ احتمال رکھتا ہے دونوں حضرات حضرت عمر رضی اللہ عنہ وعثمانؓ غسل کے سنت یا واجب ہونے کا اعتقاد رکھتے ہوں لیکن دونوں نے ضرورت تنگی وقت وغیرہ کی وجہ سے اس کا ترک جائز قرار دیا ہو۔

اور باقی ابن حجرؒ کا قول کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمانؓ کو مہاجرین وانصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں غسل کی طرف لوٹنے کا حکم نہیں دیا پس یہ بات غسل کے واجب نہ ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔ یہ قول غیر مانوس اور عجیب استدلال ہے کیونکہ بالاجماع غسل نماز جمعہ کے صحیح ہونے کیلئے شرط نہیں۔ حالانکہ حضرت عثمانؓ تاخیر سے آئے اور غسل چھوڑنے کا عذر مشغولی بتا چکے تھے۔ اور مسجد میں خطبہ کی حالت میں داخل ہوئے تھے اور تدارک کا وقت ان سے فوت ہو چکا تھا پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو غسل کی طرف لوٹنے کا حکم کیسے دے سکتے تھے جو نماز جمعہ کے فوت کرنے کی طرف مؤدی تھا ساتھ یہ بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صاحب شرع بھی نہیں ہیں لہٰذا ان کا حکم نہ دینا عدم وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔

(من طيب اهله) لیکن اپنے اہل کی رضامندی کے ساتھ استعمال کرے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''**لا يحل مال امرئٍ مسلمٍ الا عن طيب نفسٍ**'' (یعنی کسی مسلمان کا مال حلال نہیں مگر اس کی طیب خاطر کے ساتھ) یا مراد ہے اپنی اس خوشبو سے جو اپنے گھر والوں کے پاس رکھی ہے یا مطلب ہے اپنے گھر والوں کی خوشبو کی جنس سے نہ کہ اسی قسم سے استعمال کرے کیونکہ مردوں کو عورتوں کی خوشبو ممنوع ہے عورتوں کی خوشبو وہ ہوتی ہے جس کا رنگ ہو۔

(فان لم يجد) ای طیباً۔

(فالماء له طيب) اگر چہ خوشبو اور پانی دونوں کو جمع کرنے میں زیادہ صفائی ستھرائی ہے، ابن حجرؒ کہتے ہیں اسی وجہ سے وارد ہوا ہے **الماء طيب الفقراء** یعنی پانی اس آدمی کی خوشبو ہے جس کے پاس خوشبو نہ ہو۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس پر لازم ہے کہ پانی اور خوشبو دونوں کو استعمال کرے اگر خوشبو میسر نہ ہو تو پانی کافی ہے کیونکہ مقصود پاکیزگی اور بدبو زائل کرنا ہے اور وہ پانی سے بھی حاصل ہو جاتی ہے پھر اس میں (اس جملے میں) مساکین کی دل جوئی ہے اور اشارہ ہے اس بات کی طرف جو سارا نہ پاسکے وہ سارا چھوڑے بھی نہیں **(مالا يدرك كله يترك كله)** عرب کا محاورہ ہے۔

بَابُ الْخُطْبَةِ وَالصَّلٰوةِ

خطبہ اور جمعہ کی نماز کا بیان

خطبہ لغت میں مطلقاً گفتگو اور تقریر اور اس کلام کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے لوگوں کو مخاطب کیا جائے، لیکن شریعت کی اصطلاح میں خطبہ اس کلام کے مجموعے کو کہتے ہیں جو کہ نصائح ذکر واذکار، درود وسلام اور شہادتین پر مشتمل ہو۔

حکم خطبہ:

نمازِ جمعہ کے لئے خطبہ شرط اور فرض ہے اس کے بغیر نماز بالکل درست نہیں ہے۔

مقدارِ خطبہ:

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک سبحان اللہ، الحمدللہ، لا الہ الا اللہ پڑھ دینا کافی ہے یعنی فرض ادا ہو جاتا ہے لیکن طویل خطبہ پڑھنا سنت اور واجب ہے، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طویل خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ لیکن امام صاحب کے نزدیک سبحان اللہ وغیرہ کہنے سے نمازِ جمعہ درست ہو جائے گی۔

امام شافعیؒ کے نزدیک دو خطبے دینا نماز کیلئے شرط ہے اور فرض ہے اگر ایک خطبہ بھی چھوڑ دیا تو نماز درست نہیں ہے۔

اور صاحبینؒ کے نزدیک طویل ذکر واذکار اور وعظ ونصیحت پر مشتمل مجموعہ جس کو عرف عام میں بھی خطبہ کہا جاتا ہے ضروری ہے صرف سبحان اللہ سے خطبہ ادا نہیں ہوگا۔

الفصل الاول:

نماز جمعہ کا وقت

۱۴۰۱: عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُصَلِّی الْجُمُعَةَ حِيْنَ تَمِيْلُ الشَّمْسُ۔

(رواہ البخاری)

أخرجه البخاری فی صحيحه ٢/٣٨٦۔ حديث رقم ٩٠٤۔ وأبو داوٗد فی السنن ١/٦٥٤ حديث رقم ١٠٨٤۔ وأحمد فی المسند ٣/١٥٠۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز اس وقت پڑھتے تھے جبکہ سورج مغرب کی طرف مائل ہو جاتا تھا یعنی ڈھل جاتا تھا۔ (بخاری)

تشریح: "عن انس ...... الشمس" ای الی الغروب وتزول عن استوائها یعنی (مراد یہ ہے) زوال کے متحقق ہو جانے کے بعد نماز پڑھتے تھے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں زوال پر اتنا زیادہ کرتے تھے کہ سورج کا میلان محسوس ہونے لگ

جاتا تھا مطلب یہ ہے وقت مختار میں نماز ادا فرماتے تھے۔ لیکن حدیث میں طیبیؒ کی ذکر کردہ بات پر دلالت موجود نہیں یہ مضمون تو خارج سے ماخوذ ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس حدیث سے یہ بات ماخوذ ہوتی ہے کہ وقت داخل ہونے کے بعد جمعہ کی ادائیگی میں جلدی کی جائے اور جمعہ کا وقت زوال کے بعد داخل ہوتا ہے بخلاف امام احمدؒ کے کیونکہ طلوع آفتاب سے بھی جمعہ کو جائز قرار دیتے ہیں۔

اور یہ روایت صحیحین کی روایت ''كنا نصلي مع النبي ﷺ يوم الجمعة ثم ننصرف وليس للحيطان ظل يمشي فيه'' (مطلب یہ ہے ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز جمعہ ادا کے بعد لوٹتے درانحالیکہ دیواروں کا اتنا سایہ نہیں ہوتا تھا جس میں چلا جا سکے تام کے معارض نہیں کیونکہ یہ روایت (مطلقا) سائے کی نفی ظاہر نہیں کرتی بلکہ اس سائے کی جس سے سایہ لیا جا سکے دوسرے روایت کی دلیل کے ساتھ تتبع الظل اور علی سبیل التزل (یعنی اگر مان بھی لیا جائے کہ سایہ نہیں ہوتا تھا) (پھر بھی) یہ حدیث محمول ہے بہت زیادہ جلدی پڑھنے پر یہ توجیہہ کی گئی ہے احادیث میں جمع کرنے کیلئے۔

اور باقی جو امام دارقطنی اور دوسرے حضرات نے عبداللہ بن سیدان (سین مھملہ کے کسرہ کے ساتھ) سے روایت کیا ہے عبداللہ کہتے ہیں میں ابوبکر الصدیقؓ کے ساتھ جمعہ میں حاضر ہوا ان کا خطبہ زوال سے پہلے تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں اسی طرح ذکر کیا ہے اور عبداللہ آخر میں کہتے ہیں میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ اس نے اس پر کوئی طعن کیا ہو اور نہ کسی نے اس پر انکار کیا۔ اس کا جواب ہے محدثین ابن سیدان کے ضعف پر متفق ہیں۔

سونے اور کھانے میں مشغول نہ ہو بلکہ جمعہ کی تیاری کرے

۱۴۰۲: وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ مَا كُنَّا نَقِيلُ وَلَا نَتَغَدّٰى اِلَّا بَعْدَ الْجُمُعَةِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۴۲۷۔ حديث رقم ۹۳۹۔ ومسلم في صحيحه ۲/۵۸۸ حديث رقم (۳۰۔ ۸۵۹)۔ وأبو داوٗد في السنن ۱/۶۵۴ حديث رقم ۱۰۸۶۔ والترمذي في السنن ۲/۴۱۳ حديث رقم ۵۲۵۔ وابن ماجه ۱/۳۵۰ حديث رقم ۱۰۹۹۔ وأحمد في المسند ۵/۳۳۶۔

ترجمہ: حضرت سہیل بن سعدؓ فرماتے ہیں کہ ہم جمعہ کے دن نہ قیلولہ کرتے تھے اور نہ کھانا کھاتے تھے، مگر نماز جمعہ کے بعد۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: (نقیل) نون کے فتحہ کے ساتھ مطلب یہ ہے ہم قیلولہ نہیں کرتے تھے اور قیلولہ کہتے ہیں نیند وغیرہ سے استراحت حاصل کرنے کو۔

ازھری کہتے ہیں القیلولہ والمقیل اہل عرب کے نزدیک نصف نہار کے وقت آرام کو کہا جاتا ہے اگرچہ اس کے ساتھ نیند نہ بھی ہو اللہ تعالیٰ کے قول واحسن مقیلا سے دلیل لیتے ہوئے (جنت کے بارے میں فرمایا بہترین قیلولہ واستراحت کا مقام ہے) حالانکہ جنت میں نیند نہیں ہے۔

(الا بعد الجمعة) ای بعد فراغ صلاتها علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ دونوں (یعنی قیلولہ اور غداء) تبکیر سے کنایہ ہیں

یعنی جلدی جانے سے کنایہ ہیں مطلب یہ ہوگا کہ وہ نہ صبح کا کھانا کھاتے تھے اور نہ آرام کرتے تھے اور نہ کسی کام میں مشغول ہوتے تھے اور جمعہ کے سوا کسی دوسرے امر کا اہتمام نہ کرتے تھے اھ۔

اور مطلب یہ ہے کہ وہ یہ مذکورہ کام جمعہ کے بعد ان سے یہ کام جمعہ سے پہلے فوت ہو جانے کے عوض میں کرتے تھے اور یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کا دوپہر کا کھانا اور ان کا قیلولہ حقیقتاً جمعہ کے بعد ہوتا تھا کہ لازم آئے کہ خطبہ اور نماز زوال سے پہلے ہوئے تھے۔ اور امام احمدؒ کی دلیل بن جائے۔

اور باقی ابن حجرؒ کا قول: کہ اس حدیث میں امام احمدؒ پر رد ہے کیونکہ اس حدیث میں غداء کا ذکر ہے اور وہ زوال کے بعد ہوتا ہے۔ ابن حجرؒ کا قول عجیب استدلال اور غیر مانوس استنباط ہے۔

(متفق علیہ) قال میرکؒ ورواہ ابوداؤد والترمذی۔

گرمیوں میں ظہر و جمعہ دیر سے پڑھنا سنت ہے

۱۴۰۳: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اشْتَدَّ الْبَرْدُ بَكَّرَ بِالصَّلٰوةِ وَاِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ اَبْرَدَ بِالصَّلٰوةِ يَعْنِي الْجُمُعَةَ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/ ٣٨٨۔ حديث رقم ٩٠٦۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ جب سردی کا موسم ہوتا تو آنحضرت ﷺ نمازِ جمعہ کو جلدی پڑھاتے تھے اور جب موسم گرما ہوتا تو ٹھنڈا کر کے پڑھاتے تھے، یعنی نمازِ جمعہ دیر سے پڑھاتے تھے۔ (بخاری)

تشریح: وعن انس قال: كان النبی ﷺ اذا اشتد البرد بكر ای تعجل واسرع۔

(بالصلاۃ) ای صلاها فی اول الوقت۔

(وذا اشتد الحر ابرد بالصلاۃ) مطلب یہ ہے کہ نماز پڑھاتے تھے دیوار کا سایہ راستے پر پڑ جانے کے بعد تاکہ لوگوں کو سورج کی تپش سے تکلیف نہ ہو اسی طرح ذکر کیا ہے ہمارے اصحاب میں سے کچھ شارحین نے۔

حافظ تورپشتیؒ فرماتے ہیں: حضور ﷺ کی دوسری حدیث "كان يصلي الجمعة حين تميل الشمس" کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ یہ الگ فصل (بحث) میں وارد ہے دوسری فصل (بحث) کے علاوہ اور حضور ﷺ کے قول کان سے عموم احوال مراد نہیں لیا جائے گا تاکہ دونوں حدیثوں میں اتفاق ہو جائے اھ۔

اور حدیث کا ظاہر اس پر ہے کہ جمعہ میں ابراد (ٹھنڈا کر کے یعنی تاخیر کر کے پڑھنا) مسنون ہے سخت گرمی کی صورت میں ظہر کی طرح۔

اور شافعیہ نے اس کی مخالفت کی ہے اور اسے بیان جواز پر محمول کیا ہے۔

اور یہ توجیہ و حمل بعید ہے کیونکہ کان لغۃً اور عرفاً استمرار پر دلالت کرتا ہے۔

(يعنی الجمعة) یہ راوی کی جانب سے تفسیر ہے۔ (رواہ البخاری)۔

جمعہ کی پہلی اذان کی ابتداء

۱۴۰۴: وَعَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيْدَ قَالَ كَانَ النِّدَاءُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ اَوَّلُهُ اِذَا جَلَسَ الْاِمَامُ عَلَى الْمِنْبَرِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبِىْ بَكْرٍ وَعُمَرَ فَلَمَّا كَانَ عُثْمَانُ وَكَثُرَ النَّاسُ زَادَ النِّدَاءَ الثَّالِثَ عَلَى الزَّوْرَاءِ۔ (رواه البخاری)

ترجمہ: اور حضرت سائبؓ بن یزید فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جمعہ کے دن پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جبکہ امام منبر پر بیٹھ جائے، اور یہی طریقہ کار ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دورِ (خلافت) میں ہوا۔ پس جب حضرت عثمانؓ کا دور آیا اور لوگ زیادہ ہو گئے، تو تیسری اذان کا اضافہ کیا جو کہ زوراء پر دی جاتی تھی۔ (بخاری)

تشریح: وعن السائب بن یزید قال: کان النداء: ای الاعلام۔

(اذا جلس الامام علی المنبر) مطلب ہے خطبہ اور اس کے ثانی سے پہلے (اور خطبہ کے ثانی سے مراد) اور وہ اقامت ہے جبکہ امام خطبہ سے فارغ ہو کر اتر آئے۔

(فلما کان عثمان) ای زمن خلافتہ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کان تامہ ہے مطلب ہوگا حصل عهده۔ اور ابن حجرؒ فرماتے ہیں کان کا ناقصہ ہونا بھی درست ہے اور خبر محذوف ہوگی ای خلیفۃً۔ اور یہاں یہ بات ہے کہ تقدیر کی طرف ضرورۃ کے وقت پایا جاتا ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں یا مراد یہ ہے جبکہ بدعت ظاہر ہوگی جیسے یہ قول ہے کہ یہ پہلی بدعت ہے یعنی ترک تکبیر اور یہ بات ظاہر ہے (دوسری بات کی بہ نسبت) کیونکہ سارے مدینے والوں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہونے والی اذان کا سننا بھی تو بہت بعید ہے۔

(النداء الثالث) حدوث کے اعتبار سے تیسری اذان ہے اگرچہ وقوع کے اعتبار سے اول ہے پھر اس کے بعد دوسری اذان ہوگی اقامت کے ساتھ جو پہلے سے چلی آ رہی ہے۔

مفاتیح میں ہے حضرت عثمان صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤذن کو حکم دیا اول وقت میں خطیب کے منبر پر چڑھنے سے پہلے اذان دے جیسے ہمارے زمانہ میں ہے اھ۔

اور ہمارے زمانے میں ایک چوتھی اذان بھی نکل آئی ہے اور یہ اذان خطیب کے مسجد میں دخول کو بتلانے کیلئے ہوتی ہے۔

(علی الزوراء) زاء کے فتحہ اور واؤ کے سکون رًا اور مد کے ساتھ مدینہ کے بازار میں ایک جگہ کا نام ہے۔ علامہ تورپشتیؒ کہتے ہیں اس کی (یعنی زوراء کی) تفسیر سنن ابن ماجۃ میں ذکر کی گئی ہے کہ مدینہ کے بازار میں ایک گھر ہے جس کی چھت پر مؤذنین (اذان کے وقت) ٹھہرتے تھے اور شاید اس گھر کو زوراء کہنے کی وجہ اس کا شہر کی آبادی سے جھکا ہوا ہونا تھا جیسے عرب کہتے ہیں "زوراء ای مائلة وارض زوراء ای بعیدة لقله السید"۔

اور ایک قول یہ ہے یہ دیوار تھی اور ایک قول ہے یہ بڑا پتھر تھا اور ابن بطال نے آخری (یعنی بڑا پتھر ہونے) پر جزم کیا ہے

اور کہا ہے الزوراء بڑا پتھر تھا مسجد کے دروازے کے پاس لیکن اس میں نظر ہے (اشکال ہے) کیونکہ ابن اسحاق عن الزہری عن ابن خزیمۃ اور ابن ماجہ میں یہ الفاظ ہیں۔" زاد النداء الثالث علی دار فی السوق یقال لھا الزوراء فکان یؤذن علیھا نقلہ میرك عن الشیخ" اس سے معلوم ہوتا ہے زوراء گھر تھا بڑا پتھر نہیں تھا ابن حجرؒ کہتے ہیں پھر ہشام نے اس اذان کو مسجد کی طرف منتقل کر دیا۔

اور حضرت عثمانؓ نے یہ اذان لوگوں کی کثرت کی وجہ سے زیادہ کی ان کا خیال یہ تھا کہ مؤذن وقت سے پہلے اذان دے تاکہ آواز مدینہ کے اطراف تک پہنچ جائے اور لوگ امام کے نکلنے سے پہلے جمع ہو جائیں تاکہ ان سے خطبہ ابتدائی لحات فوت نہ ہوں۔

اور اسے تیسری اذان کہا جاتا ہے اگرچہ وقوع کے اعتبار سے پہلی ہے کیونکہ یہ ان دو اذانوں سے تیسری ہے جو نبی ﷺ اور شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانے میں تھی۔

اور ان دونوں اذانوں سے مراد ایک تو خطیب کے منبر پر چڑھنے سے اور خطبہ پڑھنے سے پہلے اور النداء الاول سے مراد یہی ہے اور دوسری امامت خطبہ پڑھنے سے فارغ ہونے کے بعد امام کے اترنے کے وقت اور النداء الثانی سے مراد یہی ہے یعنی حضور ﷺ اور شیخین کے عہد کی دو اذانوں سے مراد ایک تو اذان جو خطیب کا سامنے خطبہ سے پہلے دی جاتی تھی اور دوسری اذان سے مراد اقامت ہے۔

(اور طیبیؒ کے کلام میں موجود) اور ان کا قول ویؤذن المؤذن قبل الوقت باقی شراح اور اکثر فقہاء کے کلام اور ہمارے زمانے کے عرف کے خلاف ہے مگر یہ کہ اس سے وقت معتاد سے پہلے اذان دینا مراد ہو اور وقت معتاد سے مراد وہ امام کے سامنے اس کے منبر پر بیٹھ جانے کے بعد کا وقت ہے اور اسے زوال کے بعد پر محمول کیا جائے گا تو اشکال زائل ہو جائے گا۔

پھر یہ مروی ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اسے بدعت کہتے تھے اس کے بارے میں کہا گیا ہے انہوں نے اس بات کی طرف دیکھا کہ بدعت وہ ہوتی ہے جو حضور ﷺ کے بعد ایجاد ہوا گرچہ اچھی ہی کیوں نہ ہو ورنہ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو اسے ایجاد کیا اس پر صحابہ کا اجماع سکوتی ہے۔

اور اس بات کے کہ اس کی ابتداء کرنے والے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی ہیں معارض نہیں ہے۔ وہ روایت جس میں مذکور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد سے باہر پہلی اذان دینے کا حکم دینے والے ہیں تاکہ لوگ سن لیں پھر اس کے بعد اپنے سامنے دوسری اذان کا حکم دینے والے ہیں پھر فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہم نے اسے شروع کیا ہے مسلمانوں کی کثرت کی وجہ سے۔

یہ روایت معارض نہیں اس لئے کہ کیونکہ روایت منقطع ہے اور ثابت نہیں ہے۔

اور عطاء نے انکار کیا ہے اس بات کا کہ حضرت عثمانؓ نے اذان مقرر کی وہ تو صرف اعلان کا حکم دیتے تھے اور ان دونوں قولوں میں توفیق ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ والے زمانہ کا اعلام محض بدستور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں رہا پھر حضرت عثمانؓ نے دیکھا کہ اس کی جگہ کسی بلند جگہ پر اذان مقرر کر دیں۔ پس انہوں نے ایسا کر دیا اور اس وقت تمام شہروں میں لوگوں نے آپ رضی اللہ عنہ کے عمل کو لے لیا کیونکہ آپؓ اطاعت کیے جانے والے خلیفہ تھے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ مکہ میں سب سے پہلے جس نے یہ اذان مقرر کی وہ حجاج ہے اور بصرہ میں زیاد۔ اور باقی جو کچھ مالکیہ نے ابن القاسم عن مالک سے نقل کیا ہے کہ یہ اذان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہ ہوتی تھی بلکہ منارہ پر ہوتی تھی۔ اور ابن عبدالبرؒ نے جو امام مالکؒ سے نقل کیا ہے جو اذان امام کے سامنے ہوتی ہے یہ پہلے سے نہیں ہے۔ اور جو طبرانی وغیرہ میں ہے کہ محمد بن اسحاق نے اس حدیث کے ضمن میں کہا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ مسجد کے دروازے پر اذان دیا کرتے تھے۔ اس میں بہت سے لوگوں نے نزاع کہا ہے۔ ان لوگوں میں سے موالکیہ کی ایک جماعت ہے جن کا قول ہے کہ بے شک یہ اذان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی ہوتی تھی جیسے اس کا تقاضہ کر رہی ہے بخاری شریف کی روای۔ ھذا اھ۔

بخاری کی روایت میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس میں سے کسی چیز کیلئے مقتضی ہو لیکن دونوں قولوں میں جمع ممکن ہے کہ آخر کار جو طے ہوا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے (اذان دینا) ہی تھا۔ یا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان مسجد کے دروازے پر بطور اعلام کے تھی۔ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے اعلام کیلئے اصل ہوتی اور شاید ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری زمانے میں اسے ترک کر دیا گیا اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بدعت کہا اور تجدید سنت کو بدعت کہنا اسی طریقے پر ہے جیسے تراویح میں فرمایا **نعمت البدعة هي** اھ۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں اس حدیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا ہے جنہوں نے جمعہ سے پہلے کی سنتوں کی نفی کی ہے ان کا کہنا ہے یہ بات تو معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب منبر پر چڑھتے تھے تو حضرت بلالؓ اذان شروع کر دیتے تھے اور جب اذان مکمل کر لیتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ شروع کر دیتے تھے پھر سنتیں کب پڑھتے تھے اور جو آدمی یہ گمان کرتا ہے کہ جب وہ اذان سے فارغ ہوتے تھے وہ کھڑے ہوتے اور نماز پڑھتے تھے وہ لوگوں میں سب سے بڑا جاہل ہے۔

اور یہ استدلال مرفوع ہے کیونکہ ظاہر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خروج زوال کے بعد ہوتا تھا پس ممکن ہے اس کے بعد چار رکعتیں پڑھتے ہوں اور وہ بھی زوال کو مانتے تھے کیونکہ ان کے اور آج کل کے زمانے کے مؤذن میں فرق نہیں کیونکہ دخول وقت میں جو اس کا اعتماد ہے وہی ان کا اعتماد تھا اھ۔

امام طحاویؒ فرماتے ہیں سعی الی الصلوٰۃ اور خرید و فروخت کو چھوڑنا اس وقت واجب ہے جب مؤذن اذان دے درانحالیکہ امام منبر پر موجود ہو کیونکہ یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا اور شیخین کے زمانے میں اور یہی زیادہ ظاہر ہے لیکن دوسرے علماء نے ان کا علاوہ آیا ہے اس سے مراد وہ آجکل منارے پر دی جانے والی اذان ہے جو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مقرر ہوئی۔ شمنیؒ فرماتے ہیں یہی صحیح ترین قول ہے اور اسے پسند کیا ہے شمس الائمہ نے اھ۔ اور شاید انہوں نے آیت کے عموم کو لیا ہے۔ بین یدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے قطع نظر کرتے ہوئے یا اس بات کو مدنظر رکھا ہے کہ ان پر واجب ہے سعی الی الصلاۃ ایسے شغل کا چھوڑنا جو اذان خطبہ سے پہلے مانع ہوتا تا کہ ان سے خطبہ کا کچھ حصہ فوت نہ ہو جائے۔ اسی غرض کیلئے انہوں نے پہلی اذان کو مقرر کیا جو اول وقت میں ہوتی ہے۔ اور اسکی تائید اجماع سکوتی بھی کرتا ہے واللہ اعلم۔

دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا سنت ہے

۱۴۰۵: وَعَنْ جَابِرِبْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَتْ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُطْبَتَانِ يَجْلِسُ بَيْنَهُمَا يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ يُذَكِّرُ النَّاسَ فَكَانَتْ صَلَاتُهُ قَصْدًا وَخُطْبَتُهُ قَصْدًا۔ (رواہ مسلم)

أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۳۹۳۔ ۹۱۲۔ وأبو داوٗد في السنن ۱/۶۵۵ حديث رقم ۱۰۸۷۔ والترمذي ۲/۳۹۲ حديث رقم ۵۱۶۔ وأحمد في المسند ۳/۴۵۰۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دو خطبے ہوتے تھے (یعنی آپ دو خطبے ارشاد فرماتے تھے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کے درمیان بیٹھتے تھے، قرآن پڑھتے تھے اور لوگوں کو نصیحت کرتے تھے، آپ کی نماز بھی درمیانی ہوتی تھی اور خطبہ بھی درمیانہ ہوتا تھا۔ (مسلم)

تشریح: وعن جابر بن سمرة......بينهما: اى بين الخطبتين، اس میں (یعنی حدیث میں) اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ قیام کی حالت میں ہوتا تھا اور کھڑا ہونا دوران خطبہ امام شافعیؒ کے نزدیک شرط ہے۔ اور ہمارے نزدیک سنت ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک فرض ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا بیٹھنا عذر کی وجہ سے تھا جبکہ ان کے پیٹ کی چربی زیادہ ہوگئی تھی۔ جیسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ هذا۔ اى خذ هذا۔

اور فعل اگرچہ امام شافعیؒ کے نزدیک وجوب پر دلالت کرتا ہے لیکن اس کا ترک جمعہ کے بطلان پر دلالت نہیں کرتا اور ان دونوں خطبوں کے درمیان اور پہلے بیٹھنے میں کیا فرق ہے؟ باوجودیکہ ان میں سے ہر ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

شافعیہ کی ایک جماعت نے کہا ہے معاملہ ایسے ہی ہے جیسے انہوں نے کہا ہے اور تعجب ہے اس کو تو واجب قرار دے دیا نہ کہ آئندہ والے کو۔

اور ابن حجرؒ نے اس کے جواب میں طوالت سے کام لیا ہے جس کے ذکر میں فائدہ نہیں ہے ہم نے اس کے ذکر سے اعراض کیا ہے۔ پھر ابن حجرؒ نے کہا ہے ہمارے ائمہ نے راوی کے قول يقرأ القران سے یہ بات لی ہے کہ دونوں خطبوں میں سے ایک کے اندر آیت کی قراءت ضروری ہے۔

اور اسی طرح راوی کے قول يذكر الناس سے یہ بات لی ہے کہ اللہ سے ڈرنے کی وصیت ضروری ہے۔ کیونکہ خطبہ سے بڑا مقصود یہی ہے، اور اس بحث کی تفصیل عنقریب آئے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

(ويذكر الناس) یہ اسی (یعنی يقرأ) کا معطوف ہے اور اسی کے حکم میں داخل ہے انتہی التذکیر وہ وعظ اور نصیحت اور ان چیزوں کے ذکر کا نام ہے جو ترغیب و ترھیب کو لازم کریں۔

(وخطبته قصدًا) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں قصد اصل میں استقامت فی الطریقۃ کو کہتے ہیں پھر اس کا استعارہ کیا گیا امور میں توسط اور افراط سے دوری کیلئے۔ پھر دو جانبوں میں توسط وسط ہی کی طرح ہوتا ہے (یعنی دو چیزوں میں میانہ روی و توسط

ایسے ہی ہوتا ہے جیسے ان کا درمیان ہے) اور یہ توسط نماز اور خطبہ میں مساوات کا تقاضہ نہیں کرتا کہ حضرت عمار کی آئندہ آنے والی حدیث کے معارض ہو جائے۔

(رواہ مسلم) اور ابوداؤد شریف کی ایک روایت میں ہے حضور ﷺ دو خطبے ارشاد فرماتے تھے جب منبر پر چڑھتے تھے تو بیٹھتے تھے یہاں تک کہ مؤذن فارغ ہو جاتے پھر کھڑے ہوتے اور خطبہ دیتے پھر بیٹھتے اور کلام نہ کرتے پھر کھڑے ہوتے اور خطبہ دیتے۔

خطبہ مختصر مگر جامع ہونا چاہئے

۱۴۰۶: وَعَنْ عَمَّارٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ طُوْلَ صَلٰوةِ الرَّجُلِ وَقِصَرَ خُطْبَتِهٖ مَئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهٖ فَاَطِيْلُوا الصَّلٰوةَ وَاقْصُرُوا الْخُطْبَةَ وَاِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٥٨٩/٢ حديث رقم (٣٤۔ ٨٦٢)۔ والشطر الثاني ٥٩١/٢ حديث رقم (٤١۔ ٨٦٦)۔ وأبوداؤد في السنن ٦٥٧/١ حديث رقم ١٠٩٤۔ والترمذي ٣٨١/٢ حديث رقم ٥٠٧ والنسائي ١١٠/٣ حديث رقم ١٤١٨۔ وابن ماجه ٣٥١/١ حديث رقم ١١٠٦۔ والدارمي ٤٤٠/١ حديث رقم ١٥٥٧۔ وأحمد في المسند ٩٣/٥۔

ترجمہ: حضرت عمارؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آدمی کی لمبی نماز اور مختصر خطبہ اس کی دانائی کی علامت ہے لہٰذا تم نماز کو طویل اور خطبہ کو مختصر کرو، کیونکہ بعض بیان جادو کا سا اثر رکھتے ہیں۔ (مسلم)

تشریح: وعن عمار......الرجل :ای اطالتها۔

(وقصر خطبته) "قصر" قاف کے کسرہ کے اور صاد کے فتحہ کے ساتھ ای تقصیر ها۔

(مئنة) میم کے فتحہ اور ہمزہ کے کسرہ اور نون کی تشدید کے ساتھ (مئنّه) اور باقی ابن حجرؒ کا قول کہ ہمزہ کا فتحہ بھی منقول ہے یہ قول اصول میں ثابت نہیں۔

(من فقهه) ای علامة بتحقق بها فقهه:

(مئنّة) مفعلة کا وزن ہے ان مکسورۃ مشدد سے اور اس کی حقیقت ہے ظن اور مکان ہے قائل کے قول انه فقيه کا۔ کیونکہ نماز مقصود بالذات ہے اور خطبہ اس کیلئے بمنزلہ تمہید کے ہے پس توجہ کو پھیرا جائے زیادہ اہم کی طرف کذا قیل۔ یا اس وجہ سے کہ خطبے کی حالت میں توجہ مخلوق کی طرف ہوتی ہے اور نماز کی حالت میں مقصود خالق ہے۔ پس اس آدمی کی قلبی فقاہت سے ہے اپنے رب سے معراج کو طویل کرنا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں من فقهه یہ مئنّة کی صفت ہے۔ (تقدیر عبارت یہ ہوگی) ای مئنّة دما ناشئة دما من فقهه۔ نہایۃ اصول کے اندر ہے اس کا مطلب ہے یہ ایسی چیز ہے یعنی اطالت صلاۃ اور قصر خطبہ جس سے آدمی کی سمجھ وفقہ پہچانی جاتی ہے ہر وہ چیز جو کسی چیز کی طرف دلالت کرے وہ اس کے لئے مئنہ یعنی علامت ہے۔

اور اس کی (مئنۃ کی) حقیقت یہ ہے کہ یہ مفعلۃ کا وزن ہے ان کے معنی سے جو تحقیق کیلئے ہوتا ہے اس کے لفظ سے مشتق نہیں کیونکہ حروف سے کوئی چیز مشتق نہیں ہوتی۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ ان سے مشتق ہے اسے اسم قرار دینے کے بعد تو یہ بھی ایک قول ہے اور نہایت عجیب بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ ہمزہ مظنۃ کی ظا کے بدلے میں ہے اور میم ان سب میں زائدہ ہے۔ (مئنہ و مظنہ وغیرہ میں)۔

ابو عبیدہؒ فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے یہی وہ چیز جس کے ذریعے آدمی کی فصاحت پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں ابو عبید نے میم کو اس میں اصلی قرار دیا ہے حالانکہ وہ مفعلۃ کی میم ہے۔

اور حضور ﷺ نے اسے (یعنی اطالت صلاۃ قصر خطبہ کو) اس کی فقہ پر علامت اس لئے قرار دیا کیونکہ نماز وہ ہی اصل ہے اور خطبہ وہ فرع ہے اور فقہ کے فیصلوں میں سے ہے کہ اصل کو فرع پر زیادہ ترجیح دی جائے۔

(**فاطیلوا الصلاۃ و اقصرو والخطبۃ**) ابن الملکؒ فرماتے ہیں اس طول سے مراد وہ طول ہے جو سنت کے مطابق ہو نہ تو اس سے کم ہو اور نہ اس سے زیادہ ہو یہ توجیہ اس لیے کی ہے تا کہ اس حدیث اور اس سے پہلے والی حدیث میں تطبیق ہو سکے انتہیٰ۔

میں کہتا ہوں ان دونوں میں منافات نہیں ہے کیونکہ پہلی حدیث ان دونوں (یعنی خطبہ و صلاۃ) میں میانہ روی پر دلالت کرتی ہے اور دوسری حدیث ان دونوں میں سے دوسری چیز (یعنی نماز) میں خصوصیت کے اختیار کرنے پر دلالت کرتی ہے۔

پھر یہ مضمون منافی نہیں ہے اس مضمون کے جو مسلم میں وارد ہوا ہے کہ حضور ﷺ نے فجر کی نماز پڑھائی اور منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور ظہر تک خطبہ دیا پھر اترے اور نماز پڑھائی پھر منبر پر چڑھے اور عصر تک خطبہ دیا پھر اترے اور نماز پڑھائی۔ پھر جلوہ افروز ہوئے اور مغرب تک خطبہ دیا پس خبر دی ان چیزوں کی جو ہو چکیں اور جو آئندہ ہوں گیں اھ۔

(**وان من البیان لسحرًا**) مطلب یہ ہے کچھ بیان جادو جیسا عمل کرتے ہیں جیسے جادو کی وجہ سے گناہ حاصل ہوتا ہے کچھ بیانوں سے بھی گناہ حاصل ہوتا ہے۔

یا مطلب ہے کچھ بیان ایسے ہیں جو سننے والوں کے دلوں کو جو وہ سن رہے ہوتے ہیں اس کے قبول کرنے کی طرف پھیر دیتے ہیں اگر چہ وہ حق نہ ہی ہو۔ لہٰذا اس میں خطبہ کے مختصر کرنے میں حکمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ وہ خطیب مصیبت کی جگہ میں ہوتا ہے لہٰذا اس خطیب پر لازم ہے اس مشقت سے احتراز کرے کہ کسی ریا اور شہرت اور ابتغاءِ فتنہ میں نہ پڑ جائے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ یہ جملہ فصاحت و بلاغت کی تعریف و مدح ہے مراد یہ ہے بے شک بلیغ جسے ایسا ملکہ حاصل ہوتا ہے جس کے ذریعے بلیغ کلام کی تألیف پر قادر ہوتا ہے اور کلام بلیغ سے مراد وہ کلام ہے مقتضی حال کے مطابق ہو، بلیغ لوگوں کو آخرت کی محنت اور دنیا میں بے رغبتی اور مکارم اخلاق اور محاسن اعمال پر اپنی فصاحت و بلاغت کے ذریعے ابھارتا ہے۔ پس اس کا بیان وہ حلال جادو ہے قلوب کے کھینچنے میں اور دقائق اور لطائف پر مشتمل ہونے میں لہٰذا یہ تشبیہ بلیغ ہے اور ظاہر ہے یہ عطف الجمل کے قبیل سے ہے جسے بطور استطراد اذکر کیا ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ جملہ: اقصروا سے حال واقع ہے مطلب یہ ہوگا خطبہ کو مختصر کرو درانحالیکہ تم اس میں جمیع مطالب

لے کر آنے والے ہو تھوڑے الفاظ میں اور یہ بات بیان کے مراتب میں سے سب سے اعلیٰ ہے اسی وجہ سے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "اوتیت جوامع الکلم"۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں قاضی عیاضؒ نے اس جملے میں دو تاویلیں ذکر کی ہیں۔

ان دونوں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ مذمت ہے قلوب کو مائل کرنے اور پھیرنے کی وجہ سے کلام کے ٹکڑوں کے ساتھ کیونکہ اس سے گناہ حاصل ہوتا ہے جیسے جادو سے گناہ حاصل ہوتا ہے اور امام مالکؒ نے مؤطا میں اسے باب ما یکرہ من الکلام کے تحت داخل کیا ہے اور یہ ان کا مذہب ہے حدیث کی تاویل میں۔

اور دوسری تاویل یہ ہے کہ یہ جملہ مدح ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بیان سکھا کر احسان فرمایا ہے اور اسے جادو کے ساتھ تشبیہ دی ہے قلوب کے اس کی طرف میلان کی وجہ سے اور جادو کی اصل بھی پھیرنا ہے۔

اور بیان قلوب کو پھیرتا ہے اور مائل کرتا ہے اس چیز کی طرف جس کی طرف وہ دعوت دے رہا ہوتا ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں یہ دوسرا ہی صحیح مختار ہے۔ (رواہ مسلم)

خطبہ میں آواز بقدرِ ضرورت بلند ہونی چاہیے

۱۴۰۷: وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَاخَطَبَ اِحْمَرَّتْ عَيْنَاهُ وَعَلَاصَوْتُهٗ وَاشْتَدَّ غَضَبُهٗ حَتّٰى كَاَنَّهٗ مُنْذِرُ جَيْشٍ يَقُوْلُ صَبَّحَكُمْ وَمَسَّاكُمْ وَيَقُوْلُ بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ وَيَقْرُنُ بَيْنَ اِصْبَعَيْهِ السَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٢/٥٩٤ حديث رقم (٤٧۔ ٨٦٩)۔ والدارمي في السنن ١/٤٤٠ حديث رقم ١٥٥٦۔ وأحمد في المسند ٤/٢٦٣۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ خطبہ ارشاد فرماتے تھے، تو آپ ﷺ کی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں اور آپ ﷺ کی آواز بلند ہو جاتی تھی، اور آپ ﷺ کا غصہ سخت تیز ہو جاتا تھا یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ ﷺ (دشمن کے) کسی لشکر سے ڈرانے والے ہیں کہ فرما رہے ہوں کہ دشمن کا لشکر تم پر صبح یا شام حملہ کرنے والا ہے اور خطبہ میں ارشاد فرماتے تھے مجھے اور قیامت کو اس طرح بھیجا گیا ہے اور اپنی شہادت اور درمیان والی انگلی کو ملاتے تھے۔ (مسلم)

تشریح: "احمرت عیناہ" کیونکہ آپ پر انوار جلال کبریائی کی تجلیاں اترتی تھیں اور کمال رحمانیہ کی روشنیوں کی چمکیں اترتی تھیں اور امت مرحومہ کے احوال کے مشاہدے اور ان کے اکثر امور معلومہ کے پورا کرنے میں کوتاہی کی وجہ سے (آپ ﷺ کا چہرہ سرخ ہوتا تھا)

(وعلا صوتہ) صوتہ رفع اور نصب کے ساتھ ہے پہلی صورت میں مطلب ہوگا کہ آپ کا کلام بلند ہو جاتا تھا غموں کے اترنے کی وجہ سے دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ ~~اپنی آواز بلند~~ کرتے تھے افادۂ عموم کیلئے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں آواز اس لئے بلند کرتے تھے تاکہ ان کے وعظ کو ان کے کانوں تک پہنچادیں اور اس خبر کی ان کے دلوں تعظیم بیٹھانے کیلئے اور اس کی ان میں تاثیر کے ظہور کیلئے۔

(واشتد غضبه) یعنی غصے کے آثار سخت ہوجاتے تھے جو پیدا ہوئے تھے اس قلت ادب سے جس کی امت مرتکب تھی اللہ کی معصیت میں

(حتی کانه منذر جیش) منذر میں اضافت مفعول کی طرف ہے مطلب یہ ہے کہ ڈراتے تھے اس آدمی کی طرح جو لوگوں کو ایسے بڑے لشکر کے قریب آنے سے ڈراتا ہے جو لوٹ کھسوٹ کا ارادہ رکھتے ہوں۔

(یقول) منذر کی صفت ہے یا اس سے حال ہے۔

(صبحکم ومساکم) دوصیغوں میں تشدید کے ساتھ۔ ابن الملک مطلب بیان کرتے ہیں سیصبحکم العدوّ وسیمسونکم یعنی سیأتیکم وقت الصباح ووقت المساء۔

طیبیؒ معنی بیان کرتے ہیں صبحکم العدو وکذا امساکم۔ اور مراد اس سے لشکر کی صبح وشام غارت گری سے ڈرانا ہے علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ بھی جائز ہے یہ جملہ منذر جیش کی صفت واقع ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انکے اسم سے حال واقع ہو اس وقت عامل اس میں تشبیہ کا معنی ہے اور قائل اس وقت رسول اللہ ﷺ ہوں گے اور یقول الثانی کا عطف ہوگا اول یقول پر اور پہلی صورت میں اس کا عطف ہوگا کانه جملے پر اھ۔

صحیح بلکہ درست پہلی صورت (احتمال) ہے کیونکہ اُن کے منبروں پر اس قول صبحکم ومساکم کا کوئی مطلب نہیں اور اس پر صحابیؓ کے لفظ یقول کا اعادہ بھی دلالت کرتا ہے۔

(ویقول) ای النبی ﷺ اس سے اشارہ ہے قول المنذر اور اس سے پہلے والا جملہ صحیح طور پر احرت پر معطوف ہیں کیونکہ روایت میں یقول کے اندر رفع ہے۔ لہٰذا اس کے حتی کے مدخول پر (یعنی حتی کانه الخ) پر عطف کا احتمال اٹھ گیا۔

(بعثت انا والساعة) الساعة کا رفع ہے اکثر نسخ کے اندر اور یہی زیادہ بلیغ ہے اگر چہ نصب معنی کے اعتبار سے زیادہ ظاہر ہے۔

مفاتیح کے اندر ہے الساعۃ کا نصب بھی ہے اور اس کا رفع بھی ہے ابن الملک فرماتے ہیں رفع کے ساتھ اس کا عطف ہوگا ضمیر پر اور نصب کے ساتھ یہ مفعول معہ ہے تقدیر عبارت ہوگی بعثنی الیکم قریبا من القیامة۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں ضمیر منفصل کو تاکیدًا ذکر کیا ہے تاکہ عطف درست ہوجائے۔

(والوسطی) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں حضور ﷺ کا لوگوں کو یوم قیامت کے آنے اور اس کے وقوع کے قریب ہونے اور لوگوں کے مہلک چیزوں میں پڑے رہنے، ڈرانے کی حالت کو تشبیہ دی ہے اس آدمی کی حالت کے ساتھ جو اپنی قوم کو ڈراتا ہے جو اپنے سے قریب لشکر سے غافل ہیں جو لشکر ان کا ہر جانب سے اچانک احاطے کا قصد رکھتا ہے۔

جیسے ڈرانے والا اپنی آواز بلند کرتا ہے اور اس کی دونوں آنکھیں سرخ ہوجاتیں ہیں اور اس کا غصہ ان کی غفلت کی وجہ سے شدید ہوجاتا ہے۔

اور اس کی نظیر ہے جب آیت "وانذر عشیرتك الاقربین اتری تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم صفا پر چڑھ گئے اور قریش کی شاخوں کو پکارنا شروع کر دیا اور اپنے چچاؤں کو اور اپنی پھوپھیوں کو اور ان کی اولاد کو اور ارشاد فرما رہے تھے میں تمہیں اللہ سے نہیں بچا سکتا ہوں میں تو واضح ڈرانے والا ہوں۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت ہوتی تھی انذار کے وقت اور قرب قیامت کی طرف اپنی دونوں انگلیوں سے اشارہ کیا۔ (رواہ مسلم)

خطبہ میں آیات قرآنی پڑھنا سنت ہے

۱۴۰۸: وَعَنْ يَعْلَى بْنِ اُمَيَّةَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ عَلَى الْمِنبَرِ وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ۔ (متفق علیه)

أخرجه مسلم في صحيحه ۲/۵۹۲ حديث رقم (۴۳۔ ۸۶۷)۔ وابن ماجه في السنن ۱/۱۷ حديث رقم ۴۵۔

ترجمہ: حضرت یعلی بن امیہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے منبر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا ہے ﴿و نادوا يا مالك ليقض علينا ربك﴾ اے مالک تو اپنے ربّ سے سفارش کر کہ ہمارا کام تمام کر دے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: (قال سمعت النبی ﷺ یقرأ علی المنبر ونادوا) مطلب یہ ہے کفار جہنم کے خازن مالک سے کہیں گے۔ (یاملك لیقض علینا ربك) ای بالموت۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں (لیقض) قضی علیه ای اماته سے مشتق ہے جیسے قرآن کریم میں ہے۔ فوكزه موسٰی فقضٰی علیه۔ مطلب یہ ہوگا تو اپنے رب سے مطالبہ کر اس بات کا کہ وہ ہمارے بارے میں موت کا فیصلہ کرے اور یہ بات وہ ان شدائد کی وجہ سے کہیں گے جو ان پر ہو گئیں پس ان کو اس قول کے ساتھ جواب ملے گا۔ "انكم ماكثون ای خالدون یعنی تم ہمیشہ (اس میں) رہوں گے اور اس میں ان کے ساتھ ایک قسم کا استہزاء بھی ہے (انتہی) حدیث اور اس کا ماقبل دلالت کر رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قول "ان انت الا نذیر" اور اللہ تعالیٰ کا قول وان من امة الا خلافیها نذیر اور اللہ تعالیٰ کا قول لیکون للعالمین نذیرا اس بات پر کہ لوگ انذار اور تخویف کی طرف زیادہ حاجت رکھتے ہیں بہ نسبت تبشیر کے ان کے غفلت میں بڑھنے کی وجہ سے اور ان کے شہوت میں منہمک ہونے کی وجہ سے۔

ابن الملک آیت کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ای لیبین لنا قدر لبثنا فی النار فیقول لهم مالك انكم ماكثون (یعنی اے مالک سوال کرتا کہ ہمارے لئے ہمارے جہنم میں قیام کی مقدار واضح ہو جائے۔ پس مالک ان سے کہے گا تم اس میں ہمیشہ رہو گے)

اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وعظ و نصیحت اور تخویف والی آیت کا منبر پر پڑھنا سنت ہے (متفق علیہ) ورواه ابوداؤد والنسائی قاله میرك۔

صحابیہ کا ایمانی جذبہ

١٤٠٩: وَعَنْ اُمِّ هِشَامٍ بِنْتِ حَارِثَةَ بْنِ النُّعْمٰنِ قَالَتْ اَخَذْتُ قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ مِنْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَهُوَ يَقْرَءُ بِهَا عَلَى الْمِنْبَرِ فِيْ كُلِّ جُمُعَةٍ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه البخاري في صحيحه ٥٦٨/٨۔ حديث رقم ٤٨١٩۔ ومسلم في صحيحه ٥٩٤/٢ حديث رقم (٤٩۔ ٨٧١)۔

ترجمہ: حارثہ بن نعمان کی بیٹی حضرت ام ہشامؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سورۃ ق والقرآن المجید آنحضرت ﷺ کی زبان سے سن کر یاد کی تھی کہ آپ ﷺ اس کو ہر جمعہ میں منبر پر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے پڑھتے تھے۔ (مسلم)

راویٔ حدیث:

ام ہشام۔ یہ ام ہشام حارثہ بن نعمان کی بیٹی اور مشہور صحابیہ ہیں۔ ان سے ایک جماعت نے روایت کی۔ ''ہشام'' ہا کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے نسخہ میں ''ام ھاشم'' ہے قلم کا سہو ہے۔

تشریح: (وعن ام هشام) (هشام) ھا کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ ام ہشام مشہور صحابیہ رضی اللہ عنہا ہیں كذا في التقريب اور باقی جو ابن حجرؒ کی اصل میں جو ہاشم کا لفظ ہے وہ قلم کا سہو ہے۔

(الاعن لسان رسول اللهﷺ يقرأها كل جمعة على المنبر اذا خطب الناس) علامہ طیبیؒ نے مظہر سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے اور ان کی پیروی کی ہے اس قول میں ابن الملک نے اس سے مراد سورۃ کا پہلا حصہ لیا ہے ساری سورت مراد نہیں لی ہے کیونکہ حضور ﷺ اس ساری سورت کو خطبہ میں نہیں پڑھتے تھے اھ۔

شارح فرماتے ہیں اس میں یہ بحث ہے کہ یہ بات محفوظ نہیں کہ حضور ﷺ اس کا (یعنی سورتِ قٓ کا) اول حصہ ہر جمعہ میں پڑھتے تھے۔ وگرنہ تو اس کی قراءت واجب یا سنت مؤکدہ ہوتی بلکہ ظاہر ہے وہ ہر جمعے میں اس کا کچھ حصہ تلاوت کرتے تھے پس ام ہشام رضی اللہ عنہا نے ساری سورت یاد کر لی واللہ اعلم۔

پھر میں نے ابن حجرؒ کا قول دیکھا کہ حضور ﷺ کے قول یقرؤھا سے مراد ہے کلھا ساری سورت اور اسے انہوں نے اس کے ظاہر سے پھیرتے ہوئے محمول کیا ہے سورۃ کے ابتدائی حصے (کے پڑھنے) پر۔

لیکن اس میں ظاہر علامہ طیبیؒ کا ساتھ دینا ہے لیکن اسے ظاہر سے پھیرتے ہیں ساری سورت کو متعدد خطبوں پر محمول کرتے ہوئے کیونکہ اسے ہر خطبہ میں پوری سورت پر محمول کرنا بہت بعید ہے۔

(رواہ مسلم) اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ اپنے ہر جمعے کے خطبے میں قٓ پڑھا کرتے تھے اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے بے شک حضور ﷺ نے سورۃ براءۃ کے ساتھ خطبہ دیا۔

عمامہ باندھ کر خطبہ پڑھنا سنت ہے

۱۴۱۰: وَ عَنْ عَمْرِوبْنِ حُرَيْثٍ اَنَّ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطَبَ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ قَدْ اَرْخٰى طَرَفَيْهَا بَيْنَ كَتِفَيْهِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٢/٥٩٥ حديث رقم (٥١- ٨٧٣)وأحمد في المسند ٦/٤٣٦۔

ترجمہ: حضرت عمروؓ بن حریث فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک دن جمعہ کا خطبہ دیا آپ ﷺ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا اور اس کے دونوں کنارے آپ نے اپنے دونوں کندھوں کے درمیان لٹکائے ہوئے تھے۔ (مسلم)

تشریح: (وعن عمرو بن حریث) حدیث تصغیر کے ساتھ ہے قرشی اور مخزومی ہیں نبی ﷺ کو دیکھا اور آپ ﷺ نے ان کے سر کو چھوا اور ان کیلئے برکت کی دعا کی۔

اور ایک قول یہ ہے نبی ﷺ کی وفات ہوئی درانحالیکہ ان کی عمر بارہ سال تھی کوفہ کی امارت ان کو سونپی گئی ذکرہ المؤلف۔

(ان النبی ﷺ خطب) اور شمائل کے اندر ہے خطب الناس۔

(وعلیہ عمامۃ) عمامۃ عین کے کسرہ کے ساتھ ہے اور شمائل کے کچھ نسخوں کے اندر عصابۃ ہے۔

اور مغرب کے اندر ہے عصابہ کے ساتھ عمامہ کو موسوم کیا جاتا ہے اور ایک ضعیف حدیث میں آیا ہے صلاۃ بعمامۃ خیر من سبعین صلاۃ بغیر عمامۃ (عمامہ کے ساتھ نماز پڑھنا بغیر عمامہ کی ستر نمازوں سے بہتر ہے)۔

(سوداء) اور کچھ روایات میں دسماء کا لفظ بھی آتا ہے جس کا مطلب سوداء ہے۔

اور ایک قول ہے (دسماء کے مطلب میں) تر ہوتا تھا حضور ﷺ کے بالوں کی چکناہٹ کی وجہ سے جبکہ آپ زیادہ تیل استعمال کرتے تھے۔ (قد ارخٰی) ای سدل وارسل۔

(بین کتفیہ یوم الجمعۃ) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس حدیث میں یہ مضمون ہے کہ جمعے والے دن زینت والا لباس اور سیاہ عمامہ پہننا اور اس کی دونوں طرفوں کو کندھوں کے درمیان لٹکانا سنت ہے۔

میرکؒ نے شمائل کے حاشیے میں کہا ہے کہ یہ خطبہ نبی ﷺ کی اس مرض میں وقوع ہوا جس میں انکی وفات ہوئی۔

امام زیلعیؒ فرماتے ہیں سیاہ عمامہ پہننا سنت ہے اس حدیث کی وجہ سے جس میں یہ مذکور ہے اور صاحب مدخل کا ظاہر کلام یہ ہے کہ حضور ﷺ کا عمامہ سات گز کا تھا۔ ان سے ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے۔

(رواہ مسلم) قال میرك والاربعة۔ اور شمائل کے اندر ہے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ جب عمامہ باندھتے تو اپنے عمامہ میں سدل کرتے تھے یعنی اس کے دونوں کناروں کو اپنے دونوں کندھوں کے درمیان لٹکاتے تھے۔

نافعؒ فرماتے ہیں ابن عمر رضی اللہ عنہما اسی طرح کرتے تھے۔ اور عبیداللہؒ فرماتے ہیں میں نے قاسم بن محمد اور سالم دونوں کو دیکھا ایسا کرتے تھے۔

اور علامہ سیوطیؒ نے ثلج الفؤاد فی لبس السواد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے سیاہ عمامہ پہنا اور اسے لٹکایا ہوا تھا اپنے پیچھے (یعنی اس کے کناروں کو)۔

ابن سعدؒ نے ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ عمامہ کو (یعنی عمامہ کے کنارے کو پیچھے) ایک بالشت یا ایک بالشت سے کم لٹکاتے تھے۔

ابن ابی شیبہ نے تخریج کی ہے ابن زبیرؓ نے سیاہ عمامہ باندھا ہوا درانحالیکہ اپنے پیچھے ایک گز (کنارہ) لٹکایا ہوا تھا۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بہت سے صحابہ کرام اور تابعین سے سیاہ عمامے کا پہننا نقل کیا ہے جن میں سے حضرت انس بن مالکؓ اور عمار بن یاسرؓ اور معاویہؓ اور ابوالدرداءؓ اور براء رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ اور سعید بن المسیب اور حسن بصری اور سعید بن جبیر رحمھم اللہ عنہم اجمعین حضرات شامل ہیں۔

پھر فرمایا (علامہ جلال الدینؒ نے) اور ابن عدیؒ نے کامل میں اور ابونعیم اور بیہقیؒ دونوں نے دلائل النبوۃ میں حضرت ابن عباسؓ سے تخریج کی ہے فرماتے ہیں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے۔ اور میں ان کو دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ خیال کر رہا تھا۔ حضرت جبرئیلؑ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا یہ تو سفید کپڑوں والا ہے اس کی اولاد سیاہ کپڑے پہنے گی۔ علامہ سیوطیؒ نے اپنے رسالہ: المعمولۃ فی ارسال العذبہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے روایت کیا ہے فرمایا مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمامہ پہنایا پھر اس کو (اس کے کنارے کو) لٹکایا میرے سامنے اور میرے پیچھے (کی جانب) رواہ ابوداؤد۔

وفی روایۃٍ، ارسل من خلفہ اربع اصابع ونحوھا ثم قال ھکذا فاعتم فانہ اغرب احسن رواہ الطبرانی فی الاوسط واسناد حسن۔

اور ایک روایت میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم عمامے کے پیچ کو اپنے سر پر گھماتے تھے اور اسے پیچھے کی جانب داخل کر دیتے تھے۔ اسے (اس کے شملہ کو) اپنے دونوں کندھوں کے درمیان لٹکا دیتے تھے۔

اور باقی حدیث خالفوا الیھود...... اور حدیث اعوذ باللّٰہ من عمامۃ حماء ان دونوں کی کوئی اصل نہیں۔ اور جس آدمی نے جان لیا یہ سنت ہے پھر اسے ترک کیا اس سے تکبر کرتے ہوئے تو وہ گنہگار ہوگا اور تکبر کرتے ہوئے ایسا کہا تو پھر نہیں (یعنی پھر گنہگار نہیں)

امام نوویؒ نے شرح مھذب میں فرمایا ہے کہ عمامے کو پہننا اس کا کنارہ لٹکاتے ہوئے یا اس کے کنارے لٹکائے بغیر ان میں سے کسی میں کراہت نہیں ہے۔

اور ترک ارسال کے بارے میں (شملہ لٹکانے کے ترک میں) کوئی چیز ثابت نہیں اور اس (یعنی شملے کو) بہت زیادہ لٹکانا کپڑے کے لٹکانے کی طرح پس متکبرین کیلئے حرام ہے اور کسی اور کیلئے مکروہ ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما والی حدیث کی وجہ سے۔ بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ازار قمیص اور عمامہ میں لٹکانا نہیں ہے (یعنی بہت زیادہ لٹکانا) جس نے کچھ کھینچا تکبر کی وجہ سے اللہ قیامت والے دن اس کی طرف رحمت سے نہ دیکھیں گے۔ رواہ ابوداؤد والنسائی باسناد صحیح۔

اور باقی اگر کوئی شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شملے کے عمل میں اقتداء کرے اور اسے اس سے تکبر حاصل ہو اس کا علاج یہ ہے کہ اس

سے اعراض کرے اور اپنے نفس کا اسے چھوڑ کر علاج کرے۔ اور یہ بات شملے کے ترک کو لازم نہیں کرتی۔ پس اگر وہ تکبر نہ زائل ہو مگر اس شملہ کو چھوڑ کر تو اسے چاہیے اتنی مدت اسے چھوڑے رکھے۔ یہاں تک کہ وہ تکبر زائل ہو جائے کیونکہ شملے کا ترک مکروہ نہیں ہے اور تکبر وغرور کو زائل کرنا واجب ہے۔

لیکن امام نووی ؒ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے بے شک وہ رنگ وہ جس پر نبی ﷺ اور خلفائے راشدین نے مواظبت کی ہے وہ سفید ہی ہے۔

پھر امام نووی ؒ نے فرمایا ہے صحیح یہ ہے کہ وہ سفید عمامہ پہنے نہ کہ سیاہ مگر یہ کہ اسے اس پر سلطان اور کسی اور کی جانب سے فساد کے ترتب کا غالب گمان ہو جائے۔

اور ابن عبد السلام نے فتویٰ دیا ہے سیاہ کے پہننے پر ہمیشگی اختیار کرنا بدعت ہے۔ اور پہلے وہ لوگ جنہوں نے جمعات واعیاد میں اسے پہننا شروع کیا وہ بنو العباس تھے اپنے زمانہ خلافت میں اس بارے میں انہوں نے دلیل پکڑی تھی اس بات سے کہ فتح مکہ اور حنین والے دن ان کے جد امجد حضرت عباس ؓ کیلئے جھنڈا بنایا گیا وہ سیاہ تھا۔ ابن ھبیرہ فرماتے ہیں یہ (یعنی سیاہ پر مواظبت بدعت وغیرہ ہے) اس وجہ سے کہ یہ رنگ زینت سے بہت زیادہ بعید رنگوں میں سے ہے۔ اور رنگوں میں سے زہد فی الدنیا کے بہت زیادہ قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عابدین وزاہدین اسے پہنتے ہیں۔

عمامہ باندھنے کا طریقہ:

امام نووی فرماتے ہیں کہ عمامہ باندھنے کے سنت طریقے دو ہیں عمامہ باندھ کر دونوں کناروں کو کندھوں کے درمیان لٹکانا اور یہی طریقہ مشہور ہے عمامہ باندھ کر کنارے سے شملہ بالکل نہ چھوڑا جائے۔

عمامہ کا رنگ:

آنحضرت ﷺ سیاہ عمامہ بھی باندھتے تھے اور سفید بھی باندھتے تھے اور دھاری دار عمامہ بھی باندھتے تھے۔ لیکن عموماً سفید اور سیاہ عمامہ ہوتا تھا اس لیے یہ دونوں سنت ہیں۔ علامہ سیوطی نے بہت سارے صحابہ اور تابعین کے بارے میں یہی نقل کیا ہے کہ سیاہ عمامہ باندھتے تھے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: حضرت عبد الرحمٰن بن عوف ؓ، حضرت براء ابن عازب، حضرت انس بن مالک، حضرت عمار ابن یاسر، حضرت انس بن مالک، حضرت امیر معاویہ، حضرت واثلہ ابن اثقع اور سعید بن میسب ؒ، حسن بصری ؒ اور سعید بن جبیر ؒ۔

بوقت خطبہ تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم

۱۴۱۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَخْطُبُ اِذَا جَآءَ اَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالْاِمَامُ يَخْطُبُ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ وَلْيَتَجَوَّزْ فِيْهِمَا۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٢/٩٩٠ حديث رقم (٥٧- ١٣٥٩)- وأبو داوٗد في السنن ٤/٣٤٠ حديث رقم

۴۰۷۷ والنسائی ۸/۲۱۱ حدیث رقم (۵۳۴۶) وابن ماجه مختصرًا ۲/۹۴۲ حدیث رقم ۲۸۲۱۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا اس حال میں کہ آپ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ کہ جب تم میں سے کوئی جمعہ کیلئے آئے۔ اور امام خطبہ پڑھ رہا ہو، تو اس کو چاہئے کہ دو رکعتیں پڑھ لے۔ اور چاہے کہ ان دونوں میں انتہائی اختصار کرے۔ (مسلم)

تشریح: (اذا جاء احدکم یوم الجمعة و الامام یخطب) مطلب ہے خطبہ دینے کے قریب ہو یا اس کا ارادہ رکھتا ہو۔

(فلیرکع رعتین ویتجوز)

(ویتجوز) لام کے کسرہ اور سکون کے ساتھ ہے۔

(فیهما) مطلب ہے ہلکی دو رکعتیں پڑھے اور کہا گیا ہے مناسب یہ ہے کہ ان میں جمعہ کی سنتوں کی نیت کرے کیونکہ تحیۃ المسجد ان سے حاصل ہو جاتی ہے بخلاف اس کے عکس میں (یعنی تحیۃ المسجد سے سنتوں کا حصول نہیں ہوتا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اور یہی قول اختیار کیا ہے ابن الملک نے مذہب کی مخالفت کے باوجود یہ روایت دلالت کرتی ہے اس بات پر کہ تحیۃ المسجد دوران خطبہ مستحب ہے۔

(رواہ مسلم) قال میرك۔ و اللفظه وللبخاری بمعناه ولم یقل ویتجوز فیهما۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں مسلم کی روایت میں ہے سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ جمعہ والے دن آئے درانحالیکہ نبی ﷺ خطبہ دے رہے تھے پس حضرت سلیک بیٹھ گئے پس ان سے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اے سلیک کھڑا ہو جا اور دو رکعتیں پڑھ اور ان میں تخفیف کر پھر فرمایا اذا جاء احدکم ......۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کیلئے دلیل حضور ﷺ کا قول ہے۔ **اذا خرج الامام فلا صلاة ولا کلام**۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اس کا رفع غریب ہے۔ اور معروف یہ ہے کہ یہ امام زہری کا کلام ہے جسے امام مالکؒ نے مؤطا میں نقل کیا ہے اور فرمایا خروجه یقطع الصلاة و کلامه یقطع الکلام۔

اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں تخریج کی ہے حضرت علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہ یہ دونوں حضرات امام کے نکلنے کے بعد نماز اور کلام کو مکروہ سمجھتے تھے۔

اور حضرت عروہؒ نے تخریج کی ہے فرمایا جب امام منبر پر بیٹھے تو نماز نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قول صحابی ہمارے نزدیک حجت ہے جبکہ سنت میں سے کوئی دوسری چیز اس کی نفی نہ کرتی ہو۔ اور باقی جو امام مسلمؒ نے حضور ﷺ کا قول نقل کیا ہے۔ اذا جاء احدکم۔ یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ مراد یہ ہے کہ پڑھے (دو رکعتیں) خطیب کے خاموش ہونے کے ساتھ۔ کیونکہ سنت میں یہ بات بھی ثابت ہے (یعنی سنت میں یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے دوران خطبہ خاموشی اختیار کر لی تھی جب اس آدمی نے دو رکعتیں پڑھی تھیں)

یا یہ روایت خطبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت سے پہلے کی ہے۔ انتہی۔

اور ایک قول یہ ہے یہ بھی احتمال ہے کہ حضور ﷺ نے اسے اس کا حکم اس لئے دیا تا کہ اس پر صدقہ کیا جائے۔ امام احمدؒ اور ابن حبانؒ نے تخریج کی ہے کہ حضور ﷺ نے اسے نماز کا حکم تکرار کے ساتھ تین مرتبہ جمعوں میں کیا۔ لہٰذا یہ بات دلالت کرتی ہے کہ اس سے مقصود اس پر تصدق تھا۔

اور حضور ﷺ نے اسے بیٹھنے سے پہلے نماز کا حکم دیا لہٰذا یہ حکم تخصیص کے باب سے ہوا کیونکہ قائلین منع اسے تصدق کی علت کی وجہ سے جائز قرار نہیں دیتے جیسے کہ انہوں نے اس کی تصریح کی ہے۔

۱۴۱۲: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الصَّلَاةِ مَعَ الْاِمَامِ فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلَاةَ۔ (متفق عليه)

۱٤۱۲: أخرجه البخاري في صحيحه ۲/۵۷۔ حديث رقم ۵۸۰۔ ومسلم في صحيحه ۱/٤۲٤ حديث رقم (۱۶۲۔ و۶۰۷)۔ وأبوداوٗد في السنن ۱/۶۶۹ حديث رقم ۱۱۲۱۔ والترمذی ۲/٤۰۲ حديث رقم ۵۲٤۔ والنسائی ۱/۲۷٤ حديث رقم ۵۵۳۔ وابن ماجه ۱/۳۵۶ حديث رقم ۱۱۲۲۔ والدارمی ۱/۳۰۱ حديث رقم ۱۲۲۰۔ ومالك في الموطأ ۱/۱۰۵ حديث رقم ۱۱ من كتاب الجمعة۔ وأحمد في المسند ۱/۲٤۱۔

ترجمه: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ جس شخص نے نماز کی ایک رکعت امام کے ساتھ پالی اس نے نماز پالی۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: "مع الامام" علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ نماز جمعہ کے ساتھ خاص ہے اسے بیان کیا ہے فصل ثالث میں مذکور حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت نے۔

(فقد ادرك الصلاة) امام شافعیؒ مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں اس سے نماز فوت نہیں ہوئی اور جس سے جمعہ فوت نہیں ہوا اس نے دو رکعتیں پڑھی۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں امام کے سلام کے بعد کھڑا ہو جائے اور دوسری رکعت پڑھے۔

اور زیادہ ظاہر اس حدیث کو عموم پر محمول کرنا ہے جیسے کہ باب: ما علی المأموم میں حضور ﷺ کا ارشاد: من أدرك فقد ادرك الصلاة گزرا ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے من ادرك من الجمعة ركعة فليصل اليها اخرٰى۔

ابن حجرؒ نے اسے یعنی فليصل کو ضمہ اور پھر فتحہ اور تشدید کے ساتھ ضبط کیا ہے۔ لیکن یہ درست ہے کیونکہ اليها اس کے بعد موجود ہے۔ لہٰذا درست یہ ہے کہ اول لفظ کے فتحہ کے ساتھ دوسرے کے اور کسر اور لام مخففہ کے سکون (فليصل) کیونکہ وصول الی کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ (متفق علیہ)

الفصل الثانی:

دونوں خطبوں کے درمیان کلام جائز نہیں

۱۴۱۳: عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ خُطْبَتَيْنِ كَانَ يَجْلِسُ إِذَا صَعِدَ الْمِنْبَرَ حَتَّى يَفْرُغَ أُرَاهُ الْمُؤَذِّنُ ثُمَّ يَقُومُ فَيَخْطُبُ ثُمَّ يَجْلِسُ وَلَا يَتَكَلَّمُ ثُمَّ يَقُومُ يَخْطُبُ۔

(رواه ابو داود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ١/٦٥٧ حديث رقم ١٠٩٢۔ وأحمد في المسند ٢/٣٥۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن دو خطبے پڑھتے تھے۔ آپ جب منبر پر چڑھتے تو بیٹھ جاتے یہاں تک کہ مؤذن اذان دے کر فارغ ہو جاتا، پھر آپ کھڑے ہوتے اور خطبہ ارشاد فرماتے پھر آپ بیٹھ جاتے، اور کلام نہیں فرماتے تھے اور پھر آپ کھڑے ہو جاتے اور دوسرا خطبہ ارشاد فرماتے۔ (ابوداوٗد)

تشریح: (کان یجلس) استئناف مبین ہے (نیا کلام ہے ماقبل کیلئے مبین ہے)

(اذا صعد المنبر) علماء نے کہا ہے منبر پر خطبہ دینا مستحب ہے اور کچھ علماء کا قول ہے سوائے مکہ کے کہ اس کے منبر پر خطابت بدعت ہے اور اس میں سنت یہ ہے کہ کعبہ کے دروازے پر خطبہ دے جیسے یہ عمل کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ والے دن اور ان کی پیروی کی اس پر خلفائے راشدین نے اور مکہ میں یہ عمل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے شروع کیا تھا۔

لیکن اس میں یہ بحث ہے کہ انہوں نے اسے کہا اور سلف نے اس کی تقریر کی باوجود یکہ ان کے ان پر دوسرے واقعات میں اعتراضات تھے یہ بات کرتی ہے اس کے جواز پر۔

(المؤذن) نصب کے ساتھ ارادہ کا مفعول ہے۔ اور اس میں رفع بھی آ سکتا ہے فاعلیت کی بناء پر لیفرغ المؤذن تقدیر ہوگی۔ مطلب یہ ہے راوی کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں میرا گمان ہے انہوں نے فرمایا حتی یفرغ المؤذن (یہاں تک کہ مؤذن فارغ ہو جائے) کذا قال بعض الشراح۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں مراد یہ ہے راوی نے کہا میرا گمان ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے راوی کے قول حتی یفرغ کے اطلاق سے تقید بالمؤذن (یعنی اسے مؤذن کے ساتھ خاص کرنا) مراد لیا ہے۔ اور معنی یہ ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر اتنی مقدار بیٹھتے تھے کہ جب تک مؤذن اپنی اذان سے فارغ ہو جائے۔

(ثم یقوم فیخطب ثم یجلس) ای جلسۃ خفیفۃ ابن حجرؒ فرماتے ہیں اولی یہ ہے کہ سورۃ الاخلاص کی بقدر جلوس ہو۔

(ولا یتکلم) یعنی اپنے بیٹھنے کی حالت میں سوائے ذکر یا آہستہ قرأۃ کے علاوہ بات نہ کرے۔

اور زیادہ بہتر ہے قرآن کریم کی تلاوت ابن حبان کی روایت کی بناء پر جس میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھنے میں کتاب کی تلاوت کرتے تھے۔

(ثم یقوم فیخطب) منیہ کی شرح میں ہے سخت مکروہ ہے بادشاہوں کی ایسی باتوں کے ساتھ تعریف کرنا جو ان

میں موجود نہ ہوں۔ کیونکہ اس میں عبادۃ کو معصیت جو کہ جھوٹ ہے اس کے ساتھ ملانا ہے۔ انتہی۔

اور ہمارے کچھ ائمہ کا قول ہے کہ جس نے ہمارے زمانے کے بادشاہ کو عادل کہا اس نے کفر کیا۔ اور کچھ ائمہ کا قول ہے انصات واجب ہے۔ یہاں تک کہ خطیب ظالموں کی تعریف شروع کر دے۔

اس وجہ سے کچھ ائمہ اس طرف گئے ہیں کہ ہمارے زمانے میں خطیب سے دوری بہتر ہے تا کہ ظالموں کی تعریف نہ سنے۔

(رواہ ابو داؤد) قال میرك وفی اسنادہ عبداللّٰہ المعری وفیہ مقال۔

خطبہ کے وقت لوگ کس جہت مُنہ کر کے بیٹھیں

۱۴۱۴: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اسْتَوٰى عَلَى الْمِنْبَرِ اسْتَقْبَلْنَاهُ بِوَجُوْهِنَا (رواه الترمذى وَقَالَ هٰذَاحَدِيْثٌ لَا نَعْرِفُهُ اِلَّا مِنْ حَدِيْثِ مُحَمَّدِ ابْنِ الْفَضْلِ وَهُوَ ضَعِيْفٌ ذَاهِبُ الْحَدِيْثِ)۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۲/ ۳۸۳ حديث رقم ۵۰۹۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب منبر پر خطبہ کے لئے بیٹھ جاتے تھے تو ہم آپ کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے، اپنے چہروں کے ساتھ۔ (ترمذی) اور امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صرف فضل محمد کی سند کے ساتھ پہچانی جاتی ہے، اور وہ ضعیف ہیں، ان کا حافظہ کمزور ہے انہیں حدیث یاد نہیں رہتی تھی۔

تشریح: سنت ہے یہ کہ لوگ خطیب کی طرف مُتوجہ ہوں اور خطیب لوگوں کی طرف متوجہ ہو۔

منیہ کی شرح میں مذکور ہے لوگوں کیلئے مستحب ہے کہ خطبہ کے وقت امام کی طرف رخ کریں لیکن آج کل یہ طریقہ ہے کہ لوگ قبلہ کی طرف رخ کرتے ہیں۔ صفیں درست کرنے میں حرج کی وجہ سے کثرت ازدہام کی وجہ سے۔ کذا فی شرح الهدایه للخروجی۔

میں کہتا ہوں ان کے امام کی طرف رخ کر لینے کی وجہ سے استقبال قبلہ کا ترک لازم نہیں آتا جیسا کہ اس پر باب العید کے شروع میں آنے والی حدیث شاہد ہے۔

پس لوگوں کے سامنے کھڑا ہوا اور لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے ہوں ہاں اس صورت میں ان دونوں میں اجتماع متعذر ہوگا جب مسجد حرام میں امام کی جہت کے علاوہ میں ہو۔ اجتماع عام اور خاص کے وقت۔

اور منیہ کی شرح میں ہے جب خطیب منبر پر چڑھے تو ہمارے نزدیک یہ ہے کہ لوگوں کو سلام نہ کرے امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا اس میں اختلاف ہے اھ۔

(شارح اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں) اور عجائب میں سے ہے جو میرے ساتھ واقع ہوا میں نماز جمعہ سے فراغت کے بعد شافعی خطیب کے پاس گیا اور میں نے اسے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا ایک مرتبہ تو اس نے مجھے تعجب کیا۔

میں نے اس سے کہا تم اولاً سلام کرتے ~~جبکہ~~ مؤذن اذان شروع کر دیتا ہے۔ اور کوئی بھی جواب نہیں دیتا اور اگر کوئی

جواب دے تو سنتا نہیں۔ لہٰذا (اس کا جواب) اسقاط غرض کا فائدہ نہیں دیتا۔ یا تو مؤذن کو حکم دو کہ تمہارے سلام کا جواب دے وگرنہ سلام کرنا ترک کر دو تا کہ لوگ عام حرج میں اور پورے گناہ میں نہ پڑیں اس نے مجھے کہا یہ ممکن نہیں کیونکہ یہ عادت کے خلاف ہے میں نے کہا ارادہ ترک عادت ہے اور اس کے ترک سے عادۃ عبادت ہو جائے گی۔

(رواه الترمذی وقال هذا حديث لا نعرفه الا من حديث محمدبن الفضل) ای ابن عطية قاله ميرك (وهو ضعيف) ای فی الرواية (ذاهب الحديث) ای واهم فی نقله۔

قاله الطيبی ای ذاهب حديثه غير حافظ للحديث وهو عطف بيان لقوله ضعيف۔

(مراد یہ ہے امام ترمذیؒ نے اسے محمد بن الفضل ابن عطیہ کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ محمد بن الفضل ضعیف راوی ہیں۔ ضعیف کی تفسیر ذاهب الحدیث سے کی ہے جس کا مطلب ہے اپنی نقل میں وھم کرنے والا ہے علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں ذاهب حديثه کا مطلب ہے اپنی حدیث کو یاد رکھنے والا نہیں اور واهم فی نقله اور غیر حافظ للحدیث یہ دو تفسیریں ہیں۔ اور ذاهب الحدیث ضعیف کیلئے عطف بیان ہے)۔

الفصل الثالث:

۱۴۱۵: عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ قَائِمًا ثُمَّ يَجْلِسُ ثُمَّ يَقُوْمُ فَيَخْطُبُ قَائِمًا فَمَنْ نَبَّأَكَ اَنَّهٗ كَانَ يَخْطُبُ جَالِسًا فَقَدْ كَذَبَ فَقَدْ وَاللّٰهِ صَلَّيْتُ مَعَهٗ اَكْثَرَ مِنْ اَلْفَيْ صَلَاةٍ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحيحه ۵۸۹/۲ حديث رقم (۳۵۔ ۸۶۲)۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے، پھر بیٹھ جاتے اور پھر کھڑے ہوتے۔ پس کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے، لہٰذا جو شخص آپ کو یہ خبر دے کہ آنحضرت ﷺ خطبہ بیٹھ کر ارشاد فرماتے تھے تو وہ جھوٹ بولتا ہے، اللہ کی قسم میں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ دو ہزار سے بھی زیادہ نمازیں پڑھی ہیں۔

تشریح: "منیہ کی شرح میں ہے ہر وہ شہر جو تلوار کے ساتھ فتح کیا گیا ہو اس میں تلوار کے ساتھ خطبہ دیا جائے گا جیسے مکہ میں اور وہ شہر جس کے اہل نے بخوشی اسلام قبول کیا جیسے مدینہ اس میں بغیر تلوار کے خطبہ دیا جائے گا اور قیام کے بارے میں کلام عنقریب آئے گا۔

(ثم يجلس ثم يقوم فيخطب قائمًا) الينا بيع میں ہے کہ دوسرے خطبے میں جہر پہلے کے جہر سے کم ہوگا۔

(فمن نبأك) با کی تشدید کے ساتھ اخبرك اور حدثك کے معنی میں ہے۔

(فقد واللّٰه صليت) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں واللہ قسم جو قد اور اس کے متعلق کے درمیان اعتراض کے طور پر ہے اور یہ جواب قسم پر بھی دلالت کرنے والا ہے۔

فاسیہ ہے مطلب یہ ہوگا وہ ایسا جھوٹا ہے جس کا جھوٹ ظاہر ہے اس سبب سے کہ میں نے ان کے ساتھ دو ہزار سے زیادہ نمازیں پڑھی ہیں۔(معہ کثر من الفی صلاۃ) (دو ہزار سے صرف جمعہ کی نمازیں مراد ہیں) بلکہ جمعہ اور اس کے علاوہ دوسری نمازیں مراد ہیں۔یا مراد یہ انہوں نے اس سے کثرت ظاہر کرنے کا ارادہ کیا تحدید ان کا مقصود نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں صرف دس سال ٹھہرے اور پہلا جمعہ جو انہوں نے پڑھا تھا وہ آپ کی مدینہ تشریف آوری کے ساتھ ملا ہوا تھا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ہزار جمعہ نہیں پڑھے (فی المدینہ) بلکہ پانچ سو کے برابر پڑھے تھے۔(رواہ مسلم)

فمن کا فا شرط محذوف ہے اور فقد کذب میں فامن کا جواب ہے اور فقد و اللہ میں

خلافِ سنت کام دیکھ کر غصہ آنا غیرت ایمانی ہے

۱۴۱۶: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ اَنَّهٗ دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَعَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ اُمِّ الْحَكَمِ يَخْطُبُ قَاعِدًا فَقَالَ اُنْظُرُوْا اِلٰى هٰذَا الْخَبِيْثِ يَخْطُبُ قَاعِدًا وَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْلَهْوَا نِ انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٥٩١/٢ حديث رقم (٣٩۔ ٨٦٤)۔

ترجمہ: حضرت کعب بن عجرہؓ سے روایت ہے کہ وہ ایک دفعہ مسجد میں گئے تو عبدالرحمن ابن ام الحکم کو دیکھا کہ وہ بیٹھ کر خطبہ پڑھ رہا ہے تو حضرت کعب نے فرمایا کہ اس خبیث کی طرف دیکھو کہ بیٹھ کر خطبہ پڑھ رہا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْلَهْوَا نِ انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا۔''اور جب یہ لوگ سودا بکتا یا تماشا ہوتا دیکھتے ہیں تو اکثر بھاگ جاتے ہیں اور تمہیں (کھڑے کا) کھڑا چھوڑ جاتے ہیں''(مسلم)

تشریح: (کعب بن عجرۃ)(عجرۃ) عین کے ضمہ اور جیم کے سکون کے ساتھ کوفہ میں اترے اور مدینہ میں فوت ہوئے۔صحابہ کرام اور تابعین میں سے بہت سے لوگوں نے ان سے روایت کیا ہے اسے مؤلف نے صحابہ میں ذکر کیا ہے۔

وعبد الرحمن بن ام الحکم: الحکم دونوں یعنی حا اور کاف کے فتحہ کے ساتھ۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں میرا گمان یہ ہے کہ یہ بنی امیہ سے ہیں میں کہتا ہوں یا یہ ان کے اتباع میں سے تھے۔

(انظر والی ھذا الخبیث) ترک ادب میں عین تعجب ہے ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس میں مرتکب حرام پر تغلیظ کا جواز ہے جو لوگ اس کے (یعنی بیٹھ کر خطبے دینے کے) حرمت کے قائل ہیں۔

اور ان کے علاوہ دوسروں کے نزدیک مکروہ ہے کیونکہ اس عمل کے خلاف ظاہر کرنا جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مداومت کی لوگوں کے سامنے خباثت کا پتہ دیتا ہے۔

(یخطب قاعدًا وقال اللہ) اور ایک صحیح نسخے میں ہے وقد قال اللہ۔

(تعالیٰ واذا رأوا) ای ابصروا او عرفوا۔

(الیھا) ای الی التجارۃ وما ذکر معھا الیھا کی ھا ضمیر تجارت اور اس کے ساتھ مذکورہ چیزوں کی طرف راجع ہے

لہٰذا یہ باب اکتفاء سے ہے اور مذکورین میں سے قریب ترین کی رعایت ہے۔ یا تجارت کو ذکر میں خاص اس لئے کیا ہے کہ دونوں امروں میں سے وہی مقصود اعظم ہے کیونکہ ڈھول (وغیرہ) اسباب تجارت کے آنے کی خبر دیتے کہتے تھے۔ اور وہ (یعنی عرب) جب قافلہ آتا تو اس کا استقبال تالی کے ساتھ کرتے تھے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں صحابیؓ کا قول قد قال اللّٰه حال ہے جو انکار کی جہت کو پختہ کرنے والا ہے انہوں نے دیکھا ہے کہ کیسے بیٹھ کر خطبہ دے رہا ہے اور رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وترك قائماً۔

اور وہ ساتھ رہنے والے اٹھارہ یا بارہ تھے اور یہی صحیح ہے جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں ہے حضرت جابرؓ سے باقی رہنے والے بارہ تھے ان میں سے حضرت ابوبکرؓ اور عمر رضی اللہ عنہ تھے اور ایک روایت میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے اگر سارے نکل جاتے تو اللہ ان پر وادی میں آگ بھڑکا دیتے۔

اور اذان تو اداء جمعہ کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے وقت ہے وقت کے بعد جمعہ درست نہیں بخلاف باقی نمازوں کے اور اس کا وقت اجماعاً ظہر کا وقت ہے اور زوال سے قبل جائز نہیں سوائے امام احمد بن حنبلؒ کے قول کے۔ اور نہ ہی عصر کا وقت داخل ہونے کے بعد بخلاف امام مالکؒ کے۔

اور اس کی شرائط میں سے ہے خطبہ اور اسی پر ہیں جمہور اور خطبے کی شرط ہے کہ وہ وقت کے اندر ہو وقت سے قبل درست نہیں اور یہ کہ جماعت کے حاضر ہونے کے وقت ہو اور اس خطبے کا رکن خطبے کی نیت کے ساتھ مطلق ہے اللہ کا ذکر ہے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اور صاحبینؒ کے نزدیک۔ اور صاحبینؒ کے نزدیک لمبے ذکر کو خطبہ کہا جائے گا۔ اور خطبے کا واجب یہ ہے کہ طہارت اور قیام اور ستر عورۃ کے ساتھ ہو۔

اور اس کی سنن یہ ہیں دو خطبے ہوں درمیان میں بیٹھنا ہو ہر ایک مشتمل ان میں سے حمد اور تشہد یعنی لفظ شہادت اور نبی ﷺ پر درود پر اور پہلا تلاوت قرآن اور وعظ پر مشتمل ہو اور دوسرا مومنین اور مومنات کیلئے دعا پر مشتمل ہو وعظ کی جگہ اور یہ تمام چیزیں امام شافعیؒ کے نزدیک ارکان ہیں۔

پس اگر کسی نے الحمد للہ یا سبحان اللہ یا لا الٰہ الا اللہ یا اس کی مثل کہا تو یہ کافی ہو جائے گا اگر خطبے کے ارادے سے ہو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک۔ (کذا فی شرح المنیہ)

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں خطبے میں کھڑا ہونا افضل ہے کیونکہ یہ اعلام میں زیادہ بلیغ ہے جبکہ آواز کو زیادہ پھیلانے والا ہو پس اس کی مخالفت مکروہ ہو گی۔

اور علامہ ابن ہمامؒ نے فرمایا اور انہوں نے نہیں حکم لگایا یعنی کعبؓ اور ان کے علاوہ کسی اور نے اس نماز کے فاسد ہونے کا لہٰذا اس سے معلوم ہوا یہ کہ ان کے نزدیک شرط نہیں یعنی صحابہ اور تابعین کے نزدیک اور اجماع ہوا۔

پس یہ وجہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصہ سے مستغنی کر دیتی ہے کیونکہ یہ احادیث کی کتابوں سے بھی نہیں جانا گیا۔ بلکہ فقہ کی کتابوں میں بھی نہیں وہ یہ ہے کہ جب خلافت ملنے کے بعد پہلے جمعہ میں خطبہ دینے منبر پر چڑھے اور فرمایا الحمد للہ اور خطبے میں

رک گئے اور کہا ہے بے شک حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما اس مقام میں بات کرنے کے اہل تھے۔ اور تم کام کرنے والے امام کی طرف زیادہ حاجت مند ہو بہ نسبت باتیں کرنے والے امام سے اور اس کے بعد تمہارے پاس خطباء آئیں گے اور اللہ مجھے اور تمہیں معاف کرے اور منبر سے اتر آئے اور ان کو نماز پڑھائی۔ اور انہیں سے (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے) کسی نے ان پر انکار نہیں کیا۔ لہٰذا یہ ان سے اجماع ہوا یا تو اس کے (یعنی اس خطبہ کے) شرط نہ ہونے پر یا اس بات پر کہ الحمد للہ اور اس کی مثل ذکر کو لغۃً خطبہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ عرفاً اسے خطبہ نہیں کہا جاتا۔

اور اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی سے کہا جس نے من یطع اللّٰہ ورسوله فقد رشد ومن یعصمها فقد غوی کہنے والے کو فرمایا بئس الخطیب انت پس اسے اس قدر کلام کرنے پر خطیب کہا۔ اور خطاب قرآن مفہوم لغوی کے اعتبار سے متعلق ہوتا ہے کیونکہ خطاب اس زبان والوں کے ساتھ ان کی زبان کے ساتھ تقاضا کرتا ہے اس لئے کہ یہی عرف لوگوں کی گفتگو میں ایک دوسرے کیلئے ان کی اغراض پر دلالت کرنے والا ہے۔ اور باقی بندے اور اس کے رب تعالیٰ کے درمیان لغۃً لفظ کی حقیقت معتبر ہے۔ اھ کلام المحقق۔ (رواہ مسلم)

خطبہ کے وقت اُنگلی سے اشارہ کرنا جائز ہے

١٤١٧: وَعَنْ عُمَارَةَ بْنِ رُوَيْبَةَ اَنَّهٗ رَاٰی بِشْرَبْنَ مَرْوَانَ عَلَی الْمِنْبَرِ رَافِعًا یَدَیْهِ فَقَالَ قَبَّحَ اللّٰهُ هَاتَیْنِ الْیَدَیْنِ لَقَدْ رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَا یَزِیْدُ عَلٰی اَنْ یَقُوْلَ بِیَدِهٖ هٰکَذَا وَاَشَارَ بِاِصْبَعِهِ الْمُسَبِّحَةِ۔

(رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ٢/٥٩٥ حدیث رقم (٥٣۔ ٨٧٤)۔

ترجمہ: حضرت عمارہ بن رویبہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے بشر بن مروان کو دیکھا، کہ وہ منبر پر خطبہ کے وقت اپنے ہاتھ بلند کر رہا ہے، تو فرمایا اللہ تعالیٰ قبیح بنائے ان دو ہاتھوں کو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ نہیں زیادہ کرتے تھے اس سے۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔ (مسلم)

تشریح: ''(وعن عمارة) عین کے ضمہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ۔

(رویبه) تصغیر کے ساتھ ذکرہ المؤلف فی الصحابة۔

(انه رای بشر بن مروان علی المنبر) قاموس کے اندر ہے بنر الشیئ رفعه اور انہی سے ہے منبر میم کے کسرے کے ساتھ (گویا منبر بلندی سے ہے)۔

(رافعا یدیه) یعنی بات کرنے کے وقت جیسے کہ واعظین کی عادت ہوتی ہے جبکہ وہ قصد کرتے ہیں (یعنی سمجھانے کا) اور اس کیلئے شاہد ہے حضرت عمارہ کا قول واشار باصبعه المسبحة قاله الطیبی۔

(فقال) عمارة (قبح اللّٰه ها تین الیدین) اس کے خلاف بددعا ہے یا اس کے برے فعل کی خبر دیتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے تبت یدا ابی لهب......

المسبحة) جر کے ساتھ اور اس میں رفع اور نصب بھی جائز ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یقول کا مطلب ہے یشیر عند التکلم۔ یعنی اشارہ کرتے تھے خطبہ کے وقت اپنی انگلی کے ساتھ لوگوں کو مخاطب کرتے تھے اور ان کو غور سے سننے پر متنبہ کرتے تھے۔ (رواہ مسلم)

خطبہ شروع کرنے سے پہلے منبر پر کھڑے ہو کر خطیب کسی کو بلا سکتا ہے

۱۴۱۸: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ لَمَّا اسْتَوٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عَلَی الْمِنْبَرِ قَالَ اجْلِسُوْا فَسَمِعَ ذٰلِكَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ فَجَلَسَ عَلٰی بَابِ الْمَسْجِدِ فَرَاٰهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ تَعَالَ يَا عَبْدَاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ۱/ ۶۵۶ حديث رقم ۱۰۹۱۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ جمعہ کے دن جب منبر پر کھڑے ہوئے تو لوگوں سے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ، پس آپ ﷺ کا یہ ارشاد ابن مسعودؓ نے سنا۔ تو مسجد کے دروازے پر ہی بیٹھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیکھا تو فرمایا: کہ عبداللہ ابن مسعودؓ یہاں آجاؤ۔

تشریح: علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس حدیث میں دلیل ہے منبر پر کلام کے جواز کی اھ۔

اور ہمارے نزدیک دوران خطبہ خطیب کا کلام کرنا مکروہ ہے جبکہ امر بالمعروف نہ ہو۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں ظاہر حضور ﷺ نے حاضرین میں ایک آدمی کو دیکھا کہ نماز پڑھنے کیلئے کھڑا ہوا ہے تو اسے بیٹھنے کا حکم دیا بیٹھنے والے پر نماز کے حرام ہونے کی وجہ بسبب امام کے منبر پر بیٹھنے کے اجماعاً۔

(فسمع ذلك) ای امرہ ﷺ بالجلوس۔

(ابن مسعود فجلس علی باب المسجد) پیروئ حکم کی طرف مبادرت کرتے ہوئے (ابن مسعودؓ مسجد کے دروازے پر ہی بیٹھ گئے)

(فرآه رسول اللّٰه فقال تعال) یعنی جوتوں والی صف سے مردوں والی صف کی طرف آجاؤ اور مسجد کی طرف آجاؤ۔

امام راغب (لفظ تعال کے بارے میں کہتے ہیں) اس کی اصل یہ ہے کہ کسی انسان کو بلند مکان کی طرف بلایا جائے پھر اسے ہر مکان کی طرف بلانے کیلئے مقرر کر دیا گیا (عرب کہتے ہیں) **تعلی (ای) ذھب صاعدًا یقال علیته فتعلی۔**

(یا عبد اللّٰه بن مسعود) تشریف و تخصیص کیلئے خطاب ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ارباب کمال اور خاص لوگوں میں تھے جبکہ حضور ﷺ ان سے خصوصیات کی وجہ سے محبت کرتے تھے جو ان کے علاوہ کیلئے نہ تھیں۔ اور ان کے حق میں حضور ﷺ کا ارشاد کافی ہے۔ ''**رضیت لا متی ما رضی لها ابن ام عبد۔**''

اسی وجہ سے ہمارے امام اعظمؒ ان کو خلفائے راشدین کے علاوہ بقیہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر مقدم کرتے ہیں۔ (رواہ ابوداؤد)

جس شخص کی نماز جمعہ فوت ہو جائے تو ظہر پڑھ لے

۱۴۱۹: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَدْرَكَ مِنَ الْجُمُعَةِ رَكْعَةً فَلْیُصَلِّ اِلَیْهَا اُخْرٰی وَمَنْ فَاتَتْهُ الرَّكْعَتَانِ فَلْیُصَلِّ اَرْبَعًا اَوْقَالَ الظُّهْرَ۔ (رواه الدارقطنی)

أخرجه الدارقطنی فی السنن ۲/۱۱ حدیث رقم ۷۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو جمعہ کی ایک رکعت مل جائے تو اسے چاہیے کہ وہ دوسری رکعت ملا لے اور جس شخص کی دونوں رکعتیں فوت ہو جائیں تو وہ چار پڑھ لے، یہاں راوی کہتے ہیں کہ چار کے بجائے ظہر کا لفظ ارشاد فرمایا کہ وہ ظہر کی نماز پڑھ لے۔ (دارقطنی)

تشریح: (الیها) ای الی تلك الركعة۔ (أخری) كما مر فتذكر۔

(ومن فاتته الركعتان) مراد ہے پوری نماز یا دونوں رکوع۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس کی صورت یہ ہوگی کہ امام کو دوسری رکعت کے رکوع میں پالے۔ جمعہ اور دوسری تمام نمازوں میں فرق یہ ہے کہ بے شک جمعہ کاملین کی نماز ہے اور جماعت اس کی صحت اداء کیلئے شرط ہے لہٰذا اس کے لیے ایسی احتیاط کی جائے گی جو دوسری نمازوں کیلئے نہیں کی جاتی تو یہ نہیں پائی جائے گی مگر ایک کامل رکعت کے پائے جانے کے ساتھ جیسا کہ اس میں اور اس سے پچھلی حدیث میں تصریح ہے اھ۔

لیکن اس میں یہ بحث ہے کہ یہ بات التصریح کے قبیل سے نہیں ہے بلکہ مفہوم مخالف کے قبیل سے ہے جو ان کے (یعنی شوافع کے) نزدیک معتبر ہے اور صحیح طور پر ہمارے نزدیک معتبر نہیں۔

(فلیصل) (یا کے) ضمہ کے ساتھ اور پھر (صاد کے) فتحہ کے ساتھ اور پھر (لام کی) تشدید کے ساتھ۔

اور امام نوویؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ یہ ضعف سے خالی نہیں اور اسے مستغنی کر دیتی صحیحین کی وہ روایت جو گزری ہے من ادرك ركعة من صلاة فقد ادرك الصلاة۔

منیہ کی شرح میں ہے جس نے امام کو ان دونوں رکعتوں میں پالیا وہ امام کے ساتھ نماز پڑھے اور اس پر جمعہ کی بناء کرے اگرچہ اسے تشہد یا سجدہ سہو میں پالے۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں اگر وہ پالے امام کے ساتھ دوسری رکعت کا رکوع تو اس جمعہ کی بناء کرے اور اگر اس کے بعد پائے تو اس پر ظہر کی بناء کرے۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں شیخینؒ کی دلیل حضور ﷺ کے قول کا اطلاق ہے جس کی اصحاب صحاح ستہ نے اپنی اپنی کتاب میں تخریج کی ہے:

عن ابی سلمة عن ابی هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: اذا اقيمت الصلا فلا تأتوها وانتم تسعون وأتوها تمشون وعليكم السكينة فما ادركتم فصلوا وما فاتكم فأتموا وفی رواية فاقضوا۔

علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں دونوں لفظوں میں حکم کے لحاظ سے فرق ہے جس آدمی نے اتموا کا لفظ لیا ہے اس نے کہا ہے

مسبوق جو پاتا ہے وہ اس کی نماز کا اول ہے۔

اور جس آدمی نے فاقضوا کا لفظ لیا ہے وہ اس کا قائل ہے کہ مسبوق جو نماز پاتا ہے وہ اس کی نماز کا آخر ہے پھر یہ کہا یہ وہ روایت ہے: من ادرك ركعة من الجمعة اضاف اليها ركعة اخرىٰ و الا صلى اربعًا ثابت نہیں ہے۔اھ۔

اور باقی مشکوٰۃ کے الفاظ ثابت ہونے کی صورت میں ان کی صحت مخالفت پر کوئی دلالت نہیں۔اس لئے کہ من فاتته الركعتان کا مطلب ہے۔ من لم يدرك شيئاً منهما فليصل الظهر (جو نہ پا سکے اس یعنی جمعہ سے کچھ پس وہ ظہر پڑھے)۔مطلب یہ ہے کہ جمعہ کی قضاء نہیں اور باقی رکعتان کی تفسیر رکوعان سے کرنا نص کو اس کے ظاہر سے بغیر اس کے داعی اور بغیر کسی ایسی حدیث کے پھیرنا ہے جو اس پر دلالت کرنے والی ہو۔

اور اس کی شرائط میں سے مصر (یعنی شہر بھی ہے) کیونکہ ابن ابی شیبہ نے حضرت علیؓ سے موقوفاً نقل کیا ہے۔لا جمعة و لا تشريق ولا صلاة فطر ولا اضحى الا فى مصر جامع او فى مدينة عظيمةٍ۔علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں ابن حزمؒ نے اس کی تصحیح کی ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ مقتدا ہونے میں کافی ہیں۔

اور جو عبدالرحمٰن بن کعب نے اپنے باپ کعب بن مالک سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا پہلے وہ شخص جنہوں نے ہمیں حرہ بنی بیاضہ میں جمعہ پڑھایا اسعد بن زرارۃ رضی اللہ عنہ تھے۔حضرت کعب جب اذان سنتے تو سعد پر رحم کھاتے اس وجہ سے راوی کہتے ہیں میں نے پوچھا تم کتنے تھے فرمایا چالیس یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری سے پہلے کی بات ہے امام بیہقی اور دوسرے اہل علم نے اسے ذکر کیا ہے لہٰذا اس کا حجت بننا لازم نہ آیا کیونکہ یہ جمعہ فرض ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے بغیر بھی ہے۔پھر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے بعد اس کے بارے میں (کچھ) اتارا اور اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ حرہ فنائے مصر میں سے ہے اور فناء کا حکم شہر جیسا ہے لہٰذا حدیث معارض سے سلامت رہی۔

پھر ضروری ہے اسے سماع پر محمول کیا جائے کیونکہ کلام اللہ سے فرض ہونے کی دلیل تمام مضافات میں درست ہونے کا فائدہ دیتی ہے۔لہٰذا اسے بعض مقامات میں نفی پر محمول کرنا سوائے سماع کے نہ ہوگا۔کیونکہ یہ خلاف قیام ہے جو اس میں اور دوسری نمازوں میں جاری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام سے منقول نہیں کہ جب وہ شہر فتح کرتے تھے تو نصب منابر اور جمع میں مشغول ہوتے تھے بلکہ صرف شہروں میں یہ ہوتا تھا نہ کہ بستیوں میں آحاد کی نقل کے ساتھ بھی یہ نہیں ہے اھ۔

مصر کی حد میں ایسا کثیر قسم کا اختلاف ہے کم ہی ان شرائط کا وقوع کسی شہر میں ہوسکتا ہے۔اسی وجہ سے (فقہاء نے کہا ہے جس جگہ جمعہ کے جواز میں شک ہو مناسب یہ ہے کہ چار رکعتیں جمعہ کے بعد پڑھے ان میں دوسرے فرض کی نیت یوں کرے (جس کے وقت کو میں نے پالیا ہے اور ابھی تک میں نے ادا نہیں کیا)۔اگر جمعہ صحیح نہیں ہوگا تو ظہر واقع ہو جائے گی اور اگر جمعہ درست ہو گیا اور اس پر ظہر تھی وہ اس سے ساقط ہوگی۔ورنہ نفل ہوں گے۔زیادہ بہتر یہ ہے کہ جمعہ سے پہلے چار رکعتیں پڑھے۔اس وقت کی سنتوں کی نیت سے پھر چار رکعتیں پڑھے پہلی والی گزری ہوئی نیت کے ساتھ پھر دو رکعتیں اس وقت کی سنتوں کی نیت کے ساتھ پڑھے۔پس اگر جمعہ درست ہو گیا تو نمازی نے اس کی سنتوں کو کامل طریقے پر پورا کیا ورنہ اس نے ظہر کو اس کی

سنت کے ساتھ ادا کیا۔

اس آدمی کے قول سے دھوکہ نہ کھاؤ جس نے کہا ہے کہ حرمین شریفین میں سے ہر ایک مصر ہے حضور ﷺ کے ان میں نماز پڑھنے کی وجہ سے کیونکہ اوصاف اوقات کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں۔

اور مصر کی تعریف سے ہے جس کی تصحیح صاحب ہدایہ نے کی ہے کہ وہ موقع ہوتا ہے جس میں امیر اور قاضی ہو احکام نافذ کرتا ہے اور حدود قائم کرتا ہے اور اس میں وہ شک وریب نہیں احکام کو نافذ کرنے والا قاضی نادر بلکہ معدوم ہے کیونکہ اکثر قاضی عہدہ قضاء دراہم کے بدلے لیتے ہیں اور ان کے عہدہ قضاء میں اختلاف ہے۔

پھر ان میں سے اکثر احکام نافذ نہیں کرتے یا تو اپنی جہالت کی وجہ سے یا ان کے عدم التفات کی وجہ سے اور ان کے فسق کے پائے جانے کے۔

اور ان میں سے کوئی ایک قضاء کے اوصاف کے ساتھ متصف ہو اور احکام کے جاری کرنے کا ارادہ کرے اسلامی نظام کے موافق تو امراء اور حکام اس کو منع کر دیتے ہی۔ اور دین میں احتیاط متقین کی عادت ہے۔

بَابُ صَلٰوۃِ الْخَوْفِ

نمازِ خوف کا بیان

اہل علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ صلوٰۃ الخوف کا حکم حضور ﷺ کی وفات کے بعد بھی باقی ہے۔ امام مزنیؒ اس کی منسوخیت کے قائل ہیں۔ امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ صلوٰۃ الخوف حضور ﷺ کے ساتھ خاص تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ الخوف کے حکم کو ''واذا کنت فیھم'' (جب آپ ان میں ہوں) کی شرط کے ساتھ بیان کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں مذکورہ قید قید اتفاقی ہے جیسے صلوٰۃ المسافر کے بارے میں ''ان خفتم'' کی قید قرآن مجید میں مذکور ہے۔

پھر علماء کے اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ صلوٰۃ الخوف کی جو صفات حضور ﷺ سے مروی ہیں وہ سب کی سب قابل اعتبار ہیں۔ البتہ فقہاء کے مابین ترجیح کے بارے میں اختلاف ہے۔ محدثین کا کہنا ہے کہ صلوٰۃ الخوف کے تقریباً سولہ طریقے مروی ہیں۔ بعض نے کم یا زیادہ کا قول بھی اختیار کیا ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ جمہور کی رائے یہ کہ خوف رکعات کی تعداد کو نہیں بدلے گا اور وہ حدیث جس میں آتا ہے ''فی الخوف رکعۃ'' اور ابن عباسؓ نے جس کے ظاہر کو لیا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ مقتدی امام کے بغیر ایک رکعت پڑھے۔ آئندہ احادیث میں بھی یہ بات آجائے گی۔ یہ معنی لینے کی صورت میں اس حدیث کی ان احادیث سے تطبیق ہو جائے گی جن کے مطابق نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام نے صلوٰۃ الخوف میں دو سے کم رکعات نہیں پڑھیں۔

کفار کے خوف اور دشمن کے مقابلے کے وقت جو نماز پڑھی جاتی ہے اسے صلوٰۃ الخوف کہا جاتا ہے۔ اور اس کا ثبوت قرآن مجید، سنت اور اجماع صحابہ سے ہے۔ اب آیا آنحضرت ﷺ کے بعد بھی یہ نماز مشروع ہے یا یہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ

خاص تھی اس میں اختلاف ہے اور دو مذہب ہیں۔

مذہب اوّل: امام ابو یوسفؒ کے نزدیک صلوٰۃ خوف آنحضرت ﷺ کی حیات کے ساتھ خاص ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿واذا کنت فیھم فاقمت لھم الصلوٰۃ﴾ یہ خطاب صرف رسول اللہ ﷺ کو ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ محمد ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کی فضیلت حاصل کرنے کیلئے ہر ایک کی کوشش ہوگی جس کی وجہ سے جھگڑے وفساد کا خطرہ ہے۔ آنحضرت ﷺ کے بعد یہ بات ختم ہے، کیونکہ سب کے پیچھے نماز پڑھنا برابر ہے، لہٰذا آپ ﷺ کی وفات کے بعد صلوٰۃ خوف مشروع نہیں۔

مذہبِ ثانی: جمہور ائمہ کے نزدیک آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی صلوٰۃ خوف مشروع ہے۔ کیونکہ جس سبب کی وجہ سے آپ کی زندگی میں یہ نماز مشروع ہوئی ہے۔ یعنی خوف وہ آپ کی وفات کے بعد بھی باقی ہے۔ اور اسی طرح آنحضرت ﷺ کے جلیل القدر صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ کے بعد بھی صلوٰۃ الخوف پڑھائی۔ مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوعبیدہ بن جراح، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے اصفہان میں صلوٰۃ الخوف پڑھائی۔ اور اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے طبرستان میں مجوسیوں سے جنگ کی، آپ کے ساتھ حسن بن علیؓ، حذیفہ بن اسحاق، عبداللہ ابن عمرو بن عاص تھے تو سعد بن ابی العاص نے ان حضرات کو صلاۃ خوف پڑھائی، کسی نے انکار نہیں کیا۔ اور حضرت علیؓ نے جنگ صفین اور نہروان میں صلوٰۃ خوف پڑھی۔ جمہور کے نزدیک سفر وحضر میں صلوٰۃ خوف پڑھی جاسکتی ہے۔ لیکن امام مالک کے نزدیک سفر کے ساتھ مخصوص ہے۔

طریقہ صلوٰۃ خوف:

صلوٰۃ خوف پڑھنے کے کل سولہ طریقے منقول ہیں، بعض نے اس سے بھی زیادہ نقل کیے ہیں۔ جتنے بھی طریقے منقول ہیں ان کے مطابق نماز خوف پڑھنا جائز ہے، صرف اولیٰ اور غیر اولیٰ میں اختلاف ہے، کسی نے کس طریقے کو ترجیح دی ہے کسی نے کس کو۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس باب کی پہلی فصل میں حضرت ابن عمرؓ سے جو طریقہ ثابت ہے اور صحاح ستہ میں منقول ہے اس کو ترجیح دی ہے۔

صلوٰۃِ خوف کی مشروعیت:

اس میں مختلف اقوال ہیں، بعض کے نزدیک ۴ ھ میں ہوئی، بعض کے نزدیک ۵ ھ میں اور بعض کے نزدیک ۶ ھ میں، اور بعض کے نزدیک ۷ ھ میں ہوئی اور یہی جمہور کے نزدیک راجح قول ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے اپنی زندگی میں چار دفعہ صلوٰۃ خوف پڑھائی غزوہ ذات الرقاع بطن نخلہ وادی عسفان وادی ذی مرو۔

الفصل الاول:

صلوٰۃ خوف کا طریقہ

۱۴۲۰: عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قِبَلَ

نَجْدٍ فَوَازَيْنَا الْعَدُوَّ فَصَافَفْنَا لَهُمْ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ لَنَا فَقَامَتْ طَائِفَةٌ مَّعَهٗ وَاَقْبَلَتْ طَائِفَةٌ عَلَى الْعَدُوِّ وَرَكَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَنْ مَّعَهٗ وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ انْصَرَفُوْا مَكَانَ طَائِفَةِ الَّتِيْ لَمْ تُصَلِّ فَجَاءُوْا فَرَكَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهِمْ رَكْعَةً وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ فَقَامَ كُلُّ وَّاحِدٍ مِّنْهُمْ فَرَكَعَ لِنَفْسِهٖ رَكْعَةً وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ وَرَوٰى نَافِعٌ نَحْوَهٗ وَزَادَ فَاِنْ كَانَ خَوْفٌ هُوَ اَشَدُّ مِّنْ ذٰلِكَ صَلُّوْا رِجَالاً قِيَامًا عَلٰى اَقْدَامِهِمْ اَوْ رُكْبَانًا مُّسْتَقْبِلِي الْقِبْلَةِ اَوْ غَيْرَ مُسْتَقْبِلِيْهَا قَالَ نَافِعٌ لَا اَرٰى ابْنَ عُمَرَ ذَكَرَ ذٰلِكَ اِلَّا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٢/٤٢٩۔ حدیث رقم ٩٤٢۔ والنسائی فی السنن ٣/١٧١ حدیث رقم ١٥٣٩۔ والدارمی ١/٤٢٨ حدیث رقم ١٥٢١۔ وأحمد فی المسند ٢/١٥٠۔

ترجمہ: حضرت سالم بن عبداللہ بن عمرؓ اپنے والد عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ نجد کی طرف آنحضرت ﷺ کے ساتھ جہاد کیلئے گیا، جب ہم دشمن کے آمنے سامنے ہوئے اور ہم نے ان کے ساتھ مقابلے کیلئے صفیں باندھ لیں، تو آنحضرت ﷺ نماز پڑھانے کیلئے کھڑے ہوئے، ایک گروہ نماز پڑھنے کے لئے آنحضرت ﷺ کے ساتھ کھڑا ہوا اور دوسرا دشمن کے مقابلے کیلئے کھڑا رہا، تو آنحضرت ﷺ نے ان کے ساتھ ایک رکوع اور دو سجدے کیے، پھر وہ لوگ ان لوگوں کی جگہ چلے گئے جنہوں نے نماز نہیں پڑھی تھی، وہ آئے، آنحضرت ﷺ کے ساتھ نماز میں شریک ہوئے، جب آنحضرت ﷺ نے ان کو ایک رکعت پڑھائی اور ایک رکوع اور دو سجدے کیے، پھر سلام پھیرا، ان میں سے ہر ایک کھڑا ہو گیا اور اکیلے ایک رکوع اور دو سجدے کیے۔ اور نافعؒ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے، انہوں نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ اگر خوف اس سے بھی زیادہ ہو تو لوگ پیادہ یا کھڑے کھڑے ہو کر اگر ممکن ہو تو قبلہ رو ہو کر ورنہ کسی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیں۔ حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ میرا خیال یہی ہے کہ یہ الفاظ ابن عمرؓ نے آنحضرت ﷺ سے ہی نقل کیے ہونگے۔ (بخاری)

تشریح: (مع رسول اللّٰہ) یہ حال ہے۔

(قبل نجد) بکسر القاف وفتح الباء۔ ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ نجد کا لغوی معنی ہے "ابھری ہوئی زمین" علامہ ابہریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نجد الحجاز ہے نہ کہ نجد الیمن۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ نجد کا اطلاق تہامہ سے لے کر عراق تک کے تمام بلند علاقے پر ہوتا ہے۔

(فصافَفنا) یعنی ہم صفیں بنا کر کھڑے ہو گئے۔

(لهم) اس لفظ کے دو معنی ہیں:

① ہم ان سے جنگ کی صفیں بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ② ہم نے ان کے مقابلے کیلئے خود کو دو صفوں میں تقسیم کر لیا۔

(فقام رسول اللّٰہ ﷺ لنا) حضور ﷺ نے دونوں صفوں کو نماز پڑھائی تا کہ دونوں کو برابر ثواب حاصل ہو۔ اس طرز عمل

سے تعدد جماعت کی کراہت معلوم ہوتی ہے بالخصوص اس وقت جبکہ سب لوگ حاضر ہوں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ فرض پڑھنے والا نفل پڑھنے والے کی اقتداء نہیں کر سکتا کیونکہ اگر ایسا ممکن ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک جماعت کو پوری نماز پڑھا دیتے اور دوسری کی امامت میں نفل کی نیت فرماتے۔ یہ حدیث وجوب جماعت کی قوی ترین دلیلوں میں سے ہے کہ اس حالت میں بھی جماعت کو ترک نہیں کیا گیا۔

ابن الہمام فرماتے ہیں کہ واضح رہے مذکورہ صفت کے مطابق صلوٰۃ الخوف اس وقت واجب ہوتی ہے جب لوگوں کا امام کے پیچھے نماز پڑھنے کے بارے میں تنازع ہو جائے اگر لوگ کا تنازعہ نہ ہو تو افضل یہ ہے کہ امام ایک جماعت کو پوری نماز پڑھائے اور دوسری جماعت کو کوئی دوسرا امام پوری نماز پڑھائے۔

(فرکع لنفسہ رکعۃ وسجد سجدتین) اس کی تفصیل یہ ہے کہ دوسری جماعت دشمن کی طرف چلی جائے اور پہلی جماعت واپس آ کر بغیر امام کے اپنی نماز پوری کر لے اور سلام پھیر کر دشمن کے مقابلے کیلئے چلی جائے۔ پھر دوسری جماعت آ جائے اور واپس آ کر اکیلے اپنی نماز پوری کرے اور سلام پھیر لے۔ فقہ حنفی کے بعض شارحین علماء نے یونہی ذکر کیا ہے۔

یہ بات اسی طرح ہے لیکن ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ بلاشبہ یہ حدیث امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے بعض پہلوؤں کو ثابت کرتی ہے جیسے پہلی جماعت کا چلے جانا اور دوسرے جماعت کا آ کر امام کے ساتھ اپنی نماز پڑھنا۔ البتہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اس مذہب کے ثبوت میں مکمل روایت ہے جو حضرت ابن عباسؓ سے موقوفاً منقول ہے۔ جسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور امام محمد نے کتاب الآثار میں اسے ذکر بھی کیا ہے انہوں نے امام صاحب کی سند کو بھی بیان کیا ہے اور یقیناً اس معاملہ میں رائے کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا یہاں موقوف بھی مرفوع ہے۔

اس روایت سے امام نوویؒ کے کلام کا جواب بھی ہو جاتا ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ صحیحین وغیرہ کے طرق حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی کہ دو جماعتوں میں سے ایک اپنی جگہ واپس آ کر نماز پوری کرے گی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر جماعت امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی نماز کو واپس آئے بغیر اپنی جگہ پر پوری کرے گی۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک رکعت پڑھی پھر دوسری رکعت خود ہی پڑھ لی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام بخاری نے بھی اس کو اختیار کیا۔

صلوٰۃ الخوف کے بارے میں ایک مسلک اور بھی ہے وہ یہ کہ پہلی جماعت اپنی نماز کو لاحق کی طرح بغیر قراءت کے پورا کرے گی اور دوسری جماعت مسبوق کی طرح قرات کے ساتھ یہ اس وقت ہے جبکہ امام مسافر ہو اور اگر امام مقیم ہو اور رباعی نماز پڑھ رہے ہوں تو وہ ہر جماعت کو دو رکعات پڑھائے گا اور مغرب میں پہلی جماعت کو دو رکعات پڑھائے گا۔

یہ کیفیت بھی جائز ہے باوجود اس کے کہ اس میں کثرت افعال بلا ضرورت پائی جا رہی ہے اس کے جواز کی وجہ خبر صحیح ہے جس کا کوئی معارض بھی نہیں۔ اس لئے کہ یہ کیفیت کسی اور دن کی ہے اور مذکورہ روایت میں بیان کردہ کیفیت ذات الرقاع کی ہے جو غزوہ کسی اور موقع پر پیش آیا ہے اس مقام پر منسوخیت کا دعوی کرنا بھی باطل ہے کیونکہ نسخ کیلئے معرفت تاریخ اور تعذر جمع کی ضرورت ہوتی ہے اور ان دونوں میں سے یہاں کوئی موجود نہیں۔

(وروی نافع نحوه) ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے سورۃ البقرۃ کی تفسیر میں حضرت نافع کی ابن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صلوٰۃ الخوف کا طریقہ پوچھا جاتا تو فرماتے ''امام آگے بڑھے اور ایک جماعت کو ایک رکعت پڑھائے اور دوسری جماعت دشمن کے سامنے رہے جب پہلی جماعت ایک رکعت پڑھ لے تو دوسری جماعت کی جگہ آ جائے اور سلام نہ پھیرے پھر دوسری جماعت امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے۔ پھر امام اٹھ جائے کیونکہ وہ دو رکعات پڑھ چکا ہے پس دو جماعتوں کی دو رکعات ہو جائیں گی۔

(فان کان خوف) ای خوف شدید اس کی تنوین تعظیم کیلئے ہے۔

(هو أشد من ذلك) یعنی محض پیش قدمی اور دشمنی سے آمنا سامنا نہ ہو بلکہ لڑائی ہو رہی ہو جس میں جماعت کروانا ممکن نہیں۔

(رجالاً) اس لفظ کے بارے میں مختلف قول ہیں۔

۱۔ بکسر الراء وتخفیف الجیم جمع رجلان بمعنی الراجل۔

۲۔ بضم الراء وتشدید الجیم جمع راجل۔

۳۔ بضم الراء وتخفیف الجیم جمع راجل۔

(قیاماً) کے بارے میں بھی مذکورہ تین اقوال ہیں۔ نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہے یہ دونوں لفظ صلوا کی هم ضمیر سے حال ہیں اصل عبارت ہی ہوگی:

''صلوا حال کونهم راجلین قائمین''۔

(علی أقدامهم) ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے قول ''قیاما'' کے ذریعہ اس بات کی وضاحت کی کہ رجالا راجل کی جمع ہے رجل کی نہیں۔ اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ رکوع اور سجود کو چھوڑنا اور انہیں اشارے سے بجالانا ان سے عاجز آنے کے وقت ہے۔ اس بات کو قیاماً علی اقدامهم) سے بیان کیا گیا۔

(أو رکبانا) اُو تخییر، اباحت یا تنویع کیلئے ہے۔

(مستقبلی القبلة أو غیر مستقبلیها) الراجل اور المستقبل (قبلہ رخ ہونا) کی تقدیم میں افضلیت اور روایت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ چلنا، سوار ہونا اور قتال کرنا صلوٰۃ الخوف کو فاسد کر دیتا ہے۔

(لا اری ابن عمر ذکر ذلك) اس زیادتی کے بارے میں ابن حجرؒ کا کہنا یہ ہے کہ اس سے مراد ''ای فان کان خوف ...... مستقبلی القبلة......'' کا جملہ ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ جیسا کہ امام نافع کا خیال ہے اسی طرح امام شافعیؒ نے اس بات کو فرمایا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے حاصل یہ کہ نماز کو اس کے وقت میں پڑھنے کو لازم ٹھہرایا اور تاخیر کو جائز قرار نہیں دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ کیفیت نماز سے مانع ہے اور اس صورت میں تاخیر کرنا واجب ہے یہاں تک کہ خوف دور ہو جائے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خندق کے دن ایسا کیا تھا۔ ~~اور جو یہ~~ شخص کہے کہ یہ قرآن سنت کے مخالف ہے اور غزوہ خندق کے معاملے کو منسوخ

قرار دے تو آپ اس کی تصدیق نہ کریں۔

ابن حجرؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تاخیر جائز ہے واجب نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید ان سے ایک روایت یوں بھی ہوگی۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ اس حالت میں بھی جماعت کروانا مسنون ہے جیسا کہ آیت میں اس کی تصریح موجود ہے۔لہٰذا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اس جماعت سے منع کرنا درست نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ تصریح آیت میں موجود نہیں لہٰذا امام صاحب پر اعتراض ختم ہوگیا۔

شاید اس قول کے قائل وقت نماز کے احترام کا ارادہ کیا ہے وگرنہ یہ عمل نماز کی ادائیگی کیلئے کافی نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ قول قرآن وسنت اور اجماع کے مخالف ہے۔

امام ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کیلئے کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھی آپ کے پیچھے ایک صف بنا کر دشمن کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک رکعت پڑھائی پھر دوسرے لوگ آگئے اور ان کی جگہ دشمن کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوگئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی ایک رکعت پڑھائی ہے پھر سلام پھیر دیا پھر یہ لوگ کھڑے اور انہوں نے اپنی ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا۔

ابوداؤد نے اس حدیث کو اس بنا پر معمول قرار دیا ہے کہ ابوعبیدہ کا سماع اپنے والد سے ثابت نہیں اور خصیف قوی نہیں ہے۔

غزوہ ذات الرقاع کا ایک واقعہ

١٤٢١: وَعَنْ يَزِيْدَ بْنِ رُوْمَانَ عَنْ صَالِحِ بْنِ خَوَّاتٍ عَمَّنْ صَلّٰى مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ ذَاتِ الرِّقَاعِ صَلَاةَ الْخَوْفِ اَنَّ طَائِفَةً صَفَّتْ مَعَهٗ وَطَائِفَةٌ وِجَاهَ الْعَدُوِّ فَصَلّٰى بِالَّتِىْ مَعَهٗ رَكْعَةً ثُمَّ انْصَرَفُوْا فَصَفُّوْا وِجَاهَ الْعَدُوِّ وَجَاءَتِ الطَّائِفَةُ الْاُخْرٰى فَصَلّٰى بِهِمُ الرَّكْعَةَ الَّتِىْ بَقِيَتْ مِنْ صَلَاتِهٖ ثُمَّ ثَبَتَ قَائِمًا وَاَتَمُّوْا لِاَنْفُسِهِمْ ثُمَّ ثَبَتَ جَالِسًا وَاَتَمُّوْا لِاَنْفُسِهِمْ ثُمَّ سَلَّمَ بِهِمْ متفق عليه واخرج البخارى بطريق اخرعن القاسم عَنْ صَالِحِ ابْنِ خَوَّاتٍ عَنْ سَهْلِ بْنِ اَبِىْ حَثْمَةَ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

أخرجه البخارى فى صحيحه ٤٢١/٧۔ حديث رقم ٤١٢٩۔ ومسلم فى صحيحه ٥٧٥/١ حديث رقم (٣١٠۔ ٨٤٢)۔ وأبو داوٗد فى السنن ٣٠/٢ حديث رقم ١٢٣٨۔ والترمذى ٤٥٥/٢ حديث رقم ٥٦٥۔ والنسائى ١٧١/٣ حديث رقم ١٥٣٧۔ والدارمى ٤٢٩/١ حديث رقم ١٥٢٢۔

ترجمہ: حضرت یزید ابن رومان حضرت صالح بن خوات سے نقل کرتے ہیں اور وہ اس شخصیت سے نقل کرتے ہیں جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ ذات الرقاع والے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلوٰۃ خوف پڑھی، فرماتے ہیں

ایک گروہ نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ صف بندی کی، اور دوسرا گروہ دشمن کے مقابلہ میں کھڑا ہو گیا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے پہلی جماعت کو ایک رکعت نماز پڑھائی پھر آنحضرت ﷺ کھڑے رہے اور اس جماعت نے اپنی خود اکیلئے اکیلئے نماز پوری کی، پھر دوسرا گروہ آیا، آپ ﷺ نے اس گروہ کو وہ رکعت پڑھائی جو آپ کی باقی تھی، پھر آپ بیٹھے رہے اور اس گروہ نے اپنی بقیہ نماز پوری کی اور پھر آنحضرت ﷺ نے ان کے ساتھ سلام پھیرا۔ یہ بخاری و مسلم کی روایت ہے۔ اور بخاری نے اس کو ایک اور طریقہ سے بھی نقل کیا ہے۔ وہ یہ ہے **عن قاسم عن صالح ابن خوات عن سهل بن ابی حثمة عن النبی ﷺ**۔

راویٔ حدیث:

یزید بن رومان۔ یہ یزید ہیں رومان کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی کنیت "ابوروح" ہے۔ اہل مدینہ میں شمار ہوتے ہیں ابن الزبیر اور صالح بن خوات سے حدیث کی ساعت کی ہے۔ ان سے امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی۔ "رومان" راء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: (**عن صالح بن خوات**) **بفتح المعجمة وتشديد الواو وبالتاء فوقها نقطتان**۔ یہ انصاری مدنی مشہور تابعی عزیز الحدیث ہیں ان کا سماع اپنے والد اور سہل بن ابی حثمہ سے ثابت ہے۔

(**عمن صلی مع رسول ﷺ**) اس مبہم شخص کے بارے میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد کون ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد سھل بن ابی حثمہ ہیں کیونکہ قاسم بن محمد نے صلوٰۃ الخوف کو "عن صالح بن خوات عن سھل بن ابی حثمۃ" کی سند سے ذکر کیا ہے لیکن راجح یہ ہے کہ یہ ان کے والد ہیں کیونکہ ابواویس نے اس حدیث کو یزید بن رومان کے حوالے سے نقل کیا اور کہا۔ "**عن صالح بن خوّات عن أبيه**" یہ روایت ابن مندہ کی معرفۃ الصحابۃ میں بھی موجود ہے اور بیہقی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

میرکؒ کا کہنا یہ ہے کہ ممکن ہے کہ صالح بن خوات نے اس روایت کو اپنے والد اور سھل دونوں سے روایت کیا ہو۔ اسی وجہ سے کبھی اسے مبہم کرتے اور کبھی واضح کر دیتے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ احتمال متعین ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی حدیث کو دونوں سے ثابت ہے اگر چہ ان میں سے ایک کو ترجیح دی گئی ہے اسی طرح کا ابہام کلام کی قوت کو نقصان نہیں پہنچاتا کیونکہ یہ قصہ عام پر محمول ہے اور تمام صحابہ علماء کا اعلام کے نزدیک عدول ہے۔

(**یوم ذات الرقاع**) بکسر الراء۔ یہ واقعہ سن ۵ ہجری میں پیش آیا۔ لفظ یوم صلی کیلئے ظرف ہے۔ جمال الدین فرماتے ہیں کہ اس غزوہ کو ذات الرقاع کہنے کی وجہ یہ ہے کہ الرقاع جمع ہے رقعة کی اس کا معنی ہے "کپڑا، پٹی"۔ اس غزوہ میں صحابہ کرام کے پاؤں لپٹ گئے تھے اور انہوں نے پاؤں پر پٹیاں باندھی تھیں۔ اس لئے اسے ذات الرقاع کہتے ہیں۔ ذات الرقاع کی وجہ تسمیہ کے بارے میں امام بخاری اور امام مسلم نے ابوموسیٰ اشعریؓ سے یہی روایت کیا ہے۔

سید جمال الدین کہتے ہیں کہ اس حدیث میں حضرت جابرؓ کا قول ہے "**وحتی اذا کفا بذات الرقاع**" بتا رہا ہے کہ

ذات الرقاع کسی مخصوص جگہ کا نام ہے لیکن ممکن ہے کہ انہوں نے حال کا اطلاق محل پر کیا ہو۔

(و طائفة) اس کی ترکیب میں دو احتمال ہیں:

① عطف کی بنیاد پر منصوب۔ ② ابتداء کی بناء پر مرفوع۔

(و جاہ العدوّ) بکسر الواو وضمھا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ طائفۃ کی صفت ہے ای و طائفة صفت مقابل العدوّ۔

(سلم بھم) دوسری جماعت کے ساتھ سلام پھیرنے میں حکمت یہ ہے کہ جس طرح پہلی جماعت کو امام کے ساتھ تکبیر تحریمہ کہنے کی فضیلت ملی اسی طرح دوسری جماعت کو امام کے سلام پھیرنے کی فضیلت مل جائے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے امام مالک اور امام شافعیؒ جبکہ پہلی حدیث سے امام ابوحنیفہ نے استدلال کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث صحیح کے پائے جانے کے بعد یہ کہنا کیسے درست ہوسکتا ہے کہ پچھلی حدیث کی سند میں رجل مبہم سے مراد حضرت صالح کے والد ہیں قطعی طور پر۔

سید جمال الدین کہتے ہیں کہ یہ ابوحثمہ احد میں نبی کریم ﷺ کے راہبر تھے اور بعد میں بہت سے معرکوں میں شریک ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں خیبر کی طرف کچھ ذمہ داریاں دے کر بھیجا تھا۔

ابن الملک فرماتے ہیں کہ یہ فعل مقدر کیلئے ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔

آنحضرت ﷺ کا اللہ پر اعتماد

۱۴۲۲: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اَقْبَلْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اِذَا كُنَّا بِذَاتِ الرِّقَاعِ قَالَ كُنَّا اِذَا اَتَيْنَا عَلٰى شَجَرَةٍ ظَلِيْلَةٍ تَرَكْنَاهَا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَجَاءَ رَجُلٌ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَسَيْفُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُعَلَّقٌ بِشَجَرَةٍ فَاَخَذَ سَيْفَ نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاخْتَرَطَهٗ فَقَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَخَافُنِيْ قَالَ لَا قَالَ فَمَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّيْ قَالَ اللّٰهُ يَمْنَعُنِيْ مِنْكَ قَالَ فَتَهَدَّدَهٗ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَغَمَدَ السَّيْفَ وَعَلَّقَهٗ قَالَ فَنُوْدِيَ بِالصَّلٰوةِ فَصَلّٰى بِطَآئِفَةٍ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ تَاَخَّرُوْا وَصَلّٰى بِالطَّآئِفَةِ الْاُخْرٰى رَكْعَتَيْنِ قَالَ فَكَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعُ رَكْعَاتٍ وَلِلْقَوْمِ رَكْعَتَانِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٢٦/٧۔ حديث رقم ٤١٣٦۔ ومسلم في صحيحه ٥٧٦/١ حديث رقم (٣١١۔ ٨٤٣)۔ أحمد في المسند ٣٩٠/٣۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ جہاد کیلئے روانہ ہوئے، یہاں تک کہ ہم ذات الرقاع پہنچ گئے، فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ طریقہ تھا کہ جب ہم راستہ میں کسی سایہ دار درخت کے پاس آتے تو ہم اس کو رسول

اللہ ﷺ کیلئے چھوڑ دیتے تھے (تا کہ آپ آرام کرلیں اور اس دن بھی ہم نے ایسا ہی کیا اور آپ آرام فرمانے لگے)۔ راوی کہتے ہیں اچانک مشرکین کا ایک آدمی آیا اس حال میں کہ نبی کریم ﷺ کی تلوار درخت پر لٹکی ہوئی تھی۔ تو اس نے آنحضرت ﷺ سے کہا کیا تم مجھ سے ڈرتے ہو فرمایا نہیں تو اس نے کہا، کون ہے جو تم کو مجھ بچائے گا، فرمایا: اللہ تعالیٰ مجھے تجھ سے بچائے گا۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں صحابہ نے اس کو ڈرایا اور دھمکایا، اس نے تلوار نیام میں رکھ دی اور اس کو درخت پہ لٹکا دیا۔ راوی کہتے ہیں پھر نماز کیلئے اذان کہی گئی، آنحضرت ﷺ نے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں، پھر وہ گروہ پیچھے ہٹ گیا، پھر دوسرے گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں، راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی چار رکعتیں ہوئیں اور قوم کی دو دو رکعتیں ہوئیں۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: (ترکناها لرسول الله ﷺ) یعنی اس سایہ دار درخت کو ہم نے رسول اللہ ﷺ کیلئے چھوڑ دیا کیونکہ حضور ﷺ کے پاس خیمہ نہ تھا۔ ہم نے ذات الرقاع میں بھی ایسا ہی کیا اور نبی کریم ﷺ استراحت کیلئے درخت کے نیچے تشریف فرما ہوئے۔

(فاخذ سيف النبي ﷺ) پہلے سیف رسول اللہ ﷺ اور پھر سیف النبی ﷺ کی تعبیر سے تفنن مقصود ہے نیز دو لفظوں کے پے در پے پیدا ہونے والے ثقل سے بچانا چاہتے ہیں۔

(فقال لرسول الله ﷺ أتخافني؟ قال لا) کیونکہ صاحب کمال صرف ملک متعال سے ڈرتا ہے کیونکہ اللہ کا غیر تمام احوال میں نہ نفع دے سکتا ہے نہ نقصان۔

(قال فمن يمنعك مني؟) بخاری شریف کی ایک روایت میں ''من يمنعك مني ثلاث مرات؟'' کے الفاظ ہیں۔
ابن حجرؒ نے اس استفہام کو استفہام انکاری قرار دیا ہے۔ ان کی یہ بات مناسب معلوم نہیں ہوتی۔
علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ جواب میں ''اللہ'' کہہ دینا کافی تھا لیکن رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ پر اعتماد ویقین کے اظہار کیلئے کلام کو پھیلایا۔

علامہ ابہریؒ فرماتے ہیں کہ اس کلام سے حضور ﷺ کی شجاعت صبر اور تحمل کا پتہ چلتا ہے۔

(فتهدده أصحاب رسول الله ﷺ فغمد السيف وعلقه) علامہ واقدی نے ذکر کیا ہے کہ ڈر کی وجہ سے اس کی کمر میں درد اٹھا جس کی وجہ سے تلوار اس کے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گر گئی، یہ شخص مسلمان ہو گیا تھا اور بہت سے لوگوں نے اس کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

ابو عوانہ نے روایت کیا ہے کہ یہ شخص مسلمان نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے عہد کیا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ نہیں لڑے گا۔ حضور ﷺ نے اس کی تالیف قلب یا کسی اور وجہ سے اسے معاف فرما دیا تھا۔

(فصلى بطائفة ركعتين ثم تاخروا صلى بالطائفة الأخرىٰ ركعتين) علامہ مظہر فرماتے ہیں کہ یہ روایت اپنے سے پہلے والی روایت کے مخالف ہے۔ باوجود اس کے کہ جگہ ایک ہی ہے اور اختلاف، اختلاف زمان کی وجہ سے ہے۔
پس اسے اس پر محمول کیا جائے گا کہ نبی کریم ﷺ نے اس جگہ دو مرتبہ نماز پڑھائی، ایک مرتبہ وہ جسے حضرت سھل نے

روایت کیا اور دوسری مرتبہ وہ جسے حضرت جابر نے روایت کیا ہے۔ پر حضرت سہل کی روایت کو فجر اور حضرت جابر کی روایت کو ظہر یا عصر پر محمول کیا جائے گا کیونکہ اس میں سایہ دار درخت کے سائے میں آرام کرنے کا ذکر موجود ہے یہ بھی ممکن ہے اسے غزوہ کے تعدد پر محمول کیا جائے گا جیسا کہ آگے آئے گا۔ واللہ اعلم۔

زین العرب فرماتے ہیں کہ محدثین کا خیال یہ ہے کہ یہ واقعہ آیت قصر کے نزول سے پہلے کا ہے یا یہ نماز اقامت والی جگہ پڑھی گئی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ زین العرب کا یہ قول اشکال سے خالی نہیں، کیونکہ لوگوں کا دو رکعتیں پڑھنا صرف اس صورت میں درست ہوسکتا ہے جبکہ قصر مشروع ہو۔ جبکہ اس حدیث سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں نے دو اور حضور ﷺ نے پوری نماز پڑھی۔ لیکن امام شافعیؒ کا مذہب یہ نہیں ان کے نزدیک پوری نماز پڑھنے والے کی اقتداء کرنے والا پوری نماز پڑھے گا خواہ وہ دونوں مسافر ہی کیوں نہ ہوں۔ پس اس مقام کی تحقیق ہونی چاہیے۔ مجھے اس مقام پر شارحین کی طرف سے کوئی واضح اور مکمل کلام نہیں ملا۔

میں کہتا ہوں (باللہ التوفیق و بیدہ ازمۃ التحقیق) یہ کہنا کہ یہ واقعہ آیت قصر سے پہلے کا یا موضع اقامت کا ہے۔ صحیح ہے لیکن درست بات یہ ہے کہ جس کے علاوہ اور کوئی توجیہ نہیں وہ امام اعظمؒ کا مذہب ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر حدیث مذہب شافعی پر محمول کی جائے۔ نیز یہ کہ اگر حدیث کا یہ معنی درست ہوتا تو امام شافعیؒ اس کو جائز قرار دیتے۔

علامہ طیبیؒ نے اور ان کی اقتداء میں ابن حجرؒ نے حدیث کا یہ معنی کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پہلی جماعت کو دو رکعات نماز پڑھائی۔ اور سلام پھیر دیا اور لوگوں نے بھی سلام پھیر دیا اس کے بعد حضور ﷺ نے دوسری جماعت کو بھی یونہی نماز پڑھائی لیکن ان کے ساتھ حضور ﷺ نے نفلوں کی نیت کی تھی جبکہ لوگ فرض کی نیت سے نماز پڑھ رہے تھے۔

صاحب ازھار کا کہنا ہے کہ اس حدیث سے متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز کے صحیح ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پہلے فرش بچھائیں پھر نقش و نگار کیجیے یعنی جس معنی کی بنیاد پر آپ اس مسئلہ کو ثابت کر رہے ہیں اور معنی ہی درست نہیں۔

غزوہ ذات الرقاع کی تاریخ کے بارے میں اختلاف ہے صاحب ازھار اور صاحب الروضۃ کے خیال کے مطابق یہ ہجرت کے پانچویں سال جبکہ ابن الجوزی نے عیون التاریخ میں لکھا ہے کہ ہجرت کے چوتھے سال یہ غزوہ پیش آیا۔

سید جمال الدینؒ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں اقوال نص بخاری کے خلاف ہیں کیونکہ امام بخاری فرماتے ہیں کہ غزوہ ذات الرقاع۔ غزوہ خیبر کے بعد پیش آیا کیونکہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جو کہ فتح خیبر کے بعد سن سات ہجری میں آئے تھے اور بالاتفاق غزوہ ذات الرقاع میں شریک تھے البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ غزوہ متعدد بار پیش آیا ایک مرتبہ پانچ ہجری میں ایک مرتبہ سات یا آٹھ ہجری۔

فتح الباری میں لکھا ہے کہ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ غزوۃ الرقاع، غزوہ بنو قریظہ کے بعد پیش آیا کیونکہ صلوٰۃ الخوف غزوہ خندق میں مشروع نہ ہوئی تھی اور صلاۃ الخوف کا وقوع ذات الرقاع میں ثابت پیش آیا پس معلوم ہوا کہ غزوہ ذات الرقاع غزوہ خندق کے بعد کا ہے۔

اس پر اشکال ہوتا ہے کہ نسائی میں حدیث خندق میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ یوم خندق میں نماز کی تاخیر صلوٰۃ

الخوف کے نزول سے پہلے کی بات ہے۔اسے ابن ابی شیبہ،عبدالرزاق،بیہقی،شافعی دارمی اور ابویعلی نے ابن ابی ذئب عن سعید المقبری عن عبدالرحمٰن بن ابی سعید الخدری عن اَبیہ کی سند سے نقل کیا ہے۔

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ اس نماز کے طریقے میں اختلاف اس کے ٹھہرانے کے اختلاف کی بنا پر ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مقام عسفان بطن نخلہ اور ذات الرقاع میں اس نماز کو صورتحال کو پیش نظر مختلف انداز میں پڑھا ہے اور علماء نے ہر روایت سے استدلال کیا ہے۔

صلوٰۃِ خوف کا ایک اور طریقہ

۱۴۲۳: وَعَنْهُ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الْخَوْفِ فَصَفَفْنَا خَلْفَهٗ صَفَّيْنِ وَالْعَدُوُّ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ فَكَبَّرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَبَّرْنَا جَمِيْعًا ثُمَّ رَكَعَ وَرَكَعْنَا جَمِيْعًا ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ وَرَفَعْنَا جَمِيْعًا ثُمَّ انْحَدَرَ بِالسُّجُوْدِ وَالصَّفُّ الَّذِيْ يَلِيْهِ وَقَامَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ فِيْ نَحْرِ الْعَدُوِّ فَلَمَّا قَضَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السُّجُوْدَ وَقَامَ الصَّفُّ الَّذِيْ يَلِيْهِ انْحَدَرَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ بِالسُّجُوْدِ ثُمَّ قَامُوْا ثُمَّ تَقَدَّمَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ وَتَاَخَّرَ الْمُقَدَّمُ ثُمَّ رَكَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَكَعْنَا جَمِيْعًا ثُمَّ انْحَدَرَ بِالسُّجُوْدِ وَالصَّفُّ الَّذِيْ يَلِيْهِ الَّذِيْ كَانَ مُؤَخَّرًا فِي الرَّكْعَةِ الْاُوْلٰى وَقَامَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ فِيْ نَحْوِ الْعَدُوِّ فَلَمَّا قَضَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السُّجُوْدَ وَالصَّفُّ الَّذِيْ يَلِيْهِ انْحَدَرَ الصَّفُّ الْمُؤَخَّرُ بِالسُّجُوْدِ فَسَجَدُوْا ثُمَّ سَلَّمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَلَّمْنَا جَمِيْعًا۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱/ ۵۷٤ حدیث رقم (۳۰۷۔ ۸٤۰)۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک مرتبہ صلوٰۃِ خوف پڑھائی، پس ہم نے آپ کے پیچھے دو صفیں باندھ لیں، اور دشمن ہمارے اور قبلہ کے درمیان تھا (یعنی ہمارے سامنے تھا) نبی ﷺ نے تکبیر کہی، ہم سب نے بھی تکبیر کہی، جب آنحضرت ﷺ نے رکوع کیا تو ہم سب نے بھی رکوع کر لیا جب آنحضرت نے اپنا سر رکوع سے اٹھا لیا تو ہم نے بھی سر اٹھا لیا، پھر آنحضرت ﷺ سجدے کیلئے جھکے تو وہ صف جو آپ کے ساتھ ملی ہوئی تھی وہ بھی ساتھ ہی سجدے میں چلی گئی اور پچھلی صف دشمن کے مقابلے میں کھڑی رہی جو جب نبی کریم ﷺ نے سجدہ پورا کر لیا اور کھڑی ہو گئی وہ صف جو آپ ﷺ کے قریب تھی تو پچھلی صف سجدے میں چلی گئی۔ پھر جب یہ کھڑے ہوئے تو پھر پچھلی صف آگے آ گئی اور اگلی صف پیچھے چلی گئی، پھر آنحضرت ﷺ نے رکوع کیا تو ہم سب نے بھی آپ کے ساتھ رکوع کیا، پھر آپ سجدے کیلئے جھکے اور وہ صف جو آپ کے قریب تھی جو کہ پہلی رکعت میں پچھلی صف میں تھی سجدے میں چلی گئی اور پچھلی صف دشمن کے مقابلے میں کھڑی رہی، پس جب نبی ﷺ نے سجدہ کر لیا اور اس صف نے بھی جو آپ ﷺ کے قریب تھی تو پچھلی صف

سجدے میں چلی گئی، پس انہوں نے سجدہ کیا، پھر آپ ﷺ نے سلم پھیرا اور ہم سب نے آپ ﷺ کے ساتھ سلام پھیرا۔

تشریح: وقال صلّی: صحیح نسخہ میں "صلّی بنا" کے الفاظ ہیں۔

(رسول اللہ ﷺ صلوٰۃ الخوف) اضافت فی کے معنی میں ہے۔

(ثم انحدر بالسجود والصف) اس لفظ کی ترکیب میں مختلف احتمالات ہیں:

① مفعول معہ ہونے کی بنا پر منصوب۔ ② انحدر کے فاعل پر عطف ہونے کی بناء پر مرفوع۔

علامہ طیبیؒ نے اس عطف کو فعل کے وجود کی بناء پر جائز قرار دیا ہے۔ اس مقام پر عطف زیادہ مناسب ہے کیونکہ مفعول معہ بنانے کی صورت میں متابعۃ الأشرف الاضعف لازم آئے گا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ الصّف ابتداء کی بنا پر مرفوع ہو اور خبر مقدر ہو۔ ای کذلك، معنی یہ ہوگا "مثل نزوله للسجود نزل الصفُّ"۔

(وتأخر المقدم) ابن الملک نے اس مقام پر تاخر سے مراد ایک یا دو قدم پیچھے آنا مراد لیا ہے۔ لیکن اس شرط کی کوئی حاجت نہیں کیونکہ صلوٰۃ الخوف کو صلاۃ الامن پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ متقدمین اور متاخرین میں ہر ایک کا فعل دو قدم سے زیادہ نہ ہونا چاہیے۔ ورنہ ان کی نماز باطل ہو جائے گی۔

واضح رہے کہ اس شرط کا صحیح ہونا دوسرے دلائل سے موقوف ہے اگر وہ صلاۃ الخوف کے بارے میں مل جائیں۔

(ثم رکع النبیؐ) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ حضور ﷺ کھڑے ہوئے۔ سورہ فاتحہ اور کوئی صورت پڑھی پھر رکوع کیا۔

سورۃ فاتحہ اور حالت کے مطابق کسی صورت پر اکتفا کرنا بھی ممکن ہے۔

(الذی علیه الذی کان مؤخرا فی الرکعة الاولی) یہ الصّف کی صفت ثانیہ ہے۔ ابن حجرؒ نے موصول ثانی سے پہلے "وھو" مقدر مانا ہے۔

(ثم سلم النبی وسلمنا جمیعًا) پس سب کی نماز امام کے ساتھ دو رکعتیں ہوگئی۔ حاصل یہ ہے کہ بعض مقتدیوں سے حالت قومہ میں امام کی متابعت متاخر ہوگی اور ظاہر یہ ہے آپ ﷺ تشہد کی مقدار بیٹھے۔ جیسا کہ لفظ "ثم سلّم" سے معلوم ہوتا ہے اور اس کی تائید صف مؤخر کے پیچھے ہٹنے سے بھی ہوتی ہے۔ اور سب کے سلام پھیرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ منحدرین تشہد کیلئے نہیں بیٹھے اگر سلام امام سے ماخر ہو تو اس پر صادق آئے گا کہ ان سب نے سلام پھیر دیا کیونکہ معیت جمیعت میں سے نہیں ہے۔

(رواہ مسلم) ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کی یہ نماز مقام عسفان میں تھی۔

الفصل الثّانی:

۱۴۲۴: عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُصَلِّیْ بِالنَّاسِ صَلَاۃَ الظُّھْرِ فِی الْخَوْفِ بِبَطْنِ نَخْلٍ فَصَلّٰی بِطَآئِفَۃٍ رَکْعَتَیْنِ ثُمَّ سَلَّمَ ثُمَّ جَآءَ طَآئِفَۃٌ اُخْرٰی فَصَلّٰی بِھِمْ رَکْعَتَیْنِ ثُمَّ سَلَّمَ۔

(رواہ فی شرح السنۃ)

أخرجه النسائي في السنن ۳/۱۷۸ حديث رقم ۱۵۵۱۔ والدارقطني ۲/۶۰ حديث رقم ۱۰۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خوف کے وقت بطن نخل میں لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائی پس ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں، اور سلام پھیر دیا پھر دوسرا گروہ آیا اس کو دو رکعتیں پڑھائیں اور سلام پھیر دیا۔

(شرح السنہ)

تشریح: (ان النبیّ کان) یہ کان استمرار کیلئے نہیں بلکہ محض ربط اور ماضی پر دلالت کیلئے ہے۔

(ببطن نخلۃ) یہ مکہ اور طائف کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے۔

ازھار میں ہے کہ یہ عرض عطفان سے نجد کا علاقہ ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ بطن نخلہ مدینہ کے قریب ہے لہٰذا قصر کا تصور نہیں ہو سکتا۔

ہم کہتے ہیں ایسا نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو نبی کریم ﷺ ایک جماعت کو دو رکعتیں پڑھاتے اور وہ حضور ﷺ سے الگ ہو کر اپنی نماز پوری کر کے چلے جاتے اور دوسری جماعت آتی۔ حضور ﷺ انہیں بھی دو رکعتیں پڑھاتے اور پھر وہ کھڑے ہو کر اپنی نماز پوری کر لیتے۔ حضر میں صلوٰۃ الخوف اس طرح پڑھنا بھی جائز ہے۔

قائل کا یہ کہنا کہ بطن نخلہ مدینہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے اس لئے یہاں قصر نہیں ہو سکتا ایک عجیب اور غیر صحیح بات ہے کیونکہ مسافر تو مدینہ سے نکلتے ہی قصر شروع کر دے گا اور واپس مدینہ میں داخل ہونے تک قصر کرتا رہے گا۔

اس حدیث سے ایک طرف تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دو مرتبہ سلام پھیرا تھا اس لئے اتمام پر دلالت نہیں ہو سکتی۔ اور دوسری طرف اس میں نیت مفارقت پر بھی دلالت نہیں ہے اکثر علماء کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ پس امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق یہ حدیث اشکال سے خالی نہیں کیونکہ اسے حالت قصر پر عمل کیا جائے گا۔ اور دوسری جماعت کو پڑھائی گئی نماز نفل شمار ہوگی۔ لیکن ہمارے قواعد کے مطابق اس حدیث پر سخت اشکال ہے وہ اس طرح کہ اگر اسے سفر پر محمول کریں تو مفترض کا متنفل کی اقتدا کرنا لازم آئے گا۔ جو ہمارے نزدیک بالکل صحیح نہیں اور اگر اسے حالت حضر پر محمول کریں تو دو رکعات کے بعد سلام پھیرنا اس کے منافی ہے۔ پس ہم یہ کہیں گے کہ یہ حضور ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے اور لوگوں نے حضور ﷺ کے سلام کے بعد اپنی دو رکعات پڑھی ہوں گی۔ امام طحاویؒ کا خیال یہ ہے کہ حضور ﷺ فرض نماز کو اس کے وقت میں دو مرتبہ پڑھ سکتے تھے۔ واللہ اعلم۔

(رواہ فی شرح السنۃ) میرک فرماتے ہیں کہ نسائی نے اسی طرح مختصراً روایت کیا ہے اور امام ابوداؤد اور نسائی نے بھی اسے

ابوبکرہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔

الفصل الثّالث:

صلوٰۃِ خوف کا ایک اور طریقہ

۱۴۲۵: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَزَلَ بَيْنَ ضَجْنَانَ وَعَسْفَانَ فَقَالَ الْمُشْرِكُوْنَ لِهٰؤُلَآءِ صَلَاةٌ هِيَ اَحَبُّ اِلَيْهِمْ مِنْ اٰبَاۗءِ هِمْ وَهِيَ الْعَصْرُ فَاَجْمِعُوْا اَمْرَكُمْ فَتَمِيْلُوْا عَلَيْهِمْ مَيْلَةً وَاحِدَةً وَاَنَّ جِبْرِيْلَ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَمَرَهٗ اَنْ يُّقَسِّمَ اَصْحَابَهٗ شَطْرَيْنِ فَيُصَلِّيْ بِهِمْ وَتَقُوْمُ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى وَرَآءَ هُمْ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ فَتَكُوْنَ لَهُمْ رَكْعَةٌ وَلِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَكْعَتَانِ۔ (رواه الترمذی والنسائی)

أخرجه النسائی فی السنن ۳/۱۷۶ حديث رقم ۱۵۴۹۔ وأحمد فی المسند ۳/۳۷۴۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ جہاد کیلئے ضجنان اور عسفان کے درمیان اُترے تو مشرک کہنے لگے کہ ان مسلمانوں کی ایک نماز ہے جو ان کو اپنے آباء سے زیادہ محبوب ہے وہ عصر کی نماز ہے لہٰذا تم پختہ ارادہ کرلو اور ان پر یکبارگی حملہ کردو (یعنی جب نماز میں مشغول ہوں) اسی وقت جبرائیل علیہ السلام آپ کے پاس آئے اور آپ ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو دو حصوں میں تقسیم کریں اور ان کو نماز پڑھائیں (یعنی ایک حصہ کو) اور دوسرا حصہ ان کے پیچھے کھڑا ہو جائے (دشمن کی رکھوالی کیلئے) اور چاہیے کہ وہ اپنا بچاؤ اور اپنا اسلحہ ساتھ رکھے، پس ان کی ایک ایک رکعت ہو جاتی تھی اور آنحضرت ﷺ کی دو رکعتیں۔ (ترمذی، نسائی)

تشریح: (نزل بين ضجنان) بالضاد المعجمة والجيم والنون۔ یہ حرمین کے کسی جگہ یا پہاڑ کا نام ہے۔ ابن حجرؒ نے اسے عسفان کے قریب کسی پہاڑ یا جگہ کا نام قرار دیا ہے۔

مغنی کے مطابق یہ مکہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔

قاموس کے مطابق ضجنان مکہ کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے۔

(وعسفان) یہ مکہ سے دو مرحلوں کے فاصلہ پر ایک جگہ کا نام ہے۔ نہایہ کے مطابق حرمین کے درمیان کسی جگہ کا نام ہے۔ قاموس کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ضجنان منصرف اور عسفان غیر منصرف ہے۔ تصحیح شدہ نسخوں سے ان دونوں کا غیر منصرف ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ابن اہمام نے ''وحاصر المشركين'' کا اضافہ کیا ہے۔

(وهی العصر) کیونکہ قرآن مجید کی اس آیت میں نماز عصر کی پابندی کا حکم ملتا ہے:

''حافظوا على الصلوات والصلوة الوسطى''

''نمازوں کی حفاظت کرو اور بالخصوص درمیانی نماز (یعنی عصر کی نماز) کی''۔

(فتميلوا) یہ جواب امر ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔

(عليهم ميلة واحدة) قرآن مجید کی اس آیت میں بھی یہی بیان ہے:

''ودّ الذين كفروا لو تغفلون عن أسلحتكم رأمتعتكم فيميلون عليكم ميلة واحدةً''

(وأن جبرئيل أتى النبیﷺ) یہ ''فقال المشركون'' سے حال ہے جیسے ''جاء زيد والشمس طالعة''۔

(فيصلى بهم وتقوم طائفة أخرى وراء هم) ابن حجرؒ کا خیال یہ ہے کہ دونوں جماعتیں ابتداء سے ہی امام کے ساتھ تکبیر تحریمہ کہیں گی۔

ظاہر یہ ہے کہ دوسری جماعت پہلی جماعت کے فارغ ہونے تک کھڑی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''ولتات طائفة أخرى لم يصلوا فليصلوا امعك''۔

(وليأخذوا حذرهم وأسلتهم) ابن حجرؒ نے اس کی تفسیر پہرے داروں سے کی ہے حالانکہ راجح یہ ہے کہ اس سے مراد نماز میں شامل لوگ ہیں کیونکہ یہ بات گزر گئی کہ ہر رکعت میں ایک جماعت پہرہ دے گی۔

اس مقام پر غور کیجئے کہ حذر کو جس سے مراد ہوشیاری اور بیدار مغزی ہے، ایک جنگی آلہ قرار دیا گیا اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ مجاہد کو بیداری مغزی اور چالاکی کے ساتھ جنگ لڑنی چاہیے۔

(فتكون لهم ركعة ولرسول اللهﷺ ركعتان) اى كاملتان تابعة فيهما الطائفتان۔ ایک اور دو رکعات کا ذکر بیان واقع کیلئے ہے پس یہ اس حدیث کے منافی نہیں جس میں رسول اللہ ﷺ کی چار رکعات کا ذکر ہے اور لوگوں کی دو رکعات کا کیونکہ یہ دونوں واقعات محذوف ہیں۔ ہمارے امام نے باب کی پہلی اور آخری حدیث کو کتاب اللہ کے ظاہر سے موافقت کی بنا پر ترجیح دی ہے۔

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔ نیز ابو عیاش زرقی کی روایت میں اس سے مختلف الفاظ آئے ہیں۔

بَابُ صَلٰوةِ الْعِيْدَيْنِ

عیدین کی نماز

عیدین سے مراد عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہیں۔ یہ عود سے مشتق ہیں جس کا معنی ہے لوٹنا۔ یہ ہر سال لوٹ آتی ہیں۔ اس لئے اسے عید کہا جاتا ہے۔ ازھار میں لکھا ہے کہ ہر وہ اجتماع جو سرور کیلئے وہ عربوں کے نزدیک عید ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر رحمت ومغفرت کے ساتھ غور فرماتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے ''ليس العيد لمن لبس الجديد انما العيد لمن أمن الوعيد'' عید اس کی نہیں جس نے نیا کپڑا پہن لیا بلکہ عید تو اس کی ہے جو وعید سے بچ گیا ہے۔ اس کی جمع اَعیاد آتی ہے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ عید کی نماز امام شافعیؒ اور جمہور علماء کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ ابو سعید اصطخری (جو کہ ایک

شافعی عالم ہیں) نے اسے فرض کفایہ قرار دیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے واجب قرار دیا ہے۔ اس کے وجوب کی وجہ نبی کریم ﷺ کی اس پر مواظبت بغیر ترک ہے۔ ہدایہ میں یہی مذکور ہے اس کی تائید ابن حبان وغیرہ کی اس بات سے ہوتی ہے کہ عیدالفطر نبی کریم ﷺ نے پہلی مرتبہ سن ۲ ہجری میں پڑھی تھی پھر وفات تک اس پر ہمیشگی اختیار فرمائی۔

عید لفظ عود سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بار بار آنا اور عید کو بھی عید اس لئے کہتے ہیں کہ یہ بھی بار بار ہر سال آتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ عید کو عید اس لئے کہتے ہیں کہ یہ مشتق ہے عود سے، اور اللہ تعالیٰ اس دن اپنے بندوں کی طرف عود کرتا ہے یعنی اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس شخص کی عید نہیں جو نئے کپڑے پہنے، خوشبو لگائے، اور زینت اور آرائش اختیار کرے اور سواریوں پر سوار ہو۔ بلکہ عید تو اس کی ہے کہ جو اپنے رب کی رحمت کا مستحق ہو جائے اور اپنے گناہوں سے توبہ کر کے خاصان خداوندی کے حلقہ میں داخل ہو جائے اور اپنی آخرت کو سنوار لے۔

مسلمانوں کی دو عیدیں ہیں: عیدالفطر، یہ شوال کی پہلی تاریخ کو ہوتی ہے۔ عیدالاضحیٰ، یہ ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو ہوتی ہے۔ اور ان دونوں کے مجموعہ کو عیدین کہتے ہیں اور ان دونوں عیدوں میں بطور شکر کے دو دو رکعات نماز پڑھی جاتی ہے جس کو صلوٰۃ عیدین کہتے ہیں۔

حکم نماز عید:

آیا عید واجب ہے یا سنت اس میں اختلاف ہے اور دو مذہب ہیں:

مذہب اول: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نماز عیدین واجب ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے مواظبت اور ہمیشگی کے ساتھ نماز عیدین پڑھی ہے۔

مذہب ثانی: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نماز عیدین سنت مؤکدہ ہے۔

الفصل الاول:

نماز عیدین عیدگاہ میں پڑھنا مسنون ہے

۱۴۲۶: عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَالْاَضْحٰى اِلَى الْمُصَلّٰى فَاَوَّلُ شَیْءٍ يَبْدَاُبِهِ الصَّلَاةُ ثُمَّ يَنْصَرِفُ فَيَقُوْمُ مُقَابِلَ النَّاسِ وَالنَّاسُ جُلُوْسٌ عَلٰى صُفُوْفِهِمْ فَيَعِظُهُمْ وَيُوْصِيْهِمْ وَيَاْمُرُهُمْ وَاِنْ كَانَ يُرِيْدُاَنْ يَّقْطَعَ بَعْثًا قَطَعَهٗ اَوْيَاْمُرُهُمْ بِشَیْءٍ اَمَرَبِهٖ ثُمَّ يَنْصَرِفُ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۴۴۸/۲۔ حدیث رقم ۹۵۶۔ ومسلم فی صحیحه ۶۰۵/۲ حدیث رقم (۹ /۸۸۹)۔ والنسائی فی السنن ۱۸۷/۳ حدیث رقم ۱۵۷۶۔ وابن ماجه ۴۰۹/۱۔ حدیث رقم ۱۲۸۸۔ وأحمد فی المسند ۳۶/۳۔

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے دن عیدگاہ کی طرف جاتے۔ تو سب سے پہلے وہاں نماز کے ساتھ ابتداء کرتے۔ پھر جب نماز سے فارغ ہوتے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کھڑے ہو جاتے اور لوگ اپنی صفوں میں بیٹھے ہوتے تھے، آپ ﷺ ان کو وعظ اور وصیت کرتے اور ان کو کوئی حکم ارشاد فرماتے۔ اور اگر کوئی لشکر بھیجنے کا ارادہ ہوتا تو اس کو بھیجتے یا لوگوں کے معاملات میں کوئی حکم دینا ہوتا تو حکم صادر فرماتے۔ اور پھر گھر واپس آ جاتے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: (یخرج یوم الفطر و الأضحی الی المصلی) اس سے مراد مدینہ سے شہر سے باہر کی عیدگاہ مراد ہے یہ اب ایک مشہور جگہ ہے اور تبرک کے نام سے معروف ہے۔

صاحب شرح السنۃ فرماتے ہیں کہ سنت یہ کہ امام عید کی نماز کیلئے شہر کی مسجد کی طرف نکلے۔ البتہ اگر کوئی عذر ہو تو اس کی گنجائش ہے۔

ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ امام آبادی سے باہر جا کر نماز پڑھائے اور شہر میں کسی ایسے شخص کو اپنا نائب کر جائے جو ضعفاء کو نمازِ عید پڑھائے کیونکہ عید کی نماز بالاتفاق دو جگہوں پر جائز ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ سارا کلام مسجد مکہ اور بیت المقدس کے علاوہ مساجد کیلئے ہے کیونکہ عیدین کی نماز ان میں دوسرے تمام مقامات سے افضل ہے اس میں سلف وخلف کی اتباع بھی ہے نیز یہ کہ ان کو مقام شرافت بھی حاصل ہے۔

(فاوّل شیء یبدأ به الصلاۃ) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ''یبدأ به الصلاۃ'' صفت مؤکدہ ہے۔ ''فاوّل شیء'' کیلئے۔ اول شیءٍ اگر مخصص ہو تو یہ خبر بنے گا کیونکہ الصلاۃ اس سے زیادہ معروف ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔

''ان خیر من استاجرت القوی الامین'' (القصص:)

پس خبر کی تقدیم اختصاص پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت ابو سعیدؓ کا یہ قول بنو امیہ کے حکمران مروان بن حکم پر تعریض ہے جو خطبہ کو نماز پر مقدم کرتا تھا۔

(ثم ینصرف) اس سے انصراف عن الصلاۃ مراد ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں ''من صلاہ الی المنبر'' ان کا یہ قول غفلت کی نشانی ہے کیونکہ وہاں منبر تھا ہی نہیں۔

(مقابل الناس) یہ حال ہے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ عیدگاہ میں زمین پر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھنا منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھنے سے بہتر ہے۔ مسجد اور عیدگاہ میں فرق یہ ہے کہ عیدگاہ کھلی جگہ میں ہوتی ہے اور حاضرین میں سے ہر ایک آسانی سے امام کو دیکھ سکتا ہے جبکہ مسجد میں جگہ بند ہوتی ہے اور بعض لوگ امام کو دیکھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے عید کی نماز کیلئے منبر نہ بنوایا تھا جبکہ جمعہ کی نماز کیلئے منبر بنوایا گیا تھا کیونکہ ہر جمعہ کو منبر کی ضرورت تھی جبکہ عید کی حالت تو حالت نادرہ ہے۔ جب مسلمان زیادہ ہو گئے تو منبر کو اختیار کر لیا کیونکہ منبر کے ذریعہ زیادہ ظاہر اور فائدہ مند ہوتی ہے۔ پس یہ بدعت ہے اگر واضع کی نیت سیئہ تھی۔ واللہ اعلم۔

(والناس جلوس علی صفوفهم) یعنی نماز والی حالت پر حضور ﷺ کی طرف رخ کر کے بیٹھے تھے۔

(میعظھم) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بشارت ونذارت کے ذریعے دنیا سے بے رغبتی آخرت کی رغبت کی تلقین فرمارہے تھے۔ ثواب وعقاب کا بیان فرمارہے تھے تاکہ وہ دنیا کی زندگی میں گھر کر طاعت سے غافل نہ ہوجائیں۔اور معصیت میں نہ پڑ جائے جیسا کہ اس زمانے کے اکثر لوگوں کی شان ہے۔

(ویوصیھم) بالتخفیف والتشدید۔یعنی انہیں تقویٰ کی وصیت کررہے تھے جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

''ولقدو صینا الذین اوتوا الکتاب من قبلکم وایاکم ان اتقوا اللّٰہ''

یہ کلمہ انتہائی جامع اور تمام مراتب کمال کو شامل ہے اس کا ادنی درجہ شرک سے بچنا، درمیان درجہ اوامر کو پورا کرنا اور زواجر سے بچنا اور اعلیٰ درجہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ کے غیر سے بے نیاز ہوجانا۔

(یامرھم) اختصار کے ساتھ یامرھم کو ذکر کیا گیا و گرنہ امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر بھی ہوتی تھی۔مراد یہ ہے کہ عیدالفطر کے دن اس کے احکام اور عیدالاضحیٰ کے دن قربانی کے احکام بتاتے تھے۔

علامہ طیبیؒ نے ان تینوں جملوں کی یہ تشریح کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈراتے تاکہ وہ اس کی نافرمانی سے بچیں۔لوگوں کے حق میں وصیت کرتے تاکہ ان سے خیرخواہی کا معاملہ کریں اور انہیں حلال کا حکم دیتے اور حرام سے منع کرتے۔

(أو یامر) یہ منصوب ہے، اصل عبارت ہوگی۔''وان کان یرید أن یامر''۔

عیدین کی نماز کیلئے اذان واقامت مسنون نہیں

۱۴۲۷: وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ صَلَّیْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الْعِیْدَیْنِ غَیْرَ مَرَّةٍ وَّلَا مَرَّتَیْنِ بِغَیْرِ اَذَانٍ وَّلَا اِقَامَةٍ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۲/۶۰۴ حدیث رقم ۸۸۷/۷۔ وأبوداوٗد فی السنن ۱/۶۸۰ حدیث رقم ۱۱۴۸۔

ترجمہ: حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک دو مرتبہ نہیں کئی مرتبہ عیدین کی نماز پڑھی، بغیر اذان واقامت کے۔(مسلم)

تشریح: (غیر مرة ولا مرتین) یہ حال ہے ای کثیرًا۔

(بغیر اذان ولا اقامة) عید کے اذان واقامت نہ ہوتی تھی بلکہ یہ اعلان کیا جاتا تھا ''الصلاة جامعة'' (نماز کھڑی ہوگئی ہے) لوگ یہ اعلان سن کر مسجد میں آجاتے۔یہ اعلان کرنا مستحب ہے۔

شرح السنہ میں لکھا ہے کہ اکثر صحابہ کرام کا مسلک یہ ہے عید اور تمام نوافل کیلئے نہ اذان ہے نہ اقامت۔صاحب ازہار نے اسے مکروہ کہا ہے اور یہ بھی کہا کہ کسی حکمران کے عہد میں اذان شروع کرنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

عیدین کا خطبہ نماز کے بعد پڑھنا چاہیے

۱۴۲۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبُوْبَكْرٍ وَّعُمَرَ يُصَلُّوْنَ الْعِيْدَيْنِ قَبْلَ الْخُطْبَةِ ۔

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۴۵۳۔ حدیث رقم ۹۶۳۔ ومسلم فی صحیحه ۲/۶۰۴ حدیث رقم (۸/۸۸۸) والنسائی فی السنن ۳/۱۸۳ حدیث رقم ۱۵۶٤۔ وابن ماجه ۱/۴۰۷ حدیث رقم ۱۲۷۶۹ ومالك فی الموطأ ۱/۱۷۸ حدیث رقم ۳ من کتاب العیدین۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نماز عیدین خطبہ سے پہلے پڑھتے تھے۔

تشریح: نبی کریم ﷺ کے ساتھ شیخین کا ذکر یہ بتانے کیلئے کہ یہ سنت ثابت اور معمول بہا ہے۔ اور کسی نے شیخین کو اس سے منع بھی نہیں کیا حالانکہ یہ دونوں حضرات بہت سے اکابر صحابہ کی موجودگی میں ایسا کرتے تھے۔ واضح رہے کہ ابن عمر ؓ نے حضور ﷺ کے ساتھ شیخین کا ذکر اشراک فی التشریع کیلئے نہیں کیا اس کا گمان کرنا بھی غلط ہے۔

حضرت ابن عمر ؓ کا حضرت عثمانؓ کے بارے خاموشی اختیار کرنا اس بات کی طرف دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے خطبہ کو نماز سے مقدم کیا تھا۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ مروان بن حکم کا مدینہ کی گورنری کے دوران خطبہ کو نماز سے مقدم کرنا حضرت معاویہؓ کے ایماء پر تھا۔ اور صحابہ کرامؓ نے اس کا سختی سے انکار کیا تھا۔ باقی رہا حضرت عثمانؓ کا فعل تو اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ بیان جواز پر محمول ہوگا نہ کہ مداومت پر جیسا کہ مروان کا فعل جو اسی عمل کو سنت سمجھتا تھا۔ اور اسے مضبوطی سے اپنائے ہوئے تھا۔

ابن المنذر رفرماتے ہیں کہ فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ جمعہ کا خطبہ نماز کے بعد ہے اور اسے مقدم کرنا جائز نہیں البتہ اگر کسی نے ایسا کیا تو نماز صحیح ہو جائے گی۔ مروان نے سنت کو بدلا نہیں تھا بلکہ اسے جمعہ پر قیاس کیا جیسا کہ اس سے پہلے حضرت عثمان بھی یہ قیاس کر چکے تھے۔ جیسا کہ امام مالک فرماتے ہیں اور حضرت معاویہ بھی یہ قیاس کر چکے ہیں۔ جیسا کہ زہری کا کہنا ہے۔ عبدالرزاق نے اپنے مصنف میں دونوں کے فعل کو ذکر کیا۔ حضرت عثمان کے فعل کی روایت کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ یہ کسی مخصوص سال پر محمول ہوگی۔

صاحب ازھار لکھتے ہیں کہ جمعہ اور عید میں خطبہ کی تقدیم و تاخیر سے مقصود ان دونوں میں فرق کرنا ہے کہ جمعہ فرض اور عید نفل ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جمعہ کا خطبہ صحت نماز کی شرط ہے۔ لہٰذا شروط کی تکمیل کیلئے اسے مقدم کیا گیا بخلاف عید کی نماز کے کہ اس میں خطبہ صحت صلوۃ کی شرط نہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ عید کا وقت جمعہ کے وقت سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور وقت بعض مرتبہ کم پڑ جاتا ہے۔ اس لئے خطبہ مقدم کیا گیا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ جمعہ میں خطبوں کی تقدیم قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے:

''فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الأرض'' (الجمعۃ:)

عیدین کے موقع پر آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا عورتوں کو رِقت آمیز وعظ

۱۴۲۹: وَسُئِلَ ابْنُ عَبَّاسٍ اَشَهِدْتَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعِيْدَ ؟ قَالَ نَعَمْ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى ثُمَّ خَطَبَ وَلَمْ يَذْكُرْ اَذَانًا وَّ لَا اِقَامَةً ثُمَّ اَتَى النِّسَاءَ فَوَعَظَهُنَّ وَذَكَّرَهُنَّ وَاَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ فَرَاَيْتُهُنَّ يَهْوِيْنَ اِلٰى اٰذَانِهِنَّ وَحُلُوْقِهِنَّ يَدْفَعْنَ اِلٰى بِلَالٍ ثُمَّ ارْتَفَعَ هُوَوَبِلَالٌ اِلٰى بَيْتِهٖ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۵۲۳/۲ حدیث رقم ۹۶۱۔ ومسلم فی صحیحه ۶۰۲/۲ حدیث رقم (۲۔ ۸۸۴)۔ وأبوداؤد فی السنن ۶۷۹/۱ حدیث رقم ۱۱۴۶۔ وابن ماجه ۴۰۶/۱ حدیث رقم ۱۲۷۳۔ والدارمی ۴۵۶/۱ حدیث رقم ۱۶۰۳۔ وأحمد فی المسند ۳۹۶/۳۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ عیدین کی نماز میں شریک ہوئے ہیں تو انہوں نے فرمایا، جی ہاں (پھر انہوں نے تفصیل بیان کی) کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم عیدگاہ کی طرف تشریف لے گئے، آپ نے وہاں نماز پڑھائی، پھر خطبہ ارشاد فرمایا۔ راوی کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے اذان واقامت کا ذکر نہیں کیا۔ (راوی فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے فرمایا) پھر آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم عورتوں کے پاس آئے۔ اوران کو نصیحت فرمائی اوران کو دین کے احکامات یاد دلائے۔ اوران کو صدقہ دینے کا حکم فرمایا۔ پس میں نے ان کو دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں کو اپنے گلوں اور کانوں کی طرف لے جاتی تھیں اور گلوں اور کانوں کا زیور اتار کر حضرت بلالؓ کو دے دیتی تھیں۔ پھر آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور حضرت بلال اپنے گھر تشریف لے آئے۔ (بخاری)

تشریح: (أشهدت) مصابیح میں حرف استفہام نہیں ہے۔

(فيصلی ثم خطب) ابن الہمام کہتے ہیں کہ ابن ماجہ نے حضرت جابر سے نقل کیا وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم عیدین کے دن عیدگاہ کی طرف نکلتے۔ کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے پھر تھوڑی دیر بیٹھتے پھر کھڑے ہو جاتے۔

امام نوویؒ خلاصہ میں فرماتے ہیں کہ ابن مسعودؓ کا یہ جو قول نقل کیا گیا ہے کہ عید کے دونوں خطبوں کے درمیان تھوڑی دیر بیٹھ کر فصل کرنا سنت ہے۔ یہ قول ضعیف ہے اور غیر متصل ہے عید کے خطبوں کے تکرار کے بارے میں کوئی ثابت شدہ روایت نہیں بلکہ راجح یہ ہے کہ اسے جمعہ کے خطبہ پر قیاس کر کے ایسا کرتے ہیں۔

(ولم يذكر أذانا ولا اقامة) یعنی حضرت ابن عباسؓ نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نماز کی کیفیت میں اذان واقامت کا ذکر نہیں کیا۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اذان واقامت کا ذکر نہیں کیا۔ ابن حجرؒ کا بیان کردہ معنی معنوی اعتبار سے بعید اور لفظی اعتبار سے درست ہے۔

(وأمرهن بالصدقة) صدقہ فطر زکوٰۃ یا مطلق صدقہ مراد ہے۔

(فرأيتهن يهوين آذانهن وحلوقهن) یعنی عورتیں اپنے کانوں اور گردنوں کے زیور کی طرف ہاتھ بڑھانے لگیں۔

(يدفعن الى بلال) اور وہ زیور حضرت بلال کے کپڑے میں ڈالنے لگیں تا کہ وہ اسے فقراء پر صدقہ کر دیں۔

صاحب شرح السنۃ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر عطیہ کر سکتی ہے۔ یہ اکثر فقہاء کا مسلک ہے البتہ امام مالک سے اس کے برخلاف روایت کیا گیا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اس عمل کو حسن معاشرت اور مرد کی دلی خوشی پر محمول کیا جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "عورت خاوند کی اجازت کے بغیر کوئی چیز عطیہ نہ کرے" کو اس عورت کے بارے میں تصور کیا جائے گا جو زیادہ سمجھدار نہ ہو۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عورتوں کے پاس آ کر ان کو خطبہ دینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کیلئے باپ کا درجہ رکھتے ہیں اور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے خطیب کو دوسرا خطبہ لازم نہیں ہے۔

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد میں صدقہ کرنا سنت ہے اس لئے جو حضرات اسے مکروہ یا حرام قرار دیتے ہیں ان سے اتفاق نہیں ہوسکتا۔

یہ استدلال محل نظر ہے کیونکہ مذکورہ واقعہ عیدگاہ کا ہے مسجد کا نہیں۔ نیز اس دن کی تخصیص بھی ممکن ہے۔ اور جس نے مسجد میں صدقہ کو حرام یا مکروہ بتایا ہے اس نے اسے مانگنے والے لوگوں کے درمیان سے گزرنے والے اور اللہ کے ذکر سے غافل کرنے والے کے ساتھ خاص کیا ہے۔ وگرنہ مسجد میں رہنے والے فقراء کو دینے کے جواز بلکہ اس کے استحباب میں بھی کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

(وبلال الى بيته) یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بعض نے حضرت بلال کا گھر مراد لیا ہے جو درست نہیں۔

عیدگاہ میں نماز نفل پڑھنا ناجائز ہے

۱۴۳۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى يَوْمَ الْفِطْرِ رَكْعَتَيْنِ لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهُمَا وَلَابَعْدَهُمَا ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٤٥٣۔ حديث رقم ٩٦٤۔ ومسلم في صحيحه ٢/٦٠٦ حديث رقم(١٣۔ ٨٨٤)۔ وأبوداوٗد في السنن ١/٦٨٥ حديث رقم ١١٥٩۔ والترمذي ٢/٤١٧ حديث رقم ٥٣٧۔ والنسائي ٣/١٩٣ حديث رقم ١٥٧٨۔ وابن ماجه ١/٤١٠ حديث رقم ١٢٩١۔ وأحمد في المسند ١/٢٨٠۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الفطر کے دن نماز عید کی دو رکعتیں پڑھی، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو رکعتوں سے پہلے اور ان کے بعد کوئی رکعت نہیں پڑھی۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوسعیدؓ کی روایت کی بنا پر یہ نفی عیدگاہ کے ساتھ خاص ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عید سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھتے ~~تھے جب~~ گھر لوٹ آتے تو دو رکعات پڑھا کرتے تھے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ لوگوں کیلئے عید کی نماز سے پہلے یا اس کے بعد نفل پڑھنا مکروہ نہیں ہے کیونکہ بیہقی نے حضرت انسؓ کا یہی فعل نقل کیا ہے۔ البتہ ممنوع وقت سے اجتناب کیا جائے البتہ امام کے خطبہ کے دوران نفل پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے کہ اس کی وجہ سے امام سے اعراض ہو جاتا ہے۔ امام مالک اور امام احمد کا مسلک یہ ہے عید کی نماز سے پہلے اور بعد میں نوافل نہیں پڑھ سکتا، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعد میں پڑھ سکتا ہے پہلے نہیں پڑھ سکتا۔

عورتیں اگر عیدگاہ میں جائیں تو انتہائی پردے کے ساتھ جائیں

۱۴۳۱: وَعَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ أُمِرْنَا أَنْ نُخْرِجَ الْحُيَّضَ يَوْمَ الْعِيْدَيْنِ وَذَوَاتِ الْخُدُوْرِ فَيَشْهَدْنَ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَدَعْوَتَهُمْ وَتَعْتَزِلُ الْحُيَّضُ عَنْ مُصَلاَّهُنَّ قَالَتْ اِمْرَأَةٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِحْدَانَا لَيْسَ لَهَا جِلْبَابٌ قَالَ لِتُلْبِسْهَا صَاحِبَتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٦٣/٢۔ حديث رقم ٩٧٤۔ ومسلم في صحيحه ٦٠٦/٢ حديث رقم (١٢۔ ٨٨٣)۔ وأبوداوٗد في السنن ٦٧٥/١ حديث رقم ١١٣٦۔ والترمذي ٤١٩/٢ حديث رقم ٥٣٩۔ والنسائي ١٨٠/٣ حديث رقم ١٥٥٨۔ والدارمي ٤٥٨/١ حديث رقم ١٦٠٩ وأحمد في المسند ٨٤/٥۔

ترجمہ: حضرت ام عطیہ فرماتی ہیں کہ ہمیں حکم دیا گیا تھا کہ ہم ان عورتوں کو بھی عیدین کیلئے نکالیں جو حیض کی حالت میں ہیں اور ان عورتوں کو بھی جو پردہ نشین ہیں، تاکہ یہ عورتیں مسلمانوں کی جماعت اور ان کی دعا میں حاضر ہوں۔ اور حیض والی عورتیں نماز پڑھنے کی جگہ سے الگ رہیں گی۔ تو ایک عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ اگر ہم میں سے ایک ایسی ہو کہ اس کے پاس چادر نہ ہو تو وہ کیا کرے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چاہئے کہ اس کو اس کے ساتھ والی عورت چادر پہنا دے۔ (بخاری، مسلم)

راویٔ حدیث:

ام عطیہ۔ ان کا نام ''نسیبہ'' ہے۔ کعب کی بیٹی ہیں۔ بعض کے نزدیک ''حارث'' کی صاحبزادی ہیں۔ انصار میں سے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت ہوئیں۔ بڑی بڑی صحابیات کی ایک جماعت ان سے حدیث کی روایت کرتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اکثر و بیشتر غزوات میں شریک رہیں۔ اور مریضوں کا علاج معالجہ اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔

''نسیبہ'' میں نون پر ضمہ، سین مہملہ اور باموحدہ پر فتحہ ہے۔

تشریح: (أن نخرج الحيض) مفعولیت کی بنا پر منصوب ہے، یہ بضم الحاء وتشدید الیاء المفتوحۃ حائض کی جمع ہے۔ اس سے مراد بالغ لڑکیاں یا حائضہ عورتیں ہیں۔

(یوم العیدین) امام مالکؒ فرماتے ہیں اس میں لفظ یوم مفرد اور العیدین کی طرف مضاف ہے یہ تثنیہ کے معنی میں ہے جیسے ''مسح أذنيه ظاهرهما و باطنهما''۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس حدیث کو اصل کے مطابق لفظ تثنیہ کے ساتھ بھی روایت کیا جائے تو جائز ہے جیسے یومی

العیدین اوریوم العید۔

(ذوات الخدور) یہ ''الحیض'' پر عطف ہے۔تقدیری عبارت یہ ہوگی ''أمرنا أن نخرج منا الحیض و ذوات الخدور'' یہ دونوں نیابتِ فاعل کی بنا پر مرفوع ہیں۔ایک روایت ذوات الخدور کی جگہ العوائق کا لفظ ہے۔ یہ عائق کی جمع ہے جس کا معنی ہے بالغ۔

(و تعتزل)ایک روایت میں ''یعتزلن ''لغت شاذہ میں اثبات نون کے ساتھ ہے۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے تمام عورتوں کوعید کے دن عید گاہ میں آنے کا حکم ارشادفرمایا تا کہ جس عورت کا کوئی عذر نہیں وہ نماز پڑھے اور جو نماز سے معذور ہے وہ دعاء کی برکت حاصل کر لے۔اس میں لوگوں کو نمازوں میں حاضری، مجالس ذکر میں شمولیت اور صلحاء کی قربت کی ترغیب دینا مقصود ہے۔البتہ ظہور نساء کی بنا پر ہمارے زمانے میں عورتوں کا عید گاہ میں آنا مستحب نہیں ہے۔

صاحب شرح السنۃؒ فرماتے ہیں کہ عیدین کی نماز میں عورتوں کی حاضری کے بارے میں اختلاف ہے بعض علماء نے اس کی رخصت دی ہے بعض نے اسے مکروہ قرار دیا۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ کراہت کی دلیل حضرت عائشہؓ کا یہ قول ہے ''اگر حضور ﷺ کو علم ہوتا کہ عورتیں حضور ﷺ کے بعد کیا کریں گی تو آپ انہیں مساجد سے منع کر دیتے''۔

ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ عید کیلئے بوڑھی عورتیں جائیں گی جوان عورتیں نہ جائیں۔

یہ قول بہت بہتر ہے لیکن اس کی بھی کچھ شرائط ہیں۔ یہ کہ وہ عام کپڑوں میں جائیں نمایاں ہونے کی کوشش نہ کریں۔ مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو اور عورتیں زیورات ، اعلٰی کپڑوں خوشبوؤں وغیرہ سے اجتناب کریں۔اسی طرح کے بہت سے مفاسد جو ہمارے زمانے میں وجود میں آگئے ہیں ان سب سے اجتناب کریں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گھروں میں رہنے والی عورتیں عید کی نماز کیلئے نہ جائیں۔

امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کی ابتداء میں مسلمان تھوڑے تھے پس عورتوں کو مسجد میں آنے کا حکم دیا گیا تا کہ کثرت نظر آئے اور دشمنوں پر رعب پڑے۔

ان کی مراد یہ ہے کہ سبب زوال سبب سے زائل ہو جاتا ہے اسی وجہ سے مؤلفۃ القلوب کو زکوۃ کے مصرف سے نکال دیا گیا ہے ان کی یہ مراد نہیں کہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ابن حجرؒ نسخ کے قائل ہیں جو کہ درست قول نہیں۔ کیونکہ اس کیلئے محض احتمال کافی نہیں کیونکہ نسخ کے دعوی کے ناسخ اور اس کے منسوخ سے مؤخر ہونے کی معرفت کی تحقیق ضروری ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حائضہ عورت اللہ کے ذکر اور خیر کی جگہوں کو بالکل نہ چھوڑے۔نیز بچوں کو لے جانا بھی مستحب ہے۔ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے گھر میں سے جس کو عید گاہ میں لے جانے کی طاقت رکھتے اس ساتھ لے جاتے تھے۔

(لیس لھا جلباب) بکسر الجیم ~~بمعنی پلیس~~ علامہ جزریؒ فرماتے ہیں کہ جلباب سے مراد ازار ہے۔الاسامی نے بھی

اسے چادر کے معنی میں لیا ہے۔

(لتلبسها) یہ "الالباس" سے امر ہے جو ندب کیلئے ہے۔

(صاحبتها) یہ فاعلیت کی بناء پر مرفوع ہے۔

(من جلبابها) ایک قول یہ ہے کہ اس سے جنس مراد ہے یعنی جو کپڑے اس کیلئے زائد ہوں انہیں کسی کو عاریۃً دے دے۔ ایک قول یہ ہے جو کپڑے خود پہنتی ہیں ان میں اپنی ساتھ خاتون کو شریک کرلے۔ البتہ راجح یہ ہے کہ یہاں مبالغہ مقصود ہے یعنی عورتیں عید کیلئے ضرور جائیں خواہ ایک چادر میں دو ہی کیوں نہ نکلیں۔

۱۴۳۲: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ اَبَابَكْرٍ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا جَارِيَتَانِ فِيْ اَيَّامِ مِنٰى تُدَفِّفَانِ وَتَضْرِبَانِ وَفِي رواية تُغَنِّيَانِ بِمَا تَقَاوَلَتِ الْاَنْصَارُ يَوْمَ بُعَاثَ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَغَشٍّ بِثَوْبٍ بِهٖ فَانْتَهَرَهُمَا اَبُوْبَكْرٍ فَكَشَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ وَجْهِهٖ فَقَالَ دَعْهُمَا يَا اَبَابَكْرٍ فَاِنَّهَا اَيَّامُ عِيْدٍ وَفِيْ رواية يَا اَبَابَكْرٍ اِنَّ لِكُلِّ قَوْمٍ عِيْدًا وَهٰذَا عِيْدُنَا۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٤٤٥۔ حديث رقم ٩٥٢۔ ومسلم في صحيحه ١/٦٠٧ حديث رقم (١٦۔ ٨٩٢)۔ والنسائي في السنن ٣/١٩٥ حديث رقم ١٥٩٧۔ وابن ماجه ١/٦٠٧۔

ترجمہ: حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کے ہاں تشریف لائے اس حال میں کہ ان کے ہاں انصار کی دولڑکیاں ایام منیٰ میں یعنی ایام تشریق میں دف بجا رہی تھیں۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ اشعار گا رہی تھی، جو کہ انصار نے جنگ بعاث کے متعلق کہے تھے۔ اور آنحضرت ﷺ اپنے چہرے کو کپڑے سے ڈھانپ کر لیٹے ہوئے تھے، تو حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں لڑکیوں کو جھڑکا تو آنحضرت ﷺ نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا ابوبکر انہیں چھوڑ دو کیونکہ یہ عید وخوشی کا دن ہے اور ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں اور کہ ابوبکر ہر قوم کی عید کے دن ہوتے ہیں اور یہ ہماری عید ہے۔ (بخاری)

تشریح: قالت ان أبابكرٍ دخل عليها) ابوبکر کی تعبیر کے بارے میں احتمال یہ ہے کہ یہ راوی کے تصرفات میں سے ہے کیونکہ معانی کو نقل کرنا بھی جائز ہے۔

(وعندها جاريتان) اس کے معنی میں دو قول ہیں: ① دو چھوٹی لڑکیاں۔ ② دو باندیاں۔ ان میں سے ایک کا نام "حمامہ" تھا۔

(في أيام منى) اس کے منصرف وغیر منصرف ہونے کے بارے میں دونوں قول ہیں اس سے مراد ایام النحر اور ایام التشریق ہیں۔

(تدففان) بالتشدید یعنی وہ دف بجا رہی تھیں۔

(وتضربان) یہ عطف تفسیری ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ الفاظ کا تکرار زیارتِ شرح کیلئے ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ناچتے ہوئے

پاؤں زمین پر مارتی تھیں۔

ایک قول یہ ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ پر مارتی تھیں۔

(**وفی روایة تغنیان**) یہ ماقبل سے بدل یا اس پر زیادتی ہے پس یہ حال ہوگا کہ وہ اونچی آواز سے گنگنا کر اشعار پڑھتی تھیں۔ بخاری کی روایت میں ہے کہ وہ گانا گانے والی نہیں تھیں۔ یعنی وہ اچھی طرح گانا نہیں گا سکتی تھیں اور انہوں نے اسے سیکھا بھی نہ تھا۔ یا یہ معنی ہے کہ وہ گانا گانے والی عورتوں کی طرح فتنہ انگیز نہ تھیں۔ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ ''**الغناء رقیة الزنا**''۔ گانا زنا کا رستہ ہے۔

(**بما تقاولت الأنصار**) اس سے مراد وہ اشعار ہیں جن کو انصار کو اوس وخزرج کی لڑائی کے دوران پڑھا کرتے تھے۔

(**یوم بعاث**) **بعضهم الباء**۔ یہ مدینہ سے دو میل کے فاصلے پر ایک جگہ کا نام ہے۔ علامہ عسقلانی کے نزدیک اس کا غیر منصرف ہونا راجح ہے۔

نہایہ کے مطابق یہ اوس کے ایک قلعے کا نام ہے۔ اسی قلعہ کے پاس اوس وخزرج کی ایک خون ریز لڑائی ہوئی تھی۔ ان کی لڑائیاں ایک سو بیس سال تک جاری رہیں اور حضور ﷺ کی آمد کی برکت سے ان کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت کو نازل فرمایا:

''**لو انفقت ما فی الأرض جمیعًا ما ألفت بین قلوبهم ولکن اللّٰه ألف بینهم**''

''اگر تم زمین میں موجود ہر چیز خرچ کر دیتے تو اُن کے دلوں میں محبت پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پیدا کی ہے''۔

اسی طرح ان کے بارے میں فرمایا۔

''**واذکروا نعمة اللّٰه علیکم اذ کنتم أعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا وکنتم علی شفا حفرة من النار فأنقذکم منها**''

''تم اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جب تم دشمن تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم جہنم کے کنارے پر تھے اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس سے بچا لیا''۔

(**فانتهرهما أبوبکر**) یعنی ابوبکرؓ نے انہیں حضور ﷺ کی موجودگی گانا گانے کی وجہ ڈانٹا کیونکہ انہیں اس بات کا علم نہ تھا کہ حضور ﷺ نے انہیں اس تفریح کی اجازت دے رکھی ہے۔

(**فانها أیام عید**) ابن الملک فرماتے ہیں کہ ایام منیٰ یا ایام تشریق کو روزہ نہ رکھنے میں عید کی مشابہت کی بنا پر عید قرار دیا گیا۔ ابن الملک کا یہ قول مرجوح ہے۔ راجح قول ابن حجر کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے کہ یہ خوشی اور فرحت کے دن ہیں۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے عرب کے اس کلام کو گا کر پڑھنے کی اجازت دی ہے جس میں ترنم اور نغمہ پایا جائے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی موجودگی میں اور بعد میں یہ عمل بھی کیا ہے۔ اس قسم کا گانا حرام نہیں ہے۔ حتیٰ کہ گانے کی حرمت

کے قائلین یعنی اہل عراق بھی اسے جائز بتاتے ہیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صالحین کی مجالس لہو سے پاک ہوتی ہیں خواہ اس میں گناہ نہ بھی ہو۔ نیز حضرت ابوبکرؓ کا عمل بتا رہا ہے کہ اگر کسی بڑے کی موجودگی میں اس کی شان کے خلاف کوئی کام ہو رہا ہو تو اس سے منع کر دینا چاہیے۔

(ان لكل قومٍ عيدًا) یعنی ہر قوم کیلئے عید کا دن ہوتا ہے جیسے نیروز کا دن مجوس کی عید ہے۔ ہمارے علماء نے غیر مسلموں کی مشابہت میں ان کی عید کے دن کی تعظیم اور اس دن زیب و زینت اختیار کرنے اور ان کے افعال کرنے کو کفر قرار دیا ہے۔

(و هذا عيدنا) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حضور ﷺ کی جانب سے بیان حکمت ہے کہ عیدین کے دن اہل اسلام کیلئے اظہار سرور کے دن ہیں باقی دنوں میں ایسا نہیں۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ جو اشعار وہ بچیاں پڑھ رہی تھیں وہ جنگ و شجاعت کے اشعار تھے ایک نکتہ نظر سے تو یہ امر دین کی معاونت ہے۔ باقی وہ اشعار جن میں بے حیائی کی باتیں ہوں شریعت میں ان کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ حضور ﷺ کی موجودگی میں ان اشعار کے پڑھنے کا تصور نہیں ہوسکتا۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی اگر دف میں جھنکار نہ ہو تو کبھی کبھار اسے بجانا جائز ہے دوسری بات یہ پتہ چلی کہ ہجو وسب سے خالی اشعار کو گا کر پڑھنا جائز ہے۔

فتاوٰی قاضی خان میں لکھا ہے کہ گانے کا سننا حرام اور معصیت ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے ”گانے کا سننا معصیت ہے۔ اس کی مجلس میں بیٹھنا فسق اور اس سے تلذذ حاصل کرنا کفر کا حصہ ہے“۔ حضور ﷺ کا یہ فرمان تشدید پر محمول ہے۔ اگر اچانک کان میں آواز پڑ جائے تو یہ مکروہ نہیں ہے۔ لیکن اس سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے کیونکہ روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے اس سے بچنے کیلئے انگلیاں کانوں میں دے دی تھیں۔ عربوں کے وہ اشعار جن میں فسق و فجور، شراب اور لڑکوں کا ذکر ہوا نہیں پڑھنا مکروہ ہے۔

عید الفطر کے دن عید سے قبل میٹھی چیز کھانا سنت ہے

۱۴۳۳: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَغْدُوْ يَوْمَ الْفِطْرِ حَتّٰى يَاْكُلَ تَمْرَاتٍ وَيَاْكُلُهُنَّ وِتْرًا ۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/ ٤٤٦۔ حديث رقم ٩٥٣۔ والترمذي في السنن ٢/ ٤٢٧ حديث رقم ٥٤٣۔ وأحمد في المسند ٣/ ١٢٦۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ عید الفطر کے دن کھجوریں تناول کئے بغیر عیدگاہ تشریف نہیں لے جاتے تھے اور طاق عدد میں کھجوریں کھایا کرتے تھے۔ (بخاری)

تشریح: (لا يغدو يوم الفطر حتى ياكل تمرات) اس سے مراد تین سے دس تک لیا جاسکتا ہے۔

(ويأكلهن) بالنصب والرفع۔

(وترًا) یعنی تین، پانچ، سات یا دس۔ علامہ اشرفؒ فرماتے ہیں کہ عید الفطر کے دن کچھ جلدی کھانے پینے میں حکمت یہ ہے کہ رمضان کے فعل سے مخالفت ہو جائے کیونکہ رمضان کے دوران کھانا حرام ہے اور عید کے دن کھانا واجب ہے۔ آپ ﷺ عید الاضحیٰ کے دن نماز سے پہلے کچھ نہ کھاتے تھے کیونکہ اس دن میں مذکورہ معنی موجود نہیں۔

ایک وجہ یہ بھی کہ آپ ﷺ عید الاضحیٰ کے دن سب سے پہلی چیز قربانی کا گوشت کھانا پسند فرماتے تھے۔

(رواہ البخاری) مولف کا قول، رواہ البخاری محل نظر ہے کیونکہ امام بخاری نے ''یاکلھن وترًا'' کے الفاظ کو تعلیقاً ذکر کیا ہے جبکہ مصنف کا انداز بتاتا ہے کہ انہوں نے اسے موصولاً ذکر کیا ہے۔

ممکن ہے کہ مصنف کی طرف سے یہ توجیہ کی جائے گی کہ انہوں نے کتاب کے دیباچہ میں موصولات اور معلقات کی تمیز کا التزام نہیں کیا۔

عید گاہ کی طرف ایک راستے سے جانا دوسرے سے واپس آنا سنت ہے

١٤٣٤: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا كَانَ يَوْمُ عِيْدٍ خَالَفَ الطَّرِيْقَ۔

(رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ٢/٤٧٢۔ حدیث رقم ٩٨٦۔ والترمذی فی السنن ٢/٤٢٤ حدیث رقم ٥٤١۔ وابن ماجه ١/٤١٢ حدیث رقم ١٣٠١۔ والدارمی ١/٤٦٠ حدیث رقم ١٦١٣۔

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عید والے دن راستہ تبدیل فرماتے تھے۔ (بخاری)

تشریح: (کان النبی ...... خالف الطریق) یعنی عید گاہ کی طرف آنے اور واپس جانے کیلئے الگ الگ راستہ اختیار کرتے تھے۔ اس کے سبب کے بارے میں مختلف اقوال ہیں:

1. تاکہ دونوں راستوں کو نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہ کی برکت حاصل ہو جائے۔
2. دونوں راستوں کے لوگ حضور ﷺ سے مسائل پوچھ سکیں۔
3. اللہ کے ذکر کی اشاعت کیلئے۔ ۴۔ کفار کی سازشوں سے حفاظت۔
4. جب دو راستے سامنے ہو تو حضور ﷺ دائیں طرف کے راستہ کو اختیار فرماتے ہیں۔
5. جاتے ہوئے لمبے راستے کو اختیار فرماتے تاکہ زیادہ قدم ہوں اور زیادہ نیکیاں ملیں، واپسی پر مختصر راستے کو اختیار فرماتے تاکہ جلدی منزل تک پہنچ جائیں۔
6. علامہ طیبیؒ اور ابن حجرؒ نے اس سبب کو ذکر کیا ہے لیکن اس سے اتفاق مشکل ہے کیونکہ مسجد کی طرف جانے کیلئے لمبا راستہ اختیار کرنا مقصود بالذات نہیں۔
7. دونوں راستوں کے فقراء پر صدقہ کرنا مقصود ہے۔ ۸۔ دو راستے قیامت کے دن اس کے حق میں گواہی دیں گے۔
8. اپنے رشتہ داروں کی قبور کی زیارت کرنا چاہتے تھے۔ ۱۰۔ منافقین کو اشتعال دلانا مقصود ہے۔

9 تغیر حال سے تفاؤل چاہتے ہیں۔

10 اژدہام سے بچانا چاہتے ہیں۔

11 عدم تکرار طبیعت کیلئے نشاط بخش ہے۔

شہر میں عید کی نماز سے قبل قربانی جائز نہیں

۱۴۳۵: وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ خَطَبَنَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ النَّحْرِ فَقَالَ اِنَّ اَوَّلَ مَانَبْدَأُ بِهٖ فِيْ يَوْمِنَا هٰذَا نُصَلِّيْ ثُمَّ نَرْجِعَ فَنَنْحَرَ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَقَدْ اَصَابَ سُنَّتَنَا وَمَنْ ذَبَحَ قَبْلَ اَنْ نُصَلِّيَ فَاِنَّمَا هُوَ شَاةُ لَحْمٍ عَجَّلَهٗ لِاَهْلِهٖ لَيْسَ مِنَ النُّسُكِ فِيْ شَيْءٍ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۴۵۶/۲۔ حديث رقم ۹۶۸۔ ومسلم في صحيحه ۱۵۵۳/۳ حديث رقم (۱۹۶۱/۷)۔ وأحمد في المسند ۲۸۲/۴۔

ترجمہ: حضرت براءؓ فرماتے ہیں کہ امام الانبیاء نے قربانی والے دن ہمیں خطبہ دیا، فرمایا: اس دن پہلا کام جو ہم کو کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم پہلے نماز پڑھیں پھر واپس گھر آ جائیں اور قربانی کریں جس نے ایسا کیا اس نے ہماری سنت کو پالیا۔ اور جس نے ہمارے نماز پڑھنے سے پہلے ذبح کیا' پس وہ ایک گوشت والی بکری ہے جس کو اس نے اپنے گھر والوں کیلئے جلدی ذبح کر لیا، یہ قربانی بالکل نہیں ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: (قال خطبنا النبی ﷺ یوم النحر) یعنی مدینہ میں۔

(ان أوّل ما نبدأ به في يومنا هذا أن نصلّي) ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ''أن نصلي'' کو انّ کا اسم ہونا چاہیے۔ لیکن ابن حجرؒ کا یہ قول اصول معتمدہ کے خلاف ہے۔

(ثم نرجع فننحر) بالنصب فيهما ويرفعان۔

اس کی تقدیری عبارت ہوگی: ''أن نصلي صلاة العيد المستتبعة للخطبتين''۔

یہ تقدیر لینے کی صورت میں علامہ کرمانی کی اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ اس حدیث میں اس بات پر دلالت موجود ہے۔ کہ خطبہ نماز سے پہلے ہوگا کیونکہ حضور ﷺ کا قول ''اول ما نبدأ به ......'' خطبہ کی تقدیم کو بتا رہا ہے۔ لیکن تامل کے وقت یہ دلالت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ حضور ﷺ نے درحقیقت پہلے نماز پڑھی پھر خطبہ دیا اور خطبہ میں یہ ارشاد فرمایا اور اس میں یہ بتایا کہ نماز کو خطبہ پر مقدم کرنا اور ان دونوں کو ذبح پر مقدم کرنا ہی مشروع طریقہ ہے اس کی مخالفت جائز نہیں۔

(فقد اصاب سنتنا) یعنی ہمارے طریقے اور ہماری شریعت کو پالیا۔

شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ اس حدیث سے قربانی کا وقت بھی معلوم ہوتا ہے۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے۔ کہ یوم النحر کو طلوع فجر سے پہلے قربانی کرنا جائز نہیں ہے۔ ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ قربانی کا وقت تب شروع ہوتا ہے۔ جب سورج ایک نیزے کے بقدر بلند ہو جائے اور اس کے بعد اتنی دیر گزر جاتے کہ دو رکعات اور دو ہلکے خطبے پڑھے جا سکیں۔ اگر اس نے

اس وقت کے بعد ذبح کیا تو جائز ہے خواہ امام نے نماز پڑھا لی ہو یا نہ ہو۔ اور یہ وقت ایام تشریق کے آخری دن غروب شمس تک رہتا ہے۔ امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔ ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ اس وقت ایام التشریق کے دو دن تک رہتا ہے یعنی ایام النحر کے آخری دن تک۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔

اس حدیث سے ان حضرات کے مستدل ہونے میں اشکال ہے کیونکہ اس میں ان کے مسلک کی اصلاً دلالت موجود نہیں ہے اور اسے ائمہ کے متفق علیہ مسئلہ پر محمول کرنے میں کوئی شک نہیں کیونکہ علماء کا اتفاق اس پر ہے۔ کہ اچھی طرح روشنی ہو جانے کے بعد قربانی کی جائے۔

ابن الملک لکھتے ہیں قربانی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک واجب ہے اور اس کا وقت شہری کیلئے عید کی نماز کے بعد شروع ہوتا ہے امام شافعیؒ کے نزدیک یہ سنت ہے اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ یوم النحر کو طلوع فجر سے پہلے قربانی کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض حضرات نے گاؤں والوں کیلئے اس کی رخصت دی ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یوم النحر کے دن فجر سے پہلے کی قربانی کا اعتبار نہیں۔

یہ حدیث اپنے ظاہر کے ساتھ امام شافعیؒ کے خلاف اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ، امام مالک اور امام احمدؒ کے حق میں دلیل ہے۔ کیونکہ ان حضرات کے نزدیک قربانی کی شرط یہ ہے کہ امام نماز پڑھا لے اور خطبہ دے دے۔ اس کی تائید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس صریح ارشاد سے بھی ہوگی: ''ومن ذبح قبل ان نصلی فانما هو شاة لحم علیه واهله ولیس من النسك فی شیء''۔

قربانی کا وقت

۱۴۳۶: وَعَنْ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْبَجَلِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَلْيَذْبَحْ مَكَانَهَا اُخْرٰى وَمَنْ لَّمْ يَذْبَحْ حَتّٰى صَلَّيْنَا فَلْيَذْبَحْ عَلَى اسْمِ اللّٰهِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۹/ ۶۳۰۔ حدیث رقم ۵۵۰۰۔ ومسلم فی صحیحه ۳/ ۱۵۵۱ حدیث رقم (۲۔ ۱۹۶۰)۔ والنسائی ۷/ ۲۱۴ حدیث رقم ۴۳۶۸۔ وابن ماجه ۲/ ۱۰۵۳ حدیث رقم ۳۱۵۲۔

ترجمہ: حضرت جندب ابن عبداللہ بجلی فرماتے ہیں کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے قربانی کا جانور عید کی نماز سے پہلے پہلے ذبح کیا، اسے چاہئے کہ وہ اس کی جگہ پر دوسرا جانور ذبح کرے اور جو شخص نماز پڑھنے تک جانور کو ذبح نہ کرے تو اُسے چاہئے کہ نماز کے بعد اللہ کے نام پر ذبح کر دے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: (وعن جندب) بضمهما وفتح الدال۔

(ابن عبدالله البجلی) قبیلہ بجیلۃ کی طرف نسبت ہے۔

(من ذبح قبل الصلاة فلیذبح مکانها الاخرٰی) کیونکہ پہلی قربانی نسک میں شمار نہ ہوگی۔ یہ حدیث جمہور کے مسلک پر صریح دلیل ہے۔ ابن حجرؒ کا یہ کہنا کہ قبل الصلوۃ سے مراد ''قبل مضی قدر فعل الصلاة والخطبتین'' ہے بالکل

غلط ہے۔

(فلیذبح علی اسم اللّٰہ) قربانی پر اللہ کا نام لینا ہمارے نزدیک واجب اور امام شافعی کے نزدیک مستحب ہے۔

۱۴۳۷: وَعَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَإِنَّمَا يَذْبَحُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ ذَبَحَ بَعْدَ الصَّلَاةِ فَقَدْ تَمَّ نُسُكُهٗ وَأَصَابَ سُنَّةَ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٣ـ حديث رقم ٥٥٤٦ـ ومسلم في صحيحه ١٥٥٢/٣ حديث رقم (٤ـ ١٩٦١)ـ

ترجمہ: حضرت براءؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ فخر کونین ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے نمازِ عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کیا' پس بے شک وہ اس کو اپنے نفس کیلئے (یعنی گوشت کھانے کیلئے) ذبح کرتا ہے اور جس شخص نے قربانی کا جانور عید کی نماز کے بعد ذبح کیا تو البتہ تحقیق اسکی قربانی مکمل ہوگئی اور اس نے مسلمانوں کے طریقے کو پالیا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: اتنی واضح نصوص کے باوجود نہ جانے امام شافعیؒ نے جمہور کے مخالف مسلک کیوں اختیار کیا۔ نہ جانے ان کے پاس ان احادیث کو ظاہر سے پھیرنے کا کیا قرینہ ہے۔ واللہ اعلم۔

گائے' بکری کا ذبح کرنا اور اُونٹ کا نحر مستحب ہے

۱۴۳۸: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَذْبَحُ وَيَنْحَرُ بِالْمُصَلّٰى۔ (رواه البخاري)

أخرجه البخاري في صحيحه ٤٧١/٢ـ حديث رقم ٩٨٢ـ

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر ؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ عیدگاہ میں ذبح اور نحر کرتے تھے۔ (بخاری)

تشریح: (کان رسول اللّٰہ ﷺ یذبح) یعنی گائے کو یا بکری کو ذبح کرتے تھے۔

(وینحر) یعنی اونٹ کو نحر کرتے تھے۔

(بالمصلّٰی) تا کہ قربانی علی الاعلان ہو اور لوگ آپ ﷺ کی اقتداء کریں۔

الفصل الثّانی:

اسلامی تہوار

۱۴۳۹: عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَلَهُمْ يَوْمَانِ يَلْعَبُوْنَ فِيْهِمَا فَقَالَ مَا هٰذَانِ الْيَوْمَانِ قَالُوْا كُنَّا نَلْعَبُ فِيْهِمَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ أَبْدَلَكُمُ اللّٰهُ بِهِمَا خَيْرًا مِّنْهُمَا يَوْمَ الْأَضْحٰى وَيَوْمَ الْفِطْرِ ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ٦٧٥/١ حديث رقم ١١٣٤ـ والنسائي ١٧٩/٣ حديث رقم ١٥٥٦ـ وأحمد في

المسند ٣/١٠٣۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ خاتم الرسل ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ کے ہاں دو دن مقرر تھے ان دونوں میں وہ لہو ولعب کرتے تھے خوشیاں مناتے تھے تو آنحضرت ﷺ نے پوچھا یہ دو دن کیسے ہیں؟ صحابہ کرام نے عرض کی ہم ان دو دنوں میں زمانہ جاہلیت میں کھیلا کرتے تھے تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے بدلے میں تمہارے لئے ان سے بہتر دو دن مقرر فرما دیئے ہیں وہ عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے دن ہیں۔

(ابوداؤد)

تشریح: (قدم النبی ﷺ المدینة ولهم یومان یلعبون فیهما) ان دونوں سے مراد فیروز اور مہرجان ہیں۔ قاموس کے مطابق نیروز سال کے پہلے دن کو کہتے ہیں یہ نوروز کا معرب ہے۔ نوروز مشہور دن ہے۔ یہ وہ پہلا دن ہے جب سورج برج حمل کی طرف تحول کرتا ہے۔ یہ شمسی سال کا پہلا دن ہوتا ہے۔ مہرجان نیروز کے بالمقابل میزان کا پہلا دن ہوتا ہے یہ دونوں آب وہوا کے اعتبار سے معتدل ہوتے ہیں ان میں نہ گرمی ہوتی ہے نہ سردی، دن رات بھی برابر ہوتے ہیں۔ پس اس زمانے کے ماہرین فلکیات نے ان دو دنوں کو عید کا دن قرار دیا اور لوگوں نے ان کی تقلید میں ان دنوں میں عید منانی شروع کی اور جب انبیاء آئے تو حکماء کے اس عقیدے کو ختم کر کے ان کی تشریع کی بنیاد رکھی۔

(أبدلكم الله خيرًا بهما) باء یہاں متروک پر داخل ہے جو زیادہ فصیح ہے۔ خیرًا یہاں اسم تفضیل نہیں ہے۔ کیونکہ خیر ان دونوں دنوں میں نہیں ہے۔

(یوم الأضحی ویوم الفطر) یوم الاضحیٰ کو اس لئے مقدم کیا کہ یہ بڑی عید ہے۔

نبی کریم ﷺ نے نیروز اور مہرجان کے دنوں میں کھیلنے اور خوشی منانے سے منع فرمایا اس میں لطف کی انتہاء اور عبادت کا حکم ہے کیونکہ اصل خوشی تو وہ ہے جو عید کے دن ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”قل بفضل الله وبرحمة فبذلك فليفرحوا“

”آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے لوگوں کو خوش ہونا چاہیے“۔

علامہ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نیروز، مہرجان اسی طرح کافروں کی عید کے دنوں کی تعظیم جائز نہیں ہے۔ ابو حفص کبیر حنفی فرماتے ہیں جس نے نیروز کے دن اس دن کی تعظیم کرتے ہوئے کسی مشرک کو انڈہ بھی تحفہ میں دیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا اور اس کے اعمال ضائع ہو گئے۔

قاضی ابو المحاسن حسن بن منصور حنفیؒ فرماتے ہیں کہ جس نے اس دن کوئی خاص چیز خریدی جو عام دنوں میں نہ خریدتا تھا یا کسی کی طرف کوئی تحفہ بھیجا اگر اس کی نیت اس دن کی تعظیم کی تھی جیسے کفار کرتے ہیں تو یہ شخص کافر ہو گیا اگر تعظیم کی نیت نہ تھی بلکہ تفریح چاہتا تھا تو یہ کفر تو نہیں لیکن کفار کے تشبہ کی وجہ سے مکروہ ہے۔

اہل مکہ دخول کعبہ کے دنوں کو عید کا دن قرار دیتے ہیں یہ نہی میں تو داخل نہیں البتہ یوم عاشوراء میں خوارج کے ساتھ تشبہ ہے کہ وہ اس دن خوشی مناتے ہیں جیسا کہ اس دن ماتم کرنا شیعوں کا شیوہ ہے۔ اگرچہ دوسرا فعل پہلے سے زیادہ خطرناک نہیں۔

لیکن ان دونوں کو چھوڑنا بہتر ہے۔

عیدالفطر میں عید کی نماز سے پہلے کچھ کھانا مسنون ہے

۱۴۴۰: وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَايَخْرُجُ يَوْمَ الْفِطْرِ حَتّٰى يَطْعَمَ وَلَايُطْعَمُ يَوْمَ الْاَضْحٰى حَتّٰى يُصَلِّيَ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی)

سنن الترمذی، كتاب الجمعة عن رسول الله، باب ما جاء في الأكل يوم الفطر قبل الخروج، ح ٤٩٧

ترجمه: حضرت بریدہؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عیدالفطر کے دن جب تک کہ کچھ کھا نہ لیتے عیدگاہ کی طرف نہیں جاتے تھے اور عیدالاضحیٰ کے دن کچھ نہیں کھاتے تھے یہاں تک کہ عید کی نماز پڑھ لیتے۔ (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: (كان النبي لا يخرج يوم الفطر حتى يطعم) عیدالفطر کے دن کچھ کھا کر عیدگاہ کی طرف جانے کی حکمت گزر چکی ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس چیز کا میٹھا ہونا مستحب ہے۔ بیہقی اور طبرانی کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن سرخ جوڑا پہنتے تھے۔

یہ جوڑا مطلقاً سرخ نہ تھا بلکہ یہ یمنی کپڑا تھا جس میں سرخ و سبز لائنیں تھیں۔

(ولا يطعم يوم الأضحى حتى يصلي) اس کی حکمت فقراء کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا ہے کیونکہ فقراء تو عید کے دن وہی گوشت کھائیں گے جو لوگ انہیں عطا کریں گے۔ اور قربانی عید کی نماز کے بعد ہوتی ہے۔ عیدالفطر میں چونکہ صدقہ فطر عید سے پہلے ہوتا ہے۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کچھ کھا کر عید کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔

ایک توجیہہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امتثال امر کیلئے سب سے پہلی چیز قربانی کا گوشت تناول فرماتے تھے۔ بعض نے اس کے وجوب اور بعض نے سنیت کا قول اختیار کیا ہے۔

۱۴۴۱: وَعَنْ كَثِيرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ عَنْ اَبِيهِ عَنْ جَدِّهٖ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَبَّرَ فِي الْعِيدَيْنِ فِي الْاُوْلٰى سَبْعًا قَبْلَ الْقِرَاءَةِ وَفِي الْاٰخِرَةِ خَمْسًا قَبْلَ الْقِرَاءَةِ ۔ (رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤٢٦/٢ حديث رقم ٥٤٢۔ وابن ماجه ٥٥٨/١ حديث رقم ١٧٥٦۔ والدارمی ٤٥٥/١ حديث رقم ١٦٠٠۔ وأحمد فی المسند ٣٥٢/٥۔

ترجمه: حضرت کثیر بن عبداللہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں، اور وہ کثیر کے دادا سے نقل کرتے ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز میں قراءت سے پہلے پہلی رکعت میں سات تکبیریں کہیں اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں کہیں قراءت سے پہلے۔ (ترمذی، ابن ماجہ، دارمی)

تشریح: (وعن كثير بن عبدالله عن أبيه عن جدّه) جدّ سے مراد کثیر کے دادا ہیں۔ ان کا نام عمرو بن عوف المزنی ابوعبداللہ۔

(سبعًا) ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سات تکبیریں تکبیر تحریمہ کے علاوہ تھیں۔

(قبل القراءة) علامہ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ پہلی رکعت کی سات تکبیریں تکبیر تحریمہ اور تکبیر قیام کے علاوہ تھیں اور دوسری رکعت کی پانچ تکبیریں رکوع کی تکبیر سے پہلے تھیں۔ نیز دونوں رکعات میں تکبیرات قرات سے پہلے ہوں گی امام احمد اور امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پہلی رکعت میں جاتے ہوئے چار تکبیرات قیام کی تکبیر سمیت اور دوسری رکعت میں چار تکبیرات قرات کے بعد رکوع کی تکبیر سمیت ہوں گی۔ امام صاحب کی دلیل آگے آئے گی۔

(رواه الترمذي) امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور أحسن شيء في هذا الباب قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بہت سے اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے علماء کا اس پر عمل ہے امام شافعی، امام احمد اور اسحاقؒ اسی کے قائل ہیں البتہ حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ عید کی پہلی رکعت میں قرات سے پہلے پانچ اور دوسری رکعت میں قرات کے بعد رکوع کی تکبیر سمیت چار رکعات ہوں گی۔ اہل کوفہ اور سفیان ثوری کا یہی مسلک ہے۔

اگر امام ترمذی کے قول اہل کوفہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگرد مراد ہیں تو پہلی رکعت میں پانچ تکبیرات سے مراد تکبیر تحریمہ اور رکوع کی تکبیر کے ساتھ پانچ تکبیریں ہیں۔ امام ترمذی کی تعبیر "خمساً قبل القراءة" مسامحت سے خالی نہیں۔ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ بہت سے صحابہ کرام سے اس طرح کی روایت منقول ہے اور یہ اثر صحیح ہے اسے عبداللہؓ نے بہت سے صحابہ کی موجودگی میں بیان فرمایا تھا۔ ایسی روایات مرفوع کے درجہ میں ہوتی ہیں اور یہ تعداد رکعات کی طرح ہے۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ امام کے لئے مسنون ہے کہ پہلی اور آخری تکبیر کے علاوہ ہر دو تکبیروں کے درمیان یہ کلمات کہے۔

"سبحان الله والحمد لله و لا اله الا الله والله اكبر"

اس کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ایک اثر قولی و فعلی سند جید کے ساتھ موجود ہے اور امام شافعیؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔

اس حدیث کے بارے محدثین کی مختلف آراء کی رُوشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور استدلال کے قابل نہیں ہے کیونکہ اس کے راوی کثیر بن عبداللہ کو امام ابوداؤد، امام شافعی، ابن حبان، ابوحاتم اور ابن عدی نے کذاب اور ضعیف قرار دیا ہے۔

۱۴۴۲: وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ مُرْسَلاً اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَبَابَكْرٍ وَعُمَرَ كَبَّرُوْا فِي الْعِيْدَيْنِ وَالْاِسْتِسْقَاءِ سَبْعًا وَخَمْسًا وَصَلُّوْا قَبْلَ الْخُطْبَةِ وَجَهَرُوْا بِالْقِرَاءَةِ ۔ (رواه الشافعي)

أخرجه الشافعي في مسنده ص ٧٦۔

ترجمہ: حضرت جعفر بن محمدؒ مرسلاً نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ عیدین اور استسقاء کی نماز میں سات اور پانچ تکبیریں کہتے تھے، اور ان نمازوں کو خطبہ سے پہلے پڑھتے تھے اور ان نمازوں میں اونچی آواز سے قراءت کرتے تھے۔ (امام شافعیؒ)

راویٔ حدیث:

جعفر الصادق۔ یہ جعفر بن محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب ہیں۔ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔صادق ان کا لقب ہے۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پوتے کے پوتے ہیں۔ یہ اہل بیت کے بڑے بڑے لوگوں میں سے ہیں۔انہوں نے اپنے والد محمد باقر سے اور دوسروں سے بھی روایات کی ہیں۔ان سے ائمہ حدیث اور بڑے بڑے علماء نے حدیث نقل کی ہے۔جیسے یحیٰ بن سعید اور ابن جریج اور مالک بن انس اور سفیان ثوری اور ابن عیینہ اور ابوحنیفہ وغیرہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۴۸ھ میں وفات پائی۔ان کی عمر اڑسٹھ (٦٨) سال کی ہوئی۔مقام بقیع میں ایک ایسی قبر میں دفن ہوئے جس میں ان کے باپ محمد باقر اور ان کے دادا علی زین العابدین تھے۔

تشریح: (وعن جعفر) یعنی جعفر الصادق۔

(ابن محمد) ای الباقر بن علی بن الحسین بن علی بن أبی طالب رضی اللّٰہ عنہم۔

(أن النبیﷺ وأبا بکر و عمر کبّروا فی العیدین والاستسقاء سبعًا و خمسًا) یعنی پہلی رکعت میں سات اور دوسری میں پانچ تکبیرات پڑھتے تھے۔امام شافعیؒ کا مسلک بھی یہی ہے۔

(وصلوا قبل الخطبۃ) ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ نماز کے خطبے پر مقدم ہونے پر اجماع ہے۔ بنوامیہ کے لوگوں کی مخالفت کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ وہ نفس پرستی کی بنا پر خطبہ کو مقدم کرتے تھے کیونکہ جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ نماز پڑھ کر چلے جاتے ہیں اور ان کا خطبہ نہیں سنتے اور یہ ان کے جبر وظلم پر احتجاج کی علامت تھی۔تو انہوں نے خطبے کو نماز سے مقدم کرنا شروع کر دیا تاکہ لوگ خطبہ سن کر جائیں۔

(وجھروا بالقراءۃ) امام مسلمؒ نے بھی حضورﷺ سے یونہی نقل کیا ہے اس پر اتفاق ہے حتی کہ اس پر اجماع نقل کیا گیا ہے۔

(رواہ الشافعی) صاحب التخریج فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ سے اس روایت کو بیہقی نے نقل کر کے جعفر بن محمد عن أبیہ عن علی کی سند سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔انہوں اس روایت کو اپنی سند سے بھی لیا ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت علیؓ نے عید اور نماز استسقاء میں سات اور پانچ تکبیرات کہیں اور بلند آواز میں قرات کی۔اسی طرح کی روایت شیخ جزری کی تصحیح المصابیح میں بھی ہے۔

مصنفؒ کے قول کا ظاہر "عن جعفر بن محمد مرسلاً" دونوں روایتوں میں سے کسی کے مطابق بھی درست نہیں کیونکہ وہ دونوں روایتیں موقوف ہیں مرفوع نہیں ہیں۔البتہ تکلف کر کے کہا جا سکتا ہے کہ مرسلا سے مراد محمد باقر کا حضرت علی سے ارسال مراد ہے جعفر صادق کا نبی کریمﷺ سے ارسال مراد نہیں۔یا یہ کہ ارسال سے مراد انقطاع ہے خواہ وہ مرفوع ہو یا موقوف اور یہ خلاف ظاہر ہے۔یہ بھی ممکن ہے امام شافعیؒ نے اسے اپنی کسی اور تصنیف میں ذکر کیا ہو۔

تکبیراتِ زوائد چھ ہیں

۱۴۴۳: وَعَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْعَاصِ قَالَ سَأَلْتُ اَبَامُوْسٰی وَحُذَیْفَةَ کَیْفَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُکَبِّرُ فِی الْاَضْحٰی وَالْفِطْرِ؟ فَقَالَ اَبُوْمُوْسٰی کَانَ یُکَبِّرُ اَرْبَعًا تَکْبِیْرَةً عَلَی الْجَنَائِزِ فَقَالَ حُذَیْفَةُ صَدَقَ۔(رواہ ابوداود)

أخرجه أبو داؤد فی السنن ۱/۶۸۲ حدیث رقم ۱۱۵۳ وأحمد فی المسند ٤/٤١٦۔

ترجمہ: حضرت سعید بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوموسیٰ اور حضرت حذیفہ سے سوال کیا کہ شافع محشر ﷺ عید الاضحیٰ اور عید الفطر میں کتنی تکبیریں کہا کُرتے تھے؟ تو ابوموسیٰؓ نے جواب دیا آپ ﷺ چار تکبیریں کہا کرتے تھے، جس طرح کہ جنازہ میں چار تکبیریں کہا کرتے تھے۔ حضرت حذیفہ نے فرمایا کہ ابوموسیٰؓ نے بالکل سچ کہا ہے۔

(ابوداؤد)

تشریح: (فقال أبو موسٰی کان یکبّر أربعًا) ای متوالیةً۔ معنی یہ ہے کہ پہلی رکعت میں احرام کی تکبیر کے ساتھ چار تکبیریں اور دوسری رکعت میں رکوع کی تکبیر کے ساتھ چار تکبیریں پڑھتے تھے۔

(فقال حذیفة صدق۔ رواہ ابو داؤد) ابن ہمام نے اس روایت میں ان الفاظ کا اضافہ نقل کیا ہے:

''فقال ابو موسٰی کذلك کنت أکبّر فی البصرة حیث کنت علیهم''

ابن ہمام فرماتے ہیں کہ دو تکبیروں کے درمیان تین تسبیحات کے بقدر خاموش رہے گا کیونکہ پے در پے تکبیرات کہنے سے لوگوں کو اشتباہ ہوگا۔ نیز ہمارے نزدیک دو تکبیروں کے درمیان کسی قسم کا ذکر مسنون نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کا بوقت خطبہ کمان پر سہارا لینا

۱۴۴۴: وَعَنِ الْبَرَاءِ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نُوْوِلَ یَوْمَ الْعِیْدِ قَوْسًا فَخَطَبَ عَلَیْهِ۔

(رواہ ابوداوٗد)

أبوداوٗد فی السنن ۱/۶۷۹ حدیث رقم ۱۱٤٥۔

ترجمہ: حضرت براءؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ عید کے دن نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک کمان پیش کی گئی، چنانچہ آپ ﷺ نے اس پر ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا۔ (ابوداؤد)

تشریح: (أن النبی ﷺ نوول) مجہول نووی کے وزن پر ہے۔ ناول کا معنی ہے ہاتھ میں دینا۔

(یوم العید قوسًا فخطب علیه) یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ عیدگاہ میں منبر کا وجود حضور ﷺ کے بعد ہوا۔

بوقتِ خطبہ لاٹھی کا سہارا لینا مسنون ہے

۱۴۴۵: وَعَنْ عَطَاءٍ مُرْسَلًا اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ اِذَا خَطَبَ یَعْتَمِدُ عَلٰی عَنَزَتِهٖ اِعْتِمَادًا ۔ (رواہ الشافعی)

أخرجه الشافعي في مسنده ص ٧٧۔

ترجمہ: حضرت عطاء سے مرسلًا منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ جب خطبہ ارشاد فرماتے تھے تو اپنی لاٹھی پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے۔ (امام شافعیؒ)

تشریح: (وعن عطاء) عطاء بن اُبی یسار مشہور تابعی ہیں اور ابن عباسؓ سے کثیر الروایۃ ہیں۔

(کان اذا خطب یعتمد علی عنزته) عنزۃ ایک خاص قسم کے نیزے کو کہا جاتا ہے۔

(اعتمادًا) مفعول مطلق ہے۔ای اعتمادًا کلیًّا۔

بوقتِ خطبہ کسی انسان کا سہارا لینا بھی جائز ہے

۱۴۴۶: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ شَهِدْتُ الصَّلَاةَ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ یَوْمِ عِیْدٍ فَبَدَأَ بِالصَّلٰوةِ قَبْلَ الْخُطْبَةِ بِغَیْرِ اَذَانٍ وَّلَا اِقَامَةٍ فَلَمَّا قَضَی الصَّلٰوةَ قَامَ مُتَّکِئًا عَلٰی بِلَالٍ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰی عَلَیْهِ وَوَعَظَ النَّاسَ وَذَکَّرَهُمْ وَحَثَّهُمْ عَلٰی طَاعَتِهٖ وَمَضٰی اِلَی النِّسَاءِ وَمَعَهٗ بِلَالٌ فَاَمَرَهُنَّ بِتَقْوَی اللّٰهِ وَوَعَظَهُنَّ وَذَکَّرَهُنَّ۔ (رواہ النسائی)

أخرجه البخاري في صحيحه مختصرًا ٥٢٣/٢ حديث رقم ٩٦١۔ ومسلم في صحيحه ٦٠٣/٢ حديث رقم (٤ـ ٨٨٥)۔ والنسائي ١٨٦/٣ حديث رقم ١٥٧٥۔ وأحمد في المسند ٣١٨/٣۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ عید کے دن میں نماز کیلئے حاضر ہوا، آپ ﷺ نے اذان اور تکبیر کے بغیر خطبہ سے پہلے نماز پڑھائی۔ پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت بلالؓ پر ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور اللہ کی حمد وثناء بیان کی اور لوگوں کو وعظ کیا، اور ان کو عذاب اور ثواب کے احکام یاد دلائے۔ اور ان کو اللہ کی اطاعت پر ابھارا اور پھر عورتوں کی طرف گئے اس حال میں کہ آپ ﷺ کے ساتھ حضرت بلالؓ تھے اور ان کو بھی اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا اور ان کو نصیحت کی، اور انہیں عذاب اور ثواب کے احکام یاد دلائے۔ (نسائی)

تشریح: (الصلاۃ) ای صلاۃ العید۔

(فلما قضی الصلاۃ قام متکئًا علی بلالٍ) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ خطیب لاٹھی تلوار اور نیزے کے ساتھ ساتھ کسی انسان کا سہارا بھی لے سکتا ہے۔

(ووعظ الناس) امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ وعظ میں زجر وتوبیخ اور لوگوں کو اللہ سے ڈرانا ہوتا ہے۔

امام خلیل فرماتے ہیں کہ وعظ سے مراد نیکی کی ایسی نصیحت جس سے دل نرم ہو جائیں۔

(وذکرھم) بالتشدید۔ ماقبل پر عطف تفسیری ہے۔ ابن حجرؒ کا کہنا کہ ''وذکرھم العواقب'' ماقبل سے بدل ہے۔ درست نہیں۔

ممکن ہے کہ وعظ الناس کا معنی ہو۔ ''لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی نصیحت فرمائی''۔ اور ''وذکرھم'' کا معنی ہو''۔ آخرت، قیامت، جنت اور دوزخ کے احوال کے متعلق ارشاد فرمایا''۔

(وحثھم علی طاعتہٖ) یعنی اللہ کی اطاعت کی ترغیب دی۔ حضور ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت کا حصہ ہے۔ یہ تعمیم بعد التخصیص ہے کیونکہ یہ تمام مکارم اخلاق کو شامل ہے۔ البتہ راجح معنی یہ ہے کہ طاعت سے مراد اسی دن کے اعمال جیسے صدقہ فطر اور قربانی وغیرہ ہیں۔ طاعت کا ایک معنی نفلی عبادت بھی کیا گیا ہے۔

ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنی اطاعت کی ترغیب دی کیونکہ حضور ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ ابن حجر کا یہ قول سیاق وسباق سے بالاتر ہے۔

(فأمرھن بتقوی اللہ) اللہ کا تقوی مامورات کی انجام دہی اور منہیات سے اجتناب پر مشتمل ہے۔

اس مقام پر ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے عورتوں کو انجام سے ڈرایا اور یہ نصیحت کبھی بشارت کے انداز میں ہوتی کبھی نذارت کے۔ یہ عطف اعم ہے۔ ابن حجرؒ کا یہ قول ان کے سابقہ قول کے مخالف ہے کیونکہ انہوں نے پہلے اسے بدل بنایا تھا۔ اس کے عطف تفسیری ہونے کی تائید ان روایات میں سے بھی ہوئی جن میں صرف تذکیر کا ذکر ہے۔

شیخ جزریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت جابرؓ کی یہ حدیث متفق علیہ ہے اور اسے امام نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ بہتر یہ تھا کہ مؤلف اسے صحاح میں ذکر کرتے اگرچہ الفاظ میں معمولی سا فرق ہے لیکن معنی تو ایک جیسا ہے۔ شیخ قدس سرّہ نے صاحب مصابیح پر اعتراض کرتے ہوئے یونہی کہا ہے۔ پس انہوں نے بیان کر دیا کہ حضرت جابر کی حدیث سے کسی انسان کا سہارا لینے کے جواز کی دلالت معلوم ہوتی ہے۔ واللہ الھادی۔ اس جواب کو علامہ میرک نے نقل کیا ہے لیکن ان کا یہ جواب اعتراض کو دور کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس حدیث کا حق یہ تھا کہ اسے صحاح میں ذکر کیا جاتا۔ پھر احادیث حسان غیر آدمی کے جواز کے لئے مبین ومفسر ہوتیں جیسا کہ کتاب میں ان کا طرز ہے۔

عیدگاہ کی طرف جانے اور واپس آنے کا مسنون طریقہ

۱۴۴۷: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَاخَرَجَ یَوْمَ الْعِیْدِ فِیْ طَرِیْقٍ رَجَعَ فِیْ غَیْرِهٖ ۔ (رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٢/٤٢٤ حديث رقم ٥٤١۔ وابن ماجه ٤١٢/١ حديث رقم ١٣٠١۔ والدارمی ٤٦٠/١ حديث رقم ١٦١٣۔ وأحمد فی المسند ٣٣٨/٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ جب عید کیلئے جاتے تھے ایک راستے سے تو واپس آتے تھے دوسرے راستے سے۔ (ترمذی، داری)

تشریح: عید کے دن کے بارے میں ایک مسئلہ پر گفتگو کرنا باقی ہے وہ یہ کہ امام لوگوں کے ساتھ عید گاہ کی طرف تکبیرات کس طرح کہے گا۔ علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں تکبیرات کہنے کے بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں کیونکہ یہ اللہ کا ذکر ہے البتہ صاحبین کے نزدیک بلند آواز سے تکبیریں کہی جائیں گی جیسا کہ عید الاضحیٰ میں کہی جاتی ہیں جبکہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عید الفطر کے دن آہستہ آواز سے تکبیریں کہے گا۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ اونچی آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مخالف ہے:

"واذكر ربك في نفسك تضرعًا وخيفة ودون الجهر من القول"

پس بلند آواز سے پڑھنے کو شریعت کے مورد پر ہی رکھا جائے گا۔ اور وہ عید الاضحیٰ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"واذكروا الله في أيام معدودات"

اس کی تفسیر میں آیا ہے کہ اس سے مراد ان دنوں میں تکبیر کہنا ہے اور بہتر یہ ہے کہ انہی دنوں پر اکتفاء کیا جائے کیونکہ اس پر اجماع بھی ہے۔

اگر بطور سوال کے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"ولتكملوا العدة ولتكبروا الله على ما هداكم"

اور دار قطنی نے حضرت سالم سے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر کے دن جب گھر سے نکلتے تو عید گاہ میں آنے تک تکبیر پڑھتے تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں مطلقاً تکبیر کہنے کا حکم ملتا ہے۔ اس کے تو ہم بھی قائل ہیں البتہ محل نزاع بلند آواز سے تکبیر کہنا ہے۔ اور اس پر اس آیت اور حدیث میں کوئی دلالت موجود نہیں۔ نیز آپ کی ذکر کردہ حدیث بھی ضعیف ہے۔ حاکم نے بھی اس روایت کو ذکر کیا ہے اس میں بھی جہر کا ذکر نہیں البتہ دار قطنی میں حضرت نافع کے حوالے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل ملتا ہے کہ وہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ دونوں میں جہر کیا کرتے تھے۔ امام بیہقی نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے لیکن صحابی کا قول قطعية الدلالة آیت (یعنی "واذكر ربك" سے لے کر "ودون الجهر") کے معارض نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ عمل ایک اور صحابی ابن عباسؓ کے قول کے بھی خلاف ہے کہ جب لوگوں نے عید الفطر کے دن بلند آواز سے تکبیرات کہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مؤذنین عید کی رات کو مغرب کی نماز کے بعد سے فجر تک تکبیرات کہتے ہیں میں نے اس کی کوئی اصل نہیں دیکھی۔

بوقتِ عذر مسجد میں بھی نمازِ عیدین پڑھی جا سکتی ہے

۱۴۴۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّهٗ اَصَابَهُمْ مَطَرٌ فِیْ یَوْمِ عِیْدٍ فَصَلّٰی بِهِمُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الْعِیْدِ فِی الْمَسْجِدِ۔ (رواه ابوداود وابن ماجة)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ١/٦٨٦ حديث رقم ١١٦٠۔ وابن ماجه ١/٤١٦ حديث رقم ١٣١٣۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ عید کے دن بارش ہوگئی' آنحضرت ﷺ نے ان کو (یعنی صحابہ کو) نماز عید مسجد میں پڑھائی۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ)

تشریح: مسجد سے مراد مسجد نبویؐ ہے۔

ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ عید کی نماز آبادی سے باہر پڑھتے تھے لیکن جب کچھ بارش ہوتی تو آپ مسجد میں ادا فرماتے۔ پس تمام شہروں میں نماز عید آبادی سے باہر ادا کرنا افضل ہے البتہ مکہ مکرمہ کے بارے میں اختلاف ہے اور:

مکہ کے بارے میں راجح قول یہ ہے کہ مسجد حرام میں عید کی نماز ادا کی جائے گی۔ جیسا کہ اس پر آج بھی عمل ہو رہا ہے۔ حضور ﷺ اور اسلاف سے بھی اس کے خلاف عمل منقول نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''ان اوّل بیت وضع للناس''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد حرام تمام عبادتوں جیسے جمعہ، عید، استسقاء، جنازہ' کسوف اور خسوف کیلئے ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ مسجد حرام میں مکروہ نہیں ہے۔ اس کی تائید امام سیوطیؒ کی ذکر کردہ اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت آدمؑ کی نماز جنازہ باب کعبہ کے پاس پڑھی گئی تھی۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں مسجد حرام کو مساجد سے تعبیر کیا گیا ہے:

''ماكان للمشركين ان يعمروا مساجد الله''۔

ایک قرات میں ''مسجد اللہ'' ہے۔ اور مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد مسجد حرام ہے۔ مسجد حرام کیلئے جمعہ کا صیغہ یا تو مذکورہ وجہ سے لایا گیا یا اس وجہ سے کہ اس میں کعبہ ہے جو تمام مساجد کا قبلہ ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی چار جہات ہیں اور ہر جہت مسجد ہے اور مسجد حرام کی یہ خصوصیت ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اس کی عظمت کی وجہ سے اس کے ہر جز کو مساجد شمار کیا گیا۔

۱۴۴۹: وَعَنْ اَبِی الْحُوَيْرِثِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَتَبَ اِلٰى عَمْرِوبْنِ حَزْمٍ وَهُوَ بِنَجْرَانَ عَجِّلِ الْاَضْحٰى وَاَخِّرِ الْفِطْرَ وَذَكِّرِ النَّاسَ۔ (رواه الشافعي)

أخرجه الشافعي في مسنده ص ٧٤۔

ترجمہ: حضرت ابوالحویرثؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے عمرو ابن حزمؓ کی طرف خط لکھ کر بھیجا جبکہ وہ نجران میں گورنر تھے، کہ عید الاضحیٰ کی نماز جلدی پڑھائیں اور عید الفطر کی نماز تاخیر سے پڑھائیں، اور لوگوں کو خطبہ میں وعظ ونصیحت کریں۔ (امام شافعیؒ)

راوئ حدیث:

ابوحویرث: مؤلف نے ''الاکمال'' میں ان کا اسم گرامی ذکر نہیں کیا۔ بظاہر یہ تابعی ہیں ''حویرث'' تصغیر کے ساتھ ہے۔

تشریح: (عن أبي الحويرث) میرکؒ فرماتے ہیں کہ یہ متکلم فیہ راوی ہیں۔ مؤلف نے اپنے اسماء الرجال میں ان

کا تذکرہ نہیں کیا ان کا تابعی ہونا راجح ہے۔

(أن رسول اللهﷺ كتب الى عمرو بن حزم) ان کی کنیت ابوضحاک انصاری ہے۔ غزوہ خندق میں شریک ہوئے اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں نجران کا گورنر بنایا تھا۔ یہ سن ۱۰ ہجری کی بات ہے۔

(وهو بنجران) بفتح النون وسکون الجیم۔ یمن کے ایک علاقہ کا نام ہے۔

(عجل الأضحى) یعنی صلوۃ الاضحیٰ کو جلدی پڑھو تا کہ لوگ قربانی میں جلدی مشغول ہو سکیں۔

(أخر الفطر) یعنی صلوۃ الفطر کو دیر سے پڑھو تا کہ لوگوں کو نماز سے پہلے صدقۃ الفطر ادا کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع مل سکے۔

غور کیجئے کہ حضور ﷺ نے کس طرح مالدار اور نادار دونوں کی رعایت رکھی ہے اسی وجہ سے تو آپ ﷺ رحمۃ اللعالمین اور اللہ کے لطف کے مظہر ہیں۔

عید الفطر کی نماز دو شوال کو پڑھی جا سکتی ہے

۱۴۵۰: وَعَنْ اَبِیْ عُمَیْرِ بْنِ اَنَسٍ عَنْ عُمُوْمَةٍ لَّهٗ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ رَکْبًا جَاءُوْا اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَشْهَدُوْنَ اَنَّهُمْ رَءَوُا الْهِلَالَ بِالْاَمْسِ فَاَمَرَهُمْ اَنْ یُّفْطِرُوْا وَاِذَا اَصْبَحُوْا اَنْ یَّغْدُوْا اِلٰی مُصَلَّاهُمْ۔ (رواہ ابوداود والنسائی)

أخرجه أبوداؤد في السنن ٦٨٤/١ حديث رقم ١١٥٧۔ والنسائي ١٨٠/٣ حديث رقم ١٥٥٧۔ وابن ماجه ٥٢٩/١ حديث رقم ١٦٥٣۔ وأحمد في المسند ٥٧/٥۔

ترجمہ: حضرت عمیر بن انس اپنے چچاؤں سے نقل کرتے ہیں جو کہ فخر کونین ﷺ کے صحابہؓ میں سے تھے کہ ایک قافلہ آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور انہوں نے یہ گواہی دی کہ بے شک انہوں نے عید کا چاند کل دیکھا ہے (یعنی گزشتہ رات) تو آنحضرتؐ نے صحابہ کو افطار کا حکم دیا اور فرمایا کہ جب صبح ہو جائے تو سویرے عیدگاہ کی طرف چلے جائیں۔ (ابوداؤد، نسائی)

راویٔ حدیث:

ابو عمیر بن انس۔ یہ "ابو عمیر" انس بن مالک کے بیٹے ہیں اور انصاری ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کا نام "عبداللہ" ہے۔ اپنے انصاری چچوں سے روایت کرتے ہیں ان کا شمار کم عمر تابعین میں ہے اپنے والد حضرت انس رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد زمانہ دراز تک زندہ رہے۔

تشریح: (عن عمومة له) عمومۃ جمع ہے عم کی۔ کبھی یہ مصدر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

(يشهدون أنهم رأوا الهلال بالأمس) ابن الہمامؒ فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ اور دارقطنی کی روایت میں مذکور ہے۔ کہ وہ لوگ دن کے آخری حصہ میں آئے تھے۔ دارقطنیؒ اور امام نووی نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ جبکہ طحاوی نے اسی روایت کے بعض طرق میں نقل کیا ہے کہ وہ لوگ زوال کے بعد آئے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اسی سے استدلال کیا ہے کہ عید

کی نماز کا وقت ارتفاع شمس سے زوال شمس تک ہے اس لئے کہ اگر عید کی نماز زوال کے بعد ادا کی جا سکتی تو رسول اللہ ﷺ اسے اگلے دن تک کیلئے مؤخر نہ کرتے۔

(واذا أصبحوا أن يغدوا الى مصلاهم) یعنی وہ سب کل صبح عید کی نماز کیلئے عید گاہ میں آ جائیں۔

علامہ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ اگر لوگوں نے زوال کے بعد چاند دیکھنے کی گواہی دی تو لوگ روزہ توڑ دیں اور اگلے دن عید کی نماز ادا کریں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک اور امام شافعیؒ کا ایک قول یہی ہے۔ جبکہ امام مالک اور امام شافعی کے راجح قول کے مطابق عید کی نماز اس دن یا اگلے دن قضاء کی جائے گی۔

شرح المنیۃ میں لکھا ہے کہ اگر یوم الفطر کو زوال سے پہلے کسی عذر کی بنا پر عید کی نماز ادا نہ کی جا سکی تو اگلے دن زوال سے پہلے پڑھی جائے گی اور اگر اگلے دن بھی ادا نہ کی جا سکی تو اسکے بعد ادا نہ کی جائے گی۔ بخلاف عید الاضحیٰ کے کہ اگر پہلے اور دوسرے دن کسی عذر کی بنا پر نماز ادا نہ کی جا سکے تو تیسرے دن ادا کی جائے گی۔ اسی طرح اگر عید الاضحیٰ کی نماز کو دوسرے یا تیسرے دن تک مؤخر کیا تو جائز ہے لیکن کراہت سے خالی نہیں۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اداء کی طرح عید کی قضاء نماز میں بھی دو ہی رکعتیں ہوں گی۔ امام شافعیؒ اور امام مالک کا یہی مسلک ہے۔ کیونکہ اصل یہ ہے کہ قضاء ادا کی طرح ہی ہو البتہ کسی دلیل کی بنا پر اس میں تبدیلی ہو سکتی۔ امام احمدؒ کے نزدیک عید کی قضا نماز میں چار رکعات پڑھی جائیں گی۔ جیسا کہ جمعہ فوت ہو جانے کی صورت میں چار رکعات پڑھی جاتی ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دو اور چار رکعات کے درمیان اختیار ہے۔ عید کی نماز کو جمعہ پر قیاس کرنا بعید از قیاس ہے کیونکہ جمعہ ظہر کا بدل ہے یا وہ دونوں ایک ہی وقت کی نمازیں ہیں۔ پس ایک سے دوسری کی تعداد کی طرف رجوع کرنا جائز ہے جبکہ یہاں معاملہ ایسا نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا جو مسلک نقل کیا گیا وہ صحیح نہیں کیونکہ امام صاحب کے نزدیک اگر ایک آدمی امام کے ساتھ عید کی نماز نہ پڑھ سکا تو وہ قضا نہیں کرے گا۔

علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ ابوداؤد نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے اور منذری نے بھی اس پر خاموشی اختیار کی ہے۔

یہ بات گزر چکی ہے کہ ان دونوں حضرات کا سکوت تصحیح یا تحسین پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث امام مالک اور امام شافعیؒ کے خلاف حجت ہے۔

الفصل الثالث:

عید گاہ سے باہر عید کیلئے نداء درست ہے

۱۴۵۱: عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ قَالَ أَخْبَرَنِي عَطَاءٌ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَجَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَا لَمْ يَكُنْ يُؤَذَّنُ يَوْمَ الْفِطْرِ وَلَا يَوْمَ الْأَضْحَى ثُمَّ سَأَلْتُهُ يَعْنِي عَطَاءً بَعْدَ حِينٍ عَنْ ذٰلِكَ فَأَخْبَرَنِي قَالَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ أَنْ

لَّا اَذَانَ لِلصَّلَاۃِ یَوْمَ الْفِطْرِ حِیْنَ یَخْرُجُ الْاِمَامُ وَلَابَعْدَ مَا یَخْرُجُ وَلَا اِقَامَۃَ وَلَا نِدَاءَ وَلَاشَیْءَ لَانِدَاءَ یَوْمَئِذٍ وَّلَا اِقَامَۃَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۴۵۱۔ حدیث رقم ۹۶۰۔ ومسلم فی صحیحه ۲/۶۰۴ حدیث رقم ۵/۸۸۶۔

ترجمه: حضرت ابن جریج فرماتے ہیں کہ مجھے عطاءؒ نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کے بارے میں خبر دی انہوں نے فرمایا کہ نہ عید الفطر کے دن اذان دی جاتی تھی اور نہ ہی عید الاضحیٰ کے دن پھر میں نے اُن سے یہی سوال کیا (یعنی عطاءؒ سے) کچھ عرصے کے بعد تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے جابر بن عبداللہؓ نے خبر دی ہے کہ عید الفطر میں نماز کیلئے اذان نہیں ہے، نہ ہی امام کے نکلنے کے وقت اور نہ ہی امام کے باہر آ جانے کے بعد اور نہ ہی اقامت ہے اور نہ ہی نداء ہے اور نہ کچھ اور اس دن نہ نداء ہے اور نہ ہی اقامت ہے۔ (مسلم)

راوی حدیث:

ابن جریج۔ ان کا نام ''عبدالملک'' ہے۔ یہ ''عبدالعزیز بن جریج'' کے بیٹے ہیں' مکہ کے رہنے والے ہیں' مشہور فقیہ ہیں' پایہ کے علماء سے ہیں۔ انہوں نے حضرت مجاہدؒ' ابن ابی ملیکہؒ اور عطاءؒ سے حدیث کو سنا ہے۔ ان سے ایک جماعت نے روایت حدیث کی ہے۔ ابن عیینہ نے کہا کہ میں نے ابن جریج سے سنا وہ فرماتے تھے کہ علم حدیث کو جس طرح اور جس مشقت سے میں نے جمع کیا ہے کسی دوسرے نے نہیں جمع کیا ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ ''جریج'' اسم مصغر ہے۔

تشریح: ابن جریج: بضم الجیم الاولی۔ تقریب اور مغنی میں یونہی ہے۔

(یؤذن یوم الفطر) ظرفیت کی بنا پر منصوب ہے۔

(ثم سألته یعنی عطاءً۔ بعد حین عن ذلك) یعنی اس کی تفصیل کے بارے میں پوچھا یا دوبارہ سوال کیا۔

(للصلاۃ یوم الفطر) یوم الفطر پر اکتفا کرتے ہوئے یوم الاضحیٰ کو چھوڑ دیا۔

ابن زبیر فرماتے تھے کہ عید کیلئے اذان دی جائے گی۔ سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ عید کیلئے سب سے پہلے حضرت معاویہ نے اذان دی تھی۔

۱۴۵۲ : وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِالْخُدْرِیِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَخْرُجُ یَوْمَ الْاَضْحٰی وَیَوْمَ الْفِطْرِ فَیَبْدَاُ بِالصَّلَاۃِ فَاِذَا صَلّٰی صَلَاتَهٗ قَامَ فَاَقْبَلَ عَلَی النَّاسِ وَهُمْ جُلُوْسٌ فِیْ مُصَلَّاهُمْ فَاِنْ کَانَتْ لَهٗ حَاجَةٌ بِبَعْثٍ ذَکَرَهٗ لِلنَّاسِ اَوْکَانَتْ لَهٗ حَاجَةٌ بِغَیْرِ ذٰلِكَ اَمَرَهُمْ بِهَا وَکَانَ یَقُوْلُ تَصَدَّقُوْا تَصَدَّقُوْا تَصَدَّقُوْا وَکَانَ اَکْثَرُ مَنْ یَّتَصَدَّقُ النِّسَآءُ ثُمَّ یَنْصَرِفُ فَلَمْ یَزَلْ کَذٰلِكَ حَتّٰی کَانَ مَرْوَانُ بْنُ الْحَکَمِ فَخَرَجْتُ مُخَاصِرًا مَرْوَانَ حَتّٰی اَتَیْنَا الْمُصَلّٰی فَاِذَا کَثِیْرُ بْنُ الصَّلْتِ قَدْ بَنٰی مِنْبَرًا مِنْ طِیْنٍ وَلَبِنٍ فَاِذَا مَرْوَانُ یُنَازِعُنِیْ یَدَهٗ کَاَنَّهٗ یَجُرُّ فِیْ نَحْوِ الْمِنْبَرِ وَاَنَا اَجُرُّهٗ نَحْوَ

الصَّلٰوۃِ فَلَمَّا رَاَیْتُ ذٰلِكَ مِنْهُ قُلْتُ اَیْنَ الْاِبْتِدَاءُ بِالصَّلَاۃِ فَقَالَ یَا اَبَا سَعِیْدٍ قَدْ تُرِكَ مَاتَعْلَمُ قُلْتُ کَلَّا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَا تَاْتُوْنَ بِخَیْرٍ مِمَّا اَعْلَمُ ثَلَاثَ مِرَارٍ ثُمَّ انْصَرَفَ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٢/ ٦٠٥ حديث رقم (٨٨٩/٩)۔

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں آنحضرت ﷺ عیدالاضحیٰ کے دن اور عیدالفطر کے دن عیدگاہ کی طرف جاتے تو نماز سے ابتداء کرتے، جب نماز پڑھ لیتے تو کھڑے ہو جاتے اور لوگوں کی طرف متوجہ ہو جاتے اس حال میں کہ لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہوتے (یعنی خطبہ ارشاد فرماتے) اگر آپ کو کہیں لشکر بھیجنے کی ضرورت پڑتی تو اس کا تذکرہ لوگوں کے سامنے فرما دیتے یا لوگوں کی کوئی اور حاجت ہوتی اس کے بارے میں ان کو حکم ارشاد فرما دیتے اور اپنے خطبہ کے درمیان فرماتے تھے اے لوگو! تم صدقہ کرو صدقہ کرو صدقہ کرو، اور عورتیں زیادہ صدقہ کیا کرتی تھیں، اور اس کے بعد آپ ﷺ اپنے گھر تشریف لے جاتے (پس آپ ﷺ کے زمانے سے) یہی معمول رہا (یعنی خطبہ نماز کے بعد ہوتا تھا) یہاں تک کہ مروان بن حکم کا زمانہ آیا پس میں ایک دن مروان بن حکم کا ہاتھ پکڑے ہوئے نکلا یہاں تک ہم عیدگاہ میں آئے تو کیا دیکھتے ہیں وہاں کثیر بن صلت نے مٹی اور کچی اینٹوں کا منبر بنا رکھا ہے، اچانک مروان مجھے اپنے ہاتھ سے کھینچنے لگا گویا کہ وہ مجھے منبر کی طرف کھینچ رہا تھا (یعنی میں عید سے پہلے خطبہ پڑھوں) اور میں اس کو نماز کی طرف کھینچ رہا تھا (یعنی پہلے نماز پڑھیں پھر خطبہ پڑھیں گے) جب میں نے اس کی ہٹ دھرمی کو دیکھا تو میں نے کہا ابتداء بالصلوٰۃ کا وہ فعل کہاں ہے، یعنی جو آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانے سے چلا آ رہا تھا تو مروان بن حکم نے کہا اے ابوسعیدؓ جھگڑا نہ کرو، جو آپ جانتے ہیں اس کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ میں نے کہا ہرگز نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم اس سے بہتر چیز نہیں لا سکتے جو میں جانتا ہوں اور یہ بات تین مرتبہ کہی پھر ابوسعیدؓ واپس آ گئے (یعنی مروان کے اس فعل کی وجہ سے نماز میں شریک نہیں ہوئے)۔ (مسلم)

تشریح: کان یخرج یوم الأضحی ویوم الفطر فیبدأ بالصلاۃ) یعنی خطبہ سے پہلے نماز پڑھتے تھے۔

جمہور کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ عید کی پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیۃ پڑھی جائے۔ امام ابوداؤد نے اپنی سند سے حضور ﷺ کا یہی فعل نقل کیا ہے۔

(تصدقوا تصدّقوا تصدّقوا) اس لفظ کا تین دفعہ ذکر تاکید کیلئے ہے۔ یا ایک دفعہ سامنے والوں ایک دفعہ دائیں طرف والوں کیلئے اور ایک دفعہ بائیں طرف والوں کیلئے ارشاد فرمایا۔ ایک احتمال یہ ہے احوال ثلثہ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی دنیا کیلئے صدقہ کرو۔ موت کیلئے صدقہ کرو اور آخرت کیلئے صدقہ کرو۔ یا یہ معنی ہے کہ پہلا امر زکوٰۃ کیلئے، دوسرا امر صدقہ فطر کیلئے اور تیسرا امر عام صدقہ کیلئے ہے۔

(وکان اکثر من یتصدق النساء) اکثر نسخوں میں لفظ اکثر کے رفع اور النساء کے نصب کے ساتھ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ عورتوں کو کثرت سے صدقہ کی ترغیب دیا کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ نے عورتوں کو خاوند کی نافرمانی اور دنیا کی زینت کی محبت کی بنا پر اکثر جہنم والوں میں سے دیکھا تھا۔

(فلم یزل کذلك) یعنی خطبہ نماز کے بعد اور منبر کے بجائے زمین پر کھڑے ہو کر دیا جاتا رہا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کان تامہ ہے اور مضاف محذوف ہے۔ ای حدث عهده او امارة

ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ابوسعید خدریؓ اس بات پر رد فرمانا چاہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق حضرت عثمان بن عفانؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں خطبہ کو نماز سے مقدم کیا تھا۔ اور یہ کہ حضرت عمر اور حضرت معاویہؓ نے بھی خطبہ کو نماز پر مقدم کیا تھا۔ اس کی تردید حضرت ابن عباسؓ کے ایک قول سے بھی ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علیؓ کے ساتھ عید الفطر کی نماز میں شریک ہوا وہ سب نماز خطبہ سے پہلے پڑھتے تھے۔

ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت معاویہؓ نے خطبہ کو نماز پر مقدم کیا۔ اسی وجہ سے قاضیؒ فرماتے ہیں۔

خطبہ کے نماز سے مؤخر ہونے کے بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ اور خلفاء راشدین کا فعل ہے البتہ حضرت عثمانؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنی خلافت کے آخری زمانے میں لوگوں کی سستی کو دیکھ کر خطبہ کو نماز پر مقدم کر دیا تھا۔ اس طرح کا ایک قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی ملتا ہے لیکن وہ درست نہیں ایک قول کے مطابق حضرت معاویہ، ایک کے مطابق مروان نے مدینہ میں ایک کے مطابق زیادہ نے بصرہ میں اور ایک قول کے مطابق حضرت ابن زبیرؓ نے اپنے آخری ایام میں خطبہ کو نماز پر مقدم کیا تھا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ صدر اول کے اجماع کے بعد اب بلا اختلاف خطبہ نماز سے مؤخر ہے کہ اسی پر اجماع ہے۔

(یا ابا سعید! قد ترك ما تعلم) یعنی کیا آپ نہیں جانتے کہ نماز خطبہ پر مقدم ہے اور ہم نے وہ کام کیا جو اس سے بہتر ہے اسی وجہ سے انہوں نے یہ جواب دیا۔

اس قول کی بہتر تشریح یہ ہے کہ کہا جائے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ اس نے وہ چھوڑ دیا جو آپ جانتے ہیں یعنی نماز کو خطبہ پر مقدم کرنا' اب بہتر اور سنت یہ ہے کہ خطبہ کو مقدم کیا جائے کیونکہ اس میں ایک مصلحت ہے اور وہ لوگوں کا خطبہ سنے بغیر چلے جانا۔

(ثم انصرف) حضرت ابوسعید یہ ارشاد فرمانے کے بعد چلے گئے اور جماعت میں حاضر نہ ہوئے آپ کا منشا مروان کے فعل پر احتجاج اور اس کے عمل کی قباحت کو بتلانا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ جہت معتبر سے جہت صلوۃ کی طرف انصراف کر گئے جیسا کہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت معاویہ کے بارے میں جو کچھ نقل کیا گیا ہے وہ درست نہیں۔ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی امام نماز سے پہلے خطبہ پڑھے تو اس نے سنت کی مخالفت کی ہے لیکن خطبہ کو لوٹانا ضروری نہیں تاکہ اعادہ نہ ہو جائے۔

بَابٌ فِي الْاُضْحِيَةِ

قربانی کا بیان

امام اصمعیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ اضحیہ میں کئی لغات ہیں۔اضحیہ بضم الھمزہ۔ اضحیہ بکسرہ الھمزہ اوران دونوں کی جمع اضاحیہ آتی ہے۔ضَحیّہ اس کی جمع ضحایا آتی ہے۔اَضْحَات اس کی جمع اُضْحٰی آتی ہے۔یہ اس جانور کو کہتے ہیں جو قربانی کے دنوں میں تقرب الی اللہ کے لئے ذبح کیا جائے۔

''الأضحية''۔لفظ''أضحيه''ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ،''حآء'' کے کسرہ کے ساتھ اور''یا'' کی تشدید کے ساتھ ہے۔ اور یہ مذکورہ اعراب اصول مصححہ کے مطابق ہے۔جبکہ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ لفظ''أضحيه'' میں تشدید کے بجائے تخفیف ہے۔لیکن یہ قول کسی نقل صریح یا دلیل صحیح کا محتاج ہے۔

نیز علامہ نوویؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ لفظ''أضحيه''میں چار لغات ہیں۔اور لفظ اُضحیہ اس مذبوح پر بولا جاتا ہے جس کو یوم النحر میں ذبح کیا جائے۔اور وہ چار لغات بالترتیب یہ ہیں: ① ''الأضحية'' ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ۔ ② ''الاضحية'' ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ان دونوں کی جمع ''أضاحی'' تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ آتی ہے۔ ③ ''ضحية'' اس کی جمع ''ضحايا'' آتی ہے۔ ④ ''أضحاة'' ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ۔اس کی جمع ''أضحى'' آتی ہے جیسا کہ ''أرطاة'' کی جمع ''أرطى'' آتی ہے۔اور اسی وجہ سے یوم النحر کا نام ''يوم الأضحى'' رکھا جاتا ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ یوم النحر کو یوم الاٗضحیٰ اس لئے کہا جاتا کہ اس میں قربانی وقتِ ضحیٰ میں کی جاتی ہے۔

لفظ''أضحى'' منصرف ہے جیسا کہ علامہ سیدؒ نے ذکر کیا ہے۔اور علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ''الأضحية'' اس کا نام ہے کہ یوم النحر کو مخصوص جانور ذبح کیا جائے ثواب کی نیت کے ساتھ۔اور اسی وجہ سے اس دن کا نام ''يوم الأضحى'' رکھا جاتا ہے اور علامہ طیبیؒ شاہد کے طور پر عرب کا مقولہ نقل کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی وقت ضحیٰ میں قربانی والے جانوروں میں سے کوئی جانور ذبح کرتا تھا تو اہل عرب ''ضحى بكبش'' کا جملہ استعمال کرتے تھے۔پھر یہ اتنا کثیر الاستعمال اور عام ہوگیا کہ اگر کوئی وقت ضحیٰ کے علاوہ پورے دن میں بھی کسی وقت میں ذبح کرتا تو اس پر''ضحى'' کا لفظ استعمال ہونے لگا۔

علامہ راغبؒ فرماتے ہیں کہ جیسا ماقبل ذکر کیا گیا کہ''أضحيه''کو''اضحيه''اس لئے کہتے ہیں کہ قربانی وقت ضحیٰ میں ہوتی ہے۔تو وقت ضحیٰ کی نسبت سے اس عمل کو اُضحیہ کہا جاتا ہے۔پس علامہ راغب اس وجہ تسمیہ پر ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''من ذبح صلاتنا هذه فليعد......''

ترجمہ: جس نے عید کی نماز سے پہلے ذبح کر لیا تو اس کا ذبح کرنا معتبر نہیں بلکہ وہ نماز کے بعد قربانی کا اعادہ کرے۔

پس ثابت ہوا کہ''اُضحية'' ہے ہی وقتِ ضحیٰ میں اگر وقت ضحیٰ سے قبل ہو تو وہ معتبر ہی نہیں۔پس معلوم ہوا کہ اس کا نام

''اُضحیہ'' رکھنا شرع سے ثابت ہے، بلکہ اگر ہم زیادہ گہرائی میں جائیں تو معلوم ہوگا کہ اس کا نام ''اُضحیۃ'' رکھنا ''کتاب اللہ'' سے ثابت ہے، قرآن مجید میں ہے:

﴿ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴾ [الکوثر: ۲] ترجمہ: اپنے رب کی نماز پڑھیے پھر قربانی کیجئے''۔

قربانی واجب ہے یا سنت؟ اس میں اختلاف ہے امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبل اور صاحبین (امام ابو یوسفؒ وامام محمدؒ) فرماتے ہیں کہ یہ سنت موکدہ ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ شہر میں رہنے والے مقیمین پر واجب ہے۔ اور یہ اس کے وجوب میں نصاب کا اعتبار کرتے ہیں۔ اور علامہ ابن حجر العسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ ہماری دلیل وہ روایت ہے جو کہ سندِ حسن کے ساتھ پہنچی ہے کہ حضرت ابو بکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما دونوں کے دونوں قربانی نہیں کیا کرتے تھے صرف اس بات سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں لوگ اس کو واجب نہ سمجھیں۔ لیکن ہم اس روایت کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ حضرات اہل وجوب میں سے نہ تھے۔ نیز یہ عموم الوجوب کے توھم سے بچنے کیلئے ایسا کرتے تھے۔ یعنی یہ اس لئے ایسا کرتے تھے کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ شاید قربانی سب پر واجب ہے۔ پس ان حضرات نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ قربانی واجب تو ہے مگر بعض پر ہے اور بعض پر نہیں۔ اور جو لوگ اس کے وجوب کے قائل ہیں وہ دلیل پکڑتے ہیں اس بات سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دس سال تک اس پر مواظبت اختیار کی، اور یہی دس سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری دس سال تھے جو کہ مدینہ منورہ میں گزارے تھے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی اس کے وجوب پر تائید کرتا ہے۔ کہ جو نماز عید سے قبل قربانی کر لے تو وہ اعادہ کرے، اور ہم تو یہی جانتے ہیں کہ شریعت میں اعادہ کا حکم واجب سے کم پر نہیں ہوتا۔ اور جو اس کے مستحب ہونے کے قائل ہیں جیسا کہ ابن حجر العسقلانیؒ تو یہ قول بالکل مردود ہے۔ جبکہ اس کے وجوب پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی مؤید ہے:

''من وجد سعة لأن يضحي فلم يضح فلا يحضر مصلانا'' ۔(ابوداؤد وغیرہ)

ترجمہ: جس کو قربانی کی وسعت ہو پھر بھی وہ قربانی نہ کرے تو وہ ہماری نماز گاہ میں نہ آئے۔

الفصل الاول:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی

۱۴۵۳: عَنْ اَنَسٍ قَالَ ضَحّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِكَبْشَيْنِ اَمْلَحَيْنِ اَقْرَنَيْنِ ذَبَحَهُمَا بِيَدِهٖ سَمّٰى وَكَبَّرَ قَالَ رَاَيْتُهٗ وَاضِعًا قَدَمَهٗ عَلٰى صِفَاحِهِمَا وَيَقُوْلُ بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ۱۰/۲۲۔ حديث رقم ۵۵٦٤۔ ومسلم في صحيحه ۱۵۵٦/۳ حديث رقم (۱۷۔ ۱۹٦٦)۔ وأبوداوٗد في السنن ۲۳۰/۳ حديث رقم ۲۷۹٤۔ والترمذي في السنن ۷۱/٤، حديث رقم ۱٤۹٤ والنسائي ۳۱۹/۷ حديث رقم ٤۳۸۷ وابن ماجة ۱۰٤۳/۲ في حديث رقم ۳۱۲۰۔ والدارمي ۱۰۳/۲ حديث رقم ۱۹٤۵۔ وأحمد في المسند ۹۹/۳۔

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دُنبوں کی قربانی کی جو چتکبرے

تھے سینگوں والے تھے۔ان دونوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے ذبح کیا اور بسم اللہ اور اللہ اکبر پڑھی۔حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنا پاؤں ان دونوں کے پہلو پر رکھے ہوئے تھے اور بسم اللہ اللہ اکبر کہتے تھے۔(بخاری)

تشریح:(عن أنس قال ضحی) حدیث میں لفظ ''ضحّٰی'' تضحیہ سے ہے، بمعنیٰ قربانی کے جانور کو ثواب کی نیت سے ذبح کرنا۔

کبشین: لغت میں ''کبش'' بکری کے اس بچے کو کہتے ہیں جس کے دو یا چار دانت موجود ہوں، اور لفظ ''کبش'' میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ وہ جانور مذکر ہو تو افضل ہے اس لئے کہ اس کا گوشت زیادہ طیب ہوتا ہے۔نسبتاً مؤنث جانور کے گوشت کے۔(املحین) لفظ ''أملح'' ملحۃ سے تفضیل کا صیغہ ہے، بمعنی ایسا سفید جانور جس میں کالا رنگ بھی کہیں کہیں موجود ہو۔اور اسی معنی پر اکثر اہل لغت کا اتفاق ہے، جبکہ بعض نے یوں بھی کہا ہے کہ اس سے مراد ایسا جانور ہے جس میں سفیدی زیادہ ہو اور سیاہی کم ہو اور بعض نے کہا کہ اُملح ایسا جانور ہوتا ہے جو خالص سفید رنگ کا ہو۔لیکن پہلے قول کی تائید کیلئے ہمارے پاس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اشارہ ہے فرماتی ہیں کہ:

''هو الذی ینظر فی مواد ویأکل فی مواد ویمشی فی سوادٍ''۔''وہ جانور یعنی اُملح ایسا تھا جس کی آنکھوں کے اردگرد کا حلقہ سیاہ تھا۔اور اس کے منہ کا اگلا حصہ بھی سیاہ تھا اور اس کے پاؤں بھی سیاہ تھے۔الغرض اس کے جسم کے کچھ حصے سیاہ تھے جبکہ اکثر حصے سفید تھے۔''

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایسا ایک جانور جس کے جسم کا اکثر حصہ سفید ہو اس کی قربانی اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ محبوب ہے ایسے دو جانوروں سے جن کا رنگ کالا ہو۔(اس روایت کو حاکم نے مستدرک میں اور امام احمد نے مسند میں روایت کیا ہے) یاد رہے کہ اس حدیث کے مرفوع ہونے میں امام بخاریؒ نے تنازع کیا ہے، لیکن ان کا یہ تنازع اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اسلئے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے یہ جو فرمایا ہے، اپنی طرف سے نہیں فرمایا۔پس یہ مرفوع ہی کے حکم میں ہوگی۔

علامہ ابن حجر العسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ اگر جانور کے رنگ میں گوشت کے اچھے ہونے میں تعارض ہو جائے۔مثلاً ایک جانور ایسا ہے جو رنگ کے اعتبار سے تو املح ہے مگر گوشت کے اعتبار سے زیادہ اچھا نہیں اور اس کے بالمقابل ایک ایسا جانور ہے جو رنگ میں تو املح نہیں لیکن جسم کا خوب فربہ ہے، تو ایسی صورت حال میں اچھے گوشت والے کو ترجیح ہوگی۔لیکن ابن حجرؒ کا یہ فرمانا حدیث کے ظاہری معنی کی وجہ سے قبول نہ کیا جائے گا، کیونکہ حدیث مبنی ہے فقط رنگ پر قطعِ نظر اس سے کہ اس میں گوشت کیسا ہو اور کتنا ہو، باوجودیکہ گوشت کے زیادہ ہونے میں فقراء و غرباء کیلئے منفعت زیادہ ہے مگر یہاں پر ان چیزوں اور علتوں کو نہ دیکھا جائے گا کیونکہ یہ اُمر تعبدی ہے اور اُمر تعبدی کو ہر حال میں بجا لانا ہوتا ہے۔علتیں تلاش نہیں کی جاتیں۔(واللہ اعلم بالصواب)۔

(أقرنین) یعنی اس جانور کے دو لمبے لمبے سینگ تھے جبکہ بعض نے کہا لمبے ہونا ضروری نہیں، مطلقاً سینگ ہونے چاہیے۔

(ذبحهما بیده) یہاں سے یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ جانور کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا مستحب ہے مگر اس کیلئے جو ذبح

کے آداب کو جانتا ہو۔ اور اس پر قادر بھی ہو ورنہ وقت ذبح موجود ہونا ہی کفایت کر جائے گا ایک حسن خبر کی وجہ سے۔ بلکہ امام حاکم نے تو اس کو صحیح قرار دیا ہے اور دلیل کے طور پر ایک روایت پیش کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

''قومی الٰی أضحیتك فأشھدیھا فانه بأول قطرةٍ من دمھا یغفرلك ما سلف من ذنوبك۔

اے فاطمہ! اپنے قربانی کے جانور کے پاس کھڑی رہ اور اس کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھ کیونکہ جب سب سے پہلا قطرہ گرے گا تو تیرے گذشتہ سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

علامہ مظہر فرماتے ہیں کہ سنت یہی ہے کہ جانور کو اپنے ہاتھ ہی سے ذبح کیا جائے کیونکہ ذبح کرنا ایک عبادت ہے اور عبادت میں اصل یہ ہے کہ وہ کام از خود کیا جائے۔ اور اگر کسی دوسرے کو وکیل بھی بنا دیا تو یہ بھی جائز ہے۔

سوال: آنحضرت ﷺ نے دو جانور کیوں ذبح کئے؟

جواب: ایک اپنی اور اپنے اہل کی طرف سے اور دُوسرا اپنی امت کی طرف سے۔

اور جاننا چاہیے کہ تسمیہ ہمارے نزدیک شرط ہے، جبکہ تکبیر سب کے نزدیک مستحب ہے۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ذبح کرنے والے کیلئے تسمیہ پڑھنا مطلقاً ہے، یاد رہے کہ ہمارے نزدیک تسمیہ پڑھنا قبل الذبح ہے۔ پس علامہ اسی قول پر بخاری شریف کی ایک روایت پیش کرتے ہیں، جس میں مسلم کے مذبوح کو مباح قرار دیا گیا ہے کیونکہ ایسی صورت میں یہ گمان ضرور پایا جاتا ہے کہ اس نے پہلے اللہ کا نام ضرور لیا ہوگا۔ پس یہ روایت مرفوع ہے اس وجہ سے کہ آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں ایسی صورتحال کو محمول کیا ہے۔ بہرحال ہمارے مذہب کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہوتی ہے:

''فکلوا مما ذکر اسم اللّٰه علیه ان کنتم بآیاته مؤمنین ولا تأکلوا مما لم یذکر اسم اللّٰه علیه وأنه لفسق''۔ ''جن جانوروں پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہے ان میں سے کھاؤ اگر تم اللہ کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو اور ان جانوروں میں سے ہرگز نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اور بے شک یہ حرام ہے''۔

اور علامہ ابن حجرؒ نے یہ جو کہا کہ بالاتفاق متروک التسمیہ کا کھانا حرام نہیں پس ان کا یہ قول مردود ہے کیونکہ یہ مخالف ہے ہمارے ائمہ کے اقوال و مذاہب کے۔

نیز علامہ ابن حجرؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے امام شافعیؒ نے یہ اُخذ کیا ہے کہ اضحیة میں اختیار دیا جائے گا کہ چاہے تو وہ تسمیہ سے پہلے تکبیر کہہ دے اور چاہے تو تسمیہ کے بعد تین بار تکبیر کہہ لے۔ مگر ان کا یہ قول اس حدیث کے مخالف ہونے کی وجہ سے غریب ہے، اور یہ مخالفت اس حدیث کے ساتھ دو وجہ سے ہے:

(اول) حدیث میں پہلے تسمیہ کا ذکر ہے پھر تکبیر کا جبکہ علامہ کے مطابق پہلے تکبیر پھر تسمیہ۔

(ثانی) آخر میں تین مرتبہ تکبیر کا ذکر اس حدیث میں نہیں ہے۔ پس اس طرح دو وجہ سے اس قول کی مخالفت حدیث کے ساتھ پائی گئی اور پھر علامہ ابن حجرؒ تکبیر کے بعد تسمیہ پڑھنے کو قیاس کرتے ہیں رکوع کی تسبیح پر، کہ نماز میں بھی تو تسبیح سے پہلے تکبیر کہی جاتی ہے۔ پس اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ جس کو قیاس کے ساتھ ادنی سی بھی مناسبت ہو وہ علامہ کے اس قول کے

بعد صحیح اور فاسد میں صاف فرق کر سکتا ہے کہ ان کا اس کو نماز اور رکوع پر قیاس کرنا درست ہی نہیں۔ نیز جمہور کہتے ہیں کہ ذبح کے وقت آنحضرت ﷺ پر درود پڑھنا مناسب نہیں جبکہ امام شافعیؒ نے اس کی مخالفت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ مسنون ہے۔

(واضعًا) حال واقع ہوا ہے۔

(قدمه علی صفاحهما) صفاح جمع ہے "صفح" کی، صفح حاء کے فتحہ اور فاء کے سکون کے ساتھ ہے، اور اس کے معنی "پہلو" کے آتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ صفاح جمع ہے۔ "صفحة" کی اور اس کے معنی "رخسار" کے آتے ہیں، اور بعض نے کہا کہ اس کے معنی گردن کی اطراف کے آتے ہیں، اور نہایہ میں ہے کہ صفح ہر چیز کے پہلو اور دامن کو کہتے ہیں۔

(ویقول بسم الله و الله اکبر) اس عبارت میں اشارہ ہے، اس بات کی طرف کہ ذبح کرتے وقت بسم اللہ اور اللہ اکبر کے درمیان واؤ عاطفہ یا واؤ حالیہ کا لانا اولیٰ ہے، یعنی ذبح کرتے وقت بسم الله و الله اکبر کہنا اولیٰ ہے جبکہ بسم الله، الله اکبر کہنا غیر اولیٰ ہے۔ اور صحیح ہے کبش أقرن کیلئے أضحیه کی خبر دینا، اور تضحیه سے قرن کے مکسور ہونے کی وجہ سے اس کی نہی کو رد کیا گیا ہے جبکہ امام ترمذیؒ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور اعتراض کیا ہے بایں طور پر کہ اس کی سند ضعیف ہے۔

۱۴۵۴: وَعَنْ عَآئِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَرَ بِكَبْشٍ اَقْرَنَ يَطَأُ فِيْ سَوَادٍ وَيَبْرُكُ فِيْ سَوَادٍ وَيَنْظُرُ فِيْ سَوَادٍ فَاُتِيَ بِهٖ لِيُضَحِّيَ بِهٖ قَالَ يَا عَائِشَةُ هَلُمِّي الْمُدْيَةَ ثُمَّ قَالَ اَشْحِذِيْهَا بِحَجَرٍ فَفَعَلْتُ ثُمَّ اَخَذَهَا وَاَخَذَ الْكَبْشَ فَاَضْجَعَهٗ ثُمَّ قَالَ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنْ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَمِنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ ثُمَّ ضَحّٰى بِهٖ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١٥٥٧/٣ حديث رقم (١٩۔ ١٩٦٧)۔ وأبوداؤد في السنن ٢٢٩/٣ حديث رقم ٢٧٩٢۔ وأحمد في المسند ٧٨/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے لئے ایسا سینگ دار مینڈھا لانے کا حکم دیا جو سیاہی میں چلتا ہو اور سیاہی میں بیٹھتا ہو اور سیاہی میں دیکھتا ہو پس جب آپ کے پاس ایسا دنبہ لایا گیا تا کہ آپ قربانی کریں تو فرمایا اے عائشہ! چھری لاؤ۔ پھر فرمایا اس کو پتھر پر رگڑ کر تیز کرو پس میں نے اس کو تیز کیا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھری پکڑی اور مینڈھے کو پکڑ کر اس کو لٹایا اور اس کو ذبح کرنے کا ارادہ فرمایا تو ارشاد فرمایا اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں اے اللہ! تو اس کو قبول کر محمدؐ آل محمد اور امت محمدی (ﷺ) کی طرف سے اور پھر اس کو ذبح کر دیا۔ (مسلم)

تشریح: (وعن عائشةؓ ...... أمر بکبش) آنحضرت ﷺ نے کبش کا حکم دیا یعنی کبش کو اپنے پاس لانے کا حکم دیا۔

(فی سواد) "یطأفی سوادٍ" اس سے کنایہ ہے اس بات کی طرف کہ اس کے پاؤں کالے ہوں۔

(ویبرك فی سواد) "برک" کہتے ہیں چوپائے کے پیٹ کی وہ کھال جو بیٹھنے کی حالت میں زمین سے مل جاتی ہے، پس "یبرك فی سواد" میں کنایہ ہے پیٹ کی کھال کالی ہونے سے۔

بعض نے کہا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہاں سے ایسا کبش بتانا چاہتی ہیں جس کی پسلیوں کا نچلا حصہ، گھٹنوں، اور پاؤں کا حصہ اور آنکھوں کے اردگرد کا حصہ کالا ہو اور باقی سارا جسم سفید ہو۔

(فاتی به) یعنی وہ کبش آپ ﷺ کے پاس لایا گیا۔

(لیضحی به) اس میں آنحضرت ﷺ کے امر دینے کی علت کا ذکر ہے۔ یعنی اُمر کی علت ذبح کرنا تھا۔

(قال یا عائشة هلمی الدیة) هلمی المدیة کا معنی ہے ''هاتیها'' یعنی اس کو میرے پاس لا، علامہ فرماتے ہیں کہ هلم کی تثنیہ اور جمع بھی آتی ہے اور مؤنث بھی۔ جبکہ اھل حجاز کہتے ہیں کہ هلم ہی ہر حال وصورت میں استعمال ہوسکتا ہے تثنیہ یا جمع لانے کی ضرورت نہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿قل هلم شهدآء كم﴾ [الأنعام۔ ۱۰]

اس آیت میں هلم ''احضروهم'' کے معنی میں ہے یعنی ان کو حاضر کرو۔ اور اسی آیت سے علامہ ابن حجرؒ کے اس قول کی تضعیف بھی ہو جاتی ہے جس میں آپؒ نے فرمایا کہ ''هلمی المدیة'' ''تعالی بها'' کے معنی میں ہے۔

(المدیة) میم کے ضمہ کے ساتھ اُصح ہے۔ جبکہ کسرہ اور فتحہ بھی صحیح ہے اور مدیہ کہتے ہیں چھری کو۔ یعنی آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو چھری لانے کو فرمایا تھا۔

(ثم قال اشحذیها) ''حاء کے فتحہ کے ساتھ بمعنی چھری تیز کرنا۔

(بحجر) ایک خاص پتھر مراد ہے۔ جس سے چھری تیز کی جاتی ہے یا پھر مطلقاً پتھر مراد ہے۔ اور مسلم شریف کی روایت میں ہے ''ولیحد أحد کم شفرته'' یعنی تم میں سے کسی ایک کو چاہیے کہ چھری کی دھار کو تیز کرے نیز جانور کے سامنے چھری تیز کرنا مکروہ ہے، ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں کسی آدمی نے جانور کے سامنے چھری تیز کی تو آپؓ نے اسے درّے سے مارا اور منع فرمایا کیونکہ ایسا کرنے سے جانور کو تکلیف ہوتی ہے، اور ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح کرنا بھی مکروہ ہے اور اس کی کراہت حدیث سے ثابت ہے۔

(ثم أخذها وأخذ الكبش فأضجعه) یعنی اس کے پہلو پر بیٹھ گئے۔

(ثم ذبحه) یعنی ذبح کرنے کا ارادہ کیا۔

(ثم قال بسم الله) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بسم اللہ تو ذبح سے پہلے ہے جو کہ اپنی جگہ برقرار ہے جبکہ یہ بسم اللہ جو دعا سے پہلے آرہی ہے، یہ مؤخر ہے ذبح سے پہلے والی تسمیہ سے۔

(اللهم تقبل من محمد وال محمد ومن أمة محمد) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس دعا میں مشارکت سے مراد ''مشارکت فی الثواب'' ہے کیونکہ ''مشارکت فی الغنم الواحد'' تو ہو ہی نہیں سکتی۔ جبکہ ابن الملک فرماتے ہیں کہ اگر کسی ایک فرد نے اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک بکری ذبح کردی تو ایسا کرنے سے سب کی طرف سے سنت ادا ہو جائے گی۔ اور اسی حدیث کی وجہ سے امام شافعیؒ امام احمدؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مستحب ہے آدمی کیلئے کہ جب وہ قربانی کرے تو یوں کہے کہ میں یہ قربانی اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے کررہا ہوں مگر یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مکروہ ہے۔ لیکن

علامہ طیبیؒ اور ابن الملکؒ، ان دونوں باتوں کا انکار کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے نہ تو استحباب ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی منع، بلکہ اس حدیث میں تو اشارہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ اللعالمین ہونے کی طرف، کہ جب آپ نے اپنے لئے دعا کی تو پوری امت کی قربانیوں کی قبولیت کیلئے بھی دعا کر دی، یا پھر مطلقاً ان کی عبادات کی قبولیت کیلئے دعا کر دی۔ (ازاد ذبحه) کی تائید کرتا ہے، نیز ''علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر ''ثم ضحى به'' سے مراد صبح کا کھانا ہے''۔ لیکن یہ مجازی معنی ہے اور اس کے مقابلے میں حقیقی معنی ہی اولیٰ ہے کیونکہ حقیقی معنی مراد لینے میں کوئی مانع نہیں ہے۔

قربانی کے جانور کی عمر کیا ہو؟

۱۴۵۵: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّةً اِلَّا اَنْ يَّعْسُرَ عَلَيْكُمْ فَتَذْبَحُوْا جَذَعَةً مِنَ الضَّاْنِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ۱۵۵۵/۳ حدیث رقم (۱۳۔ ۱۹۶۳)۔ وأبوداؤد فی السنن ۲۳۲/۳ حدیث رقم ۲۷۹۷۔ والنسائی ۲۱۸/۷ حدیث رقم ۴۳۷۸۔ وابن ماجه ۱۰۴۹/۲ حدیث رقم ۳۱۴۱۔ وأحمد فی المسند ۳۱۲/۳۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم قربانی میں مسنہ جانور ذبح کرو اگر مسنہ پانا مشکل ہو تو پھر دنبہ یا بھیڑ کا جذعہ ذبح کرو۔ (مسلم)

تشریح: مسنّۃ کا معنی بڑی عمر کا جانور ہے پس اونٹ میں بڑی عمر کا جانور وہ ہوگا جو اپنے پانچ سال مکمل کر چکا ہو۔ اور چھٹے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ اور گایوں میں بڑا جانور وہ ہوگا جو دو سال مکمل کر چکا ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ اور اسی طرح دنبہ، بھیڑ اور بکری میں وہ جانور بڑا متصور ہوتا ہے جو ایک سال سے زیادہ عمر کا ہو، اسی طرح ابن الملک نے کہا ہے۔

(الا أن يعسر) مگر یہ کہ تم پر مشقت ہو

(عليكم) یعنی اس کا ذبح کرنا تم پر مشقت کا سبب بن جائے بایں طور پر کہ تم اسے نہ پاؤ، یہ قول ابن الملک کا ہے، اور تم پر مشقت ہونے کا مطلب ظاہر ہے کہ تم پر اس کی قیمت ادا کرنا مشکل ہو جائے، اور ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد ''الا أن يعسر'' کی وجہ سے بعض فقہاء نے کہا کہ اگر کوئی شخص مسنّہ پر قادر ہو اور وہ پھر بھی جذعہ کو ذبح کرے تو یہ کفایت نہ کرے گا، کیونکہ رعایت مشقت کی صورت میں ہے اور یہاں کوئی مشقت نہیں پائی جا رہی بلکہ وہ تو قادر ہے مسنّۃ پر، اور جن لوگوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے وہ اس حدیث کو استحباب پر محمول کرتے ہیں۔ اور یہی قول مذہب میں معتمد ہے اور اس کی تائید اس حدیث یعنی:

''نعمت الأضحيه الجذعة من الضأن''

''بھیڑوں میں سے بہتر قربانی جذعہ کی قربانی ہے''۔ سے بھی ہوتی ہے، نیز امام احمد وغیرہ روایت کرتے ہیں: ''ضحوّا بالجذعة من الضأن'' (بھیڑوں میں سے جذعہ کی قربانی کرو)۔ پس ثابت ہوا کہ جذعہ کی قربانی جائز ہے۔

(من الضأن) ضأن ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اور جذعہ سے بدل بن رہا ہے اور جذعہ اس بھیڑ کو کہتے ہیں جو ایک سال سے چھوٹا ہو ابن الملک نے یہی کہا ہے، لیکن اتنی قید ضروری ہے کہ وہ چھ ماہ یا چھ ماہ سے زیادہ کا ہو اور دیکھنے میں ایک سال والے بھیڑ کے برابر لگتا ہو اور نہایہ میں ہے کہ جذع اونٹوں میں بھی ہوتے ہیں، گایوں میں بھی ہوتے ہیں اور اسی طرح بھیڑوں میں بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ دراصل جذع کہتے ہیں اس جانور کو جس کے دو دانت آ چکے ہوں اور وہ وہی ہوتا ہے جو جوان ہو۔ پس یہ صفت اونٹوں میں سے اس میں ہوتی ہے جو پانچویں سال میں داخل ہو چکا ہو، اور گائیں میں وہ ہوتا ہے جو دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہو اور بھیڑوں میں سے وہ بھی بذع کہلائے گا جو ایک سال سے کم ہو۔

لیکن شرح السنہ میں ہے کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ خواہ اونٹ ہو یا گائے دونوں میں دو دانتوں والا جانور ہی جائز ہے۔ اور وہ اونٹوں میں وہ ہوتا ہے جو پانچ سال مکمل کر چکا ہو، اور گائے اور بکری میں سے وہ ہوتا ہے جو دو سال مکمل کر چکا ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ اور اب رہی بات بھیڑ کی، تو اس میں اختلاف ہے پس اکثر اہل علم جن میں کچھ صحابہ اور تابعین بھی شامل ہیں، فرماتے ہیں کہ بھیڑا اگر ایک سال سے چھوٹا ہو تب بھی جائز ہے لیکن ان میں سے بعض یہ شرط لگاتے ہیں کہ وہ دیکھنے میں ایک سال والے کے برابر بھی لگتا ہو۔ جبکہ امام ارہریؒ فرماتے ہیں کہ بھیڑوں میں اسی بھیڑ کی قربانی جائز ہوگی جو دو سال یا اس سے زیادہ کا ہو جیسا کہ اونٹ اور گائے میں چھٹے اور تیسرے سال میں داخل ہونے کی شرط ہے۔ لیکن اصح قول وہی ہے جو ماقبل ذکر کر دیا گیا کیونکہ حدیث میں ہے:

''نعمت الأضحية الجذع من الضأن......''

مگر یاد رہے کہ یہ جو شرح السنۃ میں بکری کے بارے میں ہے کہ دو سال مکمل اور تیسرے سال میں داخل ہو تو جائز ہے اور اس پر تمام کا اتفاق ثابت کیا ہے، یہ شرح السنۃ والے کا تسامح ہے کیونکہ یہ قول تو صرف امام شافعیؒ کا ہے، پس اس کو اتفاق کے ساتھ تعبیر کرنا درست نہ ہوا۔

الازہار میں ایک روایت نقل کی گئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ادنیٰ جانور ذبح کرنے سے منع فرمایا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنے آپ کو مشقت میں ڈال دے کیونکہ اور احادیث میں ہے کہ ''الا أن یعسر علیکم'' یعنی تم پر مشقت نہ ہو، پس اس منع والی حدیث کو ترغیب علی الأکمل والافضل پر محمول کیا جائے گا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ ترغیب دینا چاہتے ہیں کہ قربانی میں افضل سے افضل جانور ذبح کرو اور جو افضل پر قادر ہو وہ ادنیٰ کی طرف رخ نہ کرے، اور افضلیت میں مراتب یوں ہیں کہ پہلے اونٹ پھر گائے پھر بھیڑ، مگر یہ مذکورہ ترتیب شرط کے درجے میں نہیں یعنی اگر کوئی شخص اونٹ پر قادر تھا مگر اس نے بکری ذبح کر دی تو اس کی قربانی ہو جائے گی، اگرچہ وہ اونٹ کرتا تو اس میں فقراء وغرباء کا زیادہ نفع تھا۔ جبکہ بعض شارحین نے کہا ہے کہ اس حدیث سے مراد مسنہ ہے اور وہ صرف گایوں میں ہی ہوتا ہے لیکن ان کا یہ کہنا درست نہیں اور نہ ہی یہ گائے کے ساتھ خاص ہے، (ان باتوں کو علامہ سیدؒ نے بھی ذکر کیا ہے)۔ (رواہ مسلم)

۱۴۵۶: عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَعْطَاهُ غَنَمًا يَقْسِمُهَا عَلٰى صَحَابَتِهٖ ضَحَايَا فَبَقِيَ عَتُوْدٌ فَذَكَرَهٗ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ضَحِّ بِهٖ اَنْتَ وَفِيْ رواية قُلْتُ

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَصَابَنِىْ جَذْعٌ قَالَ ضَحِّ بِهٖ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ١٠/٤۔ حديث رقم ٥٥٤٧۔ ومسلم في صحيحه ١٥٥٦/٣ حديث رقم (١٦۔ ١٩٦٥)۔ والترمذي في السنن ٧٤/٤ حديث رقم ١٥٠٠۔ والنسائي ٢١٨/٧ حديث رقم ٤٣٧٩۔ وابن ماجه ١٠٤٨/٢ حديث رقم ٣١٣٨۔ والدارمي في السنن ١٠٦/٢ حديث رقم ١٩٠٥٣۔ وأحمد في المسند ١٤٩/٤۔

ترجمہ: حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک بکریوں کا ریوڑ دیا تا کہ وہ اسے صحابہؓ میں قربانی کے لئے تقسیم کریں۔ تقسیم کے بعد بکریوں کا ایک بچہ باقی رہ گیا۔ انہوں نے اس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آپ اس کی قربانی کر لیں اور ایک روایت میں ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے دنبے کا ایک بچہ ملا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اس کی قربانی کر لو۔ (بخاری)

تشریح: (وعن عقبة...... غنمًا) یعنی بہت سی بکریاں دیں۔

(يقسمها على صحابته) صحابتہ سے أصحاب النبی ﷺ مراد ہیں۔

(ضحايا) یعنی قربانی کا ارادہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے عقبہ بن عامر کو بکریاں عنایت فرمائیں، نیز لفظ ضحایا، لفظ يقسمها میں ھا ضمیر جو کہ منصوب ہے، سے حال بن رہا ہے۔

(فبقى) یعنی تقسیم کے بعد باقی بچی،

(عتود) نہایۃ میں ہے کہ لفظ عتود، عین کے فتحہ کے ساتھ ہے اور اس کا معنی ہوتا ہے بکری کا یکسالہ طاقتور بچہ۔

(فذكره) یعنی عقبہ بن عامرؓ نے عتود کے باقی بچ جانے کے بارے میں بتایا۔

اس حدیث میں اس صحابی کے ساتھ اختصاص ہے اور اسی طرح ابن نیار نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان صحابی کو یہ بھی فرمایا تھا:

''يجزئ عنك ولا يجزی عن احدٍ بعدك'' (أخرجه البخاری)۔

''یہ بکری کا بچہ تیری طرف سے تو کافی ہو جائے گا مگر تیرے بعد اور کسی کیلئے کفایت نہ کر سکے گا۔

علامہ ابن حجرؒ نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔

لیکن ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ اختصاص کے باب میں یہ قاعدہ ہے کہ اختصاص کیلئے کوئی صریح اور متفق علیہ روایت ہونی چاہیے۔ جو کہ یہاں پر نہیں کیونکہ ایک روایت میں ابن نیار کے روایت کردہ الفاظ نہیں جبکہ دوسری روایت میں ہیں، تو ایسی صورت میں کوئی ایسی راہ نکالی جائے جس پر چلنے سے دونوں پر عمل ہو جائے اور وہ یہی ہے کہ ہم ''جذعة'' کے معنی کو عام رکھیں یعنی بکری کا بچہ خواہ وہ چھ ماہ سے زیادہ کا ہو یا کم کا بچہ یوں کہیں کہ وہ جذعہ جوان صحابی کے پاس بچا تھا وہ چھ ماہ سے بھی کم کا تھا۔ اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ جذعہ (بچہ) جو کہ چھ ماہ سے بھی چھوٹا ہے) صرف تیرے لئے ہے تیرے بعد کسی اور کیلئے یہ کفایت نہ کرے گا۔ پس ایسا کرنے سے دونوں روایتوں پر عمل ہو جائے گا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

اونٹ میں نحر اور باقی جانوروں میں ذبح افضل ہے

۱۴۵۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْبَحُ وَيَنْحَرُ بِالْمُصَلّٰى۔

(رواہ البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٥٤٦/٢ حديث رقم ٩٨٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کے جانور کو ذبح اور نحر کیا کرتے تھے عیدگاہ میں۔ (بخاری)

تشریح: (وعن ابن عمر قال:...... یذبح) یعنی بکری اور گائے۔

(وینحر) یعنی اونٹ کو نحر کرتے تھے۔ ذبح اور نحر میں فرق بتانا مقصود ہے کہ اگر بکری، بھیڑ یا گائے کو اللہ کے راستے میں یوم الاضحیٰ کو قربان کیا جائے تو اس کو ذبح کہتے ہیں جبکہ یہی معاملہ اگر اونٹ کے ساتھ کیا جائے تو اس کو نحر کہتے ہیں۔

(بالمصلی رواہ البخاری) علامہ سید فرماتے ہیں کہ تحقیق یہ حدیث ابن عمر ؓ کی روایت سے صلاۃ العید میں بھی گذر چکی ہے پھر اس حدیث کو مکان الذبح کے بیان کیلئے یہاں پر ذکر کر دیا، اس لئے کہ عیدگاہ میں ذبح کرنا شعار کو ظاہر کرنے کے اعتبار سے افضل ہے۔ نیز اس لئے بھی کہ اس کو ذکر کیا تاکہ قربانی کا وقت معلوم ہو جائے، جیسا کہ حضرت براءؓ بن عازب کی روایت ہے کہ:

"أول ما نبدأ في يومنا هذا أن نصلي فننحر"۔

اس دن یعنی عید کے دن ہم سب سے پہلے جو کام کرتے تھے وہ نماز عید تھی پھر اس کے بعد ہم نحر کرتے تھے۔ (اور یہی قول زین العرب کا بھی ہے)۔

اور اس سے ماقبل بھی صحیح مذہب کر چکے جس پر تمام جمہور کا اتفاق ہے نماز سے پہلے قربانی کسی صورت میں جائز نہیں۔

اونٹ اور گائے میں سات آدمی قربانی میں شریک ہو سکتے ہیں

۱۴۵۸: وَعَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْبَقَرَةُ عَنْ سَبْعَةٍ وَالْجَزُوْرُ عَنْ سَبْعَةٍ۔

(رواہ مسلم وابوداود واللفظ له)

أخرجه مسلم في صحيحه ٩٥٥/٢ حديث رقم (٣٥٢۔ ١٣١٨)۔ وأبوداوٗد في السنن ٢٣٩/٣ حديث رقم ٢٨٠٨۔ والنسائي ٢٢٢/٧ حديث رقم ٤٣٩٣۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قربانی کے لئے ایک گائے اور ایک اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے کافی ہے۔ (مسلم۔ ابوداوٗد)

تشریح: (وعن جابر...... عن سبعة) یعنی گائے سات آدمیوں کی طرف سے کافی ہو جائے گی۔

(والجزور) جیم کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی نحر کرنا اور یہ خاص ہے اونٹ کے ساتھ خواہ اونٹ مذکر ہو یا مؤنث، جزور عربی میں ذبح ہونے والے یا ذبح کئے ہوئے اونٹ کو کہتے ہیں۔

(عن سبعة) یعنی اونٹ بھی سات آدمیوں کی طرف سے قربان کیا جا سکتا ہے، نیز امام شافعیؒ اور بہت سے فقہاء کہتے ہیں کہ اونٹ اور گائے کی قربانی سات آدمیوں سے زیادہ کی طرف سے ادا نہیں ہو سکتی کیونکہ حدیث سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔

علامہ زین العرب فرماتے ہیں کہ اگر تم میں سے کسی ایک کی نیت اپنا حصہ کھانے کی تھی یعنی قربانی مقصد نہ تھا بلکہ صرف کھانا وغیرہ ہی مقصد تھا تو ایسی صورت میں امام شافعی کے نزدیک جواز کا قول ہے جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب تمام حصے داروں کی نیت خالص قربانی کی نہ ہوگی یہ جائز نہ ہوگا۔ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ بُدن میں سات آدمیوں کیلئے اشتراک جائز نہیں جب تک کہ نہ ہوں شرکاء ایک ہی گھر کے رہنے والے۔ (اس کو نقل کیا ہے علامہ سیدؒ نے) جبکہ علامہ ابن حجر العسقلانیؒ فرماتے ہیں: گائے میں سات حصے درست ہیں خواہ ایک ہی گھر کے رہنے والے ہوں یا علیحدہ علیحدہ اور اسی طرح اونٹ میں سات حصے درست ہیں۔ (رواہ مسلم)

بعض نے اس حدیث کو بخاری کی حدیث گمان کیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اور اس کے علاوہ مسلم شریف میں ایک روایت ہے:

''نحرنا مع رسول اللهﷺ البدنة عن سبعة، والبقرة عن سبعة'' کہ ہم نے قربانی کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ، اونٹ کی سات حصوں کے ساتھ اور گائے کی بھی سات حصوں کے ساتھ۔

(وابوداؤد واللفظ) یعنی حدیث کے الفاظ (له)۔

قربانی کرنے والے کے لئے مستحب امور

١٤٥٩: وَعَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا دَخَلَ الْعَشْرُ وَاَرَادَ بَعْضُكُمْ اَنْ يُّضَحِّيَ فَلَا يَمَسَّ مِنْ شَعْرِهٖ وَبَشَرِهٖ شَيْئًا وَفِيْ رِوَايَةٍ فَلَا يَاْخُذَنَّ شَعْرًا وَّلَا يَقْلِمَنَّ ظُفُرًا وَفِيْ رِوَايَةٍ مَنْ رَاٰى هِلَالَ ذِي الْحِجَّةِ وَاَرَادَ اَنْ يُّضَحِّيَ فَلَا يَاْخُذْ مِنْ شَعْرِهٖ وَلَا مِنْ اَظْفَارِهٖ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ١٥٦٥/٣ حديث رقم (٣٩- ١٩٧٧)- وأبوداؤد في السنن ٢٢٨/٣ حديث رقم ٢٧٩١- وأخرجه الترمذي في السنن ٨٦/٤ حديث رقم ١٥٢٣ والنسائي ٢١١/٧ حديث رقم ٤٣٦٤- وابن ماجه ١٠٥٢/٢ حديث رقم ٣١٤٩-

ترجمہ: حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب ذی الحجہ کا عشرہ شروع ہو جائے تو تم میں سے جس شخص کا قربانی کرنے کا ارادہ ہو تو وہ اپنے بال اور ناخن بالکل نہ کٹوائے اور ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ پس ہرگز بال نہ کٹوائے اور نہ ہی ناخن تراشے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جو شخص عیدالاضحیٰ کا چاند دیکھ لے اور اس کا قربانی کرنے کا ارادہ ہو قربانی تک اپنے بال اور ناخن نہ کٹوائے۔ (مسلم)

تشریح: (وعن أم سلمة...... دخل العشر) یعنی جب ذی الحجہ کا عشرہ اولیٰ داخل ہو جائے۔

(وأراد) یعنی قصد ہو اور پکا ارادہ ہو۔

(بعضكم أن يضحى) وأراد بعضكم أن يضحى سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کرنے والے پر قربانی کی خواہ فرض تھی یا نفل ہر طرح کی قربانی کرنے والے پر یہ حدیث صادق آتی ہے۔ پس اس حدیث سے فرض یا نفل قربانی کی کوئی تخصیص معلوم نہیں ہوئی۔

شرح السنۃ میں ہے کہ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قربانی فرض یا واجب نہیں ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ یہاں پر ''أراد'' کے الفاظ استعمال کئے گئے۔ پس اگر یہ فرض ہوتی تو آپ اس کو ارادے پر محمول نہ کرتے بلکہ لزوم کے ساتھ ارشاد فرماتے۔ یہی مذہب حافظ ابن حجر العسقلانی کا ہے۔

لیکن میں (ملا علی القاری رحمہ اللہ الباری) ان کے اس قول کو رد کرتا ہوں، کیونکہ ایسے تو آنحضرت ﷺ نے حج کے بارے میں بھی فرمایا:

''من أراد الحج فليعجل''

''جس کا حج کا ارادہ ہو، اسے چاہیے کہ وہ جلدی کرے''۔

اسی طرح جمعہ کے بارے میں فرمایا: ''من أراد الجمعة فليغتسل''۔

''جو جمعہ پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ غسل کرے''۔

تو کیا ان ارشادات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج اور جمعہ فرض نہیں؟

پس یہی وجہ ہے کہ متاخرین شافعیہ میں سے بہت سے لوگوں نے یہی قول اختیار کیا ہے یعنی احناف والا قول اختیار کیا ہے۔

لیکن علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ:

ابن حجر العسقلانیؒ نے قربانی کے عدم وجوب کا قول کیا ہے اس لئے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما قربانی نہ کیا کرتے تھے، اس خدشے کی بناء پر کہ کہیں لوگ اس کو واجب نہ سمجھ لیں۔ حالانکہ یہ تو مستحب ہے۔ لیکن میں (ملا علی القاریؒ) اس کا جواب دیتا ہوں کہ اس حدیث کو محمول کیا جائے گا اس بات پر کہ ان حضرات پر قربانی واجب تھی ہی نہیں اس لئے کہ وہ دونوں حضرات صاحب نصاب نہ تھے، اور اگر وہ دونوں حضرات نصاب نہ ہونے کے باوجود بھی قربانی کرتے تو لوگ یہ سمجھتے کہ قربانی فقراء پر بھی واجب ہے حالانکہ ایسا نہیں، اور ویسے بھی جب ہم صحابہ کی حیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ صحابہ نے کسی ایک سنت کو اس لئے چھوڑا ہو کہ کہیں لوگ اس کو واجب نہ سمجھنے لگیں۔ کیونکہ ایسا کرنا تو شارع کی ذمہ داری ہوتی ہے، کیونکہ شارع ہی کا کسی چیز کو چھوڑنا یا نہ چھوڑنا اس کے وجوب یا عدم وجوب پر دلالت کر سکتا ہے۔ نیز اگر یہ دونوں حضرات قربانی کو چھوڑنے کے ساتھ ساتھ اس کی وجہ کی تصریح بھی فرما دیتے تو پھر شاید یہ دلیل بن سکتی مگر ان حضرات سے اس کے بارے میں کوئی صراحت نہیں پائی جاتی، لیکن صحیح قول یہ ہے کہ یہ قول اصحاب ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نہیں بلکہ خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا

ہے۔پھر علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد مبارک ہے۔

"علی أهل كل بيتٍ في كل عام أضحية و عتيرة"۔

لیکن یہ حدیث ضعیف ہے، ابن حجر بھی اس کو ضعیف ہی کہتے ہیں مگر میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث حسن ہے جیسا کہ عنقریب آئے گا اور ویسے بھی کسی حدیث کو مجتہد کا لینا اس کے قوی ہونے پر دلالت کرتا ہے اور بعد میں حدیث بیان کرنے والوں کی وجہ سے پیدا ہونے والا ضعف اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

پھر فرمایا (علامہ طیبیؒ نے) کہ عتیرہ تو بالاتفاق واجب نہیں ہے، ابن حجر نے بھی اس کا اتباع کیا ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بالاتفاق سنت نہیں کیونکہ یہ منسوخ ہے جیسا کہ امام ابوداؤد نے فرمایا ہے۔

(فلا يمس) سین مشدد کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی کاٹنا اور زائل کرنے کیلئے نہ چھونا۔

(من شعره) اس کو عین کے فتحہ اور سکون دونوں کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔

(و بشره) باء اور شین کے فتحہ کے ساتھ۔

(شيئا) علامہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ بعض نے یہ کہا ہے کہ ان دونوں سے اس لئے منع کیا تاکہ حجاج کرام کے ساتھ مشابہت ہوجائے لیکن اولیٰ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ قربانی کرنے والا اپنے آپ کو سزا کا اہل سمجھتا ہے، کیونکہ وہ ایک جان (جانور) کو قتل کررہا ہے مگر وہ جب اس جانور کو آنحضرت ﷺ کے طریقے پر ذبح کرتا ہے تو یہ قتل نہیں بلکہ اس کی طرف سے فدیہ بن جاتا ہے۔تو پس اس کے ہر جزو کے بدلے میں اس جانور کا ہر جزو فدیہ بن جاتا ہے۔لہٰذا قربانی کرنے والے کو بال اور مونچھیں وغیرہ کاٹنے سے منع کردیا تاکہ اس کے بدن کے ہر ہر جزو کے بدلے اس پر رحمت نازل ہوسکے اگر وہ ناخن یا بال کاٹ لیتا ہے تو اس کے بدلے اس پر رحمت کا نزول نہ ہوگا۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ اس کے منع کرنے کی وجہ حجاج کے ساتھ تشبیہ ہے یہ درست نہیں کیونکہ اگر تشبہ مقصود ہوتو پھر خوشبو لگانے سے بھی منع وارد ہونی چاہیے تھی، پس حجاج کے ساتھ تشبیہ مقصود نہیں ہے۔

علامہ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں "بشر" سے ناخن مراد ہیں۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ علامہ مظہرؒ شاید اس وجہ سے یہ فرمارہے ہیں کہ باقی روایات میں بالوں کے ساتھ ناخن کا ذکر بھی ہے۔مگر علامہ مظہرؒ کا یہ خیال درست نہیں کیونکہ "بشر" کے معنی تو بالکل واضح ہیں۔کہ یہ انسانی کھال پر بولا جاتا ہے، اور ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس لئے اس سے منع فرمایا ہو کہ بعض دفعہ انسان کی کھال کسی جگہ سے خراب ہوجاتی ہے اس کو چھیلنے کی ضرورت پڑتی ہے۔پس اسی نقطۂ نظر کے تحت آنحضرت ﷺ نے اس کے چھیلنے سے بھی منع فرمادیا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے اس حدیث کے ظاہری معنی کو دیکھتے ہوئے جب تک قربانی نہ ہوجائے بال وغیرہ کاٹنے کو ناجائز قرار دے دیا۔جبکہ امام مالکؒ اور شافعیؒ اس کے استحباب کے قائل ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین اس میں رخصت دیتے ہیں۔الحاصل اس حدیث کی عبارت سے مختلف مذاہب وجود میں آتے ہیں مثلاً اگر کوئی قربانی کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کیلئے مستحب ہے کہ وہ ناخن اور بال نہ کٹوائے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے یہ مباح ہے لہٰذا اگر اس نے کٹوا لیے تو کوئی

کراہت نہیں اور نہ ہی یہ مستحب ہے، اور امام احمدؒ فرماتے ہیں، اگر اس نے ناخن یا بال کٹوائے تو اس نے حرام کام کیا یعنی امام احمد مکروہ تحریمی کے قائل ہیں۔

(رحمة الامة فی اختلاف الأئمة میں ایسے ہی مذکور ہے) اس سبب کے باوجود حدیث کے شارحین کے کلام سے احناف کے بارے میں یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مستحب ہے، تو ایسی صورت میں ماقبل رخصت کے قول کا معنی یہ کیا جائے گا کہ حدیث میں نہی سے مکروہ تنزیہہ مراد ہے، پس اس کا خلاف کرنا اولیٰ اور افضل کا خلاف تو ہوسکتا ہے مگر مکروہ نہیں ہوسکتا ہے جبکہ امام شافعی اس کے مکروہ کے قائل ہیں۔

فلا یأخذن نون تاکید کے ساتھ ہے یعنی ہرگز ہرگز زائل نہ کرے۔

(شعرًا و لا یقلمن) لام کے کسرہ اور یاء کے فتحہ کے ساتھ، اور بعض نے کہا کہ نون ثقیلہ کے ساتھ ہے بمعنی نہ کاٹے۔

(ظفرًا) دونوں کے ضمہ کے ساتھ، اور صرف فآء کے سکون کے ساتھ بھی پڑھ سکتے ہیں، اور قاموس میں ہے کہ اس کو کسرہ سے بھی پڑھ سکتے ہیں مگر یہ شاذ ہے کیونکہ دوسرے حرف کے سکون والی قراءت شاذ ہوتی ہے۔ جیسا کہ امام حسن بصری کی قراءت میں ہے:

وعلى الذين هادوا حرمنا كل ذى ظفر۔

(وفی روایة من رأی هلال ذی الحجة) یعنی اس نے خود دیکھا یا اس کو کسی کے ذریعہ علم ہوا۔

(وأراد أن یضحی فلا یأخذ من شعره، ولا من أظفاره رواه مسلم)۔

عشرہ ذوالحجہ کے اعمال کی فضیلت

۱۴۶۰: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَامِنْ اَيَّامٍ الْعَمَلُ الصَّالِحُ فِيْهِنَّ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْاَيَّامِ الْعَشْرِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَاالْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ وَلَاجِهَادٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِلَّا رَجُلٌ خَرَجَ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فَلَمْ يَرْجِعْ مِنْ ذٰلِكَ بِشَيْءٍ۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۴۵۷/۲۔ حدیث رقم ۹۶۹۔ وأخرجه أبوداؤد ۸۱۵/۲ حدیث رقم ۲۴۳۸۔ والترمذی ۱۳۰/۳ حدیث رقم ۷۵۷۔ وابن ماجه ۵۵۰/۱ حدیث رقم ۱۷۲۷۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بھی ایسے ایام نہیں ہے کہ ان میں نیک عمل کرنا اللہ کے ہاں ان دس دنوں سے (یعنی ذوالحجہ کے پہلے عشرہ سے) زیادہ پسند ہو صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا بھی ان دنوں کے اعمال کے برابر نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں اللہ کے راستے میں جہاد کرنا بھی ان کے برابر نہیں۔ مگر وہ شخص جو اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد میں نکلا ہو اور پھر وہ بالکل واپس نہ آیا ہو۔ (یعنی اس کے اعمال ان دنوں سے بھی زیادہ افضل ہیں)

تشریح: (وعن ابن عباس قال...... من أيام) اس عبارت میں ''من'' زائدہ ہے، یعنی اَیام سے بعض اَیام نہیں بلکہ جملہ اَیام مراد ہیں۔

(العمل الصالح فيهن أحب) رفع کے ساتھ۔

علامہ طیبیؒ اس کی ترکیب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''العمل'' مبتداء ہے اور ''فیهن'' متعلق بہ ہے اور ''احب'' خبر ہے، جبکہ سارے کا سارا جملہ مَا کی خبر ہے۔ اور مَا کا اسم ''ایام'' ہے، اور پہلا ''حرفِ مِن'' زائدہ ہے جبکہ دوسرا مِن ''افعل'' کے ساتھ متعلق ہے جو کہ اس میں محذوف ہے گویا کہ یوں فرمایا گیا:

''ليس العمل فى أيام سوى العشر أحب الى الله من العمل فى هذه العشر''

علامہ ابن الملک فرماتے ہیں ان اَیام کے افضل واَحب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان ایام میں بیت اللہ کی زیارت ہوتی ہے اور اگر وقت افضل ہو تو اس جیسا کیا جانے والا ہر کام افضل ہوتا ہے۔

علامہ سیدؒ فرماتے ہیں کہ اس عشرہ کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا کہ یہاں سے رمضان کا آخری عشرہ مراد ہے کیونکہ اس میں لیلۃ القدر ہوتی ہے۔ اور بعض نے کہا کہ اس سے ذی الحجہ کا اول عشرہ مراد ہے۔ جن لوگوں نے رمضان کا عشرہ مراد لیا وہ لیلۃ القدر کی فضیلت کی وجہ سے لیا اور جن لوگوں نے ذی الحجہ کا عشر مراد لیا وہ وقوف عرفہ کی فضیلت کی وجہ سے لیا ہوگا۔

ہم کہتے ہیں کہ آپ کی دونوں باتیں درست ہیں کہ رمضان بھی افضل ہے اور ذی الحجہ کا عشرہ بھی افضل ہے، مگر یہاں پر ذی الحجہ کا عشرہ ہی مراد ہے کیونکہ آپ ﷺ نے ''أیام'' کا لفظ استعمال کیا۔ اگر رمضان مراد ہوتا تو اَیام کے بجائے ''لیال'' کا لفظ استعمال فرماتے (الأزهار میں ایسے ہی لکھا ہے)۔

(قالوا يا رسول الله ولا الجهاد) رفع کے ساتھ ہے۔

(في سبيل الله) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ان ایام کے علاوہ میں جہاد فی سبیل اللہ سے بھی افضل ہے ان ایام میں کوئی صالح عمل کرنا، اور اس معنی کی اچھے طریقے سے وضاحت کر دی جائے گی فصل ثانی میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کے تحت۔ (بشيء) یعنی وہ خرچ کرے اپنے مال اور اپنی جان کو اللہ کے راستے میں، علامہ ابن الملک فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مال کو لگائے اور اپنے خون کو بہائے اللہ کے راستے میں پس یہ جہاد افضل اور اَحب ہوگا اعمال میں سے اللہ تعالیٰ کے ہاں ان ایام میں، اس لئے کہ ثواب تو بقدر مشقت کے ہوتا ہے۔ اور اس کی تعلیل میں ایک لمبی بحث ہے۔

(رواہ البخاری) میرکؒ فرماتے ہیں: اور ابوداؤد اور ترمذی اور ابن ماجہ۔

الفصل الثّانی:

خصی جانور کی قربانی جائز ہے

۱۴۶۱: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ ذَبَحَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الذَّبْحِ كَبْشَيْنِ اَقْرَنَيْنِ اَمْلَحَيْنِ

مَوْجُوْئَیْنِ فَلَمَّا وَجَّهَهُمَا قَالَ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ عَلٰی مِلَّةِ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ عَنْ مُحَمَّدٍ وَاُمَّتِهٖ بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ ثُمَّ ذَبَحَ (رواہ احمد وابوداود وابن ماجة والدارمی وفی روایة لِاَحْمَدَ وَاَبِیْ داود والترمذی) ذَبَحَ بِیَدِهٖ وَقَالَ بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ اَللّٰهُمَّ هٰذَا عَنِّیْ وَعَمَّنْ لَمْ یُضَحِّ مِنْ اُمَّتِیْ۔

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲۳۰/۳ حدیث رقم ۲۷۹۵۔ والترمذی ۸۵/٤ حدیث رقم ۱۵۲۱ وابن ماجه ۱۰٤۳/۲ حدیث رقم ۳۱۲۱۔ والدارمی ۱۵۳/۲ حدیث رقم ۱۹٤٦۔ وأحمد فی المسند ۳۷۵/۳۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (قربانی کے دن) دو مینڈھے ذبح کئے جو سینگ والے اور چتکبرے اور خصی تھے پس جب ان کو ذبح کرنے کے لئے قبلہ رخ لٹایا تو فرمایا (یعنی یہ دعا پڑھی) انی وجهت وجهی...... ۔ کہ بے شک میں اپنے چہرہ کو متوجہ کرتا ہوں اس ذات کی طرف جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا۔ اس حال میں کہ میں ملت ابراہیمی پر ہوں جو کہ یکسو تھے اور نہیں ہوں میں مشرکین میں سے' بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو کہ جہانوں کو پالنے والا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ اے اللہ یہ قربانی تیری عطاء سے ہے اور تیرے لئے ہی ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کی طرف سے۔ پھر بسم اللہ اللہ اکبر پڑھا اور پھر ذبح کر دیا (احمد۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ۔ دارمی) احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی کی روایت میں ہے کہ اپنے ہاتھ سے ذبح کیے اور فرمایا بسم الله والله اکبر (یعنی واؤ کا اضافہ کے ساتھ) اللہ کے نام سے اللہ بہت بڑا ہے یہ قربانی میری طرف سے ہے اور میری امت میں سے ان افراد کی طرف سے ہے جنہوں نے قربانی نہیں کی۔

تشریح: (عن جابر قال: ذبح النبی ﷺ) اس سے مراد ذبح کرنے کا ارادہ کرنا ہے کیونکہ آگے ''فلما'' کے الفاظ آرہے ہیں جو کہ اس بات پر دلالت کرر ہے کہ آپ ﷺ نے اب تک ذبح نہیں کیا تھا بلکہ صرف ارادہ فرمایا تھا۔

(یوم الذبح) یعنی یوم الاضحیٰ اس کو یوم الذبح بھی کہتے ہیں۔

(کبشین أقرنین أملحین موجوء ین) موجوءین، میم کے ضمہ، جیم کے فتحہ، واؤ کے سکون، پھر جیم کے ضمہ، واؤ کے سکون اور ہمزہ مفتوح کے ساتھ ہے، جبکہ مصابیح میں ہے کہ یہ لفظ ''موجین'' میم کے ضمہ، جیم کے فتحہ اور یا مخففہ ومشددہ کے ساتھ ہے۔ لیکن یہ دونوں غلط ہیں کیونکہ ''المغرب'' میں ہے کہ اس کا معنیٰ ''خصیین'' ہے۔ علامہ ابن الملک فرماتے ہیں کہ موجیین بھی روایت کیا جاتا ہے۔ اور دراصل یہ موجوءین ہی سے مقلوب ہے کیونکہ اس میں ہمزہ اور واؤ کو یاء کے ساتھ بدل دیا گیا ہے بغیر کسی قاعدے کے۔

نہایہ میں ہے ''الوجآء'' کہتے ہی کوٹنے کو یعنی ایسا جانور جس کے خصیتین کو کوٹا گیا ہوتا کہ اس کی شہوت جماع ختم ہو جائے اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد وہ جانور ہے جس کی مخصوص جگہ کی رگوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دبا دیا گیا اور خصیتین اپنی اصل حالت

ہی میں موجود ہوں۔اور القاموس میں اس کا معنی کیا ہے کہ خصیتین کی رگوں کو دو پتھروں کے درمیان میں رکھ کر اس طرح کوٹنا کہ وہ باہر بھی نہ نکلیں اور اندر ہی اندر اپنی اصل حالت کھو دیں۔یعنی ٹوٹ جائیں (شرح السنۃ میں ایسے ہی ہے) بعض اہل علم نے ایسا کرنے کو مکروہ کہا ہے کیونکہ اس میں عضو کا ضائع کرنا ہے۔لیکن اصح قول یہ ہے کہ مکروہ نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے سے لحم کی لذت میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی کو خصی کرنا کہتے ہیں اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ یہ عضو جس کو خصی کیا گیا، مأکول نہیں ہے، اور قربانی میں مستحب یہی ہے کہ اپنے ہاتھ سے ذبح کیا جائے اگر اس پر قادر ہو تو اور یہی استحباب کا حکم عورت کیلئے ہے۔

(فلما وجهہما) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں فلما وجهہما کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان دونوں میں سے ہر ایک کا منہ قبلہ کی طرف کر دیا گویا کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کر دیا۔

(قال انی وجهت وجهی) یاء کے سکون کے ساتھ اور فتحہ کے ساتھ بھی ہے یعنی میں اپنی ذات کو بناتا ہوں منہ کرنے والا اس ذات کی طرف

(للذی فطر السموات والأرض) جس آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا

(علی ملة ابراهيم) یہ وجهت وجهی میں پائے جانے والے فاعل یا مفعول سے حال بن رہا ہے یعنی ''أنا علی ملة ابراهيم'' یعنی میں ملۃ ابراہیمی پر ہوں اصول میں اور بعض فروع میں۔

(حنيفًا) ابراہیم سے حال بن رہا ہے۔یعنی تمام ادیان باطلہ کو چھوڑ کر ایک ملت قیمہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے، ایسی ملۃ قویمہ جو کہ حقیقی توجیہہ پر مبنی ہے اور سیدھے راستے کی طرف دلالت کرتی ہے۔اور آپ ابراہیم علیہ السلام بالکل بھی ماسوی اللہ کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے جب ہی تو آپؑ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو یہ جواب دیا تھا جب جبرئیل علیہ السلام نے آپؑ سے عرض کیا تھا:

''ألك حاجة؟ تو آپؑ نے فرمایا: ''أما اليك فلا''۔

مجھے تیری کوئی ضرورت نہیں۔میرے لئے اللہ ہی کافی ہے۔

(وما أنا من المشركين) یعنی شرک کرنے والا نہیں نہ شرک جلی اور نہ ہی شرک خفی۔علامہ سیدؒ الازھار سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت ﷺ نبوت سے قبل کس شریعت پر تھے؟ بعض نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت پر، بعض نے کہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر، بعض نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر، لیکن صحیح قول یہ ہے کہ آپ کسی بھی شریعت کے عبادت نہ کرتے تھے کیونکہ تمام شریعتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی وجہ سے منسوخ ہو چکیں تھیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر بھی آپ عمل پیرا نہ تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ﴾ [الشوری۔۵۲] ''تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے اور نہ ایمان کو۔''

پس آپ کسی شریعت یا اس کے احکام کے تحت عبادت نہ کرتے تھے۔علماء فرماتے ہیں کہ آپ پہلے دن سے اللہ پر ایمان رکھتے تھے اور بتوں کی عبادت سے بالکل پاک تھے اور یہ مسئلہ اجماعی ہے، ہاں آپ کی عبادت کا طریقہ کیا تھا؟ یہ ہمارے علم میں

نہیں، علامہ ابن برہانؒ فرماتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس امر کو پردۂ خفا میں رکھا جیسا کہ آپ کے اور بہت سارے معجزات کو پردہ خفا میں رکھا، اور جاننا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ سے قبل النبوۃ میں بھی معجزات صادر ہوتے تھے۔ان کا نام طیبی ''ارھاص '' رکھا جاتا ہے۔پس یوں کہا جائے گا کہ آپ ﷺ قبل النبوۃ سب سے بڑے ولی تھے اور بعد النبوۃ انبیاء کے سردار بنے۔

(ان صلاتی ونسکی) یعنی میری ساری عبادات اور قربانی کے ذریعے قرب حاصل کرنا۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس دعا میں نماز اور ذبح کو جمع کیا گیا جیسا کہ اس آیت میں ہے: ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ [الکوثر۔۲]

(ومحیای) یاء کے فتحہ اور سکون کے ساتھ،

(ومماتی) سکون اور فتحہ دونوں کے ساتھ۔علامہ الطیبیؒ فرماتے ہیں کہ محیای ومماتی کا مطلب ہے کہ تمام وہ اعمال جو میں نے زندگی میں کیے اور وہ اعمال جن پر میری موت آئی ایمان اور اعمال صالحہ میں سے۔یا پھر اس کا مطلب یہ ہے ''میری زندگی اور میرا مرنا''

(للّٰہ) صرف اور صرف اللہ کیلئے ہے۔

(رب العالمین) لفظ اللہ کی صفت ہے۔بمعنی عالم کا خالق اور مالک، اور عالم میں عقلاء کو تغلیب ہوگی غیر عقلاء پر۔

(لا شریك له) یعنی الوھیت اور ربوبیت میں۔

(وبذلك) یعنی توجیہہ اور اخلاص کا۔

(اُمرت) حکم دیا گیا ہے۔

(وأنا من المسلمین) یعنی یہ قربانی کا جانور آپ ہی کا عطیہ ہے۔

(الیَّ) میری جانب آپ کی طرف سے عطاء ہوا ہے۔حدیث میں ترجمہ یہ ہوگا کہ ''یا اللہ یہ قربانی کا جانور تیری طرف سے ہی تھا اور تیرے لئے ہی اس کو قربان کرتا ہوں، پس یہ جملہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ امثال میں کہا جاتا ہے: ''مما لکم یھدی لکم ''۔علامہ ابن الملک فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے:

''اللھم اجعل ھذا الکبش منك، وجعلته لك وأتقرب به الیك ''۔

(عن محمد) یعنی محمد ﷺ کی طرف سے

(وأمته) یعنی امت میں سے وہ لوگ جو قربانی کرنے سے عاجز ہیں ان کی طرف سے۔پھر اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ خاص ہے اسی زمانے کے لوگوں کے ساتھ، لیکن تعمیم مناسب ہے، لیکن یہ شمولیت اور شرکت امت کی طرف سے قربان میں ثواب کے اعتبار سے ہے حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہے۔

(بسم اللّٰہ واللّٰہ اکبر ثم ذبح) یعنی اپنے ہاتھ سے ذبح کیا اور اسی کا حکم دیا۔

(رواہ احمد) اسی طرح ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے لیکن اس کی سند پر سکوت کیا ہے کیونکہ اس کی سند میں محمد بن اسحاق ہیں اور وہ ''عنعن'' سے بیان کرتے ہیں یعنی یہ حدیث ''حدیث معنعن'' ہے۔(ذکرہ میرك)

(وابن ماجه والدارمي) ابن حجرؒ فرماتے ہیں اس کو الحاکم نے بھی صحیح قرار دیا ہے۔

(وفي رواية لأحمد وأبي داؤد والترمذي ذبح بيده وقال: بسم الله والله اكبر اللّٰهم هذا) یعنی یہ کبش یا کبشین (جیسا ماقبل کبشین کا ذکر بھی آیا ہے)۔

(وعمن لم يضح من أمتي) پس اس موقع پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قربانی واجب ہے اور اس کا حساب بھی لیا جائے گا اس شخص سے جس پر قربانی کا نصاب پورا تھا مگر پھر بھی اس نے قربانی نہ کی۔

فوت شدہ کی طرف سے قربانی درست ہے

۱۴۶۲: وَعَنْ حَنَشٍ قَالَ رَأَيْتُ عَلِيًّا يُضَحِّي بِكَبْشَيْنِ فَقُلْتُ لَهُ مَا هٰذا فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْصَانِيْ اَنْ اُضَحِّيَ عَنْهُ فَاَنَا اُضَحِّيْ عَنْهُ. (رواه ابوداود وروى الترمذي نحوه)

أخرجه أبوداؤد في السنن ۲۲۷/۳ حديث رقم ۲۷۹۰۔ والترمذي ۷۱/٤ حديث رقم ۱٤۹۵ وأحمد في المسند ۱۵۰/۱۔

ترجمہ: حضرت حنشؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو دیکھا کہ وہ دو دنبے قربانی کرتے تھے تو میں نے آپؓ سے عرض کیا یہ کیا؟ (یعنی دو دنبوں کی قربانی کیوں کرتے ہو) تو فرمایا بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت کی ہے کہ میں (ان کی وفات کے بعد) ان کی طرف سے قربانی کروں پس میں اب آپ ﷺ کی طرف سے قربانی کرتا ہوں۔

(ابوداؤد۔ترمذی)

راویٔ حدیث:

حنش بن عبداللہ۔ یہ ''حنش'' عبداللہ سبائی کے بیٹے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کوفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے اور حضرت علی کی شہادت کے بعد مصر چلے آئے۔ ۱۰۰ھ میں وفات پائی۔ ''حنش'' حائے مہملہ مفتوحہ، نون مفتوح اور شین معجمہ کے ساتھ ہے۔

تشریح: (قال: رأيت عليًّا رضي الله عنه يضحي بكبشين) یعنی آپؓ نے دو جانور ذبح کیے یعنی اپنی قربانی کے علاوہ ایک مزید جانور ذبح کیا۔

(فقلت له ما هذا) یعنی اس دوسرے جانور کے ذبح کرنے کا سبب کیا ہے؟

(فقال: ان رسول اللهﷺ أو صاني) یعنی مجھے آنحضرت ﷺ نے حکم دیا تھا۔

(أن أضحي عنه) یعنی مجھے حکم دیا تھا کہ میں ان (ﷺ) کی طرف سے قربانی کروں ان کے وصال کے بعد، پس حضرت علیؓ نے دو جانور ذبح کیے ایک آپ ﷺ کی طرف اور ایک اپنی طرف سے۔

(فأنا أضحي عنه) ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کی طرف سے جو کہ فوت ہو چکا ہو، قربانی کرنا جائز ہے، شرح السنۃ میں ہے کہ بعض اہل علم ایسا کرنے کو درست نہیں جانتے۔ علامہ ابن المبارک فرماتے ہیں کہ

پسندیدہ یہ ہے کہ وہ شخص مرحوم کی طرف سے صدقہ کرے قربانی نہ کرے۔ کیونکہ قربانی جس سے تو وہ کچھ کھا نہیں سکتا البتہ صدقہ کی صورت میں اس کو ثواب ضرور ملے گا۔

(رواہ ابو دائود وروی الترمذی نحوہ) اور فرمایا کہ یہ حدیث غریب ہے، یہ حدیث شریک کے علاوہ کسی اور طرق سے معروف نہیں ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک کبش اپنی طرف سے اور دوسرا کبش آنحضرت ﷺ کی طرف سے ذبح کیا، اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ان کی طرف سے ہمیشہ قربانی کرتا رہوں پس میں ان کی طرف سے ہمیشہ قربانی کرتا رہوں گا۔

عیب دار جانور کی قربانی درست نہیں

۱۴۶۳: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نَسْتَشْرِفَ الْعَيْنَ وَالْاُذُنَ وَاَنْ لَّا نُضَحِّيَ بِمُقَابَلَةٍ وَلَا مُدَابَرَةٍ وَلَاشَرْقَاءَ وَلَاخَرْقَاءَ۔ (رواہ الترمذی وابوداود والنسائی والدارمی وابن ماجۃ وَانْتَهَتْ رِوَايَتُهُ اِلٰى قَوْلِهٖ وَالْاُذُنَ۔

أخرجه الترمذی فی السنن ۷۳/۴ حدیث رقم ۱۴۹۸۔ والنسائی ۲۱۶/۷ حدیث رقم ۴۳۷۳۔ وابن ماجه ۱۰۵۰/۲ حدیث رقم ۳۱۴۲۔ والدارمی ۱۰۶/۲ حدیث رقم ۱۹۵۲۔ وأحمد فی المسند ۱۰۸/۱۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم (قربانی کا جانور خریدتے وقت اس کا) کان اور آنکھ کو اچھی طرح چیک کر لیں اور ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس جانور کی قربانی نہ کریں جس کا کان اگلی یا پچھلی طرف سے کٹا ہوا ہو اور نہ ہی اس جانور کی جس کے کان لمبائی میں چیرے ہوئے ہوں۔ یا گولائی میں پھٹے ہوئے ہوں۔

(ترمذی، ابوداؤد، دارمی، نسائی) ابن ماجہ کی روایت صرف الاذن تک ہے۔

تشریح: (وعن علی قال...... والأذن) ذال کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے، یعنی ہم ان دونوں (آنکھ اور کان) کی حفاظت کریں، ایسا جانور خریدیں جس کی آنکھیں اور کان دونوں صحیح سالم ہوں اور خریدنے کے بعد بھی اس کو خراب ہونے سے بچانے کیلئے ہر ممکن کوشش کریں۔

(وأن لا نضحی بمقابلة) باء کے فتحہ کے ساتھ بمعنی ایسا جانور جس کے کان کا اگلا حصہ مقطوع ہو۔

(ولا مدابرة) ایسا جانور جس کے کان کا پچھلا حصہ مقطوع ہو۔

(ولا شرقاء) مدّ کے ساتھ ہے۔ بمعنی پھٹن اور کٹا ہوا ہونا، مراد یہاں یہ ہے کہ اس کے کان طولاً کٹے ہوئے نہ ہوں، کیونکہ اس سے زخم کا اردگرد کا حصہ بھی متاثر ہوتا ہے۔

(ولا خرقاء) مد کے ساتھ ہے، گولائی کے ساتھ کٹے ہوئے اور پھٹے ہوئے پر بولا جاتا ہے۔ پس جانور ایسا بھی نہ ہو۔ بعض نے کہا کہ الشرقآء وہ ہے جس کا کان طولاً کٹا ہوا ہو اور ''الخرقاء'' وہ ہے جس کا کان عرضاً کٹا ہوا ہو۔ علامہ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے نزدیک ایسی بکری کی قربانی جائز نہیں جس کا کان کچھ کٹا ہوا ہو۔ اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر کان کا

نصف سے کم حصہ کٹا ہوا ہو تو قربانی جائز ہے اور اسی طرح اگر سینگ ٹوٹا ہوا ہو تو پھر بھی کوئی حرج نہیں۔ علامہ طحاوی فرماتے ہیں کہ امام شافعی کا مستدل یہی حدیث ہے جب کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب دو حدیثوں کا مجموعہ ہے۔ ایک تو یہی حدیث اور دوسری حدیث حضرت قتادہؓ والی جس میں یہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے **عضباء القرن والأذن** سے، حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سعید بن مسیب سے پوچھا کہ **عضباء القرن والأذن** کیا ہوتا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا نصف یا زیادہ حصہ سینگ سے ٹوٹا ہوا ہو یا کان سے کٹا ہوا ہو۔ حاصل یہ کہ سارے کا سارا کان مقطوع ہو یہ جائز نہیں یا اکثر مقطوع ہو تب بھی جائز نہیں۔ اسی طرح نصف ہو تو تب بھی جائز نہیں۔ بخلاف اس جانور کے جس کا خلقۃً کان ہی نہ ہو، اسی طرح قربانی کا جانور نہ ہی تو دم کٹا ہوا اور نہ ہی ناک کٹا ہو، اور دم اور ناک میں بھی وہی مقدار معتبر ہوگی جو کہ اُذن میں تھی، اور نہ ہی وہ جانور جس کے تھن خشک ہو چکے ہوں، اور نہ ہی وہ جانور جس کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی ہو کیونکہ ایک آنکھ کے ضائع ہونے سے وہ صحیح طرح چارے وغیرہ کو نہ دیکھ سکے گا۔ اور نہ ہی وہ جانور ایسا ہو جس کی ہڈیوں میں روغن ختم ہو گیا ہو اور اس کی وجہ سے کمزور اور لاغر ہو گیا ہو، اور نہ ہی ایسا ہو جو اپنے منسک کی طرف از خود چل کر نہ جا سکتا ہو، اور نہ ہی اتنا بیمار ہو کہ چارہ نہ کھا سکتا ہو اور نہ ہی ایسا ہو کہ اس کی آنکھ میں ڈیلا نہ ہو۔ پس ان تمام کی تمام صفات کا قربانی کے جانوروں میں نہ پایا جانا ضروری ہے۔ (رواہ الترمذی) اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اس کو میرک نے بھی نقل کیا ہے **(وأبو دائود والنسائی والدارمی وابن ماجه وانتهت روايته)** یعنی ابن ماجہ کی روایت لفظ "الأذن" پر ختم ہو جاتی ہے۔

ٹوٹے سینگ والے جانور کی قربانی کا مسئلہ

۱۴۶۴: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ نُضَحِّيَ بِاَعْضَبِ الْقَرْنِ وَالْاُذُنِ۔

(رواہ ابن ماجۃ)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۲۳۸/۳ حدیث رُقم ۲۸۰۵ ۔ والترمذی ۷۶/٤ حدیث رقم ۱۵۰٤ والنسائی ۲۱۷/۷ حدیث رقم ٤۳۷۷۔ وابن ماجه ۱۰۵۱/۲ حدیث رقم ۳۱٤۵۔ وأحمد فی المسند ۸۳/۱۔

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ ہم ایسے جانور کی قربانی کریں جس کے سینگ ٹوٹے ہوئے ہوں اور کان کٹے ہوئے ہوں۔ (ابن ماجہ)

تشریح: (قال: نهى...... والأذن) یعنی سینگ ٹوٹا ہوا ہو اور کان کٹا ہوا ہو۔

لیکن حدیث کے ظاہری الفاظ پر ایک اشکال ہو سکتا ہے وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "**بأعضب القرن والأذن**" أعضب کہتے ہیں ٹوٹے ہوئے ہونے کو تو أعضب کا تعلق قرن کے ساتھ ہو گیا مگر اُذن کے ساتھ نہیں ہو سکتا کیونکہ اُذن تو ٹوٹتا نہیں بلکہ کٹتا ہے۔ لہٰذا یوں کہا جائے گا ان دونوں میں سے ایک کا تعلق کٹنے اور دوسرے کا تعلق ٹوٹنے کے ساتھ ہے تو پھر ان دونوں کو ایک ساتھ ہی کیوں ذکر کیا گیا؟

جواب اس کا یہ ہے کہ عرب میں ایسا ~~ہوتا ہے~~ کہ دو مختلف الأفعال اشیاء کو ایک فعل کے تحت ذکر کیا جاتا ہے جیسا کہ

عرب کا قول ہے: ''علفتها تبنًا و مآءً باردًا'' ترجمہ: ''میں نے اس کو چارہ اور پانی کھلایا''۔
اس مثال میں تعلیف کا تعلق تو صرف تبنًا کے ساتھ بن سکتا ہے مگر مآءً باردًا کو بھی ذکر کر دیا۔ پس اسی طرح حدیث میں ہوا ہے۔ نیز سینگ ٹوٹنے کے بارے کچھ تفصیل ہے وہ یہ کہ سینگ اگر جڑ سے ٹوٹا ہوا ہو تو قربانی جائز نہیں اور اگر جڑ کے علاوہ اوپر سے ٹوٹا ہوا ہو تو قربانی جائز ہوگی۔

۱۴۶۵: وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ مَاذَا يُتَّقٰى مِنَ الضَّحَايَا فَاَشَارَ بِيَدِهٖ فَقَالَ اَرْبَعًا اَلْعَرْجَاءُ الْبَيِّنُ ظَلْعُهَا وَالْعَوْرَاءُ الْبَيِّنُ عَوْرُهَا وَالْمَرِيْضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا وَالْعَجْفَاءُ الَّتِي لَا تُنْقِي۔ (رواه مالك واحمد والترمذى وابوداود والنسائى ابن ماجة والدارمى)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ٢٣٥/٣ حديث رقم ٢٨٠٢۔ والترمذى ٧٢/٤ حديث رقم ١٤٩٧۔ والنسائى ٢١٥/٧ حديث رقم ٤٣٧٠۔ وابن ماجه ١٠٥٠/٢ حديث رقم ٣١٤٤۔ والدارمى ١٠٥/٢ حديث رقم ١٩٤٩۔ ومالك في الموطأ ١٨٢/١ حديث رقم ١ من كتاب الضحايا۔ وأحمد في المسند ٢٨٩/٤۔

ترجمه: حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کس جانور کی قربانی سے بچا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کی انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ چار قسم کے جانور ① لنگڑا جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو ② ایسا کانا کہ اس کا کانا پن ظاہر ہو ③ ایسا بیمار جس کی بیماری ظاہر ہو ④ ایسا دبلا کہ جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔ (مالک۔ ترمذی)

تشريح: (وعن البراء...... ماذا يتقى) یعنی وہ کون سی صفات ہیں جو قربانی کے جانور میں نہ ہوں؟
(فأشار بيده) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے اشارہ کیا۔
(فقال أربعًا) پھر فرمایا کہ چار صفات ہیں جن سے بچا جائے یعنی ان جانوروں سے بچا جائے جن میں یہ چار صفات ہوں قربانی کے لحاظ سے۔
''أربعًا'' پر ایک اعتراض ہوتا ہے کہ سوال میں مجہول کا صیغہ یعنی یتقی مذکور تھا تو اس کے پیش نظر ''أربع'' ہونا چاہیے تھا نہ کہ ''أربعًا'' تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض نسخوں میں نتقی (جمع متکلم) کا صیغہ ہے ممکن ہے کاتب نے یہاں پر تاء کے ساتھ لکھ دیا ہو اور اگر نون کے ساتھ مان لیا جائے تو أربعًا پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یا أربعًا کا عامل فعل أمر ''اتق'' کو مان لیا جائے تو بھی ٹھیک ہے۔ لیکن میرے نزدیک اظہر قول یہ ہے کہ اصل میں جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ کرنے میں تھا اور آپ کا ''أربعًا'' والا قول ''أعني'' فعل کی وجہ سے منصوب ہے۔
(ظلعها) لام کے سکون اور فتحہ دونوں کے ساتھ بمعنی ایسا لنگڑا پن جو چلنے میں مانع ہو۔
(والعورآء) العرجاء پر عطف ہے۔
(البين عورها) دونوں کے فتحہ کے ساتھ یعنی اس کا نابینا ہونا ایک آنکھ سے لیکن بہتر ہے کہ اس کا دونوں آنکھوں سے نابینا ہونا مراد لیا جائے۔

(والمريضة البين مرضها) یعنی اس کو ایسا مرض ہو کہ وہ از خود چارہ نہ کھا سکتا ہو۔ ابن الملک فرماتے ہیں کہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا عیب جو مخفی ہو قربانی میں معاف ہے۔

(والعجفاء) بمعنی کمزور ہونا۔

(التي لا تنقي) بمعنی اتنا کمزور ہونا کہ کھڑا بھی نہ ہوا جائے یعنی اس کی ہڈیوں میں روغن نہ ہو جس کی وجہ سے ان میں طاقت ختم ہو گئی ہو

(رواہ مالک واحمد والترمذی) اور فرمایا کہ یہ حسن اور صحیح ہے، ذكره ميرك (وابو داؤد والنسائي وابن ماجه والدارمي)۔

موٹے تازے جانور کی قربانی کرنی چاہیے

۱۴۶۶: وَعَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُضَحِّیْ بِكَبْشٍ اَقْرَنَ فَحِيْلٍ يَنْظُرُ فِیْ سَوَادٍ وَّيَاْكُلُ فِیْ سَوَادٍ وَيَمْشِیْ فِیْ سَوَادٍ۔ (رواه الترمذی وابوداود وابن ماجه)

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۲۳۱/۳ حديث رقم ۲۷۹۶۔ والترمذی ۷۲/٤ حديث رقم ١٤٩٦۔ والنسائی ۲۲۰/۷ حديث رقم ٤۳۹۰ ۔ وابن ماجه ۱۰٤٦/۲ حديث رقم ۳۱۲۸۔

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے سینگ دار اور موٹے دنبے کی قربانی کرتے تھے جو سیاہی میں دیکھتا تھا اور سیاہی میں کھاتا تھا اور سیاہی میں چلتا تھا۔ (ترمذی۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ۔ نسائی)

تشریح: (وعن أبي سعيد...... أقرن فحيل) علامہ سیدؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد موٹا و فربہ جانور ہے۔ اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد جسامت میں بڑا ہونا ہے، بہرحال قربانی کے جانور کا سمین ہونا مستحب ہے۔ پس ایک موٹا جانور دو کمزور جانوروں سے افضل ہے، نیز گوشت کا زیادہ ہونا چربی کے زیادہ ہونے سے افضل ہے، لیکن گوشت اعلیٰ قسم کا ہو، اگر گوشت ردی قسم کا ہے تو تب موٹے جانور کو فضیلت حاصل نہ ہو گی۔ قاله في الأزهار۔

(ينظر في سواد) یعنی اس کی آنکھوں کے ارد گرد کا حلقہ سیاہ ہو۔

(ويأكل في سواد) یعنی اس کا منہ کا حصہ بھی سیاہ ہو۔

(ويمشي في سواد) یعنی اس کے پاؤں سفید ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ سیاہ بھی ہوں۔ (رواہ الترمذی) اور فرمایا کہ یہ حسن صحیح غریب ہے۔ اس کو میرک نے بھی نقل کیا ہے۔ (وابوداود والنسائي وابن ماجه)۔

بھیڑ کے چھ ماہ کے بچے کی قربانی جائز ہے

۱۴۶۷: وَعَنْ مُجَاشِعٍ مِنْ بَنِیْ سُلَيْمٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُوْلُ اِنَّ الْجَذَعَ يُوَفِّیْ مِمَّا يُوَفِّیْ مِنْهُ الثَّنِیُّ۔ (رواه ابوداود والنسائی وابن ماجة)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۳/۲۳۳ حديث رقم ۲۷۹۹۔ والنسائي ۷/۲۱۹ حديث رقم ۴۳۸۴۔ وابن ماجه ۲/۱۰۴۹ حديث رقم ۳۱۴۰ وأحمد في المسند ۵/۳۶۸۔

ترجمہ: حضرت مجاشعؓ جو کہ قبیلہ بنوسلیم کے ایک فرد ہیں ان سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ جذعہ کافی ہے اس سے کہ جس میں ثنی کافی ہو۔ (ابوداؤد۔ ابن ماجہ۔ نسائی)

راویٔ حدیث:

مجاشع بن مسعود۔ یہ "مجاشع" ہیں۔ "مسعود" کے بیٹے ہیں۔ اور "سلمی" ہیں۔ ان سے "ابوعثمان نہدی" نے روایت کی ہے۔ صفر ۳۶ھ میں جنگ جمل میں شہید ہوئے۔ ان کی حدیث اہل بصرہ کے یہاں مشہور ہے۔

تشریح: (وعن مجاشعؓ) میم کے ضمہ کے ساتھ۔

(من بني سليم) تصغیر کے ساتھ۔ علامہ میرکؒ فرماتے ہیں یہاں مجاشعؓ سے مجاشعؓ بن مسعود بن ثعلبہ بن وھب السلمی مراد ہیں نیز یہ حضرت مجالدؓ کے بھائی ہیں اور یہ دونوں صحابی ہیں۔

(أن رسول اللهﷺ كان يقول ان الجذع) یعنی جذع، بھیڑ میں سے۔

(يوفي) من التوفية، اور مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ جبکہ بعض نے کہا کہ یہ توفیۃ کے بجائے "ایفاء" سے ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے (أوفاه حقه ووفاه) یعنی اس نے اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ (مما يوفي منه الثني) یعنی جذع (چھوٹا بچہ) کفایت کر جائے گا ثنی میں سے یعنی بکری میں سے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ بھیڑ کا چھ ماہ کا بچہ کفایت کر جائے گا جیسا کہ بکری کا ایک سالہ بچہ کفایت کر جاتا ہے (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ)۔

۱۴۶۸: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ نِعْمَةُ الْاُضْحِيَةِ الْجَذَعُ مِنَ الضَّأْنِ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ۴/۷۴ حديث رقم ۱۴۹۹ وأحمد في المسند ۲/۴۴۵۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ دنبے کے جذع کی قربانی بہترین ہے (ترمذی)

تشریح: الأضحيه: ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ مگر ضمہ کے ساتھ زیادہ مشہور ہے۔

(الجذع من الضأن) نبی کریم ﷺ نے بھیڑ کے بچے کی تعریف فرمائی تا کہ لوگ جان لیں کہ قربانی دونوں میں جائز ہے یعنی بکری کے بچہ میں بھی اور بھیڑ کے بچے میں بھی۔

قربانی کے حصے

۱۴۶۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِیْ سَفَرٍ فَحَضَرَ الْاَضْحٰى فَاشْتَرَكْنَا فِی الْبَقَرَةِ سَبْعَةً وَّفِی الْبَعِيْرِ عَشَرَةً۔

(رَواہ الترمذی والنسائی وابن ماجۃ وَقَالَ الترمذی ھٰذاحدیث حسن غریب)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٧٥ حديث رقم ١٥٠١۔ والنسائی ٧/٢٢٢ حديث رقم ٤٣٩٣۔ وابن ماجه ٢/١٠٤٧ حديث رقم ٣١٣١ وأحمدفی المسند ١/٢٧٥۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ عید قربان کا موقع آ گیا تو گائے کی قربانی میں ہم سات آدمی شریک ہوئے اور اونٹ کی قربانی میں ہم دس آدمی شریک ہوئے۔ (ترمذی۔ ابن ماجہ۔ نسائی) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: (وعن ابن عباس...... فی سفر) حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ یہاں پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ سفر میں قربانی واجب ہی نہیں ہوتی۔ اس کے دو جواب ہیں: ① تھے تو سفر ہی میں مگر کسی شہر میں اقامت کی نیت کر لی تھی اس لئے قربانی واجب ہو گئی تھی۔ ② قربانی ان پر مستحب تھی نہ کہ واجب۔

(فحضر الأضحی) یعنی عید کا دن۔

(فاشترکنا فی البقرة سبعة) نصب کے ساتھ ہے بمعنی سات آدمی، منصوب ہونے کی وجہ بیان واقع ہونا ہے۔ جمع کی ضمیر کیلئے (علامہ طیبی کے قول کے مطابق) جبکہ بعض نے کہا کہ یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور بعض نے کہا کہ یہ مرفوع ہے بدل ہونے کی وجہ سے اشترکنا کی ضمیر سے۔ لیکن میرے نزدیک یہ مرفوع ہے مبتداء ہونے کی وجہ سے اور اس کی خبر مقدم ہے۔

(وفی البعیر عشرة) علامہ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ اسحاق بن راھویہ نے اس پر عمل بھی کیا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ عشرہ والی روایت منسوخ ہے اس قول "البقرة عن سبعة والجزور عن سبعة" کی وجہ سے، پس میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ حدیث معارض ہے روایت صحیحہ کے، جس میں بدنہ کے بارے میں سبعۃ کا ذکر ہے لہٰذا روایت صحیحہ کو لیا جائے گا اور عشرہ والی روایت کو چھوڑ دیا جائے گا۔

دس ذوالحجہ کو سب سے پسندیدہ عمل قربانی ہے

۱۴۷۰: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاعَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اِهْرَاقِ الدَّمِ وَاِنَّهٗ لَيَأْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَّقَعَ بِالْاَرْضِ فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْسًا۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٧٠ حديث رقم ١٤٩٣ وابن ماجه ٢/١٠٤٥ حديث رقم ٣١٢٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابن آدم کا نحر یعنی قربانی کے دن ایسا کوئی عمل نہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں خون بہانے سے زیادہ محبوب ہو اور بے شک وہ (یعنی قربانی میں ذبح شدہ جانور) قیامت کے دن اپنے سینگوں کے ساتھ اور اپنے کھروں کے ساتھ اور بالوں کے ساتھ آئے گا اور بے شک

قربانی کے جانور کا خون زمین پر گرنے سے قبل ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت کا مقام حاصل کر لیتا ہے لہٰذا تم اس کی وجہ سے اپنے نفس کو خوش کرو۔ (ترمذی۔ابن ماجہ)

تشریح: (وعن عائشة.....من عمل) من زائدہ ہے۔ استغراق کی تاکید کیلئے ہے یعنی کوئی بھی عمل ہو اس دن اھراق الدم سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ (یوم النحر) نصب کے ساتھ، ظرفیۃ کی بناء پر۔

(أحب) نصب کے ساتھ، بعض نے کہا کہ رفع کے ساتھ ہے تقدیری عبارت "هو أحب" ہوگی۔

(الی اللّٰه من اهراق الدم) یعنی خون بہانا۔

(و أنه) اس کی ضمیر راجع ہے۔ اس کی طرف جس پر اهراق الدم دلالت کر رہا ہے۔ علامہ طیبیؒ نے یہی فرمایا ہے۔

(ليؤتى يوم القيامة) یعنی قیامت کے دن اس جانور کو لایا جائے گا۔

(بفروثها) جمع فرث ہے بعض مینگیاں یعنی وہ نجاست جو کہ جانور کی آنت میں ہوتی ہے۔

فائدہ: بکری کا بچہ جب تک صرف دودھ ہی پیتا ہو چارہ وغیرہ نہ کھاتا ہو تو اس کی آنت کو "انفحة" کہتے ہیں اور جب وہ بڑا ہو جائے اور چارہ کھانے لگے تو اس کی آنت کو کرش کہتے ہیں تو پس خرث کی تعریف یوں ہوگی:

"وهو النجاسة التي في الكرش"۔

علامہ زین العرب فرماتے ہیں کہ قربانی کے جانور کے ہر عضو کے بدلے میں اجر ملے گا اور روز قیامت اپنے تمام اعضاء کے ساتھ آئے گا جیسا کہ دنیا میں تھا، نیز یہ جانور پل صراط پر سے گزرنے میں سواری کا کام دے گا اور فرماتے ہیں کہ ہر دن عبادت کے ساتھ خاص ہے مگر یوم النحر ایک ایسی عبادت کے ساتھ خاص ہے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا یعنی قربانی، اور اگر بکری کو ذبح کرنے سے افضل اس روز کوئی اور کام ہوتا تو اللہ جل شانہ حضرت اسماعیل کے بدلے میں اسی کام کو بدل قرار دیتا۔

(وان الدم ليقع من اللّٰه) یعنی اللہ کی رضا کیلئے اور اس کی رضا کے واسطے۔

(بمكان) یعنی رضا کی جگہ پر۔

(قبل أن يقع بالأرض) یعنی اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرما لیتے ہیں ذبح کے ارادے کے وقت ہی سے قبل اس سے کہ خون زمین پر گرے۔

(فطيبوا بها) یعنی قربانی خوش دلی کے ساتھ کرو۔ علامہ ابن الملک فرماتے ہیں کہ "فطيبوا بها" میں فآء شرط مقدر کا جواب ہے یعنی "اذا علمتم أنه تعالىٰ يقبله ويجزيكم بها ثوابًا كثيرًا فلتكن أنفسكم بالتضحية طيبة غير كارهة لها"

پس دل کی خوشی کے ساتھ قربانی کرنی چاہیے، اس طیب نفس پر ثواب بھی ملے گا اور قربانی کا ثواب تو الگ سے ملے گا ان شاء اللہ۔

(رواه الترمذي) علامہ میرک نے فرمایا اور امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن غریب فرمایا ہے۔ امام حاکم نے بھی اس کو

روایت کیا ہے اور فرمایا کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔ (وابن ماجہ)

عشرہ ذوالحجہ کی عبادت کی فضیلت

۱۴۷۱: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَامِنْ اَيَّامٍ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ اَنْ يُّتَعَبَّدَ لَهٗ فِيْهَا مِنْ عَشْرِ ذِی الْحِجَّةِ يَعْدِلُ صِيَامُ كُلِّ يَوْمٍ مِّنْهَا بِصِيَامِ سَنَةٍ وَقِيَامُ كُلِّ لَيْلَةٍ مِّنْهَا بِقِيَامِ لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔

(رَوَاهُ الترمذی و ابن ماجة وقال الترمذی اسناده ضعيف)

أخرجه الترمذی فی السنن ۱۳۱/۳ حديث رقم ۷۵۸ وابن ماجه ۵۵۱/۱ حديث رقم ۱۷۲۸۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایسا کوئی عمل نہیں کہ اس میں عبادت کرنا عشرہ ذوالحجہ سے زیادہ افضل ہو اس کے ہر دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر ہے اور اس عشرہ کی ہر رات کی عبادت شب قدر کی عبادت کے برابر ہے۔ (ترمذی) امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔

تشریح: (وعن أبی هريرة......ما) ما یہاں پر ''لیس'' کے معنی میں ہے۔

(من أيام) من زائدہ ہے۔ (و أيام) ما کا اسم ہے۔

(أحب الى اللّٰه) نصب ہے اس بناء پر کہ یہ خبر ہے ما کی اور بعض نے کہا ہے کہ ''أحب الى اللّٰه'' مرفوع ہے أیام کی صفت ہونے کی وجہ سے اور یاد رہے کہ یہاں پر أیام محلاً مرفوع ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ''أحب'' مفتوح ہوگا اس بناء پر کہ أیام کی صفت ہے اور صورت میں لفظی اعراب کو دیکھ کر اس کو مفتوح سمجھا گیا ہے کیونکہ أیام مکسور ہے اور أحب درحقیقت مکسور ہی ہے مگر چونکہ یہ غیر منصرف ہے اس لئے اس پر کسرہ کی بجائے فتحہ کو ظاہر کیا گیا ہے۔

(أن يتعبد) یہ محلاً مرفوع ہے بتاً ویل مصدر، أحب کا فاعل ہونے کی وجہ سے۔

(له) یعنی للّٰہ تعالیٰ۔

(فيها) یعنی فی الأيام۔

(من عشر ذی الحجة)۔

(يعول) بمعنی برابر ہونا۔

(صيام كل يوم منها) یعنی ذی الحجہ کا پہلا عشرہ، ابن الملک بھی یہی فرماتے ہیں، یعنی اول ذی الحجہ سے لے کر یوم عرفہ تک۔

(بصيام سنة) یعنی ایک سال کے روزے کے برابر ہے لیکن اس میں رمضان کے روزے داخل نہ ہوں گے اور ذی الحجہ کا عشرہ یعنی اس کا ایک روزہ ایسے ایک سال سے افضل ہے جس میں رمضان اور ذی الحجہ کے صیام نہ ہوں۔

(وقيام كل ليلة منها بقيام ليلة القدر رواه الترمذی و ابن ماجه وقال الترمذی اسناده ضعيف) علامہ منذری فرماتے ہیں کہ: بیہقی وغیرہ نے روایت کیا ہے یحییٰ بن عیسیٰ الرملی سے انہوں نے یحییٰ بن الجبلی سے اور انہوں نے عدی

بن ثابت سے اور یہ تینوں کے تینوں ثقات مشہور راوی ہیں پس عدی بن ثابت حضرت سعید بن جبیر سے اور یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں: کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کے ہاں ان ایام سے افضل یوم کوئی نہیں، اور نہ ہی ان میں کئے جانے والے عمل سے افضل کوئی عمل ہے (یعنی ذی الحجہ کا عشرہ) پس ان ایام میں کثرت کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہو، تکبیر پڑھو اور ذکر اللہ کرو۔ نیز اس کے ایک دن کا روزہ ایک سال کے روزے کے برابر ہے اور اس میں کیا جانے والا عمل سات سو گنا سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

الفصل الثالث:

قربانی کا وقت عید کی نماز کے بعد ہے

۱۴۷۲: عَنْ جُنْدُبِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ شَهِدْتُّ الْاَضْحٰى يَوْمَ النَّحْرِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يَعْدُاَنْ صَلّٰى وَفَرَغَ مِنْ صَلَاتِهٖ وَسَلَّمَ فَاِذَا هُوَيَرٰى لَحْمَ اَضَاحِيَّ قَدْ ذُبِحَتْ قَبْلَ اَنْ يَفْرُغَ مِنْ صَلَاتِهٖ فَقَالَ مَنْ كَانَ ذَبَحَ قَبْلَ اَنْ يُصَلِّيَ اَوْنُصَلِّيَ فَلْيَذْبَحْ مَكَانَهَا اُخْرٰى وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ صَلَّى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ النَّحْرِثُمَّ خَطَبَ ثُمَّ ذَبَحَ وَقَالَ مَنْ كَانَ ذَبَحَ قَبْلَ اَنْ يُصَلِّيَ فَلْيَذْبَحْ اُخْرٰى مَكَانَهَا وَمَنْ لَّمْ يَذْبَحْ فَلْيَذْبَحْ بِاسْمِ اللّٰهِ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاری فی صحيحه ۲ حديث رقم ۹۸۵ ومسلم ۱۵۵۱/۳ حديث رقم (۱۔ ۱۹۶۰)۔ والترمذی فی السنن ۷۸/٤ حديث رقم ۱۵۰۸۔ والنسائی ۲۱۲/۷ حديث رقم ٤۳۶۸۔ وابن ماجه ۱۰۵۳/۲ حديث رقم ۳۱۵۲۔ وأحمد فی المسند ۱۱۳/۳۔

ترجمہ: حضرت جندب بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں قربانی کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عید کی نماز کے لئے عیدگاہ میں حاضر ہوا ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ اور نماز سے پوری طرح فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کیا دیکھتے ہیں کہ قربانی کا گوشت رکھا ہوا ہے اور نماز عید سے فارغ ہونے سے پہلے ہی قربانی ہوگئی ہے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے عید کی نماز پڑھنے سے قبل قربانی کی یا فرمایا کہ ہمارے نماز پڑھنے سے قبل قربانی کی تو اسے چاہئے کہ اس جانور کی جگہ دوسرا جانور ذبح کرے اور ایک روایت میں ہے حضرت جندب فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عید قربان کے دن نماز پڑھائی پھر خطبہ ارشاد فرمایا اور پھر قربانی کا جانور ذبح کیا اور فرمایا کہ کہ جس شخص نے قربانی کا جانور ذبح کیا ہے اس سے پہلے کہ وہ عید کی نماز پڑھ لے یا ہم عید کی نماز پڑھ لیں پس چاہئے کہ وہ اس کی جگہ اور جانور ذبح کرے اور جس شخص نے نماز عید سے پہلے جانور ذبح نہیں کیا اسے چاہیے کہ وہ عید کی نماز کے بعد اللہ کا نام لے کر ذبح کرے۔ (بخاری)

تشریح: (عن جندب) جیم اور دال دونوں کے ضمہ کے ساتھ، یا صرف جیم کے ضمہ اور دال کے فتحہ کے ساتھ۔

(ابن عبداللہ قال شهدت) یعنی میں حاضر تھا۔

(ألاضحی) عید کے دن (ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہاں سے عیدگاہ مراد ہے) (یوم النحر) الأضحی سے بدل ہے۔

(مع رسول اللهﷺ فلم یعد) یعد، یاء کے فتحہ، عین کے سکون اور دال کے ضمہ کے ساتھ ہے، اور عدا یعدو سے ہے۔ اور بمعنی ''لم یتجاوز'' ہے۔

(ان صلی وفرغ من صلاته وسلم) عطف تفسیری ہے۔

(فاذا هو یری لحم أضاحی) یاء کی تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ ہے، یعنی ابھی تک آپ نماز سے فارغ ہو کر خطبہ پڑھنے کیلئے نہ گئے تھے کہ آپؐ نے قربانی کے جانور کا گوشت دیکھا۔ بعض نے کہا کہ آپ نماز سے فارغ ہو چکے تھے مگر ابھی تک گھر نہیں گئے تھے کہ اچانک قربانی کا گوشت دیکھا۔

(قد ذبحت قبل أن یفرغ من صلاته فقال من ذبح) ایک نسخہ صحیحہ میں ''من کان ذبح'' ہے۔

(قبل أن یصلی) لام کے کسرہ کے ساتھ، اس کی ضمیر آنحضرت ﷺ کی طرف راجع ہے۔

(فلیذبح مکانها) ذبیحہ سے بدل بن رہا ہے۔

(أخری) یعنی دوسرا قربانی کا جانور۔ حاصل یہ کہ وہ اب اس کی جگہ یا اسی کے بدلے میں دوسرا جانور قربان کرے۔

(وفی روایة قال: صلی النبیﷺ یوم النحر ثم خطب [ثم ذبح] وقال من ذبح) ایک نسخے میں ''من کان ذبح'' ہے۔

(قبل أن یصلی) یاء کے ساتھ۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ نون کے ساتھ ہے۔ اور بعض نسخوں میں تو ''أو نصلی'' کے الفاظ خود موجود ہیں۔

(فلیذبح أخری مکانها) حدیث کا یہ جملہ قربانی کے اعادہ کے واجب ہونے میں زیادہ صریح ہے۔

(ومن لم یذبح فلیذبح باسم الله) یہ ماقبل سے متعلق ہے۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ وہ بسم اللہ پڑھتے ہوئے ذبح کرے، اور اگر اس نے صرف اللهم کہا تو بھی جائز ہے، اور ''بسم الله'' صرف اس صورت میں ضروری ہوگا جب آنحضرت ﷺ نے خاص اسم اللہ کے ساتھ باء کے جڑے ہوئے ہونے کا قصد کیا ہو۔ اور اگر صرف اللہ کا نام لینے کا حکم دینا مقصد ہو تو فقط اللهم بھی کفایت کر جائے گا۔

قربانی کے تین دن ہیں

۱۴۷۳: وَعَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ قَالَ اَلْاَضْحٰی یَوْمَانِ بَعْدَ یَوْمِ الْاَضْحٰی۔ (رواہ مالك)

أخرجه مالك فی الموطأ ۲/۲۸۷ حدیث رقم ۱۲ من کتاب الضحایا۔

ترجمہ: حضرت نافع فرماتے ہیں کہ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ عیدالاضحیٰ کے دن کے بعد بھی قربانی کے دو دن ہیں۔ (مالک)

تشریح: (وعن نافع أن ابن عمر قال الأضحی) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ أضحاۃ کی جمع بمعنی قربانی،

''الأضحى اور''الأضحاة'' ایسے ہے جیسے''أرطى اور''أرطاة'' ہے،مراد یہاں پرقربانی کاوقت بتاناہے۔

(يومان بعد يوم الأضحى)یوم الأضحی سے پہلا دن مراد ہے۔أیام النحر میں سے ہے پس یوں تین دن ہوئے قربانی کے۔اوراسی حدیث سے امام ابوحنیفہ،امام مالک اوراحمداستدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قربانی کاوقت ایام تشریق کے چوتھے دن غروب شمس تک رہتاہے،جبکہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں قربانی کاوقت ایام تشریق کے آخری دن غروب شمس تک رہتا ہے۔الحاصل ہمارے نزدیک قربانی کے تین دن ہیں اورامام شافعی کے نزدیک چاردن ہیں۔لیکن یہ حدیث بالکل امام شافعی کے خلاف حجت ہے۔

علامہ ابن حجرالعسقلانی فرماتے ہیں کہ ایک خبرصحیح میں ہے کہ عرفہ سارے کا سارا موقف ہے اورایام منی سارے کے سارے قربانی کے دن ہیں (یادرہےایام منی گیارہ، بارہ، تیرہ ذی الحجہ ہے)۔ابن حجرؒفرماتے ہیں : درحقیقت اس مسئلہ میں أحادیث متعدد ہیں،ایک حدیث میں ہے''أیام تشریق میں ذبح جائزہے''اورابن حبان نے اس کوصحیح بھی کہاہے۔لیکن امام نوویؒ نے اس پراعتراض کیاہے یہ کہتے ہوئے کہ یہ حدیث صحیح نہیں بلکہ موقوف ہے۔اورایک موقع پرفرمایا:''یہ حدیث مرسل ہے''۔جاننا چاہیے کہ یہ حدیث (جوکہ امام شافعی کا مستدل ہے)مختلف ضعیف طرق سے ہم تک پہنچی ہے ايام التشريق كلها ذبح والی حدیث کی سندضعیف ہے جبکہ أیام منی،أیام نحر ہیں اس کی سندکوامام ابواسحاق المروزی نے صحیح کہاہےلیکن امام بیہقی نے اس میں نظرکی ہے۔

جبکہ میں یہ کہتاہوں کہ ایام تشریق اورایام منی کوتغلیباً ایام النحر کہا گیاہے۔علامہ ابن حجرؒفرماتے ہیں کہ آپ کی بات صحیح ہے کہ ان کی اسنادمیں کچھ ضعف ہے۔مگرایک ہی مفہوم کی احادیث متعددطرق سے جب منقول ہوں تواس سے ان کاضعف ختم ہوجاتاہےاورحسن کے درجے میں آجاتی ہے۔اوراسی وجہ سے ابن عباسؓ،جبیربن مطعمؓ بھی اسی کے قائل تھے،اورحضرت علیؓ سے بھی یہی منقول کیاگیاہے۔نیزتابعین کی ایک بہت بڑی جماعت اسی کی قائل ہے۔پس جولوگ اس مسلک میں امام شافعیؒ کواکیلا سمجھتے ہیں وہ غلطی پرہیں کیونکہ امام شافعیؒ کے ساتھ اس مُسلک میں بہت بڑی جماعت ہے۔نیزامام بیہقی نے توپورے حج کے مہینہ کوایام النحر کہاہے۔

۱۴۷۴:وَقَالَ بَلَغَنِيْ عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ مِثْلَهُ۔

ترجمہ:امام مالکؒ نے یہ روایت نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ مجھے سیدنا علی بن ابی طالب ﷛ سے بھی اس طرح کی روایت پہنچی ہے۔

تشریح:(وقال)اس کے قائل امام مالک ہیں۔

(بلغنی)ایک نسخہ میں''قال وبلغنی'' ہے۔

(عن علي بن أبي طالب مثله)مثلہ مرفوع ہے،مطلب یہ ہے کہ یہ روایت بھی ابن عمر ﷠ کی روایت کے مثل ہے۔

قربانی کے وجوب کی دلیل

۱۴۷۵: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشَرَ سِنِيْنَ يُضَحِّيْ ۔
(رواہ الترمذی)

أخرجه الترمذي في السنن ٤/٧٨ حديث رقم ١٥٠٧۔ وأحمد في المسند ٢/٣٨۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں دس سال رہے اور ہر سال قربانی کرتے تھے۔ (ترمذی)

تشریح: یعنی دس کے دس سال پابندی کے ساتھ قربانی کرتے رہے جو کہ اس کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں۔

قربانی کی ابتداء

۱۴۷۶: وَعَنْ زَيْدِبْنِ اَرْقَمَ قَالَ قَالَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَاهٰذِهِ الْاَضَاحِيْ قَالَ سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالُوْا فَمَا لَنَا فِيْهَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةٌ قَالُوْا فَالصُّوْفُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ بِكُلِّ شَعْرَةٍ مِنَ الصُّوْفِ حَسَنَةٌ ۔ (رواہ احمد وابن ماجۃ)

أخرجه ابن ماجه في السنن ٢/١٠٤٥ حديث رقم ٣١٢٧۔ وأحمد في المسند ٤/٣٦٨۔

ترجمہ: حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کی کیا حقیقت ہے؟ فرمایا کہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جاری کردہ طریقہ ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا پھر ہمارے لئے اس میں کیا ہے؟ یعنی کتنا ثواب ہے اے اللہ کے رسول۔ فرمایا کہ ہر بال کے بدلے نیکی ہے تو صحابہ نے عرض کیا کہ اون کا کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ اون کے ہر بال کے بدلے بھی نیکی ہے۔ (احمد)

تشریح: (وعن زید بن ارقم...... والأضاحی) تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ ما هذه الأضاحي؟ یعنی یہ قربانی ہمارے ہی شریعت کا خاصہ ہے؟ یا سابقہ شرائع میں بھی تھی؟

(قال سنة أبيكم) یعنی یہ وہ طریقہ ہے جس کے اتباع کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أن اتبع ملة ابراهيم حنيفاً﴾ [النحل۔۱۲۳]

پس یہ قربانی شرائع قدیمہ میں بھی تھی جس کو ہماری شریعت نے برقرار رکھا۔

(ابراهيم عليه السلام) ایک نسخہ میں ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ علیہ السلام کے بجائے صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہے۔

(قالوا فمالنا) ایک نسخہ میں اس کے بجائے ''ومالنا'' ہے۔

(فيها) ھآء ضمیر اُضاحی کی طرف راجع ہے۔ ومالنا فیھا کا مطلب یہ کہ اس میں ہمارے لئے ثواب کیا ہوگا؟

(قال بكل شعرة) عین کے سکون اور فتحہ دونوں کے ساتھ۔

(حسنةً) ''بکل'' میں باء بدلیت کیلئے یا سببیت کیلئے ہے۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں اس سے ثواب میں زیادتی اور کثرت بنانا مقصود ہے کہ جتنی کثرت سے جانور کے جسم پر بال ہوتے ہیں اتنی ہی کثرت سے ثواب ملتا ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''شعر'' کا لفظ استعمال کیا تھا جو کہ کنایہ ہے بکرے سے، تو اس سے صحابہ کے ذہن میں بھیڑ کی اون کا سوال پیدا ہوا کیونکہ ان کے جسم پر بال نہیں بلکہ ''صرف'' (اون) ہوتی ہے۔تو پس صحابہ نے پوچھا

(قالو فالصوف یا رسول اللہ) صحابہ کے پوچھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ یہ سمجھیں ہوں گے جس طرح ''دبر'' اونٹ کے بالوں اور اون کو کہتے ہیں تو شاید اسی طرح شعر صرف معز کے ساتھ خاص ہو۔

(قال بکل شعرة من الصوف حسنة) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: اون کے بھی ہر ریشہ کے بدلے میں ایک نیکی ملے گی۔

(رواہ احمد وابن ماجہ) اور فرمایا کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔

بَابُ الْعَتِيْرَةِ

عتیرہ کا بیان

لفظ عتیرہ، عین کے فتحہ کے ساتھ ہے اور بکری پر بولا جاتا ہے، مشرکین رجب کے اول عشرے میں ایک بکری ذبح کیا کرتے تھے اپنے اَصنام کے نام پر اور پھر اس کا خون اپنے اصنام کے سروں پر بہادیا کرتے تھے، اور اس کو عتیرہ کہتے تھے۔

الفصل الاول:

فرع اور عتیرہ کی اسلام میں کوئی حقیقت نہیں

۱۴۷۷: عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا فَرَعَ وَلَا عَتِيْرَةَ قَالَ وَالْفَرَعُ اَوَّلُ نِتَاجٍ كَانَ يُنْتَجُ لَهُمْ كَانُوْا يَذْبَحُوْنَهُ لِطَوَاغِيْتِهِمْ وَالْعَتِيْرَةُ فِیْ رَجَبَ ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۹/۵۹۶۔ حدیث رقم ۵۴۷۴۔ ومسلم ۳/۱۵۶۴ حدیث رقم (۳۸۔ ۱۹۷۶)۔ وأبوداؤد فی السنن ۳/۲۵۶ حدیث رقم ۲۸۳۱۔ والترمذی ۴/۸۱ حدیث رقم ۱۵۱۲۔ والنسائی ۷/۱۶۷ حدیث رقم ۴۲۲۲۔ وابن ماجه ۲/۱۰۵۸ حدیث رقم ۳۱۶۸۔ والدارمی ۳/۱۱۰ حدیث رقم ۱۹۶۴۔ وأحمد فی المسند ۲/۲۳۹۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام میں فرع اور عتیرہ نہیں ہے۔فرع جانور کا وہ پہلا بچہ ہے جو کافروں کے یہاں پیدا ہوتا تھا اور وہ اس کو اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے اور عتیرہ وہ جانور ہے جو رجب میں ذبح کیا جاتا تھا۔ (بخاری)

تشریح: (عن ابی هریرة...... لا فرع) یعنی اسلام میں فرع نہیں۔ فرع فآء اور عین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ ''فرع'' اونٹنی کے پہلے بچے کو کہتے ہیں۔ بعض حضرات نے اس کی اور تعریف بھی کی ہے۔ بہرحال مشرکین زمانہ جاہلیت میں اس کو اپنے معبودوں کے نام پر ذبح کرتے تھے۔ پھر جب اسلام کا سورج طلوع ہوا اور لوگ مسلمان ہونے لگے تو ابتدائے اسلام میں بھی مسلمان فرع کرنے لگے مگر بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوخ کر دیا مشابہت کی وجہ سے۔

(ولا عتیرة) عتیرہ اس بکری کو کہتے ہیں جس کو ماہ رجب میں مشرکین تقربًا الی الأصنام ذبح کرتے تھے، اور مسلمان بھی ابتدائے اسلام تقربًا الی اللہ اس کو ذبح کرتے تھے۔ پھر یہ منسوخ ہو گیا۔

(قال) اس کے فاعل ابو ہریرہؓ ہیں۔ اور الأزھار میں ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ قال کے فاعل ابو ہریرہ نہیں بلکہ قال کے بعد آنے والی تفسیر ابن شہاب کی ہے، یہی قول الخطابی کا ہے: الأعلام میں ہے کہ یہ تفسیر ابن رافعؓ کی ہے اور یہ کتاب مسلم میں بھی مذکور ہے، اور بعض نے کہا کہ یہ تفسیر خود ابو ہریرہؓ کی ہی ہے۔ میرے نزدیک آخری قول یعنی ابو ہریرہؓ والا قول ہی زیادہ اُقرب اور راجح ہے اور امام بخاری اور امام ترمذی بھی یہی پسند کرتے ہیں۔

(کانوا یذبحونه لطواغیتهم) یاء کے سکون کے ساتھ، اور جمع ہے طاغوت کی یعنی وہ اُصنام کیلئے ذبح کرتے تھے جیسا کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کیلئے کرتے ہیں۔

(والعتیرة) رفع کے ساتھ۔

(فی رجب شاة) یعنی وہ لوگ اس عتیرہ کو ماہ رجب میں ذبح کرتے تھے۔ علامہ ابن الملکؒ فرماتے ہیں کہ عتیرہ نام ہے ایک بکری کا جس کو مشرکین یہ کہتے ہوئے نذر کے طور پر ذبح کرتے تھے:

''ان کان کذا فعلي أن اذبح فی رجب کذا'' (کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو ماہ رجب میں اس کو ذبح کروں گا)۔

اور اس کا نام عتیرہ رکھتے ہیں۔ پس یہ دونوں اسلام میں ممنوع قرار دے دیئے گئے۔ لیکن اس موقع پر حدیث نبیشہ کی وجہ سے ایک اشکال پیدا ہوتا ہے، پہلے حدیث سنئے فرماتے ہیں کہ:

''قال رجل یا رسول اللّٰہ ان کنا نعتر عتیرةً فی الجاهلیة، فی رجب، فما تأمرنا؟''

ایک آدمی آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ ہم زمانہ جاہلیت میں عتیرہ ذبح کرتے تھے اب ہمارے لئے کیا حکم ہے؟

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''اذبحوا للّٰہ فی أی شهر کان وبروا للّٰہ وأطعموا'' (ابوداؤد)

اب تم اس جانور کو جس مرضی ماہ میں ذبح کرو اور اللہ کے ہاں اسکے ذریعے نیکی حاصل کرو۔ اور لوگوں میں اس کو تقسیم کرو۔

لیکن یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ حدیث ابتدائے اسلام میں معمول بہ تھی مگر بعد میں اس کا حکم منسوخ ہو گیا، پس یہی اس کا جواب ہے۔ اور وجہ منسوخ ہونے کی ''تشبه بأهل الأصنام'' ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر کسی کو وسعت ہو تو وہ ضرور جانور ذبح کرے (یعنی عید الاضحیٰ کے علاوہ) کیونکہ اس میں فقراء ومحتاجین کا فائدہ ہے مگر ایک ماہ خاص کر لینا جیسا کہ مشرکین نے رجب کا ماہ کر رکھا تھا یہ درست نہیں۔

(متفق علیہ) اور علامہ میرک فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو چاروں ائمہ نے روایت کیا ہے۔

الفصل الثانی:

عتیرہ منسوخ ہے

۱۴۷۸: عَنْ مِخْنَفِ بْنِ سُلَيْمٍ قَالَ كُنَّا وُقُوْفًا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعَرَفَةَ فَسَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ عَلٰى كُلِّ اَهْلِ بَيْتٍ فِيْ كُلِّ عَامٍ اُضْحِيَّةٌ وَعَتِيْرَةٌ هَلْ تَدْرُوْنَ مَا الْعَتِيْرَةُ هِيَ الَّتِيْ تُسَمُّوْنَهَا الرَّجَبِيَّةُ۔ (رواه الترمذی وابوداود والنسائی وابن ماجة وقال الترمذی هذا حديث غريب ضعيف الاسناد وقال ابوداود) وَالْعَتِيْرَةُ مَنْسُوْخَةٌ۔

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲۲٦/۳ حديث رقم ۲۷۸۸۔ والترمذی ۹۹/٤ حديث رقم ۱۵۱۸۔ والنسائی ۱٦۷/۷ حديث رقم ٤۲۲٤۔ وابن ماجه ۱۰٤۵/۲ حديث رقم ۳۱۲۵۔ وأحمد فی المسند ۲۱۵/٤۔

ترجمہ: حضرت مخنف بن سلیم فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان عرفات میں کھڑے تھے پس میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اے لوگو! ہر گھر والے پر ہر سال قربانی کرنا اور عتیرہ کرنا واجب ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ عتیرہ کیا ہے فرمایا عتیرہ وہ ہے کہ جس کو تم رجبیہ کہتے ہو۔ (ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ) اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب اور ضعیف ہے اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ عتیرہ منسوخ ہے۔

راویٔ حدیث:

مخنف بن سلیم۔ یہ ''مخنف'' ہیں سلیم کے بیٹے ہیں اور غامدی ہیں۔ ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے ''اصفہان'' کا حاکم مقرر فرمایا تھا۔ ان سے ان کے بیٹے اور ''ابورملہ'' نے روایت کی۔ ان کا شمار اہل بصرہ میں ہے۔ ''مخنف'' بروزن ''منبر'' ہے یعنی میم کے نیچے زیر' خائے معجمہ ساکن' نون پر زبر اور آخر میں فاء ہے۔ ''سلیم'' بصیغۂ تصغیر ہے۔

تشریح: (قال کنا وقوفًا) یعنی ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔

(مع رسول اللہ ﷺ بعرفة) یعنی حجۃ الوداع میں۔

(فسمعته یقول یا ایها الناس ان علی کل أهل بیت) ''انّ علی کل '' میں ''علی'' وجوب کیلئے ہے۔

(فی کل عام) یعنی ہر سال۔

(أضحية وعتيرة......الرجبية) یعنی وہی ذبیحہ جس کے بارے میں ماقبل ذکر ہوا، اس کو آپ ﷺ نے ''رجبیہ'' اس لئے فرمایا کہ یہ منسوب تھا ماہ رجب کی طرف۔

(رواه الترمذی وابو داؤد والنسائی وابن ماجه وقال الترمذی: هذا حديث غريب) امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے حتی کہ علامہ میرک فرماتے ہیں کہ ہم اس حدیث کو جانتے ہی نہیں مگر عون کے واسطے سے۔

(ضعيف الاسناد) علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ امام ترمذی کی طرف اس جملہ یعنی "ضعيف الاسناد" کی نسبت کرنے میں نظر ہے، کیونکہ امام ترمذی کی عبارت اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد یہ ہے:

"هذا حديث حسن غريب لا نعرف هذا الحديث مرفوعًا الا من هذا الوجه من حديث ابن عون"۔

پس اس عبارت میں ضعف کا حکم نظر نہیں آتا، اور یہی عبارت موجودہ بہت سے نسخوں میں پائی جاتی ہے اور اسی طرح "صاحب التخريج" نے نقل کیا ہے۔ علامہ الخطابیؒ فرماتے ہیں: ضعف کی وجہ ابورملۃ کا مخنف بن سلیم سے روایت کرنا ہے۔ اور یہ مجہول ہیں، بالکل اسی طرح اس بات کو ذکر کیا ہے علامہ سیدؒ نے، جبکہ علامہ نوویؒ شرح المہذب میں فرماتے ہیں:

روى أبو داؤد باسانيد صحيحة......"۔

ترجمہ: امام ابوداؤد نے اس مندرجہ ذیل حدیث کو صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے عتیرہ کے بارے میں پوچھنے والے کو جواب دیا:

"اذبحوا لله في أي شهر كان"

ترجمہ: جس مرضی چاہے ماہ میں قربانی کرو (یہاں سے قربانی نفلی مراد ہے)۔

میں (ملاعلی القاری) کہتا ہوں کہ فرع کا حکم دینا ٹھیک ہے لیکن تفصیل اس کی کچھ یوں ہوگی کہ اہل جاہلین تو سو اونٹوں پر ایک فرع دیتے ہیں جبکہ شریعت مطہرہ نے ہمیں پچاس اونٹوں پر ایک فرع کا حکم دیتی ہے، بلکہ اس کے ترک کو گناہ کبیرہ بتاتی ہے۔

نیز علامہ نووی یہ بھی فرماتے ہیں کہ صحیح وہی ہے جس پر امام شافعی ہیں اور احادیث بھی اسی کا تقاضا کرتی ہیں کہ ان دونوں کو مکروہ نہ کہا جائے بلکہ مستحب کہا جائے، یہی مذہب ہمارا ہے، جبکہ علامہ قاضی عیاض نے دعویٰ کیا ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک فرع اور عتیرہ کا حکم دینا منسوخ ہو چکا ہے۔

(وقال ابو داؤد والعتيرة منسوخة) ایک نسخہ میں العتیرہ سے پہلے واؤ نہیں ہے۔ علامہ ابوعبیدہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ عتیرہ اور فرع کے حکم کو علامہ سیدؒ کی نقل کردہ صحیح روایت نسخ کرتی ہے، روایت یہ ہے:

"لا فرع ولا عتيرة" [أخرجه البخاري في صحيحه]

علامہ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ عتیرہ اور فرع کے حکم والی حدیث اگر صحیح ہو بھی تو اس کو استحباب پر محمول کیا جائے گا۔

قربانی کا حکم:

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث یعنی "ان على كل اهل بيت في كل عام أضحية" سے قربانی کے وجوب کا قول کرتے ہیں کہ قربانی ہر مقیم پر جو کہ شہر رہتا ہو اور مالک نصاب ہو، واجب ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں: ہر مسافر پر بھی واجب ہے کیونکہ حدیث مطلق ہے۔ (اب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر قید لگانے کا اعتراض ہوگا پس غور سے پڑھئے ہم اس کا جواب پہلے ہی دے چکے ہیں)۔

اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں: سنة مؤكدة ولا تجب الا بالنذر۔ کہ قربانی سنت موکدہ ہے، واجب صرف اسی صورت

میں ہوگی جب نذر مان لی جائے۔ دلیل ان کی دو احادیث ہیں، پہلی حدیث مندرجہ ذیل ہے:

"قال رسول اللّٰہ ﷺ :الأضحی علی فریضة وعلیکم سنة" ترجمہ: قربانی مجھ پر تو واجب ہے پر تم پر سنت ہے۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ بے شک قربانی حضور ﷺ پر واجب تھی مگر وہ اللہ تعالیٰ شانہ کے فرض کرنے کی وجہ سے تھی اور ہم پر جو قربانی واجب ہے وہ حضور ﷺ کی سنت کی وجہ سے ہے۔

دوسری حدیث:

"قال رسول اللّٰہ: ثلاث کتبت علی، ولم تکتب علیکم الضحی والأضحی والوتر" (رواہ الطبرانی)

ترجمہ: حضور ﷺ نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو مجھ پر فرض کی گئی ہیں مگر تم پر فرض نہیں: ① چاشت کی نماز۔ ② قربانی۔ ③ وتر کی نماز۔

ہم اس کے جواب میں عرض کرتے ہیں کہ آپ علیہ السلام کا ارشاد بالکل ٹھیک ہے کہ وہ تین چیزیں آپ ﷺ پر تو فرض ہیں پر ہم پر فرض نہیں یعنی واجب ہیں جو کہ فرض سے کم ہے۔ پس یہ حدیث جس کو امام شافعی ہمارے خلاف پیش کرتے تھے یہ تو ہمارے ہی حق میں نکل آئی کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ یہ چیزیں واجب ہیں فرض نہیں اور آنحضرت ﷺ نے بھی وہی فرمایا کہ یہ مجھ پر فرض ہیں تم پر نہیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

الفصل الثالث:

۱۴۷۹: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُمِرْتُ بِيَوْمِ الْاَضْحٰى عِيْدًا جَعَلَهُ اللّٰهُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ قَالَ لَهٗ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَرَاَيْتَ اِنْ لَمْ اَجِدْ اِلَّا مَنِيْحَةً اُنْثٰى اَفَاُضَحِّيْ بِهَا قَالَ لَا وَلٰكِنْ خُذْ مِنْ شَعْرِكَ وَاَظْفَارِكَ وَتَقُصُّ شَارِبَكَ وَتَحْلِقُ عَانَتَكَ فَذٰلِكَ تَمَامُ اُضْحِيَّتِكَ عِنْدَ اللّٰهِ۔ (رواہ ابو داود والنسائی)

أخرجه أبو داؤد فی السنن ۳/۲۲۷ حدیث رقم ۲۷۸۹۔ والنسائی ۷/۲۱۲ حدیث رقم ٤٣٦٥ وأحمد فی المسند ۲/۱۶۹۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قربانی کے دن کو عید بنالوں اللہ تعالیٰ نے اس دن کو اس امت کے لئے عید بنایا ہے تو ایک شخص نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا کیا خیال ہے کہ اگر میں سوائے مادہ منیحہ جانور کے کچھ نہ پاؤں تو کیا پھر میں اس کی قربانی کرلوں تو فرمایا کہ نہیں لیکن تو اپنے بال کٹوالے اور اپنے ناخن تراش لے اور اپنی مونچھوں کو تراش لے اور زیر ناف بالوں کو مونڈ لے پس یہ تمام کے تمام اللہ کے ہاں آپ کی قربانی بن جائیں گے۔ (ابوداؤد۔ نسائی)

تشریح: (عن عبداللہ بن عمرو) عمرو واؤ کے ساتھ ہے قاعدہ ہے کہ جس عمر کے آگے واؤ لکھ دیا جائے وہ عمر، عمر

نہیں بلکہ عمرو بن جاتا ہے۔

أمرت بیوم الأضحی) یعنی مجھے اس دن کو عید بنانے کا حکم دیا ہے۔

(عیدًا جعله الله)ہٗ ضمیر کا مرجع یوم الاُضحیٰ ہے۔

(لهذه الأمة) یعنی اس امت کیلئے اللہ تعالیٰ نے اس دن کو عید بنایا ہے۔ علامہ طیبیؒ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ عیدًا منصوب ہے اس فعل کی وجہ سے جو اس کے بعد آ رہا ہے اور اس کیلئے مفسر بن رہا ہے، یعنی عبارت یوں ہوگی: ''بأن اجعله عیدًا''

مذکورہ بالا حدیث سے قربانی کا وجوب ثابت ہوتا ہے جو کہ ہمارا مذہب ہے اس سے وجوب کیسے ثابت ہوتا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ کیا آپ نے اس صحابی کا سوال نہیں پڑھا، اگر اس حدیث سے وجوب ثابت نہ ہوا ہوتا وہ صحابی کیونکر سوال کرتا، اور ایسی صورت میں ان کا سوال لغو چلا جاتا۔ پس ثابت ہوا کہ صحابی بھی وہی سمجھے تھے جو کہ ہم (ان کے قول سے) سمجھ سکے ہیں۔ یعنی وجوب۔

(قال له رجل یا رسول اللهﷺ أرأیت) اَرَاَیت بمعنی مجھے خبر دیجئے۔

(ان لم أجد الا منیحة) النہایۃ میں ہے کہ ''منیحة'' اس اونٹنی یا بکری کو کہتے ہیں جو ایک آدمی دوسرے آدمی کو نفع اٹھانے کیلئے دیتا ہے۔ تا کہ وہ اس سے دودھ وغیرہ حاصل کرے پھر بعد میں واپس کر دے۔ نیز منیحہ اس بھیڑ کو بھی کہتے ہیں جو ایک آدمی کسی دوسرے آدمی کو دے تا کہ وہ ایک محدود زمانے تک اس کی اون وغیرہ سے نفع اٹھائے اور پھر واپس کر دے۔

(أنثی) کہا گیا ہے کہ لفظ ''انثی'' ''منیحة'' کی صفت ہے، اور اس کا منیحہ کی صفت ہونا منیحة کے مذکر ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اگرچہ یہ دیکھنے میں مؤنث لگتا ہے بوجہ علامتِ تانیث کے۔

(افأضحی بها قال لا) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ شاید یہاں منیحہ سے وہ منیحہ مراد ہے جس سے وہ نفع اٹھاتا تھا جب ہی تو آپ ﷺ نے منع فرما دیا کیونکہ اس کے پاس اس کے علاوہ اپنی ضروریات پوری کرنے کیلئے کچھ اور نہ تھا۔

(ولکن خذ من شعرك) عین کے فتحہ اور سکون دونوں کے ساتھ ہے۔

(وتحلق عانتك فذلك) اس اشارہ کا مشارٌ الیہ وہ افعال ہیں جو ما قبل مذکور ہیں۔

(تمام أضحیتك عند الله) یعنی ان افعال کے بجالانے سے تجھے قربانی کا پورا ثواب ملے گا اگرچہ تو قربانی نہیں کر سکتا۔

حدیث کے ظاہری الفاظ سے عاجز کے علاوہ سب پر قربانی کا وجوب ثابت ہوتا ہے، اسی وجہ سے سلف کی ایک جماعت اس کی قائل ہوئی اور کہنے لگی: تجب حتی علی المعسر (کہ قربانی سب پر واجب ہے حتی کہ تنگ دست پر بھی واجب ہے ، اور اس کی تائید ایک اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ایک صحابی نے حضور ﷺ سے پوچھا:

''یا رسول الله استدین وأضحی'' ترجمہ: یا رسول اللہ کیا میں قرض لے کر بھی قربانی کروں''۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! کیونکہ یہ بھی ایک قرض ہوتا ہے، جس کو ادا کرنا ضروری ہے۔

ابن حجر فرماتے ہیں: یہ حدیث ضعیف، مرسل ہے۔
لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مرسل ہے تو ہمارے نزدیک حجت ہے اور اگر ضعیف ہے تو مؤید ہے اس لئے کہ ضعیف احادیث، فضائل میں مؤید کے طور پر ذکر کی جاسکتی ہیں۔ جبکہ جمہور کہتے ہیں کہ اسی کو مستحب پر محمول کیا جائے گا۔ نیز امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قربانی واجب نہیں مگر اس پر جو نصاب کا مالک، اور جمہور کہتے ہیں کہ یہ سنت مؤکدہ ہے، اور بعض نے کہا کہ یہ سنت کفایہ ہے۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی)

بَابُ صَلٰوۃِ الْخُسُوْفِ

صلوٰۃ خسوف کا بیان

خسوف یعنی گرہن، چاند میں بھی ہوتا ہے اور سورج میں بھی۔ صحاح میں ہے کہ خسوف لغت میں کہتے ہیں آنکھوں کے اندر دھنس جانے کو اور سر کی جانب چڑھ جانے کو، اور جب چاند کی طرف نسبت کریں تو معنی گرہن لگنے کے ہوں گے۔ امام ثعلبؒ فرماتے ہیں کہ سورج کیلئے کسوف کا لفظ اور چاند کیلئے خسوف کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور یہی سب سے عمدہ ہے۔
قاموس میں ہے کہ جب سورج یا چاند کے بعض حصے کو گرہن لگے تو اس کیلئے خسوف کا لفظ اور جب مکمل سورج یا چاند کو گرہن لگے تو کسوف کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔
لیکن مشہور وہی قول ہے کہ سورج کیلئے کسوف اور چاند کیلئے خسوف استعمال ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے: کسوف الشّمس اور خسوف القمر، نیز اولیٰ یہاں پر مؤلف کیلئے یہ تھا کہ وہ خسوف کے بجائے کسوف کہتے یعنی باب صلوۃ الخسوف کے بجائے باب صلوٰۃ الکسوف فرماتے، کیونکہ اس باب میں ساری کی ساری احادیث کسوف الشّمس سے ہی متعلق ہیں۔ یا پھر مؤلف کو چاہیے تھا کہ وہ باب صلوۃ الخسوف کے بجائے باب صلوٰۃ الکسوف والخسوف فرماتے کیونکہ ان دونوں کا حکم ایک ہی ہے اکثر مسائل میں (واللہ اعلم)
علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ کسوف میں سورج یا چاند کا رنگ سیاہی کی طرف مائل ہوتا ہے، پھر اس میں اختلاف ہے کہ کسوف اور خسوف دونوں ایک دوسرے کے مترادف ہیں یا نہیں۔ علامہ کرمانیؒ فرماتے ہیں یہ دونوں ہم معنی ہیں، جبکہ بعض نے کہا کہ کسوف رنگ کے بدلنے اور خسوف سورج یا چاند کے گم ہوجانے کو کہتے ہیں۔ لیکن فقہاء کی اصطلاح میں مشہور یہی ہے کہ کسوف شمس کیلئے اور خسوف قمر کیلئے ہے۔
امام ثعلب نے بھی اسی کو پسند کیا ہے اور امام جوھری نے فرمایا کہ یہی اُفصح قول ہے۔
قاضی عیاض بعض سے حکایت کرتے ہیں کہ اس کا عکس ہے یعنی شمس کیلئے خسوف اور قمر کیلئے کسوف ہوتا ہے۔ بعض نے کہا کہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے پر بولا جاتا ہے اور جب ہم احادیث کو دیکھتے ہیں تو ان میں بھی ہمیں ان کا ذکر اکٹھا ہی ملتا ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کسوف کا مدلول لغت کے اعتبار سے خسوف کے مدلول کا غیر نہیں ہے، کیونکہ کسوف کہتے ہیں رنگ کے

سیاہی کی طرف مائل ہونے کو اور خسوف کہتے ہیں نقصان کو، دونوں میں کسی قدر اشتراک ہے کیونکہ جب چیز سیاہ ہوتی ہے تو عام طور پر نظر نہیں آتی اور جب نقصان کی صورت میں کم ہوتی ہے تو تب بھی نظر نہیں آتی۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سبب کے باوجود ان دونوں کو مترادف نہیں کہا جا سکتا۔ اور بعض نے کہا کہ جب گرہن کی ابتداء ہو تو کسوف کہلاتا ہے اور جب انتہاء ہو تو خسوف کہلاتا ہے۔ (واللہ اعلم)

علامہ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سنت مؤکدہ ہے، بعض نے کہا کہ یہ فرض کفایہ ہے، اور علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ صلاۃ العید تو واجب ہے اس لئے کہ اس کی تاکید یا نسبت صلاۃ الکسوف کے زیادہ ہے، اور صلاۃ الکسوف بذات خود جمہور کے نزدیک سنت ہے بغیر کسی اختلاف کے، یا پھر واجب ہے ایک قول کے مطابق۔ (فتح القدیر)

یہاں عموماً دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ خسوف' کسوف۔ کسوف کا اطلاق سورج گرہن پر ہوتا ہے اور خسوف کا اطلاق زیادہ تر چاند گرہن پر ہوتا ہے اور لغت کے اعتبار سے دونوں لفظوں کا اطلاق ایک دوسرے پر ہوتا ہے مثلاً کبھی چاند گرہن کو کسوف کہتے ہیں اور کبھی سورج گرہن کو خسوف کہتے ہیں۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ کسوف سورج گرہن کو کہتے ہیں اور خسوف چاند گرہن کو کہتے ہیں اس باب میں جتنی بھی احادیث نقل کی گئی ہیں ان کا تعلق سورج گرہن والی نماز سے ہے ایک حدیث چاند گرہن کے متعلق بھی ہے۔ اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ مصنف کو چاہئے تھا کہ باب صلوٰۃ الکسوف کا عنوان قائم کرتے۔

حکم:

جمہور کے نزدیک صلوٰۃ الکسوف سنت ہے اور احناف کے نزدیک یہ نماز دو رکعت با جماعت بغیر خطبہ کے پڑھی جائے گی اور دوسری نمازوں کی طرح ہر رکعت میں ایک رکوع اور دو سجدے ہوں گے اور صلوٰۃ خسوف کی احناف کے ہاں مستقل جماعت نہیں سب لوگ اکیلے اکیلے اپنے طور پر پڑھیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک صلوٰۃ کسوف اور خسوف دونوں جماعت کے ساتھ پڑھی جائیں گی اور دونوں میں خطبہ بھی ہوگا ہر رکعت میں دو رکوع اور دو سجدے بھی ہوں گے۔

الفصل الاوّل:

آنحضرت ﷺ نے صلوٰۃِ کسوف طویل پڑھی

۱۴۸۰: عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ الشَّمْسَ خُسِفَتْ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَعَثَ مُنَادِيًا اَلصَّلٰوةُ جَامِعَةٌ فَتَقَدَّمَ فَصَلّٰى اَرْبَعَ رَكْعَاتٍ فِيْ رَكْعَتَيْنِ وَاَرْبَعَ سَجَدَاتٍ قَالَتْ عَائِشَةُ مَا رَكَعْتُ رُكُوْعًا قَطُّ وَلَا سَجَدْتُّ سُجُوْدًا قَطُّ كَانَ اَطْوَلَ مِنْهُ۔ (متفق علیه)

أخرج البخاری فی صحیحه ۲/۵۳۸۔ حدیث رقم ۱۰۵۱ ومسلم فی صحیحه ۲/۶۲۷ حدیث رقم (۲۰۔ ۹۱۰)۔ وأبو داؤد فی السنن ۱/۷۰۳ حدیث رقم ۱۱۹۰۔

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سورج گرہن ہو گیا پس آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم نے ایک منادی کو بھیجا کہ وہ الصلوٰۃ جامعۃ کی ندا لگائے۔ (کہ اے لوگو! نماز جمع کرنے والی ہے) پس جب لوگ جمع ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت نماز پڑھائی جن میں چار رکوع اور چار سجدے تھے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے کبھی اس سے لمبا رکوع نہیں کیا اور نہ ہی کبھی اس سے طویل سجدہ کیا ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: (عن عائشة قالت: ان الشمس خسفت) ایک نسخہ میں مجہول کا صیغہ ہے۔

(علی عهد رسول الله) یعنی ان کے زمانے میں۔

(ﷺ فبعث منادیاً: الصلاة جامعة) یعنی وہ اس جملے کے ساتھ منادی کر رہا تھا، ابن ہمام کہتے ہیں کہ یہ اس لئے منادی کی گئی تھی کہ جواب تک جمع نہ ہوسکا ہو وہ بھی اس جماعت میں مل جائے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: ''الصلاة'' مبتداء ہے اور ''جامعة'' خبر ہے، ترجمہ یوں ہوگا کہ نماز لوگوں کو جمع کرنے والی ہے، اور جائز ہے کہ یہاں پر مقدر عبارت نکالی جائے۔ اور یوں کہا جائے ''الصلاة ذات جماعة'' یعنی یہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے انفرادی نہیں ہوتی۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں اس کو عید کی نماز کی طرح جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں، لیکن اس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا اختلاف ہے پس امام صاحب فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں جماعت نہیں ہوتی لوگ منفرداً نماز پڑھیں گے۔ اور امام مالکؒ نے امام صاحب سے موافقت کی ہے خسوف القمر میں اور ادا کیا گیا ہے ان دونوں پر احادیث صحیحہ مسویہ بین الکسوفین کے ذریعے۔ علامہ ابن حجرؒ نے جو امام صاحب کی طرف یہ نسبت کی ہے کہ وہ کسوف الشمس میں جماعت کے قائل ہیں درست نہیں چنانچہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ کسوف بالاتفاق مسجد میں یا عیدگاہ میں جماعت کے ساتھ پڑھی جائے گی البتہ اوقات مکروہہ میں نہیں پڑھ سکتے۔

ہدایہ جلد ا صفحہ ۸۸ پر ''ولیس فی خسوف القمر جماعة'' کی عبارت بھی ملتی ہے اور اس کی تائید میں ابن الہمام فرماتے ہیں کہ دارقطنی نے جو حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ:

''أنهﷺ صلی فی کسوف الشمس، والقمر ثمان رکعات فی أربع سجدات واسناده جید)

ترجمہ: حضور ﷺ نے کسوف الشمس والقمر میں آئے (آٹھ رکوع اور چار سجدوں کے ساتھ نماز پڑھی)۔ (اس کی سند جید ہے)۔

اور اسی طرح حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔

''ان رسول اللهﷺ کان یصلی فی کسوف الشمس والقمر أربع رکعاتٍ وأربع سجدات''

[الدارقطنی ۶۴]

حضور ﷺ نے کسوف الشمس والقمر میں چار رکوع والی نماز چار سجدوں کے ساتھ پڑھی۔

علامہ ابن القطان فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں سعید بن حفص ہیں جن کے احوال سے ہم ناواقف ہیں تو ان احادیث میں جماعت کے ساتھ پڑھنے کی کوئی تصریح موجود نہیں لہٰذا اس میں اُصل عدم جماعت ہی ہوگا جب تک کہ تصریح نہ ہو جائے۔ (فتح القدیر)۔

(فتقدم) یعنی حضور ﷺ آگے ہوئے۔

(فصلی أربع رکعات) یعنی چار رکوع۔

(فی رکعتین وأربع سجدات) یہ ذکر کرنے کا مقصد رکوع میں زیادتی بتانا ہے نہ کہ سجدوں میں۔

(ما رکعت رکوعًا قط، ولا سجدت سجودًا قط، کان أطول منه) یعنی آپ ﷺ نے خسوف کے رکوع اور سجود کو جتنا طویل کیا کسی اور نماز کے رکوع وسجود کو اتنا طویل کبھی نہیں کیا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ الکسوف والخسوف دو رکعات کے ساتھ اسی صفت پر ہے۔ جس کو امام شافعیؒ اور امام احمد ذکر کرتے ہیں۔ اور باقی رہے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، تو آپ فرماتے ہیں یہ نماز دو رکعات ہیں، ہر رکعت میں ایک رکوع اور دو سجدے ہیں۔ نیز صلوٰۃ الخسوف والکسوف امام شافعیؒ اور امام احمد کے نزدیک جماعت کے ساتھ پڑھیں گے، اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کسوف بھی انفرادی پڑھیں گے جب کہ امامِ جمعہ موجود نہ ہو، اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کسوف الشمس کی نماز جماعت کے ساتھ اور خسوف القمر علیحدہ علیحدہ یعنی بغیر جماعت کے پڑھی جائے گی، جبکہ رکوع ان دونوں نمازوں کے عام نمازوں کی طرف ہی ہوں گے۔

(متفق علیہ) ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ: امام ابوحنیفہ نے تکریر رکوع والی احادیث صحیحہ کے ہوتے ہوئے بھی تکریر رکوع کا قول نہیں کیا۔ لیکن میں (ملا علی القاریؒ) اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ اس کی تحقیق امام ابن الہمام کے مطابق یہ ہے، علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں:

''وعندنا أقلها رکعتان، کسنة الصبح ودليل هذه خبر الحاکم......''۔

فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس کی کم از کم دو رکعات ہیں صبح کی نماز کی طرح اور دلیل اس کی وہ خبر ہے جس کو امام حاکم نے المستدرک میں جلد ا صفحہ ۳۳۵ پر ذکر کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث شیخین کی شرط پر ہے اور علامہ ذہبی نے بھی اس حدیث کے صحیح ہونے کا قول کیا ہے۔ وہ حدیث یہ ہے: حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دو رکعات نماز پڑھی، مثل تمہاری نماز کے، اور یہ روایت کسوف الشمس اور کسوف القمر دونوں کے بارے میں ہے، اور یہ بھی روایت صحیح ہے کہ ایک مرتبہ سورج گرہن ہوا:

''فخرج عليه السلام فزعا يجر ثوبه فصلى رکعتين فأطال فيهما القيام ثم انصرف وانجلت......''۔

ترجمہ: جب سورج گرہن ہوا تو آنحضرت ﷺ گھبرا کر باہر تشریف لائے پھر دو رکعات نماز پڑھی، اور ان دونوں میں قیام خوب طویل کیا پھر واپس تشریف لے گئے اور سورج بھی اپنی اصلی حالت میں لوٹ آیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: سورج گرہن اور چاند گرہن اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں نشانی ہے پس جب تم یہ دیکھو تو نماز پڑھو جیسا کہ فرض نماز پڑھتے ہو۔

(النسائی:۱۴۱)

پس اس حدیث میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی صریح دلیل موجود ہے۔ کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''فصلوا کأحدث صلاة صليتموها من المکتوبة'' اور جب قول اور فعل دونوں چیزیں ہمارے سامنے ہوں تو قول کو فعل پر ترجیح ہوتی ہے۔ اور باقی رہی وہ احادیث جن میں رکوع کی تعداد زیادہ ہے۔ وہ احادیث عقلاً بھی محل نظر ہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ کی حیات مبارکہ بعد

النبوۃ ایک مدتِ قلیل ہے اور اتنی قلیل مدت میں سورج یا چاند گرہن کا بار بار ہونا عادتاً محال ہے۔ یہ بات یعنی عقلاً محال ہونے والی، اس لئے کہ کہیں کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئے کہ شاید حضور ﷺ نے کسی اور موقع پر نماز پڑھی ہو اور اس میں ایک رکعت میں دو رکوع کئے ہوں (واللہ اعلم)

نمازِ خسوف کا بیان

۱۴۸۱: وَعَنْهَا قَالَتْ جَهَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ صَلَاةِ الْخُسُوْفِ بِقِرَاءَتِهٖ۔

(متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۵۴۹/۲۔ حدیث رقم ۱۰۶۵۔ وأبوداؤد فی السنن ۷۰۲/۱ حدیث رقم ۱۱۸۸۔ والترمذی ۴۵۲/۲ حدیث رقم ۵۶۳۔ والنسائی ۱۴۸/۳ حدیث رقم ۱۴۹۴۔

ترجمه: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ خسوف کے اندر بلند آواز سے قراءت کی۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: (وعنها) یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔

(قالت: جهر النبی ﷺ فی صلاة الخسوف بقراء ته) بعض نے کہا کہ یہاں خسوف سے خسوف القمر مراد ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ رات کے وقت کا ہے، بہرحال آپ ﷺ نے اس میں قراءت بلند آواز سے کی، ابن الملک نے بھی اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ جہراً قرآت مطلقاً ہے خواہ کسوف ہو یا خسوف۔ لیکن یہ مفہوم اس روایت کے مخالف ہے جس میں ہے کہ آپ ﷺ نے صلوٰۃ الکسوف اس طرح پڑھی کہ قراءت کی آواز کسی کو سنائی نہ دی، لیکن اس روایت پر ابن حبان کی روایت سے اعتراض ہوتا ہے، صحیح ابن حبان میں ہے "**أنه ﷺ جهر فی کسوف الشمس**" کہ آپ ﷺ نے کسوف الشمس میں جہراً قراءت کی"۔ علامہ ابن العربی ان دونوں روایتوں میں تطبیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اصل تو سرًا ہی ہے مگر ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے جواز بیان کرنے کیلئے جہراً بھی کر دی۔ لیکن میں (ملا علی قاری) کہتا ہوں کہ اس حدیث کی صحت کے بارے میں توقف کیا جائے گا کیونکہ کتب احادیث میں ہمیں مختلف احادیث ملتی ہیں، باقی رہی یہ بات کہ کسی میں جہراً قراءت کی ہوگی اور کسی میں سراً تو اس کیلئے بہترین جواب یہ ہے کہ خسوف القمر میں جہراً قراءت ہوگی کیونکہ یہ رات کے وقت پڑھی جاتی ہے اور کسوف الشمس میں سراً ہوگی کیونکہ یہ دن کے وقت پڑھی جاتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کا سورج گرہن کے موقع پر لوگوں کے اعتقاد فاسد کی نفی کرنا

۱۴۸۲: وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ انْخَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالنَّاسُ مَعَهٗ فَقَامَ قِيَامًا طَوِيْلًا نَحْوًا مِّنْ قِرَاءَةِ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ ثُمَّ رَكَعَ رُكُوْعًا طَوِيْلًا ثُمَّ رَفَعَ فَقَامَ قِيَامًا طَوِيْلًا وَهُوَ دُوْنَ الْقِيَامِ الْاَوَّلِ ثُمَّ رَكَعَ

رُكُوْعًا طَوِيْلًا وَهُوَ دُوْنَ الرُّكُوْعِ الْاَوَّلِ ثُمَّ سَجَدَ ثُمَّ رَفَعَ ثُمَّ قَامَ فَقَامَ قِيَامًا طَوِيْلًا وَهُوَ دُوْنَ الْقِيَامِ الْاَوَّلِ ثُمَّ رَكَعَ رُكُوْعًا طَوِيْلًا وَهُوَ دُوْنَ الرُّكُوْعِ الْاَوَّلِ ثُمَّ رَفَعَ فَقَامَ قِيَامًا طَوِيْلًا وَهُوَ دُوْنَ الْقِيَامِ الْاَوَّلِ ثُمَّ رَكَعَ رُكُوْعًا طَوِيْلًا وَهُوَ دُوْنَ الرُّكُوْعِ الْاَوَّلِ ثُمَّ رَفَعَ ثُمَّ سَجَدَ ثُمَّ انْصَرَفَ وَقَدْ انْجَلَّتِ الشَّمْسُ فَقَالَ اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰيَتَانِ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ لَايَخْسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَيَاتِهٖ فَاِذَا رَاَيْتُمْ ذٰلِكَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاَيْنَاكَ تَنَاوَلْتَ شَيْئًا فِيْ مَقَامِكَ هٰذَا ثُمَّ رَاَيْنَاكَ تَكَعْكَعْتَ فَقَالَ اِنِّيْ رَاَيْتُ الْجَنَّةَ فَتَنَاوَلْتُ مِنْهَا عُنْقُوْدًا وَلَوْ اَخَذْتُهٗ لَاَكَلْتُمْ مِنْهُ مَابَقِيَتِ الدُّنْيَا وَرَاَيْتُ النَّارَ فَلَمْ اَرَ كَالْيَوْمِ مَنْظَرًا قَطُّ اَفْظَعَ وَرَاَيْتُ اَكْثَرَ اَهْلِهَا النِّسَاءَ فَقَالُوْا بِمَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ؟قَالَ بِكُفْرِهِنَّ قِيْلَ يَكْفُرْنَ بِاللّٰهِ قَالَ يَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ وَيَكْفُرْنَ الْاِحْسَانَ لَوْ اَحْسَنْتَ اِلٰى اِحْدٰهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَاَتْ مِنْكَ شَيْئًا قَالَتْ مَا رَاَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٥٤٠۔ حديث رقم ١٠٥٢۔ مسلم في صحيحه ٢/٦٢٦ حديث رقم (١٧۔ ٩٠٧)۔ وأبوداوٗد في السنن ١/٧٠٢ حديث رقم ١١٨٩۔ والنسائي في السنن ٣/١٣٧ حديث رقم ١٤٨٢۔ وابن ماجه ١/٤٠٢ حديث رقم ١٣٦٥ ومالك في الموطأ ١/١٨٧۔ حديث رقم ٢ من كتاب صلاة الكسوف وأحمد في المسند ١/٢٩٨۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سورج گرہن ہو گیا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ سورۂ بقرہ کی قراءت کی بقدر لمبا قیام کیا پھر لمبا رکوع کیا اور پھر رکوع سے اٹھ کر طویل قومہ فرمایا۔ لیکن یہ قیام یعنی قومے والا پہلے قیام سے کم تھا پھر طویل رکوع کیا جو کہ پہلے رکوع سے کم تھا پھر رکوع سے سر اٹھایا پھر سجدہ کیا پھر دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے بہت طویل لیکن وہ پہلی رکعت سے قیام میں کم تھا اور پھر لمبا رکوع کیا جو کہ پہلے رکوع سے کم تھا پھر اپنا سر اٹھایا پھر سجدہ کیا پھر نماز سے فارغ ہوئے تو سورج روشن ہو چکا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ ان کو گرہن کسی کی موت کی وجہ سے نہیں لگتا اور نہ ہی کسی کی زندگی کی وجہ سے لگتا ہے۔ پس جب تم اس کو دیکھو تو اللہ کا ذکر کرو۔ صحابہؓ نے عرض کیا ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے اپنی اس جگہ سے کسی چیز کو لینا چاہا پھر ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ پیچھے ہٹ گئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں نے جنت دیکھی اور اس سے ایک انگور کا گچھا لینے کا ارادہ کیا اگر میں اس انگور کے گچھے کو لے لیتا تو بلاشبہ تم اسے رہتی دنیا تک کھاتے۔ اور میں نے جہنم کو دیکھا (یعنی جب تم نے مجھ کو پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھا) میں نے کبھی بھی کوئی منظر نہیں دیکھا جو کہ آج کے دن کی طرح خوفناک ہو۔ اور میں نے دیکھا کہ دوزخ میں اکثر عورتیں ہیں صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول کس وجہ سے فرمایا کہ ان کی ناشکری کی وجہ سے تو صحابہؓ نے عرض کیا کیا وہ اللہ کی ناشکری کرتی ہیں۔ فرمایا نہیں بلکہ وہ اپنے خاوندوں کی ناشکری کرتی ہیں اور نعمتوں اور احسان کی ناشکری کرتی ہیں اگر تم ان میں سے کسی ایک کے ساتھ پورا زمانہ حسن سلوک کرتے رہو اور پھر وہ تمہاری طرف سے کوئی ناگوارہ چیز دیکھ لے تو

کہنے لگی میں نے کبھی بھی آپ کے پاس بھلائی نہیں دیکھی۔(بخاری، مسلم)

تشریح: (وعن عبدالله بن عباس قال: انخسفت الشمس) بخاری شریف میں اسی طرح ہے جبکہ مسلم شریف میں ''انخسفت'' کے بجائے ''انکسفت'' ہے جبکہ شرح السنۃ میں ''خسفت'' ہے۔

(علی عهد رسول اللهﷺ فصلی رسول اللهﷺ والناس معه فقام) ''قام'' ٹھہرنے کے معنی میں ہے۔

(قیامًا طویلاً) لفظ طویلاً یا تو قیامًا کی صفت ہے یا ''زمانا'' کی صفت ہے جو کہ مقرر ہے

(نحوًا) بمعنی تقریباً اور اس کا بیان آگے آنے والا قول ہے۔یعنی

(من قراء ة سورة البقرة) سورۃ البقرۃ کی مقدار کے برابر، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں دلیل ہے، وہ یہ کہ راوی نے حضورﷺ کی آواز سنی ہی نہیں کہ انہوں نے کیا پڑھا پس اگر آپ جہراً پڑھتے تو راوی اندازے سے سورۃ البقرہ کی مقدار کا کیوں بتاتا، پس راوی کا اندازاً مقدار کا بتانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ نماز سراً تھی۔

(ثم رکع رکوعًا طویلاً ثم رفع) یعنی سر رکوع سے اٹھایا۔

(فقام قیامًا طویلاً، وهو دون القیام الأوّل ثم رکع رکوعًا طویلاً وهو دون الرکوع الأوّل) یعنی ہر قیام اور رکوع اپنے بعد والے قیام ورکوع سے اَطول تھا۔

(ثم رفع) یعنی سر اوپر اٹھایا۔

(ثم سجد ثم قام) ایک نسخہ میں ثم قام کے بجائے ''فقام'' ہے۔یعنی آپ رکعت ثانیہ کیلئے کھڑے ہوئے۔

(قیامًا طویلاً وهو دون القیام الاوّل) ظاہر معنی ہے کہ یہاں پر قیام اول سے حقیقی اول نہیں بلکہ اضافی اول مراد ہے اواسی طرح اس قول

(ثم رکع رکوعًا طویلاً وهو دون الرکوع الاوّل) میں بھی ہے یعنی یہاں بھی رکوع اول سے اضافی اول مراد ہے، خلاصہ یہ کہ تنزل تدریجاً پایا جارہا تھا۔

(ثم رفع) یعنی سر مبارک قومہ کیلئے اٹھایا۔

(ثم سجد) یعنی دو سجدے کئے۔

(ثم انصرف وقد انجلّت الشمس) یعنی سورج دوبارہ سے روشن ہوگیا۔

(فقال ان الشمس والقمر) اس جملہ میں اشارہ ہے اس طرف کہ کسوف الشمس اور کسوف القمر کا حکم ایک ہی ہے۔

(آیتان) یعنی دو علامتیں ہیں

(من آیات الله) اللہ کی نشانیوں میں سے یعنی اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے جس چیز کو چاہے، جیسے چاہے استعمال کرے اور حکم دے، لیکن مشرکین پھر بھی ایسے مالک کو چھوڑ کر دوسرے معبود بناتے ہیں افسوس ہے ایسے لوگوں پر۔

(لا یخسفان) مذکر کا صیغہ تغلیبًا ہے۔

(لموت أحد) اس سے ''خیر'' مراد ہے۔

(ولا لحیاته) یعنی نہ ہی کسی شریر کی ولادت سے۔ شرح السنۃ میں ہے: لوگ زمانہ جاہلیت میں یہ گمان کرتے تھے کسوف الشمس اور کسوف القمر عالم میں کسی کی موت یا پیدائش کی وجہ سے یا پھر کسی کو خیر یا شر ملنے کی طرف مشیر ہوتے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام گمانوں کو باطل قرار دے دیا اور فرمایا: (فاذا رأیتم ذلك فاذكروا الله) یعنی اوقات مکروہ کے علاوہ میں نماز کے ذریعے سے اللہ کو یاد کرو اور اسی طرح تہلیل، تسبیح، تکبیر، استغفار اور سارے اَذکار سے اللہ کو یاد کرو۔ نیز آئندہ آنے والی روایت یعنی ''فادعوا الله وکبرو، وصلوا'' میں موجود اَمر استحباب پر دلالت کرتا ہے اسی لئے صلوۃ الکسوف بالاتفاق سنت ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ گرہن کے وقت میں ذکر اللہ اور نماز کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دراصل مشرکین کے غلط عقائد کو باطل کرنے کیلئے ہے کہ یہ مشرک جو سمجھتے ہیں بالکل غلط ہے بلکہ سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے، اور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، اور جب اللہ کی نشانی ظاہر ہو تو ڈرنا چاہیے اور نماز وغیرہ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

''وما نرسل بالآیات الا تخویفاً'' (الاسراء۔۵۹)

پس جب کوئی خوف دامن گیر ہو تو اللہ کا خوف دل میں بٹھاؤ اور نماز، تکبیر، تہلیل، تسبیح کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ جیسا کہ ماقبل مذکورہ حدیث میں ہے۔ اور یاد رہے کہ نماز ایسی عبادت ہے جو بہت سے اذکار اور دعاؤں کو جمع کرنے والی ہے، اور بہت سے ایسے افعال کو شامل ہے جن پر اللہ تعالیٰ کو پیار اور رحم آتا ہے پھر اس کی وجہ سے اس پر آئی ہوئی پریشانی کو ختم فرما دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پریشانی کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

(قالوا: یا رسول الله رأیناك تناولت شیئاً) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کو لینے کا ارادہ کیا اور اس کو پکڑنا چاہا۔

(فی مقامك هذا) یعنی اس جگہ ہی میں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ جبکہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ نماز کی جگہ کا نہیں بلکہ اس جگہ کا ہے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر وعظ و نصیحت کیلئے جلوہ افروز ہوئے تھے۔

(ثم رأیناك تكعكعت) یعنی پہلے آپ کو دیکھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز کو لینے کی کوشش کر رہے تھے اور اب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز کو اپنے آپ سے دور فرما رہے ہیں اور دور دھکیل رہے ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

(وقال انی رأیت الجنة) رؤیۃ یہاں پر مشاہدہ یا مکاشفہ کے معنی میں ہے

(فتناولت) میں نے اس کو لینے کا ارادہ کیا

(منها عنقوداً) انگور کا گچھا یعنی جب میں جنت کے انگوروں کا گچھا دیکھا تو اسے پکڑنا چاہا اور اپنی جگہ سے تھوڑا سا آگے بڑھا۔

(ولو أخذته) ہٗ کی ضمیر عنقود کی طرف راجع ہے۔

(لاكلتم) اس سے ساری امت مراد ہے۔

(منه ما بقیت الدنیا) یعنی جب تک ~~دنیا باقی ہے~~ وہ انگور کا ایک گچھا پوری امت کیلئے کافی ہو جاتا، علامہ طیبیؒ فرماتے

ہیں کہ یہ خطاب عام ہے صحابہ کے ساتھ ساتھ قیامت تک آنے والے تمام لوگ مراد ہیں کیونکہ حدیث میں ''ما بقیت الدنیا'' کے الفاظ ہیں۔ یہاں پر ایک اشکال ہوسکتا ہے کہ انگور کا ایک گچھا میری امت کیلئے قیامت تک کیلئے کافی ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

علامہ قاضی عیاضؒ اس کے دو جواب دیتے ہیں: ① جب گچھے میں سے ایک دانہ توڑا جائے گا تو اللہ تعالیٰ شانہ اپنی قدرت سے اس کی جگہ ایک اور دانے کا گچھے میں اضافہ کر دیں گے۔ الغرض گچھے میں انگور کم ہونے ہی نہیں پائیں گے، ایک کی جگہ دوسرے اگتے رہے گے۔ ② اللہ تعالیٰ اس انگور کے گچھے کو اس طرح تا قیامت باقی رکھیں گے کہ اس کا ایک دانہ زمین میں دبایا جائے گا پھر اس سے درخت اگے گا اس طرح اس کی نوع تا قیامت باقی رہے گی اور لوگ اس سے کھاتے رہیں گے۔

محدثین فرماتے ہیں کہ اگر حضور ﷺ انگور کے اس گچھے کو پکڑ لیتے اور صحابہ کو عطا فرماتے دیتے تو اس سے صحابہ کو ایمان بالغیب کی جو فضیلت حاصل تھی اس میں کمی آجاتی اور یہ ایمان بالغیب کے بجائے ایمان بالمشاہدہ بن جاتا جو کہ ایمان بالغیب سے ادنی و اسفل ہے۔

(ورأیت النار) اور جب میں نے آگِ جہنم کو دیکھا تو میں اسے اپنے سے دور کرنے لگا بوجہ اس کی شدت حرارت کے

(فلم أر کالیوم) یعنی آج کے دن

(منظرًا قطّ) یعنی جیسی شدت اور حرارت آج کے دن دیکھی اس جیسی حرارت و شدت اس کے علاوہ نہیں دیکھی۔

(أفظع) بمعنی أشد اور أکرہ۔

(ورأیت اکثر أهلها) یعنی مسلمانوں میں سے یا پھر مطلقًا انسانوں میں سے۔

(النسآء) اس پر طبرانی شریف کی ایک حدیث کی وجہ سے اشکال ہوسکتا ہے حدیث یہ ہے کہ ''ان أدنی أهل الجنة یمسی علی زوجتین من نسآء الدنیا'' کہ اَدنی سے جنتی کو جنت میں دنیا کی عورتوں میں سے دو بیویاں ملیں گی جن کے ساتھ وہ وقت گزارے گا تو اب یہ کہنا کہ جہنم میں زیادہ عورتیں ہوگی یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ بلکہ طبرانی کی اس حدیث سے تو عورتوں کا جنت میں کثرت سے ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ابتداءً جہنم میں عورتوں کی کثرت ہی ہوگی مگر بعد میں وہ جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہوتی رہیں گیں اس طرح ایک وقت آئے گا کہ جنت میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوجائے گی۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے کسی کام کا بالقوۃ ہونا اور دوسرا بالفعل ہونا، تو یہاں پر بالقوۃ مراد ہے، یعنی بالقوۃ تو عورتیں ہی کثرت کے ساتھ جہنم میں ہوگیں پھر اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرمادیں گے اور جنت میں داخل فرمادیں گے۔ (واللہ اعلم)۔

(قالوا) ایک صحیح نسخہ میں ''فقالوا'' ہے۔

(بِمَ؟) یعنی کس عمل کے سبب؟

(یا رسول اللّٰه قال: بکفرهن قیل، یکفرن باللّٰه قال یکفرن العشیر) یعنی شوہر کی ناشکری اور ناقدری کرتی ہیں۔

(ویکفرن الاحسان) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا عطف ہے سابقہ جملے پر ایک اجنبی طریق کے مطابق جیسا کہ کہا جاتا ہے ''زیدو کرمه'' اور یہاں کفر سے مراد ''شکر کی ضد'' ہے جس کی تفصیل یہ قول

(لو أحسنت) ہے، کہ اگر تم اچھا سلوک کرو، اور اس صیغہ میں خطاب عام ہے ہر وہ شخص اس میں داخل ہے جو احسان کرے۔

(الٰی احداهن الدهر) یعنی ہمیشہ یا ایک طویل زمانے تک ان سے احسان کرو۔

(ثم رأت منك شيئاً) مگر پھر کسی موقع پر تمہاری طرف سے معمولی سی کوئی بات بری لگ جائے تو سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہیں۔ اسی بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے:

(قالت ما رأيت منك خيراً قط) کے الفاظ سے تعبیر کیا یعنی یوں کہتی ہیں کہ مجھے تو ساری عمر تیری طرف سے کبھی کوئی خوشی ملی ہی نہیں۔

(متفق علیہ) علامہ میرکؒ فرماتے ہیں: اور اس کو ابوداؤد اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

خسوفِ شمس کی صورت میں دعا تسبیح اور نماز میں مشغول ہو جانا چاہئے

۱۴۸۳: وَعَنْ عَائِشَةَ نَحْوَ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَقَالَتْ ثُمَّ سَجَدَ فَاَطَالَ السُّجُوْدَ ثُمَّ انْصَرَفَ وَقَدِ انْجَلَّتِ الشَّمْسُ فَخَطَبَ النَّاسَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰيَتَانِ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ لَايَخْسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَيَاتِهٖ فَاِذَا رَاَيْتُمْ ذٰلِكَ فَادْعُوا اللّٰهَ وَكَبِّرُوْا وَصَلُّوْا وَتَصَدَّقُوْا ثُمَّ قَالَ يَا اُمَّةَ مُحَمَّدٍ وَاللّٰهِ مَا مِنْ اَحَدٍ اَغْيَرُ مِنَ اللّٰهِ اَنْ يَّزْنِىَ عَبْدُهٗ اَوْ تَزْنِىَ اَمَتُهٗ يَا اُمَّةَ مُحَمَّدٍ وَاللّٰهِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا وَّلَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٥٢٩۔ حديث رقم ١٠٤٤۔ ومسلم في صحيحه ٢/٦١٨ حديث رقم (١-٩١) والنسائي ٣/١٣٢ حديث رقم ١٤٧٤۔ ومالك في الموطأ ١/١٨٦ حديث رقم ١ من كتاب صلاة الكسوف ۔ وأحمد في المسند ٣/٣٧٤۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا روایت کی طرح مروی ہے اور اماں جان فرماتی ہیں کہ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گئے پھر لمبا سجدہ کیا پھر جب نماز سے فارغ ہوئے تو سورج روشن ہو چکا تھا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو خطبہ دیا پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی تعریف کی پھر ارشاد فرمایا بے شک سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں ان دونوں کو کسی کی موت یا کسی کی زندگی کی وجہ سے گرہن نہیں لگتا۔ لہٰذا جب تم اس کو دیکھو تو اللہ سے دعا کرو اور اللہ کی بڑائی بیان کرو اور نماز پڑھو اور صدقہ کرو۔ پھر فرمایا اے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم قسم ہے اللہ کی کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی غیرت مند نہیں ہے جبکہ زنا کرتا ہے اس کا کوئی بندہ یا زنا کرتی ہے اس کی کوئی بندی اے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم بہت ہی کم ہنسو اور البتہ بہت ہی زیادہ روؤ۔

تشریح: (وعن عائشة نحو حديث ابن عباس) "نحو" رفع کے ساتھ ہے یعنی گزشتہ حدیث کے مثل حضرت عائشہ سے بھی مروی ہے۔

(وقالت: ثم سجد فأطال السجود، ثم انصرف وقد انجلت الشمس) یعنی سورج صاف ہوگیا۔

(فخطب الناس) یعنی لوگوں کو خطبہ دینے کا ارادہ کیا۔

(فحمد اللّٰه) یعنی شکر کیا۔

(وأثنى عليه ثم قال انّ الشمس والقمر آيتان، من آيات اللّٰه لا يخسفان لموت أحد، ولا لحياته فاذا رأيتم ذلك فادعوا اللّٰه) یعنی اس کی عبادت کرو اور یادرہے کہ سب سے افضل عبادت ''نماز'' ہے، جمہور کے ہاں یہ امر استحباب کیلیے ہے، امام ابن اہمام فرماتے ہیں کہ: الأسرار میں اس امر کو وجوب کیلئے لایا گیا ہے کیونکہ حدیث میں ''اذا رأيتم شيئاً من هذه فافزعوا الى الصلوة'' کہ جب تم ایسے حالات دیکھو تو نماز کی طرف متوجہ ہو جاؤ، کے الفاظ ہیں، جن سے وجوب ثابت ہوتا ہے۔ جبکہ علامہ ابن الملک فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں دعا کا حکم اس لئے دیا کہ جب انسان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ دل کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس حالت میں دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہو جاتی ہے۔

(وكبروا) اللہ کی عظمت بیان کرو، یا اللہ اکبر کہو کیونکہ یہ جہنم کی آگ ٹھنڈا کرتا ہے۔

(وصلوا) یعنی صلوٰۃ الکسوف یا الخسوف۔

(وتصدقوا) یعنی فقراء پر صدقہ کرو، اس حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے واقعات عام طور پر اغنیاء کو ڈرانے کیلئے رونما ہوتے ہیں کیونکہ صدقہ تو امیر شخص ہی کر سکتا ہے، نیز کثرتِ دولت کی وجہ سے ان کے قلوب غافل ہو چکے ہوتے ہیں اور ان کا ذہن متوجہ ہی نہیں ہوتا مگر اس قسم کے عبرتناک واقعات سے۔

(ثم قال يا أمة محمد واللّٰه ما من أحد أغير) فتحہ کے ساتھ، بعض نے کہا رفع کے ساتھ ہے یعنی أشد غيرة۔

(من اللّٰه) غیرت دو طرح کی ہوتی ہے۔ (فا) ایک وہ جو انسانوں سے متعلقہ ہے اس کی تعریف ''كراهة شركة الغير في حقه'' ہے۔ ۞ غیرت کی دوسری قسم کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے ہے اس کی تعریف ''كراهة مخالفة أمره ونهيه'' ہے۔ یعنی اللہ سے غیرت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے منع کردہ کام کو کرتے ہوئے یا اس کے حکم کردہ کام کو چھوڑتے ہوئے شرم محسوس ہو اور اس کو دل سے برا جانے۔

(أن يزنى) یہ أغیر سے متعلق ہے یعنی ''على أن يزنى''

(عبده أو تزنى امته) آدمی اور عورت دونوں کو الگ الگ ذکر کیا۔

(يا أمة محمد واللّٰه لو تعلمون ما أعلم) یعنی میں جو اللہ کے عذاب ومغفرۃ اور قیامت کی ہولناکیوں کے بارے میں جانتا ہوں اگر تم بھی جان جاؤ تو

(لضحكتم قليلاً) ہنسا کم کر دو یا بالکل چھوڑ دو، دونوں مراد لئے جا سکتے ہیں۔

(ولبكيتم كثيراً متفق عليه) ورواہ ابوداؤد والنسائی۔

سورج گرہن کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پریشانی کا طاری ہونا

۱۴۸۴: وَعَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ خَسَفَتِ الشَّمْسُ فَقَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَزِعًا یَخْشٰی اَنْ تَکُوْنَ السَّاعَۃُ فَاَتَی الْمَسْجِدَ فَصَلّٰی بِاَطْوَلِ قِیَامٍ وَّرُکُوْعٍ وَّسُجُوْدٍ مَا رَاَیْتُہٗ قَطُّ یَفْعَلُہٗ وَقَالَ ھٰذِہِ الْاٰیَاتُ الَّتِیْ یُرْسِلُ اللّٰہُ لَا تَکُوْنُ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَیَاتِہٖ وَلٰکِنْ یُّخَوِّفُ اللّٰہُ بِھَا عِبَادَہٗ فَاِذَا رَاَیْتُمْ شَیْئًا مِنْ ذٰلِکَ فَافْزَعُوْا اِلٰی ذِکْرِہٖ وَدُعَائِہٖ وَاسْتِغْفَارِہٖ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٥٤٥۔ حديث رقم ١٠٥٩۔ ومسلم في صحيحه ٢/٦٢٨ حديث رقم (٢٤۔ ٩١٢)۔ وأبو داؤد في السنن ١/٦٩٥ حديث رقم ١١٧٧۔ والنسائي ٣/١٥٣ حديث رقم ١٥٠٣ وابن ماجه ١/٤٠١ حديث رقم ١٢٦٣۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ سورج کو گرہن لگ گیا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پریشانی کی حالت میں کھڑے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح خوف میں مبتلا تھے جیسا کہ قیامت قائم ہو گئی۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں آئے تو طویل قیام اور رکوع اور سجدہ کے ساتھ نماز پڑھی اور میں نے ایسا کرتے ہوئے کبھی بھی آپ کو نہیں دیکھا (یعنی اتنا لمبا رکوع اور سجدہ اس سے پہلے آپ نے کبھی نہیں کیا) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ نشانیاں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ بھیجتا ہے یہ نہ کسی کی زندگی (یعنی پیدائش) کی وجہ سے ہوتی ہیں اور نہ ہی فوت ہونے کی وجہ سے ہوتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ پس جب تم ان میں سے کوئی نشانی دیکھو تو اللہ سے ڈرتے ہوئے جلدی اس کے ذکر اور اس سے دعا مانگنے اور استغفار کرنے میں مشغول ہو جاؤ۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: (وعن أبي موسى قال خسفت الشمس) رفع کے ساتھ ہے فاعل ہونے کی وجہ سے۔

(فقام النبي ﷺ فزعًا) بمعنی خائفًا، آپ ﷺ کا یہ ڈرنا، امت کو سکھانے کیلئے تھا کہ جب کوئی ایسا امر پیش آئے تو اللہ ہی سے ڈرو اور اسی طرف متوجہ ہو جاؤ، اور اس وجہ سے تھا کہ آپ ﷺ کائنات میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے عذاب و رحمت کو جاننے والے تھے۔

(یخشی) ایک نسخہ میں نخشی ہے بمعنی نخاف یعنی ہم سب ڈرے۔

(أن تكون الساعة) تکون منصوب ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ "یخشی أن تكون الساعة" راوی کی جانب سے ہے آنحضرت ﷺ کا نہیں کیونکہ آپ ﷺ تو قیامت کے بارے میں جانتے تھے کہ جب تک آپ ﷺ ان میں ہیں قیامت قائم نہیں ہوگی، بلکہ آپ ﷺ کا یہ گھبرانا امت کو سمجھانے کیلئے تھا اور آپ ﷺ جانتے تھے کہ پہلی امتوں پر جب عذاب آیا تو اسی طرح کی نشانیاں ظاہر ہوتی تھیں۔ علامہ المظہر فرماتے ہیں کہ یہ کہنا: "یخشی أن تكون الساعة" خطأ ہے کیونکہ ابو موسیٰ (جو کہ راوی ہیں) کیا جانے کہ حضور ﷺ کے دل میں کیا تھا؟ یہ تو صرف ان کا اپنا ایک ظن اور خیال ہے جو کہ صحیح نہیں۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ واقعہ ان آیات کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے اور جب تک

آپ ﷺ امت میں موجود ہیں قیامت نہ آنے کا وعدہ کیا ہے، تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ اس کے راوی ابوموسیٰ ہیں اور ابوموسیٰ فتح خیبر کے بعد ایمان لائے تھے حالانکہ آپ ﷺ فتح خیبر سے پہلے ہی نصرت کامیابی اور آپ ﷺ کے ہوتے ہوئے قیامت کے نہ آنے کی خبریں امت کو سنا چکے تھے۔ پھر بعض لوگوں نے اس جملے کی نسبت حضور ﷺ ہی کی طرف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ سے ان وعدے اور نصرتوں والی اخبار کا ذھول ہو گیا ہو۔

اور یہ بھی ممکن ہے راوی سے ذھول ہو گیا ہو کیونکہ اسی روز آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ کا انتقال ہوا تھا اور آپ ﷺ کا پریشان ہونا اسی وجہ سے تھا۔ پس اسی وجہ سے بعض لوگوں کو گمان ہوا کہ شاید کسوف آپ ﷺ کے صاحبزادے کے انتقال کی وجہ سے ہوا ہے تو آپ ﷺ نے لوگوں کا عقیدہ درست کرتے ہوئے فرمایا: أیتان من آیات اللّٰہ......"

علامہ میرک فرماتے ہیں کہ اگر ہم "یخشی" یعنی معروف غائب کے صیغے کو مجہول یا متکلم معروف کا صیغہ مان لیں تو کوئی اشکال وارد نہ ہوگا اور ایسی صورت میں یہ الفاظ حضور ﷺ کے نہ ہوں گے بلکہ راوی ہی کے ہوں گے جو کہ ایک راوی اپنی روایتیں سمجھانے کیلئے بولا کرتا ہے۔ واللّٰہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

(فأتی المسجد) یعنی مسجد نبوی ﷺ میں تشریف لائے، اس موقع پر آ کر حافظ ابن حجر العسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ اس جملہ "فأتی المسجد" میں رد ہے ان لوگوں کا جو انفرادی نماز کے قائل ہیں۔ لیکن ان کا یہ قول مردود ہے۔ اس قول کی وجہ سے جو ماقبل گزر چکا یعنی "انہ أجمعوا علی أن صلاۃ الکسوف، تصلی بجماعۃ فی الجامع"۔

(فصلی بأطول قیام ورکوع وسجود) مطلب ظاہر ہے کہ ہر رکعت میں رکوع، قیام اور سجود طویل کئے۔

(ما رأیتہ قط یفعلہ) "رأیتہ" میں ۂ ضمیر کا مرجع حضور ﷺ کی ذات بابرکت ہے۔

(فقال) یعنی نماز کسوف سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا۔

(ھذہ الآیات) یعنی کسوف، زلزلے، آندھیاں وغیرہ

(التی یرسل اللّٰہ) یعنی اللہ تعالیٰ ایسی نشانیاں بھیجتے ہیں جس طرح ان سے پہلی امتوں کے پاس نشانیاں بھیجیں تھیں۔

(لاتکون لموت أحد ولا لحیاتہ) حیات سے مراد ولادت ہے۔

(ولکن یخوف اللّٰہ بھا) ھا ء کا مرجع "آیات اللّٰہ" ہے۔

(عبادہ) اس سے اشارہ ہے اس طرف کہ سبب صرف اللہ کا اپنے بندوں کو ڈرانا ہے۔ لہٰذا علم فلکیات و نجوم والے جو اپنے اندازے، تخمینے اور اسباب بتاتے ہیں وہ درست نہیں، علامہ ابن العربی المالکی اور سیف الآمدی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے جبکہ ابن دقیق العید فرماتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں یعنی اللہ تعالیٰ کا ڈرانے کیلئے ایسا کرنا اور علم فلکیات کا حساب و کتاب، ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے تو مزید اللہ کی قدرت پر یقین میں اضافہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام ایک نظام کے تحت چل رہا ہے اور ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے اس میں ذرّہ برابر کمی بیشی نہیں ہوتی۔

(فاذا رأیتم شیئاً من ذلک) یعنی جب تم وہ علامات دیکھو تو

(فافزعوا) اس کے عذاب سے پناہ مانگو اور ڈر وار رجوع کرو۔

(الٰی ذکرہ) یعنی نماز کی طرف متوجہ ہو جاؤ

(ودعائه واستغفارہ۔ متفق علیه)

ورواہ النسائی ذکرہ میرکؒ۔

صلوٰۃ کسوف کے بارے میں ایک روایت

۱۴۸۵: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ اِنْكَسَفَتِ الشَّمْسُ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ يَوْمَ مَاتَ اِبْرَاهِيْمُ بْنُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى بِالنَّاسِ سِتَّ رَكْعَاتٍ بِاَرْبَعِ سَجْدَاتٍ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٢/٦٢٣ حديث رقم ١٠/٩٠٤۔

ترجمه: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار مدینہ کے زمانہ میں سورج گرہن ہو گیا۔ جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو چھ رکوع اور چار سجدوں کے ساتھ نماز پڑھائی۔ (مسلم)

تشریح: (وعن جابرؓ قال......مات ابراهيم) یہ واقعہ سن دس ہجری کا ہے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے کی عمر آٹھ سال اور ایک ماہ یا کچھ اس سے زیادہ تھی۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے کا انتقال ہوا وہ مہینہ کا دسواں دن تھا جیسا کہ اور بھی بعض حفاظ نے کہا ہے مگر اس قول کو بعض لوگوں نے رد کیا ہے علم ہیئت والوں کے اعداد وشمار کی وجہ سے کیونکہ ہیئت والے کہتے ہیں کہ گرہن ہمیشہ مہینے کے ساتویں، آٹھویں، نویں یا دسویں دن ہوتا ہے، اس کے علاوہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں مگر یہ خلاف عادت ہو جس کو خارق عادت کہا جاتا ہے۔

(ابن رسول اللہ ﷺ) یہاں پر ابن ہمزہ کو ثابت رکھا گیا یہ درست نہیں کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب ابن سے ماقبل اور مابعد میں ابوت اور بنوت کا رشتہ ہو تو ہمزہ گر جاتا ہے اور اس کے علاوہ میں باقی رہتا ہے۔

(فصلی بالناس ست رکعات بأربع سجدات) رکعات سے مراد رکوع ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعات پڑھیں اور ہر رکعت میں تین رکوع کیے یوں چھ رکوع ہوئے اور چار سجدے ہوئے۔ علامہ طیبیؒ کی یہ تشریح اس حدیث کے ظاہر کے بالکل مطابق ہے۔ اگرچہ یہ بھی کلام سے خالی نہیں جس کو آگے ذکر کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ اور اکثر اہل علم کہتے ہیں کہ جب خسوف یعنی گرہن زیادہ لمبا ہو جائے تو جائز ہے کہ ہر رکعت میں تین، پانچ اور چار رکوع کرلے جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے۔

لیکن علامہ میرکؒ فرماتے ہیں کہ: مذکورہ بالا قول شافعیہ کے ہاں مفتیٰ بہ قول کے مخالف ہے جیسا کہ ان کی کتابوں مثلاً المنہاج، المحرر، العجالۃ اور الفنوی وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ (یاد رہے کہ المنہاج دراصل المحرر کی مختصر ہے، المنہاج کے مؤلف امام نوویؒ (٦٧٦) ہیں اور المحرر کے مؤلف علامہ القزوینی (۶۲۳) ہیں۔

لیکن میں (ملاعلی القاری) کہتا ہوں کہ مذکورہ بالا قول امام نووی اور ان کے ماننے والوں کے ہاں مفتیٰ بہ قول کے عین

مطابق ہے، مخالف نہیں ہے جیسا کہ میرکؒ نے کہا۔لیکن شافعیہ کے اس قول میں مجھے اشکال ہے وہ یہ کہ ہمیں پہلے ہی سے کیسے پتہ چلے گا کہ یہ خسوف لمبا ہوگا؟ کہ ہم تین، چار یا آٹھ رکوع کریں۔ نیز اس باب کی ساری احادیث کسوف الشمس کے بارے میں ہیں، اور اہل عقل کے نزدیک اتنی سی کم مدت میں کسوف شمس کا بار بار ہونا ناممکن ہے۔(رواہ مسلم)

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ان دو حدیثوں اور ایک صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو، دو رکعات کر کے بار بار نماز پڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہے یہاں تک سورج سے گرہن دور ہو گیا اور سورج صاف ہو گیا، پس یہ حدیث امام شافعیؒ اور ان کے اکثر ساتھیوں کے قول کے خلاف ہے کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ اگر کسوف لمبا ہو جائے اور آپ ایک دفعہ نماز پڑھ چکے ہوں تو دوبارہ نماز نہیں پڑھ سکتے اور نہ ہی مطلقاً دو رکوعوں پر زیادتی کر سکتے ہو، جیسا کہ دو رکوعوں میں کمی نہیں کر سکتے اگر تم ان دو رکوعوں کی نیت کر چکے ہو اگرچہ سورج سے گرہن ہٹ ہی کیوں نہ جائے۔ لیکن امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''لا مساغ لحمل هذه الأحاديث على بيان الجواز الا اذا......''

کہ کوئی گنجائش نہیں ان احادیث کو بیان جواز پر محمول کرنے کیلئے مگر یہ کہ اس واقعہ کا متعدد ہونا مانا جائے، حالانکہ یہ واقعہ متعدد نہیں کیونکہ صلوٰۃ الکسوف سے متعلق ساری احادیث کا مرجع صرف وہ ایک نماز ہی ہے جو کہ آپ ﷺ نے اس دن پڑھی تھی جب آپ ﷺ کے پیارے صاحبزادے ابراہیم علیہ السلام کا وصال ہوا تھا، پس اب لازم ہے کہ ہم ترجیح دیں فقط دو رکوعوں والی اُخبار کو کیونکہ یہی سب سے زیادہ صحیح اور مشہور ہیں،

لیکن میں (ملا علی القاری) کہتا ہوں کہ نہیں (بلکہ اب لازم یہ ہے کہ ہم ترجیح دیں فقط ایک رکوع والی اُخبار کیونکہ ایک رکوع ہی اُصل ہے اور تحقیق اس کے بارے میں اُخبار قولاً وفعلاً ہر دو طریق سے وارد ہو چکی ہیں جیسا کہ پہلے گزرا جبکہ دوسری قسم کی تمام اُخبار مضطرب ہیں اور مختلف الآثار ہیں۔ پھر فرمایا کہ فقہ جمع کرنے والوں اور حدیث جمع کرنے والوں مثلاً ابن منذر وغیرہ کے درمیان اختلاف ہوا، پس ان میں سے بعض نے اس واقعہ کے متعدد ہونے کا قول کیا، اور ان روایات جن میں رکوع کی تعداد میں زیادتی یا خود نماز کو مکرر پڑھنے کا ذکر تھا، کو محمول کیا بیان جواز پر، اور اسی قول کو امام نووی نے شرح مسلم وغیرہ میں مضبوط قرار دیا ہے''۔

لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اس واقعہ میں تعدد عقلی دلائل کے ساتھ بغیر نقلی دلائل کے ثابت نہیں ہوسکتا۔ یعنی اگر ہمارے پاس اس کے تعدد پر نقلی دلائل نہ ہوں صرف عقلی دلائل ہوں تو ہم اس میں تعدد ثابت نہیں کر سکتے۔ واللہ الموفق۔

۱۴۸۶: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ صَلَّى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ كَسَفَتِ الشَّمْسُ ثَمَانَ رَكْعَاتٍ فِيْ أَرْبَعِ سَجْدَاتٍ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٦٢٧/٢ حديث رقم (١٨- ٩٠٨)-

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج گرہن کے وقت آٹھ رکوع اور چار سجدوں کے ساتھ نماز پڑھائی۔

۱۴۸۷: وَعَنْ عَلِيٍّ مِثْلَ ذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

اور حضرت علیؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ (مسلم)

تشریح: (وعن علی مثل ذلك) یعنی حضرت علیؓ سے بھی حضرت ابن عباس کی روایت کے مثل مروی ہے۔ لیکن میں (ملا علی القاری) کہتا ہوں کہ اس موقع پر دو صورتیں بنتی ہیں ایک تو یہ کہ حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کی روایات میں معنیٰ مماثلت ہے یا پھر لفظاً۔ پس اگر معناً تھی تو مؤلف پر یہ حق بنتا تھا کہ وہ ''وعن علی مثل ذلك'' کے بجائے ''وعن علی نحوه'' فرماتے، اور اگر مماثلت لفظاً تھی تو زیادہ مناسب یہ تھا کہ پہلے حضرت علیؓ کی روایت نقل کرتے پھر بعد میں اگر حضرت ابن عباسؓ روایت نقل کرنا چاہتے تو یوں فرماتے:

''وعن ابن عباس مثل ذلك'' واللہ اعلم۔ (رواہ مسلم)

(وعن عبد الرحمٰن بن سمرة قال: كنت أرتمي) یعنی میں تو اس سے تیر چلا رہا تھا۔

سورج گرہن کے وقت آنحضرت ﷺ کی طویل دعا

۱۴۸۸: وَعَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ كُنْتُ اَرْتَمِيْ بِاَسْهُمٍ لِيْ بِالْمَدِيْنَةِ فِيْ حَيَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِذَا كَسَفَتِ الشَّمْسُ فَنَبَذْتُهَا فَقُلْتُ وَاللّٰهِ لَاَنْظُرَنَّ اِلٰى مَاحَدَثَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ كُسُوْفِ الشَّمْسِ قَالَ فَاَتَيْتُهُ وَهُوَ قَائِمٌ فِي الصَّلَاةِ رَافِعٌ يَدَيْهِ فَجَعَلَ يُسَبِّحُ وَيُهَلِّلُ وَيُكَبِّرُ وَيَحْمِدُ وَيَدْعُوْ حَتّٰى حُسِرَ عَنْهَا فَلَمَّا حُسِرَ عَنْهَا قَرَأَسُوْرَتَيْنِ وَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ۔ (رواه مسلم في صحيحه عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ وَكَذَا فِيْ شَرْحِ السُّنَّةِ عَنْهُ وفي نسخ المصابيح عن جابر بن سمرة)۔

أخرجه مسلم في صحيحه ٦٢٩/٢۔ حديث رقم (٢٦۔ ٩١٣)۔

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ حیات میں اپنے تیروں کے ساتھ تیراندازی کر رہا تھا کہ اچانک سورج گرہن ہو گیا تو میں نے تیروں کو پھینک دیا اور دل میں کہا کہ اللہ کی قسم میں ضرور دیکھوں گا کہ سورج گرہن کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا حالت طاری ہوتی ہے۔ راوی فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے نماز میں کھڑے تھے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم تسبیح پڑھ رہے تھے۔ لا الہ الا اللہ۔ اللہ اکبر اور الحمدللہ پڑھ رہے تھے اور دعا فرما رہے تھے یہاں تک گرہن سورج سے ہٹ گیا پس جب سورج گرہن کا اندھیرا دور ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سورتیں پڑھیں اور نماز پڑھائی۔ (اس روایت کو امام مسلم نے اپنے کتاب صحیح مسلم میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ سے نقل کیا ہے اسی طرح شرح السنۃ میں بھی ان سے ہی ہے اور مصابیح کے بعض نسخوں میں جابر بن سمرہؓ سے منقول ہے)۔

تشریح: (باسهم) سہام کی جمع ہے۔

(لي بالمدينة) اس میں دونوں احتمال ہیں کہ یا تو وہ اس کے لیے تھے یا پھر ایک جماعت کے ساتھ تھے۔

(فی حیاۃ رسول اللہ ﷺ) یعنی بتانا چاہتے ہیں کہ میرا یہ تیر چلانا اپنی مرضی سے نہ تھا بلکہ میں اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرتے ہوئے ہی یہ کام کر رہا تھا کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

''وأعدوا لهم ما استطعتم من قوّة'' [الانفال۔۶۰]

اور نبی کریم ﷺ نے بھی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تیراندازی کو بیان فرمایا اور فرمایا کہ:

''من تعلم الرمي فتركه فليس منا''

ترجمہ: کہ جس نے تیراندازی سیکھی پھر اسے چھوڑ دیا وہ ہم میں سے نہیں۔

(اذا کسفت الشمس فنبذتها) یعنی جب کسوف الشمس ہوا تو میں نے تیراندازی چھوڑ دی۔

(فقلت) اپنے دل سے کہا ''یا'' اپنی ساتھی سے کہا۔

(واللہ لأنظرن) یعنی میں ضرور دیکھوں گا۔

(لرسول اللہ ﷺ فی کسوف الشمس، قال فاتیته وهو قائم فی الصلوة، رافع یدیه) یعنی نماز کی ہیئت میں کھڑے ہوئے تھے، چہرہ مبارک قبلہ کی طرف تھا اور لوگوں کا ایک بڑا مجمع آپ ﷺ کے پیچھے صفیں باندھے کھڑا تھا۔ ''یا'' پھر یہاں نماز سے دعا مراد ہے۔ کیونکہ نماز میں دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں (ہمارے مذہب کے مطابق)۔

لیکن حافظ صاحبؒ کی یہ بات محض تکلف ہے کیونکہ آگے صحابی کا قول آ رہا ہے کہ ''فلما حسر عنها قرأ سورتين وصلى ركعتين'' یعنی جب سورج کا گرہن دور ہو گیا تو آپ ﷺ نے نماز پڑھی اور حافظ صاحبؒ پہلے ہی نماز پڑھنے کا فرما رہے ہیں۔

(فجعل یسبح ویهلل ویکبر، ویحمد ویدعو حی حسر) یعنی جب کسوف زائل ہو گیا۔

(عنها) اور سورج صاف ہو گیا، ھا ضمیر شمس کی طرف راجع ہے۔

(فلما حسر عنها قرأ سورتين وصلى ركعتين) اس جملہ میں واؤ ترتیب کیلئے نہیں بلکہ مطلق جمع کیلئے ہے، تو ترجمہ یوں ہوگا کہ آپ ﷺ نے دو رکعات نماز پڑھی اور اس یں دو سورتیں پڑھیں، لیکن یہ نماز کسوف کے زائل ہونے کے بعد تھی۔ اور یہ روایت ماقبل ساری احادیث کے خلاف ہے۔ کیونکہ ان میں کسوف کے وقت میں نماز پڑھنے کا ذکر تھا، اب ان دونوں قسم کی احادیث میں رفع تعارض کیلئے علامہ طیبیؒ یہ توجیہہ بیان کرتے ہیں کہ:

''آنحضرت ﷺ نماز میں داخل ہو چکے تھے، اور قیام اول میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اسی حالت میں لمبی لمبی تسبیح، تحلیل، تکبیر اور تحمید کر رہے تھے یہاں تک خسوف ختم ہو گیا۔ پس جونہی خسوف زائل ہوا تو آپ ﷺ نے قرآن پڑھا پھر رکوع کیا پھر سجدے کئے پھر رکعت ثانیہ کیلئے کھڑے ہو گئے اور اس میں پھر قرآن پڑھا، پھر رکوع کیا، سجدے کئے تشہد کیا اور سلام پھیر دیا''۔

لیکن یہ اس سب کے منافی ہے جو اس سے پہلے علامہ طیبیؒ اور ان کے علاوہ اور حضرات بیان کر چکے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس نماز میں متعدد رکوع کئے تھے جب کہ کسوف طویل ہو رہا تھا، اور پہلے تو یہ بھی گذر چکا ہے کہ آپ ﷺ نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ سورج صاف ہو گیا، اور صحیحین کے حوالے سے ایک روایت گذری تھی کہ آپ ﷺ کے نماز سے فارغ ہونے سے قبل ہی سورج

گرہن دور ہو چکا تھا۔
اس روایت کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے، علامہ میرک فرماتے ہیں کہ اس روایت کو امام ابوداؤد اور امام نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔

(عن عبدالرحمٰن بن سمرة و كذا فى شرح السنة) یعنی امام بغویؒ کی شرح السنۃ

(عنه) یعنی عن عبدالرحمٰن

(وفى نسخ المصابيح عن جابر بن سمرة) یعنی المصابیح کے ایک نسخہ میں عبدالرحمٰن بن سمرۃ کے بجائے حضرت جابر بن سمرۃ ہیں۔ لیکن مؤلف فرماتے ہیں کہ میں نے صحیح مسلم، کتاب الحمیدی اور شرح السنۃ میں الجامع میں ان دونوں روایتوں کو تلاش کیا تو ہر کتاب میں عبدالرحمٰن بن سمرۃ کی روایت کو پایا مگر کسی ایک جگہ بھی مجھے جابر بن سمرۃ کی روایت نہ مل سکی (اس کو علامہ طیبیؒ نے بھی ذکر کیا ہے)۔

الہدایۃ (جلد ا صفحہ ۸۸) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت ہے جو کہ امام شافعیؒ کی دلیل ہے، اور ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ائمہ ستہ نے بھی ذکر کیا ہے چنانچہ روایت یہ ہے:

"عن عائشة رضى الله عنها: قالت خسفت الشمس فى حياة رسول الله ﷺ فخرج رسول الله ﷺ......"

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ میں سورج گرہن ہوا، تو آپ ﷺ مسجد کی طرف نکلے، پھر کھڑے ہوئے، پھر تکبیر کہی، پھر لوگوں نے آپ ﷺ کے پیچھے صفیں بنائیں، پھر آپ ﷺ نے لمبی قراءت کی، پھر تکبیر کہی اور رکوع میں چلے گئے اور طویل رکوع کیا۔ پھر رکوع سے سر اٹھایا اور فرمایا: **سمع الله لمن حمده، ربنا ولك الحمد**، پھر کھڑے ہو گئے اور طویل قراءت کی، یہ قراءت پہلی قراءت سے کچھ کم تھی، پھر آپ ﷺ نے اس قراءت کے بعد پھر تکبیر کہی اور رکوع میں چلے گئے اور طویل وقت تک رکوع میں رہے مگر یہ پہلے رکوع کی بانسبت کچھ کم طویل تھا، پھر آپ ﷺ نے سر اٹھاتے ہوئے **سمع الله لمن حمده** کہا پھر دوسری رکعت میں بھی اسی طرح کیا جس طرح پہلی رکعت میں کیا تھا، پس اس طرح آپ ﷺ نے چار رکعات اور چار سجدات پورے کئے اور سلام پھیرنے سے پہلے پہلے سورج کا گرہن دور ہو چکا تھا۔ پھر سلام پھیرنے کے بعد آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور لوگوں کے سامنے خطبہ پڑھا جس میں اللہ کی حمد وثناء اس کی شان کے مطابق کی اور لوگوں سے فرمایا کہ یہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، نہ ہی کسی کی موت سے ان کو گرہن لگتا ہے اور نہ ہی کسی کی پیدائش سے، پس جب ان کو گرہن کی حالت میں دیکھو تو اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ"۔ (فتح القدير ۲/ ۵۳)

لیکن الہدایہ (جلد نمبر ا صفحہ نمبر ۸۸) ہی میں ہماری ایک دلیل ہے جو کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، ابن ہمام اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ امام ابوداؤد، امام نسائی اور امام الترمذی نے شمائل میں اس کو ذکر کیا ہے حدیث یہ ہے:

"عن عطاء بن السائب عن أبيه، عن عبد الله بن عمرو بن العاص قال: انكسفت الشمس، على عهد رسول الله ﷺ فقام عليه الصلاة والسلام فلم يركع لم يكد يركع......"

ترجمہ: حضرت عطاء بن السائب اپنے والد سے، ان کے والد حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں:
ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے دور میں سورج گرہن ہوا، پس آپ ﷺ نماز میں کھڑے ہوگئے اور اتنا طویل قیام کیا کہ یوں محسوس ہونے لگا کہ اب آپ ﷺ رکوع نہ کریں گے مگر آپ ﷺ نے رکوع کیا اور اتنا طویل رکوع کیا کہ یوں محسوس ہونے لگا کہ اب آپ ﷺ رکوع سے سر نہ اٹھائیں گے مگر آپ ﷺ نے رکوع سے سر اٹھایا اور اتنا طویل قومہ کیا کہ یوں محسوس ہونے لگا کہ اب آپ ﷺ سجدہ نہ کریں گے مگر آپ ﷺ نے سجدہ فرمایا اور سجدہ بھی اتنا ہی طویل کیا آخر کار اس طرح ایک رکعت مکمل کی اور دوسری رکعت میں بھی ایسے ہی کیا۔

اس حدیث کی تخریج امام الحاکم نے بھی کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور ابوداؤد والنسائی نے اس کو روایت کیا ہے حضرت سمرۃ بن جندب سے، پس حدیث یہ ہے:

''عن سمرة بن جندب قال بينا أنا و غلام من الأنصار......''

حضرت سمرۃ بن جندب فرماتے ہیں کہ میں اور انصار میں سے ایک غلام، ہم دونوں تیر اندازی کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ سورج ایک ''تنّومة'' (نون کی تشدید کے ساتھ) یعنی درخت کی طرح ہوگیا، ہم میں سے ایک نے کہا کہ: آؤ مسجد میں چلتے ہیں، اللہ کی قسم! حضور ﷺ کی امت میں اس سورج کی ضرور بہ ضرور کوئی نہ کوئی شان اور معاملہ ہوگا یعنی آؤ آپ ﷺ سے مسجد میں جا کر اس سورج کے بارے میں معلوم کرتے ہیں۔ حضرت سمرۃ فرماتے ہیں جب ہم مسجد میں پہنچے تو دیکھا کہ حضور ﷺ نماز پڑھا رہے تھے۔ پس آپ ﷺ نے اتنا طویل قیام کیا کہ پہلے کبھی ایسا نہ کیا تھا، اور ہمیں آپ ﷺ کی قراءت کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی، پھر آپ ﷺ نے دوسری رکعت میں بھی ایسے ہی کیا، حتی کہ سورج اپنی اصلی حالت میں لوٹ آیا اس حال میں کہ آپ ﷺ دوسری رکعت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے سلام پھیرا، پھر اللہ کی حمد و ثناء بیان کی اور فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ہی عبادت کے لائق ہے اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ (ابوداؤد ۱/۱۰۷)

اور ابوداؤد ہی میں ایک حدیث حضرت نعمان بن بشیر کی ہے جو کہ مشکوٰۃ میں بھی ہے اور اس کا رقم الحدیث ۱۴۹۳ ہے۔ پھر فرمایا کہ ایک اور حدیث ہے جس کو ابوداؤد نے قبیصہ الھلالی سے روایت کیا ہے کہ: ایک مرتبہ کسوف الشمس ہوا، پس آپ ﷺ نے دو رکعات نماز پڑھی اور اس میں قیام کو خوب طویل کیا، آخر کار سلام پھیرا جبکہ سورج سے گرہن دور ہو چکا تھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: یہ سورج گرہن وغیرہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں، اور مقصد اپنے بندوں کو ڈرانا ہوتا ہے، پس جب تم یہ دیکھو تو نماز پڑھو جس طرح کہ تم نے ابھی ابھی ایک فرض نماز پڑھی تھی (یعنی فجر کی نماز) (ابوداؤد ۱/۱۰۷ رقم الحدیث ۱۱۸۵)

اور امام بخاریؒ نے حضرت ابوبکرۃ سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ خسوف الشمس ہوا نبی کریم ﷺ کے زمانے میں، پس آپ ﷺ مسجد کی طرف نکلے اور آپ ﷺ کے پاس جمع ہوگئے پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائی پھر سورج سے گرہن ہٹ گیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ چاند و سورج اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں اور مقصد اللہ کا اپنے بندوں کو ڈرانا ہوتا ہے، پس جب ایسے ہوں تو نماز پڑھو یہاں تک کہ سورج صاف ہو جائے۔

ان سب روایات کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ ساری احادیث صحیح اور حسن ہیں، یعنی بعض صحیح ہیں اور بعض حسن

ہیں۔ بہر حال اس مسئلہ کا دارومدار تین امور پر ہے: ① حضور ﷺ نے دو رکعات نماز پڑھی۔ ② حکم دینا صلوۃ الشمس ارتفاع شمس کے وقت ہوتا ہے یعنی جب سورج دو نیزوں کے برابر بلند ہو جائے اس وقت گرہن ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت سمرہؓ کی روایت میں ہے۔ پس آپ ﷺ کے اس طرح حکم دینے سے بطور فائدہ کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنت دو رکعات ہی پڑھنا ہے۔ اور دونوں رکعتوں میں ایک ایک رکوع کرنا ہی سنت ہے کیونکہ آپ ﷺ نے فجر کی نماز کی طرف اشارہ کیا تھا۔

③ تیسرا امر یہ ہے کہ وہ روایات جن میں رکوع متعدد ہونے کا ذکر ہے، ان کا کیا حکم ہے؟

جواب: دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہے، یا تو وہ احادیث جن میں تعدد رکوعات کا ذکر ہے، قوت میں ان سے کم ہیں جن میں تعدد رکوع کا ذکر نہیں ہے، یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ تعدد رکوع والی احادیث اُقوی ہیں عدم تعدد رکوع والی احادیث سے۔

پس اگر پہلی صورت ہو یعنی تعدد والی روایات قوت میں کم ہوں تو لازماً عدم تعدد والی احادیث کو ترجیح ہوگی، اور اگر تعدد رکوع والی احادیث اُقوی ہوں تو اس کے دو جواب ہیں۔

① ہم مانتے ہیں کہ ان احادیث میں بڑی قوت پائی جاتی ہے کیونکہ کتب ستہ میں سے ہر ایک میں یہ روایت موجود ہے، مگر عدم تعدد والی روایات میں بھی قوت کم نہیں ہے خاص طور پر امام بخاری والی روایت، اور اسی طرح نسائی، ابوداؤد والی روایات حسن کے درجے سے کم نہیں ہیں، اور اگر معنی کے اعتبار سے دیکھیں تو عدم تعدد والی روایات بھی کتب خمسہ میں پائی جاتی ہیں اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ معنی ہی مقصود اور منظور الیہ ہوتا ہے، الفاظ تو فقط معانی پر دلالت کرتے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ عدم تعدد والی اَحادیث ہی کو ترجیح ہوگی۔ (واللہ اعلم)

② تعدد رکوع والی جتنی بھی احادیث ہیں سب میں اضطراب ہے، وہ اس طرح کہ ان کا ایک راوی کہتا ہے حضور ﷺ نے دو رکوع کئے تھے ایک رکعت میں، دوسرا کہتا ہے کہ ایک رکعت میں تین رکوع کئے تھے تیسرا کہتا ہے کہ چار رکوع کئے تھے، چوتھا کہتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک رکعت میں پانچ رکوع کئے تھے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم کس کو لیں اور کس کو چھوڑیں، پس اس طرح ان احادیث میں اضطراب ہے لہٰذا یہ احادیث مرجوح ہوں گی اور عدم تعدد والی راجح ہوں۔

اشکال: اور اب اگر یہ اشکال کیا جائے کہ اس طرح تو کسوف سے متعلقہ مطلقاً روایات میں اضطراب پایا جاتا ہے، تو اب کیا کیا جائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اب ہم اصل اور معہود کی طرف رجوع کریں گے اور ضمناً یہ دیکھیں گے کہ ان تمام روایات میں آخر وہ کون سا حکم ہے جو متحد اور مشترک ہے، تو جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد ''فصلوا حتی ینکشف مابکم'' کہ نماز پڑھو یہاں تک سورج سے گرہن دور ہو جائے، مشترک ہے تو اب اس مسئلہ کو اطلاق ہی پر باقی رکھا جائے گا، اور نماز کسوف ہو یا خسوف ایک رکعت میں ایک رکوع اور دو سجدے کئے جائیں گے جیسا کہ عام فرض نمازوں میں کئے جاتے ہیں۔

فائدہ: ساری کی ساری مذکورہ بالا بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے آپ صرف یہ سوچئے کہ تعدد والی روایات میں اضطراب آخر کیوں پیدا ہوا؟ اس اضطراب کی وجہ جلدیہ ذہن میں نہیں آتی کیوں کہ تاریخ گواہ ہے کہ کسوف والا واقعہ حضور ﷺ کی

حیات طیب میں ایک مرتبہ پیش آیا تھا، تو آخر ان روایات میں اضطراب اور اختلاف کیوں ہے؟ کوئی راوی دو رکوع بتاتا ہے، کوئی تین، ایسا کیوں؟

جواب: محدثین اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دراصل اس وقت جماعت میں کثرت سے صحابہ موجود تھے، کئی صفیں تھیں جن میں صحابہ کھڑے تھے، اور حضور ﷺ قراءت سراً کرنے کے ساتھ ساتھ طویل قیام اور رکوع اور سجود فرما رہے تھے، جب آپ ﷺ رکوع میں گئے اور رکوع خوب طویل کیا تو تھوڑی دیر بعد سب سے اگلی صف والے صحابہ یہ سمجھے کہ ہوسکتا ہے آپ ﷺ نے رکوع سے سر اٹھالیا ہو اور ہمیں پتہ نہ چلا ہو، یہ سوچ کر انہوں نے سر اٹھایا مگر جب اٹھ کر دیکھا کہ آپ ﷺ رکوع ہی میں ہیں تو یہ اگلی صف والے پھر دوبارہ رکوع میں چلے گئے، اب یوں دوسری صف میں موجود صحابہ یہ سمجھے کہ شاید حضور ﷺ نے دو رکوع کئے ہیں حالانکہ آپ ﷺ نے تو ایک ہی طویل رکوع کیا تھا، پس اس طرح دوسری صف والے صحابہ نے جب آگے روایات بیان کرنا چاہی تو دو رکوعوں کا ذکر کیا۔ الغرض اس طرح جس صحابی نے جو دیکھا اس نے اتنی ہی دفعہ رکوع کرنے کا ذکر کر دیا، اب ان میں سے کچھ ایسے تھے جنہوں نے تین دفعہ اٹھ اٹھ کر دیکھا تھا پس ان تین دفعہ اٹھ اٹھ کر دیکھنے والوں کو جس نے دیکھا اس نے تین رکوعوں کا ذکر کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ اسی طرح چار اور پانچ تک کی تعداد ہم تک پہنچی، پس یہ تھی اضطراب کی وجہ۔

اس اضطراب کی وجہ سے ہمارا مذہب اور بھی نکھر کر سامنے آگیا کہ ایک رکعت میں ایک ہی رکوع ہے۔ (**واللّٰہ اعلم بحقیقۃ الحال**) [فتح القدیر ۲/۵۳-۵۵]

سورج گرہن کے وقت صدقہ

۱۴۸۹: وَعَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ اَبِیْ بَکْرٍ قَالَتْ لَقَدْ اَمَرَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِالْعِتَاقَةِ فِیْ کُسُوْفِ الشَّمْسِ۔ (رواہ البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۵۴۳۔ حدیث رقم ۱۰۵۴۔ وأحمد فی المسند ۶/۳۴۵۔

ترجمہ: حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسوف شمس کے وقت غلام آزاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ (بخاری)

تشریح: **بالعتاقة**) عین کے فتحہ کے ساتھ بمعنی غلام آزاد کرانا۔

(**فی کسوف الشمس**) اس لئے کہ غلام آزاد کرنا یا کرانا اور اسی طرح باقی تمام بھلائی کے کام اللہ کے عذاب کو دور کرتے ہیں۔ (رواہ البخاری)

الفصل الثانی:

صلوٰۃ کسوف میں قرآن آہستہ آواز میں پڑھنا مسنون ہے

۱۴۹۰: عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ کُسُوْفٍ لَا

نَسْمَعُ لَهٗ صَوْتًا ۔ (رواه الترمذى وابوداود والنسائى وابن ماجة)

أخرجه أبوداؤد فى السنن ۱/ ۷۰۱ حديث رقم ۱۱۸٤۔ والترمذى فى السنن ۲/ ٤٥۱ حديث رقم ٥٦۲۔ والنسائى فى السنن ۳/ ۱٤۱ حديث رقم ۱٤۸٤۔ وابن ماجه ۱/ ٤۰۲ حديث رقم ۱۲٦٤ وأحمد فى المسند ٥/ ۱٦۔

ترجمه: حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کسوف شمس کے موقع پر نماز پڑھائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت نہیں سنی جا رہی تھی۔ (یعنی پست آواز میں قراءت تھی جیسا کہ عام دن کی نمازوں میں ہوتی ہے)۔ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

تشریح: (عن سمرة بن جندب) جیم کے ضمہ اور دال کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ۔

(قال صلّى بنا رسول الله ﷺ فى كسوف) یعنی سورج گرہن میں

(لا نسمع له صوتاً) اس سے دلالت ہوتی ہے اس پر کہ امام قراءت جہراً نہ کرے گا، یہی مذہب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے نیز امام وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ اسی پر حدیث ابن عباسؓ دلالت کرتی ہے جس کو امام احمد اور امام ابویعلی نے اپنے مسندین میں روایت کیا ہے، حدیث یہ ہے:

''صليت مع النبى ﷺ فلم أسمع منه حرفاً من القرآءة'' (احمد فی المسند ۱/ ۲۹۳)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ صلوٰۃ الکسوف پڑھی مگر ہم نے آپ ﷺ سے قراءت کا حرف بھی نہیں سنا۔

اور ابونعیم نے ''الحلية'' میں حضرت ابن عباس ہی سے روایت کیا فرماتے ہیں:

''صليت الى جانب رسول الله ﷺ يوم كسفت الشمس فلم أسمع له قرآءة''

اس روایت میں بھی قراءت جہراً کی نفی ہے۔

لیکن جب ہم مزید گہرائی میں جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں حضرت عائشہ سے ایک روایت منقول ہے وہ یہ کہ:

''قالت: جهر النبى ﷺ فى صلوة الخسوف بقراءته'' (بخاری رقم الحدیث ۱۰۶۵، مسلم رقم الحدیث ۹۰۱۵)

کہ نبی کریم ﷺ نے صلوۃ الخسوف میں جہراً قراءت کی۔

نیز بخاری شریف میں اس مذکورہ بالا حدیث سے دو حدیثیں پہلے حضرت اسماء کی حدیث ہے وہ فرماتی ہیں کہ:

''جهر عليه الصلوة والسلام فى صلوٰة الكسوف''۔

اس روایت میں صلوٰۃ الکسوف کے جہراً پڑھنے کا ذکر ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے بھی روایت کیا ہے بلکہ اس کو حسن اور صحیح کہا ہے اور ابوداؤد اور ترمذی میں اس کے الفاظ یہ ہیں:

''صلى صلوٰة الكسوف، فجهر فيها بالقرأة'' (ابوداؤد، رقم الحدیث ۱۱۸۸)

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ اب ~~اسی علیت~~ میں تعارض پایا گیا اور جب تعارض پایا جاتا ہے تو اصل کی طرف رجوع

کرتے ہیں، اور اصل دن کی نمازوں میں اخفاء ہے۔ پس اس اختلاف کے باوجود قراءت سرًا ہوگی اور سرًا والی احادیث ہی کو ترجیح ہوگی بوجہ اُصل وقانون کے، [فتح القدیر] (رواہ الترمذی) علامہ ابن الہمام بھی اس کو صحیح اور حسن مانتے ہیں اور امام ترمذی بھی۔ (وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ)

کسی حادثہ کے وقت سجدہ کرنا

۱۴۹۱: وَعَنْ عِكْرِمَةَ قَالَ قِيْلَ لِابْنِ عَبَّاسٍ مَاتَتْ فُلَانَةُ بَعْضُ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَرَّسَاجِدًا فَقِيْلَ لَهٗ تَسْجُدُ فِيْ هٰذِهِ السَّاعَةِ فَقَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَاَيْتُمْ اٰيَةً فَاسْجُدُوْا وَاَيُّ اٰيَةٍ اَعْظَمُ مِنْ ذِهَابِ اَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

(رواہ ابوداود والترمذی)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ۱/ ۷۰٦ حدیث رقم ۱۱۹۷۔ والترمذی ٥/ ٦٦٥ حدیث رقم ۳۸۹۱۔

ترجمہ: حضرت عکرمہؓ سے منقول ہے کہ جب ابن عباسؓ سے کہا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے ایک (یعنی حضرت صفیہؓ) فوت ہوگئی تو آپؓ یہ سن کر فوراً سجدہ میں گر پڑے پس آپؓ سے عرض کیا گیا آپ اس وقت کیوں سجدہ میں گر پڑے تو فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم کوئی حادثہ یا کرشمہ خداوندی کو دیکھو تو سجدہ کرو ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے بڑا حادثہ اور کیا ہوگا۔ (ابوداؤد۔ ترمذی)

تشریح: (وعن مکرمة) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔

(قال: قیل لابن عباس ماتت فلانة) یعنی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا، اور بعض نے کہا حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا مراد ہیں۔

(بعض ازواج النبی ﷺ) ''بعضُ'' رفع کے ساتھ ہے بدل ہونے کی وجہ سے یا بیان ہونے کی وجہ سے یا خبر ہونے کی وجہ سے مبتداء محذوف کیلئے۔ اور اس کو منصوب بھی پڑھ سکتے ہیں تقدیر یعنون کی وجہ سے۔

(فخر) یعنی گر پڑے، چلے گئے

(ساجدًا) سجدے میں چلے گئے۔

(فقیل له تسجد) اس میں حرف استفہام محذوف ہے۔

(فی هذه السّاعة) یعنی فوتگی کے موقع پر سجدہ کرنا واجب تو نہیں، پھر آپ رضی اللہ عنہ سجدے میں کیوں گر پڑے؟

(فقال: قال رسول اللّٰه ﷺ: اذا رأیتم آیةً) یعنی کوئی ڈرانے والی علامت، علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہاں علامات سے وہ علامات مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈرانے کیلئے ظاہر کرتے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے کسی کی وفات انہیں علامات میں سے ہے کیونکہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت اور صحبت کا شرف حاصل کیا تھا، اور تحقیق ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں اور میرے صحابہ اُمن کا سبب ہیں''۔ لہٰذا جب ان میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اُمن میں کمی ہوگی اور خوف میں اضافہ ہوگا، تو پس حضرت حفصہؓ یا صفیہ رضی اللہ عنہا کی وفات ایک خوفزدہ کر دینے والی علامت تھی۔

(فاسجدوا) یعنی نماز پڑھو اور بعض نے کہا کہ اگر سجدہ ہی کر لیا تو کافی ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے خواہ سورج گرہن ہو یا چاند گرہن، دونوں میں نماز پڑھ جائے گی، اور یہاں پر ''سجدے'' سے نماز ہی مراد ہے، اور اگر ان دونوں کے علاوہ کوئی اور علامت ہو مثلاً زلزلہ، آندھی اور طوفان وغیرہ تو ایسے موقع پر سجدہ ہی متعارف ہے۔ اور سجدے کو نماز پر محمول کرنا بھی درست ہے۔

کیونکہ احادیث میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پریشان ہوتے تھے تو نماز پڑھتے تھے۔

(وأی آیة أعظم من ذهاب أزواج النبی ﷺ) یعنی ان کی ذات بابرکت تھی پس ان کا زندہ رہنا لوگوں سے عذاب کو دور رکھنے کا سبب تھا۔ پس ابن عباسؓ اس وجہ سے ڈرے اور نماز کی طرف متوجہ ہوئے۔

(رواہ ابو داؤد والترمذی) اور فرمایا کہ یہ حسن، غریب ہے اور ہم اس کو نہیں جانتے مگر اسی طریق سے جس کو علامہ میرک نے نقل کیا ہے۔

الفصل الثالث:

۱۴۹۲: عَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ اِنْكَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلٰی عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰی بِهِمْ فَقَرَاَ بِسُوْرَةٍ مِّنَ الطُّوَلِ وَرَكَعَ خَمْسَ رَكْعَاتٍ وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ قَامَ اِلَی الثَّانِيَةِ فَقَرَ بِسُوْرَةٍ مِنَ الطُّوَلِ ثُمَّ رَكَعَ خَمْسَ رَكْعَاتٍ وَسَجَدَ سَجْدَ تَيْنِ ثُمَّ جَلَسَ كَمَا هُوَ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ يَدْعُوْ حَتّٰی انْجَلٰی كُسُوْفُهَا۔ (رواہ ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۶۹۹ حديث رقم ۱۱۸۲۔ وابن ماجه ۲/۴۰۱ حديث رقم ۱۲۶۲۔ وأحمد فی المسند ۵/۱۳۴۔

ترجمہ: حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سورج گرہن ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو نماز پڑھائی پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (پہلی دو رکعت میں) لمبی سورتوں میں سے ایک سورت پڑھی اور پانچ رکوع اور دو سجدے کیے پھر دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے پس اس میں قراءت فرمائی طویل سورتوں میں سے کسی ایک کی قراءت کی پھر پانچ رکوع اور دو سجدے کیے اور پھر اسی حالت پر قبلہ رخ ہو کر بیٹھ گئے اور دعا کرنے لگے یہاں تک کہ سورج سے گرہن دور ہو گیا۔ (ابوداؤد)

تشریح: (عن أبی بن کعب...... فصلی بهم) یعنی صلوٰۃ الکسوف پڑھائی۔

(فقرأ سورة) ایک نسخہ میں سورۃ سے پہلے باء حرف جار ہے یعنی بسورۃ ہے۔

(من الطول) طاء کے ضمہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ ''یا'' طاء کے کسرہ اور واؤ کے فتحہ کے ساتھ۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ طولی کی جمع ہے جیسے کبریٰ اور کبر ہیں۔

(ورکع خمس رکعات) یعنی پانچ رکوع کئے۔

(وسجد سجدتين ثم قام الثانية) یہ نصب ہے علی نزع الخافض، اور ایک نسخہ "الى الثانية" ہے۔

(فقرأ بسورة) باء کے ساتھ ہے۔

(من الطول ثم ركع خمس ركعات وسجد سجدتين ثم جلس كما هو) یعنی اسی طرح دوبارہ بیٹھ گئے جس طرح پہلے بیٹھے ہوئے تھے۔

(مستقبل القبلة) نصب کے ساتھ یعنی بیٹھے نماز کے بعد جیسا کہ نماز میں بیٹھتے ہیں یعنی قبلہ کی طرف چہرہ کر کے۔

(يدعو حتى انجلى كسوفها) یعنی سورج اپنی اصلی حالت میں لوٹ آیا۔ یہاں پر ایک اشکال ہوتا ہے کہ امام کو تو اختیار ہوتا ہے کہ وہ چاہے تو چہرہ قبلہ کی طرف کر کے دعا کرے اور چاہے تو کھڑے کھڑے دعا کرے اور اسی طرح چاہے چہرہ قوم کی طرف کر کے دعا کرے اور لوگ آمین کہتے رہیں، تو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایسا کیوں کیا؟

جواب: علامہ الحلوانی فرماتے ہیں: قبلہ ہی کی طرف چہرہ کر کے دعا کرنا اَحسن ہے اور کھڑے ہو کر کسی عصا پر سہارا لگا کر یا کسی قوس وغیرہ پر سہارا لگا کر دعا کرے تو یہ حسن ہے۔ (رواہ ابوداؤد)

۱۴۹۳: وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ كَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ وَيَسْأَلُ عَنْهَا حَتّٰى اِنْجَلَتِ الشَّمْسُ (رواه ابو داود وفي رواية النسائي) اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى حِيْنَ انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ مِثْلَ صَلَاتِنَا يَرْكَعُ وَيَسْجُدُ وَلَهٗ فِيْ اُخْرٰى اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمًا مُسْتَعْجِلًا اِلَى الْمَسْجِدِ وَقَدِ انْكَسَفَتِ الشَّمْسُ فَصَلّٰى حَتّٰى انْجَلَتْ ثُمَّ قَالَ اِنَّ اَهْلَ الْجَاهِلِيَّةِ كَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَا يَخْسِفَانِ اِلَّا لِمَوْتِ عَظِيْمٍ مِنْ عُظَمَآءِ اَهْلِ الْاَرْضِ وَاِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَا يَخْسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَّلَا لِحَيَاتِهٖ وَلٰكِنَّهُمَا خَلِيْقَتَانِ مِنْ خَلْقِهٖ يُحْدِثُ اللّٰهُ فِيْ خَلْقِهٖ مَاشَآءَ فَاَيُّهُمَا انْخَسَفَتْ فَصَلُّوْا حَتّٰى يَنْجَلِيَ اَوْ يُحْدِثَ اللّٰهُ اَمْرًا۔

أخرجه أبوداؤد في السنن ۱/ ۷۰۴ حديث رقم ۱۱۹۳۔ والنسائي ۳/ ۱۴۵ حديث رقم ۱۴۸۷۔

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سورج گرہن ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت نماز پڑھنی شروع کی اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ سورج روشن ہو گیا (ابوداؤد) اور نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ جب سورج گرہن ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری نماز کی طرح نماز پڑھائی اور رکوع اور سجدہ کرتے تھے۔ اور نسائی کی ایک اور روایت میں ہے کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کی طرف جلدی جلدی تشریف لے گئے تحقیق کی تو سورج گرہن لگ گیا تھا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہو گئے۔ یہاں تک کہ سورج روشن ہو گیا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ کہا کرتے تھے کہ بے شک سورج اور چاند کو گرہن نہیں لگتا مگر زمین میں رہنے والے بڑے لوگوں میں سے کسی بڑے کی موت کی وجہ

ہے۔ حالانکہ سورج اور چاند کو گرہن کسی کی موت اور پیدائش کی وجہ سے نہیں لگتا یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے دو مخلوق ہیں اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اپنی پیدا کردہ چیز میں تغیر پیدا کرتا ہے لہٰذا جب ان دونوں میں سے کوئی گرہن میں آ جائے تو نماز پڑھو یہاں تک کہ گرہن ہٹ جائے یا اللہ تعالیٰ کوئی حکم ظاہر فرما دیں۔ (نسائی)

تشریح: (وعن النعمان بن بشیر...... رکعتین)

علامہ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نماز حضور ﷺ نے کئی بار پڑھی اور جب کسوف کی مدت لمبی ہوتی تو آپ ﷺ بھی نماز کو لمبا کر دیتے اور تعداد رکوع میں اضافہ فرما دیتے اور جب مدۃ کسوف کم ہوتی تو آپ ﷺ نماز بھی مختصر فرما دیتے، اور یہ جائز ہے کہ انسان نماز علی حسب الحال اور علی مقدار الحاجۃ پڑھے۔ اور فرمایا کہ بہت سے اہل علم کی بھی یہی رائے ہے۔ کہ جب خسوف کا زمانہ طویل ہو تو تعداد رکوع میں زیادتی کی جائے یا قیام اور رکوع کو طویل کیا جائے اور سجود کو بھی طویل کیا جائے جیسا کہ قیام کو طویل کرتے ہیں، امام شافعیؒ کی بھی یہی رائے ہے جیسا کہ علامہ طیبیؒ نے ذکر کیا ہے، لیکن یہ شافعیہ کی کتاب ''الانور'' کے مخالف ہے، اس میں یہ لکھا ہے:

کہ اس نماز کی کم از کم دو رکعات ہیں جن میں سے ہر رکعت میں دو قیام اور دو رکوع ہیں، ان پر نہ تو کمی کی جا سکتی ہے اور نہ ہی زیادتی، اور اگر کسی نے کمی اور زیادتی جان بوجھ کر کی تو نماز باطل ہو جائے گی۔ اور غلطی سے بھول کر کی تو معاف ہے، اسی طرح یہ علامہ ابن حجر کے قول کے مخالف ہے، علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ جب کسی نے ایک نیت کر کے نماز شروع کی تو اب اس پر نہ تو کمی کر سکتا ہے اور نہ ہی زیادتی۔ اس لئے کہ ان دونوں کا جواز خاص ہے مطلق نفل کے ساتھ۔ نیز اس میں نماز کے متعدد ہونے والا قول بھی ہے جس کو پہلے ہی ضعیف قرار دیا جا چکا ہے۔

(ویسأل عنھا) یعنی اللہ سے دعا کی کہ اس کو ختم فرما دے۔

(حتی انجلت الشمس) اس سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ ﷺ بار بار دو رکعات نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ سورج صاف ہو گیا مگر یہ درست نہیں کیونکہ ماقبل احادیث گذری ہیں جن میں ہے کہ آپ ﷺ کے سلام پھیرنے سے پہلے پہلے سورج گرہن ختم ہو چکا تھا تو اب بار بار نماز پڑھنے کا کیا معنی؟ لہٰذا اس حدیث سے نماز کا بار بار پڑھنا تو ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس نماز کے دو رکعات ہونے سے احناف کے مذہب کی تائید ضرور ہوتی ہے۔

(رواہ ابو داؤد وفی روایۃ النسائی أن النبی ﷺ صلی حین انکسفت الشمس، مثل صلاتنا یرکع ویسجد) پس نسائی شریف کی اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ نماز ایک رکوع اور دو سجدوں والی ہی تھی۔

(ولہ) یعنی نسائی شریف ہی کی ایک اور روایت ہے جس کو (فی أخری) کہہ کر ذکر کیا۔ علامہ ابن الہمام نے فرمایا کہ یہ حدیث ابی قلابہ عن النعمان ہے۔

(أن النبی ﷺ خرج یوماً مستعجلاً الی المسجد) ابن الہمام کی ایک روایت میں ہے آپ ﷺ جب باہر نکلے تھے تو آپ ﷺ کی چادر زمین پر گھسٹتی جا رہی تھی اور آپ ﷺ مسجد میں پہنچ گئے۔

(وقد انکسفت الشمس فصلی) اور ایک روایت میں ہے ''لم یزل یصلی'' یعنی حضور ﷺ مستقل نماز میں

رہے۔

(حتی انجلت ثم قال: ان أھل الجاھلیة، کانوا یقولون) یہاں تک سورج صاف ہوگیا۔ کانوا یقولون، یزعمون یعنی گمان کرتے تھے، کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ ایک اور روایت میں ہے۔(ان الشمس والقمر، لا ینخسفان)

ایک روایت میں ''لا ینکسفان'' ہے۔

(الا لموت عظیم، من عظماء أھل الأرض وأن الشمس)

ایک روایت میں ''أن الشمس'' سے پہلا ''لیس کذلك'' بھی ہے۔

(والقمر لا ینخسفان) ایک روایت میں ''لا ینکسفان'' ہے (لموت أحد ولا لحیاة) حیات بمعنی ولادت ہے۔

(ولکنھما خلیقتان من خلقه) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ دونوں بھی اللہ کی مخلوق ہی ہیں جس طرح اور مخلوق ہے، پس جب دوسری مخلوق کسی کے مرنے یا جینے کا اثر نہیں لیتی تو یہ کیونکر ایسا کرسکتی ہے، یہ محض مشرکین کا گمان تھا کہ کسوف یا خسوف کسی کی موت یا پیدائش کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

(یحدث اللّٰه فی خلقه ما شآء) ایک نسخہ میں ''ما یشآء'' ہے یعنی چاہے کسوف ہو، خسوف ہو، روشنی ہو یا اندھیرا ہو سب کچھ اللہ ہی پیدا کرتا ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ ماشآء مصدر کا مفعول ہے اور مضاف ہے فاعل کی طرف۔

(فأیّھما انخسف فصلوا) اور ایک روایت میں ہے ''أن اللّٰه اذا بدأ أی تجلی للشی من خلقه، خشع له فاذا رأیتم...... '' کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق یعنی سورج یا چاند کو گرہن سے صاف کردیں تو نماز پڑھو جیسا کہ اس سے پہلے متصل وقت میں ایک فرض نماز پڑھ چکے ہو یعنی فجر کی طرح ایک اور نماز پڑھو۔

(حتی ینجلی أو یحدث اللّٰه أمرًا) یعنی کوئی بھی ایسا کام ہو، جو پریشانی کا سبب بن رہا ہو یا بن سکتا ہو نماز کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

بَابٌ فِيْ سُجُوْدِ الشُّكْرِ

یہ باب سجدۂ شکر کے بیان میں ہے

وہ سجدہ جو نماز سے باہر کیا جائے اس کا حکم کیا ہے تو اس بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اس سجدہ کی چند اقسام ہیں ہر ایک کا حکم الگ ہے

قسم اوّل: سجدہ سہو۔ یہ نماز کے حکم میں ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے

نمبر۲: سجدہ تلاوت یہ بھی بلا اختلاف مشروع ہے۔

نمبر۳: سجدہ مناجات یہ سجدہ راجح یہی ہے کہ مکروہ ہے۔
نمبر۴: سجدہ شکر جو کسی نعمت کے حصول اور مصیبت کے دور ہونے پر کیا جاتا ہے اس میں اختلاف ہے اور دو مذہب ہیں۔
مذہب اول: امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک سجدہ شکر مسنون ہے۔
دلیل: ان حضرات کی دلیل وہ روایات ہیں جن میں کسی نعمت کے ملنے اور مصیبت کے ہٹنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کرام سے سجدہ کرنا منقول ہے مثلاً جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوجہل کے مرنے کی خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ شکر ادا کیا اسی طرح جب مسیلمہ کذاب کے جہنم رسید ہونے کی خبر سنی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سجدہ شکر ادا کیا۔ اور حضرت علیؓ نے ذی الثدیہ خارجی کے قتل ہونے پر سجدہ شکر ادا کیا اور حضرت کعب بن مالکؓ نے اپنی توبہ کی قبولیت کا سن کر سجدہ شکر ادا کیا۔
مذہب ثانی: امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک سجدہ شکر مکروہ ہے۔
دلیل: فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں تو پھر ہر نعمت پر شکر ادا کرنا پڑے گا تو بندہ کے اندر اتنی طاقت کہاں ہے کہ ہر نعمت کے مقابلے میں سجدہ کر سکے اس سے خواہ مخواہ اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرے گا۔
نعمتوں سے مراد یہ ہے کہ وہ نعمت جوئی ہو اور کبھی کبھی ملے تو اس پر انسان سجدہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ تعدد روایات کی وجہ سے احناف کے ہاں سجدہ شکر کے استحباب کا ہی فتویٰ دیا جاتا ہے۔
سجدۂ شکر اس سجدے کو کہتے ہیں جو آدمی کسی نعمت کے صلے پر کرتا ہے یا کسی مصیبت یا پریشانی کے دور ہونے پر کرتا ہے۔
یہ سجدہ امام شافعیؒ کے نزدیک سنت ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سنت نہیں ہے اور صاحبین کا امام صاحب سے اس میں اختلاف ہے۔

وَهٰذَا الْبَابُ خَالٍ عَنِ الْفَصْلِ الْاَوَّلِ وَالثَّالِثِ

اِس باب میں پہلی اور تیسری فصل نہیں ہے

(وهذا الباب خال عن الفصل الأول) یہ باب فصل اول سے خالی ہے۔ ''اس بات کو سمجھنے سے پہلے ایک بات کا سمجھنا ضروری ہے وہ یہ کہ مشکوۃ المصابیح اصل میں دو کتابیں ہیں: ① المصابیح ② مشکوۃ۔ پہلے المصابیح لکھی گئی جس میں صرف احادیث کو جمع کیا گیا تھا ابواب وفصول کی ترتیب نہ تھی پھر بعد میں خطیب تبریزیؒ نے المصابیح پر کام کیا اور اس میں ابواب وفصول کی ترتیب قائم کی اور ہر باب میں تین تین فصلیں قائم کیں، خطیب تبریزی کی عادت ہے کہ وہ فصل اول میں متفق علیہ اُحادیث ذکر کرتے ہیں۔ فصل ثانی میں متفق علیہ کے علاوہ اُحادیث ذکر کرتے ہیں اور فصل ثالث میں وہ احادیث ذکر کرتے ہیں جو اس باب سے متعلقہ ہیں مگر صاحب المصابیح اس کو ذکر نہ کر سکے تھے''۔ تو اس لئے صاحب مشکوٰۃ نے فرمایا کہ یہ باب فصل اول سے خالی ہے اور اس کا خالی رہنا صاحب المصابیح کی طرف سے ہے اس لئے کہ صاحب المصابیح کو متفق علیہ احادیث اس باب سے متعلقہ نہ مل سکیں۔

(والثالث) اور یہ باب فصل ثالث سے بھی خالی ہے کیونکہ مجھے بھی ایسی احادیث مزید نہ مل سکیں جن کو میں پہلے کی طرح اپنی طرف سے فصل ثالث میں ذکر کرتا۔

الفصل الثانی:

خوشی کے وقت آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا عمل

۱۴۹۴: وَعَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا جَاءَہٗ اَمْرٌ سَرُوْرًا اَوْ یَسُرُّبِہٖ خَرَّ سَاجِدًا شَاکِرًا لِلّٰہِ تَعَالٰی۔ (رواہ ابوداود والترمذی وَقَالَ ھذاحدیث حسن غریب)

أخرجه أبو داوٗد فی السنن ۳/۲۱۶ حدیث رقم ۲۷۷۴۔ والترمذی فی السنن ٤/۱۲۰ حدیث رقم ۱۵۷۸۔ وابن ماجه ۱/٤٤٦ حدیث رقم ۱۳۹٤۔

ترجمہ: حضرت ابوبکرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی خوش کن امر پیش آتا یا راوی فرماتے ہیں سروراً کی بجائے یسرہ کا لفظ فرمایا یعنی جس کام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوتے تو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گر پڑتے۔ (ترمذی، ابوداؤد) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

تشریح: امرٌ: اُمر تنوین کے ساتھ ہے اور تنوین تعظیم کیلئے ہے۔

(مسروراً) منصوب علی نزع الخافض ہے، یعنی خوشی کے ملنے کی وجہ سے، یا یہ منصوب ہے تمیز ہونے کی وجہ سے۔ یا یہ منصوب ہے تقدیری عبارت ''أعنی'' کی وجہ سے، اور یہ تقدیری عبارت راوی کی جانب سے مانی جائے گی۔ یعنی راوی یہ کہنا چاہتا ہے کہ جب حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو کوئی معاملہ پیش آتا یعنی خوشی والا معاملہ۔ ایک نسخہ میں ''أمرٌ سرورٌ'' ہے یعنی سرور صفت ہے اُمر کی مبالغہ کیلئے، اور ایک نسخہ میں ''أمرُ سرورٍ'' ہے اضافت کی وجہ سے بمعنی تقدیری عبارت یوں ہوگی ''أمر ذو سرور''۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: اس کا مطلب ہے ''اذا جاءہ أمر عظیم حال کونہ سروراً''۔ بہرحال یہ عبارت مکمل نہیں ہوتی مگر یہ کہ مضاف کو محذوف مانا جائے، یا اس کو مصدر مانا جائے اور فاعل یا مفعول کے معنی میں لیا جائے، یا پھر اس کو مبالغہ کے طور پر لیا جائے جیسا کہ کہا جاتا ہے ''رجل عدلٌ''۔

أو یسر به یعنی راوی کو شک ہے لفظ میں، لیکن یہ شک حدیث کی قوت میں کچھ کمی واقعہ نہیں کرتا کیونکہ دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔

(خرّ) بمعنی سقط۔

(ساجداً شاکراً) دونوں حال متداخل ہیں یا حال مترادف ہیں، ایک نسخہ میں ''ساجداً شکراً'' ہے، اور شکراً منصوب ہے علت کی وجہ سے،

(للّٰہ تعالیٰ)

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں کہ بہت سے علماء حدیث کے ظاہری الفاظ کو دیکھ کر یہ کہنے لگے کہ سجدہ مشروع ہے کسی نعمت کے

شکر میں جبکہ انہیں میں سے بعض علماء کی رائے یہ ہوئی کہ یہاں سجدے سے مراد نماز ہے۔یعنی شکر نعمت میں نماز پڑھو، جو علماء صرف سجدے کے قائل ہوئے وہ دار قطنی کی ایک حدیث جو کہ ابو جعفرؒ سے مروی ہے، کو دلیل بناتے ہیں، جس میں ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کے پاس ابو جہل کا کٹا ہوا سر پہنچا تو آپ ﷺ شکر کرنے کیلئے سجدے میں چلے گئے۔اور جو علماء سجدے سے نماز مراد لیتے ہیں ان کی دلیل، حضرت عبداللہ بن اُبی اُوفیؓ کی روایت ہے یہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کو دیکھا آپ ﷺ نے چاشت کی نماز پڑھی جبکہ آپ ﷺ کے پاس ابو جہل یا ایک فتح کی بشارت پہنچی تھی۔ یہ تو ان علماء کی رائے تھی جو کہ ظاہری الفاظ کو دیکھ رہے تھے، لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اُن سے ہٹ کر ہے اللہ تعالیٰ ان پر بے شمار رحمت نازل فرمائے۔

امام صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ہم سجدۂ شکر کو لازم کر دیں ہر نئی نعمت پر، تو سارے کے سارے انسان ایک لمحہ کیلئے بھی سجدۂ شکر سے خالی نہیں رہ سکیں گے یعنی ہر وقت ان کو سجدۂ شکر ہی کرتے رہنا ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے انسان پر بے شمار احسانات ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو زندگی بخشی اور اس زندگی کا آنے والا ہر سانس ایک نئی نعمت ہے اس طرح ہر بندے پر ہر سانس کے بدلے میں ایک سجدہ لازم ہوگا۔ جبکہ بعض لوگوں نے کہا کہ یہاں سرور سے مراد وہ نعمت اور خوشی ہے جس کا آپ کو کافی عرصے سے انتظار تھا پھر اچانک وہ خوشی آپ کو مل گئی، اس کی تائید حضرت سعد بن اُبی وقاصؓ کی روایت سے بھی ہوتی ہے جو کہ مشکوۃ میں بھی ہے اور ابوداؤد ۳/۲۱۷ میں بھی ہے۔

نیز اس حدیث کو حدیث النغاشی پر بھی محمول کہا جا سکتا ہے جس کی تفصیل اس سے اگلی حدیث (رقم الحدیث ۱۴۹۵) میں آئے گی۔اگرچہ یہ حدیث یعنی حدیث النغاشی ضعیف ہے لیکن جب ایک ضعیف حدیث کی تائید دوسری احادیث سے بھی ہو رہی ہو تو وہ قوی بن جاتی ہے اور حسن کے درجے میں آجاتی ہے اور جو حدیث اس کے تحت آئے وہ بھی حسن بن جاتی ہے۔ رواہ ابو داؤد والترمذی عن اُبی بکرۃ کذا ذکرہ الطیبی۔

رواه أبو داؤد والترمذي وقال: هذا حديث حسن غريب) امام حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے، اور علامہ میرک نے بھی اس کی تصحیح نقل کی ہے نیز ابن ماجہ اور احمد نے بھی اس کو روایت کیا ہے، لیکن اس کی سند میں ''بكار بن عبد العزى'' ہے۔ جس کے بارے میں بعض نے کلام کیا ہے اور بعض نے ثقہ کہا ہے، جبکہ امام الترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن، غریب ہے، ہم نہیں جانتے اس حدیث کو مگر اس طریق سے۔

اور بیہقی فرماتے ہیں: اس باب میں حدیث ہے حضرت جابرؓ سے، حضرت جریرؓ سے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے، حضرت اُنسؓ سے، حضرت ابوجحیفہؓ سے، یہ سب حضرات نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں، اور یہی حدیث حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے فعل سے مروی ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ اس باب میں حضرت ابوموسیٰ الاشعری، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔

کسی مبتلاءِ مصیبت کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنی چاہیے اور پناہ مانگنی چاہیے

۱۴۹۵: وَعَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاٰی رَجُلًا مِنَ النَّغَاشِیِّنَ فَخَرَّ سَاجِدًا۔

(رواه الدارقطني مرسلا وفي شرح السنة لفظ المصابيح)

أخرجه الدارقطني ١/ ٤١٠ حديث رقم ١ من باب السنة في سجود الشكر ـ

ترجمہ: حضرت ابوجعفرؒ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انتہائی پست قد والے شخص کو دیکھا تو سجدہ ریز ہو گئے۔ یہ دارقطنی کی روایت ہے اور انہوں نے اس کو مرسل نقل کیا ہے اور شرح السنہ نے مصابیح کے الفاظ نقل کیے ہیں۔

تشریح: أبي جعفر :ابوجعفر کنیت ہے اصل نام ''محمد بن علی بن الحسین بن علی بن اَبی طالب'' ہے۔ آپؒ ''الباقر'' کے نام سے معروف تھے اس لئے کہ آپ علم میں بڑے پختہ نظر رکھتے تھے، اور بڑے وسیع علم والے تھے۔ علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ابوجعفر سے ''محمدؒ'' الصادق'' مراد ہیں۔ لیکن حافظ صاحب کا یہ کہنا درست نہیں کیونکہ الصادق تو ان کے بیٹے کا لقب تھا، ان کا لقب تو ''الباقر'' ہی ہے۔

النغاشين)نوؔن کے ضمہ اور یاء کی تخفیف کے ساتھ، بعض نسخوں میں یاء کی تشدید کے ساتھ بھی ہے۔ علامہ میرک فرماتے ہیں: النغاشی یاء کی تشدید کے ساتھ ہے، اور ''نغاشی'' یاء کے حذف کے ساتھ بھی ہے یعنی ''النغاش'' بہرحال النغاشی یا النغاش چھوٹے قد والے، کمزور جسم والے اور ناقص خلقت والے انسان کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ مصیبت زدہ کو کہتے ہیں، اور بعض نے کہا مجنون اور مختلط العقل کو کہتے ہیں۔ اور مصابیح میں ''رجلاً نغاشیًا'' کے الفاظ ہیں۔ اور ایک حدیث میں نغاشیًا یاء مشدد کے ساتھ بھی ہے۔

(فخرّ) یعنی سجدے میں چلے گئے، علامہ مظہر فرماتے ہیں، جب کسی مصیبت زدہ کو دیکھو تو سجدہ کرو شکر کرتے ہوئے اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مصیبت سے دور رکھا، لیکن یہ سجدہ چھپ کر کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مصیبت زدہ دیکھ لے اور اس کی دل آزاری ہو، اور جب تم کسی فاسق کو دیکھو تو بھی سجدہ کرو شکر کے طور پر کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس فسق و فجور کی زندگی سے دور رکھا اور یہ سجدہ چھپ کر مت کرو بلکہ ظاہراً کرو تا کہ اس فاسق کو شرم آئے اور وہ توبہ تائب ہو جائے۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی ایسے شخص کو دیکھا جو دنیا کے مشاغل میں پھنسا ہوا تھا اور دین سے غافل تھا تو آپؒ نے فرمایا:

''الحمد لله الذي عافاني مما ابتلاك به''

ترجمہ: ''تمام تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جس نے مجھے عافیت میں رکھا اُس سے، جس میں تجھے مبتلاء کیا''۔

(رواه الدارقطني مرسلاً) یہ حدیث مرسل ہے کیونکہ حضرت ابوجعفرؒ نے حضور ﷺ کا زمانہ نہ پایا تھا البتہ یہ حدیث اپنے والد امام زین العابدین اور حضرت جابر بن عبداللہ سے سنی تھی۔

(وفي شرح السنة لفظ المصابيح) اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ شرح السنۃ میں مصابیح کے الفاظ ہیں، یعنی شرح السنۃ کے مصنف نے اس حدیث کو مصابیح کے جس نسخے سے نقل کیا۔ اس میں ''من النغاشين'' کے بجائے ''نغاشًا'' ہے۔ اسی وجہ سے خطیب تبریزیؒ نے آگاہ کر دیا کہ شرح السنۃ میں مصابیح کے حوالے سے جو حدیث مذکور ہے اس میں ''من النغاشين'' کے بجائے ''نغاشًا'' ہے۔ یہ جملہ خطیب تبریزی کی کمال احتیاط پر دلالت کرتا ہے۔

اُمت کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا

۱۴۹۶: وَعَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ مَّكَّةَ نُرِيْدُ الْمَدِيْنَةَ فَلَمَّا كُنَّا قَرِيْبًا مِّنْ عَزْوَزَاءَ نَزَلَ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ فَدَعَا اللّٰهَ سَاعَةً ثُمَّ خَرَّ سَاجِدًا فَمَكَثَ طَوِيْلًا ثُمَّ قَامَ فَرَفَعَ يَدَيْهِ سَاعَةً ثُمَّ خَرَّ سَاجِدًا فَمَكَثَ طَوِيْلًا ثُمَّ قَامَ فَرَفَعَ يَدَيْهِ سَاعَةً ثُمَّ خَرَّ سَاجِدًا قَالَ اِنِّیْ سَاَلْتُ رَبِّیْ وَشَفَعْتُ لِاُمَّتِیْ فَاَعْطَانِیْ ثُلُثَ اُمَّتِیْ فَخَرَرْتُ سَاجِدًا لِّرَبِّیْ شُكْرًا ثُمَّ رَفَعْتُ رَاْسِیْ فَسَاَلْتُ رَبِّیْ لِاُمَّتِیْ فَاَعْطَانِیْ ثُلُثَ اُمَّتِیْ فَخَرَرْتُ سَاجِدًا لِّرَبِّیْ شُكْرًا ثُمَّ رَفَعْتُ رَاْسِیْ فَسَاَلْتُ رَبِّیْ لِاُمَّتِیْ فَاَعْطَانِیْ الثُّلُثَ الْاٰخَرَ فَخَرَرْتُ سَاجِدًا لِّرَبِّیْ شُكْرًا۔ (رواہ احمد وابوداود)

أخرجه أبو داؤد في السنن ۳/۲۱۷ حديث رقم ۲۷۷۵۔

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم آقائے دو عالم کے ساتھ مکہ سے مدینہ کا ارادہ رکھتے ہوئے روانہ ہوئے جب ہم غزوزاء کے قریب پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری سے اترے اور اپنے ہاتھ مبارک اٹھائے اور تھوڑی دیر دعا فرمائی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گر پڑے اور کافی دیر تک سجدہ ہی میں رہے پھر آپ کھڑے ہوئے اور پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور دوبارہ پھر سجدہ میں چلے گئے اور بہت دیر تک سجدہ میں رہے اور فرمانے لگے۔ میں نے اپنی امت کے لئے اپنے رب سے دعا کی اور اپنی امت کے لئے رب سے سفارش کی پس مجھے تہائی امت عطاء کر دی گئی (یعنی ان کے بارے میں میری شفاعت قبول کر لی گئی) تو میں اپنے رب کے سامنے اس کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر پڑا پھر میں نے سر اٹھایا اور اپنے رب سے اپنی امت کے بارے میں سوال کیا تو مجھے دوسرا ثلث بھی دے دیا گیا تو میں نے بطور شکر کے اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ (احمد۔ ابوداؤد)

تشریح: (وعن سعد بن أبي وقاص) عشرۃ مبشرۃ میں سے ایک خوش نصیب یہ بھی ہیں۔

(قال خرجنا مع رسول اللہ ﷺ من مكة مزيد) جمع متکلم کے صیغہ کے ساتھ جبکہ ایک نسخہ میں واحد مذکر غائب کے صیغہ کے ساتھ یعنی یرید اور ھو ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف راجع ہے۔

(المدينة) یعنی مدینہ کی طرف جانے کا ارادہ تھا اور ہم بھی تابع تھے رسول اللہ ﷺ کے۔ یعنی جہاں جانے کا ارادہ ان کا تھا ہمارا بھی ارادہ وہیں کا تھا۔

(فلما كنا قريبًا من عزوزاء) یعنی جب ہم عزوزاء کے قریب پہنچے، لفظ "عزوزاء" عین کے فتحہ کے ساتھ، پہلی زاء کے سکون کے ساتھ، واؤ کے فتحہ اور زاء کے مدّ کے ساتھ، بعض نے مد کے بغیر یعنی قصر کے ساتھ کہا ہے۔ بمعنی ایک ٹیلہ جو کہ مکہ سے مدینہ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں آتا ہے۔ اس کا نام عزورآء اس لئے رکھا گیا کیونکہ یہ ایک سخت اور چٹیل زمین تھی، اور یہ ماخوذ ہے عزاز سے، عین کے فتحہ کے ساتھ، عزاز کہتے ہیں سخت اور چٹیل زمین کو جس میں پانی بھی کم ہو، اور عزوزآء ماخوذ من العزوز بھی ہو سکتا ہے۔ معزوز کہتے ہیں ایسی اونٹنی کو جس کے تھنوں کے سوراخ تنگ ہوں اور بڑی مشکل سے ان سے دودھ

نکلتا ہو۔

ایک نسخہ میں عزورآء، رآء کے ساتھ بھی ہے، جیسا کہ علامہ سیدؒ کے نسخہ کے حاشیہ میں ہے، اور علامہ میرک علامہ السید اُصیل الدین کے خط سے نقل کرتے ہیں کہ اُلف کو حذف کرنے کے ساتھ زیادہ مشہور ہے، یعنی ''عزور''۔ شراح المصابیح اس کو العزازہ (عین کے فتحہ کے ساتھ) بھی کہتے ہیں۔ بمعنی سخت اور چٹیل زمین۔

صاحب المغرب اور شیخ الجزری فرماتے ہیں تصحیح المصابیح میں کہ: یہ لفظ عزوراء، عین کے فتحہ، زاء کے سکون اور واؤ اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہے، پھر بعض اہل لغات نے راء کے بعد الف کو ثابت رکھا ہے جبکہ بعض نے الف کو حذف کیا ہے، بہر حال یہ مقام جحفہ کے قریب ایک گھاٹی کا نام ہے اور مکہ مکرمہ سے باہر واقع ہے، نیز الشیخ الجزری یہ بھی فرماتے ہیں کہ مناسب نہیں کہ متوجہ ہوا جائے ان ابحاث کی طرف جو شراح المصابیح نے لفظ ''عزوزآء'' کے بارے میں کی ہیں اور نہ ہی میں دیکھتا ہوں کہ ان میں سے کسی نے علی طریق الصواب اس کی تقیید کی ہو واللہ اعلم۔ اور قاموس میں جو ہے وہ بھی اسی کے یعنی الشیخ کے قول کے موافق ہے۔ اور النہایۃ سے بھی زآء معجمہ کے ساتھ پڑھنا ہی سمجھ میں آتا ہے۔

(نزل) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل کی تھی کہ اس جگہ اترو، وگرنہ اس بستی میں تو کوئی ایسی خاص بات نہ تھی، لیکن اب اس بستی کو ایک خاصیت ضرور حاصل ہے وہ یہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت میں سے ہر خاص اور عام کیلئے دعا فرمائی واللہ اعلم۔

(ثم قام فرفع یدیہ ساعۃ ثم خرّ ساجدًا، فمکث طویلاً ثم قام) یعنی تیسری مرتبہ۔

(فرفع یدیہ ساعۃ ثم خرّ ساجدًا) اس میں اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا آہستہ سے مانگی کیونکہ اگر بلند آواز سے مانگتے تو صحابی اس کو بھی ضرور بیان کرتے۔ اور ویسے بھی دعا میں اخفاء ہی افضل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات ہیں:

''أدعوا ربکم تضرعًا و خفیۃ'' [الأعراف۔۵۵]۔

ترجمہ: اپنے رب کو پکارو عاجزی کرتے ہوئے اور آہستہ آہستہ۔

''اذ نادی ربہ نداءً خفیًا'' [مریم۔۳]۔

ترجمہ: جب پکارا اس نے اپنے رب کو آہستہ سے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں ہاتھ اٹھانا مستحب ہے مگر ان مواقع میں نہیں جہاں پر شریعت نے منع کر دیا ہو۔

(قال انی سألت ربی) یعنی میں نے اللہ سے دعا مانگی اور رحمت طلب کی۔

(و شفعت لأمتی) یعنی ان کے گناہ کو معاف کرنے کی، ان کے عیوب کو چھپانے، ان کے درجات بلند کرنے، اور ان کی شان میں اضافہ کرنے کی سفارش کی، یعنی یہ بیان ہے اس کا کہ میں صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے کیا کیا مانگا۔

(فأعطانی) مجھے دے دیا۔

(ثلث أمتی) لام کے ضمہ اور سکون دونوں کے ساتھ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے میری اُمت کے تہائی حصہ کی مغفرت کی سفارش کرنے کی اجازت دے دی، اور یہاں اس ثلث سے امت میں سے ''سابقون'' مراد ہیں۔

(فخررت) راء کے فتحہ کے ساتھ بمعنی چلے جانے۔

(ساجدًا لربی شکرًا) یعنی نعمت کے شکر میں اور اضافے کی طلب میں کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ" [ابراھیم ۷]

(ثم رفعت رأسی فسألت ربی) یعنی اپنے رب کی رحمت اور مزید مغفرت۔

(لأمتی) یعنی سارے امت کیلئے۔

(فاعطانی الثلث الآخر) خاء کے کسرہ کے ساتھ اور بعض کے نزدیک خاء کے فتحہ کے ساتھ بھی ہے۔ بہر حال اس ثلث امت سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا یعنی گناہ گار۔

علامہ تورپشتی فرماتے ہیں: یعنی مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ چیز عطا فرمائی جو مانگی تھی، پس اب جنت اور میری شفاعت ان پر واجب ہوگئی۔ پس اب یہ گذشتہ امتوں کی طرح نہ ہوں گے۔ لیکن یہاں پر یہ دیکھنا ہوگا کہ امت کی دو قسمیں ہیں: ① امت اجابت۔ ② امت دعوت۔ تو یہاں پر جس کو شفاعت اور جنت کی بشارت دی گئی وہ امت اجابت ہے نہ کہ امت دعوت، کیونکہ امت دعوت سارے زندگی ایمان واسلام کے لباس سے عاری رہی تو اب روز آخرت جنت اور شفاعت کی پوشاک سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے عاری رہے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النسآء۔۴۸]

"خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کردے۔"

(فخررت ساجدًا لربی شکرًا) علامہ مظہر فرماتے ہیں کہ حدیث کے یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ شفاعت کی وجہ سے سارے گناہ معاف فرمادیں گے اور جس کی شفاعت ہوگی وہ جہنم میں نہ جائے گا کیونکہ اگر یہ معنی لئے جائیں تو بہت سی آیات اور احادیث کی مخالفت لازم آتی ہے۔ جن میں مالِ یتیم کھانے والے، سود کھانے والے، زنا کرنے والے، شراب پینے والے اور ناحق قتل کرنے والے کے بارے میں وعیدوز جر وارد ہوئی ہے لہٰذا یہ معنی نہ ہوگا بلکہ یہ معنی ہوگا کہ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی تھی کہ میری امت کو باقی تمام امتوں پر فوقیت اور خاصیت حاصل ہوجائے۔ مثلاً گناہوں کی وجہ سے ان کی صورتیں مسخ نہ ہوں اور نہ وہ کبائر کی وجہ سے جہنم میں ... سے گناہ ڈھل جانے کے بعد ایک نہ ایک دن ضرور نکال لی جائے، اس کے علاوہ اور بہت سی خاصیات ہیں جن کی وجہ سے حضور ﷺ کی امت کو باقی امت پر فضیلت حاصل ہے۔ (علامہ خود اس معنی کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں) "وفیہ نظر" اس معنی میں بھی نظر ہے وہ اس لئے کہ جس طرح اللہ کی سنت اہل کبائر کی تعذیب پر دلالت کرتی ہے اسی طرح ان کی مغفرت پر بھی تو دلالت کرتی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

① ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ [الزمر۔۵۳]

بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف فرمادیں گے۔

② ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [النسآء۔۴۸]

"خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کردے۔"

عفو، کریم ہی کی جانب سے ہوتا ہے تو کیا مناسب ہے کہ اس سے عذاب کی امید رکھیں؟ ہرگز نہیں کیونکہ وہ تو اکرم الاکرمین

ہے، اور باقی رہا جہنم میں داخل ہونا، تو وہ ان کیلئے ہے جو گناہ کو حلال سمجھ کر کرتے تھے بخلاف معتزلہ کے، کیونکہ معتزلہ کے نزدیک تو مطلقاً مرتکب کبیرہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں جائیں گے۔

ملا علی القاریؒ فرماتے ہیں کہ علامہ مظہر نے ''**وفیه نظر**'' کہہ کر اشکال تو پیش کیا مگر یہ اشکال کچھ ظاہر نہیں ہو سکا، اور باقی رہا ان کا یہ قول کہ اللہ کی سنت جیسا کہ اہل کبائر کی تعذیب پر دلالت کرتی ہے اسی طرح ان کی مغفرت پر بھی دلالت کرتی ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ یہ ایک دوسرے کے منافی نہیں بوجہ اس کے جو مقرر شدہ ہے عقائد کے باب میں کہ اللہ تعالیٰ اولاً تو اہل کبائر کو جہنم میں بھیجیں گے پھر ثانیاً سب کو معاف فرما کر جنت میں بھیج دیں گے۔ پس یہی تفسیر ہے ان دونوں آیتوں کی بے شک اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے چاہے جہنم میں بھیج کر معاف فرمائیں یا بغیر داخل کئے معاف فرمادیں وہ مالک ہے بہر حال گناہ جیسا بھی ہو سوائے شرک کے، اللہ پاک اسے معاف فرمائیں گے۔ دوسری تفسیر ان آیات کی یہ کی جاتی ہے کہ دوسری آیت یعنی ''**ان اللّٰہ لا یغفر**......'' محکم ہے اور پہلی آیت منسوخ یا مؤول ہے وہ اس طرح کہ ''**الذنوب**'' میں لام عہدی ہے اور مراد اس سے شرک و کفر کے علاوہ تمام گناہ ہیں، پس یہ مقید ہوں گے توبہ کے ساتھ۔

علامہ قاضی فرماتے ہیں: اور امت کی شفاعت کا مطلب یہ ہے کہ ان کو جہنم میں ہمیشہ کیلئے داخل نہ کیا جائے گا، اور ان کے صغائر سے درگذر کیا جائے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں کہ علامہ قاضی اور علامہ مظہر کے کلام سے تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ شفاعت امت کے صرف صغائر میں مؤثر ہوگی اور اہل کبائر کے حق میں عدم خلود کیلئے مؤثر ہوگی یعنی اہل کبائر جہنم میں جائیں گے لیکن اپنے گناہوں سے پاک صاف ہو کر اسی شفاعت کی وجہ سے ایک نہ ایک دن جنت میں ضرور آئیں گے یعنی **شفاعت قبل الدخول فی النار** مؤثر نہ ہوگی۔ حالانکہ ہم ترمذی اور ابوداؤد میں حضرت انسؓ کے واسطے سے ایک حدیث پڑھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''**شفاعتی لأهل الکبائر من أمتی**'' (رقم الحدیث ۴۷۳۹) (فی الترمذی۔ ۲۴۳۵)

ترجمہ: میری شفاعت میری امت کے اہل کبائر کیلئے ہے۔

اور ترمذی شریف ہی میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''**من لم یکن من أهل الکبائر فما له للشفاعة**'' (رقم الحدیث۔ ۲۴۳۶)

ترجمہ: جو اہل کبائر میں سے نہ ہو تو پس اس کیلئے میری شفاعت ہی نہیں۔ یعنی میری شفاعت ہے ہی اہل کبائر کیلئے۔

بہر حال ان سب احادیث سے یہ مفہوم ہوتا ہے نبی کریم ﷺ کو شفاعت کا اختیار دیا جائے گا، جب یہ بات سامنے آئی اب کوئی محل نزاع باقی نہیں رہا کیونکہ اب یہ معلق ہوگئی نبی کریم ﷺ کی اذن واجازت پر۔ پس اب آپ ﷺ چاہیں تو قبل الدخول شفاعت کر دیں اور اگر چاہیں تو بعد الدخول شفاعت کر دیں۔ اب یہ ان ﷺ کی مرضی پر موقوف اور معلق ہے۔ **واللّٰہ اعلم بحقیقة الحال**۔

(**رواہ احمد وابوداؤد**) یعنی عامر بن سعد بن ابی وقاص عن ابیہ کے طریق سے جید اسناد کے ساتھ جبکہ امام ابوداؤد نے اس کی سند پر خاموشی اختیار کی ہے، لیکن علامہ المنذریؒ نے اس کی تائید کی ہے ذکرہ میرکؒ۔

بَابُ صَلٰوةِ الْاِسْتِسْقَاءِ

نمازِ استسقاء کا بیان

استسقاء باب استفعال کا مصدر ہے اس میں سین' تاء طلب کے لئے ہیں اور اس کا مادہ قی ہے اس کا لغوی معنی ہے بارش طلب کرنا اور پانی مانگنا اور اصلاحِ شریعت میں استسقاء کا معنی ہے **طلب السقی بوجه مخصوص بانزال المطر ودفع الجدب والقحط**۔ پانی طلب کرنا مخصوص طریقے پر بارش کے نزول کے ساتھ قحط اور خشک سالی کو دور کرنے کے لئے۔

ایک صحیح نسخے میں ''باب الاستقاء'' کے بجائے ''**باب صلوۃ الاستسقآء**'' ہے۔ اور یہ لغت میں ''**طلب السقیا**'' یعنی ''سیرابی کو طلب کرنا'' اور شرع میں ''**طلب السقیا للعباد من اللّٰہ تعالٰی عند حاجتھم الیھا، بسبب قلۃ الأمطار او عدم جری الأنھار**''

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ سے بندوں کیلئے سیرابی کو طلب کرنا، ان کی ضرورت کے وقت، جبکہ بارشوں کی قلت یا انہار کے خشک ہونے سے ان کی سیرابی میں کمی آ چکی ہو''۔

علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں: ''لوگ تین روز تک استسقآء کیلئے باہر نکلیں گے''۔

لیکن یہ نقل نہیں کیا کہ تواضع کرنے والے، اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنے والے ہوں، بوسیدہ کپڑوں میں پیدل چل رہے ہوں، ہر دن توبہ الی اللہ کے بعد صدقہ کرنے والے ہوں، اور سب کسی میدان میں جمع ہوں مگر مکۃ المکرّمۃ اور بیت المقدس میں میدان کے بجائے مسجد ہی میں جمع ہوا جائے گا۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اس کی تین قسمیں ہیں جو کہ اَخبار صحیحہ سے ثابت ہیں۔ ان تینوں میں سے سب سے کم ''**مجرد دعا**'' ہے، خواہ انفرادی ہو یا اجتماع کی صورت میں ہو۔ امام ابوعوان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ ایک جماعت نبی کریم ﷺ کے پاس بارش کی کمی کی شکایت لے کر آئی تو پس آپ ﷺ نے فرمایا: اپنی اپنی سواریوں پر چڑھ جاؤ اور پھر کہو: ''یارب یارب'' پس سب نے ایسا ہی کیا تو اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرما دی''۔ نیز عنقریب یہ حدیث بھی آئے گی کہ نبی کریم ﷺ نے زیتون کے پہاڑوں کے قریب بارش کی دعا بغیر نماز کے مانگی۔ امام شافعیؒ اسی قسم کے استسقاء کو پسند فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں یہ طریقہ اہل صلاح کا ہے۔

اور استسقاء کی دوسری قسم جو کہ درمیانی قسم کہلاتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر نماز کے بعد دعا کرنا خواہ نوافل ہی کیوں نہ ہوں اور اسی طرح جمعہ کے خطبہ میں بھی دعا کرنا۔

اور استسقاء کی سب سے اعلیٰ اور تیسری قسم یہ ہے کہ دعا کی جائے صلوۃ اور خطبہ کے ساتھ، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اور مستحب ہے بار بار دعائے استسقآء کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو دعا میں تضرع وزاری کرنے والے محبوب ہیں۔ واللہ اعلم۔

الفصل الاول:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طلب بارش کے لئے نماز پڑھنا

۱۴۹۷: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالنَّاسِ اِلَى الْمُصَلّٰى يَسْتَسْقِيْ فَصَلّٰى بِهِمْ رَكْعَتَيْنِ جَهَرَفِيْهِمَا بِالْقِرَاءَةِ وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ يَدْعُوْ وَرَفَعَ يَدَيْهِ وَحَوَّلَ رِدَآءَهٗ حِيْنَ اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۲/۵۱٤۔ حدیث رقم ۱۰۲٤۔ ومسلم فی صحیحه ۲/٦۱۱ حدیث رقم (۱۔ ۸۹٤)۔ وأبوداؤد فی السنن ۱/٦۸۹ حدیث رقم ۱۱٦٦ والترمذی ۲/٤٤۲ حدیث رقم ٥٥٦۔ والنسائی ۳/۱٥۷ حدیث رقم ۱٥۰۹۔ والدارمی ۱/٤۳۲ حدیث رقم ۱٥۳۳۔ ومالك فی الموطأ ۱/۱۹۰ حدیث رقم ۱ من کتاب الاستسقاء۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو لے کر عیدگاہ کی طرف نکلے بارش طلب کرنے کے لئے پس ان لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائی اور دونوں رکعتوں میں بلند آواز سے قراءت فرمائی اور قبلہ رخ ہو کر دعا مانگی اور دعا میں اپنے ہاتھوں کو بلند کیا اور قبلہ رخ ہوتے ہوئے اپنی چادر کو پھیرا۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: (عن عبد اللّٰہ بن زید) اس حدیث کی سند میں عبداللہ بن زید سے مراد ''ابن عاصم بن زمان الأنصاری ہیں، عبداللہ بن زید بن عبدربہ الأنصاری الخزرجی مراد نہیں ہیں۔ جن کو خواب میں اذان سنائی دی تھی اور جب ہی سے شریعت میں اذان مشروع ہوئی۔ خلاصہ یہ کہ یہ دونوں خوش نصیب حضرات الگ الگ ہیں، ان میں سے اول یعنی ابن عاصم بن زمان وہ ہیں جو جنگ اُحد میں حاضر تھے مگر بدر میں حاضر نہ ہو سکے تھے لیکن حضرت وحشیؓ بن حرب کے ساتھ مسلیمۃ الکذاب لعن اللّٰہ علیہ کے قتل میں شریک تھے۔ اور ان میں سے دوسرے یعنی ابن عبدربہ وہ ہیں جو العقبہ میں شریک تھے، بدر میں شریک تھے اور اس کے بعد بھی غزوات میں شریک ہوتے رہے۔ ان دونوں حضرات کے احوال کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کیونکہ بعض بڑے بڑے محدثین کو اس میں وہم ہو چکا ہے۔ لیکن صحیح تحقیق وہی ہے جس کو ہم نے ذکر کر دیا۔

(قال: خرج رسول اللّٰہ ﷺ بالناس) یعنی لوگوں کے ساتھ۔

(الی المصلی) یعنی مدینہ میں مسجد کی طرف نکلے۔

(یستسقی) حال ہے یا پھر اس استئناف ہے اور تعلیل کے معنی میں ہے۔

(فصلی بھم رکعتین) ''علامہ مظہرؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ استسقاء میں صلوۃ کے بجائے صرف دعا کے قائل ہیں، اور امام شافعیؒ کے نزدیک استسقاء اور نماز عید ایک ہی طرح پڑھی جاتی ہیں جبکہ امام مالکؒ کے نزدیک اس کی دو رکعتیں ہیں باقی تمام نمازوں کی طرح۔

حافظ ابن حجرؒ سے منقول ہے آپ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک استسقاء بدعت ہے، حافظ صاحب کا یہ کہنا

بلکل غلط اور خطأ فاحش ہے، اگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس کو سنت نہیں سمجھتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اسے بدعت سمجھتے ہوں گے، کیونکہ اس کام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دفعہ کیا بھی اور بعض دفعہ چھوڑا بھی لہٰذا یہ بدعت کیسے ہوسکتی ہے۔ بہر حال امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ بدعت ہرگز نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود حافظ ابن حجر العسقلانی فرماتے ہیں:

''**من جهله وعدم اطلاعه وقلة معرفته بمرتبة المجتهدين سيتما الامام الأعظم والهمام الأقدم الذى قال الشافعي فى حقه الناس كلهم عيال على أبى حنيفة فى الفقه وكأنه لم تبلغه تلك الأحاديث مع كثرتها**''۔

(**جهر فيهما بالقرآءة**) علامہ ابن الملک فرماتے ہیں: سنت یہی ہے کہ استسقاء کی نماز بھی ایسے ہی جماعت کے ساتھ پڑھی جائے جیسا کہ عید کی نماز پڑھتے ہیں، امام ابو یوسفؒ کا بھی یہی قول ہے جبکہ امام محمدؒ کا قول ہدایہ میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اگر ایک مرتبہ پڑھا ہے تو ایک مرتبہ چھوڑا بھی تو ہے لہٰذا یہ سنت نہ ہوگی۔ (الہدایہ ۱/۸۸)

علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں: سنت وہ ہے ہوتی ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مواظبت اختیار کریں۔ اسی وجہ سے شیخ الاسلام فرماتے ہیں: **فيه دليل على الجواز عندنا**......'' یعنی اس میں دلیل ہے جواز پر ہمارے نزدیک یعنی جائز ہے اگر اس کو جماعت کے ساتھ پڑھا جائے، لیکن یہ سنت نہیں ہے۔ اور الکافی میں ہے جو کہ امام محمدؒ کی کتب کا مجموعہ ہے، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: استسقاء میں نماز نہیں لیکن صرف دعا ہے، ہم تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی پہنچا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اور دعا فرمائی، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی یہی پہنچا ہے کہ آپؓ منبر پر چڑھے اور دعا کے استسقاء کی، اور جن احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صلوۃ الاستسقاء پڑھنے کا ذکر ہے وہ ایک ہی حدیث ہے جو کہ شاذ ہے اور اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ ابن الہمام حدیث کے شاذ ہونے کی وجہ بتا رہے ہیں فرماتے ہیں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل ثابت ہوتا تو بہت مشہور ہوتا اور اس کو نقل کرنے والے کثیر ہوتے، دوسری وجہ یہ کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صرف منبر پر چڑھ کر دعا کی تو اس وقت ہزاروں صحابہ کا مجمع تھا اگر عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل خلاف سنت تھا تو لوگ خاموش کیوں رہے۔

پھر بعض نے کہا کہ افضل یہ ہے کہ رکعتِ اولیٰ میں سورۃ قٓ یا سبح پڑھے اور دوسری رکعت میں اقترب یا الغاشیۃ پڑھے، اور بعض نے کہا ہے کہ افضل یہ ہے کہ دوسری رکعت میں ''**انا ارسلنا نوحًا**'' (نوح) اس لئے کہ یہ حال کے زیادہ مناسب ہے، اور ایک ضعیف حدیث میں ہے کہ پہلی رکعت میں سورۃ الأعلیٰ پڑھے اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیہ۔

(**واستقبل القبلة**) یعنی نماز کے بعد۔

(**يدعو**) حال ہے۔

(**ورفع يديه**) یعنی دعا کیلئے۔

(**وحوّل رداءه حين استقبل القبلة**) علامہ مظہرؒ فرماتے ہیں: تحویل سے غرض ''تفاؤل'' ہے۔ تحویل حال سے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چادر پھیر کر یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یا اللہ جس طرح ہم نے چادر پھیری ہے تو ہمارے حال کو بھی ایسے پھیر دے یعنی عُسر کو یُسر سے بدل دے ~~بدحالی~~ کو خوش حالی سے بدل دے۔

تحویل کا طریقہ:

تحویل کا طریقہ یہ ہے کہ چادر کے نچلے حصے کو دائیں ہاتھ سے پکڑے بائیں جانب سے اور اسی طرح دائیں جانب سے چادر کے نچلے حصے کو بائیں ہاتھ سے پکڑے اور ہاتھوں کو پلٹ لے اپنی پشت کے پیچھے سے اس طرح کہ دائیں ہاتھ سے پکڑی ہوئی چادر کی جانب اس کے کندھے پر ہو جو دائیں جانب ہے، اور بائیں ہاتھ سے چادر کی جانب اس کندھے پر ہو جو بائیں جانب ہے، پس جب اس نے ایسا کر لیا تو تحقیق اس نے بدل لیا اپنے دائیں کو بائیں اور بائیں کو دائیں سے، اور اعلیٰ کو اُسفل سے اور اُسفل کو اعلیٰ سے۔

ابن الہمام فرماتے ہیں، اس حدیث کو صحاح ستہ میں نقل کیا گیا ہے مگر امام بخاریؒ نے اس میں اضافہ کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان دونوں میں قراءت جہراً کی لیکن یہ مسلم میں موجود نہیں ہے، اس کے علاوہ حاکم نے روایت کیا حضرت ابن عباسؓ سے اور اس کو صحیح کہا ہے اور اس حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دو رکعات نماز پڑھی اور پہلی میں سات تکبیرات کہیں اور سورۃ الاعلیٰ پڑھی اور دوسری رکعت میں سورۃ الغاشیۃ پڑھی اور دوسری رکعت ہی میں پانچ تکبیرات کہیں۔

لیکن یہ حدیث صحیح نہیں جیسا کہ سمجھا گیا ہے بلکہ یہ حدیث تو ضعیف معارض ہے، یعنی دو خرابیاں ہیں: ① تعارض ② ضعف' اور ضعف کی وجہ ''محمد بن عبدالعزیز بن عمر بن عبدالرحمٰن بن عوف ہیں، امام بخاری ان کے بارے میں ''منکر الحدیث'' کا قول کرتے ہیں، اور امام نسائی متروک کا۔ ابو حاتم ضعیف الحدیث کا، بہر حال یہ حدیث مستقیم نہیں ہے، اور تعارض اس روایت کے ساتھ ہے جس کو طبرانی نے الوسط میں حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے:

آنحضرت ﷺ نے دعائے استسقاء کی پھر خطبہ پڑھا نماز سے پہلے اور قبلہ کی طرف چہرہ کیا پھر تحویل رداء کی اور نیچے اترے پھر دو رکعات نماز پڑھی جس میں ایک تکبیر کے علاوہ کوئی اور تکبیر نہ تھی۔

اور اسی طرح حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صبح کی نماز کی طرح دو رکعات پر اضافہ نہ فرماتے تھے۔ پس ان روایات سے حافظ ابن حجر العسقلانی کا قول بھی باطل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ عید کی طرح ہے اور امام مالکؒ کے قول کا بھی رد ہو جاتا ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ باقی نمازوں کی طرح ہے۔

صلوٰۃ استسقاء میں ہاتھ اٹھا کر دُعا کرنا مستحب ہے

۱۴۹۸: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِيْ شَيْءٍ مِّنْ دُعَائِهِ اِلَّا فِي الْاِسْتِسْقَاءِ فَاِنَّهٗ يَرْفَعُ حَتّٰى يُرٰى بَيَاضُ اِبْطَيْهِ۔ (متفق علیه)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۵۱۷/۲ حدیث رقم ۱۰۳۱۔ ومسلم ۶۱۲/۲ حدیث رقم (۷۔ ۸۹۵)۔ وأبو داوٗد فی السنن ۶۹۲/۱ حدیث رقم ۱۱۷۰۔ والنسائی ۱۵۸/۳ حدیث رقم ۱۵۱۳۔ والدارمی ۴۳۳/۱ حدیث رقم ۱۵۳۵۔ وأحمد فی المسند ۲۳۶/۲۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی دعا میں اپنے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے

سوائے استسقاء کے پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھوں کو اس قدر بلند کرتے تھے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دیتی تھی۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: یدیه یعنی رفع کامل۔

(في شيء من دعائه) اس سے جنس دعا مراد ہے۔

(الا في الاستسقآء) یعنی دعاء الاستسقآء۔

(فانه يرفع) یعنی ہاتھ اٹھاتے تھے۔

(حتی یری) مجہول کے صیغہ کے ساتھ ہے۔

(بیاض ابطیه) علامہ القاضیؒ فرماتے ہیں: بغلوں کی سفیدی اسی صورت میں نظر آسکتی ہے جب ہاتھ سر سے اوپر بلند کئے جائیں اور بدن پر کپڑے مت ہوں اور ایسا صرف استسقاء ہی میں ہوسکتا ہے۔ ورنہ مطلقاً ہاتھ اٹھانے کا مستحب ہونا تو اکثر دعاؤں میں ثابت ہے۔

(متفق علیہ) قال میرک، اور اس کو ابوداؤد، النسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

استسقاء میں ہاتھ اُٹھانے کا ایک طریقہ

۱۴۹۹: وَعَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَسْقٰى فَاَشَارَ بِظَهْرِ كَفَّيْهِ اِلَى السَّمَاءِ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٦١٢/٢ حديث رقم ٨٩٦/٦۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقاء کے لئے دعا مانگی تو اپنے ہاتھوں کی پشت کے ساتھ آسمان کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ (مسلم)

تشریح: (وعنه) یعنی عن أنس رضی اللہ عنہ۔

(أن النبی ﷺ استسقی فاشار بظهر کفیه الی السمآء) محدثین کہتے ہیں کہ یہ تفاؤل ہے تقلب حال سے یعنی ہاتھوں کو پلٹنے سے اشارہ ہے اس طرف کی اللہ ہمارے حالات بھی بدل دے۔ یا پھر اشارہ ہے اس طرف کہ وہ یہ دعا کرنا چاہتے تھے! یا اللہ جس طرح میرے ہاتھ کی پشت آسمان کی طرف اور پیٹ زمین کی طرف ہے اس طرح تو بادلوں کا پیٹ زمین کی طرف فرما دے تاکہ بارش برسے اور قحط ختم ہو جائے۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ جو آدمی قحط یا پریشانی میں مبتلا ہو اور اللہ سے رفع بلاء کی امید رکھتا ہو تو وہ اپنے ہاتھ کی پشت آسمان کی طرف کرے اور جو آدمی اللہ سے نعمت کا طلب گار ہو تو وہ اپنے ہاتھ یعنی ہتھیلی کا پیٹ آسمان کی طرف کرے۔

اور امام احمد نے روایت کیا ہے کہ آنحضور ﷺ جب پناہ مانگتے تھے تو ہتھیلی کی پشت آسمان کی طرف کرتے اور جب کوئی اور دعا کرتے تو ہتھیلی کا بطن آسمان کی طرف فرماتے۔ (رواہ مسلم)۔

بارش کے وقت نفع بخش بارش کی دعا مانگنا مسنون ہے

۱۵۰۰: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا رَاَى الْمَطَرَ قَالَ اَللّٰهُمَّ صَيِّبًا نَافِعًا۔ (رواه البخاری)

أخرجه البخاری فی صحیحه ۵۱۸/۲۔ حدیث رقم ۱۰۳۲۔ والنسائی ۱٦٤/۳ حدیث رقم ۱۵۲۳۔ وابن ماجه ۱۲۸۰/۲ حدیث رقم ۳۸۹۰۔ و أحمد فی المسند ٤١/٦۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب بارش دیکھتے تو یہ دعا فرماتے اے اللہ نفع دینے والی بارش کو ہم پر خوب برسا۔ (بخاری)

تشریح: صیبًا: باء کی تشدید کے ساتھ، اصل میں صیوب تھا، واؤ کو یاء سے بدلا اور ادغام کر دیا جیسا کہ سید ہے۔ صیبًا بمعنی مطر کے ہے۔ امام بخاریؒ نے اس کو حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے، اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جو ''الکشاف'' میں ہے۔ ''الصیب'' اس بارش کو کہتے ہیں جو خوب سیراب کرنے والی ہو۔ اور خوب بہنے والی ہو۔ اور اس میں ترکیب کی جہت سے مبالغہ بھی ہے۔ اور اس لفظ یعنی صیبًا کا نکرہ ہونا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ مطر کی قسموں میں سے ایک قسم ہے۔

امام ابن ماجہ نے ''سیبًا'' روایت کیا ہے سین کے فتحہ کے ساتھ بمعنی عطاء اور بخشش۔

(نافعًا) یعنی یہ بارش نقصان والی نہ ہو، جیسا کہ نوح علیہ السلام کا طوفان، یہ ابن الملک کا قول ہے۔

علامہ ابن حبانؒ نے اس دعا میں لفظ ''ھنیئًا'' روایت کیا ہے۔

علامہ النوویؒ فرماتے ہیں اگر آپ احادیث میں آنے والے الفاظ کو جمع کرنا چاہتے ہیں تو یوں کہیے:

''اللهم صيبًا، سيبًا نافعًا، هنيئًا''۔

بارش کا پانی متبرک وصاف شفاف ہے

۱۵۰۱: وَعَنْ اَنَسٍ قَالَ اَصَابَنَا وَنَحْنُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَطَرٌ قَالَ فَحَسَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَوْبَهٗ حَتّٰى اَصَابَهٗ مِنَ الْمَطَرِ فَقُلْنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ لِمَ صَنَعْتَ هٰذَا قَالَ لِاَنَّهٗ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِرَبِّهٖ۔ (رواه مسلم)

أخرجه مسلم فی صحیحه ٦١٥/٢ حدیث رقم (١٣۔ ٨٩٨)۔ وأبوداوٗد فی السنن ٣٣٠/٥ حدیث رقم ٥١٠٠۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے کسی موقع پر تو بارش شروع ہوگئی راوی فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے سر سے کپڑے کو ہٹا لیا یہاں تک کہ آپ ﷺ کے سر مبارک پر بارش کا پانی برسنے لگا، ہم نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ آپ نے یہ کام کیوں کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا اس لئے کیا ہے کہ یہ پانی ابھی

ابھی اپنے رب کے پاس سے آیا ہے۔

تشریح: (وعن أنس قال أصابنا) یعنی ہم پر نازل ہوئی یا ہمیں پہنچی۔

(ونحن مع رسول اللّٰہ ﷺ) فاعل یا مفعول سے حال ہے۔

(مطر قال) قال کے فاعل حضرت انسؓ ہیں۔

(فحسر) بمعنی کھولنا اور ہٹانا۔

(رسول اللّٰہ ﷺ ثوبه) یعنی اپنے بدن مبارک سے کپڑا اہٹایا۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: آپ ﷺ نے سر سے کپڑا اہٹایا ہوگا یہی بات اظہر ہے علامہ طیبیؒ کے نزدیک۔ لیکن ''حاکم'' کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی پشت مبارک سے کپڑا اٹھایا تھا۔

(حتی أصابه من المطر) امام شافعیؒ ایک ضعیف سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب بارش کی دعا مانگتے تو فرماتے:

''اقربوا بنا الی هذا الذی جعله طهرًا فنتطهر منه، ونحمد اللّٰه علیه''۔

(فقلنا یا رسول اللّٰه لم صنعت هذا) یعنی اس میں کیا حکمت ہے؟

(قال لأنه) یعنی نئی بارش۔

(حدیث عهد بربه) یعنی اسکا ابھی ابھی نازل ہونا میرا رب کے ابھی ابھی کے حکم سے ہوا ہے۔ جیسا کہ نومولود بچہ ہوتا ہے نیز اسی وجہ سے ''لکل جدیدٍ لذةٌ'' یا ''کل' جدید لذیذ'' مشہور ہے۔

اور احادیث میں ہے کہ جب کوئی نیا پھل آتا تو آپ ﷺ اسے اپنے ہونٹوں پر لگاتے اور آنکھوں پر بھی لگاتے، وجہ اس کی یہی تھی کہ اس کی پیدائش یا تخلیق کا زمانہ قریب تھا، یعنی وہ ابھی ابھی اللہ کی طرف سے آیا ہوا پھل ہوتا تھا، اس وجہ سے اسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کچھ نہ کچھ قرب کی نسبت حاصل تھی اور اسی طرح کی علت بارش میں بھی پائی جاتی ہے اس لئے آپ ﷺ اس پانی کو اپنے بدن مبارک سے لگانا چاہتے تھے۔ نیز یہ بارش بُرکت ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وأنزلنا من السمآء مآءً مباركًا﴾ [ق۔۹]۔

امام شافعیؒ کی روایت کردہ خبر کے مطابق نزولِ مطر کے وقت دعا کرنا چاہیے کیونکہ یہ قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے۔

علماء کہتے ہیں کہ یوں کہنا: ''مطرنا بفضل اللّٰه ورحمته'' جائز ہے۔ (رواہ مسلم)

الفصل الثانی:

استسقاء میں تحویلِ رداء کا ذکر

۱۵۰۲: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْمُصَلّٰى فَاسْتَسْقٰى وَحَوَّلَ رِدَاءَهُ حِيْنَ اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ فَجَعَلَ عِطَافَهُ الْاَيْمَنَ عَلٰى عَاتِقِهِ الْاَيْسَرِ وَجَعَلَ عِطَافَهُ الْاَيْسَرَ

عَلٰی عَاتِقِهِ الْاَيْمَنِ ثُمَّ دَعَا اللّٰهَ ۔ (روه ابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ١/ ٦٨٨ حديث رقم ١١٦٣۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن زیدؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عیدگاہ کی طرف نکلے وہاں بارش کیلئے دعا مانگی اور اپنی چادر کو پلٹا جب قبلہ رو کھڑے ہوئے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر کا دایاں کنارہ اپنے بائیں کندھے پر کیا اور چادر کا بایاں کنارہ اپنے دائیں کندھے پر کیا اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا مانگی۔ (ابوداوٗد)

تشریح: (عن عبداللّٰه بن زيد قال:...... فجعل) جعل بمعنی ڈالنا۔

(عطافه) چادر کی جانب یا چادر کا حصہ

وجعل عطافه الأيسر على عاتقه الأيمن) النہایۃ میں ہے "العطاف" رداء کو کہتے ہیں۔ اور اس حدیث میں "عطاف" کی اضافت رداء کی طرف کی اور مراد اس سے چادر کی ایک طرف یا چادر کا ایک حصہ ہے، اور اس میں ھاء رداء کی ضمیر ہے۔

علامہ تورپشتیؒ فرماتے ہیں: رداء کو عطاف اس لئے کہہ دیا گیا کیونکہ یہ عطفین یعنی پہلوؤں پر ڈالی جاتی ہے۔

(ثم دعا اللّٰه) اس حدیث میں نماز کا ذکر موجود نہیں۔ (رواہ ابوداوٗد)

سیاہ چادر بھی پہننا مسنون ہے

۱۵۰۳: وَعَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ اسْتَسْقٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَمِيْصَةٌ لَّهٗ سَوْدَآءُ فَاَرَادَ اَنْ يَّاْخُذَ اَسْفَلَهَا فَيَجْعَلَهٗ اَعْلَاهَا فَلَمَّا ثَقُلَتْ قَلَّبَهَا عَلٰى عَاتِقَيْهِ۔ (رواه احمد و ابو داود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ١/ ١٨٨ حديث رقم ١١٦٤۔ والنسائی ٣/ ١٥٦ حديث رقم ١٥٠٧۔ وأحمد فی المسند ٤/ ٤٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن زیدؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش طلب کرنے کیلئے دعا مانگی تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سیاہ چادر تھی۔ آپ نے ارادہ کیا کہ اس کے نچلے حصہ کو پکڑیں اور اس کو اوپر کر دیں پس جب اس میں آپ کو دقت پیش آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے کندھے پر ہی پلٹ دیا۔ (احمد، ابوداوٗد)

تشریح: (وعنه) یعنی عبداللہ بن زید۔

(قال: استسقى رسول اللّٰهﷺ وعليه خميصة) یعنی کالے رنگ کی چادر تھی۔ اور مربع شکل کی تھی، دونوں جانب دو نشان تھے اور اون وغیرہ سے بنی ہوئی تھی۔ النہایہ میں ہے کہ وہ ریشم اور اون سے بنا ہوا کپڑا تھا یا نشان زدہ اون کا کپڑا تھا۔

(له) ہٗ ضمیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکت کی طرف راجع ہے۔

(سوداء) خمیصۃ کی صفت ہے۔ اور اس میں تجرید ہے۔

(فأراد أن يأخذ أسفلها فيجعله أعلاها فلما ثقلت) یعنی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مشکل ہوئی۔

(قلبها) تو اس کو پلٹ دیا۔
قلبها لام کی تشدید کے ساتھ ہے بعض نے تخفیف کا بھی قول کیا ہے۔
(علی عاتقیه) یعنی چادر کے نیچے والے حصے کو اوپر کرلیا، کندھوں کے اوپر اسی طرح ابن الملک کہتے ہیں کہ جو حصہ دائیں کندھے پر تھا اسے بائیں کندھے پر کرلیا۔
امام احمد کی اس روایت میں یہ اضافہ بھی ہے: وحوّل الناس معه، یعنی لوگوں نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تحویل رداء کیا۔
امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تحویل امام کیلئے مشروع ہے مقتدیوں کیلئے مشروع نہیں ہے۔ (رواہ احمد وابوداؤد)۔

استسقاء کیلئے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگنا مسنون ہے

۱۵۰۴: وَعَنْ عُمَيْرٍ مَوْلٰى اٰبِي اللَّحْمِ اَنَّهٗ رَاَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَسْقِيْ عِنْدَ اَحْجَارِ الزَّيْتِ قَرِيْبًا مِّنَ الزَّوْرَاءِ قَائِمًا يَدْعُوْ لِيَسْتَسْقِيْ رَافِعًا يَدَيْهِ قِبَلَ وَجْهِهٖ لَايُجَاوِزُ بِهِمَا رَاْسَهٗ۔
(وروى الترمذى والنسائى نحوه رواه ابوداود)

أخرجه أبوداؤد فى السنن ١/ ٦٩٠ حديث رقم ١١٦٨۔ والترمذى ٢/ ٤٤٣ حديث رقم ٥٥٧ والنسائى ٣/ ١٥٨ حديث رقم ١٥١٤۔ وأحمد فى المسند ٥/ ٢٢٣۔

ترجمہ: حضرت عمیرؓ جو کہ ابی اللحم کے آزاد کردہ غلام ہیں، فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو احجار الزیت کے پاس جو کہ مقام زوراء کے قریب ہے بارش کی دعا کرتے ہوئے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر بارش کیلئے دعا مانگ رہے تھے اس حال میں کہ آپؐ نے اپنے ہاتھ اپنے چہرے کے برابر اٹھائے ہوئے تھے جو کہ سر سے متجاوز نہیں تھے۔ (ابوداؤد)

راویٔ حدیث:

ابی اللحم خلف بن عبدالملک۔ یہ خلف ابن عبدالملک غفاری وحجازی ہیں۔ "آبی اللحم" کے نام سے مشہور ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ان کا نام "عبداللہ" ہے۔ اور ایک قول میں "حویرث" ہیں (آبی اللحم کے معنی ہیں گوشت سے انکار کرنے والا) اور یہ "آبی اللحم" کے لقب سے اس لئے مشہور ہوئے کہ گوشت مطلقاً نہیں کھاتے تھے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وہ اس جانور کے گوشت کو نہ کھاتے تھے جو بتوں پر ذبح کیا گیا ہو۔ (یعنی اسلام لانے سے پہلے بھی اس سے پرہیز کرتے تھے) اور ایک قول یہ ہے کہ ان کے غلام عمیر نے ایک مرتبہ ان کی اجازت کے بغیر کسی مسکین کو گوشت دیا تو انہوں نے اس کی پٹائی کی۔ اور بغیر اجازت کے گوشت دینے سے منع کر دیا تھا۔ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ جلد چہارم حدیث: ۱۹۵۳ میں آئے گا۔ یوم حنین میں شہید ہوئے۔ ان کے آزاد کردہ عمیر ان سے روایت کرتے ہیں۔ وہ بھی صحابی ہیں کہا گیا ہے کہ ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے آبی میں ہمزہ پر زبر باء موحدہ مکسور اور یاء ساکن ہے۔ "آبی یابیٰ" سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔
عمیر مولیٰ ابی اللحم۔ یہ "عمیر آبی اللحم غفاری حجازی" کے آزاد کردہ ہیں۔ دونوں ہی طبقہ صحابہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اپنے آقا "آبی اللحم" کے ہمراہ فتح خیبر میں شریک ہوئے ہیں۔ ان سے ایک گروہ روایت کرتا ہے انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشادات کو سنا اور یاد بھی رکھا ہے۔

''عمیر'' صیغہ تصغیر کے ساتھ ہے ''آبی اللحم'' میں ہمزہ کا زبر اس کے بعد الف ساکن اور بائے موحدہ مکسورہ ہے۔

تشریح: (وعن عمیر) تصغیر کے ساتھ۔

بعض نے کہا کہ یہ وہ صحابی ہیں جن کا ذکر صرف اسی حدیث میں ملتا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کو شرف صحبت حاصل ہے۔

(أنه رأى النبي ﷺ يستسقي عندأ حجار الزّيت) أحجار الزيت مدینہ منورہ کے راستے میں ایک جگہ کا نام ہے، اس کو أحجار الزّیت اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس کے پتھر سیاہ رنگ کے ہیں اور جب وہ پتھر بکھرے ہوئے ہوتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا کہ شاید زیتون بکھرے پڑے ہوں۔ اس کو بعض اوقات ''حرّہ'' بھی کہتے ہیں کیونکہ حرّہ عربی زبان میں سیاہ پتھروں والی زمین کو کہا جاتا ہے۔

(قريبًا من الزورا) زاء کے فتحہ کے ساتھ ہے، ایک جگہ کا نام ہے۔

(قائمًا يدعو يستسقي) دونوں حال ہیں یعنی اس حال میں دعا مانگ رہے تھے اور بارش کی دعا مانگ رہے تھے۔

(رافعًا يديه قبل وجهه) قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی طرف، یعنی اپنے چہرے کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کبھی آپ ﷺ اس طرح دعا مانگتے تھے جس طرح اس حدیث میں ہے اور بعض دفعہ اس طرح مانگتے تھے جیسا کہ ماقبل احادیث میں ہے۔

(لا يجاوز بهما رأسه) یعنی جب ہاتھ اٹھاتے تو سر سے بلند نہ کرتے۔ یہ منافی نہیں اس کے جس کو حضرت انس رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں، کہ حضور ﷺ دعا میں ہاتھ اٹھانے میں مبالغہ کرتے تھے کیونکہ اس حدیث میں احتمال ہے کہ شاید راوی کثرتِ احوال بتانا چاہتے ہوں، یا اس کا برعکس بتانا چاہتے ہوں۔

(رواه ابو داؤد وروى الترمذي والنسائي نحوه) یعنی اس کے معنی کو روایت کرتے ہیں۔

دُعا کے اندر خشوع و خضوع اور عاجزی کا ہونا ضروری ہے

۱۵۰۵: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْنِيْ فِي الْإِسْتِسْقَاءِ مُتَبَذِّلًا مُتَوَاضِعًا مُتَخَشِّعًا مُتَضَرِّعًا۔ (رواه الترمذي وابوداود والنسائي وابن ماجة)

أخرجه أبوداؤد في السنن ١/٦٨٨ حديث رقم ١١٦٥۔ والترمذي ٢/٤٤٥ حديث رقم ٥٥٨۔ و النسائي ٣/١٥٦ حديث رقم ١٥٠٨۔ وابن ماجه ١/٤٠٣ حديث رقم ١٢٦٦۔ وأحمد في المسند ١/٣٥٥۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ بارش طلب کرنے کیلئے باہر نکلے اس حال میں کہ آپ ﷺ زیب و زینت ترک کیے ہوئے تھے اور انتہائی تواضع کی حالت میں تھے اور انتہائی عاجزی اور انکساری کی حالت میں تھے اور انتہائی تضرع اور عجز کی حالت میں تھے۔ (ترمذی)

تشریح: (وعن ابن عباس رضی اللہ عنہ ......الاستسقاء) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یہاں سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ دعا

کے استسقاء کیلئے باہر تشریف لاتے تھے، یہی راوی کے کلام سے مفہوم ہو رہا ہے۔

(متبذّلًا) تآء، باء سے پہلے ہے، متبذلا، بذلۃ ہے بمعنی عام روزمرہ کے استعمال کے کپڑے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام کپڑے پہنے ہوئے تھے، النہایہ میں ہے مراد یہاں سے "ترك التزين" ہے تواضع کے طور پر۔ اور کپڑوں کا معمولی ہونا انسان میں عاجزی، انکساری اور حاجت مندی کو ظاہر کرتا ہے۔

(متواضعًا) یہاں سے ظاہری تواضع مراد ہے ورنہ قلبی تواضع تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہر وقت موجود ہوتی تھی۔

(متخشعًا) یہاں سے باطنی خشوع مراد ہے۔

(متضرعًا) زبان سے تضرع مراد ہے۔

(رواہ الترمذی) اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے علامہ میرک نے یہی نقل کیا ہے۔ (وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ)

بارش کیلئے خاص دعاء

وَعَنْ عَمْرِوبْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَااسْتَسْقٰى قَالَ اَللّٰهُمَّ اسْقِ عِبَادَكَ وَبَهِيْمَتَكَ وَانْشُرْ رَحْمَتَكَ وَاَحْيِ بَلَدَكَ الْمَيِّتَ۔ (رواه مالك وابوداود)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۱/۶۹۵ حديث رقم ۱۱۷۶۔ ومالك فی الموطأ ۱/۱۹۰ حديث رقم ۲ من كتاب الاستسقاء۔

ترجمہ: حضرت عمرو ابن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن عاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بارش مانگتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے: اَللّٰهُمَّ اسْقِ عِبَادَكَ وَبَهِيْمَتَكَ وَانْشُرْ رَحْمَتَكَ وَاَحْيِ بَلَدَكَ الْمَيِّتَ ۔ اے اللہ اپنے بندوں کو اور اپنے جانوروں کو پانی سے سیراب فرما دے اور اپنی رحمت کو پھیلا دے اور اپنی خشک زمین کو اور بنجر زمین کو آباد فرما دے۔ (ابوداوٗد)

تشریح: (وعن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جدّه) یعنی عن عبداللہ بن عمرو بن العاص اور اس سند کی تحقیق ماقبل گزر چکی ہے۔

(قال: كان النبی ﷺ اذا استسقى قال اللهم اسق) ہمزہ وصلی اور قطعی دونوں ہو سکتے ہیں۔

(عبادك) لفظ عباد، مردوں عورتوں، غلام اور باندیوں سب کو شامل ہے۔

(وبهيمتك) چوپاؤں سے تمام چوپائے اور حشرات الارض مراد ہیں۔

(وانشر) شین کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی پھیلا دے۔

(رحمتك واحی بلدك الميت) یعنی فصلوں کے خشک ہونے کے بعد انہیں دوبارہ سرسبز کر دے گویا کہ انہیں دوبارہ زندگی مل گئی ہو۔ یعنی ان کو بارش کے ذریعے تر کر دے۔ (رواہ مالک وابوداوٗد)۔

طلبِ بارش کی ایک اور دُعا

۱۵۰۷: وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوَاكِئُ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اسْقِنَا غَيْثًا مُّغِيْثًا مَّرِيْئًا مُرِيْعًا نَّافِعًا غَيْرَ ضَارٍّ عَاجِلًا غَيْرَ اٰجِلٍ قَالَ فَاَطْبَقَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ۔ (رواہ ابوداؤد)

سنن ابی داوٗد، کتاب الصلاۃ، باب رفع الیدین فی الاستسقاء، ح ۹۸۸

أخرجه أبوداؤد فی السنن ۱/۶۹۱ حدیث رقم ۱۱۶۹ وابن ماجه ۱/۴۰۴ حدیث رقم ۱۲۷۰ وأحمد فی المسند ۴/۲۳۵۔

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں کو اٹھائے ہوئے اور پھیلائے ہوئے طلب بارش کیلئے یہ دعا فرما رہے تھے: اَللّٰهُمَّ اسْقِنَا غَيْثًا مُّغِيْثًا مَّرِيْئًا مُرِيْعًا نَّافِعًا غَيْرَ ضَارٍّ عَاجِلًا غَيْرَ اٰجِلٍ۔ اے اللہ تو ہمیں ایسی بارش سے سیراب فرما جو کہ مددگار ثابت ہو اور جس کا انجام اچھا ہو (یعنی خوشگوار ہو) جو سرسبز بنانے والی ہو، نفع بخش ہو نقصان دینے والی نہ ہو اور جلد آنے والی ہو دیر سے آنے والی نہ ہو تو راوی (یعنی حضرت جابرؓ) فرماتے ہیں کہ آسمان ان پر ابر آلود ہو گیا۔ (رواہ ابوداؤد)

تشریح: یواکی۔ المواکاۃ والتوکؤ ٹیک اور سہارا لگانے کو کہتے ہیں، النہایہ میں "التوکؤ علی العصا" ہے۔

(فقال: اللهم اسقنا) ہمزہ وصلی اور قطعی دونوں کے ساتھ ہے۔

(غیثا) یعنی بارش۔

(مغیثا) میم کے ضمہ کے ساتھ بمعنی "الاعانة" ایک روایت میں "هنیئا" بھی ہے۔

(مریئا) میم کے فتحہ کے ساتھ، اور مد کے ساتھ، اس میں ادغام بھی جائز ہے، بمعنی "هنیئا" یعنی ایسی بارش جو "محمود العاقبة" ہو یعنی جس کا انجام اچھا ہو، اور اس میں غرق اور ھدم وغیرہ نہ ہو۔

مسلم شریف کی روایت میں "اللهم أغثنا" بھی ہے۔ علامہ القاضی فرماتے ہیں الاغاثة بمعنی المعونة ہے۔

(مریعًا) میم کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے، بمعنی کثیرًا۔ شرح السنۃ میں ہے مریعًا کہتے ہیں ایسی بارش کو جو سرسبزی کا پیغام لائے۔ اور ایک روایت کے مطابق "مریعًا" کے بجائے "مربعًا" باء کے ساتھ اور میم کے ضمہ کے ساتھ، بمعنی بہار لانے والی بارش، یعنی جیسے موسم بہار میں ہر چیز سرسبز ہو جاتی ہے تو بارش بھی ایسی ہو جو سرسبز کر دینے والی ہو۔ اور ایک روایت میں "مرتعًا" میم کے فتحہ اور تاء کے ساتھ بمعنی وہ چیز جس سے سبزہ اگے، اسی سے "یرتع ویلعب" ہے، علامہ طیبیؒ نے یہی ذکر کیا ہے۔ جبکہ بعض نے مریعًا کے معنی خصیبًا کئے ہیں۔

(نافعًا غیر ضار) "غیر ضار" تاکید ہے۔

(عاجلاً غیر آجلٍ) غیر آجل مبالغتًا ہے۔

(قال) اس کے فاعل حضرت جابرؓ ہیں۔

(فاطبقت) اس کا فاعل ''السماء'' ہے اس لئے مؤنث کا صیغہ استعمال کیا۔
(علیهم السماء) اطبق کا لفظ جب بولا جاتا ہے جب کوئی چیز کسی کے سر کو ڈھانپ لے، یعنی راوی کنایہ چاہتے ہیں کہ بادل اتنے گہرے اور زیادہ تھے کہ ہمیں آسمان نظر نہیں آ رہا تھا۔
نیز اس حدیث میں اطباق کی نسبت آسمان کی طرف مبالغتًا کی ہے وگرنہ آسمان سے تو بارش ہرگز نہیں ہوتی بلکہ بارش تو بادلوں سے ہوتی ہے۔

الفصل الثّالث:

آنحضرت ﷺ کا صلوٰۃ استسقاء کیلئے مناسب وقت اور موقع کا انتظار فرمانا

۱۵۰۸: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ شَكَى النَّاسُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُحُوْطَ الْمَطَرِ فَاَمَرَ بِمِنْبَرٍ فَوُضِعَ لَهٗ فِى الْمُصَلّٰى وَوَعَدَالنَّاسَ يَوْمًا يَخْرُجُوْنَ فِيْهِ قَالَتْ عَائِشَةُ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ بَدَا حَاجِبُ الشَّمْسِ فَقَعَدَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَكَبَّرَ وَحَمِدَ اللّٰهَ ثُمَّ قَالَ اِنَّكُمْ شَكَوْتُمْ جَدْبَ دِيَارِكُمْ وَاسْتِئْخَارَ الْمَطَرِ عَنْ اِبَّانَ زَمَانِهٖ عَنْكُمْ وَقَدْاَمَرَكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَدْعُوْهُ وَوَعَدَكُمْ اَنْ يَّسْتَجِيْبَ لَكُمْ ثُمَّ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَفْعَلُ مَايُرِيْدُ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ الْغَنِيُّ وَنَحْنُ فُقَرَاءُ اَنْزِلْ عَلَيْنَا الْغَيْثَ وَاجْعَلْ مَا اَنْزَلْتَ لَنَا قُوْتًا وَّبَلَاغًا اِلٰى حِيْنٍ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ فَلَمْ يَتْرُكِ الرَّفْعَ حَتّٰى بَدَاءُ بَيَاضُ اِبْطَيْهِ ثُمَّ حَوَّلَ اِلَى النَّاسِ ظَهْرَهٗ وَقَلَّبَ اَوْحَوَّلَ رِدَاءَهٗ وَهُوَ رَافِعٌ يَدَيْهِ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ وَنَزَلَ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ فَاَنْشَاَ اللّٰهُ سَحَابَةً فَرَعَدَتْ وَبَرَقَتْ ثُمَّ اَمْطَرَتْ بِاِذْنِ اللّٰهِ فَلَمْ يَاْتِ مَسْجِدَهٗ حَتّٰى سَالَتِ السُّيُوْلُ فَلَمَّا رَاٰى سُرْعَتَهُمْ اِلَى الْكِنِّ ضَحِكَ حَتّٰى بَدَتْ نَوَاجِذُهٗ فَقَالَ اَشْهَدُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنِّيْ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ۔ (رواه ابوداود)

أخرجه أبوداود فى السنن ۱/۶۹۲ حديث رقم ۱۱۷۳۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ لوگوں نے محبوب خدا ﷺ کے سامنے بارش کے نہ ہونے کی شکایت کی، تو آپ نے منبر رکھنے کا حکم دیا، جب آپ ﷺ کیلئے عیدگاہ میں منبر رکھ دیا گیا اور آپ ﷺ نے لوگوں کے ساتھ ایک دن مقرر کر لیا کہ وہ اس دن عیدگاہ میں چلے جائیں تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس دن دعا کیلئے عیدگاہ کی طرف نکلے جبکہ سورج کا کنارہ ظاہر ہو گیا، پس آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور تکبیر کہی اور اللہ تعالیٰ کیلئے تعریفی کلمات کہے اور پھر فرمایا کہ بے شک تم نے اپنے شہروں کے خشک ہونے کی اور بارش کے اپنے وقت پر نہ برسنے کی شکایت

کی تھی تو تحقیق اللہ نے حکم دیا ہے کہ تم اس سے مانگو اور تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے وہ تمہاری دعا کو قبول فرمائے گا۔ پھر فرمایا الحمدللہ رب العٰلمین...... تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جو جہانوں کا پالنے والا ہے' مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے' قیامت کے دن کا مالک ہے نہیں کوئی معبود مگر اللہ وہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ اے اللہ تو ہمارا معبود ہے، نہیں ہے کوئی معبود تیرے سوا، تو بے پرواہ ہے اور ہم محتاج ہیں، ہم پر بارش برسا، اور اس بارش کو جو تو اتارے ہمارے لئے قوت اور مقاصد تک پہنچنے کا ذریعہ اور طویل مدت کیلئے سبب بنا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور نہ چھوڑا اٹھانے کو یعنی اتنے اٹھائے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی پھر لوگوں کی طرف اپنی پشت مبارک کو پھیرا اور اپنی چادر اُلٹی کی یا اپنی چادر پھیری اس حال میں کہ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر منبر سے نیچے تشریف لائے اور دو رکعات نماز پڑھائیں، پس اسی وقت اللہ تعالیٰ نے بادل ظاہر کر دیا۔ پس وہ گرجنے اور چمکنے لگا پھر اللہ کے حکم سے بارش اترنا شروع ہوگئی یہاں تک آپ ﷺ اپنی مسجد تک نہیں پہنچے تھے کہ پرنالے بہنے لگے، پس جب آپ ﷺ نے دیکھا لوگوں کو اوٹ تلاش کرنے میں جلدی کرتے ہوئے تو ہنس پڑے یہاں تک آپ کی کچلیاں مبارک ظاہر ہونے لگیں اور فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ (ابوداؤد)

تشریح: (عن عائشة قالت شكا) الف کے ساتھ لکھا گیا ہے لیکن بعض نے یآء کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔

(الناس الى رسول اللهﷺ قحوط المطر) قاف کے ضمہ کے ساتھ بمعنی کسی چیز کا نہ ہونا۔

(فأمر بغنبر فوضع له في المصلى) علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں: اس میں منبر کے باہر نکالنے کا حکم دیا تھا۔

(ووعد الناس يومًا يخرجون فيه) فیہ سے في ذلك اليوم یعنی ''اس دن'' مراد ہے۔

(قالت عائشة: فخرج رسول اللهﷺ حين بدا) ''بدا'' الف کے ساتھ ہے نہ کہ ہمزہ کے ساتھ بمعنی ظاہر ہونا۔

(حاجب الشمس) یعنی سورج ابھی ابھی طلوع ہوا تھا اور اس کی پہلی پہلی کرنیں زمین پر اور لوگوں پر پڑنے لگیں تھیں، اور دیکھنے میں مثلِ حاجب تھا۔

(فقعد على المنبر فكبر فحمد الله) امام مالک، امام شافعی اور امام احمد ایک روایت کے مطابق فرماتے ہیں کہ نماز کے بعد دو خطبے مسنون ہیں، مشہور قول یہی ہے۔ اور اس خطبے کی ابتداء استغفار سے کرے گا جیسے خطبۂ عید کی ابتداء تکبیر سے کی جاتی ہے۔ اور ایک دوسرے قول کے مطابق امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد کے نزدیک اس میں خطبہ نہیں ہے فرماتے ہیں اسی پر نص موجود ہے، اور یہ تو صرف دعاء اور استغفار ہے۔

علامہ ابن اہمامؒ فرماتے ہیں: ''أصحاب السنن الأربعة'' نے روایت کیا ہے اسحاق بن عبداللہ بن کنانہ سے، یہ فرماتے ہیں: کہ ولید بن عتبہ نے جو کہ امیر مدینہ تھے، مجھے حضرت ابن عباس کے پاس بھیجا، میں نے ان سے استسقآء کے بارے میں پوچھا تو آپؓ نے فرمایا:

''خرج رسول الله متبذ لا متواضعا متضرعا حتى أتى المصلى، فلم يخطب خطبتكم هذه......''

رسول اللہ ﷺ باہر نکلے تواضع کرتے ہوئے، عاجزی وانکساری کرتے ہوئے یہاں تک ایک میدان میں آگئے پھر

آپ ﷺ نے کوئی خطبہ نہیں دیا لیکن مستقبل عاجزی وانکساری سے دعا مانگتے رہے، اور دو رکعات نماز پڑھی جیسا کہ عید کی نماز پڑھی جاتی ہے، امام ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں: دو خطبے ہوں گے اور ان کے درمیان جلوس سے فصل ڈالا جائے گا۔

(ثم قال انکم شکوتم) یعنی شکایت کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف۔

(جدب دیارکم) جیم کے فتحہ اور دال کے سکون کے ساتھ بمعنی قحط۔

(واستئخار المطر) بارش میں تأخیر ہونا۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اس میں سین مبالغہ کیلئے ہے، کیونکہ جب کسی کام کو بہت دیر ہوجائے تو کہا جاتا ہے "استأخر الشيئ اذا تأخر تأخرا بعیدًا"۔

(عن ابان زمانه) ہمزہ کے کسرہ اور باء کی تشدید کے ساتھ بمعنی وقت اور اس میں خاص کی اضافت ہے عام کی طرف بمعنی "عن اوّل زمان المطر" اور النہایۃ میں ہے کہ "الابان" ہر شئی کے اول کو کہتے ہیں۔

(عنکم) متعلق ہے "استئخار" کے ساتھ۔

(وقد أمرکم اللّٰه) یعنی قرآن مجید میں حکم دیا۔

(أن تدعوه) کہ ہمیشہ تم اسے پکارو خصوصاً سختیوں کے وقت میں۔

(ووعدکم أن یستجیب لکم) کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ادعونی أستجب لکم﴾ [غافر۔ ٦٠] مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

اور یاد رکھو اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

(ثم قال: الحمد للّٰه رب العالمین) یعنی اس حال میں بھی اور تمام احوال میں۔

(الرحمٰن الرحیم) یعنی وہ تو اپنے بندوں پر چاہے وہ کافر ہوں یا مؤمن نعمتیں برسانے والا ہے۔

(مالك یوم الدین) الف کے ساتھ۔ مالک کہہ کر اشارہ ہے اس طرف کہ مجھے اس روز بھی تمام کوتاہیاں معاف کرنے کا اختیار ہوگا جس کو چاہوں معاف کروں جس کو چاہوں عذاب دوں۔

(لا اله الا اللّٰه) اللہ کی ذات اُلوھیۃ میں منفرد ہے۔

(یفعل ما یرید ویحکم ما یشآء لا رادّ لقضائه ولا معقب لحکمه) اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا اور اس پر کوئی چیز لازم نہیں ہے اور وہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرسکتا ہے اسے کوئی روکنے والا نہیں جیسا کہ ایک حدیث قدسی ہے:

"یا عبدی أرید وترید ولا یکون الا ما أرید فمن رضی فله الرضا ومن سخط فله السخط"

[البخاری۔ ۱/۳۰۵] و [مسلم۔ ۲/۶۱۲]

"اے میرے بندے! ایک تیری چاہت ہے اور ایک میری چاہت ہے، لیکن ہوتا وہی ہے جو میری چاہت ہے، پس اگر تو میری چاہت پر راضی رہا تو تجھے تیری چاہت ملے گی جس پر تو خوش ہوگا اور اگر تو میری چاہت پر راضی نہ رہا تو تجھے تیری چاہت

بھی نہ مل سکے گی کہ تو اس پر خوش ہو سکے"۔

پس اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ہر کام تمہاری مرضی کے مطابق ہو تو اس کا آسان حل یہ ہے کہ تم وہی چاہو جو اللہ کی مرضی ہے، اس طرح ہر کام تمہاری چاہت کے مطابق ہوتا جائے گا۔

جیسا کہ بعض صوفیا نے شعر کہا ہے:

أريد وصاله ويريد هجري ۔ فأترك ما أريد لما يريد

ترجمہ: میں اس کا وصال چاہتا ہوں مگر وہ میری جدائی چاہتا ہے تو پس میں اپنی چاہت کو اس کی چاہت پر قربان کرتا ہوں۔

علامہ بایزید بسطامیؒ نے ابو یزیدؒ سے پوچھا:

یا أبا یزید ما ترید؟ (اے ابو یزید آپ کیا چاہتے ہو؟)

ابو یزید نے فرمایا:

"**أرید أن لا أرید**"۔ (میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ بھی نہ چاہوں)۔

(**اللهم انت الله لا الٰه الا أنت**) أنت تاکید ہے۔ (**الغنی**) یعنی وہ مستغنی ہے ہر کسی سے۔

(**ونحن الفقراء**) یعنی ہم محتاج ہیں تیری ہی طرف۔

(**أنزل علینا الغیث**) ایک نسخہ میں الغیث کے بجائے غیثًا ہے۔

(**واجعل ما أنزلت لنا قوة**) یعنی ایسی قوت جو ہمارے لئے حیات کا سبب ہو۔

(**وبلاغًا الی حین**) حین سے مراد موت کا وقت ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: بلاغ اسے کہتے ہیں جو ہمیں مطلوب تک پہنچادے۔ تو ترجمہ یہ ہوگا کہ ایسی بارش عطا فرما جو ہمارے لئے قوت ہو اور موت تک کیلئے سامان ہو۔

(**ثم رفع یدیه فلم یترك الرفع**) یعنی ہاتھ اٹھائے رکھے۔

(**حتی بدا**) یعنی ظاہر ہونا۔

(**بیاض ابطیه**) یعنی ان دونوں کی جگہ۔

(**ثم حوّل الی الناس ظهره**) یعنی قبلہ کی طرف رخ کر لیا اس میں مخلوق سے کنارہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

(**وقلب**) ایک نسخہ میں تشدید کے ساتھ اور دوسرے نسخہ میں تخفیف کے ساتھ ہے۔ ابط کی سفیدی اس لئے ظاہر ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابطین میں بال نہ تھے۔

(**أو حوّل**) تشکیک راوی ہے۔

(**رداءه**) تفاؤلًا ایسا کیا جیسا کہ ماقبل بھی گذر چکا۔

(**وهو رافع یدیه**) یعنی جب رخ قبلے کی طرف کیا اس وقت یہ حالت تھی۔

(**ثم أقبل علی الناس**) یعنی لوگوں کی طرف کیا۔

(**ونزل**) اور منبر سے اترے۔

(فصلی رکعتین فأنشا اللّٰہ) بمعنی پیدا کرنا۔ وجود دینا۔

(سحابۃٌ فرعدت وبرقت) راء کے فتحہ کے ساتھ یعنی بادل ظاہر ہوئے اور ان میں بجلی اور کڑک بھی سنائی دینے لگی۔

النہایۃ میں ہے "برقت" راء کے کسرہ کے ساتھ ہو تو معنی "حیرت" کے ہوتے ہیں اور اگر فتحہ کے ساتھ ہو تو بجلی کی چمک کے ہوتے ہیں۔

(ثم أمطرت باذن اللّٰہ) اکثر علماء محققین کے نزدیک اس میں دونوں لغتیں ہیں یعنی "امطرت" اور "مطرت" یعنی الف کے ساتھ بھی اور بغیر الف کے بھی۔ جبکہ بعض اہل لغت کہتے ہیں لفظ "امرت" عذاب کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً ﴾ [الحجر۔ ۷۴]

لیکن مشہور اکثر محققین کا قول ہی ہے۔

(فلم یأت) یعنی حضور ﷺ اس جگہ سے نہ آئے جہاں پر استسقاء کی دعا کی تھی یعنی صحراء سے۔

(مسجدہ) یعنی اس صحراء سے ابھی مسجد تک بھی نہ پہنچے تھے۔

(حتی سالت السیول) یعنی ہر طرف سے۔

(فلما رأی سرعتھم) یعنی ان کے تیز چلنے کو دیکھا۔

(الی الکنّ) کاف کے کسرہ اور نون کی تشدید کے ساتھ۔ اور کنّ کہتے ہیں ان گھروں کو جہاں لوگ گرمی اور سردی میں ٹھکانہ پکڑتے ہیں۔ یعنی جب آنحضرت ﷺ نے دعا کی اور بارش تیزی کے ساتھ ہونے لگی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے اپنے گھروں کی طرف تیزی سے بھاگنے لگے۔

(ضحک حتی بدت نواجذہ) نواجذ آخری داڑھوں کو کہتے ہیں۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہ جواب شرط ہے اور آپ ﷺ کا یہ مسکرانا تعجباً تھا، آپ ﷺ کو تعجب ہوا اس پر کہ پہلے کیسے بے قرار ہو کر بارش کی دعا کروا رہے تھے اور اب بارش پڑی تو اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔ نیز اللہ کی قدرت عظیمہ پر خوشی ہو رہی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاں جو مقام حضور ﷺ کو دیا تھا اس پر خوش ہو رہے تھے۔

(فقال: أشھد أنّ اللّٰہ علی کل شیءٍ قدیر وأنی عبداللّٰہ ورسولہ۔ رواہ ابوداؤد)

حضور ﷺ سے اس موقع پر مختلف دعائیں منقول ہیں لیکن ایک دعا جو کہ مندرجہ ذیل ہے، بہت جامع ہے:

"اللھم اسقنا غیثا مغیثًا ھنیئًا مریئًا مریعًا غدقًا مجللاً سحًا عامًا طبقًا دائمًا" (اے اللہ! ہم پر ایسی بارش فرما، جس سے کھیت سرسبز ہو جائیں، اور ایسی بارش فرما جو لگاتار ہو، مسلسل ہو، خوب بہنے والی ہو، دریاؤں اور نہروں کو بھر دینے والی ہو، اس کا نفع عام ہو، سب کیلئے فائدہ مند ہو)۔ اللھم اسقنا الغیث ولا تجعلنا من القانطین (یا اللہ! ہمیں بارش سے سیراب فرما اور مایوس نہ فرما)۔

اللھم انبت لنا الزرع، وأدرّ لنا الضرع واسقنا من برکات السماء، وأنبت لنا من برکات

الأرض ،(اے اللہ! ہماری کھیتی کو سرسبز فرما اور ہمارے جانور کے تھنوں کو دودھ سے بھر دے، اور ہمیں آسمان کی برکات سے مستفید فرما اور زمین کی برکات کو ہمارے لئے ظاہر فرما)۔"اللھم انا نستغفرك انك كنت غفاراً فأرسل السمآء علينا مدراراً"۔(یا اللہ! ہم آپ سے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں بے شک آپ تو بہت زیادہ معاف کرنے والے ہیں، پس ہم پر آسمان سے لگا تار بارش نازل فرما)۔

اور جب بارش ہو جاتی تو صحابہ یوں کہتے: "اللھم صيباً نافعاً" اور یہ بھی کہتے مطرنا بفضل الله ورحمته۔

پھر اگر بارش زیادہ ہو جاتی اور نقصان کا خطرہ ہوتا تو یوں دعا فرماتے:

"اللھم حوالينا ولا علينا اللھم على الآكام والظراب وبطون الأودية ومنابت الشجر" (یا اللہ! ہمارے اردگرد تو بارش ہو مگر ہمارے اوپر بارش نہ ہو، اے اللہ! پہاڑوں پر، ٹیلوں پر، صحراؤں میں اور درختوں پر بارش فرما یعنی لوگوں پر اتنی بارش نہ فرما کہ ان کیلئے نقصان کا سبب بنے"۔

اور صحیحین کی روایت میں ہے کہ ایک شخص مسجد میں آئے اور حضور ﷺ کھڑے خطبہ دے رہے تھے، اس آنے والے نے عرض کیا یا رسول اللہ! هلكت الأموال...... " اے اللہ کے رسول! جانور مرنے لگے، نہریں خشک ہو گئیں آپ اللہ سے دعا فرما دیں، پس آپ ﷺ نے فرمایا:

"اللھم أغثنا اللھم أغثنا اللھم أغثنا" (اے اللہ بارش فرما، اے اللہ بارش فرما، اے اللہ بارش فرما)

حضرت انسؓ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! آسمان پر بادل کا نام ونشان نہ تھا مگر دیکھتے ہی دیکھتے پیچھے سے بادل آئے ڈھال اور چادر کی طرح اور ہمارے سروں پر آ کر چھا گئے اور برسنے لگے حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

"فلا والله ما رأينا الشمس سبعاً" (اللہ کی قسم! ہم نے پورے سات روز تک سورج نہیں دیکھا) پھر سات روز کے بعد وہی آدمی دوبارہ اگلے جمعہ مسجد میں آئے اور رسول اللہ ﷺ پچھلے جمعہ کی طرح کھڑے خطبہ دے رہے تھے، عرض کیا یا رسول اللہ جانور مرنے لگے آپ دعا فرما دیں کہ بارش رک جائے آج پورے سات دن بارش ہوتے ہوئے گذر گئے، پس رسول اللہ ﷺ نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا:

"اللھم حوالينا ولا علينا اللھم على الآكام والظراب وبطون الأودية ومنابت الشجر"

حضرت انسؓ فرماتے ہیں فوراً بارش رک گئی اور جب ہم باہر نکلے تو سورج کی روشنی میں چلتے ہوئے گھر گئے۔

کسی بزرگ کے وسیلہ سے دعا مانگنا

۱۵۰۹: وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ إِذَا قُحِطُوا اسْتَسْقٰى بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ إِنَّا كُنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا فَتَسْقِيْنَا وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِنَا قَالَ فَيُسْقَوْنَ۔

(رواه البخاری)

أخرجه البخاري في صحيحه ٢/٤٩٤ حديث رقم ١٠١٠۔

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ راوی ہیں کہ جب قحط سالی ہوتی تو امیر المؤمنین عمر بن الخطابؓ حضرت عباس بن عبد المطلبؓ کے وسیلہ سے بارش کیلئے دعا کرواتے تھے۔ چنانچہ فرماتے اے اللہ پہلے ہم تیرے نبی کے وسیلہ سے بارش کیلئے دعا کرواتے تھے، پس تو ہمیں سیراب کر دیتا تھا، اب ہم تیرے نبی کے چچا کے وسیلہ سے دعا کرتے ہیں تو ہمیں سیراب فرما دے۔ تو راوی فرماتے ہیں کہ وہ سیراب ہو جاتے تھے۔ (یعنی بارش شروع ہو جاتی تھی)۔

تشریح: قحطوا : مجہول کا صیغہ ہے۔

(استسقی بالعباس بن عبدالمطلب) یعنی استسقاء کیلئے سفارش کے طور پر پیش کیا دعا و استغفار کے بعد۔

(فقال اللهم انا كنا نتوسل اليك نبينا ﷺ) ہم حضور ﷺ کو وسیلہ بناتے تھے۔

(فتسقينا) حرف مضارع کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ۔

(وانا نتوسل اليك بعم نبينا فاسقنا) حضرت عباس کو وسیلہ بنانا دو وجہ سے تھا: ① یہ حضور ﷺ کے چچا تھے۔ ② اللہ کے ہاں مقبول تھے۔

(قال فيسقون) رواه البخاری۔

ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے استسقاء کیلئے حضرت یزید بن الأسود کو وسیلہ بنایا اور کہا:

''اللّٰهم انا نستسقي بخيرنا و أفضلنا''۔

یا اللہ ہم اپنے سے بہتر اور اپنے سے افضل یعنی یزیدؓ بن اسود کو وسیلہ بناتے ہیں پس حضرت یزیدؓ بن الاسود نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے، لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ ہاتھ اٹھائے دیکھتے ہی دیکھتے مغرب کی جانب سے بادل آئے اور خوب برسے حتی کہ لوگ سیراب ہو گئے۔

ساری مخلوق اللہ تعالیٰ سے استسقاء کی دعا کرتی ہے

۱۵۱۰: وَعَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ خَرَجَ نَبِيٌّ مِنَ الْاَنْبِيَآءِ بِالنَّاسِ يَسْتَسْقِيْ فَاِذَاهُوَ بِنَمْلَةٍ رَافِعَةٍ بَعْضَ قَوَائِمِهَا اِلَى السَّمَآءِ فَقَالَ ارْجِعُوْا فَقَدِ اسْتُجِيْبَ لَكُمْ مِّنْ اَجْلِ هٰذِهِ النَّمْلَةِ۔ (رواہ الدارقطنی)

أخرجه الدارقطني في السنن ٦٦/٢ حديث رقم ١ من كتاب الاستسقاء۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ انبیاء میں سے ایک نبی لوگوں کے ہمراہ استسقاء کیلئے نکلے، انہوں نے اچانک ایک چیونٹی کو دیکھا جو اپنے بعض پاؤں آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھی، تو یہ دیکھ کر اللہ کے نبی نے فرمایا واپس چلو۔ اس چیونٹی کی وجہ سے آپ کی دعا بھی قبول کر لی گئی۔ (دارقطنی)

تشریح: (یستسقی) حالیہ ہے۔

(استجیب) "فقد" دال کے کسرہ کے ساتھ ہوگا اگر ہمزہ کو گرا دیں، اور اگر نہ گرائیں تو "أستجیب" ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہے۔

(لکم) ماقبل فعل سے متعلق ہے۔

(من اجل هذه النملة) اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی قدرت کا اظہار کرنا مقصود ہے۔ اور بتانا مطلوب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک چیونٹی کی بھی قدر ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر بارش فرما دی۔ (رواہ الدارقطنی) یعنی سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔

بعض محدثین کی رائے ہے کہ وہ نبی جن کا ذکر حدیث بالا میں ہے حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں۔ اور یہ بھی روایت کیا گیا کہ چیونٹی نے اپنے بعض پاؤں آسمان کی طرف بلند کئے جس طرح دعا میں ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں اور کہا:

"اللهم انی خلق من خلقك لا غنی بنا عن رزقك فلا تهلكنا بذنوب بنی آدم"۔

اے اللہ! ہم بھی تیری مخلوق میں سے ایک مخلوق ہیں، ہم میں سے کوئی بھی تیرے رزق سے مستغنی نہیں ہے۔ پس اے اللہ ہمیں ابن آدم کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک نہ کر۔

بَابٌ (فِی الرِّیَاحِ وَالْمَطَرِ)

[یہاں مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں فقط باب کا لفظ لکھا ہوا ہے لیکن ہم نے بعد تحقیق کے مشکوٰۃ کے کچھ نایاب نسخوں میں یہ باب مندرجہ ذیل الفاظ میں دیکھا تو اس کا اضافہ کر دیا]

مشکوٰۃ کے اکثر نسخوں میں یہاں صرف لفظ باب لکھا ہوا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ مستقل اور الگ باب نہیں ہے بلکہ پہلے باب کے ملحقات میں سے ہے۔ اس لئے کہ اس باب میں ہواؤں کا ذکر ہے اور ہوائیں اکثر بارش کے آگے پیچھے ہی ہوتی ہیں اس لئے یہاں عنوان قائم نہیں کیا، اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مشکوٰۃ کے ایک صحیح نسخہ میں "بابٌ فی الریاح" کے الفاظ مذکور ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس باب میں ہواؤں کے متعلق احادیث نقل کی جائیں گی۔

اگر لفظ باب پر وقف کریں تو باء کو ساکن پڑھیں گے اور اگر مرفوع پڑھیں تو اس کو مبتداء محذوف کی خبر ماننا پڑے گا۔ ایک نسخہ میں باب فی الریاح کے بجائے باب الریاح ہے۔ بہر حال مطلب دونوں کا ایک ہی ہے۔

الفصل الاول:

ہوا مدد کا ذریعہ بھی ہے اور عذاب کا ذریعہ بھی

۱۵۱۱: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نُصِرْتُ بِالصَّبَا وَاُهْلِكَتْ عَادٌ بِالدَّبُوْرِ. (متفق علیه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٥٧٨/٨۔ حديث رقم ٤٨٢٨۔ ومسلم في صحيحه ٦١٦/٢ حديث رقم (١٤۔ ٨٩٩)۔ وأبو داؤد في السنن ٣٢٩/٥ حديث رقم ٥٠٩٨ وأحمد في المسند ٦٦/٦۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری مدد کی گئی ہے بادِ صبا (جو مشرقی جانب سے چلتی ہے) کے ساتھ اور قوم عاد کو ہلاک کیا گیا ہے بادِ دبور کے ساتھ (جو مغربی جانب سے چلتی ہے)۔ (بخاری و مسلم)

تشریح: یعنی واقعہ خندق کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا﴾ [الأحزاب۔ ۹]

ہم نے ان پر ہوا بھیج دی اور ایسے لشکر جن کو وہ دیکھ نہیں سکتے تھے۔

(**بالصبا**) یہ ہوا مشرق کی جانب سورج طلوع ہونے کی جگہ سے چلتی ہے۔

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: ''الصبا'' وہ ہوا ہے کہ اگر آپ قبلہ کی طرف منہ کریں تو آپ کی پشت کی جانب سے چلے۔ اور ''الدبور'' وہ ہوا ہے کہ جب آپ کا منہ قبلہ کی طرف ہو تو آپ کے چہرے کی جانب سے چلے۔

(**وأهلكت عاد بالدبور**) دال کے فتحہ کے ساتھ بمعنی عجیب و غریب ہوا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں ''الدبور'' وہ ہوا ہے جو کعبہ کے پیچھے سے اٹھتی ہے اور اس میں نمی اور ٹھنڈک ہوتی ہے۔ اور ''الجنوب'' وہ ہوا ہے جو کعبہ کے دائیں طرف سے اٹھتی ہے اور اس میں گرمی کے ساتھ ساتھ نمی ہوتی ہے۔ اور ''الشمال'' وہ ہوا ہے جو کعبہ کے بائیں جانب سے اٹھتی ہے اور اس میں خشکی اور ٹھنڈک ہوتی ہے۔ اور یہ ہوا جنت سے چلتی ہے۔ (رواہ مسلم)

روایت کیا گیا ہے کہ غزوہ احزاب قریش، غطفان اور یہود تینوں جو اس وقت کی بڑی طاقتیں تھیں مسلمانوں کے خلاف ہوئے اور مسلمانوں کا محاصرہ کر لیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ریح الصبا چلائی جس سے ان کے خیمے ٹوٹ گئے، جانور ہلاک ہو گئے، کمزور لوگ بھاگ گئے خود ان کی آنکھوں میں پتھر اور مٹی پڑنے لگی، ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے اس سبب رعب ڈال دیا، آخر کار اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو مع ایک جماعت کے میدان میں نصرت کیلئے بھیج دیا، کافروں کو اپنی شکست اور مسلمانوں کو اپنی فتح کا یقین ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے اس ہوا کے سبب مسلمانوں کے خوف کو اطمینان سے بدل دیا۔

پس یہ ہوائیں اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہیں جیسا کہ قوم عاد کو ''ریح الدبور'' کے ذریعے ہلاک کیا۔ اس قوم کا قد بارہ گز لمبا تھا مگر یہ آپس میں ٹکرا ٹکرا کر ہلاک ہو گئے۔ پس ان واقعات میں عقل والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔

بادل اور ہوا دیکھ کر آنحضرت ﷺ کا متفکر ہونا

۱۵۱۲: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ مَارَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَاحِكًا حَتّٰى اَرٰى مِنْهُ لَهَوَاتِهٖ اِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ فَكَانَ اِذَا رَاٰى غَيْمًا اَوْ رِيْحًا عُرِفَ فِيْ وَجْهِهٖ۔ (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٣٠٠/٦۔ حديث رقم ٣٢٠٥۔ ومسلم في صحيحه ٦١٦/٢ حديث رقم (١٥۔ ٨٩٩)۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں نے کبھی بھی رسول اللہ ﷺ کو اس طرح ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ آپ کا تالو نظر آتا ہو بے شک آپ مسکراتے تھے پھر جب بادل یا ہوا دیکھ لیتے تو آپ کے چہرے پر تغیر (یعنی پریشانی کے آثار) پہچانا جاتا تھا۔ (بخاری ومسلم)

تشریح: (وعن عائشة قالت...... ضاحكًا) حال ہے یا مفعول ثانی ہے۔

(حتی أری) یہاں تک کہ میں دیکھوں۔

(منه لهواته) لهوات جمع ہے لهاة کی۔ لهاة کہتے ہیں اس گوشت کے ٹکڑے کو جو حلق میں لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو ''کوا'' بھی کہا جاتا ہے۔ اور بعض نے کہا کہ یہ منہ کا وہ گڑھا ہے جو زبان کی جڑ کے قریب ہوتا ہے۔

(انما كان يتبسّم) آپ ﷺ صرف مسکراتے تھے آپ کو کبھی قہقہ لگا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا اس حدیث سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرۃؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ ہنسے حتی کہ آپ کے نواجذ یعنی داڑھیں نظر آنے لگیں، ان دونوں میں تعارض ہے، یہ کیسے رفع ہوگا؟

حقیقت یہی ہے کہ آپ ﷺ ساری زندگی قہقہ لگا کر نہیں ہنسے اور نہ ہی ایسے ہنسے کہ آپ کی داڑھیں نظر آنے لگیں ہوں، اب رہی یہ بات کہ حضرت ابو ہریرۃ کی روایت کا کیا جواب ہے؟ تو اس کے دو جواب ہیں۔

① حضور ﷺ کے نواجذ تھے تو اندر ہی یعنی ظاہر نہیں ہوئے تھے مگر اپنی چمک کی وجہ سے ظاہر کی طرح محسوس ہوتے تھے۔

② اس حدیث میں نواجذ سے مطلقاً دندان مبارک مراد ہیں۔

علماء نے دوسرا جواب پسند کیا ہے۔

(فكان اذا رأى فيها) یعنی بادل۔

(أو ريحًا عرف) یعنی تبدیلی۔

(في وجهه) علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ کے چہرے سے پریشانی کے آثار کا واضح ہونا مراد ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ ساری کائنات پر شفیق تھے۔ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ میری امت ہر قسم کے عذاب سے محفوظ رہے۔ اسی وجہ سے جب تھوڑی تیز ہوا چلتی تو آپ ﷺ گھبرا جاتے۔

(متفق علیہ) میرکؒ نے فرمایا: اور اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

آندھی کے وقت آنحضرت ﷺ کی ایک خاص دعا

۱۵۱۳: وَعَنْهَا قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا عَصَفَتِ الرِّيْحُ قَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ خَيْرَهَا وَخَيْرَ مَا فِيْهَا وَخَيْرَ مَا اُرْسِلَتْ بِهٖ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّمَا فِيْهَا وَشَرِّ مَا اُرْسِلَتْ بِهٖ وَاِذَا تَخَيَّلَتِ السَّمَاءُ تَغَيَّرَلَوْنُهٗ وَخَرَجَ وَدَخَلَ وَاَقْبَلَ وَاَدْبَرَفَاِذَامَطَرَ تْ سُرِّيَ عَنْهُ فَعَرَفْتُ ذٰلِكَ عَائِشَةُ فَسَاَلَتْهُ فَقَالَ لَعَلَّهٗ يَا عَائِشَةُ كَمَا قَالَ قَوْمُ عَادٍ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا

هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا وَفِيْ رِوَايَةٍ وَيَقُوْلُ إِذَا رَأَى الْمَطَرَ رَحْمَةً .. (متفق عليه)

أخرجه البخاري في صحيحه ٨/٢٩١ـ حديث رقم ٤٦٢٧ـ وأحمد في المسند ٢/٢٤ـ

ترجمه: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب تیز ہوا چلتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے تھے: اللھم انی اسئلك...... اے اللہ میں تجھ سے وہ خیر مانگتا ہوں جو اس ہوا میں ہے اور اس چیز کی بھلائی اور خیر مانگتا ہوں جس کیلئے یہ ہوا بھیجی گئی ہے، اور میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے ہوا کے شر سے اور اس چیز کے شر سے جو اس ہوا میں ہے اور اس چیز کے شر سے جس کیلئے یہ ہوا بھیجی گئی ہے اور جب آسمان ابر آلود ہو جاتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ متغیر ہو جاتا تو آپ بے چینی کی وجہ سے گھر سے باہر نکلتے اور کبھی اندر تشریف لاتے اور اسی طرح آگے پیچھے پھرتے، پس جب بارش شروع ہو جاتی تو آپ کا اضطراب ختم ہو جاتا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک مرتبہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اضطراب محسوس کیا تو عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اس کا کیا سبب ہے تو فرمایا اے عائشہ کیا خبر ہے کہ کہیں یہ بادل ویسا ہی ہو جس کو دیکھ کر قوم عاد نے کہا تھا هذا عارض ممطرنا کہ جب اس کو دیکھا کہ وہ بادل انکی وادیوں کی طرف آ رہا ہے تو کہنے لگے یہ وہ بادل ہے جو ہم پر برسے گا۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں، کہ جب بارش شروع ہو جاتی یعنی جب بارش کو دیکھتے تو فرماتے یہ اللہ کی رحمت کا سبب ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح: (وعنها) یعنی عن عائشةؓ۔

(قالت كان النبي ﷺ اذا عصفت الريح) یعنی جب ہوا تیز ہوتی۔

(قال اليلهم انى أسألك خيرها) یعنی اس ہوا کی ذات میں جو خیر ہے وہ مطلوب ہے۔

(وخيرما فيها) اس سے اس کے تمام منافع مراد ہیں۔

(وخير ما أرسلت به) یہاں سے خاص اوقات میں چلنے والی ہوا مراد ہے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اُرسلت میں تاء ساکن نہ ہو بلکہ مفتوح ہو تو اس سے اللہ کی ذات مراد ہوگی مطلب یہ ہوگا کہ یا اللہ تیرے ہی ہاتھ میں اس کا چلانا، ہر خیر اور شر تیرے ہی ہاتھ میں ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے:

''الخير كله بيدك''

لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم شر کی نسبت اللہ کی طرف نہ کریں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ علامہ طیبی کا یہ قول محض تکلف ہے۔ یہ مجہول اور مؤنث کا صیغہ ہی ہے۔ (وأعوذ بك من شرها وشر ما فيها وشر ما أرسلت به) یہاں بھی تاء ساکن ہے۔

(واذا تخيلت السماء) یعنی جب بادل چھا جائیں اور بارش کا خیال پیدا ہونے لگے۔ علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں یہاں السماء سے بادل مراد ہیں اور تخيلت السماء سے بادلوں کا چھا جانا مراد ہے۔

(تغير لونه) اللہ کی خشیت سے۔

(وخرج) کبھی گھر سے باہر آتے۔

(ودخل) اور کبھی اندر جاتے۔

(وأقبل وأدبر) یعنی خوف کی وجہ سے بے قرار سے ہو جاتے۔

(فاذا) بعض نسخوں میں واؤ کے ساتھ ہے۔

(مطرت) یعنی بادل۔

(سری عنه) یعنی خوف ختم ہو جاتا، سرّی میں تشدید مبالغہ کیلئے ہے۔ ابن حجر نے تخفیف کو بھی جائز کہا ہے لیکن یہ اصول کے خلاف ہے۔

(فعرفت ذلك) یعنی تغیر اور تبدیلی۔

(عائشة فسألته) یعنی اسکا سبب پوچھا۔

(فقال لعله یا عائشة) بعض نے کہا لعله سے ''لعل هذا المطر'' مراد ہے۔ لیکن ظاہر یہاں سے ''لعلّ هذا السحاب'' ہے۔

(كما قال قوم عاد) اضافت بیان کیلئے ہے۔ مثال دینا چاہتے ہیں۔ قوم عاد کے ساتھ کہ جب ان پر بادل آئے تو کہنے لگے یہ تو ہم پر برسنے آئے ہیں۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ذکر کیا۔

(فلما رأوه) یعنی بادل دیکھے۔

(عارضا) پھیلے ہوئے بادل۔

(قالوا) کہا انہوں نے یہ سوچتے ہوئے کہ یہ بادل ہم پر برسیں گے۔

﴿هذا عارض ممطرنا﴾ [الاحکاف آیة۔ ۲۳] یعنی یہ تو ہم پر برسنے والے ہیں۔

(وفی روایةٍ: ویقول اذا رأی المطر رحمة:

رحمت منصوب ہے۔ اور فعلِ امر محذوف ہے۔ یعنی ''اجعله رحمةً'' کہ اس کو رحمت بنا دے عذاب بنا دے، اور اگر رفع پڑھیں تو مبتداء محذف ''هذه'' کی خبر ہوگی۔ (متفق علیہ) لیکن بعض محدثین نے اس میں کلام کیا ہے۔ اور ''الحصن'' میں ہے کہ جب آپ ﷺ بارش دیکھتے تو دعا مانگتے: ''اللهم صيبًا نافعًا'' (رواہ البخاری)

پانچ چیزوں کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے

۱۵۱۴: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَفَاتِيْحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ ثُمَّ قَرَأَ إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ الْآيَةَ۔ (رواه البخاری)

أخرجه مسلم فی صحیحه ٤/٢٢٢٨ حدیث رقم(٤٤۔ ٢٩٠٤)۔ وأحمد فی المسند ٢/٣٤٢۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ غیب کے خزانے پانچ ہیں اور پھر یہ آیت پڑھی کہ بے شک اللہ تعالیٰ کے ہی پاس قیامت کا حکم ہے وہی بارش برساتا ہے...... (بخاری)

تشریح: قال رسول اللہ ﷺ: مفاتیح الغیب بعض نے کہا ہے کہ مفاتیح جمع ہے ''مفتح'' کی بمعنی مخزن یعنی مفاتیح الغیب سے مراد خزائن الغیب ہے۔

(خمس) ان پانچ پر اللہ کے علاوہ کوئی اور مطلع نہیں ہوسکتا۔

(ان اللّٰہ عندہ) یعنی اللہ کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں۔

(علم الساعۃ) یعنی قیامت کے قیام کا وقت۔

(وینزل) تشدید اور تخفیف دونوں کے ساتھ۔

(الغیث) یعنی بارش اتارتا ہے۔ جو کہ شہروں کو، بندوں کو سیراب کرتی ہے۔ پس بارش کتنی ہوگی، کب تک ہوگی، کیسے ہوگی اس سب کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

(الایۃ) الایۃ کو منصوب، مرفوع اور مجرور تینوں طرح پڑھ سکتے ہیں، منصوب اس صورت میں پڑھیں گے جب ''اقرأ'' فعل اُمر کو محذوف مانیں۔ مرفوع اس صورت میں پڑھیں گے۔ جب اس کو مبتدأ مانیں اور خبر کو محذوف مانیں۔ اور مجرور اس صورت میں پڑھیں گے جب حرف جر اور مضاف کو محذوف مانیں۔ یعنی ''الی آخر الایۃ''

(وھو یعلم ما فی الأرحام من ذکر أو أنثی) کہ وہ بچہ تام ہوگا یا ناقص ہوگا، گورا ہوگا یا کالا ہوگا، لمبا ہوگا یا قصیر ہوگا، نیک بخت ہوگا یا بد بخت ہوگا۔ بہر حال اس کی تفصیل اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

نیز قرآن مجید میں ہے: ''وما تدری نفس ماذا تکسب غدًا''
کوئی آدمی نہیں جانتا کہ کل اس کو کیا ملنے والا ہے یعنی کیا خیر یا شر اس کو ملنے والی ہے اس کا علم صرف ایک وحدہ لاشریک کے پاس ہے۔

خشک سالی سے ہی قحط نہیں پڑتا

۱۵۱۵: وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَیْسَتِ السَّنَةُ بِاَنْ لَّا تُمْطَرُوْا وَلٰكِنَّ السَّنَةُ اَنْ تُمْطَرُوْا وَلَا تُنْبِتُ الْاَرْضُ شَیْئًا ۔ (رواہ مسلم)

أخرجه مسلم في صحيحه ٤/٢٢٢٨ حديث رقم(٤٤۔ ٢٩٠٤)۔ وأحمد في المسند ٢/٣٤٢۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ حبیب خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قحط یہی نہیں ہے کہ تم پر بارش نہ برسے قحط تو یہ بھی ہے کہ تم پر بارش تو برسے لیکن زمین کچھ بھی نہ اُگائے۔ (مسلم)

تشریح: قال رسول اللہ ﷺ: لیست السنۃ) السنۃ سے مراد قحط ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا قحط یہ نہیں۔

(بان لا تمطروا) بارش نہ ہو بلکہ قحط تو یہ ہے کہ بارش ہو، بار بار ہو مگر زمین سے سبزہ وغیرہ کچھ نہ پیدا ہو اسی کو ان الفاظ ولکن السنۃ أن تمطروا وتمطروا ولا تنبت الارض شیئًا سے نبی کریم ﷺ نے امت کو سمجھایا یعنی مطلوب کثرت نہیں بلکہ برکت ہے اگر برکت ~~نہ ہو تو کثرت~~ کسی کام کی نہیں۔ (رواہ مسلم)

الفصل الثانی:

ہوا اللہ کی رحمت ہے

۱۵۱۶: عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الرِّیْحُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ تَاْتِیْ بِالرَّحْمَةِ وَبِالْعَذَابِ فَلَا تَسُبُّوْهَا وَسَلُوا اللّٰهَ مِنْ خَیْرِهَا وَعُوذُوْا بِهٖ مِنْ شَرِّهَا ۔

(رواہ الشافعی وابوداود وابن ماجة والبیهقی فِی الدَّعْوَاتِ الْکَبِیْرِ)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۵/۳۲۸ حدیث رقم ۵۰۹۷۔ وابن ماجه ۲/۱۲۲۸ حدیث رقم ۳۷۲۷۔ وأحمد فی المسند ۲/۲۵۰۔

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہوا اللہ کی رحمت میں سے ہے اللہ کی رحمت بھی لاتی ہے اور عذاب بھی لاتی ہے، پس تم اس کو برا بھلا نہ کہو، اور اللہ سے اس کی بھلائی مانگو اور اللہ تعالیٰ سے اس کے نقصان سے پناہ مانگو۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ، بیہقی، الشافعی)

تشریح: (عن ابی هریرة......روح الله) راء کے فتحہ کے ساتھ۔ بمعنی ''رحمت'' جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿فروح وریحان﴾ [الواقعہ۔ ۱۹]

(تأتی بالرحمة وبالعذاب فلا تسبوها) یعنی اس میں ضرر بھی ہے اس لئے بعض لوگ اس کو برا بھلا کہتے ہیں مگر ایسا نہیں کہنا چاہیے کیونکہ اس میں خیر اور رحمت بھی تو ہے۔

نیز ایک اور جگہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ﴾ [یوسف۔ ۸۷ (اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو)۔

بہرحال یہ ہوا اللہ کے بندوں کیلئے رحمت ثابت ہوتی ہے جبکہ ظالموں کیلئے عذاب۔

(وسلوا الله من خیرها وعوذوا به من شرها)

بعض نے کہا ہے کہ ''الریاح'' یعنی ہوائیں آٹھ قسم کی ہیں جن میں سے چار رحمت کی ہیں اور چار عذاب کی ہیں۔

رحمت والی چار ہوائیں:

① الناشرات۔ ② المرسلات۔ ③ الذاریات۔ ④ المبشرات۔

عذاب والی چار ہوائیں:

① العاصف۔ ② القاصف۔ (ان دونوں کا تعلق سمندر سے ہے) ③ الصرصر۔ ④ العقیم (ان کا تعلق خشکی سے ہے)

(رواہ الشافعی وابوداؤد وابن ماجہ والبیہقی فی الدعوات الکبیر)

ہوا پر لعنت نہیں کرنی چاہئے

۱۵۱۷: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلًا لَعَنَ الرِّیْحَ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَا تَلْعَنُوا الرِّیْحَ

فَاِنَّهَا مَامُوْرَةٌ وَاِنَّهٗ مَنْ لَّعَنَ شَیْئًا لَیْسَ لَهٗ بِاَهْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَةُ عَلَیْهِ۔ (رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

أخرجه أبوداوٗد فی السنن ۲۱۲/۵ حديث رقم ۴۹۰۸ والترمذی فی السنن ۳۰۹/٤ حديث رقم ۱۹۷۸۔

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوا پر لعنت کی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہوا پر لعنت نہ کرو، اس لئے کہ وہ اللہ کی جانب سے مامور ہے (یعنی جو کچھ کرتی ہے اللہ کے حکم سے ہے) اور بے شک جو شخص ایسی چیز پر لعنت کرتا ہے جو لعنت کی مستحق نہیں ہوتی تو وہ لعنت لعنت کرنے والے پر ہی لوٹ آتی ہے۔

اسنادی حیثیت: یہ روایت امام ترمذی نے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: فقال لا تلعنوا الريح فانها مأمورة : یعنی یا تو رحمت کے ساتھ یا عذاب کے ساتھ مأمور ہے۔ یعنی اس کو جو حکم ملا ہے اس کا کام اس کو پورا کرنا ہے۔

(و انه) ضمیر شان ہے۔

(من لعن شیئًا لیس) یعنی وہ چیز۔

(له) ۂ ضمیر اللعن کی طرف راجع ہے۔

(بأهل) یعنی جس چیز پر لعنت کی گئی اور وہ اس لعنت کی حق دار نہ تھی۔

(رجعت اللعنة عليه) وہ لعنت لوٹ آتی ہے اسی پر جس نے لعنت بھیجی تھی۔ یاد رکھئے لعنت رحمت کی ضد ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں لعنت کے مستحق تین افراد ہیں۔

① کافر۔ ② بدعتی۔ ③ فاسق۔ ہوا لعنت کی مستحق نہیں ہے۔

(رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب)

ہوا کے چلنے کے وقت دعا مانگنی چاہئے

۱۵۱۸: وَعَنْ اُبَیِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاتَسُبُّوا الرِّيْحَ فَاِذَا رَاَيْتُمْ مَا تَكْرَهُوْنَ فَقُوْلُوْا اَللّٰهُمَّ اِنَّانَسْئَلُكَ مِنْ خَيْرِ هٰذِهِ الرِّيْحِ وَخَيْرِ مَافِيْهَا وَخَيْرِ مَا اُمِرَتْ بِهٖ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ هٰذِهِ الرِّيْحِ وَشَرِّ مَافِيْهَا وَشَرِّ مَا اُمِرَتْ بِهٖ۔ (رواه الترمذی)

أخرجه الترمذی فی السنن ٤/٥٢١ حديث رقم ۲۲۵۲۔ وأحمد فی المسند ۱۲۳/۵۔

ترجمہ: حضرت ابی ابن کعبؓ سے روایت ہے کہ محبوب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہوا کو گالی مت دو، پس جب تم اس میں وہ چیز دیکھو جو تمہیں ناگوار محسوس ہو تو یہ دعا پڑھو۔ اے اللہ ہم تجھ سے اس ہوا کی بھلائی طلب کرتے ہیں اور جو کچھ اس ہوا کے اندر ہے اور اس چیز کی جس کیلئے یہ ہوا مامور کی گئی ہے اور ہم تجھ سے پناہ طلب کرتے ہیں اس ہوا کی شر سے اور اس چیز کے شر سے جو اس میں ہے اور اس چیز کے شر سے جس کیلئے یہ ہوا مامور ہے۔ (ترمذی)

تشریح: (وعن أبی كعب ...... الريح) کیونکہ یہ تو مأمور اور معذور ہے۔

(فاذا رأیتم ما تکرھون) یعنی تمہیں یہ بری لگ رہی ہو زیادہ سرد یا زیادہ گرم ہونے کی وجہ سے
(فقولوا) یہ کہو۔
(اللھم انا نسألك من خیر ھذہ الریح وخیر ما فیھا وخیر ما أمرت بہ ونعوذبك من شر ھذہ الریح وشر ما فیھا وشر ما أمرت بہ رواہ الترمذی)
اور فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ریح اور ریاح میں فرق

۱۵۱۹: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَاهَبَّتْ رِيْحٌ قَطُّ اِلَّا جَثَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا رَحْمَةً وَّلَا تَجْعَلْهَا عَذَابًا اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا رِيَاحًا وَلَاتَجْعَلْهَا رِيْحًا قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا وَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ وَاَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ وَاَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ ۔ (رواہ الشافعی والبیھقی فی الدعوات الکبیر)
أخرجہ الشافعی فی مسندہ ص ۱۸۱۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے جب کبھی بھی تیز ہوا چلتی تھی تو آنحضرت ﷺ دو زانو ہو کر بیٹھ جاتے تھے اور یہ دعا پڑھتے تھے ''اللھم اجعلھا رحمۃ ولا تجعلھا عذابا اللھم اجعلھا ریاحا ولا تجعلھا ریحًا'' اے اللہ تو اس ہوا کو رحمت بنا اور عذاب نہ بنا اور اس ہوا کو ریاح (رحمت والی) بنا، ریح (یعنی عذاب والی) نہ بنا۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اللہ کے اس ارشاد ﴿انا ارسلنا علیھم ریحًا صرصرًا وارسلنا علیھم الریح العقیم وارسلنا الریاح لواقح. وان یرسل الریاح مبشرات﴾ اور بھیجی ہم نے ان پر تیز و تند ہوا اور بھیجی ہم نے ان پر بانجھ ہوا (یعنی جو ان کے درختوں کے پھل ختم کر دیتی تھی، اور بھیجی ہم نے ان پر پھل لانے والی ہوائیں اور یہ کہ بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ بارش کی خوشخبری لانے والی ہوائیں۔ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ان آیات میں ریح عذاب والی ہوا کیلئے ہے اور ریاح رحمتوں والی ہواؤں کیلئے ہے۔ (بیہقی، شافعی)

تشریح: (وعن ابن عباس......) بمعنی ''قعد'' یعنی بیٹھ گئے۔
(علی رکبتیہ) بعض نسخوں میں رکبتین کے بجائے ''رکبۃ'' ہے۔ اور اس طرح بیٹھنے سے عاجزی سے کنایہ ہے۔
(وقال اللھم اجعلھا رحمۃ) یعنی ہمارے لئے رحمت بنا دے۔
(ولا تجعلھا عذابًا) یعنی ہمارے اوپر عذاب نہ بنا۔
(اللھم اجعلھا ریاحًا ولا تجعلھا ریحًا قال ابن عباس: فی کتاب اللّٰہ) مؤلف نے ابن عباس کا قول تائیدًا ذکر کیا۔ قرآن مجید میں ہے:
''انا ارسلنا علیھم ریحًا صرصرًا''۔ ''ہم نے ان پر سخت سرد ہوا بھیجی''۔

''ارسلنا علیهم الریح العقیم''۔ ''ہم نے ان پر ایسی ہوا بھیجی جس میں خیر نہ تھی''۔
ان دونوں آیتوں میں ریح شر والی ہوا کو کہا ہے اسی وجہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ریح سے پناہ مانگی جبکہ قرآن مجید میں ہی ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
''وأرسلانا الریاح لواقح''۔ ''ہم نے ایسی ہوا بھیجی جو درختوں کو لہلہانے والی تھی''۔
''أن یرسل الریاح مبشرات''۔ ''خوش خبری دینے والی ہوا بھیجی گئی''۔
پس اس سے معلوم ہوا کہ ریح عذاب والی ہوا اور ''الریاح'' رحمت والی ہوا کو کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ علیہ السلام نے ریح سے پناہ مانگی اور ''الریاح'' کو طلب کیا۔

بارش کے وقت کی دُعا

۱۵۲۰: وَعَنْ عَآئِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَااَبْصَرْنَا شَيْئًا مِنَ السَّمَآءِ تَعْنِي السَّحَابَ تَرَكَ عَمَلَهُ وَاسْتَقْبَلَهُ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَافِيْهِ فَاِنْ كَشَفَهُ اللّٰهُ حَمِدَ اللّٰهَ وَاِنْ مَطَرَتْ قَالَ اَللّٰهُمَّ سَقِيًّانَافِعًا۔ (رواہ ابوداود والنسائی وابن ماجۃ والشافعی واللفظ لہ)

أخرجه أبوداوٗد في السنن ٥/٣٣٠ حديث رقم ٥٠٩٩۔ والنسائي ٣/١٦٤ حديث رقم ١٥٢٣۔ وابن ماجه ٢/١٢٨٠ حديث رقم ٣٨٨٩۔ وأحمد في المسند ٦/١٩٠۔

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب آسمان سے کوئی بادلوں کی گھٹا اٹھتی ہوئی دیکھتے تو اپنا کام کاج چھوڑ دیتے تھے اور اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے اور یہ دعا کرتے تھے، اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس چیز کی برائی سے جو اس میں ہے اگر اللہ تبارک وتعالیٰ اس ہوا کو بارش برسانے سے پہلے ہی ختم فرما دیتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی حمد وثناء کرتے اور اگر بارش ہو جاتی تو یہ دعا پڑھتے تھے۔ اے اللہ تو نفع دینے والا پانی ہم پر خوب برسا۔ (ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ' شافعی) یہ الفاظ شافعیؒ کے ہیں۔

تشریح: (وعن عائشة ...... شيئا) یعنی بادل دیکھتے۔
(من السماء) مراد دونوں کی یہی ہے کہ آسمان پر بادل دیکھتے۔
(تعنی السحاب) یہ جملہ معترضہ ہے۔ ماقبل کی تشریح وتفسیر کیلئے تھا۔
(ترك) اس کے فاعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔
(عمله) یعنی وہ مباح عمل چھوڑ دیتے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشغول ہوتے تھے۔
(واستقبله) یعنی بادل۔
(وقال اللهم انی اعوذبك من شر ما فيه فان) فاء تفصیلیہ ہے۔

(كشفه الله) یعنی بارش نہ ہو اور بادل چھٹ جائے۔

(حمد الله) تو اس پر بھی اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں شر سے نجات دی۔

(وان مطرت قال: اللهم سقياً) سین کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ بمعنی "اللهم اسقنا سقياً" "یا" وأسالك سقياً۔
یعنی یہ مفعول مطلق ہے یا مفعول بہ۔

(نافعًا) فائدہ مند۔

(رواه ابو داؤد والنسائي وابن ماجه والشافعي واللفظ له) یعنی لفظ الحديث للشافعي وللباقين معناه۔

گرج اور بجلی گرنے کے وقت کی دُعا

۱۵۲۱: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا سَمِعَ صَوْتَ الرَّعْدِ وَالصَّوَاعِقِ قَالَ اَللّٰهُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذٰلِكَ۔

(رواه احمد والترمذى وقال هذا حديث غريب)

أخرجه الترمذى فى السنن ٥/٥٠٣ حديث رقم ٣٤٥٠ وأحمد فى المسند ٢/١٠٠۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب گرج کی آواز سنتے تھے یا بجلی گرنے کی آواز سنتے تھے تو دعا فرماتے اے اللہ تو ہمیں اپنے غضب سے ہلاک نہ کر اور اپنے عذاب کے ساتھ ہمیں نہ مار اور ہمیں اس سے پہلے پہلے عافیت عطا فرما دے۔ (ترمذی) امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔

اسنادی حیثیت: احمد، ترمذی اور امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح: أن النبی ﷺ كان اذا سمع صوت الرعد) اس میں بیان کیلئے عام کی خاص کی طرف اضافت ہے۔
بہر حال رعد کہتے ہیں اس آواز کو جو بادلوں سے سنائی دیتی ہے۔ جیسا کہ ابن الملک نے فرمایا، لیکن صحیح یہ ہے کہ "رعد" اس فرشتے کی آواز ہے جو بادلوں پر مقرر ہے۔ امام شافعیؒ نے الثقہؒ سے اور یہ مجاہد سے نقل کرتے ہیں کہ:
"رعد" ایک فرشتے کا نام ہے اور "برق" اس کے پر ہیں۔ جن کے ذریعے سے وہ سحاب کو ہانکتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:
"اللہ تعالیٰ نے بادلوں کو بھیجا، پس انہوں نے نطق کیا تو کمال کا نطق کیا اور اسی طرح وہ مسکرائے تو کمال کا مسکرائے، پس ان بادلوں کا نطق "رعد" ہے اور ان کا مسکرانا "برق" ہے"۔
اور بعض نے کہا کہ "البرق" سوط کی چمک ہے جبکہ الرعد اس سوط کو کھینچنے سے پیدا ہونے والی آواز ہے۔

(والصواعق) نصب کے ساتھ ہے پس اس کی تقدیری عبارت یوں ہوگی۔"احسن الصواعق" اوراگر مجرور ہو جیسا کہ حدیث میں ہے تو یہ معطوف ہوگا الرعد پر۔

(قال) آپ ﷺ فاعل ہیں۔

(اللهم لا تقتلنا بغضبك ولا تهلكنا بعذابك) اپنے غصے کی وجہ سے ہمیں مارمت ڈالنا۔یعنی ہمیں ایسی حالت میں ہی نہ لا کہ جس سے تیرا غصہ ہم پر ہو اور ہم مارے جائیں اور نہ ہی اپنے عذاب وعقوبت میں ہمیں ہلاک کر۔کیونکہ جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو ہر نیک اور بد پر یکساں آتا ہے۔

(وعافنا) یعنی اے اللہ! میری امت کو عافیت سے رکھنا۔

(قبل ذلك) ہر عذاب سے۔

رواه احمد، والترمذی وقال هذا حديث غريب۔

قال ميرك: نقلاً عن التصحيح ورواه النسائی فی اليوم والليلة والحاكم واسناده جيد وله طرق۔

الفصل الثالث:

گرج کی آواز سن کر تسبیحات میں مشغول ہو جانا چاہیے

۱۵۲۲: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّهٗ كَانَ اِذَا سَمِعَ الرَّعْدَ تَرَكَ الْحَدِيْثَ وَقَالَ سُبْحٰنَكَ الَّذِيْ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ۔ (رواه مالك)

أخرجه مالك فی الموطأ ۲/۹۹۲ حديث رقم ۲٦ من كتاب الكلام۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ جب وہ گرج کی آواز سنتے تھے تو بات چیت چھوڑ دیتے تھے اور سُبْحٰنَكَ الَّذِيْ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔"پاک ہے وہ ذات جس کی رعد پاکی بیان کرتا ہے اس کی تعریف کے ساتھ اور فرشتے بھی اس کے خوف کے ساتھ"۔

(امام مالک)

تشریح: (عن عبدالله بن الزبير أنه كان اذا سمع الرعد) یعنی اس کی آواز۔

(ترك الحديث) یعنی لوگوں کے ساتھ بات چیت چھوڑ دیتے۔

(وقال: سبحان الذی يسبح الرعد) اور یہ وہ فرشتہ ہے جو بادلوں پر مقرر ہے۔

(بحمده) یعنی اللہ کیلئے ہی ہر تعریف ہے۔علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: اس کی نسبت مجازی ہے کیونکہ الرعد سبب ہے اس کا کہ اس کو سننے والا اللہ کی تسبیح کرے ڈرتا ہوا اور امید رکھتا ہوا، لیکن یہ ضعیف ہے بوجہ اس کے جو صحیح حدیث میں ہے کہ الرعد ایک فرشتے کا نام ہے۔پس تسبیح کی نسبت اس کی طرف کرنا حقیقی ہے مجازی نہیں۔

(والملائکة من خیفته) یعنی اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے۔اور بعض نے کہا کہ رعد یعنی فرشتے کے خوف سے کیونکہ یہ ان کا سردار ہے۔(رواہ مالک)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ سفر میں تھے، اچانک بجلی چمکنے اور کڑکنے لگی، حضرت کعب نے ہم سے کہا کہ جو شخص بجلی کے کڑکنے کے وقت یہ تین دفعہ پڑھے تو وہ عافیت میں رکھا جاتا ہے۔

''سبحان من یسبح الرعد بحمده والملائکة من خیفته''۔

پس ہم سب نے مندرجہ بالا دعا پڑھی تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں حفاظت میں رکھا۔ نیز حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی بجلی کڑکنے کے وقت یہ دعا پڑھے لیکن پھر بھی بجلی اسے کوئی نقصان پہنچائے تو اس کی دیت (خون بہا) مجھ پر ہے۔ یعنی میں اس کی جان کا بدلہ دوں گا۔

ابن السنی سے مروی ہے۔ اگرچہ اسناد ثابت نہیں لیکن یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ جب ستارے ٹوٹ کر گریں تو ہمیں ان کو دیکھتے ہی مت رہیں بلکہ یوں کہیں ''ما شاء الله لا قوة الا بالله''۔

امام شافعیؒ سے ضعیف مرسل سند کے ساتھ مروی ہے کہ دن اور رات میں کوئی گھڑی ایسی نہیں گذرتی مگر یہ آسمان برس رہا ہوتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اسے جہاں چاہتے ہیں پھیر دیتے ہیں۔(مسند الشافعی ص:۸۲)

اور حضرت کعب سے ضعیف سند کے ساتھ مروی ہے:

''قیامت کے قریب سیلاب زیادہ آنے لگیں گے''۔ میرکؒ کہتے ہیں اس کی سند صحیح ہے۔

لِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَآ اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ